وہ عظیم الشان اور علمی کتاب جس میں شیعہ مذہب کی ابتداء ان کے بے شمار فرقے شیعوں کے اسلاف و علماء اور ان کی کتابیں واحادیث اور ان کے راویوں کے حالات۔ ان کے طریقے جن سے وہ سادہ لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف لاتے ہیں۔ الوہیت، نبوت، معاد اور امامت کے بارے میں ان کے عقائد ان کے پوشیدہ فقہی مسائل، صحابۂ کرامؓ، ازواج مطہرات اور اہلِ بیت کے متعلق ان کے عقائد و اقوال۔ ان کے اوہام و تعصبات اور ہفوات کی تفصیل۔ غرض اس کتاب میں اس موضوع کے تمام مباحث جمع کر دیئے گئے ہیں۔

تصنیف : حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ

ترجمہ اردو : مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی (مظاہری)

دارالاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ فون ۲۶۳۱۸۶۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحفہ اثنا عشریہ اردو

وہ عظیم الشان کتاب جس میں شیعہ مذہب کی ابتداء، ان کے بے شمار فرقے شیعوں کے اسلاف و علماء اور ان کی کتابیں و احادیث اور ان کے راویوں کے حالات۔ ان کے مکر و فریب کے طریقے جن سے وہ سادہ لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف لاتے ہیں۔ الوہیت، نبوت، معاد اور امامت کے بارے میں اُن کے عقائد اُن کے پوشیدہ فقہی مسائل، صحابہ کرامؓ، ازواج مطہرات اور اہل بیت کے متعلق ان کے عقائد و اقوال۔ اُن کے جھوٹ، مکائد و مطاعن، ان کے اوہام و تعصبات اور مغلطات کی تفصیل۔ غرض اس کتاب میں اس موضوع کے تمام مباحث جمع کر دیے گئے ہیں۔

تصنیف: حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

ترجمہ اردو: مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی (مظاہری)

ناشر

مقابل مولوی مسافرخانہ۔ کراچی ۱

حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ کے مختصر حالات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت اور دفاع کا کام ہمیشہ اپنے مخصوص بندوں اور علمائے کرام و اولیاء عظام سے ہی لیا ہے۔ جس زمانہ میں بھی کسی فتنہ نے سر اٹھایا، تو یہی جانباز اور سرفروش بندے سر سے کفن باندھ کر اس فتنہ کے مقابلے کے لئے میدان میں آئے اور ہر قسم کی قربانیاں پیش کرکے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کردیا اور اسلام کے پرچم کو سربلند رکھا۔ فتنۂ اعتزال ہو یا فتنۂ رفض، فتنۂ خارجیت ہو یا فتنۂ بدعت۔ ان سب کے مقابلے پر ہمیشہ یہی بندگانِ خدا صف سامنے آئے اور اپنا اپنا کام کرگئے ؎ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ہندو پاکستان بھی ہمیشہ طرح طرح کے فتنوں کی آماجگاہ بنے رہے ہیں۔ مغلیہ دور میں اگر اکبر بادشاہ کے دینِ الٰہی کا فتنہ اٹھتا ہے تو اس کی سرکوبی کے لیے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ میدان میں آجاتے ہیں اور اس فتنہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیتے ہیں۔

اور جب رفض و بدعت سر اٹھاتے ہیں تو اس کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے لائق فرزند اور صحیح جانشین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو پیدا فرما دیتا ہے اور ان سے اپنے دین کی حفاظت کا کام لیتا ہے۔ جو دین میں طرح طرح کی آمیزشوں اور آلائشوں کو اپنی تحریر و تقریر سے پاک و صاف کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ہندو پاکستان کا ہر مسلمان حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا مرہونِ منت ہے کیونکہ آج دین کی جو کچھ صحیح شکل و صورت نظر آتی ہے وہ اسی خاندان کی اسلامی خدمات کی بدولت ہے۔

جنہوں نے یہاں تمام علومِ اسلامی اور خصوصاً تفسیر و حدیث اور فقہ اسلامی کی ایسی شاندار اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں جو رہتی دنیا تک انشاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ اور ان کے لئے ہمیشہ کے لئے ایک صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گی۔

ان کے خاندان کے لئے فی الحقیقت یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ایں سلسلہ از طلائے ناب است ایں خانہ تمام آفتاب است

ایسے ہی بوریہ نشین اور خدامست علماء میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سرفہرست ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ موقع کی مناسبت سے یہاں اُن کے کچھ حالاتِ زندگی اور کارناموں کا ذکر کیا جائے۔

لیکن افسوس کہ ایسے عظیم المرتبت ولی کامل اور یگانۂ روزگار مفسر، محدث اور فقیہ اور جامع کمالات شخصیت کے حالاتِ زندگی یکجائی طور پر بہت کم ملتے ہیں۔ کافی تلاش و جستجو سے ہمیں اُن کے جو حالات میسر آسکے وہ ہم یہاں مختصراً درج کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے حالات سے پہلے کچھ اُن کے زمانہ اور عہد کا حال معلوم کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے جن حالات اور جس زمانہ میں آنکھ کھولی وہ زمانہ انتہائی سخت فتنہ کا زمانہ تھا۔ جس میں اظہارِ حق سخت دشوار تھا اس لئے شاہ صاحب ترویجِ دین کا کام نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ کرتے تھے اور فتنہ انگیز عنوانات سے پرہیز کرتے تھے اور وجہ یہ تھی کہ شاہ صاحب کا جن لوگوں سے واسطہ پڑا تھا وہ دین سے بالکل ناآشنا تھے ایسے لوگوں کو راہ پر لگانا سخت دشوار تھا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے اپنی کمال حکمت و دانائی سے ان کو

راہ پر لگایا اس زمانہ میں روافض کا غلبہ اور نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے حضرت شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروائے تھے۔ تاکہ کچھ لکھ نہ سکیں۔ اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کو شہید کرا دیا تھا۔

اور روافض نے خود شاہ عبدالعزیز رحؒ کو دو مرتبہ زہر دلوایا تھا۔ دوسرے مصنوعی صوفیوں کا غلبہ تھا جن کا اثر بادشاہ شاہزادوں اور شاہزادیوں پر تھا۔ ایسا سخت زمانہ تھا جس میں حضرت شاہ صاحب کو اپنا کام انجام دینا تھا۔ جس میں وہ اپنی فہم و فراست اور حکمت و دانائی سے بڑی حد تک کامیاب ہوئے[1]

شاہ صاحب کی پیدائش نام ونسب اور حلیہ | آپ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آپ دہلی میں ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۷۴۶ء کو بوقت سحر پیدا ہوئے والد ماجد نے اُن کا نام عبدالعزیز رکھا اور آپ کا تاریخی نام غلام حلیم رکھا اور آپ نے یہی نام معلماً تحفہ اثنا عشریہ پر اپنا تحریر فرمایا ہے۔ آپ کا نسب چونتیسویں پشت میں حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب سے جا ملتا ہے۔ آپ نے تمام علوم ظاہری و باطنی اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ سے حاصل کئے۔ اور بعض کتب کی سند شاہ صاحب کے بعض تلامذہ سے بھی حاصل کی۔ آپ اپنے والد ماجد ہی سے بیعت ہوئے۔ اور پھر خرقہ خلافت پہنا۔ جس وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ برس تھی تو حضرت شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد اُن کے صحیح جانشین ہوئے۔ آپ دراز قد، گندم رنگ، لاغر جسم اور آنکھیں بڑی بڑی رکھتے تھے۔ چہرے پر خوبصورت گول داڑھی تھی۔ آپ کی نرینہ اولاد کوئی نہ تھی البتہ تین صاحبزادیاں تھیں۔

آپ کے چند محاسن و کمالات | آپ کی ذات ایسی جامع کمالات اور مجموعہ صفات تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آپ نرم طبیعت خوش اخلاق اور مزاج میں نہایت خوش طبعی تھی ہر چیز میں نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ صاحب علم و حلم، زہد و ورع و تقویٰ اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ تمام علوم متداولہ اور فنون عقلیہ و نقلیہ میں عبور و دستگاہ رکھتے تھے حافظہ ایسا قوی کہ صحاح ستہ از بر تھیں۔ تعبیر خواب میں خصوصی ملکہ اور واعظ ایسے کہ عوام و خواص، علماء و فقراء، امراء سلاطین و امراء سب ہی آپ کی مدح و تحسین میں رطب اللسان تھے۔ صاحب دلیل و برہان تھے اور موافق مخالف شیعہ و سنی سب آپ کے معتقد تھے۔

آپ نے ساری عمر درس و تدریس افتاء وعظ و نصائح میں ہی بسر فرمائی۔ اور خصوصاً علم حدیث کا فیض ہندوستان میں عام کیا۔ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ اسناد آپ تک اور آپ کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچا ہے۔

دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں آتے اور علم کی پیاس بجھاتے اور سند کی تکمیل حاصل کرتے اور اپنی اس نسبت تلمذی کو باعث صد فخر جانتے۔ آپ مرجع علماء و مشائخ اور قطب ارشاد تھے۔

آپ کی معلومات بے حد وسیع تھیں جو صرف اسلامی علوم و فنون تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے متعلقہ علوم ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ زبان، لغت، انشا و شاعری، موسیقی، خوشخطی، تعبیر خواب، تیر اندازی، گھوڑ سواری اور پیراکی غرض کوئی علم و فن ایسا نہ تھا جس میں آپ کو کامل دستگاہ نہ ہو۔

آپ خود فرماتے ہیں کہ جو علوم میں نے مطالعہ کئے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق مجھے یاد بھی ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس ۱۵۰ ہے۔ انہیں سے نصف کے قریب تو وہ علوم ہیں جو امت مسلمہ کی تخلیق ہیں اور باقی نصف دوسری امتوں کے۔ اور تو اور آپ کو فن موسیقی کے علمی پہلوؤں سے پوری واقفیت تھی اور مختلف راگوں کو پوری طرح پہچانتے تھے[2]

اس زمانہ کی شعر و شاعری اور ادبی معاملات میں بھی آپ کی رائے ایک حجت اور سند سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ جب شاہ نصیر دہلوی (جو مشہور شاعر ذوق کے استاد ہیں) نے ذوق کی غزل درست کرنے سے انکار کر دیا تو ذوق دہلی کے

---

[1] ارواح ثلاثہ بروایت امیر الروایات از میر شاہ خاںؒ۔ [2] حالات و کرامات عزیزی، رود کوثر شیخ محمد اکرم۔

سب اساتذہ کو چھوڑ کر شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب آپنے غزل کے متعلق اس کی تسلی کر دی تو ذوقؔ نے کسی اور سے اصلاح لئے بغیر بے دھڑک اس غزل کو مشاعرہ میں پڑھا[1]

اور ذوقؔ کا تعلق جب شاہ نصیر سے ختم ہو گیا تو وہ اکثر شاہ صاحب کے وعظ میں شریک ہونے لگا۔ کسی دوست نے پوچھا کہ تم یہاں کیوں آتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ شاہ صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اس لئے میں ان کے بیان و گفتگو سنتا ہوں اور اردو زبان کے محاورے اور روزمرہ یاد کرتا ہوں۔ دراصل شاہ عبدالعزیز بچپن میں اپنے والد محترم کے حکم کے بموجب خواجہ میر درد کی خدمت میں اردو زبان سیکھنے جایا کرتے تھے۔ اور خواجہ میر دردؔ اردو زبان کے موجد و مجتہد ہیں[2]

الغرض یہاں تک آپ کے کمالات گنوائے جائیں اس کے لئے تو ایک دفتر درکار ہے۔ صاحب تذکرہ علمائے ہند لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب۔ بالجملہ وے جامع علوم بلکہ آیتے از آیات الٰہی بود

اور علامہ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے فرمایا ہے۔ ؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت شاہ صاحب کی وفات | آپ کی وفات اسی سال کی عمر میں ۷ رشوال ۱۲۳۹ھ مطابق ۵ جون ۱۸۲۴ء کو صبح کے وقت ہوئی۔ اور کہتے ہیں کہ نماز جنازہ میں ہجوم کا یہ عالم تھا کہ آپ کی نماز جنازہ ۵۵ پچپن مرتبہ پڑھی گئی۔ اور دہلی میں اپنے والد ماجدؒ کے قریب آپ مدفون ہوئے۔

مشہور شاعر حکیم مومن خاں مومنؔ نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیئے ہوئے نام مومن خاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ تاریخ وفات کہی تھی۔

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں۔ فضل و ہنر۔ لطف و کرم۔ علم و عمل (۱۲۳۹ھ)

حضرت شاہ صاحب کے چند تلامذہ | آپ کے شاگردوں کی تعداد تو بے شمار ہے ہم یہاں چند نام درج کرتے ہیں
شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ۔ شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ[3]۔ مفتی صدرالدین دہلویؒ۔ شاہ غلام علی صاحب۔ مولانا مخصوص اللہ صاحب۔ مولانا عبدالحی صاحب۔ مولانا میر محبوب علی صاحب۔ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مولانا سید احمد بریلویؒ۔

آپ کی تصانیف | آپ کا زیادہ تر وقت درس و تدریس اور خدمت فتویٰ و حدیث میں گذرا۔ اس لئے تصانیف کے لئے زیادہ وقت نہ مل سکا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی جو تصانیف ہیں وہ سب نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں۔ جن سے آپ کی جلالت شان اور علوئے مرتبہ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں
تفسیر عزیزی ہے جو اپنے طرز کی منفرد تفسیر ہے۔ عجالۂ نافعہ اصول حدیث میں بے مثل کتاب ہے۔ بستان المحدثین جو محدثین کے حالات میں نہایت عمدہ اور جامع کتاب ہے سر الشہادتین ہے۔ آپ کا مجموعۂ فتاویٰ ہے جو ہر قسم کے مسائل پر مشتمل ہے ان کے علاوہ اور بھی چند رسائل آپ کے تصانیف ہیں۔ لیکن آپ کی سب سے زیادہ مشہور اور عظیم المرتبہ کتاب تحفۂ اثنا عشریہ ہے ہم یہاں اس اہم کتاب کا تعارف قدرے تفصیل سے کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] رود کوثر بحوالہ آب حیات
[2] رود کوثر بحوالہ لال قلعہ کی ایک جھلک سید ناصر نذیر فراق۔
[3] شاہ عبدالغنی مولانا مملوک العلی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا سلسلہ اسناد انہی کے واسطہ سے حضرت شاہ ولی اللہ تک پہنچتا ہے۔

تحفۂ اثنا عشریہ فارسی

جیساکہ ہم شروع صفحات میں لکھ چکے ہیں کہ شاہ صاحب کا زمانہ بڑے فتنوں کا زمانہ تھا۔ اور شاہ صاحب ہر معاملہ میں بڑے حزم واحتیاط سے کام لیتے تھے۔ لیکن دین حق اور کلمۂ حق کے معاملہ میں آپ جری بھی ایسے تھے کہ خاص انگریزوں کے تسلط کے زمانہ میں سب سے پہلے آپ ہی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا تھا۔

اور معاملہ فہم ایسے تھے کہ جب انگریزوں نے دہلی کالج قائم کیا تو مسلمان اس میں تعلیم حاصل کرنے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن آپ نے ہی سب سے پہلے مسلمانوں کو اس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی اور پھر اسی دہلی کالج سے ایسے ایسے یگانۂ روزگار علماء وفضلاء پیدا ہوئے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

آپ کی اسی حق گوئی وبے باکی نے انتہائی نامساعد اور کٹھن حالات میں آپ سے تحفۂ اثنا عشریہ جیسی[1] عظیم المرتبت کتاب تصنیف کرائی۔ جو بلاشک ایک بہت بڑا علمی کارنامہ تو تھا ہی۔ لیکن نجف خاں جیسے جابر وظالم کے زمانۂ اقتدار میں اس کتاب کی تصنیف واشاعت کوئی دل لگی یا آسان کام نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت اور ہمتِ مردانہ کا کام تھا۔ حضرت شاہ صاحب تحفہ کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

ہمارے زمانہ میں اور ہمارے شہروں میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جس میں ایک دو آدمی اس مذہب کے قائل اور شیعہ خیالات سے متاثر نہ ہوں۔

چنانچہ اسی فتنہ کی سرکوبی کے لئے یہ کتاب تالیف کی گئی۔ اصل کتاب فارسی زبان میں تصنیف کی جو بڑے سائز کے تقریباً پانچسو صفحات پر پھیلا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۰۴ھ میں مطبع ثمر ہند لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اور پھر نولکشور پریس وغیرہ مطابع میں بھی چھپتی رہی۔[2]

تحفہ اثنا عشریہ فی الحقیقت ایک عہد آفریں کتاب ہے۔ جس کی تالیف میں شاہ صاحب نے بے حد محنت وجانفشانی سے کام لیا ہے۔ قوتِ بیان اور ندرتِ کلام اور ایجاز واختصار کے ساتھ مطالب ومعانی اور بے شمار ناقابل تردید دلائل ایسے دل نشین اور متین انداز میں تحریر کئے گئے ہیں کہ اس سے قبل ایسی جامع ومانع کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں شیعہ سنی مسائل ومباحث کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کردیا گیا ہے کہ جس کے بعد اس موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور بحث ومناظرہ میں اکثر علماء اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیونکہ شیعہ سنی معاملات کے تمام مباحث

اس کتاب میں نہایت جامعیت

کے ساتھ آگئے ہیں۔ کہ اگر تحفہ کو ان مسائل کی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو وہ بالکل درست ہوگا۔

تحفہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ روایات اور بیان کے انتخاب میں اصولِ حق کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اور شیعہ مذہب وخیالات کے بیان میں صرف مستند ومعتبر شیعہ کتب پہ انحصار کیا گیا ہے۔ اور تواریخ وتفسیر وحدیث میں سے صرف انہی چیزوں کو چنا ہے جن پر شیعہ سنی دونوں متفق ہیں اور طرز بیان بھی نہایت متین اور مہذبانہ ہے۔

---

[1] شاید انہی حالات کی وجہ سے شاہ صاحب نے کتاب پر اپنا تاریخی نام غلام حلیم تحریر فرمایا ہے۔ [2] نواب آرکاٹ نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کراکر عرب میں بھیجا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں شیعہ مذہب کا جو فروغ شروع ہوا تھا اس کو روکنے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کے شکوک و شبہات دور کر کے راہِ راست پر لانے میں تحفہ اثنا عشریہ نے زبردست کارنامہ انجام دیا۔

اس کتاب کی تصنیف و اشاعت نے شیعہ حلقوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور پوری جماعتِ شیعہ کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا جواب لکھ کر اس کتاب کے اثرات کو روکا اور زائل کیا جائے۔ لہٰذا اس میں بہتوں نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور ہندوستان و ایران کے بہت سے شیعوں نے اس کے جواب لکھے۔

لکھنؤ کے شیعہ علماء میں سب سے ممتاز نام مولوی دلدار علی مجتہد اول کا ہے جنہوں نے اس کی تردید میں چھ کتابیں اور رسالے لکھے۔ ان کے علاوہ بعض شیعوں نے تو اپنی پوری عمر ہی اس کے جواب لکھنے میں صرف کر دی۔ لیکن یہ سب جواب برائے جواب و ہرزہ گوئی اور دور از کار باتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پوری جماعت شیعہ کی جہد بلیغ کے بعد بھی آج تک اس کتاب کا جواب نہ ہو سکا۔

اس کتاب کے جواب کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ کتاب ارواحِ ثلاثہ (جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف ہے) میں بروایت کتاب امیر الروایات درج ہوا ہے۔ وہ یہ ہے۔

خاں صاحب نے فرمایا کہ جب شاہ صاحب کا تحفہ لکھنؤ پہنچا تو لکھنؤ کے نواب نے جو اس وقت برسرِ حکومت تھا تمام مجتہدین شیعہ سے درخواست کی کہ اس کا جواب لکھا جائے۔ چنانچہ مجتہدین میں سے دلدار علی خاں نے جواب لکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ لیکن تحفہ کی زبان چونکہ بے نظیر تھی۔ اس لئے مرزا قتیل سے درخواست کی گئی کہ مضامین تو قبلہ و کعبہ لکھیں اور آپ اپنی عبارت میں اس کو ادا کر دیں تاکہ مضامین کا جواب مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت سے ہو جائے۔ لیکن مرزا قتیل نے یہ کہہ کر عذر کر دیا کہ میں شاہ صاحب جیسی عمدہ عبارت لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔ ناچار قبلہ و کعبہ نے خود ہی جواب لکھا تو اس جواب کو نواب صاحب نے مرزا قتیل کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ بتلایئے کیسا جواب ہے؟ مرزا قتیل نے دیکھ کر کہا کہ اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں؟ نواب صاحب نے کہا فرمایئے۔ مرزا قتیل نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ قبلہ و کعبہ کو تو اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہ آیا۔ شاہ صاحب تو تحفہ پیش کر رہے ہیں اور قبلہ و کعبہ تحفہ کا جواب تلوار سے دیتے ہیں۔ (قبلہ و کعبہ نے اپنی کتاب کا نام ذوالفقار رکھا تھا) اس کے بعد قبلہ و کعبہ نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت فرمایئے۔ قتیل نے کہا کہ حضور کہاں جائس کا جولاہا اور کہاں دلی کی سیڑھیوں کا بیٹھنے والا شہزادہ۔ قتیل نے یہ اس لئے کہا کہ قبلہ و کعبہ جائس کے رہنے والے تھے جہاں کے جولاہے مشہور ہیں۔[1]

حضرت شاہ صاحب نے کتاب کے دیباچہ[2] میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کتاب کا نام تحفہ اثنا عشریہ اس مناسبت سے رکھا ہے کہ بارھویں صدی ہجری کے اختتام پر یہ کتاب جلوہ گر ہو رہی ہے۔ اور دیباچہ کے آخر میں فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو بارہ اماموں کی تعداد کے مطابق بارہ ابواب پر مرتب کیا گیا ہے۔

---

[1] نقل از ارواحِ ثلاثہ حکایت ۲۰ بروایت امیر شاہ خان صاحب۔ [2] ناظرین سے درخواست ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے قبل اس کا دیباچہ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

تحفہ اثنا عشریہ کا اُردو ایڈیشن

یہ عظیم الشان اصل کتاب تو فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اردو خوانوں کے لئے اردو ایڈیشن کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے متعدد اردو ترجمے شائع ہوئے۔ غالباً پہلا اردو ترجمہ تو ہدیہ مجیدیہ ہے جو مولانا عبدالمجید خان پیلی بھیتی نے آج سے تقریباً نوّے سال قبل کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ مولانا سعد حسن خان ٹونکی نے بھی کیا تھا جو شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن آج سے نوّے سال قبل کی اردو زبان اور محاورے اب بالکل نامانوس ہو چکے ہیں۔ اور اس زمانہ کے لوگ ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ دوسرے یہ ترجمے عرصہ سے کمیاب و نایاب ہیں۔

اس لئے ایک ایسے جدید اردو ترجمہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ جو سادہ اور آسان زبان میں ہو تاکہ ہمارے زمانہ کے عام لوگ بھی اس عظیم المرتبہ کتاب سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکیں۔

خدا کا شکر ہے کہ احقر کے قدیم کرم فرما مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری نے احقر کی درخواست پر تحفہ اثنا عشریہ فارسی کا نہایت سلیس اور شگفتہ اردو زبان میں مکمل اردو ترجمہ فرما دیا ہے۔ جو احقر پر اور مسلمانوں پر اُن کا ایک احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر آخرت میں عطا فرمائے۔

اور خدا کا بے حد شکر ہے کہ اب یہ نفیس تحفہ کتابت، طباعت، کاغذ اور جلد بندی کے اعلیٰ معیار کے ساتھ دارالاشاعت کراچی سے شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مؤلفِ علام کو اس کے مترجم کو اور اس کے ناشرین اور وہ سب لوگ جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں حصہ لیا ہے ان سب کو اپنے حبیب پاک کے صدقہ میں زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب عطا فرمائے۔ اور اس کو ہمارے لئے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

جمعہ ۱۶ شوال ۱۴۰۲ھ
مطابق ۶ اگست ۱۹۸۲ء

فقط ننگِ اسلاف
احقر محمد رضی عثمانی مدیر دارالاشاعت

فہرست مضامین تحفۂ اثنا عشریہ اردو

باب ۱۰: خلفاء ثلاثہ وکبار صحابہ پر مطاعن اور ان کے جواب

فہرست ختم شد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ مصنّف

از حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصًا علیٰ سید الوریٰ صاحب قاب قوسین او ادنیٰ بدر الدجا شمس الضحیٰ نور الهدیٰ محمد ن المجتبیٰ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ ذوی الدرجات العلیٰ۔

حافظ غلام حلیم (حضرت شاہ عبد العزیزؒ کا تاریخی نام) بن شیخ قطب الدین احمد (الملقب بشاہ ولی اللہ) بن شیخ ابو الفیض وشاہ عبد الرحیمؒ) دہلوی، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی مغفرت فرمائے اور صالح و نیک بندوں میں ان کا حشر فرمائے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

یہ ایک کتاب ہے جو شیعوں کے حالات کی پوری وضاحت کرتی اور یہ بتاتی ہے کہ ان کے اصول کیا ہیں۔ ان کے مذہب کی بنیاد کیا ہے؟ اور دوسروں کو اپنے مذہب کی دعوت دینے کا طریقہ کیا ہے! ان کے اسلاف کون تھے! ان کی روایتوں اور احادیث کے راوی کون اور کس حیثیت کے لوگ تھے!

ان باتوں کے علاوہ اس کتاب میں ان کے ان عقائد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو وہ الوہیت، نبوت، امامت، اور معاد کے متعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ان مسائل کو فقیہہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ جن کی اصل ملت حنفیہ سے مخفی اور پوشیدہ ہے اسی کے ساتھ وہ اقوال و افعال بھی زیر بحث لائے گئے ہیں جو یہ حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) ازواج مطہراتؓ اور اہل بیت نبوی رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں کہتے ہیں۔

میں نے اس کتاب کا نام تحفہ اثنا عشریہ اس مناسبت سے رکھا ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے اختتام پر یہ کتاب منظر وجود پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔

ان گذشتہ صدیوں میں شیعہ حضرات بالخصوص فرقۂ امامیہ اثنا عشریہ، اہل سنت کے مقابلہ میں گفتگو اور مناظرہ بازی کے دوران جو باتیں کہتے رہے ہیں مع اسباب و علل ان کا بیشتر حصہ اس کتاب میں درج کر دیا گیا ہے اور جو حصہ نظر انداز کر دیا گیا ہے اس کا اندازہ درج شدہ حصہ سے واضح ہو جائے گا۔

اس کتاب کو نصیحۃ المومنین وفضیحۃ الشیاطین کا لقب دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گذر رہے ہے اور جس زمانہ میں ہم زندگی گذار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلغلہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ مشکل کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں کوئی نہ کوئی یہ مذہب اختیار نہ کر چکا ہو۔ یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ لیکن ان میں سے اکثریت چونکہ اپنے علم تاریخ اور مسائل مذہب سے کوری ہے۔ اور اپنے اسلاف اور بزرگوں کے حالات سے یکسر بے خبر اور غافل ہے۔ اس لئے جب اہلسنت کی مجلسوں میں گفتگو کی نوبت آتی ہے تو وہ بے ربط، بے محل اور لایعنی ہوتی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کتاب کو مرتب کیا گیا، تاکہ مناظرہ اور مذاکرہ کے وقت یہ لوگ جادۂ انصاف سے نہ ہٹ جائیں اور بے علمی کے سبب اپنے ہی اصولوں سے انحراف نہ کرنے لگیں، اور امور واقعی و حقیقی میں شک و تردّد کو جگہ نہ دیں۔

اس کتاب میں اس امر کی پابندی کی گئی ہے کہ شیعہ مذہب یا ان کے اصول اور ان الزامات کے بیان و حوالہ کے وقت جو ان سے منسوب کیے جائیں ان کی معتبر کتب کے حوالہ کے سوا کسی اور کتاب سے حوالے نہ دیے جائیں اور قرین انصاف یہی ہے کہ شیعہ حضرات کی طرف سے اہل سنت والجماعت پر جو الزامات عائد کیے جائیں وہ بھی اہل سنت کی روایات کے مطابق ہوں ورنہ انصاف نہیں ہو سکے گا اور فریقین میں سے ہر ایک باہم تعصب و عناد سے ایک دوسرے کو متہم کریگا۔ اور باہم بھروسہ و اعتماد کی صورت پیدا نہ ہوگی۔

اس کتاب میں جو تاریخی واقعات یا گذشتہ قصص و حکایات بیان کی گئی ہیں وہ بھی صرف وہی ہیں جن پر ہر دو فریق متفق ہیں۔ اور تفسیر قرآن مجید اگرچہ ہر دو فریق کی تقریباً یکساں ہیں تاہم حوالے صرف شیعی تفاسیر ہی سے دیے گئے ہیں تاکہ کسی کو اتہام لگانے کا گمان تک نہ ہو۔ وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

اس کتاب کے ناظرین اور سامعین سے التماس ہے کہ وہ مطالعہ کے وقت درج ذیل چند امور کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

اوّل: اہل بیت عظام، یا اصحاب و ازواج مطہرات خیر الانامؐ، کی شان میں جو کچھ طعن و تشنیع یا انبیاء و ملائکہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نقائص سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز اس کتاب میں صراحۃً یا ضمناً درج ہوئی ہو اس سے مصنف کو بری الذمہ سمجھیں، کیونکہ وہ ہزار، لاکھ بار ایسے نازیبا و ناشائستہ الفاظ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے! اور ایسی بے ادبی اور ہرزہ سرائی سے ہزار بار اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے لیکن چونکہ سابقہ ایسے فرقہ سے ہے کہ یہ باتیں اس کے اصول مذہب میں شامل ہیں اس لیے نقلِ کفر کفر نباشد کے مصداق، انہیں کی کہی ہوئی باتیں مجبوراً نقل کی گئی ہیں۔

دوم: جہاں کہیں کلام کو مطلق چھوڑ کر، مذہب شیعہ کا بیان شروع کر دیا ہے یا جہاں اہلسنت کے مذاق کے مطابق کلام کو مقید لا کر ان کی پیروی کی ہے تو ایسے موقعوں پر یہ خیال نہ کیا جائے کہ کلام مطلق ہمارے مذہب پر مبنی ہے۔ حاشا و کلا۔

سوم: ہماری یہ کتاب اسی شخص کے لیے مفید ہو سکتی ہے جو اہل سنت والجماعت اور شیعہ مذہب ہر دو کے اصولی و فروعی احکامات پر پوری پوری مہارت و دسترس رکھتا ہو اور جو ایک مذہب کو جانتا ہو اور دوسرے کی واجبی سی شد بد رکھتا ہو وہ اس کتاب سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

ہاں جو شخص مذہب شیعہ پر تو عبور رکھتا ہو مگر مذہب اہل سنت سے چنداں واقف نہ ہو اس کے لیے بھی یہ کتاب نافع اور مفید ثابت ہوگی، البتہ جو شخص مذہب شیعہ سے تو کما حقہٗ، واقف نہ ہو اور مذہب اہل سنت پر عبور رکھتا ہو تو اسے بھی چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کتاب میں گفتگو اور کلام کی بنیاد شیعی اصول اور روایات پر رکھی گئی ہے۔

چہارم: اس کتاب میں شیعوں کی معتبر کتابوں سے جتنے حوالے بھی دیے گئے ہیں ان میں افتراء، کذب اور بہتان کا شائبہ بھی نہیں۔ اس لیے کہ سارے کے سارے حوالے شیعی مذہب کی معتبر اور مشہور کتابوں کے ہیں۔ شک و شبہ

میں پڑ کر نادانی کے ارتکاب کے بجائے ہمارے حوالہ کا ان کی اصل کتابوں سے موازنہ کرلے۔ اور اس بات کا خوف نہ کرے کہ نقل وحوالہ کی صحت اگر ثابت ہوگئی تو اسے اس کی پیروی لازمی ہوگی۔

پنجم :- اپنے دل میں کسی تاویل کے احتمال کو جگہ نہ دے اور یہ نہ سوچے کہ گو یہ سب کچھ شیعوں کی معتبر کتابوں میں ہے لیکن ممکن ہے ان کی کوئی ایسی تاویل کی جاسکتی ہو جس تک ہمارے ذہن کی رسائی نہ ہو پائی ہو۔ کیونکہ مناظرہ کے وقت ایسی خیال آرائی اور گومگو کی کیفیت عاجزی اور بیچارگی کی علامت ہے اور جہالت و نادانی پر دال ہے اور مزید گفتگو سے نااہلی کی شہادت!

اس کتاب کو "بارہ اماموں" کی تعداد کے مطابق بارہ بابوں پر مرتب کیا گیا ہے۔

پہلا باب۔ اس بیان پر مشتمل ہے کہ شیعہ مذہب کس طرح وجود میں آیا۔ اور کب اور کس طرح مختلف فرقوں میں بٹا۔

دوسرا باب۔ شیعوں کے مغالطوں، دھوکے بازی اور فریب کاری کے بیان میں کہ وہ دوسروں کو کس طرح فریب دیتے اور گمراہ کرتے ہیں۔

تیسرا باب۔ شیعوں کے اسلاف علماء اور کتابوں کے بیان میں۔

چوتھا باب۔ ان کے اخبار و روایات اور راویوں کے ذکر میں۔

پانچواں باب۔ الٰہیات میں۔

چھٹا باب۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے بیان میں۔

ساتواں باب۔ امامت کے بیان میں۔

آٹھواں باب۔ معاد کے بیان میں۔

نواں باب۔ مسائل فقہیہ کے بیان میں۔

دسواں باب۔ اس طعن و تشنیع کے بیان میں جو شیعہ، خلفاء راشدینؓ، ام المؤمنینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کی شان میں کرتے ہیں۔

گیارہواں باب۔ مذہب شیعہ کے خواص کے ذکر میں۔ اور یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اول شیعی اوہام میں؛ فصل دوم، شیعوں کے تعصبات اور فصل سوم، شیعوں کی بے اصل و بے بنیاد باتیں۔

بارہواں باب۔ تولا (محبت) اور تبرا کے بیان میں۔ یہ باب دس مقدمات پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ عز شانہٗ و جل سلطانہ کے فضل سے امید ہے کہ وہ ان بزرگوں کی ذوات عالیہ کی برکت سے اس رسالہ کو قبولیت سے سرفراز فرماتے گا۔

واللہ الھادی الی سبیل الرشاد والملھم للحق والسداد۔

باب ا: شیعہ مذہب کی ابتدا۔ اور ان کا فرقوں میں بٹنا

واضح ہے کہ شیعہ مذہب ابتدائے وجود ہی سے رنگ برنگ شکلوں اور طرح طرح کے بھیسوں میں رونما ہوتا رہا ہے (اور اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ شیعہ مذہب روحانی مذہب نہیں بلکہ ایک سیاسی مذہب ہے تو اس بوتلمونی اور طرح طرح کے بہروپ کا جواز سمجھ میں آجاتا ہے۔)

غرض یہ ہر وقت انوکھے رنگ اور نئے طرز سے دنیا کے سامنے آتا رہا۔ تا آنکہ عراق و خراسان میں صفوی سلاطین نے اس مذہب کے اصول و قواعد کو ضبط میں لانے کی صورت نکالی اور اس کے تحفظ و ترویج میں اپنے شاہی اثرات استعمال کیے۔ اور علماء وقت نے بہت جد و جہد کے ساتھ اس کے اصول و فروع کی کاٹ چھانٹ کر کے ایک صورت دی۔ اور اس کو کتابوں میں مدون کیا۔ تب کہیں جا کر اس کی رنگا رنگی اور تغیر و تبدل بند ہوا۔ اور ایک حالت پر قرار نصیب ہوا۔

مگر چونکہ تغیر و تبدل اس مذہب کی خصوصیت بن چکا ہے۔ اس لئے بانیان مذہب شیعہ وقت و زمانہ کے مطابق اپنا خاص مذہب تراشتے رہے۔ اور کسی ایک خاص طریقہ پر قرار نہیں لیا یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کے اصول و ارکان میں بڑا اختلال و اختلاف پیدا ہوا۔

بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ گو وہ فروع میں ایک دوسرے سے مختلف رہے مگر انہوں نے اصول کبھی نہ بدلے اور ارکان مذہب میں تبدیلی کو کبھی روا نہ رکھا۔

اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے دور میں یہود و نصاریٰ، مجوس و مشرکین کے دیار و امصار اللہ تعالیٰ کی عنایت سے صحابہ کرام و تابعین عظام رضی اللہ عنہم کے ہاتھ پر فتح ہوئے اور کفار کو قتل و قید اور ذلت و ادبار سے سابقہ پیش آیا۔ غلامی کی ذلت برداشت کرنی پڑی اور جزیہ ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ تو اس حالت سے نکلنے کے لیے اول دو خلفائے کرامؓ کے زمانہ میں انہوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ میدان حرب و ضرب گرم کیئے۔ مگر چونکہ نصرت الہی اسلام کی پشت پناہ تھی اس لئے بجز ذلت و خواری کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تو انہوں نے کھلے کفر کو منافقت کا حلہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور خلیفہ سوم رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان میں سے بہت سے لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمانوں میں شامل ہو گئے، اور در پردہ نور اسلام کو بجھانے اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد اور بغض و عناد کو ہوا دینے کی تدبیروں میں لگ گئے، ناگاہ جب تقدیر الہی سے دور خلافت ختم ہونے لگا تو مصریوں کی ایک جماعت نے خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور ان کی اطاعت سے منکر ہو گئے۔ بغاوت کی آگ بھڑکانے میں یہ گروہ سب سے زیادہ پیش پیش تھا۔ اس گروہ کے دیگر افراد جو اطراف و اکناف خصوصاً کوفہ اور نواحی عراق میں پھیلے ہوئے تھے موقعہ غنیمت جان کر مدینہ میں سمٹ آئے اور وہ سارے فتنہ انگیز پروگرام جو سالوں سے ترتیب دیئے جا رہے تھے اور جن کو دبدبہ اسلام کے سبب زبان پر لانے کی جرأت نہ کر پا رہے تھے۔ علی الاعلان ان پر عمل شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور خاتم الخلفاء حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت قائم ہوئی۔ تو منافقوں کے اس گروہ نے اپنے آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص محبین کے رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنے آپ کو شیعان علیؓ کہنے لگے۔ وہ اس

انقلاب پر بے حد خوش تھے! اب انہوں نے اپنے لئے حالات سازگار دیکھ کر اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔

اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ بن سبا یمنی، صنعانی تھا جو اصلاً یہودی تھا! جو یہودی ہونے کے زمانہ میں اسلام و مسلمانوں کا کھلا دشمن تھا۔ دھوکے اور فریب کاری کا ماہر، حرب و ضرب کی چالوں سے خوب واقف، فتنہ انگیزی میں یکتا، سیاسی چالوں سے آشنا، اس نے جب دیکھا کہ جو شورش خلیفہ ثالث رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت برپا ہو گئی تھی۔ اب ماند پڑتی جا رہی ہے اور جو فتنہ ان لوگوں نے کھڑا کر دیا تھا وہ اپنی موت آپ مرتا جا رہا ہے اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار کا جو منصوبہ ان کے پیش نظر تھا وہ ناکام ہوا چاہتا ہے۔ تو یہودی سیاست کو بروئے کار لا کر اس نے طریقۂ واردات بدل دیا۔ اور اجتماعی ہنگامہ آرائی سے ہٹ کر افراد پر توجہ دینی شروع کی۔ اور ہر فتنہ پرداز کو نئے طریق سے فریب دینا شروع کیا اور ہر ایک کی استعداد کے مطابق اس کے دل میں گمراہی کی کاشت کرنے لگا۔

سب سے پہلے خاندان نبوی ؐ کے ساتھ خلوص و محبت کا حربہ اختیار کیا اور لوگوں کو اہل بیت کی محبت پر مضبوط و پختہ رہنے کی تلقین کرنے لگا۔ خلیفہ برحق کی جانبداری، دوسروں کے مقابلہ میں ان کو ترجیح، اور ان کے مخالفین کی باتوں پر کان نہ دھرنے کی پالیسی اختیار کرنے کو کہنے لگا، اور یہ باتیں ایسی تھیں کہ ہر خاص و عام کا مطمح نظر تھیں، اور کہیں سے بھی ان کی مخالفت متوقع نہیں تھی۔ اس لئے ان کی کافی پذیرائی ہوئی، اور لوگوں میں اس کا اعتماد بہت بڑھا۔ اور اس کو مسلمانوں کا خیر خواہ سمجھا جانے لگا۔ اس کے بعد اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے افضل ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے اقرب انسان ہیں۔ کیونکہ آپ رسول اللہ کے وصی، بھائی اور داماد ہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق قرآن مجید میں جو آیات فضائل ہیں یا احادیث مروی ہیں وہ سب اور اسی کے ساتھ اپنی طرف سے احادیث گھڑ گھڑ کر لوگوں میں پھیلانی شروع کیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے شاگرد اور ماننے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر ایمان لے آئے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات جڑ پکڑ گئی کہ تو اپنے بہت ہی خاص لوگوں اور اپنے بھائیوں کو نہایت رازداری کے ساتھ بتایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیغمبر علیہ السلام کے وصی تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے الفاظ میں ان کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا اور یہ کہ آپ کی خلافت قرآن مجید کی اس آیت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ سے ظاہر ہوتی ہے۔

لیکن صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے مکر سے اور اقتدار کی خاطر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وصیت کو ضائع کر دیا اور خدا اور رسول کی اطاعت نہیں کی۔ اور حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے حق کو تلف کر دیا۔ دنیا کے لالچ میں آ کر دین بھی چھوڑ بیٹھے۔ اور باغ فدک کے سلسلہ میں سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا اور خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے مابین شکر رنجی ہو گئی۔ جو صلح و صفائی کے بعد ختم بھی ہو گئی تھی۔ اپنے قول کے ثبوت میں سند و دلیل کے طور پر بیان کیا۔ اور ان حواریوں کو یہ راز چھپانے کی از حد تاکید کی۔ اور یہ کہا، کہ اگر لوگوں سے اس مسئلہ پر تمہاری بحث ہو جائے تو بطور حوالہ میرا نام ہرگز نہ لینا۔ بلکہ مجھ سے نفرت و بیزاری ظاہر کرنا۔ کیونکہ میں نام و نمود اور شہرت کا خواہاں نہیں۔ نہ جاہ و مرتبہ کی خواہش رکھتا ہوں۔ اس نصیحت سے میرا مقصد صرف ایک حق بات کہنا اور ایک واقعہ کو ظاہر کر دینا ہے۔

اس کی اس وسوسہ اندازی کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود جناب علی کرم اللہ وجہہٗ کی فوج میں ان باتوں کا تذکرہ اور خلفاء

پر طعن و تشنام کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مناظرہ بازی اور جھگڑوں کا آغاز ہوگیا۔ حتیٰ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے برسر منبر خطبوں میں اس جماعت سے اپنی نفرت و بیزاری کا اظہار فرمایا۔ بعض سرگرم لوگوں کو دھمکایا اور شرعی سزا کا خوف دلایا۔

ابن سبا نے دیکھا کہ تیر نشانہ پر بیٹھا اور شہد کی انگلی کام کر گئی۔ اور مسلمانوں کے عقیدہ میں فتنہ و فساد کا بیج بار آور ہوگیا۔ مناظرہ بازی میں ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا کوئی پاس نہیں رہا۔ تو اگلے قدم کے طور پر اپنے مخصوص ترین شاگردوں کی ایک اور جماعت منتخب کی اور رازداری کا حلف لینے کے بعد، پہلے بھید سے بھی زیادہ باریک اور نازک "راز" کا انکشاف کیا۔ کہ جناب علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) سے چند ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جو انسانی طاقت سے بالاتر ہیں۔ مثلاً کرامتیں۔ ذاتوں کا بدل دینا۔ غیب کی خبریں سنانا۔ مُردوں کو زندہ کر دینا۔ اللہ کی ذات اور دنیا کے حقائق بیان کرنا۔ باریک اور گہری جانچ۔ حاضر جوابی۔ الفاظ و عبارت میں فصاحت و بلاغت۔ زہد و پرہیزگاری۔ بلند درجہ بہادری اور وہ قوت و طاقت کہ دنیا والوں نے نہ دیکھی نہ سنی۔

تم جانتے ہو یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہے؟ اور اس کا راز کیا ہے؟ سب نے عاجزی کا اظہار کر کے کہا نہیں (استاد) ہم نہیں جانتے آپ فرمائیے۔ جب ان کے جذبہ شوق کو خوب بھڑکا چکا تو رازوں کو چھپانے کی تاکید مزید کر کے کہنے لگا کہ یہ سب کچھ خواص الوہیت ہیں، جو لباس بشریت میں جلوہ گر ہیں۔ غیر فانی لباس فنا میں خود کو نمودار کر رہا ہے۔ فاعلموا ان علیاھو الا لٰہ ولا الٰہ الاھو یعنی جان لو کہ علی ہی معبود ہیں ان کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔

اور اپنے قول کی شہادت و تائید میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کے وہ کلمات پیش کئے جو بحالت وجد و کیفیت جو کبھی اولیاء اللہ پر غالب و طاری ہو جاتی ہے۔ آپ کے منہ سے نکلے تھے۔ مثلاً انا حی لاموت میں زندہ ہوں نہیں مروں گا۔ انا ابعث من فی القبور قبروں سے مُردوں کو میں اٹھاؤں گا۔ انا مقیم القیامۃ میں ہی قیامت برپا کروں گا۔"

چنانچہ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی، کے مصداق یہ نازیبا کلام بھی راز نہ رہا۔ اور لوگوں میں پھیلتا چلا گیا اور جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے سمع مبارک تک بھی پہنچا۔

آپ نے استاد شاگرد سب کو پکڑا۔ اور فرمایا تم نے ان خرافات سے توبہ نہ کی تو سب کو آگ میں جلا کر مار ڈالوں گا۔ چنانچہ سب نے توبہ کی۔ اس کے بعد ابن سبا کو مدائن میں جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر وہ وہاں بھی اپنی حرکتوں اور غلط و گمراہ عقائد کی تعلیم و اشاعت سے باز نہیں آیا۔ اپنے خاص گرگوں کو آذربائیجان اور عراق کے علاقہ میں پھیلا دیا۔ اور ادھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ، شام کی مہم اور کار خلافت کے سبب اتنے مصروف و مشغول رہے کہ ابن سبا اور اس کے چیلوں کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ یہاں تک کہ اس ملعون کے پھیلائے ہوئے غلط عقائد نے لوگوں کے دلوں میں جڑ پکڑ لی، اور وہ خوب مشہور ہوئے۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فوجی اس وسوسہ کو قبول کرنے اور نہ کرنے کی بناء پر چار فرقوں میں بٹ گئے۔

(۱) پہلا فرقہ ان مخلصین اور جاں نثار ساتھیوں کا ہے جو اہل سنت والجماعت کے مقتدا و پیشوا ہیں یہ حضرات، اصحاب کبار، ازواج مطہرات ؓ کی حق شناسی اور ظاہر و باطن کی پاسداری نیز جنگ و جدل کے باوجود سینہ کو بے کینہ اور پاک و صاف رکھنے میں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے قدم بقدم رہے۔ ان کو ہی شیعان اولیٰ، اور شیعان مخلصین کہتے

ہیں اور بمصداق آیت کریمہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ (البتہ میرے خاص بندوں پر تیرا غلبہ نہ ہو سکے گا) یہ حضرات ہر حیثیت سے اس دھوکہ باز شیطان کے شر سے محفوظ و مامون رہے۔ اور ان کے دامن پر اس شیطان کے گندے عقائد کا کوئی دھبہ نہ لگ سکا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے خود اپنے خطبوں میں ان لوگوں کی مدح فرمائی اور ان کے رویہ کو سراہا۔

(۲) دوسرا فرقہ تفضیلی شیعوں کا تھا۔ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو تمام صحابہؓ سے افضل کہتے تھے ایا ابن سبا کے ادنیٰ شاگردوں میں سے تھے کہ انہوں نے اس وسوسہ کے ایک مختصر سے حصے کو تسلیم کیا۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی ڈانٹ ڈپٹا، اور فرمایا کہ اگر کسی کے بارے میں، میں نے یہ سنا کہ وہ مجھے جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہے تو میں اُسے افتراء کی شرعی حد اسی کوڑے ماروں گا۔

(۳) تیسرا فرقہ تبرائی شیعوں کا تھا ان کو شیعہ سبیہ بھی کہتے ہیں، یہ لوگ عقیدۃً صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) کو ظالم، غاصب، بلکہ کافر و منافق مانتے اور کہتے تھے۔ گویا یہ اس شیطان مجسم کے درمیانی درجہ کے شاگرد تھے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، اور حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تنازعہ ان لوگوں کے مذہب کے لئے مؤید اور ان کے خیال کے لئے محرک بن گیا۔ اور چونکہ ان جھگڑوں کی بنا خلیفہ سوم رضی اللہ عنہ کی شہادت تھی۔ اس لئے لامحالہ ان لوگوں نے ان کی شان میں بھی زبان طعن دراز کی، اور جب کہ خلیفہ سوم کی خلافت کی بناء شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت پر تھی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اسکے بخیال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بحیثیت ثالث بانی مبانی تھے اس لئے ان بدبختوں کے تیر ملامت کا یہ حضرات بھی نشانہ بنے۔ اور مخلصین کے ذریعہ جب بھی اس دشنام و تبری کی اطلاع حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے سمع مبارک تک پہنچی۔ آپ خطبہ عام کے وقت ان لوگوں کو برا بھلا کہتے اور ان لوگوں سے اپنی کھلی بیزاری کا اظہار فرماتے۔

(۴) چوتھا فرقہ غالی شیعوں کا تھا۔ اور یہ ابن سبا کے خاص الخاص شاگردوں اور راز دار دوستوں کا گروہ تھا۔ اور یہی گروہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا قائل تھا۔

پھر جب مخلصین نے سختی کے ساتھ ان پر سخت الزامات عائد کئے اور کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تو الوہیت کے آثار کے خلاف بشریت کے تقاضے موجود ہیں تو بعض لوگوں نے صریح الوہیت کے عقیدہ کو ترک کر دیا مگر یہ پھر بھی کہتے رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جسم فانی میں روح الٰہی حلول و سرایت کئے ہوئے ہے۔

اور جس طرح قرآنی آیت وَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا۔ (کہ ہم نے ان میں اپنی روح پھونکی) سے دھوکہ کھا کر نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنے مذہب کی صحت ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض کلمات کی لچر اور دور از کار تاویلات سے اپنے لچر و بیہودہ عقیدہ کی صحت کی کوشش کرتے رہے۔

تو یہ ہے شیعہ مذہب کے وجود میں آنے کی حقیقت اور اصل بنیاد، اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دراصل اہل تشیع کے بنیادی طور پر تین فرقے بیک وقت وجود میں آئے اور ان تینوں کا موجد اور بانی یہی بد باطن، نفاق پیشہ یہودی تھا۔ جسے دنیا عبداللہ بن سبا کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ یہ ہر شخص کو اسی کے مذاق و صلاحیت کے مطابق اپنے جال میں پھانستا اور سبز باغ دکھا کر اپنے قابو میں رکھتا تھا۔

فرقہ کی کثرت کی وجہ | فرقہ وارانہ تفریق و اختلاف کے بعد ایسے امور بکثرت رونما ہوئے غالی فرقہ کی کمی اور تبرائی

جو تبرائی عقیدہ کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ مثلاً:۔

اوّل اتفاقاً اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ و حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم سے جنگ جمل چھڑ گئی اور یہ چونکہ سب خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے قریبی متعلقین تھے اور خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قصاص کے دعویدار! اس لئے لامحالہ تبرائی فرقہ کے لوگوں کے دِلوں میں دونوں خلفاء کی طرف سے بغض و عناد نے جگہ بنالی۔ اور ان کے نزدیک شیعیت مرتضیٰ گویا صرف اسی بغض کا نام قرار پایا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال جو شیخین رضی اللہ عنہما کی مدح و تعریف میں صادر ہوئے تھے اور وہ دھمکیاں اور سختیاں جو آنجنابؓ ان بدزبان لوگوں کے خلاف عمل میں لاتے تھے۔ ان سب کو تقاضائے مصلحت اور اصول دلداری و ظاہرداری پر محمول کرتے، جو اکثر دنیا طلب سردار برتا کرتے ہیں۔

خلیفہ اوّل کے ساتھ برائیوں کا بغض و عناد ہی خلیفہ دوم کے ساتھ بغض کا سبب بنا اس لئے کہ خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کی خلافت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی خلافت کے تابع تھی اور ہر دو اصحاب کا رویہ اور طریقہ زندگی ایک ہی تھا۔ یہاں تک کہ گویا ہر دو حضرات نے سیرت اور طریقہ زندگی میں ایک دوسرے کی اتباع و اقتداء کو لازمی جان رکھا تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ مبارک میں حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حیثیت وزیر و مشیر کی سی تھی۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزھراء رضی اللہ عنہا کو فدک سے باز رکھنے نیز دیگر تنازعات میں آپ خلیفہ اوّل کے ہمخیال اور شریکِ کار تھے۔

یہ واقعات و اسباب تبرائیوں کے ذہن و خیال پر اس بری طرح حاوی ہوئے کہ وہ تعلقات و نسبت خاص جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے تھی مثلاً داماد ہونا۔ رشتہ دار ہونا دین و خلافت کے اہم معاملات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے طلب رائے اور شریک مشورہ بنانا، ان سب کو تقیہ پر اور جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی کمزوری اور بیچارگی پر محمول کرتے رہے۔

اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ اکثر برگزیدہ انصار و مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی طعن کا نشانہ بنایا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی طرح ان خلفاء رسول کی بھی اتباع کرتے، ان کی مدد اور پشت پناہی کرتے ان کے احکامات کی بجاآوری کو اپنے اوپر لازم اور فرض گردانتے تھے۔

دوم یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کی اولاد مثلاً زید شہید رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ یا دیگر سادات حسینیہ ہمیشہ شام کے مروانی نواصب (خارجیوں) اور عراق کے عباسی نواصب کے ساتھ برسرِ نزاع اور برسرِ پیکار رہے اور باہم کینہ پروری فروغ پاتی رہی۔ اس لئے ادھر تو بعض نواصب گمراہی کے انتہائی درجے تک پہنچکر روسیاہی کی زندگی گذارتے اور حضرات مذکورہ کی شان گرامی میں بڑی بے ادبی کا مظاہرہ کرتے۔ شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو نیکی سے یاد کرتے۔ بلکہ مروانیوں نے تو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف داری میں شرارت و گمراہی کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ تو دوسری طرف تبرائی فرقہ بھی ان نواصب کے مقابلہ میں " بغض معاویہ "، کے مظاہرہ میں پیچھے نہ رہا اور مسلمانوں کے اسلاف ہر سہ خلفاء رضی اللہ عنہم کے متعلق ہرزہ سرائی وطیرہ بنا لیا۔

چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی طرف سے جی بھر کے دادِ بے حیائی دی۔

سوم یہ کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دیگر تمام آئمہ اطہار رحمۃ اللہ علیہم ان بدبخت خارجیوں کی ظاہری

شرارت، بدذاتی اور خباثت و بدطینی کے پیشِ نظر گاہے گاہے کچھ کلمات لعن آمیز عام اوصاف کی آڑ میں ارشاد فرماتے رہے۔ مثلاً نواصب کا ظلم و غضب، اہل بیت کے ساتھ تعصب و بغض، سنت رسول کو بدل ڈالنا، بدعات اختراع کرنا اور خلاف شرع احکام گھڑ لینا۔ وغیرہ

گو جناب مرتضیٰ اور ائمہ کا روئے سخن نواصب کی طرف تھا، مگر حقیقت شناس حضرات سمجھتے تھے کہ بدخیال اور جلد باز گروہ نے ان کلمات کو صحابہ کرام اور ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں استعمال کیا کیونکہ وہ اپنے لغو عقیدہ کی بناء پر ان ہی حضرات کو ان کلمات کا محل سمجھتے تھے۔ جب ان لوگوں سے کہا گیا کہ اگر جناب مرتضیٰ اور ائمہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا روئے سخن ان بزرگ اسلاف کی طرف تھا تو ان حضرات نے ان کے نام کیوں نہ لئے، تو اس کا ان کے پاس ایک ہی گھڑا گھڑایا جواب ہوتا تھا کہ مصلحت وقت اور تقیہ اس کا سبب تھا۔

زمانہ امیرؓ کے تبرائی ایک سوچی سمجھی اسکیم کی وجہ سے جانتے بوجھتے صحابہ کرام ازواج مطہرات اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم پر لعن طعن کرتے تھے۔ تو بعد میں آنے والوں کے لئے ان کا یہ طرز عمل نص صریح بن گیا۔ اور اب لعن طعن شیعی سیاست کی بجائے مذہب ہو گیا۔

حاصل کلام یہ کہ ان اور ان جیسے اسباب کی وجہ سے تبرائی فرقہ دوسرے تمام فرقوں سے قوت اور تعداد میں بڑھ گیا۔ کیونکہ پے بہ پے ایسے واقعات رونما ہوتے چلے گئے جو ان کے عقیدہ کے ممد ثابت ہوئے۔

تبرائیوں کے مقابلہ میں غالی فرقہ کا حال روز بروز پتلا، قوت کم اور ذلت و ادبار فزوں تر ہوتا رہا۔ اور یہ حال ہو گیا کہ عقیدہ کے کھلے بطلان اور ان وحشت انگیز کلمات کی کھلی برائی کے سبب ان کی بکواس پر اب کوئی کان دھرنے کو بھی تیار نہ تھا۔

اور اگر کوئی بطور "فیشن" یہ عقیدہ اپنا بھی لیتا تو کبھی اپنی ہی عقل کی رہنمائی یا کنبہ برادری کے افراد کی نصیحت جلد اس عقیدہ سے ہٹا دیتی۔

اب رہے تفضیلی، تو وہ لَا فِی الْعِیْرِ وَلَا فِی النَّفِیْرِ۔ کی تصویر بن کر رہ گئے تھے، کہ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ تبرائی ان کو منہ لگاتے نہ اپنے میں شامل کرتے، اور کہتے کہ یہ اہل بیت کی محبت کا حق ادا نہیں کرتے جو تبرائیوں کے عقیدہ کے مطابق بعض صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کو گالی بک کر اور لعن طعن کر کے ادا ہوتا ہے۔

دوسری طرف مخلصین ان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے رویہ کے خلاف چلتا دیکھ کر اور آپؓ کی دھمکیوں کا مورد بنا کر حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ہنوز تبرائی ان اہل سنت اور خارجیوں میں فرق و تمیز نہیں کرتے۔ حالانکہ اہل سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلصین خاص ہیں خاندان نبوت پر دل و جان سے فدا ہیں۔ شام و عراق اور مغرب کے ناصبیوں سے نہ صرف علمی اور زبانی لڑائی لڑنے میں مشغول ہیں، بلکہ تلواروں کی لڑائی میں بھی دو بدو ہو چکے ہیں۔

اور احکام شریعت کی مدد اور مردانی بدعات کا قلع قمع بھی کر چکے ہیں۔ نواصب کو نہایت بدزبان سمجھتے ہیں۔

اور تعجب بالائے تعجب اس بات پر ہے کہ تبرائیوں کے علماء جو اپنے متعلق یہ غلط فہمی رکھتے ہیں کہ وہ اسلاف کے اخبار اور اہلِ علم کے اقوال سے باخبر ہیں وہ بھی نواصب کا لفظ شیعانِ اولیٰ پر بولتے ہیں۔

کسی دانا نے کیا خوب کہا ہے، کہ ؎

"ہر بیماری کی ایک دوا ہے جس سے وہ جاتی رہتی ہے ٭ مگر حماقت کہ وہ اپنے معالج کو عاجز کرتی ہے"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شیعی لغت میں نواصب کا لفظ ہر اس شخص کے لیے ہے جو ان کے عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو۔ اس اصول کی بنا پر غالی شیعہ، تبرائی شیعہ کو اور تبرائی، تفضیلی شیعہ کو اور تفضیلی شیعانِ اولی (مخلصین)، کو نواصب جانتے اور گردانتے ہیں۔

ان شیعانِ اولی، کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے کہ شیعوں کے تمام گمراہ فرقوں اور خارجیوں دونوں کی لعنت و ملامت کا نشانہ بنے اور سب کے ساتھ مخالفت اختیار کی۔ گویا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وراثت میں مسکنت اور غربت عقلی ان ہی کے نصیب میں آئی۔ اور جنگ و جدال اور مجاہدات شاقہ کے لیے ان کے صحیح وارث یہی قرار پائے۔ درحقیقت یہ حدیث ان ہی کے حال پر ٹھیک منطبق ہوئی اور ان کے انجام کا پتہ دیتی ہے۔

إِنَّ الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ والحمد للہ

انشاء اللہ تعالیٰ اس کتاب میں آگے چل کر یہ بات کھلے گی کہ شیعانِ اولی میں مہاجرین و انصار کی اس جماعت کا شمار ہے جن میں سے اکثر سعادت مآب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ہمرکابی میں باغیوں، اور قرآن میں تاویل کرنے والوں کے مقابلہ میں جنگ لڑ چکے تھے! ایسے ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی رفاقت میں منکرینِ قرآن سے لڑائیوں میں شریک رہے تھے۔ اور ان میں سے بعض ایسے تھے جو انتہائی پرہیزگاری اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے اور اہل کلمہ اور اہل قبلہ کے قتل سے گریز کرتے ہوئے چند عذر پیش کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے اور جن کے سب عذر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قبول فرمائے تھے اور باوجود اس گوشہ نشینی کے انہوں نے آپؓ کے مناقب و فضائل کو پھیلانے اور آپؓ کی محبت پر لوگوں کو ابھارنے اور آپؓ کی عزت و تعظیم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، چنانچہ انہوں نے اپنے عمل سے اس آیت کی ترجمانی فرمائی:۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۔ (ترجمہ) "نہیں ہے ان ضعیفوں، مریضوں اور ان لوگوں پر جو خرچ کے لیے کوئی مال نہیں رکھتے کوئی حرج، جب کہ وہ اللہ و رسول کے خیر خواہ ہوں اور نیکوں پر کوئی الزام نہیں"

اور آگے چل کر قارئین کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ بیعت رضوان کے حاضرین میں سے تقریباً آٹھ سو حضرات نے جنگ صفین میں وادِ جاں نثاری دی اور تین سو نے جامِ شہادت نوش کیا، ان کے علاوہ دوسرے صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم نے جو خدمات دین و خلافت کی انجام دیں نہ کسی زبان کو اس کے بیان کا یارا ہے نہ کسی قلم کو یہ تاب کہ ان کو رقم کر سکے۔

لیکن چونکہ دورِ خلافت ختم ہو چکا تھا اور خاتم الخلفاء حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا جامِ حیات لبریز ہو چکا تھا اس لیے دنیاوی طور پر یہ قربانیاں بار آور نہ ہو سکیں بجز اس کے کہ وہ حضرات ثواب آخرت اور جنت میں درجات بلند کے حقدار ٹھیرے جو منجملہ دو بھلائیوں کے ایک بھلائی ہے۔

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں شیعیت کے جنم لینے اور چار فرقوں میں بٹ جانے کے بعد شیعی مذہب میں اور بھی نئی نئی باتیں رونما ہوتی رہیں اس تغیر و تبدل اور فرقہ بازی کا راز یہ ہے کہ ہر انقلابی موڑ پر

اس مذہب نے نیا چولا بدلا۔ اور نئے روپ اور نئے مذہب کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا اور اس قسم کے اکثر انقلابات آئمہ کرام کی شہادت کے موقعہ پر رونما ہوتے رہے۔

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو: جب عراق کے بدبختوں نے یزید کی سیاست میں آکر بدبخت زیاد کے بھڑکانے اور اکسانے پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تو کیسان نامی نے جو سبط اکبر حسن مجتبٰی رضی اللہ عنہ کے متبعین میں سے تھا اور آنجناب کی وفات کے بعد آپ کے بھائی محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کی جو محمد بن الحنیفہ کے نام سے مشہور ہیں۔ صحبت اٹھا چکا تھا۔ بلکہ ان سے عجیب عجیب علوم کا استفادہ بھی کر چکا تھا۔ امام شہید رضی اللہ عنہ کے انتقام کا مدعی بن کر اٹھا اور لوگوں کو بھی اس مہم میں شرکت کے لئے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ حضرات شیعان اولیٰ میں سے مثلاً سلیمان بن صرد خزاعی اور رفاعہ وغیرہ اور کچھ لوگ تبرائی شیعوں میں سے اس کے ساتھ ہو گئے۔ اور ایک جتھہ بنا کر ابن زیاد اور اس کے عاملوں سے الجھ پڑے۔ مگر نتیجہ کشت و خون کا ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس ناکامی کے بعد تبرائی فرقہ کے ایک شخص مختار ثقفی کو اپنا لیڈر اور سردار بنایا۔ مختار حکومت و سیاست، فن جنگ و جدال اور حرب و قتال میں ماہر تھا۔ اور سیاست زمانہ پر گہری نظر رکھتا اور مکر و فریب میں ابن سبا ہی کی طرح دسترس رکھتا تھا۔ مختار کی سرداری کے ساتھ ساتھ ابراہیم بن مالک اشتر کو امیر الامراء مقرر کیا۔

ابن زیاد کے ساتھ مختار کے کئی معرکے ہوئے، اور بالآخر ابن زیاد مختار کے ہاتھوں مارا گیا۔ مختار نے اس کے بعد کیسان کا مذہب قبول کر لیا۔ کیسان ابتداء میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت کا قائل نہیں تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد، براہ راست جناب محمد بن الحنیفہ امامت کے مستحق اور حقدار تھے۔ اس کے نزدیک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ تو اہلیت امامت اس وجہ سے کھو چکے تھے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام سے صلح کر لی تھی اور امام حسین رضی اللہ عنہ نے چونکہ بڑے بھائی کی متابعت کی تھی گو بادل نخواستہ تھی اس لئے وہ بھی اس کے عقیدہ کے معیار پر پورے نہیں تھے اور وہ بھی اہلیت امامت سے محروم ہو گئے تھے۔ لہٰذا مجبور ہو کر محمد بن علی رضی اللہ عنہما کو ہی اس نے سر مرتضوی کا خازن اور لواء امامت کا حامل قرار دے لیا تھا۔ اور ان کے متعلق بیان کرتا تھا کہ ان کو جناب امیرؓ سے وراثت میں کرامتیں اور عجیب و غریب علوم ملے ہیں۔

مختار زمانہ سازی اور حالات کے مطابق اپنے آپ کو بدل کر فائدہ اٹھانے کا فن خوب جانتا تھا اور اب قوت حکومت و اقتدار کی چاٹ لگ گئی تھی۔ اس لئے بادل نخواستہ کوفہ کے عوام کو رام کرنے کے لئے کیسان کے عقیدہ کے خلاف حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت کا انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ کوفہ کے عوام ان ہر دو حضرات کے انتہائی مطیع و فرمانبردار تھے۔ لہٰذا اس نے اب یہ کہنا شروع کر دیا کہ امام شہید رضی اللہ عنہ کے بعد حق امامت محمد بن علیؓ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ اور نواصب (خارجیوں) سے لڑنے اور امام شہیدؓ کا بدلہ لینے کے لئے ہمیں انہوں نے مامور کیا ہے۔

اور اس سلسلہ میں جناب محمد بن علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے جھوٹے اور جعلی مہر شدہ فرامین تیار کر کے لوگوں کو دکھانے لگا۔ اور کیسان کی اپنے ساتھ موافقت بطور شہادت پیش کرنے لگا۔ چنانچہ یہ جعل سازی اور چال بازی کامیاب رہی اور بہت سے لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسا لیا۔ اور عراق کے شہروں دیار بکر، اہواز اور آذربائیجان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ تا آنکہ حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بھائی

اور امام شہید رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ کیونکہ جناب سکینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ مختار کی بداطواریاں دیکھ اور سن کر اس پر فوج کشی کی۔ اور اسے واصلِ جہنم کر کے خلق خدا کو اس کے جور و تشدد سے رہائی دلائی۔

مختار نے اپنے ماننے والوں کے لیے مختاریہ کا لقب دیا تھا۔ جب کہ وہ پہلے کیسانیہ کہلاتے تھے۔ جب مختار کی برائیاں، بدعقیدگیاں اور ظلم وستم زبان زدِ خلق ہوئیں اور ہر طرف سے لعنت و پھٹکار برسنے لگی تو اس کے ماننے والوں نے مختاریہ کا لقب ترک کر کے سابقہ کیسانیہ ہی اختیار کر لیا۔

مختار دینی معاملات میں صدر درجہ بدعقیدہ تھا۔ آخر میں تو اس نے نبوت کا دعویٰ ہی کر دیا تھا اور کہتا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آتے اور امراء، صوبہ داروں اور لشکریوں کی خبریں مجھے بتا جاتے ہیں۔

اُدھر جناب محمد بن الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں مختار کے گندے اور بیہودہ عقائد و بداطواریوں پر لعنت بھیجتے تھے اور اس کے کرتوتوں سے اظہار بیزاری فرماتے تھے۔

مختار ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے رسم ماتم عاشورہ اور نوحہ گری کی بنیاد ڈالی، اور وہ یہ سیاست گری اور سارا کھیل اس لئے کھیلتا تھا تاکہ اہلِ کوفہ کو بھڑکا کر اہلِ شام کے ساتھ جدال و قتال پر کھڑا کرے اور اس کی آڑ میں زمامِ سلطنت واقتدار پر اپنا قبضہ مضبوط رکھے۔ اس کو امام حسین رضی اللہ عنہ سے کیا واسطہ تھا وہ تو خود پیغمبر بن بیٹھا تھا اور اس کے پیرو علی الاعلان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر سب وشتم کرتے تھے۔

جب جناب محمد بن الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی تو کیسانیہ انتخاب امام میں باہم مختلف ہو گئے۔ کہ اب امامت کس کی طرف منتقل ہوئی۔ ابوکریب جو اس فرقہ کے سرداروں میں سے تھا یہ کہنے لگا کہ محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ خاتم الائمہ ہیں۔ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ دشمنوں کے خوف سے روپوش ہو گئے کچھ عرصہ بعد ظہور فرمائیں گے۔ اور مطلب اس سے یہ تھا کہ لوگ کسی دوسرے کے پیرو اور گرویدہ نہ ہو جائیں، بدستور سابق میرے ہی مطیع و فرمانبردار بنے رہیں۔

اس کے برخلاف ایک دوسرے سردار اسحاق نامی نے رسل ورسائل کے ذریعہ حضرت ابوہاشم بن محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ سے اپنا رشتہ جوڑا اور کہنے لگا کہ اب وہ امام ہیں اور انہوں نے مجھے نائب و نمائندہ مقرر کیا ہے۔ ابوہاشم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اسحاقیہ فرقہ ان کی اولاد میں امامت منتقل ہونے کا قائل ہوا۔

ادھر ابن حرب جو اسحاقیہ فرقہ کا سردار تھا خود امامت کا دعویٰ کرنے لگا۔

ایک اور جماعت جو عبداللہ بن جعفر کے چیلے چانٹوں پر مشتمل اور پہلے اسحاقیہ میں شامل تھی حضرت ابوہاشم رحمہ اللہ علیہ کے بعد عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر کی امامت کی قائل ہو گئی اور کوفہ کے شیعوں کی بڑی اکثریت ان کے تابع ہو گئی۔

کیسانیہ ہی کی ایک جماعت نے یہ کہا کہ حضرت ابوہاشم رحمہ اللہ علیہ کے بعد امامت اولاد ابوطالب سے منتقل ہو کر اولاد عباس رضی اللہ عنہ کو ملی۔ چنانچہ انہوں نے علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو امام مانا اور ان کے بعد ان کی اولاد میں امامت کا سلسلہ چلایا تا آنکہ منصور دوانقی عباسی کا زمانہ آیا تو یہ سلسلہ بھی موہوم سا ہوا۔

اس سلسلہ میں عجیب تربات یہ ہے کہ یہ لوگ جن کو اپنے خیال میں امامت کا درجہ دیتے تھے اور ان کی امامت کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے تھے وہ خود اس دعوے سے پورے طور پر بیزاری کا اظہار فرماتے اور اپنے آپ کو اس کھڑاگ

سے بے تعلق ظاہر کرتے۔ اور یہ بے حیا لوگ، ان کے انکار اور بیزاری اور کنارہ کشی کو ان کے تقیہ اور دشمنوں کے خوف پر محمول کرتے، کیونکہ ہنوز مدینہ منورہ پر مروانیوں کا قبضہ و تسلط تھا۔

شیعہ مذہب میں تقیہ نے دراصل اسی زمانہ سے جڑ اور شہرت پکڑی!

اس زمانہ میں مذہب تشیع صرف دو فرقوں۔ کیسانیہ اور مختاریہ میں بٹا ہوا تھا اور کوفہ کے شیعہ اسی مذہب کے پیرو تھے۔ غالی شیعہ اور تفضیلی فرقے بہت کم اور ذلیل و حقیر ہو کر رہ گئے تھے۔ البتہ کیسانیہ فرقہ میں زبردست پھوٹ تھی اور وہ خود کئی فرقوں پر تقسیم ہو چکا تھا۔

شیعہ مذہب میں تیسرا انقلاب یہ ہوا کہ جب حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اس عالم فانی سے دار بقاء کو سدھارے، تو زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے جو زید شہید کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہشام بن عبدالملک بن مروان خلیفہ وقت پر چڑھائی کر دی۔ جب آپ کوفہ و عراق کے گرد و نواح میں پہنچے تو شیعہ مخلصین کی ایک جماعت آپ کے ساتھ ہو گئی۔ اس لئے کہ مروان کی اولاد، اپنے عاملوں کے ظلم و ستم کے سبب اور ان کو اس سے روکنے میں ناکام رہنے کے باعث ریاست کی ظاہری قابلیت اور دبدبہ سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ حضرت زید شہید کے اپنے ساتھیوں، مخلص شیعوں کے علاوہ تیس ہزار کی ایک جمعیت۔ تبرائی شیعوں کی بھی شامل ہو گئی جس کی اکثریت کیسانیوں اور مختاریوں پر مشتمل تھی۔ یہ پورا لشکر یوسف بن عمر ثقفی سے قتال کرنے کے لئے روانہ ہوا جو اس وقت ہشام کی طرف سے امیر العراقین تھے۔

جب حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تبرائیوں کا سب و شتم اور تبری سنا تو بار بار ان کو ڈانٹا، دھمکایا، اور ان لوگوں کے سرداروں کو پابند کیا کہ وہ اپنے ماتحتوں کو اس لائق نفرت فعل سے باز رکھیں۔ جب بات زبانی کلامی حد و اور سب و شتم سے آگے بڑھ کر تلوار اور بھالے تک پہنچی۔ اور محبان اہل بیت شیعوں کی عملی آزمائش کی گھڑی آ پہنچی تو سارے کے سارے تبرائی، آپ کی رفاقت سے منہ موڑ کر اور آپ کو دشمنوں کے حوالے کر کے گھروں میں جا گھسے۔ اور عذر یہ گھڑا کہ ہمکو صحابہ پر تبرا بازی سے کیوں روکا۔ گویا تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دوہرایا اور کوفہ کے شقی لوگوں نے جناب امام حسین رضی اللہ عنہ سے غداری کا جو سلوک کیا تھا وہی سلوک ان کیسانیوں اور مختاریوں نے جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ سے کیا۔ نتیجۃً جناب زید شہید ہو گئے، آپ کی شہادت کے بعد مذہب شیعہ میں ایک عجیب انقلاب آیا کہ وہ جماعت جو جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہ گئی تھی۔ اس نے اپنا لقب شیعہ خالص رکھا۔ وہ اس کے قائل تھے۔ کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت زید شہید ہی امام برحق تھے۔ اور شہادت جو ان کے باپ دادا کی میراث تھی۔ ان کو نصیب ہوئی۔ راہ خدا میں اپنی جان پر کھیل گئے اور یہی امام کے شایان شان ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرے اور تلوار لے کر اٹھ کھڑا ہو، کسی انسان کی رفاقت اور مفارقت کی اس کو پرواہ نہ ہو۔

اور ان لوگوں کو جو جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کو میدان جنگ میں چھوڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ گئے تھے۔ روافض کا لقب دیا۔ بلکہ خود جناب زید رحمۃ اللہ علیہ نے ان جھوٹے، بیوفا اور غداروں کے حق میں فرمایا "رفضونا فھم الروافض یعنی انہوں نے ہم کو چھوڑا تو وہ روافض ہوئے"

پھر جب حضرت زیدؒ کے یہ ساتھی اپنے گھروں کو واپس ہوئے تو ان کے سامنے اپنے لئے امام منتخب کرنے کا سوال آیا۔ اس جماعت نے اپنے لئے امامیہ لقب چنا۔ ان میں سے کچھ جناب حسن مثنیٰ بن حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہم

کی امامت کے قائل ہوئے۔ جب کہ اکثریت نے امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امام تسلیم کیا۔ جو اس وقت اہل بیت میں سب سے افضل، عالم اور سب سے زیادہ پرہیزگار اور عبادت گذار تھے۔ اور ان لوگوں نے کیسانیہ اور مختاریہ فرقوں کو اپنے مذہب کی دعوت دینا شروع کی۔ اس مذہب کے داعی جو اس گروہ کے سردار تھے یہ لوگ تھے۔ ہشام بن الحکم احول۔ ہشام بن سالم جوالیقی۔ شیطان الطاق مشبی اور زرارہ بن اعین کوفی۔

امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اس گروہ میں پھر اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ وہ زندہ ہیں مرے نہیں۔ اور ایک جماعت ان کی موت کی قائل ہوئی اور آپ کے صاحبزادے حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امام مانا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ وہ زندہ ہیں مریں گے نہیں۔

کچھ لوگوں نے حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کو امام مانا۔ یہ گروہ تعداد میں بڑھ گیا کیونکہ بہت سے لوگ ان کے ہمخیال ہو گئے۔ انہوں نے امامیہ کا لقب اپنے لئے مخصوص قرار دے لیا۔ اور حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کو امام ماننے والوں کو زیدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔

پھر امامیہ فرقہ میں سرداروں کی بھرمار کے سبب مذہبی نزاع رونما ہوا۔ ہر رئیس اور سردار نے اپنی خواہش کے مطابق نیا مذہب تراشا اور اپنا گروہ علیحدہ بنایا، اس لئے لامحالہ سرداروں کے ناموں پر ہشامیہ۔ سالمیہ۔ شیطانیہ۔ ہشمیہ اور زراریہ فرقے ان میں پیدا ہوئے۔

شیعوں کی مذہبی تاریخ میں یہ چوتھا بڑا اور ہولناک انقلاب تھا جو حضرت جعفر صادق کی وفات پر رونما ہوا۔ کچھ نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ جناب صادقؒ زندہ ہیں، غائب ہو گئے ہیں، پھر ظاہر ہوں گے۔ ایک فرقہ آپ کی موت کا قائل ہوا۔ اور اس نے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے جناب کاظم موسیٰ بن جعفر رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کو تسلیم کیا۔ ایک دوسرے گروہ نے جناب اسمٰعیل بن جعفر رحمۃ اللہ علیہ کو امام ٹھیرایا۔

پھر ان اسمٰعیلیوں میں بھی تفرقہ پڑا۔ بعضوں نے کہا کہ اسمٰعیلؒ آخری امام ہیں ان کے بعد کوئی امام نہیں اور ان کے متعلق حی لا یموت کا عقیدہ قائم کر لیا۔ اور بعض دوسرے ان کی موت اور ان کے بیٹے محمد بن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کے قائل ہوئے۔

پھر ان میں بھی پھوٹ پڑ گئی، اس سبب سے کہ جناب اسمٰعیل بن جعفرؒ حضرت جعفرؒ کی حیات میں وفات پا گئے اور اپنے پیچھے اپنا بیٹا محمدؒ چھوڑا۔ وہ اپنے دادا کے ہمراہ بغداد گئے وہیں وفات پا کر مقابر قریش میں مدفون ہوئے۔

ان کا ایک غلام مبارک نامی تھا۔ جو خوش نویسی، نقش و نگار سازی اور دستکاری میں یکتائے روزگار تھا۔ عبداللہ بن میمون اقداح اہوازی اس غلام سے آکر ملا۔ اور حضرت جعفر صادقؓ کی وفات کے بعد اس سے کہا کہ میں تیرے آقا و مولیٰ حضرت محمدؒ کے شیعوں میں سے ہوں، غلام کے ساتھ کچھ عرصہ اٹھنے بیٹھنے اور بے تکلف ہونے کے بعد تنہائی میں اس سے کہا کہ مجھے تیرے آقا سے بعض ایسے اسرار اور بھید ملے ہیں کہ ان کی میرے سوا کسی کو انہوں نے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ پس مقطعات قرآنی کے متعلق فلسفیانہ انداز کی باتیں بتانی شروع کیں کچھ شعبدے، سحر اور طلسمات بھی مبارک کو دکھائے اور سکھائے۔ اس کے متعلق محمد بن زکریا رازی نے کتاب المخاریق میں کچھ ذکر کیا ہے۔ یہ عبداللہ بن میمون اقداح ملحد، بدعقیدہ، زندیق اور دین اسلام کا پکا دشمن تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اسلام میں فتنہ و فساد برپا کرے

لیکن کوئی مناسب موقعہ نہیں ملتا تھا۔ اب مبارک کی دوستی میں اس کو اپنی ناپاک خواہش برلانے کا موقعہ میسر آگیا تھا۔
خلاصہ کلام یہ کہ کچھ عرصہ کے یارانہ کے بعد دونوں میں باہم کچھ عہد و پیمان ہوئے اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مبارک تو کوفہ چلا گیا اور وہاں اسمٰعیلی مذہب کا داعی بنکر اس کی دعوت دینے لگا اور اپنے فرقہ کا نام مبارکیہ اور قرمطیہ رکھا کیونکہ مبارک اس کا نام اور قرمط لقب تھا۔ ادھر عبداللہ بن میمون کوہستان عراق پہنچا اور کوہستانیوں کو طلسمات و نیرنجات کے زور پر اپنے جال میں پھانسا، وہ اپنے ہر متبع کو ان الفاظ میں نصیحت کرتا اُسْتُرْ ذَهَبَكَ وَذِهَابَكَ وَمَذْهَبَكَ (اپنے سونے، اپنے سفر اور اپنے مذہب کو چھپا) اس نے اپنے گروہ کو میمونیہ کا لقب دیا۔
جب کوہستانیوں کی طرف سے اس کو پورا پورا اطمینان ہو گیا، اور اپنا بازو قوی بنا لیا تو خلف نامی ایک شخص کو اپنا نائب بنایا اور دعوت مذہب کی ہدایت کر کے اسکو خراسان، قم اور کاشان کی طرف روانہ کیا اور خود بصرہ کا رخ کیا۔ اور وہاں کے لوگوں کو گمراہ کرنے اور بہکانے میں مشغول ہو گیا۔
خلف پہلے طبرستان گیا، اور وہاں کے شیعوں کو مذہب میمونیہ کی دعوت دینے لگا۔ وہ کہتا تھا کہ اہل بیت کا مذہب یہی ہے اور اَهْلُ الْبَيْتِ اَدْرٰى بِمَا فِيْهِ (صاحب خانہ ہی گھر کی چیزوں کو اچھی طرح جانتا ہے) اور مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے اپنے الگ مذہب گھڑ لئے ہیں اسی وجہ سے وہ مصائب اور تکالیف کا شکار ہوئے اور لذائذ و طیبات سے تہی دست!

وہاں سے اس نے نیشاپور کا رخ کیا۔ اور وہاں کے شیعوں کو بھی اسی آفت میں ڈالا۔ اور خود نیشاپور کے کسی گاؤں میں اقامت پذیر ہو گیا۔ اہل سنت کو جب اسکی فتنہ پردازیوں کی خبر ہوئی تو وہ اس کے پیچھے پڑ گئے اور وہ چھپ کر بھاگ گیا۔ وہاں سے رے پہنچا اور وہاں بھی یہی فتنہ انگیزی شروع کر دی۔ غرض جب تک زندہ رہا۔ یہی کرتا رہا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹے احمد نے باپ کی جگہ لے لی۔ اور غیاث نامی ایک شخص کو اپنا نائب بنا کر عراق میں بھیجا۔ غیاث ادیب، شاعر، مکار اور غدار آدمی تھا۔
فرقہ باطنیہ کا بانی مبانی اور اول مصنف یہی ہے "مذہب باطنیہ کے اصول کے بیان میں" نامی کتاب اسی نے لکھی ہے۔ جسے دلپذیر اشعار اور امثال عرب سے مزین کیا۔ اور اپنی دلیل میں آیات و احادیث کے بہت حوالے دیتا ہے۔ وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر احکامات کو باطنی فرقہ کے مطابق بیان کر کے ثبوت میں لغت کے حوالے پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان سب امور سے شارع (علیہ السلام) کی یہی مراد ہے، عام لوگوں نے ان کے جو معانی و مطالب سمجھے ہیں سراسر غلط ہیں۔
غیاث کے زمانہ میں باطنی فرقہ نے بڑا زور پکڑا۔ اور عوام کو یہ نیا اور آسان طریقہ جس میں بے باکی اور پوری پوری آزادی ملتی تھی، بہت مرغوب اور دلچسپ معلوم ہوا، یہی وجہ تھی کہ ہزاروں جاہل اور فاسق و فاجر اس کی اطاعت کے جال میں پھنس گئے۔ اور دور دراز کے شہروں سے سمٹ سمٹ کر اس کی طرف آنے لگے۔ یہ واقعہ ۲۰۲ھ کا ہے، جس کی طرف حدیث صحیح کے الفاظ ظہور الآیات بعد المائتین، میں صاف اشارہ ملتا ہے کہ "دوسری صدی کے بعد نشانیوں کا ظہور ہوگا"۔ اسوقت شیعہ مذہب گویا کفر و فلسفہ کا معجون مرکب بن گیا تھا۔ جس کی مثال بول و براز اور خون حیض کے ملغوبے کی سی تھی۔

غیاث جب گمراہی کے بام عروج پر تھا اور اس کا کاروبار گمراہی، اور اس کی جادوگری کے ڈنکے بج رہے تھے اسے خبر ملی، کہ اہل سنت کے رؤسا و سردار، تیرے مار ڈالنے کی فکر میں ہیں جان پیاری ہے تو بھاگ جا۔ وہ یہ وحشتناک خبر سنتے ہی بدحواسی کے عالم میں بھاگ اٹھا اور مرو شاہجہان میں جا چھپا۔ اور ایک مدت تک خاموشی اور گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن اس خاموشی میں بھی وہ اپنے مشن سے غافل نہیں ہوا جو بھی اسے ملتا بہکانے سے باز نہ آتا ایک عرصہ کے بعد پھر رے جا پہنچا، مگر پھر خطرے کی بھنک پاکر دوبارہ بھاگ نکلا مگر راستہ ہی میں تھا کہ پیک اجل نے رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔

عبد اللہ بن میمون کو اس کی موت کا بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ آخر وہ اسی صدمہ میں مرگیا۔ اور بصرہ میں دفن ہوا۔ اس نے اپنے لڑکے احمد کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا جو فتنہ کی آگ بھڑکانے میں باپ سے بھی دو قدم آگے تھا۔ اور شرارت و گمراہی میں باپ سے کسی طرح بھی کمتر نہ تھا۔

پہلے تو وہ بصرہ سے شام گیا مگر وہاں مروانیوں کے اخلاف اور ان کے تعصب کی وجہ سے اس کی دال نہیں گلی۔ اس کے بعد وہ مغرب گیا اور وہاں ایک جماعت کو بہکانے میں کامیاب رہا پھر شام ہوتا ہوا بصرے آیا۔ جہاں اجل نے اسے بھی باپ کے پاس پہنچا دیا۔

اس کا جانشین اس کا بیٹا محمد ہوا۔ وہ پہلے مغرب گیا جہاں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور بڑی عزت وقدر اور بڑا مرتبہ نصیب ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے یہ دعوی کر دیا کہ مہدی موعود میں ہی ہوں۔ اس دعوی پُر فریب کا بھی بہت لوگ شکار ہوئے، غرض یہ برّ افریقہ اور دوسرے مغربی شہروں پر چھا گیا۔ اپنے ماننے والوں کو اس نے مہدویہ کا لقب دیا۔ ایک مدت کے بعد مہدویہ میں بھی اندرونی اختلاف و افتراق پیدا ہو گیا اور یہ فرقہ بھی دو فرقوں میں بٹ گیا۔ اور اس کا سبب یہ ہوا کہ مستنصر جو محمد مہدی مذکور کی اولاد میں سے تھا۔ اور مصر و دیار مغرب کا بادشاہ تھا اس نے پہلے تو اپنے بعد اپنے بھائی نزار کی امامت کا حکم دیا۔ مگر پھر اپنے بیٹے مستعلی کی امامت کا بھی دوسرا حکم جاری کر دیا۔ لہذا ایک جماعت نے تو پہلے حکم کی تعمیل میں نزار کو امام مانا۔ اور حکم ثانی کو لغو قرار دیا کیونکہ حکم اول نفاذ پا چکا تھا۔ اور ایک دوسری جماعت نے حکم ثانی کو حکم اول کا ناسخ قرار دے کر مستعلی کو امام برحق تسلیم کیا۔

پھر ۲۵۵ھ میں اسمعیلیہ فرقہ میں سے ایک شخص محمد بن علی برقعی نامی اہواز میں امامت کے دعوی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور خود کو علویہ کی طرف منسوب کیا۔ اگرچہ یہ خود علوی نہ تھا مگر اس کی ماں سے کسی علوی نے نکاح کر لیا تھا۔ اور اس نے اس علوی کے گھر میں پرورش پائی تھی اس لئے اس نے علوی کی طرف اپنی نسبت ظاہر کی۔ اور خوزستان بصرہ و اہواز پر اپنا اقتدار جما لیا، اور بڑی مخلوق کو گمراہ کر ڈالا۔ اس نے اپنے فرقہ کو برقعیہ کا لقب دیا۔ معتضد عباسی خلیفہ نے اس کی سرکوبی کو لشکر بھیجا جس نے اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر اس نے شورش کی اور پھر شکست پائی مار دھاڑ کی یہ آنکھ مچولی پندرہ برس جاری رہی بالآخر ۲۷۰ھ میں ایک بہت بڑی فوج اس کی سرکوبی کو بھیجی گئی، باوجودیکہ اس کے ہمراہیوں نے جان کی بازی لگا دی مگر شکست سے نہ بچ سکے برقع قید ہو کر بغداد گیا اور معتضد نے اسے سولی چڑھا دیا۔

۲۷۰ھ میں اسمعیلیہ فرقہ میں حکم بن ہشام نامی ایک اور شخص پیدا ہوا۔ اس نے اپنا لقب مقنع رکھا۔ یہ ایک فلسفی

اور سائنسدان شخص تھا۔ ہر صنعت میں ماہر، خصوصاً فن بلاغت علم شعبدہ بازی، حیلہ گری، طلسمات، سحر اور نیرنجات۔ میں بہت دسترس رکھتا تھا، علوم فلسفہ سے خوب واقف تھا۔ اور عجیب و غریب باتیں اس سے سرزد ہوتی تھیں، اس نے شہر نسف میں ایک کنواں بنایا تھا۔ مغرب کے وقت اس کنویں سے ایک چاند نکلتا تھا جس کی روشنی سے پانچ فرسنگ تک کا علاقہ روشن رہتا تھا، رات بھر یہ چاند روشن رہتا تھا اور طلوع فجر سے پہلے غائب ہو جاتا تھا۔ مقنع چار خداؤں میں سے اپنے آپ کو چوتھا خدا کہتا تھا۔ شیعہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے جاتے اور اس طرح اس کی جمعیت میں اضافہ ہوتا رہتا۔ یہ تعداد اتنی بڑھی کہ سلاطین ماوراء الہند اس سے عاجز آگئے، بالآخر خلیفہ بغداد امرائے خراسان اور ملوک ماوراء النہر نے اس کی سرکوبی کو اپنے اپنے بھاری لشکر بھیجے۔ اس نے بھی امکان بھر جم کران کا مقابلہ کیا۔ آخر جب ہر طرف شکست ہی شکست دکھائی دینے لگی تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مضبوط قلعہ میں جو ایسے ہی کسی خطرہ کے پیش نظر پہاڑ کی چوٹی پر بنایا تھا۔ پناہ گزین ہو گیا۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر کے اس کی رسد بند کر دی۔ جب اسے موت سامنے نظر آنے لگی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کرو۔

پھر ان سب کو زہر آمیز شراب پلا کر ختم کر دیا ان کی لاشوں کو آگ میں جلا کر ان کی راکھ ہوا میں اڑا دی۔ سب کے بعد خود ایک ایسے مٹکے میں بیٹھ گیا جس میں تیزاب فاروق بھرا ہوا تھا، اس تیزاب کی یہ خاصیت تھی کہ اس میں جو کچھ بھی ڈالا جائے پانی ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ وہ بھی پانی بن کر ختم ہو گیا۔ محاصرین کو اندر کا کچھ پتہ نہ تھا وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ اندر موجود ہے۔ اسی قلعہ کے کسی گوشہ میں ایک نوجوان عورت کسی مرض کے سبب بیہوش پڑی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے آگ کے الاؤ وغیرہ کے مناظر دیکھے۔ مگر وہ گوشہ سے نہیں نکلی اور جب سب کچھ ختم ہو گیا تو باہر نکل کر محاصرین کو بتایا کہ قلعہ خالی ہے

میرے سوا کوئی نہیں۔ یہ سنکر کچھ فوجی برجوں اور فصیلوں پر چڑھ کر قلعہ کے اندر آئے۔ قلعہ کے دروازے کھولے اور فوج اندر گھس آئی۔ خوب دیکھ بھال کی گئی، وہاں انسانی جسم کا نشان تک ان کو نہ ملا۔ آخر اس عورت نے جو کچھ دیکھا تھا ان کو بتایا تب پتہ چلا کہ وہ مرتے مرتے بھی اپنے پس ماندگان کے گمراہ ہونے کے لئے کیا چالبازی کر گیا۔ چنانچہ جب ان ساتھیوں کو جو پہلی شکست کے بعد ہی منتشر ہو کر ادھر اُدھر دیہات وغیرہ میں چھپ گئے تھے یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے اس واقعہ کو اس کے معبود ہونے کی سچی اور پکی دلیل سمجھ کر خوشی کا اظہار کیا کہ بے شک وہ خدا تھا جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمان پر چلا گیا۔ اور ہائے کاش کہ ہم بھی اسی کے ساتھ چلے جاتے اور اس ترقی سے فائز المرام ہوتے۔

معتضد عباسی کے عہد میں اسی اسمٰعیلی فرقہ سے ایک شخص ابو سعید بن الحسن بن بہرام جنابی پیدا ہوا ابتداءً بحرین میں ظاہر ہوا پھر رفتہ رفتہ ہجر، لحا اور قطیف اور تمام بحرین کے شہروں پر قابو پا گیا۔ لوگوں کو باطنی مذہب کی تعلیم دیتا تھا۔ اپنے متبعین کو جنابیہ کا لقب دیا۔ ان کا اصول زندگی سکھوں کے اصول سے ملتا جلتا تھا۔ ان کا پیشہ اور ذریعہ معاش دیہاتوں میں لوٹ مار اور مویشی چرانا، قافلوں پر ڈاکے مارنا اور مسلمانوں کو قتل کرنا تھا۔ بالآخر اسی کے ایک خدمتگار نے حمام میں اس کو مار ڈالا۔ یہ واقعہ ۳۰۱ھ میں پیش آیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا طاہر باپ کا قائم مقام ہوا۔ اور کافی زور پکڑ گیا۔ ۳۱۷ھ میں حاجیوں کو پہلے پہل اسی نے لوٹا۔ مذہب باطنی کو رائج کیا۔ جب خلفاء اور ملوک کی مدافعانہ کوشش سے اس کی شوکت اور دبدبہ کا زور ٹوٹا تو ایک دوسرا شخص ہمدان نامی قرامطہ میں سے نکلا، اور محمد بن اسمٰعیل مذکورہ بالا

کی امامت کی طرف لوگوں کو دعوت دینے لگا۔ اور کہنے لگا کہ وہ نہ مرے ہیں نہ مریں گے، بلکہ وہ زندہ ہیں اور مہدی موعود وہی ہیں۔ وہ ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو قرامطہ کا لقب دیا اور یہ لقب ان پر ایسا غالب ہوا کہ پھر کوئی مبارکیہ کو قرامطہ نہیں کہتا تھا بلکہ صرف اس کے تبعین ہی اس لقب سے پکارے جاتے تھے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لقب تمام مبارکیہ کا ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ اپنے موقعہ پر بیان کیا جائے گا۔

حمدان کے بعد ایک شخص ابن ابی الشمیط اٹھ کھڑا ہوا، یہ حمدان کا مخالف تھا۔ اور کہتا تھا کہ اسمٰعیل کے بعد امامت ان کے بھائی محمد کو ملی۔ پھر ان کے بھائی موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے بھائی عبداللہ افطح بن حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد ان کے بھائی اسحاق بن جعفرؒ امام ہیں۔

وہ محمد بن اسمٰعیل کی امامت کا منکر نہیں تھا البتہ ان کی حیات اور پھر ظاہر ہونے کو نہیں مانتا تھا اس نے اپنے گروہ کا نام شمطیہ رکھا۔ پس میمونیہ، خلیفہ، برقعیہ، مقنعیہ، جنابیہ اور قرمطیہ سب کی سب باطنی فرقہ کی شاخیں ہیں۔ اصول و عقائد میں سب کے سب متفق ہیں۔ البتہ بعض فروع میں باہم مختلف ہیں، باطنی فرقہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ احکام کے باطن پر عمل کرنا فرض ہے ظاہر پر نہیں۔ اسی لئے ان کو باطنیہ کہا جاتا ہے۔ البتہ ان میں سے مقنعیہ فرقہ کا اختلاف بنیادی ہے۔ اس لئے کہ وہ مقنع کی الوہیت کے قائل ہو گئے تھے۔

اہل تاریخ کہتے ہیں کہ برقعی، مقنعی اور قرامطی باہم خفیہ مراسلاتی روابط رکھتے ہیں اور سب کے سب اغراض و مقاصد میں متفق تھے کیونکہ ان کا واحد مقصد جس رنگ اور جس طریقہ سے بھی ممکن ہو مسلمانوں کو قتل کرنا، ان کے مذہب کو درہم برہم اور اہل اسلام کی بیخ کنی اور لوگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا تھا۔ ان میں اقداح اہوازی ہی وہ پہلا شخص ہے۔ جس نے باطنی مذہب ایجاد کیا اور برقعی وہ پہلا آدمی ہے جس نے تقیہ ترک کر کے علی الاعلان اور برملا اس مذہب کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس کے بعد مقنع، اور جنابی پھر نزاریہ میں سے حسن اور اس کی اولاد اور مہدویہ کہ جس کے آغاز کا حال پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ سب اگرچہ اصل عقیدہ کے لحاظ سے اسمٰعیلی تھے، لیکن جب مصر و افریقہ کی ولایت ان کے قبضہ میں آئی تو لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر ظاہری احکام شرع کی پابندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہ خود بھی ظاہری احکام شرعی کے نفاذ پر بہت زور دینے لگے مگر تنہائی میں اپنے خاص خاص لوگوں میں باطنی مذہب کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے فہیم و سنجیدہ لوگ درج ذیل نتائج تک ضرور رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اول۔ شیعہ مذہب کے وجود میں آنے کا باعث وہ نفاق یا دشمنی تھی۔ جو اس کے موجد مسلمانوں کے بارے میں رکھتے تھے، جیسے عبداللہ بن سبا اور اس کے بھائی، کہ وہ یہودیت کے سبب مسلمانوں سے زخم اٹھا کر، اور ذلیل و خوار ہو کر، اپنے دلوں میں عناد رکھتے تھے۔

دوسرے۔ حکومت و اقتدار کا لالچ۔ جو واقعہ مختار و کیسان سے ظاہر ہے۔

تیسرے۔ امام زادہ حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مخالفت، جو شاہین اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے ظاہر ہوئی۔

چوتھے۔ کفر و الحاد سے لگاؤ اور تکالیف شرعیہ سے گریز، جس خیال میں کہ عبداللہ بن میمون اقداح لگا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیعہ مذہب کے اصول صرف پانچ ہیں، کیونکہ ابتدائی فرقے بھی پانچ تھے، یعنی شیعہ اولیٰ، غلاۃ، کیسانیہ، زیدیہ، اور امامیہ شیعان اولیٰ کے دو فرقے شمار ہوتے ہیں۔ پہلا فرقہ ان اہل سنت والجماعت مخلصین کا

ہے جن میں مہاجرین وانصار صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم شامل ہیں، جو ہمیشہ حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ کے رفیق اور ان کی خلافت کے مددگار رہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ برحق ہیں اور ان کی اطاعت سب مسلمانوں پر فرض ہے اور یہ کہ وہ اپنے زمانہ کے موجودین میں سب سے افضل ہیں جس نے ان کی خلافت کی مخالفت کی اور ان کو لائق خلافت نہ سمجھا وہ باغی وگمراہ اور خطاکار ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ وطلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کو ان کی خلافت کے بارے میں کوئی نزاع نہ تھا بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے میں عجلت اور اس میں تاخیر کرنے یا نہ کرنے میں اختلاف تھا۔ اور یہ اختلاف بھی دور ہونے والا اور باہم صلح وصفائی ہوا ہی چاہتی تھی کہ عبداللہ بن سبا اور اس جیسے لوگوں نے طرفین کے سرداروں کے مشورہ اور مرضی کے بغیر لڑائی چھیڑ دی، اور پھر جو کچھ نہ ہونا تھا ہوا۔

غرض تمام بزرگوں نے خصوصیت کے ساتھ خلافت کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لیاقت وقابلیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ ان کو اہل عصر میں بہتر جانتے اور مانتے تھے ان کے محاسن اور خوبیوں کے نہ صرف معترف تھے بلکہ علی الاعلان ان کو بیان بھی کرتے تھے۔

اور اس فرقہ کا یہ بھی مذہب تھا کہ جس طرح کلام اللہ اور کلام رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کو ظاہر پر محمول کیا جاتا ہے اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال اور کلام کو ظاہر پر محمول کرنا چاہیئے نہ کہ تقیہ اور ظاہرداری پر۔ کیونکہ خلیفہ برحق پیغمبر کا نائب ہوتا ہے تو پیغمبر کے اقوال جس طرح ظاہر پر محمول ہوتے ہیں ایسے ہی خلیفہ کے کلمات کا بھی معاملہ ہے۔

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ بعض صحابہ کو خود پر فضیلت دینے کے بارے میں فرماتے یا ان اصحاب کے محاسن وخوبیاں بیان فرماتے ہیں جو آپ سے برسرپیکار تھے۔ ان سب پر بلاشک وشبہ یقین کرنا اور ان کو ماننا چاہیئے کہ وہ اصول اعتقاد یا عمل سنت مصطفویہ علی صاحبہا الف الف تحیۃ جو صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے اس کو جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے درست اور ٹھیک فرمایا ہے۔ اور تمام صحابہ کی درجہ بدرجہ مدح وتوصیف فرمائی ہے، جسکی تفصیلات انشاء اللہ اس کتاب میں آگے آئے گی۔ اس فرقہ کے ان ہی خیالات وعقائد کی بنا پر ان کو اہل سنت والجماعت کا لقب دیا گیا، کیونکہ یہ لوگ ان تمام اقوال وکلمات کو جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صحابہ کے حق میں فرمائے ظاہر پر محمول کیا اور سب صحابہ رضوان اللہ علیہم کے درجہ بدرجہ معتقد ہوئے۔

دوسرا فرقہ تفضیلیہ ہے، جو اگرچہ شیعیان اولیٰ میں تو داخل نہیں ہے لیکن ایک مسئلہ تفضیل کو چھوڑ کر باقی تمام مسائل ومعاملات میں اہل سنت کے ساتھ متفق اور ان کا اعتقاد وعمل بھی صحابہ کرام سے مروی ہے اس لئے اختلاف وانتشار کو سمیٹنے اور بات کو مختصر کرنے " کے محاورے واصول کے مطابق ان کو بھی شیعیان اولیٰ میں شامل کئے لیتے ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ صرف حضرت علی اور ان کی اولاد (رضی اللہ عنہم) ہی خلافت کی حقدار ہے تاوقتیکہ وہ خود اپنی مرضی سے اپنا یہ حق دوسروں کو منتقل نہ کر دیں اسی بنا پر چونکہ جناب شیخین رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر سب کا اتفاق ہو چکا تھا ان کی خلافت کو حق جانتے اور درست تسلیم کرتے ہیں، اور یہ حقداران جب خود دعویدار ہوں تو پھر کسی دوسرے کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ یہ لوگ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل الناس مانتے ہیں۔ اور صحابہ کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔ اور ظلم، وغضب اور گمراہی کی نسبت ان کی طرف ہرگز نہیں کرتے۔ گویا یہ لوگ سوائے مسئلہ تفضیل کے کسی بھی مسئلہ میں شیعیان اولیٰ سے مخالفت نہیں رکھتے۔

اور فرقہ اسمٰعیلیہ کا مذہب اگرچہ (امامیہ سے) بالکل جدا ہے۔ انتشار کو کم کرنے کی غرض سے ان کو امامیہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔
یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ شیعان اولیٰ جس میں اہل سنت اور اہل تفضیل دونوں شامل ہیں، پہلے شیعہ ہی کہے جاتے تھے مگر جب سے غلاۃ (غالی) روافض، زیدیوں، اور اسمٰعیلیوں نے اپنے لئے شیعہ لقب اختیار کیا اور ان کے اعمال و عقائد کی قباحتیں اور شر ظاہر ہونے لگے تو حق و باطل کے مل جانے کے خطرہ کے پیش نظر فرقہ سنیہ و تفضیلیہ نے اس لقب کو اپنے لئے ناپسند کر کے ترک کر دیا اور اس کی جگہ اہل سنت والجماعت کا لقب اختیار کیا۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ تاریخ کی قدیم کتابوں میں اساطین اہل سنت کے لئے جو یہ الفاظ "فلاں من الشیعۃ او من شیعۃ" مذکور ہیں۔ تو یہ الفاظ اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ پہلے ایسے حضرات شیعان اولیٰ کا یہ لقب تھا۔ واقدی کی تاریخ اور استیعاب ہیں اس قسم کے الفاظ بہت آتے ہیں لہٰذا اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ یہ حضرات مذکورین ہرگز ایسے شیعہ نہ تھے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رفاقت اور مددگاری کے سبب شیعان علیؓ (علیؓ کے ساتھی) کہلاتے تھے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا غلاۃ۔ کیسانیہ اور اسمٰعیلیہ فرقے ایسے ہیں کہ جن کو بلا اختلاف کافر کہا جا سکتا ہے یا مرتد ٹھیرایا جا سکتا ہے۔ باقی رہے زیدیہ و روافض جو خود کو امامیہ کہتے ہیں ان کی تکفیر میں اختلاف ہے اس میں حق بات یہ ہے کہ ان کو باہم ایک دوسرے پہ فضیلت ہے۔ اس کا بیان بھی انشاء اللہ آگے آئے گا۔

اور غلاۃ، کیسانیہ، زیدیہ اور روافض (امامیہ) بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کے ناموں اور مذہبوں کی تعداد کتاب ملل و نحل اور دوسری بڑی کتابوں میں ملتی ہے اس کا تذکرہ یہاں بے فائدہ ہے اس لئے کہ اصل کی پہچان کے بعد تابع کی پہچان خود بخود ہو جاتی ہے اور اصل کے فساد سے تابع کا فساد خود ہی عیاں ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم ناظرین کتاب کی دلچسپی اور تفنن طبع کے طور پر، اس تفصیل کا مختصر اجمال بیان کرتے ہیں۔

غالی شیعوں کے چوبیس فرقے

غلاۃ (غالی فرقہ) کے چوبیس فرقے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) **فرقہ سبائیہ** ۔ یہ پہلا فرقہ عبداللہ بن سبا کے شاگردوں، ساتھیوں اور ہم عقیدہ لوگوں کا ہے۔ یہ کہتے تھے کہ حضرت علی معبود حقیقی ہیں وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ ابن ملجم نے ایک شیطان کو مارا ہے جو آپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ (نعوذ باللہ) بھلا شیطان لعین آپ کی پاک شکل میں کیسے منتقل ہو سکتا تھا۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ابر میں پوشیدہ ہیں، اور یہ بجلی کا کڑکا آپ کی آواز ہے اور بجلی آپ کا کوڑا ہے۔ اسی لئے جب یہ لوگ بادل کی گرج سنتے ہیں تو کہتے ہیں الصلوٰۃ والسلام علیک یا امیر المؤمنین ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ ایک مدت کے بعد نزول فرمائیں گے اور اپنے دشمنوں کو زیر و زبر کر ڈالیں گے۔ ان لوگوں کے کلمات باہم ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں اور لا یعنی ہیں اس لئے کہ ابر کی سخت کڑک اور بجلی گرا کر جب ایک عالم کو مار سکتے ہیں تو اپنے دشمنوں کے بارے میں یہ ڈھیل کیوں اور یہ انتظار کس کا؟

(۲) **فرقہ مُفَضَّلِیہ** ۔ یہ فرقہ مفضل صیرفی نامی ایک شخص کے ساتھیوں کا ہے جب سبائی مذہب برائیوں کا نشانہ اور لعنت و ملامت

کا ہدف بنا تو ان لوگوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اور یوں کہنے لگے کہ جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ سے وہی نسبت ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے تھی۔ بقول نصاریٰ کہ لاہوت و ناسوت دونوں باہم مل کر ایک چیز ہو گئے ہیں۔

اس فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور جس بھی کسی کا اتحاد ذات لاہوت سے ہو اوہ نبی ہے اور جس نے رہنمائی عالم اور گمراہوں کی ہدایت کو اپنا پیشہ بنا دیا وہی رسول ہے۔ اس لئے اس فرقہ میں نبوت و رسالت کے دعویدار بہت گزرے ہیں۔

(۳) فرقہ بیزغیہ۔ یہ فرقہ بیزغ کے ساتھیوں کا ہے۔ ان کا بھی وہی مذہب ہے جو مفضلیہ کا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق لاہوت کا حلول صرف پانچ ہستیوں میں ہوا ہے۔ یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم، حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ حضرت جعفرؓ اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہم۔

(۴) فرقہ بیزغیہ۔ یہ گروہ بیزغ بن یونس کے ساتھیوں کا۔ یہ فرقہ حضرت جعفرؒ کے الٰہ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اپنی اصلی صورت میں نظر نہیں آتے تھے۔ بظاہر جس ہستی کو لوگ جعفر کہتے تھے۔ وہ ان کی اصل شکل و صورت نہ تھی۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور امام الوہیت نہیں رکھتا۔ البتہ وحی کا نزول، معراج کا حصول اور عالم ملکوت کی سیر یہ باتیں تمام ائمہ کو حاصل ہوتی ہیں۔

(۵) فرقہ کاملیہ۔ یہ کامل کے ساتھیوں کی جماعت ہے۔ یہ لوگ روحوں کے تناسخ کے قائل ہیں، یعنی کہ روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ کہتے ہیں کہ روح الٰہی پہلے آدم علیہ السلام کے بدن میں آئی۔ پھر شیث علیہ السلام کے پھر اسی طرح سلسلہ بسلسلہ تمام انبیاء علیہم السلام وائمہ کے ابدان میں منتقل ہوتی رہی اسی طرح بنی آدم کی ارواح ایک دوسرے کے ابدان میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

یہ لوگ صحابہ کو کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی اور تماشا یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی کافر کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنا جائز حق کیوں چھوڑا۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کے نزدیک انتقال و حلول روح الٰہی کے لئے ایمان بھی شرط نہیں ورنہ حضرت علی کی تکفیر ممکن نہیں تھی۔

(۶) فرقہ مغیریہ۔ یہ مغیرہ بن سعید عجلی کی ٹولی ہے، یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نورانی شخص کی صورت میں ہے جس کے سر پہ تاج ہے اور اس کا دل حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔

(۷) فرقہ جناحیہ۔ یہ لوگ بھی تناسخ ارواح کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ روح الٰہی حضرت آدم و شیث علیہما السلام اور تمام انبیاء کے ابدان سے منتقل ہوتی ہوئی پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم تک آئی، اور پھر جناب علی رضی اللہ عنہ و حسنین رضی اللہ عنہما اور محمد بن الحنیفہ رحمہ اللہ علیہ میں اور ان کے بعد عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر میں منتقل ہوئی یہ امامت بھی اسی ترتیب سے مانتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک بدن انسانی میں روح الٰہی کے حلول ہی کا نام نبوت یا امامت ہے۔

یہ قیامت کے منکر ہیں اور حرام اشیاء کو حلال کہتے ہیں۔

(۸) فرقہ بیانیہ۔ یہ بیان بن سمعان نہدی کا گروہ ہے یہ خدا تعالیٰ کو اسی شکل و صورت کے ساتھ جانتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن میں حلول کیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بدن میں پھر محمد بن الحنیفہ کے بدن میں پھر ابو ہاشم ابن محمد بن الحنیفہ کے بدن میں۔ اس کے بعد۔ بیان بن سمعان

کے بدن میں۔ اور کہتے ہیں کہ لاہوت، ناسوت کے ساتھ مل کر بیان کے رگ ریشے میں ایسا سرایت کر گیا ہے جیسے کوئلے میں آگ اور مٹی میں گلاب۔

(۹) فرقہ منصوریہ۔ یہ ابو منصور عجلی کے ساتھیوں کا گروہ ہے۔ یہ اس بات کے قائل ہیں کہ رسالت ختم نہیں ہوئی۔ عالم قدیم ہے احکام شریعت ملاؤں کی گھڑت ہے۔ جنت و دوزخ خیالی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کے بعد ابو منصور کو امام مانتے ہیں۔

(۱۰) فرقہ غمامیہ۔ اس فرقہ کو ربیعیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ اس بات کے معتقد ہیں کہ پروردگار عالم موسم بہار میں ابر کی شکل میں زمین پر نزول فرماتا ہے اور دنیا میں چکر لگا کر پھر آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ اور یہ سب پھول پھلواری میوہ و غلہ، اور باغ و بہار اسی کا اثر ہے۔

(۱۱) فرقہ اُمویہ۔ یہ فرقہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نبوت و رسالت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا شریک و سہیم مانتا ہے۔

(۱۲) فرقہ تفویضیہ۔ اس فرقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے امور دنیا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سپردگی اور چارج میں دے دیئے تھے۔ اور جو کچھ دنیا میں ہے آپ کے لئے حلال کر دیا تھا۔

اس فرقہ کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ چارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیا گیا تھا۔ اور بعض دوسرے اس کے قائل ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کے سپرد کیا تھا۔

(۱۳) فرقہ خطابیہ۔ یہ فرقہ ابو الخطاب محمد بن زینب الاجدع الاسدی کے ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ تمام ائمہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اور حضرت علی اور جعفرؒ دونوں کو الٰہ مانتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بڑا اور حضرت جعفر رحمۃ اللہ علیہ کو چھوٹا۔

اور ابو الخطاب کو پیغمبر ماننے کے بعد ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ گذشتہ تمام انبیاء کرام علیہ السلام نے نبوت ابو الخطاب کے حوالہ کر دی ہے۔ اور سب لوگوں پر اس کی اطاعت فرض کر دی ہے۔

ابو الخطاب اپنے ماننے والوں کو یہ نصیحت کرتا تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے بوقت ضرورت جھوٹی قسم کھا لینا۔ اس لئے فقہ کی کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ خطابیہ کی گواہی غیر معتبر اور ناجائز ہے۔

(۱۴) فرقہ معمریہ۔ یہ فرقہ معمر کی طرف منسوب ہے۔ یہ امام جعفر کی امامت کے قائل ہیں اور ان کے بعد ابو الخطاب کو نبی جانتے ہیں اور اس کے بعد معمر کو۔ ان کا عقیدہ ہے کہ احکام شرع معمر کو سپرد ہو گئے تھے اور وہ چونکہ آخر الانبیاء تھے اس لئے اس نے تمام احکام ساقط کر دیئے اور تکلیفات شرع کو ختم کر دیا۔ یہ فرقہ خطابیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔

(۱۵) فرقہ غرابیہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا مگر انہوں نے پہچان میں غلطی کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی، اور ایسا اس وجہ سے ہوا کہ یہ دونوں حضرات شکل و شباہت میں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے تھے۔ ان دونوں کی شباہت اس سے بھی زیادہ تھی جتنی ایک کوے کو دوسرے کوے سے ہوتی ہے۔ لہذا حضرت جبرئیلؑ کے لئے ان میں باہم تمیز ممکن نہ رہی۔
(حضرت جبرئیلؑ کی اس غلطی میں واقعی کیا شک ہو سکتا ہے کہ نودس سالہ نوعمر لڑکے اور چالیس سالہ بزرگ میں بھی تمیز نہ

کرسکے کہ بچہ کے لیے دی گئی وحی اور جبرئیل عمر بزرگ کو پہنچادی اور پھر ۲۳ سال مسلسل اس بھول کا شکار رہے (مترجم)۔

اس فرقہ کے ایک شاعر نے اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ غَلِطَ الْاَمِیْنُ فَجَاوَزَهَا عَنْ حَیْدَرٍ۔ یعنی جبرائیلؑ نے غلطی کی کہ حضرت علی کو چھوڑ کر وحی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچادی۔

ایک دوسرا فارسی گو شاعر کہتا ہے۔

جبریل کہ آمد ز بر خالق بے چوں ۔۔۔ در پیش محمد شد و مقصود علی بود،

اور یہ باتیں تو ان کے پڑھے لکھے لوگوں کی ہیں، جاہل تو لعنة اللہ علی صاحب الریش کے صریح الفاظ کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام پر لعنت بھیجتے ہیں۔

(۱۶) فرقہ ذبابیہ۔ یہ فرقہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو نبی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اللہ مانتا ہے۔ یہ کہتے ہیں ان حضرات کی صورتوں میں اس سے زائد مشابہت تھی جتنی ایک مکھی کو دوسری مکھی سے ہوتی ہے۔ یہ فرقہ غرابیہ کا وہ فرقہ ہے جس نے اپنے عقیدہ کو چھوڑ کر دوسرا عقیدہ اختیار کر لیا ہے۔

(۱۷) فرقہ ذمیہ۔ اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ ہیں۔ انہوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف اس لئے بھیجا تھا کہ وہ انہیں علی کی طرف دعوت دیں لیکن اس کے برخلاف وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینے لگے۔ اسی لئے یہ فرقہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو برائی کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اسی سبب سے اس کا نام ذمیہ ہو گیا۔

(۱۸) فرقہ اثنینیہ۔ یہ فرقہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ دونوں کو خدا مانتا ہے اس فرقہ میں پھر دو گروہ ہو گئے ایک حضور کی خدائی کو ترجیح دیتا اور غالب و قوی بتاتا ہے۔ جبکہ دوسرا حضرت علیؓ کو۔

(۱۹) فرقہ خمسیہ۔ یہ وہ فرقہ ہے جو پانچوں کو خدا مانتا ہے۔ یہ لفظ فاطمہؓ میں تانیث کی تا نہیں لگاتے۔ اور کہتے کہ پانچوں درحقیقت شخص واحد ہیں۔ کہ ایک ہی روح سب میں حلول کئے ہوئے ہے ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ ان پانچوں سے مراد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم ہیں۔

(۲۰) فرقہ نصیریہ۔ یہ فرقہ حضرت علی اور آپ کی اولاد میں سے جن کو وہ امام مانتے ہیں، کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ان میں خدا حلول کر گیا ہے اور کبھی یہ مجازاً اسم اللہ حضرت علیؓ کے لئے بولتے ہیں گویا حال کا اطلاق محل پر کرتے ہیں۔

(۲۱) فرقہ اسحاقیہ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زمین کبھی بھی پیغمبر سے خالی نہیں رہتی۔ یہ بھی حضرت علیؓ اور ائمہ میں خدا کے حلول کے قائل ہیں البتہ اس امر میں باہم اختلاف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد پہلے کس میں حلول ہوا۔

(۲۲) فرقہ علبائیہ۔ یہ علباء ابن ذراع اسدی یا دوسی کے ساتھیوں کا فرقہ ہے، یہ بھی حضرت علی کی الوہیت کے قائل ہیں اور آپ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل مانتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں حضور نے علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے انکی متابعت خود پر لازم کر لی تھی۔

(۲۳) فرقہ رزامیہ۔ ان کے نزدیک سلسلہ امامت یوں ہے، حضرت علی۔ بعدہ محمد بن الحنفیہ پھر ان کے بیٹے ابو ہاشم پھر ان کی وصیت کے مطابق علی بن عبد اللہ بن عباس ان کے بعد محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس، اسی طرح سلسلہ جاری رکھتے ہوئے منصور دوانیقی تک پہنچاتے ہیں۔ اور ابو مسلم مروزی میں جو صاحب دعوت عباسی تھا، اللہ تعالیٰ کا حلول مانتے ہیں اسی وجہ سے ان کا شمار بھی غالیوں میں ہوا، یہ لوگ تارک فرائض ہیں اور حرام چیزوں کو حلال بتاتے ہیں۔

(۲۴) **فرقہ مقنعیہ** ۔ یہ گروہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد مقنع کو الٰہ مانتے رہے اور کہتا ہے کہ خدا چار ہیں۔ مقنع کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یہ دراصل اسمٰعیلی تھا، جب الوہیت کا دعویدار ہوا تو غالیوں میں اس کا بھی شمار ہوا۔

اس ساری تفصیل سے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ مذہب غلاۃ کا دارومدار یہی، امام کو اللہ یا اس میں اللہ کے حلول کرلینے پر ہے۔ لیکن تعیین میں امام کے بارے میں تو وہی تین مذہب کیسانیہ۔ زیدیہ، امامیہ پیش نظر ہیں۔

ان غلاۃ میں بعض کیسانیہ ہیں اور بعض امامیہ، البتہ زیدیہ میں سے اب تک کسی کو غلاۃ نہیں سنا گیا کہ وہ حضرت زید رحمۃ اللہ علیہ میں سے یا ان کی اولاد میں سے کسی کو الٰہ مانتے یا ان میں اللہ کے حلول کے قائل ہوں۔ اس لئے ان چوبیس فرقوں میں ان کا نام نہیں آیا۔

کیسان۔ اور اس کے فرقے

فرقہ کیسانیہ کے متعلق یہ واضح رہے کہ کیسان کے متعلق تحقیق میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جوہری صاحب صحاح اللغت کی تحقیق ہے کہ مختار کا نام ہی کیسان ہے اور صاحب قاموس اور اکثر اہل لغت بھی اس کی تائید کرتے ہیں لیکن ثقہ اور معتمد اہل تاریخ کے نزدیک وہ ایک الگ شخصیت ہے جو حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا پیرو اور جناب محمد بن الحنفیہ کا شاگرد تھا۔ آپ سے اس نے اکتساب فیض کیا اور بہت سے عجیب و غریب علوم حاصل کئے۔ اسی کیسان کے متعلق اور پیروکار ان کو کیسانیہ کہتے ہیں۔

کیسان کے پیروؤں کے کچھ گروہ اور فرقے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

(۱) **فرقہ کربیہ** ۔ یہ ابوکریب ضریر کے ساتھیوں کا فرقہ ہے یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد جناب ابوالقاسم محمد بن الحنفیہ کی امامت کے قائل ہیں اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں نشان لشکر ان ہی کے سپرد کیا تھا گویا ان کے نزدیک یہ امامت پر دلیل قطعی ہے۔ یہ لوگ ان ہی محمد بن الحنفیہ کے متعلق حَیٌّ لَا یَمُوْتُ (زندہ ہیں مریں گے نہیں) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ صاحب الزمان ہیں، کوہ رضویٰ کے درہ میں قدرت الٰہی سے ان کے لئے وہیں دو چشمے شہد اور دودھ کے جاری ہیں۔

ایک شاعر کثیر عزہ نامی بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کے یہ اشعار اس عقیدہ کا ثبوت دیتے ہیں وہ کہتا ہے۔

وَسِبْطٌ لَا یَذُوْقُ الْمَوْتَ حَتّٰی ۔۔۔ یَقُوْدَ الْخَیْلَ یَقْدُمُهَا اللِّوَاءُ
یُغَیَّبُ فَلَا یُرٰی فِیْهِمْ زَمَانًا ۔۔۔ بِرَضْوٰی عِنْدَهٗ عَسَلٌ وَمَاءُ

ترجمہ۔ "یہ وہ بیٹا ہے جو اس وقت تک موت سے ہمکنار نہیں ہوگا جب تک آگے اڑتے ہوئے جھنڈے والے لشکر کی قیادت نہ کرے۔ اس وقت تک وہ غائب رہے گا اور لوگ اپنے میں ان کو نہ دیکھیں گے کوہ رضویٰ میں اس کے پاس پانی اور شہد موجود ہے۔"

شیعوں میں ابوکریب وہ پہلا شخص ہے جو امام صاحب الزماں کے غائب ہو جانے کا قائل ہوا اور امام کا دشمنوں کے خوف سے چھپنا اور پھر عرصہ ظاہر ہونے کے عقیدہ کا بھی یہی موجد ہے۔ شیعوں کے تمام فرقوں نے امام مفقود کے بارے میں دل کی تسلی کے لئے یہ سبق اسی ابوکریب سے سیکھا ہے۔

(۲) **فرقہ اسحاقیہ** ۔ یہ فرقہ اسحاق بن عمر کے ساتھیوں پر مشتمل ہے یہ لوگ جناب محمد بن الحنفیہ کی موت کے قائل ہیں اور

کہتے ہیں ان کی وفات کے بعد امامت ان کے بیٹے ابو ہاشمؒ کو منتقل ہو گئی۔ جو ان کی اولاد در اولاد منتقل ہوئی۔ کیونکہ ہر امام اپنے بیٹے کے لئے وصیت کر جاتا تھا۔

(۳) فرقہ حرمیہ۔ یہ فرقہ کندیہ بھی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ عبداللہ بن حرب کندی کے پیرو ہیں۔ یہ جناب ابو ہاشم رہ کے بعد عبداللہ بن حرب کو امام مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابو ہاشم رہ نے اس کے حق میں وصیت فرمادی تھی۔

(۴) فرقہ عباسیہ۔ اس فرقہ کے لوگ علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو جناب ابو ہاشم کی وصیت کی بنا پر امام مانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے منتقل ہوتی ہوئی منصور عباسی تک پہنچی ہے۔

(۵) فرقہ طیاریہ۔ ان کا کہنا ہے کہ بمطابق وصیت جناب ابو ہاشم رہ جناب عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابو طالب امام ہوئے۔

(۶) فرقہ مختاریہ۔ اس گروہ کے لوگ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت کے بارے میں کیسانیہ سے اختلاف رائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے امامت پائی اور ان کے بعد حضرت محمد بن الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے۔ اس اختلاف کا سبب پہلے بیان ہو چکا ہے۔

زیدیہ اور اس کے فرقے | اس فرقہ کے اصحاب اپنے آپ کو جناب زید بن علی بن الحسین بن علی رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر اختلاف سے یہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ اور نو فرقوں میں بٹ گئے، جن کا بیان یوں ہے۔

(۱) خالص زیدیئے۔ یہ حضرت زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ کے" اصحاب ہیں جنہوں نے اولاد عبدالملک بن مروان پر لشکر کشی کرتے وقت آپ سے بیعت کی، یہ اصول مذہب اور کچھ فروعات کی روایت جناب زید سے کرتے ہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر تبریٰ نہیں کرتے۔ بلکہ سب کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں اور اسی تبرا نہ کرنے پر مصدقہ روایات حضرت زید سے نقل کرتے ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ گو امامت کا حق حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو پہنچتا تھا مگر آپ نے جناب شیخین و ذی النورین رضی اللہ عنہم کے بارے میں خود اپنے حق سے دست برداری فرمائی تھی۔

یہ اس کے بھی قائل ہیں کہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت درست تھی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے راضی تھے اور معصوم کبھی غلط اور باطل پر راضی نہیں ہوتا۔ غرض تمام مسائل امامت پر ان کا مذہب اہل سنت کے مذہب سے ملتا جلتا ہے۔ اختلاف صرف اتنا ہے کہ یہ امام کے لئے فاطمی ہونے کو شرط قرار دیتے ہیں اور اس کے سپرد کرنے سے کسی دوسرے کو امام مانتے ہیں۔ گویا شیعان اولیٰ کا فرقہ ثانیہ اس فرقہ کی اصل ہے لیکن ان کے پچھلے لوگوں نے معتزلہ اور دوسرے شیعوں کے میل جول اور آخر میں آکر اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اور اصل مذہب سے بہت دور جا پڑے: کہا جاتا ہے کہ جناب امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید کی امامت سے متفق تھے۔ ان کے خروج کو درست جانتے تھے اور لوگوں کو ان کی رفاقت کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ اسی لئے زیدیئے فروع میں مذہب حنفیہ سے متفق ہیں مگر اصول میں معتزلہ کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) فرقہ جارودیہ۔ یہ گروہ ابوالجارود زیاد بن ابی زیاد کے دوستوں کا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بدلیل وصف، نہ بدلیل تعین نام حضرت علی رضی اللہ عنہ امام تھے۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے چونکہ ان کی اقتدا نہ

نہیں کی اس لئے ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد بالترتیب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو امام مانتے ہیں۔ اور ان کی امامت کے بعد انکی اولاد میں امامت شوریٰ کے معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان میں جو تلوار تھام کر اٹھ کھڑا ہو اور وہ عالم و شجاع بھی ہو وہی امام وقت ہے۔ چنانچہ زید بن علی رح اور یحیٰی بن زید کو بھی امام مانتے ہیں۔ البتہ امام منتظر کے بارے میں ان میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں وہ محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن رح ہیں جو عہد منصور میں مدعی امامت ہوئے۔ اور مقتول ہوتے ان کے اعتقاد میں یہ اب بھی زندہ ہیں مقتول نہیں ہوئے۔

بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ وہ محمد بن حسن طالقانی ہیں جو معتصم کے عہد میں پکڑے گئے قتال کیا اور قید ہوئے اور حالت اسیری میں ہی وفات پائی۔ مگر یہ ان کی وفات کے منکر ہیں۔

ان کی ایک اور جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ یحیٰی بن عمر رح ہیں جو جناب زید بن علی بن حسین کے پوتوں میں سے ہیں جن کو صاحب الکوفہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مستعین کے عہد میں ہوئے، قتال کیا اور پھر مقتول ہوئے۔ مگر یہ جماعت ان کے قتل کی بھی منکر ہے۔

(۳) فرقہ جریریہ۔ اس فرقہ کو سلیمانیہ بھی کہتے ہیں، یہ سلیمان بن جریر کے پیرو کاروں کی جماعت ہے یہ بھی امامت شوریٰ کے معتقد ہیں اور کہتے ہیں کہ دو نیک بخت مسلمانوں کی رضا مندی سے بھی امامت درست تسلیم کر لی جاتی ہے حضرت ابوبکر و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت کو تو مانتے ہیں مگر ان سے بیعت کرنے والوں کو خطا کار کہتے ہیں اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ان حضرات کی بیعت کیوں کی، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کو کافر بتاتے ہیں۔

(۴) فرقہ تبریہ۔ اس کا لقب تومیہ بھی مشہور ہے۔ یہ مغیرہ بن سعد جس کا لقب تبر تھا کے ساتھیوں کا گروہ ہے یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت خطا پر مبنی نہیں تھی کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر سکوت فرمایا تھا اور جس بات پر معصوم سکوت کرے حق ہوتی ہے، البتہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی امامت تسلیم کرنے میں ان کو تامل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رضا مندی و سکوت اس معاملہ میں حسب دلخواہ ثابت نہیں۔ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیعت کے وقت سے امام مانتے ہیں۔

(۵) فرقہ نعیمیہ۔ یہ نعیم بن الیمان کے دوستوں کا گروہ ہے، ان کا اور تبریہ کا مذہبی مسلک ایک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں اور ان پر تبریٰ بھی کرتے ہیں۔ باقی صحابہ کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

(۶) فرقہ دکینیہ۔ جو فضل بن دکین کی طرف منسوب ہے ان کا مذہب جارودیہ سے ملتا ہے فرق یہ ہے کہ یہ حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہم کو کافر کہتے ہیں اور باقی اصحاب رسول کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

(۷) فرقہ خشبیہ۔ یہ خلف بن عبد الصمد کے ساتھیوں کا گروہ ہے۔ یہ اولاد فاطمہ میں امامت شوریٰ کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کوئی غیر مستحق جامۂ امامت زیب بر کرے تو اس کی مخالفت واجب ہے ان کو خشبیہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اپنے وقت کے بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو تیر و تلوار سے مسلح ہونے کے بجائے لاٹھی اور ڈنڈے ان کا ہتھیار تھے اور لغت عرب میں خشب لکڑی کو کہتے ہیں۔

(۸) فرقہ یعقوبیہ ۔ یہ یعقوب کے ساتھیوں کی ٹولی ہے ۔ یہ رجعت کے قائل ہیں، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی امامت کو نہیں مانتے بلکہ ہر دو حضرات گرامی پر تبرّیٰ بازی کرتے ہیں۔

(۹) فرقہ صالحیہ ۔ جو حسین بن صالح کی طرف منسوب ہے ۔ یہ بھی اولاد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں امامت شوریٰ کے قائل ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ فاطمیوں میں سے جو بھی صفات علم شجاعت اور سخاوت سے متصف ہو کر ابھرے وہ امام ہے ان کے اور زیدیوں کے نزدیک ایک زمانہ میں ایک ملک میں بیک وقت کئی اماموں کا ہونا ممکن ہے ۔

امامیہ ۔ اور اس کے فرقے | اب رہا فرقہ امامیہ تو ان کے مذہب کا دار و مدار اور ان کے تمام فرقوں کا مشترکہ عقیدہ یہ ہے کہ زمان تکلیفِ شرع ائمہ فاطمیہ سے کبھی خالی نہیں رہتا ۔ اس ایک فرقہ سے انتالیس فرقوں نے جنم لیا ۔ جن کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو :

(۱) فرقہ حسنیہ ۔ اس فرقہ کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں ان کے بعد ان کے بیٹے حسن مثنیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو جن کو ضامن آل محمد بھی کہتے ہیں ۔ پھر ان کے بعد ان کے صاحبزادے جناب عبداللہ کو امام تسلیم کرتے ہیں اور وہ تنازع اور رد و کد جو ان کے اور جناب جعفر صادق کے درمیان ہوا اور جس کا حوالہ کتب اثنا عشریہ میں موجود و مذکور ہے اور اس کو ملا محمد رفیع واعظ نے ابواب الجنان میں کلینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے ۔

ان عبداللہ کے بعد انکے بیٹے محمد نفس زکیہ کو، پھر ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کو امام مانتے ہیں ۔ یہ دونوں بھائی منصور دوانیقی کے زمانہ میں نکلے، لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی لوگوں کی کافی جمعیت نے ساتھ دیا بالآخر جنگ و جدل اور میدان کارزار گرم ہوا مگر امرائے منصور کے ہاتھوں دونوں بھائی قتل ہو گئے ۔

(۲) فرقہ نفسیہ ۔ یہ بھی حسنیہ ہی کا ایک فرقہ ہے جو کہتا ہے کہ نفس زکیہ قتل نہیں ہوئے بلکہ غائب اور چھپے ہوئے ہیں چند روز بعد پھر ظہور فرمائیں گے ۔

(۳) فرقہ حکمیہ ۔ اس کا نام ہشامیہ بھی ہے ۔ کیونکہ یہ اصحاب ہشام بن حکم پر مشتمل ہے ان کا کہنا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بعد امامت حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد میں آئی ۔ اور اس سلسلہ امامت کو بالترتیب حضرت جعفرؒ تک چلاتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں وہ جسم صوری رکھنے کے قائل ہیں گویا وہ اپنے معبود کو مجسم شکل میں مانتے ہیں جو طول و عرض و عمق ہر سہ اطراف تو برابر رکھتا ہے ۔ مگر ان ظاہری اجسام میں سے کسی صورت سے مشابہ نہیں ۔

(۴) فرقہ سالمیہ ۔ اس فرقہ کا نام جوالقیہ بھی ہے ۔ کیونکہ یہ ہشام بن سالم جوالیقی کے ساتھیوں پر مشتمل ہے امامت اور اللہ تعالیٰ کی جسمیت کے بارے میں ان کے عقائد بھی فرقہ حکمیہ سے ملتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کو بصورت انسانی مانتے ہیں ۔

(۵) فرقہ شیطانیہ ۔ اس فرقہ کا ایک نام نعمانیہ بھی ہے کیونکہ یہ محمد بن نعمان صیرفی جو کہ شیطان الطاق کے لقب سے مشہور ہے ماننے والوں کا گروہ ہے ۔ یہ امامت کا سلسلہ جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ تک چلاتے ہیں، اور خدا تعالیٰ کو مجسم مان کر اس کے اعضاء و جوارح ثابت کرتے ہیں ۔

(۶) فرقہ زراریہ ۔ یہ فرقہ زرارہ بن اعین کوفی کے اصحاب پر مشتمل ہے ۔ ان کے نزدیک امامت کا سلسلہ حضرت جعفرؒ تک آتا ہے یہ صفات الٰہی کو حادث مانتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نہ حیات رکھتا تھا نہ علم نہ قدرت نہ

سمیع وبصیر۔
(۷) فرقہ یونسیہ۔ یہ یونس بن عبد الرحمن قمی کا گروہ ہے، یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔
(۸) فرقہ بدائیہ۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعض باتوں کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے ارادہ پہ نادم ہوتا ہے کہ ایسا ارادہ کرنا خلاف مصلحت تھا۔ ہر سہ خلفاء رضوان اللہ علیہم کی خلافت اور ان کے مناقب و محاسن پہ اسی خیال کو منطبق کرتے ہیں۔
(۹) فرقہ مفوضہ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی پیدائش کا معاملہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو سونپ رکھا ہے لہذا دنیا اور اس کی مخلوقات سب کی سب آنحضرت کی پیدا کردہ ہیں۔
ایک گروہ انہیں میں سے اس خیال کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چسپاں کرتا ہے۔
اور ایک تیسرا طبقہ ہر دو پر!
مذکورہ بالا میں سے سات فرقے غلاۃ امامیہ کے ہیں یہ باتفاق کافر ہیں۔ ان سب کا مشترک عقیدہ ائمہ ستہ کی امامت ہے۔
(۱۰) فرقہ باقریہ۔ یہ فرقہ حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حی لایموت کا عقیدہ رکھتا ہے۔ اور ان کو امام منتظر مانتا ہے۔
(۱۱) فرقہ حاضریہ۔ ان کا کہنا ہے کہ امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے بیٹے زکریا امام ہوئے جو اب حاضر پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت تک چھپے رہیں گے تاآنکہ ان کو غیب سے خروج کا حکم نہ ملے۔
(۱۲) فرقہ ناوسیہ۔ اصحاب عبد اللہ بن ناوس کا یہ فرقہ کہتا ہے کہ امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ زندہ ہیں مگر پردۂ غیب میں ہیں۔ وہی مہدی موعود ہیں اور وہی قائم منتظر۔ ان میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ بالکلیہ غائب نہیں ان کے دوست کبھی ان کو خلوت و تنہائی میں دیکھ بھی لیتے ہیں۔
(۱۳) فرقہ عماریہ۔ یہ اصحاب عمار ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ مر چکے ہیں اور ان کے بعد ان کے بیٹے محمد امام ہیں۔
اسماعیلی۔ اور ان کے فرقے (اسمٰعیلی بھی اگرچہ امامیہ میں شامل ہیں مگر الگ شاخ ہے اس لئے ان کے فرقوں کا علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے) یہ فرقے جن کی تعداد آٹھ بلکہ دس ہے۔ ان کا مشترک عقیدہ یہ ہے کہ خود جناب جعفرؓ کے اس قول صریح یعنی اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِی الْاَکْبَرِ مَا لَمْ یَکُنْ بِہٖ عَاھَۃٌ (یہ امامت بڑے بیٹے میں ہی رہے گی۔ تاآنکہ اس میں کوئی عیب نہ ہو) کے مطابق بڑے بیٹے اسمٰعیل امام ہیں۔
علاوہ ازیں حضرت جعفر کی اولاد میں سب سے زائد شریف النفس ہیں کیونکہ ان کی ماں فاطمہ بن حسن بن علی کی بیٹی ہیں۔
(۱) فرقہ مبارکیہ۔ یہ فرقہ اسی مبارک کے ساتھیوں کا ہے جس کا کچھ حال پہلے بیان ہو چکا ہے یہ لوگ جناب اسمٰعیل کے بعد ان کے بیٹے محمد کو امام مانتے ہیں اور ان کو خاتم الائمہ قائم منتظر اور مہدی موعود یقین کرتے ہیں۔

(۲) **فرقہ باطنیہ۔** یہ جناب اسمٰعیل رح کے بعد ان کے قول سابق کی وجہ سے جو بعد میں آ تا گیا امام ہوتا گیا کے قائل ہیں وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ عمل باطن کتاب پر واجب ہے نہ کہ ظاہر پر۔

(۳) **فرقہ قرمطیہ۔** اس کے متعلق اہل لغت بہت مختلف الخیال ہیں بعض کہتے ہیں کہ قرمط مبارک مذکورہ کا نام یا لقب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ نہیں یہ کسی اور شخص کا نام ہے، جو کوفہ کے مضافات میں سے کسی جگہ کا رہنے والا تھا۔ اور مذہب قرمطیہ کا بانی تھا۔ بعض کے نزدیک اس کا نام حمدان بن قرمط ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ واسط کے ایک گاؤں کا نام ہے، حمدان یہاں کا رہنے والا تھا تو وہ قرمطی ہوا اور اس کے متبعین قرامطہ کہلائے۔ بہر حال یہ کوئی بھی ہوں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اسمٰعیل بن جعفر رح خاتم الائمہ ہیں۔ اور رجی لا یموت! محرمات شرعیہ کو یہ لوگ جائز سمجھتے ہیں۔

(۴) **فرقہ شمطیہ۔** یہ یحییٰ بن ابی شمط کا فرقہ ہے۔ ان کا قول ہے کہ جناب جعفر صادق رح کے بعد امامت اس ترتیب سے ان کے بیٹوں تک پہنچی۔ (۱) اسمٰعیل رح (۲) محمد رح (۳) موسیٰ کاظم رح (۴) عبداللہ افطح اور (۵) اسحاق رحمہم اللہ۔

(۵) **فرقہ میمونیہ۔** اس میں عبداللہ بن میمون اقداح اہوازی کے ساتھی شامل ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ظاہر پر عمل حرام ہے اور یہ قیامت کے بھی منکر ہیں۔

(۶) **فرقہ خلفیہ۔** یہ کہتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا دیگر اعمال کتاب و احادیث میں جہاں مذکور ہیں وہاں ان کے لغوی معنے مراد ہیں اصطلاحی نہیں۔ یوم آخرت اور جنت و دوزخ کے یہ بھی منکر ہیں۔

(۷) **برقعیہ۔** یہ محمد بن علی برقعی کے ساتھیوں کا فرقہ ہے۔ یہ احکام شرعیہ کا انکار کرتے ہیں۔ نصوص میں تاویل کرتے ہیں۔ بعض انبیاء کی نبوت کو بھی نہیں مانتے بلکہ ان پر لعنت کو واجب مانتے ہیں۔

(۸) **فرقہ جنابیہ۔** یہ ابوطاہر جنابی کے پیروکاروں کا گروہ ہے۔ وہ اس مذہب میں اور بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ قیامت و احکام شرعیہ کے منکر ہی نہیں ان پر عمل کرنے والوں کو واجب القتل سمجھتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے حجاج بیت اللہ الحرام کو قتل کیا، حجر اسود کو کھود کر لے گئے۔ تاکہ لوگ بدعقیدہ ہو کر خانہ کعبہ کا قصد نہ کریں اور اس کا طواف چھوڑ دیں۔

مذکورہ فرقوں میں سے شمطیہ، میمونیہ، خلفیہ، برقعیہ اور جنابیہ قرامطہ میں داخل ہیں اور ان ہی میں ان کا شمار ہے۔ اس لئے اسمٰعیلیہ فرقوں کو آٹھ بتایا ہے ورنہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ چنانچہ اسمٰعیلی اصول کی بناء پر نواں فرقہ سبعیہ ہے۔

(۹) **فرقہ سبعیہ۔** ان کا قول ہے کہ وہ انبیاء جو شریعت لائے اور رسول ہیں ان کی تعداد سات ہے۔ آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، محمد و مہدی (علیہم السلام)

اور ہر دو رسولوں کے درمیان سات اور دوسرے آدمی ایسے ہوتے ہیں جو سابق شریعت کو آنے والی شریعت تک باقی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسمٰعیل بن جعفر رح ان ہی سات آدمیوں میں سے ایک تھے کہ انہوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امام مہدی رح کے درمیان شریعت کو باقی رکھا۔

اور یہ بھی ان کا قول ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے سات آدمیوں کا ہونا ضروری ہے جو اقتداء کے قابل ہوں۔

(۱۰) **فرقہ مہدویہ۔** یہ اصول اسمٰعیلیہ پر ایک فرقہ ہے۔ یہ فرقہ ملک کے طول و عرض میں کافی پھیلا ان میں صاحبان تصنیف

و تالیف اہل علم بھی گذرے ہیں اور ملک مغرب کے سلاطین و ملوک بھی، اس مذہب کے ماننے والوں میں شامل ہیں۔ گویا تسلط و اقتدار اس فرقہ کے حصہ میں آیا۔ امامت کا سلسلہ اس طرح مانتے ہیں۔ اسمٰعیلؒ کے بعد ان کے بیٹے محمد وصی پھر ان کے بیٹے احمد وفی، ان کے بعد ان کے بیٹے محمد تقی، پھر ان کے بیٹے عبداللہ رضی پھر ان کے بیٹے ابوالقاسم عبداللہ پھر ان کے بیٹے محمد ملقب۔ محمد مہدی ان کے بعد ان کے بیٹے احمد قائم بامراللہ، پھر اسمٰعیل بن احمد منصور بقوۃ اللہ پھر معد بن اسمٰعیل معز الدین اللہ، ان کے بعد ابو منصور نزار بن معد عزیز باللہ پھر ابو علی منصور بن نزار حاکم بامراللہ پھر ابوالحسن علی بن منصور ظاہر الدین اللہ پھر معد بن علی بن منصور مستنصر باللہ۔

کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں باپ اپنے اپنے بیٹوں کے لیئے وصیت کرتے گئے۔ جب امامت مہدی کا عہد آیا تو اس نے اپنا حکم ملک مغرب میں نافذ کیا اور وہاں کا بادشاہ بننا چاہا اسوقت بے شمار مخلوق اس کے زیر اثر تھی۔ اس نے اول بلاد افریقہ پر اقتدار قائم کیا پھر رفتہ رفتہ بلاد مصر پر قبضہ جما لیا۔ مغرب اور مصر اس کی اولاد کے قبضہ میں رہے۔ بلکہ اس کی اولاد میں سے کچھ نے بلاد شام پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا اہل یمن نے بھی اس مذہب پر لبیک کہا اور یہی مذہب اختیار کیا۔

مستنصر کے بعد امام کون ہو؟ اس مسئلہ پر ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مستنصر نے پہلے تو اپنے بھائی نزار کی امامت کے احکامات جاری کیئے مگر کچھ عرصہ بعد اپنے بیٹے ابوالقاسم احمد مستعلی باللہ کے امامت کا اعلان کر دیا۔ جن لوگوں نے حکم ثانی کو اول کا ناسخ قرار دے کر مستعلی کو امام مانا ان کو مستعلویہ کہتے ہیں اور مستعلی کے بعد اس کے بیٹے منصور بن احمد آمر باحکام باللہ کو امام مانتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے بھائی عبدالحمید ابو میمون بن احمد حافظ الدین اللہ کو اس کے بعد اس کے بیٹے المنصور محمد بن عبدالحمید ظاہر بامراللہ کو اس کے بعد اس کے بیٹے ابوالقاسم علی بن محمد فائز بنصر اللہ اور پھر اس کے بیٹے محمد بن علی عاضد لدین اللہ کو امام تسلیم کرتے ہیں۔

جب امامت پر عاضد فائز تھا تو امراء و ملوک شام نے اس پر چڑھائی کی اور اس کو گرفتار کر کے حوالہ زندان کر دیا اور وہیں قید خانہ میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اب مہدی کی اولاد میں امامت کا کوئی دعویدار باقی نہ رہا۔

ادھر دوسرے گروہ نے حکم اول کی موجودگی میں دوسرے حکم کو لغو اور مہمل قرار دے کر نظر انداز کر دیا اور نزار کو امام تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ہادی کو پھر اس کے بیٹے حسن کو! مگر ان کی یہ سب روایتیں جھوٹی ہیں، مورخین نے اس معاملہ میں کہا ہے کہ احمد مستعلی جب بادشاہ ہوا تو اس نے نزار اور اس کے دو چھوٹے بیٹوں کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور ان تینوں کی موت جیل ہی میں واقع ہوئی۔ ان کی نسل میں کوئی نہیں رہا۔

فرقہ نزاریہ کو صباحیہ و حمیریہ بھی کہتے ہیں جس کی وجہ تسمیہ ابھی معلوم ہو گی۔ نیز نزاریہ کو ہی مسقطیہ اور سقطیہ کہتے ہیں۔ اس لیئے کہ ان کے مذہب میں امام فروعی احکامات کا مکلف نہیں اور اسے حق پہنچتا ہے کہ کچھ یا سب کی سب تکلیفات شرعیہ لوگوں سے ساقط کر دے۔

اور ان سے وابستہ لغویات میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے کہ حسن بن صباح حمیری مصری آیا اور نزار کی جو عورتیں اس کے بھتیجے کی قید میں تھیں ان سے ملا۔ ان سے ایک چھوٹا بچہ لے لیا اور ظاہر یہ کیا کہ یہ نزار کا بیٹا ہے۔ اس بچے کو رے لے گیا اور اسے ہادی کے نام سے شہرت دی اور اسی کے نام سے لوگوں کو دعوت دینے لگا۔ جب اس کے پاس اچھی خاصی جمعیت اکٹھی ہو گئی تو قلعہ الموت اور دوسرے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اپنے اہل و عیال مال و اسباب اور ہادی کو

قلعہ الموت میں رکھا۔ جب موت کا وقت آیا تو ہادی اس وقت بچہ ہی تھا، اس وقت اسنے ابن کیا نامی ایک شخص کو اپنا نائب بنایا۔

اور ہادی کی تربیت اور اس کے اکرام و توقیر کی بڑے زوردار طریقہ پر وصیت کی۔ جب ابن کیا بھی مرنے لگا تو اپنے بیٹے محمد کو اپنا نائب مقرر کیا اور حسن کی طرح اس نے بھی ہادی کی خدمت و توقیر کی زوردار وصیت کی۔

ایک روز ہادی پر شہوت غالب ہوئی اور اس نے ابن کیا کی بیوی کو بلا کر اپنی خواہش پوری کی، اس لئے کہ ان کے گمان میں امام کے لئے تمام چیزیں حلال ہیں اور اس کو حق حاصل ہے کہ جو چاہے کرے، گویا لَایُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ اسی کی شان ہے۔

اتفاقاً اس صحبت سے ابن کیا کی بیوی حاملہ ہوئی، اور ایک بچہ جنا جس کا نام حسن رکھا۔ اس دوران ہادی کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ ابن کیا کی بیوی نے بتایا۔ جس پر ہادی کے اکثر متبعین نے اعتبار کر لیا۔ مگر بعض لوگوں نے اسے مشکوک قرار دیا۔ اور کہا کہ ہادی کی صحبت شدہ عورت کوئی اور تھی۔ ابن کیا کی بیوی بھی اسی زمانہ میں حاملہ ہوئی اور اتفاقاً دونوں کے ہاں ولادت ایک ہی وقت ہوئی۔ ابن کیا کی بیوی نے چالاکی سے اپنے بیٹے کو ہادی کے بیٹے سے بدل لیا اور اس کا نام حسن رکھا۔

بہرحال حقیقت جو بھی ہو ابن کیا کے مرنے کے بعد حسن نے خود کو ہادی کا بیٹا اور نزار کی اولاد ظاہر کیا۔ اور امامت کا مدعی ہوا۔ یہ حسن نہایت زیرک، بلیغ الکلام اور حاضر جواب تھا۔ نہایت خوش گو خطیب تھا۔ خطبے بہت دیتا تھا۔ اپنے خطبوں میں اس مضمون پر بتاکید و تکرار بہت زور دیتا تھا کہ امام کو یہ حق ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ بلکہ اسے تو یہ بھی حق ہے کہ شریعت کا جو حکم چاہے لوگوں سے اسے ساقط کر دے۔

اپنے متعلق کہتا تھا کہ مجھے غیب سے یہ امر الٰہی ہوا ہے کہ تم لوگوں کو احکام شرعیہ سے آزاد کر دوں۔ اور تمام حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دوں، تم جو چاہو کرو، مگر آپس میں متحد رہو، جدال و قتال نہ کرو اور امام کی اطاعت نہ چھوڑو۔
اس کے بعد اس کا بیٹا محمد، پھر پوتا ملا دالدین محمد بن جلال الدین حسن محمد ابن حسن اسی نہج اور روش پر چلتے رہے مگر جلال الدین حسن جو محمد بن حسن کا صلبی بیٹا تھا۔ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے منکر و متنفر ہو کر سچا اور پکا مسلمان بن گیا۔

اس کے حسن اسلام کا حال تاریخ کی کتابوں میں مشہور و معروف انداز میں درج کیا ہے۔ اس نے تو یہاں تک کیا کہ باپ دادا کے اس کتب خانہ کو جو زندقہ و الحاد اور کفر و کذب کے مخطوطوں اور کتابوں سے بھرا ہوا تھا نذر آتش کر دیا۔ یہ اپنے اسلاف پر بڑے واضح اور پرزور انداز میں لعن و طعن کرتا تھا اس نے تو گویا باطنی فرقہ کی جڑ کھود کر رکھ دی تھی۔ اپنے پیروکاروں کو اچھی باتوں کا حکم دیتا بری باتوں سے روکتا تھا، قلعوں میں شاندار مساجد بنوائیں، ان کو آباد کرایا۔ اہل بغداد کو اپنے حسن اسلام سے واقف کیا۔ اپنی ماں کو تحفے تحائف دیکر خانہ کعبہ کے حج کو روانہ کیا۔

لیکن اس کا بیٹا اپنے باپ کی روش کو چھوڑ کر اپنے ملحد و زندیق اسلاف کے رویہ پر چلا، اور اس کا بیٹا جس کا لقب رکن الدین تھا وہ بھی ملحد ہی رہا۔ اسی کے عہد میں تاتاری ترک یعنی چنگیزیوں نے اس کے ملک کو برباد اور اس کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ چند روز تو قلعہ الموت میں پناہ گزیں رہا۔ آخر کار ان کی اطاعت قبول کر کے ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ اس کو ساتھ لے کر اپنے وطن روانہ ہوئے مگر یہ راستہ ہی میں مرگیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا جو قلعہ الموت

ہی میں رہ گیا تھا۔ امامت کا مدعی ہوا اور جدید الدولہ لقب اختیار کیا۔ جب تاتاری امراء کو اس کی خبر ہوئی تو اس کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی جس نے قلعہ تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے ساتھی ادھر اُدھر پراگندہ و منتشر ہو گئے اور یہ خود طبرستان کے کسی گاؤں میں مرکھپ گیا۔ اس کے بعد پھر کوئی مدعی امامت نہ اُٹھا۔

گویا اسمٰعیلی فرقوں میں باطنیہ، قرامطہ، سبعیہ اور حمیریہ ملحد ہیں، مہدویہ بظاہر شرع کے معتقد ہیں۔ ان فرقوں میں حمیریہ زیادہ شدید الکفر ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ اسماعیلیہ کے دس فرقے ہیں، اور یہ امامیہ کے تیرہ فرقوں کا تذکرہ ہوا دونوں مل کر تعداد تیئیس ہوگئی، باقی فرقوں کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(۲۴) فرقہ افطحیہ۔ اس فرقہ کو عمائیہ بھی کہتے ہیں اس لئے کہ یہ عبدالرحمٰن بن عمار کے پیرو ہیں۔ یہ گروہ عبداللہ بن جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کی امامت کا قائل ہے اس کا لقب افطح تھا کیونکہ اس کے پاؤں چوڑے تھے اور یہ اسمٰعیل بن جعفرؒ کے حقیقی بھائی تھے یہ لوگ ان کی موت اور پھر ظاہر ہونے کے معتقد ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی کہ نسل میں امامت کا سلسلہ چلتا۔

(۲۵) فرقہ اسحاقیہ۔ یہ لوگ اسحاق بن جعفر رحمہ اللہ علیہ کی امامت کے معتقد ہیں، یہ واقعی علم و تقویٰ اور پرہیز گاری میں اپنے عالی قدر پدر بزرگوار کے بہت مشابہ تھے۔

چنانچہ سفیان ابن عیینہ اور دیگر ثقہ محدثین نے ان سے روایات لی ہیں۔

(۲۶) فرقہ قطعیہ۔ یہ مفضل بن عمر کا گروہ ہے اس لئے مفضلیہ بھی کہلاتے ہیں یہ جناب موسیٰ کاظمؒ کی امامت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کی وفات پر امامت کے سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔

(۲۷) فرقہ موسویہ۔ یہ لوگ جناب موسیٰ کاظمؒ کی موت و حیات میں متردد اور مشکوک الخیال ہیں اس لئے ان کی امامت پر توقف کرتے ہیں اور سلسلۂ امامت ان کے آگے نہیں چلاتے۔

(۲۸) فرقہ ممطوریہ۔ یہ جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ کی حیات کے قائل ہیں اور ان کو مہدی موعود اور منتظر مانتے ہیں اپنے عقیدہ کے ثبوت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے دلیل لاتے ہیں سَابِعُهُمْ قَائِمُهُمْ سَمِيُّ صَاحِبِ التَّوْرَاةِ۔ یعنی ساتواں امام خروج کرے گا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم نام ہوگا۔

ان کو ممطوریہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے فرقہ قطعیہ سے مناظرہ کیا۔ قطعیہ کے رئیس یونس بن عبدالرحمٰن نے ان سے کہا کہ تم ہمارے نزدیک بھیگے ہوئے کتوں سے بھی زیادہ حقیر ہو۔ یہ فقرہ ان پر ایسا چسپاں ہوا کہ اس کے بعد یہ ان کا لقب ہی بن گیا جو آج تک باقی ہے۔

(۲۹) فرقہ رجعیہ۔ اس فرقہ کے لوگ جناب موسیٰ کاظمؒ کی موت کے تو قائل ہیں مگر دوبارہ ظہور کے منتظر ہیں۔

مذکورہ بالا یہ تینوں فرقے واقفیہ بھی کہلاتے ہیں کیونکہ یہ تینوں امامت کو جناب موسیٰ کاظمؒ پر ختم مانتے ہیں۔

(۳۰) فرقہ احمدیہ۔ یہ جناب موسیٰ کاظمؒ کی وفات کے بعد ان کے لڑکے احمد بن موسیٰ کو امام مانتے ہیں۔

(۳۱) فرقہ امامیہ۔ یہ گویا اس فرقہ کے اصل اصول ہیں۔ لفظ امامیہ جب بغیر کسی قید کے بولا جائے تو یہی فرقہ مراد ہوتا ہے۔ یہ اثنا عشریہ ہیں ان کے نزدیک سلسلہ امامت اس طرح ہے۔ پہلے علی موسیٰ الرضاؒ ان کے بعد ان کے بیٹے

محمد تقی جو الجواد کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کے بعد ان کے بیٹے علی نقی معروف بہادی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حسن عسکری ان کے بعد ان کے بیٹے محمد مہدیؒ ان کو یہ قائم منتظر بھی مانتے ہیں اور ان کے خروج کے منتظر ہیں۔ پھر ان ہی کے وقت غیبت اور سن وسال میں مختلف الخیال ہو کر یہ چند فرقوں میں بٹ گئے۔ بلکہ بعض بعض ان کی موت اور رجعت کے بھی قائل ہیں ان فرقوں کو شامل کر کے گویا ان کی مجموعی تعداد انتالیس تک پہنچتی ہے۔

(۳۲) فرقہ جعفریہ ۔ یہ حسن عسکریؒ کے بعد جعفر بن علیؒ کی امامت کے قائل ہیں، جو ان کے بھائی تھے کہتے ہیں کہ حسن عسکریؒ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ یہ تولد مہدی کے بھی منکر ہیں۔

اسی بیان کے ذیل میں یہاں چند فائدے لائق تحریر ہیں ناظرین انہیں بغور ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا فائدہ : شیعہ کے لقب سے سب سے پہلے وہ انصار و مہاجرین ملقب ہوئے جو ہر پہلو سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی متابعت اور پیروی میں سرگرم رہے اور خلافت کے وقت آپ کے رفیق صحبت رہے۔ آپؓ کے مخالفین سے لڑتے رہے۔ آپ کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرتے رہے۔ دراصل مخلصین شیعہ یہی حضرات تھے، یہ لقب پہلے پہل ۳۷ھ میں روشناس ہوا۔ اس کے بعد تین سال بعد فرقہ تفضیلیہ وجود میں آیا۔ ابوالاسود دولی جو علم نحو کا موجد اور امام مانا جاتا ہے اسی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا وہ امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاگرد تھا۔ اور آپ ہی کے حکم اور تعلیم کے مطابق علم نحو کے مدون اور تالیف کرنے میں مشغول ہوا۔

ابوسعید یحییٰ بن یعمر عدوانی جو تابعی تھے۔ اسی فرقہ میں سے تھے اور عبداللہ بن سوید عدوی سے میل ملاقات رکھتے تھے۔ یہ قرأت، تفسیر، نحو اور لغات عرب کا بڑا عالم اور ماہر تھا۔ اس کا شمار بصرہ کے قراء میں ہوتا ہے اور نحو میں ابوالاسود مذکور کا شاگرد تھا۔

قاضی شمس الدین احمد بن خلکان۔ وفیات الاعیان میں بیان کرتے ہیں کہ یحییٰ بن یعمر شیعانِ اولیٰ کے اس فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جو اہل بیت کی تفضیل کے قائل تھے۔ بغیر اس بات کے کہ دیگر صاحبان فضل حضرات کی برائی میں ملوث ہو! یہ حضرات بھی اسی فرقہ سے متعلق تھے۔

(۱) سالم بن ابی حفصہ، جو امام محمد باقرؒ اور امام جعفر رحؒ سے حدیث کا راوی ہے۔

(۲) عبدالرزاق صاحب مصنف جو اہل سنت کے معروف و مشہور محدث ہیں۔

(۳) ابو یوسف یعقوب بن اسحاق، جو اصلاح المنطق کے مصنف ہیں۔ ان کو ہی ابن سکیت کہتے ہیں۔

اس کے بعد تبرائی شیعوں کا فرقہ وجود میں آیا۔ یہ بدبخت بڑے جلیل القدر صحابہ کرامؓ اور امہات المومنین رضوان اللہ علیہم اجمعین پر نہ صرف لعن وطعن کرتے تھے بلکہ گالیاں بھی دیتے تھے۔

یہ بیان شدہ ترتیب مذاہب کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ یہ سب فرقے امیرالمومنین کے عہد ہی میں عبداللہ بن سبا کے ورغلانے اور بہکانے سے وجود میں آچکے تھے۔

باقی کے معروف فرقوں کی سنین پیدائش حسب ذیل ہیں۔

کیسانیہ ۶۴ھ میں مختاریہ ۶۶ھ میں ہشامیہ ۱۰۰ھ میں زیدیہ ۱۱۲ھ میں جوالیقیہ اور شیطانیہ ۱۱۳ھ میں زرائیہ، مفوضیہ، بدائیہ، ناؤسیہ اور عمائیہ ۱۴۵ھ میں، اسماعیلیہ ۱۵۵ھ میں (اسماعیلیہ میں سے) مبارکیہ ۱۵۶ھ میں

(اور امامیہ میں سے) واقفیہ ۱۸۳ھ میں حسنیہ ۱۹۵ھ میں۔ اثنا عشری امامیہ ۲۵۵ھ میں (اسماعیلیہ میں سے) مہدویہ ۲۹۹ھ میں۔

اس فرقہ کے لوگ محمد بن عبداللہ بن عبیداللہ کے جن کا لقب ان کے خیال میں مہدی تھا۔ کی امامت کے قائل ہیں۔ یہ مہدی خود کو اسمٰعیل بن جعفر کی اولاد میں شمار کرتا تھا اور امامت کا مدعی تھا۔ سنہ مذکور میں اطراف مغرب میں اس نے خروج کیا اور ۳۰۰ھ میں افریقہ پر اقتدار حاصل کر لیا۔

یہ اپنا نسب یوں بیان کرتا تھا۔ محمد بن عبداللہ بن عبیداللہ بن قاسم بن احمد بن محمد بن اسمٰعیل بن جعفر۔ علماء نسب اس نسب کے بیان میں اسے دروغ گو قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اسمٰعیل بن جعفر اپنے والد سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور انہوں نے سوائے محمد کے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ یہ محمد اپنے دادا کے ساتھ بغداد گئے اور وہیں لاولد فوت ہوئے۔ شیعوں میں بھی سب کو اس نسب نامہ کی صحت سے انکار ہے۔

تو پھر اس کا حقیقی نسب کیا تھا؟ اس میں علمائے انساب کا اختلاف ہے، مغرب کے علمائے انساب کہتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن سالم بصری کی اولاد میں سے ہے۔ اور اس کا باپ بصرہ میں نان بائی تھا۔ اور عراق کے علمائے انساب کا کہنا ہے کہ وہ بمطابق بیان بالا عبداللہ بن میمون اقداح اہوازی کی نسل سے ہے۔

بہر حال مہدویہ کا عقیدہ یہ تھا کہ محمد بن عبداللہ مذکور مہدی موعود ہے۔ اس کے ثبوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے یہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔ عَلٰی رَأْسِ ثَلٰثِمِائَۃٍ تَطْلُعُ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِھَا (تیسری صدی کے اختتام پر سورج اپنے غروب ہونے کی سمت سے طلوع ہو گا) اور سورج سے مراد مہدی اور مغرب سے مراد ملک مغرب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیث اور مرادی معنی دونوں ہی ان کے من گھڑت ہیں۔

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسمٰعیلیوں کا اصل عقیدہ یہ ہے کہ شرع کے احکام کا انکار کیا جائے اور نظم دین کو درہم برہم کیا جائے۔ چنانچہ اس فرقہ مہدویہ کے ایک بادشاہ نے جو امام بھی تھا مصر میں یہ فرمان جاری کیا تھا کہ مجلس میں جب اس کا نام آئے تو لوگ سجدہ میں گر جائیں۔ وہ خدا سے ہمکلامی کا بھی دعویدار تھا اور علم غیب کا مدعی بھی! اگر اس کی بداعمالیاں اور بدفعلیاں دیکھنی ہوں تو کتب تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مہدویہ کفر و الحاد، کو دل میں چھپا کر، بظاہر پرہیزگاری، کثرت طاعت اور نفاذ احکام شرع میں بڑے سرگرم دکھائی دیتے اور زور دیتے تھے۔ تاکہ لوگوں کو اپنی طرف زیادہ سے زیادہ مائل رکھ کر فوجوں کے لئے نفری حاصل کرتے رہیں۔

یہی طرز عمل حمیریہ کا بھی تھا۔ کفر و الحاد کا برملا اظہار قرامطہ کی ایجاد ہے۔ یہ (قرامطہ) مقتدر عباسی کے خلاف مصروف پیکار ہوئے، بعض شہروں اور دیہات پر قبضہ کر لیا حج کے دنوں میں مکہ معظمہ پہنچے اور تین ہزار حاجیوں کو بیدردی سے شہید کیا۔ یہ واقعہ ۳۱۹ھ میں پیش آیا اس گروہ کا سردار ابو سعید جنابی قرمطی تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بھی باپ کے قدم بقدم چلا۔ بلکہ دو قدم آگے ہی رہا۔ اس نے بھی بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ حج کے دنوں میں مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، تمرد و سرکشی کا یہ عالم کہ گھوڑے پر سوار مسجد الحرام میں گیا، شراب کا پیالہ ہاتھ میں تھا وہاں شراب پیتا رہا اور حاجی اس کے سامنے اس کے حکم سے قتل کئے جاتے رہے۔

گستاخی اور پاجی پن کی انتہا کر دی کہ گھوڑے کو شتکارا اور عین مسجد الحرام میں پیشاب کرایا، فوجیوں کو حکم دے

کر حجر اسود اکھڑوایا۔ پہلے تو اسے کوفہ کے گھوڑوں پر لاد دیا۔ پھر اٹھوا کر اپنے قبضہ میں کر لیا، چنانچہ حجر اسود اس ملعون کے قبضہ میں رہا۔ عباسی خلیفہ مطیع لامر اللہ ابوالقاسم فضل بن المقتدر نے تیس ہزار اشرفیوں کے عوض اس سے خریدا۔ خریداری کے سودے کے وقت یہی ابوطاہر بن ابوسعید حجر اسود لے کر کوفہ کی مسجد میں آیا اور ایک ستون پر اس کو لٹکا دیا۔ شہر کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کیا اور ان کی موجودگی میں اسے خلیفہ کے وکیل کے حوالہ کیا۔ اس مجلس میں محدث ابن حکیم بھی موجود تھے۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی جس میں حجر اسود کی بعض علامات مذکور ہیں۔

يُحْشَرُ هٰذَا الْحَجَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَهٗ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ يَتَكَلَّمُ بِهٖ يَشْهَدُ لِمَنِ اسْتَلَمَهٗ بِحَقٍّ وَاِنَّهٗ حَجَرٌ يَطْفُو عَلَى الْمَاءِ وَلَا يَحْتَرِقُ بِالنَّارِ۔ (قیامت کے دن حجر اسود کے آنکھیں بھی ہوں گی جن سے وہ دیکھتا بھی ہوگا، اس کے زبان بھی ہوگی جس سے وہ بولتا ہوگا۔ جس شخص نے اس کا استلام کیا ہوگا۔ اس کے متعلق گواہی دے گا۔ یہ وہ پتھر ہے جو پانی پر تیرتا ہے اور آگ اسے جلا نہیں سکتی)

ابوطاہر نے اس کے یہ اوصاف سنے تو طنز و مذاق سے ہنسنے لگا۔ امتحان کے لئے آگ منگائی حجر اسود کو اس میں ڈالا مگر وہ نہ جلا۔ پھر پانی منگوا کر اس میں ڈالا تو وہ پانی پر تیرتا رہا۔ وہ بڑا حیران ہوا اور بے ساختہ کہنے لگا۔ آج مجھ پر اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس کی بیخ کنی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مگر ہٹ دھرمی دیکھئے کہ اس صریح اعتراف کے بعد بھی اپنے مذہب و عقیدہ سے دستکش نہیں ہوا اسی سے چمٹا رہا۔

مہدویہ میں کا فرقہ حمیریہ جس کو المومنیہ بھی کہتے ہیں۔ اور جس کا بیان اوپر آچکا ہے ۴۵۳ھ میں ظاہر ہوا اور ان کا فرقہ مستقلیہ بھی فتنہ تاتار شروع ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

دوسرا فائدہ ۔ جب شیعہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے، تو ہر فرقہ کا داعی مذہب، شہر شہر، ملک ملک پھیل گئے، تاکہ ملکی اور سیاسی اور ریاستی تسلط و غلبہ حاصل کرنے کے لئے اپنے متبعین کی تعداد بڑھائیں۔ اس سلسلہ میں ان کا باہم رابطہ قائم رہتا اور وہ اپنی اس جدوجہد میں صلاح مشورہ بھی کرتے رہتے! اپنے مذہب اور فرقہ کی ترویج اور لوگوں کو اپنی طرف بلانے کی جتنی کوشش اور سعی شیعی فرقوں نے کی کسی اور فرقہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد بعض خاص اشخاص کی امامت پر منحصر ہوتی تھی۔ اور امامت چونکہ ریاست کا ایک شعبہ ہے بلکہ اعلیٰ قسم کی ریاست ہے اس لئے ان کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے امام کے حالات کا زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کریں اور لوگوں کو ترغیب دے کر ان کا معتقد بنائیں تاکہ امامت ریاست و اقتدار کی شکل اختیار کر لے۔ بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان کا اصل مذہب ریاست سے کوئی خاص شغف نہیں رکھتا۔

شیعوں کے جن فرقوں کی تقدیر نے یاوری کی ان کو اقتدار و جاہ و ثروت حاصل ہو گئی اور بعض ناکامیوں کا داغ دل پر لئے رخصت ہوئے۔ پھر جن کو جاہ و ثروت حاصل ہوئی تو بعض کے ہاں دو تین پشت تک اس کا سلسلہ چلا۔ اور بعض دوسروں کے ہاں چار دن کی چاندنی ثابت ہوئی۔ اس لئے ان میں ہر فرقہ کا زمانہ وجود مختلف رہا۔

اہل تاریخ کے بیان کے مطابق بغداد میں ناؤسیہ فرقہ کی ۵۰۰ھ کے دوران بہت کثرت تھی۔ شیعوں کے دوسرے فرقے اکثر مصر، شام، عراقین، آذربائیجان، فارس اور خراسان میں پھیلے ہوئے تھے۔ جب تاتاری فتنہ نمودار ہوا تو یہ اپنے شہر چھوڑ کر دور دراز اطراف و جوانب میں جا پڑے اور وہاں کے شہریوں کے لئے مصیبت اور وبال جان

وا ایمان بن گئے، لوگ ان کے بہکانے میں آکر راہ راست سے بھٹک کر گمراہی میں جا پڑے۔ مگر فتنہ تاتار نے کسی کو نہ بخشا، ان کے اکثر فرقے بے نام و نشان اور نیست و نابود ہو گئے، سوائے چند غلاۃ اور باطنیہ کے، البتہ زیدیہ، امامیہ اثنا عشریہ اور مہدویہ کی خاصی تعداد بچ گئی۔

غلاۃ میں سب سے بڑا فرقہ سبائیہ کا ہے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہیں۔ اردبیل اور آذربائیجان کے کچھ شہروں میں یہ برائے نام موجود ہیں۔ ان کی عبادت صرف یہ ہے کہ سال بھر میں تین روزے رکھ لئے جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترکی کے شہر بغداد میں بھی کچھ موجود ہیں۔ ان کا سردار کہتا ہے کہ وہ یحییٰ بن زید بن علی بن حسین کی نسل سے ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس شہر کے سارے باشندے قدرتی طور پر بے داڑھی کے ہوتے ہیں۔ البتہ سردار لمبی داڑھی والا ہوتا ہے۔ زابلستان کے دیہات میں بھی ان کا کچھ پتہ چلتا ہے۔

غلاۃ کے دوسرے فرقوں میں سے مفضلیہ اور نصیریہ ہی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اللہ تعالیٰ کے حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان میں مفضلیہ کا زمانہ وجود کافی دراز ہوا اور وہ اب تک بلاد گنجہ میں موجود ہیں، اور نصیریہ بھی کہ ان کا زمانہ وجود بھی کافی دراز ہے اور وہ اب تک کوہستان خراسان میں اور کہیں کہیں خراسان کے شہروں میں بھی موجود ہیں، ان میں سے بعض محمد شاہ (غالباً رنگیلا) بادشاہ دہلی کے زمانہ میں ہندوستان بھی آئے تھے اور امیر خان کے گھر اترے تھے۔ چند معتبرین سے ان کی ملاقات بھی ہوئی، دوران ملاقات انہوں نے بتایا کہ کوہستان خراسان میں ابجیان نام کا ایک گاؤں ہے وہاں کے باشندے سب کے سب غلاۃ اور نصیریہ ہیں۔ اس گاؤں میں ان کا ایک امام ہے جو خود کو علوی کہتا ہے۔ خراسان کے ہر ایک شہر میں اپنا ایک نائب اور ایک واقعہ نویس بھیجتا ہے۔

ان کی اصطلاح میں امام کو اِلٰہ نائب کو رسول اور واقعہ نویس کو جبرئیل کہتے ہیں۔ ان کو مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ کسی عبادت سے واقف نہیں، سوائے اس کے کہ اپنے امام کو خمس ادا کرتے ہیں۔ ابجیان کے قرب و جوار کے دیہات میں بھی اسی مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ (یہ نصیری اور غلاۃ علوی اب پندرھویں صدی ہجری میں بھی عراق و شام میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ حکومت و اقتدار پر بھی آجکل ان کا قبضہ ہے۔ ۱۲ نعمانی)

ان کے لغو عقیدوں میں سے چند یہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی زمین کی رہائش سے اکتا جاتا ہے تو وہ ابر کو حکم دیتا ہے تو وہ سیڑھی کی طرح قائم ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر چڑھتا ہے اور آسمان پر پہنچ کر وہاں کی سیر کرتا ہے اور پھر زمین پر اتر آتا ہے۔ وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرستادہ ہیں۔

یہ قیامت کے منکر ہیں، اور اجسام و ابدان میں تناسخ ارواح کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ روحیں ہمیشہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اس انسان کے بدن کا نام ہے جو صاحب ثروت و نعمت ہو اور دوزخ اس انسان کے بدن کا نام ہے جو صاحب فقر و مسکنت ہو (یعنی بھوکا ننگا)

اور زیدیہ بلاد عرب میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں تک بعض شرفاء حسنیہ جو زیدی مذہب رکھتے تھے بلاد یمن پر مستقل ہو گئے۔ انہوں نے زیدیوں کو یمن میں بلا کر اکٹھا کر لیا۔ اور اب تک یہ وہیں جمع ہیں۔ یمن کا نصف علاقہ جو بلند اور کوہستانی علاقہ ہے اور نجد یمن کہلاتا ہے زیدیہ مذہب کے لوگوں سے آباد ہے اور دوسرے نصف یعنی

نشیبی اور ساحل علاقے میں شافعی المذہب لوگ سکونت پذیر ہیں۔

اور اسمٰعیلیہ فرقہ میں سے باطنیہ بعض بلاد خراسان، کوہستان بدخشان دریائے شور کے ساحلوں اور گجرات ہند میں موجود ہیں جن کو اہلِ خراسان کی اصطلاح میں میمن کہتے ہیں۔ چیچک میمنان جہاں سے عمدہ اور اچھے گھوڑے برآمد کئے جاتے ہیں۔ میمنوں سے آباد و معمور اور بھرا پڑا ہے۔

اسمٰعیلیہ فرقہ کی شاخ مہدویہ کی رسی بہت دراز ہوئی۔ اور ان کی طاقت و قوت بام عروج تک پہنچی۔ چنانچہ محمد بن عبداللہ کے حالات میں سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔

یہ شخص جس نے اپنا لقب مہدی رکھا سنہ ۲۹۶ھ میں بلاد مغرب میں اٹھا اور مقتدر عباسی کے امراء سے برسرپیکار ہوا جو ان اطراف کے صوبہ دار تھے۔ بالآخر ان پر قابو پا کر افریقہ پر قابض ہوا اور اپنا اقتدار اور قبضہ جما لیا۔ مصر و مغرب بھی مدت تک اس کی اولاد کے زیر نگیں رہے۔ رفتہ رفتہ یمن والے بھی ان کے مذہب کے حلقہ بگوش ہوئے۔

ان کی سلطنت و اقتدار کا دور از ابتدا تا انتہا دو سو ساٹھ برس ایک رفتار سے چلا تا آنکہ حسن صباح حمیری نے ۴۸۳ھ میں سر اٹھایا اور ان پر تسلط حاصل کر کے حصن الموت کو اپنا مستقر بنایا۔ اور حصن الموت سے باہر ایک صومعہ بنا کر ریاضات شاقہ میں مشغول ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کے تقوی و پرہیزگاری کو دیکھ کر دھوکہ کھا جائیں اور اس کے دام تزویر میں پھنس جائیں اور اس کا یہ مکر کامیاب رہا۔ اور قزوین، طبریہ اور کوہستان کے لوگ جوق در جوق اس کی عقیدت کا پھندا گلے میں ڈال کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے مذہب نزاریہ کو ظاہر کیا۔ اور اہل سنت کی جان کا لاگو ہو گیا۔ اور ان کی ایذا رسانی میں کوئی مکر، کوئی حیلہ باقی نہیں چھوڑا۔ اس کا سب سے بڑا مکر یہ تھا کہ اپنے متبعین میں سے فتنہ پرداز اور اندھے مقلد فدائیوں کو چھانٹ چھانٹ کر اسلامی شہروں میں بھیجتا اور ان کو ہدایت کرتا کہ اہل سنت کے علماء، امراء اور حکام کو جس طرح اور جب بھی موقعہ ملے قتل کر دیں۔ چنانچہ کچھ فدائی طالب علم بن کر بعض علماء کے شاگرد بن کر رہے۔ جلوت و خلوت میں خدمت کر کے ان کا اعتماد حاصل کیا اور جب موقعہ ملا ان کو شہید کر کے چلتے بنے۔

اس حیلہ و فریب سے اہل سنت والجماعت کے بہت سے علماء، امراء، اور صلحاء کی ایک جماعت کو قتل کرایا۔ جب قوت و اقتدار میں کافی اضافہ کر لیا تو اب امراء و حکام اور بادشاہوں کے ساتھ برسرپیکار ہو گیا۔ اور ان کو شکست دی۔

یہ بات پہلے مذکور ہو چکی ہے کہ حسن صباح کا وقت آخر قریب آیا تو اس نے ابن کیا کو اپنا نائب بنا کر اپنا مشن جاری رکھنے کی تاکید کی۔ ابن کیا نے مرتے وقت اپنے بیٹے محمد کو اور اس نے اپنے بیٹے حسن کو جو اپنا نسب ہادی بن نزار سے ملاتا تھا، اپنا نائب بنایا۔ یہ حسن کفر و الحاد کا گویا مجسمہ تھا۔ اس کے اسلاف نے جن باتوں کو چھپا رکھا تھا یہ ان کو برملا ظاہر کرتا تھا۔ اس کے نائبوں اور پیروکاروں کی بادشاہت ایک سو اکہتر برس تک چلی۔ بالآخر تاتاریوں نے ان کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ گویا قدرت نے ان کا قلع قمع کرنے کو ہی تاتاری پیدا کئے تھے۔

فرقہ مستعلویہ کی بادشاہت پانچ سو ساٹھ برس رہی۔ مگر اب ان چند لوگوں کے سوا جن کا کچھ پتہ یمن کے انتہائی اطراف میں یا دریائے سندھ کے کنارے ملتا ہے کوئی باقی نہیں بچا۔ واللہ اعلم

واضح رہے کہ ہندوستان میں ایک اور جماعت ہے جنہوں نے اپنا نام مہدویہ رکھا ہوا ہے۔ جن کا خیال ہے

کہ حضرت مہدی آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ یہ لوگ بلاد دکن اور راجپوتانہ میں کافی تعداد میں ہیں۔ مگر ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق اسمٰعیلیہ مہدویہ سے نہیں ہے یہ ایک جدا اور مستقل جماعت ہے اس کا مسئلہ امامت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اہل سنت سے فروعی مسائل مثلاً دعا میں ہاتھ اٹھاتے یا تقسیم میراث میں کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ سید محمد جونپوری کے پیروکار ہیں جو اپنے آپ کو مہدی موعود سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسی خیال کے رد میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح احادیث پر مشتمل ایک رسالہ تصنیف کیا جس میں مہدی موعود کی علامات بالتفصیل بیان کی ہیں۔

اب رہے اثنا عشریہ، تو یہ ابتداً عراق کے گردونواح میں متفرق جماعتوں کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ اکثر خود کو اہل سنت میں شمار کرتے اور تقیہ و اخفا سے کام لے کر دور دور رہتے تھے۔ یہاں تک کہ بلاد عراق میں آل بویہ دیالمہ برسر اقتدار آئے۔ ان کا پہلا بادشاہ عماد الدولہ تھا۔ جس نے اپنے علاقہ کے بادشاہ کو زیر کر کے اس سے حکومت چھین لی، پھر مقتدر عباسی کی خلافت کے زمانہ میں اطراف و جوانب کے بادشاہوں سے بڑی بڑی لڑائیاں لڑ کر فتح حاصل کی۔

درحقیقت اس کا باپ اور بھائی باعتبار پیشہ شکاری تھے، جو پرندوں اور مچھلیوں کا شکار کر کے ان کو فروخت کر کے گذر بسر کرتے تھے۔ اسی حال میں انہوں نے دیلم کے کوہستان سے عراق عجم کا سفر کیا، وہاں کسی شہر میں ٹھہرے ذرا ڈھنگ کا لباس پہن کر ایک امیر سے ملاقات کو گئے، وہ ان کی جسمانی وجاہت اور لچھے دار باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کو بادشاہ کے پاس لے گیا۔ وہاں ان کو نوکریوں میں بھرتی کر لیا گیا۔ یہ اپنی کارگذاریوں اور تملق و چرب زبانی کے باعث بلند سے بلند عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ تا آنکہ امارت عظمیٰ تک جا پہنچے، جب بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو عماد الدولہ جو عقل و تدبیر سے اہل خانہ میں اپنا اعتماد جما چکا تھا۔ تخت شاہی پر متمکن ہو گیا۔ یہ ۳۲۱ھ کا واقعہ ہے ان کا دور حکومت ایک سو ستائیس برس تک دراز ہوا۔ اور اس دوران ان کی حکومت بلاد فارس، عراق عجم اور دیلم میں مضبوط و مستحکم ہو گئی۔

ان کا پورا خاندان غلاۃ اثنا عشری تھا۔ اس لئے سارے کے سارے اثنا عشریہ ادھر اُدھر سے سمٹ کر ان کے شہروں میں اکٹھے ہو گئے، اور آذربائیجان، خراسان، جرجان، مازندران، جیلان اور جبال دیلم تک جو ان کی قلمرو کی آخری حد تھی اسی مذہب کا زور ہو گیا۔

اس مذہب میں کثرت سے اہل علم پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اس غلبہ اور قوت کے باوجود تقیہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہاں تک کہ ان کا وزیر اعظم صاحب عباد خود کو معتزلی بتاتا تھا حالانکہ درپردہ بڑا سخت اور کٹر رافضی تھا۔

جب دیالمہ (دیلم والوں) کی سلطنت کا شیرازہ پراگندہ ہوا۔ اور سلطنت جاتی رہی تو اکثر اثنا عشریوں نے تقیہ سے کام لیا اور معتزلیوں اور اہل سنت سے شیر و شکر ہو گئے۔ تا آنکہ فتنہ تاتار کا ہنگامہ برپا ہوا۔ جس نے سب خشک و تر کو جلا کر خاک کر ڈالا۔ اس وقت کے عباسی خلیفہ کا نام وزیر علقمی تھا۔ جو غداری کر کے درپردہ تاتاریوں سے ساز باز رکھتا تھا۔ اول اول تو اس نے بہت زور پکڑا مگر بالآخر تباہی و بربادی کی ذلت سے دوچار ہوا۔ پھر جب اسلام میں کچھ ضعف ہوا۔ اور اہل سنت کا ڈر دلوں سے نکلا تو پھر اس فرقہ نے پر پرزے نکالے

اور خاصی قوت پکڑ گئے۔ اور ان شہروں میں پھر اپنے مذہب کی اشاعت شروع کر دی۔
جب ۷۱۶ھ میں سلطان غازان بن ارغون بن ابقا بن ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں۔ مسلمان ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہزاروں لشکری اور اس کے بیشتر کار بھی مسلمان ہوگئے۔ اس نے اپنا نام محمود رکھا۔ اور طریق اہل سنت کے موافق نہایت سلامت روی کے ساتھ حکومت کی اور زندگی گذاری۔ اس کے بعد اس کا بھائی الجائیتو خدا بندہ بادشاہ بنا۔ یہ فن تعمیر کا دلدادہ، کھیل تماشوں اور لہو و لعب کا شوقین تھا۔ اتفاقاً ایک اثنا عشری رافضی جس کا نام تاج الدین تھا اس سے آٹکرایا۔ اس نے بادشاہ کو اپنے مذہب کی ترغیب دی، بادشاہ اس سے متاثر ہوا، اور اس کے بہکانے میں آکر اپنا مذہب ترک کرکے شیعہ ہوگیا۔ اس بات سے شہ پاکر تاج الدین نے زور شور سے اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ اپنے مذہب کے علماء خصوصاً ابن مطہر حلی کو دربار شاہی میں کھینچ لایا۔ بادشاہ کے سامنے تعریف و توصیف کرکرکے ابن مطہر کی قدر و منزلت بادشاہ کے دل میں اتاری۔ اور رفتہ رفتہ سلطان کو یہ باور کرادیا کہ سب اسلامی فرقوں میں نجات یافتہ فرقہ بس اثنا عشری ہی ہے۔ کھلنڈرا سلطان جو نو مسلم ہی تھا، حقیقت دین سے ناواقف اور تاریخ اسلامی سے نابلد۔ اس لئے تاج الدین کا جادو اس پر اچھی طرح چل گیا۔ اور سلطان کو مع اہل خانہ و متبعین اپنے مذہب میں گھسیٹ لایا۔
ابن مطہر کی کتابیں مثلاً نہج الحق۔ منہج الکرامہ وغیرہ خصوصی طور پر سلطان اور اس کے امراء و متبعین کے لئے لکھی گئیں۔ غرض اس زمانہ میں مذہب اثنا عشریہ کا غلغلہ خوب بلند ہوا۔ ابن مطہر نے الفین شرح تجرید، استبصار نہایہ خلاصہ اور مبادی در اصول جیسی کتابیں اس فرقہ کے لئے لکھیں۔
۷۱۷ھ میں سلطان کا بیٹا تخت نشین ہوا تو علمائے اہل سنت کے سمجھانے بجھانے سے مذہب رفض سے توبہ کرلی، اور اس عقیدہ بد سے بیزاری کا اظہار کرکے تمام رافضیوں کو اپنی قلمرو سے نکال دیا، اور حلی کا بوریا بستر بھی گول ہوگیا۔
غرض ان کے تمام علماء اور داعی اِدھر اُدھر روپوش ہوگئے۔
تا آنکہ تراکمہ نے جو دراصل اثنا عشری تھے، دیار بکر اور اس کے گرد و نواح میں قوت حاصل کرکے اپنی سلطنت قائم کرلی، تو بکھرے ہوئے آوارہ گرد، علماء اور فریب کار پھر ایک جگہ جمع ہوگئے اور تقریباً پچاس برس تراکمہ کے زیر سایہ سب و شتم کا غوغہ مچاتے اور اپنی عاقبت خراب کرتے رہے۔ جب تراکمہ کی حکومت کمزور پڑی۔ تو اس مذہب کا زور ٹوٹا۔ مگر جب ۹۰۶ھ میں سلاطین حیدریہ جو اپنے آپ کو صفوی کہتے تھے اور جن کی تراکمہ سے قرابت داری اور سمدھیانے کی رشتہ داری تھی۔ تراکمہ کی سلطنت پر قابض ہوگئے۔ اور عراق عجم، کرمان، مازندان، آذربائیجان، خراسان اور تبریز بغیر کسی مقابلہ و مجادلہ کے ان کے زیر اقتدار آگئے تو ایک بار پھر ان کو بکجا ہونے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اور اس فرقہ کے علماء بڑے شد و مد سے پھر جمع ہوکر اپنے شیطانی کام میں جٹ گئے، اس دفعہ ایک نئے فتنہ کی داغ بیل ڈالی، کسی خوشامدی عالم نے بادشاہ کو نائب صاحب الزمان قرار دے کر سجدہ کی رسم جاری کرائی۔ اس کی چاپلوسی جب کامیاب ہوئی اور مصاحبت شاہی کا اعزاز مل گیا تو بادشاہ کے کان بھرے کہ وہ لوگوں کو سجدہ پر مجبور کرے اور سرتابی کرنے والے کو حوالہ تیغ کردے۔ جمعہ و جماعت کی ادائیگی سے مسلمانوں کو جبراً روکے۔ تحویل قبلہ بجانب یسار کرے

خطیبوں کے لئے فرمان جاری کرے کہ منبروں پر ہی نہیں گلی کوچوں میں بھی جلیل القدر صحابہ کرام امہات المومنین حضرت صدیقہ وحضرت حفصہ رضی اللہ عنہم پر علی الاعلان گالی گلوچ کریں۔ مجوز نے تبری اور لعن طعن کے وجوب پر کتابیں شائع کیں۔ وہ جو کہتا بادشاہ دل وجان سے اس کو مانتا، علمائے اہل سنت کی ایک جماعت اس کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ مساجد ویران و برباد ہوئیں، صالحین امت میں سے عین القضاۃ ہمدانی، قاضی ناصرالدین بیضاوی رحمہا اللہ کی میتوں کی بے حرمتی کی حتیٰ کہ ان کی قبروں سے ان کی ہڈیاں نکال کر نذر آتش کی گئیں۔ البتہ بہت سے اور بزرگ علماء وصلحاء مثلاً شیخ الاسلام احمد جامی، شیخ ابوالحسن خیرقانی، ابویزید بسطامی، شیخ الاسلام عبداللہ انصاری اور تمام مشائخ ہرات رحمہم اللہ تعالیٰ جو وفات پا چکے تھے حمایت ایزدی سے اس فتنہ اور بے حرمتی سے محفوظ رہے۔

اس پُر فتن دور میں اہل سنت کی جائے پناہ بلاد ماوراء النہر تھے۔

جو شخص بھی ان کے جور وستم سے بچ نکلتا وہ کسی نہ کسی صورت سرزمین توران پہنچتا اور ان کی بربریت ظلم و شقاوت کی مجسم تصویر وہاں کے حکمرانوں کو دکھاتا۔ بہت سے اہل دین اور علمائے کرام کی طرح ہرات کے ملازادے بھی ان کے مظالم سے نہ بچ سکے، جب وہ ظلم وستم سہہ کر اور بے انتہا دکھ جھیل کر توران پہنچے تو خاقان اعظم عبیداللہ خاں کے پاس گئے اور اس کو مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی کے لئے غیرت دلائی، چنانچہ اس نے اس کا اثر لیا اور خراسان پر چڑھائی کرکے نہ صرف مظلوموں کا پورا پورا بدلہ لیا بلکہ ظالموں کا اقتدار بھی خاک میں ملا کر خراسان سے بے دخل کرکے خود اس پر قبضہ کر لیا۔

عبیداللہ خاں کے انتقال کے بعد صفویوں نے گو خراسان پر دوبارہ قبضہ کر لیا، مگر ملوک بخارا و بلخ نے انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ازبک اور ترک ہر سال پے بہ پے ان سے برسر پیکار رہتے۔ دوسری طرف ملوک و امرائے خوارزم ان سے برابر جہاد کرتے رہتے اور قتل وغارت اور ان کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، اُدھر قیصر روم تبریز اور اردبیل کی طرف سے ان کے سر پر سوار رہتا۔ غرض دو سال بدنظمی اور اختلال کے ساتھ گذار کر بالآخر افاغنہ کے قدموں تلے روندے گئے۔ اور ذلت و خواری سے دوچار ہوئے۔ ان افغانوں نے بادشاہ وقت کو اصفہان میں نرغے میں لے لیا۔ بالآخر حصار کی بندشوں اور بھوک کی تکلیف سے تنگ آکر انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔

افغانوں کا سردار شہر میں فاتحانہ داخل ہوا بادشاہ اور اس کے گھر والوں کو گرفتار کرکے مملکت پر قابض و متصرف ہو گیا۔

یہی وقت تھا کہ اس مذہب کے لوگ ان شہروں سے بھاگ کر ہند و سندھ میں پناہ گیر ہوئے اور اچھا خاصہ جتھہ جمع ہو گیا۔ وہ یہاں کے امراء، تجار اور ملوک کے سامنے ہر ممکن طریقہ اور حربے سے اپنا اعتبار جما لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر یہاں بھی انہوں نے اپنی فطرت کے جوہر دکھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، رفتہ رفتہ یہاں بھی ان کا مذہب پھیل گیا۔ اور بالآخر ہندوستان کی وزارت، امارت اور صوبہ داریاں قبضانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں انہوں نے عراق و خراسان کی طرح اثر ورسوخ قائم کر لیا۔

تیسرا فائدہ: شیعی فرقوں میں سے ہر فرقہ میں داعیان مذہب ہوتے تھے جن کو دُعاۃ کہتے تھے۔ یہ صرف اپنے اپنے فرقہ کے مذہب کی طرف بلاتے تھے۔ ان کی دعوت کے چار طریقے تھے۔ (۱) علم (۲) مال (۳) زبان (۴) تلوار۔

(۱) **علم:** سے وہ اس طرح کام لیتے کہ شبہات کو شہرت دیتے اور ان پر ایسی موزوں اور جچی تلی گفتگو کرنے

کہ ہر خاص و عام کے دل میں اتر جائے۔ اور ہر شخص کی قابلیت، عادت اور مذاق کے مطابق ہمکلامی کرتے۔ اہلسنت کے دلائل توڑ مروڑ کر اپنے مذہب کی تائید و تعریف میں اور دوسرے کے مذہب کی مذمت میں استعمال کرتے۔

(۲) مال سے کام لینے کا طریقہ۔ مثلاً اس مذہب کو قبول کرنے والوں کو، ہدیئے، تحفے اور انعامات دینا۔ نومسلموں کی بہت تعظیم کرنا اور ان کو انعام و اکرام سے نوازنا۔ اپنے ہم مذہبوں کو ملازمتوں اور عہدوں کے ذریعہ فائدہ پہنچانا۔ غیر مذہب والوں کو ملازمتوں سے نکالنا۔ اور ان کو حقیر و ذلیل رکھنا۔ مقدمات، میں ہم مذہبوں کے ساتھ رعایت اور جانبداری کا سلوک کرنا۔ غیر مذہب والوں کو ملزم و قصور وار ٹھیرانا۔

(۳) زبان سے دعوت کا کام لینے کی صورت۔ قبولیت مذہب پر اچھے وعدہ کرنا۔ جو ان کے مذہب کی طرف مائل ہو تو محبت و شفقت آمیز گفتگو کرنا، اور جو ان کے مذہب کا مخالف ہو تو اس سے تیوری چڑھا کر بات کرنا اور سختی و درشتی سے ہمکلام ہونا۔

(۴) اور تلوار سے یوں کام لیتے ہیں کہ مخالف مذہب کو قتل کر دیتے، لوگوں کو مذہب قبول کرنے پر مجبور کرتے۔ مخالف مذہب کے امراء و حکام سے جنگ کرتے۔ تاکہ ان کی شوکت کم ہو۔

جو داعی دعوت دینے کے لئے چاروں طریقے استعمال کرے وہ مکمل داعی کہلاتا، مگر ایسا داعی نادر الوجود ہوتا ہے بعض داعی، دو طریقے اور بعض تین طریقے استعمال کرتے۔ پھر دعوت کے اسباب بھی کئی ہیں۔

دعوت مذہب کے اسباب

پہلا سبب :۔ اہل مذہب کو گمراہ کرنا۔ ان کی جمعیت میں پھوٹ ڈالنا اور افتراق پیدا کرنا تاکہ اپنے ہم مذہب ان کی برائیوں سے امن و حفاظت میں رہیں۔ چنانچہ عبداللہ بن سبا اور اس کے بھائی بندوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

دوسرا سبب :۔ لشکر کی تعداد بڑھانا تاکہ ان کی کثرت کے سہارے اپنے پروگرام پورے کر سکیں جیسا کہ کیسانیوں نے کیا۔

تیسرا سبب :۔ حکومت و اقتدار اور جاہ و مرتبہ کی محبت اور ملک و مال کا حصول۔ جیسا کہ مختار کا حال تھا کہ اس نے مذہب کو زینۂ اقتدار و حکومت بنایا، اور اس کے ذریعہ جاہ و مرتبہ اور مال و دولت اکٹھا کیا۔

اس فرقہ میں ائمہ و امامیہ کے درمیان بہت سے لوگ سفیر و وکیل کا کام انجام دیتے تھے خصوصاً صاحب الزماں کی غیر موجودگی ہیں۔ دور عباسیہ میں تو اکثر ائمہ، سر من رائے اور بغداد میں نظر بند ہوتے تھے عوام سے ان کا براہ راست رابطہ نہیں تھا۔ بلکہ یہی سفیر اور وکلاء سرگرم رہتے تھے۔ اور ائمہ کی طرف سے بناوٹی خطوط اور جعلی دستاویزات پیش کر کے لوگوں کے دلوں میں ائمہ کی صداقت، بٹھاتے تھے، صرف اس لئے کہ تمام شیعہ ان داعیوں یا وکلاء اور سفراء کو اپنا پیشوا تسلیم کریں سوہ خمس مال کے حقدار ٹھیریں۔ امہات اولاد اور باکرہ و کنواری لڑکیاں ان کے لئے حلال قرار دی جائیں۔ وہ پر تکلف دعوتیں اڑا سکیں۔ انہیں نذرانے پیش کئے جا سکیں۔

یہ لوگ جو وکلاء اور سفراء کہلاتے تھے مندرجہ بالا فوائد حاصل کرنے کے لئے ائمہ کی طرف سے سراسر جھوٹی روایتیں پیش کیا کرتے تھے۔ فروعات شیعی میں اکثر خرابی کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔

چوتھا سبب :۔ صاحبان دولت و ثروت کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے رہنا تاکہ وہ ان کے مذہب کا

ولدادہ اور اہل مذہب کا بنا رہے۔

پانچواں سبب:۔ دعوت مذہب کے کام میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا امیدوار رہنا۔ مگر اس فرقہ نے اس سبب کو کبھی مقصد دعوت نہیں بنایا۔

چھٹا سبب:۔ ہم مذہب دوستوں، عزیزوں کے ساتھ مذہبی اتحاد باقی رکھنا، تاکہ باہم روابط استوار رہیں۔ اور گھر ہی میں نہ پھوٹ پڑ جائے۔

ساتواں سبب۔ بنی نوع انسان کو عذاب دوزخ سے نجات دلانا۔ بعض سادہ لوح احمق لوگوں نے اس غرض سے بھی تبلیغ کی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اصفہان میں کسی مشہدی خواجہ نے اپنے گھر میں ایک عجیب باغ لگایا تھا موسم بہار میں اذن عام دیتا کہ ہر خاص و عام آکر باغ کی خوش منظری سے لطف اٹھائے اور اس کے پھولوں پھلوں سے بہرہ ور ہو۔ اب اگر اس مجمع میں کوئی اہل سنت بھی آجاتا تو خواجہ ہائے ہائے کر کے چلاتا اور روتا تھا۔ لوگ سبب پوچھتے تو کہتا کہ مجھے بنی نوع انسانی کے ان لوگوں پر رحم آتا اور صدمہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے دوزخ میں جلیں گے۔

آٹھواں سبب:۔ اہل سنت کے درمیان بغض و عناد اور دشمنی کا ایسا بیج بونا کہ ایک گھر والے بھی آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جائیں۔ تاکہ ان کا روزگار تباہ اور زندگی تلخ ہو جائے۔

گذشتہ تحریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر فرقہ کا پہلا داعی ہی اس فرقہ کا بانی یا موجد ہوا ہے۔ ان میں سب سے پہلا داعی عبداللہ بن سبا تھا۔ اس کی مذہبی دعوت کا سبب بھی یہی تھا کہ کسی طرح اسلام میں رخنہ اندازی کی جائے اور مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ تاریخ طبری کے ترجمہ میں، جس کا مترجم بھی شیعہ ہی ہے۔ اس کی دعوت کا تفصیلی واقعہ درج کیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ ۳۵ھ کے آغاز میں مذہب رجعت رونما ہوا، اور حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) پر فتنوں کا ہجوم ہوا۔ اس مذہب رجعت کا بانی یہ عبداللہ بن سبا ہی ہے۔ یہ یمن کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ قدیم کتب کا مطالعہ کئے ہوئے تھا۔ یہ حضرت عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) کے پاس آیا اور کہا میں آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہوں، اس اسلام لانے کا مطلب جو یہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا، یہ تھا کہ جب میں ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوں گا تو یہ میری ناز برداری کریں گے۔ مگر حضرت عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) نے اُسے منہ نہ لگایا تو یہ ناراض ہو گیا۔ اب یہ جہاں بیٹھتا آپ کی برائی کرتا جب آپؓ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے اسے شہر بدر کرا دیا۔ وہاں سے یہ مصر پہنچا، پڑھا لکھا، عقلمند و چالاک اور عیار و چرب زبان تھا، چند ہی دنوں میں اس کے پاس اچھا خاصا جمگھٹ ہونے لگا۔ اور جب لوگوں نے اس کی علمی باتیں سنیں تو اس کی قدر کرنے اور اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے لگے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لوگ میری باتوں پر توجہ دیتے اور ان سے متاثر ہوتے ہیں تو ان کے سامنے اپنا یہ نظریہ رکھا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے قائل ہیں، اس قسم کا عقیدہ اگر مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رکھیں تو زیادہ حق بجانب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود فرمایا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ "بے شک وہ خدا جس نے تجھ پر قرآن نازل کیا تجھے لوٹنے کی جگہ پر دوبارہ لوٹائے گا۔

کچھ لوگوں نے اس نظریہ کو بڑا پسند کیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ لوگ اس بات کو ہضم کر گئے اور اس پر جم

گئے ہیں تو ایک اور شوشہ چھوڑا اور کہنے لگا کہ اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آچکے ہیں اور ہر نبی کا ایک وزیر ہوتا رہا ہے تو ہمارے پیغمبر کا وزیر کیوں نہ ہو؟ ہمارے پیغمبر کے وزیر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) تھے اور انہیں کو جانشینی اور خلافت کا حق تھا۔ مگر عثمان (رضی اللہ عنہ) نے ظلم وستم سے یہ حق لے لیا۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اس مسئلہ کو شوریٰ کے حوالہ کر دیا تھا۔ اہل شوریٰ سب علی (رضی اللہ عنہ) کی خلافت پر متفق الرائے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا ہاتھ پکڑا کہ عثمان (غنی رضی اللہ عنہ) کی بیعت کرلیں اور عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) نے دھوکہ دے کر بیعت کرادی۔ ادھر خود عثمان (رضی اللہ عنہ) خود بھی اس ناحق بات کے لئے آمادہ ہو گئے۔ لوگوں نے اس کی یہ بات بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرلی۔ اور اس کے خیال کی تائید کرنے اور اس کی بات ماننے لگے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ دونوں باتیں لوگوں نے کھلے دل سے قبول کرلی ہیں، تو کہنے لگا کہ دیکھو جس طرح نماز روزہ فرض ہے اسی طرح ہر مسلمان پر امر بالمعروف بھی فرض ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط (لوگوں میں تمہیں بہتر امت بنا کر اس لئے اٹھایا گیا ہے کہ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اب ہم عثمان (رضی اللہ عنہ) کے معاملہ میں اتنا کر سکتے ہیں کہ ان کا حکم مانیں اور نہ ان کے کارندوں کا۔ اور یوں ان کے ظلم سے اپنے کو محفوظ بنالیں۔

غرض ان باتوں سے عبداللہ بن سبا کی یہ تھی کہ لوگوں کو حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کے احکام کی خلاف ورزی پر لوگوں کو ہمت وحوصلہ دلائے، اور انہیں جری و بے باک بنا دے۔ مریض دلوں کے لئے یہ مذہب "نسخہ شفا" تھا لوگوں کو یہ مذہب بہت اچھا لگا اور رجعت کے قائل ہوگئے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو علی الاعلان تو نہیں مگر دل میں کافر کہتے تھے، آخر ابن سبا کا یہ گروہ اس بات پر متفق ہوگیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا جائے اور ان کی جگہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنایا جائے۔ ابن سبا نے سب سے وعدہ لیا۔ کہ سب کے سب فلاں دن مدینہ میں جمع ہو جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی اس کی اطلاع مل گئی کہ شہروں میں لوگ جمع ہو ہو کر یہ فیصلے کر رہے ہیں کہ ان کو معزول کر دیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ

خلاصہ کلام یہ کہ اس پورے ہنگامہ اور خلفشار میں ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کا یہ کام رہا کہ جب بھی معاملہ کو رو باصلاح دیکھیں تو ہر طریقے سے اُسے ناکام بنائیں اور معاملات کی اصلاح نہ ہونے دیں۔ بالآخر فتنہ کی یہ آگ پورے زور سے بھڑک اٹھی، اور مصر کے غنڈوں اوباشوں نے حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو شہید کرکے اس کی دلی مُراد پوری کردی۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت ہو چکی تو اسے پھر اندیشوں نے گھیر لیا کہ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں میں سکون لوٹ آئے اور جہاد کا سلسلہ پھر جاری ہو جائے، تو اب اس نے شیعان علی میں شمولیت اور شرکت کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ باہر رہنے کی نسبت اندر رہتے ہوئے حالات پر قابو رکھنا آسان ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد جو اپنے اور پرائے جمع ہوگئے تھے۔ ان میں سے اپنے مطلب کے آدمی چھانٹ کر شیطانی وظیفہ انجام دینے میں خوب موقع ملا۔ اہل بیت کی نئے سرے سے بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے کام کو کیسان اور مختار ثقفی

نے انجام دیا کیونکہ اس کے بعد یہی دونوں اس فرقہ کے داعی تھے۔
اب ان کا بھی طریق دعوت ملاحظہ فرمائیے! شام و عراق کے شقی لوگوں نے جب جناب امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا (اگرچہ قاتلانِ حسین میں شیعان کوفہ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں) تو کیسان نے جس کا حال ماقبل میں بیان ہوا۔ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد دراصل محمد بن الحنفیہ امام ہیں نہ کہ حسنین (رضی اللہ عنہما) کیونکہ یہ دونوں حضرات اہل شام سے نرمی کا سلوک فرماتے اور زمانہ سازی سے کام لیتے تھے۔ مختار ثقفی بھی کیسان کے پیروکاروں میں شامل تھا۔ اور یہی اس کا مذہب تھا۔
جب مختار ثقفی کے ہاتھ میں کوفہ اور گردونواح کی زمام ولایت و اقتدار آگئی، تو اس نے اپنے مذہب کی دعوت دینی شروع کی۔ مگر کوفہ کے شیعوں کی دلداری کی خاطر اپنے اور اپنے مرشد کیسان کے عقیدہ میں ترمیم کر کے جناب حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت کو بھی تسلیم کر لیا اور محمد بن الحنفیہ کو ان کے بعد کا درجہ دیا۔ (گویا تھوک کر چاٹ لیا، اس لئے کہ حسنین رضی اللہ عنہما کی امامت سے یہ اسی لئے منکر تھا کہ وہ حضرات سیاست یا زمانہ سازی سے کام لیتے تھے، اور اب جو اس نے کوفہ کی شیعی اکثریت کی خاطر اپنے عقیدہ کی ترمیم کی تو وہ سیاست یا زمانہ سازی نہیں تو اور کیا تھا۔ نعمانی)
مختار کے عقیدہ میں ترمیم کر لینے سے کوفہ کے سب شیعوں نے اس کی متابعت اختیار کر لی۔ اب اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ نواصب مروانیہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے انتقام اور بدلہ لینے کے لئے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اپنا نائب بنایا ہے اور مفتوحہ شہروں کی امامت بھی مجھے مرحمت فرما دی ہے۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں رؤسائے شیعہ کو ایک سربند اور مہر شدہ خط دیا اور ان سے کہا کہ سب کے سامنے اسے کھولیں اور حاضرین کو پڑھ کر اس کا مضمون سنائیں۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

> "محمد بن الحنفیہ کی طرف سے شیعان کوفہ اور اس کے رؤسا کے نام، فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں معلوم کریں کہ میں نے مختار بن ابی عبیدہ کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ پس اس کے حکم کی اطاعت کریں اور اس کی ہمرکابی میں جان و مال سے دشمنوں سے جہاد کریں۔ اپنے متبعین اور پیروؤں کو دشمنوں سے لڑنے اور مختار کی اطاعت پر پابند کریں۔"

اس رقعہ کی موجودگی میں کسی کو اب دم زدن نہیں تھی سب نے اس کی اطاعت، کو قبول کیا۔ اول اول انہوں نے کوفہ میں قاتلانِ امام کو تلاش کر کے قتل کیا، امیر کوفہ، تاب مقابلہ نہ پا کر کوفہ سے بھاگ نکلا۔ تو مختار ثقفی کوفہ کا امیر بن بیٹھا۔ اس کے بعد ان لوگوں سے جہاد کے لئے جو مروانیوں کے ساتھی یا پیروکار تھے اور عراق میں رہتے تھے۔ ابراہیم بن اشتر کو نامزد کیا۔ چنانچہ ابراہیم کوفہ سے نکلا اور جو قابو آگیا قتل کرتا چلا گیا۔ تا آنکہ بلاد عراق و اہواز پر قبضہ کر لیا اور دیار بکر، آذربائیجان پر بھی اپنا اثر جما لیا۔ اس کے بعد شام اور دمشق پر حملہ کا ارادہ کیا۔
جب عبدالملک بن مروان کو اس کے ارادوں کی بھنک ملی۔ تو اس نے عبداللہ بن زیاد کو ایک لاکھ فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ ابراہیم کے ساتھ صرف بارہ ہزار فوج تھی، گھمسان کی لڑائی کے بعد ابراہیم بن اشتر نے ایک لاکھ کے لشکر کو شکست دی اور ابن زیاد قتل ہوا۔ ان واقعات کے بعد شیعوں کی نظر میں مختار کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی۔ اور بڑی واہ واہ ہوئی۔ یہاں تک کہ مخلص شیعوں نے بھی جو اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے مروانی فوج

کی شکست اور ابن زیاد کے قتل پر سجدہ شکر ادا کیا اور مختار کے اس کارنامے کو گو وہ ملک و ریاست کے لالچ میں کیا گیا تھا۔ بہت سراہا۔ مختار کی یہ اقبال مندی دیکھ کر چاروں طرف سے شیعہ سمٹ سمٹ کر اس کے پاس آنے لگے اور اس کا مذہب اختیار کرنے لگے۔

مختار کی حکومت تقریباً دس سال تک رہی اور جب دشمنوں کی طرف سے اسے خاطر خواہ اطمینان و تسلی ہو گئی تو وہ اپنے اصلی جامہ میں ظاہر ہو گیا اور دین میں تحریف اور ایجادات میں مشغول ہوا

پہلے پہل اس نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرسی کو تابوت السکینہ کا نام دے کر بتوں کی طرح اس کی پوجا کرائی، حالانکہ تاریخی حوالہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امیر المومنین کی کرسی ہرگز نہیں تھی بلکہ طفیل بن جعدہ کسی روغن فروش کی دکان سے اٹھا لایا تھا۔ اس کے بعد وہ بلند بانگ دعووں پر اتر آیا مثلاً کہتا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آتے ہیں۔ اور مجھے غیب کا علم حاصل ہے۔ اس قسم کی باتیں بطور عقیدہ اپنے تک نہیں رکھتا تھا بلکہ لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہتا تھا اس کی انہیں ہفوات کی بناء پر کوفہ کے شیعوں کی اکثریت اس سے متنفر ہو گئی اور آپس میں بحث و مناظرہ کا دروازہ کھل گیا۔ بالآخر یہ تمام واقعات حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے گوش گذار ہوئے اور لوگوں نے اس کا مداوا کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہما کو جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے داماد اور جناب سکینہ رحمۃ اللہ علیہا کے شوہر تھے۔ مختار کی سرکوبی اور اس کے پھیلائے ہوئے فتنہ کے دفعیہ کے لئے نامزد فرمایا۔ تاکہ کوفہ کے شیعہ ان کو مختار کے مقابلہ میں ریاست و سیادت کا زیادہ حقدار سمجھ کر مختار سے کنارہ کش ہو جائیں۔

حضرت مصعبؓ پہلے بصرہ گئے اور اپنے برتاؤ اور طرز عمل سے ان کو اپنا گرویدہ بنایا۔ ادھر کوفہ کے شیعوں سے مراسلاتی رابطہ قائم کر کے مختار سے برگشتہ اور اپنے ساتھ وابستہ کیا۔ اور ابراہیم بن اشتر کو جو مختار کا دست و بازو اور شمشیر براں تھا موصل و دیار بکر کی سرداری کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور جب ہر طرف سے مختار کو تنہا کر دیا تو اس پر حملہ آور ہو کر قتل کر ڈالا، اور اس کی جمعیت کو پراگندہ و منتشر کر کے اس فتنہ کو پامال کیا۔ مختار کے زمانہ میں کلیدی اور بڑے بڑے عہدے مختاریوں اور کیسانیوں کے پاس تھے، ان عہدوں پر اہل سنت کو فائز و سرفراز کیا۔

کیسانیوں کی اکثریت نے اپنے مذہب سے توبہ کی اور جو بچ رہے وہ ادھر ادھر روپوش ہو گئے۔ ان بچے ہوئے کیسانیوں میں تعیین امام میں اختلاف پیدا ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

آخر ان بچے کھچے کیسانیوں کے سرداروں میں سے ہشام احول، ہشام بن سالم اور شیطان الطاق فرقہ امامیہ کے داعی بن کر اٹھے، اور خود کو امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی اولاد سے رشتہ عقیدتمندی کے ذریعہ وابستہ کیا۔ اور محمد بن الحنفیہؒ اور ان کی اولاد پر تبری بھیجنے لگے۔

تفضیلیوں کا ایک گروہ اور مختاریوں کے باقی ماندہ میں سے کچھ لوگ بھی ان کے مذہب میں شامل ہو گئے۔ اور اسی وقت انہیں ان لوگوں کے ذریعہ مذہب امامیہ وجود میں آیا۔ اور یہی لوگ اس مذہب کے داعی ہیں اور امامیہ کے اسلاف اور پیشوا اور راویان اخبار ہیں اور اس مذہب کے پیروؤں نے دین و ایمان، عقیدہ و عمل جو کچھ لیا انہیں مذکورہ الصدر تین داعیوں سے لیا ان کے نزدیک ان کا قول و فعل قابل تقلید اور لائق اعتماد و پیروی ہے۔

یہ کیسے لوگ تھے، اور ان کے کیا کرتوت تھے ان کا بیان اس کتاب میں عنقریب مذکور ہو گا تو معلوم ہو گا

کہ مجسمہ مصرحہ ہیں (کھلا بعید ہیں) جو اپنے معبود موہوم کو اپنے ذہن میں ترتیب دے کر اور تراش کر ہزاروں برائیوں سے اس کا دامن آلودہ کرتے ہیں۔

اور وہ ائمہ کرام رحمہم اللہ، جن سے یہ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے، وہ خود ان سے ان کے لغو عقائد سے ہمیشہ بیزار و متنفر رہے ان پر لعنت بھیجتے رہے۔ اور ان کو بدبخت اور گمراہ ٹھیراتے رہے۔

ان ہی دنوں میں ایک اور فرقہ۔ فرقہ زیدیہ پیدا ہوا، اور اس کے داعی اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہوگئے، اس فرقہ کا مقصد پیدائش یہ تھا کہ حضرت زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم مروانیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیعان مخلصین تفضیلیہ اور کوفہ والوں کو اپنی طرف دعوت دی، چنانچہ بہت بڑی جماعت نے ان کی دعوت پر لبیک کہی۔

جناب امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو مبنی برحقیقت اور درست سمجھتے تھے اور اہل کوفہ کو آپ کی متابعت کی ترغیب دلاتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس لوگوں کی قابل واپسی امانتیں نہ ہوتیں یا مجھے اپنے پس ماندگان کے متعلق یہ اطمینان ہوتا کہ ہر ایک امانت کو اس کے مالک تک پوری دیانت داری سے سپرد کرنے کی ان میں اہلیت ہے تو میں جناب زیدؒ کے شانہ بشانہ دشمنوں سے جہاد کرتا۔ (اسی کے ساتھ یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ اپنی فراست مومنانہ سے کوفہ کے شیعوں کے متعلق یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ اپنی تاریخ عذر دہرائے بغیر نہیں رہیں گے اور جو یہ ایک مرتبہ امام حسین رضی اللہ عنہ سے کر چکے ہیں وہی کچھ جناب زید سے بھی کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے عملی شرکت کے بجائے ترغیب و تائید کا راستہ اختیار کیا۔

ان شیعوں نے امام زیدؒ کے ساتھ جو کچھ کیا اب اس کا قصہ پڑھیے۔ مترجم)

القصہ جب جناب زید رحمۃ اللہ علیہ کا مقابلہ مروانیوں سے ہوا۔ تو کوفہ کے تیس ہزار شیعہ عین عالم جنگ میں امام موصوف کو چھوڑ کر اپنے اپنے بلوں میں جا گھسے۔ بات یہ تھی یہ لوگ تمام قابل احترام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں گستاخیاں اور تبرّیٰ بازیاں کرتے تھے۔ جس کو جناب زید نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان کو سختی سے منع فرماتے اور اس پر ڈانٹ پھٹکار بھی کرتے تھے۔ (یہ لوگ بدبخت نہ ہوتے اور ان کو امام کا یہ طرز عمل اچھا نہیں لگتا تھا تو جنگ کے نازک لمحے کے پیش آنے سے پہلے امام کا ساتھ چھوڑ کر چلے جاتے تو ان کا وہ عذر قابل قبول بھی ہوتا اور جناب زیدؒ کو بھی آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کا موقعہ　　مل جاتا۔ مگر عزت و ذلت دینے والے رب کریم نے ان کو ذلت کے قعر عظیم میں دائمی طور پر گرانا ہی تھا اس لیے وہی سرزد ہوا جو ان کی فطرت تھی۔ نعمانی)

چونکہ اس جنگ میں ان کو موت نظر آ گئی تھی اس لیے جناب زیدؒ کو اپنی جانوں کا صدقہ بنا کر دشمنوں کے حوالہ کر کے خود بھاگ گئے۔ اور عذر یہ تراشا کہ چونکہ جناب زیدؒ ہم کو صحابہ کرام پر تبرّیٰ سے منع کرتے ہیں تو یہ ہمارے مذہب و عقیدہ کے نہیں ہیں اس لیے ہم ان کے جھنڈے کے نیچے کیسے لڑ سکتے ہیں۔

بہرحال جناب زیدؒ شہادت کی سعادت و عزت سے سرفراز ہوئے، اور ان کے بچے کھچے لوگوں نے اپنے آپ کو امام زادہ سے وابستہ کر لیا۔ اور ایک نئے فرقہ کی تشکیل ہوگئی۔ ان لوگوں میں سربرآوردہ داعی یحییٰ بن زید بن علی بن حسین ہیں۔

حسن ابن حسن بن علی (رضی اللہ عنہم) کی نسل سے ایک شخص یحییٰ بن حسین بن ہاشم حسنی تھا جس کا لقب ہادی تھا۔ ۲۰۵ھ میں اس نے خروج کیا۔ اس نے پہلے بلاد یمن پر اور پھر بلاد حجاز پر اقتدار حاصل کیا۔ فقہ مذہب زیدیہ میں اس نے ایک کتاب بعنوان احکام، اپنی یادگار میں چھوڑی۔
اس کا بیٹا مرتضیٰؒ اور دو پوتے، حسن بن احمد بن یحییٰ اور یحییٰ بن احمد بن یحییٰ بھی اس فرقہ کے داعی رہ چکے ہیں۔
بعض زیدیوں نے اپنے مذہب میں تحریف بھی کر ڈالی، مذہب امامیہ اور اسمٰعیلیہ سے چند باتیں اپنے مذہب میں شامل کر لیں۔ اور پھر خود ہی اس تحریف شدہ مذہب کے داعی بن بیٹھے، اور صاحب فرقہ کہلائے۔ چنانچہ ابوالجارود، سلیمان بن جریر، تبر توفی، حسین بن صالح، نعیم بن الیمان اور یعقوب، یہ سب اب زیدیہ فرقے میں شمار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔
فرقہ امامیہ کے داعی دراصل ہشامین، شیطان الطاق اور اس کے ساتھی ہیں۔ لوگوں کے بہکانے اور اپنے مذہب کی طرف دعوت دینے میں جس مکر و فریب سے ان لوگوں نے کام لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان بھی ان کے سامنے کان پکڑتا ہے۔ اور دجال بھی اس پر حیران ہے۔ اسی لئے فرقہ امامیہ کی تعداد دوسرے تمام فرقہ والوں سے بڑھ گئی۔
جب فرقہ امامیہ مختلف فرقوں میں تقسیم ہوا تو ہر فرقہ کا علیحدہ اپنا داعی بنا۔ ہر امام کی وفات کے بعد یہ اختلاف اور وسیع ہوتا۔ بعض تو ان کی وفات تسلیم کر کے ان کے کسی بیٹے کو امام مانتے، بعض کسی دوسرے بیٹے کو۔ اور بعض ان کے بھائی کو امامت کی مسند پر بٹھاتے۔ اسی طرح ائمہ کے آخری سلسلہ تک اختلاف در اختلاف پیدا ہوتا گیا اور ان کا تفرقہ بڑھتا ہی گیا۔ درحقیقت یہ اس آیت کریمہ کے صحیح مصداق و محمل بنے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (بے شک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے فرقے ہو گئے۔ آپ ان سے بالکل علیحدہ ہیں)
یہاں تک کہ امام عسکریؒ کا زمانہ آیا، اور ان کی وفات پر یہ لوگ پھر مختلف الرائے ہوئے۔ بعضوں نے کہا ان کے کوئی بیٹا نہیں۔ لہٰذا ان کے بھائی جعفر بن علیؒ امام ہیں۔ بعضوں نے کہا انہوں نے ایک لڑکا محمد نامی چھوڑا ہے جو مہدی موعود اور خاتم الائمہ ہیں۔ لیکن دشمنوں کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔
البتہ جس بات پر یہ سارے متفق ہوئے وہ ائمہ کی تعداد ہے۔ جو بارہ پر مشتمل ہے۔ اسی لئے ان کو اثنا عشری کہتے ہیں۔
ائمہ کے خاتمہ کے بعد، دعوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ہر ایک داعی مذہب بن بیٹھا پھر دعوت کو سفارت کا نام دے دیا گیا۔ اور ہر ایک سفارت کا مدعی بنا۔ اور کہنے لگا کہ میں امام غائب اور امامیہ کے درمیان سفیر ہوں، یہ واقعات ۲۶۶ھ کے ہیں۔ ہر سفیر مرتے وقت اپنا ایک خلیفہ بنا جاتا اور سفارت اس کے سپرد کر جاتا۔ سفارت کا یہ سلسلہ ۳۱۶ھ میں علی بن محمد تک پہنچا اور وہ خاتم السفراء کہلایا۔
کہتے ہیں علی بن محمد کی وفات ۳۲۸ھ میں ہوئی، اس کے بعد پھر کوئی امام غائب کی طرف سے سفارت کا مدعی نہ بنا۔ گویا امام کو پھر غیبت کبریٰ حاصل ہو گئی۔
ان داعیان مذہب میں سفیروں کی طرح بعض اصحاب کتابت بھی ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ امام

سے ساتھ ان کا خط و کتابت کا رابطہ تھا۔ جھوٹے اور جعلی خط شیعوں کے سامنے پیش کر کے کہتے تھے کہ یہ امام کے وہ دستخطی خط ہیں جو انہوں نے ہماری درخواستوں کے جواب میں تحریر فرمائے۔

اور ان میں سے کچھ لوگ وہ علماء ہیں جو مذہبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے لئے وقف ہو کر، علم، فقہ اور کلام کے سرچشمہ بنے اور کچھ وہ راویانِ اخبار ہیں جو ائمہ یا ان کے اصحاب سے اصول، فروع یا فضائل اعمال کو بواسطہ یا بلا واسطہ روایت کرتے ہیں۔ ان سب کا حال بھی انشاء اللہ عنقریب رقم ہوگا۔

اور ان میں سے چند وہ بادشاہ بھی ہیں جو کبھی تلوار کے زور سے اور کبھی انعام و احسان کا لالچ دے کر لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کرتے رہے ہیں۔ ان کے حالات بیان کرنے کی ذمہ دار تاریخ ہے۔

ناوسیہ اور اسمٰعیلیہ، دونوں امام موسیٰ کاظمؒ کی امامت کے انکار پر تو متفق ہیں۔ لیکن امام جعفرؒ کے بارے میں باہم مخالف! ناوسیہ کہتے ہیں کہ امام جعفرؒ مرے نہیں، پوشیدہ ہیں اور پھر چند دن بعد ظاہر ہوں گے۔ ان کا داعی عبداللہ بن ناوس ہے۔

اسمٰعیلیہ کہتے ہیں کہ امام جعفرؒ مر گئے، ان کے بعد ان کے بیٹے اسمٰعیل امام ہیں حالانکہ اہلِ تاریخ اس پر متفق ہیں کہ وہ اپنے والد کی زندگی ہی میں وفات پا کر جنت البقیع، مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔

پھر اسمٰعیل کو ایک گروہ زندہ اور منتظر موعود مانتا ہے، اور اس کا داعی مبارک ہے اور اس کے خلفاء اس کے قدم بقدم چلے ہیں۔

عام اسمٰعیلی امام جعفرؒ کے بعد محمد بن اسمٰعیل بن جعفرؒ کو امام مانتے ہیں اور ان کے بارے میں امام صادقؒ کی وصیت نقل کرتے ہیں۔ ان کا داعی حمدان بن قرمط ہے۔

چند اور دوسرے لوگ کہتے ہیں اسمٰعیل نے امام جعفرؒ کے بعد وفات پائی۔ اور امامت ان میں اور ان کی اولاد میں جاری رہی۔ اس طرح کہ ہر جانے والا آنے والے کے لئے وصیت کرتا گیا۔ ان کا داعی عبداللہ بن میمون اقداح' اھوازی ہے۔

اب مہدویہ کو لیں جن کا تفصیلی حال بیان ہو چکا ہے۔ یہ لوگ سلسلہ امامت کو محمد بن عبداللہ ملقب بمہدی تک کھینچ لے گئے ہیں۔ ملک مغرب میں انہوں نے اقتدار پایا۔ اور اپنے داعیوں کو مصر و شام اور دوسرے اسلامی شہروں میں پھیلا دیا، ان کے داعی اکثر صاحبِ شوکت تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مصر کی زمام حکومت سنبھال لی۔ علمائے وقت نے مال و دولت کی حرص میں ان کی صحبت اختیار کی اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہوئے، لہٰذا اسی وقت سے ان کے ہاں بھی عالم داعی ہوئے۔ مثلاً نعمان بن محمد بن منصور، علی بن نعمان، محمد بن نعمان، عبدالعزیز، محمد بن مسیب، مقلد بن مسیب عقیلی، ابوالفتوح رجوان اور محمد بن عمار کتابی الملقب بامین الدین، وغیرہ وغیرہ

پھر جب مصر و مغرب کی زمام سلطنت مستنصر کے ہاتھ میں آئی تو عامر بن عبداللہ رواحی کا شمار بڑے داعیانِ مذہب میں ہونے لگا۔ ادھر علی بن محمد بن علی الصلیحی جن کے والد سنی المذہب، صالح اور بہت بڑے عالم اور یمن کے قاضی تھے، دولت کے لالچ میں مستنصر سے آملے۔ اور اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ پھر یہ عامر رواحی کے خلیفہ ہوئے۔ کہتے ہیں کہ عامر سوار ہو کر خود اس قاضی زادے کے پاس جاتا اور بڑی توقیر و عزت اور انعام و احسان کا برتاؤ کر کے اسے مسرور

وخوش دل کرتا۔

بعض اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ عامر کے پاس تصویروں کی ایک کتاب تھی جس میں وہ علی صلیحی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ بڑی رازداری اور خفیہ طریقہ سے علی کو بھی وہ تصویر دکھائی اور موجودہ و آئندہ کی خوشخبری سنائی۔ موت کے وقت اس کو اپنے علم اور کتب پر خلیفہ بنایا۔ تصویروں کی یہ کتاب عامر کے بیش بہا ذخیروں میں شمار ہوتی تھی۔ الغرض مہدویہ اور علی صلیحی عامر کے مذہب سے بہت متاثر تھے۔

علی صلیحی، نہایت ذکی، فہیم اور زیرک تھا۔ مختصر سی مدت میں، ادبی، کلامی، حکمی اور فقہی علوم میں کمال حاصل کر کے دولت عبیدیہ میں چوٹی کا فقیہ شمار ہوا۔ اور کافی عرصہ تک اس کا یہی حال رہا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ پندرہ سال تک لوگوں کو حج کراتا رہا۔ وہ حجاج کے قافلے کا امیر الحج بھی ہوتا تھا۔ ہر خاص و عام اس کی نوازشات اور انعامات و احسانات کا مورد ہوتا تھا۔

اچانک ۴۲۸ھ میں ساٹھ آدمیوں کے ساتھ یمن کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جا چڑھا۔ وہاں اپنے ساتھ کے آدمیوں سے پختہ عہد و پیمان لے کر اس بات پر بیعت لی کہ وہ لوگوں کو مہدوی مذہب کی دعوت دیں گے اور مستنصر علوی کے لئے لوگوں سے بیعت لیں گے۔ وہاں بہت بڑی تعداد میں لوگ اس کے پاس اکٹھے ہوں گئے۔ اور اس نے اسی پہاڑ پر بہت سنگین اور مضبوط قلعہ کی بنیاد رکھی۔

ظاہر میں تو تہامہ کے رئیس نجاح کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے دوستانہ اور خوشگوار تھے مگر در پردہ اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے ساز باز میں لگا ہوا تھا کیونکہ وہ اسے اپنے مقاصد کے حصول میں ایک رکاوٹ سمجھتا تھا۔ نجاح کو قتل کرنے کے سلسلے میں خفیہ طور پر بذریعہ خط و کتابت اس کا مستنصر سے بھی رابطہ تھا۔ بالآخر اظہار دوستی کے طور پر نجاح کو ایک کنیز، تحفۃً بھیجی وہ کنیز نہایت حسین ہونے کے ساتھ، آداب ملوکانہ سے بھی آراستہ و پیراستہ تھی، آداب مجلس میں ماہر اور انداز گفتگو دلنشین، خوش گو، خوش محاورہ، ہمہ صفت موصوف تھی۔

رئیس تہامہ نجاح کو یہ کنیز بہت پسند آئی۔ اور دل کو بہت بھائی۔ اور پھر ۴۵۲ھ میں اسی کنیز نے علی صلیحی کے ایما پر نجاح کو زہر دے کر مار ڈالا۔ جب یہ کانٹا درمیان سے نکل گیا تو ۴۵۳ھ میں مستنصر کو لکھا کہ اگر اجازت ہو تو دعوت کا کام علی الاعلان شروع کروں کیونکہ جو رکاوٹ تھی وہ تو راستہ سے ہٹادی گئی۔ مستنصر نے اجازت دیدی۔

چنانچہ اس نے بلاد یمن پر رفتہ رفتہ اپنا تسلط جمانا شروع کیا۔ بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا، اور دو سال کی مختصر سی مدت میں حسن تدبیر سے تمام یمن کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اور اس کے اثر سے یمن کی اکثریت نے مہدوی مذہب قبول کر لیا۔ ۴۷۳ھ میں دو ہزار سواروں کے ساتھ جن میں ایک سو ساٹھ نفر اس کے عزیز و اقارب تھے۔ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوا جب بیر اُم معبد نامی ایک گاؤں میں پہنچا، رئیس تہامہ نجاح کا بیٹا سعید اور اس کا بھائی جو شہر زبید میں اس کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یک بیک اس پر ٹوٹ پڑے۔ فوجیوں کی اکثریت اپنی ضروریات کے سلسلہ میں اِدھر اُدھر منتشر تھی، اس کے پاس بہت کم آدمی تھے۔ اس لئے ان کے قابو آ گیا، سعید نے اسے قتل کر دیا اور سر کاٹ کر لے گیا۔ اس کے علاوہ اس کے بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی تہ تیغ کیا۔ اور اس طرح اس فتنہ کی پوری پوری سرکوبی ہو گئی۔

صالح بن زریک ارمنی مہدوی فرقہ کا ایک اور داعی ہے جو بڑے داعیوں میں شمار ہوتا ہے یہ فائز بن ظافر عبیدی کا وزیر تھا۔ اس نے ہزاروں لوگوں کو دولت اور عہدوں کے لالچ دے کر شیعی مذہب قبول کرنے پر مجبور و مائل کیا۔

تاریخ یمن کا مصنف فقیہ عمارۃ یمنی بھی مہدوی فرقہ کے داعیان مذہب میں سے تھا۔ یہ خوش کلام مشہور شاعر تھا۔ اصل میں تو یہ شافعی المذہب تھا مگر دولت کی حرص میں پھنس کر مہدوی مذہب قبول کر کے ان کے مذہب کا داعی بنا۔ ان تمام حالات کے باوجود آخر عمر تک در پردہ شافعی المذہب ہی رہا۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ فقیہ عمارۃ باوجودیکہ در پردہ خود مہدوی مذہب سے بیزار تھا۔ مگر خلفاء، امراء اور وزرائے عبیدیہ کا مرہون کرم اور نمک خوار تھا عین اس وقت جب کہ سلطان صلاح الدین ایوبی دولت عبیدیہ کا تختہ اُلٹ کر مصر کو اپنے زیر اقتدار لایا، اور ان کے بچے کھچے لوگوں کو ٹھکانے لگانے میں مصروف تھا، یہ سلطان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کوشش میں لگ گیا کہ عبیدی حکومت از سر نو قائم ہو جائے چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھ دولت عبیدیہ کے سات سربرآوردہ لوگوں نے باہم اتفاق کر کے ساحلی انگریزوں سے سازباز کر لی اور ان سے کہا کہ وہ سامان حرب و ضرب جہازوں میں بھر کر لائیں اور عاضد کے بیٹے کو تخت نشین کریں۔ جب سلطان کو اس سازباز اور سازش کا پتہ چلا تو اس نے سارے سرغنوں کو سولی پر چڑھا کر زمین کو ان کے بوجھ سے ہلکا کر دیا۔ اس کے بعد مہدوی فرقہ صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گیا۔ مصر اور اس کے گرد و نواح میں اس مذہب کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ کیونکہ سلاطین ایوبیہ ان کی بیخ کنی میں لگ گئے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر چھوڑا۔ وہی تھوڑے سے لوگ بچ سکے جو کشتیوں یا جہازوں میں بیٹھ کر ہند کے آخری اطراف یا یمن و جزائر میں نکل گئے۔

چونکہ قرامطیہ اور نزاریہ کے داعیوں کا حال ہم صفحات ماسبق میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے اس کے اعادہ کو بے فائدہ سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس باب میں جو کچھ لکھا گیا وہ گو بظاہر قصہ، کہانی یا افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا مگر اس کو بھی بے فائدہ جان کر نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، بلکہ اس کو اپنے حافظہ میں محفوظ رکھنا چاہئے کیونکہ اس کے لفظ لفظ میں ایک نقطہ اور اس کے ہر قصہ میں ایک کھلی حکمت ہے آئندہ ابواب میں جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

دوسرا باب

شیعی مکروفریب اور ورغلا کر اپنے مذہب کی طرف لانیکے طریقے

یہ ایک ایسا علم ہے جس کی بنیاد دھوکہ پر استوار ہوئی ہے اور جس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اول ہم اس فن کے اصول و کلیات بتائیں اور پھر ان کے مکروفریب کی جزئیات پر تفصیل بحث کریں۔ لہذا یہ باب دو فصلوں پر مشتمل و مرتب ہے۔

پہلی فصل۔ ورغلانے اور دھوکہ دینے کے قواعد کلیہ | یہ بات جان لینی چاہیئے کہ اہل تشیع کے نزدیک مذہب کی بنیاد کے لئے سات قسم کے آدمی ضروری اور لابدی ہیں۔

اول:۔ امام، کہ اس کو پردہ غیب سے بلا واسطہ علم ملتا ہے اور وہ علم حاصل کرنے کے لئے زنجیر کی آخری کڑی ہے۔

دوسرا:۔ حجت، یہ وہ ہے جو مخاطب یا سامع کے مذاق کے مطابق اصول خطابت و برہان کی رعایت کرتے ہوئے

امام کے علم کو بیان کرتا ہے۔

تیسرا:۔ ذو مصہ۔ یہ وہ ہے جو علم کو حجت کے ذریعہ چوستا، یا کھینچتا ہے۔ کیونکہ عربی لغت میں مَص پستان سے دودھ چوسنے کو کہتے ہیں۔

چوتھا:۔ ابواب۔ ان کو دوسرے لفظوں میں دُعاۃ بھی کہتے ہیں۔ ان کے چند مراتب ہیں، سب سے بڑا داعی وہ ہے جو مومنین کا درجہ بڑھائے اور ان کو ترقی کی راہ پر لگا کر امام و حجت سے قریب کرے۔

پانچواں:۔ داعی ماذون۔ یہ وہ ہے جو لوگوں سے عہد و پیمان لے کر ان کو مذہب میں شامل کرتا ہے۔ اور ان پر علم و معرفت کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔

چھٹا:۔ مکلب۔ یہ وہ ہے جو اگرچہ بذات خود بلند مرتبہ کا مالک ہے۔ لیکن وہ دعوت مذہب کا مجاز نہیں۔ اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ دلیل و حجت سے لوگوں کو ہموار کرے، اور ان کو گھیر گھار کر داعی کی صحبت میں کھینچ لائے۔ اس کو شکاری کتے سے تشبیہ دی ہے۔ جو شکار کو ہانک کر اور ہر طرف سے اس کا راستہ بند کر کے شکاری کے پاس لے آتا ہے۔ ویسا ہی یہ مکلب ہے کہ آدمی کے مذہب میں شبہات ڈالتا ہے اور اس کے ہر احتمال کا جواب، دیتا ہے۔ جب وہ آدمی متحیر ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں حق طلبی کا جذبہ اور حق جوئی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ مکلب اس کو داعی ماذون کے پاس لے جاتا ہے اور داعی ماذون اس سے عہد و پیمان لے کر ذو مصہ کے حوالے کرتا ہے اگر اس شخص کی استعداد و قابلیت ذو مصہ سے بلند تر ہو تو وہ اس کو حجت تک پہنچاتا ہے اور وہ اس کو اسی طرح امام تک، بشرطیکہ امام مفقود نہ ہو۔

ساتواں:۔ وہ متبع مومن جو مکلب اور داعی کی کوشش سے امام کی تصدیق کر دے۔ اور دل میں امام کی متابعت کا عزم بالجزم رکھے۔

مراتب دعوت | پھر اسی طرح دعوت کے بھی سات مراتب ہیں۔

اول مرتبہ:۔ زرق۔ یعنی عقل و فراست سے مدعو کے بارے میں صحیح جانچ پرکھ کہ وہ دعوت کے قابل ہے یا نہیں یا اس پر دعوت اثر کرے گی یا نہیں کیونکہ انہیں کے بقول بنجر زمین میں تخم ریزی نہیں کرنی چاہیے یعنی جو دعوت کی قابلیت نہ رکھتا ہو اسے دعوت نہیں دینی چاہیے انکا یہ بھی قول ہے کہ جہاں روشنی ہو وہاں دم نہیں مارنا چاہیئے۔ یعنی جس جگہ اہل سنت کا اصولی، یا متکلم عالم ہو وہاں لب کشائی مناسب نہیں۔

دوسرا مرتبہ:۔ مدعو کو خود سے مانوس کرنا۔ اور ہر شخص کے مذاق کے مطابق اس کی دلجوئی کرنا مثلاً اگر ایک شخص زہد و طاعت کی طرف زیادہ مائل اور اس کا دلدادہ ہے تو اس کے سامنے اپنے آپ کو بھی زاہد و متقی ثابت کرنا۔ ائمہ کرام سے زہد و طاعت کے ثواب کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا

یا کوئی دوسرا جواہرات و زیورات پر فدا ہے اور ان کا شوقین ہے تو اس کے سامنے عقیق و یاقوت اور فیروزے کی فضیلتوں کی روایات بیان کرنا۔ اور اس پر ثواب عظیم کا وعدہ دینا۔ اسی طرح دیگر تمام امور خصوصاً کھانے، اولاد، عورتوں باغات یا گھوڑوں یا ان کے علاوہ معاملات میں مخاطب کے طبعی رجحان کے موافق بات کرنا۔

تیسرا مرتبہ:۔ تشکیک۔ یعنی فریق مخالف کے عقائد و اعمال میں شک و شبہ پیدا کرنا۔ مثلاً قصہ فدک بیان کرنا۔ اور اور اس میں حدیث قرطاس کا بیان چھیڑ دینا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تاریخ معین نہ کرنا۔ اور ایسے ہی آپ

کے نسک کی تعیین دلنشین نہ کرنا۔ کہ آیا وہ حج افراد تھا یا قران یا تمتع۔

یا اہل سنت کے مسائل میں فروعی اختلاف کو چھیڑنا۔ مثلاً رفع یدین کرنا یا نہ کرنا بسم اللہ بالجہر پڑھنا یا نہ پڑھنا۔ یا مقطعات قرآنی کا ذکر درمیان میں لانا یا متشابہات کے بارے میں تفاسیری اختلاف کو چھیڑنا موضوع بحث بنانا۔ یا ان جیسی کسی اور بات کی طرف کلام کا رخ بار بار پھیرنا۔ اور اسپر اظہار تعجب کرنا تاکہ سامع کے دل میں تردد اور شک پیدا ہو اور مطالب ان امور کی تحقیق حق کی طرف مائل ہو جائے۔ اور اپنے اہل سنت کے مذہبوں سے مایوس ہو کر دوسرے مذہب کی طرف جھک جائے۔

چوتھا مرتبہ:۔ ربط۔ یعنی عہد و پیمان کرنا اور ہر شخص سے اس کے اعتقاد کے موافق پختہ قول و اقرار کرنا کہ وہ ان بھیدوں کو فاش نہ کرے اور ان کو منظر عام پر نہ لائے، ان میں بعض ایسے ہیں جو مرتبہ تشکیک کے بعد مرتبہ چہارم میں حوالہ کرتے ہیں ان کی اصلاح میں حوالہ کے یہ معنے ہیں کہ جو امور اپنے سے حل نہ ہو سکیں ان کی تشریح کے لئے امام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیئے کہ امام دراصل اسی کام کے لئے ہے کہ علم بلا واسطہ غیب سے حاصل کر کے امت تک پہنچائے اور ایسی پریشانی کے دنوں میں ان امور کا حل بیان کر کے اختلافات کی جڑ کاٹے۔ اگر اہل سنت بھی اپنے علوم کا استفادہ امام سے کرتے تو آج اس زق زق بک بک میں نہ پڑتے اور الٹی سیدھی باتیں نہ کرتے

پانچواں مرتبہ:۔ تدلیس۔ یعنی ان اکابر دین، اکابر علماء اور برگزیدہ اولیاء کے بارے میں جو باجماع امت اس مذہب کے مخالف تھے یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ہمارے ہم مذہب تھے مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ حضرت سلمان فارسی ابوذر غفاری، مقداد کندی، اور عمار یاسر (رضی اللہ عنہم) شیعہ مذہب رکھتے تھے اور ان کے بعض کلمات کو اپنے جھوٹے دعوے پر بطور دلیل پیش کرنا۔ اور کہنا کہ حضرت حسان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) حضرت اویس قرنی اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری اور امام غزالی ملقب بحجۃ الاسلام بھی شیعہ تھے۔

اور کتاب سر العالمین کو جو محض ان بزرگ پر افتراء و بہتان ہے۔ اپنے دعویٰ کا شاہد بنانا اور کہنا کہ حکیم سنائی، مولانا روم، شمس تبریز اور خواجہ شیرازی رحمہم اللہ بھی باطن میں شیعہ تھے۔ اور ان ابیات کو جو ان سے منسوب ہیں یا ان کی مثنویات اور دیوانوں سے ملحق ہیں اپنے کلام کا گواہ بنانا۔

یہ ساری دروغ گوئی اس غرض سے کرتے ہیں کہ سامع کا میلان مذہب شیعہ کی طرف زیادہ ہو اور وہ سوچے کہ جس چیز کو ان اکابرین دین نے اختیار کیا اور یہ پوشیدہ رکھا ہے لامحالہ اس میں بھی کوئی بھید اور راز ہے۔

چھٹا مرتبہ۔ تاسیس۔ یعنی اپنے قاعدوں ضابطوں کو سامع کے ذہن میں رفتہ رفتہ جمانا۔ اور ان کے اصول مبادیات کو جو بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ ایسے طریقہ پر ان کے ذہن نشین کرنا کہ جب نتیجہ ان کے سامنے لایا جائے تو سوچ بچار کی گنجائش نہ رہے اور اس کو قبول کرتے ہی بنے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ قرآن مجید تمام مسلمانوں کا محور دین و ایمان ہے کسی کو اس سے مجال انکار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو کچھ فرمایا ہے۔ واجب القبول اور لائق تسلیم ہے۔ یہ کہہ کر پھر کہتے ہیں کہ آپ قُلْ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی ۔ (آپ کہئے ہیں میں اس ہدایت پر قرابت داروں سے محبت کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا) کیا معنی رکھتی ہے۔ اور الفاظ اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ (خبردار ہو کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے) کے متعلق کیا کہتے ہو۔ اور قراۃ متواترہ اَنْ جُلِیْکُمْ دزیہ کے ساتھ) کیا مطلب ظاہر کرتی ہے؟ اور قراۃ

شاده فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ کیا مضمون ادا کرتی ہے۔
ساتواں مرتبہ، خلع ۔ یعنی چہرہ کا پردہ ایک طرف رکھ کر صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) کی طرف ظلم و غضب کی نسبت کھلم کھلا کرنا۔ اور اپنے مذہب کے اصول و فروع کو صاف صاف بیان کرنا جب مدعو اس حد تک پہنچ جائے کہ سب امور کو بہ دانست کرے تو گویا مقصد حاصل ہو گیا۔ ان میں سے بعض مرتبہ خلع کے بعد ایک مرتبہ اور اضافہ کرتے ہیں جس کو سلخ کہتے ہیں، یعنی مدعو سے اپنے سابقہ معتقدات سے اظہار بیزاری کرانا اور اس کے آبا و اجداد جو اس مذہب پہ تھے ان سے اس کو متنفر کرنا۔ اور اولاد و اقارب سے قطع تعلق کرانا۔
عام طور پر تو ہوتا یہ ہے کہ ساتویں مرتبہ تک پہنچتے پہنچتے یہ باتیں از خود مدعو میں پیدا ہو کر رہتی ہیں۔ اس لئے داعی کو ان امور کی دعوت کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔

(دوسری فصل)

روافض کے دھوکوں کی تفصیلی جزئیات

معلوم ہونا چاہیئے کہ دھوکے تین قسموں سے زائد نہیں ہوتے۔
(۱) یا تو وہ محض افترا اور بہتان ہے۔ جو وہ اہل سنت پر باندھتے ہیں۔
(۲) یا انداز گفتگو اور طرز بیان میں کچھ گڑبڑ یا تبدیلی پیدا کرنا مثلاً ایک امر واقعی کو اس ڈھب سے بیان کرتے ہیں کہ اس کو سن کر عوام کے خیالات میں لازمی انتشار پیدا ہو۔ اور اصل میں۔
(۳) یا مذہب اصل سنت اصل میں تو بغیر تغیر و تبدل کے بے کم و کاست ہے۔ اور بطور حقیقت وہ کسی لعن و طعن کے قابل ہے۔
قلت فرصت کے سبب اور محاورۃً سب کچھ نہ پا سکو تو سب کچھ چھوڑ دینا بھی نہ" کے مصداق کے پیش نظر ہم ان کے دھوکوں کی جزئیات میں سے کچھ حصہ بیان کرتے اور ہر سہ اقسام میں گڑبڑ کو بغیر ان میں آپس کے امتیازی فرق کو چھیڑے بیان کرتے ہیں،
اس لئے کہ جو کچھ ہم نے بیان میں چھوڑ دیا ہے اس کا اندازہ لگانے میں ہم سامع کی ذہانت و ذکاوت پر اعتماد رکھتے ہیں۔
یہ بات بھی علم میں رہے کہ شیعی فرقوں میں باعتبار دھوکہ دہی اور لعن و طعن میں سب سے زیادہ سخت فرقہ امامیہ ہے! یہ لوگ مذہبی دعوت کو بہت اہمیت دیتے ہیں حالانکہ خود ان کے مذہب میں دوسرے کو اپنے مذہب کی دعوت دینا حرام اور ممنوع ہے۔ گویا اس دعوت میں وہ اپنے ہی اعتقاد کے مطابق مجرم اور گنہگار ٹھیرتے ہیں۔ چنانچہ کلینی امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا کُفُّوْا عَنِ النَّاسِ وَلَا تَدْعُوْا اَحَدًا اِلٰى اَمْرِكُمْ (لوگوں سے کنارہ کش رہو اور کسی ایک کو بھی اپنے مذہب کی دعوت نہ دو) جب امام مرحوم نے دعوت سے ممانعت فرما دی تو دعوت حرام ہوئی، اور اس کا ارتکاب بلکہ اس سے بھی زائد اسے عبادت کا درجہ دینا امام معصوم کی صریح مخالفت ہے!

پہلا دھوکہ :- یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ذمہ جو چیز واجب ہے اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے۔ اور جو بات اس کے مرتبہ الوہیت کے شان شایاں اور لائق ہے اس کو چھوڑتا ہے" ۔ یہ کھلا جھوٹ اور محض افترا ہے۔ کیونکہ اہل سنت نہ تو صراحتاً واصالتاً اس کے قائل ہیں اور نہ ہی ان کے اصول وقواعد سے یہ بات لازم آتی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اہل سنت تو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں کیونکہ کسی چیز کے وجوب کی نسبت اس کی طرف کرنا تصور وعقل سے باہر ہے جب واقعہ یہ ہو تو پھر کوتاہی کرنے یا چھوڑ دینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ البتہ خود شیعوں کے اصول کے مطابق یہ بات لازم آتی ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ہے۔ اور وہی اللہ تعالیٰ کی نسبت ایسی باتیں کہتے ہیں۔

• اللہ تعالیٰ تو درحقیقت ان ظالموں کی کہی ہوئی باتوں سے بہت ہی بلند و بالاتر ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ایک وقت معلوم تک کے لئے ابلیس کو پیدا کیا اور مہلت دی۔ اور بہکانے اور گمراہ کرنے کی اس کو طاقت بخشی حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ بات لازم تھی کہ گمراہ کرنے اور بہکانے کے ارادہ کے بعد اس کو ایک لمحہ کی فرصت نہ دیتا بلکہ فوراً اس کی جان مارتا، کہ اس کے مکلف بندے اطمینان قلب کے ساتھ اس کی عبادت وطاعت میں لگ جاتے۔ اور اگر مہلت دیتا بھی تو اس کو چاہیئے تھا کہ گمراہ کرنے کی طاقت اس کو نہ بخشتا۔ کیونکہ شیعی قاعدہ ہے کہ جو امر بندوں کے حق میں زیادہ بہتر ہو اس کو انجام دینا اللہ تعالیٰ پر فرض و واجب ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس فرض کو چھوڑ دیا۔

اہل سنت تو اصل وجوب ہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ بلکہ وہ سب سے باز پرس کرے گا اگر اس پہ کوئی چیز واجب و فرض ہوتی تو وہ بھی مخلوق کی طرح محکوم اور کسی کے زیر فرمان ہوتا۔ حالانکہ وہ جملہ مخلوق پر خواہ وہ عاقل ہو قہر و غلبہ رکھتا ہے۔

شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد بن حسن مہدی صاحب الزماں کے پاس سونے کی مہروں سے مزین ایک کتاب بھیجی تھی۔ جس میں ان کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ رہیں"۔

اس طرح تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو امام کے فیض وارشاد سے محروم کر دیا۔ اس کے جواب میں اگر شیعہ یہ کہیں کہ دشمنوں کے خوف سے ان کو اس قسم کا حکم دیا گیا تو اس پہ ہم کہیں گے کہ ان کے دشمنوں کو پیدا ہی کیوں کیا۔ اور پیدا کیا بھی تھا تو ان کو امام کو تکلیف پہنچانے کی طاقت کیوں نہ سلب کر لی اور یہ سب کچھ نہیں کیا تھا تو امام کو مدافعت کیوں نہ دیدی۔

الغرض یہ لوگ اپنا عیب دوسروں پر چسپاں کرنے میں بڑے چالاک و ماہر ہیں اس موقع کی تحقیق یہ ہے کہ اہل سنت تو اول قدم پر ہی اس کے منکر ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب ہے۔ تاکہ اس قسم کے شبہات میں ان کی عقل نہ چکرائے۔ یہ تو شیعہ اور معتزلہ ہی ہیں۔ جو وجوب اصلح کے قائل ہوئے اور جب واقعہ کے لحاظ سے اس کے خلاف دیکھا تو پھر اور مہمل تکلفات سے ان شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جو سائل کے دل کی کسی طرح تسلی و تشفی نہیں کر سکتے تھے۔ جب اس سے کام نہ چلا کھسیانی بلی نے کھمبا نوچا، اور اہل سنت پر طعن کرنے لگے۔ کہ

ہم اللہ تعالیٰ کے لئے جس چیز کو واجب جانتے ہیں اہل سنت اس کو کیوں نہیں مانتے، بلکہ اس کے ترک کو جائز خیال کرتے ہیں۔
بات کچھ نہیں یہ ایک دھوکہ ہے۔ جو اکثر تنخواہی مسائل میں پیش آتا ہے۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ جس چیز کو تم واجب کہتے ہو وہ درحقیقت واجب ہے ہی نہیں۔ تو اس کا ترک، واجب کا ترک کیسے کہلائے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک جاہل شخص مفتی کے پاس گیا، اور پوچھا کہ بیوی کی ماں بیوی ہو سکتی ہے۔ مفتی نے کہا نہیں! کہنے لگا میں نے تو ایسا کر لیا۔ اب کیا ہو؟۔

یہی حال ان کا ہے کہ عقلی گدوں اور کرتبوں کے باوجود ملحدوں کے شبہات دور کرنے میں جب ان کی سٹی گم ہو جاتی ہے تو عاجز و شرمندہ ہو کر آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کاموں کی مصلحتیں اللہ ہی جانتا ہے۔

ان پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ انچہ دانا کند، کند ناداں، لیک بعد از خرابی بسیار دکہ دانا جو کچھ کرتا ہے نادان کو بھی جھک مار کر وہی کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا دھوکہ: یہ دھوکہ بھی اسی قسم کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل سنت اللہ تعالیٰ سے برائیوں کے صدور کو جائز مانتے ہیں،، مثلاً زنا، چوری کا صدور اللہ تعالیٰ کے خلق وارادہ کی بنا پر مانتے ہیں نہ کہ انسان وشیطان کے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا سوء ادب اور سخت گستاخی ہے۔ اور یہ نادان نہیں جانتے کہ اہل سنت کا تو یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل برا نہیں۔ جو فعل جو انسان وشیطان کی نسبت سے برا ہے اور اسی پر ان کی گرفت ہوگی وہی فعل اللہ تعالیٰ کی نسبت سے برائی سے پاک اور بری ہے

یہ بات بالکل واضح ہے کہ حسن وقبح اچھائی، برائی نسبتی امور میں سے ہیں جن کی طرف ان کی نسبت کی جائے ان کے اختلاف کی وجہ سے ان میں بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اصل قباحت اور برائی تو ان دونوں کا اللہ تعالیٰ سے صدور ماننا ہے جس کی وجہ سے الجھنوں کے گرداب میں پڑ جاتا ہے۔

اصول شیعہ کے مطابق جب اچھائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ کے افعال میں پایا گیا تو چاہے برائی پیدا کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ بھی کی جائے تب بھی برے کاموں پر بندوں کو قدرت و اختیار دینا تو اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اور یہ بات چار و ناچار شیعوں کو بھی ماننی پڑ رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے برائیوں کا صدور خود بخود لازم آجاتا ہے کیونکہ برائی پر کسی کو قدرت و اختیار دینا بھی تو برائی ہے۔

مثلاً ایک شخص کے متعلق ہم یقین سے جانتے ہیں کہ اگر اسے چھری مل گئی تو وہ اپنا پیٹ پھاڑ لے گا اس کے باوجود اسے چھری تھما دیں۔ تو عقلمندوں کے نزدیک قابل ملامت و مذمت باہم ہوں گے نہ وہ خود اور اس کے باوجود کہ اسنے اپنا پیٹ خود پھاڑا ہے، اس کے مارڈالنے والے ہمیں ہوں گے۔ یہ دونوں صورتیں بالکل ایک جیسی ہیں۔ تو اس طعن کے مورد بھی شیعہ خود ہی ٹھہرے،

اہل سنت نے تو یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ کی ذات افعال قبیحہ کے صدور سے پاک و بری ہے اور صدور فعل میں توحید حقیقی کا اعتقاد رکھ کر بلا شرکت غیر اس سے افعال صادر ہوتے ہیں تمام اعتراضات والزامات کی جڑیں ہی کاٹ دیں۔ اور امن چین سے ہو گئے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ۔ (یہ ان پر اللہ کا فضل ہے)۔

اور ایک بات یہ بھی کہ سب مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کے گوشت کو انسان کے لئے حلال کیا ہے اور

ان کو حیوانات پر پورا پورا تسلط دیا ہے، پس ان کو ذبح کرتے ہیں، ان کی کھال کھینچتے ہیں۔ اب انسانوں میں تو بہت سے نافرمان و سرکش بھی ہیں جب کہ جانور سب کے سب مطیع و فرمانبردار اور تسبیح خواں ہیں، تو نافرمانوں کو مطیع و فرمانبردار پر اس حد تک مسلط کرنا کہ وہ انہیں قتل بھی کریں، ان کی کھال بھی کھینچیں۔ اگر چہ یہ برائی نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ حیوانوں کو یہاں جو دکھ اور تکلیف پہنچ رہی ہے اس کے عوض آخرت میں یہ کئی گنا بدلہ پائیں گے۔ جیسا کہ شیعہ اور معتزلہ کا مذہب ہے۔ اور جس تکلیف کے عوض بہت کچھ اچھا بدلہ ملے۔ وہ ضائع اور رائیگاں نہیں ہوتا تو اس پر ہم کہیں گے کہ پہلے تکلیف پہنچانا پھر بدلہ دینے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ اسے تکلیف پہنچائی ہی نہ جائے کہ اس کا بدلہ دینا پڑے۔ اکثر عقلمندوں کے نزدیک یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص کے بیٹے کو اول مار ڈالا جائے اور پھر قتل کی دیت دیدی جائے اور یہ عذر کیا جائے کہ اس سے غرض تو یہ تھی کہ اس دیت کی رقم سے اس شخص کا افلاس دور ہو تو کون عقلمند اس کو عدل و انصاف کہے گا۔

ایک اور صورت: کہ اللہ تعالیٰ اپنے اکثر گنہگار بندوں کو بڑی فراوانی سے دولت دیتا ہے حالانکہ ان لوگوں کے حق میں دولت کی کثرت سم قاتل سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے زمین پر فساد، تباہ کاری فسق و فجور، تکبر و بغاوت برپا کرتے اور خون ریزی، زنا کاری، لواطت، شراب نوشی وغیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں، بلکہ بعض تو نمرود، فرعون اور مقنع کی طرح خدا بن بیٹھتے ہیں۔ بعض پیغمبروں، پیغمبر زادوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ تو یہ سارے افعال سب ہی کے نزدیک برے اور قبیح ہیں اور ان برے کاموں پر قدرت دینا۔ یا ان کے لئے اسباب مہیا کر دینا۔ بجائے خود قبیح تر ہے۔

اس پر اگر شیعہ یہ کہیں کہ پیغمبروں یا پیغمبر زادوں پر قید و بند یا قتل و ذلت کی جو کچھ مصیبتیں آئیں وہ چونکہ آخرت میں ثواب عظیم کا سبب ہیں اس لئے ان مصیبتوں میں تو حسن و صلاح ہے نہ کہ قبیح و فساد، تو ہم ان سے پوچھیں گے کہ ان پیغمبروں یا پیغمبر زادوں کو جو ان مصائب سے دوچار نہیں ہوئے، یہ ثواب ملے گا یا نہیں۔ اگر ملا تو مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں ترک اصلح ہوا اور فعل قبیح کا ارتکاب؛ اور اگر ان کو یہ ثواب نہیں ملے گا تو پھر ان کے حق میں ترک اصلح اور فعل قبیح کا ارتکاب ہوا کہ وہ ثواب عظیم سے محروم ہوئے۔

اب ہر دو مسئلوں کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ کہ وجوب کی اور حسن و قبح کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) طبعی، (۲) شرعی اور (۳) عقلی۔

تو معلوم ہونا چاہیئے کہ باجماع علماء یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وجوب طبعی و شرعی متصور نہیں کیونکہ پہلا وجوب بے اختیاری اور بیچارگی کی دلیل ہے کہ طبیعت سے مجبوری کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرا محکوم و مکلف ہونے کو متقاضی ہے اور اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب سے پاک و منزہ ہے اب رہا وجوب عقلی کے یہ معنے کہ ہر خصوصی اور جزئی واقعہ میں عقل کے تقاضے کے خلاف کام کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے جائز نہ ہو تو یہ معنی شان الوہیت کے سراسر خلاف ہے اور بحث بھی اسی میں ہے۔ کیونکہ شیعہ اور معتزلہ اسی معنی کو صرف دین، یا دین و دنیا دونوں میں ثابت کرتے ہیں ان کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی حیثیت، ارسطو، افلاطون، یا سکندر، دارا اور نگزیب کی سی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب عقلاء اور عقول حادث ہیں اور مخلوق و مقہور، اور ہر حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے زیر فرمان تو اب اللہ تعالیٰ

کو اسی کی مخلوق اور حوادثات کے زیر فرمان ماننا کتنی بے عقلی اور بد عقلی کی بات ہے۔
اور اگر وجوب عقلی کا یہ مطلب ہے کہ تمام عالم کی مصلحتوں کے پیش نظر جو کچھ حکمت کا تقاضا ہو اس کے مطابق اللہ تعالیٰ سے فعل سرزد ہو تو یہ بات اہل سنت کے ہاں بھی تسلیم شدہ ہے (یُرَاعِی الْحِکْمَۃَ فِیْمَا خَلَقَ وَاَمَرَ د اللہ تعالیٰ ہر چیز کی پیدائش اور اس کے حکم کے وقت حکمت کو مدنظر رکھتا ہے)، جیسا کہ عقائد عضدیہ اور علم کلام کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔
لیکن جب تمام عالم کی مصلحتوں کا لحاظ رکھنے کا نام حکمت الٰہیہ ہے اور ان مصلحتوں پر خدائے علام الغیوب کے سوا کسی کا احاطہ ممکن نہیں تو ہر خصوصی فرد یا جزئی واقعہ میں اصلح پہلو کو متعین کرنا اور اس کو اللہ تعالیٰ پر واجب ٹھہرانا انتہائی بے ادبی اور حد درجہ کی بے عقلی ہے۔ اور پھر یہ ممکن بھی نہیں۔ اس لئے اہل سنت نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ سرزد ہو اس کے بارے میں یہ اجمالی عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ وہ حکمت کے مطابق ہے۔ اور جو صادر نہ ہو اس کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ حکمت کے موافق نہ تھا۔ یہ نہیں کہ وہ ادھورے جزئی اصول کلیہ جو عقلا کی ایک جماعت نے گھڑ گھڑا کر مقرر کر لئے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چسپاں کر دیا جائے۔ لہٰذا اہل سنت وجوب یہاں بھی استعمال نہیں کرتے تاکہ خلاف مقصود کا وہم تک نہ ہو سکے۔
حاصل کلام یہ کہ ان شبہات کا جواب دینا شیعوں کے احاطہ امکان سے باہر ہے تا آنکہ وہ اہل سنت کے مذہب کو مان کر عقیدہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ تسلیم نہ کر لیں۔
تیسرا دھوکہ: شیعہ یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ اہل سنت اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم منسوب کرتے ہیں اس لئے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ مومن مطیع کو ہمیشہ دوزخ میں رکھ کر ابدی عذاب بھی دے تو جائز ہے۔
اس دھوکہ کا جواب بھی اوپر کے بیان میں آگیا۔ کہ اہل سنت کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تو ظلم کا صدور ممکن ہی نہیں اس لئے کہ تمام مخلوق اس کی ملک ہیں وہ مالک و مختار ہے جو چاہے کرے۔
پھر اس کے علاوہ عذاب کو جائز جاننا اور چیز ہے اور اس کے وقوع کا قائل ہونا دوسری چیز۔ بلکہ یہاں تو معاملہ الٹا ہے کہ اہل سنت کے بجائے شیعوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے ظلم جائز بھی ہے اور واقع بھی۔ چنانچہ ائمہ سے ابن بابویہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ اِنَّ اَوْلَادَ الْکُفَّارِ فِی النَّارِ (کافروں کی سب اولاد جہنم میں ہے) اب ظاہر ہے کہ کافر ماں باپ کے گناہوں میں معصوم و بے قصور اولاد کو پکڑنا اور عذاب ابدی کی سزا دینا سراسر خلاف انصاف ہے اور یہ بھی کہ دنیا میں درندوں کو پیدا کیا۔ کمزور جانوروں کا گوشت ان کی غذا بنایا۔ حالانکہ یہ کمزور جانور بے گناہ ہیں تو قوی کو ضعیف و ناتواں پر مسلط کرنا عین ظلم ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں۔
دوسرے، انسان کو پیدا کیا، اس میں قوت شہویہ رکھ کر نفس شہوانی کو غلبہ دیا پھر دنیاوی لطائف و لذائذ سے اسے باخبر کر کے ایسی شرعی ذمہ داریاں اس پر لگائیں جو اس کے نفس پر شاق اور اسکی طبیعت کے خلاف ہیں اور دنیاوی مزوں کے استفادہ سے اس کو روک دیا، ایک چھپے ہوئے اور اس کی نظروں سے اوجھل دشمن کو اس پر مسلط کر دیا کہ اس کے دل میں وسوسے ڈالے۔ ادھر تو دشمن کو دل پر پورا تصرف دیا وسوسہ ڈالنے کی پوری قدرت بخشی اور دوسری طرف دل کو قوت مدافعت سے محروم کر دیا۔ تاکہ وہ محض بے اختیار ہو کر اس کا تابع ہو جائے۔ امام جو ایک حد تک اس کے شر کو دور کر سکتا تھا اس کو چھپنے کا حکم دے دیا یہ سب کھلم کھلا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک فقیر کو، ہم نے ایک مکان میں بند کر کے بھوکا

پیاسا رکھا، جب وہ بھوک پیاس سے لب دم ہو گیا تو اس کے لئے طرح طرح کے خوش ذائقہ کھانے اور مشروبات لذیذہ کا انتظام کیا، اس کے ساتھ ایک مصاحب بھی بٹھا دیا جو اس کو بار بار ان لذیذ کھانوں اور مشروبات کی طرف رغبت دلاتا رہے۔ اور ان کی خوبی اس کے دل میں جماتا رہے اور اسے سمجھائے کہ ان کھانوں اور مشروبات کا مالک بڑا سخی بخشش کرنے والا، تجھ پر تیرے ماں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان ہے، عفو و درگزر اس کی خصلت ہے تو کیوں اپنی جان بھوک پیاس میں ضائع کرتا ہے کھا اور خوب کھا اور اس سے امید عفو رکھ۔

ایسے حالات میں اس بھوکے فقیر کو ہم اگر یہ کہیں کہ دیکھ خبردار جو تو نے ان کھانوں اور مشروبات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یا ان پر نظر بھی ڈالی، تو تجھے ایسا عذاب دیں گے، ظاہر ہے اس مسکین فقیر کے حق میں یہ صاف صریح ظلم ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر اہل بیت کرام کا، جو مذہب شیعی کتابوں میں منقول ہے و مروی ہے وہ تو لامحالہ قابل قبول ہونا ہی چاہیئے۔ سو ہم انشاء اللہ الہیات کی بحث میں حضرت سجاد ابن العابدینؒ کی وہ صاف صریح روایات شیعہ کتب سے نقل کریں گے جن میں کہا گیا ہے کہ بیگناہ کو بدلہ دیئے بغیر تکلیف دینا جائز ہے۔

چوتھا دھوکہ: شیعہ کہتے ہیں کہ اہل سنت انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق یہ غلط و ناقص عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف شیعہ ان میں پوری نزاہت اور پاکیزگی کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ اسے درست نہیں سمجھتے کہ نبیوں سے نبوت سے پہلے یا نبوت کے بعد کوئی بڑا یا چھوٹا گناہ سرزد ہو سکتا ہے اس لحاظ سے اس اہل سنت کی نسبت شیعہ مذہب ادب سے زیادہ قریب ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انبیاء کرام سے گناہ سرزد ہونا تسلیم کر لیا جائے تو ان کے قول و فعل سے اعتماد اٹھ جائے گا اور ان کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

مگر یہ سب کچھ افتراء، بہتان، تحریف اور مسخ ہے۔ کیونکہ اہل سنت گناہ کبیرہ کو بعد نبوت عمداً و سہواً ہرگز جائز نہیں رکھتے۔ البتہ گناہ صغیرہ کو سہواً جائز سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ اس پر اصرار نہ ہو۔ اور جھوٹ، نہ عمداً نہ سہواً نہ قبل نبوت نہ بعد نبوت، ان سے منسوب کرنیکو جائز نہیں سمجھتے اس صورت میں ان سے اعتماد اٹھنے کا سوال ہی نہیں۔

یہاں ایک باریک بات قابل غور ہے کہ شیعہ اکثر مسائل میں زیادتی سے کام لیتے ہیں اور ہر بلند درجہ کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں مگر واقعہ اور حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کا مذہب ایک وہم اور غیر حقیقی بن کر رہ جاتا ہے۔

برخلاف اہل سنت کے کہ وہ ہر قدم، جانچ پرکھ اور خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں اور واقعہ و حقیقت کبھی ان کی تکذیب نہیں کرتے۔ شیعوں کے اکثر اعتقادی مسائل میں یہی نقص پیدا ہو گیا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے موہوم عقائد کو نفس الامر سے ہم آہنگ کرنے میں عقلی طور پر فرو مایہ رہ جاتے ہیں، اور حیران و پریشان ہوتے ہیں اور پھر لچر و مہمل اقوال ان سے سرزد ہونے لگتے ہیں چنانچہ یہ عقیدہ بھی انہی مسائل میں سے ہے۔

بے شمار آیات قرآنی اور احادیث نبوی اثبات پر ناطق و شاہد ہیں کہ انبیاء کرام سے لغزشوں کا صدور ہوا اور ان پر عتاب الٰہی بھی ہوا اور نتیجۃً اور ان حضرات کی جانب سے، بکاء، ندامت اور اظہار عجز و زاری ہوا اگر ہم عصمت کو نکتہ عروج پر پہنچا دیں تو پھر ان صریح آیات و احادیث کی توضیح و تشریح میں مہمل و بے معنی کلمات کے سوا ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا تو اول ہی مرحلے پر ہم عصمت کے ایسے معنی کیوں نہ متعین کر لیں کہ بعد میں ان الجھنوں اور پریشانیوں سے سابقہ نہ پڑے۔

پھر تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس بلندی اعتقاد کے باوجود یہ خود اپنے معصوم ائمہ سے ایسی روایات بیان کرتے ہیں جن سے انبیاء کرام علیہم السلام سے نبوت کے بعد گناہ کبیرہ سرزد ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ کلینی سند صحیح کے ساتھ ان الفاظ سے ابویعفور سے روایت بیان کرتا ہے اور وہ ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہ اَنَّ یُوْنُسَ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَدْ اَتٰی ذَنْبًا کَانَ الْمَوْتُ عَلَیْہِ حَلَالًا۔

اسی طرح مرتضیٰ، جس کا شمار ان کے ان معتبر مجتہدین میں ہوتا ہے انبیاء کرام سے قبل البلوغ گناہ کے صدور کو جائز قرار دیتا ہے۔ اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کے سلوک کو صغر سنی پر محمول کرتا ہے۔ اس کلام کی کمزوری ظاہر و باہر ہے۔

غرض ان شیعوں نے جو کام بھی کئے ہیں چھوٹی عمر کے بچوں سے بھی ایسے کاموں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پانچواں دھوکہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت پیغمبروں سے بھول چوک سرزد ہونے کو جائز کہتے ہیں اور دلیل میں اہل سنت کی یہ روایت لاتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو چار رکعت والی نماز میں سہو ہوا اور آپ نے دو رکعت پہ سلام پھیر دیا۔

تو بھلا اس میں طعن کا کونسا پہلو ہے۔ بھول چوک خاصہ بشری ہے۔ اور چونکہ بشریت میں انبیاء کرام سب انسانوں کے ساتھ شریک ہیں۔ لہٰذا ان میں امور بشریہ کا ہونا لازمی ہے۔ مثلاً مرض درد سر۔ زخم اور قتل جیسے عوارض ان کو بھی لاحق ہوتے ہیں سانپ بچھو ان کو بھی ڈستے ہیں، دکھ درد ان کو ستاتا ہے، نیند و غفلت ان کو بھی ہوتی ہے (جادو سے یہ بھی متاثر ہوتے ہیں)۔ تو اب سہو ان امور میں کونسا بلند مرتبہ رکھتا ہے جس کا لاحق ہونا انبیاء علیہم السلام کی ذات میں علامت نقص کا باعث ہوا۔ البتہ تبلیغی امور میں ان سے سہو کبھی سرزد نہیں ہوتا نہ اس کا اعتقاد جائز ہے کہ جائز کو ناجائز یا امر کے بجائے نہی فرمائیں۔

بعض محقق علماء نے لکھا ہے کہ انبیاء کرام سے سہو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ہر دم ذات باری کے حضور اور اس کے مشاہدہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور عوام کا سہو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور میں پراگندہ دل ہوتے ہیں تو صورت سہو میں تو مشترک ہے۔ مگر سبب اور درجہ میں اختلاف: اسی لئے کہا گیا ہے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر	(ہرگز نیک لوگوں پر اپنے آپ کو قیاس نہ کرو اگرچہ شیر (درندہ)
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شِیر	اور شیر ایک طرح لکھے جاتے ہیں دیکھو پھر بھی الگ الگ ہیں)

شیخ حلی نے قصہ ذوالیدین کو اصل سنت پر طعن کا بڑا اچھا مورد خیال کیا ہے حالانکہ واقعہ کے بیان اور امر حق کی روایت میں طعن کیا ہے اس کے بعد باوجود دروغ گو را حافظہ نباشد کے مصداق شیخ مذکور کو یہ یاد نہیں رہا کہ خود کلینی اور ابوجعفر طوسی صحیح سندوں کے ساتھ ذوالیدین کے قصہ کو روایت کرتے ہیں۔ جو ان کی کتابوں میں موجود ہے تو جس بات پر وہ اصل سنت کو مطعون کرتے ہیں وہ خود اس کا مورد ٹھیرتے ہیں اس لئے کہ اہل سنت تو سہو کو نقص نہیں سمجھتے اور شیعہ اس کو نقص ماننے کے باوجود اس کی روایت کرتے ہیں۔ جو زیادہ قابل طعن ہے۔

چھٹا دھوکہ۔ یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت پیغمبروں کے لئے زبان سے کلمہ کفر کی ادائیگی کو جائز کہتے ہیں اور روایت کرتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے لات و عزیٰ کی مدح فرمائی۔

ان کا طعن یہ بھی مسخ و تحریف میں شمار ہوتا ہے، اس لئے اہل سنت کی کتب تفسیر میں ضعیف روایت کے حوالہ سے یہ آیا ہے کہ سورہ نجم کی تلاوت کے وقت شیطان نے اس مجلس میں شریک ہو کر بلند آواز سے چند ایسے کلمے ادا کئے جن سے غرانیق علا کی مدح نکلتی ہے حالانکہ غرانیق کا لفظ بھی ملائکہ اور اصنام ہر دو میں شریک ہے۔ کفار اس کو اپنے بتوں کی تعریف سن کر بڑے خوش ہوئے۔ موسیٰ بن عقبہ نے روایت کی ہے کہ مسلمانوں نے یہ الفاظ بالکل نہیں سنے اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ کو بے انتہا رنج و صدمہ ہوا۔ چنانچہ آپ کی تسلی کی خاطر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ۔

"اور آپ سے پہلے بھی ہم نے کوئی نبی و رسول نہیں بھیجا کہ کسی وقت اس نے تمنا کی ہو اور شیطان نے اس میں کچھ نہ ڈالا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے ڈالے ہوئے کو دور کر دیتا ہے اور مضبوط کرتا ہے اپنی آیتوں کو اور اللہ تعالیٰ دانا اور بڑی حکمت والا ہے کہ کر دیتا ہے شیطانی ملاوٹ کو ان کے حق میں فساد جن کے دلوں میں روگ ہے اور جن کے دل سیاہ ہیں"

اب بنظر انصاف سیاق آیت پر غور کیجئے کہ یہ آیت اس قصہ پر کس حد تک چسپاں ہوتی ہے، گو یا اس کے معنے صرف یہی ہیں اور پھر اس قصہ پہ غور و فکر کی نظر ڈالیں کہ اس میں برائی کونسی ہے۔ اور پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر کونسے کلمات کفر آئے۔

شیطان کا انسان کو اشتباہ میں ڈالنا، آوازوں اور نغموں کے ذریعہ حکایات کرنا کونسی انوکھی اور تعجب کی بات ہے۔ ہاں اس بات پر تعجب ہے کہ کفار کے سامنے شیطانی کلمات، فرقانی کلمات سے گڈ مڈ کیسے ہو گئے کہ فرقانی کلمات تو اعجازی صفت سے متصف ہوتے ہیں اور شیطانی کلمات اس سے عاری۔ لیکن جب واقعہ کی گہرائی تک پہنچ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کفار کی عجلت پسندی نے ان کو شیطانی کلمات کے اعجازی پہلو اور بلاغت پر غور اور سوچ کا موقع ہی نہیں دیا۔ انہوں نے ان کلمات کے ظاہری مطلب کو اپنے عقیدہ کے مطابق پایا تو یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ سب کلمات فرقانی ہی ہیں جیسا کہ عام شیعہ کی حالت ہے اگر ان کو اپنے امام سے کوئی ضعیف روایت بھی مل جاتی ہے جو ان کے مذہب کے موافق ہو اور مذہب اہل سنت کے مخالف ہو تو اسے سر آنکھوں پہ رکھتے اور اس کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں صحیح احادیث کو پس پشت ڈال دیتے ہیں حالانکہ ائمہ کا کلام غیر ائمہ کے کلام کے ساتھ مشتبہ نہیں ہو سکتا لیکن حمیت و عصبیت کا پردہ آنکھوں میں ایسا پڑا ہوتا ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ اگر اہل سنت اتنی سی بات پہ مطعون قرار پاتے ہیں تو امامیہ تو جو اپنی کتب صحیحہ میں انبیاء اور رسولوں کی "کفریات"، کی روایت بیان کرتے ہیں۔ جس کی مثالیں انشاء اللہ ان کے عقائد کے بیان میں پیش کی جائیں گی۔ ملعون ٹھیرتے ہیں۔ اور مطعون و ملعون کے فرق کو یقیناً ہر کوئی جانتا ہے

ساتواں دھوکہ۔ شیعہ کہتے ہیں، کہ سوائے پانچ چھ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اہل بیت کے دشمن اور ان کی طرف سے بغض رکھنے والے تھے"۔

یہ الزام بھی سراسر بہتان اور افترا ہے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اہل شام کا اور متعصب جماعت کا رئیس بتلاتے ہیں۔ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی تھے کہ جنہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید حتی کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مرضی پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مرضی کو ترجیح دی واقعہ یہ ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کا رشتہ ام خالد سے جو حسن وجمال میں یکتا تھی کرنا چاہا۔ اور مقصد کے لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو شام سے مدینہ بھیجا۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن زبیر رضؓ عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن مطیع بن اسودؓ نے بھی اپنی منگنی کے مقامات انہی کے توسط سے بھیجے، ادھر غالباً حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس کے خواستگار رہوں گے۔ جب ام خالد نے اس معاملہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کو اپنا مشیر بنا کر ان سے مشورہ کیا کہ ان لوگوں میں سے کس کو ترجیح دوں تو آپ رضؓ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہیں رسول اللہ کے نواسے اور فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا کے لال سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتا تو دنیا کے مال ومتاع پر خاک ڈال اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بہو بننے کو غنیمت جان؛ چنانچہ ام خالد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کے مشورہ سے دولت کو ٹھکرا کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا اور اس شرف سے مشرف ہوئی علاوہ ازیں ابن السمان کی کتاب الموافقہ میں اہل بیت کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت اور ان کی خاص نسبتوں کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ وہاں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

آٹھواں دھوکہ۔ کہتے ہیں کہ اہل سنت قرآن کی مخالفت کرتے ہیں مثلاً وضوء میں پاؤں پر مسح کرنے کے بجائے ان کو دھوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی آیت صاف طور پر مسح پر دلالت کرتی ہے۔ اس دھوکہ نے بہت سے ایسے جاہلوں کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے جو نحو اور عربی کی معمولی شد بد کے ساتھ احکام الٰہی کی تحقیق میں قدم رکھتے اور خود کو عالم سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اتنی قابلیت بھی نہیں رکھتے اصول اور قواعد اجتہاد کو سمجھ سکیں۔ یا مختلف مسائل میں باہم تطبیق دے سکیں۔

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو فریقین کے نزدیک قرآن مجید میں آیت وضو میں اَرْجُلِکُمْ ل کے زیر اور زبر کی قرأتیں متواتر صحیح اور درست ہیں۔

پھر دونوں اس اصول قاعدہ پر بھی متفق ہیں کہ جب دو متواتر قرأتیں باہم متعارض ہوں تو وہ دو مختلف آیتوں کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لئے پہلے تو ان دونوں میں تطبیق کی کوشش کرنی چاہیئے۔ پھر ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کے بارے میں غور کرنا چاہیئے اگر دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو ان کو کالعدم تصور کرکے ان سے کم مرتبہ دلائل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے مثلاً دو آیتوں میں تطبیق ممکن نہ ہو تو حدیث کی طرف رجوع کریں، کیونکہ تعارض کے سبب آیتوں پر عمل ممکن نہ ہونے کے سبب وہ کالعدم ہوگئیں اور اگر احادیث باہم متعارض ہوں تو اقوال صحابہ اور اہل بیت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یا جو لوگ قیاس کے قائل ہیں ان کو مجتہدین کے قیاس پر عمل کرنا چاہیئے۔

پس اس آیت وضو میں ہم نے دونوں قرأتوں میں غور کیا تو اہل سنت کے نزدیک ہر دو قرأت میں دو وجوہ سے تطبیق پائی۔

ایک یہ کہ مسح کو غسل پر محمول کریں جیسا کہ ابو زید انصاری اور دوسرے اہل لغت نے ان الفاظ میں تصریح کی ہے۔

اَلْمَسْحُ فِی کَلَامِ الْعَرَبِ یَکُوْنُ غَسْلاً یُقَالُ لِلرَّجُلِ اِذَا تَوَضَّاءَ تَمَسَّحَ وَیُقَالُ مَسَحَ اللّٰہُ مَابِکَ اَیْ اَزَالَ

کلام عرب میں مسح کے معنے غسل کے بھی ہوتے ہیں۔ وضو کرنے والے کے لئے کہا جاتا ہے تمسح یعنی اس نے وضو کیا یہ بھی کہتے ہیں مسح اللہ

عَنْكَ الْمَرَضَ وَيُقَالُ مَسَحَ الْاَرْضَ الْمَطَرَ ۔ کہ اللہ تعالیٰ تیرے مرض کو دور کرے اور اسی طرح مسح الارض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بارش نے زمین کو دھو دیا ۔

اس وجہ میں اگر شیعہ یہ جرح کریں کہ پہلے جملہ میں مسح کے حقیقی معنی مراد ہیں اور اس جملہ میں مجازی معنی ۔ تو ایک ہی چیز میں حقیقت و مجاز کا اجتماع ناجائز اور ممتنع ہے ۔

اس کا جواب یہ ہوگا کہ بار جملہ سے پہلے امسحوا کا لفظ لایا گیا ہے ۔ تو اب جب لفظ دو ہو گئے تو دو معنے مراد لینے میں کوئی منافقہ نہ رہا ۔ شارح زبدۃ الاصول امامیہ کے ماہرین عربیت سے نقل کرتا ہے کہ حقیقت و مجاز کا اس طرح جمع ہونا جائز ہے مثلاً معطوف علیہ میں حقیقی معنے مراد ہوں اور معطوف میں مجازی ۔ چنانچہ آیت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ ۔ میں کہا ہے کہ صلوٰۃ بحالت معطوف علیہ مخصوص ارکان شریعت میں حقیقی معنے ہیں یعنی مسجد جو محل نماز ہے میں مستعمل ہے ۔ شارح زبدہ کا کہنا ہے کہ یہ استخدام کی ایک قسم ہے ۔

امامیہ کے مفسرین کی ایک جماعت اور ان کے فقہا نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے پس آیت زیر بحث میں بھی یہی صورت ہوگی کہ وہ مسح جو رؤس (سر) سے تعلق رکھتا ہے اپنے حقیقی معنوں میں لیا جائے گا اور وہ مسح جو پاؤں سے تعلق رکھتا ہے مجازی معنی غسل میں لیا جائے گا ۔

پھر اس بحث سے قطع نظر اس آیت کے نزول سے کئی سال پہلے ابتدائے بعثت ہی میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے وضو کی فرضیت اور اس کی تعلیم وقوع میں آچکی تھی ۔ پس اس قسم کا ایہام یہاں مراد لینے میں کوئی منافقہ نہیں کیونکہ مخاطبین ، وضو کی کیفیت ترتیب تو پہلے ہی سے سمجھتے تھے بلکہ روزانہ پانچ مرتبہ عملی مظاہرہ کرتے رہتے تھے اس لئے وضو کی کیفیت ترتیب کا سمجھنا ان کے لئے اس آیت پر ہی منحصر نہ تھا ۔ بلکہ ظاہری طرز کلام سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کلام خاص وضو ، اور غسل کے متبادل طریقہ تیمم کے لئے ہے اور وضو کا ذکر بطور تمہید و تقریب ہے اور جو بات بطور تمہید و تقریب ہو اس کے بیان میں چنداں وضاحت ضروری نہیں ہوتی ۔

دوسرے یہ کہ ارجل کا زیر اپنے متصل لفظ رؤس کے زیر کی وجہ سے ہے مگر معنی باعتبار زبر کے ہوں گے !

اور جر جوار کو سیبویہ ، اخفش ، ابوالبقاء اور دیگر تمام معتبر نحویوں نے نعت اور عطف دونوں صورتوں میں جائز رکھا ہے ۔ اور یہی قرآن میں بھی ہے ۔ نعت کی حالت میں جر جوار کی مثال قرآن مجید کی اس آیت میں ہے ۔ عَذَابُ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۔ کہ اس میں الیم اگرچہ عذاب کی صفت ہے مگر جر جوار یعنی یوم کی وجہ سے مجرور ہوا عطف کی حالت جر جوار کی مثال حُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۔ ہے کہ اس میں بقراءۃ حمزہ کسائی اور بروایت مفضل عاصم کی قراءت پر جر جوار اَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ کی وجہ سے مجرور ہے ۔ اور وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ پر معطوف ہے کیونکہ اَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ پر عطف کرنے سے اس کے کوئی معنے نہیں رہتے ۔

اس کے علاوہ خالص اور اصل شعرائے عرب کے نظم و نثر میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں ۔ نابغہ کا ایک شعر ہے ۔

لَمْ يَبْقَ اِلَّا اَسِيْرٌ غَيْرُ مُنْفَلِتٍ
وَمُوْثَقٍ فِىْ حِبَالِ الْاِسَارِ مَكْبُوْلٌ

ان میں سے کوئی قیدی زندہ نہیں رہا ۔ مگر وہ جو دو رسیوں سے پابستہ ہے ۔

اس میں موثق اگر یہ عطف امیر کی سریر گیا ہے اس پر معطوف ہے مگر بسبب جر جوار یعنی متقارنت کے مجرور ہوا۔
اب اگر زجاج حرف عطف کی موجودگی کے سبب جر جوار سے انکار کرے تو اس کا قول قابل توجہ نہیں۔ کیونکہ ماہرین لسان اور ائمہ عربیت نے اس کو جائز رکھا ہے، اور قرآن مجید اور بلغاء عرب کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں زجاج کا قول دراصل اس کے تتبع اور تحقیق کی خامی کے سبب ہے اسی کے ساتھ یہ ایک طرح کی شہادت بر نفی ہے اور ایسی شہادت معتبر نہیں۔
اس مسئلہ میں اہل سنت نے تطبیق کی ایک دوسری صورت بھی ذکر کی ہے وہ یہ کہ قراۃ جارہ کو موزہ پہننے کی حالت پر محمول کرتے ہیں اور قراۃ نصب (زبر) کو پاؤں میں موزہ نہ ہونے کی صورت پر۔ لیکن اس صورت میں ہمیں ایک ضمیر ماننے کی مجبوری درپیش ہے جو طبیعت سے کچھ دور ہے۔
شیعہ حضرات کے نزدیک بھی ان دونوں قراۃوں میں دو وجوہ سے تطبیق دی جاتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اہل سنت قراۃ نصب کو جس کے ظاہری معنے غسل کے ہیں اصل قرار دیتے ہیں اور قراۃ جر کو اسی طرف لوٹاتے ہیں اور شیعہ اس کے برخلاف کرتے ہیں۔
پہلی وجہ تطبیق یہ ہے کہ قراۃ نصب کی صورت میں ارجل کا عطف محل رؤس پر ہوا اس صورت میں رؤس اور ارجل دونوں سر پاؤں، ہر دو پر مسح کا حکم ہوگا۔ اس لئے کہ اس قراۃ پر اگر منصوب پر عطف کرتے ہیں تو معطوف اور معطوف علیہ میں اجنبی جملے کا فاصلہ آتا ہے اور یہ جائز نہیں۔
اور دوسری وجہ یہ ہے کہ واؤ مع کے معنے میں ہو جیسا کہ کہتے ہیں۔ اِسْتَوَى الْمَاءُ وَالْخَشَبَةُ مگر ان دونوں وجوہ پر اہل سنت کی طرف سے چند اعتراضات ہیں اول تو یہ کہ محل پر عطف قرار دینا باجماع فریقین خلاف ظاہر ہے اس صورت میں عطف بظاہر مغسولات پر ہے۔ اور ظاہر سے انحراف بغیر دلیل ظاہر کے جائز نہیں۔ اگر اس پر قرات جر کو دلیل ٹھہرائیں جیسا کہ پچھلے کلام سے معلوم ہوا تو وہ قراۃ نصب میں ہو سکتا ہے اور اجنبی جملہ کا بیچ میں آنے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ کا تعلق مغسولات سے کچھ نہ ہو اور اگر یہ معنے کئے جائیں کہ دھونے کے بعد اپنے ہاتھوں کو سر پر ملو تو اجنبی کا فصل کیسے ہوا اکثر اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے کہ بقیہ غسل سے مسح کر سکتے ہیں۔
ایک وجہ اعتراض یہ بھی ہے کہ دو متناظر جملوں یا معطوف علیہ میں کسی بھی اہل عربیت کے نزدیک فصل ممتنع نہیں۔ بلکہ ان کے ائمہ نے بھی اس کے جائز ہونے کی تصریح کی ہے اور ابوالبقاء نے تو تمام نحویوں کا اس کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے ہاں اہل بلاغت کے کلام میں اجنبی کا درمیان میں لانا کسی خاص نکتہ پر مبنی ہوتا ہے۔
ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اگر ارجلکم کا عطف محل برؤسکم پر کریں تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے غسل کے معنے سمجھیں کیونکہ عربی کے مقررہ قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب قریب معنے والے دو فعل ایک جگہ جمع ہوں جن میں سے ہر ایک کا ایک متعلق ہو تو ایک فعل کو حذف کر کے اس کے متعلق ہو تو ایک فعل کو حذف کر کے اس کے متعلق کا فعل مذکور پر عطف کرنا گویا اسی کا متعلق ہے۔ جائز ہے۔ لبید بن ربیعہ العامری کا یہ شعر اسی قبیل سے ہے

فَعَلَا فُرُوعَ الْاَيْهُقَانِ وَاَطْفَلَتْ — چڑھا ایہقان کی شاخوں پر اور بچے دیئے پہاڑوں
بِالْجَلْهَتَيْنِ ظِبَاؤُهَا وَنَعَامُهَا — میں ہرنیوں اور شتر مرغوں نے

یہاں باضمت نعل حذف ہوا۔ بانضت نعامہا۔ اس لئے کہ شتر مرغ بچے نہیں انڈے دیتی ہے اسی قاعدہ کی ایک

اور مثال ایک اور شاعر کے کلام سے بھی ملتی ہے۔

تَرَاهُ كَأَنَّ مَوْلَاهُ يَجْدَعُ أَنْفَهُ
وَعَيْنَيْهِ إِنَّ مَوْلَاهُ كَانَ لَهُ وَفْرٌ

تو اس کو دیکھے گا کہ گویا اس کا آقا اس کی ناک کاٹتا ہے اور اس کی آنکھیں پھوڑتا ہے۔ اس کا آقا بہت دولتمند تھا۔

اس شعر میں قاعدہ مذکورہ کے مطابق یفقاء فعل محذوف ہے اس کے متعلق کا عطف فعل مذکورہ کے متعلق پر کر دیا ہے۔

اس قاعدہ کی تیسری مثال میں ایک اور شاعر کا قول ہے۔

إِذَا مَا الْغَانِيَاتُ بَرَزْنَ يَوْمًا
وَزَجَّجْنَ الْحَوَاجِبَ وَالْعُيُونَا

جب نکلیں کسی دن گانے والیاں کشیدہ ابرو اور سرمہ لگائے آنکھوں میں۔

یہاں کحلن فعل محذوف ہے یعنی کحلن العیونا۔

اسی قاعدہ کے مطابق کسی اعرابی کا قول۔

عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَمَاءً بَارِدًا۔ یہاں سقیتہا فعل محذوف ہے۔ جس کا متعلق ماءً مذکور ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ واؤ کو مع کے معنے میں لینا بغیر قرینے کے جائز نہیں اور یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس کے خلاف قرینہ موجود ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب دونوں طرف تطبیق کی وجوہ ہیں تو اب سوال ترجیح کا رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے اہل سنت کے محققین احادیث نبویہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور انہیں کو بسبب ترجیح قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ قرآنی معانی کو یہی حل کرتی ہیں۔ پھر زیر بحث وضو ایسا فعل ہے جس کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن رات میں پانچ مرتبہ عمل میں لاتے تھے۔ اور نومسلموں کی خاطر ایسے احکام شرعی کو کھلم کھلا طریقے سے شہرت دیتے تھے۔ جو مسلمان ہوتا تو سب سے پہلے نماز اور اس سے بھی پہلے اس کے شرائط مثلاً وضو سیکھنا ان میں سے کسی نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو میں پاؤں پر مسح کی روایت نہیں کی بلکہ غسل کی ہی روایت کی ہے۔ یہاں تک کہ خود شیعہ اس کے معترف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غسل رجلین ہی کی روایت ہے۔ البتہ شیعہ حضرات یہ کہہ کر بحث ختم کر دیتے ہیں۔ کہ آئمہ سے ہم کو صحیح روایات پہنچی ہیں کہ وہ مسح کیا کرتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل سنت جن آئمہ سے غسل کی روایت بیان کرتے ہیں سو وہ صرف تقیہ تھا۔ اب اس پر اہل سنت کہتے ہیں کہ امامیہ کی کتب صحیح میں صاف صاف روایتیں موجود ہیں۔ جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ ائمہ اطہار ایسے موقعوں پر جہاں تقیہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ پاؤں دھویا کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غسل کی روایت آئمہ سے اتفاق شدہ ہے اور مسح کی روایت مختلف فیہ۔ کہ بعض شیعہ روایت کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے۔

بہر حال یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل بالاجماع غسل ہی کا ہے۔ آنحضرت ؐ سے مسح کی روایت ہر دو فریق میں سے کسی نے نہیں کی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرآن کے معانی کوئی نہ سمجھتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ غسل کے جو معنے ہم نے سمجھے ہیں وہ عین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ کے مطابق ہیں۔

اور یہیں سے وہ الزام لوٹ گیا کہ فہم آنحضرت کے بموجب، قرآن کی مخالفت شیعہ کرتے ہیں۔ اہل سنت نہیں۔

سچ ہے جو کوئی اپنے بھائی کے لئے گڑھا کھودتا ہے۔ اس میں خود ہی جا گرتا ہے۔

اور زیادہ تعجب اور اچنبے کی بات یہ ہے کہ ان کے جلیل القدر علماء نے پاؤں دھونے کی روائتیں اپنی کتابوں میں کی ہیں اور ان کا کوئی جواب نہیں دیا نہ ہی راویوں کا کوئی عذر بیان کیا۔ ان کی اس انوکھی بات کا عذر کوئی ہو سکتا ہے۔ تو صرف یہ کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اور عذر نسیان واقعی بالاجماع عذر شرعی ہے۔

اب ذرا ان حضرات کی اس سلسلہ کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے۔

(۱)۔ روی العیاشی عن علی بن حمزہ قال سالت ابا ابراھیم عن القدمین فقال تغسلان غسلا (علی بن حمزہ

سے عیاشی روایت کرتا ہے کہ علی نے ابو ابراہیم سے قدمین کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا یقیناً دھوئے جائیں گے۔

(۲)۔ روی محمد بن النعمان عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال اذا نسیت مسح راسک حتی تغسل رجلیک فامسح راسک ثم اغسل رجلیک۔

"محمد بن نعمان نے ابی بصیر سے اور انہوں نے ابو عبد اللہ علیہ السلام سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ اگر سر کا مسح بھول جائے اور پاؤں بھی دھولے تو اب سر کا مسح کر اور پاؤں پھر دھو"۔

اس روایت کو کلینی اور ابو جعفر طوسی دونوں نے صحیح سندوں سے روایت کیا ہے۔ اس میں نہ ضعف کی گنجائش ہے نہ تقیہ کی کیونکہ مخاطب مخلص شیعہ تھا۔

(۳)۔ وروی محمد بن الحسن الصفار عن زید بن علی عن ابیہ عن جدہ عن امیر المومنین قال جلست اتوضاء فاقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلما غسلت قدمی قال یا علی خلل بین الاصابع۔

محمد بن حسن صفار نے زید سے زید نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی، کہ حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ میں وضو کرنے بیٹھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، جب میں نے پاؤں دھوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا علی، انگلیوں میں خلال بھی کر لو۔

اس طرح کی اور روایات بھی ان کی کتب صحیحہ میں موجود ہیں۔

اس بیان سے یہ دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول تو یہ کہ شیعہ حضرات کو چاہیئے کہ بموجب قواعد اصول مسح و غسل ہر دو کو جائز رکھیں نہ صرف مسح کو، دوسرے یہ کہ اگر اہل سنت غسل کی روایت کو جس کی سند پر دونوں کا اتفاق ہے۔ احتیاطاً اختیار کریں اور مسح کی روایت کو جس کی سند مختلف فیہ ہے، نظر انداز کر دیں تو وہ ہرگز قابل الزام اور لائق ملامت نہ ہوں گے۔ خصوصاً جب کہ شریف رضی نے نہج البلاغہ میں امیر المومنین سے روایت کرتے ہوئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وضو کی روایات بیان کی ہیں جن میں پاؤں کا دھونا ثابت کیا ہے۔

اسی طرح دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے صرف غسل ہی کی روایت کی ہے۔

اور وہ ضعیف روایات جو بطریق عباد بن تمیم اور اس کے چچا سے مروی ہیں کہ آپ نے وضو کیا اور قدموں پر مسح کیا وہ سب غلطیوں سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ اول تو وہ اس روایت میں منفرد ہے۔ اور عام راویوں سے اپنی روایت میں مختلف دوسرے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ ممکن ہے۔ اس وقت اپنے پاؤں میں موزے پہن رکھے ہوں اور راوی نے موزے نہ دیکھے ہوں صرف مسح کا عمل دیکھا ہو اور تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ راوی نے مسح کا لفظ مجازاً استعمال کیا ہو اور امیر المومنین سے جو روایت بایں الفاظ مروی ہے کہ

مَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمَسَحَ عَلَى رَأْسِهِ وَرِجْلَيْهِ وَشَرِبَ فَضْلَ طَهُوْرِهٖ قَائِمًا وَقَالَ اِنَّ النَّاسَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّ الشُّرْبَ قَائِمًا لَا يَجُوْزُ وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ هٰذَا وُضُوْءُ مَنْ لَمْ يُحْدِثْ۔

یعنی اپنے چہرے، ہاتھوں، سر اور پاؤں کا مسح کیا اور وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا اور وضو کا لوگ گمان کرتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینا جائز نہیں تو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا۔ یہ وضو اس شخص کا ہے جس کا وضو نہ ٹوٹا ہو۔

شیعوں کی طرف سے یہ روایت اس لئے حجت نہیں بن سکتی کہ امر زیر بحث بے وضو کا وضو ہے نہ وضو والے کا وضو۔ کیونکہ محض نظافت و پاکیزگی اطراف تو مسح سے بھی ہو سکتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس روایت میں چہرے اور ہاتھوں کا مسح بھی بیان کیا ہے۔ جب کہ خود شیعوں کے ہاں بھی ہاتھوں اور چہرے کے مسح کا کوئی قائل نہیں گو ان میں سے ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت کا مذہب یہی مسح ہے، جیسے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابوذر اور انس رضی اللہ عنہما۔ حالانکہ یہ محض افترا ہے۔ ان اصحاب میں سے کسی سے بھی صحیح طریق پر کوئی ایسی روایت مروی نہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ حضرات اس کے قائل تھے۔ بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تو بطور شبہ و تعجب یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم قرآن میں تو صرف مسح ہی کو پاتے ہیں مگر اہل اسلام نے غسل ہی کو مانا ہے۔

مطلب یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق قرآن کے ظاہری الفاظ سے تو مسح کا پتہ چلتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا اس پر عمل نہ تھا وہ غسل فرماتے تھے۔ اس سے واضح طور پر یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ زیر کی قرأت قابل تاویل اور متروک الظاہر ہے۔

اس سے ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ابو العالیہ، عکرمہ اور شعبی سے جو لوگ یہ روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ مسح کو جائز کہتے تھے۔ محض افترا اور ان پر بہتان ہے۔

اسی طرح جناب حسن بصری رحمہ اللہ علیہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مسح اور غسل ہر دو کو جمع کرنے کے قائل تھے۔ جیسے کہ زیدیہ میں سے ناصر کا یہ مذہب ہے۔ تو یہ بھی بہتان اور جھوٹ ہے۔

یہ محمد ابن جریر طبری کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ اختیار کے قائل تھے کہ چاہو مسح کرو اور چاہو تو غسل کر لو۔ یہ بھی جھوٹ ہے۔

درحقیقت شیعہ راویوں نے اس قسم کے جھوٹ گھڑ کر ان کو مشہور کیا ہے، اور بعض اہل سنت نے بھی صحیح و ضعیف میں تمیز کئے بغیر بے سند، اس کی روایت کر دی ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ جو اہل سنت میں آثار صحابہ و تابعین کے علم میں بلند مرتبہ کے مالک ہیں عبدالملک بن سلیمان سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عطاء سے دریافت کیا کہ کیا تم کو کسی صحابی سے ایسی روایت ملی ہے کہ انہوں نے پاؤں پر مسح کیا ہو تو عطاء نے جواب دیا کہ نہیں۔

یہ بات بھی جان لینی چاہیئے کہ محمد بن جریر طبری نام کے دو اشخاص ہیں ایک محمد بن جریر بن رستم آملی، اور یہ شیعہ ہے جو کتاب "الایضاح والمسترشد در بیان امامت" کا مصنف ہے۔ دوسرے محمد بن جریر بن غالب طبری، ابو جعفر ہے، جو تفسیر ابن جریر اور تاریخ کبیر کا مصنف ہے۔ یہ اہل سنت میں سے ہے۔ اور انہوں نے صرف غسل کی روایت کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن مجید کی اعرابی حالت کی توجیہہ کرنے کو قرآن کی مخالفت کہنا اس شخص کے لئے ہرگز زیبا نہیں جس میں ذرا عقل بھی ہو۔ ہاں اگر قرآن کے الفاظ و کلمات کا جو انکار کرے وہ ضرور قرآن کی مخالفت کرتا ہے، جیسا کہ یہ شیعہ کہتے ہیں کہ قرآن میں الی المرافق کا لفظ نہیں ہے بلکہ من المرافق ہے۔ اسی طرح قرآن کے کسی حکم کا انکار کرنا یا اس کے کسی عام حکم کو خاص کرنا قرآن کی مخالفت ہے۔

چنانچہ شیعہ کہتے ہیں کہ باپ کی میراث میں سے تلوار، قرآن، انگوٹھی اور بدنی پوشاک بڑے بیٹے کا مخصوص حق ہے اس کے علاوہ اور بھی مال اگر چھوڑا ہو تو اس سے بھی حصہ لے گا، اس طرح شوہر کی میراث میں زمین، جاگیر، مکان، جانوروں ہتھیاروں اور سامان میں بیوی کا حصہ نہیں مانتے۔ حالانکہ قرآن مجید، ان ہر دو کے میراث میں حصہ اور حقوق بلا کسی تخصیص اور صاف صاف بتاتا ہے چنانچہ مطہر حلی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم کے متعلق مدح کی آیات کو ایک خاص زمانہ تک مخصوص کرنا۔ یا ان میں سے بعض کو مدح و تعریف کے لئے مخصوص کرنا قرآن کی سراسر مخالفت ہے۔ (نعوذ باللہ)

نواں دھوکہ :- یہ کہتے ہیں کہ " اہل سنت حدیث کی صریح مخالفت کرتے ہیں، کہ متعہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی وجہ سے اور صلوۃ الضحیٰ کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مَا صَلّٰہَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے حرام جانتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں متعہ جائز تھا۔ اور صلوۃ الضحیٰ آپ پڑھا کرتے تھے۔ جیسا کہ ائمہ سے مروی ہے "

اس طعن اور دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت ابتدائے اسلام میں اس کے جواز کو مانتے ہیں۔ اور اس کو بھی مانتے ہیں کہ اول مرتبہ حرام ہو جانے کے بعد بعض غزوات میں بوجہ ضرورت اس کی اجازت دی گئی تھی۔ البتہ اب تک اور ہمیشہ کے لئے اس کے جواز کے منکر ہیں۔ اس کے متعلق ممانعت اور حرمت اہل سنت کے نزدیک صحیح طریق سند سے ثابت ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس تحریم کو رائج کرنے اور تاکید کرنے والا مانتے ہیں، (نہ کہ حرام کرنے والا)

اسی طرح صلوۃ الضحیٰ اہل سنت کے نزدیک مسنون ہے! مسند امام احمدؒ میں بسند صحیح اور طبرانی کی کتاب الدعا میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اُمِرْتُ لِصَلوٰۃِ الضُّحٰی۔ مجھ کو صلوۃ ضحیٰ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن ابن ماجہ میں معاذہ عدویہؒ سے ان الفاظ میں روایت کی گئی ہے سالت عائشۃ کم کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی صلوۃ الضحی فقالت اربع و یزید ماشاء۔ (میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے، آپ نے جواب دیا چار رکعت۔ اور حسب منشا اس میں اضافہ بھی فرما لیتے)

پس معلوم ہوا کہ صلوۃ الضحیٰ سے انکار کی نسبت اہل سنت کی طرف سراسر کذب، بہتان اور افترا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے انکار کو دو وجوہ پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے یا تو اس کی ہمیشگی کا انکار فرمایا، اصل نماز سے انکار نہیں فرمایا۔ یا اس نماز کا دیگر نمازوں کی طرح باجماعت پڑھنے سے انکار فرمایا جس کا طریقہ اس زمانہ میں رائج ہو چکا تھا۔

یعنی آپ نے اس کا انکار فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیئت اجتماعی اور جماعت بندی کے ساتھ یہ نماز

کبھی نہیں پڑھی۔
متعہ کے متعلق تحقیق انشاءاللہ اپنے مقام پر آگے آئے گی۔
حاصل کلام یہ ہے کہ بعض روایات کو بعض دوسری روایات پر ترجیح دینے کا نام مخالفت حدیث رکھنا عقل سے بعید البتہ تعصب سے قریب ہے۔
ہاں مخالفت حدیث یہ ہے کہ جس کا ارتکاب شیعہ حضرات کرتے ہیں اور خلاف حدیث عقائد رکھتے ہیں۔ مثلاً ترک جمعہ وجماعت کا جائز سمجھنا۔ ودی۔ مذی کو طاہر و پاک سمجھنا۔ اور ان کے خروج سے وضو نہ ٹوٹنا۔ عضو تناسل کے تین مرتبہ جھٹکنے کے بعد (نکلنے والے) پیشاب کا پاک ہونا۔ اس کے خروج بلکہ سیلان کے بعد نماز کا جائز ہونا۔ چنانچہ یہ تھوڑے سے چند مسائل باب فروع میں انشاءاللہ بیان کئے جائیں گے۔
وسواں دھوکہ: کہتے ہیں "کہ اہل سنت خود کو شارع سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کا حکم خدا نے نہیں دیا یہ اپنی عقل سے اس کو شریعت میں داخل کر دیتے ہیں مثلاً قیاس کو بھی حکم شرعی کی ایک دلیل قرار دے کر اس سے احکام شرعی نکالتے ہیں"۔
حقیقت اگر دیکھی جائے تو یہ طعن اہل سنت پر نہیں بلکہ اہل بیت پر ہے۔ کیونکہ زیدیہ اور تمام اہل سنت قیاس کی روایت اہل بیت ہی سے کرتے ہیں اور انہوں نے طریق قیاس ان ہی بزرگوں سے سنا ہے۔ چنانچہ قیاس کی روایات کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ امامیہ میں سے ابونصر ہبۃ اللہ ابن احمد بن محمد (اور اس کے پیرو اس کے قائل ہیں کہ قیاس بھی ایک شرعی حجت ہے۔ اس لئے عام اثنا عشری طعن کے طور پر ان کو ثلاثہ عشریہ کہتے ہیں اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ قیاس کی روایتیں خود اثنا عشریوں کی کتب صحاح میں سند صحیح کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روایت کو ابوجعفر طوسی) تہذیب میں ابوجعفر محمد بن علی الباقر سے ان الفاظ میں روایت کرتا ہے۔

اَنَّہٗ جَمَعَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَصْحَابَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا تَقُوْلُوْنَ فِی الرَّجُلِ یَاْتِیْ اَھْلَہٗ وَلَا یُنْزِلُ فَقَالَتِ الْاَنْصَارُ اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ وَقَالَ الْمُھَاجِرُوْنَ اِذَا الْتَقَی الْخِتَانَانِ وَجَبَ الْغُسْلُ فَقَالَ عُمَرُ لِعَلِیٍّ مَا تَقُوْلُ یَا اَبَا الْحَسَنِ فَقَالَ اَتُوْجِبُوْنَ عَلَیْہِ الْحَدَّ وَلَا تُوْجِبُوْنَ عَلَیْہِ صَاعًا مِّنْ مَّآءٍ۔

یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تمام صحابہ کو جمع فرما کر ان سے سوال کیا کہ اس شخص کے متعلق تم کیا کہتے ہو جس نے اپنی بیوی سے صحبت کی مگر اس کو انزال نہیں ہوا؟ اس پر انصار بولے کہ قاعدہ الماء بالماء کے موافق غسل انزال پر ہوتا ہے۔ مہاجرین نے فرمایا کہ جب دو شرمگاہیں باہم مل جائیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ابوالحسن تم اس بارے میں کیا کہتے ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں تم لوگ اس پر حد کو تو واجب جانتے ہو مگر ایک صاع پانی یعنی غسل اس پر واجب نہیں جانتے"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا حد شرعی پر غسل کے قیاس کی کھلی اور صاف صورت ہے۔ بعض دانشمند شیعہ اس قیاس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قیاس نہیں ہے بلکہ ایک اولیٰ اور بہتر چیز سے غیر اولیٰ پر دلیل لانا ہے جس کو حنفیہ کی اصطلاح میں دلالت النص کہتے ہیں۔ جیسے وَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ۔ کا مارنے کی حرمت پر دلالت کرنا۔ اس کے سمجھنے میں مجتہد اور غیر مجتہد دونوں برابر ہیں۔ شیعوں کی اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صحبت بلا انزال سخت و سنگین مشقت یعنی حد پہ اثر انداز ہوئی تو کمزور و ضعیف مشقت یعنی غسل پر بطریق اولیٰ اثر انداز ہوگی۔ اس تقریر کا بے ڈھنگا

یہاں دیکھئے۔

اگر آپس میں ایک دوسرے سے مَس (رگڑ) کا عمل ہو تو یہ عمل اہل سنت کے نزدیک باعث تعزیر ہے۔ اور امامیہ کے نزدیک حد شرعی کا موجب ہے اور بالاجماع غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح دخول کے ساتھ لواطت کا فعل ہو تو وہ بعض اہل سنت اور امامیہ کے نزدیک حد شرعی کا موجب ہے ان کے علاوہ اوروں کے نزدیک موجب تعزیر ہے۔ اور امامیہ کے نزدیک اس پر غسل واجب نہیں۔ یا مثلاً اجنبی عورت کے ساتھ مباشرت فاحشہ صرف موجب تعزیر ہے، نہ موجب غسل بالاتفاق۔ حلی، شارح مبادی الاصول باوجود کٹر اور متعصب شیعہ ہونے کے اس بات کا مقر و معترف ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قیاس پر عمل ہوتا تھا۔

علاوہ ازیں آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ امام باقر، امام صادق اور امام زید شہید رحمۃ اللہ علیہم نے جناب امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کو قیاس کی اجازت دی تھی۔ باقی یہ بات کہ قیاس کے ثبوت کے دلائل اور منکرین کے اقوال کی تردید تو ان سب کے لئے اہل سنت کی اصول کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

گیارھواں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ "اثنا عشری مذہب حق ہے اور اہل سنت کا مذہب باطل ہے اس لئے کہ اکثر اوقات اور اکثر شہروں میں اثنا عشری تعداد میں کم اور ذلیل و خوار ہیں جب کہ اہل سنت کی تعداد بھی بہت ہے اور عزت و وقار بھی ان کو حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل حق کے بارے میں وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (اہل حق کم ہیں) فرمایا اور ایک اور جگہ فرمایا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (میرے بندوں میں شکر گزار بندے کم ہی ہیں)"

شیعوں کی یہ بات کلام اللہ کی تحریف اور تبدیلی کہی جا سکتی ہے، انہوں نے کلام اللہ کے متعلق غلط بیانی کی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اصحاب الیمین (وہ جن کے اعمال نامے قیامت کے دن دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے) کے بارے میں فرمایا ہے۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ۔ (ایک انبوہ ہے پہلوں سے اور ایک انبوہ ہے پچھلوں سے) جس سے کثرت معلوم ہوتی ہے۔ البتہ جہاں کمی بتائی ہے وہاں شکر گذار بندے مراد ہیں۔ جیسا فرمایا وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔ (ان میں سے اکثر کو آپ شکر گزار نہیں پائیں گے۔) اور واقعہ بھی یہی ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام نعمتوں کو ان کی فطری اور خلقی غرض و غایت میں صرف کرنے کا نام ہی شکر ہے۔ اور حقیقت میں یہ درجہ نادر الوقوع اور بہت ہی کمیاب ہے۔ تو ان آیات میں کسی مذہب کی حقانیت یا بطلان کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔ البتہ شاکرین کی قلت اور ناشکروں کی کثرت کا بیان ہے۔ اسی طرح آیت وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ میں اس کا ذکر ہے کہ تمام نیک کام کرنے والے کمیاب ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (مگر جو ایمان لائے اور کام نیک کئے وہ بہت کم ہیں) اس آیت میں بھی حق و باطل عقائد کا ذکر کہاں ہے؟

اور اگر ذلت و قلت حقانیت کا سبب ہو تو پھر انہیں مان لینا چاہیئے کہ نواصب، خوارج، زیدیہ، افطحیہ، ناؤسیہ وغیرہ اثنا عشریہ سے زیادہ حقانیت و صداقت کے حامل ہوں۔ کیونکہ یہ فرقے باعتبار تعداد بھی اثنا عشریہ سے کم ہیں اور ان کی نسبت ذلیل بھی زیادہ ہیں۔

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے تو اپنی کتاب عزیز میں، بار بار یہ فرمایا ہے کہ اہل حق کا ظہور، غلبہ اور تسلط ہوگا چنانچہ ارشاد ہے وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ۔

دا پنے رسول. بندوں کے متعلق ہمارا حکم پہلے ہی جاری ہو چکا کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی بلاشک غالب ہونے والا ہے) دوسری جگہ فرمایا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ - (زبور میں نصیحت (کی باتوں) کے بعد ہم نے یہ بھی لکھا ہے کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے)

ایک اور جگہ یوں ارشاد فرمایا:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا - (ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے پہلوں کو جس طرح اقتدار دیا تھا ان کو بھی زمین پر اقتدار دے گا اور ان کے دین کو مضبوط کرے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔)

اسی طرح کی اور بھی آیات ہیں اور احادیث میں بھی جا بجا تاکید ملتی ہے کہ امت کی جمہوریت کی موافقت و تابعداری کرنی چاہیئے۔

پھر قرآن و احادیث میں مجاہدین کی تعریف کی گئی ہے اور حدیث میں یوں آیا ہے۔ لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ (میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر جمی رہے گی مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے)

اہل تاریخ اس پر متفق ہیں کہ شیعوں میں سے آج تک کوئی بھی جہاد پر کمر بستہ نہیں ہوا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے کسی ملک یا اس کے حصہ کو کفار سے چھین کر اسے دارالسلام بنایا بلکہ اس کے برخلاف انہیں اگر کسی شہر کی سیادت یا حکمرانی مل بھی جیسے مصر و شام کی ریاست ان کے ہاتھ آ بھی گئی تو انہوں نے کفار ہی کی طرف دوستی اور یگانگت کا ہاتھ بڑھایا اور دین کو دنیا کے عوض بیچ کر دارالسلام کو دارالکفر میں تبدیل کر دیا۔ (یہ ہمیشہ کافروں سے دوستی اور مسلمانوں کے قتل پر شیر رہے) چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں اس مذہب کے سبز قدم نہیں پہنچے وہاں کے باشندے ہمیشہ غالب، ذی عزت و شان رہے۔ چنانچہ توران، ترکستان، روم اور ہندوستان کے بادشاہوں نے شیعوں کے اختلاط اور دوستی سے پہلے عزت و شان کی زندگی بسر کی ہے۔ اور جب بھی کسی شہر اور ملک میں شیعہ مذہب رائج ہوا وہیں فتنہ و فساد، بدبختی اور ذلت اور باہمی نفاق۔ جو زوال سلطنت کے اندرونی اسباب شمار ہوتے ہیں۔ آسمان سے بارش کی طرح برسنے لگے، اور پھر وہاں کی نشا نا قابل اصلاح ہو گئی۔ ایران، دکن اور ہندوستان ہی نہیں، ملک عرب شام، روم، توران و ترکستان وغیرہ کے حالات کو دیکھ لیجئے (تو اس کی تصدیق ہو جائے گی)۔

اور تاریخ کا ایک یہ بھی ناقابل تردید تجربہ ہے کہ جب بھی اتفاق سے کسی ملک میں شیعی غلبہ ہوا ہے تو اس کے متصل بعد ہی اس پر کفار کا غلبہ ہونا گویا لازمی ہو گیا۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا تسلط کفار کے تسلط کا گویا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور یہ گویا چھوٹے کفار ہیں۔ بنگال، دکن، پورب، دہلی و گرد و نواح، لاہور، پنجاب میں کفار کو یہی بدبخت سیاہ رو، سیاہ کار ہی برسر اقتدار لائے۔ اس سے بھی پہلے فتنہ تاتار، اہل اسلام کا قتل قرامطہ اور اسماعیلیہ کا زور ان ہی

کی وجہ سے ہوا۔ ان رافضیوں کے فرقے عراقین، بغداد، حلہ اور کرخ میں پھیل گئے پھر مطابق آیت کریمہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (ایسے فتنے سے بچو جس کی لپیٹ میں صرف ظالم ہی نہیں آئیں گے) نیک و بد سارے ہی تباہی و بربادی کا شکار ہوئے۔

بارہواں دھوکہ: ان شیعوں کے علماء نے محض اہلِ سنت پر لعن طعن کرنے اور ان کے اسلاف صحابہ کرام و تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عیب جوئی کے مقصد کی خاطر کتابیں اور رسائل تصنیف کئے اور ان میں دانستہ افتراء، جھوٹ، اور بہتان کی خوب خوب داد دی۔ کہ مسیلمہ کذاب کی روح بھی وجد میں آگئی ہوگی۔

ان لوگوں میں سے سرفہرست مرتضیٰ ابن مطہر حلی، اس کا بیٹا جو محقق کے لقب سے مشہور تھا۔ محمد بن حسن طوسی اور اس کا نواسہ جو ابن طاؤس کے نام سے معروف ہے اور ابن شہر آشوب سروی مازندرانی ہیں، اور ان میں سے بھی ابن مطہر حلی زیادہ آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس دھوکہ کا زیادہ شکار وہ لوگ ہوئے جو اپنے اسلاف کے حالات اور اپنے مذہبی علوم سے ناواقف، بے بہرہ اور نابلد تھے۔ وہ ان افتراآت اور بہتانات پر اعتبار کر کے اپنے مذہب سے برگشتہ و بدعقیدہ ہوئے۔ اور بالآخر ان کی گود میں جا گرے۔

تیرھواں دھوکہ: کہتے ہیں کہ "حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم نے قرآن میں تحریف کر کے ان آیات اور سورتوں کو قرآن مجید سے خارج کر دیا جن میں اہل بیت کے فضائل و احکام تھے۔ جن میں ان کی اتباع کا حکم دیا گیا اور ان کی مخالفت سے روکا گیا تھا اور ان کی محبت کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ یا جن میں اہلِ بیت کے دشمنوں کے نام اور ان پر لعن و طعن کا بیان تھا، یہ سب کچھ چونکہ ان خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم) پر شاق تھا، اور ان کی تعریف سے ان کو حسد ہوا لہٰذا انہوں نے قرآن کو ان سب سے پاک کر دیا۔ ان تحریف شدہ حصوں میں سے ایک وہ ٹکڑا تھا جو سورہ الم نشرح کا جزو تھا یعنی "وَجَعَلْنَا عَلِيًّا صِهْرَكَ" "اور ہم نے علی کو تمہارا داماد بنایا" (ذرا دیانت تو دیکھئے کہ دو بیٹیوں کے داماد کا ذکر ہی نہیں کیا)۔ اس طرح ایک لمبی سورت "الولایت" نامی بھی ساقط کر دی گئی جو فضائل اہلِ بیت اور ائمہ سے پُر تھی"۔

شیعوں کے اس الزام کو باطل ٹھہرانے کا ذمہ تو خود اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لے لیا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

تو جس کتاب (ذکر) کی حفاظت کا خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہو، بشر کی کیا طاقت کہ اس میں کمی یا زیادتی کر سکے۔ یا اس کا خیال دل میں لا سکے۔ ہاں اگر خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے اقتدار کو (نعوذ باللہ) اقتدار الٰہی سے بڑھ کر مانیں یا ان حضرات کو کارخانہ الٰہی کا شریک غالب تسلیم کر لیں تو کچھ بات بن سکتی ہے، مگر پھر ان حضرات کی توہین و تحقیر کے مذہبی غبارہ میں ہوا کہاں رہے گی۔

چودھواں دھوکہ: عوام کو دھوکہ دینے کے لئے ایسی روایات بیان کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہوتی ہیں کہ جناب علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کی اولاد کی محبت عذاب آخرت سے نجات دلانے کے لئے کافی ہے۔ (بشرطیکہ یہ محبت شیعوں کی عداوت نما محبت کی مانند ہو، سچی اور حقیقی محبت نہ ہو) اس محبت کے بعد (عذاب آخرت سے بچنے کے لئے) اطاعت بجا لانا اور گناہوں سے اجتناب کرنا ضروری نہیں۔

منجملہ ان کے ایک روایت وہ ہے جس کا راوی بادیہ ہے جو ان کے ہاں صدوق مشہور ہے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے علیؓ سے محبت رکھی اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کا عذاب نہیں دے گا۔

اب چونکہ عام شہوت پرست اور حرص و ہوس کے بندے اس بات کے نہایت شوقین ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی قدغن اور پابندی نہ ہو۔ ان کو کھل کھیلنے کی آزادی ملے۔ دنیا بھر کی تمام چیزیں ان کے لئے جائز قرار دی جائیں۔ عیش و عشرت میں ان پر کوئی گرفت نہ ہو۔ گناہوں اور محرمات، کے ارتکاب میں ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ عبادت الٰہی سے جان چراتے ہیں۔ اور اس میں سستی اور ڈھیل سے کام لیتے رہیں۔ اس لئے یہ بشارت ان کے ذہنوں پر کافی اثر انداز ہو کر ان کو اس مذہب کی طرف راغب کر سکتی ہے، اور یہ اس کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

حالانکہ خود ان شیعوں کی معتبر و صحیح کتابوں میں اس قسم کی روایات موجود ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد اور ذریت کو بار بار فرمایا کہ تم اپنے نسب پر گھمنڈ نہ کرو بلکہ طاعات و عبادت کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرو۔

جب خوف و ہراس میں خود اہل بیت کا یہ حال ہے تو دوسروں کو اہل بیت کی محبت پر بھروسہ کر کے ارتکاب معاصی و محرمات کے جائز ہونے کا امکان ہی کہاں ہے!

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اہل بیت کرام سے حقیقی محبت اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب کہ طاعات و بندگی، زہد و تقویٰ میں ان بزرگوں کی روش اختیار نہ کی جائے اس طریقے سے ان کی محبت حاصل کی جائے گی۔ تو اس ضمن میں تمام کمالات حسنہ خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔

پس الفاظ لَا یُعَذِّبُ اللّٰهُ بِالنَّارِ مَنْ وَالٰی عَلِیًّا صرف اس معنی میں صحیح ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت تمام دینی کمالات پر حاوی اور ان کو شامل ہے۔ نہ صرف زبانی، کلامی محبت، جو صرف زبان سے ادا ہو، اور اقوال و افعال میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ سے کوئی مناسبت یا مشابہت نہ رکھتی ہو اور آپ کے اقرباء و اصحاب کی شان میں بدزبانی سے نہ رکتا ہو۔

غرض ہر بات میں تو آنجناب رضی اللہ عنہ کے اقوال کی مخالفت کرنا اور پھر اس قطعہ کا سچا مصداق بننا۔

تَعْصِی الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ هٰذَا لَعَمْرِیْ فِی الْقِیَاسِ بَدِیْعٌ
لَوْ کَانَ حُبُّکَ صَادِقًا اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

(۱) تو خدا کی نافرمانی بھی کرتا ہے اور محبت بھی جتلاتا ہے بخدا میرے خیال میں تو یہ بڑی عجیب بات ہے۔

(۲) اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا کیونکہ محب تو محبوب کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔

پندھرواں دھوکہ: بحوالہ توریت کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ خلفاء مقرر کئے ہیں جو آپ کے بعد آپ کے نائب ہوں گے۔

(۱) ایلیاد (۲) فیراز (۳) ایراھیل (۴) مشوب (۵) مسھور (۶) مسموط (۷) ذومرا (۸) اہراد (۹) ثمور (۱۰) قسطور (۱۱) نوفش (۱۲) قدمیونیا"

حالانکہ توریت کے دستیاب چار نسخوں میں اس افتراء اور جھوٹ کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ایک نسخہ فراسین کے

پاس ہے، دوسرا ربانیین کے پاس تیسرا نصاریٰ کے پاس جس کا ترجمہ انہوں نے عبرانی سے اپنی زبان میں کر لیا ہے۔ چوتھا سامرین کے پاس جس میں دیگر نسخوں کی نسبت مضامین کچھ زائد ہیں۔

اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ایک شیعہ عالم نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں ایک بے اصل قصہ گھڑا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے شوق ہوا کہ اس توراتی نص کا سراغ لگاؤں، اس کے لئے اہل کتاب سے ربط و ضبط بڑھایا مگر انہوں نے اس کی اصل کا کچھ پتہ نہ دیا۔ آخر انہیں اہل کتاب میں سے ایک کے پاس اس کا کھوج ملا۔ اس نے اس عالم کا نام بھی لکھا، اور بڑی شرح و بسط سے، اس کو بیان کیا ہے، مگر اس روایت میں کئی باتیں قابلِ توجہ اور وجہ اعتراض ہیں۔

اول تو چونکہ یہ شیعہ کی روایت ہے جو نا قابلِ اعتماد ہے۔ دوسرے وہ عالم اہل کتاب بھی جس کی یہ روایت ہے۔ کب لائق بھروسہ ہو سکتا ہے۔ جس کا شیوہ خاص ہی اہل اسلام کے ساتھ بغض و عناد ہو۔ اور مسلمانوں کی جماعتوں میں تفرقہ، عناد اور پھوٹ ڈالنا اور ان میں باہم عداوت و دشمنی پیدا کرنا جن کی دلی آرزو ہو۔ جب بات یہ ہو تو ایسا معاند اور شدید العداوت شخص ایک سادہ ذہن شیعہ کو گمراہ کیوں نہ کرتا۔ جب کہ وہ اپنا قرآن اور حدیث چھوڑ کر منسوخ شدہ اور تحریف کردہ کتابوں کی طرف لپکتا ہوا وادی ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہو۔ چنانچہ جیسا کہ معلوم ہوا۔

اس شیعہ مذہب کی بنیاد ہی اہلِ کتاب میں سے ایک بداصل عبد اللہ بن سبا یہودی صنعانی کے ہاتھوں اور اس کے فریب سے پڑی۔ اب اگر ان ہی میں سے ایک اور اپنے بزرگوں کے لگائے ہوئے پودے کو سینچے اور پروان چڑھائے تو تعجب کی کیا بات ہے۔

پھر بفرضِ محال، اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو شیعوں کو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ بارہ کا عدد ان کے ہاتھ لگتا ہے۔ اس میں نہ ان بارہ اماموں کے نام متعین کئے گئے ہیں، نہ ان کا اہل بیت سے ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی امامت کے دیگر لوازمات و اوصاف کا مذکور۔ یہ عبرانی الفاظ تو ایسے ہیں کہ ان کے لفظی معنی معلوم نہ معانی کے مفہوم کا پتہ۔ جو دل چاہے معنی و مفہوم گھڑ لیجئے۔ اگر اس روایت کو لے کر نواصب و خوارج ان ناموں کو یزید، مروان، حجاج اور ولید وغیرہ پر چسپاں کر لیں تو کس بنیاد پر ان کو ایسا کرنے سے کوئی روک سکے گا۔

اور تعجب تو ان میں سے ان لوگوں پر ہے جو اہلِ علم کہلاتے ہیں اور ایسے مہمل اور لغو خیالات پر پھولے پھرتے ہیں۔ اور بچوں کی طرح شیطانی کھلونوں پر مٹے جاتے ہیں۔ اور پھر اسے اپنے مذہب کے لئے پختہ دلیل بھی ٹھیراتے ہیں پچ ہے۔ من یضلل اللہ فلا ھادی لہٗ۔

سولھواں دھوکہ:۔ یہ ہے کہ ان کے علماء نے تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو اہل سنت کے محدثین ظاہر کیا اور علم حدیث کے قابل اعتبار محدثین اہل سنت سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور صحیح اسناد یاد و حفظ کیں۔ ظاہری زہد و تقویٰ سے اپنے کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کی اس ظاہری حالت سے اہل سنت کے طلبائے حدیث نے بھی دھوکہ کھایا اور ان کی شاگردی کو قابلِ اعتماد سمجھا۔ اور ان سے علم حدیث پڑھا۔

اہلِ علم میں اعتماد پیدا کرنے کے بعد انہوں نے یہ حرکت شروع کی کہ صحیح و حسن احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی گھڑی ہوئی احادیث بھی خلط ملط کر دیں۔ عوام تو کیا خواص تک اس دھوکہ اور فریب کے شکار ہوئے اس لئے کہ احادیث صحیحہ و موضوعہ میں تمیز کی صورت رواۃ حدیث ہیں۔ اور جب اس چالبازی کی وجہ سے اچھے اور

بُرے راوی مل جل گئے تو اب تمیز کی کوئی صورت نہ رہی، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل اہل سنت کے شامل تھا اور ان مکاروں کے کید و فریب کا پردہ چاک کرنا منظور تھا۔ لہٰذا فن رجال کے ماہرین اس طرف متوجہ ہوئے، تحقیق و تفتیش میں لگے اور بالآخر اس دھوکہ کا پتہ چلا لیا۔ اور پورے طور پر اس سے آگاہ ہوئے۔

جب دھوکہ اور فریب کھلا اور معاملہ طشت از بام ہوا تو اس گروہ کے کچھ لوگوں نے تو حدیثیں گھڑنے اور وضع کرنے کا صاف صاف اقرار کر لیا اور بعض دوسروں نے گو زبان سے تو اقرار نہیں کیا مگر کچھ اور قرائن و علامات نے ان کی سازش اور فریب دہی کا راز کھولا۔

چنانچہ اب تک ان کی مضمون اور مصنفات میں یہی احادیث مشہور و معروف ہیں اور اکثر شیعہ اور تفضیلیہ دلیل میں انہیں موضوع اور گھڑی ہوئی "احادیث" کو پیش کرنے اور ان کا سہارا لیتے ہیں۔

ان میں جابر جعفی دو پہلا شخص ہے جو اس دھوکہ اور فریب کا صحیح معنوں میں موجد ہے اسی لئے بعد تحقیق حال امام بخاری اور مسلم نے احتیاطاً اس کی تمام مرویات کو درجہ اعتبار و اعتماد سے گرا کر نظر انداز کر دیا۔ ترمذی و ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایات کو متابعات و شواہد کے طور پر تو قبول کیا ہے (یعنی دوسری صحیح احادیث کی تائید مل جانے پر) ورنہ جو روایت وہ تنہا بیان کرتا ہے اس کو رد کر دیا اور ناقابل اعتماد و قبول ٹھیرایا۔

اور ان کا دوسرا شخص ابوالقاسم سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی ہے۔ وہ عیاری و چالاکی میں خوب چاق و چوبند اور سب سے آگے ہے۔ بعض ناواقف اہل سنت بھی اس کو اسی اختلاط اسناد کی وجہ سے اپنے معتبر رجال اسناد میں سے سمجھتے ہیں، مگر نجاشی نے جو شیعہ رجال اسناد کو پرکھنے میں ماہر ہے، اس کو اپنے فرقہ کا فقیہ و سرگردہ قرار دیا ہے۔

ستر ھواں دھوکہ یہ ہے کہ اہل بیت کرام سے ایسی احادیث اور روایتیں بیان کرتے ہیں۔ جن سے صحابہ کرامؓ کی مذمت کا ثبوت ملے اور جن سے ان کے ظلم و تعدی پر اہل بیت کی شکایت ظاہر ہو۔ اور بعض ایسے آثار بیان کرتے ہیں جن سے صحابہ کرامؓ کا دین سے ارتداد ظاہر ہو، اور جن سے یہ بتائیں کہ قیامت کے دن اہل بیت کے حقوق غصب کرنے والوں پر سب سے زیادہ سخت عذاب ہو گا۔ اور یہ کہ صحابہ کرام چونکہ اہل بیت کے حقوق کے غاصب ہیں۔ اس لئے ان کو ان سے محبت رکھنے والوں کو دوزخ میں جلایا جائے گا۔ اور شیعہ اور اہل بیت سے محبت رکھنے والے جنت میں رکھے جائیں گے۔ اور پھر ان احادیث و روایات کی تائید میں وہ حدیثیں پیش کرتے ہیں جو اہل بیت کے ساتھ محبت رکھنے کی فضیلت اور ان کے دشمنوں کی برائی میں اہل سنت کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔

اس دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ کے دور میں نواصب اور خارجیوں کے ہاتھوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت کریمہ پر ظلم اور ان کی تحقیر و تذلیل ہوئی، اور بعض اولاد ائمہ اہل بیت نے ان ہی نواصب کی بد اطواریاں اور سیاہ کاریاں دیکھ کر ان کی مذمت کی۔

مگر اتنی سی بات کو شیعی کینے اور بغض و عداوت نے ان لوگوں پر اپنا غبار نکالنے کا ذریعہ بنایا اور صحابہ کرامؓ کی ذات گرامی کو اس میں ملوث کر لیا۔ اور ان مطاعن کو ان پر چسپاں کرنے کی ناپاک جسارت کی۔ اس کا پورا پورا بیان انشاءاللہ باب مطاعن کے آخر میں آئے گا اور ہم وہاں شیعوں ہی کی کتابوں سے نقل کر کے اس فریب کا پردہ

چاک کریں گے۔

اٹھارواں دھوکہ: یہ کہ اپنے مذہب کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع احادیث گھڑ لیتے ہیں اور پھر ان کو رواج و شہرت دیتے رہتے ہیں، ان کی اکثر حدیثیں، قصہ و کہانی کے انداز کی ہوتی ہیں۔ بعض الفاظ و صیغے صحیح احادیث سے اڑا کر اس انداز و طریقے سے ادا کرتے ہیں جن سے ان کے مذہب کی تائید نکل سکے۔ اور بعض وقت ایسے صیغے بھی گھڑ لیتے ہیں کہ احادیث صحیحہ میں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ انبیاء اولو العزم یہ آرزو رکھتے تھے کہ شیعان علی میں محشور ہوں۔ (یعنی ان کا حشر انہیں کے ساتھ ہو) اسی جیسے اور الفاظ و صیغے۔

انیسواں دھوکہ: یہ دیتے ہیں کہ اہل سنت کے معتبر رجال اسناد پر نظر رکھتے ہیں ان میں سے کسی کا نام یا لقب ان کے رجال میں سے کسی سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ تو اس کی حدیث اور روایت کو اسی کی سند سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اب چونکہ دونوں کا نام و لقب ایک ہوتا ہے اس لئے تمیز مشکل ہو جاتی ہے اور ناواقف سنی ان کے راوی کو اپنا معتبر راوی سمجھنے کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور اس کی روایت پر اعتماد کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً سدی کے نام کے دو راوی ہیں سدی کبیر، سدی صغیر۔ اول اہل سنت کے معتبر راوی ہیں اور دوسرا کذاب۔ روایتیں گھڑنے والا خالص متعصب شیعہ۔

یا مثلاً ابن قتیبہ کہ اس نام کے بھی دو راوی ہیں۔ ایک ابراہیم بن قتیبہ جو کٹر شیعہ ہے۔ دوسرے عبداللہ ابن مسلم قتیبہ جو اہل سنت میں سے ہیں اور کتاب المعارف انہیں کی تصنیف ہے۔ ڈھیٹ پن ملاحظہ ہو کہ اس مذکورہ بالا رافضی نے بھی ایک کتاب لکھی اور اس کا نام بھی کتاب المعارف ہی رکھا۔ تاکہ دونوں کتابوں میں اشتباہ پیدا ہو جائے۔

بیسواں دھوکہ: یہ ہے کہ لغت و عرف کا لحاظ کئے بغیر قرآنی کلمات کی من مانی تفسیر کرتے ہیں اور اس کو اہمیت دینے اور قابل اعتبار ٹھہرانے کے لئے اس کی نسبت اہل بیت کی طرف کر دیتے ہیں، مثلاً رب جہاں کہیں وہ مضاف بضمیر خطاب ہو اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہو، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد لیتے ہیں۔ یا مؤمنین یا مومن سے شیعان علی مراد لینا اور کافرین سے اہل سنت اور منافق و منافقین سے کبار صحابہ (رضوان اللہ علیہم)

اکیسواں دھوکہ: یہ دیتے ہیں کہ ایک ایسی کتاب جس میں صحابہؓ پر لعن طعن ہو اور مذہب اہل سنت کا بطلان ہو خود تصنیف کر کے اس کو اہل سنت کے کسی جلیل المرتبہ عالم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اور اس کے خطبہ میں مصنف کی طرف سے یہ وصیت بھی درج کر دیتے ہیں کہ ہم نے اس میں جو کچھ لکھا ہے یہ ہمارا اصلی اور پوشیدہ عقیدہ ہے، اس کو ایک محفوظ امانت اور پوشیدہ بھید سمجھ کر راز میں رکھیں۔ اس کے علاوہ دوسری کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اسے ظاہرداری اور زمانہ سازی محض تصور کریں۔ مثلاً کتاب سر العالمین کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح کی اور کئی کتابیں ترتیب دے کر انہوں نے یہی حرکت کی ہے۔

اب چونکہ ایسے صاحب ذوق لوگ بہت ہی کم ہیں کہ وہ اس فرضی بزرگ مصنف کے طرز کلام سے گہری واقفیت رکھتے ہوں کہ ان کے اور دوسروں کے مذاق سخن میں فرق و امتیاز کر سکیں اس لئے لامحالہ عام طلبائے دین اس مکر کے چکر میں غوطے کھاتے اور بہت حیران و پریشان ہوتے ہیں۔

بائیسواں دھوکہ:- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی برائیاں اور مذہب اہل سنت کا بطلان ایسی کتابوں سے نقل کرتے ہیں جو نہایت کم یاب اور نادر الوجود ہوتی ہیں حالانکہ ان کتابوں میں اس جھوٹ کا دور دور تک ذکر نہیں ہوتا لیکن چونکہ یہ کتابیں ہر جگہ ہر ایک کو دستیاب نہیں، اس لئے اکثر ان نقل حوالوں کو دیکھنے والے شک و شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر یہ نقل صحیح ہے تو اہل سنت کی مشہور روایات اور اس روایت میں تطبیق و موافقت کیسے ہوگی۔ حالانکہ ان بیچاروں کی یہ سوچ اور فکر مندی بے کار اور فضول ہے، یہ نہیں سوچتے کہ اگر بالفرض نقل صحیح بھی ہو تو موافقت اور تطبیق کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کہ دونوں روایتیں شہرت، صحت ماخذ وضاحت معنی اور عدالت رواۃ میں برابر، وہم مرتبہ ہوں۔ اور جب یہ امور ان مشہور روایات کے مقابلہ میں جن کا ماخذ معلوم اور جن کی دلالت واضح ہے اس موہوم و بے اصل نقل میں ناپید ہیں تو تطبیق کی ضرورت ہی کہاں رہی۔

غرض یہ شیعہ، اہل سنت پر الزام لگانے کے لئے جو حوالے لاتے ہیں وہ ایسی ہی نادر الوجود کتابوں سے لاتے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ کتب دستیاب بھی ہوں تو ہم کہیں گے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی ہر بات کی صحت کی پابندی نہیں کی بلکہ اس نے اچھا اور برا سب اس میں جمع کر دیا ہے۔ اور اس پر نظر ثانی کا موقعہ دیا ہے۔ کہ چھان پھٹک کر اچھی بات لے لی جائے اور بری کو نکال کر پھینک دیا جائے۔ اربلی مصنف کشف الغمہ، اور حلی مصنف الفین اسی قسم کی کتابوں سے نقل پر نقل کرتے چلے گئے اور بزعم خود سمجھتے ہیں کہ ہم نے پالا مار لیا ہے۔

اسی طرح ابن طاؤس بھی اپنی تصانیف میں اسی قسم کے بے اصل نقلوں کے انبار پر انبار لگاتا چلا گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے واقعی اہل سنت کو ملزم ثابت کر دیا۔

تئیسواں دھوکہ:- امامیہ اثنا عشریہ، اور زیدیہ کو چھوڑ کر کسی اور فرقہ کے عالم کا نام لے کر نہایت شد و مد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش خام کرتے ہیں کہ وہ متعصب سنی تھا۔ اور بعض تو اس کو کٹر خارجی بتاتے ہیں۔ پھر اس کی طرف سے کوئی عبارت نقل کرتے ہیں، جس سے اہل سنت کے مذہب کا بطلان اور امامیہ اثنا عشریہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے اور اس حرکت سے غرض مذموم یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والا غلط فہمی میں پڑے، اور الجھن میں مبتلا ہو کر یہ سوچے کہ جب مصنف اتنا متعصب سنی ہوتے ہوئے ان روایات کو بیان کرتا ہے اور پھر ان کی تردید کے بجائے اس پر سکوت اختیار کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے یہ روایات صحیح ہی ہیں۔

مثلاً زمخشری صاحب کشاف کہ تفضیلی اور معتزلی ہے اخطب خوارزم کہ کٹر زیدی ہے، ابن قتیبہ کہ صاحب معارف کہ رافضی مفرط ہے ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ۔ جس نے تشیع اور اعتزال کو جمع کیا ہے۔ ہشام کلبی مفسر جو شدید العقیدہ رافضی ہے۔ مسعودی صاحب مروج الذہب اور ابو الفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی یا اور ان جیسے دوسرے اشخاص کو شیعہ پہلے تو اہل سنت میں داخل کرتے ہیں اور پھر ان سے اقوال نقل کر کے اہل سنت کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔

چوبیسواں دھوکہ:- کہتے ہیں کہ اہل سنت اہل بیت کے دشمن ہیں اور بعض بیوقوں کے سامنے اس بارے میں قصے کہانیاں بھی بیان کرتے ہیں جن کو سن کر جاہل راستہ سے بھٹک جاتا ہے اور اپنے مذہب سے بیزار ہو جاتا ہے۔

تو یہ بات بھی تمام باتوں کی طرح جھوٹ اور افتراء محض ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ محبت

اہل بیت ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض و لازم بلکہ ان کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اہل بیت کے فضائل میں انہوں نے تنہا بھی اور اجتماعی طور پر بھی کتابیں لکھیں اور ان بزرگوں کے مناقب کی روایات بیان کی ہیں۔ چنانچہ اسی محبت اہل بیت کے سبب عرصۂ دراز تک نواصب مروانیہ و عباسیہ سے برسر پرخاش رہ کر ایک جماعت نے شہادت پائی۔
جیسے سعید بن جبیرؒ اور نسائیؒ جب کہ ایک اور جماعت رنج و اذیت کا شکار بنی، اور یہ وہ وقت تھا جب یہ مگر مچھ کے آنسو بہانے والے شیعہ تقیہ کر کرکے نواصب کی گود میں بیٹھتے جارہے تھے، اور مال و دولت اور عہدوں کی خاطر نواصب کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ یہ اہل سنت ہی تھے جو ہر آڑے وقت اہل بیت کرام کے رفیق و مددگار رہے۔ ہر نماز میں ان پر درود بھیجتے رہے۔ جو سچے دل سے ان سے لگاؤ اور تعلق رکھتے تھے۔ شیعوں کی طرح نہیں کہ ہر امام کے بعد ان کے بھائی بھتیجوں اور عزیزوں کو کافر بنائیں۔ یا ان کے فرزندوں کو امام مان کر دوسروں پر زبان طعن دراز کریں۔ بات یہی ہے (جو شیعوں کے لئے کڑوی گولی بن کر رہ گئی ہے) کہ اہل بیت سے محبت کرنے والے، ان کی مدد کرنے والے سوائے اہل سنت کے کوئی نہیں ہے۔
حدیث نبویؐ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی۔ (میں تم میں دو بھاری بھرکم اور باوقار چیزیں چھوڑ رہا ہوں قرآن اور میری عترت) میں عترت سے اہل بیت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ اب جس طرح قرآن کے ایک حصہ کو ماننا اور دوسرے جزو کا انکار کرنا بے سود و بے نتیجہ ہے اسی طرح بعض اہل بیت سے محبت اور بعض دوسروں پر لعن طعن آخرت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ یا جس طرح پورے قرآن پاک پر ایمان لانا اور عمل کرنا چاہیئے اسی طرح تمام اہل بیت کو محبوب و دوست رکھنا چاہیئے۔ اور یہ سعادت اور اس مطلب کا انکشاف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہل سنت ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس لئے کہ خارجیوں نے تو جناب امیرؓ اور آپ کی ذات سے دشمنی رکھ کر بدبختی کا ذخیرہ جمع کریں۔ اور تمام شیعوں نے امہات المومنین حضرت عائشہ صدیقہ و حضرت حفصہ اور آپ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم سے عداوت برت کر لعنت و ذلالت کا لبادہ اوڑھا۔
پھر پچھلوں میں کیسانیہ امامت حسنین رضی اللہ عنہما کے منکر ہوئے۔ مختاریہ امام زین العابدین کی امامت کے۔ امامیہ نے حضرت زید شہیدؒ کے ساتھ دغا کی اور اسماعیلیہ نے امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کو نہیں مانا جس کی کچھ تفصیل گذر چکی اور انشاء اللہ کچھ آگے آئے گی۔ (اس طرح پوری قوم اہل بیت کی کسی نہ کسی جہت اور صورت میں دشمن ٹھہری۔ دوست نما دشمن)
پچیسواں دھوکہ: کہتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خاتون جنت رضی اللہ عنہا کے اس گھر کو جہاں جناب حسنین، جناب امیر رضی اللہ عنہم۔ سادات اور بنو ہاشم تھے۔ نذر آتش کیا، اور اس پر تمام صحابہ کرامؓ نے ناراضگی کے بجائے خاموشی و رضامندی ظاہر کی، اور اپنی تلوار کے قبضہ سے جناب سیدہ بتول الزہرا رضی اللہ عنہا کے پہلو پر ایسی ضرب و چوٹ لگائی جو اسقاط حمل کا سبب بنی۔
یہ ساری باتیں ان کی من گھڑت، افتراء اور بے اصل و جھوٹ ہیں۔ ان پر عقل کا اندھا اور بے بہرہ ہی یقین کرے گا۔ اور پھر مزہ کی بات یہ کہ یہ روایات خود شیعی روایات سے ٹکراتی اور ان کے جھوٹ کا بھانڈہ پھوڑتی ہیں۔ باب مطاعن میں تقیہ کے تحت انشاء اللہ ہم ان کو بیان کریں گے۔

چھبیسواں دھوکہ یہ کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب ہی اتباع کا زیادہ سزاوار و حقدار ہے کہ وہ اہل بیت کے مطیع ہیں۔ جن کی شان میں خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ (اے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے رجس و برائی دور کرکے تم کو بالکل پاک کردے)

اور ان ہی بزرگوں کے اقوال و افعال سے اپنے دعوے کی دلیل لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کے علاوہ تمام فرقے غیر اہل بیت کی پیروی کرتے ہیں اور اہل بیت کے اقوال و افعال سے روگردانی اور احتراز کرتے ہیں۔ اس لئے شیعہ کے لئے نجات لازمی اور یقینی ہے جب کہ دوسرے فرقے گرفت کے خوف و خطر میں ہیں۔

پھر اسی جھوٹے مفروضے پر حدیث سفینہ سے تائید پیش کرتے ہیں۔ کہ مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ فِیْکُمْ مَثَلُ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَہَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ غَرِقَ۔ (میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے جو اس میں سوار ہوگیا بچ گیا اور جو اس سے بچھڑ گیا غرق ہوگیا)

یہاں انہوں نے غلط مبحث کیا ہے۔ اور حق و باطل کو خلط ملط کردیا ہے۔ اس میں کلام کس کو ہے کہ اہل بیت کی اتباع موجب نجات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اہل بیت کا متبع کون فرقہ ہے۔ اور شیطان کا پیرو گمراہ فرقہ کون ہے۔ جو ناجائز اور مشئوم اغراض کی خاطر اہل بیت کا دامن تھامے ہوئے تھے، اور ان کے اور اہل بیت کے رسم و آئین میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ کس منطق کی رو سے، اہل بیت کے متبع کہلا سکتے ہیں۔ اب اس بات کا ثبوت کسی بھی طرح ممکن نہیں کہ شیعہ اہل بیت کے متبع ہیں۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ اور۔ جس کی روش ہو وہ کیا کہلاتا ہے۔ سب جانتے ہیں۔

مشرکین مکہ خود کو ملت ابراہیم کا متبع کہتے تھے اور مسلمانوں کو صابی یا صباۃ کا لقب دیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے خیال میں ان کو ملت ابراہیمیہ کا مخالف سمجھتے تھے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی اتباع کا دم بھرتے تھے۔ اور عبداللہ بن سلام اور نجاشی یا ان جیسے دوسروں کو ان انبیاء کا مخالف بتاتے تھے۔

درحقیقت کسی کا نام لینا اور عمل میں اس کے خلاف راستہ اختیار کرنا سراسر رسوائی اور بے حیائی ہے۔ آزاد خیال اور ملحد بھی خود کو قادری، سہروردی یا چشتی کہتے ہیں، ایسے ہی سربرہنہ لمبے بالوں والوں کا ایک فرقہ اپنے آپ کو مدار یہ کہتا ہے۔ ان سب کو محض ان نسبتوں سے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ جب کہ یہ ایسے طرز عمل کے سبب اپنی رسوائی اور خفت کو زیادہ بڑھا لیتے ہیں۔ کاش! یہ ان بزرگوں کا نام سرے ہی سے نہ لیتے تو ان سے ان بزرگوں کی رسوم اور طریقوں کی پیروی کا کوئی مطالبہ بھی نہ کرتا۔

اس سلسلہ میں سچ صرف یہ ہے کہ اتباع کا زیادہ حقدار اہل سنت کا ہی مذہب ہے۔ اس لئے کہ جناب امیرالمؤمنین حضرت علی و ائمہ اطہار رضی اللہ عنہم ظاہر و باطن میں اسی مذہب پر تھے۔ اور اس مذہب کے مخالف کو نہ صرف اپنی مجلسو اور لشکروں سے باہر نکال دیتے بلکہ جلاوطن بھی کر دیتے تھے۔

ان حضرات نے امام ابوحنیفہ اور امام مالک (اساطین اہل سنت)، رحمہا اللہ کے ساتھ عزت و نرمی روا رکھی، پھر ان اساطین اہل سنت نے بھی ائمہ اہل بیت کی شاگردی اختیار کرکے کسب فیض کیا۔ اصول مذہب سیکھے، جب دوسروں کو بھی ائمہ کے موافق دیکھا اور ائمہ نے بھی ان کی حقانیت کو تسلیم کر لیا تو انہوں نے ان سب سے معاملات دین کی تحقیق کی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر صرف اہل بیت کی طرف نسبت کر دینا حقیقت مذہب کے لئے کافی ہوتا تو چاہیئے تھا کہ غلاۃ کیسانیہ، مختاریہ، اسمٰعیلیہ، زیدیہ، امامیہ، حمیریہ اور قرامطہ یا شیعوں کے دیگر فرقے بھی حق ہوتے اور پھر کسی کو کسی پر متعین اور مخصوص کر کے فخر کرنے اور بغلیں بجانے کا حق نہ ہوتا۔ حالانکہ یہ سب فرقے ایک ادعا، ایک نسبت کے باوجود ایک دوسرے کو کافر و گمراہ کہتے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ (اور اسی پر بس نہیں ماضی میں ایک دوسرے کی گردنیں تک کاٹتے رہے ہیں اور آج بھی ان کی کیفیت تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتی کے عین مطابق ہے۔ نعمانی)

ستائیسواں دھوکہ: یہ من گھڑت جھوٹا قصہ ہے کہ ایک سیاہ فام لڑکی ہارون رشید کی مجلس میں پہنچی وہاں اس نے مذاہب پر بحث چھیڑ دی اور تمام مذاہب کے عیوب اور خامیاں گنائیں۔ مگر شیعہ مذہب کی تعریف کی اور ناقابل تردید دلائل سے اس کی حقانیت ثابت کر دی۔ حالانکہ ہارون رشید کی مجلس میں جید علمائے اہل سنت موجود تھے مگر اس نے کسی کی پرواہ نہ کی، اور نہ ہی اہل مجلس میں سے کسی سے اس کا جواب بن پڑا۔ اور یہ جبہ و دستار والے اس کی ایک بھی دلیل توڑنے سے عاجز رہے جب ہارون رشید نے اہل مجلس علماء کا یہ سکوت اور عجز دیکھا تو شہر کے دیگر بڑے علماء کو بلوایا جس میں جناب قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ شاگرد رشید امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ بھی تھے۔ اب اس چھوکری نے ان سے مناظرہ کیا اور ہر ایک پر ایسے الزام لگائے کہ کوئی بھی ان کا جواب نہ دے سکا۔ اور سب لاجواب ہو گئے۔

اس جھوٹے قصے کی گھڑنت کا مقصد یہ تھا کہ علمائے اہل سنت کو بتایا جائے کہ تمہارا مذہب اس قدر بودا اور کمزور ہے کہ ایک معمولی چھوکری اس کا تار، پود بکھیر سکتی ہے۔ اور تم کو لاجواب کر سکتی ہے۔ اور اس کی بحث کا تمہارے جلیل المرتبہ علماء بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اب اگر غور کیا جائے تو اس واقعہ سے بعد شیعی عالموں کی ہی اڑتی ہے اور الزام انہیں پر آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے سالوں ہی نہیں پوری عمر فن گویائی اور تقریر بازی کی مشق کرنے میں کھپا دی پھر بھی اس سیاہ فام چھوکری کے مقابلہ میں عشر عشیر تک بھی نہ پہنچ سکے۔ اس لئے کہ اپنے لمحہ پیدائش سے آج تک اتنی طویل مدت میں ان کا کوئی بھی عالم کسی بھی مجلس میں کسی بھی عالم اہل سنت پر ایک بھی الزام نہ لگا سکا۔ اور جب کبھی اس کی نوبت بھی آئی تو اس مجلس سے خود ہی ملزم بن کر اور الزامات کا پشتارہ سر پر اٹھا کر نکلا ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس سیاہ فام کنیز کی شاگردی کر کے ہی طریقہ واردات سیکھ لیتے کہ دائمی ندامت اور شرمندگی سے تو چھٹکارہ پا جاتے۔

سچ تو یہ ہے کہ ان سیاہ دل بد باطنوں کا مذہب جو احمقوں اور بے وقوفوں کا گھڑا ہوا ہے اسی قابل ہے کہ اس کے متکلم، مجتہد یا مناظر ایسی ہی سیاہ فام چھوکریاں ہوں۔ اگر بلند مرتبہ علماء اہل سنت ایسی جاہلانہ اور سوقیانہ گفتگو پر مہر بلب ہوں تو یہ ان کا نقص نہیں بلکہ جواب جاہلاں باشد خموشی کے مطابق ایک بلیغ انداز میں مسکت جواب ہے۔

اور پھر جواب تو وہاں دیا جاتا ہے کہ جہاں مخاطب میں فہم و فراست کی کوئی رمق تو نظر آئے، اور وہ ماشاء اللہ ان سیاہ فام چھوکریوں میں تو کیا ہ روشن چہرہ "حاملان جبہ و دستار شیعوں میں بھی مفقود ہے۔

اٹھائیسواں دھوکہ: طریقہ واردات یہ ہے کہ شیعوں کے علمائے مذہب، اپنے مذہب کے اثبات اور اہل سنت کے مذہب کے بطلان میں ایک کتاب تصنیف کرتے ہیں اور مصنف یا مؤلف کی جگہ کسی کنیز یا عورت کا نام ٹانک دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے جاتے ہیں کہ یہ کتاب اہل سنت کے علماء نے بھی مطالعہ کی ہے مگر کوئی

بھی اس کی تردید نہ کر سکا۔ ایسی ہی ایک کتاب الحسنہ ہے جو لکھی تو شریف مرتضٰی نے ہے مگر کہتے یہ ہیں کہ وہ کنیز ان اہل بیت میں سے کسی کنیز کی تصانیف ہے۔

انتیسواں دھوکہ: یہ کیا کرتے یہ ہیں کہ اپنے مذہب کے ثبوت میں اور اہل سنت کے مذہب کو باطل ثابت کرتے ہیں۔ کتاب لکھتے تو خود ہیں مگر لعنت بر کذاب کا مصداق بننے کے لئے ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ایک ذمی نے لکھی ہے۔ اور اس کتاب کے آغاز میں اسی مجہول العلم ذمی کی زبانی بیان کراتے ہیں کہ جب میں بالغ ہوا، اور دین حق کے تلاش کرنے کی فکر ہوئی تو میں نے اس سلسلہ میں بڑی تکلیف اٹھائی۔ بہت تگ و تاز کی، سرد و گرم زمانے سے دوچار ہوا، تا آنکہ توفیق الٰہی نے رہنمائی و دستگیری فرمائی۔ اور مجھے دارالسلام پہنچا یا، یہاں پہنچ کر میں نے دین اسلام کو جانچا پرکھا اور ہر طرح سے اسے دین حق پایا اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد جب میں نے اس کے ماننے والوں میں اندرونی اختلاف رائے کو دیکھا تو میرے تو ہوش اڑ گئے۔

میں تو بھانت بھانت کے اقوال و آراء سن کر سراسیمہ ہو گیا کہ کس کو حق سمجھوں کس کو غلط، مختلف آراء اور مذاہب کا جائزہ دلائل کی روشنی میں لیا تو مجھے معلوم ہو گیا اسلامی مذاہب میں سے صرف شیعہ مذہب ہی حق ہے۔ اس کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں سب گھڑے ہوئے اور تحریف شدہ ہیں ان ہی دلائل کی روشنی میں علمائے اہل سنت سے بحث و گفتگو کی اور ان پر الزام لگایا مگر کسی کو ان کے جوابات کی توفیق نہیں ہوئی اور کوئی بھی لگائے ہوئے الزامات کے جواب پر قادر نہ ہوا۔ اس کو دیکھ کر میرا عقیدہ پختہ تر ہو گیا کہ شیعہ مذہب ہی حق ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے سوچا کہ ان دلائل کو ضبط تحریر میں لے آؤں تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو بھی راہ راست دکھا سکوں۔

اس نوعیت کی ایک کتاب یوحنا بن اسرائیل ذمی کی ہے۔ جس کا اصل مصنف شریف مرتضٰی ہے، اس کو کسی نامعلوم الحال ذمی کی طرف منسوب کرکے اس کے شروع میں لکھتا ہے۔

کہ اول میں طلب حق میں حیران و سرگرداں رہا۔ ہر مذہب کی کتابوں کا بنظر غائر اور انصاف پسندی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اور ہر مذہب کی مشکلات کو اس کے معتبر علماء سے حل کرنے کی کوشش کی۔ مگر میرے دل میں شیعہ مذہب کے سوا کسی مذہب کی حقانیت و صداقت نے اثر نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں ایک حکایت بھی کتاب میں بیان کی گئی۔ کہ فلاں تاریخ کو بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ میں گیا تو دیکھا کہ ایک عظیم الشان مجلس منعقد ہے۔ جس میں جلیل القدر علمائیں سے فلاں فلاں عالم موجود ہیں۔ میں نے ان سے گذارش کی کہ حضرات میں عیسائی ہوں۔ اللہ کی توفیق سے حقیقت اسلام سے آگاہ ہوا۔ اور بجان و دل اس کا والہ و شیدا ہوا۔ لیکن اہل اسلام میں میں نے باہم بڑا اختلاف دیکھا کہ ہر ایک کا قول دوسرے کے قول سے ٹکراتا ہے۔ عرصہ سے میں اسی جستجو میں تھا کہ علمائے اسلام کا اجتماع کسی مجلس میں دیکھوں اور اپنی خلش دور کروں۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میں اس مبارک محفل تک پہنچ گیا، آپ حضرات کی بڑی عنایت اور کرم نوازی ہوگی اگر دلائل کی روشنی میں مذہب حق سے مجھے روشناس کرا دیا جائے۔

چنانچہ اہل سنت کے چاروں فرقوں میں سے ہر ایک نے اپنے حق ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور ہر فرقہ والے نے اپنا مذہب حق ثابت کرنے کے لئے دوسرے فرقہ کے مذہب کو باطل قرار دیا۔ ہر طرف سے باہم لعن طعن، گالم گلوچ کا

ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور بات ہاتھا پائی تک آ گئی۔ اس وقت میں نے انہیں للکارا کہ لے نا انصافو! بدراہو! مذہب حق دراصل تم چاروں فرقوں کے مذہب میں کوئی سا بھی نہیں، حق مذہب تو ایک اور ہی ہے جس کو تم رفض کا نام دیتے ہو، اس مذہب کو حقیر اور اس کے ماننے والوں کو ذلیل سمجھتے ہو۔ اس کے بعد جو میں نے مذہب رفض کے دلائل بیان کرنا شروع کئے تو چاروں فرقوں کے عالموں میں سے کسی نے بھی دم نہ مارا۔ بلکہ سب کے سب سرنگوں رہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ان دلائل کو بصورت کتاب ضبط تحریر میں لے آؤں، پس ثواب آخرت کی امید اور گمراہوں کو راہ راست دکھانے کی خاطر میں نے یہ کتاب تصنیف کی۔

شریف مرتضیٰ پر بڑا تعجب ہے کہ اس نے اختلاف کی نسبت اہل سنت کی طرف کی حالانکہ وہی نہیں ساری شیعہ ذریت جانتی ہے اصول و بنیاد عقائد و اعمال میں ان میں باہم ہرگز کوئی اختلاف نہیں۔ فروعات میں البتہ اختلاف ہے سو وہ بھی اتنا سنگین نہیں کہ ایک دوسرے کو کافر یا گمراہ کہنے کی حد تک جا پہنچے۔ پھر اتفاقی مسائل زیادہ ہیں اور ایسے مسائل بہت کم ہیں جن میں اختلاف ہے۔ چھان بین اور جائزہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چاروں مذاہب میں جن فروعی مسائل میں اختلاف ہے ان کی تعداد تین سو سے کچھ زائد نہیں۔ اور وہ بھی وہ جن میں صراحت سے کوئی حکم شرعی نہیں ملتا۔ بخلاف مذہب شیعہ کے، کہ ان میں اختلاف ہی اصولی ہے۔ اور بہت زیادہ ہے۔ ہر فرقہ دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتا ہے۔ امامیہ کے بارے میں چھان پھٹک سے پتہ چلا ہے کہ اثنا عشریہ ایک ہزار فروعی مسائل میں باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مسائل کے بارے میں امام کا حکم صریح موجود ہے۔ مثلاً شراب کا پاک یا ناپاک ہونا، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل! ان کی نئی اور پرانی کتابوں سے جو واقف ہے وہ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ تو پھر مرتضیٰ جس کا لقب ہی علم الہدیٰ ہے، وہ مجتہد کیا مذہب کا بانی مبانی ہے ان باتوں سے کیسے بے خبر رہ سکتا ہے۔ لیکن تعصب اور عناد کی پٹی اس کی آنکھوں پر ایسی چڑھی ہوئی ہے کہ اسے یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ رہیں وہ دلیلیں اور حجتیں جو وہ ذمی کے منہ سے اگلواتا ہے اور جن کو اپنے خیال خام میں بڑی مضبوط اور قیمتی خیال کرتا ہے وہی برتے برتائے مضامین اور گھسی پٹی دلیلیں ہیں جو حیض کے پرانے چیتھڑوں کی طرح اجڑے ہوئے گھوروں اٹھالایا ہے۔ بار بار انہیں کو دھوتا ہے اور انہیں سے شیعہ فرقہ کے لئے نیا لباس بنا لیتا ہے۔ حالانکہ وہ ساری دلیلیں اہلسنت کے نزدیک مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور اور شہتوت کے پتے سے بھی زیادہ بودی ہیں۔ جن کو ان کے مکتب کے بچوں نے روند رکھا ہے۔ اور انگلیوں کے ناخنوں نے ان کا حال خستہ کر رکھا ہے۔

تیسواں دھوکہ:- ان کے علماء مذاہب اربعہ کو باطل ٹھہرانے میں ایک اور گہری چال چلتے ہیں وہ یہ کہ ایک مذہب کو تو اشاروں کنایوں اور پردہ و آڑ میں رد کرتے ہیں اور باقی تین کو کھلم کھلا۔ چنانچہ ان کے کسی عالم کی ایک کتاب اسی نوعیت کی میری نظر سے گذری ہے۔ اس میں اس کے شیعی مصنف نے اپنے آپ کو شافعی المذہب ظاہر کیا ہے اور اپنی کتاب کی بنا باقی تین مذاہب کو باطل ثابت کرنے پر رکھی ہے۔ اب جہاں شافعی مذہب کو صحیح ثابت کرنے کا موقعہ آتا ہے وہاں وہ ایسے کمزور اور ناکارہ دلائل اور ناقابل قبول قیاسات حجت میں لاتا ہے۔ اور دور دراز کی خیالی تاویلات پیش کرتا ہے کہ کوئی بھی اس کے ماننے پر ہرگز تیار نہیں ہوتا مثلاً قیاس طرد۔ قیاس شبہ۔ وغیرہ جو خود احناف کے ہاں غیر مستند اور درجۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ پھر قیاس کے خلاف ایک حدیث بیان

کرتا۔ اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ حدیث قیاس کے مخالف ہے اور جو حدیث مخالف قیاس ہو وہ متروک الظاہر ہوتی ہے (یعنی اس کے ظاہری معنے چھوڑ دیئے جاتے ہیں) گویا اس کتاب کی تصنیف محض یہی بتانے کے لیئے ہوتی ہے کہ سنی قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ پس جب اس نے مذاہب ثلاثہ کو شافعی مذہب کے دلائل سے سر کر دیا۔ اور مذہب شافعی کو ایسے کمزور اور پوچ دلائل سے ثابت کیا جو ہر سننے اور دیکھنے والا ان کے کمزور ناکارہ اور ناقابل استدلال ہونے کو اول نظر ہی میں جان لے تو لا محالہ اس چال کا یہ نتیجہ برآمد ہونا لازمی ہے کہ چاروں مذہب بیک وقت وبیک نوع دیکھنے والے کی نظر میں پوچ اور بے اصل ثابت ہو جائیں گے۔ یہ دھوکہ بہت پوشیدہ اور بہت ہوشیاری سے ترتیب دادہ ہے۔ اس لیئے علمائے اہل سنت میں سے اکثر اس فریب میں آجاتے اور حیران و دم بخود رہ جاتے ہیں۔

اکتیسواں دھوکہ:۔ شیعہ فرقہ کا کوئی عالم فقہ میں کوئی کتاب تالیف کرتا ہے۔ جو اہل سنت پر لعن وطعن اور رد وقدح پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کی نسبت اہل سنت کے کسی امام کی طرف کر دیتا ہے مثلاً مختصر جس کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ ایک شیعہ کی لکھی ہوئی ہے اس میں یہ بھی لکھ مارا ہے کہ آقا کے لیئے اپنے مملوک سے لواطت جائز ہے کیونکہ آیت وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے معنی بظاہر عام ہیں۔

پھر ایک معتبر شخص کے ذریعہ یہ خبر ملی ہے کہ اس نے اصفہان میں اسی قسم کی ایک کتاب دیکھی ہے جسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور جو ناشائستہ اور نازیبا مسائل سے پُر ہے۔ اس دھوکہ کی اصلیت غالباً یہ ہے کہ ملک مغرب جہاں مالکی حضرات کی اکثریت ہے وہاں تو اس کتاب کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ظاہر کرتے ہیں اور ہندوستان و توران میں جہاں احناف کی اکثریت ہے اس کتاب کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اہل سنت کو تو اپنے ہی امام کی روایات پر زیادہ عبور ہوتا ہے۔ دوسرے ائمہ کی روایات کی زیادہ کھوج کرید اور تحقیق نہیں کرتے۔ اس لیئے اس کی صداقت ان کے دل میں جلد بیٹھ جاتی۔

اس دھوکہ میں بھی اکثر اہلسنت کے جلیل القدر علماء پھنس گئے ہیں۔ مثلاً متعہ کی حلت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف صاحب ہدایہ نے بھی کر دی حالانکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ متعہ پر حد جاری کرنے کو واجب کہتے ہیں۔ بخلاف امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ حد کو واجب نہیں کہتے۔

بتیسواں دھوکہ:۔ شیعہ علماء کی ایک جماعت بڑی سعی و کوشش سے اہل سنت کی تفاسیر اور سیرت کی ان کتابوں میں جو علماء اور طلباء میں بہت کم معروف و مشہور ہوں۔ یا نادر الوجود ہوں، ایسی جھوٹی باتیں ملا دیتے ہیں۔ جو شیعہ مذہب کی تائید اور اہل سنت کے مذہب کی تردید کرتی ہوں۔

چنانچہ باغ فدک کے ہبہ کا قصہ بعض تفاسیر میں داخل کر دیا ہے اور اس کی روایت یوں بیان کی کہ جب آیت وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ۔ (اور دیجیئے اقرباء کو ان کا حصہ) نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو بلایا اور باغ فدک ان کو عطا فرما دیا۔

مگر اس کو کیا کیجیئے کہ ان بدبختوں کو جھوٹ بولنا بھی نہ آیا۔ اور وہ یہ بھول گئے کہ یہ آیت تو مکی ہے یعنی مکہ کے قیام کے زمانہ میں نازل ہوئی ہے اس وقت باغ فدک ملا ہی کہاں تھا۔ وہ مکہ میں تو تھا نہیں۔

پھر آیت میں صرف ذوالقربیٰ ہی کو دینے کا حکم تو نہیں تھا۔ مساکین اور ابن سبیل کو بھی بخشش وعطا میں شامل کیا

گیا تھا۔ ان کو اس عطیے اور بخشش سے کیوں محروم رکھا گیا۔ اس آیت کے مطابق ان کو بھی تو ان کا حصہ دیا جانا چاہیے تھا تاکہ پوری آیت پر عمل ہو جاتا۔

علاوہ ازیں، اعطاھا فدك کے الفاظ سے ہبہ و تملیک تو ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے تو ان کو وھبھا کا لفظ گھڑنا چاہیے تھا۔ مگر پھر یہ رسوائی اور شرمندگی انہیں کہاں ملتی ؟

اسی طرح بعض اور کتب و تفاسیر و سیرت میں اسی قسم کی جھوٹی ملاوٹ کا پتہ چلتا ہے اس جھوٹ میں بھی اکثر بیخبر علماء سنت اُلجھ جاتے اور ذہنی تشویش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے زمانہ میں امراء شیعہ میں دو افراد، مرتضیٰ خاں اور مرید خاں نامی تھے، ان کا وطیرہ ہی یہ تھا کہ اہل سنت کی کتابوں مثلاً صحاح ستہ، مشکوٰۃ یا بعض تفاسیر کو خوشخط لکھواتے اور امامیہ کی کتابوں سے اپنے مطلب کی کوئی حدیث لے کر ان میں شامل کر دیتے، پھر اس مخطوطہ کو جدولوں، اور آب زر سے مزین کر کے نہایت کم قیمت پر گلی کوچوں میں فروخت کر دیتے۔ اور دھوکہ دہی کا یہ طریقہ آغا ابراہیم بن علی شاہ کے زمانہ میں جو سلاطین صفویہ میں کا بڑا بادشاہ تھا۔ اس کا ایک امیر اصفہان میں استعمال کرتا تھا۔ لیکن ان کا یہ دھوکہ کچھ چلا نہیں اس لئے کہ اہلسنت کی جو مشہور و معروف کتب ہیں وہ تو علماء و طلباء کے ہر دم زیر مطالعہ رہتی تھیں اور بکثرت شائع اور دستیاب تھیں اس لئے ان میں ردو بدل چھپنا مشکل تھا۔ اور اس کا پتہ بھی آسانی سے لگ سکتا تھا۔ اور جو کتابیں مشہور نہیں تھیں وہ ناقابل اعتبار سمجھی جاتی تھیں۔ اسی لئے محققین علماء اہلسنت نے غیر مشہور کتابوں سے نقل و حوالہ کو جائز نہیں رکھا۔ البتہ ترغیب یا خوف دلانے کے مسائل میں ان کو سابقہ انبیاء کے صحف کا سا درجہ دیا ہے، کہ ان میں ردو بدل اور تحریف کے احتمال کی وجہ سے ان سے عقیدہ و عمل کا کوئی مسئلہ نہیں لے سکتے۔

تینتیسواں دھوکہ :- یہ ہے کہ روایات کی نقل میں خیانت سے کام لیتے ہیں، نقل تو کتب اہل سنت سے کرتے ہیں مگر بیچ میں کہیں اپنے مفید مطلب ایک دو لفظ ایسے بڑھا دیتے ہیں جن کا اصل کتاب میں نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ اب بعض اہل سنت اس نقل پر غور و فکر کئے بغیر دیکھتے ہیں، اور اس حوالہ کو وہ اصل کتاب میں بھی دیکھ چکے ہوتے ہیں، جعلی اور ملاوٹی الفاظ کا لحاظ نہ رکھنے کے سبب حیران و پریشان ہوتے ہیں چنانچہ علی بن عیسیٰ اردبیلی نے اپنی کتاب کشف الغمہ میں اور ابن مطہر حلی، نے اپنی کتابوں الفین، منہج الکرامہ اور نہج الحق میں اسی نوع کی بہت سی نقلیں اور حوالے دیئے ہیں۔ لہذا اس دھوکہ سے بھی باخبر رہنا چاہیئے۔

چونتیسواں دھوکہ :- اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب میں ایک کتاب تصنیف کرتے ہیں۔ جس میں اہلسنت کی مسانید، سنن، اجزاء اور معاجم سے صحیح احادیث نقل کرتے ہیں، مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کرنے کا موقعہ آتا ہے تو خود گھڑ کر، یا امامیہ کی کتابوں سے نقل کر کے ایسی بات شامل کر دیتے ہیں جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی شان میں موجب قدح ہوتی ہے۔ یا ایسی صریح روایات بیان کر دیتے ہیں۔ جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احق بالخلافت ہونے کا مضمون ہوتا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہوتا ہے کہ اُن کی موجودگی میں جو خلافت کرے وہ ایسا ہے، ویسا ہے، تاکہ سامع و ناظر دھوکہ میں پڑ جائے اس لئے کہ وہ فضائل خلفاء میں اس کے بیان سے یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ مصنف کوئی اہل سنت ہے۔ اور اس کا یہی یقین اس کو یہ خیال کرنے پر مجبور کرتا

ہے کہ اہلِ سنت کی تصانیف میں بھی ایسی احادیث موجود ہیں جو تینوں خلفاء کی شان میں قدح کا سبب ہیں۔ اور یوں اس کے دین و یقین دونوں کو سخت ٹھیس لگتی ہے۔

چنانچہ اسی نوعیت کی ایک ضخیم کتاب نظر پڑی، جس میں ہر حدیث کے شروع میں حدیث کے راوی اور اس کی تخریج کرنے والے کا نام درج تھا۔ اس دھوکہ میں بعض بلند مرتبہ علماء حدیث بھی امتیاز نہ کرنے کے سبب پھنس گئے۔ اور فریب کو سمجھنے سے قاصر رہے! چنانچہ ریاض النضرہ فی مناقب العشرہ کے مصنف بھی اس دھوکہ میں آگئے اور اس قسم کی احادیث مجموعہ فضائل خلفاء اربعہ سے اپنے ہاں نقل کر بیٹھے۔ البتہ فن حدیث میں جن کی نظر گہری ہوتی ہے وہ اس چال میں نہیں آتا۔ کیونکہ من گھڑت اور خود ساختہ، پرداختہ الفاظ کی کمزوری، بودا پن اور معانی کا کچا پن، ان کے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ دیتے اور اس فریب کا پتہ دیدیتے ہیں۔ اور صاحب سلیقہ، اور باذوق آدمی پہلی ہی نظر میں تاڑ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی شیطان صفت شخص کی کارستانی ہے۔

پینتیسواں دھوکہ: پچھلے زمانہ میں اہل سنت، شیعوں کے بعض گندے مسائل پر ان کو ہدف لعن طعن بناتے ہیں اس لعن طعن سے بچنے کی علمائے شیعہ نے یہ صورت نکالی کہ ان کتابوں کے نئے ایڈیشنوں سے ایسے مسائل کو بالکل نکال ڈالا اور کتابوں کے پرانے نسخوں کو چھپا دیا۔ اور پھر کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ان مسائل کو اہل سنت کی طرف منسوب کر دیا۔ مثلاً اپنے مملوک سے لواطت کا مسئلہ، کہ اسے امام مالک رحمہ اللہ علیہ کی طرف اور "لف حریر یا مادرو خواہر" (کہ عضو خاص پر ریشم لپیٹ کر ماں بہن کو بے حرمت کیا جا سکتا ہے) کا مسئلہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس قسم کے افترا آمیز مسائل، سید مرتضیٰ، ابن مطہر حلی، ابن طاؤس اور حلی کے بیٹے نے اپنی کتابوں میں بہت نقل کئے ہیں۔ اور غرض صرف یہ ہے کہ "ناک والوں کو نکٹا کہو، تاکہ اپنے نکٹے پن کو چھپایا جا سکے" اور اپنے سر سے لعن و طعن کا بوجھ اھل سنت کے سروں پر لاد دیا جائے کہ اس کی جوابدہی وہ کریں، اور اس طرح ان سے ہمارا پیچھا چھوٹ جائے۔

چھتیسواں دھوکہ: اہل سنت کے مقتداؤں کے اشعار میں ملاوٹ اور جعل سازی بھی ان کی فریب کاری کا ایک طریقہ ہے۔ ان اشعار کے ہموزن و ہم قافیہ، ایک دو شعر اپنے مفید مطلب گھڑ کر، ان کے اشعار میں شامل کر دیتے ہیں ہیں، جن کا مضمون وضاحت سے شیعہ مذہب کی موافقت اور اہل سنت کے مذہب کی مخالفت کرتا ہے اور پھر بے شرمی اور ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت نے شرمندگی اور خفت سے بچنے کے لئے ان اشعار کو اپنی نظم سے نکال دیا ہے۔

اس قسم کی حرکت اکثر و بیشتر اہل سنت کے مشہور اور مقبول شعرائے کرام کے کلام میں کرتے ہیں مثلاً شیخ فریدالدین عطار، شیخ اوحدی، شمس تبریز، حکیم سنائی، مولانا روم، حافظ شیرازی اور حضرت خواجہ قطب الدین دہلوی، وغیرہ ان سے قطع نظر پہلوں میں سے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی انہوں نے یہی سلوک کیا ہے، اور ان کے اشعار میں بھی اپنے گھڑے ہوئے اشعار خلط ملط کر دیئے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے یہ اشعار ہیں۔

یَا رَاکِبًا قِفْ بِالْمُحَصَّبِ مِنْ مِنًی — وَاهْتِفْ بِسَاکِنِ خَیْفِهَا وَالنَّاهِضِ
سَحَرًا اِذَا فَاضَ الْحَجِیْجُ اِلٰی مِنًی — فَیْضًا کَمُلْتَطِمِ الْفُرَاتِ الْفَائِضِ
اِنْ کَانَ رَفْضًا حُبُّ اٰلِ مُحَمَّدٍ — فَلْیَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اَنِّیْ رَافِضِیْ

(۱) اے شتر سوار، منیٰ کی مد پر وادی محصب میں ٹھہر کر نشیب میں رہنے والوں کو پکار، اور وہاں سے اٹھنے والے۔
(۲) حجاج کو جو صبح کے وقت نہر فرات کے پانی کی طرح موج در موج منیٰ کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں بتا۔
(۳) کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہل بیت سے محبت رفض ہے تو میں جن وانس کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ میں رافضی ہوں۔
نواصب، اور خارجی محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت رکھنے والے کو رافضی کہتے تھے ان اشعار میں امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے ان کو مقابلہ میں للکارا ہے۔

مگر شیعوں کی بد باطنی اور موقعہ سے غلط فائدہ اٹھانے کی خصلت دیکھئے کہ چند ابیات اپنی طرف سے گھڑ کر انہیں بھی امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے سر منڈھ دیا۔ اور شرم وحیاء بالائے طاق رکھ کر انہیں اشعار کی بناء پر امام صاحب موصوف کو بھی شیعہ ثابت کرنے لگے، وہ جعلی اشعار یہ ہیں۔

قِفْ ثُمَّ نَادِ بِاَنَّنِیْ لِمُحَمَّدٍ — وَوَصِیِّهٖ وَبَنِیْهِ لَسْتُ بِبَاغِضٖ
اَخْبِرْهُمُ اَنِّیْ مِنَ النَّفَرِ الَّذِیْ — بِوَلَاءِ اَهْلِ الْبَیْتِ لَیْسَ بِنَاقِضٖ
وَقُلِ ابْنُ اِدْرِیْسَ بِتَقْدِیْمِ الَّذِیْ — قَدَّمْتُمُوْهُ عَلٰی عَلِیٍّ مَا رَضِیْ

(۱) اس کے بعد یہ بھی پکار کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے وصی، اور وصی کے بیٹوں سے بغض نہیں رکھتا۔
(۲) اور یہ بھی بتادے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں جو اہل بیت سے رشتہ توڑنے والے ہیں۔
(۳) اور یہ بھی کہہ کہ ابن ادریس (شافعی) اسے پسند نہیں کرتا کہ علی (رضی اللہ عنہ) پر کسی کو ترجیح دے۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے اصل کلام اور ان گھڑے ہوئے اشعار میں جو فرق ہے وہ عربی زبان کے ماہرین پر روز روشن کی طرح عیاں وظاہر ہے۔ اور ان کی یہ دھوکہ بازی بیہودہ اور لچر ہے۔ اس لئے کہ ان بزرگوں کا تو تمام کام، اور بناء شریعت وطریقت از سرتا پا اہل سنت کے مذہب پر ہے۔ پھر محض ایک دو شعر کی وجہ سے ان کو شیعہ سمجھنا ایسی حماقت ہے۔ جس کی توقع کسی طفل مکتب سے بھی بعید ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایسا بھی کرتے ہیں کہ کسی کے اشعار میں الحاق کئے بغیر ان کا کوئی شاعر خود اپنے کہے ہوئے اشعار کو اہل سنت کے کسی بزرگ شاعر کی طرف منسوب کرکے انہیں ان اشعار کا مصنف بنا دیتا ہے۔ مثلاً ان شیعوں کی کتابوں میں ان اشعار کو امام شافعیؒ کے اشعار بتا کر درج کر دیا گیا۔

شَفِیْعِیْ نَبِیٌّ وَالْبَتُوْلُ وَحَیْدَرٌ — وَسِبْطَاهُ وَالسَّجَّادُ وَالْبَاقِرُ الْمَجْدِیْ
وَجَعْفَرُ وَالثَّاوِیْ بِبَغْدَادَ وَالرِّضَا — وَفِلْذَتُهٗ وَالْعَسْکَرِیَّانِ وَالْمَهْدِیْ

(۱) میرے شفیع نبی، بتول اور حیدر ہیں، اور ان کے دونوں نواسے اور سجاد وباقر سخی (بھی)
(۲) اور بغداد کے رہنے والے جعفر اور علی رضا اور ان کے دونوں بیٹے، عسکری ومہدی! (یہ سب میرے شفیع ہیں)

اب قدرت کی طرف سے اس جھوٹ کی پردہ دری ملاحظہ ہو، کہ تاریخ ان کی عقلوں پر ماتم کر رہی ہے۔
امام علی نقیؒ ۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے، اور امام حسن عسکری کی پیدائش تو ان کے بھی بہت بعد کی ہے۔ اور امام تقی

کی وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی اور وہ کرخ میں مدفون ہوئے۔
اور امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کی وفات ۲۰۴ھ میں ہو چکی تھی، تو کیا ان حضرات کی مدح میں یہ اشعار دوبارہ زندہ ہو کر کہے، اس کے علاوہ امام حسن عسکری کا قیام سر من رائے میں تھا جسے اب سامرہ کہتے ہیں اور جو معتصم کا بسایا ہوا تھا۔ حالانکہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے معتصم کا زمانہ پایا ہی نہیں۔ سچ ہے دروغ گو را حافظہ نباشد، (اور خیر حافظہ نباشد میں تو گنجائش ہے اور بھول چوک کہہ کر معاملہ رفع دفع ہو سکتا ہے مگر یہ مکار اور عیار گروہ تو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے، دھڑے سے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ لعنت الٰہی اس کا محبوب طرۂ امتیاز ہے۔ نعمانی)
البتہ اتنی بات صحیح ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کو اپنے زمانہ میں جن اہل بیت کرام کا پتہ چلا تو ان کے فضائل و مناقب انہوں نے بیان کئے ہیں، اور یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تمام اہل سنت نے ان کی مدح سرائی کو ایک عبادت سمجھا ہے۔ اور اہل سنت کی کتابوں میں ائمہ کرام رحمہم اللہ سے بہت سی احادیث کی روایت کی گئی ہے اور اہل بیت کے اسی سلسلہ روایات کو سلسلۃ الذہب، کے نام سے موسوم کیا ہے۔
(اغوا اور دھوکہ دہی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ہم نامی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کفریہ اور شرکیہ مضامین پر مشتمل اشعار کو بزرگان اہل سنت کی طرف نسبت دینے کو بڑی شہرت دیتے ہیں، مثلاً فارسی کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔
شاہ است حسین الخ اس رباعی کو سرگروہ چشتیاں خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ اور کیا عوام اور کیا خواص، سب کے سب اس رباعی کو خواجہ صاحب کا کلام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس رباعی کے مضمون کو دیکھتے ہوئے معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ خواجہ اجمیری رحمہ اللہ علیہ ایسے جاہلانہ عقیدہ سے ہزار بار پناہ مانگتے ہیں۔
یہ اشعار دراصل ایک ایرانی شاعر معین الدین حسن سنجری نامی کے ہیں جو شیعہ تھا! اور اہل سنت نادانستہ طور پر اور شیعہ دانستہ طور پر خواجہ اجمیری رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نعمانی)
سینتیسواں دھوکہ: جب شیعوں نے تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ پڑھا کہ بعض عرب کاہنوں ستارہ شناسوں اور دانشمندوں نے اہل کتاب سے معلوم کرکے یا علم نجوم کی مدد سے، جو کہ اس وقت تک حقیقت کے کچھ قریب تھا اس لئے کہ اس وقت تک شیطانوں کو کن سوئیاں لے کر آسمانی باتوں کی سن گن لینے کی ممانعت نہیں کی گئی تھی۔ بت پرستی چھوڑ دی تھی اور نبی موعود کے لئے چشم براہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبریں سنایا کرتے اور لوگوں کو ترغیب دلایا کرتے کہ جب آپ تشریف لے آئیں تو آپ کی متابعت کی سعادت سے مستفید ہوں۔ تو ان شیعوں کی رگ جعلسازی پھڑکی اور ان قصوں کے ضمن میں چند ایسی باتوں کا بھی اضافہ کر دیا جن سے مذہب رفض کی تائید ہوتی ہو، اور اس کو اسی مرد جاہل کے سر تھوپا۔ بعض جگہ اسی قول کی تصدیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا پیوند بھی لگا دیا۔ اور پھر ان روایات و حکایت پر فخر کرتے اور خوشی سے بغلیں بجاتے۔ ایسی ہی باتوں میں سے جارود عبدی کا ایک قصہ ہے، جو ان کی کتابوں میں مشہور و معروف ہے اور ان کی حدیث کی کتابوں میں بڑے طمطراق اور دھوم دھڑکے سے بیان کیا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

جارود عبدی ایک نصرانی شخص تھا جو سال صلح حدیبیہ میں اسلام لایا۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ اشعار بھی کہے ہیں، ان میں کا ایک شعر یہ ہے۔

أَنْبَأنَا الْأَوَّلُوْنَ بِاسْمِكَ فِيْنَا ✻ وَبِأَسْمَاءِ أَوْصِيَاءٍ كِرَامٍ

یعنی ہمارے اگلوں نے ہمیں آپ کے نام سے آگاہ کیا۔ اور آپ کے بزرگ وصیوں کے نام بھی۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا ہے جو قیس بن ساعدہ کو جانتا ہو؟ جارود بولا حضرت یوں تو ہم سے ہر شخص اس کو جانتا ہے مگر میں اس کے حالات اور پردہ واقعات سے بخوبی واقف ہوں، اس مجلس میں حضرت سلمان فارسی بھی موجود تھے۔ انہوں نے جارود سے کہا کہ ہم کو اس کا کچھ حال اور اشعار سناؤ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی خواہش ظاہر فرمائی تو اس نے کہا۔

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ شَهِدْتُ قُسًّا وَقَدْ خَرَجَ مِنْ نَادٍ مِنْ أَنْدِيَةِ أَيَادٍ إِلٰى صَحْصَحٍ ذِيْ قَتَادٍ وَسَمُرٍ وَعَتَادٍ وَهُوَ مُشْتَمِلٌ بِنِجَادٍ فَوَقَفَ فِيْ أَضْحِيَانِ اللَّيْلِ كَالشَّمْسِ رَافِعًا إِلَى السَّمَاءِ وَجْهَهُ وَإِصْبَعَهُ فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ الْأَرْفَعَةِ وَالْأَرَضِيْنَ الْمُمْرِعَةِ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَالثَّلٰثَةِ الْمَحَامِيْدِ مَعَهُ وَالْعَلِيِّيْنَ الْأَرْبَعَةِ وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنَيْنِ الْأَبْرَعَةِ وَجَعْفَرٍ وَمُوْسَى التَّبِعَةِ سَمِيِّ الْكَلِيْمِ الضَّرَعَةِ أُولٰئِكَ النُّقَبَاءُ الشَّفَعَةُ وَالطُّرُقُ الْمُهَيَّعَةُ دَرَسَةُ الْأَنَاجِيْلِ وَنُفَاةُ الْأَبَاطِيْلِ وَالصَّادِقُوا الْقِيْلِ عَدَدَ النُّقَبَاءِ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ فَهُمْ أَوَّلُ الْبِدَايَةِ وَعَلَيْهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَبِهِمْ تُنَالُ الشَّفَاعَةُ وَلَهُمْ مِنَ اللّٰهِ فَرْضُ الطَّاعَةِ اسْقِنَا غَيْثًا مُغِيْثًا ثُمَّ قَالَ لَيْتَنِيْ أُدْرِكُهُمْ وَلَوْ بَعْدَ لَأْيٍ مِنْ عُمْرِيْ وَمَحْيَايَ ثُمَّ أَنْشَأَ يَقُوْلُ أَقْسَمَ قُسٌّ قَسَمًا لَيْسَ بِهِ مُكْتَتِمًا لَوْ عَاشَ أَلْفَيْ سَنَةٍ لَمْ يُلْقَ مِنْهُمْ سَأَمًا حَتّٰى يُلَاقِيْ مُحَمَّدًا وَالنُّجَبَاءَ الْحُكَمَاءَ هُمْ أَوْصِيَاءُ أَحْمَدَ أَفْضَلُ مَنْ تَحْتَ السَّمَاءِ يَعْمَى الْأَنَامُ عَنْهُمْ وَهُوَ ضِيَاءُ الْعَمٰى لَسْتُ بِنَاسِيْ ذِكْرِهِمْ حَتّٰى أُحَلَّ الرَّجَمَا قَالَ الْجَارُوْدُ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَنْبِئْنَا بِخَبَرِ هٰذِهِ الْأَسْمَاءِ الَّتِيْ لَمْ نَشْهَدْهَا وَأَشْهَدَنَا قُسٌّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا جَارُوْدُ

یعنی جب قس قوم ایادی کی کسی مجلس سے ایک ایسے فراخ میدان کی طرف باہر نکلا جس میں قتاد۔ میوہ اور اسباب کے درخت تھے تو میں اس کے پاس ہی تھا، وہ پرتلہ ڈالے ہوئے چاندنی رات میں اس طرح کھڑا تھا جیسے آسمان میں سورج۔ اس کا چہرہ اور انگلیاں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں میں اس کے کچھ اور قریب ہوا تو اس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اے خدا، بربنہ آسمانوں اور کاشت شدہ زمینوں کے مالک پروردگار بحرمت خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور ہر سہ محمد و ہر چہار علی و فاطمہ حسنین کاملین، جعفر اور موسیٰ۔ جو سب کے متبوع بلند مقام ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے ہمنام یہ سب سرداروں کا گروہ ہے۔ شفاعت کرنے والے اور وحی کی سیدھی راہ کی طرف بلانے والے، جھوٹ کو مٹانے والے، سچ کہنے والے، جن کی تعداد سرداران اسرائیل سے ملتی ہے انہیں سے دنیا کی ابتدا ہے اور انہیں پر قیامت قائم ہوگی، شفاعت یہی کریں گے اور اللہ کی طرف سے انکی اطاعت فرض ہے بس نصیب کر ہم کو فریاد کو پہنچنے والی بارش، پھر کہا کاش میں ان کو پاتا اگرچہ میری عمر اور زندگی کے بدلے میں وہ ملتے۔ پھر کہنے لگا کہ قیس صاف صاف قسم کھاتا ہے کہ اگر یہ دو ہزار برس بھی زندہ رہے تو بھی ان سے تنگ دل نہ ہوگا، یہاں تک کہ ملاقات کرے محمد سے۔ وہ لوگ شرفاء ہیں، حکماء اور وصی، آسمان کے، نیچے سب سے زیادہ بزرگ۔ لوگ ان کی طرف سے اندھے ہیں اور یہ لوگ

لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ اِلَی السَّمَآءِ اَوْحَی اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَیَّ اَنْ سَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا عَلٰی مَا بُعِثُوْا قُلْتُ عَلٰی مَا بُعِثُوْا قَالَ بَعَثْتُھُمْ عَلٰی نُبُوَّتِكَ وَوِلَایَةِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ وَالْاَئِمَّةِ مِنْکُمَا ثُمَّ عَرَّفَنِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی بِاَسْمَائِھِمْ ثُمَّ ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَسْمَآءَھُمْ وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ اِلَی الْمَھْدِیِّ ثُمَّ قَالَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ھٰؤُلَآءِ اَوْلِیَآئِیْ وَھٰذَا الْمُنْتَقِمُ مِنْ اَعْدَآئِیْ یَعْنِی الْمَھْدِیَّ۔

بینائی کے نور تا آنکہ میں تہہ میں نہ آؤں۔ ان کی یاد بھلانے والوں میں سے نہیں۔ جارود نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی مجھے ان ناموں سے آگاہ فرمائیے جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ قس ہی نے مجھے ان کے حالات سے واقف کرایا ہے۔ حضور نے فرمایا اے جارود معراج کی رات اللہ کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی کہ ان پیغمبروں سے پوچھئے جو آپ سے پہلے مبعوث ہوئے کہ آپ کی بعثت کس پر ہوئی میں نے کہا کس پر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کی نبوت پر، اور علی اور ان کی اولاد میں سے ائمہ کی ولایت پر۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کے نام بتائے اور پھر یہی نام امام مہدیؑ تک بالترتیب حضور نے مجھے بتائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے دوست ہیں اور یہ (مہدی) میرے دشمنوں سے بدلہ لینے والے ہیں۔

اب اس روایت کا تجزیہ کیا جائے تو بناوٹ، جھوٹ کے آثار اتنے واضح اور صاف ہیں گویا وہ خود بہانگ دہل اپنی تردید آپ کا مصداق ہیں۔

ماہر عربیت کو اس روایت کے الفاظ کا پھس پھسا پن اس کے من گھڑت ہونے کی چغلی کھاتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلیغ سے ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رکھتے۔ دوسری بات یہ وہی جارود تو ہے جس کا بیٹا منذر نامی جناب امیر کی خلافت میں عامل تھا اور وہ تمام متعلقہ علاقوں کا خراج وصول کر کے فرار ہو گیا اور جناب امیر کے دشمنوں سے جا ملا۔ جناب امیر نے سرزنش و ملامت کے بہت سے خطوط لکھے۔ مگر اس نے کسی ایک کو بھی قابل توجہ نہ سمجھا اور ساری رقم ہضم کر گیا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس کا باپ جناب امیر رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولاد سے اتنا واقف اور معتقد تھا۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو آپ کی جلالت شان سے واقف نہ کر دیا ہو۔ اور پھر ایسے باپ کا بیٹا ان کے ساتھ ایسی غداری کرتا اور بے حیائی سے پیش آتا۔ پھر اسی جارود کے بیٹے نے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا مصاحب خاص تھا اور شاگرد بھی۔ اس نے ائمہ اطہار سے علم کیوں حاصل نہیں کیا۔ انس بن مالک کی شاگردگی ہی پر قانع ہو کر کیوں بیٹھ رہا۔

صحیح اور قابل اعتبار کتابوں سے جارود کا صرف اتنا سا حال معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہا وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَقَدْ وَجَدْنَا وَصْفَكَ فِی الْاِنْجِیْلِ۔ وَلَقَدْ بَشَّرَنَا بِكَ اِبْنُ الْبَتُوْلِ۔ (اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ آپ کا وصف ہم نے انجیل میں موجود پایا اور ابن مریم علیہ السلام نے ہم کو آپ کی بشارت دی)۔

البتہ قس بن ساعدہ الایادی کا حال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یوں معلوم ہوا ہے۔

قَالَ اِنَّ وَفْدَ بَکْرِ بْنِ وَائِلٍ قَدِمُوْا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا فَرَغُوْا مِنْ حَوَائِجِھِمْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ فِیْکُمْ اَحَدٌ یَعْرِفُ قُسَّ بْنَ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بکر بن وائل کا ایک وفد آیا۔ جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا تم میں سے کوئی قس بن

سَاعِدَةَ الْاَيَادِيْ قَالُوْا قُلْنَا نَعْرِفُهٗ قَالَ مَا فَعَلَ قَالُوْا هَلَكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ كَاَنِّیْ بِہٖ عَلٰی جَمَلٍ اَحْمَرَ بِعُكَاظٍ قَائِمًا يَقُوْلُ اَيُّهَا النَّاسُ اِجْتَمِعُوْا وَاسْمَعُوْا وَعُوْا فَكُلُّ مَنْ عَاشَ مَاتَ وَكُلُّ مَنْ مَاتَ فَاتَ وَكُلُّ مَا هُوَ اٰتٍ اٰتٍ اِنَّ فِی السَّمَآءِ لَخَبَرًا وَاِنَّ فِی الْاَرْضِ لَعِبَرًا مِهَادٌ مَوْضُوْعٌ وَسَقْفٌ مَرْفُوْعٌ وَبِحَارٌ تَمُوْرُ وَتِجَارَةٌ لَنْ تَبُوْرَ لَيْلٌ دَاجٍ وَسَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ اَقْسَمَ قُسٌّ حَقًّا لَئِنْ كَانَ فِی الْاَمْرِ رِضًی لَيَكُوْنَنَّ بَعْدَهٗ سَخَطٌ وَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّتْ قُدْرَتُهٗ دِيْنًا هُوَ اَحَبُّ اِلَيْہِ مِنْ دِيْنِكُمُ الَّذِیْ اَنْتُمْ عَلَيْہِ مَالِیْ اَرَی النَّاسَ يَذْهَبُوْنَ وَلَا يَرْجِعُوْنَ اَرَضُوْا فَاَقَامُوْا اَمْ تُرِكُوْا فَنَامُوْا ثُمَّ اَنْشَدَ اَبُوْ بَكْرٍ شِعْرًا كَانَ يَحْفَظُهٗ۔ بیت

فِی الذَّاهِبِيْنَ الْاَوَّلِيْنَ مِنَ الْقُرُوْنِ لَنَا بَصَائِرُ
لَمَّا رَاَيْتُ مَوَارِدًا لِلْمَوْتِ لَيْسَ لَهَا مَصَادِرُ
وَرَاَيْتُ قَوْمِیْ نَحْوَهَا يَسْعَی الْاَصَاغِرُ وَالْاَكَابِرُ
لَا يَرْجِعُ الْمَاضِیْ اِلَیَّ وَلَا مِنَ الْبَاقِيْنَ غَابِرُ
اَيْقَنْتُ اَنِّیْ لَا مَحَالَةَ حَيْثُ صَارَ الْقَوْمُ صَائِرُ

ساعدہ کو جانتا ہے انہوں نے کہا ہم سب اس کو جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اب اس کا کیا حال ہے۔ وہ کہنے لگے اس کا تو انتقال ہو گیا۔ اس پر آپ نے فرمایا، میری نظروں میں وہ منظر ابھی تک ہے کہ وہ عکاظ میں سرخ اونٹ پر بیٹھ کر وہ کہہ رہا ہے۔ لوگو! آؤ، سنو اور یاد رکھو کہ جو زندہ ہے وہ مرے گا اور جو مر گیا وہ فنا ہو گیا۔ اور جو آنے والا ہے وہ ضرور آئے گا۔ البتہ آسمان میں بھلائی ہے اور زمین کی عبرتیں! ایک ستون ہے گڑا ہوا۔ اس پر چھت ہے ڈالی ہوئی سمندر موجزن ہے! سودا ہے بے نقصان! رات اندھیری ہے اور آسمان برج والا ہے اور قس قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس وقت اگر کام میں خوشی ہے تو بعد میں اس میں ناخوشی ہوگی اور اس اللہ کے نزدیک جس کی قدرت سب پر غالب ہے ایک دین ہے جو اس کو تمہارے دین سے زیادہ پسند اور محبوب ہے۔ کیا بات ہے کہ میں لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ دنیا سے چلے جا رہے ہیں اور پھر واپس نہیں ہوتے۔ کیا ان کو کوئی ایسی چیز مل ہے کہ وہیں رُک گئے! یا معاف کر دیئے گئے تو سکون سے وہیں سو رہے۔

پھر ابوبکر نے ایک شعر پڑھا جو اس کو یاد تھا۔ (ترجمہ یہ ہے)

"پچھلی صدیوں کے گذرے ہوئے لوگوں میں ہمارے لئے عبرت و نصیحت ہے کہ موت ایک دن آئے گی، اور اس پر اترنے کی جگہ تو ہے مگر واپسی کی جگہ نہیں اور میں نے دیکھا کہ میری قوم کے چھوٹے اور بڑے اسی کی طرف دوڑے جا رہے ہیں نہ گیا ہوا کوئی لوٹتا ہے اور نہ ہی بقیہ میں سے کوئی باقی رہے گا۔ تو میں نے یقین کر لیا کہ میں بھی ضرور وہیں جاؤں گا جہاں میری قوم چلی گئی۔"

اب اس عبارت اور پچھلی عبارت میں جو قس کی بتائی جاتی ہے زمین و آسمان کا فرق ہے عربی لغات کا انبار لگا دینے سے بھی کہیں کلام میں بلاغت پیدا ہوتی ہے، قس کا شمار عرب کے چوٹی کے بلغاء میں تھا اور پچھلی عبارت میں بلاغت و فصاحت کا شائبہ تک نہ تھا صرف قاموس کے لغت اکٹھے کر دیئے گئے اور بس! اور جن کو فصاحت و بلاغت میں ذرا بھی درک ہے وہ اسے بخوبی سمجھ لیں گے

دراصل وہ قصہ سرتاپا، من گھڑت اور جھوٹ کی پوٹ ہے۔ اس کے جھوٹا ہونے کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ جناب امیر اور آپ کی اولاد کی ولایت شب معراج میں طے پا جاتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالتفصیل اور بالترتیب ان ائمہ کے نام بتاتے اور وہ بطریق تواتر ہم تک پہنچتے جس طرح نماز کی فرضیت اور دیگر واقعات معراج بوضاحت بیان فرمائے اور وہ بطریق تواتر ہم تک پہنچے، یا کم از کم جناب امیر اور آپ کا خاندان تو اس سے مطلع ہوتا تاکہ یہ پھر امامت کے معاملہ

میں آپس میں نہ جھگڑتے۔ اور اگر کتب سابقہ میں یہ قصہ مذکور ہوتا تو یہود و نصاریٰ تو باخبر ہوتے، بلکہ جاہلیت اولیٰ کے عرب لوگ کو بھی ضرور اطلاع ہوتی۔ اور وہ اس کی خبر دیتے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ شیعوں کے سارے فرقے یہ روایت بیان کرتے اور کیسانیہ، اسماعیلیہ، واقفیہ، زیدیہ، اس معاملہ میں اثنا عشریوں کے ساتھ موافق ہوتے۔

اس کے علاوہ اسی قسم کی طرف منسوب کردہ کلام میں ائمہ کی طرف نفاۃ الاباطیل سے کی گئی ہے۔ یعنی برائیوں اور لغویات کے مٹانے والے، جب کہ ان حضرات کرام کو تو باطل کے مٹانے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو سکی اس لئے کہ اثنا عشری شیعوں کے گمان و خیال کے موافق تو ان حضرات کی ساری زندگی تقیہ اور دشمنوں کے خوف میں بسر ہوئی۔ ان کے زمانہ میں عباسی اور مروانی لغویات کا رواج و چرچا ہوتا رہا۔ مگر یہ ایک حرف زبان سے نہ نکال سکے۔

اسی طرح ان کو صادق القیل (کہ وہ سچ بولنے والے ہیں) کہا گیا۔ حالانکہ بقول ان ہی شیعوں کے کہ تقیہ کی وجہ سے ان ائمہ کو عمر بھر حرف سچ زبان پر لانے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔

پھر ان کی مدح میں درستہ الانجیل (انجیل کے پڑھنے پڑھانے والے ہیں)، کے الفاظ بھی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک صاحب سے بھی انجیل کا پڑھنا پڑھانا ثابت نہیں۔

اڑتیسواں دھوکہ: یہ ہے کہ ایک گھڑی ہوئی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیعانِ علی کے کسی چھوٹے بڑے گناہ کے بارے میں اُن سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔ بلکہ ان کی برائیاں اچھائیوں میں بدل دی جائیں گی۔ نیز یہ بھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَا اُعَذِّبُ اَحَدًا وَالٰی عَلِیًّا وَاِنْ عَصَانِیْ۔ (علی سے محبت والوں میں سے میں ایک کو بھی عذاب نہیں دوں گا خواہ اس نے میری نافرمانی ہی کی ہو۔)

ان گھڑی ہوئی روایات نے ہوا و حرص کے بندوں، آزاد خیال لوگوں کو گمراہی کی کھلی چھوٹ دے دی۔ اب وہ دھڑلے سے بدکاریوں کے مرتکب ہوتے اور خوب دادِ عیش دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس سند موجود ہے۔

کیا یہ احمق اتنا نہیں سمجھتے کہ جن بزرگوں سے صرف اظہار محبت جو محض زبانی و کلامی ہے۔ گناہوں کو نیکیوں میں بدل سکتا ہے تو ان بزرگوں اور پاکباز ہستیوں کو خود طاعت و بندگی کی تکلیف و مشقت برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ہمیشہ گرفت اور باز پرس کے خوف و ہراس میں زندگی کیوں گذارتے۔

اقرباء، اہلِ خاندان، احباب، خدام اور تبعین کو طاعت و عبادت کی ترغیب و تحریص کیوں دلاتے، کیوں تاکید فرماتے؟ گناہ اور محرمات کے ارتکاب پر دھمکیاں دیتے اور سختیاں کیوں کرتے اور شروع ہی سے لوگوں کو نماز، روزہ، حج اور جہاد اور دوسری مشقتوں کے لئے کیوں دعوت دیتے۔ اور ان کی طبعی خواہشات و مرغوبات کے چھڑانے کا سبب کیوں بنتے؟ نجات کا آسان و قریب ترین راستہ صرف محبت کیوں نہ بتا دیتے؟ اور اسی کو نجات کا دارومدار اور دعوت کا مقصد اصلی کیوں نہ ٹھہراتے کہ آسان راستہ ہوتے ہوئے مشکل راستہ اختیار کرنے کا الزام لازم نہ آتا۔ اور مکلفین کے حق میں اختیارِ اصلح کا اصول بھی ہاتھ سے نہ جاتا۔

اسی طرح قرآن مجید میں باوجود انتہائی رحمت و شفقتِ الٰہی کے نجات کے اس راستہ کا پتہ کیوں نہیں دیا۔ اور دعوت کو اعمال طاعت و تقویٰ کے تنگ دائرہ میں کیوں محصور رکھا؟

حاصل کلام یہ کہ ان افترا آمیز روایات سے ان کی غرض یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا شیرازہ بکھیرا جائے۔ اور اس کے بجائے لادینیت اور لامذہبیت کو رواج دیا جائے۔

انتالیسواں دھوکہ:۔ یہ ہے کہ شیعہ کہتے ہیں !" اہل بیت کے بارے میں یا خاص طور سے امامت و فضائل امیرالمومنین کے سلسلہ میں جو آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی صحت پہ دونوں فریقوں سنی وشیعوں کا اتفاق ہے۔ البتہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم یا خلافت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ مختلف فیہ ہے۔ اب عقل کا تو یہ تقاضا ہے کہ جن باتوں پر اتفاق ہے ان کو لے لیا جائے، اور مختلف فیہ کو ترک کر دیا جائے تاکہ تردد اور شک سے بچ جائیں۔ اور حدیث دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَىٰ مَا لَا يُرِيبُكَ (مشکوک بات کو چھوڑ کر یقینی بات اختیار کرو) پر بھی عمل ہو سکے"۔

دالزاما ہم کہتے ہیں کہ شیعوں کا مذکورہ بالا شبہ یہود و نصاریٰ کا چربہ ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت، فضائل و مناقب پر یہودیت، نصرانیت اور اسلام، تینوں مذاہب کا اتفاق ہے، اور نبوت، فضائل و مناقب پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر اختلاف، عقلمندوں کو چاہیئے کہ متفق علیہ کو لے لیں اور مختلف فیہ کو چھوڑ دیں۔

اور پھر خوارج کا نظریہ اور شبہ بھی اسی طرح کا ہے وہ بھی کہتے ہیں کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت اور ان کے خلافت اور ان کے مناقب پر ان کے زمانہ میں سب متفق تھے ان کے ساتھیوں میں سے نہ کسی نے مخالفت کی، نہ ان کے خلاف بغاوت کی اور نہ ان کی شان میں لعن طعن کی زبان درازی کی۔ اب عرصۂ دراز اور مدت مدید کے بعد جب کہ جھوٹ پھیل چکا ہو ان پر کوئی تہمت دھرے اس کا کوئی اعتبار نہیں، اسے نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ ان پر اعتبار نہ کرنے والوں سے وہ زمانہ تو دیکھا ہی نہیں، صرف یہ گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں سن کر بد اعتقادی میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے برخلاف حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی خلافت خود ان کے زمانہ ہی میں مخالفتوں اور جھگڑوں کا شکار ہو گئی اور اور ان کے ساتھی بلکہ ان کے عزیز و اقارب اور اہل خاندان ان کی خلافت کے منکر ہوئے اور ان کی بزرگی پر طعن کرنے لگے۔ اور تقاضائے عقل یہ ہے کہ متفق علیہ کو لے لیا جائے مختلف فیہ کو نظر انداز کر دیا جائے"۔

اس قسم کے سارے شکوک و شبہات کا جو شیعہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جواب صرف ایک ہے وہ یہ کہ متفق علیہ کو لینا اور مختلف فیہ کو چھوڑ دینا عقلاً اس وقت ضروری ہوتا ہے جب ان دو باتوں پر سوائے اتفاق و اختلاف کے کوئی اور دلیل موجود ہی نہ ہو۔ اور اگر کوئی قوی دلیل ایسی مل جائے جو کسی ایک جانب کو ترجیح دیتی ہو، تو پھر اتفاق و اختلاف والی صورت سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بلکہ اسی قوی دلیل کو قابلِ اتباع اور لائق حجت مانا جائے گا۔

کیونکہ حق بہرحال حق ہے۔ اگرچہ اس کے حامی و مددگار تھوڑے ہی ہوں، اور باطل باطل ہی ہے چاہے اس کے، نقل کرنے والے بکثرت کیوں نہ ہوں۔

اور کاش شیعہ حضرات اپنے مقرر کردہ اس قاعدہ و اصول پر جمے رہیں مگر ان کا حال تو اس آیت کا مصداق ہے کہ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ (یہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں)

خود ان کے فقہ کا مقرر اور تسلیم شدہ یہ اصول و قاعدہ ہے کہ جب ائمہ سے دو روایتیں منقول ہوں۔ ایک عام خیال کے مخالف، دوسری موافق ۔ تو مخالف روایت کو لینا چاہیئے نہ کہ موافق کو، اس لئے کہ حقیقت کی بناء مخالفت عام

ہی پر تو ہے۔

ان کے اس مقررہ اصول پر غور کر کے ذرا ان کی سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور عقل و دانش کا اندازہ لگا لیا جائے۔ آگے چل کر ہم انشاء اللہ باب امامت اور باب مطاعن میں وضاحت کے ساتھ آپ کو بتائیں گے کہ خلفائے ثلاثہ، بلکہ تمام صحابہ کرام۔ رضوان اللہ علیہم کے فضائل و مناقب پر سنی اور شیعہ روایات، سب کا اتفاق ہے۔ اور ان بزرگوں کی برائیاں صرف بعض شیعی روایات میں آئی ہیں۔ ایسی صورت میں اب عقل کا کیا تقاضا ہے، وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

چالیسواں دھوکہ: شیعہ مذہب کو حق ثابت کرنے اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کرتے ہیں، کہ "شیعوں کو یقین ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ مگر اہل سنت کو اپنے بارے میں دونوں باتوں پر یقین نہیں ہے اور اپنے متعلق یقین رکھنے والا اسبات کا زیادہ حقدار ہے کہ اپنے متعلق شک رکھنے والے کے مقابلہ میں اس کا اتباع اور پیروی کی جائے"۔

شیعوں کا یہ استدلال بہت بودا ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت عمومی طور پر تو اس میں ہرگز شک نہیں کرتے کہ وہ ہر شخص جو ایمان صحیح اور عمل صالح پر مرے وہ یقیناً جنتی ہے اور دوزخ سے اس کی نجات لازمی ہے۔

لیکن چونکہ عاقبت کا معاملہ نامعلوم الحال ہے، اس لئے انفرادی حیثیت سے ہر ہر شخص کے بارے میں یہ دعوے کیا جائے کہ وہ یقیناً جنتی ہے یا دوزخ سے آزاد ہے ایک بے معنی بات ہے۔ بلکہ اس صورت میں تو اللہ کے خوف کو دلوں سے دور کرنا اور مکر الٰہی سے اپنے آپ کو مامون سمجھنا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُوْنَ (اللہ تعالیٰ کے مکر سے دنیا میں بے خوف فاسق ہی ہوتے ہیں، کیونکہ عقبیٰ میں ایسے بے خوف لوگوں کی پوری پوری گرفت ہوگی۔

اور امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب تفسیر میں صراحۃً یہ موجود ہے کہ جو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتا وہ مومن ہی نہیں"

اور ادعیہ صحیفہ کاملہ میں جو شیعوں کے نزدیک بطریق تواتر جناب امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے ہے۔ جابجا انجام کار سے خوف دلایا ہے۔

اور پھر یہ استدلال یوں بھی غلط ہو جاتا ہے کہ مثلاً یہود و نصاریٰ غلاۃ قرامطہ حمیریہ اور اسمعیلیہ فرقے اپنی اپنی نجات کا یقین رکھتے ہیں۔ ان میں ایک طائفہ، اپنے آپ کو اَبْنَاءُ اللّٰهِ (اللہ کے بیٹے) اور اَحِبَّاءُ اللّٰهِ اللہ کے دوست، کہتا ہے تو دوسرا اپنے اندر اللہ تعالیٰ کا حلول مانتا ہے یا اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اتحاد کا قائل ہے تو شیعہ استدلال کے مطابق یہ فرقے اسبات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کا اتباع کیا جائے حالانکہ یہ فرقے سب بالاتفاق باطل ہیں۔

اکتالیسواں دھوکہ: اہل سنت کو الزام دیتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مذہب میں ایسے لوگوں کا اتباع کرتے ہیں کہ جو معصوم نہیں ہوتے اور جب غیر معصوم کو خود اپنے ہدایت یافتہ ہونے کا یقین نہیں وہ دوسرے کو کیا ہدایت کرے گا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَمَنْ يَّهْدِيْ إِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْ إِلَّا اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔ (جو شخص حق کا راستہ بتائے وہ اتباع کا زیادہ مستحق ہے یا وہ جو اس وقت تک راستہ نہ پائے جب

تک کوئی دوسرا اس کو راستہ نہ بتائے۔ پس تمہیں کیا ہوگیا ہے یہ کیسے فیصلے کرتے ہو۔)

اہل سنت کی مثال تو اس اندھے کی سی ہے جس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو، اور وہ اپنے گھر پہنچنا چاہتا ہے مگر راستہ بھٹک جانے کا ڈر ہے۔ اس تردد و حیرانی کے وقت اسے ایک شخص ملتا ہے جو اس کے گھر سے واقف نہیں اور یہ اندھا اپنا ہاتھ اس کو تھما دیتا ہے اور بے کھٹکے اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ اب وہ شخص اس کو کھینچ کر ایسے مہلک و خار دار جنگل میں جا چھوڑ دیتا ہے۔ جو درندوں اور موذی جانوروں سے بھرا ہوا تھا اور کہہ دیتا ہے تیری منزل مقصود یہی ہے۔"

اس طعن کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں۔ اور اس قرآن مجید کی جو حبل اللہ المتین ہے۔ لیکن احادیث کی روایت کرنے اور قرآن مجید کے معانی سمجھنے میں صحابہ کرام اور اہل بیت کی روایت کے محتاج رہتے ہیں۔ جن کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صداقت، صلاح اور نجات و فلاح کی گواہی دی ہے۔ اور ایسی ہی ان حضرات کرام نے اپنے برگزیدہ شاگردوں اور بزرگ ہمعصروں کے حق میں شہادت دی ہے۔ چنانچہ اسی طرح صدی بعد صدی ایک دوسرے کی تصدیق کرتے چلے آتے ہیں۔ بخلاف شیعہ کے کہ انہوں نے ائمہ اور اپنے درمیان، جھوٹے مفتری۔ اور دنیا طلب لوگوں کو واسطہ بنایا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ خود ان کی صحیح کتابوں میں یہ بھی مروی ہے کہ ائمہ عظام نے ان بدبخت (واسطوں) سے بہزار زبان بیزاری ظاہر کی، ان پر تبرّیٰ بھیجا اور لعنت برسائی۔ ان میں اکثر مجسمیہ مشبہہ، اباحیہ اور حلولیہ ہوئے ہیں۔

اہل سنت کی مثال تو ایسے شخص کی سی ہے جو بادشاہ کی ملازمت کا ارادہ کرکے بادشاہ کے مقرب اور دربار رس سے ملے، وہ کسی امیر کے سپرد کرے اور امیر بادشاہ کے وزیر خاص سے ملائے اور ان واسطوں کے متعلق مشہور یہ ہو کہ ان سب کو بادشاہ کا تقرب خاص حاصل ہے اور یہ بھی زبان زد خلائق ہو کہ بادشاہ کی مہربانیاں اور عنایتیں ان پر پیہم ہوتی ہیں (ایسے شخص کے متعلق کون کہے گا کہ وہ منزل سے بھٹکا ہوا ہے)

رہے شیعہ تو ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بلا اطلاع، بے سند اور غائبانہ، بادشاہ سے کوئی جاگیر، جائداد حاصل کرنے کا پروانہ حاصل کرنا چاہے اور اس کے مکاروں، دغا بازوں، جعلسازوں اور جعلی مہریں بنانے والوں سے خفیہ ساز باز کرلے جو خود ہی بادشاہ کے خوف سے لرزاں ترساں رہتے ہوں اور چھپے چھپے پھرتے ہوں اور جن کے متعلق شاہی فرامین یہ ہوں کہ ان کے ہاتھ قلم ہوں، ناک، کان کاٹے جائیں۔ (نامرادی اس کی دیکھا چاہیئے۔)

تِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں شاید وہ ان پر غور کریں۔)

بیالیسواں دھوکہ: یہ لوگ صحابہ کرامؓ پر افتراء و الزام لگاتے ہیں کہ ان حضرات نے قرآن میں تحریف کرکے ان آیات کو اس سے خارج کردیا جو امیر المومنین حضرت علیؓ یا اہل بیت کے فضائل میں نازل ہوئی تھیں یا جن میں لوگوں کو اہل بیت کی اتباع و اعانت کی رغبت دلائی گئی تھی۔ اور سب لوگوں پر ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کے خلاف اتفاق کرکے اہل بیت کا حق غصب کیا اور ان کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔

ان کی اس ہفوات کی تردید خود قرآن مجید کی آیات میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۔ (قرآن ہم ہی نے اتارا اور ہم ہی محافظ ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔

ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین پر اسی طرح اقتدار دے گا جیسا ان سے پہلوں کو دیا تھا۔ اور ان لوگوں کے لئے جس دین کو اس نے پسند کیا ہے اس کو ثبات و اقرار بھی دے گا۔ اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے کسی کو میرا ساجھی نہیں پائیں گے۔ (ان باتوں کو سن لینے کے بعد) جو لوگ کفر کریں گے وہی فاسق ہوں گے۔

نیز ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے :۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔

(ان کو اجازت دیدی گئی کہ جو تم سے لڑتے ہیں ان سے جنگ کرو، کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے۔ اور جن لوگوں کو اپنے دیار و امصار سے خواہ مخواہ نکالا گیا، ان کی مدد پر اللہ تعالیٰ یقیناً قادر ہے ان کا یہی تو قصور اور کہنا تھا کہ اللہ ہمارا رب و معبود ہے اور اللہ تعالیٰ ایک سے دوسرے کی گوشمالی نہ کراتا رہے، تو درویشوں کے خلوت خانے یہود و نصاریٰ کے صومعے اور عبادت خانے اور مسلمانوں کی مساجد جن میں بکثرت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے ڈھا دیئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ اسی کی مدد کرتا ہے جو اللہ کے مددگار ہوتے ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہی قوت و غلبہ والا ہے۔ (اللہ اپنے مددگاروں کے بارے میں فرماتا ہے کہ) یہ لوگ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر حکومت و اقتدار عطا فرمائیں تو یہ نماز (کا نظام) قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، بھلی باتوں کو نافذ کریں اور بری باتوں سے لوگوں کو روکیں اور (تمام کاموں کا انجام و نتیجہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۔

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں کے حق میں تو بہت سخت ہیں مگر باہم بڑے نرم دل اور مہربان ہیں، تو ان کو (جب دیکھے) رکوع و سجود میں مشغول پائے گا اور وہ اللہ کا فضل اور خوشنودی کے (ہر وقت) طالب رہتے ہیں، سجدوں کے نشان ان کے چہروں (اور پیشانی) پر نمایاں ہیں)

اب آپ دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن صحابہ کے متعلق یہ کچھ فرمایا ہے، یہ

بدبخت ان پر کیا بہتان و افترا باندھتے ہیں۔ (ختم اللہ علی قلوبھم)

تینتالیسواں دھوکہ:۔

اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں کے متعلق یہ بہتان لگاتے ہیں کہ وہ دن رات صبح و شام میں اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے یہی التجا کرتے تھے کہ ان کو شیعانِ علی میں داخل فرمائے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ بہتان اولوالعزم پیغمبروں کی شان میں نقص و کمزوری کا پتہ دیتا ہے، کہ ان کی پیہم دعائیں بھی اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائیں۔ اور ان کو یہ تک نہیں بتایا کہ شیعانِ علی کا زمانہ ابھی آیا کہاں ہے کہ آپ لوگ قبل از وقت اور بے محل اظہار خواہش کی تکلیف میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

اس ذیل میں اہل سنت کی ضعیف روایات بھی سامنے لاتے ہیں جو شیعانِ علی کی مدح میں وارد ہیں۔ اول تو ان روایات کی صحت ہی امکان سے دور ہے۔ پھر اپنے اوپر یا اپنے جیسوں پر لفظ شیعہ کا اطلاق کرنا بھی دعویٰ بلا دلیل ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صحیح شیعہ تو اہلِ سنت ہی ہیں وہی آنجناب رضی کی روش پر چلتے ہیں اور کسی کے لئے باعثِ آزار نہیں۔ ہر ایک کو نیکی اور بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔ عقائد و اعمال میں قرآن و حدیث کا اتباع کرتے ہیں۔ اور سیرت میں آپ کی پیروی۔

ہم صفحات ماسبق میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ شیعانِ علی کا لقب دراصل ان شیعانِ اولیٰ کے ساتھ مخصوص تھا جو اہلِ سنت کے پیشوا ہیں۔

پھر جب رفتہ رفتہ جھوٹے، بناوٹی دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے تو ان بزرگوں نے اس لقب پر تین حرف بھیجے اور اس کو اپنے لئے ترک کر دیا۔ اور ان کی جگہ اہلِ رفض و اباحت اور زندیقوں نے اس کو اپنے لئے طرۂ امتیاز بنا لیا۔ اور جب یہ قیمتی لقب رذیل لوگوں کے ماتھے کا جھومر بنا تو اہلِ سنت نے اگر اس کو ترک کر دیا تو تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ اب یہ عزت و شان کا مظہر نہیں رہا تھا بلکہ رذالت و کم بختی کی نشانی بن گیا تھا۔

چوالیسواں دھوکہ:۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام انبیاء اور رسولوں پر فضیلت دیتے ہیں البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رتبہ و ہمسر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور تمام ملائکہ اور حاملین عرش و کرسی پر بھی ان کی برتری کے قائل ہیں۔ اور اس معاملہ میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اس ساری تگ و دو کا راز صرف یہ ہے کہ جب کوئی اس قدر عزت و منزلت کا معتقد ہوگا تو لامحالہ یہ بھی مان لے گا۔ کہ خلافت ان ہی کا حق تھا کہ دوسرے کو اس میں مداخلت کا حق نہیں تھا۔ حالانکہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ خلافت کا معاملہ افضلیت مرتبہ پر موقوف نہیں۔ چنانچہ عالم غیب میں حضرت جبرائیل و میکائیل علیہما السلام کے ہوتے ہوئے حضرت طالوت علیہ السلام کو جن کا پیشہ چمڑا رنگنا تھا۔ خلافت کے لئے چُنا گیا۔ اور دنیا میں حضرت شموئیل پیغمبر (علیہ السلام) کی حیات میں منصب خلافت سے انہیں طالوت کو نوازا گیا۔ پھر زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (علم و جسم میں ان کو کشادگی بخشی) کے الفاظ سے ان کی مدح سرائی کی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ امور مملکت کی انجام دہی اور معاملات حکومت کا حل و عقد اور بسط و کشاد دوسری چیز ہے اور نسبت کی شرافت و نجابت، علم کی گہرائی اور ذہن کی رسائی دوسری شئے۔

پینتالیسواں دھوکہ:۔ شیعوں میں یہ بات معروف و مشہور ہے بلکہ ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی بھی ہے کہ

خلفائے راشدین، ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ معظمہ رضی اللہ عنہم کو سب و شتم کرنا عبادات میں سب سے افضل و اکمل عبادت ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گالی دینا" ذکر اللہ اکبر" سے زیادہ بہتر! اب ان کے احمق او بے وقوف لوگ اس عقیدہ سے گمراہ ہو کر بہت سی فرض عبادت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، اور اس" افضل عبادت" پر بڑی پابندی سے کاربند رہتے ہیں۔

اور اتنی بات نہیں سمجھتے کہ جو بھی انسان گمراہ ہوتا ہے وہ شیطان کے ورغلانے سے، اور شیطان اپنے اس"مشن" میں اتنا بلند مرتبہ ہے کہ انسان کا تو خیال بھی اس بلندی کو نہیں چھو سکتا۔ اس کے باوجود کسی مذہب میں بھی شیطان پر لعن طعن کو عبادت شمار نہیں کیا گیا۔ نہ قربت کا سبب و معیار بنایا گیا۔

(حضرت اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک حسب موقعہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

نئی ترکیب شیطاں نے نکالی ہے یہ اغوا کی ؎ خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو بُرا کہئیے

پھر جائیکہ ان بزرگ ہستیوں کی شان میں جنھوں نے مدتوں خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت اٹھائی اور آنجناب سے سسرال و قرابت کے گہرے رشتے رکھتے تھے۔ اہل سنت کی ایک عظیم اکثریت، بلکہ ان کے علاوہ دوسرے فرقے مثلاً کرامیہ، معتزلہ اور نجاریہ ان بزرگوں کی ہمیشہ تعظیم و توقیر کرتے رہے۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ فرق اسلامیہ میں بڑے سے بڑا فرقہ اہل سنت ہی کا رہا ہے ان میں ایک جماعت ایسی بھی گذری ہے جس نے لوگوں کے حالات کو جانچا، پرکھا، مدح کے قابل کی مدح سرائی کی، قابلِ مذمت کی مذمت کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات کے نقل میں انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ جن کی ذکاوت و ذہانت اور سلیم عقول ضرب المثل ہیں۔ چنانچہ عقلیہ، فلسفیات، ریاضیات اور طبعیات میں انہوں نے ایسی ایسی بحثیں اور گہرے نکات نکالے کہ اگر ان علوم کو مرتب کرنے والے ان موشگافیوں کو دیکھ پائیں تو یقیناً ان کے سر احسانمندی سے ان کے سامنے خم ہو جائیں بلکہ بعض علوم مثلاً علم اصول یا فنون ادبیہ کے تو یہ حضرات خود موجد بھی ہوئے۔ تو ایسے عقیل و فہیم صاحبان علم و دانش کی اکثریت جن کی مدح و تعریف، عزت و توقیر اور تعظیم پر متفق ہو تو لا محالہ ان کے سامنے متفقہ فیصلہ پر رد و قدح اور لعن طعن کرنے والا کب معتبر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی آدمی کا کردار مشتبہ ہو گا نہ کہ ان ہستیوں کا اور رد و رجی بات پر یقین کسی عقلمند کا کام نہیں ہو سکتا اور پھر ایسے پیشواؤں پر ان کا معذور ہونا اور ان سے دھوکہ کھانا جن کا حال آگے کھلے گا، دانشمندی سے بعید اور منافی ہے۔

چھیالیسواں دھوکہ:۔ انہوں نے اپنی احادیث کی کتابوں میں اس مضمون کی گھڑی ہوئی چند روایات درج کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اکثر و بیشتر یہ وحی بھیجتے رہے ہیں کہ آپ ہم سے یہ دعا کریں کہ ہم آپ کو حب علی بن ابی طالب نصیب کریں"۔ ان کے متاخرین نے ان روایات پر بڑا زور دیا اور بہت مشہور کیا۔ لیکن یہ نادان یہ نہیں سوچتے کہ ان کی افتراء پردازی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس کئی جہت سے مجروح ہوتی اور اس میں نقص لازم آتا ہے۔

اوّل:۔ یہ کہ "حب علی" جو ایمان کا جزء اور دین کا ایک رکن ہے۔ آپؐ کو حاصل نہیں۔

دوم:۔ ایسے ضروری امر میں آپ سستی فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار تاکید فرمائی جا رہی ہے۔

سوم :۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مہبت علی میں سوال و دعا کی احتیاج کیوں رکھی بلا طلب دعا کیوں عطا نہیں فرما دی۔ حالانکہ تمام انبیاء کو ضروریات ایمانی ابتدائے خلقت سے مرحمت فرمائیں۔
ان شیعوں کی روایات گھڑنے اور تراشنے میں ایسی مثال ہے جیسے کسی عقلمند نے کسی بیوقوف کے بارے میں کہا تھا۔ بَنیٰ قَصْرًا وَ هَدَمَ مِصْرًا۔ (ایک گھر تو بنا لیا مگر ساتھ ہی ایک شہر اجاڑ دیا)
سینتالیسواں دھوکہ :۔ ان میں کوئی عالم، مذاہب اربعہ میں سے دکھاوے کے لئے کوئی مذہب قبول کر کے اس کا اپنے اوپر اتنا گہرا رنگ چڑھا لیتا ہے کہ لوگ ظاہری اور باطنی امتحان اور تجربے کے بعد اپنے مذہب کا مقتدا سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر اس مذہب کے مدارس میں تدریس بھی ان کے سپرد ہو جاتی ہے اور منصب افتاء میں بھی ممتاز نظر آنے لگتے ہیں اور جب وہ فرشتۂ اجل کو قریب آتے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے نزدیک مذہب شیعہ ہی حق ہے۔ اور وصیت کرتا ہے۔ کہ میری تجہیز و تکفین کی رسوم کسی شیعہ سے ادا کرائی جائیں۔ اور مجھے شیعوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اور اس حیلہ کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ شاگردوں، معتقدوں اور دوست و احباب کے دلوں میں تردد اور شک و شبہ پیدا کر دیا جائے تاکہ وہ یہ سوچیں کہ اتنا عالم فاضل اور پرہیزگار شیعہ مذہب کو حق اور سچ نہ جانتا ہو تو اس کی طرف کیوں جھکتا اور اہل سنت کے مذہب سے کیوں دست بردار ہوتا۔
چنانچہ ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب نہج الکرامہ میں لکھا ہے، (ترجمہ) ہمارے زمانہ کے اکثر شافعی مدرسین مرتے وقت یہ وصیت کر گئے کہ ان کی تجہیز و تکفین کوئی شیعہ کرے۔ اور ان کو مشہد امام کاظم میں دفن کیا جائے۔
اڑتالیسواں دھوکہ :۔ ان کے کسی عالم معروف و مشہور نے ایک کتاب لکھی اور اس میں یہ افتراء بھی لکھ مارا کہ اہل سنت کے اکثر علماء و مشائخ در پردہ امامیہ مذہب رکھتے تھے مگر ظاہرداری برتتے اور تقیہ کرتے تھے۔ چنانچہ وفیات الاعیان جو ایک عراقی شیعہ عالم کی لکھی ہوئی کتاب ہے اسی نوع کی ہے اس میں حضرت بایزید بسطامی، حضرت معروف کرخی، جناب شفیق بلخی، جناب سہل بن عبداللہ تستری اور ان کے علاوہ اہل سنت کے مشہور مشائخ رحمہم اللہ کو امامیہ میں شمار کیا ہے۔ اور ان کے کچھ اقوال و کلمات کو افتراء اور بہتان کے اضافہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جن سے ان کے امامیہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان بزرگوں کے مناقب و محاسن اور کرامتیں خوب شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں۔
اسی طرح کی ایک اور کتاب مجالس المؤمنین ہے۔ جس کا مؤلف قاضی نور اللہ شوستری شیعی ہے۔ اس نے بھی اسی قسم کے افتراء آمیز مضامین کثرت سے اس میں درج کئے ہیں۔
علمائے ہرات میں سے اسی قاضی کے ہم مذہب ایک عالم نے اس سے کہا کہ تم نے اس کتاب میں روایات و حکایات وغیرہ جو کچھ بیان کی ہیں وہ اہل سنت ہی کے علماء نے نہیں ثقہ شیعہ حضرات نے بھی ان کو جھوٹ اور باطل ٹھہرایا ہے اور یہ بے اصل اور خلاف واقعہ باتیں ہیں۔
اور کتب تاریخ و اخبار میں بھی ان کا سراغ نہیں ملتا اس کے جواب میں شوشتری کہنے لگا کہ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ مگر میرا مقصد تو یہ ہے کہ جو کوئی بھی یہ کتاب پڑھے گا وہ ان حکایات و واقعات کو دوسرے سے بھی نقل کرے گا۔ اس طرح یہ روایات و حکایات اپنے انوکھے پن اور دلچسپ ہونے کی وجہ سے شہرت

پائیں گی اور بالآخر کسی نہ کسی مرحلہ پر قابل اعتبار کتابوں میں اپنی جگہ بنا لیں گی اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ شیعوں کی تعداد بڑھ جائے گی، دوسرا یہ کہ اہل سنت شک و شبہ میں پڑ جائیں گے۔ اب اگر اہل سنت کے محقق علماء ان کو نہیں مانتے، نہ مانیں عوام تو اختلاف روایت پر ان کو محمول کر کے ان کو تسلیم کریں گے۔

چنانچہ عراق و خراسان کے علما کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مجالس المؤمنین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی شوشتری کی من گھڑت اور بے اصل اور سراپا جھوٹ ہے۔

انچاسواں دھوکہ:۔ ان کے بعض راوی اپنے ائمہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے امام سے یوں روایت منسوب کرتے ہیں کہ

"میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، تو آپ ایک شیعہ شاعر کی بڑی ستائش فرما رہے تھے اور اس کے لئے دعائے خیر فرما رہے تھے، کیونکہ اس نے ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں محبت اہل بیت کا خلفائے ثلاثہ و دیگر صحابہ کرام پر تبرّیٰ کا مضمون باندھا ہے اور وہ حضور بار بار پڑھ اور اس سے لطف و اندوز ہو رہے ہیں"

چنانچہ سہل بن دینار نے اسی قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں ایک روز اور شیعوں کے آنے سے پہلے امام رضا کی خدمت میں باریاب ہوا امام اس وقت تنہا اور تخلیہ میں تھے میری آمد پر امام نے مجھے خوش آمدید کہی اور فرمایا ابن دینار تم خوب آئے میں تم کو کسی کے ذریعہ ابھی بلوانے والا تھا۔

امام اس وقت انگشت بر زمین، کسی سوچ میں غرق تھے۔ میں نے عرض کیا جناب مجھے کسی غرض سے یاد فرما رہے تھے، فرمایا میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس نے مجھے مضطرب و بے چین کر رکھا ہے! اور میری نیند اڑا دی ہے۔ میں نے عرض کیا خیر تو ہے، بات کیا ہے۔ فرمایا کہ میں نے سو زینوں کی ایک سیڑھی دیکھی جس پر میں چڑھ گیا ہوں میں نے عرض کیا مبارک ہو کہ آپ سو سال تک زندہ رہیں گے۔ فرمایا پھر میں نے دیکھا کہ سبز رنگ کا ایک برج ہے جو اتنا صاف و شفاف ہے کہ اندر کا حصہ باہر سے اور باہر کا حصہ اندر سے صاف نظر آتا ہے اور اس برج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہیں۔ آپ کے دائیں بائیں دو خوش جمال جوان رعنا، بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک نے ایک بوڑھے کے زانو کا تکیہ لگایا ہوا ہے۔ بوڑھا اتنا ضعیف و عمر رسیدہ ہے کہ اس کی بھنویں آنکھوں پر پڑی ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ارشاد فرما رہے ہیں اپنے دادا حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کو سلام کرو۔ چنانچہ میں نے ان کو سلام کیا۔ پھر فرمایا اور اس شاعر کو بھی سلام کرو۔ یہ ہمارا شاعر اور دین و دنیا میں ہمارا مصاحب اور دوست ہے۔ یعنی اسمٰعیل بن محمد حمیری میں نے ان کو بھی سلام کیا۔ اس گفتگو کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شاعر سے کہا ہاں! لا، وہی قصیدہ جس میں ہم مشغول تھے۔ بوڑھے شاعر نے ایک طویل قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ جب اس شعر پر پہنچا:

قَالُوا لَهُ لَوْ شِئْتَ اَعْلَمْتَنَا اِلٰی مَنِ الْغَايَةِ وَالْمَفْزَعُ

(انہوں نے اس سے کہا کہ تو اگر چاہتا تو ہم کو بتا دیتا کہ مآل کار اور جائے پناہ کیا ہے)

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسمٰعیل ذرا ٹھہر! پھر آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور فرمایا

اے میرے خدا! اے میرے سردار! تو گواہ ہے کہ میں نے ان کو باخبر کر دیا تھا۔ کہ خوف کے وقت کس کے پاس جائیں۔ اور کس کی پناہ لیں، اور آپ اس وقت ہاتھ کا اشارہ امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) کی طرف فرماتے جا رہے تھے۔ پھر میری طرف رخ کر کے فرمایا کہ اے علی، اس قصیدہ کو تو خود بھی یاد کر لے اور ہمارے شیعوں سے کہہ دے کہ وہ بھی یاد کر لیں۔ اس قصیدہ کو جو بھی یاد کر لے گا اس کے بہشتی ہونے کا میں ضامن ہوں۔

امام رضا کہتے ہیں کہ میرے دادا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ قصیدہ بار بار دہرا کر مجھے یاد کراتے رہے تا آنکہ مجھے وہ یاد ہو گیا"۔

وہ قصیدہ جس کے چار شعر ایسے ہیں کہ ان میں صحابہ کرام کی شان ارفع میں نہایت گندی اور سب وشتم سے لبریز زبان استعمال کی گئی ہے کوئی بھی مسلمان اس کو زبان پر لانا تو درکنار نوک قلم پر لانا بھی گوارا نہ کرے۔

مگر ہم (نقل کفر کفر نباشد کے مصداق) اس کو اس لئے نقل کر رہے ہیں کہ شیعوں کی طرف سے نرم گوشہ رکھنے والے اور غیر جانبدارانہ رویہ والے افراد کہیں اسے محض تہمت سمجھ کر اکے جرم گستاخی کو نظر انداز کرکے انسے کسی جھنکے متوقع نہ ہو بیٹھیں اور وہ ازراہ انصاف اسپر غور فرمائیں کہ ان لوگوں کے دلوں میں صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خلاف کتنا کینہ اور بغض وعناد بھرا ہوا ہے۔ جو بات اہل عقل ومروت، کے نزدیک فرعون وہامان کے لئے بھی کہنا جائز نہیں۔ ان اساطین اسلام کو ان کا ہدف بنانا کب جائز اور کہاں کی شائستگی اور شرافت ہے۔ اور پھر اس نازیبا حرکت اور معاندانہ طرز عمل کو بہشت کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔ تو ہے اس جسارت وگمراہی کا کوئی جواب؟

وہ قصیدہ یہ ہے

لِأُمِّ عَمْرٍو بِاللَّوَى مَرْبَعٌ ۔۔۔ طَامِسَةٌ أَعْلَامُهُ بَلْقَعٌ

ام عمرو کا ریگستان میں مسکن تھا جو اب بے نشان وویران پڑا ہے۔

لَمَّا وَقَفْتُ الْعِيسَ فِي رَسْمِهَا ۔۔۔ وَالْعَيْنُ مِنْ عِرْفَانِهِ تَدْمَعُ

(دوران سفر) جب میں نے وہاں پڑاؤ کیا تو اس کی یاد مجھے رلانے لگی۔

ذَكَرْتُ مَنْ كُنْتُ أَلْهُو بِهِ ۔۔۔ فَبِتُّ وَالْقَلْبُ شَجِيٌّ مُوجَعُ

مجھے یاد آیا کہ میں اس کے ساتھ یہاں کھیلا کرتا تھا، تو اس یاد نے رات بھر مجھے چین نہ لینے دیا۔

كَأَنَّ بِالنَّارِ لِمَا شَفَّنِي ۔۔۔ مِنْ حُبِّ أَرْوَى كَبِدِي تَلْذَعُ

گویا اس کی طرف سے مجھے جو محبت ملی اس کی آگ میرے دل کو جلا رہی ہے۔

عَجِبْتُ مِنْ قَوْمٍ أَتَوْا أَحْمَدَا ۔۔۔ بِخُطَّةٍ لَيْسَ لَهَا مَوْضِعُ

مجھے اس قوم کے حال پر تعجب ہے جو احمد کے پاس ایسی خصلت کے ساتھ آئی جس کی وہاں گنجائش نہیں۔

قَالُوا لَهُ لَوْ شِئْتَ أَعْلَمْتَنَا ۔۔۔ إِلَى مَنِ الْغَايَةُ وَالْمَفْزَعُ

انہوں نے اس سے کہا کہ اگر تم چاہتے تو ہمیں باخبر کر سکتے تھے کہ قال کار اور جائے پناہ کہاں ہیں۔

إِذَا تُوُفِّيتَ وَفَارَقْتَنَا ۔۔۔ وَفِيهِمْ فِي الْمُلْكِ مَنْ يَطْمَعُ

جب آپ وفات پا جائیں اور ہم سے جدا ہو جائیں اور لوگوں میں کوئی ایسا ہو جو سلطنت کا لالچ رکھتا ہو، تو

ہم کیا کریں)

قَالَ لَوْ اَعْلَمْتُكُمْ مَفْزَعَهَا   كُنْتُمْ عَسَيْتُمْ فِيْهِ اَنْ تَصْنَعُوْا

فرمایا اگر میں تم سے فزع کا مرجع بیان کردوں تو قریب ہے کہ تم اس کے حق میں وہ کام کروگے۔

صَنِيْعَ اَهْلِ الْعِجْلِ اِذْ فَارَقُوْا   هَارُوْنَ فَالتَّرْكُ لَهُ اَوْدَعُ

جو گوسالہ پرستوں نے ہارون سے جدا ہوتے وقت کیا تھا۔ اس لئے اس ذکر کو جانے دو۔

وَفِي الَّذِيْ قَالَ بَيَانٌ لِمَنْ   كَانَ اِذَا يَعْقِلُ اَوْ يَسْمَعُ

اس کلام میں گوش ہوش رکھنے والوں کے لئے بیان ہے۔

ثُمَّ اَتَتْهُ بَعْدُ ذَا عَزْمَةٌ   مِنْ رَبِّهِ لَيْسَ لَهَا مَدْفَعُ

اس کے بعد پیغمبر کے پاس ان کے رب کی طرف سے تاکید آئی کہ اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں

اَبْلِغْ وَاِلَّا لَمْ تَكُنْ مُبَلِّغًا   وَاللّٰهُ مِنْهُمْ عَاصِمٌ يَمْنَعُ

(جو تم سے کہا گیا وہی) پہنچاؤ ورنہ تم پہنچانے والے نہیں ہوگے، خداتعالیٰ ان سے تم کو بچانیوالا ہے۔

فَعِنْدَهَا قَامَ النَّبِيُّ الَّذِيْ   كَانَ بِمَا يَاْمُرُهُ يَصْدَعُ

پس اسوقت پیغمبر اللہ کے حکم کو صاف صاف بیان کرنے کے لئے اٹھے۔

يَخْطُبُ مَاْمُوْرًا وَفِيْ كَفِّهِ   كَفُّ عَلِيٍّ ظَاهِرٌ يَلْمَعُ

اور خدا کے حکم سے خطبہ دینا شروع کیا۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں علی کا چمکتا ہوا ظاہری ہاتھ تھا۔

رَافِعُهَا اَكْرِمْ بِكَفِّ الَّذِيْ   يَرْفَعُ وَالْكَفُّ الَّذِيْ يُرْفَعُ

اس ہاتھ کو اٹھایا۔ اور کیا کہنا اس ہاتھ کی برکت کا جو اٹھاتا ہے اور اٹھتا ہے۔

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا لَهُ   مَوْلًى فَلَمْ يَرْضَوْا وَلَمْ يَقْنَعُوْا

اور کہا جس کا میں دوست ہوں یہ اس کا مولیٰ ہے۔ پس وہ اس پر راضی نہیں ہوئے نہ اس پر قناعت کی۔

وَظَلَّ قَوْمٌ غَاظَهُمْ فِعْلُهُ   كَاَنَّمَا آنَافُهُمْ تُجْدَعُ

اور وہ ایسے لوگ ہوگئے جنکو پیغمبر کا یہ فعل کینہ میں مبتلا کرگیا اس حال میں گویا ان کی ناکیں کاٹی جارہی ہیں۔

حَتّٰى اِذَا وَارَوْهُ فِيْ لَحْدِهِ   وَانْصَرَفُوْا عَنْ دَفْنِهِ ضَيَّعُوْا

حتیٰ کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو قبر میں رکھ کر دفن سے فارغ ہوئے تو انہوں نے بھلا دیا۔

مَا قَالَ فِي الْاَمْسِ وَاَوْصٰى بِهٖ   وَاشْتَرَوُا الضَّرَّ بِمَا يَنْفَعُ

وہ قول جو کل کہا گیا ہے اور جس کی وصیت کی گئی تھی۔ اس طرح انہوں نے نفع کے بجائے نقصان خریدا۔

وَقَطَّعُوْا اَرْحَامَهُمْ بَعْدَهٗ   فَسَوْفَ يُجْزَوْنَ بِمَا قَطَّعُوْا

اس طرح اپنا رشتہ قرابت کاٹ ڈالا، اور عنقریب اس قطع کا بدلہ پالیں گے۔

وَاَزْمَعُوْا مَكْرًا بِمَوْلَاهُمُ   تَبًّا لِمَا كَانُوْا بِهٖ اَزْمَعُوْا

اور انہوں نے اپنے مولیٰ کے بارے میں فریب کیا جو انہوں نے ٹھانا ہے خدا اس میں انہیں ہلاک کرے۔

لاموا علیہ یردوا حوضہ ... غدا ولا ہو لہم یشفع

ایسے لوگ کل نہ پیغمبر کے پاس حوض پر آسکیں گے اور نہ پیغمبر ان کی شفاعت کریں گے۔

وحوض لہ ما بین صنعا الی ایلۃ ... طول والعرض منہ اوسع

پیغمبر کے اس حوض کا طول وعرض صنعاء سے ایلہ تک ہے بلکہ اس سے بھی وسیع تر۔

ینصب فیہ علم للہدی ... والحوض من ماء لہ مترع

وہاں نشان ہدایت قائم ہوگا۔ اور وہ حوض اپنے پانی سے لبالب پر ہوگا۔

حصاہ یاقوت ومرجانہ ... ولؤلؤ لم تجنہ اصبع

اس کے سنگریزے یاقوت ومرجان اور در ناسفتہ ہوں گے۔

والعطر والریحان انواعہ ... ذاک وقد ہبت بہ زعزع

اس کی خوشبو عطر وریحان کی قسم کی ہوگی، اور تیز ہوا اس پر چلتی ہوگی (کہ خوشبو ہر طرف اڑالے)۔

ریح من الجنۃ مامورۃ ... ذاہبۃ لیس لہا مرجع

جنت کی ایک ہوا اس (حوض) پر مامور ہے۔ جو ہر وقت رہے گی واپس نہیں ہوگی۔

اذا دنوا منہ لکی یشربوا ... قیل تبا لکم فارجعوا

جب یہ لوگ پانی پینے حوض کے قریب آئیں گے تو ان سے کہا جائے گا۔ تمہارا ناس ہو یہاں سے ہٹو۔

دونکم فالتمسوا منہلا ... یرویکم او مطعما یشبع

یہ پانی تمہارے لئے نہیں ہے، اپنی سیرابی کے لئے کوئی اور حوض ڈھونڈ لو، اور اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی اور طعام خانہ تلاش کرو۔

ہذا لمن والی بنی احمد ... ولم یکن غیرہم یتبع

یہ چشمہ تو ان کے لئے ہے جو آل احمد سے محبت رکھتا اور ان کے غیر کا تابع نہیں ہے۔

فالفوز للشارب من حوضہ ... والویل والذل لمن یمنع

پس اس حوض سے پینے والے کے لئے کامیابی ہے اور ان کے لئے ہلاکی ہے جن کو اس سے روک دیا گیا۔

والناس یوم الحشر راباتہم ... خمس فیہا ہالک اربع

قیامت کے دن لوگوں کے لئے پانچ علم ہوں گے ان میں سے چار کے لئے ہلاکی ہے۔

فرایۃ العجل وفرعونہا ... سامری الامۃ المشنع

ایک علم گوسالہ سامری کا ہے۔ اور اس بدکردار گروہ کا سامری فرعون ہے۔

ورایۃ یقدمہا حبتر ... لزبرلہ واللہ مقمع

اور ایک نشان کا پیشوا حبتر (باطل شی) ہے خدا کرے اس کی قبر ٹھنڈی نہ ہو۔

ورایۃ یقدمہا نعثل ... کلب بن کلب نحلہ مقطع

اور ایک نشان کا پیشرو نعثل دھوتا کا نز ا ہے۔ کلب ابن کلب اس کا انجام ہولناک ہے۔

وَرَایَۃٌ یَقْدُمُھَا اَبْکَمُ ۔۔۔ عَبْدٌ لَھُمْ لُکَعٌ اَلْکَعُ

اور ایک نشان کا پیشوا گونگا بندہ ہے وہ لئیم سے لئیم ہے

وَرَایَۃٌ یَقْدُمُھَا حَیْدَرٌ ۔۔۔ کَاَنَّہٗ بَدْرٌ اِذَا یَطْلَعُ

اور ایک نشان ہے جسکے پیشوا حیدر ہیں گویا چودھویں رات کا چمکتا ہوا چاند۔

اِمَامُ صِدْقٍ وَلَہٗ شِیْعَۃٌ ۔۔۔ یَرِدُوْا عَنِ الْحَوْضِ وَلَمْ یُمْنَعُوْا

وہ حیدر امام راستی اور ان کے تابعین ہی حوض سے سیراب ہوں گے کوئی انکو منع کرنے والا نہیں۔

بِذَالِکَ الْوَحْیُ عَنْ رَّبِّنَا ۔۔۔ یَا شِیْعَۃَ الْحَقِّ فَلَا تَجْزَعُوْا

ہمیں ہمارے پروردگار نے یہی حکم بھیجا ہے، اے گروہ "حق" تم مت گھبراؤ"

اب واضح رہنا چاہیئے کہ اس قصہ کی رو سے دو بزرگوں اور لائق صد احترام ہستیوں پر الزام آتا ہے۔ اول تو جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم پر دوسرے جناب امام علی رضا پر اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب سچے اور مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں۔ اسی طرح امام معصوم کے خواب بھی نفسانی اور شیطانی نہیں ہوتے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان خوابوں میں منکرات وکفریات دین داخل ہو جائیں۔

پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ اشعار ایسے ناکارہ اور کھوٹے سکے ہیں جو ابن دینار جیسے عبدالدراہم والدنانیر کی ٹکسال سے نکلے اور اس کی اختراع محض صد فی صد جھوٹے ہیں۔

فہم صحیح اور عقل سلیم رکھنے والے کیلئے یوں تو قصیدہ کا ہر مصرع افتراء و بہتان کی پوٹ ہے مگر ہم بارہ اماموں کی گنتی کے مطابق تبرکا۔ بارہ وجوہ بیان کرتے ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ یہ قصہ سراسر خلاف عقل مخالف قرآن وحدیث خلاف دین اور خلاف واقعہ ہے۔

(۱) یہاں بسم اللہ ہی غلط ہو گئی کہ اس شیعہ نے سو زینوں والی سیڑھی کی تعبیر یہ دی تھی کہ امام رضا کی عمر سو سالہ ہو گی۔ سو یہ تعبیر غلط نکلی اور دونوں فرقوں کے مورخین کے مطابق ان کی عمر سو سال تک نہیں پہنچی گو تعبیر کی غلطی خواب کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے مگر اس کو کیا کہا جائے کہ یہی راوی کہتا ہے کہ جب میں نے امام کے سامنے یہ تعبیر بیان کی تو امام نے اسپر سکوت فرمایا اور کسی غلطی پر ایسے موقع پر معصوم کا سکوت جہاں تقیہ کی گنجائش نہ ہو جائز نہیں اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ قصہ جھوٹا اور گھڑا ہوا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس خواب میں جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم نے معصوم واجب الاطاعت امام کو حکم دیا کہ وہ ایسے شاعر کو سلام کرے جس کے متعلق تاریخ کا فیصلہ ہے کہ وہ فاسق و فاجر اور شرابی تھا۔ تو یہ امام معصوم کی تحقیر ہوئی۔ اور جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں خلاف شرع امر کے ارتکاب کی نسبت ہوئی۔ اور قلب موضوع و معاملہ الٹ دینا کہ بد، نیک کو سلام کرے نہ کہ نیک بد کو سلام کرے، الزام آیا۔

(۳) راوی نے اس قصہ میں یہ بھی بیان کیا کہ خواب دیکھنے سے امام کو قلق اور بے چینی ہوئی اس سے پتہ چلا کہ خلفائے ثلاثہ پر تبرئی کا جواز امام کو پہلے معلوم نہ تھا بلکہ وہ تو اس کے خلاف اس حرکت بد کو حرام اور کبیرہ

گناہ سمجھتے رہے۔ اب خواب میں اس کے جواز کا انکشاف ہوا تو اس پر قلق، اضطراب، تشویش اور بے چینی کا پیدا ہونا لازم تھا۔ اسپر پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ واجب کا وجوب محرمات کی حرمت اور جائز چیزوں کا جواز امام کو معلوم ہونا امامت کے خواص میں سے ہے۔ اگر ان باتوں کا علم نہ ہوگا تو درجہ امامت سے گر جائے گا۔ اب اگر اس قصے کو سچ مانتے ہیں تو امام علی رضا کی امامت ہاتھ سے جاتی ہے۔ بلکہ کلینی نے تو کتاب کافی میں اس امر کے اثبات کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ کہ امام کو چاہیئے کہ گذشتہ و آئندہ معاملات کا ان کو علم حاصل ہو تو یہاں یہ کیسے ہوا کہ امام اس شاعر کے حال سے اور اس کے اسقدر مقبول قصیدہ سے بے خبر تھے کہ جس کے ایک مرتبہ پڑھنے سے جنت کے داخلے کی ضمانت مل جائے اور خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے، اور امام کو ایسے اہم معاملہ کا پتہ تک نہ ہو۔

امام کی بعثت تو ہوتی ہی اس لئے ہے کہ وہ خدا سے دور کرنے والی باتوں یا اس سے قرب کرنے والے امور کو وضاحت سے بیان کرے یہی نہیں یہ عیب تو گذشتہ ائمہ پر بھی لگتا ہے کہ وہ ایسے اہم امر سے غافل رہ کر دنیا سے چلے گئے اگر کوئی یہ کہے کہ ان ائمہ کو علم تھا تو یہ سوال ہوتا ہے کہ ان حضرات نے امام علی رضا کو اس کی تبلیغ کیوں نہ کی ان کو بے خبر کیوں رکھا۔

(۴) اس قصیدہ میں یہ سفید جھوٹ بھی ہے کہ صحابہ کرام اکٹھے ہو کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تعیین امام کیلئے گئے اور آپ سے درخواست کی اس لئے کہ یہ بات کسی بھی مؤرخ نے خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ نہ تو کہی نہ اپنی کسی کتاب میں لکھی۔

بلکہ اس قسم کا جھوٹ جوڑنا، پھر اس کی تکرار پہ بہشت کی ضمانت دینا، اسلوب نبوت و رسالت کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ باعث توہین بھی۔ کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام جھوٹ سے بالکل پاک ہوتے ہیں ان کے کلام میں کذب کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

(۵) قصیدہ کے جھوٹے ہونے کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ قصہ میں ایک صریح جھوٹ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا کرایا گیا کہ آپ نے شاعر مذکور کے بارے میں فرمایا کہ وہ دین دنیا میں ہمارا مصاحب و رفیق ہے حالانکہ اس حمیری شاعر نے نہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی نہ ہی اس کو رفاقت حاصل رہی اور یہ بات کون نہیں جانتا تو نبی کی نسبت ایسا جھوٹ تراشنا ان کے پاک دامن پر دھبہ لگانا ہے۔

(۶) اس قصیدہ میں ایک اور کھلا کفر بھی ہے کہ جہالت، بیوقوفی اور ناعاقبت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، اور پیغمبر کی عقل کو علم الٰہی سے کامل تر مستقیم تر قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ تعیین امام کے سلسلے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جن نقصانات اور خطرات کا اندیشہ تھا وہ سب واقع ہوئے، امن کا شیرازہ بکھر گیا کتاب کی تحریف ہوئی اور مسلمانوں کی ایک جماعت جس کی جمعیت و قوت سے دین کی اشاعت و شوکت کی امید کی جا سکتی تھی وہ مرتد ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے محض حکمرانی کی غرض سے صبر و اکرام سے کام لے کر پیغمبر علیہ السلام سے تعیین امام کرائی اس کے بعد جو سانحات پیش آئے اس کا العوذ باللہ یا تو اللہ تعالیٰ کو علم ہی نہ تھا اگر تھا تو ان کو دفع کرنے کا قصد نہ فرمایا اور نبی کے کئے کرائے کو بلکہ خود اپنی سابقہ تائیدات و توفیقات کو یک قلم و بیک حرف حرف غلط

کی طرح مٹا ڈالا اور پھر وہ حالت ہوئی کہ جاہلیت اولیٰ بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

(۷) ساتویں وجہ یہ کہ ترک اصلح، و ترک لطف کی رعایت جو بلحاظ اصول مذہب شیعہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ناگزیر ہے، اور جن کی قباحت شیعوں کے نزدیک معلوم و مسلم ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوتاہی لازم آتی ہے اور یہی وہ بات ہے جس کا شیعہ بار بار اہل سنت کو الزام دیتے ہیں۔ (تو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا)۔

(۸) جھوٹ کی آٹھویں وجہ یہ ہے کہ صاحب قصیدہ نے لوگوں کو پانچ نشانوں (علموں) میں محصور کیا ہے حالانکہ یہود، نصاریٰ، مجوس، ہنود، صابئین، اہل خطا، اہل حبش، اور یاجوج و ماجوج، بظاہر ان میں سے کسی بھی نشان میں نہیں ہیں۔ پھر اس کھلے جھوٹ کو پیغمبر علیہ السلام اپنی زبان مبارک سے کس طرح دھرائیں اور اس پر لطف اندوز ہوں۔

(۹) خلفائے ثلثہ اور ایسے ہی ان کے پیرو، عقیدے اور عمل میں باہم کسی بھی حیثیت سے مختلف نہ تھے تو پھر ان کے نشانات جداجدا قرار دینا سراسر خلاف عقل ہے۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ یہی اشخاص بعینہٖ دوسرے نشان میں بھی تھے تو ایک ہی ذات کا ایک ہی وقت میں دو جگہ ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض کو ایک نشان میں اور بعض کو دوسرے نشان میں مانیں تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے (یعنی ایک چیز کو بلا معقول وجہ کے دوسرے پر برتری دینا) اور یہ دونوں صورتیں عقل کے نزدیک بالبداہت باطل و لغو ہیں ہاں شاعر کا کلام اس حد تک تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ الناس (لوگ) سے مراد محض شیعہ ہوں۔ کیونکہ دوسروں کو بد دیانتی کی وجہ سے ناس سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اور پھر یہ پانچ نشان یوں ہوں۔ کہ شیعہ اولیٰ نشان حیدری کے تحت کیسانیہ نشان دوم میں، امامیہ نشان سوم میں زیدیہ نشان چہارم میں اور غلاۃ نشان پنجم ہیں، تو ایسی صورت نشانات کا تعدد کچھ معقول ہو سکتا ہے، اس لئے کہ تبوعین اور متبعین آپس میں مختلف ہیں۔

(۱۰) قرآن مجید میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ۔ (ہم نے ان کو نہ شعر سکھایا اور نہ وہ فن ان کے شایان شان تھا۔ اور اہل سیرت شیعہ وسنی اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ جناب پیغمبر علیہ السلام ایک شعر بھی وزن و قافیہ کی درستگی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے تھے، پھر اتنے طویل قصیدہ کو نہ صرف خود یاد کرنا بلکہ امام رضا کو بار بار پڑھ کر یاد کرانا اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔

(۱۱) تاریخ کے آئینہ میں بھی اس شاعر کا چہرہ دیکھ لیا جائے، کہ یہ کس درجہ خبیث، فاسق اور شراب خور تھا۔ پھر ایسے لعین کی عالم قدس میں آنجناب تک رسائی یعنی چہ؟

۱۲۔ اللہ تعالیٰ نے شعراء کے بارے میں فرمایا ہے

وَالشُّعَرَاۗءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (شاعر گمراہوں کے پیرو ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شاعر ہر میدان میں سرگشتہ ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک کام کئے اور خوب اللہ کی یاد کی (ایسے شاعر گمراہوں کے پیرو نہیں۔

اور یہ حمیری شاعر تمام مؤرخین کے نزدیک نہ اہل صلاح تھا نہ اہل ذکر میں سے تھا، بلکہ کھلا فاسق و فاجر تھا، پس ایسے شخص کی اتباع بالکل گمراہی ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسے شخص کی اتباع کا حکم دینا محال و ممتنع ہے،

پچاسواں دھوکہ :- شیعوں میں سے بعض مکار، اہل سنت کے ثقہ محدثین کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرتے ہیں، اپنے مذہب سے بیزاری ظاہر کرتے اور اپنے مذہبی اسلاف کو برا اور مذہب کے فسادات و عیوب کو علی الاعلان بے نقاب کرتے ہیں، تو بہ، دیانت، احسن سیرت، اور تقویٰ کی صفات سے اپنے آپ کو متصف کرنے کی بظاہر کوشش کرتے ہیں۔ حدیث صرف ثقات سے لینے کی رغبت دکھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ علماء و طلبا ان کو قابل و ثوق اور لائق اعتماد سمجھنے اور صدق و پاکدامنی پر اطمینان ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جب ان کو یہ مرتبہ مل جاتا ہے تو یہ اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں۔ اور اپنی مکاری کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ اور معتبر و ثقہ روایات میں اپنی گھڑی ہوئی روایات کا جوڑ لگا دیتے یا بعض کلمات میں تحریف کرکے روایت کرتے ہیں تاکہ لوگ دھوکہ میں پڑ جائیں یہ ان کا بہت بڑا اور چلتا ہوا مکر و فریب ہے۔ اس قسم کا پہلا دھوکہ باز اجلح نامی ایک شخص تھا اور اس نے یہ دجل و فریب جاری کیا حتیٰ کہ یحییٰ بن معین جو اہل سنت کے نہایت قابل بھروسہ علماء میں سے ہیں دھوکہ کھا گئے اور باب جرح و تعدیل میں اس کی توثیق کر گئے اور اس کی درپردہ مکاریوں کا سراغ نہ لگا پائے اور اس کے بڑے گہرے تقید کی وجہ سے سچے توبہ کرنے والوں میں شمار کر لیا، مگر بعض دیگر اہل سنت علماء نے اس کی عیاری اور دھوکہ بازی کو پا لیا اور ان پر منکشف ہوا کہ یہ جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے اس کے برخلاف بڑا عیار، مکار اور دھوکہ باز ہے چنانچہ جن روایات میں یہ تنہا ہے ان کو نظرانداز کر دیا گیا۔

ان میں سے ایک روایت یہ ہے،

عَنْ بُرَیْدَۃَ مَرْفُوْعًا اَنَّ عَلِیًّا وَلِیُّکُمْ مِنْ بَعْدِیْ (علی میرے بعد تمہارے ولی ہیں)۔

اکیاونواں دھوکہ :- ان کی ایک جماعت مورخین کو اس طرح دھوکہ دیتی ہے کہ ایک کتاب تاریخ میں تصنیف کرتے ہیں۔ اور اس میں اخبار و حکایات کے بیان کا ایسا اسلوب رکھتے ہیں جس سے یہ پتہ نہ چل سکے کہ اس کا مؤلف اہل سنت نہیں ہے، البتہ خلفاء کی سیرت احوال صحابہ اور ان کے محاربات میں اپنے مذہب کے متعلق بھی کچھ ملا دیتے ہیں۔

پھر بعض سنی مولف یہ سمجھ کر کہ یہ سنی کی تصنیف ہے بطور حوالہ اسے نقل کر دیتے ہیں اور یوں دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کی یہی غلطی سطحی نظر رکھنے والے لوگوں کے لئے گمراہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اور وہ بات ان کے ذہن پر جم جاتی ہے۔

اس طرح مصنفین تاریخ کی ایک بڑی جماعت کو چکمہ دیتے ہیں اور ایسی تاریخی کتابوں کے مطالعہ کرنے والوں کے گلے میں طوق ضلالت و گمراہی پڑ جاتا ہے۔

حتیٰ کہ سید جمال الدین محدث مصنف روضۃ الاحباب بھی بعض جگہ اسی قسم کے غلط تاریخی مواد کو نقل کر گئے ہیں

خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بیعت کا معاملہ اور اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا سکوت و تامل۔
یا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے واقعہ قتل سے متعلق حوالہ!
اور جہاں، اس قسم کی ملاوٹ ہوتی ہے وہاں وہ بوقت نقل یوں کہتا ہے کہ بعض روایات میں یوں آیا ہے۔
اسی لئے محققین اہل سنت نے نامعلوم الحال مصنف کی تاریخوں سے احتراز کرنا ضروری سمجھا۔

باونواں دھوکہ: مورخین کو یہ ایک اور ڈھب سے دھوکہ دیتے اور نئی چال چلتے ہیں وہ اس طرح کہ تاریخ کی ایک کتاب لکھتے ہیں۔ اور اس میں اہل سنت کی معتبر کتب تواریخ سے بلا خیانت حوالہ جات نقل کرتے ہیں لیکن جب صحابہ کرام کا ذکر اور ان کے باہمی تنازعات کا موضوع آتا ہے۔ تو ان کی بعض بھائیاں محمد بن جریر طبری شیعی کی تاریخ سے جو اس نے مذمت صحابہ میں لکھی ہے نقل کر دیتے ہیں۔ یا اس کی کتاب ایضاح المسترشد سے جو امامت کے بیان میں ہے، کوئی حوالہ درج کر دیتے ہیں۔ مگر ان کتابوں کا نام وضاحت سے ذکر نہیں کرتے۔ (مثلاً یوں کہدیں کہ تاریخ طبری میں یوں لکھا ہے، یا مصنف تاریخ طبری نے اپنی ایک اور تصنیف میں اس طرح بیان کیا ہے۔ اور اس عدم وضاحت سے مقصد ناظرین کو یہ دھوکہ دینا ہوتا ہے۔ کہ وہ یہ خیال کر لیں کہ یہ حوالہ محمد بن جریر طبری شافعی کا ہے جو تاریخ کی بہت مشہور کتاب اور امہ التواریخ سمجھی جاتی ہے (اسی طبری کی ایک کتاب تاریخ کبیر بھی ہے۔ اس دھوکہ میں پڑکر نقل در نقل کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور اس نقل کو صحیح سمجھنے والے بحر ضلالت کے بھنور میں پھنس کر غوطے کھاتے رہتے ہیں طبری کی تاریخ کبیر اب نادر الوجود ہے، اس کا اصل بہت کم دستیاب ہے، جو نسخہ ملتا ہے۔ وہ اس کا اختصار ہے۔ اور یہ اختصار بھی ساطی نامی شیعہ کا تحریف کردہ ہے۔ اس کا بیان انشاء اللہ آگے چل کر ہوگا اور اس مختصر کے مترجمین میں اکثریت شیعوں کی ہے۔

ترپنواں دھوکہ: بعض مصنف تاریخ کی کوئی کتاب از خود لکھتے ہیں۔ اور اس میں تمام تر باتیں جو صحابہ کرام کی شان میں ہتک آمیز اور برائیوں کو ظاہر کرتی ہوں گھڑگھڑ کر شامل کرتے ہیں۔ تاکہ سطحی ذہن کے لوگ اس کے حوالہ جات اپنے ہاں نقل کریں اور اپنی روزمرہ گفتگو میں استعمال کریں تاکہ رفتہ رفتہ وہ شہرت پا جائیں اور لوگ ان کو اتفاقی روایات سمجھنے کے فریب میں مبتلا ہوجائیں اس مکاری اور فریب کا موجد اور رائج کرنے والا پہلا شخص ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی نامی شیعہ ہے۔ اس کی کتاب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی لڑائیوں کے اکثر قصے سرتاپا، جھوٹے، بناوٹی اور من گھڑت ہیں۔

چونواں دھوکہ: ان کے بعض علماء علم کلام کی کتابوں میں صحابہ کی مذمت کا مستقل باب قائم کرتے ہیں اور اس کے ثبوت میں اس باب کے تحت اہل سنت کی صحیح، حسن، اور ضعیف احادیث لفظی یا معنوی معمولی سی تحریف کے ساتھ لے آتے ہیں، حالانکہ اس پر ذرا سی توجہ اور معمولی غور بھی کر لیا جائے تو ان میں ان کے منفید مطلب کوئی بات بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ ان کی تحریف کا بھانڈہ پھوڑ دیتی ہیں اور جو وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کی تردید کرتی ہیں اس کی ایک مثال۔

ایک مرتبہ خلیفۂ ثانی عمر الفاروق رضی اللہ عنہ بر سر منبر، بھاری بھاری مہر باندھنے پر حاضرین کو سمجھا رہے تھے کہ اگر بھاری مہر دینا آخرت میں موجب فخر ہوتا تو ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اس کے لئے

زیادہ لائق تھے کہ یہ فخر حاصل کرتے حالانکہ تم جانتے ہو کہ ازواج مطہرات اور آپ کی صاحبزادیوں (رضوان اللہ علیہم) کا مہر پانچ سو درہم سے زیادہ نہیں بندھا۔ ایک عورت جو اس مجلس میں حاضر تھی بولی کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہماری مہر کو جائز رکھا جب کہ فرمایا وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا (اور دیا تم نے ان میں سے ایک کو ڈھیر) تو آپ ہم کو اس سے کیوں منع کرتے ہیں۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے کلام الٰہی کے ادب کو ملحوظ رکھتے اور کچھ تواضع برتتے ہوئے فرمایا کُلُّ النَّاسِ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى الْمُخَدَّرَاتِ فِی الْحِجَالِ۔ (عمر سے تمام لوگ زیادہ فقیہ ہیں حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی)۔

اس شیعی مؤلف نے اس روایت کی ترجمانی یوں کی کہ آپ اس عورت کے جواب سے عاجز رہے لہٰذا اس کو اس باب مطاعن میں درج کر دیا۔

پچپنواں دھوکہ۔ ان کے بڑے دھوکوں میں ایک بڑا دھوکہ یہ ہے کہ یہ اپنے مذہب کے موافق کوئی مضمون گھڑ کر اس کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ اس سے پاک اور بالکل بری الذمہ ہوتے ہیں۔ بڑی چھان بین اور تگ و دو کے بعد ان کی عیاری کا پتہ چلا کہ وہ یہ دھوکہ چند طریقوں سے دیتے ہیں۔

اول۔ پورے کا پورا کلام ہی گھڑ لیتے ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک لفظ نہیں ہوتا۔

دوم۔ آپ کے کلام میں ایک دو لفظ گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔

سوم روایت بالمعنیٰ کرتے ہیں۔ آپ کے الفاظ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ معنے جو یہ آپ کے کلام سے اپنے خیال خام میں سمجھے ہیں اس کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر بیان کر دیتے ہیں۔

چنانچہ نہج البلاغہ جو مشہور کتاب ہے جس کا مصنف بعضوں نے رضی کو کہا ہے اور یہی صحیح ہے اور بعضوں نے اس کے بھائی مرتضیٰ کو اس کا مصنف کہا ہے وہ کتاب اسی نوعیت کے کلام سے بھری ہوئی ہے! کیا یہ ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خطبات، خطوط، مواعظ اور نصائح کو اول یکجا کیا پھر اس میں حسب منشا کانٹ چھانٹ، کمی بیشی، الفاظ، کلمات اور جملوں میں تغیر و تبدل اور تحریف کر کے اپنے مذہب کے موافق بنا کر اس کا نام نہج البلاغہ رکھ دیا۔ بالغ نظر ارباب علم بیک نظر پہچان لیتے اور صاف صاف معلوم کر لیتے ہیں کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے کلام کا مثلہ کیا گیا ہے۔ اس میں سے کچھ حروف نکال دیئے گئے اور بے موقع کلمات کی آگے پیچھے پیوند کاری کی گئی ہے۔ آپ کے کلام یا تقریر میں اگر کہیں کچھ نام آ گئے ہیں تو بعض جگہ ناموں کی جگہ لفظ فلاں کا اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ کلام کی صحیح مراد سمجھنے میں دشواری ہو۔ اہل سنت اس سے دلیل نہ لا سکیں، رجب بن محمد بن رجب البرسی الحلی کی کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے بعض اور کتابوں کا بھی حال یہی ہے۔

چھپنواں دھوکہ۔ ان کا کوئی عالم کتاب خود تصنیف کرتا ہے مگر اس کو ائمہ طاہرین میں سے کسی کے نام منسوب کر دیتا ہے۔ اس کتاب کے شروع میں اس امام کے صحیح اقوال اور معتبر روایات درج کرتا ہے تاکہ قاری کو اطمینان ہو جائے کہ کتاب کی نسبت صحیح ہے مگر درمیان میں وہ ایسی روایات ٹھونس دیتا ہے جو من گھڑت اور بناوٹی و جعلی ہوتی ہیں اور اس کے مطلب کے موافق ہوتی ہیں۔ ایسی کتابوں میں سے ایک وہ تفسیر ہے جس کو امام ابو محمد حسن بن علی عسکری کی طرف منسوب کیا گیا ہے، حالانکہ وہ ابن بابویہ کی تالیف ہے۔

ستاون واں دھوکہ:- ان میں کوئی فصیح البیان شخص ایک ایسی دعا گھڑتا ہے جس میں تینوں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے شان میں گستاخی اور لعن طعن ہوتا ہے۔ اس دعا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کہ آپ کی دعائے قنوت یہی تھی۔ ایسی ہی دعاؤں میں سے ایک وہ دعا ہے جس کو یہ لوگ دعائے صنمی قریش عنوان سے مشہور کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں جناب شیخین رضی اللہ عنہما کو "صنمی قریش" (قریش کے دو بت)، کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بطور نقل کفر اس کا ترجمہ یہ ہے۔!

اے خدا لعنت کر قریش کے دو بتوں، دو طاغوتوں اور دو معبودوں پر جنہوں نے تیرے حکم کے خلاف کیا وحی کے منکر ہوئے تیرے انعام کا انکار کیا تیرے رسول کی نافرمانی کی تیرے دین کو الٹ دیا تیری کتاب کی تحریف کردی الی آخر الیکواس۔

اس دعا کے جھوٹ اور بے اصل اور ہفوات ہونے میں کسی کو بھی شک و شبہ نہیں کیونکہ قریش کے ایسے دو بتوں کا وجود شیعوں کے وہم کے سوا کہیں نہیں ہے!

اٹھاون واں دھوکہ:- ان کا کوئی شاعر چند ایسی ابیات لکھتا ہے جن میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی تعریف بعد الانبیاء آپ کی فضیلت، آپ کی امامت کی تعیین، اور شیعی مذہب کی حقانیت بیان ہوتی ہے پھر ان اشعار کو یہودی، یا نصرانی میں سے کسی ذمی کے سر تھوپ کر، اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور مطلب ان کا صرف ایک ہی ہے کہ کسی سنی کو گمراہ کیا جائے ان کی ایسی حرکتوں سے کوئی جاہل سنی دھوکہ کھا بھی جاتا ہے اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ ایک کافر نے جب ایسی باتیں کہیں ہیں تو لامحالہ ان کا مضمون، توریت و انجیل یا کسی صحیفے سے ہی لیا ہوگا۔

اسی قسم کے وہ اشعار ہیں جنکو شیعوں نے ابن فضلون یہودی کے سر منڈھا ہے۔

عَلِیٌّ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَزِیْمَۃً ۔۔۔ وَمَا لِسِوَاہُ فِی الْخِلَافَۃِ مَطْمَعٌ

باعتبار تحقیق امیر المومنین علی ہی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کو خلافت کی آرزو کرنے کا کوئی حق نہیں۔

لَہُ النَّسَبُ الْعَالِیْ وَاِسْلَامُہُ الَّذِیْ ۔۔۔ تَقَدَّمَ بَلْ فِیْہِ الْفَضَائِلُ اَجْمَعُ

وہ بلند نسب ہیں۔ وہ اسلام میں سب سے مقدم ہیں بلکہ ان میں تمام فضائل یکجا ہیں۔

لَوْ کُنْتُ اَھْوٰی مِلَّۃً غَیْرَ مِلَّتِیْ ۔۔۔ لَمَا کُنْتُ اِلَّا مُسْلِمًا اَتَشَیَّعُ

اگر میں اپنے مذہب کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرتا تو شیعہ مسلم ہوتا

ذیل کے دو اشعار بھی اسی کی طرف منسوب ہیں۔

حُبُّ عَلِیٍّ فِی الْوَرٰی جُنَّۃٌ ۔۔۔ فَاَمْحُ بِھَا یَارَبِّ اَوْزَارِیْ

علی کی محبت مخلوق کے حق میں ڈھال ہے اے خدا اس کی برکت سے میرے گناہ معاف کردے۔

لَوْ اَنَّ ذِمِّیًّا نَوٰی حُبَّہٗ ۔۔۔ حُصِّنَ فِی النَّارِ مِنَ النَّارِ

اگر آدمی ان کی محبت کی نیت کرلے تو وہ آگ میں ہوتے ہوئے بھی آگ جہنم سے محفوظ رہے گا۔

اسی قسم کی اور مثالیں بھی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

انسٹھواں دھوکہ: اس حدیث کو حضرت علی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلے اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ نَحْنُ شَجَرَۃٌ اَنَا اَصْلُھَا وَفَاطِمَۃُ فَرْعُھَا وَاَنْتَ لِقَاحُھَا وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ ثَمَرَتُھَا وَالشِّیْعَۃُ وَرَقُھَا وَکُلُّھَا فِی الْجَنَّۃِ (میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم ایک ایسا درخت ہیں جس کی جڑ میں ہوں فاطمہؓ اس کی شاخ، تم اس کے پھل حسنؓ وحسینؓ اس کے میوے اور شیعہ اس کے پتے ہیں۔ اور یہ پورا درخت جنت میں ہے،

اسی مضمون کو کسی شیعی شاعر نے یوں نظم کیا ہے۔

یَا حَبَّذَا شَجَرَۃٌ فِی الْخُلْدِ نَابِتَۃٌ   مَا مِثْلُھَا نَبَتَتْ فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرٖ

وہ درخت جو جنت میں اگا ہوا ہے کیا ہی اچھا ہے کہ زمین میں اس جیسا کوئی درخت نہیں اُگا۔

اَلْمُصْطَفٰی اَصْلُھَا وَالْفَرْعُ فَاطِمَۃٌ   ثُمَّ اللِّقَاحُ عَلِیٌّ سَیِّدُ الْبَشَرِ

جس کی جڑ مصطفےٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) ہیں تو فاطمہؓ شاخ، پھر پھل سید البشر علی ہیں۔

وَالْھَاشِمِیَّانِ سِبْطَاہُ لَھَا ثَمَرٌ   وَالشِّیْعَۃُ الْوَرَقُ الْمُلْتَفُّ بِالشَّجَرِ

پیغمبر کے دو ہاشمی نواسے اس کا میوہ ہیں اور شیعہ اس درخت کے لپٹے ہوئے پتے۔

ھٰذَا مَقَالُ رَسُوْلِ اللّٰہِ جَاءَ بِہٖ   اَھْلُ الرِّوَایَۃِ فِی الْعَالِ مِنَ الْخَبَرِ

رسول اللہ کا یہ وہ قول ہے جس کو بلند سند راویوں نے روایت کیا ہے۔

اِنِّیْ بِحُبِّھِمْ اَرْجُو النَّجَاۃَ بِھِمْ   وَالْفَوْزُ فِیْ زُمْرَۃٍ مِنْ اَفْضَلِ الزُّمَرِ

میں ان کی محبت کے صدقہ نجات کی امید رکھتا ہوں اور کامیابی اس جماعت کے لئے ہے جو سب جماعتوں سے افضل ہے۔

اس روایت کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہ اس حدیث کی صحت پر کوئی قطعی دلیل نہیں۔ اور دلیل ہو بھی تو اس سے شیعوں کی مطلب برآری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ یہ نام کے شیعہ نہیں بلکہ وہ اصلی شیعہ مراد ہیں جو دراصل اہل سنت تھے اور ابتدائے عہد میں جو شیعہ اولیٰ کے لقب سے مشہور رہتے (اس لئے کہ اس درخت سے لپٹے ہوئے پتے وہی تھے کہ باوجود حوادث کے جھگڑا اور آندھیاں بھی ان کو شجر نبوت سے جھاڑنے میں ناکام ہو گئیں۔ وہ جناب امیر کے سچے ساتھی، اور خوشی وغمی کے جان نثار دوست اور رفیق تھے)۔

لیکن جب رافضیوں نے جو جناب امیر و اہل بیت کے دوست نما دشمن تھے یہ لقب ہتھیا لیا۔ تو اہل سنت نے اس سے دست برداری دیدی کیونکہ اس وقت یہ لقب لائق افتخار نہیں قابل مذمت بن گیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے حاملین محبان وجان نثاران اہل بیت نہیں تھے۔ سبائیوں کا ایک غول تھا جس پر امیر المومنین اور ائمہ کرام نے ہمیشہ لعنت بھیجی!)

دارقطنی نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِعَلِیٍّ اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ فِی الْجَنَّۃِ اِلَّا اَنَّ مِمَّنْ یَزْعَمُ اَنَّہٗ یُحِبُّکَ

أَقْوَامٌ يُصَغِّرُوْنَ الْإِسْلَامَ يَلْفِظُوْنَهٗ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ لَهُمْ نَبْزٌ يُقَالُ لَهُمُ الرَّافِضَةُ فَجَاهِدْهُمْ فَإِنَّهُمْ مُشْرِكُوْنَ قَالَ عَلِيٌّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْعَلَامَةُ فِيْهِمْ قَالَ لَا يَشْهَدُوْنَ جُمُعَةً وَ لَا جَمَاعَةً وَ يَطْعَنُوْنَ عَلَى السَّلَفِ۔

(حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اور تمہارے متبعین جنت میں جائیں گے۔ مگر ان میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو تمہاری محبت کے دعویدار تو ہونگے مگر زبان سے اسلام کی توہین کریں گے۔ قرآن پڑھیں گے۔ مگر قرآن ان کے حلق سے نہیں اترے گا رافضی لقب سے وہ مشہور ہوں گے ایسے لوگوں سے تم جہاد کرنا کیونکہ وہ مشرک ہوں گے جناب علی کرم اللہ وجہہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ان کی ظاہری نشانی کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نماز جمعہ و جماعت میں حاضر نہیں ہوں گے۔ اور اسلاف پر لعن طعن کریں گے۔"

افاضل اہل بیت جناب موسیٰ بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) سے روایت ہے کہ وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے، کہ ہمارے شیعہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کی اطاعت کی اور ہمارے جیسے کام کئے۔

ساٹھواں دھوکہ:- اماموں سے اس قسم کی روایت کرکے اسے شہرت دیتے ہیں۔ کہ شیعان علی سے قیامت کے دن کوئی باز پرس نہیں ہوگی اور بہشت میں صرف وہی داخل ہوں گے۔"

اول تو سرے سے یہ روایت ہی جعلی، جھوٹی، اور من گھڑت ہے۔ بفرض محال اگر اس کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس سے شیعان اولیٰ اور ان کے متبعین مراد ہیں۔ نہ کہ رافضی (ان کو تو جنت کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔

اکسٹھواں دھوکہ:- ائمہ کی طرف نسبت کرکے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ إِنَّ شِيْعَةَ عَلِيٍّ يَغْبِطُهُمُ الرُّسُلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (علی کے شیعوں پر قیامت کے دن انبیاء بھی رشک کریں گے۔

حسب دستور یہ بھی روایت جعلی اور بناوٹی ہے اور ائمہ پر افترا ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو اس سے مراد اہل سنت کے وہ اولیا کرام ہو سکتے ہیں جن کے متعلق حدیث قدسی میں یوں آیا ہے۔ اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِيْ جَلَالِيْ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَالشُّهَدَاءُ (میرے جلال و عزت کی خاطر باہم محبت رکھنے والے قیامت کے دن ایسے نورانی منبروں پر بیٹھے ہوں گے کہ ان پر انبیاء اور شہدا بھی رشک کریں گے) اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس زمرہ میں وہی لوگ آئیں گے۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خالصتاً لوجہ اللہ محبت کرتے ہوں گے۔ اور ان کے حسن توسل سے فیضان ہدایت حاصل کیا ہوگا۔ اور ایسے حضرات جو اس صفت و خوبی پر فخر کر سکیں صرف اور صرف اولیاء اہل سنت ہی ہیں نہ کہ رافضی، کہ جن کے اسلاف نے دنیا کی ناکارہ و بیہودہ اغراض کی خاطر مثلاً ملک و مال یا ریاست و سیادت کے لالچ، جاہ و حشمت کی حرص، یا ملکوں و سلطنتوں میں غدر و فساد برپا کرنے یا ان کا تختہ الٹنے کی غرض سے خود کو آنجناب کی طرف منسوب کر رکھا تھا تاکہ اس نسبت سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈال کر اور ان کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنا الو سیدھا کر سکیں۔ پھر ان کے اخلاف بمصداق آیت کریمہ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّيْنَ فَهُمْ عَلٰى آثَارِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ۔ (انہوں نے اپنے باپ دادوں کو گمراہ پایا تو خود بھی انہیں کے نقش قدم پر دوڑ پڑے)۔

باسٹھواں دھوکہ: شیعوں کی مدح وثنا اور تعریف وتوصیف میں زیادتی اور مبالغہ کی حدود بھی پار کر جاتے ہیں، اپنی تفاسیر میں انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ انبیاء آرزو کیا کرتے تھے کہ کاش ان کا حشر شیعوں میں ہو چنانچہ شب معراج جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے شیعان علی کے چہروں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن دیکھا تو غایت تمنا کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ انہیں بھی شیعان علی میں داخل فرما۔

چنانچہ دعا قبول ہوئی اور قرآنی آیت وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ میں اسی کی طرف اشارہ ہے (اس کے شیعوں میں سے ابراہیم ہیں)۔

اس هفوات کی شناعت اور رقاحت اور اس افترا، و بہتان کی ذلالت و برائی ظاہر و باہر ہے کہ اس سے اولوالعزم انبیاء اور حضرت ابراہیم علیہم السلام پر شیعوں کی برتری اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے ۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ پیغمبروں کا درجہ امتیوں سے بھی گھٹیا اور کمتر ہے اور پھر آیت کریمہ سے یہ معنی مراد لینا رکاکت و رذالت تو ہے ہی اسی کے ساتھ قرآن کی کھلی تحریف بھی ہے اور نظم قرآن میں اختلال، اضمار قبل الذکر اور ایہام خلاف مقصود جیسے عیوب لازم آتے ہیں، جو عام لوگوں کی گفتگو اور کلام تک میں معیوب سمجھے جاتے ہیں چہ جائیکہ کلام ربانی میں یہ پائے جائیں۔

تریسٹھواں دھوکہ: ان کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے احسانات و انعامات ہیں کہ وہ قیامت تک ان کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے ۔ یہ صرف مبالغہ نہیں بلکہ کفر کی حد سے بھی اونچا مبالغہ ہے یہ خالی خولی الزام نہیں اس بارے میں اس فرقہ کی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں ان میں سے ایک یہ ہے جس کو ان کے معتبر راویوں نے روایت کیا ہے۔

کہ ایک روز جبریل علیہ السلام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک حضرت علی رضی اللہ عنہ آگئے، جبریل علیہ السلام اٹھ کر تعظیم بجالائے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تو جبریل علیہ السلام کہنے لگے۔ مجھ پر ان کا ایک اتنا بڑا احسان ہے کہ زندگی بھر اس کے شکریہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا وہ کس طرح؟۔

تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا تو مجھ سے پوچھا میں کون ہوں، تو کون ہے، اور تیرا نام کیا ہے؟ مجھے اس کا کوئی جواب نہ سوجھا میں حیران پریشان اور خاموش کھڑا تھا کہ یہ نوجوان عین بر وقت آپہنچا اور مجھ سے کہا کہ مت! کہدے تو رب جلیل ہے۔ میں عبد ذلیل ہوں اور میرا نام جبریل ہے۔ اس وقت میں اسی احسان کے حق کی ادائیگی میں اٹھا اور آداب بجالایا۔ پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تمہاری عمر کتنی ہے۔ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا کہ ایک ستارہ ہے جو تیس ہزار سال بعد نکلتا ہے اور میں اس کو تیس ہزار مرتبہ نکلتے دیکھ چکا ہوں"

یہ قصہ اس فرقہ کے جھوٹ کا شاہکار ہے۔ کیونکہ ان دو تین حرفوں کی تعلیم کیا اس پورے قرآن کی تعلیم برابر ہو سکتی ہے۔ جو صاف اور بے شبہ حکم قرآن کے موجب حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم تک اور آپ سے حضرت رضی اللہ عنہ تک پہنچی اتنی بڑی اور عظیم الشان نعمت کے مقابلہ میں ان دو حرفوں کی کیا حقیقت اور ان کا کیا حق اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی طالب علم استاد سے قرآن مجید حفظ کرتا ہے اور پھر تراویح میں اپنے استاد کو کہیں

ایک لقمہ دیدیتا ہے تو استاد کے اتنے بڑے احسان کے مقابلہ میں اس لقمہ کی کیا حیثیت ہوگی۔

اب رہا حضرت جبریل علیہ السلام کی عمر کا معاملہ، یہ معاملہ خلاف عقل و مشاہدہ ہے کیونکہ کسی ستارہ کا تیس ہزار سال بعد طلوع محالات میں سے ہے اکثر آباد اقلیموں میں ستاروں کا طلوع وغروب فلک الافلاک کی حرکت سے ہے جس کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہے کہ رات دن میں عالم کا پورا چکر طے کرلیتا ہے۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام آٹھویں آسمان سے جو ثوابت ستاروں کا مرکز ہے دن رات میں کئی مرتبہ گذر جاتے ہیں تو ان کی طرف کسی ستارہ کے طلوع وغروب کے دیکھنے کی نسبت کرنا خلاف عقل ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وجود ظاہری چونکہ جبریل علیہ السلام سے ہزاروں سال بعد ہے تو آپ کی تعلیم کا مسئلہ کیسے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اگر جناب امیر کا وجود مثالی یا روحی مانیں تو یہ بھی بیکار سی بات ہے اس لئے کہ اس وقت نفس ناطقہ کا وجود کہاں تھا؟ جس پہ اختیاری اعمال کا دارومدار ہے جو مدح وذم ثواب وعقاب اور ثبوت حقوق کا مصداق ہے۔ بلکہ ان وجوہات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے جو صفات واسماء کی حیثیت ہیں اس کی پاک ذات میں ثابت وقائم ہیں اس وجود میں جو افعال کسی شخص سے صادر ہوں ان کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جاسکتی اور وہ مدح وذم یا اثبات حقوق کے قابل نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ ساری باتیں اپنی اپنی جگہ علمی طور پہ ثابت شدہ حقیقت کے طور پہ بیان وتحریر میں آچکی ہیں

آنے والے دھوکہ کا حل بھی مندرجہ بالا تحریر میں آگیا۔

چونسٹھواں دھوکہ:۔ ان کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرشتوں کو تسبیح وتہلیل کی تعلیم دی ہے۔"

یہ بات بھی اس دروغ گو فرقہ کی بے اصل زیادتیوں اور لغویات میں شمار کئے جانے والا جھوٹ ہے کیونکہ فرشتوں کی تسبیح وتہلیل تو وجود آدم سے پہلے ہی سے ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (ہم حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔) اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وجود ظاہری جو اختیاری افعال کی جائے صدور ہے وجود آدم علیہ السلام سے ہزاروں سال بعد ہے۔

پینسٹھواں دھوکہ:۔ بعض ایسے کلمات جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں تو زبان زد خلق ہیں۔ اور بہت مشہور ومعروف بھی، مگر محدثین کے نزدیک بے اصل ہیں، جیسے لولاک لما خلقت الافلاک (آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)، ان ہی کلمات کو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہ چسپاں کرتے اور ان کو قطعی الثبوت بتاتے ہیں مثلاً ابن بابویہ نے ایک مرفوع حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے لولا علی لما خلق اللہ النبیین والملائکۃ (اگر علی نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ پیغمبروں اور فرشتوں کو پیدا نہ کرتا۔)

چھیاسٹھواں دھوکہ:۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ مرنے والا مومن ہو یا فاجر، موت کے وقت اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دیدار ہوتا ہے۔ پس آپ اپنے شیعوں کو دوزخ کے عذاب ملک الموت کے مددگاروں اور عذاب کے فرشتوں سے نجات دلاتے ہیں۔ اس کو خوشذائقہ، ٹھنڈا شربت پلاتے ہیں اور دوزخ کو حکم دیتے ہیں کہ ان کے شیعہ کو کسی قسم کا آزار اور تکلیف نہ پہنچائے۔ اور ناجر کے لئے۔ اور ان کے نزدیک ہر وہ شخص فاجر ہے جو ان

کے مذہب پر نہیں ہے عذاب دیئے جانے کا حکم فرماتے ہیں گویا ثواب و عذاب کے فرشتے ان کے زیر فرمان ہیں ان لوگوں کا یہ عقیدہ عیسائیوں کے اس عقیدہ سے ملتا جلتا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ تمام بنی نوع انسان کی ارواح حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ کے پاس لوٹ کر جاتی ہیں، اور تمام حساب کتاب جزا سزا، انعام بخشش اور دار و گیر آپ ہی کے سپرد ہیں فرق اتنا ہے کہ عیسائیوں کو ایک حد تک یہ اعتقاد زیب دیتا ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں اور ہر بیٹا اپنے باپ کے مہمات کے اجراء و تنقید میں اس کا نائب اور ولیعہد اس کے بجائے کاغذات پر دستخط کرتا ہے سلام و مجرا لیتا اور نذرانے وصول کرتا ہے یہ خلاف رافضیوں کے کہ وہ امیر المومنین کو وصی اور نائب رسول مانتے ہیں اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے فرستادہ بندہ ؛ پھر یہ لوگ معلوم نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ کس منطق اور دلیل کے ساتھ دیتے ہیں۔

بعض شیعی چند اشعار پیش کرتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حارث اعور ہمدانی سے دوران گفتگو میں یہ اشعار سنائے جو آپ کے اس حق کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ حارث اعور ہمدانی دنیا کا مشہور چھٹا ہوا کذاب اور دروغ گو ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس نے خود یہ شعر گھڑ کر انکی نسبت جناب امیر کی طرف کردی ہو۔

اور یوں لوگوں کی گمراہی کا ذریعہ بنا ہو۔ پھر ان اشعار کے شروع میں منادیٰ مضاف کی ترمیم واقع ہے جو تمام ماہرین لسان عربی کے نزدیک غلط اور خطا ہے۔ لہٰذا یہ غلطی ہی اسبات کا واضح اور صاف اعلان ہے کہ یہ اشعار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نہیں ہو سکتے یہ اسی کذاب نے گھڑے ہوں گے

اشعار یہ ہیں۔

يَا حَارِ هَمْدَانَ مَنْ يَمُتْ يَرَنِي   مِنْ مُؤْمِنٍ أَوْ مُنَافِقٍ قُبُلَا

اے حارث جو کوئی مرتا ہے تو مجھے دیکھتا ہے خواہ وہ پہلے مومن ہو یا منافق۔

يَعْرِفُنِي لَحْظَةً وَأَعْرِفُهُ   بِنَعْتِهِ وَاسْمِهِ وَمَا فَعَلَا

وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے اور میں بھی اسے اس کے نام، اوصاف اور اعمال کے ساتھ پہچان لیتا ہوں۔

أَقُولُ لِلنَّارِ حِينَ تُعْرَضُ لِلْعَبْدِ   ذَرِيهِ لَا تَقْرَبِي الرَّجُلَا

جب بندہ کے پاس آگ آتی ہے تو میں اس سے کہتا ہوں اسے چھوڑ اس کے قریب نہ جا۔

نَارُ ذِيهِ لَا تَقْرَبِيهِ إِنَّ لَهُ   حَبْلًا بِحَبْلِ الْوَصِيِّ مُتَّصِلًا

اسے چھوڑ اس کے قریب نہ جا کہ اس کا رشتہ وصی سے منسلک ہے۔

أَسْقِيهِ مِنْ بَارِدٍ عَلَى ظَمَإٍ   تَخَالُهُ فِي الْحَلَاوَةِ عَسَلَا

میں پیاس کے وقت اسے ٹھنڈا اور شہد سا شیریں پانی پلاتا ہوں۔

قَوْلُ عَلِيٍّ لِحَارِثٍ عَجَبٌ   كَمْ ثَمَّ أُعْجُوبَةٌ لَهُ مَثَلَا

حارث کے لئے علی کا یہ قول عجیب ہے اور اس کے مثل اور بہت عجوبے ہیں۔)

اور بفرض محال یہ اشعار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہی ہوں تب بھی اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنے مخلصوں کی مدد اور شفاعت ثابت ہوتی ہے۔

اور یہ بات بھی شیعان اولیٰ اہل سنت کے لئے باعث مسرت ہے۔ نہ کہ رافضیوں کے لئے مگر یہ مبالغہ اس سے کہاں ثابت ہوا کہ دار الجزاء کا پورا کارخانہ ہی جناب امیر کے قبضہ قدرت میں ہے۔

سترسٹھواں دھوکہ: اہل سنت پر شیعہ یہ طعن کرتے ہیں کہ یہ لوگ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں کہ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِعَلِیٍّ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ زَوَّجَکَ فَاطِمَۃَ وَجَعَلَ الْاَرْضَ صَدَاقَھَا حضور صلے علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فاطمہؓ کو تمہاری زوجیت میں دیا اور روئے زمین ان کے مہر میں دی)

جب واقعہ یہ ہے تو خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) نے فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کیوں نہیں دیا اور اہل سنت اس معاملہ میں ابوبکر کو حق بجانب کیوں کہتے ہیں۔ یہ تو کھلا تناقض ہے جو ان کے مذہب میں پایا جاتا ہے۔

اس طعن کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے ہاں یہ روایت، صحیح یا ضعیف کسی بھی طریقہ سے کہیں نہیں ہے یہ شیعوں کا خالص افتراء اور بہتان ہے ہاں۔ بنگال کے جاہلوں میں یہ ضرور مشہور ہے کہ بنگال کا ملک جو ہندوستان کی ترائی میں واقع ہے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جہیز میں ہے یہ بات کیوں اور کیسے مشہور ہوئی اس کا کچھ بھید اور سبب نہیں کھلتا ویسے جہلا میں بہت سی بے اصل باتیں مشہور ہوتی ہی رہتی ہیں اور فدک چونکہ بنگال میں نہیں اس لئے اس کا معاملہ ناقابل حل ہی رہا۔

اگر ذرا بھی غور اور عقل سے کام لیا جائے تو اس روایت کی گھڑت اور افتراء صاف نظر آجاتا ہے اس لئے کہ شیعوں یا سنیوں کی کتابوں میں یا تو فدک کی میراث کا دعویٰ منقول ہے۔ یا دعویٰ ھبہ اور مذکورہ بالا روایت کی رو سے خاص میراث یا ہبہ کے دعویٰ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بلکہ ساری زمین کی ملکیت کا ہی دعویٰ کرنا چاہیئے تھا۔

اور جب یہ ہوتا تو پھر کسی شیعہ یا سنی کو یہ حق نہ ہوتا کہ وہ جناب زہرا رضی اللہ عنہا یا آپ کی اولاد کی اجازت کے بغیر زمین کا کوئی ٹکڑا اپنی ملک میں لاسکے۔

اور اس کا تقاضائے لازم یہ بھی تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا خیبر یا دیگر مفتوحہ علاقوں کو غنیمت پانے والوں میں بطور جاگیر یا انعام تقسیم کرنا بیکار و ظلم ہو کیونکہ اس صورت میں حضرت فاطمہؓ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد کی حق تلفی ہوتی تھی۔

خلاصہ کلام یہ اس کلام فاسد کی برائیاں اور خرابیاں حد و شمار سے بھی زائد ہیں۔ لہذا ایسی لغو اور باطل روایت کی نسبت اہل سنت کی طرف کرنا　ایک انوکھا افتراء ہے۔ اور کچھ نہیں۔

اڑسٹھواں دھوکہ: اہل سنت پر ان کا ایک طعن یہ ہے کہ یہ روایت نقل کرنے میں منافق اور مخلص کی بھی تمیز نہیں کرتے ہر صحابی کی روایت لے لیتے ہیں حالانکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہونے کے سبب منافق و مخلص میں تمیز اٹھ چکی تھی۔ بخلاف شیعہ کے کہ وہ صرف اہل بیت سے ہی روایت کرتے ہیں۔ جن کی پاکی و طہارت اور ان کا گندگی سے پاک ہونا نص قرآنی سے قطعی الثبوت ہے ''اس طعن کا جواب یہ ہے کہ شیعوں نے آئمہ سے براہ راست بلاواسطہ کچھ نہیں سنا۔ اور یہ واسطہ بھی ایسے مفتریوں اور جھوٹوں کا ہے جن پر خود ائمہ لعنت بھیجتے اور ان کی تکذیب کرتے رہے۔ یہ واسطے زیادہ تر ہشام بن اور زرارہ بن اعین جیسے بد اعتقاد اور ملحد و زندیق لوگوں کے ہیں۔ اس کی

تفصیل ہم باب سوم و چہارم میں شیعوں کی کتابوں کے حوالوں کے ساتھ بیان کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ شیعہ ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہیں جن کا نفاق ائمہ معصومین کی قطعی شہادت سے ثابت ہے بخلاف اہل سنت کہ ان کے مجتہدین نے بلا واسطہ ائمہ کرام سے علمی خوشہ چینی کی ہے۔ اور انہوں نے ان ہی ائمہ کی اجازت اور شہادت سے ہی اجتہاد و فتوی کی ذمہ داری کو انجام دیا ہے۔

چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور ان دونوں حضرات کے بارے میں امام موصوف رحمۃ اللہ علیہ نے بشارتیں دی ہیں۔ جو حسب موقع مناسب بیان ہونگی۔

دوسرے یہ کہ منافق اور بے دین کی روایت لینے میں غلطی اس وقت ہے کہ وہ اپنی روایت میں تنہا ہو اور جب اہل بیت یا کبار صحابہ سے جن کے مرتبہ کی بلندی نصوص قرآنی سے ثابت ہے، کسی حدیث کی روایت ہو اور پھر اسی کی تائید میں دوسروں سے بھی روایت ہو جن کے نفاق پر بظاہر کوئی دلیل نہ ہو تو اس روایت کے قبول کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ خصوصاً قرن صحابہ و تابعین میں تو سب ہی صلاح و صدیق کی صفت سے متصف تھے جب کہ امام الائمہ سرور کونین حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس پر شاہد ہے۔

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ (الی آخر الحدیث)

(سب صدیوں سے بہتر میری صدی ہے۔ پھر اس کے بعد والی)

نیز جناب امیر المومنین اور ائمہ اطہار رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یا دوسرے خلفاء راشدین اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے روایتیں کی ہیں اور ان کی تصدیق فرمائی ہے۔

پھر یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی آخر حیات کے وقت مومنین اور منافقین باہم ممتاز ہو چکے تھے اور آپ کی وفات کے بعد کوئی منافق زندہ نہیں رہا تھا۔ جس پر یہ آیت شاہد ہے۔ مَا کَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ پاک و ناپاک کو جدا کئے بغیر مومنوں کو اس حال میں چھوڑ دے جس پر تم ہو) اور یہ حدیث بھی اَدَّ اِنَّ الْمَدِیْنَةَ تَنْفِی النَّاسَ کَمَا یَنْفِی الْکِیْرُ خُبْثَ الْحَدِیْدِ (یوں سمجھو کہ مدینہ لوگوں کو ایسے نکھار دیتا ہے جیسے بھٹی لوہے کو میل سے)

اور اگر اکا دکا چھپا منافق رہا بھی ہو تو صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کی شان و شوکت اور ان کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دبدبے سے اور ان کی گرفت سے جو وہ روایات میں تساہل برتنے والوں کے خلاف عمل میں لاتے تھے اتنا خوفزدہ و ہراساں رہتا ہو گا کہ دین یا واقعہ کے خلاف کوئی روایت گھڑنے کی اس میں جرأت و ہمت ہی کہاں باقی رہتی ہوگی۔

چنانچہ سیر خلفاء کا گہرا مطالعہ کرنیوالوں پر یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

اور پھر اہل سنت نے بطور اصول ایک قاعدہ مقرر کیا ہے جس کی وجہ سے بفضل خداوہ اس آمیزش کے خطرہ سے محفوظ ہیں کہ بمقتضائے اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ (اکثریت کی پیروی کرو) ان کو جو روایت خلاف جمہور ملتی ہے وہ اس کو ترک کر دیتے ہیں۔ برخلاف شیعہ کے کہ وہ ان منافقین کے کھلونے ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد ہی جمہور کی مخالفت پر رکھی ہے اور نادر و کمیاب روایتوں کا کھوج لگاتے پھرتے ہیں اور ان ہی کو معیار عمل بناتے ہیں۔ پس منافقین کا دخل ایسی ہی روایات میں ہے بلکہ ان کے دین و مذہب اور ان کی روایات کا انحصار ہی ان پر ہے۔

انہترواں دھوکہ:۔ وہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن حشر کی ہولناکی وزن اعمال اعمالناموں کی پیشی اور اعمال پر سزا دیا جانا یہ سب خطرات جو روایات میں منقول ہیں غیر شیعہ کو درپیش ہوں گے شیعہ ان تمام شدائد سے محفوظ و مامون رہیں گے۔ اور اس بہتان کی نسبت ائمہ کرام کی طرف کرتے ہیں۔

شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بالیقین نجات یافتہ ہیں اس لئے کہ وہ نحن ابناء اللہ و احباءہ ہیں (ہم اللہ کے بیٹے اور ان کے محبوب ہیں) اور کہتے ہیں لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔ (ہمیں آگ صرف چند دن ہی چھوئیگی) حالانکہ یہ دعویٰ ان نصوص قطعیہ کے خلاف ہے یعنی مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (جو بھی برا کام کرے گا۔ اس کا بدلہ پائے گا) اور وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ۔ (جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اسے دیکھے گا)

سترواں دھوکہ:۔ یہ اہل سنت پر بہتان لگاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کوئی شخص اس وقت تک سنی نہیں ہو سکتا جب تک اس کے دل میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے خلاف چکور یا مرغی کے انڈے کے برابر بغض نہ ہو اس افترا اور بہتان کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ کسی شیعی عالم نے ان ہی الفاظ کی ایک روایت علی بن الجہیم بن بدر بن الجہیم القرشی سے بیان کی ہے۔ اور یہ علی فرقہ نواصب میں اول درجہ شریر اور چھٹا ہوا لچا تھا جو کسی خفیہ مصلحت سے سنی کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ اور تقیہ پر عامل تھا اور عمر بھر امیر المومنین سے لوگوں کو برگشتہ کرنا اس کا مقصد زندگی رہا اور اس نے ایسا کیا تو کیا بعید ہے اور ان کے اخلاف نے جو سطحی ذہن اور بے تحقیق تھے اس روایت کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اہل سنت کے حق میں خاص طور سے مجالس المومنین کے مصنف نے تو بالکل ہی یقین کر لیا ہے کہ ہر سنی کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ضرور بغض ہوتا ہے۔ مگر مخالفین کے ڈر اور خوف سے آپ کے بعض فضائل بھی بیان کر دیتے ہیں (مخالف کے خوف کا کابوس ایسا سوار ہے کہ اب سنی میں بھی انہیں "تقیہ" نظر آنے لگا۔)

حیرت اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ پڑھا لکھا شخص جو بزعم خود عقلمند بھی ہے۔ اتنا نہیں سوچتا کہ دلوں کا حال تو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا تجھے سنیوں کے دل کا حال کیسے معلوم ہو گیا سچ ہے۔ (اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِهٖ ہر انسان دوسرے کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لیتا ہے)، یہ اپنے تقیہ اور خوف کی نسبت کر کے ان کو بھی اپنے جیسا بزدل اور منافق سمجھتا ہے کیا اس نے تاریخ میں نہیں دیکھا کہ علماء اہل سنت نے ظالم و سفاک اور خونخوار امرائے نواصب حجاج و ولید کے سامنے بے دھڑک اپنے مذہب کا اظہار کیا اور خاندان نبوت پر اپنی عزیز جانیں نثار کر دیں اور موت سے دوچار ہوئے چنانچہ اہل سنت کے جلیل القدر محدث و امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اس جرم میں کہ امیر المومنین کے مناقب میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ جام شہادت نوش کیا، اسی طرح حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے جو جناب حسنین رضی اللہ عنہما کو ذریت رسول کہتے تھے حجاج کے سامنے اس کا اظہار کیا۔ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ۔ سے حجاج کو مسکت جواب دیا اور اس کی پاداش میں خون شہادت سے گلنار ہوئے۔ اس تعصب اور اندھے پن کا کیا ٹھکانا کہ نادیدہ کو دیدہ بنانا اور ان سنی کو سنی خیال کر لینا سنی اگر ایسے ہی بزدل تھے تو انہوں نے جس طرح مخالفین کے ڈر سے امیر المومنین کے فضائل بیان کئے اسی طرح ان کے ڈر سے جناب شیخین (رضی اللہ عنہم) کی برائیاں کیوں نہ بیان کیں، کیونکہ مخالفین کے دلوں میں بھڑکتا ہوا جہنم صرف امیر المومنین کی تعریف سے تو ٹھنڈا نہیں پڑتا اس میں تو ٹھنڈک جناب شیخین رضی اللہ عنہما کی قدح سے پڑتی ہے۔

اکہترواں دھوکہ:۔ شیعوں کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن اہل سنت کے اعمال و طاعات گرد و غبار کی طرح ہوا میں اڑ کر نیست و نابود ہو جائیں گے" اس طعن کا بہترین جواب ہمارے خیال میں ان آیات میں موجود ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا (اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔
دوسری جگہ ارشاد ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ (جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا۔
شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ" رافضیوں کے علاوہ کوئی اور اگر ہزار سال بھی خدا کی عبادت کرے تقویٰ و زہد کا مجسمہ بھی بن جائے۔ تب بھی اس کو ہرگز اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور نہ ہی وہ عذاب سے نجات پائے گا۔
حالانکہ ان کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا۔ یہ بات نہ تمہاری آرزو پر نہ اہل کتاب کی آرزو پر منحصر ہے بلکہ امر سب یہ ہے کہ جو کوئی برا کرے گا اس کی سزا پائے گا اور اللہ کے سوا کسی کو اپنا حامی و مددگار نہ پائے گا اور جو کوئی نیک کام کرے خواہ مرد ہو یا عورت اور ایمان رکھتا ہو گا تو ایسے سب لوگ جنت میں جائیں گے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ ہوگا
اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ اہل سنت جناب امیرالمومنین کی امامت تسلیم نہ کر کے اپنا ایمان ضائع کر چکے کیونکہ عقیدہ امامت بھی عقیدہ نبوت کی طرح ضروریات ایمان میں سے ہے۔
تو ہماری طرف سے یہ جواب ہے کہ امیرالمومنین اور ائمہ طاہرین کی امامت میں اہل سنت کو ذرہ برابر شک ہے نہ انکار ان کا قصور البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو بھی امامت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ امامت کے مستحقین کی جماعت میں سے جب کسی ایک کی امامت پر اتفاق رائے ہو جائے تو وہی امام وقت ہے۔ چنانچہ ارباب حل و عقد نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر اتفاق کیا اس وقت وہی امام تھے اور اہل سنت میں سے کسی نے ان کو امام ماننے سے انکار نہیں کیا خلاصہ کلام یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک اگر امامت کا استحقاق نص سے ثابت ہو تو وہ خلافت راشدہ ہے اور اگر عقل اور قرائن ظنیہ سے ثابت ہو تو وہ خلافت عادلہ ہو گی۔ اور بغیر استحقاق کوئی جابرانہ طور پر تسلط حاصل کر لے تو اس کی خلافت جابرہ کہلائے گی۔
اہل سنت کے نزدیک چاروں خلفاء کی خلافت خلافت راشدہ ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا استحقاق نص سے ثابت ہے۔
اور اگر ہر امام کی امامت پر ہر وقت (چاہے وہ اس وقت خلیفہ ہو یا نہ ہو) اعتقاد رکھنا ضروریات ایمان میں سے شمار کیا جائے گا تو پھر شیعوں کو اپنے ایمان کی خیر منانا چاہیئے۔ کہ وہ تلف ہو جائے گا اس لیے کہ وہ جناب علی رضی اللہ عنہ کی حیات میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی امامت کے معتقد نہیں تھے اور اسی طرح امام حسن رضی اللہ عنہ پر تو ہر امام کی امامت کے زمانہ میں نہ تو ان سے پہلے کی امامت کو مانتے ہیں نہ آئندہ آنے والے امام کی امامت کو!
اس صورت میں شیعہ تمام ہی اماموں کی امامت کے معتقد نہ رہے بلکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حین

حیات یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کے بھی معتقد نہیں تھے۔

اور پھر یہ شیعہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں کہ جناب محمد الحنفیہ اور جناب زید شہید رحمہا اللہ اور ان کے علاوہ دیگر امام زادوں نے امام زین العابدین اور امام باقر رحمۃ اللہ کی امامت اور استحقاق امامت کا صاف انکار کیا ہے اور مذکورہ الصدر دونوں بزرگوں نے ان دونوں کو کبھی امام تسلیم نہیں کیا تو اگر اس انکار کے باوجود محمد بن الحنفیہ اور زید شہید رحمہا اللہ کا ایمان صحیح و سالم ہے تو اہل سنت کا ایمان تو بدرجہ اولیٰ صحیح و سالم ہوگا۔ کیونکہ وہ تو اس کے قائل اور معتقد ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ مستحق امامت تو ہر وقت تھے۔ البتہ اپنے زمانہ میں امام و خلیفہ بالفعل ہو گئے۔

اور پھر کیا یہ بات باعث تعجب نہیں کہ شیعہ باوجود اہل سنت کے ساتھ شدید بغض و عناد رکھنے کے ان کی کتابوں میں خود ان ہی کی ایسی صحیح روایات موجود ہیں۔ جن سے اہل سنت کی نجات ثابت ہوتی ہے ہم انشاء اللہ باب معاد میں ان روایات کو نقل کریں گے۔ انہوں نے جس مبالغہ آرائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کے سطحی پن اور پست ذہنیت پر دال ہے، یہ نواصب اور اہل سنت میں تمیز نہ کر سکے اور ان کے عقائد کو اہل سنت کے سر تھوپ دیا۔

ان کے اگلوں نے تو ناسمجھی اور مغالطہ میں ایسا کیا مگر ان کے اخلاف نے دیدہ و دانستہ اس بدتمیزی کو اپنا شعار بنایا

اسی طرح کی ایک اور بات ان کی کتابوں میں ملتی ہے، کہ اگر رافضی ہزاروں سال تک بھی اللہ کی نافرمانی اور اور محرمات قبیحہ کے مرتکب ہوتے رہے ہوں تب بھی ان سے قطعی باز پرس نہ ہوگی اور وہ بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ بلکہ شیعوں کو گناہ کے عوض بھلائیاں دی جائیںگی اور ان کی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ شیعوں کے بعض اعمال مثلاً اسلاف پر لعنت کرنا انبیاء کے اعمال کے برابر شمار ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شیعہ کا گناہ سنی کی عبادت سے افضل ہے اس لئے کہ شیعہ کا گناہ تو قیامت کے دن بھلائی سے بدل جائے گا اور اس پر اس کو اجر بھی ملے گا مگر سنی کا نیک عمل قیامت کے دن تلف ہو کر پراگندہ غبار کی طرح نیست و نابود ہو جائے گا۔

بہترواں دھوکہ: ان کا اہل سنت پر یہ طعن ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح کتابوں میں یہ روایت کی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو چار رکعت والی نماز میں سہو ہوا اور آپ نے چار رکعت کے بجائے دو رکعت ادا فرمائیں" گویا آپ کے سہو کی روایت کرنا جرم ہے، اور حال یہ ہے کہ یہ روایت خود ان کی اپنی صحیح کتابوں میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ کلینی نے (کتاب) کافی میں اور ابو جعفر طوسی نے تہذیب میں صحیح سندوں سے یہ روایت بیان کی ہے مگر خیر ہم اس سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور وہی جواب دیتے ہیں جو ایک دفعہ پہلے بھی دے چکے ہیں کہ افعال البشری میں سہو انبیاء کی شان میں کوئی عیب نہیں کہ اس سے لامحالہ صحیح بات کا انکار کیا جائے۔

ہاں البتہ تبلیغ احکام الٰہی میں انبیاء سے سہو ہونا ممتنع ہے اور نہ وہ کبھی واقع ہوا۔

تہترواں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت نے اپنی احادیث میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ لیلۃ التعریس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صبح کی نماز قضا ہو گئی اس وادی میں ایک شیطان تھا۔ جس کے تسلط سے سب پر غفلت چھا گئی۔ تو

گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی شیطان کا تسلط ثابت کرتے ہیں۔

شیعوں کے اس دھوکہ میں وہ آسکتا ہے، جو ان کی کتابوں سے ناواقف ہو کلینی نے خود اپنی کتاب کافی میں اور ابو جعفر نے اپنی کتاب تہذیب میں لیلۃ التعریس کے اسی قصہ کو مختلف سندوں اور متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے پھر اہل سنت ہی ملزم کیوں! اپنے متعلق بھی تو کچھ بولئے۔

چوہتروال دھوکہ:۔ اہل سنت پر ان کا ایک افترا یہ بھی ہے کہ انہوں نے خارجیوں اور حروریوں کو ثقہ، و عادل تسلیم کرکے اپنی کتابوں میں ان سے احادیث کی روایت کی ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابن ملجم سے بھی روایت کی ہے"!

ان کا یہ الزام بھی محض افترا، اور سراسر جھوٹ اور بہتان ہے، ان کو شرمانے کے لئے اہل سنت کی ان روشن کتابوں کا آئینہ دکھا دینا ہی کافی ہے۔

یہ کتابیں شرق سے غرب تک ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں کیا شیعوں کے علاوہ بھی کسی کو ان کتابوں میں خارجیوں اور ابن ملجم کی کوئی روایت نظر آئی یا آسکتی ہے!

کون نہیں جانتا کہ اہل سنت کے نزدیک تو اہل بیت اور امیر المومنین رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والے کی روایت کی صحت باطل ہے اگرچہ وہ صادق القول اور صالح العمل ہی کیوں نہ ہو، اور اسی بنا پہ جریر بن عثمان کی توثیق کو اہل سنت نے غلط ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے ظاہری احوال اور کلام کی سچائی سے متاثر ہو کر جن لوگوں نے اس کی توثیق کی ہے ان کو دھوکہ لگا ہے اور انہیں اس کے باطنی عقیدہ کا پتہ نہ لگ سکا وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا۔

اسی طرح اہل سنت کی کتابوں میں ابن ملجم کو اشقی الاخرین کہا گیا ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی میں آچکا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کوچیں کاٹنے والا اشقی الاولین ہے اور امیر المومنین کا قاتل اشقی الاخرین ہے۔

پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابن ملجم نے شہید کر دیا۔ تو بعض حروریوں نے اس کی تعریف و توصیف میں نظمیں لکھیں اور اشعار کہے اور اس کے قابل نفرت فعل کی مدح و ستائش کی تو ان کا جواب بھی شعرائے اہل سنت نے دیا۔ اور ان کے جواب میں قصائد لکھے اور ان کو دندان شکن جواب دیئے چنانچہ یہ قصائد اور نظمیں کتاب استیعاب میں موجود ہیں۔

ہاں بخاری میں مروان سے البتہ روایت آئی ہے باوجودیکہ وہ نواصب میں سے تھا بلکہ اس بدبخت گروہ کا سرغنہ اور سربراہ تھا۔ لیکن اس روایت میں بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روایت کا مدار امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ پر رکھا ہے اور ان ہی پر روایت کو ختم کیا ہے اگر امام ہی مروان سے خود روایت کریں تو پھر امام بخاریؒ کو اس سے بچنے اور احتراز نہ کرنے کا کب حق ہے۔ اس کے باوجود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تنہا مروان سے کسی بھی جگہ روایت نہیں کی بلکہ مسور بن مخرمہ یا دوسروں کو اس کے ساتھ لائے ہیں اور یہ بات پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر کوئی منافق یا بدعتی نقل حدیث میں اہل حق کے ساتھ موافق ہو تو اس کی روایت لیتے ہیں کوئی قباحت

نہیں۔ اور پھر بخاری میں اس کی صرف دو روایتیں ہیں، ایک حدیبیہ کے قصہ میں دوسری بنی طائف وہ بنی ثقیف اور یہ دونوں جگہیں بھی عقیدہ اور عمل سے متعلق نہیں۔ ایسے ہی صحاح کی دوسری کتب میں بھی مروان سے اتنی ہی اور اسی قسم کی روایت ہے۔

اب رہا معاملہ عکرمہ کا جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خاص پیر وار شاگرد رشید تھا، اہل سنت کی کتابوں میں اس کی کافی روایات ہیں۔ جن پر بعض ناواقف ناصبی یا خارجی ہونے کا الزام لگاتے ہیں جو حقیقت میں خلاف انصاف ہے اس لئے کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خاص غلام تھا۔ پیرو وہ اور شاگرد رشید تھا اور ہر دم ان کے ساتھ رہتا تھا۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما بالاجماع شیعان اولی میں شامل ہیں اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے محب و مدد گار ہیں۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوشتری نے بھی ان کو شیعہ شمار کیا ہے۔

ایسی صورت میں اثبات کا کیا امکان! کہ ان کا ایسا غلام جو ان کا ہم صحبت اور ہم مشرب ہو ان کے عقیدہ سے اس قدر ہٹ جائے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے حال سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اسے اپنی صحبت سے نکال باہر نہ کریں۔

پچھتروان دھوکہ :- کہتے ہیں کہ اہل سنت مٹی کی ٹکیہ پر سجدہ نہیں کرتے اس لئے وہ شیطان کے مشابہ ہیں کیونکہ اس نے بھی خاک پر سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے راندہ بارگاہ ہوا اس کا قول اللہ تعالیٰ نے یوں نقل فرمایا خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ۔ (مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے) شیعوں کے کسی شاعر نے اس طعن کو نظم بھی کیا ہے۔

آنکس کہ دل از بغض علی پاک نکرد — بے شک تصدیق شہ لولاک نہ کرد
بر مہرہ نماز کے گذار دستی — شیطان ز ازل سجود بر خاک نکرد

(جس نے بغض علی سے اپنا دل پاک نہیں کیا بے شک اس نے شہ لولاک کی بھی تصدیق نہیں کی، مٹی کی ٹکیہ پر سنی کب سجدہ کر سکتا ہے۔ شیطان نے بھی تو خاک پر سجدہ نہیں کیا تھا)

اس طعن کا جواب یہ ہے، کہ اہل سنت کو خاک پر سجدہ سے کب اور کہاں انکار ہے البتہ وہ خاک کے علاوہ دوسری اشیاء کپڑا، چمڑہ وغیرہ پر سجدہ کرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں،

اخبار مشہورہ میں آیا ہے کہ راندہ درگاہ ہونے سے پیشتر شیطان نے زمین و آسمان کے چپہ چپہ پر سجدے کئے۔ لیکن جب اس نے آدم خاکی کو، جو بصورت گوشت پوشت تھے سجدہ نہ کیا۔ تو اس کی وجہ سے وہ سارے سابقہ سجدے رد اور نامقبول قرار پائے اور لعنت و پھٹکار کا موجب بنا! پس معلوم ہوا کہ خاک پر سجدہ کرنا اور ان چیزوں کے سجدے سے بچنا جو خاک سے پیدا ہوئی اور دوسری شکل اختیار کرنا ہے اس کا حشر و انجام وہی ہوتا ہے جو شیطان کا ہوا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تحفیر یا اہل بیت نبوی کے خلاف ان کا بغض وحسد یا ان کی نبوت سے انکار کے متعلق ان کی کتابوں میں جو کچھ مذکور ہے وہ سب انشاء اللہ باب نبوت میں بیان کیا جائے گا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس ذات کی تعظیم ترک کرنے پر شیطان اس درجہ پر پہنچا تو اسی ذات کی تحقیر و تذلیل کرنے سے شیعوں کا یہ فرقہ لعنت و ذلت کے کس درجہ تک پہنچے گا۔ اب ذرا انصاف کو کام میں لاکر فرمایئے کہ شیطان کی مشابہت کیا ہے اور شیطان کے مشابہ کون ہے۔

مذکورہ بالا اشعار میں سے پہلا شعر اہل سنت کے عقیدہ کا ترجمان ہے، مگر دوسرے شعر کا مضمون کچھ ادھورا رہ گیا اس لئے کہ شیطان نے خاک پر سجدہ کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ خاک سے بنے ہوئے جسم آدم کے سجدہ سے منکر ہوا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شیعہ و سنی ہر دو خاک کو سجدہ نہیں کرتے ان کا مسجود تو کوئی شے دیگر ہی ہے اور تقاضائے انصاف بھی یہی ہے کہ خاک پر سجدہ ضرورت سے جائز ہو ورنہ ان میں کیا مناسبت اور معقولیت ہے کہ ہم اپنی نشست اور بیٹھک کی جگہ سرین جو اعضا بدنی میں کمتر درجہ کی ہے کے آرام کے لئے تو زرین مسند یا رنگ برنگ ندے اور قالین سے آراستہ و پیراستہ کریں۔

اور جب پروردگار کے سامنے حاضری ہو اور اس سے التجا و مناجات کا وقت آئے تو سامنے خاک ڈال کر اعضائے بدن میں جو ممتاز و اشرف حصہ ہے یعنی سر و چہرہ اس کو خاک پر رکھیں (مسند و مصلی موجود ہو تو اسے ہٹا دیں) حالانکہ حدیث کی رو سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اس لئے کہ وہ صفات واجب الوجود علم قدرت سمع و بصر اور کلام کا مظہر ہے اور ان تمام صفات کا منبع صدر جسم انسانی کا یہی اعلیٰ حصہ ہے جس کو خاک پر ڈالا جا رہا ہے۔

اس معاملہ میں شیعہ حضرات کا قول دور جاہلیت کے مشرکین کے طرز عمل سے ملتا جلتا ہے جو مادر زاد ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ گو انسان سے عبادت و تعظیم کا مطالبہ ہے، مگر انسانی اوصاف کی رعایت کے ساتھ حیوانوں اور درندوں کی طرح ننگے ہو کر نہیں کہ شرافت و شریعت میں ستر عورت واجب قرار دیا گیا ہے۔ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ (خوش پوشاک ہو کر مسجد میں جاؤ)

پھر ایک اور بات کہ ٹکیہ مقام سجدہ پر رکھنے سے کئی وہم پیدا ہوتے ہیں۔

اول۔ ٹکیہ رکھنا کفار اور منافقین کی خصوصیت ہے۔

دوسرے۔ خاک پر سر رکھنا بد فالی ہے۔ جو عمل کے سوخت ہو جانے کی دلیل ہے۔

تیسرے۔ اس میں بت پرستوں کے فعل سے مشابہت ہے کہ وہ بھی عبادت کے وقت کسی نہ کسی چیز کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

(اس طعن میں شیعوں کی ایک فارسی رباعی بھی درج ہوئی ہے اس کے جواب میں اہل سنت کی طرف سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف میں آٹھ رباعیاں بیان کی ہیں یہاں صرف ایک پر کفایت کی جاتی ہے اس لئے کہ۔ ۶ نادان کو نہیں کافی دفتر نہ رسالہ!)

سنی دل را بیاد حق رُستہ کنند	کافر زپے آتش و خور، خستہ کنند
شیعی کہ خسیس تر بود وقت نماز	دل را بکلوخ خاک وابستہ کنند

سنی تو دل کو (نماز میں) اللہ کی یاد میں لگاتا ہے، کافر آگ اور سورج کے پیچھے پڑ کر اسے خستہ حال

کرتا ہے اور شیعہ ! جو کافروں سے بھی زیادہ خسیس ہے دبر تت نماز، اپنے دل کو مٹی کے ڈھیلے سے وابستہ کرتا ہے۔

چھہتر واں دھوکہ :- شیعہ مذہب کے حق اور اہل سنت کے مذہب ناحق ہونے کے بارے میں تو گھڑ گھڑ کر روایات بیان کرنا، ان کو شائع کرنا تو ان کا دطیرہ ہے ہی ایسی جھوٹی روایات بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے امامیہ مذہب کا انکار کرکے ان کے ساتھ مباہلہ کیا تو وہ فی الفور ہلاک ہو گیا۔ ایسی روایات میں سے ایک روایت وہ ہے جس کا راوی نجاشی ہے وہ نقل کرتا ہے کہ محمد بن احمد بن عبداللہ بن تضاعۃ بن مہران حمال ابوعبداللہ شیخ الطائفہ نے امامت کے معاملہ میں ابن حمدان امیر موصل کے روبرو موصل کے قاضی سے مناظرہ کیا بحث کی گرما گرمی میں بات بڑھتے بڑھتے مناظرہ سے مباہلہ تک آ گئی قاضی نے کہا کیا کل تم مجھ سے مباہلہ کرو گے !

چنانچہ دوسرے دن دونوں مجلس میں آئے اور مباہلہ کیا قاضی نے اپنا ہاتھ ابن مہران کے ہاتھ میں دبا اور پھر دونوں جدا ہو گئے اور مجلس سے چلے گئے قاضی کا یہ معمول تھا کہ وہ روزانہ امیر کے ہاں حاضری دیتا تھا دو روز گزر گئے مگر قاضی امیر کے پاس نہیں آیا امیر نے اپنے کسی معتمد کو حال دریافت کرنے بھیجا تو معلوم ہوا کہ قاضی جوں ہی مجلس سے نکلا بخار نے آگھیرا اور اس کا وہ ہاتھ جو اس نے مباہلہ کے وقت ابن مہران کے ہاتھ میں دیا تھا سوج کر سیاہ پڑھ گیا تھا اور دوسرے روز قاضی کا انتقال ہو گیا (غالباً ابن مہران نے کسی طرح چالاکی سے کسی انگلی میں زہر انجکٹ کر دیا ہوگا۔ نعمانی)

غرض اسی قسم کی جھوٹی روایات نقل کرتے ہیں جو سراسر افترا ہیں۔ اہل سنت نے اس قصے کو بے اصل بتایا ہے بعض نے کہا ہے کہ ہاتھ سوج کر مرنے والا مہرانی حمال تھا واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ تاریخ سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مہرانی حمال دنیا طلب اور دروغ گو شخص تھا۔ جھوٹ بولنا اور افترا پردازی اس کی عادت تھی اسی نے یہ قصہ گھڑ کر شیعوں کے حق میں نقل کر دیا ہو تو کوئی عجب نہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قاضی، امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی امامت کا منکر ہو اور انکار امامت کو اہل سنت بھی غلط کہتے ہیں اور اصل امامت حضرت امیر رضی اللہ عنہ میں تو وہ بھی شیعوں سے متفق ہیں بحث واختلاف تو تقدیم وتاخیر میں ہے قاضی کے انکار امامت کا قرینہ یہ ہو سکتا ہے کہ موصل کے لوگ شام کے پڑوسی ہونے کے سبب نواصب کے عقیدہ کی طرف مائل تھے ممکن ہے قاضی بھی انھی میں ہو۔

ستترواں دھوکہ :- یہ اپنے آئمہ کرام سے اس مضمون کی جھوٹی روایات نقل کرتے ہیں کہ شیعوں کو دوزخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی اور ان روایات پہ بہت زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے راویوں نے مرتے وقت یہ کہہ کر کہ یہ وقت جھوٹ بولنے کا نہیں، ان کو بروایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جو نجاشی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے ۔ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ زِيَادٍ الْوَشَّاءِ الْبَجَلِيِّ الْكُوفِيِّ وَكَانَ عَيْنًا مِنْ عُيُوْنِ الطَّائِفَةِ وَوَجْهًا مِنْ وُجُوْهِهِمْ وَهُوَ ابْنُ بِنْتِ اِلْيَاسَ الصَّيْرَفِيِّ الْخَزَّازِ مِنْ اَصْحَابِ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّهُ رَوٰى عَنْ جَدِّهٖ اِلْيَاسَ قَالَ لَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ قَالَ لَنَا اشْهَدُوْا عَلَيَّ وَلَيْسَتْ سَاعَةُ الْكِذْبِ هٰذِهِ السَّاعَةُ سَمِعْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَا يَمُوْتُ عَبْدٌ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ

وَيَتَوَلَّى الْأَئِمَّةَ فَتَمَسَّهُ النَّارُ ثُمَّ أَعَادَ الثَّانِيَةَ ثُمَّ الثَّالِثَةَ۔

(حسن بن علی بن زیاد الوشاء بجلی کوفی سے روایت ہے اور یہ شیعوں کا نامور رئیس الطائفہ اور الیاس صیرفی خراز کا نواسہ تھا اور یہ صیرفی امام رضاؒ کا ساتھی تھا۔ وہ اپنے نانا سے روایت کرتا ہے کہ اس نے عین نزع کے وقت سب کو گواہ بنا کر کہا کہ یہ وقت جھوٹ بولنے کا نہیں ہے میں نے ابو عبداللہ علیہ السلام کو یہ کہتے سنا کہ اللہ کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی اللہ و رسول کی محبت اور ائمہ کی دوستی پر مرے اور دوزخ کی آنچ اس کو چھولے پھر یہی قول مکرر سہ کرر دہرایا۔

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو یہاں ائمہ کی دوستی سے مراد ان کا اتباع ہے اور ائمہ کی روش اور طریق زندگی پر عمل کرنے کا فخر اہل سنت کے بڑے بڑے اولیاء کو حاصل ہے اور پھر اس روایت میں شیعوں کے لئے خوشی کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہاں ائمہ سے مراد دین کے سارے ہی پیشوا ہیں جن میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، بدرجہ اولیٰ اور سب سے پہلے شامل ہیں۔

اٹھترواں دھوکہ:۔ ان میں کے بعض دروغ گو عیار اپنے مذہب کے اصول و فروع میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اس کی نسبت امام صادق رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کر دیتے ہیں اور کبھی کوئی رسالہ لکھ کر امام باقر یا امام صادق کے اصحاب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور غرض یہ ہوتی ہے کہ جاہل لوگ اس پر جھٹ پٹ یقین کر لیتے ہیں اور جلدی حرز جان بنا لیں حالانکہ تاریخ کے ناقابل تردید ثبوت سے یہ بات ظاہر و عیاں ہے کہ ان ائمہؒ میں سے کسی نے بھی تصنیف و تالیف کا کوئی کام کبھی بھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی یہ فعل ان کے شایان شان تھا۔ ورنہ یہ بھی دیگر مصنفین کی طرح دانشمندان روزگار کی طرف سے لِمَ لَا نُسَلِّمُ کے سوالات کا نشانہ بنتے، بقول کسے کہ مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ (جس نے کچھ تصنیف کیا اس نے اپنے آپ کو نشانہ بنالیا)۔

اناسی واں دھوکہ:۔ کہتے ہیں کہ جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ جو مہاجرین اولین میں سے ہیں، اور غزوات میں اکثر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمدم و ہمرکاب رہے۔ اور اکثر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اسباب خانگی پر داروغہ بھی رہے ہیں. وہ امامیہ میں سے تھے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ اور پھر کوفہ میں بیت المال کے داروغہ بنا دیئے گئے یہ بات علمائے شیعہ نیز احمد بن علی النجاشی جو رجال شیعہ کا بڑا نقاد ہے۔ نے بھی بیان کیا ہے۔

یہ ایسا تاریخی جھوٹ ہے کہ اس کی تردید تاریخ نے خود ہی کر دی ہے اس لئے کہ جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ کا انتقال تو حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی پہلے ہو گیا تھا البتہ ان کے دونوں صاحبزادے عبداللہ، اور علی (رضی اللہ عنہما) جناب امیر کی ہمرکابی میں تھے۔ انشاء و کتابت کی خدمت عبیداللہؓ کے سپرد تھی اہل سنت کی کتابوں میں اسی عبیداللہ کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایات اکثر آئی ہیں البتہ ان کے بھائی علی کے حالات سے تاریخ خاموش ہے۔

نجاشی نے اس معاملہ میں افتراء پردازی کی حد کر دی، جناب ابو رافع رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا بڑا شاگرد قرار دیا شیعہ مذہب فقہ کی ایک کتاب کو انکی طرف منسوب کیا اور ان کو امامیہ فرقہ میں شمار کیا۔ اسی پر بس

نہیں کی۔

امامیہ مذہب کی ایک اور کتاب جو سنن، قضایا اور احکام پر مشتمل ہے اس کا ان کو مصنف بتایا حالانکہ دنیا بھر کے تاریخ داں اسبات پر متفق ہیں کہ ہجرت سے سو سال بعد تک اسلام میں کوئی تصنیف معرض وجود میں نہیں آئی۔ اسی سے شیعوں کی تاریخ دانی کا پول کھل گیا۔ سچ ہے جب حیا جاتی رہے تو جو چاہو کرو۔

اسی واں دھوکہ:- اپنے مذہب کی بعض روایات علی بن محمد عدوی۔ ابوالحسن سماطی شیعی کی تاریخ سے نقل کرتے ہیں جو تاریخ طبری کا اختصار ہے جس میں اس نے جعلسازی کرکے بہت سی باتیں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں کیونکہ تاریخ طبری کا اختصار بھی اسی نے کیا ہے۔ اور وہ سہل عبارت کے سبب شہرت و رواج پا گئی ہیں۔

ان روایات کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تاریخ طبری میں موجود ہیں، حالانکہ اصل تاریخ طبری میں ان کا نام و نشان تک نہیں۔ تاریخ طبری کے اس اختصار نے اہل سنت کے بھی بہت سے مورخین کو گمراہ کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ان کو جو ملتا ہے وہ لاعلمی اور جعلسازی سے بے خبری کی بنا پر اصل تاریخ کی طرف اسے منسوب کر دیتے ہیں۔

اکیاسی واں دھوکہ:- اپنے مذہب کی بعض روایات یہ ایسے شخص سے نقل کرتے ہیں جو لوگوں کے خیال میں سنی ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہوتا ہے۔

چنانچہ ابن عقدہ جارودی رافضی تھا۔ ابن قتیبہ کٹر شیعی، اور اخطب خوارزم متعصب زیدی تھا۔

اور بعض روایات ایسے شخص سے نقل کرتے ہیں۔ جس کو اہل سنت اپنے میں شمار کرتے ہیں جب کہ واقعتہ وہ شیعہ ہوتا ہے۔

جیسے ہشام کلبی، کہ اکثر لوگ اس کو سنی سمجھتے ہیں۔ مگر نجاشی خود ان کو اپنے رجال میں شمار کرتا ہے، اور حقیقت میں وہ ہے بھی انہیں کے رجال ہیں۔

بیاسیواں دھوکہ:- اہل سنت کے کسی عالم پر بہتان لگاتے ہیں کہ انہوں نے ائمہ اہل سنت میں سے کسی امام پر کوئی الزام لگانا چاہا مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے اور بالآخر خفیف و شرمندہ ہوئے اور ملزم ٹھہرے اور مقصد اس جھوٹ کا یہ ہوتا ہے۔ کہ نہ صرف اس عالم کے خلاف بلکہ تمام علمائے اہل سنت کے خلاف بداعتمادی اور نفرت کی فضا پیدا کی جائے اور لوگ ان کی پیروی اور شاگردی سے گریز کریں چنانچہ عیاشی کی یہ روایت جو وہ اپنی اسناد سے بیان کرتا ہے۔ اس بہتان کی کھلی مثال ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت سلیمان نے پرندوں کے غول میں سے ہدہد کی عدم موجودگی کو کیوں محسوس کیا۔ اس میں کیا خاص صفت ہوتی ہے، حضرت عبداللہ بولے۔

"لِاَنَّ الْهُدْهُدَ يَرَى الْمَاءَ فِيْ بَطْنِ الْاَرْضِ كَمَا يَرٰى اَحَدُكُمُ الدُّهْنَ فِي الْقَارُوْرَةِ فَنَظَرَ اَبُوْحَنِيْفَةَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ فَضَحِكَ فَقَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ مَا يُضْحِكُكَ قَالَ ظَفِرْتُ بِكَ قَالَ الَّذِيْ يَرٰى مَا فِيْ بَطْنِ الْاَرْضِ كَيْفَ لَا يَرَى الْفَخَّ فِي التُّرَابِ حَتّٰى يَاْخُذَ بِعُنُقِهٖ قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللّٰهِ يَا نُعْمَانُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهٗ اِذَا نَزَلَ الْقَدَرُ عَمِيَ الْبَصَرُ"۔

دکیونکہ ہدہد زمین کے اندر کی چیز کو اسی طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شیشی میں تیل کو دیکھ لیتا ہے اس وقت ابو حنیفہؒ نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور پھر ہنس پڑے تو ابو عبداللہ نے فرمایا کیونکہ تم کس بات پہ ہنسے انہوں نے کہا میں آپ سے جیت گیا اس لئے کہ جو زمین کے اندر دیکھ لیتا ہے۔ وہ مٹی میں چھپا ہوا پھندا کیوں نہیں دیکھ پاتا یہاں تک وہ اس میں اپنی گردن پھنسا بیٹھتا ہے۔ جناب ابو عبداللہ بولے اے نعمان تم جانتے نہیں کہ جب حکم الٰہی ہو جاتا ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔

یہ اتنا کھلا افتراء اور گندہ بہتان ہے۔ جس کے جھوٹ اور بے اصل ہونے میں کسی کو شبہ نہیں اتنا تو یہ مفتری بھی جانتے ہیں اور مانتے ہیں کہ امام اعظمؒ عظیم المرتبت عالم تھے۔ جاہل نہیں تھے۔ باوقار اور خاص تمکنت کے مالک تھے شیعوں کی طرح سفلے یا چھچھورے نہیں تھے، بزرگوں اور بڑوں سے اس قسم کی چشمک زنی یا ان کی خردہ گیری کی توقع تو ان سے ممکن ہی نہیں تھی۔

اور یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ایک چیز کو دیکھ لینا اس کے سارے حالات اور نتائج جان لینے کو لازم نہیں اگر ہدہد زمین پر جال دیکھ بھی لے اور شکاری کی غرض سے واقف نہ ہو تو کچھ بعید نہیں اس کے نزدیک وہ دانے جو جال میں بکھرے ہوں اور وہ دانے جو چھلنی میں رکھے ہوں دونوں یکساں ہیں یہ اس کی نظر کا قصور نہیں۔ اور چھلنی اور جال کی غایت و مقصد کو علیحدہ علیحدہ جاننا بھی اس کی نظر کا کھیل نہیں اور نہ صرف کسی چیز کو دیکھ لینے سے اس کی حقیقت کو سمجھ لینا لازم ہے۔

اور پھر امام اعظم تو جناب امام صادق رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و خدمت پہ ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ قول تو بہت ہی مشہور رہے۔ لَوْلَا السَّنَتَانِ لَهَلَكَ النُّعْمَانُ (اگر امام صادق کی صحبت کے یہ دو سال نہ ملتے تو نعمان ہلاک ہی ہو گیا تھا۔ تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں امام صادق رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایسے خیال کا گذر بھی ہوتا   ۔ یا وہ ایسے الفاظ اپنی زبان زبان پہ بھی لاتے اور یہ بات تو شیعہ اور سنی دونوں کے نزدیک پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مروانیوں پر چڑھائی کی تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے دس ہزار دینار سرخ سے آپ کی مدد کی اور کوفہ میں اہل بیت کے مناقب و فضائل بیان کرنے شروع کئے اور علی الاعلان بتایا کہ اس وقت جناب زیدؒ کی مدد عین دین اسلام کی مدد ہے۔

اور عہد منصور میں امام صاحب کا قید ہونا کوڑے کھانا اور بالآخر زہر سے ہلاک کیا جانا ان سب واقعات کا سبب واحد محبت اہل بیعت رسول ہی تھی۔

پھر اولاد زید شہید نے جب نواح خراسان و سیستان میں منصور کے خلاف چڑھائی کی تو امام صاحب لوگوں کو ان کی اتباع و بیعت پہ راغب کرتے تھے۔ جب منصور نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ نے علم کس سے سیکھا تو انہوں نے فرمایا کہ اصحاب علی سے اور انہوں نے حضرت علیؓ اور اصحاب ابن عباسؓ سے اور انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور پھر خارجیوں سے امام صاحب کا مناظرہ اور اس مناظرہ کے نتیجہ میں بعض کا ہدایت یاب ہو جانا یہ سارے واقعات مشہور و معروف اور زبان زد خلق ہیں،

ان میں سے ایک یہ روایت یوں ہے کہ امام صاحب کا ایک بڑا ہی بڑا اکھڑ حروری (خارجی) تھا وہ امام صاحب

کو کافر کہتا تھا۔ آپ حق ہمسائیگی کی خاطر ازراہ ہمدردی اس کو بہت نصیحت و ہدایت فرماتے مگر وہ کسی پہلو مانتا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے چند روز اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا پھر چند روز بعد آپ اس کے ہاں تشریف لے گئے اور تنہائی میں اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ کہنے لگا تم میرے پاس آئے ہی کیوں اور تمہارا مقصد کیا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا مجھے ایک شخص نے تیری لڑکی کے لئے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ وہ کہنے لگا کون ہے وہ آپ نے اس کی دولت حشمت، اخلاق و کردار اور حسب نسب سب کچھ بتائے اور آخر میں فرمایا کہ ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عیب بھی ہے کہ وہ یہودی ہے اس پہ وہ بہت بگڑا اور غصہ دکھاتے ہوئے کہنے لگا تم عجیب مسلمان ہو کہ مسلمان کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ اپنی لڑکی یہودی کو دیدے تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ مسلمان لڑکی یہودی سے کیسے بیاہی جا سکتی ہے اس پہ امام صاحب نے بڑی رسانیت سے کہا خواجہ اتنے گرم کیوں ہوتے ہو، تم تو امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہو میں نے سوچا کہ جب ایک نبی کی لڑکی کافر کو دی جا سکتی ہے تو ایک حروری کی لڑکی ایک یہودی کو مل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ سنتے ہی حروری کی تو سٹی گم ہو گئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد امام صاحب کے قدموں پر گر پڑا اور اپنے مذہب سے تائب ہو گیا۔

اوپر کی ہدہد والی روایت میں عیاشی کئی غلطیوں کا شکار ہوا۔

اول تو یہ کہ سائل امام صاحب نہیں بلکہ ایک خارجی تھا اور سوال ابو عبداللہ سے نہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تھا۔ اور روایت بھی صرف اسی قدر ہے کہ۔ قَالَ نَجْدَةُ الْحَرُوْرِیُّ لِاِبْنِ عَبَّاسٍ اِنَّكَ تَقُوْلُ اِنَّ الْهُدْهُدَ اِذَا اَبْصَرَ الْاَرْضَ عَرَفَ مَسَاحَةَ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْمَاءِ وَهُوَ لَا يُبْصِرُ شَعْرَةَ الْفَخِّ فَقَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ اِذَا جَاءَ الْقَضَاءُ غَشِيَ الْبَصَرُ (نجدہ حروری نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ ہدہد جب زمین دیکھتا ہے تو اس فاصلہ کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ جو اس کے اور پانی کے درمیان ہے تو پھر وہ پھندہ کا بال کیوں نہیں دیکھ پاتا اس پہ ابن عباسؓ نے فرمایا جب قضا آتی ہے تو آنکھ بند ہو جاتی ہے)۔

اسی طرح طبرسی نے (کتاب) احتجاج میں ایک روایت لکھی ہے وہ بھی اس طرح گڑبڑ سے پڑھے اور وہ یہ ہے۔ اَنَّهُ دَخَلَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ الْمَدِيْنَةَ وَمَعَهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُسْلِمَةَ فَقَالَ لَهُ يَا اَبَا حَنِيْفَةَ اِنَّ هٰهُنَا جَعْفَرَ بْنَ مُحَمَّدٍ مِنْ عُلَمَاءِ آلِ مُحَمَّدٍ فَاذْهَبْ بِنَا نَقْتَبِسْ مِنْهُ عِلْمًا فَلَمَّا اَتَيَا اِذَا هُمَا بِجَمَاعَةٍ مِنْ شِيْعَتِهٖ يَنْتَظِرُوْنَ خُرُوْجَهُ فَبَيْنَاهُمْ كَذٰلِكَ اِذْ خَرَجَ غُلَامٌ حَدَثٌ فَقَامَ النَّاسُ هَيْبَةً لَهُ فَقَالَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ لِاِبْنِ مُسْلِمَةَ مَنْ هٰذَا الْغُلَامُ فَقَالَ هٰذَا اِبْنُهُ مُوْسٰى لَاُجَبِّهَنَّهُ بَيْنَ يَدَيْ شِيْعَتِهٖ قَالَ مَهْ لَا تَقْدِرُ عَلٰى ذٰلِكَ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّهُ ثُمَّ الْتَفَتَ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ يَا غُلَامُ اَيْنَ يَضَعُ الرَّجُلُ حَاجَتَهُ فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذِهٖ فَقَالَ يَتَوَارٰى خَلْفَ الْجِدَارِ وَيَتَوَقّٰى عَيْنَ الْجَارِ وَشُطُوْطَ الْاَنْهَارِ وَمَسَاقِطَ الثِّمَارِ وَلَا يَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرُهَا فَحِيْنَئِذٍ يَضَعُ حَيْثُ شَاءَ (امام ابو حنیفہ عبداللہ بن مسلمہ کی معیت میں مدینہ منورہ پہنچے ابن مسلمہ نے آپ سے کہا آئیے جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں چلیں جو آل محمد کے علماء میں سے ہیں اور ان سے کچھ اکتساب فیض کریں۔ جب دونوں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ شیعوں کی ایک جماعت ان کے انتظار میں وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ ابھی انتظار ہو ہی رہا تھا کہ ایک نوعمر صاحبزادے اندر سے باہر آئے تو سب احتراماً

کھڑے ہوں گئے۔ امام صاحب نے ابن مسلمہ سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں انہوں نے کہا کہ یہ موسیٰ حضرت جعفرؓ کے بیٹے ہیں، امام صاحب کہنے لگے میں شیعوں کے سامنے ہی ان کی پیشانی پر بوسہ دوں گا ابن مسلمہ نے کہا تم ایسا نہیں کر سکتے۔ امام صاحب نے کہا واللہ میں ضرور ایسا کروں گا۔

پھر امام صاحب نے موسیٰ سے مخاطب ہو کر پوچھا میاں صاحبزادے تمہارے اس شہر میں آدمی تقضائے حاجت کہاں کرے؟ موسیٰ بولے۔ دیواروں کی آڑ میں، پڑوسی کی نظر سے بچے نہروں کے کنارے پر نہ کرے، میووں کے چھلکنے کی جگہ نہ کرے اور قبلہ کی طرف نہ منہ کرے نہ پشت ان باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جہاں چاہے فارغ ہولے)۔

یہ روایت بھی کسی متعصب شیعہ کی گھڑنت اور ان کے گھڑے ہوئے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ۔ اس میں صحیح اسی قدر ہے جو دوسرے شیعوں نے روایت کی ہے یا اہل سنت بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے۔

لَمَّا دَخَلَ اَبُوحَنِیْفَةَ الْمَدِیْنَةَ زَارَ قَبْرَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَتٰی اِلٰی دَارِ الصَّادِقِ فَجَلَسَ یَنْتَظِرُ خُرُوْجَهٗ فَخَرَجَ ابْنُهٗ مُوْسٰی وَهُوَ صَغِیْرٌ فَقَامَ وَوَقَّرَهٗ ثُمَّ قَالَ اَیْنَ یَضَعُ الْغَرِیْبُ حَاجَتَهٗ فِیْ بَلَدِكُمْ فَاَجَابَ بِمَا ذُكِرَ سَابِقًا فَقَالَ اَبُوحَنِیْفَةَ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مدینۃ النبی پہنچے تو پہلے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ پر حاضری دی پھر حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر حاضر ہوئے اور ان کے انتظار میں وہاں بیٹھے کہ اتنے میں ان کے کمسن بیٹے موسیٰ باہر آئے امام صاحب نے یہ آیت پڑھی اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ رسالت کس کو بخشے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے بچے سے سوال اہل بیت کے بچوں کی ذکاوت و تیزی فہم سے متاثر ہو کر اظہار تعجب کے طور پر کیا تھا۔ اور یہ بات اس زمانہ ہی میں نہیں آج کل بھی ہے کہ بچوں کی ذکاوت و ذہانت سے حیرت زدہ ہو کر بطور امتحان اس قسم کے سوالات کر ہی لیتے ہیں

اور مقصد یا تو اس خاندان سے اظہار عقیدت ہوتا ہے یا دوسروں پر اس خاندان کی بلند مرتبیت واضح کرنا الزام وطعن کا تو ایسے موقعہ پر سوال ہی نہیں۔

تراسیواں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) جنکی خلافت کے اہل سنت قائل ہیں۔ خود اپنی خلافت میں متردد تھے بر خلاف امیر المومنین (رضی اللہ عنہ) کے کہ ان کو شک و تردد کے بجائے پورا یقین و وثوق تھا اور ظاہر ہے یقین کی اتباع شک و تردد کی اتباع سے زیادہ بہتر ہے۔

اور خلیفہ اول کے شک و تردد ثابت کرنے کے لیئے یہ روایت گھڑی کہ عین وفات کے وقت آپ نے یہ الفاظ فرمائے یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم هَلْ لِلْاَنْصَارِ فِیْ هٰذَا الْاَمْرِ شَیْئٌ (کاش میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھ لیتا کہ کیا اس خلافت میں انصار کا بھی کوئی حق ہے۔)

اور جب یہ گھڑت شیعوں کے ہاتھ لگی تو بڑا اچھلا کودا اور بڑی ڈینگ مارنے لگا اور بزعم خود یہ سمجھ بیٹھا کہ ایسی دلیل ہاتھ لگی ہے کہ اس سے اہل سنت کا ناطقہ بند کیا جا سکتا ہے۔ اور اب تو مناظرہ کی بازی اپنے ہاتھ آگئی (اور شیعوں کو یہ واقعی حق حاصل ہے کہ وہ افتراء، بہتان اور جعل سازی پر جتنی چاہیں بغلیں بجائیں کہ یہ تو ان کے مذہب کی بنیاد ہی ہے مگر چونکہ اہل سنت کے نزدیک یہ دلیل بے اصل اور من گھڑت ہے۔ اس لیئے وہ اس کے من گھڑت

ہونے کی تشریح یوں کرتے ہیں۔)
کہ اگر خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) کو انصار کے معاملہ میں کچھ تردد تھا تو وہ خود ایک مہاجر یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں حکم خلافت کیوں صادر فرماتے، اور اگر انصار کو خلافت نہیں دی تھی تو کم از کم ان کو کسی نوع امور خلافت ہی میں شریک کر دیتے،

اور بفرض محال یہ روایت صحیح بھی مان لی جائے تو پھر ان الفاظ کا مقصد یہ تھا کہ کاش حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے انصار کی موجودگی میں یہ سوال کر لیتا تاکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جواب باثواب کو یہ حضرات اپنے کانوں سے سن لیتے اور آج اس معاملہ میں مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔

اور پھر یہ کلام اگر خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا ہی مان لیا جائے تو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو ثالث مقرر کرنے کے معاملہ سے تو بڑھ کر نہیں۔

کیونکہ خارجی فرقہ تو پیدا ہی اس وجہ سے ہوا۔ اور وہ اسی وجہ سے بد عقیدہ ہو کر آپ کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے یہی تو اعتراض کیا کہ "اگر اس شخص (امیر المومنین رضی اللہ عنہ) کو اپنے برحق ہونے کا یقین ہوتا تو پنچایت کیوں بلاتے لہٰذا معلوم ہوا کہ بغیر حکم صریح اور بلا استحقاق اس اہم کام کا دعویٰ کیا اور جب کچھ بس نہ چلتا دیکھا تو صلح پر رضامندی ظاہر کی اور معاملہ مشورہ پر چھوڑ دیا۔"

دوسری بات یہ کہ خلیفہ اول کے زمانہ سے لے کر آج تک سوائے ان جھوٹے رافضیوں کے کسی نے بھی یہ روایت نقل نہیں کی۔ اس کے مقابلہ میں تحکیم کا معاملہ تو ایسا طشت ازبام ہوا ہے کہ کوئی لاکھ کوشش کرے اس کو چھپا نہیں سکتا پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے اس قول پر کوئی خلفشار اور انتشار پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد اور صورت حال کا علم ہو جانے سے خود انصار رضی اللہ عنہم معاملہ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ بخلاف معاملہ تحکیم (ثالثی) کے کہ اس کے بعد جو فساد برپا ہوا اور ایسا برپا ہوا کہ اہل بیت کے خاندان سے خلافت ہی نکل گئی اور پھر کسی نے بھی ان کو خلافت میں دخیل نہ ہونے دیا۔ اور انہوں نے اپنے طرز عمل کی بنیاد اسی دلیل کو بنایا کہ خاندان اہل بیت کا خلافت میں کوئی حق ہوتا تو وہ امر خلافت کو ثالثوں کے سپرد نہ کرتے اور امیر المومنین پنچایت نہ بلاتے نہ اس پر راضی ہوتے یہی وجہ تھی کہ حروری ان سے ناراض ہوئے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ نواصب اور مروانیوں کا جھنڈا بلاد اسلامیہ پر لہرایا اور ان کی امارت کو مستحکم بنانے کے لئے عام مسلمانوں نے بھی کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔

چوراسی واں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت عروج کی اس حد کو پہنچ گئی کہ لوگ ان کی الوہیت کے قائل ہو گئے، لیکن خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کو یہ عروج یہ قدر منزلت حاصل نہ ہو سکی لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر سہ خلفاء رضوان اللہ علیہم سے افضل اور امامت و خلافت کے زیادہ حقدار ثابت ہو گئے۔ اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خرق عادات امور اور معجزات ظاہر ہوئے جو بتاتے ہیں کہ آپ ہی امامت و خلافت کے حقدار ہیں، خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے ایسی کوئی بات ظاہر نہ ہوئی۔

شیعوں کا یہ بیان عیسائیوں کے خیالات کا چربہ (یا ان کا اگلا ہوا نوالہ ہے) کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت

مسیح علیہ السلام کے ساتھ لوگوں میں جو بلند اعتقادی ہے۔ وہ پیغمبر آخرالزمان صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں اور نہ خوارق عادات امور مثلاً مردوں کو زندہ کرنا مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو بینا اچھا کر دینا۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے تو ان کا صدور بار بار اور پے در پے ہوا مگر پیغمبر آخرالزماں سے ایسی کوئی بات صادر نہیں ہوئی اگر آپ سے کبھی کبھار دو چار معجزے صادر بھی ہوئے تو وہ شہرت و تواتر کی حد تک نہ پہنچے اس لئے ان وجوہ کی بنا پر پیغمبر آخرالزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتباع کے زیادہ حق دار ہیں۔

معلوم نہیں عقل کا جنازہ نکل گیا ہے یا لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اگر لوگوں نے خلاف واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو الوہیت کی مسند پہ بٹھا دیا ہے تو کیا جاہلوں کی اس گندی عقیدت ہی کی بنا پہ واقعی ان حضرات میں فضیلت و بزرگی کا پھندنا لگ گیا ہے۔ کیا عرب کے ان گھڑ لوگوں نے لات و منات اور عزیٰ کو مسند الوہیت نہ بخشی؟ تو گیا ان گھڑ لوگوں کے گھڑے ہوئے پتھروں میں فضیلت و بزرگی پیدا ہو گئی پھر ان ہی گندہ ناتراش جاہلوں نے یا ان کے اخلاف نے عبداللہ بن سبا یہودی کے بہکانے میں آ کر اور اپنی عقل و دانشمندی کو اس کے ہاتھ گروی رکھ کر جناب امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا اعتقاد رکھا منہ سے نکالا کتابوں میں اچھالا تو کیا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی بزرگی میں اس نے کچھ اضافہ کیا؟ اگر بزرگی اور فضیلت کا مدار جہلانے زمانہ اور عوام کالانعام پر ہی ہے تو ہمارے دیار میں تو پھر شیخ سدو وغیرہ فضیلت میں ان حضرات سے بازی لے جائیں گے العیاذ باللہ وانا للہ وانا الیہ راجعون!

اور زیادہ ماتم تو شیعہ علما کی عقلوں کا ہے کہ وہ ایسے لچر عقیدوں کو مطالب اصولیہ کے ثبوت میں دلیل بتاتے ہیں چنانچہ ان کے ہی ایک عالم نے ایک شعر کہا ہے اور حسب عادت ورواج اس کا رشتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جوڑ دیا ہے وہ کہتا ہے۔

كَفٰى فِي فَضْلِ مَوْلَانَا عَلِيٍّ ۔۔۔ وُقُوعُ الشَّكِّ فِيْهِ اَنَّهُ اللّٰهُ

ہمارے آقا علیؓ کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ ان کی ذات میں خدا ہونے کا شک ہو گیا۔

وَمَاتَ الشَّافِعِيُّ وَلَيْسَ يَدْرِي ۔۔۔ عَلِيٌّ رَبُّهٗ اَمْ رَبُّهُ اللّٰهُ

شافعی مرتے مر گئے مگر یہ نہ جان سکے کہ ان کا رب علی ہے یا اللہ۔

رہا معجزات کا کثرت سے صادر ہونا تو یہ بھی شیعوں کے نزدیک وجہ فضیلت نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ان ہی کے عقیدہ کے مطابق حضرت مہدیؑ سے اتنے کثیر معجزات کا صدور ہونے والا ہے کہ ان کے بزرگ اجداد سے بھی صادر نہ ہوئے ہوں گے تو اگر معجزوں کی کثرت کو وجہ فضیلت قرار دیں تو حضرت مہدی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فضیلت و بزرگی میں بڑھ جائیں گے۔ اور یہ بات سنیوں کے نزدیک بھی باطل ہے اور شیعوں کے نزدیک بھی۔

اور زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ اثنا عشری جو غلاۃ کے اعتقاد سے امکانی برأت اور کنارہ کشی کرتے ہیں اس قسم کی باتوں کی طرف دل ان کا بھی جھکتا ہے ان میں سے بعض صاف الوصیت یا حلول کے عقیدہ سے گھبرا کر سرخفی کے اعتقاد کی چادر میں چھپ گئے ہیں۔ اور کہتے ہیں جو بھی مخفی بھید کھولے گا اس کا خون معاف ہے ان کے بعض شعرا نے اس مضمون کو شعروں میں ادا کیا ہے۔

لا تحسبوني هويت الطهر حيدرة　　لعلمه وعلاه من ذوي النسب

یہ نہ سمجھو کہ میں نے حیدر سے بلندیٔ علم یا نسبی برتری کی وجہ سے محبت کی۔

ولا شجاعته في كل معركة　　ولا التلذذ في الجنات من اربي

نہ اس وجہ سے کہ ہر معرکہ میں داد شجاعت دی۔ اور نہ جنت کی ابدی لذتوں کے حصول کے لئے۔

ولا التبري من نار الجحيم ولا　　نجوته من عذاب النار يشفع بي

اور نہ دوزخ سے چھٹکارا پانے کے لالچ میں نہ اس امید میں کہ دوزخ کے عذاب سے بچانے کے لئے میری شفاعت کریں گے۔

لكن عرفت هو السر الخفي فان　　اذعته حللوا قتلي والدم بي

لیکن میں نے انہیں پہچان لیا ہے کہ وہ سر مخفی ہیں اگر میں اسے فاش کر دوں تو میرا خون معاف اور میں سزا کا مستحق ہو جاؤں گا۔

يمنعهم عنه داء لا دواء له　　كالماء يعرض عنه صاحب الكلب

لوگوں کو ان کی حقیقت جان لینے سے وہ بیماری روکتی ہے جس کی کوئی دوا نہیں (یعنی جہان، جس طرح کتے کا کاٹا پانی سے بھاگتا ہے۔)

ان کے بعض علماء اپنے دعوئ افضلیت کی تائید میں یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے کندھے پہ ان کا پاؤں رکھا۔ پورا قصہ یوں نقل کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کعبے میں داخل ہوئے تو کعبہ کو بتوں سے بھرا ہوا پایا آپ نے سب کو گرا گرا کر توڑ ڈالا ایک بت کسی اونچی جگہ پر رکھا ہوا تھا کہ وہاں تک آپ کا دست مبارک نہ پہنچ سکا حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ میرے کندھے پہ پاؤں رکھ کر چڑھ جاؤ اور اس بت کو توڑ دو۔ امیر المومنین نے بہ پاس ادب عرض کیا یا رسول آپ میرے شانے پر چڑھ جائیں اور پھر وہ بت توڑ دیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بار نبوت کے برداشت کی تاب نہ لاسکو گے" اب اس واقعہ سے بات کھل کہ امیر المومنین حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کندھے پہ کیوں چڑھے تھے اور اس میں سر مخفی کیا ہے۔

اس کے مقابلہ میں یہ قصہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ ہجرت کی شب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی پشت پہ اٹھا کر پنجوں کے بل کئی کوس تک گئے پورا پاؤں ٹیکنے سے اس خدشہ کے پیش نظر احتراز کیا کہ کہیں دشمن کھوج نہ لگالیں اس سے ایک بات بڑی واضح طور پہ ثابت ہو گئی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بار نبوت برداشت کرنے کی غایت درجہ لیاقت تھی۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک پہ چڑھنے کا قصہ اگرچہ زبان زد خلق ہے پھر بھی اس نوعیت سے یہ قصہ صرف شیعہ روایات میں ملتا ہے اہل سنت کی کتب صحاح میں اس کا سراغ نہیں ملتا اس لئے اس سے اہل سنت کو الزام دینا بھی صحیح نہ ہوگا۔ کتب صحاح میں یہ واقعہ اس طرح ملتا ہے۔

انه صلى الله عليه وسلم دخل الكعبة يوم الفتح وحول البيت ثلاثمائة وستون نصبا فجعل يطعنها بعود في يده ويقول جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا فكانت تسقط باشارة يده

د فتح کے دن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہیں پس آپ اس چھڑی سے جو آپ کے ہاتھ میں تھی ان کو کچوکے لگاتے اور فرماتے ۔

حق آیا اور باطل مٹ گیا باطل تو بے شک مٹنے ہی والا ہے۔ لہٰذا وہ بت آپ کے اشارے کے ساتھ ہی گرتے جاتے ۔

ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ بت تو آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے اشارہ ہی سے گرتے جارہے تھے اس میں کاندھے پہ چڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی ممکن ہے یہ واقعہ کعبے کے اردگرد نصب کئے ہوئے بتوں کا ہو اور اندرون کعبہ کے بتوں کو کسی دوسرے وقت پچھلی روایت میں مذکورہ صورت کے مطابق توڑا ہو۔ بہر حال اہل سنت کی صحیح کتب میں تو روایت اسی قدر ہے۔ کہ وہ تصویریں جو کعبے کی دیواروں پہ بنی ہوئی تھیں آپ نے ان کو پانی سے دھو یا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما، زمزم کا پانی لارہے تھے اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے ان تصویروں کو دھو دھو کر مٹارہے تھے۔ جب مجسموں کی باری آئی تو آپ کے حکم سے وہ باہر نکالے گئے انہیں مجسموں میں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے ان کے ہاتھوں میں فال دیکھنے کے پانسے تھمائے ہوئے تھے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کافروں پر لعنت کرے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان بزرگوں نے یہ کام نہیں کیا پھر بھی ناحق ان کے ہاتھوں میں یہ قرعے دیدئے ۔

پچاسیواں دھوکہ: شیعہ اہل سنت پر طعن کرتے ہیں کہ وہ ائمہ اربعہ، ابو حنیفہ، شافعی مالک اور احمد رحمہم اللہ کا مذہب تو اختیار کرتے ہیں۔ مگر ائمہ اہل بیت کا مذہب اختیار نہیں کرتے۔ حالانکہ وجوہ ذیل سے ائمہ اہل بیت اتباع کے زیادہ حقدار ہیں ۔

(۱) وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لخت جگر ہیں رسول اللہ کے گھر میں پرورش پائے ہوئے ہیں آئین شریعت بچپن ہی سے یاد کئے ہوئے ہیں اور صاحب البیت أدری بما فیہ کے مصداق گھر کے یہ افراد گھر کے اندرونی حالت سے زیادہ واقف ہیں ۔

(۲) صحیح حدیث میں جو اہل سنت کے نزدیک بھی معتبر ہے انکی اتباع کا حکم آیا ہے جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي (میں تم میں دو ایسی قابل اعتماد چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اگر تم ان سے وابستہ رہے تو میرے بعد گمراہ نہ ہوگے ایک اللہ کی کتاب دوسرے میرے اہل بیت)

اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے۔ مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَى وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ (تم میں میرے اہل بیت کی حیثیت نوح علیہ السلام کی کشتی کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا بچ گیا اور جو اس سے پھڑ گیا غرق ہوا۔)

(۳) ائمہ اہل بیت کی بزرگی، عبادت ان کا تقویٰ اور زہد و علم شیعہ وسنی ہر دو فریق کو تسلیم ہے بخلاف دوسروں کے اور ظاہر ہے کہ جن کی بزرگی پر اتفاق ہو وہی اتباع کے زیادہ حق دار ہیں نہ کہ دوسرے "

اس مکر اور کید کا جواب یہ ہے کہ امام دراصل نبی کا نائب ہوتا ہے اور نبی صاحب شریعت ہوتا ہے نہ کہ

صاحب مذہب: اس لئے کہ مذہب اس راستہ کا نام ہے جو امت ہی سے بعض ہی کے لئے کشادہ ہوتا ہے پھر وہ چند مقررہ قواعد واصول کے ذریعہ شریعت کے مسائل کا استخراج کرتے ہیں چنانچہ مذہب میں خطا و ثواب دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ جبکہ امام خطا سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور نبی کا حکم رکھتا ہے عقل کا تقاضا نہیں کہ اس کی طرف مذہب کی نسبت کر دیں۔

اسی طرح مذہب کی نسبت خدا تعالیٰ، حضرت جبرئیل اور فرشتوں کی طرف کرنا بھی بے عقلی کی دلیل ہے اور اہل سنت کے فقہا صحابہ کی طرف بھی مذہب کی نسبت کر کے ان کو بھی صاحب مذہب نہیں کہتے باوجودیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو امام ابوحنیفہ و امام شافعی وغیرہ سے افضل واعلیٰ مانتے ہیں۔

بلکہ صحابہ کرام کے اقوال وافعال کو فقہ کی اصل اور احکام شرعیہ کی دلیل شمار کرتے ہیں اور خود ان کو امت تک علم کے پہنچنے کا غیبی ذریعہ اور وسیلہ۔

اور فقہاء امت کی اتباع عین ائمہ ہی کی اتباع ہے اس لئے کہ انہوں نے فقہ مذہب اور قواعد ان حضرات ائمہ ہی سے تو سیکھے ہیں وہ اپنی شاگردگی کی نسبت انہیں سے قائم کرتے ہیں۔ پس اہل سنت تو ان ائمہ کی اتباع کو ہی مقصود نظر سمجھتے ہیں مگر مذہب کی نسبت انکی طرف نہیں کرتے۔

اور شیعوں کے حالات وواقعات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی براہ راست ائمہ کی اتباع نہیں کرتے یہ بھی ان واسطوں کی پیروی کرتے ہیں۔ جو خود کو ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور انہیں سے علم حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے متبوعین اہل سنت اصل عقائد میں ائمہ کی ہرگز مخالفت نہیں کرتے ان کے متعلق ائمہ کی بشارتیں اور خوشنودی مزاج کی سندیں موجود ہیں۔

بخلاف متبوعین شیعہ کے۔ مثلاً ہشامین، احول طاق ابن اعین اور ان کے مثل کہ انہوں نے بنیادی عقائد میں ائمہ کے خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور اس کے اعضا ہونیکے قائل ہوئے ائمہ کرام نے ان سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور ان کے عقائد باطل ہونے پر شہادت دی ان کو دروغ گو اور افتراد پرداز بتایا چنانچہ یہ سب مباحث کتاب ہذا کے باب سوم وچہارم میں شیعوں کی معتبر کتابوں کے حوالوں کے ساتھ انشاء اللہ بیان کئے جائیں گے۔

درحقیقت امام کا منصب یہ ہے کہ عالم کی اصلاح کرے رفع شر اور دفع فساد کرے جس فن میں کمی دیکھے اس کی تکمیل کرے اور جو معاملہ ٹھیک چل رہا ہو اسے اس کے حال پر چھوڑ دے تاکہ تحصیل حاصل نہ لازم آئے۔ پس ائمہ نے اپنے منصب سے زیادہ مناسب اور اہم طریق سلوک وطریقت کو خیال کر کے اپنی پوری توجہ ادھر ہی مبذول رکھی اور امور شرعیہ کو اپنے بزرگ دوستوں۔ برگزیدہ مصاحبوں اور لائق ترین شاگردوں کے سپرد کیا اور خود انہوں نے عبادت، ریاضت، تربیت باطن تعیین اذکار اوراد نمازوں اور دعاؤں کی تعلیم تہذیب اخلاق طالبین سلوک کو اس کے فوائد سے آگاہ و مطلع کرنا ہے اور کلام اللہ وکلام رسول سے حقائق و معارف اخذ کر کے ارشاد فرمانا اپنا خاص مشغلہ بنایا ان مشاغل مبارکہ کے لئے خلوت وگوشہ نشینی لازم ہے اس لئے یہ بزرگ حضرات استنباط احکام و اجتہاد مسائل کی طرف توجہ مبذول نہ رکھ سکے۔

یہی سبب ہے کہ علم طریقت کے دقائق نکات اسرار اور بھید زیادہ تر انہی بزرگوں سے منقول ہیں اور اہل سنت اس وجہ سے ولایت کے تمام سلاسل انہی بلند ہستیوں پر ختم کرتے ہیں حدیث ثقلین بھی ان کی اسی حیثیت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ ظاہر شریعت کی تعلیم کے لئے کتاب اللہ کافی ہے اور علم لغت و اصول جو وضع اور عقل سے تعلق رکھتے ہیں فہم شریعت میں مدد پہنچانے کے لئے بہت ہیں ان میں امام کی کیا حاجت؟

البتہ امام کی ضرورت سلوک و طریقت کے ان دقائق میں محسوس ہوتی ہے جو بظاہر کتاب اللہ سے سمجھے نہیں جاتے اور ائمہ نے بھی یہی راز معلوم کر کے اپنی توجہ اسی ضروری امر کی طرف مبذول رکھی اور شریعت کا صرف اجمالی بیان فرمایا علم و عقل کو مجتہدین پر چھوڑا۔ چنانچہ شیعہ و سنی دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی امام نے تصنیف و تالیف کا کام نہیں کیا نہ اصول نکالے نہ اصولوں سے فروع نہ کوئی کتاب لکھی نہ کوئی فن مرتب کیا کہ اس پر کفایت کی جاتی بلکہ مسائل و احکام کی روایات ائمہ کے دوستوں اور شاگردوں میں مشہور و معروف ہوئیں اور مسائل جزئیہ میں قواعد استنباط معرض خفا میں رہے تو لامحالہ اب ایسے شخص کی ضرورت ہوئی جو ان تمام روایات کو جمع کرے قواعد کی چھان بین کر کے ان کو علیحدہ کرے اور اس طرح اصول اجتہاد کی بنیاد ڈالے،

اس بحث سے معلوم ہوا کہ جس طرح مذہب کی نسبت کسی خاص امام کی طرف نہیں کی جا سکتی اسی طرح امام کا اتباع بھی بلا واسطہ مجتہد کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

گویا پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا مقلد کے لئے اتباع مجتہد کو واسطہ بنائے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اور شیعہ حضرات ہر چند ائمہ کے اتباع کا دعوی کرتے ہیں لیکن ان مسائل میں کہ ائمہ سے ان کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی اپنے علمائے مجتہدین ہی کی طرف جھکتے ہیں مثلاً ابن عقیل عضائری، سید مرتضی اور شیخ شہید اور پھر ان کے افعال پر فتاوی صادر کرتے ہیں جو ائمہ کے راویان کی صحیح روایات سے ٹکراتے ہیں۔ اس قسم کے مسائل میں سے کچھ تھوڑے سے مسائل بطور نمونہ باب فروع میں انشاء اللہ حوالہ قلم ہوں گے۔

تو اب اگر خود شیعوں کے نزدیک ایسے مجتہد کی بھی تقلید جائز ہے جس کے اقوال ائمہ کی بعض روایات کے مخالف ہوں اور یہ تقلید مجتہد ائمہ کی اتباع سے مانع نہیں تو اہل سنت کی اتباع امام ابو حنیفہ و شافعی وغیرہ کیوں قابل اعتراض سمجھی جائے۔

یہ ضرور ہے کہ ان مجتہدین کے بعد اقوال ائمہ کی بعض روایات کے مخالف ہیں مگر یہ مخالفت نہ نقصان دہ ہے اور نہ ائمہ کی اتباع اس سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ اصول و قواعد میں یہ مجتہدین ائمہ کے ساتھ متفق ہیں۔

جیسا کہ امام محمد بن حسن شیبانی اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما دونوں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہوئے بعض مسائل میں ان کے خلاف گئے ہیں۔ اور تمام مذاہب میں ایسا ہوا ہے کہ امام مجتہد کی رائے سے ان کے شاگردوں نے اختلاف کیا ہے۔

اور ابن الاثیر جزری مصنف جامع الاصول نے امام علی بن موسی الرضا کو جو امامیہ مذہب کا مجدد صدی سوم کا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امامیہ اپنے موجودہ مذہب کا سلسلہ سند ان تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح اس مذہب کی ابتداء ان ہی سے جانتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ تابعین میں حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ اور صحابہ میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ

عنہ مذہب حنفی کے بانی مبانی تھے۔ یا نافع و زہری رحمہما اللہ تابعین میں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ صحابہ میں مذہب مالکیہ کے بانی مبانی ہیں۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ابن الاثیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ امامیہ کے گمان اور عقیدہ کے مطابق لکھا ہے نہ کہ فی الواقعہ ایسا ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کے مجددوں کو اس نے اہل مذہب ہی کے اعتقاد کے مطابق نامزد کیا ہے۔

چھپاسیواں دھوکہ: اہل سنت کی کتابوں سے چھانٹ چھانٹ کر ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن سے صحابہ کرام علیہم کی شان ارفع و اعلیٰ میں بدگمانی کا وہم پیدا کریں، اور ان روایات کو اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ خلافت کے مستحق نہ تھے۔"

وہ اپنے خیال میں اس مکر و کید کو بڑی اہمیت دیتے اور تمام کیدوں کا سرتاج سمجھتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی ان چالوں اور دھوکوں نے بہت سوں کو راہ ہدایت سے بھٹکا دیا۔

ان تمام اخباروں و روایات کی تفصیلی بحث تو باب مطاعن میں انشاء اللہ آئیگی اور وہاں معلوم ہوگا کہ ان روایات سے نہ ان کی مطلب برآری ہوتی ہے اور نہ ان کی غرض پوری ہوتی ہے۔ البتہ یہاں مقام کی مناسبت سے ان کے اس دھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اہلسنت کو الزام دینا ہی ہے تو انصاف سے تو کام لو، اور اسکی صورت یہ ہے کہ اہل سنت کی تمام صحیح روایات کا اعتبار کرو جو مناقب و بدائع خلفا و صحابہ کرام میں اہل سنت کے نزدیک بطریق تواتر منقول ہیں اور پھر دونوں قسم کی روایات کو پیش نظر رکھ کر دیکھو ان میں باہم تعارض ہو تو علم اصول میں تعارض دور کرنے کی جو وجوہ مقرر کی گئیں ان کے مطابق تعارض دور کرنے کی کوشش کرو۔ یعنی اکثر کو اقل پر، اظہر کو اخفیٰ پر اور اس راوی کو جو عمل و اعتقاد کے موافق ہو اس کے خلاف پر قابل ترجیح جانیں۔

اب اس جمع کرنے، چھان بین کرنے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے اور ان میں حق و ثواب معلوم کرنے کے بعد جو نتیجہ نکلے گا وہ عین اہل سنت کا مذہب ہوگا۔

یہ حرکت خلاف انصاف ہوگی کہ الزام دینے والی روایات کو یا گھڑی ہوئی اور ضعیف کو عام روایات کے خلاف صرف آحاد (تنہا) کی روایات کو، جو تاویل شدہ اور صحیح معنوں پر محمول ہوں نظر اعتبار سے گرا دینا اور ان روایات سے چشم پوشی کرنا جو متواتر اور قطعی الثبوت ہوں، جیسا کہ اس فرقہ کا معمول ہے۔

ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو قرآن مجید سے ایسے جملوں کو چھانٹتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی لغزش کا ثبوت دیتے ہیں جیسے وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ۔ یا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کے بارے میں سوال کرنا۔ یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو اپنا پروردگار کا کہنا اور بتوں کے توڑنے کی جھوٹی نسبت بڑے بت کی طرف کرنا اور خود کو جھوٹ موٹ کا بیمار ظاہر کرنا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کر دینا اور اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ کر بلا تحقیق و تامل کے کھینچنا، اور حضرت داؤد علیہ السلام کا اوریا کی بیوی کے معاملہ میں گناہ یا اور اسی قسم کی باتیں۔ اور پھر اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید میں ان انبیاء کی برائیاں قطعیت اور تواتر سے ثابت ہیں اس لئے یہ نبوت کے مستحق نہ تھے، بلکہ ان کو نیک جاننا فرمان خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور یہ بدتمیز اور عقل سے پیدل شخص اتنا نہیں سمجھتا اور اگر سمجھتا بھی ہے تو بدبختی کا پردہ اس کی عقل پر ایسا پڑا ہوا ہے کہ وہ ان

قطعی اور متواتر نصوص قرآنی کو دیکھنے سے عاجز ہے۔ جو جا بجا قرآن مجید میں آئی ہیں جو ان محترم حضرات کی تعریف اور ان کے حال اور نتیجے کی خیر و خوبی سے بھری ہوئی ہیں۔

اگر کسی تنبیہ، یا حکم میں دوسروں کی عبرت کے لئے یا ان بزرگوں کی تادیب و ارشاد کے لئے کوئی عتاب آمیز جملہ وارد ہوا ہے تو یہ ان کثیر، قطعی الثبوت نصوص کو باطل نہیں کر سکتا لامحالہ اس عتاب آمیز کلام کو کسی ایسے معنے پر محمول کریں گے

جو ان کی ارفع و اعلیٰ شان پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ جو قطعی طور پر ثابت ہے۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اگر کوئی چاہے کہ وہ متشابہ آیات جو اللہ تعالیٰ کی ذات میں جسمیت یا لوازم جسمیت ثابت کرتی ہیں اور جن میں چہرے سے کر پنڈلی تک کے اعضاء و اجزاء جسمانی کا اللہ تعالیٰ کے لئے ظاہر ہونا سمجھا جاتا ہے۔ ان آیات کو لے کر اللہ تعالیٰ کے حق میں نقص کا تصور کر کے یہ کہے کہ جو ذات ان عیوب سے متصف ہو خدا بننے کے لائق نہیں۔ تو اس قسم کے شبہات اور ہفوات کا ایک ہی جواب ہے کہ۔ حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ (ایک چیز کو بچانے کے لئے تو نے ساری چیزیں کھو دیں۔)

اور شیعوں کا یہ شبہ اس ملحد کے شبہ سے ملتا جلتا ہے جو نماز کے انکار میں آیت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ پیش کرتا ہے۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اسی آیت کو سباق و سباق کے ساتھ یا دوسری آیت دیکھ تو کہتا ہے کہ بابا سارے قرآن پر عمل کس نے کیا ہے۔ ایک دو کلموں پر ہی عمل ہو جائے تو غنیمت ہے۔

ستاسیواں دھوکہ: ان کے وہ علماء جن کو اپنی تاریخ دانی پر بڑا اعزہ ہوتا ہے، بناوٹی اور جھوٹی حکایتوں کو جنہیں تاریخ کذب صریح کہہ کر ردی میں ڈال دیتی ہے۔ اپنی بڑی معتبر کتابوں میں دھڑلے سے جگہ دیتے ہیں۔ اور کذب و بہتان کی اسی پوٹ سے اپنے اعتقادی مسائل ثابت کرتے ہیں۔

ان حکایات میں بلند درجہ وہ جھوٹی حکایت ہے جو ان کے سیرت نگاروں اور اخبار نویسوں نے گھڑی ہے اور ان کے علماء نے انہیں اخبار نویسوں پر اعتماد کر کے اور حسن ظن سے کام لے کر ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اس کی تصدیق کی ہے۔

اسی حکایت سے وہ انبیاء اولوالعزم علیہم السلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت ثابت کرتے ہیں۔ جو اس مسائل نبوت میں ہے اور شیعوں مذاہب یہودیت نصرانیت اور اسلام کے خلاف ہے

وہ روایت حلیمہ بنت ابی ذویب عبداللہ بن حرث سعدیہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلانے والی تھیں۔

یہ ایک دن کسے ہمراہ عراق میں حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس پہنچیں تو حجاج نے ان سے کہا حلیمہ اچھا ہوا تم خود ہی آگئیں میں تم کو پکڑ بلوانے والا تھا۔ تاکہ تم سے انتقام لوں وہ بولیں آخر اس خفگی کی وجہ کیا ہے وہ بولا میں نے سنا ہے کہ تو علی کو، ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہم پر فضیلت دیتی ہے یہ سنکر حلیمہ نے سر جھکا لیا اور بڑی دیر بعد سر اٹھا کر کہا اس اے حجاج میں اپنے امام کو خدا کی قسم نہ صرف ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) پر ترجیح دیتی ہوں کہ ان دونوں کی کیا حیثیت کہ آں جناب کے ساتھ ایک ترازو میں تل سکیں، میں تو آپ کو آدم نوح ابراہیم سلیمان موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) پر فضیلت دیتی ہوں۔

یہ سنکر حجاج آگ بگولہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ میں تو اس بات پہ نادم تھا۔ کہ تو اس شخص (رضی اللہ عنہ) کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دو صحابیوں (رضی اللہ عنہما) پہ ترجیح دیتی ہے اور اب تو نے بھرے منہ پہ تمام اولوالعزم پیغمبروں پر ترجیح دے کر اپنے جرم کو اور بھی سنگین اور میرے غصے کو اور بھی بھڑکا دیا ہے۔ اگر تو اپنے اس دعوے سے دست بردار نہ ہوئی تو میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ اور تجھے تماشائے عبرت بنا دوں گا۔ حلیمہ بولیں: اگر تیرا مقصد کیا ہے اگر مجھ پر ظلم ہی توڑنا چاہتا اور ناحق میرے خون سے ہاتھ رنگنا چاہتا ہے تو بہتر ہے، اور یہ لعنت اور اگر مجھ سے اس دعوے کی دلیل سننا چاہتا ہے تو میرا بیان غور سے سن۔ حجاج کہنے لگا، ہاں بتا کس دلیل سے تو آدم علیہ السلام پر علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دیتی ہے حالانکہ آدم کے خمیر کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ سے گوندھا۔ چالیس روز ان پہ رحمت نازل کی پھر ان کے جسم میں اپنی خاص روح پھونکی۔ ان کو اپنی جنت میں بسایا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ ان کو سجدہ کرو۔

حلیمہ نے کہا اس دلیل سے کہ آدم کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (کہ آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی پس بہکا) اور سورہ ھل اتیٰ میں طاعت و بندگی سے علی رضی اللہ عنہ کی تعریف فرمائی اور اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ میں بھی نماز و زکوٰۃ کے حوالہ کے ساتھ انکی مدح سرائی کی۔ پھر عہد آدم علیہ السلام سے اب تک کوئی ایسا نہیں گزرا جس نے عین نماز میں فقیر کو بطور صدقہ انگوٹھی دی ہو (بجز علیؓ کے)، حجاج بولا تو نے سچ کہا اچھا اب یہ بتا کہ تو نے نوح (علیہ السلام) پہ ان کو کس وجہ سے فضیلت دی؟ حلیمہ نے کہا یہ اس لئے کہ علیؓ کی زوجہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نساء عالمین کی سیدہ تھیں جن کا نکاح سدرۃ المنتہیٰ کے نیچے جبریل علیہ السلام کی سفارت اور ملائکہ کی شہادت و گواہی سے منعقد ہوا۔ بخلاف زوجہ نوح علیہ السلام کے وہ کافرہ و منافقہ تھیں چنانچہ نص قرآنی میں اس کا صاف ذکر ہے حجاج حلیمہ کی اس حاضر جوابی سے بہت متاثر و حیران ہوا اور حلیمہ کی بہت تعریف و ستائش کی۔

اس کے بعد پوچھا کہ اب یہ بتا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پہ علی (رضی اللہ عنہ) کو کس دلیل سے ترجیح دیتی ہو۔ وہ بولی کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کی رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (میرے رب مجھے دکھادے کہ آپ مردے کس طرح زندہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا ایمان نہیں لایا، کہا کیوں نہیں لیکن صرف اس لئے کہ میرا دل اطمینان حاصل کرلے)، بخلاف اس کے علی رضی اللہ عنہ نے برسر منبر فرمایا لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا اگر حجاب کا پردہ اٹھ بھی جائے تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا، پھر حلیمہ نے کہا ایک روز حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ اور مومنین و منافقین کی جماعتوں نے چاروں طرف سے آپ کے گرد حلقہ کیا ہوا تھا۔ تب میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا اے جماعت مومنین معراج کی رات میرے لئے ایک منبر رکھا گیا جس پر میں بیٹھا پھر میرے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اور اسی منبر پر مجھ سے ایک درجہ نیچے بیٹھ گئے دوسرے پیغمبران کرام بھی جوق در جوق آنے اور مجھے سلام کرنے لگے تا آنکہ میرے چچازاد بھائی (علی رضی اللہ عنہ) کو جنت کی اونٹنی پر سوار کرکے لایا گیا۔ ان کے ہاتھ میں لوائے حمد اور ان کے چاروں طرف ایسی مخلوق تھی جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے تھے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے پوچھا یہ جوان کونسا پیغمبر ہے میں نے کہا یہ پیغمبر نہیں بلکہ میرے چچازاد بھائی علی بن ابی طالب ہیں۔ پھر پوچھا ان کے اردگرد کون لوگ ہیں؟ میں نے جواب دیا یہ ان کے شیعہ اور

محبین ہیں تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا فرمائی اے اللہ مجھے بھی علی کے شیعوں میں سے کر، چنانچہ سورۂ صافات کی اس آیت کے یہی معنی ہیں۔

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرَاہِیْمَ اِذْ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (البتہ ابراہیم بھی ان کے شیعہ میں سے ہیں جب کہ آیا وہ اپنے رب کے پاس قلب سلیم کے پاس آیا۔

حجاج نے کہا تو نے یہ بھی ٹھیک کہا۔ اب یہ بتا کہ سلیمان (علیہ السلام) پر علی (رضی اللہ عنہ) کی فضیلت کی کیا وجہ ہے حلیمہ (رضی اللہ عنہا) نے کہا کہ سلیمان (علیہ السلام) نے بادشاہ اور دنیاوی جاہ و عزت کیلئے ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ (اے میرے رب مجھے اس شان کا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو بے شک عطا کرنے والا تو ہی ہے۔ بخلاف اس کے جناب علی (رضی اللہ عنہ) نے دنیا کو تین طلاقیں دیں اور کہا کہ اِلَیْکِ عَنِّیْ یَا دُنْیَا طَلَّقْتُکِ ثَلَاثًا لَا رَجْعَۃَ بَعْدَھَا حَبْلُکِ عَلٰی غَارِبِکِ غُرِّیْ غَیْرِیْ لَا حَاجَۃَ لِیْ فِیْکِ (اے دنیا مجھ سے پرے ہٹ میں نے تجھ کو تین طلاقیں دی جس میں رجوع بھی نہیں ہو سکتا تو جان تیرا کام جانے کسی اور کو جا کر بہکا مجھے تجھ سے کوئی سروکار نہیں) حجاج نے کہا یہ بھی تو نے ٹھیک کہا ہے اب یہ بتا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر کس دلیل سے علی (رضی اللہ عنہ) کو فضیلت ہے حلیمہ نے کہا کہ جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے بھاگے تو ہراساں اور ڈرے ہوئے تھے۔ بفرمان اللہ تعالیٰ فَخَرَجَ مِنْھَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ (پس وہ مصر سے ڈرے سہمے نکلے اور ادھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی رات جناب علی (رضی اللہ عنہ) آپ کے بستر پہ اطمینان کی نیند سو رہے تھے اگر ان پر خوف و ہراس ہوتا تو نیند حرام ہو جاتی حجاج نے کہا یہ بھی تو نے ٹھیک کہا۔ اب عیسیٰ علیہ السلام پہ وجہ فضیلت بتا بولی اس کی دلیل یہ ہے کہ مقام حساب میں جب عیسیٰ (علیہ السلام) کو کھڑا کیا جائے گا اور ان سے باز پرس ہو گی کہ کیا نصاریٰ نے تمہارے کہنے سے تمہاری عبادت کی اور تم نے ان کو آمادہ کیا تو وہ معذرت چاہنے اور توبہ کرنے پر مجبور ہوں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا۔ کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو خدا بنا لو) برخلاف اس کے سبائیہ نے جب امیر المومنین کو خدا کہا تو آپ بہت برافروختہ ہوئے اور ان کو جلا وطن کر دیا اور ایسی سزا دی کہ مشرق سے مغرب تک اس کا شہرہ ہو گیا اور خود امیر المومنین بری الذمہ ہو گئے۔ حجاج بولا تو نے سچ کہا۔ پھر ایک ہزار دینار اظہار خوشنودی کی خاطر ان کو دیئے اور مستقل سالانہ وظیفہ بھی مقرر کیا۔

اس کے بعد حلیمہ نے حجاج سے کہا کہ ایک دوسرا نکتہ بھی سن کہ جب مریم بنت عمران (علیہا السلام) کو دردزہ ہوا تو وہ بیت المقدس میں تھیں، ان کو حکم ہوا کہ فوراً جنگل میں جاؤ اور وہاں کسی خشک کھجور کے درخت کے نیچے عمل زچگی پورا کرو۔ تاکہ تمہارے نفاس کی گندگی سے بیت المقدس آلودہ نہ ہو۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ جو بنت اسد تھیں، کو دردزہ لاحق ہوا تو ان کو وحی الٰہی آئی کہ کعبے میں جا اور میرے گھر کو اس مبارک بچے کی پیدائش سے مشرف کر اب ذرا انصاف کر دان میں سے کونسا بچہ افضل ہے حجاج نے حلیمہ کے لئے دعائے خیر کی اور عزت و احترام کے ساتھ ان کو رخصت کیا"

آپ یقین کرلیں کہ پوری کہانی جھوٹوں کے سرداروں کی من گھڑت، بناوٹی افتراء اور جھوٹ کی پوٹ ہے اور اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ نے باتفاق مورخین خلفائے راشدین تک کا زمانہ نہیں پایا تو حجاج تک پہنچنے کا تو امکان ہی نہیں اگر وہ حجاج کے زمانہ تک زندہ ہوتیں تو ان کی عمر ایک سو چالیس سال ہونی چاہیئے تھی بلکہ مورخین کا اس میں ہی اختلاف ہے کہ حلیمہؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بعثت بھی پایا یا نہیں۔ اور وہ ایمان بھی لائی تھی یا نہیں۔

اس کے علاوہ حجاج؛ شرفاء، سادات اور خاندان اہل بیت کے وابستگان کے قتل ناحق اور خونریزی میں خصوصی طور پہ شہرہ آفاق تھا۔ اور نواصب کا ایک بدترین فرد تھا۔ امیرالمومنین اور آپ کی اولاد سے اس کی دشمنی تو زبان زد خلق تھی۔ چنانچہ اہل سنت کی ایک جماعت کو اسی وجہ سے اس نے شہید کیا پھر کسی کو اس کی مجال و تاب کب تھی کہ اس کی مجلس میں بن بلائے کوئی گھس جائے۔

اس کے مصاحبوں اور خدام میں سے بھی اگر کوئی اس کے سامنے جاتا تو جان و آبرو بچانے کی فکر میں لرزاں و ترساں رہتا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادم خاص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرام تک کی توہین و تذلیل سے باز نہ آیا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگان زمانہ کو مارڈالنے کے کیا کیا جتن نہ کئے اور کہاں کہاں ان کی تلاش نہ کرائی ان حالات میں یہ ممکن ہی کب تھا کہ حلیمہ ان کے پاس آتیں اور اس دھڑلے سے ان سے گفتگو کر پاتیں۔

اور پھر یہ راز بھی نہیں کھلتا کہ حلیمہ اس کے پاس آئی کیوں تھیں۔ حجاج نہ تو سخیوں میں سے تھا۔ نہ اس کے ہاں بخشش و داد و دہش کا سلسلہ تھا کہ کچھ لینے اور پالینے کی امید میں اپنی قوم بنی سعد کی فرودگاہ سے جو حجاز میں طائف کے حوالی میں تھی، عراق کے دور و دراز مقام پر چلی آتیں۔

اور یہ بات تو تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ اہل بیت کا اتنا کڑا دشمن یہ ساری باتیں سن کر بھی حلیمہ کو ایک ہزار دینار ہی نہیں دیگا بلکہ اس کا مستقل وظیفہ بھی مقرر کردے گا یہ بات تو اس کے عقیدہ اور سرشت کے سراسر خلاف تھی اور پھر سارے ہی مورخ خواہ سنی ہوں یا شیعہ اس پر متفق ہیں کہ حجاج مرتے دم تک اپنے عقیدہ پہ قائم تھا۔ تائب ہونا تو دور کی بات ہے اس نے اپنے عقیدہ میں نرمی یا کمزوری تک کو داخل نہ ہونے دیا اور یہ بات بھی سب متفق ہو کر کہتے ہیں کہ زندگی کے آخری گھڑی تک امیرالمومنینؓ اور آپ کی ذریت کے ساتھ دشمنی رکھنے اور سادات کشی پہ تلا ہوا تھا۔

اب آئیے ذرا حلیہ بائی۔ کے دلائل پہ ایک تنقیدی نظر بھی ڈال لیں جن کو شیعہ نے بڑے طمطراق اور بڑی چمک دمک سے بیان کیا ہے۔

حالانکہ وہ سب چند در چند وجوہ سے جس پہ بڑی طویل گفتگو درکار ہوگی بے حقیقت اور بے معنے ہی نہیں حد درجہ پھر بھی ہیں یہاں ہم اطناب اور طوال سے گریز کرکے صرف بارہ وجوہ ہی سپرد قلم کرتے ہیں۔

(۱) یہ سارے دلائل اہل اسلام کے عقائد کے خلاف ہیں، بلکہ یہود و نصاری کے بھی کیونکہ کوئی ولی کسی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

(۲) یہ سب باتیں قرآنی نصوص کے بھی خلاف ہیں۔ کیونکہ قرآن میں جا بجا انبیاء کو تمام مخلوقات پہ فضیلت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کو ساری مخلوقات میں سے چنا اور منتخب کیا گیا ہے۔

(۳) ان استدلالات میں انبیاء کرام علیہم السلام کی لغزشوں کو شمار کیا گیا ہے اور پھر ان کا مقابلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب و مدائح سے کیا گیا ہے اور انبیاء کے مناقب و مدائح کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ اگر دونوں کے مناقب اور مجد و شرف کو برابر رکھ کر کچھ کہا جاتا تو ادھر توجہ کا شائبہ جواز نکل آتا ورنہ یہ طریقہ احتجاج تو ہر جگہ چل سکتا ہے۔ اس کی بنا پر تو کوئی شورہ پشت اور بد بخت یہ بھی کہہ سکتا ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سورہ عبس میں اسیران بدر سے فدیہ کے معاملے میں انشاء اللہ چھوڑ دینے پر منافق کی نماز جنازہ پڑھنے پر غزدہ تبوک میں منافقین کو عدم شرکت کی اجازت دینے، باطعیمہ اور اس کے بھائیوں کو جانبداری پر اللہ تعالیٰ نے بانداز عتاب خطاب فرمایا۔

اور دوسری طرف نہ صرف امیر المومنین بلکہ، ابو ذر، عمار، سلمان اور مقداد رضی اللہ عنہم، کی فلاں فلاں آیات میں ستائش فرمائی۔ اور اس سے العیاذ باللہ وہ یہ نتیجہ نکالے کہ یہ حضرات حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوئے۔

(۴) حضرت آدم علیہ السلام جو تمام انسانوں کے باپ اور پوری نوع انسانی کے اصل اصول ہیں ان کی اولاد میں جو نیکی اور خوبی وقوع پذیر ہوتی ہے باپ ہونے کے ناطے ان کے اعمال نامے میں لکھی جاتی ہے کیونکہ یہ امر مذہباً طے شدہ ہے کہ والدین اگر مومن ہیں۔ تو ان کی اولاد کے اچھے اعمال ان کے نامہ عمل میں ثبت کئے جائیں گے لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بزرگی ان کے حق میں ھل اتیٰ کا نزول اور عین نماز میں فقیر کو انگوٹھی کا صدقہ، حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت و بزرگی کے مقابلہ میں ذرہ حقیر سے زائد نہیں۔ کیونکہ تمام انبیاء و اولیاء، علماء و صلحاء ائمہ واحیا اور خود امیر المؤمنین کے جتنے بھی اعمال خیر ہیں وہ سب حضرت آدم علیہ السلام کے اعمال نامہ میں درج اور آپ کی ذات پاک میں جاگزیں ہوں گے۔ کہ بندگی و طاعت، تو یہ شرمندگی کی سنت آپ ہی سے تو جاری ہوئی اور اس بارے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صریح ہے۔ مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلَامِ سُنَّۃً فَلَہٗ اَجْرُھَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِھَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ (اسلام میں جس نے نیک رسم کی بنیاد ڈالی اس کو اجراء سنت کے اجر کے ساتھ اس پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملتا رہے گا)۔

(۵) بیان فضیلت کے سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام اور علی رضی اللہ عنہ کی بیویوں میں موازنہ بھی عجیب اور انوکھا طرز استدلال ہے (جو کسی بڑے دماغ والے شیعہ ہی کے لئے طرہ افتخار ہو تو ہو۔ کسی مسلمان کو تو اپیل نہیں کرتا۔ ن)

کیونکہ کسی کی بیوی کا کسی دوسرے کی بیوی سے افضل ہونا اس کے شوہر کی افضلیت ثابت نہیں کرتا اس منطق کی رو سے ماننا پڑے گا کہ فرعون پیغمبروں سے افضل تھا کیونکہ زوجہ فرعون بالاجماع حضرت نوح و حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں سے افضل تھیں، اور بقول شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ازواج رسول اللہ سے افضل تھیں تو اب آپ دیکھ لیجئے کہ اس استدلال کی روشنی میں کون شوہر کس سے افضل ہوا۔ ؟ (یہی تو مکر و فریب کے وہ جال ہیں جن سے شیعہ اہل ایمان کا شکار کھیلتے ہیں۔ ن)

(۶) حدیث ثوکشف الغطاء بھی گھڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ شیعوں اور سنیوں دونوں کی کتابوں میں مذکورہ

سند کے ساتھ یہ حدیث نہیں ہے۔

اور اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو اس سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یقین کی زیادتی کا انکار کیا ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اطمینان کی طلب کی ہے اور اطمینان کوئی اور شئے ہے۔ اور یقین کچھ اور لہذا اطمینان حاصل ہونے کے بعد یقین میں زیادتی لازم نہیں آتی بلکہ اطمینان تو عیاں سے مشابہ ایک حالت کا نام ہے۔ اور یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ زیادہ ہونے والی چیز اس چیز کی جنس سے ہونی چاہیئے جس پر زیادتی کی گئی ہے۔

(۷) معراج کی رات میں جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حاضر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ یہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا بلکہ اس میں اختلاف ہے چنانچہ ابن بابویہ قمی نے کتاب المعراج میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں یوں بیان کیا ہے کہ آسمان پر فرشتوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے یوں کہا اِذَا رَجَعْتَ اِلَی الْاَرْضِ فَاَقْرَأْ عَلِیًّا مِنَّا السَّلَامَ (جب آپ زمین پر تشریف لے جائیں تو علی سے ہمارا سلام کہئے۔ پھر اسی کتاب میں ابن بابویہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ معراج کی رات حضرت علی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہیں تھے بلکہ زمین پر تھے البتہ حجاب کا پردہ نظر کے سامنے سے اٹھ گیا تھا۔ جو کچھ حضور صلے اللہ علیہ وسلم عالم ملکوت میں مشاہدہ فرما رہے تھے اس کو حضرت علی یہیں زمین سے دیکھ رہے تھے۔

اور صاحب نوادر الاصول نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے اور قطب راوندی نے بریدہؓ سے بایں الفاظ مرفوع روایت نقل کی ہے۔ اِنَّ عَلِیًّا کَانَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْلَةَ الْاِسْرَاءِ وَاَنَّهٗ رَاٰی کُلَّمَا رَاَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (معراج کی رات جناب علیؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ جو کچھ نبی صلے اللہ علیہ وسلم دیکھتے وہی آپ بھی دیکھتے۔

شیعوں کے نزدیک دونوں روایتیں صحیح ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد اور باہم متناقض ہیں

(۸) جابر دو عبدی کی گذشتہ حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ تمام انبیاء کی بعثت ولایت علیؓ پر ہوئی بلکہ تشیع کے معنے ہی ولایت علی میں منحصر ہیں، چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے اس کی تصریح کی ہے ایسی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب ابتدائے نبوت سے ہی علی کی ولایت حاصل تھی تو معراج کی رات کو اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنا تحصیل حاصل اور پہلے سے موجود چیز کی طلب ہے جو ایک مہمل اور بے معنی عمل ہے۔

(۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ڈر اور خوف، اور حضرت علی رضی اللہ کے اطمینان کے متعلق جو اس روایت میں کہا گیا ہے۔ وہ نرا مغالطہ ہے۔

اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ میں نو عمر بچہ ہوں اور پیغمبر کا تابع مجھ سے ان کو کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ اس کی بنا پر مجھے مار ڈالیں اس لئے ان کے ڈرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا (چنانچہ مشرکین مکہ نے ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

اس کے علاوہ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی تھی اور فرمادیا تھا کہ وہ تمکو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے لہذا ان کے اطمینان کا سبب قول پیغمبر پر ایمان تھا۔ اسی نے ان کے دل کو مطمئن رکھا۔

اس کے علاوہ باہم جنگ و قتال کی ابھی نوبت ہی نہیں آئی تھی ان کے علاوہ دوسری طرف محبت کے اسباب قرابت و رشتہ داری اور ابو طالب کی ریاست یہ سب چیزیں بدستور قائم اور برقرار تھیں اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی لگا ہوا تھا کہ اگر ان کو کوئی نقصان پہنچا تو حمزہ و عباس (رضی اللہ عنہم) اور دوسرے چچازاد بھائی اس کا بدلہ لینے کو تیار و موجود ہیں۔

ادھر موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں میں سے کوئی بات حاصل نہ تھی بلکہ ان کو یہ گمان غالب تھا کہ یہ لوگ مجھے قبطی کے بدلہ قتل کر ڈالیں گے اور اس سلسلہ میں رؤسائے قبط کے مشورے اور تدبیریں ایک معتبر ذریعہ سے ان کو بھی معلوم ہو گئی تھیں اور فرعون سے محفوظ رکھنے کا خدائی وعدہ بھی ابھی نہیں ہوا تھا۔ اور جب یہ وعدہ الٰہی اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی (میں تم دونوں کے ساتھ ہوں اور سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں) اور اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغٰلِبُوْنَ (تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب رہیں گے۔) کے الفاظ میں ان تک پہنچا تو ان کی پوری تسلی ہو گئی اور پھر اس فرعون کے مقابلہ میں ڈٹ گئے جس کے دبدبہ اور فوج و لشکر کا حال معلوم ہی ہے کہ کفار قریش کی نسبت تو اس کے سامنے اتنی بھی نہیں جتنی ایک تنکے کی پہاڑ کے سامنے ہوتی ہے اور پھر اسی باسطوت و جبروت بادشاہ کی عین ناک کے نیچے اسی شہر میں چالیس سال تک رہتے بستے رہے۔

بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جب (بقول شیعہ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے خلافت چھینی تو اس کمزور اور بزدل شخص کا خوف اور ڈر ان کے دل میں اس قدر بیٹھ گیا کہ امامت سے بھی دست بردار ہو گئے۔ حالانکہ ان کی امامت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ تھی، اسی خوف اور تقیہ کی وجہ سے بہت سے "فرائض اور واجبات کو چھوڑا اور قرآن کی تحریف اور احکام کی تبدیلی گوارا کی اور اس پر راضی رہے۔

اسی طرح جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں (بقول شیعہ) جب ان کی دختر کو چھینا تو انتہائی خوف اور ڈر کی وجہ سے اس "ذلت" کو بھی قبول کر لیا"

حالانکہ یہ سارا خوف و ہراس صرف نقصان پہنچنے کے اندیشۂ موہوم پر مبنی تھا۔ نہ جان جانے کے خطرے پر۔ اس لئے کہ شیعوں کے نزدیک یہ امر تسلیم کردہ اور طے شدہ امور میں سے ہے کہ ہر امام کو اپنی موت کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے اختیار سے مرتا ہے۔

اور اہل سنت کے نزدیک بھی بطریق صحیح یہ ثابت ہے کہ جب ایک دفعہ قصبہ ینبع میں حضرت علی بیمار ہوئے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم عیادت کو آئے تو آپ سے کہا کہ یہ آبادی گنوار کسانوں کی ہے اس لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مدینہ منورہ تشریف لے چلیں اس لئے کہ خدانخواستہ کوئی امر معین وقوع پذیر ہو جائے تو تجہیز و تکفین تو تسلی بخش طریقے سے ہو سکے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے میرے قتل کی حقیقت سے پورے طور پر آگاہ فرمایا ہے، جب تک وہ وقت نہ آ جائے ایسی ویسی بات کا مجھے کوئی خطرہ نہیں اسی طرح متعدد بار آپ نے اپنی شہادت کے متعلق تفصیلات بتائیں۔ بلکہ منقول تو یہاں تک ہے کہ آپ نے قاتل کی تعیین بھی فرما دی تھی۔ تو ان معلومات کے ہوتے ہوئے (شیعوں کا بیان کردہ) خوف و ہراس

کیوں تھا۔؟

(۱۰) حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے کہ وہ جاہ وحشمت دنیاوی کے طالب ہوتے ہوں اس لئے کہ یہ عقیدہ رکھنا تو ان کے دامن نبوت پہ دھبہ لگانے کے برابر ہے اور صریحاً ان کی نبوت کے انکار کے مترادف ہے۔ جسے غالباً شیعہ بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس لئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس دعاء طلب میں وجاہت دنیاوی نہیں بلکہ کوئی اور صحیح غرض مدنظر ہوگی۔

اس سلسلہ میں سید مرتضیٰ کی وہ کتاب قابل غور و توجہ ہے اور تنزیہ الانبیاء والائمہ کے سلسلہ میں شیعوں کے ہاں معتبر سمجھی جاتی ہے اس میں اس نے جو توجیہات بیان کی ہیں۔ وہ ذرا سمجھنے کی ہیں۔

(۱) ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس قسم کے ملک کا مطالبہ اس لئے کیا ہو کہ وہ آپ کی نبوت کی دلیل و معجزہ بن جائے۔ کیونکہ معجزہ وہی ہوتا ہے جس پہ کوئی دوسرا قادر نہ ہو جائے۔

(۲) یا ملک کی طلب آپ نے صرف مخلوق خدا میں عدل و انصاف قائم کرنے اور رشد و ہدایت پھیلانے کی غرض سے کی ہو کیونکہ یہ مقصد شاہی اقتدار کے تحت آسان طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے جوں جوں اقتدار بڑھتا ہے اس مقصد کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔

(۳) یا لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ سے مراد صرف ان کی امت ہو گویا درخواست کا یہ مطلب ہوگا کہ اس بادشاہی امتیاز سے وہ بحیثیت نبی اپنی امت سے ممتاز ہو جائیں" اس توجیہ میں صاف خلش ہے، کیونکہ احادیث صحیحہ اور اس نص کے ظاہری الفاظ عموم پہ دلالت کرتے ہیں پھر کوئی توجیہ اس وقت صحیح ہوتی کہ وہ اسی صفت کی بادشاہت طلب کرتے نہ اصل بادشاہت اس لئے کہ نبی کا امتیاز اپنی امت سے اور دوسری چیزوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ بادشاہت ہی کیا ضروری ہے۔

(۴) یا اللہ تعالیٰ نے ان کو باخبر کر دیا ہوگا کہ اس طرح کا ملک ہو جانے کے بعد ہی ان کو دنیا میں صلاح و تقوی حاصل ہوگا۔ نیکیوں، بھلائیوں اور طاعات کی کثرت نصیب ہوگی۔ بخلاف اس کے کہ اگر یہی ملک کسی دوسرے کے ہاتھ آیا تو بجائے اس کے کہ اس کے لئے صلاح و تقویٰ کا سبب بنے توجہ الی الحق اور طاعات و خیرات سے اس کے لئے مانع نہ ہو جائے۔

ان توجیہات کے علاوہ اسی قسم کی اور باتیں بھی اس کتاب میں درج ہیں بہر حال ان سے حضرت سلیمان کی کمتری اور حضرت علیؓ کی برتری ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کو طلاق دینے کے بعد بھی خلافت کی نہ صرف خواہش کی بلکہ اس کے لئے جد و جہد بھی فرمائی تاآنکہ مسلمانوں میں باہم کشت و خون کی نوبت تک آئی۔

اس طرز عمل سے گویا یہ واضح ہو گیا کہ بعض لوگوں کے لئے دنیا سے دست برداری طلب ملک کے مخالف نہیں کیونکہ طلب ملک سے ان کا مقصد حصول جاہ و مال نہیں بلکہ دشمنان خدا سے جہاد کرنا کفار کی بیخ کنی احکام شریعت کو رواج دینا بیت المال کی نگہداشت اور حقداروں پہ اس کی تقسیم بھی اس طلب کا مقصد ہو سکتا ہے لہذا حضرت سلیمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں اس امر میں تو باہم متفق ہیں کہ طلب ملک و خلافت کے وقت دونوں کے دلوں میں یہی

نیک ارادے اور نیت صالح تھی اتنا فرق البتہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ بلا امداد و اسباب ظاہری مخلوقات ان کے تابع فرمان اور زیر نگین ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ پس ہوا کو ہم نے ان کے تابع کر دیا۔ وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ (شیاطین ان کے لئے تعمیر و غوطہ خوری کرتے تھے،

اور جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسباب ظاہری یعنی فوج کشی اور جنگ و قتال کی صورت میں اس قسم کی درخواست کی لیکن ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی صرف اس مصلحت کی وجہ سے کہ ان کی نظر سے اسباب ظاہری کی وقعت و منزلت گر جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خاص بندوں سے کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کو ارب و رشد کا سبق دینا ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا سے بالکل قطع تعلق دین محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصد ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر ترک دنیا ہی باعث فضیلت ہے تو ہند کے جوگی، کشمیر کے رشی نصاریٰ کے رہبان اور چین کے لامے جو دنیا سے اپنا رشتہ بالکل کاٹ چکے ہیں اور عبادت اور خشک خوری کو اپنی عادت بنا چکے ہیں کیا نعوذ باللہ حضرت سلیمان و حضرت یوسف علیہما السلام سے افضل کہلائیں گے۔

(۱۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فضیلت دینے کے سلسلہ میں جو بیان ہوا اس کا لب لباب اور خلاصہ دو باتوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے متعلق بد اعتقادی کے مجرموں کو جلا وطن کیا ان کو سزا دی، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا،

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے باز پرس ہوگی اور وہ اپنا عذر پیش کرنے پر مجبور ہوں گے مگر جناب علی کرم اللہ وجہہ سے نہ باز پرس ہوگی اور نہ وہ عذر و معذرت پر مجبور ہوں گے۔ لیکن ہمیں ان دونوں باتوں پر اشکال و اعتراض ہے اس لئے کہ یہ دونوں باتیں حضرت علی رضی اللہ کی برتری حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ثابت نہیں کرتیں۔

اب دیکھئے سزا دینے نہ دینے کا معاملہ تو ہم کہتے ہیں کہ جناب امیرؓ کی محبت میں حد سے بڑھ جانے والوں نے تو یہ لغو عقیدہ اور کلمات کفر خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں شائع و ذائع کر دیئے اور عوام و خواص میں پھیلا دیئے تھے جب کہ حضرت عیسیٰ کی محبت میں غلو کرنے والوں نے جو کچھ کیا ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد کیا ان حالات کے پیش نظر جناب علی رضی اللہ عنہ کے لئے تو سزا دینا ممکن تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ممکن نہ تھا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے تو ان کا قتل بھی ممکن تھا۔ اور اگر یہ قتل ہو جاتا تو فتنہ کی جڑ ہی کٹ جاتی اور پھر کوئی اس کا نام بھی نہ لیتا لیکن چونکہ یہ مقدر نہ تھا اس لئے ایسا نہ ہوا جلا وطنی کے بعد بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے بلکہ اب محتاط ہو کر ان کو یہ کفر مدائن، عراق اور تبریز میں پھیلانے کا بہتر موقعہ مل گیا۔

اب جواب طلبی کے معاملہ کو لیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے باز پرس کا ذکر تو قرآن مجید میں آ گیا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اس سلسلہ میں کچھ معلوم نہیں۔ اور کسی چیز سے لاعلمی اصل بات یا چیز کے وجود کی نفی کو لازم نہیں ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی رسول ہوتا یا ان پر وحی اترتی اور اس میں ان سے باز پرس کی نفی ہوتی تو یہ فرق کچھ قابل لحاظ ہوتا۔ بلکہ بعض آیات قرآنی کا عموم تو یہ بتاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس باز پرس سے نہ بچیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ (جس دن وہ جمع کرے گا لوگوں کو اور ان کو جن کی وہ خدا کے سوا عبادت کرتے تھے پس ان

سے پوچھے گا کہ تم نے میرے ان بندوں کو بہکایا تھا یا یہ خود ہی بہک گئے تھے)
اس پر یہ حضرات بھی عذر کریں گے۔ قَالُوا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ (وہ کہیں گے تو پاک ہے ہمارے لئے یہ لائق ہی نہ تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو ولی بناتے) اور ظاہر ہے اس قسم کی باز پرسی میں کوئی الزامی پہلو نہیں ہے کیونکہ اس باز پرس سے تو ان پرستش کرنے والوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا مقصود ہے اور تنبیہ کر کے خود ان کے معبودوں کی زبانی ان کے مذہب وعقیدہ کا کذب ظاہر کرنا ہے۔

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایسی باز پرس فرشتوں سے بھی ہوگی حالانکہ فرشتے بالاجماع معصوم ہیں اور غیر مکلف نہ وہ قابل مواخذہ ہیں نہ لائق عتاب!

چنانچہ ارشاد ہے۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے اسوقت فرشتوں سے پوچھیں گے کہ کیا یہ لوگ تم کو پوجتے تھے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باز پرس نہ ہونا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہونا یہ قرین انصاف تو ہے۔ قابل اعتراض بالکل نہیں۔ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے اور پیغمبر کا فرمان قطعی دلیل ہوتا ہے اس لئے اس سے استدلال کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر بیان کیا جا سکتا ہے بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کہ آپ سید الاولیا تو تھے مگر پیغمبر بالکل نہ تھے اور ولی کا قول دلیل قطعی بالکل نہیں اور نہ اس سے استدلال کر کے بارگاہ ایزدی میں غور کیا جا سکتا ہے۔

اور پھر ایک بات اور بھی ہے کہ امت کی اچھائی اور برائی پر پیغمبر کی شہادت ضروری ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (یوم بعث میں ہم ہر امت سے ایک گواہ اٹھائیں گے۔ اور ان سب پر آپ سے گواہی لیں گے۔ اس مضمون کی اور بھی آیات ہیں مگر امت پر ولی کی شہادت ضروری نہیں! لہٰذا معلوم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کرنا اور حضرت علی سے نہ کرنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کی واضح دلیل ہے۔

(۱۲) روایت مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ محض لچر اور تاریخی اعتبار سے سراسر بے اصل و بنیاد ہے اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش میں بڑا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں۔ فلسطین میں ہوئی تو بعض دوسرے مصر میں مانتے ہیں اور بعض دمشق (شام) ہیں، مگر مشہور قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت بیت اللحم میں ہوئی مگر یہ بات کسی مورخ نے لکھی نہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بیت المقدس میں دردزہ لاحق ہوا اور اگر یہ صورت تسلیم کر لی جائے تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ ان کو بیت المقدس سے نکالا گیا قرآنی عبارت تو صاف یہ بتاتی ہے کہ ان کو دردزہ کی وجہ سے سخت بے چینی لاحق تھی انہوں نے چاہا کہ کسی چیز سے پیٹھ لگا کر سہارا لیں چنانچہ ویرانے کی طرف نکل کھڑی ہوئیں۔

چونکہ بچہ بے باپ کا نفخ ملک (فرشتہ) سے تھا اس لئے وہ شرماتی بھی تھیں، (اسی لئے کسی سے مدد بھی نہ لینا چاہتی ہوں گی۔)، لامحالہ اس وقت جنگل ہی ان کے حال کے مطابق تھا وہاں جا کر ایک کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں جنگل کا ماحول، ولادت کے عمل سے ناواقفیت تنہائی اور دردزہ اس لئے بے ساختہ موت

کی دعا لبوں پر آ گئی، فَاَجَاءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔ (دردزہ ان کو ایک کھجور کے تنے کی طرف لایا۔ اس وقت، انہوں نے کہا کاش میں اس سے قبل ہی مر کر بھولی بسری ہو جاتی)۔

فاطمہ بنت اسد، رضی اللہ عنہا کے متعلق جو یہ کہا گیا کہ ان کو وحی ہوئی کہ خانہ کعبہ میں جا کر وضع حمل کریں درحقیقت ایک بے لطف جھوٹ ہے کیونکہ اسلامی یا غیر اسلامی کسی فرقہ کے نزدیک بھی وہ نبی نہیں تھیں پھر حجاج نے اس کو کسی بنا پر تسلیم کر لیا یہ قابل تعجب بات ہے۔

مشہور روایت میں آیا ہے کہ ایام جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ رجب کی پندرہ تاریخ کو کعبہ کا دروازہ کھولتے اور اس مبارک گھر کی زیارت کے لئے اندر داخل ہوتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی چونکہ اسی دن ہوئی تھی اس لئے اس کو یوم الاستفتاح یا روزہ مریم کہتے ہیں۔

بزرگوں نے اس دن کے کچھ اوراد و وظائف بھی مقرر کئے ہیں۔ رسم یہ تھی کہ اس دن سے ایک دو روز پہلے عورتیں کعبہ کی زیارت کرتیں۔ اتفاقاً عورتوں کے لئے مخصوص انہیں دنوں میں فاطمہ بنت اسدؓ نے بھی زیارت کا ارادہ کیا گو ان کی مدت گزر چکی تھی مگر یہ دن چونکہ سال میں ایک ہی مرتبہ آتا تھا۔ اس لئے باوجود ایسے دنوں میں حرکت دشواری اور باعث تکلیف ہوتی ہے مگر انہوں نے تکلیف برداشت کر کے اپنے کو کعبہ کے دروازے تک پہنچایا اس زمانہ میں بھی بابِ کعبہ قد آدم سے اونچا تھا۔ اور سیڑھی وغیرہ بھی نہیں ہوتی تھی اس لئے عورتوں کو ان کے مرد بدقت تمام اوپر چڑھاتے تھے

چنانچہ اس اٹھانے بٹھانے کے سبب درد میں اضافہ ہو گیا، فاطمہ نے خیال کیا کہ تھوڑی دیر میں یہ تکلیف جاتی رہے گی میں اس کی وجہ سے زیارت کعبہ سے کیوں محروم رہوں وہ جیسے ہی دروازہ میں داخل ہوئیں۔ درد نے شدت اختیار کر لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولادت ہو گئی۔

شیعوں کی روایات میں یہ واقعہ دوسرے انداز سے بیان ہوا ہے کہ مدت حمل گزر جانے اور درد کی شدت میں اضافہ کے سبب جناب ابو طالب مایوس ہو کر شفا طلبی کے لئے ان کو کعبہ میں لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور جلد ولادت ہو گئی۔

کتب شیعہ میں یہ روایت جناب امام زین العابدین رحمہ اللہ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔ اَخْبَرَتْنِيْ زُبْدَةُ بِنْتُ عَجْلَانَ السَّاعِدِيَّةِ عَنْ اُمِّ عَمَارَةَ بِنْتِ عُبَادِ السَّاعِدِيَّةِ اَنَّهَا قَالَتْ كُنْتُ ذَاتَ يَوْمٍ فِيْ نِسَاءٍ مِّنَ الْعَرَبِ اِذَا اَقْبَلَ اَبُوْطَالِبٍ كَئِيْبًا فَقُلْتُ لَهٗ مَاشَانُكَ قَالَ اِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَسَدٍ فِيْ شِدَّةٍ مِّنَ الطَّلْقِ وَاَنَّهَا لَا تَضَعُ ثُمَّ اَنَّهٗ اَخَذَ بِيَدِهَا وَجَاءَ بِهَا اِلَى الْكَعْبَةِ فَدَخَلَ بِهَا وَقَالَ اِجْلِسِيْ عَلٰى اِسْمِ اللّٰهِ فَجَلَسَتْ وَطَلَقَتْ طَلْقَةً فَوَلَدَتْ غُلَامًا نَظِيْفًا فَسَمَّاهُ اَبُوْطَالِبٍ عَلِيًّا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھ کو زبدہ بنت عجلان الساعدیہ نے خبر دی اور انہوں نے روایت کی ام امارہ بنت عباد الساعدیہ سے، انہوں نے کہا میں ایک روز مستورات عرب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک ابو طالب فکر مند سے وہاں آئے میں نے ان سے خیریت اور حال پوچھا تو کہنے لگے فاطمہ بنت اسد دردزہ کی تکلیف میں مبتلا ہے مگر ولادت نہیں ہو رہی۔ پھر انہوں نے فاطمہ کا ہاتھ پکڑا اور کعبہ تک لائے اور اندر

لے گئے، اور کہا اللہ کا نام لے کر بیٹھ جا وہ بیٹھ گئیں تو درد کی شدت اور بڑھ گئی اور بالآخر ایک بچہ کو جنم دیا جس کا نام جناب ابو طالب نے علیؓ رکھا)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر کعبہ میں پیدا ہونے ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر برتری حاصل ہوئی، تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کو افضل ہونا چاہیئے حالانکہ ایسی بات نہ سنی سوچ سکتے ہیں اور نہ شیعہ اس کے قائل ہیں۔

اور پھر تاریخ کی معتبر کتابیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام بن خویلد بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ سو شیعہ منطق کی رو سے ان کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی نہیں تمام انبیاء سے افضل ہونا چاہیئے حالانکہ ایسے سرپھرے عقیدہ والوں کی شناخت ظاہر ہے۔

اٹھاسیواں دھوکہ:- شیعہ توریت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ شریعتیں صرف چھ گزری ہیں اور ہر نبی کے بارہ وصی ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت (۲) حضرت نوح علیہ السلام کی (۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام (۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی (۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور (۶) حضور اکرم محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت۔

ملا حیدر آملی (شیعہ) نے محیط اعظم (نامی کتاب) میں ان کے نام تفصیلاً درج کئے ہیں مگر نہ ان کے الفاظ و معانی کے بارے میں صحیح علم ہے نہ ان کے صحیح تلفظ سے کوئی واقف اور مزے کی بات یہ کہ خود توریت میں اس نقل کا کوئی نام و نشان نہیں۔ لہٰذا اس کے جھوٹ ہونے میں کیا شبہ ہے!

اور دلیل عقلی سے بھی اس کا افتراء ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام تمام روئے زمین کے لئے مبعوث نہیں ہوتے تھے اس لئے شرائع کو خاص تعداد (مثلاً چھ) میں محدود کرنے کا کیا مطلب۔؟

دوسری بات یہ کہ اس وقت سلسلہ نبوت ختم نہیں ہوا تھا، حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے حضرت ادریس، پھر حضرت ابراہیم و اسحاق علیہم السلام ان کے بعد حضرت یعقوب، حضرت یوسف حضرت موسیٰ، حضرت یوشع علیہم السلام نبوت و رسالت سے سرفراز ہوئے اور دین کی برقراری خود ان انبیاء کرام کی ذوات مبارکہ سے تھی تو ان کے ساتھ اوصیاء کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اگر یہ سب کچھ مان بھی لیا جائے تو توریت کے حوالہ سے بارہ کے عدد کے سوا اور کیا فائدہ حاصل ہوا اور اس میں یہ احتمال ہے کہ ان بارہ میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم بحیثیت اوصیاء شامل و داخل ہوں اور حقیقت میں وہ وصی ہونے کے لائق اور حقدار بھی ہیں۔

کیونکہ جہاد کرنا، شہروں کو فتح کرنا، کفر کو ملیامیٹ کرنا، مسجدوں اور منبروں کی تعمیر کرنا اور شریعت کو مکمل طریقہ سے نافذ و رائج کرنا۔ ان ہی بزرگوں کے مبارک ہاتھوں سے بھلائی کے یہ سارے کام انجام پذیر ہوئے بخلاف ائمہ کے کہ (شیعوں کے صدقے میں) انہوں نے ساری زندگی خاموشی، عزلت اور گوشہ نشینی میں گزار دی۔ (اور دسویں والا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا)۔

نواسی واں دھوکہ: الزام لگاتے ہیں کہ اہل سنت ظاہر الثبوت چیزوں کا بھی انکار کرتے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے قائل ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا دیدار بالوضاحت باطل اور محال ہے۔ کیونکہ کسی چیزوں کو دیکھنا چند باتوں کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ نہ پائی جائیں تو دیکھنا متحقق نہیں ہو سکتا، مثلاً۔

(۱) دیکھنے والی چیز دیکھنے والے کے مقابل یا مقابل کے حکم (جیسے آئینہ میں صورت دیکھنا) میں ہو۔

(۲) بالکل قریب نہ ہو۔

(۳) حد نظر سے بہت دور بھی نہ ہو۔

(۴) درمیان میں کوئی آڑ حائل نہ ہو۔

(۵) اندھیرے اور تاریکی میں نہ ہو، بلکہ اس تک روشنی پہنچ رہی ہو۔

(۶) صد درجہ لطیف بھی نہ ہو، کچھ نہ کچھ کثافت بھی ہو، جیسے ہوا کی لطافت کے سبب ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۷) دیکھنے والے کی نظر بھی سالم ہو اندھے پن، رتوندے یا اسی قسم کے امراض چشم لاحق نہ ہوں۔

(۸) دیکھنے والے کا دیکھنے کا ارادہ بھی ہو۔

اور ظاہر ہے یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے بارے میں متصور نہیں۔

اس سلسلہ میں اہل سنت کا یہ جواب ہے کہ بطور عادت دیکھنے کے لئے درحقیقت یہی صورتیں شرط ہیں کہ ان کے بغیر عام طور سے کسی چیز کا دیکھنا ممکن نہیں لیکن بعض خاص حالات میں ان کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے اس بات کی کیا دلیل ہے کہ عقل بھی ان شرطوں کے بغیر کسی چیز کو دیکھنے کو جائز نہیں رکھتی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ بھی عام جاہلوں کی طرح عادیات اور اولیات میں فرق و تمیز نہیں کرتے۔ عالم اور محقق ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں آکر اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ برف کے بطور بارش گرنے کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ وہ خلاف عادت ہے۔ وہ انکار کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پتھر کے مانند ٹھوس اور جمی ہوئی چیز کے تودے کے تودے زمین و آسمان کے درمیان معلق اور لٹکے ہوئے ہوں اور پھر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برسیں۔

اور یہ بھی نہیں مانتے کہ موسم بہار میں چاول کی فصل اسی سے ہوتی ہے، حالانکہ سرد ممالک میں یہ بات عام اور مشہور ہے۔

خط استوا میں آٹھ فصلیں ہوتی ہیں، اس کو بھی ہندو جاہل نہیں مانتے اور محالات میں شمار کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر ملک کے جاہل اپنے ملک کے مقررہ موسم کے خلاف میوہ جات کی پیداوار کو بھی محالات میں شمار کرتے ہیں۔

اگر بالفرض کسی شخص کی عادت طلوع آفتاب سے سوتے اور غروب آفتاب کے بعد جاگنے کی ہو تو وہ ان چیزوں کے علاوہ جو مشعل، چراغ یا موم بتی کی روشنی یا چاند کی چاندنی میں دکھائی دیتی ہیں، ان کی روشنی میں دکھنے والی چیزوں کا کبھی قائل نہ ہو گا، کیونکہ وہ دن کی حقیقت سے ناآشنا اور شعاع آفتاب کی کیفیت سے نابلد ہے وہ نہیں جانتا کہ آفتاب کی شعاع کو اس کی معلوم شدہ شعاعوں سے کیا نسبت ہے: وہ کہا جائے کہ آفتاب کی روشنی میں

وہ جس چیز کو میل بھر سے دیکھ سکتا ہے مشعل اور چراغ کی روشنی میں چند گز کی مسافت سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور دکھنے والی چیزوں کی دوسری باریکیاں اور مسامات جس طرح سورج کی روشنی میں دیکھے جا سکتے ہیں دوسری شعاعوں میں ان کو دیکھنا غیر ممکن ہے!

جب عالم دنیا کے دن رات اور ملکوں اور شہروں کے اختلافات کا یہ حال ہو تو دوسرے عالم کے اختلاف کو کیوں اور کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے جس کا زمانہ دوسرا جس کا مکان جدا اور جس کے دن (یوم آخرت) کو شعاع۔ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا روشن کرے گی۔ اور جو تبلی السَّرَائِرُ اور یَوْمَ الْفَصْلِ کا مصداق ہے۔ اس دن کے مقابلہ میں تو عالم دنیا کے دن اندھیری کوٹھریوں کی طرح معلوم ہوں گے۔

وہ دن تو اپنے رب کے نور سے منور و روشن ہوگا اس دن نہ دکھنے والی اشیاء مثلاً پوشیدہ وچھپے ہوئے اخلاق و اعمال بھی دکھائی دیں گے۔ روح حیوانی میں صرف عالم بدل جانے سے وہ فراخی اور کشادگی پیدا ہو جائی گی اور اس کے تمام حواس دنیاوی حواس کے مقابلہ میں ہزاروں گنا برتر اور حساس ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ دار آخرت ہی حیات زندگی ہے، کاش یہ اس کو جانتے ہوتے اور فرمایا اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا (جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو خوب دیکھنے اور خوب سننے والے ہوں گے۔ (پھر فرمایا) فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (پھر ہم نے تجھ سے تیرا پردہ دور کر دیا۔ بس آج کے دن تیری نگاہ تیز ہوگی۔

اب اس بارے میں کہ دیکھنے کے لئے مذکورہ عقلی شرطیں ضروری نہیں دلیل سنئے ہزار سے زائد قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سنتا بھی ہے دیکھتا بھی ہی ہے اور خود شیعہ بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور سننے والا مانتے اور کہتے ہیں حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں یہ شرائط ناپید ہیں۔ اور دیکھنے والی آنکھ کی پتلی میں دکھنے والی چیز کی صورت کا چھپنا اور اس سے شعاعوں کا نکلنا اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ فلاسفہ جو عادات کے پھندے میں گرفتار اور عقلیات کی بیڑی میں جکڑے ہوئے ہیں دیدار کے لئے ان شرطوں کو ضروری نہیں سمجھتے۔

ثابت قرہ حرانی نے جہاں روحانی اشیاء کو دیکھنے یا ان سے گفتگو و ملاقات کو جائز بتایا ہے وہیں وہ کہتا ہے کہ زحل کی روح کو میرے ساتھ خاص وابستگی اور تعلق تھا۔ وہ میرے دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کرتی تھی ایک دن یہ سانحہ پیش آیا کہ خلیفہ وقت موثق باللہ سے کسی نے میری چغلی کھائی کہ تمہارے لڑکے معتضد کو بہکاتا اور برے افعال پر ابھارتا اور ان کا باعث بنتا ہے۔ خلیفہ اس حاسدانہ چغلی پر بہت برہم ہوا اور میرے قتل پر آمادہ ہو گیا ادھر مجھے کچھ خبر نہ تھی میں بے خبر اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ یک بیک وہ روحانیت میرے پاس آئی اور مجھے جگا کر صورت حال سے آگاہ کر کے بھاگ جانے کی ہدایت کی۔

میں حواس باختہ گھر سے نکلا اور ایک دوست کے گھر جا چھپا، ادھر خلیفہ نے ایک جماعت میری گرفتاری کے لئے بھیجی انہوں نے گھر میں مجھے تلاش کیا، بڑی سختی کی مگر میرا سراغ نہ ملا میرا لڑکا سنان بھی گھر ہی میں رہ گیا تھا میرے ساتھ نہ آ سکا حالانکہ وہ انہیں کے ساتھ چل پھر رہا تھا۔ مگر وہ اس کو نہ دیکھ سکے۔

دوسرے دن وہ روحانیت میرے پاس آئی اور سارا قصہ مجھے بتایا میں نے اس سے کہا کہ پھر مجھے بھی میرے لڑکے کی طرح کیوں نہ کر دیا کہ میں گھر ہی میں رہتا اور دوست کا احسان مند نہ ہوتا۔ وہ کہنے لگی کہ تیرا زائچہ مریخ کے مقابلہ میں تھا۔ اس لئے تجھ پر میری پوری توجہ نہ تھی اور تیرے بیٹے کا زائچہ نحوست سے محفوظ تھا۔ اس لئے اس پر میری پوری توجہ تھی۔

ثابت قرہ مذکور نے یہ بھی لکھا ہے کہ فلاسفہ قدیم نے ایک سرمہ تیار کیا تھا جو اس قدر مقوی بصر تھا کہ اس کے لگانے سے دن کے وقت تارے نظر آجاتے تھے اور دور کی چیز ایسی نظر آتی تھی جیسے آنکھوں کے سامنے قریب ہی ہو میں نے وہ سرمہ بابل کے ایک شخص کے بطور تجربہ لگایا، وہ شخص کہنے لگا کہ ثوابت و سیارے اپنی اپنی جگہ مجھے صاف نظر آرہے ہیں۔ میری نظر کثیف اور ٹھوس چیزوں سے بھی گزر رہی ہے۔ اور میں ان کے پیچھے کی چیزوں کو بھی صاف دیکھ رہا ہوں، چنانچہ میں اور قسطا بن لوقا بعلبکی بطور امتحان ایک گھر کے اندر گئے اور اس شخص کو باہر کھڑا کر دیا گھر کے اندر ہم نے ایک کتاب لکھنی شروع کی وہ شخص باہر کھڑا ہوا ہمکو کتاب کی عبارت پڑھ کر لفظ بلفظ سنا رہا تھا وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ پہلی سطر اس عبارت سے شروع ہوتی ہے۔ اور دوسری ان الفاظ سے پھر ہم نے ایک کاغذ لیا اور اس پر کچھ لکھنے لگے اس شخص نے بھی باہر ایک کاغذ لیا اور ہمارے لکھے کی ساتھ ساتھ نقل کرنے لگا۔ پھر ہم نے اپنے لکھے ہوئے سے اس کی تحریر ملائی تو لفظ بلفظ صحیح تھی۔

ایک مرتبہ قسطا نے اس شخص سے اپنے بھائی کا حال دریافت کیا جو بعلبک میں تھا اس نے نظر ڈالی اور کہا وہ بیمار ہے اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جس کا طالع برج ہے ثور کا تیسرا درجہ ہے چنانچہ تفتیش و تحقیق سے پتہ چلا کہ اس نے جو بتایا صحیح تھا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جو شخص عالم دنیا اور عالم آخرت کے فرق و اختلاف کو جانتا و مانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر اعتقاد رکھتا ہے وہ ان تمام امور کو بعید از عقل نہیں مانتا جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے جنت یا دوزخ میں کیا ہے اور اس میں تو اہل اسلام ہی نہیں ہر مذہب کا بھی اتفاق ہے کہ آخرت میں مومن و کافر کو فرشتے، حوریں اور غلمان دکھائی دیں گے۔ اسی طرح بہشتی اپنے ملکیتی رقبہ کو ایسے دیکھے گا جیسے ابتدائی حصے کو دیکھتا ہو گا حالانکہ دونوں کناروں کے بین بڑی طویل مسافت اور بعد ہو گا۔ چنانچہ ابن بابویہ قمی کی روایت مذکورہ کتاب المعراج کا وہ حصہ اس کی تائید کرتا ہے جس میں اس نے بتایا تھا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ زمین پر وہی کچھ دیکھ رہے تھے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم آسمان پر ملاحظہ فرما رہے تھے۔

اس کے علاوہ ابن بابویہ نے کتاب الروضہ میں متعدد صحیح طرق سند سے اور ابو جعفر طوسی نے (کتاب) امالی میں روایات بیان کی ہیں کہ ہر مومن، جناب پیغمبر علیہ السلام و جناب علی و حسین رضی اللہ عنہ کی آرام گاہوں کو دیکھتا ہے۔ اور راوندی نے بھی روایت کی ہے کہ جب خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہ کی مدت حمل پوری ہو کر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی ولادت کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا حضرت سارہ حضرت مریم حضرت آسیہ (علیہم السلام) کو ان کے پاس بھیجا کہ ان کی خدمت کریں۔ جیسا کہ ایک زندہ عورت کی زندہ عورتیں خدمت کرتی ہیں، حضرت خدیجہ رض ان کو دیکھتی تھیں ان سے ہم کلام ہوتیں۔

صفار نے کتاب البصائر میں بیان کیا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آنکھوں پر اپنا دست مبارک ملا اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے ابو جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو اور ان کے رفقا کو علیحدہ علیحدہ حبشہ کے دریا میں کشتی کے واپسی سفر میں دیکھ لیا۔

اور شیخ الطائفہ محمد بن النعمان نے کتاب المقالات میں دعویٰ کیا ہے کہ مذکورہ اور تحریر کردہ آثار و اخبار شیعوں کے نزدیک تواتر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔

یہ ساری گفتگو اس صورت میں ہے جب اہل سنت رویت خالق و مخلوق میں کوئی تمیز و فرق نہ کریں اور دونوں رؤیتوں کو متحد الماہیت مانیں لیکن اگر گفتگو اور کلام کی بنیاد محققین اہل سنت کے مذہب پر رکھیں جو یہ ہے کہ ان کے نزدیک مخلوق کا دیکھنا اور ہے۔ اور خالق کا دیکھنا جدا کہ ایسی رویت دنیا میں ایک دو بار سے زائد وقوع پذیر نہیں ہوئی اور وہ بھی صرف پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ کو تو اس صورت میں اشکال و اعتراض بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بالکل ظاہر الثبوت چیز ہے۔ کہ ایک قسم کا مشروط ہونا بعض شرطوں کے ساتھ یہ لازم نہیں کرتا کہ دوسری قسم بھی انہیں شرطوں کے ساتھ مشروط ہو۔

نوے واں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ قبر کا عذاب اہل سنت اور دوسرے اسلامی فرقوں کے لئے مخصوص ہے لیکن امامیہ کتنے ہی فاسق و فاجر عاصی و خاطی کیوں نہ ہوں ان کے لئے عالم قبر میں سوائے لذت و نعمت کے دکھ کا کوئی سوال ہی نہیں۔

ان کا یہ اعتقاد بے اصل اور لغو ہے کیونکہ خود شیعوں کی کتابوں میں صاف و صریح روایتیں اور آثار مروی ہیں جو ہر عاصی و گناہ گار مسلمان کے حق میں ہیں۔ بالخصوص شیعوں کے حق میں، چنانچہ ابن بابویہ قمی عمران بن زید سے ان الفاظ میں روایت کرتا ہے، قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدُ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامِ اِنِّیْ سَمِعْتُكَ اَنْتَ تَقُوْلُ كُلُّ شِیْعَتِنَا فِی الْجَنَّۃِ عَلٰی مَا كَانَ مِنْهُمْ قَالَ صَدَقْتُكَ وَاللّٰہِ كُلُّهُمْ فِی الْجَنَّۃِ قُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاكَ اِنَّ الذُّنُوْبَ كَثِیْرَۃٌ صِغَارٌ وَّكِبَارٌ فَقَالَ اَمَّا فِی الْقِیٰمَۃِ فَكُلُّهُمْ فِی الْجَنَّۃِ بِشَفَاعَۃِ النَّبِیِّ الْمُطَاعِ اَوْ وَصِیِّ النَّبِیِّ لٰكِنِّیْ وَاللّٰہِ اَتَخَوَّفُ عَلَیْهِمْ فِی الْبَرْزَخِ قَالَ اَلْقَبْرُ مِنْ حِیْنِ مَوْتِہٖ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ (کہا میں نے ابی عبداللہ علیہ السلام سے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے سارے شیعہ جنت میں ہیں خواہ وہ کسی بھی حال میں ہوں فرمایا واللہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ سب جنت میں ہیں۔ میں نے کہا میں آپ پر فدا۔ چھوٹے بڑے گناہ کی تو کثرت ہے فرمایا وہ گناہ تو (نبی اور ان کے وصی کی شفاعت سے) معاف ہو جائیں گے اور وہ (سب جنت میں ہیں لیکن واللہ میں برزخ میں تمہارے بارے میں خوفزدہ اور فکر مند ہوں میں نے کہا برزخ کیا۔) فرمایا قبر کا عرصہ موت سے قیامت تک۔

اکانوے واں دھوکہ: کہتے ہیں کہ اہل سنت اہل بیت کے دشمنوں کو دوست رکھتے ہیں اور دشمنوں کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے کیونکہ حکماء نے کہا ہے کہ دشمن تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنا دشمن۔ اپنا دوست کا دشمن اپنے دشمنوں کا دوست اسی طرح دوست بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنا دوست اپنے دوست کا دوست اپنے دشمن کا دشمن۔

پس لا محالہ اہل سنت بھی اہل بیت کے دشمن ہوئے اور یہ کلام اس قاعدہ پر مبنی ہے جو اہل شرح و اہل عقل

کا مظہر کر دیا اور ثابت کردہ ہے کہ کسی سے محبت رکھنے والا اس کے حبیب اور محبوب دونوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کے دشمن کا دشمن یا جس کا وہ دشمن ہوتا ہے اس کا بھی دشمن ہوتا ہے اسی طرح کسی سے دشمنی رکھنے والا محبت رکھتا ہے اس کے دشمن سے اور اس سے جس کا وہ خود دشمن ہے،

اور دشمنی رکھتا ہے اس کے حبیب و محبوب سے! لہذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوست عام ہے دوست رکھنے والے اور دوست رکھے ہوئے سے اور دشمن عام ہے دشمن رکھنے والے اور دشمن رکھے ہوئے سے؛

اہل سنت کی طرف سے اس طعن کا جواب ایک تو بطور جدل ہے کہ اہل سنت خوارج و نواصب کے دشمن ہیں اور وہ اہل بیت کے دشمن ہیں۔ لہذا اہل سنت جب اہل بیت کے دشمن کے دشمن ہوئے تو اہل بیت کے دوست ہوئے۔

اور شیعہ خوارج و نواصب کے دشمن ہیں اور وہ پیغمبر علیہ السلام کے دوست ہیں تو گویا شیعہ پیغمبر علیہ السلام کے دوست کے دشمن ہوئے اور دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے تو ثابت ہوا کہ شیعہ پیغمبر علیہ السلام کے دشمن ہیں! اس ضمن میں اسی قسم کی اور باتیں بھی کہی جاسکتی ہیں جن سے شیعوں کی پیغمبر دشمنی ثابت ہوتی ہو)

دوسرے! یہ کہ دوستی اور دشمنی جب براہ راست ہو تو بالواسطہ دوستی اور دشمنی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح تمام نسبتوں اور تعلقات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے کہ بالواسطہ یا بلا واسطہ کے مقابلے میں قابل لحاظ نہیں۔

مثلاً ایک شخص کسی کا سگا بھائی ہے، اور اس کے دشمن کا ہم زلف بھی تو یہ اپنے بھائی کا دشمن شمار نہیں ہوگا ایسے ہی اگر ایک شخص کا نوکر اس کے دشمن کے نوکر کا بھائی ہے اور اس نوکر کو اس شخص کے دشمن کا نوکر نہیں کہیں گے یہی حال باقی نسبتوں کا سمجھ لو! پس اب جب اہل سنت بلا واسطہ اہل بیت کے دوست ہوئے تو اسی بلا واسطہ دوستی کا اعتبار ہوگا اور وہ دشمنی جو ان کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھنے والوں سے بالواسطہ لازم آتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ بالواسطہ اوصاف کا لحاظ اسی وقت ہے جب بلا واسطہ اوصاف نہ ہوں کیونکہ بلا واسطہ اوصاف قوی تر اور اولیٰ تر ہیں اور قوی تر کی موجودگی کے وقت کمزور علاقہ کا اعتبار خلاف عقل ہے۔

تیسرے یہ کہ تحقیق یہ ہے کہ نفس دوستی و دشمنی کا اعتبار صفات و حیثیات کے لحاظ کئے بغیر خلاف عقل ہے بلکہ دوستی اور دشمنی کی غرض و غایات صفات و حیثیات ہی ہیں۔

پس اگر کوئی شخص کسی کو خاص وصف و حیثیت کی وجہ سے دوست رکھتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام حیثیات سے اس کو دوست رکھتا ہے اور دوستی اور دشمنی بالواسطہ کی تبدیلی اس وقت ہوتی ہے کہ ایک ہی حیثیت سے اس کو دوست بھی رکھتا ہے اور دشمن بھی؛ پس اہل سنت اہل بیت کے دشمنوں کو اس حیثیت سے دوست نہیں رکھتے کہ وہ اہل بیت کے دشمن ہیں۔ لہذا یہ الزام ان پر آتا ہی نہیں۔

چوتھے یہ بھی تحقیق شدہ امر ہے کہ اہل سنت ان کو دوست رکھتے ہیں جن کو وہ اپنے اعتقاد میں اہل بیت کا دشمن نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کے دوست اور اعتقاد میں موافق خیال کرتے ہیں اور ان کی روایتوں میں بتواتر یہ ثابت ہے کہ وہ ہمیشہ اہل بیت کے مداح اور ثناخواں رہے۔

اور ان کے دین و شریعت کے مددگار و معاون، پنجوقتہ نمازوں اور خطبوں اور دوسری دعاؤں میں ان پر درود بھیجتے رہے۔ البتہ شیعوں نے اپنے گمان میں ان حضرات کو مخالف اور دشمن اہل بیت قرار دیا ہے تو شیعوں کے اس گمان

سے وہ واقعہ میں اہل بیت کے دشمن نہیں ہو جاتے پھر اہل سنت، اہل بیت کے دشمن کو کس طرح دوست رکھ سکتے ہیں جب کہ خود ان کی کتابوں میں اس مضمون کی صحیح روایات موجود ہیں کہ (ترجمہ: جو شخص آل محمد سے بغض رکھنے کی حالت میں مرجائے تو اگرچہ وہ نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اور طبرانی میں یہ روایات ہیں۔ مَنْ اَبْغَضَ اَهْلَ الْبَيْتِ فَهُوَ مُنَافِقٌ (اہل بیت سے بغض رکھنے والا منافق ہے۔) یا۔ لَا يُبْغِضُنَا اَهْلَ الْبَيْتِ اَحَدٌ وَلَا يَحْسُدُنَا اَحَدٌ اِلَّا ذِيْدَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْحَوْضِ بِسِيَاطٍ النَّارِ (ہم میں سے جو کوئی بھی اہل بیت سے حسد و بغض رکھے گا وہ قیامت کے دن حوض کوثر سے آگ کے کوڑے مار کر بھگا دیا جائے گا۔

اسی طرح ترمذی نے نوادر اصول فی اخبار الرسول میں حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت کی ہے کہ مَعْرِفَةُ اٰلِ مُحَمَّدٍ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَحُبُّ اٰلِ مُحَمَّدٍ جَوَازٌ عَلَى الصِّرَاطِ وَالْوِلَايَةُ لِاٰلِ مُحَمَّدٍ اَمَانٌ مِنَ الْعَذَابِ (آل محمد کی معرفت آگ سے برأت ہے اور آل محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی محبت پل صراط پار کرنے کا پروانہ ہے۔ اور آل محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے دوستی عذاب سے ضمانت ہے۔

بلکہ فاضل کاشی نے بھی جو شیعہ امامیہ کے فضلا میں سے ہے اہل سنت کو کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم کی محبت پر معذور سمجھا ہے۔ اور اہل سنت کی نجات کا قائل ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان کو اس پر جناب باری سے ثواب و اجر کا امید وار قرار دیا ہے۔ یہی نہیں پھر ائمہ کرام کی روایات سے اپنے ان اقوال کو ثابت بھی کیا ہے یہاں ہم اس کے کلام کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ اس دھوکہ کا ازالہ شیعہ فضلاء کی شہادت سے بالکلیہ ہو جائے۔ اَلْمَحَبَّةُ وَالْمُبْغِضَةُ اِذَا كَانَتَا لِلّٰهِ يُؤْجَرُ صَاحِبُهُمَا وَاِنْ كَانَ الْمَحْبُوْبُ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَالْمَبْغُوْضُ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ لِاِعْتِقَادِ الْخَيْرِ فِي الْاَوَّلِ وَالشَّرِّ فِي الثَّانِيْ وَاِنْ اَخْطَاءَ فِيْ اِعْتِقَادِهٖ يَدُلُّ عَلٰى ذَالِكَ مَا رَوَاهُ فِي الْكَافِيْ بِاِسْنَادِهٖ عَنْ اَبِيْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لَوْ اَنَّ رَجُلًا اَحَبَّ رَجُلًا لِلّٰهِ لَاَثَابَهُ اللّٰهُ عَلٰى حُبِّهٖ اِيَّاهُ وَاِنْ كَانَ الْمَحْبُوْبُ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَلَوْ اَنَّ رَجُلًا اَبْغَضَ رَجُلًا لِلّٰهِ اَثَابَهُ اللّٰهُ عَلٰى بُغْضِهٖ اِيَّاهُ وَاِنْ كَانَ الْمَبْغُوْضُ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَلَا يَخْفٰى اَنَّ هٰذَا الْحُبَّ وَالْبُغْضَ يَرْجِعُ اِلٰى مَحَبَّةِ الْمَقَامِ وَالْحَقِيْقَةِ دُوْنَ الشَّخْصِ الْجُزْئِيِّ وَكَذَا الْمُبْغِضَةُ خُصُوْصًا اِذَا لَمْ يَرَ الْمُحِبُّ وَالْمُبْغِضُ مَحْبُوْبَهٗ وَمَبْغُوْضَهٗ وَاِنَّمَا سَمِعَ بِصِفَاتِهٖ وَاَخْلَاقِهٖ وَمِنْ هٰهُنَا يُحْكَمُ بِنَجَاةِ كَثِيْرٍ مِنَ الْمُخَالِفِيْنَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ سِيَّمَا الَّذِيْنَ فِيْ عَصْرِ خَفَاءِ الْاِمَامِ الْحَقِّ الْمُحِبِّيْنَ لِاَئِمَّتِنَا صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ وَاِنْ لَمْ يَعْرِفُوْا قَدْرَهُمْ وَاِمَامَتَهُمْ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ مَا رَوَاهُ الْكَافِيْ بِاِسْنَادِهِ الصَّحِيْحِ عَنْ زُرَارَةَ عَنْ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ قُلْتُ اَصْلَحَكَ اللّٰهُ اَرَأَيْتَ مَنْ صَلّٰى وَصَامَ وَاجْتَنَبَ الْمَحَارِمَ وَحَسُنَ وَرَعُهٗ مِمَّنْ لَا يَعْرِفُ وَلَا يَنْصِبُ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ اُولٰئِكَ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِهٖ وَفِي اِحْتِجَاجِ الطَّبْرَسِيِّ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ اَنَّهٗ قَالَ فِيْ كَلَامٍ لَهٗ فَمَنْ اَخَذَ بِمَا عَلَيْهِ اَهْلُ الْقِبْلَةِ الَّذِيْ لَيْسَ فِيْهِ اِخْتِلَافٌ وَرَدَّ عِلْمَ مَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ سَلِمَ وَنَجَا بِهٖ مِنَ النَّارِ وَدَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ وَفَّقَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَنَّ عَلَيْهِ وَاحْتَجَّ عَلَيْهِ بِاَنْ نَوَّرَ قَلْبَهٗ بِمَعْرِفَةِ وُلَاةِ الْاَمْرِ مِنْ اَئِمَّتِهِمْ وَمَعْدَنِ الْعِلْمِ اَيْنَ هُوَ فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ سَعِيْدٌ وَلِلّٰهِ وَلِيٌّ ثُمَّ قَالَ بَعْدَ كَلَامٍ اِنَّمَا النَّاسُ ثَلٰثَةٌ مُؤْمِنٌ يَعْرِفُ حَقَّنَا وَيُسَلِّمُ لَنَا وَيَأْتَمُّ بِنَا فَذَالِكَ نَاجٍ مُحِبٌّ لِلّٰهِ وَلِيٌّ وَنَاصِبٌ لَنَا الْعَدَاوَةَ يَتَبَرَّءُ مِنَّا وَيَلْعَنُنَا وَيَسْتَحِلُّ دِمَاءَنَا وَيَجْحَدُ حَقَّنَا وَيَدِيْنُ اللّٰهَ

تعالیٰ بالبراءۃ منا فہو کان کافر مشرک فاسق وانما کفر واشرک من حیث لا یعلم کما یسب اللہ عدوا بغیر علم وکذالک یشرک بغیر علم ورجل اخذ بما لا یختلف فیہ ورد علم ما اشکل علیہ الی اللہ تعالیٰ مع ولایتنا ولا یاتم بنا ولا یعادینا ولا یعرف حقنا نحن نرجو ان یغفر اللہ لہ ویدخل الجنۃ فھذا مسلم ضعیف انتھٰی (محبت اور دشمنی جب صرف اللہ کے لئے ہو تو وہ ماجور من اللہ ہے اگرچہ اس کا محبوب دوزخی ہو اور دشمن جنتی کیونکہ اس کو محبوب سے اعتقاد نیک ہوتا ہے اور دشمن سے برائی کا اگرچہ وہ اپنے اعتقاد میں حق بجانب نہ ہو اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو صاحب کافی نے اپنے سندوں سے کافی میں بیان کی ہے کہ ابی جعفر عبداللہ سے روایت ہے کہ فرمایا جس کسی نے کسی سے اللہ کے واسطے محبت رکھی اللہ تعالیٰ اس محبت رکھنے پر اس کو ثواب دے گا۔ اگرچہ اس کا محبوب اللہ کے علم میں دوزخی ہو اسی طرح اگر کسی نے کسی سے اللہ واسطہ کا بیر (بغض) رکھا تو اللہ تعالیٰ اس کے بغض رکھنے پر اس کو اجر دے گا اگرچہ اس کا مبغوض اللہ تعالیٰ کے علم میں جنتی ہو اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ محبت وعداوت حقیقت اور مقام محبت کی طرف لوٹتی ہے نہ اس خاص شخص کی طرف خصوصًا جب کہ محبت وبغض رکھنے والے نے محبوب ومبغوض کو نہ دیکھا ہو بلکہ اس کے اخلاق واوصاف سنے ہوں۔

اسی نظریہ کے تحت ان برائے نام مخالفوں کی نجات کا حکم لگایا گیا ہے جو کسی امام کی پوشیدگی کے وقت موجود ہوں مگر وہ ہمارے ائمہ کرام کے ساتھ محبت رکھتے ہوں گو وہ ان کی پوری قدر ومنزلت اور امامت کو نہ پہچان سکے ہوں۔ اس پر کافی کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جو زرارہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابی عبداللہ سے باین الفاظ روایت کی ہے کہ میں نے آپ سے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے مجھ کو اس شخص کے حال سے باخبر فرمایئے جو نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے محرمات سے بچتا ہے اور خوب تقوے والا ہے مگر ہے ایسے لوگوں میں سے جو نہ ائمہ کے دشمن ہیں نہ ان کی امامت کے قائل ہیں پس آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔

اور احتجاج طبرسی (نام کتاب) میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے دوران گفتگو ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جس نے اسباب کو لیا۔ جس پر سب اہل قبلہ متفق ہیں اور اختلافی بات کو حوالہ خدا کیا تو وہ محفوظ رہا اور اس نے دوزخ سے نجات پائی اور جنت میں جگہ پائی اور جس پر اللہ کا احسان ہوا اسے توفیق ملی اور محبت قائم ہوئی تو اس کے دل کو صاحب ریاست اور معدن علم ائمہ کی معرفت سے منور کیا۔ ایسا شخص اللہ کے نزدیک نیک بخت ہے اور اللہ کا ولی ہے، پھر کچھ مزید گفتگو کے بعد فرمایا کہ لوگ تین قسم کے ہیں ایک وہ مومن جو ہمارا حق پہچانتا ہے ہماری تابعداری اور پیروی کرتا ہے۔ پس وہ نجات پانے والا اللہ کا محب اور ولی ہے۔

دوسرا وہ جو ہم سے عداوت رکھتا ہے ہم سے بیزار ہے۔ ہم پر لعنت بھیجتا ہے ہماری خونریزی کو حلال جانتا ہے ہمارے حق سے انکار کرتا ہے اور ہم سے بیزاری کو اللہ تعالیٰ کا دین کہتا ہے۔ پس ایسا شخص کافر مشرک اور فاسق ہے اس نے لاعلمی میں کفر وشرک کیا جیسے بغیر جانے بوجھے کوئی اللہ کو گالی دیتا ہے اسی طرح یہ بغیر علم کے شرک کرتا ہے۔

اور تیسرا وہ شخص جو متفق علیہ بات کو قبول کر لیتا ہے اور جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے اللہ کے حوالہ کرتا

ہے، ہم سے دوستی تو رکھتا ہے مگر ہماری پیروی نہیں کرتا اور نہ ہم سے عداوت رکھتا ہے۔ نہ ہمارے حق کو پہچانتا ہے۔ تو اس کے بارے میں ہم امید رکھتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ بخش دے اور جنت میں داخل کرے کہ یہ ضعیف الایمان مسلمان ہے۔

فاضل کاشی کا یہ کلام بظاہر تو بڑا معقول اور پر مغز اور نقص سے خالی نظر آتا ہے مگر اس کی تہ اور گہرائی میں جھانکا جائے تو وہ نقص عیاں ہو جاتا ہے اور یہ کلام اصلاح و درستگی کا محتاج نظر آتا ہے۔

اس کلام کا نقص تو یہ ہے کہ یہ ائمہ کرام کے کلام کے خلاف اور متضاد معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ائمہ کرام نے نواصب کو مروز خی کافر اور ناسق فرمایا ہے جب کہ خود کاشی نے کافی سے نقل کیا ہے۔ حالانکہ نواصب اسبات کے مدعی ہیں کہ ائمہ اہل بیت سے ان کا بغض صرف اللہ داسطے کا ہے اور بموجب قول امام مذکور جب ان کا بغض اللہ داسطے کا ہوا تو چاہیے وہ خلاف واقعہ ہو وہ نجات بلکہ ثواب کا موجب ہوگا ایسی صورت میں ان کو کافر و فاسق کہنا کیسے درست ہوگا۔

پھر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے کلام میں تفصیل ہے کہ جو شخص خاندان نبوت سے کم اور کم زور سی محبت رکھتا ہو ان کی واقعی قدر و عزت کو نہ پہچانتا ہو اس کو ناجی قرار دیا ہے اور جو ان کے ساتھ عداوت رکھتا ہو اور اس میں خاندان نبوت سے محبت کی بو تک نہ ہو اس کو ہالک ٹھیرایا ہے اس سے یہ پتہ چلا کہ محبوبان خدا سے عداوت کسی صورت میں عذر پذیر نہیں۔ البتہ محبت و تعظیم کے جتنے درجے ہیں سب مقبول ہیں اور درجہ اولیٰ سے اعلیٰ تک ناجی معذور محبت کے اعلیٰ درجہ میں قصور، وکمی اور چیز ہے، اور عداوت اور چیز! قصور کو نظر انداز اور صاحب قصور کو معذور رکھیں تو بجا و درست ہے، لیکن عداوت میں اس کی گنجائش کہاں۔

اس کلام کی اصلاح و درستگی پورے اور مکمل طور پر تو کتاب کے بارہویں باب تولا و تبرا میں انشاء اللہ پیش کی جائے گی یہاں صرف ناظرین کے انتظار کی تسکین کے لئے مختصر سا بیان کیا جاتا ہے لہذا اس کا مطالعہ نہایت توجہ اور غور سے کرنا چاہیئے۔

اول تو یہ کہ محبوب و مبغوض میں فرق و تمیز کرنی چاہیئے اور یوں سمجھنا چاہئے کہ استحقاق محبوبیت و مبغوضیت دراصل دو قسموں پر منقسم ہے۔

(۱) ایک یہ کہ شارع کی طرف سے اس کا ثبوت قطعی اور تواتر کے ساتھ ہو اس قسم میں خلاف واقعہ اعتقاد کو قابل عفو و درگزر نہیں سمجھنا چاہیئے کہ شرعاً جو محبوب ہو اسے مبغوض خیال کرے اور جو مبغوض ہو اسے محبوب اور اس اعتقاد میں نہ کسی باطل تاویل اور فاسد شبہ کو دخل انداز ہونے دینا چاہیئے اور نہ ایسی باتوں پر کان دھرنا چاہیئے۔

ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاذ اللہ اس شخص کو بھی معذور اور مستحق اجر ماننا پڑے گا جو انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کی لغزشوں کی وجہ سے للہ مبغوض رکھتا ہو اور ابلیس اور فراعنہ کو نیز ائمہ کفر کو صرف اس لئے کہ وہ بھی آخر اللہ کے بندے ہیں اس کی صفات کے مظہر ہیں اللہ داسطے محبوب رکھتا ہو۔

(۲) دوسرے یہ کہ یہ استحقاق بطریق تواتر ہم تک نہ پہنچا ہو۔ اور حضرت ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو اسی پر محمول کرنا چاہیئے اور آپ کا وہ کلام جو مطلق ہے۔ وہ اس بنا پر کہ محبت و بغض جو اللہ داسطے کا ہوگا وہ لا محالہ ضروریات دین کے مخالف نہ ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو آپ کا کلام صاف صاف اس قید کی خبر دیتا ہے جہاں آپ نے فرمایا ہے

وَاِنْ کَانَ فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ خِلَافَ اِعْتِقَادِہٖ - کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ علم کی طرف حوالہ اسی جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے جہاں شریعت سے اس کا قطعی ثبوت صراحت کے ساتھ نہ ہو۔

قسم اول کے محبوبین کی مثال اہل بیت نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) ہیں جن کی شان میں قرآن مجید میں ارشاد ہے قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (آپ فرماتے ہیں تم سے کسی مزدوری کا بجز اپنے عزیز و اقارب سے محبت کے خواہاں نہیں ہوں)

دوسری جگہ یوں ارشاد ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَہْلَ الْبَیْتِ۔ (اے اہل بیت اللہ تعالیٰ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ تم سے رجس دور کردے۔

یا اس کی مثال وہ صحابہ کرام ہیں۔ جنہوں نے بیعت رضوان کی ہجرت و نصرت پیغمبر کے فخر سے سرفراز ہوئے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتدین کے فتنہ کا قلع قمع کرنے اٹھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (ان کو اللہ دوست رکھتا ہے۔ اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں۔) یا یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ (ان کو دوست رکھتے ہیں۔ جنہوں نے ان کی طرف ہجرت کی) یا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (اللہ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے راضی ہیں) یا لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جو ایمان لائے ان کی طرف سے ہمارے دل میں کھوٹ پیدا نہ کر)

اسی طرح قسم اول کے مبغوضین کی مثال ابلیس اور دیگر تمام معاندین کفار ہیں۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا (البتہ شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اس کو اپنا دشمن جانو) یا فرمایا لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ (مومنوں کو چاہیئے کہ وہ مومنین کے علاوہ کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اللہ کی طرف سے اسے کچھ نہ ملے گا (نہ حمایت نہ امداد و نصرت) یا فرمایا۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (تم کسی قوم کو ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاکر بھی ایسے شخص کو دوست بنائیں جس نے اللہ و رسول کی نافرمانی کی ہو۔

ان ارشادات ربانی کی موجودگی میں اب کوئی ناصبی اہل بیت کی عداوت میں اور کوئی رافضی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف بغض رکھنے میں خاص کر ان صحابہ کے بارے میں جنکا شمار مہاجرین اولین اور انصار سابقین میں ہوتا ہے اور جنہوں نے بیعت رضوان کا شرف حاصل کیا اور مرتدین اسلام کو تہ تیغ کیا ہرگز معذور نہیں سمجھا جائے گا ہاں کوئی فرقہ ان بزرگوں کی حقیقی اور واقعی قدر و منزلت سے کم جاننے اور اپنی جہالت یا نادانی کے سبب یا کسی شبہ و تاویل کی بنا پر ان کے کسی مرتبہ یا درجہ کا انکار کر بیٹھے تو وہ البتہ معذور شمار ہوگا۔

جیسے تفضیلی شیعہ یا خود حضرات ائمہ رحمہم اللہ کے وہ دوست یا محب جنہوں نے ان کی امامت کا انکار کیا۔

مثلاً محمد بن الحنفیہ اور زید بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہم چنانچہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے کلام میں بھی اسی قسم کے لوگوں کو معذور قرار دیا گیا ہے۔

قسم ثانی کے محبوبین کی مثال عام نیک بخت مسلمان خصوصًا عام صحابہ عرب اور قریش ہیں اور اسی قسم کے

مبغوضین کی مثال عام فاسق نافرمان، ظالم اور کاذب لوگ ہیں کہ ان ہر دو فریق کی محبت وبغض کا ثبوت شریعت میں اوصاف عامہ کے تحت یا مفہومات کلیہ کے ضمن میں ہے مثلاً فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ط (تحقیق اللہ نیک کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) یا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ (بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ یا فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (بے شک اللہ ان غازیوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، صف بستہ ہو کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ اور فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔) نیز فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ بے شک اللہ تعالیٰ خائنوں کو دوست نہیں رکھتا یا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اُحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلٰثَۃٍ اِنِّیْ عَرَبِیٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِیٌّ وَلِسَانُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ عَرَبِیٌّ (عربوں کو تین باتوں کے سبب دوست رکھو میں عربی ہوں قرآن عربی ہے۔ اور اہل جنت کی زبان عربی ہے۔ یا فرمایا مَنْ اَھَانَ قُرَیْشًا اَھَانَہُ اللّٰہُ۔ وَمَنْ عَادٰی قُرَیْشًا اَکَبَّہُ اللّٰہُ (جو قریش کی اہانت کرے اللہ اس کی اہانت کرتا ہے اور جو قریش سے دشمنی رکھے اس کو اللہ تعالیٰ نگونسار و شرمسار کرے) یا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (اللہ تعالیٰ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا)، نیز فرمایا اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ (سن رکھو۔ جھوٹے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے اور فرمایا یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ (جس دن اللہ اپنے نبی اور اس کے اصحاب کو رسوا نہیں کرے گا۔ اَللّٰہَ اللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ۔ (دیکھو دیکھو میرے بعد میرے صحابہ کو دشمن نہ بناؤ جو ان سے محبت رکھے وہ مجھ سے محبت کے سبب سے ان سے محبت کرتا ہے۔ اور جو ان سے بغض رکھے تو مجھ سے بغض رکھنے کے سبب سے ان سے بغض رکھے گا۔)

اس قسم ثانی کے تمام متعلقہ اشخاص میں سے ہر ایک کی محبت وبغض دو وجوہ سے قطعی الثبوت نہیں اول یہ کہ ان عبارات کے منشاء اور مضمون کا ان خاص خاص ذاتوں میں قطعی طور سے پایا جانا نادر و کمیاب ہے، دوئم مضمون عبارت یا کلام کا کسی جگہ متحقق ہونا حکم کے تحقق اور وجود کے لئے اس وقت تک کافی نہیں جب تک تمام موانع دور نہ ہو جائیں مثلاً محبت میں حب کے موانعات نفاق خبث باطن اور فاسد ارادوں کا نہ ہونا ضروری ہے اسی طرح بغض میں اس کے موانعات یعنی صحت ایمان صفائے باطن، اور صلاح نیت کا رہنا لازمی ہے اور ان موانعات کے دور ہو جانے کا قطعی اور یقینی علم تکمیل وختم نبوت اور سلسلہ وحی بند ہو جانے کے بعد محال ہو گیا ہے۔ (جب تک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ اور سلسلہ وحی جاری تھا کسی بھی معاملہ میں قطعی اور یقینی علم ہو جاتا تھا مثلاً صحیح احادیث میں نعیمان صحابی رضی اللہ عنہ پر باوجود ان کے شرابی ہونے کے برائی سے یاد کرنے اور ان پر لعنت کرنے پر زجر و توبیخ کی گئی آپ نے فرمایا کہ وہ اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہے (اس پر لعنت و پھٹکار نہ کرو) مالک بن دخیش جن کا منافقین میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ ان کا بہی خواہ بھی تھا۔ جب ظاہری حالات کی بناء پر ان کو منافق کہا گیا تو اس کو رد کیا گیا اور اس کے ایمان صحیح ہونے کی توثیق کی گئی۔ ایک اور شخص جو بڑا مسخرہ اور بدزبان تھا اس کے حق میں ارشاد فرمایا گیا۔ خَبِیْثُ اللِّسَانِ وَطَیِّبُ الْقَلْبِ (زبان کا تو گندہ ہے مگر دل کا

پاک ہے، اسی طرح کی اور بہتیری مثالیں ہیں۔
علی ہذا مبت سے متعلق بھی بہت سی روایت اور آثار مروی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ محض گمان اور خیال آرائی پر بھروسہ کرکے کسی کی نجات اور بلندی درجات کی شہادت نہیں دینی چاہیئے تا آنکہ حقیقت حال پوری طرح منکشف نہ ہو جائے۔

بخلاف قسم اول کے جب محبت یا لبغض معینہ اشخاص کی قطعی دلیل سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو گئی تو اب مضمون کلام کا مستحق ہونا اور حکم کا پایا جانا قطعاً لازم ہو گیا۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا حال معلوم ہوا۔
بانوے واں دھوکہ: یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت خلافت و امامت کے معاملہ میں، بزدل کو شجاع پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ خلافت و امامت کا تو مدار ہی بہادری اور شجاعت پر ہے۔ اور کفار کے ساتھ جدال و قتال اور ان پر فوج کشی اس کا خاصہ ہے۔ مزید وضاحت کے طور پر کہتے ہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بہادری اور شجاعت میں تمام عالم میں ضرب المثل اور شہرہ آفاق ہیں۔ بخلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کہ وہ بزدل ہیں۔ جنکی بزدلی پر قرآن کی یہ آیت دلالت کرتی ہے اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ (جب کہ وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ غم نہ کرو) معلوم ہوا کہ غار میں حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) غمگین اور فکرمند تھے۔ اور ایسے صبر آزما مرحلے پر غم کرنا ہی بزدلی کی نشانی ہے"

اس طعن اور طنز کا جواب کئی طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔
اوّل۔ حزن اور غم سے روکنا (صاحب حزن کی) بزدلی کی نشانی بالکل نہیں ہے اس لئے کہ حزن و غم تو شجاع اور بہادر کو بھی ہوتا ہے اس لئے کہ حزن اور غم کے معنی کسی محبوب چیز سے محرومی یا کسی ناگوار چیز کا سامنے آجانا ہے۔ اور یہ شجاعت کے منافی بالکل نہیں ہے۔
چنانچہ رستم جیسے شجاع کو بھی سہراب کے قتل پر غم ہوا۔ اور اتنا ہوا کہ اس نے ماتمی سیاہ لباس پہن لیا۔ ماتم کیا اور گریبان چاک کیا یہ گھر کی بات نہیں یہ واقعہ تو زمانہ بھر میں مشہور ہے۔ ہاں حزن کے بجائے خوف ہوتا تو البتہ قابل توجہ بات ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اگر حزن سے روکنا بزدلی کی علامت ہوتا تو پھر حضرت موسیٰ اور حضرت لوط علیہما السلام پر بھی یہی طعن وارد ہو گا کیونکہ ان حضرات کو تو حزن سے نہیں خوف سے منع کیا گیا ہے یٰمُوْسٰی لَا تَخَفْ (اے موسیٰ ڈرو مت) اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ (کیونکہ میرے رسول ڈرا نہیں کرتے۔ یا فرمایا وَقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (فرشتوں نے کہا نہ ڈرو نہ غم کرو کہ ہم تم کو اور تمہارے اہل کو (اس عذاب سے نجات دیں گے، مگر تمہاری بیوی کہ وہ البتہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے)
یہی نہیں بلکہ بعض نصوص قرآنی میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام واقعی خوف زدہ بھی ہوئے فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں ڈر محسوس کیا۔
تیسرے تاریخ کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ جب کفار مکہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر آپ کا گلا گھونٹا اور دم گھٹنے سے آپ کی مبارک آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آپ کو سخت اذیت ہوئی تو ان کفار کے

ڈر اور خوف کے سبب یار دوست عزیز و اقارب میں کوئی بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب نہ آ سکتا تھا۔ ایسے کٹھن لمحے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کی جرأت تھی کہ وہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد و حمایت میں آگے بڑھے اور مدد فرمائی۔

اسی طرح جب ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیا اور کفار مکہ کے قہر و غلبہ سے آپ کو ڈرایا۔ (اور آپ کو اعلانیہ عبادت اور قرآن پڑھنے سے ازراہ ہمدردی منع کیا) تو آپ نے ہمت و دلیری کا یوں مظاہرہ فرمایا کہ اپنے گھر سے باہر ایک جگہ مخصوص کر کے سب کے سامنے عبادت و تلاوت کا عمل شروع کر دیا اور بلند آواز سے قرأت کی۔

ایسے ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتدوں کے قتل کے معاملہ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (ازراہِ احتیاط) خوف زدہ تھے، جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جس طرح جرأت و ہمت اور دلیری کا اظہار فرمایا اس پر دنیا بھر کے دلیر اور شجاع انگشت بدنداں ہیں۔

چوتھے۔ شیعوں کے شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی کی روایت کے مطابق جو اس نے امالی میں بیان کی ہے شب معراج کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے بعد تم کو وصی، میرا وزیر، میرا خلیفہ بنا دیا ہے اور صاحب فوادر الحکمۃ کی روایت کے بموجب جو اس نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بیان کی یا قطب راوندی کی روایت کے موافق جو اس نے بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے کی، جناب امیر رضی اللہ عنہ معراج کے سفر میں آپ کے ہمراہ تھے اور آپ نے لوح محفوظ کا مطالعہ فرمایا تھا تو ان کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تیس سال زندہ رہوں گا اور امامت و خلافت کی مسند پر فائز ہوں گا اور پھر مجھ کو ابن ملجم مرادی شہید کرے گا تو اس سب کچھ کے باوجود آپ لڑائیوں میں ڈرنے کیوں لگے۔

پانچویں۔ شیعوں کے ہاں یہ بات طے شدہ ہے کہ امام اپنی مرضی اور اختیار سے مرتا ہے ایسی صورت میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ لڑائیوں میں شرکت فرماتے اور دشمنوں کے مقابلہ میں آتے تو آپ اپنی موت اختیار نہیں فرماتے تھے اور آپ کی مرضی کے بغیر موت کا آنا محال تھا۔ بخلاف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ ان کو باجماع امت نہ یہ درجہ حاصل تھا اور نہ ان کو اس قسم کا علم اور یہ بھی ظاہر اور فطری بات ہے کہ جس کو اپنی جان کا خطرہ ہوگا وہ امکان بھر جنگ و جدل میں ملوث ہونے میں پس و پیش کرے گا اور جس کو اپنی جان جانے کا خطرہ نہ ہوگا بلکہ یقین ہوگا کہ وہ ابھی نہیں مریگا اس کو کسی بات کی پرواہ نہ ہوگی تو ایسی صورت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو باوجود جان جانے کے خطرہ اور خوف کے جان نثاری اور جانبازی دکھائیں۔ دین کی نصرت فرمائیں اور مرتدین سے بے دھڑک قتال کریں تو یہ تو جرأت اور بہادری اور انتہائی دلیری اور ثبات قلبی کی دلیل ہے (ان کو کیسے بزدل کہا جا سکتا ہے۔

چھٹے۔ پھر جب خود جناب امیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دلیری اور شجاعت پر گواہی دی ہو تو اس کے بعد ان کو بزدل کہنا خود جناب امیر رضی اللہ عنہ گواہی کا انکار اور رد کرنا ہے چنانچہ محمد بن عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ خَطَبَنَا عَلِيٌّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ مَنْ اَشْجَعُ النَّاسِ فَقُلْتُ اَنْتَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَقَالَ ذَالِكَ اَبُوْ بَكْرِنِ الصِّدِّيْقُ اَنَّهُ لَمَّا كَانَ يَوْمُ بَدْرٍ وَّ صَنَعْنَا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَرِيْشَ فَقُلْنَا مَنْ يَقُوْمُ عِنْدَهُ لَا يَدْنُوْ اِلَيْهِ

اَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَمَا قَامَ إِلَيْهِ إِلَّا أَبُوْبَكْرٍ وَإِنَّهُ كَانَ شَاهِرًا السَّيْفَ بِرَأْسِهٖ فَكُلَّمَا دَنٰى إِلَيْهِ أَحَدٌ أَهْوٰى إِلَيْهِ أَبُوْبَكْرٍ بِالسَّيْفِ۔ (ہمارے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقریر فرمائی اور حاضرین سے پوچھا بتاؤ سب سے زیادہ بہادر کون ہے۔ میں نے کہا اے امیر المومنین آپ! آپ نے فرمایا۔ وہ (بہادر) ابوبکر صدیق ہیں جنگ بدر کے دن ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے گھاس پھونس کا ایک سائبان بنایا پھر لوگوں سے پوچھا کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے آپ کے پاس کون کھڑا ہوگا کسی مشرک کو آپ کے پاس پھٹکنے نہ دے تو اس کے لئے ابوبکر کے سوا کوئی آمادہ نہ ہوا۔ آپ شمشیر برہنہ، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوگئے جب بھی کوئی مشرک ادھر کا رخ کرتا آپ تلوار لے کر اس پر ٹوٹ پڑتے۔

ساتویں۔ ایک ایسا شخص جس سے بہادروں اور دلیروں جیسے کام سرزد ہوئے ہوں، جس کے ہاتھوں امور خلافت و امامت روز روشن کی طرح انجام پائے ہوں اس کے متعلق بزدلی کا دل میں خیال لانا یا یہ کہنا کہ یہ شخص خلافت و ریاست کے قابل نہ تھا نہایت لغو و لچر اور بے معنے بات ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص عین دوپہر کی دھوپ میں بیٹھے آفتاب کی شعاعوں کی روشنی میں سب کچھ دیکھے پھر بھی یہ کہے یا دل میں خیال لائے کہ آفتاب تو تاریک ہے، تو یہ اس شعر کا مصداق ہوا گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ؎ چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔

اور جو شخص واقف سیرت ہو، اور جنگ (فتوحات عراق و شام کے حالات سے بخوبی آگاہ ہو، وہ یقیناً یہ مانے گا اور اس کی گواہی دے گا کہ سخت ہیجان کے وقت دلی مضبوطی ارادہ کی انتہائی پختگی اور اس پر ڈٹے رہنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی ہمسر اور مثیل نہ تھا۔

چنانچہ قاضی فاضل اپنے رسائل میں اس بادشاہ کی مدح سرائی کرتے ہوئے رقمطراز ہے جس نے مختصر سی مدت میں ملک شام کو فرنگیوں کے پنجے سے آزاد کرا لیا ان سے جنگ آزما ہوا اور ان کے قلعوں کو مسمار کیا لَهُ الْعَزَمَاتُ الصِّدِّيْقِيَّةُ وَالْفُتُوْحَاتُ الْعُمَرِيَّةُ وَالْجُيُوْشُ الْعُثْمَانِيَّةُ وَالْهَجَمَاتُ الْحَيْدَرِيَّةُ۔ (جو صدیق رضی اللہ عنہ جیسے پختہ ارادے رکھنے والا اور عمر رضی اللہ عنہ جیسی فتوحات کرنے والا اور عثمان جیسی فوجی طاقت کا مالک اور حیدر جیسا حملہ آور تھا)

البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہادری و قوت بازو، شمشیر زنی، نیزہ بازی پہلوانوں کو پچھاڑنے خود بنفس نفیس معرکہ کار زار اور جنگ و جدل میں حصہ لینے اور دشمنوں میں گھس پڑنے کی جتنی روایات منقول ہیں اتنی دوسرے کے بارے میں نہیں مگر یہ صفات چونکہ ہتھیار، سواری، نیزہ بازی کے فنون اور جنگوں اور میدان جنگ کی تجربہ کاریوں سے تعلق نہیں رکھتی ہیں، اصل شجاعت سے جو ایک قلبی صفت ہے زیادہ تعلق نہیں رکھتی اور ریاست کبریٰ و خلافت میں اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

کیونکہ مثلاً حضرت امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد بہت سے دوسرے ائمہ ان فنون اور باتوں سے بالکل ناآشنا تھے۔ حالانکہ ان سب کو امامت کبریٰ کا مستحق مانا گیا ہے۔

اسی طرح بہت سے بادشاہ مثلاً سکندر اور نگ زیب وغیرہ گزرے ہیں کہ جو شجاع قلب اور شیر افگن تھے مگر میدان جنگ میں کسی ہمسر سے دوبدو نبرد آزمائی یا پہلوانوں سے کشتی لڑنے کا موقعہ پیش نہیں آیا اس کے باوجود ان کی شجاعت میں کسی نے شک نہیں کیا (نہ ان کو بزدل کہا۔) دراصل ان ہر دو صفات شجاعت، جنگی مہارت میں فرق

ہے شجاعت ایک قلبی صفت ہے اور یہ خلقی اور فطری ہوتی ہے جب کہ جنگی مہارت بدنی صفت ہے جو مشقی اور کسبی کام ہے۔ عام اصطلاح میں اس کو فن سپاہ گری بھی کہتے ہیں۔ اور شجاعت کو اس سے بالکل الگ صفت شمار کرتے ہیں۔

دھوکہ (۹۳) شیعوں کا ایک گروہ مثلاً ابن مطہر حلی اور اس کے پیرو اہل سنت پر طعن کر کے کہتے ہیں کہ یہ لوگ مجسمہ مجبرہ ہیں جو تجسیم الٰہی اور جبر مانتے ہیں، حالانکہ یہ طعن بھی حسب عادت افترا اور جھوٹ اور سراسر بہتان ہے اہل سنت تو مجسمہ اور مجبرہ کو کافر بتاتے ہیں ان کے اقوال وعقائد کے رد میں رسالے اور کتابیں لکھی ہیں البتہ ان شیعی حضرات کے سربرآوردہ پیشوا اور راویان اخبار بے شک مجسمہ گزرے ہیں جسکی پوری تفصیل انشاء اللہ آگے بیان ہوگی اور ان ہی میں سے ایک بڑی جماعت مجبرہ کی بھی گذری ہے۔ چنانچہ کلینی خود کافی میں اسے روایت کیا ہے۔

اس سلسلہ میں شہرستانی کے اس قول سے جس میں اس نے اہل سنت کو مجسمہ کہا ہے سند لانا اور دلیل میں پیش کرنا درست نہیں کیونکہ اہل سنت نے اس گروہ کے قول کو بھی رد کیا ہے۔ اگر چہ اہل سنت کے مذہب کی تعبیر میں لفظ جسم آتا ہے مگر اس سے مراد صرف وجود مستقل ہے۔ اور یہ درست ہے اور اسی لفظی اشتراک کے سبب ان کو بھی مجسمہ کہدیا گیا ہے۔

ہاں وجود مستقل پر لفظ جسم کا اطلاق کرنا اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو ابعاد ثلاثہ (طول، عرض، عمق) اور لوازم جسمانیت سے پاک جاننا شبہ کی گنجائش اور اختلاف اسی میں ہے اس لئے کہ اکثر حضرات نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر چہرہ ہاتھ، آنکھ وغیرہ کا اطلاق جائز بتایا ہے مگر ان کے نزدیک بھی ذات باری کو اجزاء میں بٹا ہوا ماننا اور اس حیثیت سے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کا اعتقاد رکھنا گمراہی ہے بخلاف شیعہ حضرات کے کہ وہ ابعاد ثلاثہ کے اعتقاد کے ساتھ ذات باری کی حقیقی جمعیت کو مانتے ہیں اور بعض نے تو ذات باری کی شکل وصورت بھی بیان کی ہے (شنید ہے کہ بعض ملکوں میں ذات باری کے خیالی فوٹو بھی دستیاب ہیں)

اسی طرح اہل سنت جبر و متوسط کو مانتے ہیں جو بالکل حق اور درست ہے جیسا کہ جناب ابی عبد اللہ رحمہ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ نہ پورا جبر ہی ہے اور نہ پوری تفویض بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک چیز ہے۔

دھوکہ (۹۴) کہتے ہیں کہ اہل سنت کی اپنی صحیح کتابوں میں یہ روایت مروی ہے کانت عائشۃ تلعب بالبنات فی بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں گڑیاں کھیلا کرتی تھیں) اب ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف کرنا اور آپ کی زوجہ محترمہ کو متہم کرنا کہ وہ ناجائز مورت بناتی تھیں اور ایسے گھر میں جو اتنے جلیل القدر پیغمبر کی عبادت گاہ ہو اور وحی فرشتوں اور جبرائیل علیہ السلام کی فرودگاہ ان میں حرام صورتوں کو رکھتی تھیں بہت ہی بری اور نازیبا بات ہے حالانکہ خود اہل سنت نے روایت کی ہے کہ جس گھر میں صورت یا بت ہو نماز جائز نہیں اور فرشتے اس گھر میں نہیں آتے اور ان ہی نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے تو وہاں حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے بت رکھے دیکھے تو ان کو باہر نکالنے کا حکم فرمایا۔

اس طنز ودھوکہ کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت پر یہ الزام اس وقت لگانا تو کچھ ٹھیک ہوتا جب وہ بجائے

بنات کے تصویر، تمثال یا صورت کے الفاظ نقل کرتے بنات سے صورت ہی کے معنے کیوں مراد لیئے جائیں اس سے مراد ہی لینا چاہیئے جو اس زمانہ میں مروج و مشہور ہو، چنانچہ اس زمانہ میں گڑیا کی ہیئت کچھ اس طرح ہوتی تھی کہ گول شکل کا ایک کپڑا کترتے، پھر اس کے بیچ میں دوسرے کپڑے کی گول سی لپٹی ہوتی گولی رکھ دیتے اور گول کپڑے کے اطراف کو سیدھی الٹی سمت سے سمیٹ کر گولی کے نیچے دھاگہ سے مضبوطی کے ساتھ سی لیتے۔ کہ وہ گولی آدمی کے سر کی طرح ہو جاتی اور اس کے نیچے کا حصہ آدمی کے دھڑ کی مانند لگتا اس دھڑ میں ہاتھ پاؤں یا دوسرے اعضا نہیں ہوتے تھے نہ گول حصہ میں منہ ناک آنکھ کچھ ہوتا اسی گڑیا کو اوڑھنی، کرتا پہناتے اور تیار کردہ شکل کو کھلونے کے طور پر بنات کہتے اور آج کل طرح طرح کی باریکیوں اور نوع بنوع کاریگریوں کا جو رواج ہے اس زمانہ میں بالکل رواج نہ تھا اور ایک گڑیا ہی کیا رہن سہن کھانے پینے زیورات و ملبوسات فرش و فروش میں جو سادگی تھی اس میں اور آج کل کے تکلفات میں زمین و آسمان کا فرق ہے یہ آج کل کی بت اور صورت سازی تو فقہائے اہل سنت کے نزدیک حرام ہے البتہ ادھوری تصویر جس سے کوئی حکمت دینی مقصود ہو وہ تو جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے مثلاً ایک مرتبہ آپ نے ایک خط کھینچ کر اس انسانی شکل کو ظاہر فرمایا۔ اور دوسرے دو خطوں میں سے ایک سے اجل اور دوسرے سے امل کی تصویر کھینچی ہے اور ایسی گڑیوں کی ایجاد بھی اس لئے تھی کہ چھوٹی بچیوں میں کم سنی ہی سے۔ امور خانہ داری پڑھنے لکھنے، سینے پرونے وغیرہ جیسے کاموں میں دلچسپی اور رغبت پیدا کی جائے جیسے ہر زمانہ میں حسب ضرورت و مناسب حالات بچوں کے لئے طرح طرح کے کھلونے بنائے جاتے ہیں تاکہ کم سنی ہی سے ان کے متعلق معلومات دلچسپی اور واقفیت پیدا ہو، اور ان سے کام لینے کی مشق ابھی سے کرائی جائے۔

علاوہ ازیں اس طنز پر زبان کھولنا اس وقت تو زیب دیتا کہ اس وقت تک تصویر بنانا یا ان کو گھروں میں رکھنا حرام ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گھر میں تصویر رکھنے سے فرشتے گھر میں نہیں آتے تھے اور یہ ثابت کیا بھی کیسے جا سکتا ہے جب کہ قصہ مذکورہ ہجرت کے متصل زمانہ کا ہے اور تصویروں کا مٹانا اور کعبہ سے ان کا نکالنا آٹھ سال بعد کا واقعہ ہے۔ اور کسی چیز کی حرمت سے پہلے کی کسی بات پر نہ طنز درست ہے اور نہ وہ قابل گرفت مثلاً حرمت خمر سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شراب نوشی یا حرمت سود سے پیشتر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا سودی لین دین۔

اور تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ یہاں تو ان شیعوں نے زوجہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خانہ مبارک کی ہمدردی کو اس طعن کی سند بنا کر پیش کیا ہے مگر جہاں ان ظالموں نے ام المومنین صدیقہ و ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہما کی شان میں سراسر جعلی اور گھڑی ہوئی ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن سے ان کا ایمان سلب ہوتا اور یہ کفر و ارتداد تک پہنچ جاتے ہیں وہاں وہ ایسی ہمدردی کو کیوں بھول گئے۔ ان پر وہ مثل صادق آتی ہے، "مرا یاد تو فراموش"، (مجھ کو تو یاد ہے تو بھول گیا ہوگا، انشاء اللہ باب مطاعن اور باب ہفوات میں ہم انکے اسی قسم کے بہت سے کھوٹے اور غیر ٹکسالی سکوں کو گنوائینگے اور ان کا کھوٹ اور جعل برملا بیان کریں گے۔

دھوکہ (۹۵) یہ اہل سنت پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ بے غیرتی بے حجابی اور برے کام پر سکوت اور اس سے نہ روکنے کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لئے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت بایں الفاظ نقل کرتے ہیں۔

اَنَّهَا قَالَتْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلے اللہ علیہ وسلم يَسْتُرُنِيْ بِرِدَائِهٖ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَى الْحَبَشَةِ يَلْعَبُوْنَ بِالدَّرَقِ

وَالحِرَابِ یَومَ العِیدِ (فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر سے میرا پردہ کر لیا اور میں نے ان حبشیوں کا کھیل دیکھا جو عید کے دن اپنے ہتھیاروں سے کھیل رہے تھے)۔

پس اس روایت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر یہ بات آتی ہے کہ آپ نے خود بھی یہ کھیل دیکھا اور عین مسجد میں حبشیوں کے کھیل پر اور اپنی زوجہ مطہرہ کے نامحرموں پر نظر ڈالنے پر سکوت فرمایا اور یہ سب باتیں خلاف شرع اور منافی غیرت ہونے کے ساتھ ساتھ اہل سنت کی اس روایت کے بھی خلاف ہیں جو انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے کہ اَتَعجَبُونَ مِن غَیرَۃِ سَعدٍ وَاَنَا اَغیَرُ مِنہُ وَاللہُ اَغیَرُ مِنِّی (کیا تم کو سعد کی غیرت پر تعجب ہوتا ہے میں ان سے بھی زیادہ غیرت والا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرت والے ہیں)، تو پیغمبر تو پیغمبر کوئی ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی یہ گوارا نہ کرے گا کہ ان کی بیویاں غیروں کو یا ان کے کھیل تماشے کو دیکھیں"

اس طعن کا جواب یہ ہے کہ ان کا اتنا بڑھ چڑھ کر بولنا اسلام کے ابتدائی حالات سے ناواقفیت اور تاریخ سے جہالت کی دلیل ہے۔

اس لئے کہ یہ واقعہ آیت حجاب کے نزول سے پہلے کا ہے جب کہ تمام مسلمان عورتیں حتیٰ کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی محرمات اور صاحبزادیاں گھروں سے باہر آتیں اور باہر کے کام کاج انجام دیتی تھیں، چنانچہ سنی اور شیعوں ہر دو کی روایات سے ثابت ہے کہ خاتون جنت بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے جنگ احد کے موقعہ پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زخم کو دھویا اور دوا لگائی۔ سہل بن سعد اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے یہ واقعہ دیکھا اور اس کی روایت کی۔

تو اگر یہ کسی ایسی بات کی روایت کریں جو آیت تحریم سے پیشتر کی ہو تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی زوجہ مطہرہ رضی اللہ عنہا کی نسبت ہی ہو تو اس پر طعن کا کیا جواز ہے۔

اسی طرح صحیح طریق سند کے ساتھ شیعہ اور سنی دونوں کے ہاں یہ واقعہ ثابت ہے کہ حضرت حمزہ حضرت ابو طلحہ اور دوسرے اصحاب نے شراب پی، مست ہوئے اور باہم دست وگریباں ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ صورت ملاحظہ فرمانے کے باوجود اس پر سکوت فرمایا اور ان حضرات کو کچھ نہ کہا۔

منکر پر سکوت کا الزام تو اس وقت آئے گا جب وہ منکر ہو، اور حرام ہونے سے پیشتر وہ منکر کیسے ہو سکتا ہے۔

پھر ایک بات کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا اس وقت غیر مکلف تھیں کہ عمر ہی کیا تھی۔ اگر کوئی بچی پردہ میں ہو کر کہ غیر مرد نہ دیکھ سکے اس قسم کی جنگی مشق دیکھے تو اس میں قباحت کی بات ہی کیا ہے۔

اور پھر یہ کھیل کود کب تھا۔ ہتھیاروں سے فوجی مشق اور جنگ کی تیاری کے لئے پینترے بازی، آلات حرب کے استعمال کی تربیت کی ایک لائق تعریف شکل تھی؛ گو ظاہر میں کھیل کود لگتا تھا مگر در پردہ اور فی الحقیقت اس میں حکمت ہوتی تھی جیسے گھڑ دوڑ اور نیزہ بازی۔!

ایسے کرتبوں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف ملاحظہ فرماتے بعض اوقات عملی شرکت بھی فرماتے، بلکہ یہاں تک فرمایا کہ اس قسم کے ذہنی کھیلوں میں فرشتے بھی شریک ہوتے ہیں۔

اب رہی بات اس روایت کی جس سے ان حبشیوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جھڑکنا اور ڈانٹنا ثابت ہوتا ہے۔ تو اس کا سبب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے شدت محبت ہے اس محبت ہی نے ان کو

اس پر ابھارا۔ کہ گو یہ فعل شرعاً جائز ہے مگر محبوب کے وقار و شان کے سامنے یہ خفیف الحرکتی ہے جو محب کو بری لگتی ہے اور آپ کا سکوت اخلاق کریمانہ کا مظہر ہے۔ لیکن جب محبوب کا یہ فرمان سنا (دُونَكُمْ يَا بَنِي أَرْفِدَةَ) (اے بنی ارفدہ اطمینان سے اپنے مظاہرہ میں لگے رہو) تو نہ صرف ڈانٹ ڈپٹ ہی سے باز آ گئے بلکہ خود بھی خوشدلی کے ساتھ اسے دیکھا کئے اور سمجھ گئے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مرضی مبارک یہی ہے تو یہ کھیل (اور جنگی مظاہرہ) اہل فضل کے وقار و تمکین سے بھی اونچی کوئی چیز ہے۔

شیعوں کی یہ بات باعث حیرت و تعجب ہے کہ قبل تحریم کے واقعات کو تو یہ بے عزتی اور سکوت منکر کہتے ہیں اور خود ائمہ اطہار سے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لخت جگر اور آپ کے نائب ہیں اور وہ ان کے نزدیک معصوم اور واجب الاطاعت بھی۔ ایسی روایات کی نسبت کرتے ہیں کہ ان کے محبان صادق تو کیا ہر شریف شخص کی زبان ان کی نقل و حکایت سے لڑکھڑاتی اور ان کے سننے سے ہر مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ جو ان کی کتب میں بروایت صحیح منقول ہے کہ حضرت ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دوستوں اور شیعوں سے فرمایا اِنَّ خِدْمَةَ جَوَارِيْنَا لَنَا وَفُرُوْجُهُنَّ لَكُمْ حَلَالٌ (ہماری چھوکریاں ہمارے لئے ان کی خدمت کافی ہے اور ان کی شرمگاہیں تمہارے لئے حلال ہیں)، اسی لغو و بیہودہ روایت پر بنا رکھتے ہوئے شیعہ علماء نے اس وقت کہ امام حق روپوش تھے، جہاد معطل و بیکار تھا۔ خمس مال غنیمت سے علیحدہ نہ ہونے کے سبب اپنے مصرف میں صرف نہ ہوتا تھا اور سارے مال غنیمت سے علیحدہ نہ ہونیکے سبب اپنے مصرف میں صرف نہ ہوتا تھا اور سارے مال غنیمت میں مل کر اس کو بھی خراب کر دیتا تھا، شیعوں کے لئے چھوکریاں حلال ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔

اب ذرا چشم عبرت وا کریں اور اس ناشائستہ لفظ پر غور کریں کہ کیا اس کو غیرت و شرم سے دور کا واسطہ بھی ہے۔

اسی طرح اس فرقہ کے بڑے مفسران قرآن میں سے ایک مفسر مقداد کنز العرفان فی احکام القرآن کا مصنف آیت هٰؤُلَاءِ بَنَاتِيْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ (یہ میری لڑکیاں ہیں اگر تم کرنا ہی چاہتے ہو۔ کی تفسیر یوں کرتا ہے۔ أَرَادَ الْإِتْيَانَ مِنْ غَيْرِ الطَّرِيْقِ الْمَعْهُوْدِ بَيْنَ النَّاسِ (یہاں اتیان سے مراد مقرر اور رائج طریقے کے خلاف طریقہ مراد ہے) یہاں اس ہیچ نہاد مفسر نے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف ایسے شرمناک کام کی نسبت کی ہے جس کو رذیل ترین اور اوباش آدمی بھی اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ شرفاء اور پیغمبر یا پیغمبر زادے۔

اگر کسی شیعی کے دل میں یہ بات کھٹکے کہ گو اسوقت اجنبیوں کے دیکھنے کا حکم تحریم نہ آیا تھا۔ لیکن سلیم الطبع اشخاص کی فطری خصلت اسے عار ہی سمجھتی ہے اس لئے پیغمبر علیہ السلام کو اس کی اجازت نہ دینی چاہیئے تھی بلکہ منع کرنا چاہیئے تھا۔ تو اس کا یہ شک قابل تسلیم نہیں اس لئے کہ طبرسی کی مجمع البیان اور دوسری شیعی تفاسیر میں لکھا ہوا ہے کہ جس وقت خوش جمال اور خوش پوشاک فرشتے مہمانوں کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اس وقت ان کا فرشتہ ہونا ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تو حضرت سارہ علیہا السلام بھی وہاں آئیں اور مہمانوں کی باتیں سن کر ہنسیں بھی مسکرائیں بھی۔

تو حضرت سارہ علیہا السلام کا آنا، غیر مردوں کی باتوں پہ مسکرانا ہنسنا، غیرت و شرم سے کس قدر بعید بات ہے لہٰذا اس سے پتہ چلا عار اور شرم اس وقت لاحق ہوتی ہے کہ ذہنوں میں اس کے متعلق برائی بیٹھی ہو اور برائی دل

میں بیٹھنا حکم شرع کے نزول پر موقوف ہے۔ حکم شرع سے پہلے عار کیسی اور کیوں؟

پھر دنیا بھر کی ان مختلف قوموں کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو مختلف ملکوں، اور شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے ہاں عورتوں کا مردوں سے چھپنا یا ان کی طرف نظر نہ کرنا نہ معمول تھا اور نہ مروج اور نہ معیوب، کیا ان میں کوئی بھی سلیم الطبع فرد موجود نہ تھا ان کے بادشاہ، وامراء تاجر اور صاحب ثروت لوگ تو مسلمانوں سے بھی زیادہ نخوت وتکبر اور اقتدار کے مالک ہیں غیرت وناموس کے بڑے بلند آہنگ دعوی دار ہیں۔ بالخصوص ہند کے راجپوت؛ وغیرہ۔

لہذا حکم شریعت کے نزول سے پہلے ایسے امور کو غیرت کے منافی خیال کرنے اور اس کو بے غیرتی پن سے تعبیر کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ان میں عادی اور خلقی (پیدائشی) باتوں میں فرق وتمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں اور نہ یہی دھوکے کی جڑ ہے۔

پھر مسلمانوں میں مختلف عادات رواج پا گئی ہیں، ان کے امراء وسلاطین باوجود مستحکم اقتدار رکھنے اور غیرت وشرم کے بڑے بڑے دعوؤں کے اپنی بیگمات کو بالاخانہ اور جھروکوں میں بٹھا کر فوجی مشقوں، جانوروں کی لڑائیوں یا مردوں کے دوسرے کھیل تماشے دکھاتے ہیں جنگلوں باغات اور دریاؤں، سمندروں کی سیر کراتے ہیں البتہ اس کا ضرور خیال اور اہتمام کرتے ہیں۔ کہ غیر مردوں کی نظر ان پر نہ پڑے۔

علاوہ ازیں عورتوں کا اجنبی مردوں کو ایسی حالت میں دیکھنا کہ ان کا ستر کھلا ہوا نہ ہو بالاجماع حرام نہیں ہے بلکہ یہ اختلافی مسئلہ ہے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اجنبی مرد کو دیکھنا عورت کے لئے اسی طرح حرام ہے۔ جس طرح اجنبی عورت کو کسی مرد کا دیکھنا حرام ہے۔ اور اکثر شرعی دلائل اور قرون سابقہ خلفائے عباسیہ کے عہد تک کے حالات اسی اخیر قول کے مؤید ہیں۔

پس ایسے فعل کو بری نظر سے دیکھنا یا اس پر اظہار تعجب کرنا جس کے جائز وحرام ہونے میں اختلاف موجود ہو بجائے خود محل نظر ہے! اور بالفرض اس کو حرام بھی مان لیں تو وہ واقعہ اس وقت کا ہے جب آیت حجاب وتحریم نازل نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر یہ بات کیوں فراموش کردی جاتی ہے، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے شارع ہونے کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے اور ان امور میں طرز گفتگو اور اعتراض کا لہجہ ایسا کیوں اختیار کیا جاتا ہے جیسا عام آدمی کے متعلق ہوتا ہے نبوت کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر قول ہر فعل ہر حکم، اور سکوت بجائے خود شریعت ہے چاہے اس کے متعلق کوئی حکم نازل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور یہ کس کو معلوم نہیں کہ آیت تحریم کے بعد بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کم ازکم مستورات نمازوں کے لئے تو مسجد نبوی میں آتی ہی رہی ہیں۔ کیا وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر تشریف لاتی تھیں کہ کسی مرد پر نظر نہ پڑ جائے۔

آیت تحریم کے بعد بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا صحابیات کو مسجد میں آنے سے نہ روکنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا اجنبی مردوں کو دیکھ لینا حرام نہیں! (نعمانی) اور پھر وہ کھیل لہو ولعب کے تماش کا نہیں تھا فنون سپہ گری کا مظاہرہ تھا، دیکھنے والیاں بھی ان کرتبوں کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ مردوں کو تاک جھانک تو ان کے حاشیہ خیال تک میں نہ تھی۔

اس میں نہ کوئی اعتراض کی بات ہے نہ تعجب کی، تعجب اور ماتم تو ان لوگوں پر کرنا چاہئیے جنہوں نے چھوکریوں کی شرمگاہوں کو اپنے لئے حلال جانا جس کو سبھی لوگ ننگ و عار سمجھتے اور نازیبا و ناشائستہ حرکت خیال کرتے ہیں ان کے لئے کیسے قابل قبول اور لائق تسلیم ہو گیا۔

دھوکہ (۹۶):۔ ان کا ایک طنز اہل سنت پر بصورت الزام یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صحاح میں یہ قصہ بیان کیا ہے کہ ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے پاس قبض روح کے لئے آئے تو آپ نے ان کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا کہ ملک الموت کی ایک آنکھ جاتی رہی حالانکہ اس واقعہ میں کئی قابل اعتراض باتیں ہیں۔ اول یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدائی فیصلہ پر راضی نہ ہوئے۔ دوسرے۔ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کیا۔

حالانکہ خود اہل سنت نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ من کرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقائہ (جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات پسند نہیں فرماتا)

تیسرے یہ کہ کیا ملک الموت اتنے کمزور، عاجز اور بے اختیار ہو گئے تھے کہ تھپڑ کھایا آنکھ گنوائی مگر اتنا نہ ہو سکا کہ روح قبض کر لیتے آخر ناکام ہو کر واپس ہوئے اور خالق الموت والحیات کے دربار میں شکایت کی یہ ساری خرابیاں اصول شریعت کے خلاف ہیں۔

اس طنز کا جواب یہ ہے کہ روح قبض کا عمل دو طریقوں پر ہوتا ہے، پہلا طریقہ تو یہ ہے جو ملک الموت عام مخلوق کے ساتھ برتتے ہیں کہ اس کو بغیر کوئی اختیار دیئے اور بے پوچھے اور بتائے بغیر کہ میں ملک الموت ہوں اگر اجازت ہو تو ایسا کروں اس کی روح قبض کر لیتے ہیں دوسرا طریقہ وہ ہے کہ جو وہ پیغمبروں کے ساتھ اختیار کرتے ہیں کہ اول تو اپنا تعارف کراتے ہیں کہ میں ملک الموت ہوں پھر چلنے اور رہنے کا اختیار دیتے ہیں اور یہ پیغام دیتے ہیں۔ ارجعی الی ربک (اپنے رب کی طرف لوٹ چلئے) چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام لقاء رب کے انتہائی شائق ہوتے اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اس لئے ان سے قبض روح کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ جب اجازت لے چکتے ہیں تو اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

پس موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہلی مرتبہ اسی عام طریقہ سے آئے نہ اپنا تعارف کرایا نہ ہی شکل و صورت فرشتے کی سی تھی اس لئے موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھ سکے کہ کون ہیں۔ اور کیوں آئے ہیں۔ بلکہ انسانی شکل میں ہونے کے سبب یہ سمجھے کہ کوئی دشمن ہے جو قتل کرنے کے لئے آیا ہے۔ جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان دو فرشتوں کو جو محراب کی دیوار پھاند کر اندر آ گئے اور آپس میں جھگڑنے لگے اپنا دشمن خیال کیا اور چلا اٹھے قرآن مجید میں بھی اس کا قصہ ہے اور اسی طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اعرابی سائل کی شکل میں دیکھ کر نہ پہچانا حالانکہ جبرئیل علیہ السلام سے آپ کو اتنا لگاؤ اور اتنی زیادہ مجالست رہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کا دسواں حصہ بھی میسر نہ تھا اور دشمن سے ہر ممکنہ طریقہ پر دفاع ضروری اور لازمی ہے اس لئے انہوں نے ملک الموت کے ساتھ یہ برتاؤ کیا دشمن سمجھ کر کیا اور ملک الموت نے خصوصی طریقہ اختیار نہیں کیا تھا۔ پھر ان کے مرتبے، نبوت اور اس قرب سے جو جناب باری سے ان کو تھا۔ واقف تھے۔ اس لئے مار کھا کر بھی ان کے سامنے جھک گئے اور کوئی حرکت نہ کی اور آخر تک اپنی حیثیت ظاہر نہ کی پھر دربار الٰہی میں حاضر ہو کر روداد بیان کی اور جو واقعہ گزرا تھا۔ عرض کیا

پھر دوسری مرتبہ اسی اصول و امتیاز کے ساتھ جو انبیاء کرام کے لئے مخصوص تھا ملک الموت کو بھیجا گیا تب انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور موسیٰ علیہ السلام کو چلنے یا رہنے کے متعلق اختیار دیا، تو آپ نے چلنے پر آمادگی ظاہر فرمائی اور اتنی مہلت مانگی کہ زمین مقدس کے نزدیک پہنچ جاؤں تو اپنا کام کر گزرنا۔

اب ذرا اس پر انصاف کی نظر ڈال کر دیکھ لیجئے اس میں اعتراض کی کیا بات ہے اور کونسی خرابی لازم آتی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی آخری گھڑی یہی مقرر تھی اس لئے اس میں موت کے ٹل جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اور ملک الموت فرشتگانہ طاقت و قوت کے مالک ہوتے ہوئے بھی بہت سی جگہ سپاہیانہ ہو جاتے ہیں ان میں مرتبہ شناسی ہوتی ہے حفظ مراتب کا خیال اور تعظیم کا لحاظ رکھتے ہوئے اجازت طلب ہوتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کا واقعہ جو امام جعفر سے شیعہ سنی دونوں کے ہاں منقول ہے۔

اور جب موسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہ ملک الموت ہیں اور بحکم الٰہی روح قبض کرنے کے لئے آئے ہیں، تو اس میں تقضائے الٰہی سے ناخوشی اور لقاء رب سے ناپسندیدگی کا سوال ہی کہاں سے نکل آیا۔

اب ہم اس حکایت کو لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو پہلی دفعہ ہی اس ہیئت اور شکل میں کیوں نہ بھیجا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو پہچان کر مقصد آمد جان جاتے تب نہ جیل و حجت کا موقعہ آتا نہ مارپیٹ کی نوبت آتی تو اللہ تعالیٰ کے معاملات اور طریقے اپنے مخصوص بندوں کے ساتھ جس تنوع کے ہیں ان کی حکمتوں مصلحتوں اور اسرار و رموز تک جو بہت نازک باریک اور گہرے اور پوشیدہ ہیں ہر ذہن کی رسائی نہیں ہوتی اگر کوئی اپنے مذاق و مشرب کے مطابق حکمت کلام، تصوف اور فقہ سے اخذ کر کے یا سنی، شیعہ معتزلہ کے مذاہب کے اصول کی بنا پر لب کشائی کرے اور کوئی ایک آدھ نکتہ بیان کر دے تو اس نکتہ کی حقیقت اور واقعہ سے اتنی سی نسبت ہوتی ہے، جیسے قطرہ کی دریا سے یا ذرہ کی صحرا سے اسلئے اہل تحقیق نے ان اسرار و رموز کے علم کو اللہ کے حوالے کیا اور خود مہر بلب ہو رہے۔ اور عقل اجمالی طور پر اتنا جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بعض معاملات میں بعض بندوں کو مخصوص کر لینا کئی اسباب سے ہوتا ہے کبھی درجات قرب کے لحاظ سے کبھی لطائف روحیہ کے درجات کے مطابق اور کبھی ان اسماء و صفات الٰہی کے باعث جو اس بندہ کے مربی ہوتے ہیں انہیں اسباب پر مبنی ہوتا ہے بعض بندوں کا مخصوص کر لینا بعض رنگوں اور شکلوں کے ساتھ رزق کی فراخی و تنگی کے ساتھ، عمر کی درازی یا کوتاہی کے ساتھ،

چنانچہ بعض اسباب کا اہل طبائع یا اطبا کی نظر سراغ لگا لیتی ہے، تو بعض تک اہل نجوم و احکام کی غور و فکر پہنچ جاتی ہے۔

غرض کارخانہ خداوندی کا احاطہ اس کی ذات کے سوا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اسوقت اگر ہم اس معاملہ کے کہ جس کو علم تاویل الاحادیث کہتے ہیں جو باریک بھی ہے اور باریک اصولوں پر مبنی، بھی اسباب کو حل کرنے بیٹھیں تو موضوع اور مذاق کتاب سے بہت دور جا پڑیں گے اور پھر سامع کے اکتا جانے اور گھبرا جانیکا باعث بھی ہوگا۔

دھوکہ (۹۷) ایک الزام اہل سنت پر یہ لوگ یہ بھی لگاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی صحاح میں ایسی روایات بھی درج کی ہیں جن سے حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف شک کی نسبت پائی جاتی ہے مثلاً یہ حدیث جس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى

دہم ابراہیم سے زیادہ شک کے حقدار ہیں، جس کا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مردوں کی دوبارہ زندگی کی کیفیت معلوم کرکے کیا رَبِّ اَرِنِی کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی۔

اس طعن کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ خود شیعوں نے حضرت حلیمہ سعدیہ کے مکالمہ میں جو حجاج کے ساتھ ہوا جس کا بیان اوپر آچکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے اور صرف ایک ہی پیغمبر کے متعلق شک کا اظہار طعن وتشنیع کے لئے کافی ہے تو جس بات کا اہل سنت کو الزام دیتے ہیں خود اسی الزام کے مورد ہیں۔ جب دونوں ہی اس میں شریک ہیں تو اہل سنت ہی کو اس کے لئے مخصوص کیوں کیا جاتا ہے۔

دوسرے۔ یہ کہ یہ حدیث شریف قیاس استثنائی کے معنے میں ہے، کہ اس میں نقیض ثانی کی استثنائی ہے تاکہ اس سے نقیض مقدم نتیجہ حاصل ہو۔ دراصل اس کلام سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ شک کے ہونے اور یقین کے حاصل نہ ہونے پہ دلالت کرتی ہے بلکہ آپ کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک ہوتا تو ہم کو بھی شک ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ہم ان سے زیادہ شک کے حقدار ہیں۔ اور جب ہم کو شک نہیں تو لامحالہ ان کو بھی شک نہیں تھا۔ تو گویا آپ کا سوال صرف علم الیقین سے ترقی کرکے عین الیقین تک پہنچنے کے لئے ہے، اور اگر کلام کو ظاہر پہ محمول کریں تو بھی درست ہے اس لئے کہ شک یقین کے مقابل ہے اور جس طرح یقین کے درجے تین علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین ہیں اسی طرح شک کے بھی تین ہی درجے ہیں، لہذا یہاں شک سے مراد یہ ہے علم الیقین رکھتے ہوئے عین الیقین کا حاصل نہ ہونا اور پھر عین الیقین کا حاصل نہ۔ ورنہ کوئی نقص یا عیب تو نہیں یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ انبیاء کرام علیہ السلام تمام امور غیبیہ کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے ملاحظہ فرمائیں اور نہ شیعوں اور سنیوں میں سے کوئی بھی اس کے واجب ہونے کا قائل ہے۔ پس اس صحیح مطلب کو تو جو راہ حق سے ذرا بھی ادھرادھر ہٹا ہوا نہیں ہے یہ مورد الزام ٹھیراتے ہیں اور اپنے ہاں جو انہوں نے انبیاء کرام کے حق میں قابل الزام روایات کو اپنی کتابوں میں بھر رکھا ہے۔ اس کو بھول گئے چنانچہ اس کا کچھ حصہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پہ انشاء اللہ باب نبوت میں ذکر کیا جائے گا اور اس سے ان کے اس عقیدہ کی قلعی کھل جائے گی جو یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق رکھتے ہیں۔

دھوکہ (۹۸) یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت نے یہ روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ بولے ہیں حالانکہ انبیاء کرام کا جھوٹ سے پاک ہونا بالاتفاق واجب ہے ورنہ پھر ان کی تبلیغ پر سے اعتماد اٹھ جائے اور بعثت کی غرض مفقود ہو جائے گی، اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں جھوٹ سے مراد تعریض ہے جو صورۃً تو جھوٹ دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت سچ ہے، چنانچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاحات میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا اَنَّھَا لَا تَدْخُلُ الْجَنَّۃَ (بوڑھی عورتیں جنت میں داخل نہیں ہوں گی)، یا فرمایا اِنِّی حَامِلُکَ عَلٰی وَلَدِ نَاقَۃٍ میں تجھے اونٹنی کے بچہ پر سواری کراؤں گا، اِنَّ فِی عَیْنِ زَوْجِکِ بَیَاضًا (تیرے شوہر کی آنکھ میں سفیدی ہے)

اسی قسم کی اور مثالیں ملتی ہیں اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی بہت سی تعریضات مروی ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ تین جھوٹ بھی اسی نوعیت کے تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنی زوجہ کو تشدد کے خوف سے بہن بتایا اور اس سے مراد اسلامی اخوت تھی اور اِنِّی سَقِیْمٌ فرمایا تو اس سے غرض روحانی کدورت اور پژمردگی

تھی جو جسمانی مرض سے زیادہ سخت چیز ہے اور نَعۡدَۃً کَبِیۡرُھُمۡ کفار کو الزام دیتے ہوئے بطور فرض فرمایا۔ تو ان باتوں کو جھوٹ کہنا محض جھوٹ سے مشابہت رکھنے اور ہم شکل ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ایک ضروری مصلحت کی بنا پر تھا۔ کیونکہ کسی ظالم کو اپنے مال، جان اور آبرو سے باز رکھنے میں اگر صاف جھوٹ بولنا پڑ جائے تو اس کی بھی شرعاً اجازت ہے تعریضیں تو جھوٹ ہے ہی نہیں، بہر حال ان صحیح المعنی روایات کو مورد الزام ٹھیرانا اور اپنی ان روایات کو بھول جانا یا پس پشت ڈال دینا جو انبیاء کرام علیہم السلام کے پاک دامن پر برائی اور الزام کا دھبہ لگاتی ہیں انتہائی ڈھیٹ پن اور حد درجہ بے شرمی ہے۔

آگے چل کر باب نبوت میں انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ بعض انبیاء کو تو یہ وحی سے بھی منکر مانتے ہیں۔ بعض پر حسد بغض و عناد کا اتہام لگاتے ہیں اور بعض کو گناہ کبیرہ کا مرتکب ٹھیراتے ہیں ان کے ہاں تو بطور اعتقاد یہ تک ملتا ہے کہ انبیاء پر کفر کا اظہار بطور تقیہ واجب ہے،

اہل سنت کو الزام دینے سے پہلے ان کو چاہیئے کہ اپنے عقائد اور ان روایات کا مقابلہ و موازنہ ان تعریضات سے کریں، پھر زبان کھولیں،

دھوکہ (۹۹) :۔ ایک طعن یہ کرتے ہیں کہ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت ہے کہ اِنَّ الشَّیۡطَانَ یَفِرُّ مِنۡ ظِلِّ عُمَرَ (شیطان حضرت عمر کے سایہ سے بھی بھاگتا ہے) حالانکہ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت انبیاء کرام علیہم السلام پر ظاہر ہوتی ہے، اس لئے کہ انبیاء تو نصوص قرآنیہ کے بموجب شیطان سے محفوظ نہ رہ سکے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا، فَوَسۡوَسَ اِلَیۡہِ الشَّیۡطَانُ، (شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ھٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّیۡطَانِ (یہ شیطان کا کام ہے) حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا، اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطَانُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ (بے شک چھوا مجھے شیطان نے دشمنی اور تکلیف کے ساتھ) پھر تمام رسولوں اور نبیوں کی شان میں ارشاد ہوا ہے، وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطَانُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِہٖ، (آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان کی تمنا میں شیطان نے گڑبڑ نہ کی ہو) اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیات و احادیث ہیں اب جب کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا بلکہ ان کے سائے سے بھی بھاگتا ہے اور انبیاء و رسل کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ ان کے دلوں پر قبضہ پا کر ان میں وسوسہ ڈالتا ہے تو لامحالہ حضرت عمر انبیاء سے افضل ہوئے اور یہ بات بالاجماع غلط و باطل ہے،

ان کے ہاں یہ الزام بڑا معرکۃ الآراء سمجھا جاتا ہے اور ان کے ہاں کے اہل علم اس شبہ کو بیان کرکے بڑی خوشی اور فخر کا اظہار کرتے ہیں،۔

اہل سنت کی طرف سے اس الزام کا جواب کئی انداز اور وجوہ سے دیا جاتا ہے اوّل ہم خود ان شیعوں سے پوچھتے ہیں کہ تم ان آیات مذکورہ یا ان جیسی دوسری آیات کی روشنی میں انبیاء پر شیطان کا عمل دخل مانتے ہو یا نہیں اگر مانتے ہو تو انبیاء و آئمہ کرام کی عصمت کا عقیدہ تمہارے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اور نہ ماننے کی صورت میں ان آیات کی تاویل کرکے انبیاء کرام کی عصمت شیطان سے محفوظ و برقرار رکھو گے تاکہ ان کی ذات پہ کوئی الزام نہ آئے، اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس صفت میں انبیاء کرام کے شریک ہو جائیں گے اور اس میں

کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ بعض اولیا انبیاء کے ساتھ بعض صفات میں شریک ہو جاتے ہیں، البتہ ان میں فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام پر شیطان کا تسلط اور غلبہ نا ممکن ہے اور ان کے اسی مرتبہ کا نام عصمت ہے اور اولیاء پر شیطان کا غلبہ ممکن ہے، اور ان کے اس مرتبہ کا نام محفوظیت ہے، شیطان کا غلبہ ممکن ہے اور ان کے اس مرتبہ کا پتہ بعض قرآنی آیات سے بھی چلتا ہے کہ خدا کے بعض بندے بھی شیطان کے تسلط سے مامون ہیں، یہ خاصہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے، إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ بے شک میرے خاص بندوں پر تجھ کو غلبہ حاصل نہیں ہوگا، نیز فرمایا إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (مگر ان میں سے تیرے بعض مخلص بندے) تو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار بھی ایسے بندوں میں ہو جائے تو اس میں کونسی شرعی یا عقلی خرابی لازم آتی ہے،

اب رہے یہ الفاظ کہ فلاں، فلاں کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ تو یہ محض ایک مثال ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ ان الفاظ کو حقیقی معنے پر محمول کر کے دور از عقل معنے پیدا کریں۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ شیطان ان کو بہکانے میں بے بس ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے اس فرمان قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ (دیکھئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو) میں مراد بچتے ہو، ہے یا فرمایا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ (وہ دیوار جو ٹوٹا ہی چاہتی تھی) اس میں گرا ہی چاہتی تھی مراد ہے،

دوسرے۔ شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈر کر بھاگنا اور انبیاء و رسل سے نہ ڈرنا اس بات سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت انبیاء کرام پر ثابت نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ چور کوتوال، اور پہرے دار سے اور راہزن فوجدار سے جتنا ڈرتے اور کانپتے ہیں اتنا بادشاہ وقت سے نہیں کیونکہ کوتوال اور فوجدار کی تو ڈیوٹی اور فرض ہی یہ ہے کہ مفسدوں چوروں ڈاکوؤں سے ملک و شہر کو پاک کریں اسی لئے یہ مفسدوں اور چوروں کے مکر و فریب اور ہتھکنڈوں کو بادشاہ کی نسبت زیادہ جانتے اور پہچانتے ہیں بادشاہ کو ملکی مہمات اور معاملات میں الجھ کر یہ موقع کہاں کہ وہ چوروں کی نفسیات اور ان کی وارداتوں کی ٹوہ لگائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ عہدہ احتساب سے سرفراز تھے اس لئے بدکردار اور بد افعال اشخاص جو در پردہ شیطانی گرگے تھے ان سے لرزاں و ترساں رہتے تھے بلکہ ان کے احتساب کو تو دریائے نیل بھی مانتا تھا۔ کہ ان کے حکم پر جاری ہوا۔

خلاصہ کلام یہ کہ شیطان کا کسی شخص یا چیز سے ڈرنا اس شخص یا چیز کی اصلیت کو اس شخص یا چیز پر ثابت نہیں کرتا جس کی افضلیت قطعی الثبوت ہے،

مثلاً اذان کے بارے میں فریقین کے ہاں بروایت صحیح مروی ہے کہ اذان سن کر شیطان گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے اور پھر نماز میں آموجود ہوتا ہے اور وسوسے ڈالتا ہے حالانکہ یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ نماز تمام اصل عبادات میں افضل ہے چہ جائیکہ اذان کہ وہ تو وسیلہ نماز ہے نہ اصل عبادت ہے نہ فرض، اور نماز سے اس کی برابری کا سوال ہی نہیں اسی صورت پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے معاملہ کو قیاس کرنا چاہیئے

تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام تو شیطانی مکر و فریب اجمالی طور پر بیان کر کے اس کے راستے بند فرماتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے مکر و فریب کا پوسٹ مارٹم کر کے اس کے سارے انجر پنجر کو جانچتے اور پرکھتے ہیں، اور بہکانے، گمراہ کرنے کے ذرائع و وسائل، اور اوزاروں کی تفصیلی جانچ پڑتال کرتے اور ان کا توڑ تلاش

کرتے ہیں

اور چونکہ عقل مدرک (سمجھنے والی) احکام کلیات کی ہے اور وہم جزوی احکام کا مدرک ہے، اور وہم ہی قوی کیا پورے وجود انسانی پر حکمرانی کرتا ہے اور اکثر لوگوں میں اکثر اوقات عقل پر غالب رہتا ہے اور عقل کے خوف وڈر کو خاطر میں نہیں لاتا نہ اس کے خوف سے اپنی مملکت اعضائے انسانی میں من مانے احکام صادر کرنے سے باز رہتا ہے نہ عاجز ہوتا ہے جب تک وہ خود ہی کسی بات یا چیز سے خائف نہ ہو جائے شیطان بھی جب تک اس کی مدد اور موافقت نہ حاصل کرلے کوئی کام انجام نہیں دیتا۔ وہم شیطان کا اتنا بڑا ہتھیار ہے کہ وہ ساتھ نہ دے تو شیطان مفلوج ہو کر رہ جائے،

لہٰذا ان وجوہ سے شیطان حضرت عمر سے خائف ہوگا انبیاء کرام سے نہیں اور یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا ان جیسی ہستیوں کی فضیلت کی نہیں بلکہ یہ چیز ان کی جزئی کارگیری اور باریک بینی سے حاصل ہوئی ہے جسے فراست مومنانہ بھی کہا جاسکتا ہے، جو انبیاء کرام علیہم السلام ہی سے ماخوذ اور ان کے انوار و تجلیات کا پرتو ہے یہ زیرکی و دانائی اور ژرف نگاہی نور نبوت ہی کا فیضان ہے،

چوتھے یہ کہ انبیاء کرام تو جنت کی نعمتوں کی امید دلا کر، اور دوزخ کے شدائد اور ہولناکیوں سے ڈرا کر، طاعت کی طرف راغب اور معاصی سے نفور و خائف کرتے ہیں، اول تو یہ باتیں نظر سے غائب ہیں، اور بہت سے لوگوں کی عقل میں بھی نہیں آتیں۔ دوسرے یہ صرف وعدہ و وعید ہے اور وہ بھی حشر کے دن کا! اور ایسے آدمی کو شاذ و نادر ہی ملیں گے جو ان وعدوں پر ایسا ایمان رکھتے ہوں جیسا کہ آنکھوں دیکھی چیز پر، اور جن کو انبیاء کرام علیہم السلام کے وعدوں پر اعتماد کلی ہو!

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا ان جیسی ہستیاں دنیاوی نعائم کے ساتھ رغبت دلا کر یا ڈنڈے کے زور سے اطاعت کی طرف راغب کرتی اور برائیوں سے باز رکھتی ہیں۔ پھر دنیا کے اکثر لوگ تو ترت فائدے اور نفع ہی کو قابل توجہ سمجھتے اور یہیں کے مکافات عمل سے ڈرتے اور خوف زدہ ہوتے ہیں، اس لئے لامحالہ شیطانی فوج اور اس کے گرگے، عمری دبدبہ و قہر سے زیادہ خائف اور ان کے نام سے لرزہ براندام تھے، نہ کہ انبیاء سے، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے، اَلسُّلْطَانُ یَزَعُ اَکْثَرَ مِمَّا یَزَعُ الْقُرْاٰنُ (قرآنی بندوبست سے زیادہ سلطانی بندوبست درست ہوتا ہے) اردو میں بھی ایک مثل مشہور ہے کہ " مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے " جو جن بھوت تعویذ گنڈوں سے نہ بھاگے اس کی اگر پٹائی کردی جائے تو فوراً دفع ہو جاتا ہے پانچویں یہ روایت بھی اس طعن کے بجائے ادھیڑتی ہے جو شیعوں اور سنیوں دونوں کی کتب میں موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آپ کے احباب اور دوستوں کے مراتب دریافت کیے گئے تو آپ نے فرداً فرداً بیان فرمائے اور حضرت عمار کے فضائل میں یہ الفاظ فرمائے ذَالِکَ الَّذِیْ اَجَارَہُ اللّٰہُ عَنِ الشَّیْطَانِ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّکُمْ یہ وہ ہستی ہے جس کے شیطان سے پناہ میں رہنے کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دلوائی) اس روایت سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا شیطان سے محفوظ ہونا ثابت ہوتا ہے، تو چاہیئے انہیں بھی انبیاء کرام علیہم السلام پر فضیلت ہو، (اور کسی کے نزدیک بھی ایسا نہیں ہے)، بہر حال عمر ہوں یا عمار مادہ دونوں کا مشترک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عمار خود شیطان سے محفوظ ہیں اور حضرت

عمر رضی اللہ عنہ خود محفوظ ہونے کے ساتھ شیطان کے لئے ہوّا بھی ہیں، کہ ان کے سایہ تک سے لرزتا ہے اور میدان چھوڑ بھاگتا ہے، اب اگر طعن کرنے والوں کی منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو بدیہی نتیجہ نکلے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام نعوذ باللہ، شیطان سے محفوظ نہ رہ سکے اور حضرت عمار کی محفوظیت کی لسان نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی تو گویا یہ بھی انبیاءؑ سے افضل ہوئے،

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں　　لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔

دھوکہ (۱۰۰) امامیہ کہتے ہیں کہ کتب صحاح میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بہشت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے آگے آگے دیکھا اور ان کی جوتی کی آواز آپ کی سماعت میں آئی، اعتراض ان کا یہ ہے کہ اس روایت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام کی حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر فضیلت لازم آتی ہے، اور یہ بڑی ناروا بات ہے۔

اس اعتراض میں بڑے ظلم اور تعصب سے کام لیا گیا ہے، اس لئے کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا بہشت میں آگے چلنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے زمین پر تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ آگے آگے ہی چلتے تھے تاکہ راہ کے موانعات اور تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دیں (حمالۃ الحطب کی طرح بہتیرے آپ کے دشمن تھے آپ کی ایذا رسانی کے لئے کچھ بھی آپ کے راستے میں ڈال سکتے تھے یہ بھی نہ ہو تو راستہ میں اینٹ، پتھر اور روڑے تو ہوتے ہی ہیں نعمانی) اور وہ اینٹ پتھر جو بھی ہوتا اٹھاتے اور آپ کے لئے راستہ صاف کرتے تھے، عام طور پر خدام اسی لئے رکھے جاتے تھے اگر ان کو اس کام کے لئے خاص طور پر نہ بھی رکھا جاتا تو خدام از خود اسے اپنا فرض قرار دے لیتے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو کہ آقا کو کلفت اور بے آرامی ہو۔

اور اس وقت یہ رسم غایت ادب کی علامت اور نشانی تھی۔ اور خدام کا یہ عام معمول تھا کہ اپنے آقا و مخدوم کے آگے آگے چلیں، (اور اس کا مشاہدہ آج بھی برأی العین کیا جا سکتا ہے۔ سلاطین زمانہ اور حکام وقت کے باڈی گارڈ کہاں چلتے ہیں؛ پیچھے ہاتھ باندھے یا آگے دندناتے ہوئے، دنیا میں اعتراض کرنے والی یہی ایسی عجیب الخلقت مخلوق ہے جس کو عین ادب بے ادبی نظر آتا ہے نعمانی۔

اس ادب کے مقابلہ میں یہ بات سوء ادب ہے کہ مخدوم اپنے راستے کے موانعات خود اپنے ہاتھ سے ہٹائے راستہ صاف کرنے اور خدام دست بستہ تماش بین بنے پیچھے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام امراء، اغنیاء اور بادشاہوں اور ذی اقتدار لوگوں میں ادب کی یہی صورت ہمیشہ رائج رہی ہے اور تو اور عرب کے جاہل اکھڑ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے والے ذی حشم لوگ بھی اسی کو شائستہ ادب مانتے تھے، چنانچہ مثل کے طور پر ان کے ہاں یہ مشہور ہے، ثَلٰثٌ يَتَقَدَّمُ فِيهَا الْاَصَاغِرُ عَلَى الْاَكَابِرِ اِذَا سَارُوْا لَيْلًا اَوْ خَاضُوْا سَيْلًا اَوْ صَادَفُوْا خَيْلًا ـ تین مواقع پر چھوٹے بڑوں کے آگے رہتے ہیں جب رات کو کہیں جائیں یا پانی میں گھسیں یا لشکر لے کر چلیں) اور اس قسم کا تقدم نہ جنت میں پہلے داخل ہونے کا متقاضی ہے، اور نہ ہی مرتبے اور درجہ کی بلندی کا۔ جس سے کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں، اور فرض کر لیں کہ وہ جنت میں پہلے ہی داخل ہوئے تھے تو بھی جنت میں داخلہ اسوقت بزرگی و فضیلت کا باعث ہوتا ہے جب کہ ثواب اور اجر اعمال بھی اس سے زائد ہوں ورنہ یوں تو فرشتے بھی انبیاء سے پہلے جنت میں چلے جاتے ہیں اور حضرت ادریس علیہ السلام ہمارے حضور صلے اللہ

علیہ وسلم سے پہلے جنت میں چلے گئے بلکہ جنت میں تو ابلیس حضرت آدم سے پیشتر پہلا جاتا تھا۔

پھر بڑی فضیلت اور برتری تو یہ ہے کہ جیتے جاگتے اس گوشت پوست کے جسم کے ساتھ بہشت میں داخلہ ہوا جیساکہ ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوا نہ یہ کہ خواب یا استغراق میں صرف روح جنت میں جائے اور خود کو پتہ تک نہ چلے۔

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو (معراج کی شب) آپ کی امت کے مراتب اور ان کے ثواب و درجات کی مقدار دکھائی اور بتائی جا رہی تھی تو ساتھ ساتھ صاحب درجات و مراتب کی صور مثالیہ بھی پیش کی جا رہی تھیں اور بتایا جا رہا تھا کہ آپ کی امت میں سے فلاں شخص کو فلاں عمل کے سبب یہ درجہ و مرتبہ نصیب ہوا تاکہ آپ لوگوں کو اس عمل کے خواص و فضائل سے آگاہ فرمائیں۔

اسی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی سے فرماتے کہ میں نے تم کو اس مرتبہ و درجہ پر فائز دیکھا ہے تم ایسا کیا کام کرتے ہو جس کے سبب اس مرتبہ کے مستحق سمجھے گئے مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اس عمل کی اہمیت و افادیت سے واقف ہو اور پھر کبھی وہ عمل ترک نہ کرے اور دوسرے لوگ بھی اس کام کی طرف راغب ہوں اور ان میں بھی اس کی حرص پیدا ہو۔ حالانکہ ایسے حضرات کو ان امور کا کچھ پتہ نہ ہوتا تھا اور نہ انہوں نے اپنے آپ کو خواب میں بھی جنت میں دیکھا تھا، چنانچہ جناب بلال رضی اللہ عنہ کو بہشت میں اپنے آگے دیکھنے کا معاملہ بھی اسی طرح کا تھا، یہ ان کی مثالی صورت ہے جو آپ نے ملاحظہ فرمائی یا محسوس فرمائی، جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے عمل کے بارے میں دریافت فرمایا تو یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ تحیۃ الوضو (پابندی اور اہتمام سے) پڑھتے تھے اور اس سے تحیۃ الوضو کی فضیلت واضح ہوگئی،

اسی طرح دوسرے صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم کے بارے میں متعدد احادیث میں یہ آیا ہے کہ آپ نے نام لے کر فرمایا کہ فلاں کو ایسا دیکھا اور فلاں کو ایسا اور یہ فلاں فلاں عمل کے سبب تھے ان میں حضرت ابو طلحہ کی بیوی حضرت رمیضا۔ رضی اللہ عنہا بھی ہیں اور حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ بھی کہ بہشت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی قرأت سماعت فرمائی پھر معلوم ہوا کہ ان کا یہ اعزاز اور مرتبہ ماں کی خدمت کا صلہ نتیجہ اور سبب ہے!
طبرانی میں اسی حدیث بلال کے آخر میں فقراء اور ان کی اولاد کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے جس سے یہ شبہ بالکل ہی جاتا رہا۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صلے اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ دَخَلْتُ الْجَنَّۃَ فَسَمِعْتُ حَرَکَۃً اَمَامِیْ فَنَظَرْتُ فَاِذَا بِلَالٌ وَنَظَرْتُ اِلٰی اَعْلَاھَا فَاِذَا فُقَرَاءُ اُمَّتِیْ وَاَوْلَادُھُمْ وَنَظَرْتُ فِیْ اَسْفَلِھَا فَاِذَا ھُمُ الْاَغْنِیَاءُ۔ (ابی امامہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے کچھ چاپ سنی جب میں نے ادھر نظر ڈالی تو بلال نظر آئے، اوپر کے حصہ کی طرف نظر اٹھائی تو وہاں میری امت کے فقراء اور ان کی اولاد نظر آئی اور نیچے کے حصہ کی طرف جھانکا تو وہاں امراء اور اغنیاء نظر آئے۔

شیعوں کے اعتراض میں اگر آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے متعلق تعارفی الفاظ غلام ابوبکر پر غور کریں گے تو ان کے دلوں میں چھپا ہوا تعصب اور عناد عیاں ہو کر سامنے آجائے گا یہ نامنصف متعصب اتنا نہیں سوچتے کہ اہل سنت اگر حضرت بلال کے فضائل اور نیکی کا اعتقاد صرف اس بنا پر رکھتے ہیں کہ ان کی نسبت اور وابستگی حضرت ابوبکر صدیق

رضی اللہ عنہ سے ہے تو ان کی جگہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو جنت میں کیوں نہ دکھاتے اور ان کی تعریف کیوں نہ کرتے اس لئے کہ بیٹا بہرحال غلام ہے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت، ایمانی قوت صدق اخلاص اور طاعات پر مداومت کی برکت سے نصیب ہوا اسی لئے یہ روایت تحیۃ الوضو کی طرف رغبت و شوق دلانے کے سلسلہ میں لائی گئی ہے نہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل میں،

دھوکہ نمبر (۱۰۱) اعتراض یہ ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی نَظَرَ عَشِیَّۃَ یَوْمِ عَرَفَۃَ اِلٰی عِبَادِہٖ فَبَاھَا بِالنَّاسِ عَامَّۃً وَّ بِعُمَرَ خَاصَّۃً (اللہ تعالیٰ نے یوم عرفہ کی شام اپنے بندوں پر نظر ڈالی تو سب پر عموماً اور عمر پر خصوصاً فخر کیا) یہ روایت حضرت عمر کی فضیلت پیغمبر علیہ السلام پر اور جناب پیغمبر علیہ السلام کی تحقیر ثابت کرتی ہے کہ اس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں میں شمار کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاص ہیں،

اس اعتراض میں ظلم و نا انصافی تعصب و دشمنی حد سے بڑھ گئی اور کلام کو بالکل غیر محل پر استعمال کیا ہے اول تو اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں میں شمار کرنے کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں کیونکہ ناس سے مراد وہ تمام حجاج ہیں جو میدان عرفات میں حاضر تھے اصول کا قاعدہ ہی یہ ہے کہ متکلم عموم کلام سے خارج ہوتا ہے (یہاں متکلم خود حضور ہیں تو ان کا عام میں شمار نہیں) دوسرے معترض نے عموم و خصوص کے وہ معنے سمجھے جو آج کل لوگوں میں مشہور و معروف ہیں، کہ کہتے ہیں فلاں شخص عام لوگوں میں سے ہے اور فلاں خواص میں سے۔ یہ معنے عربیت کے بالکل مناسب نہیں اور جس نے ایسا سمجھا اس نے کلام عرب سے اپنے کو نا آشنا ثابت کیا، اس کے معنے تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس روز فرشتوں پر حاجیوں کی فضیلت بالعموم اور حضرت عمر کی بالخصوص بیان فرمائی پس اس حدیث میں حجۃ الوداع کے سارے ہی حاجیوں کی فضیلت فرشتوں پر مقصود ہے

ہاں حضرت رضی اللہ عنہ کو ان کے شرف کے اظہار کے لئے فخر سے مخصوص فرمایا۔ کیونکہ ملاءِ اعلیٰ میں آپ کی فضیلت شہرت پا چکی تھی اور سب فرشتے آپ کی بزرگی کے معتقد ہو چکے تھے اور اس وقت بھی ان کو حضرت عمر کے حال سے باخبر بہ بتانے کیلئے کیا کہ میرے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم کے دوستوں میں سے ایک یہ بھی ہیں، جو اس بلند مرتبہ سے شرفیاب ہوئے یہ فخر تو درحقیقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت و بزرگی پر ہے کہ آپ کے دوست اور ساتھی ایسے مرتبوں اور عزت کے مالک ہیں۔

دھوکہ (۱۰۲) اہل سنت پر ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اپنی روایت میں ایک رکیک اور نازیبا بات کی نسبت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے ان کا اشارہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی طرف ہے، اَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وَسَلَّمَ اَتٰی سُبَاطَۃَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا (حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک کوڑی پر ہوا اور آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا)

اہل سنت کی طرف سے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے ہاں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح سند کے ساتھ یہ روایت بھی درج ہے کہ مَنْ حَدَّثَکُمْ اَنَّ النَّبِیَّ صلے اللہ علیہ وسلم کَانَ یَبُوْلُ قَائِمًا فَلَا تُصَدِّقُوْہُ مَا کَانَ یَبُوْلُ اِلَّا قَاعِدًا (جو تم سے یہ بات کہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا کرتے تھے اس کو

یا در نہ کرتے کیونکہ آپ بیٹھ کر ہی پیشاب فرماتے تھے) اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ کی عادت شریفہ یہی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو ازواج مطہرات اور اہل بیت اس سے ضرور واقف ہوتیں کیونکہ اکثر اس کی نوبت اندرون خانہ بھی پیش آتی تھی) لہذا جب دوسرے صحابہ کی روایات کی طرف رجوع کیا گیا تو اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مفصل روایت ملی جس میں اس کی پوری تشریح موجود ہے اور اس سے ہر قسم کا شک و شبہ دور ہو جاتا ہے چنانچہ امام حاکم بیہقی رحمہا اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت نقل کی ہے کہ اِنَّمَا بَالَ قَائِمًا لِجُرْحٍ كَانَ فِي مَابِضِهِ (آپ نے رگ مابض میں زخم کی وجہ سے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا)، مابض زانو تک کی ایک رگ کا نام ہے،

اس سے معلوم ہو گیا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کی وجہ کیا تھی۔ اور تندرستی اور بیماری کی حالت کے فرق کو جو زمین و آسمان کا فرق ہے، کون بیوقوف نہیں جانتا یا نہیں مانتا۔

جو بات صحت و تندرستی کی حالت میں نازیبا اور خلاف مروت سمجھی جاتی ہے وہ بیماری کی حالت میں بری نہیں ہوتی اور نہ کوئی خلاف مروت کہتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے، لَيْسَ عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ، مریض پر کوئی پابندی یا بندش نہیں،

اس فرقے کے اندھے تعصب پر حیرت و تعجب ہوتا ہے کہ اہل سنت کی روایات کی صحیح توجیہہ ہوتے ہوئے جن کو خود اہل سنت نے بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ سید مرتضیٰ اور دوسرے امامی علما نے خود یہ اصول اور قاعدہ مقرر کیا ہے، اِنَّ الْخَبَرَ مَتٰى وُجِدَ لَهٗ مَحْمَلٌ صَحِيْحٌ فَلَا يُرَدُّ (جب حدیث کا صحیح معنوں پر حمل ہو سکے تو اسے رد نہیں کرتے مان لیتے ہیں اور خود امام صادق رحمہ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ سے خِذْمَةُ جَوَادِ بِيْنَا لَنَا وَ نَدْرُدُ جَهْتَ لَكُمْ جیسی روایت نقل کرنے پر ان شیعوں کو شرم نہیں آتی اور اس کو کسی ایسے صحیح معنے پر حمل کیوں نہیں کرتے جو غیرت و مروت کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ یہ تو دانستہ ڈھٹائی اور بے شرمی کیساتھ انبیاء کرام اور ائمہ پر جھوٹ کا الزام اس لئے لگاتے ہیں کہ ان بزرگوں اور قابل تقلید ہستیوں کے اقوال و افعال پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے۔

دھوکہ نمبر (۱۰۴) ایک الزام یہ لگاتے ہیں کہ اہل سنت کتے کی کھال پر نماز پڑھنے کو جائز کہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک احناف کے ہاں کتے کی ایسی رنگی ہوئی کھال پر جس کی رطوبت مصالحوں اور کیمیکلز کے استعمال سے جاتی رہی ہو، نماز پڑھنا جائز ہے اور یہ جواز اس حدیث کی روشنی میں ہے جو فریقین کے نزدیک صحیح ہے، کہ دِبَاغُ الْجِلْدِ طُهُوْرُهٗ (کھال کا رنگنا ہی اس کی پاکی ہے۔ نیز یوں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے، اَيُّمَا اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ (جو کھال رنگ لی جائے پس وہ پاک ہو جاتی ہے،)

پھر یہ بات عقلی طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مثلاً حرام جانور، شیر بھیڑیا، بلی وغیرہ پر ان کی زندگی میں اگر کوئی ان پر ہاتھ پھیرے تو وہ ہاتھ ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ پسینہ وغیرہ کی تری نہ ہو اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کرام سے اس قسم کے جانوروں پر ہاتھ پھیرنا ثابت ہے اور گدھوں، خچروں پر سواری تو متواتر مروی ہے،

ان جانوروں کے مرنے کے بعد ان کی کھالوں کا حرمت کا حکم صرف اس لئے لگایا جاتا ہے کہ اس وقت بدن رطوبت خون چربی اور گوشت کے ساتھ مل جل کر یکجان ہو جاتی ہے جب وہ رطوبت مصالحوں اور کیمیکلز کے ذریعہ کھال سے نکال کر اسے صاف و خشک کر لیا جائے تو کھال پھر اپنی اصل (پاکی) حالت پر لوٹ آتی ہے اور اس کا حکم بدل جاتا ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی نجاست کپڑے پر لگ جائے اور دھو کر صاف کر لیا جائے تو کپڑا پاک ہو جاتا ہے، البتہ خنزیر کی کھال اس اصول کلی سے خارج ہے کیونکہ قرآن مجید میں اس کو مجسمہ ناپاک فرمایا گیا ہے، ذاتی طور پر خبیث وہ بالکل نجس ہے، اسی لئے اس کی کھال، ہڈی، بال اور ہڈی تک سب ناپاک ہیں اور اس مسئلہ میں کتا بھی خنزیر کی مانند ہے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں بلکہ قرآن مجید میں کتے کے شکار کو حلال فرمایا گیا ہے،

اور ایسے شکار کو سنی اور شیعہ دونوں کھاتے ہیں، حالانکہ شکار کرتے وقت اس کا لعاب دہن شکار کو لگ جاتا ہے ایسی صورت میں کھال اور دوسرے اعضاء، بال و ہڈی وغیرہ کیوں ناپاک ہوں گے اگر کتا بھی خنزیر جیسا ہوتا تو اس کا شکار حلال کیوں ہوتا،

اس کلام سے واضح ہو گیا کہ اس مسئلہ میں اہل سنت پر اعتراض نہ قرآن کی رو سے درست ہے نہ حدیث کی رو سے! اور ان معترضین امامیہ کی اپنی حالت یہ ہے کہ ان کے نزدیک جہاں انسان کا بول و براز پھیلا ہوا ہو اس جگہ نماز پڑھنا جائز ہے حالانکہ انسانی براز بالاجماع نجس العین ہے جو کسی طرح بھی پاک نہیں ہو سکتا، چنانچہ شیخ حلی نے (کتاب) ارشاد میں ابو القاسم نے کتاب شرائع میں اور ابو جعفر طوسی نے اس مسئلہ کو بالتصریح بیان کیا ہے غرض جملہ امامیہ کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے، اب آپ انسانی گندگی اور کتے کی کھال میں خود ہی موازنہ کر کے معترضین کی دماغی ساخت کے متعلق غور فرما لیجئے۔

طعن نمبر (۴۰۱): اعتراض یہ ہے کہ اہل سنت شطرنج کے کھیل کو جائز کہتے ہیں حالانکہ از روئے شرع ہر قسم لہو و لعب برے ہیں اور ان کی برائی قرآنی نصوص سے ثابت ہے، اس اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ احناف، مالکیہ اور حنابلہ شطرنج کی حرمت کے قائل ہیں اور اس کی حرمت میں احادیث بیان کرتے ہیں۔ البتہ شوافع کے نزدیک اس میں دو قول ہیں، اول یہ کہ مندرجہ ذیل پانچ شرائط کی رعایت کے ساتھ یہ مکروہ ہے حرام نہیں (۱) اس کی وجہ سے نماز وقت سے موخر نہ ہو، نہ اس کی وجہ سے نماز کی ادائیگی میں عجلت کرے اور نہ آداب سنن نماز کو ترک کرے (۲) شرط لگا کر نہ کھیلے نہ اس میں جوئے کی کوئی اور شکل ہو، (۳) اس کی وجہ سے کسی دوسرے واجب میں فرق نہ آنے پائے، مثلاً والدین کی ضروری خدمت، اہل و عیال کی دیکھ بھال عزیز و اقارب سے میل جول مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شمولیت (۴) کھیل کے دوران کھیل سے متعلق لڑائی جھگڑا، جھوٹ، قسم وغیرہ قسم کی باتیں پیش نہ آئیں، (۵) اس کے مہروں اور گوٹوں پر انسان یا حیوانات کی تصاویر نہ ہوں،

اگر پانچوں شرطوں میں سے ایک کی بھی خلاف ورزی ہو گی تو یہ کھیل حرام ہو جائے گا، اور انکی پابندی نہ کرنے والا گناہ کبیرہ کا مستحق ہو گا احیاء (غالباً احیاء العلوم) میں بھی اسی طرح ذکر ہے،

اور امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کا دوسرا قول دیگر ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے موافق ہے، یعنی وہ بھی بغیر شرط مطلق حرام فرماتے ہیں اور یہ ثابت شدہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول سے رجوع فرمایا ہے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے

بالتصریح اس کو رقم کیا ہے،

اور بالفرض اس کو جائز ہی مان لیں تو گھوڑ دوڑ، تیر اندازی، نیزہ بازی وغیرہ کی طرح یہ بھی ایک مباح کھیل ہوگا کیونکہ اس کھیل میں یہ فائدے ہوتے ہیں،

ذہن کو تیز کرتا ہے۔ جنگ بازی کے ہنر سکھاتا ہے، اور بتاتا ہے کہ دشمن کی چالوں سے کس طرح بچا جائے وغیرہ وغیرہ۔ برا کھیل وہ ہوتا ہے، جس میں کوئی دینی فائدہ نہ ہو، وہی لہو ولعب بھی کہلاتا ہے اور ایسے کھیل کو اہل سنت جائز نہیں بتاتے برخلاف امامیہ کے وہ عین حالت نماز میں جو خالق سماوات والارض کے ساتھ مناجات کا وقت ہے، اور ایک معنی کہ وہ اپنے رب کے ساتھ معراج کی حالت پہ ہوتا ہے اعضائے مرثانہ سے تلعب کو جائز کہتے ہیں چنانچہ ابوجعفر طوسی اور دوسروں نے تہذیب نامی کتاب اور دوسری کتابوں میں اسے لکھا ہے، اپنے موقعہ پہ انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔

دھوکہ نمبر (۱۰۵):۔ اہل سنت کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ گانے بجانے کو جائز کہتے ہیں حالانکہ اس کی مذمت بے شمار احادیث و آثار میں بیان کی ہے۔

یہ اعتراض افتراء محض اور سراسر بہتان ہے، اس لئے کہ آلات موسیقی کے ساتھ گانا بجانا چاروں ائمہ رحمہم اللہ کے ماننے والے فقہاء کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے بڑے اور اونچے درجہ کے مشائخ اور بلند مرتبت صوفیائے کرام رحمہم اللہ نے ایسے حرام گانے نہ سنے اور نہ ان کو اس کی رغبت ہوئی

بلکہ سید الاولیاء، امام الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اِنَّهٗ بَطَالَةٌ (یہ بیہودہ اور لغو چیز ہے۔ اور شیخ برزدق فارسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اَلسَّمَاعُ حَرَامٌ کَالْمَیْتَةِ (سماع مردار جانور کی طرح حرام ہے، سماع نام کی جو چیز بزرگان دین کی طرف منسوب ہے اور جسکا سماع ثابت بھی ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی قوال مرد خوش آواز ہوتے نہ مرد، یا عورت اجنبی، جن کو دیکھ کر سفلی جذبات بھڑکیں، اور کوئی فتنہ برپا ہو، ہرگز ہرگز ان کی محفل میں بار نہ پا سکتے تھے، اور آلات موسیقی میں سے کسی چیز کے ہونے کا تو ان کے ہاں سوال ہی نہیں تھا،

پھر جو اشعار وہ سنتے تھے اکثر جنت و دوزخ کے ذکر یا طاعات کی طرف رغبت اور معاصی سے نفرت کے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے یا پھر ان میں وصل ہجر کا بیان ہوتا تھا جو محبت الٰہی میں مستغرق حضرات کے حسب حال ہوتا تھا خلاف شرع کوئی مضمون نہ ہوتا ان کی اس پاکباز انہ مجلس میں، امرد یا عورت کی شرکت تو کجا وہ کچے ذہن کے مریدوں کو بھی شریک نہ کرتے تھے۔ نہ انکی مجلسیں آج کل کی طرح سرعام سجائی جاتی تھیں، تخلیہ میں ان پابندیوں کے ساتھ ان بزرگان کرام کا سماع ہوتا تھا، ایسے سماع کو حرام کہنا ہی خلاف شرع ہے بلکہ خود ان شیعوں کے مذہب کے بھی خلاف ہے، چنانچہ ان شیخ مقتول نے کتاب الدروس میں ذکر کیا ہے یَجُوْزُ الْغِنَاءُ بِشُرُوْطِهٖ فِی الْعُرْسِ (شادی کے موقع پہ گانا شرط کا لحاظ رکھتے ہوئے جائز ہے) اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کے ہاں گانے کے جواز کے لئے جو شرائط مقرر ہے، فساد کی جڑ اور فاسقانہ ہے وَھُوَ اَنْ یَّکُوْنَ الْمُسْمِعُ اِمْرَاَۃً وَلَا یَکُوْنَ رَجُلًا وَلَا یَکُوْنَ الشِّعْرُ فِی الْھِجَاءِ (وہ گانے والی عورت ہو مرد نہ ہو اور نہ شعر کسی کی ہجو میں ہو) شرح القواعد میں بھی اسی طرح کا مضمون موجود ہے، اب آپ خود اندازہ لگائیں، کہ کس صورت میں گانا سننا قبیح ہوگا۔ صوفیاء کی شرائط کے مطابق یا ان طاعنوں

اور معتبر صنوں کی شرائط پر،

دھوکہ نمبر (۱۰۶) ان کے اسلاف سادہ دل بندوں اور کم عقلوں لوگوں کو دھوکہ اور فریب دینے کے لئے یہ حربہ استعمال کرتے ہیں کہ ائمہ اور بزرگان دین کی خدمت میں کثرت سے آمد ورفت رکھتے ان کی مجلسوں میں شرکت کرتے اور موقع بموقعہ ان کے مکانوں میں آتے جاتے ہیں تاکہ لوگ اس دھوکہ میں پڑ جائیں کہ یہ ان کے بہت چہیتے شاگرد یا بہت گہرے دوست ہیں اور اپنے دینی مسائل کا حل انہیں سے حاصل کرتے ہیں، اور ان کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب لوگ اس قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں تو ان کا اصل رنگ کھلتا ہے اسوقت یہ اپنی گھڑی ہوئی لغو اور گمراہ کن باتیں ان روایات میں داخل کر کے ان کو پھیلانے اور خوب شہرت دیتے ہیں اور یوں وہ خوش فہم لوگ ان کے دام مکر میں آکر اپنا دین وایمان برباد کر بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کے مکار اور غداروں کے سرگروہ ہشام بن الحکم، ہشام بن سالم، احول طاق ہیثمی زید بن جہیم ہلالی زرارہ بن اعین حکم بن عتبہ اور عروہ عجمی ہیں جو حضرت سجاد حضرت باقر اور حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہم کے زمانے میں گزرے ہیں یہ ان ہی اماماں عالی مقام سے روایت کرنے کے مدعی ہیں پھر ان کے بعد صدی بعد صدی بہت سے گروہ اس قماش کے پیدا ہوتے رہے اور مخلوق خدا کا دین و ایمان بے باکی سے غارت کرتے رہے،

حتی کہ امام محمد بن حسن المہدی کا زمانہ آیا آپ پیدا ہوتے بچپن اور کم سنی ہی میں وصال بھی فرما گئے ان کے بعد جھوٹ اور مکر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اصول و فروع میں جھوٹے اقوال داخل کیے گئے، صحابہ، خلفاء امہات المومنین سے متعلق رکیک، نازیبا اور سراسر جھوٹے الزامات تراشے گئے۔ شیعوں کی تعریف اور اہل سنت کی مذمت میں روایات کے انبار لگائے گئے حالانکہ ائمہ کرام نے ہر وقت ان کے عقیدوں کی تکذیب کی ان کی خرافات اور جعلسازیوں سے اپنی براءت اور بیزاری کا اظہار فرمایا ان کے عقیدوں کی تکذیب کی ان کی روایات کو بے اصل اور من گھڑت قرار دیا۔

اور یہ ڈھیٹ پنے۔ سے یہی کہتے رہے کہ یہ سب ائمہ کا تقیہ اور زمانہ سازی ہے اور ظاہر داری پر مبنی ہے، ورنہ ہم تو ان کے بڑے چہیتے ہیں ہمیں تو ان کی جناب میں وہ قرب وخصوصیت حاصل ہے جو دوسروں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی،

اور اسی ذریعہ سے عام لوگوں خصوصاً مدینہ منورہ سے دور دراز ملک اور شہروں کے رہنے والوں مثلاً عراق فارس قم کاشان۔ سے خمس اور طرح طرح کے نذر ونیاز وصول کرتے رہے اس کام کے لئے جعلی مہر شدہ رقعہ جات حضرات آئمہ کی طرف سے پیش کرتے ہیں غرض اسی طرح دین کو ثمن قلیل کے عوض بیچنے کا دھندا کرتے تھے اور یہ دھندا اتنا بڑھا کہ اس نے ایک مذہب کی شکل اختیار کرلی۔

اور تعجب اس پر ہے کہ کلینی اور دوسرے امامی علماء نے اپنی صحاح میں ائمہ سے ان ہی روایات کی مذمت بھی نقل کی ہے اور پھر ان ہی روایات کو اپنا قبلہ وکعبہ بھی بنایا ہے،

چنانچہ حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ نے برملا اس گروہ کے عقائد سے انکار کیا ان کو ڈانٹا ڈپٹا یہاں تک کہ ایک روز ہشام احول سے کہا،

اَلَا تَسْتَحْيِ فِيْمَا تَقُوْلُ عَنْ اَبِيْ وَهُوَ بَرِيْءٌ عَنْهُ حَتّٰى قَالَ الْاَحْوَلُ لَهُ بِزَعْمِكَ اَنَّكَ لَسْتَ بِامَامٍ وَاِنَّمَا الْاِمَامُ بَعْدَ اَبِيْكَ اَخُوْكَ مُحَمَّدٌ فَقَالَ يَا اَحْوَلُ اَلَا تَسْتَحْيِ فِيْمَا تَقُوْلُ اِنَّ اَبِيْ يُعَلِّمُكَ مَسَائِلَ الدِّيْنِ وَلَا يُعَلِّمُنِيْ وَاِنَّهُ كَانَ يُحِبُّنِيْ حُبًّا شَدِيْدًا كَانَ يُبَرِّدُ اللُّقْمَةَ فَيَجْعَلُهَا فِيْ فَمِيْ فَكَيْفَ لَا يَكْفِيْنِيْ عَمَّا يُدْخِلُنِيْ النَّارَ هٰذَا لَا يَكُوْنُ اَبَدًا۔ رَوَاهُ الْكُلَيْنِيُّ وَغَيْرُهُ مِنَ الْاِمَامِيَّةِ

تجھے میرے باپ پر جھوٹا الزام لگاتے شرم نہیں آتی حالانکہ وہ اس الزام سے پاک ہیں تو ایک دفعہ احول نے ان سے کہا اپنے باپ کے بعد آپ امام نہیں ہیں امام تو آپ کے بھائی محمد ہیں آپ نے فرمایا تجھے یہ کہتے ہوئے بھی حیا نہیں آتی کہ میرے والد تجھے تو دین کے مسائل سکھاتے تھے مگر مجھے نہیں حالانکہ ان کو مجھ سے بہت محبت تھی وہ لقمہ کو تو ٹھنڈا کر کے میرے منہ میں دیتے تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ مجھے ایسی بات سے آگاہ نہ فرماتے جو مجھے آگ میں لے جانے کا باعث ہو ایسا ہرگز کبھی نہیں ہو سکتا اس کی روایت کلینی اور دوسرے امامیوں نے کی ہے۔

پھر امامیہ مذہب کے داعیوں میں سے ایک اور شخص اسحاق بن ابراہیم نامی، جس کا لقب دیک الجن تھا اور وہ شاعر بھی تھا خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں گزرا ہے وہ خود کو حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کرتا تھا مگر درحقیقت پرلے درجے کا پلید زندیقی تھا صانع اور نبوت کا منکر تھا آخرت کو بھی نہیں مانتا تھا، اس کے عیوب کا پشتارہ تاریخ کی کتابوں میں بکھرا پڑا ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ کافی شہرت یافتہ ملزم ہے۔

اس کے باوجود امامیہ کے شیخ الطائفہ محمد بن محمد بن نعمان نے جو شیخ مفید کے لقب سے مشہور ہے جو محمد بن بابویہ قمی کا شاگرد اور سید مرتضیٰ اور ابو جعفر طوسی کا استاد ہے اپنی کتاب المثالب والمناقب میں اس زندیق پلید کو اپنے فقہا اور بلغاء میں شمار کیا ہے قیاس کن ز گلستان من بہار مرا)۔

ان لوگوں میں سے بعض نے جعلی نسخے جھوٹی اور کتابیں مرتب کر لی ہیں اور ان کی نسبت حضرت باقر حضرت صادق اور دوسرے ائمہ کی طرف کر دی ہے، اور اس کے ساتھ یہ شوشہ بھی چھوڑا ہے کہ ان ائمہ نے اپنی زندگی میں بطور تقیہ ان کو چھپائے رکھا اور ہم کو وصیت کی کہ وقت آنے پر ان روایات کو یاد کر کے ان کو پھیلائیں اور شائع کریں،

جب یہ کتابیں شیعوں کے ہاتھ لگیں تو انہوں نے چوم چاٹ کر سر پر رکھا اور بے دھڑک آزادی سے نقلی روایات کا کاروبار جاری ہو گیا اور جعلی ٹکسال کے سکوں کی خوب قدر و منزلت ہوئی جیسا کہ کلینی نے ابو خالد شنبولہ سے روایت کی ہے۔

اسی طرح ان میں سے ایک جماعت نے ایک کتاب ائمہ کے کسی رشتہ دار کی طرف منسوب کر دی جیسے کتاب، قرب الاسناد امامیہ"

پھر ان کے اسلاف میں بعض نصرانی بھی ہوئے ہیں کہ اہل بیت کی محبت کے مدعی بن کر خود کو شیعوں میں داخل کیا اور کہہ دیا کہ ہم فلاں امام کے ساتھی ہیں، حالانکہ اپنی قوم و قبیلہ میں اپنا اسلام تک ظاہر نہیں کیا نماز روزہ، عبادات طور و طریق اور رسوم میں ان کے ساتھ رہے اور ان ہی میں گھلے ملے رہے ساری عمر کھانا پینا اور دوسرے معاملات نصرانیوں کی طرح کرتے رہے اور ادھر شیعہ ان کو اپنے میں شمار کر کے دین و ایمان و عقائد سے متعلق ان کی روایات

بے دھڑک قبول کرتے رہے، چنانچہ زکریا بن ابراہیم نصرانی اسی قماش کا شخص ہے جس سے ابو جعفر طوسی نے بھی تہذیب (کتاب) میں روایت کی ہے اور اسی طرح دوسرے بھی کرتے رہے ہیں،

دھوکہ نمبر (۱۰۷) ان کے کید و مکر کا سب سے بڑا حربہ تقیہ ہے، اس پر یہ باب اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ تقیہ کا مطلب ہے اہل عقل و شعور سے اپنے باطل مذہب اور غلط عقیدوں کو چھپائے رکھنا سادہ لوحوں، بیوقوفوں جاہلوں بچوں اور اور عورتوں پر اس کو پیش کرنا اہل عقل و دانش سے چھپانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی اور جھوٹ پر مطلع ہو کر کہیں وہ ان کا تار پود نہ بکھیر دیں، اہل علم کی طرف سے جب ان کی گرفت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں کتاب میں تو ائمہ سے ایسی روایات پائی جاتی ہیں جو تمہاری روایت اور عقیدہ دونوں کی تردید کرتی ہیں تو جان چھڑانے کو ان کا بہترین جواب ایک رہ ہے کہ یہ ان کا تقیہ تھا۔ گویا یہ تقیہ ان کے مذہب کا سب سے بڑا اصول ہے اگر یہ بھی ان کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو یہ ترتیب اور ائمہ بھی ان کے ہاتھ نہ آتے اور ان کی نظروں سے بھی ان کا یہ مذہب گر جاتا اور اعتبار و رواج نہ پاتا۔

اب چونکہ ان فرقوں کی ساری خوشی اور تمام فخر اس بنا پر ہے کہ ہم نے اپنا مذہب اہل بیت سے لیا ہے اور ہم خاندان نبوت کے خاص شاگرد ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس مذہب کے مدوّن مرتب اور مصنفین براہ راست ائمہ کرام سے تو نہ شرف ملاقات رکھتے ہیں اور نہ ہی بلاواسطہ شاگرد ہیں، اس اس لئے لامحالہ ان ان کے اور ائمہ کے درمیان ان کے وہی پیشوا واسطہ ہیں جو خود کو ائمہ سے منسوب کرتے ہیں اور ان ہی سے نقل مذہب کا دعویٰ کرتے تھے،

تو ان حالات میں یہ ضروری اور مناسب ہے کہ ان کے اسلاف، پیشواؤں اور واسطوں کا کچھ حال بھی ضبط تحریر میں لے آیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ ان کے اس مذہب کی حقیقت و قدرت کا پول بھی کھل جائے اور جو کچھ ان کے اسلاف سے لیا گیا ہے وہ بھی بے نقاب ہو جائے اس اہم مقصد کی خاطر ایک علیحدہ و مستقل باب قائم کیا گیا ہے۔

باب سوم
شیعوں کے اسلاف کے حالات کے بیان میں

اگرچہ یہ بحث اجمالی حیثیت سے باب اول میں آچکی ہے جس میں شیعہ مذہب کی پیدائش کے حالات اس کے چند در چند شاخوں میں بٹ جانے کا بیان کیا گیا ہے لیکن اس باب میں ان کے اسلاف کے حالات، خوبیاں اور بزرگیاں بالتفصیل سپرد قلم ہوں گی۔ اور بحث و نظر کا رخ اصالۃً اسی مقصد کی سمت رکھا جائیگا کیونکہ بالقصد نظر ضمنی نظر پر لامحالہ اہمیت رکھتی ہے اور تفصیلی بحث اور اجمالی بحث میں بہت فرق و تفاوت ہوتا ہے،

یہاں پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ شیعوں کے اسلاف چند در چند طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں،

پہلا طبقہ:۔ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے براہ راست ضلالت و گمراہی کے سرگروہ اور اصل الاصول ابلیس لعین سے فائدہ اٹھایا، یہ طبقہ منافقین کا ہے جو درپردہ اپنے دلوں میں اہل اسلام سے دشمنی چھپائے ہوئے تھے زبان سے اسلام کا نام اس لیے لیتے تا کہ اہل اسلام میں میل جول، آمد و رفت کی راہ کھلی رہے اور ان کی مخالفت، بغض و عناد ڈالنے اور ان کے بھکانے کے مواقع حاصل رہیں۔ اس طبقہ کا سرگروہ اور پیشوا وہی عبداللہ ابن سبا یہودی منافق تھا جس کا ابتدائی حال تاریخ طبری کے حوالے سے باب اول میں تحریر کیا گیا اس نے پہلے قدم کے طور پر حضرت علیؓ کی فضیلت و برتری کے عقیدہ کی طرف لوگوں کو بلایا اس میں کامیابی کے بعد صحابہ کرام اور خلفاء عظام رضوان اللہ علیہم کی تکفیر وارتداد کا شوشہ چھوڑا۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مسند الوہیت پر لا بٹھایا۔ اس کی کامیابی کا اصل راز مردم شناسی تھا وہ اپنے گرگوں میں جس قسم کی باتوں کو قبول کرنے کی استعداد دیکھتا اس کو وہی باتیں اور عقیدہ بتاتا تاکہ قابو میں آیا ہوا پنچھی بھاگ نہ جائے چونکہ بہت کائیاں اور منصوبہ باز تھا اس لئے کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر معاملہ کے ہر پہلو کو جانچ کر قدم اٹھاتا،

لہذا وہی لعین سارے رافضی فرقوں کا سرچشمہ اور سرتاج ہے، کہ گندگی سے بھرا ہوا یہ مذہب اسی کے سینہ پر کینہ سے ابلا ہے، اور اہل زمین کو ملوث اور ان کے دلوں میں اترا ہے اگرچہ ان فرقوں میں سے اکثر اس کا احسان نہیں مانتے اور اس کو برائی سے یاد کرتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کو صرف غلاۃ (غالی شیعوں) کا پیشوا سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب اسی کے شاگرد اور اسی کے فیض کے خوشہ چین ہیں یہی وجہ ہے کہ ان سب فرقوں میں یہودیت کی جھلکیاں صاف اور نمایاں دکھائی دیتی ہیں اور یہودیوں کے اخلاق خفیہ اور غیر محسوس طریقہ سے ان میں جڑ پکڑ گئے ہیں۔ مثلاً جھوٹ، افتراء بہتان، بزرگوں اور اسلاف کو گالیاں دینا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جان نثار رفیقوں اور دوستوں پر لعنت و تبری بھیجنا اللہ اور رسول اللہ کے کلام کو غلط معانی پہ محمول کرنا ان کا مطلب کچھ کا کچھ بتانا۔ اہل حق کی طرف سے دل میں دشمنی چھپائے رکھنا موقعہ مل جائے تو اس کے اظہار سے نہ چوکنا، خوف و طمع اور لالچ کی وجہ سے چاپلوسی اور خوشامد درآمد سے کام نکالنا نفاق کو بطور پیشہ اپنانا تقیہ کو دین کا رکن رکین شمار کرنا بناوٹی رقعے، اور جعلی خطوط و دستاویزات بنا لینا اور بے شرمی کے ساتھ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم یا ائمہ کرام رحمہم اللہ کی طرف ان کو منسوب کر دینا دنیاوی اغراض فاسدہ اور چند ٹکوں کی خاطر حق کو باطل، باطل کو حق کہہ دینا۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا یہ تو کچھ نہیں پہاڑ کی مانند ڈھیر کے بانگی کے چند دانے ہیں، ان کے تفصیلی حال سے جو آگاہ ہونا چاہے، وہ سورہ بقرہ سے سورۃ انفال کا بغور مطالعہ کرے قرآن کے اس حصہ میں یہودیوں کے اوصاف اعمال و اخلاق جو کچھ ملتا جائے ذہن میں محفوظ کرتا جائے پھر اس فرقہ کے اوصاف اعمال و اخلاق سے ان کا موازنہ کرے اور انہیں آمنے سامنے رکھ کر ملائے ہم کو یقین ہے کہ ہمارے قول کی سچائی اس کے دل میں اتر جائے گی اور زبان سے طابق النعل بالنعل کے محاورہ کی تصدیق پر مجبور ہو جائیگا اور دونوں کے اوصاف حرف بحرف گلے ملتے نظر آئیں گے۔

دوسرا طبقہ:۔ ان ضعیف الایمان، منافق، قاتلین ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن سبا کے ان پیرووں کا ہے، جو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی شان میں دریدہ دہنی اور بدزبانی سے کام لیتے تھے، یہ جن برائیوں اور بڑی بڑی

ہرزہ سرائیوں کا سرچشمہ ہے، بلاد اسلامیہ میں کس منہ سے رہ سکتے تھے اس لئے چاروناچار ہر طرف سے بھاگ کر جناب علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں گھس پڑتے تھے، ۔ اور اپنے آپکو شیعان علی شمار کرتے تھے اور یہی مخلص صادقین کہلاتے تھے ان میں سے کچھ ملازمتوں اور عہدوں کے لالچ میں دامن امیر سے چمٹے کر رہ گئے تھے اس کے باوجود ان کی بدباطنی جب بھی وقت و موقع دیکھتی پردہ خفا سے نکل کر منظر عام پر آجاتی، اور کھلم کھلا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کا ارتکاب کرتے اور آپ کے ارشاد پر کان نہ دھرتے، ا

نہ آپ کی دعوت قبول کرتے نہ آپ کے اوامر و نواہی کی پرواکرتے اور اگر عہدوں اور مرتبوں پر فائز ہوتے تو خدا اور خلق کے اموال و حقوق میں خیانت کرتے اور ظلم وستم کی گرم بازاری کرتے اور صرف اپنی گرم بازاری کی خاطر صحابہ کرام پر زبان طعن و تشنیع دراز کرتے۔ یہی بدکردار خائن ظالم اور بدزبان لوگ رافضیوں کے پیشوا ان کے اسلاف اور ان کی مسلم الثبوت مقتدر ہستیاں ہیں جن کی روایات و منقولات پر انہوں نے اپنے دین وایمان کی بنیاد رکھی کیونکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے اکثر روایات ان ہی فاسق منافقین کی وساطت سے تو اس فرقہ تک پہنچی ہیں،

واقعہ تحکیم پیش آیا تو ان منافقین فساق کے چہرے سامنے آگئے تاریخ بتاتی ہے کہ مسئلہ پنچایت پیش آنے سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شیعان اولی یعنی انصار و مہاجرین کے غلبہ کے سبب یہ لوگ دبے اور بے دست و پا اور شکست خوردہ سے وقت گزاری کر رہے تھے جب واقعہ تحکیم رونما ہوا اور امور خلافت کی درستی واصلاح کی امید ٹوٹی ۔ ادھر خلافت موعودہ کا زمانہ فطری ختم ہونے کا وقت قریب نظر آنے لگا تو شیعان اولی نصرت دین کے اس طریق سے مایوس ہو کر محل تحکیم دومۃ الجندل سے اپنے اپنے اوطان اور شہروں مثلاً مدینہ منورہ مکہ معظمہ یا حجاز کے دیگر قریوں اور قصبوں کی طرف لوٹے اور وہاں نصرت دین کی ایک اور جہت سے خدمت میں مصروف ہو گئے، اور خود جناب علی رضی اللہ عنہ بھی کوفہ پہنچ کر ان مشاغل میں مصروف ہو گئے گویا جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف واپس ہوئے تو یہ وہ وقت تھا جب جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہمراہی معدودے چند رہ گئے تھے

اور ان میں بھی وہ زیادہ تھے جو کوفے ہی میں رہتے تھے شیعان اولی میں سے کوئی باقی نہ رہا تھا۔

تو ان منافقین نے میدان خالی پا کر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں نافرمانی، تحکم اور بے ادبی کی خوب داد دی ادھر آپ کے زندہ و مردہ دوستوں کی شان میں بدگوئی اور طعن و تشنیع پر زبان دراز کی اور چونکہ اس سارے فساد کی جڑ بھی یہی تھی اس لئے جناب امیر رضی اللہ عنہ ہی کے تصرف و اقتدار میں تھے ان میں خدمت اور عہدوں کے حصول کی طمع اور لالچ بھی ان کے دلوں کی بھٹی میں بھڑک رہا تھا اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتے تھے کہ دشمنوں کی کثرت اور مددگاروں کی قلت کے باعث جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی اس وقت ہم سے دست بردار نہیں ہوں گے اور ہماری زیادتیاں چاروناچار برداشت کریں گے اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے حوالہ سے اگر کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس وقت کی حالت کا مطالعہ کرے جس میں آپ گھر گئے تھے، کہ ایک طرف تو وفادار دوستوں کا مجمع آپ کے پاس سے چھٹ چکا ہے، اور ان کی جگہ ایسے نامشروں نے آپ کو گھیر رکھا ہے، دوسری طرف شام، مصر، اور عرب کے دوسرے شہروں پر آپ کے دشمن چھائے ہوئے تھے تو حضرت رسالتماب صلے اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی یقیناً تصدیق کرے گا کہ اَشَدُّ الْبَلَاءِ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ سب سے سخت آفت انبیاء پر آتی ہے پھر ان کے ہم جنسوں پر درجہ بدرجہ،

گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ان منافقوں کے ساتھ یا ان منافقوں کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو بہو ایسا تھا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہودیوں کا یا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافقین کا کہ نہ تو یہ لشکر سے اپنا منہ کالا کرتے تھے اور نہ اطاعت و فرماں برداری کرتے تھے بلکہ ہمیشہ رنج و ملال خاطر کا سبب اور سوہان روح بنے رہتے تھے،

اب چونکہ شیعہ اہل سنت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اس لیئے اس باب میں اہل سنت کی روایات کو چھوڑ کر مجبوراً جناب علی رضی اللہ عنہ کے فرمودات خود شیعوں کی معتبر کتابوں سے جن کے اکثر مصنفین زیدیہ امامیہ ہی نقل کرتے ہیں، ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں اور انصاف کو کام میں لائیں،

امام موید باللہ یحییٰ بن حمزہ زیدیہ اپنی کتاب اطواق الحمامہ فی مباحث الامامہ کے آخر میں سوید بن غفلہ سے یوں روایت بیان کرتا ہے،

مَرَرْتُ بِقَوْمٍ يَنْتَقِصُوْنَ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ فَاَخْبَرْتُ عَلِيًّا وَقُلْتُ لَوْلَا اَنَّهُمْ يَرَوْنَ اَنَّكَ تُضْمِرُ مَا اَعْلَنُوْا مَا اجْتَرَءُوْا عَلٰى ذَالِكَ مِنْهُمْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَبَا وَكَانَ اَوَّلُ مَنْ اَظْهَرَ ذَالِكَ، فَقَالَ عَلِيٌّ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ ثُمَّ نَهَضَ وَاَخَذَ بِيَدِيْ وَاَدْخَلَنِي الْمَسْجِدَ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ ثُمَّ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ وَهِيَ بَيْضَاءُ فَجَعَلَتْ دُمُوْعُهُ تَتَحَادَرُ عَلٰى لِحْيَتِهٖ وَجَعَلَ النَّظَرَ لِلْبِقَاعِ حَتَّى اجْتَمَعَ النَّاسُ ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَذْكُرُوْنَ اَخَوَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَزِيْرَيْهِ وَصَاحِبَيْهِ وَسَيِّدَيْ قُرَيْشٍ وَاَبَوَيِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَنَا بَرِيْءٌ مِمَّا يَذْكُرُوْنَ وَعَلَيْهِ مُعَاقِبٌ صَحِبَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجِدِّ وَالْوَفَاءِ وَالْجِدِّ فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ يَاْمُرَانِ وَيَنْهَيَانِ وَيَقْضِيَانِ وَيُعَاقِبَانِ لَا يَرٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَرَاْيِهِمَا رَاْيًا وَلَا يُحِبُّ كَحُبِّهِمَا حُبًّا لِمَا يَرٰى مِنْ عَزْمِهِمَا فِيْ اَمْرِ اللّٰهِ فَقُبِضَ وَهُوَ عَنْهُمَا رَاضٍ وَالْمُسْلِمُوْنَ رَاضُوْنَ فَمَا تَجَاوَزَا فِيْ اَمْرِهِمَا وَسِيْرَتِهِمَا رَاْيَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَمْرَهٗ فِيْ حَيَاتِهٖ وَبَعْدَ مَوْتِهٖ فَقُبِضَا عَلٰى ذَالِكَ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ فَوَالَّذِيْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَالنَّوٰى وَبَرَاَ النَّسَمَةَ لَا يُحِبُّهُمَا اِلَّا مُؤْمِنٌ فَاضِلٌ وَلَا

میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کی توہین کے مرتکب ہو رہے تھے تو میں نے اس کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دی اور ان سے کہا کہ اگر ان لوگوں کو یہ خیال نہ ہوتا کہ جس بات کو وہ برملا کہہ رہے ہیں اسی بات کو آپ دل میں چھپائے ہوئے ہیں تو وہ اس دیدہ دلیری کی کبھی ہمت نہ کر پاتے انہیں عبداللہ بن سبا پہلا شخص ہے جس نے اسکو ظاہر کیا یہ سنکر حضرت علیؓ نے فرمایا خدا پناہ میں رکھے اللہ تعالیٰ ان دونوں رفیقوں پر رحم فرمائے پھر وہاں سے اٹھے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر مسجد میں آئے، منبر پر تشریف فرما ہوئے اپنی سفید ریش مبارک مٹھی میں تھام کر آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دو بھائیوں، دو وزیروں اور دو ساتھیوں کا اور قریش کے دو سرداروں اور مسلمانوں کے دو باپوں کا ذکر برائی کے ساتھ کرتے ہیں اور میں ان کے اس قول سے بری الذمہ ہوں اور ان کو ایسی باتیں کہنے کی وجہ سے سزا دی جائے گی، ہمہ قسم جدوجہد، وفا اور حدود اللہ کے معاملات میں یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے امر و نہی کا فرض ادا کرتے رہے، یہ فیصلہ بھی کرتے اور سزا بھی دیتے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی رائے کے سامنے کسی کی رائے کو اہمیت نہ دیتے تھے نہ ان کی برابر کسی سے

وَلَا يُبْغِضُهُمَا إِلَّا شَقِيٌّ مَارِقٌ وَحُبُّهُمَا قُرْبٌ وَبُغْضُهُمَا مُرُوْقٌ إِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْثِ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اَضْمَرَ لَهُمَا إِلَّا الْحَسَنَ الْجَمِيْلَ وَسَتَرٰى ذٰلِكَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ اَرْسَلَ إِلَى ابْنِ سَبَا فَسَيَّرَهٗ إِلَى الْمَدَائِنِ وَقَالَ لَا تُسَاكِنِّيْ فِيْ بَلْدَةٍ اَبَدًا۔

محبت کرتے تھے ان کی یہ قدر و عزت اللہ کے حکم میں ان کے ارادوں کے سبب تھی، پس جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو آپ ان دونوں سے راضی تھے اور مسلمان بھی ان دونوں سے خوش اور مطمئن تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے حکم اور سیرت میں نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حین حیات نہ بعد وصال آپ کی رائے اور حکم سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا اور اسی حال پر ان کی وفات ہوئی اور اللہ تعالیٰ ان پر اپنا رحم فرمائے اس ذات پاک کی قسم جس نے دانہ کو اگایا اور جان کو پیدا کیا ان کو بلند درجہ مومن ہی دوست رکھ سکتا ہے اور ان سے بغض رکھنے والا مرتد بدبخت ہی ہو سکتا ہے ان کی محبت قرب الی اللہ کی نشانی ہے اور ان سے بغض بے دینی کی علامت (الی آخر الحدیث) اور ایک روایت میں یوں ہے اللہ اس پر لعنت کرے جو ان کے متعلق اچھائی کے سوا کوئی اور بات اپنے دل میں رکھے اور عنقریب ہی تم اس کا نتیجہ دیکھ لوگے پھر آپ نے اپنے کارندے کو بھیج کر عبداللہ بن سبا کو مدائن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ اور کہلا بھیجا تو میرے ساتھ ایک شہر میں کبھی نہیں رہ سکتا۔

پھر جب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے قتل کی جو مصر میں ہوا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو جو آپ کی طرف سے بصرہ کے صوبہ دار تھے ایک خط لکھا جس میں اس بدبخت اور شقی کے گروہ کے متعلق شکایتوں کے انبار لگا دیئے۔

اب ہم کتاب نہج البلاغہ سے جو ان شیعوں کے نزدیک کتاب اللہ کے بعد اصح الکتب کا درجہ رکھتی ہے اور متواتر ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کرامت نامہ کی بعینہ نقل کرتے ہیں تاکہ ان کے اسلاف کی بزرگی اور امام معصوم کی شہادت کی خوبی سے روز روشن سے زیادہ واضح اور گزرے کل سے زیادہ صاف ہو جائے خط کی عبارت یہ ہے۔

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ مِصْرًا قَدْ فُتِحَتْ وَمُحَمَّدُ بْنُ اَبِيْ بَكْرٍ فَقَدِ اسْتُشْهِدَ فَعِنْدَ اللّٰهِ نَحْتَسِبُهٗ وَلَدًا نَاصِحًا وَعَامِلًا كَادِحًا وَسَيْفًا قَاطِعًا وَرُكْنًا دَافِعًا وَكُنْتُ قَدْ حَثَثْتُ النَّاسَ عَلٰى لِحَاقِهٖ وَاَمَرْتُهُمْ بِغِيَاثِهٖ قَبْلَ الْوَقْعَةِ وَدَعَوْتُهُمْ سِرًّا وَجَهْرًا وَعَوْدًا وَبَدْءًا فَمِنْهُمُ الْاٰتِيْ كَارِهًا وَمِنْهُمُ الْمُعْتَلُّ كَاذِبًا وَمِنْهُمُ الْقَاعِدُ خَاذِلًا اَسْاَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى اَنْ يَّجْعَلَ لِيْ مِنْهُمْ فَرَجًا عَاجِلًا فَوَاللّٰهِ لَوْلَا طَمَعِيْ عِنْدَ لِقَاءِ الْعَدُوِّ فِي الشَّهَادَةِ وَتَوْطِيْنِيْ نَفْسِيْ عَلَى الْمَنِيَّةِ لَاَحْبَبْتُ اَنْ لَّا اَلْقٰى مَعَ هٰؤُلَاءِ يَوْمًا وَّاحِدًا وَّلَا اَلْتَقِيْ بِهِمْ اَبَدًا۔

(بعد حمد و ثنا) مصر فتح ہو گیا اور محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے ثواب و اجر کی دعا کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ لڑکا خیر خواہ، محنتی ننگی تلوار، اور ارکان کو بلند کرنے والا تھا، اس سانحہ سے پہلے میں نے لوگوں کو اس کی رفاقت کی تاکید کی تھی اور ان کو حکم دیا تھا کہ اس کی فریاد رسی کریں تو اس وقت بعض لوگوں نے ابتدا ہی تاکید کے ساتھ اس کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور دعوت دی تھی تو اس وقت بعض لوگوں نے اس کو برا سمجھتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور بعض نے جھوٹ بولتے ہوئے بہانہ بازی کی اور بعض مدد سے دست کش ہو کر بیٹھ رہے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو ان لوگوں سے جلد خلاصی عطا فرمائے، خدا کی قسم اگر دشمن کے مقابلہ کے وقت مجھے شہادت کی آرزو نہ ہوتی اور میں اپنی جان کو موت پر آمادہ نہ کر لیتا تو میں اس بات کو پسند کرتا

کہ ان لوگوں کے ساتھ ایک دن بھی نہ رہوں اور ان کی شکل تک نہ دیکھوں،

اور پھر جب یہ خبر پہنچی کہ سفیان بن عوف، جو قبیلہ بنی عامر سے تعلق رکھتا تھا اور امراء معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے تھا، کے سواروں نے شہر انبار پہنچکر وہاں کی رعایا کو تہ تیغ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا جس کا ایک حصہ یہ ہے،

وَاللّٰهِ يُمِيتُ الْقَلْبَ وَيَجْلِبُ الْهَمَّ مَا نَرٰى مِنِ اجْتِمَاعِ هٰؤُلَاءِ عَلٰى بَاطِلِهِمْ وَتَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ فَقُبْحًا لَكُمْ وَتَرَحًا حِيْنَ صِرْتُمْ غَرَضًا يُرْمٰى يُغَارُ عَلَيْكُمْ وَلَا تُغِيْرُوْنَ وَتُغْزَوْنَ وَلَا تَغْزُوْنَ وَيُعْصَى اللّٰهُ وَتَرْضَوْنَ فَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ اِلَيْهِمْ فِيْ اَيَّامِ الْحَرِّ قُلْتُمْ هٰذِهٖ حَمَارَّةُ الْقَيْظِ اَمْهِلْنَا يُنْسَلِخْ عَنَّا الْحَرُّ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِالسَّيْرِ اِلَيْهِمْ شِتَاءً قُلْتُمْ هٰذِهٖ صَبَارَّةُ الْقُرِّ اَمْهِلْنَا يَنْسَلِخْ عَنَّا الْبَرْدُ فَكُلُّ هٰذَا فِرَارًا مِنَ الْحَرِّ وَالْقُرِّ فَاِذَا كُنْتُمْ مِنَ الْحَرِّ وَالْقُرِّ تَفِرُّوْنَ فَاَنْتُمْ وَاللّٰهِ مِنَ السَّيْفِ اَفَرُّ يَا اَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ حُلُوْمُ الْاَطْفَالِ وَعُقُوْلُ رَبَّاتِ الْحِجَالِ لَوَدِدْتُ اَنِّيْ لَمْ اَرَكُمْ وَلَمْ اَعْرِفْكُمْ مَعْرِفَةً۔

اس خدا کی قسم جو دلوں کو مردہ کر دیتا ہے اور رنج کو کھینچ لیتا ہے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، کہ اہل شام تو باطل پہ جمع ہو گئے ہیں اور تم حق سے بچھڑ گئے ہو تمہارا ناس ہو اور ذلیل و خوار ہو کہ تم تیروں کا نشانہ بنگئے ہو، تم پر تیر اندازی ہوتی ہے تم پہ حملہ کیا جاتا ہے مگر تم حملہ آور نہیں ہوتے تم سے جہاد کیا جاتا ہے، تم جہاد نہیں کرتے جو نافرمانی کرتا ہے تم اس کی نافرمانی پر خوش ہوتے ہو، میں اگر گرمی میں تم سے جہاد کا مطالبہ کرتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ یہ چلچلاتی گرمی ہے اتنی مہلت دیجئے کہ یہ گزر جائے اور جب موسم سرما میں جہاد کا تقاضا کرتا ہوں تو تم کہتے ہو یہ تو چلے کا جاڑہ ہے ذرا ٹھہر جائے یہ سردی گذر جائے دیجئے پس یہ سردی گرمی سے فرار ہے اور جب تم سردی گرمی سے اتنے حواس باختہ ہو اور اس کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تو خدا کی قسم تلوار سے تو تم کہیں زیادہ بھاگو گے اے مرد نما نامردو بچوں جیسی عقل رکھنے والو اور عورتوں جیسی سمجھ رکھنے والو کاش کہ میں نے تم کو دیکھا ہی نہ ہوتا، اور جانا ہی نہ ہوتا۔

پھر اسی خطبہ میں یہ بھی فرمایا۔

قَاتَلَكُمُ اللّٰهُ لَقَدْ مَلَأْتُمْ قَلْبِيْ قَيْحًا وَشَحَنْتُمْ صَدْرِيْ غَيْظًا وَجَرَّعْتُمُوْنِيْ نُغَبَ التَّهْمَامِ اَنْفَاسًا فَاَفْسَدْتُمْ عَلَيَّ رَأْيِيْ بِالْخِذْلَانِ وَالْعِصْيَانِ حَتّٰى قَالَتْ قُرَيْشٌ اِنَّ ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ رَجُلٌ شُجَاعٌ وَلٰكِنْ لَا عِلْمَ لَهٗ بِالْحَرْبِ لِلّٰهِ اَبُوْهُمْ وَهَلْ اَحَدٌ اَشَدُّ لَهَا مِرَاسًا وَاَقْدَمُ فِيْهَا مَقَامًا مِنِّيْ لَقَدْ نَهَضْتُ فِيْهَا وَمَا بَلَغْتُ الْعِشْرِيْنَ وَهَا اَنَا ذَا قَدْ ذَرَّفْتُ عَلَى السِّتِّيْنَ وَلٰكِنْ لَا رَأْيَ لِمَنْ لَا يُطَاعُ۔

اللہ تمہیں ہلاک کرے تم نے میرا دل زخموں سے بھر دیا سینہ غموں سے لبریز کر دیا، دمبدم تم نے مجھے فکروں اور رنجوں کے جرعے پلائے میرا ساتھ چھوڑ کر میری نافرمانی کر کے تم نے میری تدبیروں کو تلپٹ اور برباد کر دیا اور قریش کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ابن ابی طالب آدمی تو بہادر ہے مگر جنگ کی اونچ نیچ اور داؤ پیچ نہیں جانتا بھلا یہ غلط ہے کیا کوئی ہے جو جنگ کا مجھ سے زیادہ ماہر ہو اور آزمودہ کاری میں مجھ سے بڑھا ہوا ہو۔ میری عمر بیس سال بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں محاربات میں کود پڑا تھا، اب تو میری عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر گئی لیکن جس کی بات ہی کوئی نہ مانے اس کی رائے ہی کیا،

ایک دوسرے خطبہ میں ارشاد فرمایا،

يٰاَيُّهَا النَّاسُ الْمُجْتَمِعَةُ اَبْدَانُهُمْ الْمُخْتَلِفَةُ اَهْوَاؤُهُمْ كَلَامُكُمْ يُوْهِي الصُّمَّ الصِّلَابَ وَفِعْلُكُمْ يُطْمِعُ فِيْكُمُ الْاَعْدَاءَ تَقُوْلُوْنَ فِي الْمَجَالِسِ كَيْتَ وَكَيْتَ فَاِذَا حَضَرَ الْقِتَالُ فَاَنْتُمْ حَيَادِ مَا عَزَّتْ دَعْوَةُ مَنْ دَعَاكُمْ وَلَا اسْتَرَاحَ قَلْبُ مَنْ قَاسَاكُمْ اَعَالِيْلُ بِاَضَالِيْلَ وَدِفَاعَ ذِي الدَّيْنِ الْمَطُوْلِ۔

اے لوگو! جسمانی خواہشوں میں گھرے ہوئے لوگو! باتیں تو ایسی کرتے ہو کہ پتھر موم ہو جائے اور تمہارا عمل ایسا ہے کہ لوگ تم کو نرم چارہ سمجھ کر تم پر جھپٹ پڑیں مجلسوں میں بڑے چرب لسان ہو لیکن جب جنگ کا موقع آتا ہے تو ساری چوکڑیاں بھول کر بیکار بیکارہ جاتے ہو جس نے تم کو اپنے زیر علم جمع کیا اس نے تم سے کوئی تقویت نہ پائی اور جس نے تمہاری خاطر تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں تم سے اس کے دل کو کوئی آرام و سکون نہ ملا قرضخواہوں کو ٹرخانے کی طرح تمہارے پاس جھوٹے بہانے بہت ہیں،

دوسرے خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا۔

اَلْمَغْرُوْرُ وَاللّٰهِ مَنْ غَرَرْتُمُوْهُ وَمَنْ فَازَ بِكُمْ فَازَ بِالسَّهْمِ الْاَخْيَبِ وَمَنْ رَمٰى بِكُمْ رَمٰى بِاَفْوَقَ نَاصِلٍ اَصْبَحْتُ وَاللّٰهِ لَا اُصَدِّقُ قَوْلَكُمْ وَلَا اَطْمَعُ فِيْ نَصْرِكُمْ وَلَا اُوْعِدُ الْعَدُوَّ بِكُمْ۔

وہ دھوکہ کھایا ہوا ہے جس کو تم نے دھوکہ دیا۔ اور جس نے تم کو پایا اس کے حصہ میں ایک ردی اور ناکارہ حصہ آیا اور تم جس کے پالے پڑے اس کو لمبے تیروں سے پالا پڑا اللہ کی قسم میری حالت ایسی ہو گئی ہے کہ نہ میں تمہاری بات کو سچ سمجھتا ہوں نہ تمہاری مدد کی مجھے خواہش ہے اور نہ تمہارے ذریعہ میں دشمن کو مرعوب کر سکتا ہوں،

پھر ایک اور مرتبہ شامیوں کے بارے میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

اُفٍّ لَكُمْ لَقَدْ سَئِمْتُ عِتَابَكُمْ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ عِوَضًا وَبِالذُّلِّ مِنَ الْعِزِّ خَلَفًا اِذَا دَعَوْتُكُمْ اِلٰى جِهَادِ عَدُوِّكُمْ دَارَتْ اَعْيُنُكُمْ كَاَنَّكُمْ مِنَ الْمَوْتِ فِيْ غَمْرَةٍ وَمِنَ الذُّهُوْلِ فِيْ سَكْرَةٍ يُرْتَجُ عَلَيْكُمْ حِوَارِيْ فَتَعْمَهُوْنَ وَكَاَنَّ قُلُوْبَكُمْ مَاْلُوْسَةٌ فَاَنْتُمْ لَا تَعْقِلُوْنَ مَا اَنْتُمْ فِيْ مَنْعَةٍ يَسْتَحِشُّ اللَّيَالِيْ مَا اَنْتُمْ بِرُكْنٍ يُمَالُ بِكُمْ وَلَا ذُوْ زَوَافِرِ عِزٍّ يُفْتَقَرُ اِلَيْكُمْ مَا اَنْتُمْ اِلَّا كَاِبِلٍ ضَلَّ رُعَاتُهَا فَكُلَّمَا جُمِعَتْ مِنْ جَانِبٍ اِنْتَشَرَتْ مِنْ جَانِبٍ اٰخَرَ وَلَبِئْسَ لَعَمْرُ اللّٰهِ مُسَعِّرُوْ نَارِ الْحَرْبِ اَنْتُمْ تُكَادُوْنَ وَلَا تَكِيْدُوْنَ وَتَنْتَقِصُ اَطْرَافُكُمْ وَلَا تَتَغَيَّظُوْنَ وَلَا يُنَامُ عَنْكُمْ وَاَنْتُمْ فِيْ غَفْلَةٍ سَاهُوْنَ۔

میں تم سے بہت دل تنگ ہو گیا میں نے تمہارا عتاب سن لیا۔ کیا تم آخرت کے بدلے میں دنیا کی زندگی سے خوش ہو گئے اور عزت کے عوض ذلت پسند کر لی جب میں تم کو تمہارے ہی دشمنوں سے جہاد کے لئے بلاتا ہوں تو تمہاری آنکھیں یوں چڑھ جاتی ہیں جیسے مرنے والے کی نزع کے وقت یا بیہوشی کی حالت میں جان دینے والے کی طرح میرا جواب تمہارے ذمہ ہے اور تم سرگشتہ ہو گئے ہو، گویا تمہارے دل سخت گھٹن میں ہیں اور تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا نہ تم حملہ کے وقت کی ایسی قوت ہو کہ سختی سے ڈٹ جاؤ نہ ایسے ستون ہو کہ تمہاری طرف میلان کیا جائے نہ ہی تم ذی عزت و وقار ہو کہ کوئی کسی کی حاجت کی تم سے امید رکھے تم تو درحقیقت ایسے بھٹکے ہوئے اونٹوں کی طرح ہو جن کے چرواہے گم ہو گئے ہوں، ایک طرف سے اگر ان کو گھیرا جائے تو دوسری طرف سے نکل بھاگتے ہیں، اور اللہ کی قسم جو لڑائی بھڑکانے والا ہے اور تم پہ چالیں چل رہا ہے مگر تم کوئی چال اور داؤ نہیں

کھیلے، تمہارے ملک کے علاقے تمہارے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں مگر تم کو جوش و غصہ نہیں آتا تمہارے فکر میں تمہارے دشمنوں کی تو نیندیں حرام ہو رہی ہیں، اور تم میٹھی نیند میں پڑے سو رہے ہو،

ایک اور خطبہ میں یوں ارشاد ہے،

مُنِیْتُ بِمَنْ لَا یُطِیْعُ إِذَا أَمَرْتُ وَلَا یُجِیْبُ إِذَا دَعَوْتُ وَلَا أَبَا لَکُمْ مَا تَنْتَظِرُوْنَ بِنَصْرِکُمْ رَبَّکُمْ أَمَا دِیْنٌ یَجْمَعُکُمْ وَلَا حَمِیَّةٌ تُغْضِبُکُمْ أَقُوْمُ فِیْکُمْ مُسْتَصْرِخًا وَأُنَادِیْکُمْ مُتَغَوِّثًا فَلَا تَسْمَعُوْنَ لِیْ قَوْلًا وَلَا تُطِیْعُوْنَ لِیْ أَمْرًا حَتّٰی تَکَشَّفَ الْأُمُوْرُ عَنْ عَوَاقِبِ الْمَسَاءَةِ فَمَا یُدْرَکُ بِکُمْ ثَارٌ وَلَا یَبْلُغُ مِنْکُمْ مُرَادٌ دَعَوْتُکُمْ إِلٰی نَصْرِ إِخْوَانِکُمْ فَجَرْجَرْتُمْ جَرْجَرَةَ الْجَمَلِ الْأَسَرِّ وَتَثَاقَلْتُمْ تَثَاقُلَ النِّضْوِ الْأَدْبَرِ ثُمَّ خَرَجَ مِنْکُمْ جُنْدٌ مُتَذَائِبٌ ضَعِیْفٌ کَأَنَّمَا یُسَاقُوْنَ إِلَی الْمَوْتِ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ،

میرے لئے وہ لوگ مصیبت بن گئے ہیں جو نہ میرا حکم مانتے ہیں، نہ میری پکار پر کان دھرتے ہیں تمہارے باپ مریں کیا تم اللہ کی مدد کا انتظار کر رہے ہو جبکہ نہ دین تم کو اکٹھا کرتا ہے نہ غیرت تمہارے دلوں کو گرماتی ہے میں تم میں کھڑا چیخ رہا ہوں اور فریاد رسی کے لئے چلا رہا ہوں لیکن تم نہ میری بات سنتے ہو اور نہ میرا حکم بجا لاتے ہو یہاں تک کہ کاموں کا نتیجہ بد انجامیوں کی شکل میں ظاہر ہو تو پھر نہ تمہارے ذریعہ کسی سے بدلہ لیا جا سکتا ہے اور نہ تم سے مقصد تک پہنچا جا سکتا ہے، میں نے تمہیں تمہارے بھائیوں کی مدد کے لئے بلایا تو تم نے اس طرح گردن ڈال دی جیسے اڑیل اونٹ گردن ڈال دیتا ہے اور ایسے بیمار ہو پڑ جاتے ہو جیسے کمزور اور زخمی پیٹ والا اونٹ اور تم میں سے ایک لشکر نکلا بھی تو پاؤں گھسٹتا ہوا سست اور کمزور جیسے کوئی موت کی طرف گھسیٹے لئے جا رہا ہو اور موت سامنے نظر آ رہی ہو)

پھر انہیں جیسے یاروں کے بارے میں فرمایا۔

کَمْ أُدَارِیْکُمْ کَمَا یُدَارَی الْبِکَارُ الْعَمِدَةُ وَالثِّیَابُ الْمُتَدَاعِیَةُ کُلَّمَا خِیْطَتْ مِنْ جَانِبٍ تَهَتَّکَتْ مِنْ جَانِبٍ آخَرَ وَکُلَّمَا أَطَلَّ عَلَیْکُمْ مَنْسِرٌ مِنْ مَنَاسِرِ الشَّامِ أَغْلَقَ کُلُّ رَجُلٍ مِنْکُمْ بَابَهٗ وَانْجَحَرَ انْجِحَارَ الضَّبَّةِ فِیْ حُجْرِهَا وَالضَّبُعِ فِیْ وِجَارِهَا،

میں کہاں تک نازک بدن کنواریوں یا ان پرانے کپڑوں کی طرح تمہاری حفاظت کروں کہ ان کو اگر ایک طرف سے سیا جائے تو دوسری طرف سے مسک جائے جب کوئی شامی افسر تمہارے سر پر آ دھمکتا ہے تو تم سے ہر شخص اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے اور گوہ کی طرح اپنے بل میں اور بجو کی طرح اپنے بھٹ میں گھس پڑتا ہے،

پھر ایک اور خطبے میں یوں فرمایا۔ مَنْ رَمٰی بِکُمْ فَقَدْ رَمٰی بِأَفْوَقَ نَاصِلٍ إِنَّکُمْ وَاللّٰهِ لَکَثِیْرٌ فِی الْبَاحَاتِ وَقَلِیْلٌ تَحْتَ الرَّایَاتِ، جس نے پہلے تم پر اس پر بے پھل کے تیر برسے اللہ کی قسم تم نام و نمود کی مجلسوں میں تو بہت ہوتے ہو مگر جھنڈوں کے نیچے خال خال ہی ہوتے ہو

رضی نے یہ سارے خطبے نہج البلاغہ میں درج کئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے امامیوں نے بھی اپنی کتابوں میں ان کی روایت کی ہے، چنانچہ علی بن موسیٰ بن طاؤس سبط محمد بن حسن طوسی شیخ الطائفہ نے کہا ہے اِنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ کَانَ یَدْعُو النَّاسَ عَلٰی مِنْبَرِ الْکُوْفَةِ اِلٰی قِتَالِ الْبُغَاةِ فَمَا اَجَابَهٗ اِلَّا رَجُلَانِ فَتَنَفَّسَ الصُّعَدَاءَ وَقَالَ اَیْنَ یَقَعَانِ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کوفے میں برسر منبر باغیوں سے جنگ کے لئے بلایا تو دو آدمیوں کے سوا کسی نے آپ کے بلاوے کا جواب نہ

دیا۔ تو آپ نے ٹھنڈا سانس بھر کر ان سے کہا میں تم دو کا کیا کروں،

پھر ابن طاؤس کہتا ہے،

هٰؤُلَاءِ خَذَلُوْهُ مَعَ اعْتِقَادِهِمْ وَاِظْهَارِهِمْ بِفَرْضِ طَاعَتِهٖ وَاَنَّهٗ صَاحِبُ الْحَقِّ وَاَنَّ الَّذِيْنَ يُنَازِعُوْنَهٗ عَلَى الْبَاطِلِ وَكَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُدَارِيْهِمْ وَلٰكِنْ لَا يُجْدِيْ الْمُدَارَاةُ نَفْعًا وَقَدْ سَمِعَ قَوْمًا مِنْ هٰؤُلَاءِ يَنَالُوْنَ مِنْهُ فِيْ مَسْجِدِ الْكُوْفَةِ وَيَسْتَخِفُّوْنَ بِهٖ فَاَخَذَ بِعِضَادَتَيِ الْبَابِ وَاَنْشَدَ مُتَمَثِّلًا بَيْتٌ

هَنِيْئًا مَرِيْئًا غَيْرَ دَاءٍ مُخَامِرٍ
لِعَزَّةَ مِنْ اَعْرَاضِنَا مَا اسْتَحَلَّتِ
فَيَئِسَ مِنْهُمْ كُلِّهِمْ وَدَعَا عَلَيْهِمْ۔

ان لوگوں نے آپ کا ساتھ ایسی حالت میں چھوڑا کہ ان کی عقیدت کے بھی مدعی تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ آپ کی اطاعت فرض ہے اور در، اطاعت کرانے کے صحیح حقدار بھی ہیں اور آپ سے لڑنے والے ناحق جناب امیر رضی اللہ عنہ ان کی رکھوالی کرتے تھے مگر ان کو ان کی رکھوالی سے کچھ فائدہ نہ تھا اور ان میں سے ایک جماعت کو عین مسجد کوفہ میں آپ کی تحقیر و توہین کرتے سنا گیا، اس وقت آپ کے دروازے کے دونوں پٹ پکڑ کر تمثیلاً یہ شعر پڑھا۔ ہمارے محبوب کو بغیر کسی آزار کے گوارا و مرغوب ہو ہماری عزتیں اور جو کچھ وہ حلال جانے! پس آپ ان سے ناامید ہو گئے اور ان کے لئے بددعا فرمائی!)

ان تمام خطبوں اور ابن طاؤس کی روایت سے ثابت ہوا کہ اس فرقہ کے حق میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شیعیت کے دعویدار تھے آپ نے قَاتَلَكُمُ اللّٰهُ قبحا لکم ترحا جیسے کلمات فرمائے اور قسم کھا کر فرمایا کہ ان کے کہے کو کبھی سچ نہ جانیں گے،

جا بجا آپ کے حکم کی نافرمانی کرنے اور آپ کی بات نہ سننے کی شکایت کی بلکہ آپ تو ان کو دیکھنے یا ان کی بات سننے تک سے بیزار تھے۔ ادھر وہ بھی اپنی عادت کے پکے تھے کہ ہمیشہ آپ سے دغا کرتے رہے رنج پہنچاتے اور آپ کے دل میں غیض و غضب پیدا کرنے کا سبب بنتے رہے عین مسجد میں آپ کے پس پشت آپ کی شان میں بدگوئی کرتے اور آپ کی تحقیر و توہین کرتے رہے ایک اور بات کا ہیں۔ سے پتہ چلا کہ اس وقت کے سارے شیعہ بجز دو آدمیوں کے اس بداطواری، ذلت و توہین میں شریک کار تھے، اب قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب پہلی مبارک صدی کے پہلے طبقہ کا یہ حال ہو جو ان کے نزدیک چھٹے ہوئے تیر اور چیدہ پھول تھے تو پھر ان کے بعد والوں کا جو حال اور رویہ رہا ہوگا اس کے افسوسناک ہونے میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے،

تیسرا طبقہ اثنا عشری اسلاف میں، سے اس جماعت کا ہے جس نے حضرت علی رضؓ کی شہادت کے بعد سید مجتبیٰ جگر پارہ زہرا حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو امام تسلیم کیا چالیس ہزار افراد نے موت پہ بیعت کر کے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ و قتال پہ آمادہ کیا اور کوفہ سے باہر نکال لائے مگر درپردہ یہ ناپاک پختہ و پزکر چکے اور دل میں ٹھان چکے تھے کہ آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے، چنانچہ راستہ میں تنخواہ کی بابت جھگڑا اٹھا کر آپ کو آزردہ خاطر کیا اور بدزبانی اور بدعملی اور بے ادبی سے پیش آئے، یہاں تک کہ مختار ثقفی جو بڑا حمایتی بنا پھرتا تھا اور اپنے آپ کو شیعان اولیٰ میں گنتا تھا آپ کے قدم مبارک کے نیچے سے مصلی کھینچ کر لے گیا، ایک دوسرے لعین نے آپ کے قدم مبارک پر کدال (جیسی کوئی چیز) اٹھا ماری اور جب نوبت لڑائی اور مقابلے کی آئی تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف جھک گئے اور آپ کی مدد سے کنارہ کش ہو کر

دنیا و آخرت کی بربادی اپنے سئے مول لی، حالانکہ دعویٰ یہ تھا کہ ہم آپ کے اور جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے شیعوں میں سے ہیں اور مذہب شیعہ انہی کا نکالا ہوا ہے اور اس کی بنیاد انہیں نے رکھی ہے،

سید مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں اس جماعت کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، جہاں کہ اس نے امام حسن رضی اللہ عنہ کا جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے اور خلافت سے دست برداری کا عذر بھی بیان کیا ہے،

کتاب الفصول امامیہ میں لکھا ہے کہ اس لشکر غدار کے رؤساء حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے خفیہ خط و کتابت کا رابطہ رکھے ہوئے تھے، ان کو تاکیداً لکھتے اور در غلاتے کہ آپ جلد کارروائی کریں تاکہ ہم امام کو آپ کے حوالہ کر دیں اور یوں دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی چند ٹکوں کے عوض خرید سکیں، بلکہ ان میں سے بعض تو اپنے دل میں یہ ناپاک ارادہ چھپائے بیٹھے تھے کہ موقع پائیں اور امام کو دھوکہ سے قتل کر ڈالیں۔

ادھر امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو ان غداریوں اور مفسدوں کے فاسد ارادوں کی ثبوت کے ساتھ یقینی اطلاعات اور خبریں مل چکی تھی اسی لئے انہوں نے مصالحت پہ گردن خم کی اور خلافت سے مجبوراً دست برداری اختیار کی۔

یہ کتاب، فصول کی عبارت کا صحیح خلاصہ اور لب لباب ہے جو امامیہ کی معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے،

چوتھا طبقہ:- اسلاف شیعہ میں سے ان کثیر التعداد کوفیوں کا ہے جنہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور خاتون جنت فاطمہ البتول رضی اللہ عنہا کے جگر پارے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو امرار بھری عرضیاں اور خلوص بھرے خط بھیجکر ان سے دغا بازی کی چال چلی اول آپ کو مجبور کیا کہ دار الامن حرم نبوی کو چھوڑ کر کوفہ رو انہ ہوں اور جب آں جناب کوفہ کے نزدیک پہنچے اور دشمنوں سے مقابلے اور مقاتلے کی نوبت آئی۔ اور صدق اخلاص کے امتحان کا وقت آیا تو ان سب نے آپ کو دغا دی اور دشمنوں کی کثرت کے باوجود امام مظلوم کی مدد و نصرت سے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہاتھ کھینچ لیا بلکہ ان میں سے کچھ تو آپ کے دشمنوں کے ساتھ ڈریا لپکے سبب جا ملے۔ اور جناب امام اور آپ کے رفقاء کی شہادت کا سبب بنے اور کربلا میں کچھ پیش آیا یہ سب کچھ اسی فرقہ کی بے وفائی اور دغا بازی کی وجہ سے پیش آیا۔

پانچواں طبقہ:- اسلاف شیعہ میں سے ان لوگوں کا ہے جنہوں نے مختار ثقفی کے عراق وغیرہ پہ اقتدار قائم کر لینے کے بعد امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے محض مختار کی موافقت کی خاطر منہ پھیر کر جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلمہ پڑھا اور انہیں کو امام تسلیم کیا حالانکہ یہ نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نسب و نسل سے تعلق رکھتے تھے نہ ان کی امامت کی کوئی وجہ جواز تھی چنانچہ ان اسلاف شیعہ کا پورا حال پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آخر آخر تو یہ دین ہی سے پھر کر بے دین ہو گئے تھے کیونکہ یہ مختار کی نبوت اور اس کے پاس وحی آنے کے قائل ہو گئے تھے

چھٹا طبقہ:- ان کے اسلاف میں سے ان لوگوں کا ہے جنہوں نے پہلے تو عدے وعید کر کے حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کو مقابلہ میں نکلنے کے لئے مجبور کیا اور ان کا ساتھ دیا مگر جب نوبت رو برو مقابلہ اور مقاتلہ کی آئی تو ان کی امامت سے انکار کر کے کوفہ میں جا گھسے۔

اور بہانہ یہ گھڑا کہ یہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم پر تبرا نہیں کرتے اس طرح حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرح اس امام زادے کو دشمنوں کے پنجے میں دے دیا اور یوں وہ شہید ہوئے اور حضرت امام حسین کا واقعہ تازہ ہوا

۔ اگر وہ امام نہ تھے نہ امام زادہ ہونے میں تو ان کے کوئی شک نہ تھا اور خلفاء پر تبرا کرنا اتنا بڑا جرم تھا کہ ان کو موت کے جبڑے میں دیدیا۔
ائمہ کی صحیح روایات جو فاضل کاشی کے حوالہ سے پہلے گزر چکی ہیں کہ خلفاء کی شان میں بدگوئی کرنا جنت میں جانے کے لئے کوئی ضروری نہیں، اگر وہ امام محمد بن الحنفیہ کی امامت کے قائل نہ تھے تو دائرہ ایمان سے تو خارج نہیں ہوئے تھے یہ بھی انہیں کی روایات سے معلوم ہوا ہے،
ان سب باتوں کے باوجود آخر وہ مظلوم تھے پھر اہل بیت کے دشمنوں کے حوالے کر دینے کی آخر تک کیا تھی۔ حالانکہ قدرت ہوتے ہوئے ایسے مظلوم کافر کی اعانت خصوصاً جب کہ وہ کافروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہو فرض قطعی ہے،
ساتواں طبقہ: ان کے اسلاف میں ان لوگوں کا ہے، جو خود تو ائمہ کی صحبت و شاگردی کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر ائمہ ان کو کافر ٹھیرا تے اور جھوٹا اور جھوٹا کہتے ہیں۔ اگر ہم ان کو نام بنام گنائیں اور ائمہ نے ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا یا کتب امامیہ ہی سے اس کو نقل کریں تو بڑا لمبا چوڑا دفتر اور ایک طول طویل کتاب چاہیئے لیکن بمطابق اصول ما لا یدرک کلہ لا یترک یعنی جو چیز پوری کی پوری حاصل نہ کی جائے تو اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے ہم ان بزرگواروں کے فضائل و مناقب اور کچھ عقائد ضروری جان کر ان کی خدمت انجام دیتے ہیں،
واضح رہنا چاہیئے کہ شیعیت اور خصوصاً مذہب امامیہ کا دار و مدار اس جماعت پر ہے، جو اللہ تعالیٰ کے لئے ایسا جسم جس میں لمبائی چوڑائی اور موٹا پا پایا جائے۔ مانتی ہے۔ مثلاً ہشامین، شیطان الطاق، اور میثمی ان کا یہ عقیدہ مشہور شیعی مصنف کلینی کی کتاب کافی میں مذکور ہے جس سے انکار کی کسی کو مجال نہیں،
پھر ان میں سے ہشام بن حکم اور شیطان الطاق نے اللہ تعالیٰ کے لئے صورت بھی ثابت کی ہے اور بعض نے ناف تک کا حصہ پولا اور کھوکھلا مانا ہے اور اس سے نیچے کا حصہ ٹھوس اور موٹا تصور کیا ہے جیسے ہشام بن سالم اور میثمی، اور زرارہ بن اعین، سلیمان جعفری اور محمد بن اسلم وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کو ازل میں جاہل مانا ہے،
ان میں سے اکثر نے اللہ تعالیٰ کے لئے مکان اور جہت بھی ثابت و تسلیم کی ہے،
ان کے پیشواؤں میں بعض ملحد و بے دین بھی ہوئے ہیں جیسے دیک الجن شاعر اور اس کے مثل جو صانع، انبیاء اور بعثت کسی کے بھی قائل نہیں،
ان میں سے بعض نصرانی بھی تھے جنہوں نے اپنی قومی وضع، قطع، طرز بود و باش اور لباس معاشرت کو بالکل نہیں بدلا اور انہیں میں ان کا حشر ہوا جیسے زکریا بن ابراہیم نصرانی جس سے ان کے شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی نے کتاب تہذیب میں روایت لی ہے، اور اس کی جماعت اسلاف شیعہ میں گزری ہے جس کے بارے میں امام صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، یَرْوِیْ عَنَّا الْاَکَاذِیْبَ وَیَفْتَرِیْ عَلَیْنَا اَهْلَ الْبَیْتِ (یہ لوگ ہم سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں اور اہل بیت پر افتراء باندھتے ہیں، مثلاً نبان جس کی کنیت ابو احمد ہے، ان میں سے ایک گروہ شیعہ ایسا بھی گزرا ہے جن کے برے عقائد رکھنے سے حضرات ائمہ نے لوگوں کو ڈرایا ہے اور ان شیعوں کی احادیث و آثار کے راوی اور ناقل بھی یہی لوگ ہیں جن کے عقائد سے ائمہ نے ڈرایا ہے،

رَوَی الْکُلَیْنِیُّ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْخَزَّازِ — کلینی نے ابراہیم بن محمد بن الخزاز اور محمد بن حسین سے روایت کی

وَمُحَمَّدِ بْنِ الْحُسَيْنِ قَالَا دَخَلْنَا عَلَى أَبِي الْحَسَنِ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقُلْنَا إِنَّ هِشَامَ بْنَ سَالِمٍ وَالْمِيثَمِيَّ وَصَاحِبُ الطَّاقِ يَقُوْلُوْنَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى أَجْوَفُ إِلَى السُّرَّةِ وَالْبَاقِي صَمَدٌ فَخَرَّ لِلّٰهِ سَاجِدًا ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا عَرَفُوكَ وَلَا وَحَّدُوكَ فَمِنْ أَجْلِ ذَالِكَ وَصَفُوكَ،

کہ یہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم ابی الحسن رضا کے پاس گئے اور آپ سے کہا کہ ہشام بن سالم میثمی اور صاحب الطاق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناف تک کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس تو آپ یہ سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور فرمایا اے اللہ تو پاک ہے تجھ کو انہوں نے نہ پہچانا نہ واحد جانا اسی لئے تیرے بارے میں ایسی باتیں بنائیں،

اور اسی جماعت کو نیز زرارہ بن اعین کو حضرت صادق نے بد دعا دی اور فرمایا اخزاهم الله۔ واللہ ان کو ذلیل کرے، اس کی تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام پر آئیگی۔

اور کلینی نے علی بن حمزہ سے یہ بھی روایت بیان کی ہے،

قَالَ قُلْتُ لِأَبِي عَبْدِ اللهِ السَّلَامُ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ الْحَكَمِ يَرْوِي عَنْكُمْ أَنَّ اللهَ جِسْمٌ صَمَدِيٌّ نُوْرِيٌّ مَعْرِفَتُهُ ضَرُوْرِيٌّ يَمُنُّ بِهَا عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَقَالَ سُبْحَانَ مَنْ لَا يَعْلَمُ أَحَدٌ كَيْفَ هُوَ إِلَّا هُوَ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ لَا يُحَدُّ وَلَا يُحَسُّ وَلَا يُحِيْطُ بِهِ شَيْءٌ وَلَا صُوْرَةٌ وَلَا تَخْطِيْطُ وَلَا تَحْدِيْدٌ۔

کہ میں نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ سے کہا کہ میں نے ہشام بن حکم کو آپ کے حوالہ سے روایت بیان کرتے سنا کہ اللہ تعالیٰ ایک ٹھوس نوری جسم ہے جس کا پہچاننا ضروری ہے اپنے جس بندہ پر چاہتا ہے پہچان کرا کر اس کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا پاک ہے وہ جس کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیسا ہے اس کے ہم شکل کوئی چیز نہیں وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے نہ عقل سے سمجھا جا سکتا ہے نہ حس سے جانا جاتا ہے نہ اس کو کوئی چیز گھیرتی ہے، نہ جسم ہے نہ صورت نہ خطوط میں گھر سکتا ہے نہ حد بندی میں،

ان کے اسلاف میں سے کچھ ناوسیہ ہیں جو حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کی موت کے منکر ہیں، وہ آپ کو مہدی موعود جانتے ہیں۔ باقی ائمہ امامت سے انکار کرتے ہیں، ان کے اکثر راوی واقفیہ ہیں جن کے نام ان کی اسماء الرجال میں جا بجا اس حوالہ سے ملتے ہیں کہ فلاں فلاں واقفیہ ہیں،

یہ دونوں فرقے (ناوسیہ و واقفیہ) ائمہ کی تعداد اور تعین کو نہیں مانتے جیسا کہ کتاب ہذا کے باب اول میں مذکور ہوا، اس کے برخلاف شیعہ منکر امامت کو منکر نبوت مانتے ہیں (تو یہ دونوں فرقے بھی شیعوں کے نزدیک منکر نبوت ہوئے) اس کے باوجود دونوں فرقوں سے بے دھڑک اپنی صحاح میں بہت سی روایات درج کی ہیں، حالانکہ یہ دونوں فرقے خود بھی ان ائمہ سے روایت بیان کرتے ہیں اس طرح انکا جھوٹ صاف کھل گیا۔

ان کے اسلاف میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے امام وقت کو ہی نہیں پہچانا اور ساری عمر تردد و حیرانی میں رہے چنانچہ یہ وعیدان پر صادق آئی مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً جو امام زمانہ کو پہچانے بغیر مر گیا، وہ جاہلیت کی موت مرا، ایسے لوگوں میں حسن بن سماعہ بنی فضائل اور عمر بن سعید اور انہیں جیسے اور ان کے راویان حدیث ہیں (امامیہ) جار و دیہ سے بھی اپنی صحاح میں روایات لاتے ہیں حالانکہ ان کا مذہب معلوم ہو ہی چکا۔

ان کے بعض اسلاف نے کورا جھوٹ گھڑا اور پھر اسی پر جمے رہے مثلاً ابن عمیر ابن معرہ اور نمیری،
بعض وہ ہیں، جنہوں نے امام صادق رحمہ اللہ علیہ کو اپنی مسجد سے نکال دیا اور پھر اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی، جیسے ابن مسکان؛
ان ہی کا ابو بصیر وہ ہے جس نے اپنی دروغگوئی کا خود اقرار و اعتراف کیا ہے،
ان ہی سے دارم بن حکم، ربان بن صلت، ابن ہلال جعی زرارہ، اور ابن سالم کا تعلق فرقہ بدائیہ غالیہ سے ہے اس عقیدہ کے یہ لوگ، جمہور شیعہ کے نزدیک مذہباً بدترین اور باطل ترین ہیں۔ اس کے باوجود اسلاف میں شمار ہیں،
ان اسلاف میں ایسے بھی ہیں، جو باہم ایک دوسرے کی تکذیب کرتے اور ایک دوسرے کی روایات کو غلط ثابت کرتے ہیں، مثلاً ہشامین صاحب طلق اور میثمی،
ان کے روایان احادیث و آثار میں سے ایک ابن عباش بھی ہے جس کو انہوں نے اپنے رجال میں کذاب تک لکھا ہے اور ائمہ سے اس کے بارے میں ایسی روایات بیان کی ہیں جس میں اس کو جھوٹا کہا گیا ہے (پھر بھی اس سے روایات قبول کرتے ہیں)
ان کے متقدمین میں سے ابن بابویہ صاحب رقعہ مزورہ اور متاخرین میں سے شریف رضی بھی مسیلمہ کذاب کی ہیچ یادگار ہیں۔
مذکورہ بالا دعووں کے دلائل آئندہ باب میں ان ہی کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے بیان کئے جائیں گے،
اس کے علاوہ ان کے وہ علماء جو کتب اسماء الرجال اور اپنے اسلاف کے حالات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے ممکن نہیں کہ اس سے انکار کر سکیں۔ اگر کوئی جاہل یہاں شک و تردد بھی کرے تو اس کا کوئی گلہ بھی نہیں کہ انشاء اللہ اس کا شک و تردد بھی آئندہ دور ہو جائے گا،
یہاں ایک بڑا عمدہ نکتہ جو انتہائی توجہ طلب ہے یہ ہے کہ شیعوں کے جملہ فرقوں کا یہ دعوی ہے کہ انہوں نے علوم اہل بیت ہی سے حاصل کئے ہیں، ان میں ہر ایک کسی امام زادے سے اپنی نسبت اور تعلق جوڑتا ہے اور انہیں سے اپنی نسبت و تعلق جوڑتا ہے اور انہی سے اپنے مذہب کے اصول و فروع کی روایات لیتا ہے اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ناقابل تردید ہے، کہ یہ سب فرقے باہم ایک دوسرے کو جھٹلانے گمراہ بتانے اور کافر قرار دینے میں بھی مشغول و مصروف رہتے ہیں حتی کہ اصول عقائد خصوصاً امامت کے بارے میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں ان کے اس باہم اختلاف و نزاع سے عقلمند اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ سب جھوٹے ہیں اس لئے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی گھر سے یہ سب مختلف و متناقض توجیہات و روایات بیان کی جائیں اگر اہل خانہ میں کسی ایک کو صدق میں ترجیح دیں گے تو بعض دوسرے اہل خانہ کی تکذیب لازم آئے گی اور ان پر غلط گوئی اور مخلوق خدا کو گمراہ کرنے کا الزام آئے گا اور یہ بات نص قرآنی کے خلاف تو ہے ہی واقعہ کے بھی خلاف ہوگی اللہ تعالی نے فرمایا اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (بے شک اللہ تعالی چاہتا ہے کہ اے اہل بیت وہ تمکو ہر قسم برائی سے ایسا پاک کر دے جو پاک کر دینے کا حق ہے،
پھر تاریخ سے بھی گواہی اس کی ملتی ہے کہ اہل بیت کے بزرگ خصوصاً دیگر بندگان خدا میں سب سے بڑے

کے متبع اور پیروتھے، اس کا کوئی امکان ہی نہیں کہ وہ اپنی ریاست وسیاست کی خاطر جھوٹ بولیں یا لوگوں کو دھوکہ اور فریب دیں، لا محالہ اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل بیت رحمہم اللہ ان روایات و حکایات سے بری الذمہ بھی ہیں اور بے خبر بھی اور ان مختلف فرقوں نے جس طرح مذہب تراشے اسی طرح اس کی اس تائید اور مخالف کی تردید میں حکایت و روایات بھی گھڑلیں، جنکی نہ کوئی اصل ہے نہ بنیاد؛ اور جن کا مذہب جعلی ہو اس کو اس جعلسازی کے لئے صحیح روایات کہاں سے میسر آسکتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (اگر یہ کلام پاک اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نازل کردہ ہوتا تو البتہ وہ اس میں بہت اختلاف پاتے)

معلوم ہوا کہ کلام الٰہی کی طرح دین و مذہب کے اصول بھی خدا کی طرف سے اس کے رسول ہی متعین و بیان کرتے ہیں اس لئے اس کے اصول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا، دین و مذہب کے اصول میں اختلاف و تضاد اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ دین باطل اور مذہب جعلی ہے،

اب رہا اہل سنت کا باہم اختلاف۔ تو اول تو یہ اختلاف اجتہادی ہے کہ انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دور سے لے کر فقہاء کے زمانہ تک سب کو مجتہد تسلیم کیا ہے اور مجتہد کو اپنی رائے پر عمل کا اختیار ہوتا ہے اور وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتا ہے، اور اجتہاد و آراء کا اختلاف نوع انسانی کی فطری بات ہے روایات کا اختلاف نہیں کہتے جس سے جھوٹ اور افتراد کا ثبوت ہو،

دوسرے عقائد اہل سنت کا جو بھی باہم اختلاف ہے وہ فروعات فقہیہ میں ہے، اصول عقائد میں نہیں اور فروعی اختلاف، جو اجتہاد کا نتیجہ ہوتا ہے بطلان مذہب کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جس طرح مجتہدین امامیہ آپس میں فروع میں مختلف ہیں کہ مثلاً شراب پاک ہے یا ناپاک یا عرق گلاب سے وضو جائز ہے یا نہیں،

اب اس کے مقابلہ میں اہل بیت کے اختلاف کیونکر جو شیعی علوم کے ماخذ ہیں یہ بحث گو اجمالی طور پر باب اول میں گزر چکی ہے مگر تفصیل کی بات ہی کچھ اور ہے،

شیعی فرقوں میں غالی فرقہ تمام فرقوں کا سرتاج ہے اور غلاة دراصل عبداللہ بن سبا کے شاگرد ہیں، جو خود کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خاص الخاص شاگرد اور آپ کا محرم راز کہتا تھا، اور مختاریہ و کیسانیہ حضرت علی حضرت حسنین محمد بن علی اور ابوہاشم بن محمد بن علی۔ رضوان اللہ علیہم کی روایات سے اپنے مذہب کو متعین کرتے ہیں۔

زیدیہ:۔ حضرت علی، حضرات حسنین، امام زین العابدین، زید بن علی بن یحییٰ، زید بن یحییٰ اور یحییٰ بن زید رضی اللہ عنہم سے،

باقریہ:۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر امام باقر رحمہ اللہ علیہ تک، پانچ اماموں سے،

ناوسیہ:۔ چھ آئمہ سے، پانچ تو او پر والے اور چھٹے امام صادق رحمۃ اللہ علیہ،

مبارکیہ :۔ سات سے چھ اوپر والے ساتویں اسمٰعیل بن جعفر رحمۃ اللہ علیہ،
قرامطہ : آٹھ سے : سات مذکورہ بالا اور آٹھویں محمد بن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ۔
شمطیہ :۔ بارہ سے : آٹھ مذکورہ بالا اور چار یہ محمد بن جعفر، موسیٰ بن جعفر عبداللہ بن جعفر اور اسحاق بن جعفر،
مہدویہ :۔ بائیس سے : ان کے نام باب اول میں بیان ہو چکے ہیں۔
اور یہ لوگ مصر اور دیار مغرب کے بادشاہوں کو جو محمد مہدی کی اولاد میں سے تھے۔ امام مانتے ہیں اور ان کی عصمت اور ان کے علم محیط کے معتقد ہیں، چنانچہ ابو محمد نجم الدین عمارہ بن علی بن زبید الزجی، مشہور شاعر اپنے قصیدہ میمیہ میں جو اس نے فائز بن ظافر اور اس کے وزیر کی تعریف میں لکھا کہتا ہے،
اُقْسِمُ بِالْفَائِزِ الْمَعْصُوْمِ مُعْتَقِدًا فَوْزَ النَّجَاۃِ وَاَجْرَ الْبِرِّ فِی الْقَسَمِ (میں فائز معصوم کی قسم اس اعتقاد کے ساتھ کھاتا ہوں کہ میری قسم کامیابی اور سچائی کا اجر رکھتی ہے)
اور پھر یہ بادشاہ خود بھی اپنے متعلق معصوم ہونے اور علم غیب اور دیگر مخفی علوم مثلاً کیمیا سیمیا وغیرہ کے حامل ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے چنانچہ مصر و دیار مغرب کی تواریخ اس پر گواہ ہیں۔
نزاریہ :۔ اپنے مذہب کی روایت اٹھارہ حضرات سے کرتا ہے جن میں پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور آخری مستنصر۔
امامیہ :۔ بارہ سے : اول ان میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آخر میں امام محمد مہدی۔
امامیہ کے معتقدات کی اگر کچھ اصلیت ہوتی تو حضرت یحییٰ بن علی رحمۃ اللہ علیہ سب کے روبرو احول پر غضبناک ہو کر شدت سے اس کی برائی کیوں کرتے اور اس کو اپنی مجلس سے کیوں نکالتے یہی حال دوسرے فرقوں کے معتقدات کا بھی سمجھنا چاہیئے،
ان تمام فرقوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ ان سب نے اپنے لیے کتابیں اور دفتر کے دفتر تیار کیے، اور ان میں علماء فضلاء اہل زبان اور صاحب تصنیف سب ہی گزرے مگر اس ملک میں صرف امامیہ ہی کی کتب نظر آتی ہیں، اور دوسروں کی کمیاب بلکہ نادر الوجود ہیں،۔
بہرحال ان فرقوں کے علما کا حال علماء امامیہ کے حال سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سب کے سب ایک ہی شجر کے ثمر اور شاخیں ہیں،
علمائے امامیہ اور ان کے راویان حدیث کی حقیقت ابھی معلوم ہو چکی، کہ بعض تو انہی سے مرتکب کبائر تھے جن کی شکایت جناب امیر رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں، بعض مذہب و دیانت میں خراب　　اور مجسمہ و مشبہ ہیں بعض ضعیف اور نامعلوم الحال جھوٹے اور جعلساز ہیں۔ اور بعض وہ جن کی جرح و تعدیل میں یہ خود مختلف الخیال ہیں اور ان کے بارے میں کسی جانب کو ترجیح نہ دے سکے۔
بعض ان میں صرف خطوط اور رقعات کے راوی ہیں جنکی صحت پر کوئی اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک تحریر کو دوسری تحریر سے ملا دینا اس فن کے ماہرین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے خصوصاً امام غائب کا خط و رقعہ بنا لینا، جن کا نہ کسی کو حال معلوم اور نہ کسی نے دیکھا بھالا۔

ان میں سے بعض ایسا کرتے ہیں، کہ ایک پرچہ پر کوئی سوال لکھ کر رات کے وقت کسی درخت کے سوراخ میں رکھ آتے، اور صبح اسی پرچہ کو نکال لاتے اور شیعوں کو سناتے اور کہتے کہ اس رقعہ کے بین السطور میں لکھا جواب امام کے ہاتھ کا ہے اور احمق آنکھ بند کرکے اس پر یقین کر لیتے،

شیعی علما، اور ان کی کتابیں اب ہم ہر فرقے کے عالموں اور ان کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جو زیر نظر کتاب کے اہم مسائل میں سے ہے، اس غرض سے کہ اگر کوئی عبارت کسی کتاب سے یا کسی عالم کے حوالہ سے نقل کی جائے تو سامع اور ناظر کو بھی معلوم رہے کہ یہ کتاب یا یہ عالم کس فرقہ سے متعلق ہے اور شیعوں کے نزدیک اس کا کیا مرتبہ ہے، یا اس کا قول اور اس کی روایت قابل اعتبار ہے یا نہیں،

غلاۃ ان کا سب سے پہلا عالم عبداللہ بن سبا ہے اس کے بعد ابو کامل اور مغیرہ عجلی ہیں امام جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ نے ان دونوں سے نفرت ظاہر فرمائی اور ان کو جھوٹا قرار دیا اور فرمایا، اِنَّهُمَا يَفْتَرِيَانِ عَلَيْنَا اَهْلَ الْبَيْتِ وَيَرْوِيَانِ عَنَّا الْاَكَاذِيْبَ (یہ دونوں ہم اہل بیت پر افترا کرتے اور ہم سے جھوٹی روایات منسوب کرتے ہیں)،

نصیر، اسحاق غلبا، زرام مفضل صیرفی صریع بزیغ اور محمد بن یعفور بھی غلاۃ کے علماء میں سے ہیں، ان کا سارا کلام لغو بیہودہ نہ کہنے کے لائق نہ سننے کے قابل،

کیسانیہ :۔ ان کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا عالم خود کیسان ہے، جو خود کو جناب محمد بن علی رحمہ اللہ علیہ کا شاگرد کہتا تھا، اس کے بعد ابو کریب ضریر اسحاق بن عمرو اور عبداللہ بن حرب اور ان کے علاوہ دوسرے تھے۔

زیدیہ :۔ ان کا سب سے بڑا عالم یحییٰ بن زید ہے اور دوسرے زید بن علی کے دوست ان کی زیادہ تر روایات حضرت علی جناب حسنین امام سجاد اور خود زید شہید رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ان کے ائمہ میں سے ایک ناصر بھی ہے جس کا یہ مذہب مشہور ہے کہ پاؤں کا مسح بھی کرنا چاہیئے اور دھونا بھی چاہیئے، ان کے کبار علما میں ہادی ہے جس نے ۳۰۰ھ کے بعد اس مذہب کو رواج دیا اس کا بیٹا مرتضیٰ بھی ان کے بڑے عالموں میں شمار ہوتا ہے، یہ دونوں سادات حسینی سے تعلق رکھتے ہیں خود کو خالص زیدیہ کہتے تھے، کیونکہ غیر خالص زیدیوں کی ایک اور جماعت بھی ہے جو اپنے آپ کو زیدیہ کہتے ہیں حالانکہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے ان کے علما یہ ہیں،

جارود بن احمد بن محمد بن سعید سبیعی ہمدانی، ابن عقدہ، سلیمان، تبر توی، خلف بن عبد الصمد، نعیم ابن الیمان یعقوب، حسین بن صالح اور اخطب خوارزمی صاحب مناقب امیر المومنین بھی زیدی ہیں،

زیدیہ غیر خالص میں سے سوائے چند مسائل کے مثلاً امامت صاحب الکبیرہ کا فر نعمت فاسق کے اصول میں معتزلہ کے پیرو ہیں اور فروع میں جناب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان میں سے بعض فروع میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی کرتے ہیں سوائے چند مسائل میں اختلاف کے مثلاً موزوں پر مسح کا انکار کرتے ہیں،

اسماعیلیہ :۔ ان کے علما یہ ہیں، مبارک، عبداللہ ابن میمون قداح، غیاث مصنف کتاب البیان محمد بن علی برقعی اور مقنع،

مہدویہ :۔ یہ اسماعیلیہ ہی میں سے ہیں۔ ابتداء میں ان کے ہاں نہ کوئی عالم تھا نہ کتاب کیونکہ ان

کا سرگروہ محمد بن عبداللہ جو مہدی کے لقب سے مشہور تھا، اکثر عراقی، حجازی، مصری اور شامی اس کی شرافت وسیادت کے منکر تھے، اور اس کی ہمراہی میں شورش پسند اور سپاہی پیشہ اور اکھڑ لوگوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ یہانتک کہ عزیز جو اس کی اولاد میں سے تھا خلافت تک پہنچا ایک جمعہ کو خطبہ دینے منبر پر چڑھا تو وہاں ایک رقعہ رکھا ہوا پایا جس میں یہ اشعار لکھے ہوئے تھے،

إِنَّا سَمِعْنَا نَسَباً مُنْكَراً	يُتْلَى عَلَى الْمِنْبَرِ فِي الْجَامِعِ
إِنْ كُنْتَ فِيمَا تَدَّعِي صَادِقاً	فَاذْكُرْ أَباً بَعْدَ الْأَبِ الرَّابِعِ
إِنْ تُرِدْ تَحْقِيقَ مَا قُلْتَهُ	فَانْسُبْ لَنَا نَفْسَكَ كَالطَّائِعِ
أَوْ فَدَعِ الْأَنْسَابَ مَسْتُورَةً	وَادْخُلْ بِنَا فِي النَّسَبِ الْوَاسِعِ
فَإِنَّ أَنْسَابَ بَنِي هَاشِمٍ	يَقْصُرُ عَنْهَا طَمَعُ الطَّامِعِ

جامع مسجد کے منبر پر ہم نے ایک غیر مشہور لقب کا ذکر ہوتے سنا۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو ذرا اپنے چوتھے باپ سے اوپر کے پانچویں باپ کے نام تو بتا اگر تم اپنی بات کو مؤثر بنانا چاہتے ہو تو یا تو ہمارے سامنے اپنے نسب کو چمکتے سورج کی روشنی کی طرح صاف بیان کر دو یا اس کو اسی طرح چھپا رہنے دو اور ہمارے ساتھ کھلے اور وسیع نسب میں شامل ہو جاؤ کیونکہ بنو ہاشم کے نسبوں میں شرکت کی طمع رکھنے والا اپنی طمع کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے،

ان اشعار میں طائع کے لفظ سے اشارہ عباسی خلیفہ طائع ما بعد کی طرف ہے جو اس زمانہ میں بغداد کے اور دیگر اسلامی شہروں کا خلیفہ تھا۔ یہ واقعہ اسی کے عہد میں پیش آیا تھا، اور اس کا نسب شہرت میں اتنا واضح تھا، جیسا پہر دن چڑھے کا سورج۔

اور فاذکر ابا بعد الاب الرابع، جو کہا ہے وہ اس لئے کہ طائع کا چوتھا باپ مہدی کا بھی باپ تھا اور اس کا نام عبیداللہ بن عبداللہ تھا اس لئے ان کو عبیدیین بھی کہتے ہیں۔

جب مہدی کے دماغ میں یہ خناس سمایا کہ وہ مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ اس وقت تک ممکن نہیں تھا۔ جب تک اس کے باپ کا وہی نام نہ ہو جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا تھا یعنی عبداللہ اور مہدی کے باپ کا نام عبیداللہ تھا، اس لئے اس نے اپنے دادا کو باپ بنایا اور باپ کو دادا اور یوں اس نے بجائے مہدی بن عبیداللہ کے اپنا نسب یوں چلایا مہدی بن عبداللہ بن عبیداللہ بن القاسم بن احمد بن محمد بن اسمٰعیل بن جعفر الصادق

جب دیار مصر میں ان کا اقتدار مستحکم ہوا اور عرصہ اقتدار طویل ہوا تو نوکریوں اور عہدوں کے لالچ میں لوگ ان کے مذہب کے حلقہ بگوش ہونے لگے، تو ان میں بھی علماء فضلا اور ادباء پیدا ہوئے زیادہ بھی ملازمت یا قدردانی کے خیال سے مذہب بدل کر ان میں شامل ہوگئے چنانچہ ان کے چوٹی کے علما میں ابوالحسن علی بن نعمان اور ابوعبداللہ محمد بن نعمان تھے جو معز اور عزیز کے زمانہ میں گزرے ہیں پھر ابوالقاسم مشہور ہوئے یہ عبد العزیز حاکم کے زمانہ میں ہوئے اور عامر بن عبداللہ رواحی اور علی بن محمد بن علی صلیحی مستنصر کے دور میں!

جن لوگوں نے مال وجاہ کی طمع میں ان کا مذہب قبول کیا ان میں فقیہ عمارہ یمنی ہے کہ عبیدیین کے پورے

عہد سلطنت میں اس کا کوئی مثل پیدا نہیں ہوا علم و فضل میں یہ بہت بلند پایہ تھا اس لئے جب اس نے مذہب تبدیل کر لیا تو اس کے بے شمار پیرو اور شاگردوں کی ایک بڑی جماعت بھی گمراہ ہو گئی اور اس پر یہ مثل صادق آئی،

اِنَّ الْفَقِیْہَ اِذَا غَوٰی وَاَطَاعَہٗ قَوْمٌ غَوَوْا مَعَہٗ فَضَاعَ وَضُیِّعَا
مِثْلُ السَّفِیْنَۃِ اِذَا ھَوَتْ فِی لُجَّۃٍ غَرِقَتْ وَیَغْرَقُ مَا ھُنَاکَ جَمِیْعًا

بے شک جب ایک عالم فقیہ گمراہ ہو جائے جس کی ایک قوم پیروی کرتی ہو تو وہ قوم بھی گمراہ ہو جاتی ہے پس وہ خود بھی ضائع ہو جاتا ہے اور وہ قوم بھی۔ اس کی مثال کشتی کی سی ہے، کہ جب وہ دریا میں ڈوبنے لگتی ہے تو اس کے ساتھ جو بھی ہوتا ہے ڈوب جاتا ہے،

خود مہدی کی اولاد میں بھی بعض اہل علم ہوئے مثلاً عزیز باللہ کہ وہ شاعر کے ساتھ ادیب اور فاضل عالم تھا ایسے ہی معز اور اس کا بیٹا حاکم۔

ان میں سے اکثر علم غیب کا دعویٰ کیا کرتے خصوصاً حاکم کہ وہ تو کہتا تھا کہ کوہ طور پر میرے ساتھ مناجات و مکالمہ ہوتا ہے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا وہ کوہ طور پر بار بار جاتا تھا، علم کیمیا بھی جانتا تھا، چنانچہ فن کیمیا میں تعویذ الحاکم۔ اس کی مشہور کتاب ہے اسی طرح کتاب الصیاکل بھی اس کی مشہور کتابوں کے منجملہ ایک کتاب ہے،

خلاصہ کلام یہ کہ ان لوگوں کی ہمہ دانی اور غیب دانی میں مورخین رطب اللسان میں اور اوراق تاریخ میں ان کے یہ اوصاف ثبت ہیں،

کہتے ہیں کہ ایک روز عزیز جمعہ کے خطبہ کے لئے منبر پر چڑھا تو وہاں ایک رقعہ رکھا ہوا تھا جس پر یہ قطعہ تحریر تھا،

بِالظُّلْمِ وَالْجَوْرِ قَدْ رَضِیْنَا وَلَیْسَ بِالْکُفْرِ وَالْحَمَاقَۃِ
اِنْ کُنْتَ اُعْطِیْتَ عِلْمَ غَیْبٍ فَقُلْ لَنَا کَاتِبَ الْبِطَاقَۃِ

ہم ظلم و جور کی وجہ سے تمہارے تسلط سے راضی ہوئے ہیں مگر کفر و حماقت کو ہم برداشت نہیں کریں گے اگر تمہیں علم غیب عطا ہوا ہے تو ذرا ہمیں اس رقعہ کے کاتب کا نام تو بتا!)

ان میں حاکم بڑا اسٹرا ہوا رافضی تھا اس نے چند آدمی بطور خفیہ طور سے مدینہ منورہ بھیجے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے جسموں کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک سے نکالدیں،

یہ بدبخت مدینہ منورہ پہنچے، اور روضہ مطہرہ کے پاس ایک علوی کو دھوکہ دے کر اس کے مکان میں مقیم ہوئے رات کو موقع پا کر نقب لگائی اور وہ نقب جسد مبارک تک پہنچی ہی تھی کہ یکایک مدینہ پر سخت آندھی اور جھکڑ چلنے لگے ہیبت ناک بجلیاں کوندنے لگیں گرد و غبار کا گویا طوفان آگیا اور مدینہ منورہ میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ فضا کی ہولناکی اتنی بڑھی کہ لوگ سمجھنے لگے کہ بلا کی یقینی ہے اور اس سے نجات و خلاصی سے ناامید ہو گئے کسی طرح اس علوی اور اس کے اہل خانہ کو بدکرداروں کی حرکت ناشائستہ کا علم ہوا تو انہوں نے امیر مدینہ کو اس کی اطلاع دی حاکم مدینہ نے فی الفور ان کو پکڑ کر تہ تیغ کیا تو اس کے بعد طوفان تھما فضا سے گرد و غبار صاف ہوا اندھیرا دور ہوا اور لوگوں کی جان میں جان آئی۔

قاضی فاضل ابو عبداللہ ابو منصور رسنائیؒ نے اپنی کتاب الاستنصار میں یہ واقعہ تحریر کیا ہے،

نزاریہ ا۔ ان کا سب سے بڑا عالم فاضل حسن بن صباح حمیری تھا۔ اس کے بعد ابوالحسن سلیمان بن محمد جو راشدین کے لقب سے مشہور تھا یہی اسمٰعیلی قلعوں کا مالک تھا یہ ایک فاضل ادیب اور بہت اچھا شاعر بھی تھا فن انشاء میں عالمانہ مقالے اور رسالے بھی لکھے ہیں، انہیں تحریروں میں اس کا وہ خط بھی ہے جو اس نے سلطان نورالدین محمود ابن سلطان علاالدین شہید زنگی، شاہ شام کو اس وقت لکھا تھا جب صلاح الدین بن ایوب نے سلطان کی طرف سے مصر فتح کیا تھا اور مہدیوں کے پنجے سے نکالا تھا، مصر پر چڑھائی کے ساتھ سلطان نورالدین زنگی نے اس راشدالدین کو بھی تنبیہی خط لکھا تھا کیونکہ یہ بھی تو خود کو عبیدیین کے پس ماندوں میں شمار کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ کے خط کے جواب میں لکھا۔

يا للرجال لامر هال مفظعه ... ما مر قط على سمعي توقعه
يا ذا الذي بقراع السيف هددنا ... لا قام مصرع جنبي حين تصرعه
قام الحمام الى البازي يهدده ... واستيقظت لصراع الاسد اضبعه
اضحى يسد فم الافعى باصبعه ... يكفيه ماذا تلاقي منه اصبعه
وقفنا على تفصيله وجمله وعلمنا ... ما هددنا به من قوله وفعله

فيا لله العجب من ذبابة تطن باذن فيل وبعوضة تعد في التماثيل، وقد قالها قوم آخرون فدمرنا عليهم وما كان لهم ناصرون، أو للحق تدحضون وللباطل تنصرون، وسيعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون، اما ما صدرت به قولك من قطع راسي وقلعك لقلاعي في الجبال الرواسي فتلك الاماني كاذبة وخيالات غير صائبة، فان الجواهر لا تزول بالاعراض كما ان الارواح لا تضمحل من الامراض، كم بين قوي وضعيف ودني وشريف، ان عدنا الى الظواهر والمحسوسات وعدلنا عن البواطن والمعقولات فلنا اسوة برسول الله صلى الله عليه وسلم في قوله ما اوذي نبي مثل ما اوذيت، وقد علمتم ما جرى في عترته واهل بيته وشيعته والحال ما حال والامر ما زال، ولله الحمد في الآخرة والاولى اذ نحن مظلومون لا ظالمون ومغصوبون لا غاصبون، وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا، وقد علمتم ظاهر حالنا وكيف قتال رجالنا وما يتمنو الموت* ان كنتم صادقين ولن يتمنوه ابدا بما قدمت ايديهم والله عليم بالظالمين، وفي الامثال السائرة او للبط تهددون بالشط فهيئ للبلاء جلبابا وتدرع للرزايا اثوابا ولا تكن كالباحث عن حتفه بظلفه والجادع مارن انفه بكفه، واذا وقفت على كتابنا فكن من امرنا بالمرصاد ثم اقرأ اول النحل وآخر الصاد

بنا نلت هذا الملك حتى تأثلت ... بيوتك فيه واستقر عمودها
فاصبحت ترمينا بنبل بنا استوى ... مغارسها فينا وفينا جريدها

لوگو وہ ہولناک خطرہ ہمیں ڈرا رہا ہے جس کے متعلق میرے کان میں کبھی بھنک بھی نہ پڑی۔

وہ شخص جو ہم کو تلواروں کی جھنکار کا ڈراوا دے رہا ہے، جب تو اس پر چھپٹے تو پھر اس کو میرے پاس

* ويتقربون من حياض الموت فتمنوا الموت *

اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہنا چاہیئے،

کبوتر باز کو دھمکا رہا ہے اور بجو شیروں کو پچھاڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں،

وہ اژدھے کے منہ کو اپنی انگلی سے بند کرنا چاہتا ہے اس تنگ و دو میں اژدھے کی طرف سے اسکی انگلی کو جو تکلیف پہنچے گی وہی اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیگی

اس نے ہمیں اشاروں میں اور صراحت سے جتا دیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے۔

پس خدا کی شان ہے کہ مکھی اور مچھر ہاتھی (کو زچ کرنے کے لئے) اس کے کانوں پر بھنبھنانے لگے ہیں اور وہ بھی تصاویر میں شامل ہوتے ہیں،

دوسرے لوگوں نے بھی اس کو اسی طرح دھمکایا تھا، ہم نے ان کو ایسی حالت میں موت کے گھاٹ اتارا کہ کوئی مددگار بھی نہ ملا کیا تم باطل کی مدد سے حق کو ڈگمگانا چاہتے ہو، ظالموں کو عنقریب پتہ چل جائیگا کہ وہ کس پہلو پلٹتے ہیں،

تم نے اپنے خطبہ کی ابتداء میں میرا سر قلم کرنے اور میرے پہاڑی قلعوں کو پیوند زمین کرنے کے متعلق کہا ہے تو یہ تمہاری ناکام تمنا اور خام خیالی ہے، کیونکہ جواہر اعراض سے ملیا میٹ نہیں نہیں ہوتے اور نہ امراض سے روحیں کمزور و مضمحل ہوتی ہیں، طاقتور اور کمزور کے نیز ذلیل اور شریف کے درمیان بہت فرق ہے اور اگر ہم ان عقلی اور باطنی چیزوں میں جواب دینے کے بجائے ظاہر اور حسی طور پر کچھ کہنا چاہیں تو ہمارے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور مسرت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جتنی اذیت و تکلیف مجھے دی گئی اتنی اور کسی نبی کو نہیں پہنچی اور تمہیں پتہ ہی ہے کہ آپ کی اولاد، آپ کے اہل بیت اور آپ کے شیعوں پر کیا کچھ نہیں گذرا دنیا و آخرت میں حمد و تعریف اللہ ہی کے لئے ہے اس وقت ہم ظالم نہیں مظلوم ہیں ہم کسی پر غضب و غارت نہیں ڈالتے ہم پر غارت ڈالی جا رہی ہے، کہو حق آیا، باطل مٹا بے شک باطل تو مٹتا ہی ہے،

ہماری ظاہری حالت اور طاقت و قوت کو تم جانتے ہی ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے آدمی کیسی بے جگری سے لڑتے ہیں۔ اور موت کی ان کو کتنی تمنا رہتی ہے وہ جان ہار دیتے ہیں مگر میدان جنگ سے منہ نہیں موڑتے۔ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو اور ایسا ہی کرنا چاہتے ہو تو موت کی تمنا کرو، مگر وہ ہرگز ان عملوں کی وجہ سے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں موت کی تمنا نہیں کرینگے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے بطور مثل کہتے ہیں کہ کیا تم بطخ کو دریا سے ڈراتے ہو تو اب تم مصیبت سے بچنے اور آفتوں کو سہنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور خود اپنے ناخن سے اپنی موت کریدنے والے نہ بنو نہ اپنے ہاتھ سے اپنی ناک کاٹنے والا بنو جب تم ہمارے جواب سے آگاہ ہو جاؤ تو ہم سے بچاؤ کے لئے جو تدابیر کر سکتے ہو کر لو اور ہمارے کام سے ہوشیار رہو۔

اور پھر سورہ نحل کا ابتدائی اور سورہ ص کا آخری حصہ مطالعہ کرو،

تم نے ہمارے طفیل ملک حاصل کیا تا آنکہ اپنے مکانات کو محفوظ و مضبوط بنا لیا اب تم پھر ہی تیر اندازی کرنے لگے ہم ہی پوری ہماری ہے،

امامیہ اور خصوصاً اثنا عشریہ میں تو ان کے علماء کی حد و شمار ہی نہیں البتہ ان کے قدماء میں جو مشہور ہیں

یہ ہیں، قیس بن سلیم بن قیس ہلالی، آبان، ہشام بن حکم، ہشام بن سالم صاحب الطاق ابوالاحوص علی بن منصور، علی بن جعفر بنان بن سمعان جس کی کنیت ابو احمد ہے اور جزری لقب سے مشہور ہے! ابن ابی عمیر، عبداللہ بن مغیرہ نظیری ابو بصیر محمد بن حکم محمد بن فرج الرجی، ابراہیم خزاز، محمد بن حسین، سلیمان جعفری محمد بن مسلم بکیر بن اعین، زراہ ابن اعین اور ان دونوں کے بیٹے سماعہ بن مہران علی بن ابی حمزہ عینی عثمان علی، یہ تینوں ہی فضال ہیں احمد بن محمد بن عبد اللہ ابو نصرہ ابو نطی یونس بن عبداللہ القمی ایوب بن نوح حسن بن عیاش الجریش علی بن سنطاہر واسطی احمد بن اسحاق جابر بن جعفی محمد بن جمہور قمی، حسین بن سعید، عبداللہ، عبیداللہ، محمد عمران اور عبدالاعلی یہ سب علی بن شیبہ کے بیٹے ہیں،

اثنا عشریہ میں مصنفین میں یہ لوگ شمار کئے جاتے ہیں۔ صاحب معالم الاصول فخر المحققین محمد بن علی الطرازی محمد بن علی الجباعی ابو الفتح کراجکی کفعمی جلال الدین حسن بن احمد شیخ مقتول، محمد بن ابی حسن الصفار ابان بن بشر البنال عبید بن عبدالرحمٰن خشعمی فضل بن شادل قمی حسین بن بابویہ قمی اور محمد بن بابویہ قمی،

یہ قمی وہ نہیں ہے جس سے حدیث شفا میں امام بخاری نے استشہاد کیا ہے،

صحیح بخاری کی کتاب الطب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے رواہ القمی عن لیث عن مجاہد،

اس لئے کہ یہ بابویہ قمی چوتھی صدی کا ہے اور لیث دوسری صدی کے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ بابویہ قمی نے لیث کو دیکھا ہو، اور ان سے روایت کی ہو اور اگر رواہ عن لیث کو ارسال اور روایت بالواسطہ محمول کریں تو اگرچہ یہ بخاریؒ کے اصول کے خلاف بھی۔

پھر بھی اس موقعہ پر اس کی گنجائش نہیں کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تیسری صدی کے وسط کی ہے، جبکہ ابن بابویہ اس کے بہت بعد کا ہے تو اس سے استشہاد کا سوال ہی نہیں امام بخاری رحمہ اللہ علیہ کی پیدائش، وفات اور زمانہ حیات کے متعلق کسی نے خوب کہا ہے کہ وہ سچائی کے ماحول میں پیدا ہوئے تعریف کے ساتھ زندہ رہے اور نور میں وفات پائی، (یہ بحساب ابجد آپ کی تینوں حالتوں کا بیان ہے)

بعض جلیل القدر اہل علم کو سمعانی کی عبارت سے یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ یہ قمی، وہی قمی ہے جس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استشہاد کیا ہے، اس لئے یہاں سمعانی کی عبارت نقل کر کے غلطی کے منشا کو واضح کیا جاتا ہے،

قَالَ السَّمْعَانِي فِي الْمَنْسُوبِيْنَ إِلَى قُمْ أَبُوْجَعْفَرٍ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ بَابُوَيْهِ الْقُمِّيُّ نَزَلَ بَغْدَادَ وَحَدَّثَ بِهَا عَنْ أَبِيْهِ وَكَانَ مِنْ شُيُوْخِ الشِّيْعَةِ وَمَشْهَادِيْرِ الرَّافِضَةِ رَوٰى عَنْهُ مُحَمَّدُ بْنُ طَلْحَةَ النِّعَالِيُّ وَيَعْقُوْبُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَعْدٍ الْقُمِّيُّ اِسْتَشْهَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ فِي صَحِيْحِهِ فِي كِتَابِ الطِّبِّ فَقَالَ فِي حَدِيْثِ الشِّفَاءِ فِي ثَلٰثٍ شَرْطَةُ مِحْجَمٍ وَشَرْبَةُ عَسَلٍ وَكَيَّةُ بِنَارٍ رَوَاهُ الْقُمِّيُّ عَنْ لَيْثٍ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَالْأُسْتَاذُ الْعَمِيْدُ أَبُوْطَاهِرٍ سَعْدُ ابْنُ عَلِيِّ بْنِ عِيْسَى الْقُمِّيُّ صَارَ وَزِيْرًا لِسُلْطَانِ سَنْجَرَ بْنِ مَلِكْ شَاهْ إِلٰى مَا قَالَ هٰذِهِ عِبَارَةُ الْأَنْسَابِ وَصَرَّحَ شُرَّاحُ الْبُخَارِيِّ بِأَنَّ الْقُمِّيَّ الَّذِيْ اسْتَشْهَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ هُوَ يَعْقُوْبُ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ سَعْدٍ الْقُمِّيُّ لَا بْنُ بَابُوَيْهِ وَالضَّابِطَةُ فِي كِتَابِ الْأَنْسَابِ

اَنْ یُعْطَفَ اَحَدُ الْمَنْسُوْبَیْنِ بِنِسْبَۃٍ وَّاحِدَۃٍ عَلَی الْاٰخَرِ بِوَاوِ عَطْفٍ مَکْتُوْبَۃٍ بِالْحُمْرَۃِ فَلَعَلَّ نَاسِخَ نُسْخَۃِ ذَالِکَ الْبَعْضِ سَہَا فَکَتَبَ تِلْکَ الْوَاوَ بِالسَّوَادِ حَتّٰی ظَنَّ مَنْ رَاٰہُ بْنُ بَابُوْیَہ وَاَنَّ مَابَعْدَہٗ وَھُوَ قَوْلُہٗ اِسْتَشْھَدَ بِہِ الْبُخَارِیُّ مَا یَتَعَلَّقُ بِحَالِ ابْنِ بَابُوْیَہْ وَالْوَاقِعُ لَیْسَ کَذَالِکَ بَلْ تَمَّتْ تَرْجَمَۃُ ابْنِ بَابُوْیَۃَ اِلٰی قَوْلِہٖ رَوٰی عَنْہُ مُحَمَّدُ بْنُ طَلْحَۃَ النَّعَالِیُّ وَابْتَدَاءَ بِقَوْلِہٖ یَعْقُوْبُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ سَعْدِ الْقُمِّیِّ اِسْتَشْھَدَ بِہِ الْبُخَارِیُّ فِیْ تَرْجَمَۃٍ اُخْرٰی وَکُلُّ ھٰذَا الْاِنْشَاءُ مِنْ غَلَطِ النَّاسِخِ وَتَصَرُّفُ النُّسَّاخِ اَشَدُّ تَغْلِیْطًا مِنْ ھٰذَا الْقَدْرِ وَاللّٰہُ الْعَاصِمُ عَنْ کُلِّ زَلَلٍ،

سمعانی نے قم کی طرف منسوب لوگوں کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بابویہ قمی بغداد میں آیا وہاں اپنے باپ کی سند کے ساتھ احادیث کی روایت کرتا تھا، یہ شیعوں کے شیوخ میں سے تھا اور مشہور رافضیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا محمد بن طلحہ نعالی اور یعقوب بن عبداللہ بن سعد قمی نے اسی سے روایت کی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کی کتاب الطب میں حدیث شفاء کے ذیل میں اسی سے استشہاد کیا ہے، اور کہا ہے کہ روایت کی اس کی قمی نے لیث سے انہوں نے مجاہد سے مجاہد نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے! اور استاذ عمید ابوطاہر یعنی سعد بن علی ابن عیسیٰ قمی، سلطان سنجر بن ملک شاہ کا وزیر ہو گیا تھا۔

یہ عبارت انساب سمعانی کی ہے بخاری کے شارحین کی جو تصریحات اس عبارت سے متعلق ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس سے استشہاد کیا ہے وہ یعقوب بن عبداللہ سعد قمی ہے ابن بابویہ قمی نہیں ہے،

کتاب الانساب میں یہ قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک ہی نسبت سے منسوب دو افراد میں سے جب ایک کا عطف بذریعہ واؤ دوسرے پر کیا جاتا ہے تو اس واؤ کو سرخ روشنائی سے لکھتے ہیں اور یہاں کاتب نے بھول کر واؤ خلاف قاعدہ سیاہی سے لکھدیا اور اس طرح اس کے راویوں میں بابویہ قمی کو شمار کر لیا گیا،

اور یوں استشھد بہ البخاری کا تعلق بظاہر بابویہ سے ہو گیا حالانکہ یہ خلاف واقع اور غلط تھا کیونکہ اس کے متعلق تعارف تو روی عنہ محمد بن طلحۃ النعالی پر ختم ہو گیا، اور "و یعقوب بن عبد اللہ بن سعد استشھد بہ البخاری" سے دوسرا تعارف شروع ہوا اور یہ ساری غلط نہیاں کاتب کی اس غلطی سے ہوئیں کہ اس نے عطف کا واؤ سرخ نہیں لکھا اور یہ غلطی تو کیا کاتب حضرات تو اتنی خطرناک غلطیاں کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ! اور ہر لغزش سے اللہ تعالیٰ ہی بچانے والا ہے،

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، اثنا عشریہ کے علماء و مصنفین میں یہ حضرات مزید ہیں، عبیداللہ بن علی حلبی، علی بن مہران یا راہوازی، سالار علی بن ابراہیم قمی، ابن براج ابن زہرہ اور ابن ادریس ہیں،

یہ ابن ادریس وہی ہے جس کے فرضی اشعار امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں جیسا کہ باب دوم میں گزرا ہے، دراصل یہ جرأت کنیت کی یکسانی کے سبب عمل آئی ورنہ یہ تو اپنے خیال میں کذب صریح سے بچا ہے،

نیز ان کے علماء و مصنفین میں یہ بھی شمار ہوتے ہیں، حسن کیدای، معین الدین مصری، ابن جنید، حمزہ ابو الصلاح ابن مشر عمر الواسطی، ابن عقیل، عضایری، کشی، نجاشی، ملا حیدر آملی، برقی محمد بن جریر طبری آملی، ابن ہشام دیلمی رجب بن رجیب بن محمد البرسی الحلی ابن شہر آشوب سروی مازندرانی منتخب دین ابو الحسن علی بن عبید اللہ جو علی بن حسین بن بابویہ قمی کا پانچ واسطوں سے پوتا ہے طبرسی، محمد بن احمد بن یحیٰی بن عمران اشعری صاحب نوادر الحکمۃ شیخ مقتول، محمد بن مکی، سعدی بن عبد اللہ کتاب الرحمہ کا مصنف محمد بن حسن بن ولید شیخ ابن بابویہ احمد بن فہد میثم بن میثم البحرانی، عبد الواحد بن صیقی نعمانی، ابو علی الوزان ابن راوندی مسیحی ابو عبد اللہ محمد بن نعمان ملقب شیخ مفید عبید بابا ابن المعلم سید مرتضیٰ، سید رضی ابو جعفر محمد بن حسن طوسی جس کا لقب شیخ الطائفہ ہے اور اس کے نواسے علی بن موسیٰ بن طاؤس اور احمد بن طاؤس، جمال الدین ابو علی بن حسن بن یوسف بن مطہر حلی سے مشہور ہے اس کا بیٹا فخر الدین محقق حلی جس کا لقب ہے نصیر الدین بن محمد طوسی جو خواجہ نصیر سے مشہور ہے، ابو القاسم نجم الدین بن سعید صاحب شرائع اس کا لقب محقق ہے، تقی الدین بن داؤد سدید الدین محمود حمصی رضی الدین بن طاؤس، جمال الدین بن طاؤس اس کا بیٹا غیاث الدین مقداد علی بن عبد العالی اس کا داماد میر باقر زین الدین مقتول، اس کا شاگرد بہاؤ الدین محمد عاملی اور تقی الدین شارح سد، تقی مجلسی شارح من لا یحضرہ الفقیہ اور اس کا بیٹا باقر مجلسی، صاحب بحار الانوار،

یہ گویا اس فرقے کے مصنفین کی آخری کڑی ہے، اور ان کے مذہب معتمد علیہ کہ روایات سابقہ میں سے یہ جس روایت کو اپنے امتحان کی کسوٹی پر کس کے کھرا بتادے تو وہ ان کے نزدیک وحی منزل من اللہ ہے بلکہ بالفعل اگر ان کے مذہب کی نسبت باقر مجلسی کی طرف کریں، ان کے سابقین کی طرف تو زیادہ اور بجا ہے۔

مذکورہ بالا کے علاوہ ان کے اور بھی علماء ہیں، جنہوں نے علوم دینیہ میں زیادہ لب کشائی نہیں کی۔ جیسے صدر الدین شیرازی، آخوند حسین خوانساری اور حبیب اللہ مشہدی، ابو القاسم قندرسکی، استاد ملا محمود جونپوری شمس بازغہ کا مصنف ان میں سے بعض نے مذہب و کلام میں البتہ دخل دیا ہے اور اس فرقہ کے عوام کے نزدیک درجہ اعتبار تک پہنچے مثلاً قاضی نور اللہ شوستری ملا عبد اللہ مشہدی صاحب اظہار الحق اور ملا رفیع واعظ ابواب الجنۃ کا مصنف،

اب ان کے علماء کی تعداد کے شمار کے بعد یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ ہم ان کی معتبر کتابوں سے بھی روشناس کرائیں۔

کیونکہ ان علماء کا جو علم بھی ہے وہ ان ہی کتابوں میں تو منضبط اور درج ہے اور ان سے روایت یا نقل ان کتابوں کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں،

ان میں سلیم بن قیس ہلالی وہ پہلا شخص ہے جس نے ان کے اخبار میں کتاب تصنیف کی اور شیعوں کے تمام فرقوں نے اسے معتبر سمجھا ہے اور اب بھی اسے نایاب اور قیمتی چیز سمجھتے ہیں، اور گراں سے گراں تر قیمت پر بھی بڑے شوق سے خرید لیتے ہیں،

سبائیہ کی کوئی معقول کتاب نہیں ہے مگر ان کے بیوقوفوں کا جمع کردہ بہت قلیل سا ذخیرہ جس میں امیر المومنین کی کچھ تعریف آپ کی علامات الوہیت آپ کے خوارق عادات افعال اور کچھ بیان اس بارے میں کہ آپ شہید نہیں

ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں، اور اب پھر نزول فرمائیں گے،

علویہ کے پاس کچھ تصنیفی ذخیرہ ہے جس کا ماحصل اور کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے محض روح کی شکل میں تھا، پھر قالب آدم میں داخل ہوا جس کی طرف ان کے خیال میں وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي سے اشارہ ملتا ہے، پھر صدی بعد صدی اور پشت در پشت انبیاء کے اجسام میں حلول کرتا ہوا اور منتقل ہوتا ہوا جناب امیرؓ اور ان کی ذریات تک پہنچا۔

کیسانیہ:۔ کے ہاں بھی ذٹلیات کے سوا کوئی قابل ذکر علمی کتاب نہیں مثلاً محمد بن الحنیفہ کا کچھ فرضی حال ان کے خوارق عادات ان کی کرامات، دیووں اور پریوں سے ان کی نبرد آزمائی اور ان کا جنوں کو مسخر و تابع کر لینا جس طرح داستان امیر حمزہ جو عام افسانہ گویوں اور قصہ خوانوں کی زبان ہے اسی ضمن میں کچھ نصوص امیرالمومنین سے ان کی اور ان کی اولاد کی خلافت کے بارے میں لے آئے ہیں،

زیدیہ:۔ ابتداً ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، اصولوں میں معتزلہ کی خوشہ چینی کرتے اور فروع میں حنفیہ کی معدودے چند روایات ان کے ائمہ سے سینہ بسینہ چلی آتی تھیں جو ان دونوں کے خلاف تھی بعد میں ان کے علمائے مسائل فقہیہ میں اجتہاد کا سلسلہ شروع کیا اور اکثر مسائل میں حنفیہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے اختیاری مسائل کو جمع کیا اور یوں تصنیف کا سلسلہ شروع ہوگیا اس کے بعد اصول و فروع میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں فروع کی کتابوں میں ان کے ہاں کتاب الاحکام ہے جو بلاد یمن و حجاز میں شرفا کے ہاں ملتی ہے۔ اصول میں عقیدہ الالباس ہے جو بہت مدلل اور ابواب و فصول پر مرتب ہے اس کے رد میں شیخ ابراہیم کردی مدنی نے نیز اس کے نام سے بہت ضخیم شرح لکھی ہے حدیث و اخبار میں بھی ان کے پاس کچھ ذخیرہ ہے،

اسماعیلیہ:۔ ان کے ہاں دولت عبیدیین سے پیشتر سوائے کتاب البیان کے جس کا ذکر باب اول میں ہوا اور کوئی کتاب نہ تھی البتہ مہدی کے خروج کے بعد جب اس کا اور اس کی اولاد کا مصر و دیار مغرب میں تسلط و اقتدار قائم ہوگیا بہت سی تصانیف معرض وجود میں آئیں ان میں سب سے اچھا مصنف نعمان بن محمد منصور قاضی ہے ان کی کتب میں سے چند کتابیں یہ ہیں، کتاب اصول المذاہب کتاب الاخبار فی الفقہ کتاب الرد علی المخالفین اس میں امام ابو حنیفہ امام شافعی امام مالک اور ابن شریح رحمہم اللہ چاروں فقیہوں پر رد لکھا ہے کتاب اختلاف الفقہاء اس کتاب میں اپنے خیال کے مطابق مذہب اہل بیت کی بہت تائید لکھی ہے کتاب الانتصار فی الفقہ اس میں بھی اس قسم کا مضمون ہے کتاب المناقب والمثالب، اور کتاب الابتداء الدعوۃ العبیدہ لیکن جب ان کی حکومت و اقتدار کا شیرازہ منتشر ہوا اور تسلط ختم ہوا تو ان کی کتابیں بھی صفحہ ہستی سے نابود ہوگئیں البتہ خال خال بلاد عدن و یمن میں جہاں ان کے مذہب کے کچھ لوگ رہتے ہیں ان کے پاس ملتی ہیں،

اہل سنت بھی ان کے مذہب کے بعض اصولی یا فروعی مسائل ان کی معتبر کتابوں سے اپنی تصانیف میں نقل کرتے ہیں بطور نمونہ ان مسائل میں سے کچھ کا تذکرہ ہم بھی یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ ان کے طرز کلام کا کچھ پتہ لگایا جا سکے مثلاً کہتے ہیں، يَجِبُ اَنْ يَّكُوْنَ الْاِمَامُ مَعْصُوْمًا عَنِ الْمَعَاصِيْ عِنْدَ الْوِلَايَةِ لَا قَبْلَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ قَبْلَهَا اَيْضًا ولایت سے پہلے یہ ضروری ہے کہ امام گناہوں سے پاک ہو اور ولایت سے قبل یہ ضروری نہیں مگر بعض کہتے

ہیں کہ ولایت سے پہلے بھی ضروری ہے، اور کہتے ہیں اِنْ نَصَّ الْاِمَامُ عَلٰی شَیْئٍ ثُمَّ عَلٰی نَقِیْضِہٖ فَالثَّانِیْ نَاسِخٌ لِلْاَوَّلِ عِنْدَ الْمَهْدَوِیَّةِ وَالْقَدَامَاءِ وَقَالَتِ النِّزَارِیَّةُ یُعْمَلُ بِالْاَوَّلِ وَیُلْغَی الثَّانِیْ (اگر امام نے کوئی فرمان جاری کیا اور پھر اس کے خلاف کوئی حکم صادر کیا تو دوسرا حکم پہلے حکم کے لئے ناسخ ہوگا مہدویوں اور قدماء کے نزدیک اور نزاری کہتے ہیں کہ پہلے حکم پر عمل کیا جائے گا اور دوسرا حکم لغو سمجھا جائے گا)

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب امام کوئی حکم صادر کرے تو مسلمان مرد و عورت پر اس کی تعمیل واجب و لازم ہوتی ہے چاہے وہ حکم ان کی مرضی کے خلاف ہو کیوں نہ ہو پس اگر امام کسی عورت کو کسی بے زوجہ مرد کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے نامزد کر دیتے تو دونوں پر عقد لازم ہو گیا اس کو توڑا نہیں جا سکتا چاہے عورت اسے ناپسند کرے یہی حکم دوسرے معاملات بیع و اجارہ وغیرہ کا ہے،

فقیہ عمارہ یمنی نے جو مشہور شاعر تھا کہا ہے کہ سیدہ بنت احمد بن جعفر بن احمد صلیحیہ حسن و جمال حسن ادب حسن اخلاق اور نزاکت و ظرافت میں شہرہ آفاق اور یکتائے روزگار تھی اہل یمن اس کو بلقیس الاسلام کہتے تھے اس کا شوہر شاہ یمن مکرم صلیحی تھا شہر ذی جبلہ میں دار العزا اسی کا بنوایا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد بخت و اتفاق سے سبا ابن احمد بن مظفر صلیحی یمن کا حاکم بن گیا۔ ملک پر اقتدار و تسلط کے ساتھ اس کی خواہش ہوئی کہ سیدہ پر بھی تسلط حاصل کرے مگر باوجود صاحب اقتدار و عروج کے سیدہ کی طرف سے پیہم انکار ہوتا رہا اور معاملہ نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ دونوں فریق آمادہ پیکار ہو گئے اور جنگ کی دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں سبا کے مصاحبوں نے اس کو مشورہ دیا کہ لڑائی میں خطرہ نظر آتا ہے کہیں یہ اقتدار ہی ہاتھ سے نہ جاتا رہے حصول مقصد کا آسان طریقہ یہ ہے کہ مستنصر عبیدی کو جو والی مصر تھا اور اہل یمن اس کی دعوت پر قائم تھے خط لکھو

چنانچہ بات اس کی سمجھ میں آگئی، اپنے آدمیوں میں سے دو معتمد اشخاص کو مناسب پیشکش کے ساتھ مصر روانہ کیا اور سارا قصہ اسے لکھ بھیجا، مستنصر نے اپنا ایک معتمد خواجہ سرا اور دو آدمی بطور ایلچی بھیجدئے خواجہ سرا نے یمن پہنچ کر روساء اور امراء کو جمع کیا اور سب کو سیدہ کے گھر لے گیا ان کو دروازہ پر کھڑا کر کے خود سیدہ کے پاس گیا اور کہا کہ امیر المومنین مستنصر نے تم کو امیر الامراء ابو حمیر سبا ابن احمد بن مظفر کے عقد میں ایک لاکھ دینار نقد اور بصورت زیور و تحائف دیا ہا قیمتی پچاس ہزار دینار کے عوض دیدیا ہے اور امیر المومنین نے یہ بھی کہا ہے یہاں قرآنی آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حکم دیں تو ان کو اس بات میں کوئی اعتراض باقی رہے اور جس نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہو گیا،

سیدہ نے اپنے مذہب و عقیدہ کی پاسداری میں اسے قبول تو کر لیا مگر دونوں کی نبھی نہیں اور رنجشیں پیدا ہو گئیں جس کی تفصیل تاریخوں میں موجود و مذکور ہے۔

ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ امام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہمکلام ہونا چاہئے چنانچہ حاکم عبیدی اسی بات کا مدعی تھا۔ اور کوہ طور پر اکثر جانا رہتا تھا، نیز کہتے ہیں اور اثنا عشریہ کا یہ قول ہے کہ امام کے لئے غیب دانی لازم ہے،

ان کے فرعی مسائل کے منجملہ ایک یہ مسئلہ ہے۔ کہ درود شریف میں آل پر علی کو لگانا حرام ہے، اور اس کے ثبوت میں یہ روایت بیان کرتے ہیں، مَنْ فَصَلَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ آلِیْ بِعَلیٰ لَمْ یَنَلْ شَفَاعَتِیْ (جو میرے اور میری آل کے درمیان لفظ علی سے فصل (بعد) پیدا کرے وہ میری شفاعت سے محروم ہوگا، حالانکہ یہ روایت سراسر افترا اور بہتان ہے،

پھر ان کے نزدیک مرد کے لئے بیک وقت اٹھارہ عورتیں نکاح میں رکھنا جائز ہے، اور دلیل اس آیت سے لاتے ہیں فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (عورتوں میں سے جو پسند ہوں ان سے نکاح کرو دو دو، تین تین، چار چار) اور معنے کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اعداد کے مکرر ذکر کا مطلب ہے کہ ہر عدد کو دوگنا کرکے مجموعہ کی تعداد کے مطابق نکاح کرو۔ ۲+۲+۳+۳+۴+۴=۱۸۔

اہل سنت میں سے کسی نے بطور تعریض اس کے جواب میں کہا کہ انہیں بیس عورتیں جائز ہونی چاہئیں اس لئے کہ ایک عورت سے نکاح میں تو کسی شبہ کی گنجائش نہیں تو ایک کے عدد کو بھی مذکورہ اعداد میں شامل کرکے ایک کے دو گنے

دو کو اٹھارہ میں ملا لیا جائے تو تعداد پوری بیس ہو جائے گی،

تفنن برطرف، اللہ تعالیٰ کی اس آیت کے مذکورہ بالا معنی لینا کلام اللہ کی کھلم کھلا تحریف کرنا ہے اور اللہ کی کتاب کو بازیچہ اطفال بنانا ہے (نعوذ باللہ) کیونکہ یہ معنے عرف لغت شرع اور عقل چاروں کے خلاف ہیں،

عرف کے خلاف تو اس طرح کہ آپ اپنے کسی خادم، نوکر کو کچھ روپے دے کر کہیں کہ محتاجوں کو دو دو، تین تین، چار چار روپے تقسیم کر آؤ اور وہ سب کو اٹھارہ اٹھارہ روپے دے آئے تو آپ اس پر یقیناً غصے ہوں گے اور کہیں گے میرا یہ حکم تو نہیں تھا تم نے ایسا کیوں کیا، اور ہر عقلمند آپ کی برہمی اور غصہ کو حق بجانب سمجھے گا۔ کیونکہ ایسی بات کا عام مفہوم یہی سمجھا جاتا ہے کہ دو دو روپے، یا تین روپے یا چار روپے فی کس دیدو،

لغت کے خلاف اس طور پر ہے کہ مثنیٰ دراصل اثنین اثنین (درمیان میں واؤ کے بغیر سے بنا ہے پس دوبارہ جو اثنین ہے وہ بعینہٖ اول ہے نہ یہ کہ دو کو دو میں ملاؤ اور جمع مراد تو تکرار کی غرض یہ ہے کہ اس عدد میں شرکت بصورت جمع کا وہم پیدا نہ ہونے پائے، اور مثنیٰ و ثلث کے درمیان جو واؤ ہے وہ معطوف اور معطوف علیہ کی شرکت کی غرض سے ہے حلت نکاح میں،

اور اس کے معنے ہیں کہ یہ عدد بھی حلال ہے اور یہ بھی باعتبار لغت تمام معطوفات میں یہی معنے سمجھے جاتے ہیں۔ جمع یا ترتیب کے معنے دینے کے لئے لفظ مع ہے واؤ یا دوسرے حروف عاطفہ اس کے لئے استعمال نہیں ہوتے اور اگر یہاں واؤ کو مع کے معنے میں لے لیں تو گو یہ عربی زبان کے قاعدہ کے خلاف ہوگا تاہم بھی ان کا مقصد اس سے حاصل نہ ہوگا اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ دو مجموعوں کے ایک جا جمع ہونے سے چھوٹا عدد بڑے عدد سے ساقط ہو جاتا ہے، اگر کسی کے ذہن میں شک سر ابھارے کہ ممکن ہے کہ اثنین اثنین میں گو لفظی اعتبار سے حرف عطف نہیں لیکن ممکن ہے معنی میں حرف عطف ملحوظ ہو، کیونکہ حرف عطف کا قاعدہ میں حذف جائز ہے، جیسا ایک اثنا عشری شاعر کا یہ شعر۔

قُلْتُ لَہٗ عِدَّۃُ اَعْدَادٍ مِّنْھُمْ اَرْبَعَۃٌ اَرْبَعَۃٌ اَرْبَعَہٗ

(میں نے اس سے کہا ان کے بڑوں کی تعداد کیا ہے (تو کہا) چار، چار، چار")

تو یہاں بارہ کی تعداد مراد ہے اور یہاں حرف عطف واؤ درمیان سے گرادیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو اہل لغت اس طرح کے معنے مراد لینے کو غلط کہتے ہیں دوسرے اسماعیلیہ مذہب کے ثبوت میں کسی اثنا عشری شاعر کا کلام پیش کرنا "چور کا بھائی گرہ کٹ" کے محاورہ کے پیش نظر ویسے بھی غلط ہے،

اس کے علاوہ بھی اس کا کلام سند میں پیش نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ مولدین میں سے ہے اور عربی میں سنداً جاہلین اور مخضرمین کے کلام کے سوا کسی اور کا کلام پیش نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ قبول کیا جاسکتا ہے اور یہ بات اپنے مقام اور موقعہ پر طے شدہ ہے،

اور پھر یہ بھی ہے کہ شاعر ضرورت شعری کی بنا پر خلاف قاعدہ باتیں بھی استعمال کرلیتے ہیں۔ جو نثر میں بالکل کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس شاعر کے پورے کلام کی بنیاد تقیہ پر ہے جیسا کہ اسی شعر کے ساتھ کے دوسرے اشعار کے الفاظ مذھبی السنۃ یا فی میتہ ابنہ اس پر دلالت کرتے ہیں اس شعر میں شاعر ان الفاظ کو اس ڈھب اور طریقے پر لایا ہے کہ لغت کے اعتبار سے اہل سنت کے مذہب کے موافق ظاہر ہوں اور خلفائے اربعہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو اس طرح تو اس کے کلام میں بھی اس عدد کی تکرار صرف تاکید کو ظاہر کرتی ہے نہ جمع کو

شرع کے خلاف یہ اس وجہ سے ہے کہ اگر معنی مذکور مد نظر ہوں تو یہ لازم آتا ہے کہ آیت مذکور میں جو اعداد بیان ہوئے ہیں، ان سے کم کی تعداد میں نکاح جائز نہ ہو۔ کیونکہ مثنیٰ مع اپنے معطوفات کے حال سے اور حال، باجماع اہل عرب اپنے عامل کی قید ہوتا ہے، جیسے اِضْرِبْ زَیْدًا رَاکِبًا میں راکبا حال بھی ہے اور قید بھی کہ بغیر حالت رکوب کے مارنا جائز نہیں اور جب واو کو جمع و ترتیب کے معنے میں لیں، شرکت فی الحکم کے معنے میں نہ لیں تو لا محالہ حلت نکاح ان اعداد کی جمع و ترتیب کے ساتھ مقید ہوگی، حالانکہ یہ صورت بالاجماع باطل ہے،

پھر اگر اس آیت میں یہی معنے مراد ہوں تو اس سے ایک اور بات لازم آئی گی کہ پھر ہر فرشتے کے اٹھارہ اٹھارہ بازو ہوں، کیونکہ قرآن مجید میں ان کے لئے بعینہ یہی الفاظ آئے،

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ

(بنانے والا فرشتوں کو رسول دو دو تین تین، چار، چار بازوں والے)

کیونکہ یہاں ملائکہ لفظ جمع لایا گیا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جمع پر ال۔ داخل ہو تو اس کے سارے ہی افراد مراد ہوتے ہیں،

عقل کے خلاف اس طور پر کہ اگر یہی معنے مراد ہوتے تو یوں کہنا چاہیئے تھا۔ مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ثَمَانِیَۃَ عَشَرَ عورتوں میں سے اٹھارہ عورتوں سے نکاح کرو جو تمکو پسند ہوں،

ایک ظاہر المعنی اور نسبتاً مختصر لفظ کو چھوڑ کر غیر ظاہر اور دراز لفظ کو لانا ایسی بات ہے جو کم فہموں کو

بھی خندہ، استہزاء پر مائل کرتی ہے اور پھر ایسی رکیک حرکت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا کہ اس نے اپنے اس کتاب میں جو لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے، ایسی عبارت درج فرمائی۔

اور پھر اگر کسی مجلس میں کسی اٹھارہ سالہ نوجوان سے اس کی عمر دریافت کی جائے اور وہ جواب اسی طرح دو دو، تین، تین، چار، چار کہہ کر دے تو بھری مجلس میں جو اس کا مذاق اڑے گا اسے کون نہیں جانتا،

بعض اسمٰعیلی نو عورتوں تک نکاح جائز سمجھتے ہیں (۲+۳+۴ = ۹) اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس آیت میں عطف کے معنے ملحوظ نہیں ہیں، یہ گویا عطف اور جمع میں تمیز نہیں کرتے،

اسمٰعیلی فرقہ میں باطنیہ کی کتابیں کثرت سے ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب البیان ہے جو غیاث کی لکھی ہوئی ہے، جس کا ذکر پہلے گزر چکا۔ اور کتاب تاویل الاخبار اور کتاب التاویلات بھی ان کی کتابیں ہیں جو ناصر خسرو کی طرف منسوب ہیں۔

نزاریہ:۔ ان کے ہاں بھی بہت سی کتب معروف ہیں، جن کے مصنف ابن صباح اور نصیر الدین طوسی صاحب تجرید ہیں۔ طوسی اگرچہ خود اثنا عشری ہے مگر بعض سلاطین کی فرمائش پر نزاری مذہب کے لئے اس نے کتابیں لکھی ہیں،

سلطان جلال الدین جس نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے توبہ کر لی تھی اس نے ان کے کتب خانوں کو نذر آتش کر دیا تھا، یوں ان کی کتابیں ضائع ہوگئیں اور چنگیزی فتنہ کے وقت تو ان کے فرقے ہی باقی نہ رہے کتابیں تو کیا بچتیں ان کا نام و نشان بھی نہ رہا،

البتہ امامیہ کے جن ابن الوقتوں نے چنگیزی دربار سے تعلق استوار کر کے آمد و رفت کی راہ نکال لی تھی وہ خوب پھلے پھولے، ان کے مذہب نے بھی خاصا عروج پایا،

امامیہ:۔ اب ہم فرقہ امامیہ کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے مختلف علوم و فنون مثلاً علم کلام، تفسیر حدیث اصول فقہ اور فروع فقہ میں تصنیف کیں اور بکثرت لکھیں۔ مذہب و کلام ہشام بن حکم کی کتابیں ہیں جو علم کلام پہ پہلا مصنف شمار ہوتا ہے اس کے علاوہ ہشام بن سالم محمد بن نعمان صیرفی الطاق ابن جہم ہلالی ابوالاحفض علی بن منصور، حسین بن سعید، فضل بن شاذان قمی کی تصانیف بھی ہیں فضل قمی کی ایک کتاب القائم بہت مشہور رہی ہے قابل اعتبار بھی سمجھی جاتی ہے،

ابوعیسٰی الوزان، ابن راوندی، کی کتابیں اور مسیحی کی کتاب الیاقوت اور محمد بن حسن صفار کی کتابیں، مثلاً الدرجات وغیرہ اسی طرح علی بن مظاہر واسطی کی کتاب اور علی بن بابویہ کی کتاب التوحید اور محمد بن علی بن بابویہ کی کتاب التوحید اور اعتقادات جو اعتقادات صدوق کے نام سے مشہور ہے اور حسین بن علی بن بابویہ کی بھی کتاب التوحید کے نام سے تصنیف، مسئلہ امامت میں مرتضیٰ کی کتاب الشافی اور بن محمد بن جریر طبری کی کتاب استرشد ہیں طوسی کی کتاب تجرید العقائد اور اس کی شرح اور ابن مطہر حلی کی کتاب الالفین، نہج البلاغہ منہج الکرامہ اور باب حادی عشر مقداد کی شرح باب حادی عشر، قواعد نظم البراھین، اور اس کی شرح نہج البراہین اور اس کی شرح نہج المسترشدین اور اس کی شرح واجب الاعتقاد اور اس کی شرح کتاب میثم بن میثم البحرانی اور تقویم وغیرہ وغیرہ۔

ان کی کتب تفسیر میں ایک تفسیر وہ ہے جس کو یہ حضرت امام حسن عسکری کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی روایت ابن بابویہ نے بھی اپنی سند سے کی ہے اور دوسروں نے بھی اپنا اسناد سے تدریسے کی بیشی کے ساتھ روایت کی ہے۔

اہل سنت نے بھی امام مذکور اور دیگر ائمہ سے تفسیری روایات لی ہیں، جس کی تفصیل در منثور میں مذکور ہے اسی طرح تفسیر شاہی میں بھی اس کا پورا ذخیرہ ہے،

البتہ شیعہ حضرات نے ائمہ سے جو تفسیری روایات بیان کی ہیں اہل سنت کی روایات کے ساتھ بالکل میل نہیں کھاتیں۔

مثلاً علی بن ابراہیم کی تفسیر، قمی کی تفسیر مجمع البیان، محمد بن حسن طوسی کی تفسیر البیان، تفسیر النعمان، تفسیر العیاشی حیدر آملی کی المحیط الاعظم فی تفسیر القرآن الکریم۔ مقداد کی تفسیر کنز العرفان فی احکام القرآن اور کسی اور کی تفسیر الاحکام۔

اب رہیں ان کی کتب حدیث تو اخبار تو ان کا کہنا ہے، اور اس کے سچ جھوٹ کی پوری ذمہ داری انہیں پر ہے کہ چار سو مصنفین کے چار سو نسخے تھے، جن کو اصول کہا جاتا تھا، رفتہ رفتہ وہ سب نسخے ضائع ہو گئے، پھر ایک جماعت نے ان نسخوں کا خلاصہ تیار کیا اور ان سے چند نسخے تیار کئے ان میں سے،

محمد بن یعقوب کلینی کی کافی۔ ابی جعفر محمد بن حسن طوسی کی تہذیب، الاستبصار،

محمد بن علی بن بابویہ قمی دجوان کے ہاں صدوق مشہور ہے، کی من لا یحضرہ الفقیہ، دیلمی کی معتبر سرائر اور ارشاد القلوب، علی بن جعفر کی قرب الاسناد کتاب المسائل،

حسن قمی کی نوادر، بزنطی کی جامع برقی کی کتاب المسائل اور ابن بابویہ کی کتاب العلل ابن شہر آشوب سروی مازندرانی کی دعاء الاسلام و کشف المقنع و المکارم الملہوف، کتاب العیاشی، فلاح السائل اور کتاب المناقب ابن معلم کی الارشاد معانی الاخبار، المجالس ابی علی بن ابی جعفر طوسی کی کتاب الروضۃ، کتاب المجالس، ابن فہد کی عدۃ الداعی ابن طاوس کی کتاب الطرف ابن بابویہ کی کتاب المجالس، الفقیہ اور المجالس، ابن مطہر حلی کی الاستنصار۔ ابن عیاش کی کتاب انا انزلنا فی لیلۃ القدر۔ برقی کی کتاب الخصائل۔ سعد بن عبد اللہ کی کتاب البصائر۔ دیلمی کی اعلام الدین۔ راوندی کی مجمع البیان، البصائر الصفار، الجامع کتاب النوادر ملتقی الجان، کتاب الجرائح و الجوائح ابی جعفر طوسی کی کتاب المحاسن معانی الاخبار۔ ابن بابویہ کی نوادر الحکمۃ کتاب الرحمۃ، ثواب الاعمال و الخصال، کتاب المعراج اور عیون اخبار الرضا، طوسی کی جامع الاخبار و الخلاف اور مصباح اور ابن شہر لیفہ واسطی کی اکمال الدین و العیون عقاب الآمال و الامالی الہدایہ علل الشرائع و الاحکام، احتجاج مشارق انوار الیقین فی کشف اسرار امیر المومنین اور کتاب اللباب۔

یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ اصول حدیث میں اس فرقہ کے ہاں کوئی کتاب نہیں تھی، نہ ان کے ہاں اس کے اصول و قواعد منضبط تھے نہ یہ روایات کو کسی کسوٹی پہ پرکھتے تھے غرض اس معاملہ میں بہت غفلت سستی اور لاپروائی ان کا شعار تھا ان کے اگلوں نے اپنے اسلاف کی کتابوں میں جو کچھ لکھا پایا بغیر جانچے پرکھے اس کو قبول کر لیا یہی انہوں نے کیا اور یہ سمجھ لیا کہ ان کے راویان اخبار و احادیث میں وہم خطا، نسیان اور کذب کا شک محالات میں سے ہے۔

جب ان اخلاف نے اپنے ہاں کی روایات میں اختلاف بلکہ تناقض کو دیکھا اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا تو اہل سنت کے اصول حدیث کو سے کر اور حسب منشا ان میں کچھ کمی بیشی کر کے چند ایسے قواعد بنا ڈالے جو ان کے اصول و وضع سے نہ ٹکرائیں، اور ان سے چند کتب مرتب کریں، ان میں سے ایک کتاب تو بدا یہ فی علم الہدایہ ہے اور ایک اس کی طرح، اور دوسری تحفۃ القاصدین فی معرفۃ اصطلاح المحدثین

اسی طرح ان کے اسلاف کے پاس فن جرح و تعدیل میں بھی کوئی کتاب نہ تھی اس فن میں ان کے ہاں پہلی کتاب کشی ہے مگر بہت مختصر،

اس کے بعد ابو جعفر طوسی جمال الدین بن طاؤس کی عضایری اور نجاشی ہیں علامہ حلی کی کتاب الخلاصہ اور ایضاح ہیں اور حسن بن داؤد کی کتاب تقی الدین اس فن میں یہ کتاب بہت مفصل ہے،

اصول فقہ میں ان کے ہاں مشہور معتقد اور عدہ اور ان دونوں کی شرحیں ہیں پھر علامہ حلی کی مبادی اور اس کی شرح مقداد کی قواعد شیخ مقتول اور اس کی شرح زبدۃ الاصول اور اس کی شرح عراق و خراسان میں اس کی بہترین شرح مازندرانی کی مانی جاتی ہے اور ہندوستان میں مولوی احمد اللہ سندیلوی کی جو انہوں نے صفدر جنگ ابو المنصور خاں کے ہاں تقرب حاصل کرنے کی غرض سے لکھی تھی،

فقہ میں ان کی سب سے پہلی کتاب فقہ الرضا ہے،

پھر ابن مطہر حلی کی قرب المسائل، بلبسوط اسناد منتہی المطلب، تحریر تذکرۃ الفقہاء ابن بابویہ کی مقنعہ محمد بن علی بن ابراہیم کی، مقنع معتبر مکارم الاخلاق اور کتاب العلل۔ کرجکی کی کنز الفوائد ابن بابویہ کی کتاب الافعال مدینۃ العلم اور مجلس۔ کفعمی کی فلاح السائل اور جنۃ الامان ابن جنید کی لمعہ اس کی شرح ایضاح خلاف تحریر ارشاد نافع اس اس کی شرح، نہایا، قواعد مصباح اور مختصر۔ ابن فہد کی، فتاویٰ محقق اور مہذب۔ ابن بابویہ کی ایضاح القواعد منتہی شرائع اور اس کی شرحیں مدارک اور مسالک اور ان کے علاوہ خلاصہ، مختلف معالم اور مجالس، شیخ مقتول کی دروس ذکریٰ اور بیان باقر مجلسی کی بحار الانوار،

وہ کتابیں جو ابن بابویہ نے اپنے اساتذہ کے حالات میں لکھیں یا نجاشی نے اپنے رجال کی سیرت پر لکھیں ان سب کا نام و نشان بھی باقی نہیں، البتہ جن کتابوں کا ذکر اوپر آیا ہے بلاد ایران میں رائج اور مستعمل ہیں اور ان کے اکثر نسخے یہاں بھی مل جاتے ہیں، یعنی ہندوستان بزمانہ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ ن)

فائدہ ۱: واضح رہے کہ ان کے تمام علوم مثلاً کلام، عقائد اور تفسیر ان سب کی بنا احادیث پر ہے اور دارو مدار محدثین پر! اور باجماع اثنا عشریہ احادیث کا پورا ذخیرہ چار کتابوں پر تقسیم ہے جن کو یہ اپنے ہاں کی اصح الکتب کہتے ہیں اور جو اصول اربعہ کے نام سے مشہور ہیں،

کافی جو کلینی کر کے مشہور ہے۔ من لا یحضرہ الفقیہ تہذیب، اور استبصار،

ان چاروں کتابوں پر عمل کرنے کو انہوں نے صراحت کے ساتھ واجب و لازم قرار دیا ہے، یہ بھی انہوں نے صاف صاف کہا ہے کہ امامی کی روایت پر بشرطیکہ وہ محدثین کی روایت سے نہ ٹکرائے عمل واجب ہے چنانچہ ابو جعفر طوسی شریف مرتضیٰ اور فخر الدین ملقب بمحقق حلی نے ان دونوں باتوں کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں لکھا

ہے اس لئے ان دونوں قاعدوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کیونکہ آئندہ بحثوں میں یہ بہت سی جگہ کام آئیں گے،

ان چاروں کتابوں میں باہم ایک دوسرے کے مراتب و درجات فضیلت میں علمائے اثنا عشریہ کا اختلاف ہے بعض کافی کو سب سے بلند درجہ سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے من لا یحضرہ الفقیہ کو، اور ان کے اخلاف نے جو اسلاف کے کلام کو پرکھنے میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں ہر دو فریق بالا میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ اصول میں احسن کتب کافی الکلینی تہذیب اور استبصار ہیں، اور کتاب من لا یحضرہ الفقیہ حسن ہے احسن نہیں ہے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان حضرات کے مذہب کا پورا پورا مدار و قرار ان چار کتابوں پر ہی ہے اصول عقائد فقہی مسائل اور امامت کے مباحث سب کے سب انہیں کتابوں سے لیتے اور ان ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں،

اب ہم ذرا ان کے اخبار کی اسناد پر ایک تحقیقی نظر ڈال لیں اس میں تو شک نہیں کہ ان میں ہمہ رنگ راوی ملتے ہیں مجسمہ مصرحہ مثل ہشامین اور صاحب الطاق جیسے راوی بھی ان میں ملتے ہیں جو دل میں اللہ تعالیٰ کو جاہل جانتے ہیں، جیسے زرارہ بن اعین، احولین سلیمان جعفری محمد بن اسلم اور ان کے علاوہ ایسے بھی بد عقیدہ ان میں موجود ہیں، جو کسی بھی امام کو نہیں مانتے، یا امام وقت کو نہیں مانتے جیسے بنی فضال، ابن مہران اور ابن بکیر اور ان جیسے دوسرے روایات گھڑنے والے جن کے متعلق خود شیعوں کو اقرار ہے کہ ان کا یہی پیشہ ہے مثلاً جعفر فرادی، ابن عیاش اور بعض ایسے ہیں جو ان کے خود کے نزدیک جھوٹے غلط گو ہیں مثل محمد بن عیسٰی کے بعض ایسے جو کمزور اور نا معلوم الحال ہیں جیسے ابن عمار ابن مسکان ابن سکر اور زید یمامی اور کچھ ایسے جو نا تحقیق الحال ہیں جیسے تفلسی قاسم حزا ابن فرقد اور ان کے مثل پھر ان کی سندوں کی آخری کڑی ایسے لوگ ہیں، جو گناہ کے مرتکب ہی نہیں امام وقت کے غیظ و غضب کا شکار بھی ہیں، جیسے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکری یا سبط مجتبیٰ امام حسن رضی اللہ عنہ کے فوجی، یا سبط شہید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دغا دینے اور ان کے ساتھ بے وفائی کرنے والے چنانچہ کتاب کلینی ابن عیاش کی روایات سے بھری پڑی ہے اور یہ ابن عیاش وہی ہے جس کے متعلق سب کا یہ متفقہ فیصلہ ہے، کہ وہ جھوٹا اور روایتوں کو گھڑنے والا ہے،

اسی طرح ابو جعفر طوسی ایسے راویوں سے روایت لاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ براہ راست امام عالی مقام سے روایت کرتے اور انہیں امام کی صحبت بھی نصیب ہے، مگر امام کے دوسرے دوستوں نے نہایت شد و مد سے ان کی تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ ان کو کبھی بھی امام کی صحبت نصیب نہیں ہوئی، اور نہ ہی ملاقات، جیسے ابن مکان جو براہ راست امام صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرنے کا مدعی ہے مگر امام کے دوسرے دوست اس کو جھٹلاتے ہیں،

اسی طرح ابو جعفر طوسی ابن معلم سے بھی روایت کرتا ہے اور وہ ابن بابویہ صاحب رقعہ مزورہ سے،

اور حیرت تو شریف مرتضیٰ پر ہے، کہ پڑھا لکھا اور عقلمند ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کر بیٹھا کہ ہمارے فرقہ کی تمام احادیث درجہ تواتر تک پہنچ چکی ہیں، حالانکہ خود ان کے علماء نے تمام کتابوں میں کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ سوائے حدیث مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (جس نے قصداً مجھ سے جھوٹ منسوب کیا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں

بنالے) کوئی حدیث متواتر نہیں؛

شیخ مقتول نے بھی اس کی تصریح کی ہے، بلکہ اگر کوئی انکی کتابوں کی چھان بین کرے تو اس پر یہ راز بھی کھلے گا کہ ان کی احادیث میں سے کوئی بھی حدیث حد تواتر کو نہیں پہنچی، بلکہ احاد کے درجہ ہی سے آگے نہیں بڑھی اگر کوئی حدیث کسی جماعت سے لائی بھی گئی ہے تو اس حدیث کے راوی نہ الفاظ و حدیث میں متفق ہوتے ہیں نہ قریب قریب ہی پہنچتے ہیں، بلکہ پورا اختلاف موجود ہوتا ہے، اور وہ اختلاف واضطراب بھی اس درجہ کا ہوتا ہے کہ ان میں باہم تطبیق وموافقت میں دشوار ہو جاتا ہے اور جب راویوں کی کثرت اس رنگ ڈھنگ کی ہو کہ ایک ہی واقعہ میں ہر راوی دوسرے سے مختلف البیان ہو تو یہ بات حدیث کو درجہ صحت ہی سے گرا دیتی ہے، درجہ شہرت اور حد تواتر تک پہنچنے کا کیا سوال؛ پھر اس اختلاف واضطراب کے ساتھ ساتھ ان کی سندوں کا سلسلہ ایسے لوگوں پہ جا کر ختم ہوتا ہے جن پہ یہ خود جھوٹ کی تہمت لگاتے ہیں؛

ایک دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے ثقہ حضرات کی ایک جماعت ایک حدیث روایت کرتی اور اسے صحیح قرار دیتی ہے پھر اسی جماعت کے ہم مرتبہ ایک اور جماعت اسی حدیث کو موضوع اور گھڑی ہوئی بتاتی ہے اور ایسی سب روایات ان کی کتب صحاح میں موجود ہیں مثلاً ابن بابویہ نے ان احادیث کو موضوع بتایا ہے جو تحریف قرآن اور اسقاط آیات کے سلسلہ میں وارد ہیں یہی روایات کافی کلینی میں اس کے گمان کے مطابق صحیح سندوں سے لائی گئی ہیں اسی طرح ابن مطہر حلی نے خبر لیلۃ التعریس اور خبر ذی الیدین کے موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔ جو کافی کلینی میں موجود ہیں اور شریف مرتضیٰ نے بڑے زور دار الفاظ میں خبر میثاق کو جو اس کے استاذ الاستاذ ابن بابویہ اور محمد بن حسن صفار کی روایت ہے موضوع قرار دیا ہے حالانکہ ان کے خیال میں ان میں سے ہر ایک کی سند صحیح ہے؛

اب جب سلسلۂ کلام روایات واحادیث کے حال تک آ پہنچا ہے کہ جن پہ درحقیقت ان کے مذہب کا دارومدار ہے اور وہ اپنے اوپر وارد شدہ تمام الزامات کو ان اخبار کے ذریعے ٹالتے ہیں، اور اسی بنا پہ ان کے محدثین دوسرے علماء پر فخر کرتے اور اس پر خوشی محسوس کرتے ہیں تو اب یہ بات مناسب اور ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان کی اخبار واحادیث کا اصل حال جاننے کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا جائے کیونکہ ان جیسے معاملات میں استقلالی اور تفصیلی بیان کے بجائے ضمنی اور اجمالی بیان ناظر وسامع اور قاری کو مطمئن نہیں کیا کرتا اللہ ہی سے مدد و توفیق کی دعا ہے،

چوتھا باب
شیعوں کی احادیث کے اقسام
اور
راویانِ اسناد کے حالات

ان کے نزدیک حدیث کی اصل چار قسمیں ہیں، (۱) صحیح (۲) حسن (۳) موثق اور (۴) ضعیف،

(۱) حدیث صحیح | صحیح وہ حدیث ہے، جس کی سند متصل ہو اور وہ عادل امامی راویوں کے واسطے سے امام معصوم تک پہنچے ان کی اس تعریف سے مرسل اور منقطع صحیح سے خارج ہوگئیں حالانکہ انہوں نے اپنے کلام میں ان ہر دو کو صحیح کہا ہے، جیساکہ کہتے ہیں روی ابن عمیر فی الصحیح کذا وفی صحیح ابن عمیر کذا پھر صحیح کے بولنے میں عدالت کا لحاظ نہیں کرتے اگرچہ اس تعریف میں عدالت کو دخل ہے کہ روایت مجہول الحال کو صحیح کہہ دیتے ہیں، مثلاً حسین بن حسین بن ابان کی روایت کو جو مجہول الحال ہے صحیح کہا ہے، چنانچہ حلی نے منتہی میں اور تقی الدین بن داؤد نے اس کی تصریح کی ہے اور خلاصہ میں کہا ہے طریق الفقیۃ إلی معاویۃ بن میسرۃ والی عابد الاحمسی والی خالد بن نجیح والی عبد الاعلی صحیحۃ (کہ فقیہ کا سلسلہ سند معاویہ ابن میسرہ اور عابد احمسی اور خالد بن نجیح اور عبد الاعلی تک صحیح ہے،) حالانکہ مذکورہ ہر سہ راویوں کا ذکر کسی نے توثیق یا جرح میں نہیں کیا اور جو تھے کی تصدیق انہوں نے خود نہیں کی ہے بلکہ صحیح کے بولنے میں انہوں نے امامی ہونے کا اعتبار بھی درمیان سے اٹھا دیا ہے گویا انہوں نے صحیح کی تعریف کی تمام قیود سے غفلت برت کر ان کو نظر انداز کر دیا ہے،

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حسن بن سماعہ کی روایت کو صحیح کہا ہے اور وہ متعصب واقفی ہے اور امام وقت کی امامت سے منکر اسی طرح ابان بن عثمان کی روایت کو صحیح بتاتے ہیں، جو فطحی تھا اور امام وقت کی امامت سے منکر ہو کر دوسرے امام کو مانتا تھا ایسا ہی علی بن فضال اور عبد اللہ بن بکیر کی روایات کو صحیح کہتے ہیں حالانکہ دونوں بد مذہب تھے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سب کچھ ان کے علاوہ احوال رجال میں لاتے بھی ہیں، اور پھر بھی ان کی روایات لیتے اور بالاتفاق ان کی توثیق و تصحیح بھی کرتے ہیں،

مثلاً ابن مطہر حلی خلاصۃ الاقوال میں کہتا ہے علی بن فضال کان فقیہا بالکوفۃ ووجہہم وثقتہم وعارفہم بالحدیث، کہ علی بن فضال کوفہ کا فقیہ تھا اور ان سب میں سربلند قابل اعتماد اور حدیث میں کافی درک رکھنے والا تھا نجاشی کہتا ہے. لم یعثر لہ علی زلۃ (میں اس سے لغزش پر علیحدہ نہیں ہوا)

پس ان کے اپنے مقرر کردہ قواعد کے بموجب ان جیسوں کی روایتوں کو موثق ہونا چاہیئے نہ کہ صحیح کیونکہ صحیح میں راوی کا امامی ہونا شرط ہے محض عدالت سے کام نہیں چلتا،

اور یہ تو اس راوی کی حدیث کو بھی صحیح کہدیتے ہیں جس کو امام معصوم نے بددعا دی ہو اور لعنت بھیجی ہو یا اس کے حق اخزاہ اللہ قاتلہ اللہ یا ان جیسے کلمات فرمائے ہوں اس کے عقیدہ کی برائی بیان کی ہو اور خود کو اس سے بری اور بیزار ظاہر کیا ہو۔

یہ اس کی روایت کو بھی صحیح بتاتے ہیں جس نے امام وقت پہ افترا باندھا اور امام نے اس کو اس روایت میں جھٹلایا ہو جو اس نے ان سے کی ہو؛ بلکہ خود اس نے بھی اپنے جھوٹ کا اعتراف و اقرار کر لیا ہو،

یہ مجسمہ، مشبہ اور مصرحہ راویوں کی روایات کو بھی صحیح کہتے ہیں، جو اللہ تعالٰی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ جسم رکھتا ہے، مکان و جہت رکھتا اور صورت و شکل والا ہے۔ ہاتھ رکھتا ہے۔ اور یہ کہ ازل میں اس کے اندر یہ صفتیں نہ تھیں حالانکہ یہ سب باتیں بالاجماع کفر ہیں۔ اور کافر کی تو روایت ہی ہرگز قابل لحاظ نہیں چہ جائیکہ اس کو صحیح مانا جائے،

پھر ابن بابویہ کے نقل کردہ رقعوں کی روایات کو اور ان خطوط کی جن کو یہ ائمہ کے بتلاتے ہیں عمل میں اپنی صحیح الاسناد روایات پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ابن بابویہ نے اس کی تصریح کی ہے آئندہ بیان میں انشاء اللہ یہ سب کچھ سامنے آئے گا،

یہ اس شخص کی روایت کو بھی صحیح کہتے ہیں جس نے امام کے راز کو فاش کیا اور یوں خیانت کا مرتکب ہوا مثلاً ابی بصیر اس کا حال بھی انشاء اللہ ابھی آئے گا،

اور صحیح حدیث کا اطلاق ایسے شخص کی حدیث پر بھی کر دیتے ہیں جو کاذب الاسناد ہو کہ ایک شخص سے حدیث سنتا ہے مگر اس کو منسوب اس کے باپ یا دادا سے کر دیتا ہے،

اور جس کے مجہول الحال ہونے پر سب کا اتفاق ہے اس کی حدیث کو بھی صحیح کہتے ہیں مثلاً حسن بن ابان کہ ابن مطہر نے منتہی اور مختلف میں اور شیخ مقتول نے دروس میں اس کی حدیث کو صحیح کہا ہے،

اسی طرح اس شخص کی حدیث کو بھی قابل اعتماد کہتے ہیں جس کی یہ خود تضعیف کرتے ہیں، جیسے محمد بن سنان جس کو یہ بہت ہی ضعیف شمار کرتے ہیں،

اور اس کی روایت کو صحیح کہتے ہیں جس کو امام اور شیعوں کے درمیان ایلچی ہونے کا دعوی ہوتا ہے، بغیر کسی گواہ یا دلیل کے بلکہ جس عادل امامی نے صاحب الامر کو دیکھا ہو اگرچہ ایلچی ہونے کا مدعی نہ ہو اس کی حدیث کو بھی صحیح بتاتے ہیں جیسے ابن مہریار اور داود جعفری، تو یہ ہے چہرہ ان کی صحیح حدیث کا جو قوی ترین بلند ترین اقسام حدیث میں سے ہے،

(۲) حدیث حسن :- اب حدیث حسن کو لیجئے حسن کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں، کہ حدیث حسن وہ ہے جس کا سلسلہ سند متصل ہو، اور ایسے تعریف شدہ امامی کے واسطے سے وہ امام معصوم تک پہنچے جس کی عدالت پر تصریح نہ ہو۔

اس تعریف سے بھی یہ لازم آتا ہے کہ مرسل و منقطع حسن نہ ہوں۔ حالانکہ مرسل و منقطع کو حسن کہنا ان کے ہاں مشہور و معروف بات ہے، چنانچہ ان کے فقہائے تصریح کی ہے کہ زرارہ کی روایت مفسد حج کے بارے میں جبکہ اس کی قضا کی جائے حسن ہے، حالانکہ وہ روایت منقطع ہے اور یہ واقعہ ان کی احادیث میں بے شمار جگہ ہے،

پھر یہ حسن کا اطلاق ان لوگوں کی روایتوں پر بھی کرتے ہیں جو تعریف سے یاد نہیں کئے گئے مثلاً ابن مطہر کہتا ہے، طَرِیْقُ الْفَقِیْہِ اِلٰی مُنْذِرِ بْنِ جَبْرٍ حَسَنٌ (کہ فقیہ کا سلسلہ سند منذر بن جبر تک حسن ہے) حالانکہ منذر بن جبر کو اس فرقے میں سے کسی نے بھی تعریف سے یاد نہیں کیا یہی حال فقیہ کے سلسلہ سند کا ادریس تک ہے،

یہ واقفیوں کی روایت کو بھی حسن کہتے ہیں حالانکہ اس کا امامی نہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے جیسے فقیہ کا سلسلہ سند سماعہ بن مہران تک جو واقفی تھا

(۳) حدیث موثق :- موثق جس کو قوی بھی کہتے ہیں کی تعریف یوں کرتے ہیں مَا دَخَلَ فِیْ طَرِیْقِہٖ مَنْ نَصَّ الْاَصْحَابُ عَلٰی تَوْثِیْقِہٖ مَعَ فَسَادِ عَقِیْدَتِہٖ مَعَ سَلَامَۃِ بَاقِی الطَّرِیْقِ عَنِ الضُّعْفِ (موثق وہ حدیث ہے جس کے سلسلہ سند میں وہ راوی ہے جس کی توثیق علمائے بالصراحت الالفاظ کی ہو اور اس کے عقیدہ میں خرابی ہو مگر باقی سلسلہ سند ضعف سے پاک ہو) اس میں بھی ان کو خبط ہو گیا ہے کہ انہوں نے سکونی کی روایت کو جو اس نے ابی عبداللہ

سے کی ہے اور انہوں امیرالمومنین سے موثق کہا ہے، حالانکہ ان کے فرقہ کے نزدیک وہ بالاجماع ضعیف ہے،
اسی طرح نوح بن دراج، ناجیہ بن عمارہ صیداوی اور احمد بن عبداللہ جعفر حمیری کی روایات پر قوی کا اطلاق کیا ہے۔ حالانکہ یہ سب امامیہ ہیں نہ ممدوح نہ مذموم۔

(۴) حدیث ضعیف :- حدیث ضعیف کی تعریف ان کے ہاں یوں ہے، مَا اشْتَمَلَ طَرِيقُهُ عَلَى مَجْرُوْحٍ بِالْفِسْقِ وَنَحْوِهِ اَوْ مَجْهُوْلِ الْحَالِ ۔ (کہ جس سند میں ایسا راوی ہو جو فسق یا اس جیسے کسی عیب سے متہم ہو یا مجہول الحال ہو)

صحیح پر عمل :- ان کے ہاں حدیث صحیح پر عمل بلا خوف واجب ہے۔ حالانکہ یہ خود اپنے خیال میں ایک روایت کو صحیح کہتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ شاذ ہے اگرچہ دوسری صحیح روایات سے اس کی تائید ہوتی ہو مثلاً سعد بن ابی خلف کی روایت ابی الحسن الکاظم علیہ السلام سے ان الفاظ کے ساتھ، قَالَ سَأَلْتُهُ عَنْ بَنَاتِ الْاِبْنَةِ وَجَدَّةٍ فَقَالَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسُ وَالْبَاقِيْ لِبَنَاتِ الْاِبْنَةِ راوی کہتا ہے میں نے آپ سے نواسیوں اور دادی کے حصے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا دادی کے لئے چھٹا حصہ ہے اور باقی نواسیوں کے لئے ہے) یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح ہے،

پھر امامیہ کی ایک بڑی جماعت نے اس کی تائید میں مختلف طرق سے روایات نقل کی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جس کا راوی علی بن حسین رقاط ہے اس کا سلسلہ ابی عبداللہ تک پہنچایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں قَالَ اَلْجَدَّةُ لَهَا السُّدُسُ مَعَ اِبْنَتِهَا وَاِبْنَةِ اِبْنَتِهَا) فرمایا کہ دادی کا چھٹا حصہ ہے بیٹی اور نواسی کے ساتھ)

اور ایک وہ روایت ہے جو زرارہ نے ابی عبداللہ سے بایں الفاظ بیان کی ہے قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَى الْجَدَّةَ السُّدُسَ وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا اللّٰهُ شَيْئًا وَهٰذَا الْخَبَرُ مُوَثَّقٌ (فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا۔ اور یہ خبر موثق ہے)

ایک روایت وہ ہے جو اسحاق بن عمار نے ماں باپ اور نانی کے بارے میں ابی عبداللہ سے بایں الفاظ روایت کی ہے، قَالَ لِلْاُمِّ السُّدُسُ وَلِلْجَدَّةِ السُّدُسُ، وَمَا بَقِيَ وَهُوَ الثُّلُثَانِ لِلْاَبِ (فرمایا ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے اور دادی کے لئے چھٹا حصہ ہے اور باقی جو دو ثلث ہوگا وہ باپ کے لئے ہے،

حدیث حسن پر عمل :- حدیث حسن پر عمل کرنے کے بارے میں بھی یہ باہم مختلف الرائے ہیں، بعض اس پر صحیح کی طرح مطلقاً عمل واجب قرار دیتے ہیں، چنانچہ شیخ الطائفہ کا یہی مذہب ہے بعض نے اس کو بالکل منع کیا ہے اور بیشتر لوگوں نے یہی مذہب اختیار کیا ہے بعض تفصیل کے قائل ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ حدیث کا مضمون اصحاب میں مشہور ہو تو اس پر عمل واجب ہے، ورنہ نہیں اور یہ حدیث موثق اور ضعیف کو بھی اس میں داخل کرتے ہیں فخرالدین بن جمال الدین بن سطر نے یہی مسلک لکھا ہے اور معتبر میں اس کی تصریح کی ہے پھر اس کا شاگرد شیخ مقتول محمد بن کلی اسی کے نقش قدم پر چلا ہے اور ذکری میں اس کی تصریح کی ہے!

حدیث موثق پر عمل :- ان کے اکثر علماء نے موثق پر عمل جائز نہیں رکھا، باوجودیکہ ابن بکر اور ابن فضال کی روایات کو صحیح مانتے ہیں۔ اور واجب العمل بھی جیسا کہ پہلے گزرا اور فخرالدین اور اس کا شاگرد اس پر بھی عمل کو واجب العمل کہتے ہیں، مگر ان شرطوں کے ساتھ کہ شہرت سے اس کو تقویت مل چکی ہو یا ایک ہی جیسے یا قریب قریب الفاظ سے

وہ روایت رواج میں آگئی ہو اور اکثر و بیشتر کتب میں اس نے جگہ بھی پالی ہو اور علماء نے اسی روایت کے مضمون پہ فتوے بھی صادر کیئے ہوں۔

پس اس لحاظ سے تو اہل سنت کی اکثر احادیث جو ان کی کتابوں میں ثبت ہیں اور ان کے اندر شہرت یافتہ اور ان کے علماء کے نزدیک مفتی بہ ہوں واجب العمل قرار پائے گی۔

حدیث ضعیف پہ عمل ۱۱۔ ان کے اصحاف نے ضعیف روایت پر بھی عمل جائز قرار دیا ہے اگر وہ مشہور ہو جائے، بلکہ شیخ الطائفہ نے تو فاسقوں کی روایات کو بھی قابل عمل بتایا ہے اور اس میں شہرت کی بھی قید نہیں لگائی اسی طرح کلینی اس شخص کی روایت کو بھی قابل عمل بتاتا ہے جو صرف ائمہ کے اصحاب میں سے ہو گو وہ ان کی امامت کا منکر ہی کیوں نہ ہو حالانکہ ایسا شخص ان کے نزدیک کافر ہے خصوصًا جب کہ امام نے اس کو دعوت دی اور اس نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا ہو،

پھر یہاں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ اکثر علمائے شیعہ زمانہ ماسبق میں اپنے اصحاب کی روایات پر ان کو جانچے پرکھے بغیر عمل کرتے رہے ہیں، رواۃ کے اچھے برے کی ان میں تمیز ہی نہ تھی اس لیئے رجال کے حالات یا ان کی اچھائی برائی میں ان کے پاس کوئی کتاب ہی نہ تھی۔ اور عرصہ دراز تک یہی حال رہا پھر کہیں جا کر ۴۰۰ھ کے لگ بھگ کسی نے اسماء رجال اور ان کے حالات میں کتاب کیا مختصر سا رسالہ لکھا۔ اس صورت حال سے ناظر کی حیرت اور تشویش اور بھی بڑھی کیونکہ وہ جرح و تعدیل میں متعارض احادیث تو بیان کرتا تھا لیکن ایک کو دوسرے پہ ترجیح دینے سے قاصر و عاجز رہتا تھا تو گویا تب بھی رجال کے حالات پر اشتباہ کا پردہ پڑا ہی رہا۔

پھر غضائری نے ضعفاء پہ کچھ گفتگو کی اس کے بعد نجاشی اور ابو جعفر طوسی نے جرح و تعدیل میں کتابیں لکھیں اور جمال الدین بن طاؤس ابن مطہر تقی الدین بن داؤد نے بھی اس سلسلہ میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے لیکن سب ہی نے تعریف و مذمت کے ٹکراؤ اور تضاد کو دور کرنے میں غفلت اور سستی سے کام لیا اور کسی قوی دلیل سے ایک کو دوسرے پہ ترجیح دینے سے قاصر رہے۔

اسی لئے صاحب درایہ نے انصاف سے کام لیتے ہوئے جرح و تعدیل کے معاملہ میں ان لوگوں کی تقلید سے قطعی رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر جگہ وہ ایسے فرد کی تعدیل کر جاتے ہیں جو تعدیل کے بالکل بھی قابل نہیں ہوتا اور اس بات کا پتہ ان کی کتب اسماء الرجال کے مطالعہ سے خصوصًا خلاصہ اول سے جو سارے ہی دفاتر کا خلاصہ ہے چلتا ہے، ان حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ خود ان پہ ہی ان کے رجال کے حالات نہ کھل سکے اور اتنے دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے باوجود ان سے اشتباہ کا پردہ نہ اٹھ سکا۔

اور پھر یہ ستم کیا کہ ان علماء رجال نے راویوں کے ناموں کو بدل ڈالا جس کی وجہ سے حدیث میں بھی اشتباہ پیدا ہو گیا مثلاً ابونصیر کو ابوبصیر اور مراجم کو مزاحم لکھ مارا، پس اس وجہ سے ان کے نزدیک مقبول الروایت اور غیر مقبول الروایت آپس میں گڈمڈ ہو گئیں۔ اور تمیز صحیح و غلط کی صورت نہ رہی،

ناموں کے تبدیلی میں ابن مطہر سب کا گرو گھنٹال ہے، اس نے بہت سے ناموں کو بدل ڈالا ہمارے اس قول کی صداقت کی گواہی اگر کسی کو مطلوب ہو تو وہ ابن مطہر کا خلاصہ ایک طرف اور ایضاح الاشتباہ کو دوسری

طرف رکھنے پھر دونوں کا تقابلی مطالعہ کرتا جائے اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھتا جائے،

اس بے ربطی اور گڑبڑ پر مطلع ہو کر تقی الدین بن داؤد نے ہر غلطی پکڑی اور اپنے خیال کے مطابق اسکی تصحیح بھی کی مگر پھر بھی ناقابل گرفت مقامات کی کافی تعداد جوں کی توں رہی ؎ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم کا معاملہ ہے بات دراصل یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے محدثین نے حد درجہ غفلت اور سستی برتی اور جیسی توجہ اس فن کی طرف دینی چاہیئے تھی نہ رہی۔ (ہمارا خیال ہے کہ یہ غفلت دانستہ ہے کیونکہ اگر اسماء الرجال کا ذخیرہ صحیح طور پر مرتب ہو جاتا تو کتنی صحیح روایات ان کے ہاتھ آتیں، اور پھر اس جعلسازی کے کارخانہ کا کیا بنتا۔ اس کو چلانے کے لئے نام راوی کہاں سے میسر آتا؟ ن)

متفرق اور متفق کی تمیز کا رواج ان کے ہاں تھا ہی نہیں اکثر مرتبہ راوی کا اپنے نام اور باپ کے نام کے ساتھ کسی اور راوی سے اشتراک ہو جاتا ہے تو ان کے محدثین انہی مشترک ناموں کو کسی علامت سے ان میں تمیز کے بغیر روایت میں ذکر کر جاتے ہیں، اور اس طرح ثقہ اور غیر ثقہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتے اور مقبول الروایت و غیر مقبول الروایت ایک دوسرے کے لباس میں نمودار ہوتی ہیں،

مثلاً ان کے تمام محدثین محمد بن قیس سے روایت کرتے ہیں حالانکہ یہ نام چار آدمیوں میں مشترک ہے ان میں سے دو محمد بن قیس الاسدی جس کی کنیت ابی نصر ہے اور محمد بن قیس البجلی جس کی کنیت ابی عبد اللہ ہے ثقہ ہیں تیسرا محمد بن قیس الاسدی مولی بنی نصر ممدوح غیر موثق ہے، چوتھا محمد بن قیس جسکی کنیت ابو احمد ہے بہت ہی ضعیف ہے ابن بابویہ اسی آخری راوی سے بہت روایات بیان کرتا ہے اور ان کو بغیر تمیز کے یوں ہی مطلق چھوڑ جاتا ہے۔ اس لئے لوگوں کو لامحالہ دھوکا لگتا ہے اس قسم کی غفلت اور سستی میں شیخ الطائفہ سب کا سرگروہ ہے، اور دوسرے بھی اس کی تقلید میں اس لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ان کی روایت خود ان کے ہاں قابل اعتماد نہیں رہیں کبھی ایک روایت موثق آتی ہے تو اس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ وہ موثق ہے جس طرح سکونی نے ابی عبد اللہ سے روایت کی اور کہا ہے، قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ علیہ السلام بَعَثَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ عَلَیْہِ وسلم فَقَالَ یَا عَلِیُّ لَا تُقَاتِلَنَّ اَحَدًا حَتّٰی تَدْعُوْہُ وَاَیْمُ اللّٰہِ لَاَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْکَ رَجُلًا خَیْرٌ لَّکَ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ وَغَرَبَتْ وَلَکَ وَلَاؤُہٗ یَا عَلِیُّ امیر المومنین نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرما کر بھیجا کہ اے علی جب تک تم اسلام کی دعوت نہ دو کسی سے نہ لڑو اللہ کی قسم اگر ایک آدمی بھی تیرے ذریعہ ہدایت پالے تو وہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن پر آفتاب طلوع و غروب ہوتا ہے اور اے علی اس کی ولا تیرے ہی لئے ہے،

پس اس روایت پر اس کے موثق ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کرتے اور حدیث ضعیف پر جو ان کے ہاں بالاتفاق درجہ موثق سے باعتبار درجہ گری ہوئی ہے عمل کرتے ہیں اسکی یہ مثال ہے، رَوٰی عُبَیْدُ بْنُ زُرَارَۃَ عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنِ الصَّبِیِّ یَتَزَوَّجُ الصَّبِیَّۃَ ھَلْ یَتَوَارَثَانِ فَقَالَ نَعَمْ اِذَا کَانَ اَبَوَاھُمَا زَوَّجَھُمَا۔

عبید بن زرارہ نے ابی عبد اللہ سے روایت کی کہ آپ سے اس بچہ کے بارے میں جس نے ایک بچی سے شادی کر لی ہو یوں پوچھا گیا کہ کیا وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر ان کے باپوں نے ان دونوں کا نکاح کیا ہو،

اس فرقہ کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس سند میں ایک راوی قاسم بن سلیمان ہے جو مجہول العدالیت ہے اس کے باوجود اس پر سب نے عمل کیا،

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں شیخ الطائفہ نے بہت آزادی دی ہے اور حدیث ضعیف پر عمل نہ صرف جائز بنایا ہے بلکہ واجب قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں عمر و بن حنظلہ کی حدیث پیش کی ہے کہ باوجود اس کے وہ حدیث ضعیف ہے مگر سب نے عمل کیا ہے،

ابن حنظلہ کی روایت کا ضعف اس لئے ہے کہ اس میں محمد بن عیسیٰ اور داؤد بن حصین دونوں بہت ضعیف ہیں، مگر ابن حنظلہ نے تعدیل و جرح کسی پر کوئی نص نہیں کی۔ ایسی حدیث کو مقبول المتن کہتے ہیں اور اس قسم کی احادیث ان کے ہاں اتنی ہیں کہ حد و شمار سے باہر، پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی آزادی اور اتنی گنجائش کے باوجود حدیث موثق پر عمل نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے،

اور اس سے بڑھ کر یہ بات باعث تعجب ہے کہ کلینی میں ابو عبد اللہ سے مراسیل پر عمل کرنے کی صحیح روایت موجود ہے جو انشاء اللہ ہم نقل کریں گے اور خود انہوں نے صحیح و حسن میں اتصال سند کی شرط لگائی ہے اس کے باوجود بھی ابن ابی عمیر کی مراسیل پر عمل واجب کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ دعوی بھی کرتے ہیں کہ ابن ابی عمیر ثقات کے علاوہ کسی سے مراسیل روایت نہیں کرتا مگر ان کا یہ دعوی بلا دلیل ہے اسی بنا پر بشری شرح ذکریٰ کے مصنف نے اس معاملہ میں جمہور سے نزاع کیا ہے،

علی ہذا النظیر ہی اور عبد اللہ بن مغیرہ کی مراسیل کو بھی واجب العمل کہتے ہیں اور ان دونوں کا جو حال ہے وہ عنقریب ظاہر ہو گا،

شیخ الطائفہ اور متاخرین میں سے اس کے شاگردوں نے سند کے اضطراب کو حدیث پر عمل کرنے میں مانع نہیں سمجھا ہے۔ اضطراب سند کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی راوی کی روایت الفاظ و سند حدیث میں مختلف ہو ایک مرتبہ ایک طریقہ سے روایت کرے اور دوسری مرتبہ دوسرے طریقہ پر بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی پر کسی کو ترجیح دی جائے،

حالانکہ عقلاً بھی اضطراب عمل سے مانع ہوتا ہے کہ دو مخالف اور باہم متضاد باتوں پر بیک وقت کسی طرح اور کیونکر عمل کیا جا سکتا ہے اور سبب ترجیح کے بغیر ایک کو دوسری پر ترجیح کس طرح دی جا سکتی ہے،

ان کے اصولیوں نے بھی سند کے اضطراب کو مانع عمل کہا ہے، اور ان کے محدثین نے اس پر اتفاق بھی کیا ہے کہ جب دو حدیثیں باہم مختلف ہوں تو ان میں وہ حدیث جو ائمہ کے خط کی ہو اس حدیث کے لحاظ سے قابل ترجیح ہے جو سند صحیح سے مروی ہو چنانچہ ابن بابویہ نے اس پر نص کی ہے اور خط پر عمل کرنا اس کے خلاف ہے، جس کی کلینی نے صحیح سند سے روایت کی ہے،

اور پھر یہ بات ثابت کرنا بھی تو مشکل اور دشوار ہے کہ یہ خط امام کا ہی ہے اور احکام شرعیہ کو جن پر دین و ایمان کا مدار ہے اس قسم کی مشتبہ شہادت سے ثابت کرنا عقل سے بعید اور دیانت سے دور ہے،

اور غالی شیعوں کی ایک بڑی جماعت نے تو احادیث گھڑنے کو جائز قرار دیا ہے،

چنانچہ ابوالخطاب یونس طبیان اور یزید بن صائغ نے اپنے مذہب کی تائید میں بے شمار احادیث گھڑ لیں صاحب تحفۃ القاصدین فی اصلاح المحدثین نے اس کو بڑے واضح اور صاف الفاظ میں لکھا ہے،

ان میں سے ایک نبان مہدی ہے جو امامیہ کے شیوخ میں سے ہے اور ان کا مجتہد ہے مگر پرلے درجہ کا بڑا گہرا زندیق ہے اور دوسرا مغیرہ بن سعید سنجی جو کوفہ کا رہنے والا اور جھوٹا جادوگر ہے یہ دونوں حدیث گھڑنے میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں ان دونوں کو خالد بن عبداللہ القسری نے قتل کر کے جلا دیا۔ ان کی عادت تھی کہ جب کسی معاملہ میں ان کی کوئی رائے ہوتی تو اسی کے موافق حدیث گھڑ لیتے،

یہ لوگ عبداللہ بن میمون قداح سے بھی اپنی کتابوں میں بہت سی روایات لاتے ہیں، صاحب معالم الاصول تو ابتداء بطور تبرک اس کی چند حدیثوں کو اپنے ہاں لایا ہے، حالانکہ گذشتہ اوراق میں معلوم ہو چکا ہے کہ بڑا گھاگ زندیق اور مجسمہ کذاب تھا علاوہ ازیں ان رجال میں باطنیہ، اسماعیلیہ اور قرامطہ بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں،

اگر ان کے مقتداؤں اور پیشواؤں کے تفصیلی حالات ضبط تحریر میں لائے جائیں تو طویل و ضخیم دفتر درکار ہوگا یہاں بطور نمونہ تھوڑا سا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے،

قاضی نور اللہ شوستری زرارہ بن اعین شیبانی کوفی کے حالات میزان ذہبی سے نقل کرتا ہے، مگر اس پر سکوت اختیار کر لیتا ہے۔ (یہاں صرف ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے،

زرارہ بن اعین شیبانی کوفی برادر حمران رافضی تھا عقیلی نے جو ضعفا میں سے ہے کہا کہ مجھ سے یحییٰ بن اسمٰعیل نے حدیث بیان کی اس نے یزید بن خالد ثقفی سے اس نے عبداللہ بن خالد صیدی سے اس نے ابی صباح سے اس نے زرارہ بن اعین سے اس نے محمد بن علی بن عباس سے کہ فرمایا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اے علی مجھ کو کوئی تیرے سوا غسل نہ دے"

" حدیث بیان کی مجھ سے یحییٰ نے اس سے اس کے باپ نے اس سے سعد بن منصور نے اس سے ابن السمان نے وہ کہتا ہے کہ جب میں حج کو گیا تو میری ملاقات زرارہ بن اعین سے قادسیہ میں ہوئی وہ مجھ سے کہنے لگا کہ مجھے تجھ سے بہت ضروری کام ہے اور اس کی بڑی اہمیت جتائی۔ میں نے پوچھا وہ کام کیا ہے تو کہنے لگا کہ جب تیری ملاقات جعفر بن محمد سے ہو تو پہلے تو ان کو میرا اسلام کہنا پھر میری جانب سے پوچھنا کہ میں دوزخیوں میں سے ہوں یا جنتیوں میں سے میں اس کی بات پر حیران ہوا اور اس سے کہا وہ کیسے بتا سکتے ہیں تو کہنے لگا کہ وہ اس کو جانتے ہیں پھر جب میں جعفر بن محمد سے ملا تو ان کو یہ سارا قصہ سنایا تو آپ نے جواب دیا کہ وہ دوزخیوں میں سے ہے میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا تو کہا کہ اس کی بد عقیدگی سے!"

قاضی نور اللہ شوستری نے لکھا ہے کہ زرارہ کے چار بھائی تھے (۱) حمران (۲) عبدالملک (۳) بکیر۔ (۴) عبدالرحمٰن، اور دو بیٹے حسن اور حسین۔ حمران کے دو بیٹے تھے حمزہ اور محمد عبدالملک کا صرف ایک بیٹا حریش تھا، بکیر کے پانچ بیٹے عبداللہ جہم، عبدالحمید عبدالاعلیٰ اور عمر و قاضی کے قول کے مطابق یہ ان سب کا وہی عقیدہ تھا جو زرارہ کا تھا،

پھر قاضی نور اللہ نے عضائری سے جابر بن جعفر بن یزید جعفی کوفی کا حال نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ جعفر خود تو ثقہ ہے لیکن اس کی اکثر روایات جو اس سے نقل ہوئی ہیں ضعیف ہیں، قاضی نے اس کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے

حضرت امام باقر رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد لوگوں پر اس راز کا انکشاف کیا کہ امام موصوف نے اپنی زندگی میں مجھے دو کتابیں دی تھیں، ایک کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی تھی کہ بنو امیہ کے زمانے تک تو اس کی روایت نہ کرنا اگر تو نے اس کے خلاف کیا تو تجھ پر خدا کی لعنت ہو، البتہ ان کے عہد کے بعد اس کی روایت کر سکتا ہے دوسری کتاب کے متعلق ارشاد فرمایا کہ تو اس کی روایت کسی سے بھی قطعاً نہ کرنا میں نے اس بھید کو حتی الامکان چھپایا مگر جب تاب برداشت نہ پاسکا اور ضبط راز کے سبب میرے پیٹ میں مروڑ اٹھا تو میں نے ایسے بیابان کا رخ کیا جہاں انسان کا گزر نہ تھا وہاں میں نے اس کتاب کی روایت کی تو مجھے اس مروڑ سے چھٹکارا ملا۔ اب میں اس کتاب کو لوگوں پر ظاہر کرتا ہوں جس کی روایت کی تو مجھے اجازت مل چکی ہے۔ قاضی یہاں یہ بھی لکھتا ہے کہ ولید کے مارے جانے کے بعد ابھی بنی امیہ کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا کہ جابر نے مسجد میں جا کر اس کی روایت کرنی شروع کر دی یہ حرکت چونکہ امام کی ہدایت و حکم کے خلاف تھی اس لئے وہ مرد خدائی لعنت کا شکار رہا ہوگا،

اب جب گفتگو ان کے رجال کے حالات تک آپہنچی ہے تو ضروری معلوم ہوا کہ ان کے بعض راویوں کے حالات نقل کر دیئے جائیں،

اول تو یہ بات جان لینی چاہئیے کہ شیعوں کے ہر فرقہ کا یہ دعوی ہے کہ اس کے پاس روایات کا جو ذخیرہ ہے وہ سب اہل بیت سے لیا گیا ہے، اور نہایت صحیح و معتبر ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ من گھڑت اور بے اصل ہے اور ان کا آپس میں ایک دوسرے کو جھٹلانے کا یہ رویہ ابتدا ہی سے ہے اور اب تک جاری ہے اس کا ایک ہی نتیجہ ہے کہ ان سب ہی سے اعتبار و اعتماد اٹھ گیا ہے دوسری طرف زیدیہ، اسماعیلیہ اور امامیہ جو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور باہم یک دگر تکذیب کرتے رہے ہیں ان کے قصے مشہور و معروف ہیں، اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ امامیہ کے اسلاف اور ان کے مقتدا جو ان کے محدثین سندوں کی آخری کڑیاں ہیں، مثلاً ہشام بن حکم، ہشام بن سالم جوالیقی اور صاحب الطاق یہ خود آپس میں ایک دوسرے کی تکذیب کرتے ایک دوسرے کی روایات کو جو ہر سہ ائمہ امام سجاد، امام باقر اور امام صادق رحمہم اللہ سے مروی تھیں غلط ثابت کیا کرتے، اور ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ہشام بن حکم نے جوالیقی اور صاحب الطاق کے رد میں ایک کتاب لکھی، جس کا نجاشی نے بھی ذکر کیا ہے، لہذا ان سب کی احادیث درجۂ اعتبار سے ساقط ہو گئیں اور امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے شیعوں کا حال پہلے گزر ہی چکا کہ سب کے سب گناہ کبیرہ کے مرتکب تھے اور آخر تک امام وقت کی نافرمانی پر جمے رہے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو رنج پہنچاتے رہے اور آنجناب بھی ان کو جھوٹا قرار دیتے رہے اور ان کے قول کی ہرگز تصدیق نہ فرماتے۔ ان میں بعض نے جناب حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی امداد سے کنارہ کشی ہی نہیں کی جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور جناب یزید سے خفیہ خط و کتابت رکھی اور یوں دین فروشی کر کے دنیا کے خریدار بنے اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے اماموں کے ساتھ ایسی نازیبا اور ناشائستہ حرکات کی ہوں ان سے دین لینے اسلام کا پیشوا بنانے اور ان کی روایات کو وقعت کی نظر سے دیکھنے کا کیا جواز رہ جاتا اور کیا وجہ بیان کی جا سکتی،

پھر ان کا آپس کا اختلاف و تعارض اور ان کی احادیث میں اضطراب اس درجہ کا ہے جس کی کوئی حد ہی نہیں چنانچہ من لا یحضرہ الفقیہ اور استبصار کے مطالعہ سے اس بات کا پورا انکشاف ہو جاتا ہے غرض ہر عقلمند اس قدر اختلاف، تعارض

اور اضطراب کے ہوتے ہوئے کسی جانب کی حدیث پر بھی عمل پیرا نہیں ہو سکتا،
خود ان کے شیخ الطائفہ بھی اس امر کے اعتراف پر مجبور ہوئے کہ جن احادیث سے وہ دلیل لاتے ہیں ان کی سندوں میں ضعیف، نامعلوم الحال، جھوٹے اور حدیث گھڑنے والے موجود ہیں،
ان سب واقعات کے ذہن نشین ہو جانے کے بعد اب ذرا تفصیل کی طرف توجہ دینی چاہئیے اور ایں خانہ ہمہ آفتاب کی تصویر دیکھنی چاہئیے،
جعفر بن محمد بن عیسیٰ ابن شاپور قواریری جسکی کنیت ابن عبداللہ ہے، جھوٹا اور وضاع حدیث ہے پھر بھی ان کے ثقہ اس کی روایات قبول کرتے اور اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں۔
قَالَ النَّجَاشِیُّ کَانَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ ضَعِیْفًا فِی الْحَدِیْثِ وَقَالَ اَحْمَدُ بْنُ حُسَیْنٍ یَضَعُ الْحَدِیْثَ وَضَّاعًا وَیُرْوِیْ عَنِ الْمَجَاهِیْلِ وَسَمِعْتُ مَنْ قَالَ فَاسِدُ الْمَذْهَبِ وَقَدْ رَوٰی عَنْهُ اَبُوْ جَعْفَرٍ الطُّوْسِیُّ شَیْخُ الطَّائِفَةِ وَاعْتَمَدَ عَلَیْهِ
(نجاشی کہتا ہے کہ ابوعبداللہ حدیث میں ضعیف ہے، اور احمد بن حسین نے کہا ہے کہ وہ حدیثیں گھڑا کرتا ہے، اور اس میں خوب مشاق ہے، نامعلوم الحال راویوں سے روایات بیان کرتا ہے میں نے بعض کو یہ کہتے سنا کہ وہ بدمذہب ہے حالانکہ شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی نے اس سے روایت لی اور اس پر اعتماد کیا)،
اسی طرح حسن بن عباس بن حریش رازی جس نے جعفر ثانی سے روایت کی ہے بہت ضعیف ہے اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ، اسی کی تصنیف ہے جس میں مضطرب الالفاظ حدیثوں کی روایات لایا ہے، اس کے باوجود بھی کلینی نے اس سے چند حدیثوں کی روایت کی ہے جب کہ کلینی کی کتاب ان کے ہاں صحیح ترین شمار ہوتی ہے،
حدیثیں گھڑنے والا علی بن حسان بھی ہے، قَالَ النَّجَاشِیُّ ضَعِیْفٌ جِدًّا ذَکَرَهٗ بَعْضُ اَصْحَابِنَا فِی الْغُلَاةِ فَاسِدُ الْاِعْتِقَادِ لَهٗ کِتَابُ تَفْسِیْرِ الْبَاطِنِ تَخْلِیْطٌ کُلُّهٗ، (نجاشی نے کہا وہ بہت ضعیف ہے۔ ہمارے بعض نے اس کو بدعقیدہ غلاۃ میں سے بتایا ہے اس کی تفسیر میں ایک کتاب تفسیر الباطن کے نام سے مشہور ہے جو از سر تا پا بے ربط اور بے جوڑ ہے، حالانکہ اسی سے کلینی نے اپنی صحیح میں روایت لی ہے،
ایک ایسا ہی شخص محمد بن عیسیٰ ہے جس کے متعلق نصر بن صباح نے کہا ہے وہ جھوٹا تھا حالانکہ ابوعمرو کشی اور دوسروں نے اس سے روایت بیان کی ہے،
اور ایک نام عبدالرحمٰن بن کثیر ہاشمی کا ہے اس کے بارے میں نجاشی کہتا ہے کہ ہمارے اصحاب کے اس پہ ناک بھوں چڑھائی ہے کہ یہ تو حدیثیں گھڑتا ہے پھر بھی ان کے ثقہ حضرات اس سے روایت کرتے ہیں مثلاً حسین بن علی بن فضال وغیرہ اور کلینی ابن بابویہ اور محمد بن حسن طوسی نے بھی اس کی روایات قبول کی ہیں ہشامین اور ان کے ہم عمروں کے حالات میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم اور صورت مانتے ہیں ائمہ پر صاف اور کھلا بہتان باندھتے ہیں چنانچہ حضرت امام علی رضا رحمۃ اللہ علیہ نے اس افتراء اور بہتان پر گواہی بھی دی ہے پھر بھی ان کے محدثین کا سارا دارومدار انہیں پر ہے،
ان کے وہ راوی جو مجہول اور ضعیف ہیں اور فقہی مسائل میں یہ جن سے حوالے اور حجت لاتے ہیں بے حد و بے شمار ہیں، ان دونوں میں سے نمونہ کے طور پر ہم چند نام گناتے ہیں، ان میں سے ضعیف یہ ہیں،

شیعوں کے ضعیف راوی :- ابراہیم بن صالح انماطی، ابو اسحاق احسن بن سہل نوفلی، حسن بن راشد طفاوی اسمٰعیل بن عمران بن ابا ہیل لیثی، اسمٰعیل بن یسار ہاشمی حسین بن احمد منقری، اور جابر بن سعید ختعمی یہ ضعیف کے ساتھ فاسد بھی ہے اس سے کلینی نے روایت لی ہے عثمان بن عیسیٰ اس سے شیخ الطائفہ اور دوسروں نے روایت کی عمر بن شمر اس سے ایک جماعت نے روایت کی ہے، جیسے طوسی وغیرہ سہل بن زیاد اس سے ابو جعفر نے بھی روایت کی ہے اور اس کی روایت پر اعتماد کیا ہے، اس کے باوجود کہ اس کے ضعف پر سب نے اتفاق بھی کیا ہے ابراہیم بن عمر و یمانی اور داؤد بن یبرقی جو ضعیف اور فاسد ہے، اس سے طوسی نے تہذیب اور استبصار میں اور دوسروں نے بھی روایت کی ہے صالح بن حماد امیر جس کی کنیت ابو خدیجہ ہے معاویہ بن طیرہ عابد احمسی خالد بن نجیح محمد بن قیس ابو احمد محمد بن عیسیٰ داؤد بن حصین علی بن حمزہ، رقبہ بن مصقلہ، حسین بن یزید الہرتی اسمٰعیل بن زیاد سکونی، واہب بن واہب اور حسین بن عبید، اور ان جیسے بے شمار دوسرے! کہ جن کے ضعف اور برائی پر ان کے تمام علمائے حدیث اور خصوصاً علمائے جرح و تعدیل کا اتفاق ہے، مثلاً نجاشی، غضائری، تقی الدین بن داؤد سبکی اور حلی جیسا کہ اس نے خلاصہ میں ذکر کیا ہے اور اس سب کچھ کے باوجود ان کے محدثین نے ان ہی راویوں کی روایتوں سے اپنی صحاح کا پیٹ بھرا ہے اور پھر ان کے فقہا ان ہی روایات سے استدلال کر کے اپنے فقہی مسائل ہی نہیں اعتقادات کو بھی ثابت کرتے ہیں،

شیعوں کے مجہول راوی :- اب رہے ان کے مجہول راوی تو ان کا شمار و حساب نہیں ہے مثلاً حسن بن ابان کہ اس کی حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے، حالانکہ ابن مطہر نے مختلف اور منتہی (کتابوں کے نام ہیں) اور شیخ مقتول نے دروس میں اس کی جہالت کی تصریح کی ہے، اسی طرح قاسم ابن سلیمان اور عمر و بن حنظلہ دونوں مجہول ہیں (کما مر) عمر بن رباح حسین بن علا اور ابن ابی العالیہ، تینوں مجہول الاسم بھی ہیں اور ان کی شخصیت بھی مجہول ہے، اور عباس بن عمر فقعی، فضل بن سکن، علی بن عقبہ بن قیس بن سمعان، ہاشم بن ابی عمار حسینی بشیر بن یسار الیساری موسیٰ بن جعفر فضل بن سکرہ زید الیمامی سعید بن زید عبد الرحمٰن بن ابی ہشام، بکار بن ابی بکر، فلیح بن زید، محمد بن سہیل، عبد اللہ بن یزید، غالب بن عثمان ابی حبیب الاسدی ابی سعید المکاری، ارکاز بن فرقد، حسن تفلسی، قاسم بن خزاز، صالح سعدی، علی بن دویلی، حسین بن علی بن ابراہیم، ابراہیم بن محمد حسن بن علی، اسحاق النحوی، عثمان بن عبد اللہ، عثمان بن عبد الملک، عیسیٰ بن عمر مولی الانصار، ربیع بن محمد سلمی، علی بن سعد السعدی، محمد بن یوسف بن ابراہیم، محمود بن میمون اور خضر بن سوید ابن جعفر بن کلاب،

پس یہ سب کے سب اور ان جیسے ان گنت راوی مجہول ہیں، مگر شیعوں کے شیوخ مثلاً علی بن ابراہیم اور اس کا بیٹا ابراہیم محمد یعقوب الکلینی، ابن بابویہ، ابی جعفر طوسی، اسکا استاذ ابی عبد اللہ ملقب بہ مفید نے اپنی کتابیں جنہیں یہ صحاح کہتے ہیں انہی مجہول الحال راویوں سے بھری ہیں جن کو ان کے مجتہدین نے واجب العمل قرار دیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ علم یقینی کو مفید ہیں، جیسا کہ مرتضیٰ طوسی اور حلی نے اس کی تصریح کی ہے،

اور حد درجہ تعجب و حیرت ہے کہ ان کے علمائے حدیث ایسے راویوں سے روایت کرتے ہیں جن کی تکذیب علی اسماء الرجال نے کی ہے۔ جیسے عبد اللہ بن سکان جو ابی عبد اللہ سے روایت کرتا ہے اس کی چند حدیثیں محمد بن یعقوب کافی میں، ابن بابویہ فقیہ میں، ابو جعفر تہذیب میں اور دوسرے اپنی کتابوں میں درج کرتے ہیں جب کہ نجاشی کہتا ہے کہ یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ اس نے ابی عبد اللہ سے کسی بھی چیز کی روایت کی ہو اور یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں

امامیہ میں خوب مشہور ہے، محمد بن عیسیٰ بھی اسی زمرے میں آتا ہے جو محمد بن محبوب اور دوسروں سے روایت کرتا ہے، ابو عمر کشی نے اس کے بارے میں کہا ہے نصر بن جاج کہتا ہے کہ محمد بن عیسیٰ محمد بن محبوب سے عمر میں اس قدر چھوٹا ہے کہ اس سے روایت کرنا قرین قیاس ہی نہیں، محمد بن عیسیٰ بن عبد یقطین بھی اسی قماش کا راوی ہے جس کے متعلق محمد بن بابویہ قمی نے ابن الولید سے یہ قول نقل کیا ہے۔ إنه قال ما انفرد به محمد بن عيسى من حديث يونس وكتبه لا يعتمد عليه۔ (ابن الولید نے کہا محمد بن عیسیٰ جو حدیث یونس سے روایت کرے اور وہ اس میں تنہا ہو، اس کو اگر وہ لکھ بھی لے تب بھی اس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے،

محمد بن احمد بن یحییٰ بن عمران الاشعری القمی، بھی اسی قماش کا ہے اس میں نجاشی اور دوسروں نے عیب لگایا ہے اور کہا ہے کہ وہ ضعیفوں سے روایت کرتا ہے، اور جس سے روایت کرتا ہے، اس کی اچھائی برائی سے سروکار نہیں رکھتا اور مراسیل پہ اعتماد رکھتا ہے،

پھر ان کے بعض معتبر راوی اسناد میں ارسال کرتے ہیں جیسے ابن ابی عمیر نظیری، اور عبداللہ بن مغیرہ، حالانکہ ان کے نزدیک ارسال کبیرہ گناہ ہے،

ابن یعقوب کلینی اور دوسرے علماء حدیث ابی عبداللہ رح سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا شاخ در شاخ جھوٹ کیا ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم سے کوئی شخص حدیث بیان کرے اور جب تم وہ حدیث بیان کرنے لگو تو جس نے تم سے کوئی حدیث بیان کی اس کا نام تو درمیان سے نکال دو اور اس شخص نے جس شخص سے وہ حدیث تمہیں سنائی تھی تم اس سے روایت کرنے لگو،

ان کے معتبر راویوں میں سے بہت سے وہ ہیں جو امام وقت کے منکر ہی نہ تھے۔ بلکہ ان کے خلاف دل میں دشمنی رکھتے تھے۔ اور اکثر امامیہ شیعوں کے نزدیک ان کا یہ بُرا عقیدہ پایہ ثبوت تک پہنچ چکا تھا، مثلاً واقفیہ میں سے حسن بن محمد سماعہ ابو محمد الکندی الصیرفی۔ یہ وقف کے معاملہ میں دل میں دشمنی اور تعصب رکھتا ہے، حسن بن محمد سعید ہاشم بن حیان المکاری ابو عبداللہ، حسین بن مہران بن محمد بن ابی نصر اسکونی، احمد بن محمد البطاحی الحیری جو طاہری کے لقب سے مشہور ہے، صفوان ابن یحییٰ ابی محمد البجلی، عثمان بن عیسیٰ ابی حمزہ العامری الرواسی، مولیٰ بنی رواس وغیرہ وغیرہ جارودیہ افطحیہ میں سے۔ مثلاً احمد بن محمد بن سعید سبیعی ہمدانی، حسن ابن علی بن فضال، عبداللہ بن بکیر بن اعین شیبانی، اور عمرو بن سعید ابی الحسن مدائینی اور ان جیسے دوسرے،

ان سب سے شیعوں کی حدیث کی صحیح کتابوں میں روایات موجود ہیں، شیخ مقتول نے ذکری میں یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت صادق نے عبداللہ بن مسکان کو اپنے پاس آنے سے رد کر دیا تھا۔ اور یہ پھر بھی ان سے روایت کرنے سے باز نہیں آتا۔

ابو جعفر طوسی عدہ میں لکھتا ہے، یعنی اعضائے بدنی سے سرزد شدہ بدکاریاں روایت کے قبول کرنے میں حارج نہیں،

اور اس کا تو کوئی جواز ہی نہیں کہ نصرانیوں تک سے ان لوگوں نے حدیث کی روایت کی اور اسے قبول کرتے اور ان کو اپنے ائمہ کا دوست سمجھتے ہیں مثلاً ذکریا بن ابراہیم نصرانی کہ اس سے طوسی اور دوسرے لوگوں نے

روایت کی ہے ۔

اور ایسا بھی ہے کہ ان کے علمائے حدیث اپنے اساتذہ کی کتابوں سے ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن کی نسبت امام کی طرف نہیں ہے مگر دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ان روایات کی نسبت امام ابو جعفر اور امام ابو عبد اللہ کی طرف ثابت ہے اور صحیح ، ہمارے اساتذہ نے اسے پردۂ خفا میں رکھا اور ائمہ کا نام ظاہر نہیں کیا اس لئے کہ اسوقت تقیہ کی ہوا زور پر تھی ، اب اساتذہ کے انتقال کے بعد جب یہ کتابیں ہمارے ہاتھ لگیں تو ہم کو قرائن سے پتہ لگا کہ یہ سب احادیث درحقیقت ائمہ کی ہیں ،

اب عقل و انصاف سے کام لے کر سوچا جائے اور بتایا جائے کہ ان حالات میں ان کی روایات پر اعتماد اور بھروسہ کہاں باقی رہا اس کی مثال وہ روایت ہے ، جس کو کلینی اپنے چند اصحاب سے اور وہ محمد بن خالد شنبولہ یا دوسروں سے نقل کرتا ہے چنانچہ ان کی اکثر روایات جن میں عن عن سے روایت ہو اسی قسم کی ہیں ،

مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی احادیث کا تقریباً آدھا ذخیرہ ایسے راویوں سے مروی ہے جو خود اپنی دروغگوئی کا اعتراف کر چکے ہیں ۔ اور یہ پھر بھی ان کو چیدہ اور ثقہ راویوں میں شمار کرتے ہیں ۔ مثلاً ابو بصیر ، کہ کلینی کا چوتھا حصہ اس کی روایتوں سے بھرا ہوا ہے ، کلینی نے خود اس کا یہ قول نقل کیا ہے " كُنْتُ أَسْمَعُ الْحَدِيْثَ مِنَ الصَّادِقِ وَأَرْوِيْهِ عَنْ أَبِيْهِ وَأَسْمَعُهُ عَنْ أَبِيْهِ وَأَرْوِيْهِ عَنْهُ " (میں ایک حدیث سنتا تو امام صادق سے تھا اور اس کی روایت ان کے بجائے ان کے والد سے کر دیتا ۔ اور سنتا تو ان کے والد سے تھا مگر روایت امام صادق سے کر دیتا) ۔

اور یہ ابو بصیر وہی تو ہے جس نے امام کے منع کرنے کے باوجود ان کے راز کو اس شد و مد سے پھیلایا اور شہرت دی کہ وہ شیعہ کتب تک میں جگہ پا گیا اور ان زبانوں پہ جاری ساری ہو گیا جو اس قابل نہ تھیں کہ ان پاک اسرار کو ادا کر سکیں ، ۔

" میں نے ابی عبد اللہ سے کہا کہ یہ بتائیے کہ قیامت کے دن مومن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے آپ نے فرمایا ہاں !
اور وہ تو قیامت سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں ! میں نے کہا وہ کب ؟ آپ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے الست بربکم فرمایا پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ مومن قیامت سے پہلے بھی سب کو دیکھتے ہیں اور کیا تو اس وقت سب کو نہیں دیکھ رہا ہے ، ابو بصیر نے کہا میں آپ پر قربان کیا یہ حدیث میں آپ سے روایت کر دوں آپ نے فرمایا نہیں ! "

اس کا لڑکا محمد امام کی نافرمانی میں اپنے والد کا خلف رشید بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے نکلا کلینی نے اس سے یہ روایت کی ہے ، " اَنَّهٗ قَالَ دَفَعَ اِلَيَّ اَبُو الْحَسَنِ مُصْحَفًا وَقَالَ لَا تَنْظُرْ فِيْهِ فَفَتَحْتُهٗ وَقَرَأْتُ فِيْهِ لَمْ يَكُنْ فَوَجَدْتُ فِيْهِ سَبْعِيْنَ رَجُلًا مِنْ قُرَيْشٍ بِاَسْمَائِهِمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِهِمْ " (اس نے کہا کہ مجھے ابو الحسن نے ایک قرآن دیا اور کہا کہ اس کو کھول کر نہ دیکھنا مگر میں نے اسے کھول لیا اور اس میں لم یکن سورۃ پڑھی تو میں نے اس میں قریش کے ستر آدمیوں کے نام مع ولدیت درج پائے) ،

پھر ایک بات اور بھی ہے جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کی کتابوں کی چھان بین کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی اکثر احادیث آحاد ہیں ، نہ متواتر اور مشہور ، اور وہ آحاد بھی ضعیف ، جن میں سے کچھ کو تو یہ صحیح سمجھتے ہیں

کچھ کو موثق اور حسن احادیث، خود ان کے نزدیک ضعیف ہیں،

گویا خود ان ہی کے خیال کے مطابق ان کی کتب میں صحیح و حسن حدیثیں نہیں ہیں ان کے صرف عقلی مفہومات ہیں خارج و ظاہر میں ان کا کوئی جواب نہیں ہے، چنانچہ یہی بات صاحب ہدایہ نے صراحت سے بیان کی ہے۔ چلئے یہ سب سہی مگر ان کی ضعیف اور موثق حدیثیں بھی تو اس قسم کی ہیں کہ آپس میں ایک دوسری سے متعارض اور مخالف ہیں اور ان کی اسناد و متون ہر دو میں اضطراب ہے،

شیخ ابو جعفر نے جس طریقے سے ان متعارض روایات کو جمع کرنے اور تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور پھر ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے وہ درحقیقت اہل تحقیق و اہل نظر کے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہے ہم اس میں سے صرف ایک نکتہ بطور نمونہ ذکر کرتے ہیں دوسرے مسائل اسی پر قیاس کر لئے جائیں،

ان کی اکثر روایات میں آتا ہے کہ گلاب کے پانی سے وضو جائز ہے، اور بہت سی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جائز نہیں ہے اس کے بارے میں شیخ ابو جعفر کہتا ہے کہ صحیح تو یہ ہے کہ وضو درست نہیں اور حسن روایات سے جواز معلوم ہوتا ہے، ان سے مراد عرق گلاب نہیں بلکہ وہ عام پانی مراد ہے جس میں کچھ پھول ڈال دیئے گئے ہوں"

لہٰذا ان مذکورہ اسباب سے ان کی روایات خود ان کے گمان کے مطابق نہ قابل حجت ہیں نہ لائق اعتماد پھر مخالفین کی کیا منہ سے کر مخالفت اور مقابلہ کرتے ہیں،

یہ حال تو ان ظاہر السند روایات کا تھا، جو ظاہر اور عالم وجود میں آئے ہوئے ائمہ ظاہرین سے مروی ہیں کہ جن کے وجود میں کسی نے شک نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ملاقاتیں کیں ان کو دیکھا اور ان سے ہمکلام ہوئے،

اب شیعوں کی ان روایات کا حال سنئے جو صاحب الزماں سے مروی ہیں، اول تو امامیہ کے نزدیک ان کی پیدائش ہی بالاتفاق ثابت نہیں، کیونکہ بعض ان کی پیدائش سے انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں امام حسن عسکری نے کوئی پس ماندہ نہیں چھوڑا۔ یہ منکرین جعفریہ ہیں اس لئے کہ وہ حسن بن علی عسکری کی وفات کے بعد جعفر بن علی الہادی کی امامت کے قائل ہیں، ایک طائفہ ان بزرگوار کے وجود کا تو البتہ قائل ہے مگر ان کے بقاء حیات سے منکر ہے اور کہتا ہے کہ وہ بچپن ہی میں وفات پا گئے، پھر جو ان کو بلوغ تک پہنچاتا ہے ان کے درمیان بھی مختلف الخیالی پائی جاتی ہے بعض کہتے ہیں کہ بحالت نماز اچانک انتقال فرما گئے بعض کہتے ہیں کہ کس وقت غائب ہوئے بعض ۲۵۶ھ بتاتے ہیں تو بعض دوسرے ۲۶۵ھ یا ۲۶۶ھ۔ پھر مکان غیبت کے بارے میں بہت اختلاف ہے ان کے ثقات مثلاً محمد بن یعقوب کلینی اور اس کے ہم خیال اکثر شیعہ متقدمین کہتے ہیں کہ ان کا مکان غیبت بجز خال خال شیعہ کے کوئی نہیں جانتا،

پس اب یہاں ان کا خاتمہ تباہی اور پریشانی پر ہے کیونکہ ان کے اسناد کی آخری کڑیاں یا جائے انتہا ایسے لوگ ہیں جو خود کو امام کی غیبت صغریٰ کے زمانہ میں جس کی مدت چوہتر برس ہے، سفرائے آئمہ کہتے ہیں۔ اول سفیر ابو عمرو عثمان بن سعید ہے اس کے بعد اس کا بیٹا ابو جعفر محمد بن عثمان جو ۳۲۸ھ میں فوت ہوا، اس کے بعد ابو القاسم حسین بن روح جو ماہ شعبان ۳۲۶ھ میں مرا اور آخری سفیر علی بن محمد ہوا جس کو خاتم السفراء کہتے ہیں، اس کے بعد غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع اور سفارت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ان میں سے جس کسی نے بھی سفارت کا دعویٰ کیا خالی خولی اپنے دعوے کے اپنی سفارت پر کوئی گواہ پیش نہ کر سکا اور اس پر سارے شیعوں کا اتفاق ہے،

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نفس انسانی میں حب جاہ اکثر اس دعوے کا سبب ہو جاتی ہے خصوصاً جب اس پر دلیل و گواہ کا مطالبہ بھی نہ ہو تو پھر دعویٰ کا میدان بہت وسیع و فراخ ہوتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ امام صاحب الامر سے روایت کرنے میں سفراء کا واسطہ بھی چنداں ضروری نہیں، بلکہ جس نے صرف یہ دعویٰ کیا کہ اس نے آنجناب کو دیکھا ہے اور اس کو گو سفارت سے کوئی سروکار نہ ہو اس کی روایت بھی ان کے ہاں معتبر اور واجب القبول ہے۔ چنانچہ ابو ہاشم داؤد بن ابی القاسم جعفری، محمد بن علی بن ہلال، احمد بن اسحاق، ابراہیم بن مہزیار اور محمد بن ابراہیم، وغیرہ وغیرہ انہوں نے صرف روایات کا دعویٰ کیا اور آنجناب سے عجیب و غریب روایات بیان کیں پھر بھی انہوں نے ان روایات میں کسی احتمال و شک کو دخل دیئے بغیر ان کو بسر و چشم قبول کیا۔ یہ بات در اصل ان جیسے بلند بانگ دعویٰ کرنے والوں کے لئے عبرت کا مقام ہے کہ ایک طرف تو دروغ گوئی خطا و لغزش سے اس قدر احتیاط اور اس درجہ گریز کا دعویٰ کہ اسی مقصد کی خاطر امام کا تقرر خدا تعالیٰ پر واجب و ضروری قرار دیا اور خود امام کی فضیلت و عصمت پر نص قطعی متواتر کی شرط لگائی،

اور دوسری طرف دین کے اہم معاملات میں ایسے بے اصل، لغو، لچر احتمالات اور باتوں سے استدلالات کئے اور بلا تحقیق و بلا دلیل ہر کائیں کائیں پر فدا اور انکر الاصوات پر فریفتہ ہو گئے ان پر تو یہ مثل سولہ آنے راست آتی ہے کہ بوچھاڑ سے بھاگے اور پرنالا کے نیچے جا کھڑے ہوئے"

اور پھر یہ عجوبہ بھی لائق توجہ ہے کہ یہ صاحب الامر سے صرف روایات ہی پر صبر نہیں کرتے بلکہ ان کے ثقات نے رقعہ جات کی روایت کا شگوفہ بھی چھوڑ رکھا ہے، بعض نے سفراء کے ذریعہ مسائل کے رقعے بھیجے اور ان کا جواب آیا، اور بعض نے سفراء کے واسطہ بغیر ہی رقعے ارسال کئے،

اب چونکہ سفیروں کی سفارت کبوتر کے بازوؤں سے بندھی ہوئی ہے رقعہ کا جو جواب ان کے ذریعہ ملے ظاہر ہے وہ کس قدر قابل اعتماد ہو گا اور جو جواب ان کے واسطے کے بغیر ہو گا وہ اس سے زیادہ بدتر ہو گا،

سفراء کے ذریعہ جوابات ملنے والے بہت سے ہیں، ان میں سے ایک وہ جو علی بن حسین بن روح نے جو سفراء میں سے تھا علی بن جعفر بن اسود کو دیا، کہ وہ اس کو صاحب الامر کے پاس پہنچا دے پھر یہ رقعہ اس نے یہ گمان کرتے ہوئے اس کے پاس بھیجا کہ وہ صاحب الامر کا جواب ہے، محمد بن عبداللہ بن جعفر ابن حسین بن جامع بن مالک حمیری، ابی جعفر قمی، کے رقعے بھی اسی نوعیت کے ہیں،

اس کے متعلق نجاشی کہتا ہے کہ ابو جعفر قمی صاحب الامر کا منشی تھا۔ اور اس نے بہت سے مسائل شرعیہ کو حل کیا ہے اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم سے احمد بن حسین نے بیان کیا کہ اصل نسخے سے میں نے ان مسائل پر واقفیت حاصل کی جن میں بین السطور دستخط تھے محمد بن حسن طوسی نے بھی کتاب الغیبۃ اور کتاب الاحتجاج میں ان جوابات کا ذکر کیا ہے، ابو العباس جعفر بن عبداللہ بن جعفر قمی کے رقعے بھی اسی قسم کے ہیں، یہ دونوں قمیوں کا استاد اور سردار ہے، اور اس کے دوسرے بھائی حسین اور تیسرے بھائی احمد کے رقعات ایک ہی جیسے ہیں، ان تینوں بھائیوں کا دعویٰ تھا کہ صاحب الامر سے ان کی خط و کتابت ہے اور یہ کہ ہم مسائل شریعت انہیں سے حل کرتے ہیں، اور ان کے پاس مسائل کے جو جوابات ہیں وہ صاحب الامر ہی کی طرف سے ہیں نجاشی اور دوسروں نے اس کا تذکرہ کیا ہے،

اسی ابو العباس نے ان رقعہ جات کو جمع کر کے ان سے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام اقرب الاسناد، الی صاحب الامر رکھا،

علی بن سلیمان بن حسین بن جہم بن بکیر بن اعین ابوالحسین الرازی، کے رقعے بھی اسی قماش کے ہیں، ان کے متعلق نجاشی کا کہنا ہے کہ یہ رقعہ جات صاحب الامر تک پہنچے اور ان پر دستخط ثبت ہیں،

اب رہے بلاواسطہ کے رقعہ جات تو ایسے رقعات محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی کے ہیں، جن کی صداقت پر خطوط ہی سے دلیل دیتا ہے، کہتا ہے کہ میں جواب طلب کوئی مسئلہ لکھ لیتا اور شہر قم سے باہر ایک درخت کے سوراخ میں رکھ آتا ایک دن رات اس کو یہیں رکھا رہنے دیتا دوسرے دن اس کو لے آتا۔ تو اس مسئلہ کا جواب اس میں لکھا ہوا پاتا،

صاحب الامر اور گزشتہ ائمہ کی تحریرات جو شیعوں کے سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہیں، اور ان کے گمان میں وہ ائمہ کی دستی ہیں، وہ سب ان کے نزدیک صحیح الاسناد روایات پر قابل ترجیح ہیں، چنانچہ ابن بابویہ فقیہ نامی کتاب میں باب الرجل یوصی الی رجلین میں جانب مقدس سے آنے والی تحریرات میں سے کسی تحریر کو نقل کر کے کہتا ہے کہ میرے پاس ابی محمد حسن بن علی کی یہ دستی تحریر موجود ہے، اور دوسری طرف محمد بن یعقوب کی کتاب کلینی میں جناب امام صادقؑ سے ایک روایت مذکور ہے جو اس تحریر کے خلاف ہے، پھر اس نے وہ حدیث نقل کر کے کہا ہے کہ میں اس حدیث پر فتویٰ نہیں دیتا بلکہ میں اس تحریر پر فتویٰ دیتا ہوں جو میرے پاس حسن بن علی کی دستی موجود ہے،

ان میں اگر عقل ہو تو وہ یہاں اس بات پر غور کریں کہ اس کا ثابت کرنا کیسے ممکن ہے کہ یہ تحریر امام ہی کی ہے کیونکہ ایک تحریر دوسری سے اکثر ملتی رہتی ہے، اور اس میں بناوٹ اور جعلسازی اتنی رواج پا چکی ہے، کہ ایک شخص نے کسی دوسرے کے خط کی نقل کر کے اسی شخص کے سامنے پیش کی تو وہ بھی چکرا گیا اور تمیز نہ کر سکا۔ اور اس نے یہی خیال کیا کہ وہ اسی کی تحریر ہے،

اور پھر اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد کون اس کی تصدیق کر سکتا ہے امام کی تحریر عمر بھر میں اگر کبھی کسی نے دیکھی بھی ہوگی تو ایک دو مرتبہ وہ بھی تبرک کا اور بطور تبرک ایک دو دفعہ دیکھنے سے کیا دوسرے خطوں میں کوئی تمیز و فرق کر سکتا ہے ایسا ممکن نہیں، چنانچہ اب خط کوفی میں اگر کوئی تحریر کسی کی نظر پڑتی ہے تو وہ جھٹ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تحریر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی ہے حالانکہ ذریعہ شناخت کسی کے پاس نہیں اور نہ ہی اب اس کی تصدیق ممکن ہے،

اور پھر صاحب الامر، کا خط جس کو کسی نے دیکھا ہی نہ ہو، وہاں اس بات کا تو سوال ہی نہیں کہ اس کے دیکھنے پڑھنے کا اس کو اکثر واسطہ پڑا ہوگا۔ جس پر خط کی شناخت و معرفت موقوف ہے،

حاصل کلام یہ کہ دین کے احکامات ان موہوم اور دور از کار احتمالات سے ثابت کرنا کسی بے وقوف اور احمق ہی کا کام ہو سکتا ہے عقلمندوں کے نزدیک تو یہ پاگل پنے کی حرکت کے سوا کچھ نہیں اور امام کو ابھی تک حیات ماننا جب کہ تقریباً ہزار سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے اسی قسم کی حرکت ہے، اور لغو خیال ہے، کیونکہ اس زمانہ میں کسی انسان کی اتنی طویل العمری عادتاً محال ہے اور حضرت نوح علیہ السلام، یا لقمان بن عاد یا اسی قسم کے حضرات کے مثال سامنے رکھنے اور اس پر قیاس کر کے حکم لگانے کی حرکت تو اس فرقہ کی مزید بیوقوفی ہوگی اس لئے کہ اگر اس قیاس سے یہ جتلانا مقصود ہو کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو اس سے ان کی مطلب برآری یوں نہیں ہو سکتی کہ اس امکان کا تو کوئی بھی منکر نہیں اور اگر غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ عمر کی اس قدر درازی عادۃً جائز ہے تو یہ بالکل غلط ہے خوارق عادت اور امور نادرہ پر قیاس کرنا جائز نہیں خصوصاً جب کہ اس میں بدن کی ساخت اور زمان و مکان کو بھی دخل ہو۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہوگا کہ کوئی ولایت گرم سیر کو ولایت سرد سیر پر اور اس زمانہ کے لوگوں کو قوم عاد پر اور موسم سرما کو موسم گرما پر قیاس کر لے اور ظاہر ہے اس زمانہ میں عمر کا اتنا دراز ہونا عادی امر تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر تو ندرت سے اتنی

لمبی ہوگئی چنانچہ اس زمانہ میں سو یا ایک سو بیس برس کی عمر ندرت میں حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کے برابر کا حکم رکھتی ہے، اور لقمان بن عادیا کی عمر ان کی دعا قبول ہو جانے کی وجہ سے خلاف عادت اتنی دراز ہوئی اور یہ کیا ضروری ہے کہ جو خرق عادت سابقہ پیغمبروں یا دوسرے مسلمانوں سے ظہور میں آیا وہ ہمارے پیغمبر اور ان کی امت کے ائمہ سے بھی ظہور پذیر ہو۔ ورنہ پھر ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی حضرت نوح وحضرت لقمان علیہما السلام سے کم نہ ہوتی۔

اگر حضرت خضر وحضرت الیاس علیہما السلام کی درازی عمر کی بات صحیح ہو تو وہ بھی اس امت اور اس زمرے سے خارج ہیں اور پھر وہ فرشتوں کے حکم میں ہیں جس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔

ان سے احکام دین واصول شریعت لینا اور واقعات وحادثات میں ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ولابدی نہیں اور اگر وہ اپنی زندگی پوشیدہ گزار رہے ہیں گزارتے ہیں کسی کو کیا پرواہ بخلاف امام وقت کے، کہ امت کا کاروبار، احکام شریعت کی حفاظت اوامر ونواہی کا اجراء، حدود وتعزیرات کا قائم کرنا، جمعہ وجماعت افواج اور لشکروں کی تیاری کافروں اور سرکشوں کے ساتھ جنگ وقتال، یہ سارے امور ان کی تدبیر سے وابستہ اور ان کے احکام وفرامین پر موقوف ہیں اور پھر وہ نہ کسی کو نظر آتے ہیں نہ کسی سے ملاقات ہوئی ہے بلکہ کوئی نہ ان کو جانتا پہچانتا ہے نہ ان کی آواز سنتا ہے، لوگوں نے ان پر افتراء اور بہتان باندھ لئے ہیں جعلی خطوط اور بناوٹی تحریریں بنا بنا کر لوگوں کو ضلالت وگمراہی کے غار میں دھکیل رہے ہیں، یہ تو بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو کوتوال شہر بنا کر یہ حکم دیدے کہ لوگوں کی نظر سے اوجھل رہو نہ کسی کو اپنی صورت دکھاؤ نہ آواز سناؤ نہ اپنے مسکن اور ٹھکانے کا لوگوں کو پتہ بتاؤ، کہ وہ تم تک پہنچ نہ سکیں اور تمہارا سراغ نہ لگالیں،

اب کوئی بتلائے ہم بتلائیں کیا ؟ کیا یہ باتیں عقلمندوں کی ہیں ؟ جہالت نے یہ سارے گل کھلائے ہیں،

اگر طویل العمری کے بارے میں ابو ریحان بیرونی، ابو معشر بلخی، ماشاء اللہ مصری، ابن شاداں مسیحی اور دیگر اہل نجوم سے اگر یہ فرقہ دلیل لائے تو یہ باطل محض اور بے فائدہ بات ہے،

اہل نجوم کہتے ہیں کہ اگر کسی کی پیدائش قران اکبر کی تحویل سے قریب ہو اور طالع، زحل یا مشتری کے دو خانوں میں سے کسی ایک میں ہو اور ہیلاج (اصطلاح نجوم میں دلیل عمر) آفتاب کا دن میں ہو یا ماہتاب کا رات میں ہو اور خمسہ متحیرہ (آفتاب وماہتاب کے علاوہ سات ستاروں میں سے پانچ ستارے، قوی الحال اوتاد میں ناظر، یا کدخدا بنظر تودُّد) تو ممکن ہے وہ بچہ قران اکبر کے سالوں کے مطابق نو سو اسی شمسی سال زندہ رہے۔ یا اسباب فلکی اگر اس کے خلاف بتائیں تو اس سے کچھ کم یا زیادہ رہ سکے!۔

اول تو نجومیوں کی ہفوات کو شریعت کے اعتقادی امور میں دخل دینا پرلے درجہ کی بے دینی ہے دوسرے ان نجومیوں نے بھی کوئی حتمی ویقینی بات نہیں کہی عمر کی درازی کو اسباب فلکیہ کے حوالہ سے کہا ہے اور ایک امکان کا ذکر کیا ہے، اور یہ سطور بالا میں معلوم ہو چکا کہ امکان سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن ہر ممکن کو یقینی، اور واقع ہونا، جاننا یہ تو صریح مالیخولیا اور جنون ہے یا اس سے بھی کچھ سوا،

تیسرے، تھوڑی دیر کو اگر ان باتوں کو مان بھی لیں تو باتفاق منجمین ومورخین اور بشہادت ان کتابوں کے جن سے ائمہ کی پیدائش کا پتہ چلتا ہے مثل کتاب اعلام الوریٰ وغیرہ حضرت امام صاحب الامر کی پیدائش ایسے حالات ومواقع میں نہیں ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو،

امام مہدی علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کے بارے میں دو قول ہیں،

اول یہ کہ ان کی پیدائش شب برأت ۲۵۵ھ میں ہوئی بعد گزرنے چند ماہ قران اصغر سے کہ جو ہوتا تھا، قران اکبر کا جو قوس میں واقع ہوا۔ اور طالع، سرطان سے پچیس تھا اور زحل قوس کے آٹھویں درجے اور بارہویں دقیقے میں مشتری رجعت میں تھا اور مریخ جوزا کے بیسویں درجے اور چونتیسویں دقیقے میں، اور زہرا، جوزا کے پچیسویں دقیقے میں اور عطارد، اسد کے چوتھے درجے اڑتیسویں دقیقے میں۔ اور قمر، دلو کے تئیسویں درجے اور تیرہویں دقیقے میں، اور راس، حمل کے انتیسویں درجے اور انسٹھویں دقیقے میں، اور ذنب، میزان کے اٹھائیسویں درجے اور انسٹھویں دقیقے میں،

دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی پیدائش ۲۳ شعبان ۲۵۵ھ بوقت صبح ہوئی آپ کا طالع سرطان پچیسواں درجہ اور ساتواں دقیقہ تھا، اور زحل عقرب کے بیسویں درجے اور اٹھارھویں دقیقے میں، مشتری و مریخ، حمل کے آٹھویں درجے اور چونتیسویں دقیقے میں، اور سورج، اسد کے اکیسویں درجے اور اڑتیسویں دقیقے میں اور زہرا جوزا کے پچیسویں درجے اور سترھویں دقیقے اور چاند دلو کے تیسویں درجے اور تیرھویں دقیقے میں،

لہذا اس سے پتہ چلا کہ دلائل فلکیہ آپ کی درازی عمر پہ دلالت نہیں کر رہے تھے، بلکہ اس کے خلاف کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور اس بات کو ماہر نجوم ان دونوں زائچوں کی روشنی میں بخوبی معلوم کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ثابت نہ ہوا کہ آپ کی پیدائش تحویل قران اکبر کے نزدیک تھی اور امام صاحب الامر کی پیدائش سے متعلق ان دو اقوال کے علاوہ کوئی اور قول نہ مروی ہے، نہ منقول،

بخلاف حضرت نوح علیہ السلام کے کہ باتفاق نجومی مورخین آپ کی پیدائش تحویل قران اکبر کے نزدیک تھی، اور دلائل فلکیہ بھی آپ کی درازی عمر پر صاف دلالت کر رہے تھے چنانچہ نجومیوں نے آپ کے زائچہ ولادت کی شرح میں اس کا ذکر کیا ہے،

پھر قطع نظر ان سب باتوں کے دلائل قطعیہ عقلیہ بھی ایسے موجود ہیں جو امام صاحب الامر کی درازی عمر کو خود اصول شیعہ کے مطابق رد کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر ان کو زندہ مانیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف ترک واجب کا الزام آتا ہے کہ ایک طرف تو آپ کو اس کے باوجود کہ آپ حکمرانی اور امور امامت کو سرانجام دینے میں سب سے زیادہ قابل دلائق تھے اہل دنیا میں مقبول نہیں بنایا بلکہ اس کے برخلاف اہل دنیا کو ان سے متنفر کیا اور اس حد تک کہ وہ آپ کے قتل اور ایذا رسانی کے درپے ہو گئے جسکی وجہ سے آپ کو غیبت کبریٰ کے پردہ میں چھپنا پڑا۔ اور دوسری طرف ظالموں، کافروں، اور فاسقوں کو آپ کے ہوتے ہوئے زمین پر مسلط کیا لہذا اصلح کی جو رعایت اللہ تعالیٰ پر واجب تھی اس نے ترک کر دی،

اس کے ساتھ یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف امر قبیح کی نسبت بھی کی (نعوذ باللہ) کہ ایک ایسے شخص کے ہوتے ہوئے جو امامت اور ریاست کے قابل ہو دوسرے کو جو قطعی نااہل ہو ملک و سلطنت اور امور دنیا پر تصرف دیدینا سراسر قبیح ہے،

پھر ایک شخص کو امامت بخشنا اور اس کو غائب و روپوش ہو جانے کا بھی حکم دینا اور ادھر لوگوں کو مجبور کرنا کہ اس پوشیدہ اور روپوش شخص سے جس کے نام کے سوا وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں احکام دین کی تحقیق کریں اور مشکلات دنیا میں اسی کی طرف رجوع کریں اور جملہ امور تقسیم ملک و غنیمت، فوجوں کی تیاری، شہروں کا فتح کرنا جنگ و صلح سب اسی کی صوابدید پر کریں تو یہ سب تکلیف مالا یطاق ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ ہم نے جبرائیل کو تمہارا امام بنایا۔ اپنے تمام دینی مسائل انہی سے سیکھو اور کوئی دنیاوی کام بغیر ان کی مرضی کے نہ کرو تو ہر عقلمند ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں کرتا اور ہر دو کو تکلیف مالا یطاق سمجھتا ہے، جو بالاجماع محال ہے، اور ایسے امام کو مقرر کرنا ہی عبث اور بے فائدہ ہے، کہ جس کی ذات سے امامت کے

فوائد سرے سے ظہور پذیر ہی نہ ہوں۔ فرض کریں کہ کوئی فرقہ عنقا کو اپنا امام مان کر اپنے کو فرقہ عنقائیہ کہنے لگے تو اس کے مذہب کو کوئی کیسے باطل کرے اور ایک عبث فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا انتہائی قبیح ہے جس کی نفی اللہ تعالیٰ کی ذات سے کرنا خود شیعوں کے نزدیک بھی واجب ہے،

خلاصہ کلام یہ کہ ان لوگوں کے خیال فاسد کے رد اور بطلان پہ دلائل اتنے ہیں کہ دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں مگر چونکہ یہ ضمنی بحث کا مقام ہے اور اس موقعہ کی مناسبت سے جتنا کچھ تحریر ہوا وہ حق کے متلاشی اور انصاف پسندوں کے لئے انشاء اللہ کافی ہوگا، اس لئے اب اسپ قلم کی باگ اس میدان سے موڑ کر موضوع باب کی طرف لوٹتے ہیں،

ان کے راویوں میں سے جس نے ایسی چیز کی بھی روایت کر دی ہے جس کو قطعی اور عقلی دلائل محال قرار دیتے ہیں پھر بھی یہ اس کی کمزوری پکڑنے کے بجائے اس کی روایت کو قبول کر لیتے اور اپنی مہر تصدیق ثبت کر کے خود کو بھی اس راوی کی سطح پر لے آتے ہیں، مثلاً ابو بصیر نے امام صادق رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ وہ الوہیت کا دعویٰ کرتے تھے،

یہاں تک کہ شیعوں کے اخبار و رجال کے حالات بطور نمونہ مشتے از خروارے بیان کر رہے تھے، اب مناسب اور ضروری معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے بقیہ دلائل کا بھی اجمالی جائزہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ ان پہ ان دلائل کی حقیقت بھی منکشف ہو جائے اور ان کے جملہ استدلات کی کمزوری مجموعی طور پہ ان کے علم میں آ جائے اور وہ ان کے جزئی و تفصیلی دلائل کو انہی بیانات کلیہ کی کسوٹی پہ پرکھ کے ان کے کھوٹے اور ناکارہ ہونے کا بخوبی اندازہ لگائیں،

تتمہ باب

شیعوں کے بقیہ دلائل

واضح رہے کہ ان کے نزدیک دلیل کی چار قسمیں ہیں، کتاب، خبر، اجماع، اور عقل کتاب یعنی قرآن مجید تو ان کے خیال میں قابل استدلال نہیں، کیونکہ اس کے قرآن ہونے پر اسی وقت اعتماد کیا جا سکتا ہے، جبکہ یہ امام معصوم کے واسطے سے پہنچے اور ائمہ کے واسطے سے پہنچا ہوا کوئی قرآن ان کے پاس موجود نہیں اور مروجہ قرآن ان کے گمان میں ائمہ کے نزدیک معتبر نہیں تھا اور انہوں نے نہ اس کو قابل استدلال یا حجت کے قابل جانا، چنانچہ یہ سب کچھ کلینی اور ان کے دوسری کتابوں سے نقل ہوگا کتاب کے متعلق ہم نے جو ان کا گمان بیان کیا ہے تو ہمارے اسی قول کا ثبوت مندرجہ ذیل وجوہ سے ہو سکتا ہے،

اول۔ امامیہ کی ایک بڑی جماعت نے اپنے ائمہ سے روایت کی ہے کہ کلمات قرآن منزل میں تحریف کی گئی ہے اور نہ صرف آیتیں بلکہ سورتیں تک حذف کر دی گئیں ہیں،

اور ترتیب اصلی میں بہت کچھ فرق آ چکا ہے اور اب جو نسخہ دستیاب ہوتا ہے وہ مصحف عثمان ہے کہ انہوں نے سات نسخے لکھوا کر عالم میں اس کی اشاعت کرائی اور جو اصل ترتیب و وضع کے قرآن کو پڑھتا اس سے مار پیٹ کرتے اور طرح طرح ستاتے تھے اس لئے مجبوراً سب اہل دنیا نے اس مصحف پہ اجماع کر لیا اور یوں یہ قرآن قابل استدلال اور لائق تمسک نہ رہا نہ اس کی عبارت و الفاظ عام و خاص قابل اعتماد رہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ احکام جو اس وقت قرآن میں موجود ہیں سب کے سب یا اکثر ان آیات و سورتوں سے منسوخ یا مخصوص ہوں جو قرآن سے خارج کر دی گئیں،

دوسرے یہ کہ اس قرآن کو نقل کرنے والے بلاشبہ توریت و انجیل کے نقل کرنے والوں کی طرح تھے کہ بعض تو اہل نفاق،

تھے مثلاً کبار و سربرآوردہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور بعض زمانہ ساز، دنیا طلب، دین فروش، جیسے عام صحابہ بجز چار کے جو مال اور عہدوں کے لالچ سے اپنے سرداروں کے پیچھے ہو لئے اور مرتد ہو گئے سنت رسول کو خیرباد کہا اور رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے خاندان کے ساتھ عداوت و دشمنی رکھی، اس کی کتاب تحریف کر ڈالی اور اس کے کلام کو بدل ڈالا مثال کے طور پر من المرافق کی جگہ الی المرافق بنا دیا اور ائمۃ ھی ازکی من ائمتکم کی جگہ امۃ ھی اربی من امۃ لکھ دیا اسی طرح اور بھی! چنانچہ دعائے صنمی قریش میں جس کو یہ قنوت امیر المومنین (رضی اللہ عنہ) کہتے اور متواتر خیال کرتے ہیں اس کا ذکر ہے، اس کا کچھ بیان باب دوم میں گزر چکا ہے،

لہٰذا جس طرح توریت و انجیل کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ عقیدہ و عمل کی کوئی بات لی جا سکتی ہے گویا ہر دو ناقابل تمسک ہیں، اسی طرح قرآن موجود سے بھی تمسک مشکل ہے، اور جس طرح ان دونوں کتابوں کے احکام قرآن مجید سے منسوخ ہوئے اسی طرح خود قرآن کی بہت سی چیزیں منسوخ ہو چکیں، اور ناسخ کو سوائے ائمہ کے کون جان سکتا ہے،

تیسرے یہ کہ نزول اعجاز قرآن کا ثبوت بلکہ خود نبوت کا ثبوت نقل کرنے والوں کی صداقت سے وابستہ ہے، جب ناقلین نبوت پیغمبر اتفاق سے ایسی جماعت ہو، جنہوں نے اپنی لغو اغراض کی بنا پر اس صریح حکم کو جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے روبرو دیا گیا تھا، چھپا دیا اور بوقت ضرورت کسی نے اس کے ظاہر کرنے کی جرأت نہ کی حتیٰ کہ خاندان نبوت کا حق تلف ہوا اور اس اصول دین یعنی امامت کا تختہ الٹا جو درحقیقت نبوت کے ہم پلہ ہے تو ایسے لوگوں کی نقل پر کیسے اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے، ان سے کیا بعید کہ کسی غرض فاسد کے لئے سب کے سب یک زبان ہو گئے کہ فلاں نبی تھا، معجزے لایا اور اس پہ قرآن اترا اور بلغاء عرب و عجم اس کے مقابلہ سے عاجز رہے اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو،

اب رہا خبر کا معاملہ تو اس کا بیان اسی باب کے اوراق ماسبق میں گزر چکا ہے، نئی بات یہ ہے کہ خبر کے لئے ناقل درکار ہے، اور وہ ناقل یا شیعہ ہو یا غیر شیعہ، غیر شیعہ تو درجہ اعتبار سے یوں گر گئے کہ ان کا پہلا طبقہ جن پر ان کی سندیں ختم ہوتی ہیں مرتد ہو گیا، اور منافق و محرف کتاب اور خاندان رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دشمن گزرے ہیں رہے شیعہ تو یہ آپس میں خود اصل امامت، اس کی تعیین اور ائمہ کی تعداد میں شدید اختلاف رکھتے ہیں،

کتاب چونکہ ان امور میں ایسا ثبوت بہم پہنچانے سے ساکت ہے جو مخالف پر چسپاں ہو سکے اس لئے لامحالہ ان میں سے کسی ایک کے قول کا ثبوت خبر سے ہی ہو سکتا ہے، تو اگر خبر کا ثبوت بھی نیز اس کی حجیت اسی قول پر موقوف ہو تو یہ صاف دور ہوگا (یعنی قول کا ثبوت خبر سے اور خبر کا ثبوت قول سے)، اور دور باطل اور غلط ہے، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ خبر کا حجت ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ معصوم کا قول ہو یا کسی معصوم کا قول بھی کسی معصوم کے واسطے سے پہنچا ہو اور اس شخص معین کی عصمت پھر اسی خبر پر موقوف ہے کیونکہ کتاب تو ساقط ہے ہی عقل بھی ثبوت سے عاجز و درماندہ ہے اسی طرح معجزہ کا ثبوت بھی خبر پر موقوف ہے اس لئے کہ ہر شخص تو بذات خود معجزہ دیکھتا ہی نہیں یہی حال اجماع کا ہے کہ غائبین تک اجماع کی نقل میں خبر ہی ذریعہ لازم اور ضروری ہے، اور اس کے حجت ہونے کا مدار بھی اسی پر ہے کہ اس میں معصوم کو دخل ہے اور شخص معین کی عصمت اس معصوم کی خبر سے یا کسی دوسرے معصوم سے جو اس کے واسطے سے ہو ثابت کرنا صاف اور واضح دور ہے علاوہ ازیں خبر کی حجت نبی کی نبوت اور امام کی امامت کے ثبوت پر موقوف ہے وہ کیسے ثابت کی جا سکتی ہے،

غرضیکہ خود شیعوں کے نزدیک تواتر سے بھی اعتماد اٹھ گیا اور وہ بھی معتبر نہیں رہا۔ اس لئے کہ واقعہ کی پوشیدگی عدد تواتر سے ظہور میں آئی اور یہ حال غیر واقع کا ہے، اس کے علاوہ اخبار آحاد تو وہ اس قسم کے مطالب میں قابل لحاظ نہیں لہٰذا اب خبر سے استدلال کسی صورت بھی ممکن نہ رہا،

اب رہا اجماع تو اس کا بطلان تو سب شقوں سے زیادہ ظاہر و باہر ہے، کیونکہ اجماع کا ثبوت موقوف ہے نبوت و شریعت کے ثبوت پر اور جب یہ دونوں ہی اپنے ثبوت کے لئے معرض شک میں ہوں تو اجماع کا ثبوت کیسے ہوگا اور پھر اجماع بذات خود حجت ہے نہیں وہ تو معصوم کے قول کے دخل کی وجہ سے ہے؛ اور اس کا معصوم ہونا اور تعین تشخص کہ وہ ایسا کون ہے اور پھر اس کا قول کون اور کیسا شخص بیان کر رہا ہے، یہ سب ہی باتیں ابھی موضوع بحث و تفتیش میں ہیں،۔ تو اجماع کے ثبوت کا سوال ہی کہاں رہا۔

قطع نظر اس کے صدر اول و دوم کا اجماع جبکہ ابھی امت میں اختلافات رونما نہیں ہوا تھا یوں غیر معتبر ٹھیرا کہ ان شیعوں نے ان امور خلافت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، حرمت متعہ تحریف کتاب، منع از میراث پیغمبر، امام حق کو حق سے محروم کرنے اور تعلقات خاندان رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو غصب کرنے پر اجماع کر لیا،

تو اب اس وقت کا اجماع جب کہ امت اختلاف کا شکار ہو کر فرقہ فرقہ ہو گئی، کس طرح معتبر ہو اور یوں بھی مختلف فیہ مسائل میں کہ جن میں استدلال و حجت کی سخت اور خصوصی ضرورت و احتیاج ہے۔ پھر امت اجماع میں معصوم کا دخل ہونا یا اس کا تمام امت کے قول کے مطابق ہونا سب کچھ خبر ہی سے ثابت ہوتا ہے اور خبر کا تعارض، تساقط اور ضعف جیسا کچھ ہے وہ عیاں و ظاہر ہے،

اور ہر مسئلہ مختلف فیہ میں اجماع کا نقل د حوالہ خصوصیت سے ایسا امر ہے کہ جو کبھی واقع نہیں ہو سکتا اور علمائے شیعہ خصوصًا اثنا عشریہ کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکذیب و تردید میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک فرقہ اگر اپنے فرقہ کا اجماع نقل کرتا ہے تو دوسرا اسے جھٹلاتا ہے اور تکذیب کرتا ہے، تو جب صرف ایک فرقہ امامیہ کا اجماع جو شیعوں ہی کا ایک فرقہ ہے، شیعوں کے دوسرے فرقہ کے نزدیک ثابت نہیں ہوتا۔ تو پوری امت کے اجماع کو ثابت کرنا تصور تک میں نہیں آسکتا۔

اس کی وضاحت ذیل کی مثالوں سے اچھی طرح ہو جائے گی مثلاً سبیل السلام الی معالم الاسلام کا مصنف حدیث عقل کے ذیل میں کہتا ہے۔ كَلَامُ الشَّيْخِ اَبِي الْفَتْحِ الْكَرَاجِكِيِّ فِي كَنْزِ الْفَوَائِدِ يَدُلُّ عَلَى إِجْمَاعِ الْإِمَامِيَّةِ عَلَى الْبَدَاءِ وَاَنَّهُ مِنْ خَصَائِصِهِمْ وَاَنْكَرَهُ سَائِرُ الْفِرَقِ وَكَلَامُ الْحِلِّيِّ فِي النِّهَايَةِ وَالتَّهْذِيبِ وَكَشْفِ الْحَقِّ يَدُلُّ عَلَى الْاِصْرَارِ فِي الْاِنْكَارِ۔ کہ کنز الفوائد میں شیخ ابوالفتح کراجکی کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امامیہ کا مسئلہ بداء پر اجماع ہے اور یہ مسئلہ ان کے خصائص میں سے ہے (مگر یہ غلط ہے) کیونکہ تمام فرقوں نے اس سے انکار کیا ہے بلکہ حلی نے نہایا، تہذیب اور کشف الحقائق میں اس انکار پر اصرار کیا ہے"۔

اسی طرح ان کے شیخ شہید ثانی نے ایک پوری فصل صرف اس لئے رکھی کہ ان کے شیخ نے جابجا فرقہ کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ دوسری جگہ اس نے خود ہی اس کے خلاف رکھا ہے، اس فصل سے مختصر سا حوالہ ہم یہاں تحریر کئے دیتے ہیں،

قَالَ فَصْلٌ فِيمَا يَشْتَمِلُ عَلَى مَسَائِلَ اِدَّعَى الشَّيْخُ الْاِجْمَاعَ* فِيهِ اَفْرَدْنَاهَا لِلتَّنْبِيهِ عَلَى اَنْ لَا يَغْتَرَّ الْفَقِيهُ بِدَعْوَى الْاِجْمَاعِ فَقَدْ وَقَعَ فِيهِ الْخَطَاءُ وَالْمُجَازَفَةُ كَثِيرًا مِنْ كُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْفُقَهَاءِ سِيَّمَا مِنَ الشَّيْخِ مُرْتَضَى فِيمَا اِدَّعَى فِيهِ الْاِجْمَاعَ

* فِيهَا مَعَ اَنَّهُ نَفْسَهُ خَالَفَ فِي حُكْمِ مَا ادَّعَى الْاِجْمَاعَ *

مِنْ کِتَابِ النِّکَاحِ دَعْوَاهُ فِي الْخِلَافِ الْإِجْمَاعَ عَلَى أَنَّ الْكِتَابِيَّةَ إِذَا أَسْلَمَتْ وَانْقَضَتْ عِدَّتُهَا قَبْلَ أَنْ يُسْلِمَ الزَّوْجُ يَنْفَسِخُ النِّكَاحُ وَقَالَ فِي النِّهَايَةِ وَفِي كِتَابِ الْأَخْبَارِ لَا يَنْفَسِخُ النِّكَاحُ بَيْنَهُمَا انتہی یہ فصل ان مسائل کے بیان پر مشتمل ہے جن پر اجماع ہونے کا شیخ نے دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ پھر خود ہی اپنے دعویٰ کی تردید بھی کر دی ہم نے اس پر مستقل فصل اس لئے قائم کی کہ فقیہ ان کے اس دعویٰ اجماع پر اعتبار نہ کرے۔ کیونکہ یہ شیخ اور اکثر فقہا ایسے دعویٰ میں خطاو لغزش کے مرتکب ہوئے ہیں خصوصیت کے ساتھ شیخ اور مرتضیٰ۔ مثلاً کتاب النکاح میں اس مسئلہ پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے کہ اگر ایک کتابیہ عورت اسلام لے آئی، اور خاوند کے اسلام لانے سے پہلے اس کی عدت ختم ہو گئی ہو تو اس کا نکاح فسخ ہو جائے گا مگر نہایا اور کتاب الاخبار میں لکھتا ہے کہ نکاح فسخ نہیں ہو گا،

اسی طرح ابواب فقہ میں سے ہر باب میں شیخ اور سید مرتضیٰ کی تردید کرتا ہے یہ رسالہ خاصا طویل ہے ستر یا اس سے زائد مسائل اس میں درج ہیں،

اب رہ گئی عقل۔ تو اس سے تمسک (حجت لانا) یا تو امور شرعیہ میں ہو گا، یا غیر شرعیہ میں امور شرعیہ میں تو اس فرقہ کے نزدیک عقل بالکل ہی غیر معتبر اور ناقابل تمسک و حجت ہے، کیونکہ اسی سبب سے تو وہ قیاس کے منکر ہیں اور اسے حجت تسلیم نہیں کرتے۔

اور امور غیر شرعیہ میں اس کا قابل حجت ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ وہم، عادت طبیعت کے شبہات سے پاک ہو اور صور و اشکال میں ترتیب کی غلطی سے بری اور دور ہو اور ان سب باتوں کا علم امام کے ارشاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر فرقہ کے انسان کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی عقل سے چند چیزوں کو قبول کرتا اور بعض دوسری چند کا انکار کرتا ہے اور یوں گروہ انسان میں اصولی اور فروعی اختلاف پیدا ہوتا ہے، اب اس اختلاف میں محض عقل سے ترجیح کیسے ہو ورنہ تو پھر ترجیحات میں بھی جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو گا،

اس لئے لامحالہ یہ ضروری ہے کہ عقل سے بالاتر فیصلہ کن ترجیحات دینے والی کوئی اور ہستی ہونی چاہیے جو ایک جانب کو درست اور دوسری جانب کو غلط ٹھیرا سکے، اور اس قسم کی ہستی سوائے نبی یا امام کے اور کون ہو سکتی ہے اور چونکہ ثبوت نبوت و امامت کا معاملہ ہی ابھی طے نہیں وہ معرض بحث ہی میں ہے اس لئے یہ عقل بھی بیکار ہو گئی اس سے بھی تمسک نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ عنوان گفتگو دلائل شرعیہ ہیں اور شرعی امور عقل کی رہنمائی سے ثابت نہیں کئے جا سکتے اس لئے کہ عقل ان کے تفصیلی علم سے بالاجماع عاجز ہے ہاں جب بذریعہ شریعت شارع سے اصلی حکم حاصل و معلوم کر لیتی ہے تو دوسرے امور پر قیاس کر سکتی ہے، مگر مقطع میں بات ہی یہ پھنسی ہے کہ قیاس کو یہ فرقہ باطل تسلیم کرتا ہے اسے نہیں مانتا ایسی صورت میں صرف عقل کو امور شرعیہ میں دخل دینے کا نہ جواز رہا نہ ہی راستہ! خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ قواعد و کلیات شرعیہ ہی میں تردد و اضطراب جاری ہو تو عقل کس کام آئے گی گھوڑے سے پہلے لگام کیسی! پہلے چھت تو بناؤ پھر نقش و نگار کرو،

فائدہ جلیلہ (۱) واضح رہے کہ تمام عقلی دلائل کا ثبوت بدیہیات (بلا دلیل سمجھ میں آنے والی) کے اعتقاد پر موقوف ہے مثلاً سوفسطائی فرقہ ان تمام بدیہی مقدمات کو نہیں مانتے کہ ایک دو کا نصف ہے۔ نفی و اثبات ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے،

نہ ایک ساتھ بیک وقت اٹھ سکتے ہیں، ایک جسم ایک آن میں دو جگہ نہیں پایا جاسکتا جو حواس کی گرفت سے باہر اور غائب ہو اسے حاضر نہیں کہہ سکتے اور کسی چیز کا نام عین وہی چیز نہیں ہے یا ان جیسے اور بدیہی امور، تو ایسے لوگوں کے نزدیک تو کوئی بھی دعویٰ عقلی دلائل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا،

اور یہی حال شرعی دلائل اور دینی مقدمات کا ہے، جو ملت حنیفیہ کے اثبات کے لئے لائے گئے ہیں، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اب تک تمام ادیان و مذاہب میں مسلم اور متفق علیہ رہے ہیں، مثلاً اللہ ایک ہے، وہ ایک رسول بھیجتا ہے جو معجزات اپنے ساتھ لاتا ہے۔ فرشتے اللہ کے فرستادے ہیں جو مخلوق کے پاس آتے ہیں، اور جو تبلیغ وارسال میں جھوٹ و خیانت سے قطعی پاک ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو احکام کی تکلیف دیتا ہے، جن پر انکو قیامت کے دن اٹھنے پر جنت کی صورت میں ثواب یا دوزخ کی شکل میں عذاب دے گا،

اور ملت حنیفیہ کے اصول و قواعد کا ثبوت شیعی طریقے پر تو ممکن نہیں تو پھر کوئی بھی دینی مسئلہ ان کے نزدیک دلیل سے ثابت نہیں، تو گو یا یہ شیعہ دین کے سوفسطائی" ہوئے۔

اس اجمال واختصار کی تفصیل اور تشریح یہ ہے کہ یہ لوگ حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو جو تمام اصول و قواعد کا منبع اور سرچشمہ ہے امیر المومنین وائمہ کی روایت اور واسطہ سے ثابت کرتے ہیں، اور یہ بات عیاں اور اظہر من الشمس ہے کہ براہ راست روایت کرنا ان کو نہ امیر المومنین سے نصیب نہ ائمہ سے۔ بلکہ واسطوں کے محتاج ہیں اور پھر وہ واسطے بھی ایسے ہیں جن کی تکذیب خود امیر المومنین وائمہ نے فرمائی ان کو متہم کیا اور حقیقت الامر یہ ہے کہ انہوں نے جس طرح نبوت کے متعلق روایت کی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور صورت وشکل کی بھی روایت کی،

اور یوں بزرگوں پر جھوٹ جوڑا۔ اور پھر یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ شرائط امامت اور اس کے تعین میں اتنا شدید اختلاف رکھتے ہیں کہ اس کو رفع کرنا امکان سے باہر ہے ایسی صورت میں ان میں سے کسی ایک فرقہ کا جھوٹا ہونا یقینی ہوا اور ظاہر ہے کہ جھوٹوں کا تواتر جو کسی بیہودہ وناشائستہ غرض سے کسی جھوٹ کی اشاعت پر یک زبان ہو جانا جس طرح قرن اول کے مسئلہ خلافت پر قابل اعتماد بھروسہ نہیں ہے، اور پھر ان کے نزدیک تو لاکھوں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف چار یا چھ ہی قابل اعتبار ہیں تو صرف ان چار یا چھ کی روایات پر تواتر کا اطلاق کیسا، اور بطور فرض محال اس کو مان بھی لیں تو چار یا چھ آدمیوں کی حدیث جس کو عام لوگ عقل سے بعید اور محال جانیں یقین کو کس طرح مفید ہوں گی۔

سلیم بن قیس ہلالی نے کتاب وفات النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور انہوں نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور بہتوں نے امام صادق رحمۃ اللہ علیہ سے کہ

"سوائے چار کے سب صحابہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے، اور جناب صادق کی ایک روایت میں چھ کی تعداد آئی ہے"۔

گو یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ان شیعوں کے نزدیک مرتد، دین سے خارج، فاسد اغراض رکھنے والے اور دروغ گو تھے۔ لہٰذا ان کے خیال فاسد اور گمان غلط کے مطابق ان "مرتدین" کی یہ جماعت جو بھی روایت کرے مثلاً دعوائے رسالت اس دعوے کے ثبوت میں معجزہ پیش کرنا، قرآن کے نزول قرآن کے مقابلہ میں فصحائے عرب کا عجز، جنت و دوزخ کے حالات شرعی تکلیفات نزول وحی وملائکہ بلکہ گزشتہ انبیاء کی نبوت، توحید کی دعوت، شرک سے روکنے والی ساری روایات مردود

ہوں گی، کیونکہ یہ ساری روایات آخر اسی جماعت کی تو ہیں، جنہوں نے اس وصیت کے خلاف پر اجماع کیا جو ایک لاکھ بیس ہزار پیغمبروں کے مجمع میں بااصرار و تاکید کی گئی تھی، خصوصاً جب کہ اس جماعت کی روایات شیعوں اور ان کی ہم مشرب جماعتوں کے نزدیک حد تواتر کو بھی نہ پہنچی ہوں اور اس صدی میں یا مابعد صدیوں میں صرف شہرت اور اشاعت کو ان امور بالا کی صداقت کے لئے کافی سمجھا جانے تو یہ دینی امور میں کمال درجہ کی بے احتیاطی ہے کیونکہ یہ دستی) اس صدی یا بعد کی صدیوں سب کے سب پیغمبر کے اوامر و نواہی کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے،

چنانچہ انہوں نے قرآن کی تحریف کر ڈالی، اور بہت سے ان احکام کو جو اللہ کی طرف سے نازل کئے حکم کے خلاف تھے ان صدیوں میں اتنا مشہور و معروف کر دیا، کہ اصل شریعت، کو بھی اتنی شہرت نصیب نہ ہوئی۔ جیسے وضو میں پاؤں دھونے کا مسئلہ کہ اس نے اس درجہ شہرت پکڑی کہ روزانہ پانچ وقت، بے شمار اشخاص نے اس کو دیکھا اور سب غلط روایات کرتے چلے گئے یہی حال موزوں پر مسح کا ہوا اور اسی طرح کی اور بدعتیں ان کے مقتداؤں اور پیشواؤں نے اپنی طرف سے گھڑ کر ان کو رواج دینے میں اتنا زور لگایا کہ لوگ ان کو ہی اصل شریعت سمجھنے لگے، مثلاً سنت تراویح اور حرمت متعہ وغیرہ،

تو ایسی "بے دین" اور بے باک" جماعت سے کیا بعید کہ انہوں نے امر نبوت اور نزول وحی و ملائکہ اور ذکر جنت و دوزخ پر لوگوں کو ڈرانے یا ترغیب دلانے کی غرض سے اتفاق و اجماع کر لیا ہو، اور تواتر اس وقت یقین پیدا کرتا ہے جب اہل تواتر اغراض فاسدہ سے پاک ہوں اور یہاں تو ان رسیلیوں، کی ان گنت اور بے شمار اغراض موجود ہیں بہت ممکن ہے ان میں چند کسی اپنی پوشیدہ غرض کے تحت دعوائے نبوت و اظہار معجزات کی روایات بیان کرتے ہوں اور دوسروں نے موافقت کے لالچ میں اور دین میں بے جا سستی کو کام میں لاتے ہوئے اور بغیر تحقیق کئے ان کو قبول کر کے شہرت دیدی ہو،

اور اس کا بھی احتمال ہے کہ گذشتہ کاہنوں اور نجومیوں سے انہوں نے سن لیا ہو کہ قریش میں عبد مناف کی اولاد میں فلاں شخص کے ہاں فلاں نام کا بیٹا پیدا ہوگا، جو روئے زمین کا اور ان کے خزانوں کا مالک و متصرف ہوگا۔ تو ہر مفلس فاقہ کشی کا مداوا ڈھونڈتے ہوئے اور ہر عیاش طبع خطۂ ایران کی نازک اندام پریزادوں سے لطف اندوزی کے ارادے دل میں چھپائے ہوئے اور ہر دنیا پرست مناظر قدرت کا دلدادہ کسریٰ کے باغات قزوین و شیراز کی تفریح گاہوں، قیصر کے محلات و آسائش گاہوں کے خیالی لطف ولذت سے متاثر ہو کر اس قریشی لقب ہاشمی و مطلبی (فداہ ارواحنا) کے پیچھے لگ پڑے ہوں دوسری طرف یہودیوں کی بھی ایک جماعت اپنی پرانی کتابوں کے ذریعہ اس قصہ و واقعہ سے باخبر ہو کر توریت سے اسی مدعی نبوت کی تائید میں کوئی نص نکال لائی ہو، اور توریت کے قصص و اخبار کو فصیح و بلیغ عبارات سے آراستہ کر کے اس کو دیدیا ہو گو ابھی خود توریت کا نزول اور اس کے قصص کی صداقت ہی موت و زیست کے خطرے اور گڑبڑی میں مبتلا ہے، اس کی موافقت یا مخالفت کیسے نتیجہ خیز ہو سکتی ہے،

اول اول تو عرب کے جاہلوں نے ان اغراض کے سبب اتباع میں پیش قدمی کی پھر لوگ اندھا دھند غلطی پر غلطی کا شکار ہوتے ہوئے نفسانی خواہشات اور دنیاوی طمع و لالچ کے سبب مسلسل اس بھیڑ کے نقش قدم پر چلتے چلے گئے اور دھیرے دھیرے یہی غلط روی اور غلط رفتاری ایک دین و مذہب کی شکل اختیار کر گئی، چنانچہ شیعوں کے خیال کے مطابق اکثر امور شرعیہ میں یہی صورت پیش آئی،

مثلاً شیعوں نے وضو میں پاؤں دھونے کے مسئلہ میں ہو بہو یہی شبہات و احتمالات پیدا کئے ہیں، جب کہ مسح کے

مقابلہ میں پاؤں دھونے میں زیادہ مشقت اور تکلیف ہے، اور مشقت و تکلیف کے کام کو رواج دینے اور مشہور کرنے میں دنیا کا کوئی فائدہ نظر بھی نہیں آتا تو جن امور میں بظاہر آرام ہی آرام اور مزے ہی مزے نظر آتے ہوں وہاں تو ان کے لئے ایسے شبہات و احتمالات نکالنے میں بڑی آسانی اور زیادہ مواقع ہیں مثلاً معاملہ نبوت، کہ وہ ریاست عامہ کا معاملہ ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور دل پسند بھی، اور طمع و حرص کے لئے اچھی آماجگاہ بھی؛ ہزاروں لاکھوں اشخاص سرداری اور ریاست کے لئے اپنی جانیں تک دے ڈالتے ہیں اس کے لئے کوئی ایک بات یا ایک روایت یہ یک زبان ہو جائیں تو کوئی تعجب بھی نہیں اور پھر جب اس جھوٹ کے لئے یہ تائید بھی مل جائے کہ جو ان سے آمادہ پیکار ہوا تو ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کا شکار ہوا اور یہ ایسی تائید ہے کہ آئندہ آنے والے اپنے اسلاف کے ایسے حالات دیکھ کر اور معلوم کر کے ان کی روایت کی صداقت پر پختہ خیال ہو گئے،

اور یہی وہ احتمالات و شبہات ہیں جو یہ شیعے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت اہل مصر میں ان کی شہرت اور آئندہ آنے والی اہل سنت کی جماعتوں کے متعلق نیز ان کے اعتقادات کے بارے میں نکالتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر اسی قسم کے بزرگوں کا تواتر مفید ہوتا تو پھر یہود و نصاریٰ کا تواتر بھی مفید ہونا چاہیئے، جب کہ یہود کا تواتر اللہ کی کتاب میں تحریف انبیاء کی مخالفت و تکذیب اور ان کی وصیتوں کو دین موسوی کی خاطر ٹھکرانے میں ان دسنیوں، سے بھی چند قدم آگے ہے اس لئے کہ یہودی بھی موسیٰ علیہ السلام سے بطریق تواتر یہ نص صریح نقل کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا کہ جب تک آسمان و زمین قائم ہیں میری شریعت قائم رہے گی،

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں سنیچر کی تعظیم قائم رہے گی" یہی حال نصاریٰ کے تواتر کا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ نص صریح روایت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں، اور یہ کہ "انسانی رسالت ان کے آنے سے پہلے ختم ہو چکی"

اب اس سنی، جماعت کے پاس جو تحریف شدہ قرآن ہے اس کی وہی حیثیت ہے جو تحریف شدہ توریت اور انجیل کی ہے، کیونکہ اس میں سے بہت سی آیات اور متعدد سورتیں نکال دی گئی ہیں اس کے کلمات کو اپنی جگہ سے بدلا گیا ہے اور ترتیب کو بگاڑا ہے، اگر اس قسم کے متواتر قرآن سے ہم تمسک کر سکتے ہیں تو انجیل سے بھی تمسک ہو سکتا ہے اور انجیل مرقس میں جو اصحاح ثانی میں انجیل ثانی ہے یہ نص موجود ہے اور چاروں انجیلیں ان کے نزدیک متواتر ہیں،

قَالَ غَرَسَ رَجُلٌ اَشْجَارًا فِي اَرْضِهٖ وَبَنٰى حَوَالَيْهَا الْجُدْرَانَ وَحَفَرَ فِيْهَا بِئْرًا وَبَنٰى عَلَيْهَا بُيُوْتًا فَلَمَّا كَمُلَتْ عِمَارَةُ الْبُسْتَانِ اَوْدَعَهٗ عِنْدَ الزُّرَّاعِ وَسَافَرَ اِلٰى بَلَدٍ اٰخَرَ وَاَقَامَ بِهَا فَلَمَّا حَانَ اَنْ يَنْفَعَ الثِّمَارَ اَرْسَلَ عَبْدًا اَمِيْنَ عَبِيْدِهٖ اِلَى الزُّرَّاعِ لِيَاْخُذَ الثِّمَارَ فَلَمَّا جَاءَهٗ وَاَرَادَ اَنْ يَاْخُذَ ثَمَرًا ضَرَبُوْهُ وَاَرْسَلُوْهُ خَائِبًا ثُمَّ اَرْسَلَ عَبْدًا اٰخَرَ فَاٰذَوْهُ وَاَضَرُّوْهُ وَاَدْمَوْهُ وَشَجُّوْا رَاْسَهٗ ثُمَّ اَرْسَلَ

ایک شخص نے اپنی زمین میں درخت لگائے اس کے گرد چار دیواری بنائی اس میں کنواں کھدوایا اور عمارات بنوائیں جب باغ کی عمارات مکمل ہو گئیں تو وہ باغ کاشتکاروں کے حوالہ کر کے خود کسی اور شہر میں جا بسا جب باغ پھل لے آیا تو اپنے ایک غلام کو کاشتکاروں کے پاس بھیجا کہ باغ سے پھل لے آئے۔ جب غلام وہاں پہنچا اور پھل لینے کا ارادہ کیا تو کاشتکاروں نے اسے مار پیٹ کر نکال دیا اس نے پھر اپنا دوسرا غلام بھیجا انہوں نے اسے زدوکوب

آخَرَ فَقَتَلُوْهُ فَكَانَ يُرْسِلُ اِلَيْهِمْ عَبِيْدَهٗ تَتْرٰى فَيَضْرِبُوْنَ بَعْضَهُمْ وَيَقْتُلُوْنَ بَعْضَهُمْ وَكَانَ لَهٗ اِبْنٌ وَاحِدٌ يُحِبُّهٗ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ وَلَدٌ سِوَاهُ فَاَرْسَلَهٗ اِلَيْهِمْ فَلَمَّا رَاٰهُ الْكُفَّارُ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ هٰذَا الَّذِيْ يَرِثُ بَعْدَهُ الْجَنَّةَ فَهَلُمُّوْا نَقْتُلْهُ وَنَرِثُ الْبُسْتَانَ فَوَثَبُوْا عَلَيْهِ فَقَتَلُوْهُ فَلَا جَرَمَ يَغْضَبُ عَلَيْهِ صَاحِبُ الْحَائِطِ وَيَرْجِعُ اِلَيْهِمْ وَيَنْزِعُهٗ مِنْ اَيْدِيْهِمْ وَيُدَمِّرُ وَيَدْفَعُهٗ عِنْدَ الْآخَرِيْنَ۔

اور لہو لہان کر دیا اور سر پھاڑ دیا اس نے تیسرا غلام بھیجا تو اس کو قتل کر دیا، وہ اسی طرح غلام پہ غلام بھیجتا اور یہ بعض کو مار پیٹ کر نکال دیتے اور بعض کو قتل کر دیتے اس شخص کا ایک ہی بیٹا تھا جس سے اسے بہت محبت تھی اس کے سوا دوسرا بیٹا بھی نہ تھا اس نے اسے بھی بھیجا جب کاشتکاروں نے لڑکے کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ اس باغ کا وارث و مالک یہی لڑکا ہو گا آؤ اسے قتل کر دیں تاکہ پھر ہم ہی اس باغ کے مالک بن سکیں پس سب مل کر اس پر پل پڑے اور اس کو قتل کر ڈالا اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ یہی ہو گا کہ باغ کا مالک غصہ میں بھر کر خود ان کے پاس جائے گا باغ ان سے چھینے گا، ان کو ہلاک کرے گا اور پھر باغ دوسروں کے سپرد کر دے گا،

ان تمام تفاصیل سے یہی بات ثابت ہوئی کہ ملت حنیفیہ کا ثبوت جو خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماننے پر ہو سکتا ہے اہل سنت کے اصول مذہب کا اتباع کئے بغیر ممکن نہیں کیونکہ وہ ان اصول کو ان کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم کی جماعت سے حاصل کرتے ہیں، جو عشرہ مبشرہ عبادلہ اربعہ اور مکثرین میں داخل اور اہل بدر اور اہل بیت رضوان اور مہاجرین اولین ہیں، کہ جن کی سچائی اور صلاح عمل پر حق تعالیٰ خود اپنی کتاب میں ان مختلف الفاظ سے گواہی دیتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (سچے وہی ہیں) یا یہ فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں الخ۔ اور اسی طرح بہت سی آیتوں میں ان کی شان میں خوشنودی و رضامندی کے کلمات ارشاد فرمائے ہیں مثلاً لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ - اللہ راضی ہوا مومنین سے جب کہ وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے،، اور ان جیسی دوسری آیات ہیں۔

پھر اہل سنت کے اسلاف نے قرآن و احادیث میں یہ نصوص پڑھ اور سن کر ان بزرگوں کے متعلق حالات کی اچھی چھان بین اور تحقیق کی تو یہ پھر بھی اسی نتیجہ پر پہنچے۔ کہ واقعی یہ سب کے سب سچے عقیدہ والے اور نہایت محبت و رسوخ والے مخلص اور عدول تھے۔ اس روشن شریعت کے جھنڈوں کو بلند کرنے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا، نہ اس میں سستی اور غفلت سے کام لے کر ملت حنیفیہ کے احکام کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کیا خدا کی کتاب کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھا دین الٰہی کی عزو برداشت اپنے آپ سے بڑھ کر کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو نہ صرف عبادت کی حیثیت دیکر ہی مضبوطی سے کاربند رہے، بلکہ آپ کی عادات کو بھی عبادات ہی کی طرح اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔

عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کبار صحابہؓ کے فیض صحبت سے متاثر ہو کر اور ان کے سیاسی تدبر اور انتظام کے تحت یہی طریق زندگی اختیار کیا۔ اسی طرح ان کی صحبت اور ان کے انوار کی کرنوں سے فیضیاب ہو کر تابعین رحمہم اللہ بھی اسی وطیرہ زندگی کو تھامے اور عمل پیرا رہے اور صدی بعد صدی یہ طریقہ یونہی جاری و ساری رہا۔ بلکہ ہوتا یوں رہا، کہ سرداران عرب میں سے اگر کسی کا دل محبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خالی رہا تو وہ اپنی قوم کا سردار دیکھا ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں میں حقیر و ہلکا ہی رہا، خلیفہ دوم کے ہاں اقرع بن حابس وغیرہ تو مجلس میں نشست کے لئے بڑی مشکل اور جتن سے جوتیوں

میں جگہ پاتے تھے۔ جب کہ اہل ایمان کے فقراء، و مساکین اور غلام مثلاً صہیب و عمار وغیرہ (رضی اللہ عنہم) صدر مجلس ہوتے اور اقتدار کے وقت ان بزرگوں کا طرز عمل یہ رہتا تھا کہ اختیارات کی تقسیم کے وقت قرابت و رشتہ داری کے لحاظ کی جگہ اسلام میں قدیم ہونے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت میں بلند درجہ ہونے کو باعث ترجیح جانتے پھر ان میں سے بہتوں نے کافی خون خرابے اور قتل و غارت، عزیز و اقارب کے کٹ جانے اور کفر پر عرصے تک ڈٹے رہنے کے بعد جب قوی معجزے دیکھ لئے تو ایمان کے سامنے سرنگوں ہوئے اور اس کو قبول کیا۔ اگر کاہنوں، نجومیوں اور اہل کتاب کے قول کے مطابق مال و دولت اور عہدہ و اقتدار کے لالچ میں ایمان لانا ہوتا تو وہ اتنی کھکھیڑ میں پڑتے ہی کیوں شروع ہی میں ایمان لے آتے، اتنے عرصہ تک پیغمبر سے دشمنی مول لینے اور ان کو اذیت دیکر اپنی دنیا و آخرت خراب کرنے کی حماقت کیوں کرتے اور اپنے پیاروں کو کیوں قتل کراتے، اور کیوں اہل ایمان کے کاموں میں ابتری پھیلاتے اور رہل چل مچاتے،

اور جب ایسے لوگوں کی روایت سے دعویٰ نبوت ظہور معجزہ، نزول قرآن اور فصحائے عرب کا عجز بمقابلہ قرآن ثابت ہو تو اس پر یقین ہونا لازمی ہے کہ یہ سب واقعی ایسا ہی تھا، اور آپ کی صداقت و صلاح کا علم قرآنی و نبوی شہادت سے دور کی شکل میں نہیں تھا، جس سے کوئی خرابی لازم آئے بلکہ وہ محض اعتقاد کی پختگی اور یقین کی زیادتی کے طریقے پر تھا۔ ورنہ ان کی متواتر روایات کی صداقت کا اعتقاد اور ان کے طریقوں کی اتباع و پیروی کا لازم ہونا تو ان کے حالات کی تحقیق سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے

پس اگر شیعہ قرآن و حدیث رسول یا اجماع سے حجت لائیں تو لامحالہ وہ اپنی شیعیت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اہل سنت کے اثر سے آلودہ ہو جائیں گے ورنہ ان کے تمسکات محض سراب کی چمک اور نقش بر آب کی طرح بے حقیقت اور بے اصل ہو جائیں گے،

اب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ اصل شیعت کی بنا پر ان کی کوئی بھی دلیل ٹھیک نہیں اترتی۔ اور جب انہوں نے قرآن کے ماننے اور اصول ملت حنیفیہ کے قبول کرنے میں اہل سنت ہی کا دامن پکڑا تو اب انہیں چاہیے کہ وہ تمام متواتر امور مثلاً ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کا اختیار دینا ان کے فضائل و مناقب یا غسل رجلین اور مسح خفین، جو قرآن و اصول ہی کی طرح متواتر ہیں انہیں بھی قبول کر لیں ورنہ یہ کیا بات ہوئی کہ کھائیں کسی کا اور شکریہ ادا کریں، دوسرے کا، اس میں کوئی مزے داری نہیں،

وجد و منع بادہ اے زاہد چہ کافر نعمتی است دشمن مے بودن وہم رنگ مستان زیستن

(اے زاہد یہ کیا ناشکری ہے کہ شراب کی ممانعت بھی اور وجد و حال بھی، شراب کا دشمن بھی اور مستوں کی طرح جینا بھی، لہٰذا یہ فائدہ بہت ہی قیمتی اور مفید ہے، اسے معمولی سمجھ کر ہاتھ سے نہ جانے دیں،

گزشتہ بابوں سے اس کا علم ہو چکا ہے، کہ شیعہ مذہب کی تمام تر بنا اصحاب آئمہ کی روایات پر ہے اور آئمہ نیز ان کے اصحاب کے حالات سے اس کا بھی پتہ چلا کہ آئمہ کے اکثر اصحاب جھوٹے تھے، جن کے کذب و دروغ کی آئمہ نے خود شہادت دی اور کوئی امام ایسا نہیں گزرا کہ آنے والے امام نے اس کے کچھ اصحاب کی تکذیب نہ کی ہو اور سبب اس کا صرف یہ ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس امام کی امامت کے قائل نہ رہے یا اس کے علاوہ دوسرے کسی کو امام مان بیٹھے یا وہ تردد اور شک میں پڑ کر سلسلہ امامت رک جانے کے قائل ہو گئے،

ان حالات کے ہوتے بھی ان شیعوں کو اصحاب امام سے "حسن ظن" ہے، اور اسی وجہ سے وہ نہ امام وقت کی اور نہ امام لاحق کی تکذیب کو ذرہ برابر وقعت بھی دینے کو تیار نہیں، اور ان سب کی روایات پر پورا پورا اعتماد بھی کر لیتے ہیں تو پھر کیا بات ہے کہ وہ اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حسن ظن رکھ کر ان کی روایات کو کیوں قبول کر نہیں لیتے جو تاثیر صحبت میں آئمہ

سے ہرگز روایات ائمہ کی روایات سے ٹکرائیں گی اور ان کو صحابہ کی صداقت پر شک ہوگا، مگر یہ کوئی ایسی اہم اور بڑی بات یوں نہیں کہ آراء اور روایات کا اختلاف و ٹکراؤ تو ہر امام کے اصحاب میں بھی ہوتا رہا ہے، اور یہ اختلاف و ٹکراؤ پھر بھی اصحاب ائمہ کی روایات قبول کرنے میں رکاوٹ نہیں بنا تو اصحاب رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے حق میں قبول روایت سے مانع کیوں ہوگا،

لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ بات اصول و دیانت کی نہیں، بات صرف تعصب و دشمنی کی ہے اور اس سے بھی زیادہ تاثیر صحبت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اہانت و تذلیل کی ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم حالانکہ خود ائمہ کرام نے اصحاب رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو باہمی تخالف میں معذور رکھا، اور ان حضرات کی صداقت بیان فرمائی اور یہ سب کچھ ان کی اپنی صحاح میں موجود ہے، لیکن اس تعصب کا کیا علاج جس نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور کانوں کو بہرا کردیا چنانچہ کتاب کافی کلینی میں باب اختلاف الحدیث" میں حذف اسناد کے ساتھ منصور بن حازم سے یوں روایت ہے،

قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ مَا بَالِیْ اَسْئَلُکَ عَنِ الْمَسْئَلَۃِ فَتُجِیْبُنِیْ فِیْھَا بِالْجَوَابِ ثُمَّ یُجِیْبُکَ غَیْرِیْ فَتُجِیْبُہٗ فِیْھَا بِجَوَابٍ اٰخَرَ فَقَالَ اِنَّا نُجِیْبُ النَّاسَ عَلَی الزِّیَادَۃِ وَالنُّقْصَانِ قَالَ قُلْتُ فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلے اللہ علیہ وسلم صَدَقُوْا عَلٰی مُحَمَّدٍ اَمْ کَذَبُوْا قَالَ بَلْ صَدَقُوْا قَالَ قُلْتُ فَمَا بَالُھُمْ اخْتَلَفُوْا فَقَالَ اَمَا تَعْلَمُ اَنَّ الرَّجُلَ کَانَ یَاْتِیْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَیَسْئَلُہٗ عَنِ الْمَسْئَلَۃِ فَیُجِیْبُہٗ فِیْھَا بِالْجَوَابِ ثُمَّ یُجِیْبُہٗ بَعْدَ ذَالِکَ بِمَا یُنْسِخُ ذَالِکَ بِمَا یُنْسِخُ ذَالِکَ فَنَسَخَتِ الْاَحَادِیْثُ بَعْضُھَا بَعْضًا۔

" میں نے ابی عبداللہؒ سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھوں تو آپ مجھے تو اس کا ایک جواب دیتے ہیں اور جب دوسرا شخص وہی مسئلہ پوچھتا ہے تو اس کو آپ دوسرا جواب دیتے ہیں، فرمایا کہ ہم لوگوں کو کمی زیادتی کے ساتھ جواب دیتے ہیں، پھر میں نے یہ کہا کہ ذرا یہ بتائیے کہ اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ سے صحیح روایات کرتے ہیں یا جھوٹی؛ تو فرمایا صحیح تو میں نے کہا کہ پھر انہوں نے اختلاف کیوں کیا؛ فرمایا کیا تو اتنا نہیں جانتا کہ ایک آدمی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا اور آپ سے کوئی مسئلہ پوچھتا آپ اس کو ایک جواب دے دیتے پھر اس کو اس کے بعد ایسا جواب دیتے جو پہلے جواب کو منسوخ کرتا، اسی لئے بعض احادیث نے بعض کو منسوخ کیا،"

پھر حذف اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے اور وہ ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتا ہے، قَالَ قُلْتُ مَا بَالُ اَقْوَامٍ یَرْوُوْنَ عَنْ فُلَانٍ وَّفُلَانٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلے اللہ علیہ وسلم وَلَا یُتَّھَمُوْنَ بِالْکِذْبِ فَیَجِیْئُ مِنْکُمْ خِلَافُہٗ قَالَ اِنَّ الْحَدِیْثَ یُنْسَخُ کَمَا یُنْسَخُ الْقُرْاٰنُ ۔ اس نے کہا کہ میں نے پوچھا کیا بات ہے کہ بہت لوگ فلاں فلاں سے روایت کرتے ہیں، اور پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اور کسی کو جھوٹ سے متہم بھی نہیں کیا جاتا۔ پھر آپ اس کے خلاف فرماتے ہیں آپ نے فرمایا کہ قرآن کی طرح حدیث بھی منسوخ ہوتی ہے،

دوسرا فائدہ | یہ دوسرا فائدہ پہلے سے بھی زیادہ اہم ہے ہم نے اس کو "سعادۃ الدارین فی شرح حدیث الثقلین" کے لقب سے ملقب کیا، اگر کوئی چاہے تو اس کو بعد کے پانچ ابواب کے ساتھ ملا کر الگ رسالہ بنالے،

واضح رہنا چاہیئے کہ شیعہ اور سنی دونوں کے نزدیک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ فرمودہ حدیث صحیح ہے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَحَدُھُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ کِتَابُ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ میں تم میں دو ثقل چیزیں (بڑی قدر و منزلت والی) چھوڑے جاتا ہوں اگر تم ان کو پکڑے رہوگے تو میرے بعد ہرگز

نہ ہونگے وہ ایک دوسرے سے اہم ہیں، یعنی اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترت میرے اہل بیت، لہٰذا معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام نے دینی معاملات اور شرعی احکام میں یہ دو عظیم القدر چیزیں ہمارے حوالہ کی ہیں، اب جو مذہب ان دونوں کا مخالف ہو وہ باطل اور نامعتبر ہے، اور ایسے ہی جو ان دونوں بزرگ مرتبہ چیزوں سے منکر ہو وہ گمراہ اور دین اسلام سے خارج ہے،

اب ہمیں یہ دیکھنا اور اس کی تحقیق کرنی ہے کہ دونوں فریق میں سے کونسا فریق ان دونوں مضبوط رسیوں کو تھامے ہوئے ہے اور کون سا ان کی تحقیر و اہانت کرتا اور ان سے روگرداں ہے، ان کو درجہ اعتبار سے گراتا اور ان پر طعن کرتا ہے برائے خدا اس بحث کو بہت توجہ اور غور سے نیز از راہ انصاف ملاحظہ فرمائیں. کہ ایک بہت انوکھی بات اور عجیب قصہ ہے، جس طرح اس پوری کتاب میں سارے کے سارے حوالے شیعوں کی معتبر کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں اس بحث میں بھی یہی التزام ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اس کی پابندی کی گئی ہے،

اب شیعہ عقیدہ کے مطابق کتاب اللہ موجود قرآن تو توریت و انجیل کی طرح معتبر اور قابل اعتماد رہی نہیں کیونکہ بقول ان کے اس میں تحریف کی گئی ہے، اس کے بہت سے احکام منسوخ ہو گئے ہیں اس کی بیشتر آیات اور سورتیں جو احکام کی ناسخ اور عمومات کی تخصیص کرنے والی تھیں چوری ہو گئی ہیں، باقی جو ہے اس کے بھی الفاظ بدلے ہوئے اور بعض الفاظ میں کمی بیشی کی گئی ہے، چنانچہ کلینی نے ہشام بن سالم سے روایت کی ہے اور اس نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہ، اِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِیْ جَاءَ بِہٖ جِبْرَئِیْلُ علیہ السلام اِلٰی مُحَمَّدٍ صلے اللہ علیہ وسلم سَبْعَۃَ عَشَرَ اَلْفَ آیَۃٍ جس قرآن کو لے کر جبرائیل علیہ السلام محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے اس میں سترہ ہزار آیات تھیں)۔

اور محمد بن نصر نے انہیں سے روایت کی ہے کہ کَانَ فِیْ لَمْ یَکُنْ اِسْمُ سَبْعِیْنَ رَجُلًا مِنْ قُرَیْشٍ بِاَسْمَائِھِمْ وَاَسْمَاءِ آبَائِھِمْ (کہ سورہ لم یکن میں قریش کے ستر آدمیوں کے نام مع ولدیت درج تھے اور سالم بن سلمہ کی روایت یوں ہے،۔ وَرَوٰی عَنْ سَالِمِ بْنِ سَلَمَۃَ قَالَ قَرَأَ رَجُلٌ عَلٰی اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ وَاَنَا اَسْمَعُہٗ حُرُوْفًا مِنَ الْقُرْآنِ لَیْسَ مَا یَقْرَؤُہَا النَّاسُ فَقَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ مَہْ اُکْفُفْ عَنْ ہٰذِہِ الْقِرَاءَۃِ وَاقْرَأْ کَمَا یَقْرَؤُہُ النَّاسُ حَتّٰی یَقُوْمَ الْقَائِمُ فَاِذَا قَامَ الْقَائِمُ اِقْرَأْ کِتَابَ اللّٰہِ عَلٰی حَدِّہٖ، اس نے کہا کہ میری موجودگی میں ابی عبد اللہ کے پاس ایک آدمی نے قرآن کے ایسے الفاظ پڑھے جو اور لوگ نہیں پڑھا کرتے آپ نے وہ الفاظ سن کر اس سے کہا ٹھہر! ان الفاظ میں قرات کرنے سے اس وقت تک باز رہو جب تک امام مہدی نہ آجائیں اب تو جیسے اور لوگ پڑھتے ہیں تو بھی پڑھ ان کے آنے کے بعد کتاب اللہ کو صحیح طریق پر پڑھنا،

اور کلینی نے نیز دوسروں نے جو روایت حکم بن عتبہ سے کی ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ علی بن حسین نے آیت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ میں نبی کے بعد لفظ مُحَدَّثٍ بڑھا کر اسے تلاوت کیا اور کہا کہ جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مُحَدَّث (صاحب الہام) تھے،

اور محمد بن جہم ہلالی اور دوسروں نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی کہ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ اللہ کا کلام نہیں بلکہ اس آیت میں تحریف ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تو اَئِمَّۃٌ ھِیَ اَزْکٰی مِنْ اَئِمَّتِکُمْ کہ یہ امام تمہارے اماموں سے زیادہ پاک ہیں، ا ھ

اور ان کے اپنے ہاں یہ بات ثابت و طے شدہ ہے اور مشہور ہے کہ بعض صورتیں پوری کی پوری حذف کر دی گئی ہیں، مثلاً سورہ الولایہ اور بعض سورتوں کا اکثر حصہ مثلاً سورہ الاحزاب کہ وہ سورہ انعام جتنی طویل تھی اور اس سورت میں سے اہل بیت کے فضائل اور ان کی امامت کے مسائل نکال دیئے گئے، اور آیت لا تحزن ان اللہ معنا کے شروع سے ویلک تیرا ناس ہو) اور آیت وقفوھم انھم مسئولون کے آخر سے عن ولایۃ علی، ساقط ہیں، اور ویلک بنو امیۃ کو بنو امیہ کا ناس ہو، آیت خیر من الف کے آخر سے حذف ہے، اور بعلی بن ابی طالب کو آیت کفی اللہ المومنین القتال کے بعد سے نکال دیا، لفظ آل محمد کو آیت وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون میں ظلموا اور ای کے بیچ میں سے نکال دیا اور لفظ علی تو آیت لکل قوم ھاد کے بعد سے حذف ہے،

چنانچہ ابن شہر آشوب نے المازندرانی نے کتاب المثالب میں ان تمام تحریفات کا ذکر کیا ہے اور ان آیات کے علاوہ بہت سے کلمات اور بے شمار آیات گنوائی ہیں۔

پس ایسے حالات میں موجودہ قرآن اور توریت و انجیل میں ان کے ہاں کوئی فرق نہیں رہا اور ان کے نزدیک ان تینوں سے کسی بھی طرح تمسک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ تحریف شدہ، مسخ شدہ اور کسی نامعلوم الحال کی منسوخ کی ہوئی ہیں،

اب رہا عترت کا معاملہ! تو اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ لفظ عترت انسان کے اقارب پر بولا جاتا ہے اور یہ لوگ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے نسب کے سب افراد کو عترت سے خارج کرتے ہیں، مثلاً آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ و حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو، اور بعض کو عترت میں شمار نہیں کرتے مثلاً آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اور ان کی اولاد کو اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو، اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہ کی اکثر اولاد کو دشمن جانتے ہیں اور ان کو برائی سے یاد کرتے ہیں، مثلاً حضرت زید بن علی حسین رضی اللہ عنہم کہ بڑے متقی اور عالم تھے۔ جو مروانیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ان کے بیٹے حضرت یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دشمن خیال کرتے ہیں۔ یہی حال جناب ابراہیم بن موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے،

اور جناب جعفر بن موسیٰ رحمہ اللہ علیہ کو تو کذاب کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حالانکہ وہ بڑے پایہ کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے علم طریقت انہیں سے سیکھا ہے ان کے بارے میں انہوں نے یہ غلط مشہور کیا کہ وہ حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے،

اور جعفر بن علی حضرت امام حسن عسکری رحمہما اللہ کے بھائی کو کذاب کہتے ہیں۔

اور حسن بن حسن مثنیٰ ان کے بیٹے عبداللہ محض اور ان کے بیٹے محمد جن کو نفس زکیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ ان تینوں کو کافر اور مرتد کہتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم بن عبداللہ زکریا بن محمد باقر محمد بن عبداللہ بن حسین بن حسن محمد بن قاسم بن حسن اور یحییٰ بن عمر کہ زید بن علی بن حسین کے پوتوں میں سے ہیں، سب کو کافر و مرتد کہتے ہیں،

اور سادات حسنیہ و حسینیہ رحمہم اللہ میں سے ایک جماعت کو جو جناب زید بن علی بن حسین کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں گمراہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ کتب انساب اور کتب تاریخ سادات اس پر بصراحت دلالت کرتی ہیں، کہ اکثر اہل بیت حسنی و حسینی حضرت زید بن علی بن حسین رحمہم اللہ کی امامت و فضیلت کے قائل تھے اور اکثر اثنا عشری ان بزرگوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کافر و مرتد تھے اور یہ کہ یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ چنانچہ آگے چل کر باب معاد میں

ان کی کتابوں سے سارے حوالے نقل کئے جائیں گے،

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک منکر امامت ایسا ہی ہے جیسا منکر نبوت! اور منکر نبوت کافر ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہے گا، اس میں کسی کو کیا شک! اور یہ بزرگ حضرات امام وقت کی ہی امامت کے منکر نہیں ہوئے بلکہ بعض ائمہ گذشتہ کی امامت کے بھی منکر ہوئے،

اثنا عشریہ کی ایک چھوٹی سی جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ لوگ مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ اعراف میں رہیں گے، بعض کہتے ہیں کہ سخت عذاب بھگتنے کے بعد اپنے باپ دادا کی شفاعت سے عذاب سے نجات پائیں گے۔ مگر یہ دونوں ہی قول لغو اور مردود ہیں ان کے اصول و قواعد کے موافق وہ پہلا ہی قول ہے کیونکہ کفار کے حق میں بالا جماع شفاعت مقبول نہیں۔ اور اعراف ہمیشہ رہنے کی جگہ بھی نہیں پھر اعراف میں رہنے کی ان کی کوئی وجہ بھی نہیں کہ یہ تو امامت کے منکر تھے اور امامت کا منکر کافر ہوتا ہے اور کافر کی جگہ دوزخ ہی ہے اعراف نہیں مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ لوگ یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت رکھنے والا دوزخ میں نہیں جائے گا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بزرگ امیرالمومنین کو بلا اختلاف محبوب رکھتے ہیں،

اب یہاں ذرا اس فرقہ کے ناصبیوں کا تماشا دیکھئے کہ ائمہ کرام کے جگر پاروں اور بھائیوں کی یہ کسقدر توہین و تذلیل کرتے ہیں اور اہل بیت کی معدودے چند ہستیوں مثلاً بارہ اماموں یا ان کے چند قرابت داروں کی محبت کی آڑ میں ہزاروں عیوب اور برائیوں کو ان کے سر تھوپتے ہیں اور خوارج سے بڑھ کر ان کی توہین و تذلیل کا ارتکاب کرتے ہیں، سچ ہے نادان دوست سے دانا دشمن بہر حال بہتر ہے، چنانچہ ان کی کتابوں اور روایات کے جائزہ اور چھان پھٹک اور تفتیش و جستجو سے ان سب برائیوں کا راز روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے لیکن یہاں ان کی کفر آمیز بکواس اور گندگی کے انبار در انبار سے بطور نمونہ چند باتیں تحریر کرتے ہیں،۔

اول:۔ یہ کہتے ہیں کہ "امام وقت" صاحب عصر و زماں امام مہدی، اس قدر بزدل ڈرپوک، خوفزدہ اور ترسیدہ ہیں کہ ایک چھوٹی سی جماعت کے ڈر سے روپوش ہو گئے اور چھپے ہوئے ہیں ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر ان کو منظر عام پر آنے کی جرات نہیں ہو رہی گو اس درمیان بڑے بڑے انقلاب برپا ہو چکے عباسی حکومت کا تختہ الٹا چنگیزی دنیا پر چھا گئے پھر وہ مسلمان بھی ہوئے اور محب اہل بیت بھی ہوئے بلکہ بعض تو شیعہ مذہب کے بھی حلقہ بگوش رہے ادھر عراق و خراسان پر جو شیعوں کی کان اور ان کے لئے خطۂ مردم خیز ہے۔ صفویوں نے اپنا تسلط قائم کر لیا اور دوسری طرف ہند و سندھ میں سلاطین دکن، بنگالہ، یورپ کی امامت و وزارت ان کے ہاتھ آئی،

دوسرے:۔ ان کی تمام کتابوں میں جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت موجود ہے یَا مَعْشَرَ الشِّیْعَةِ خِلُّ مَتَّجَلِیِنَا لَنَا وَ كُونُوْ جُهْنًا لَكُمْ۔ غضب خدا کا بدباطن لوگ کتنی آسانی اور اپنے بزرگوں پر اس گندے بہتان کو تھوپنے میں کتنے جری اور بے شرم ہیں،

تیسرے:۔ یہ عترت رسول پر یہ تہمت دھرتے ہیں، کہ حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی کے بارے میں حضرت نے یہ کہا هٰذَا اَوَّلُ فَرْجٍ غُصِبَ لَنَا کس جرات بے باکی اور آسانی سے یہ گندہ و بیہودہ کلمہ اپنی زبان سے نکال رہے ہیں ان پر تو آسمان ٹوٹ پڑنا چاہئے آپ دیکھیں تو سہی کہ اول تو پاکدامن سیدہ کے حق میں جو رسول

کے بدن کا حصہ اور جگر کے جگر کا ٹکڑا ہے، یہ کس قدر گستاخی اور بے ادبی ہے کہ ایسی نجس خصلت کا داغ اس پاکدامن پاک طینت پر لگاتے ہیں،

پھر حضرت امیر و حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کی اس میں کس درجہ بے حرمتی اور بے عزتی ظاہر ہو رہی ہے، اور ایسے ہی حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ان نازیبا کلمات سے کتنی بے غیرتی کا ثبوت ملتا ہے، اول تو ایسے گندے ناشائستہ الفاظ بزرگ لوگ اپنی زبان پہ لاتے ہی نہیں۔ پھر ایسے عضو بدنی کا لفظ جس کے نام و مسمی ہر دو شرمناک اور وہ بھی اپنے بزرگ اقارب کی نسبت کہ اوباش اور شہدہ بھی تو اس سے بچتا ہے، چنانچہ درانیوں کے ہنگامہ کے وقت عورتوں کی جو بے حرمتی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ دہلی کے بازاری لوگ بھی اس شرمناک حیا سوز فعل کو زبان پر لانا اپنے لئے عار سمجھتے تھے چہ جائیکہ اس گندے واقعہ کا احتمال جگر پارۂ رسول کی نسبت گو جبر واکرہ ہی ہوا کسی مسلمان کو کیا تاب کہ اس نازیبا بات کو زبان پر لائے،

چوتھے:۔ کہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی صاحبزادیاں اور بہنیں کافروں اور فاجروں کے نکاح میں دیدیتے ہیں کہ حضرت سکینہ رحمہ اللہ علیہا مصعب بن زبیر برادر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، اسی طرح اپنی قریبی مستورات کو کافر ناصبوں کے عقد میں دیدیتے ہیں جس کی تفصیل کتب انساب سادات میں شرح و بسط سے ملتی ہے،

پانچویں:۔ حضرت صادق رحمۃ اللہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید زمین پہ پھینک دیا۔ اور اس کی توہین کی اس طرح انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کو جلانے کا جو الزام لگایا ہے اسی جیسا الزام یہ خود حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ پر لگاتے ہیں، چنانچہ کلینی نے زید بن جہم ہلالی سے ان الفاظ کی روایت کی ہے اِنَّہٗ قَرَأَ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اَئِمَّۃٌ ھِیَ اَزْکٰی مِنْ اَئِمَّتِکُمْ فَقُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاکَ اَئِمَّۃٌ اَیْ وَاللّٰہِ قُلْتُ اِنَّمَا یَقْرَءُ اَرْبٰی قَالَ مَا اَرْبٰی وَاَوْمَأَ بِیَدِہٖ فَطَرَحَھَا اِھَانَۃً انہوں نے آیت وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا پڑھی اور جب اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ پر پہنچے تو اس کی جگہ اَئِمَّۃٌ ھِیَ اَزْکٰی مِنْ اَئِمَّتِکُمْ پڑھا، راوی کہتا ہے میں نے آپ سے کہا میں آپ پر قربان ۔ کیا یہ لفظ ائمہ ہے کہا ہاں خدا کی قسم میں نے کہا کہ پڑھا تو اربیٰ جاتا ہے فرمایا اربیٰ کیا؟ پھر ہاتھ سے اشارہ کیا اور قرآن مجید کو زمین پہ پھینکدیا۔

چھٹے:۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نص سے ائمہ کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہیں جو ایمان کے بالکل منافی اور علامات مومن کے سراسر مخالف ہے، غرض اس سے یہ ہے کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حوالہ سے ائمہ کے ایمان کو مشکوک اور اس میں رخنہ پیدا کریں اور یہ بات ثابت کریں کہ ائمہ اپنی پوری زندگی میں کسی خوف و خطر کے نہ ہوتے ہوئے بھی حق کو چھپانے اور باطل کو ظاہر کرنے (یعنی تقیہ) پر جمے رہے،

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی وہ نص متواتر جو کہ نہج البلاغہ میں موجود ہے یہ ہے، قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ عَلَامَۃُ الْاِیْمَانِ اَنْ تُؤْثِرَ الصِّدْقَ حَیْثُ یَضُرُّکَ عَلَی الْکِذْبِ حَیْثُ یَنْفَعُکَ۔ (جناب امیر نے فرمایا کہ ایمان کی علامت یہ ہے کہ تو اس وقت سچ نہ بولے جب سچ تجھے نقصان اور جھوٹ فائدہ دیتا ہو)

ساتویں:۔ یہ کہ ائمہ سے بعض قرآن آیات کی ایسی تفسیر نقل کرتے ہیں جو عربی قواعد نحو کے لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں

ہونا غرض خفیہ وہی کہ ائمہ کی ثقاہت علمی کو مجروح کیا جائے، ایسی صورت میں لامحالہ سامع کے دل میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگی کہ یہ حضرات متون عربیہ اور قواعد نحو سے بھی نابلد ہیں یا اس طرح بعض ایسی تفاسیر نقل کرتے ہیں جن میں کلام کا ربط ناقص عبارت بے جوڑ ضمائر میں گڑبڑ اور سیاق سخن مختل ہوجاتا ہے اور جس کی وجہ سے ان حضرات کے کمال علمی کے بارے میں بدظنی پیدا ہوتی ہے،

آٹھویں :۔ ائمہ سے ایسی روایت نقل کریں گے جس سے معلوم ہو کہ وہ جہاد سے روکتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں جس تاکید اور پرزور الفاظ میں جہاد کا حکم دیا ہے، وہ ایک مکتبی بچہ سے بھی پوشیدہ نہیں،

اس طرح یہ ثقلین میں اختلاف پیدا کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں اگرچہ خود ہی روایت بھی بیان کرتے ہیں اگرچہ خود ہی یہ روایت کرتے ہیں کہ لَنْ یَّتَفَرَّقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ۔ (جب تک یہ حوض پر آئیں گے، ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔)

لہٰذا اس عبارت سے صاف پتہ چلا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرماتے ہوئے کہ لوگ میری عترت پر جھوٹ و افترا جوڑیں گے اس لئے ہمیں ان جھوٹوں اور مفتریوں کے قول اور مذہب کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے ایک کسوٹی اور ایک معیار عنایت فرماگئے اور وہ ہے قرآن۔ کہ ہم ان لوگوں سے جو کچھ سنیں ان کو قرآن کی کسوٹی پہ رکھ کر دیکھ لیں ان کی جس روایت یا قول کی قرآن تصدیق کردے اسے صحیح سمجھیں اور جس کی کسوٹی یہ تصدیق نہ کرے اسے جھوٹ اور افترا سمجھ کر جھوٹوں اور مفتریوں کے منہ پر ماریں اور قرآن چونکہ متواتر ہے، ہر وقت ہر جگہ ہر ایک کے پاس ہے یا اس تک رسائی آسان ہے پھر اس کی حفاظت کا انتظام خود اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا ہے کہ بقول اس کے فرمان لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ۔ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ۔ (کہ باطل نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے پھٹک سکتا ہے، وہ حکمت والے اور لائق تعریف اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتاب ہے)، اس لئے وہی معیار اور کسوٹی مقرر کئے جانے کے لائق تھا۔

بخلاف عترت کے کہ بتقاضائے بشریت، موت، غیبت مکانی، بدزبانی اور دوسرے ایسے عوارض ان میں موجود ہیں، جن کی وجہ سے دروغگوئی، افترا پردازی اور بہتان تراشی کا دروازہ کھل سکتا ہے (اور ہوا بھی یہی۔ کہ قرآن کے متعلق تو ان کی اڑائی ہوئی خاک نے انہیں کے منہ کالے کئے، مگر عترت کے ساتھ جس انداز اور طور طریقوں سے اپنا خبث نکالا اور جس جس طرح ان کی عزت کے درپے رہے وہی آپ یہاں ملاحظہ فرمارہے ہیں، ن)

نویں :۔ یہ ائمہ کی طرف منسوب کرکے کہتے ہیں، کہ انہوں نے مطلقہ سے جماع جائز بتایا ہے، حالانکہ یہ تو صاف زنا کو جائز قرار دینا ہوا۔

دسویں :۔ عین ادائیگی نماز کی حالت میں مردانہ مخصوص اعضا سے کھیل ائمہ کے حوالہ اور نسبت سے جائز بتاتے ہیں، کھیل آپ سمجھتے ہی ہیں، اسے آپ بوقت ضرورت ہاتھ چھوجانے پر محمول نہیں کرسکتے اور پھر ایسے کھیل کی عین نماز میں ائمہ کی طرف سے اجازت بھی نسبت تفو برتو اے۔۔۔!

گیارہویں :۔ ائمہ کی طرف یہ بھی منسوب کرتے ہیں کہ جس کپڑے پر نجاست غلیظہ (پاخانہ وغیرہ) لگی ہو اس پر نماز پڑھنا جائز ہے، حالانکہ امور باللہ کے متعلق ائمہ کی طرف سے جواز کا تصور بھی کوئی مسلمان نہیں کرسکتا،

بارہویں:۔ یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ امام نے مردہ جانور کے بچے کا گوشت کھانا جائز بتایا ہے،
تیرھویں:۔ حالت نماز میں بیوی کے ساتھ چوما چاٹی کو بھی ائمہ کے حوالہ سے جائز کہتے ہیں۔ (باب فروع میں انشاءاللہ ان سب کے حوالہ جات انہیں کی کتابوں سے نقل کئے جائیں گے)

چودھویں:۔ عام لوگ خصوصاً عورتوں کو واجبات دینی سے روکنے اور منع کرنے کی نسبت بھی ائمہ کی طرف کرتے ہیں شیخ الطائفہ نے ادیم بن حر کی روایت جناب ابی عبداللہ سے بایں الفاظ نقل کی ہے، قَالَ سَأَلْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ علیہ السلام عَنِ الْمَرْأَۃِ تَرٰی فِیْمَا یَرَی النَّائِمُ عَلَیْهَا غُسْلٌ قَالَ نَعَمْ وَلَا تُحَدِّثُوْهُنَّ فَیَتَّخِذْنَهٗ عِلَّةً (میں نے ایسی عورت کے بارے میں مسئلہ پوچھا جو خواب میں وہ دیکھے جو سونے والا دیکھتا ہے کیا اس پر غسل ہے آپ نے فرمایا ہاں مگر عورتوں کو نہ بتادینا ورنہ وہ اس کو بہانہ بنالیں گی)، اس سے جو بات ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ائمہ جنابت کی حالت میں عورتوں کے نماز پڑھنے کو جائز خیال فرماتے تھے، جو بالاتفاق کفر ہے اور پھر کفر پہ راضی ہونا بھی بالاتفاق کفر ہے اور دوسری یہ بات کہ ائمہ مکلف انسان کے واجبات شریعت سے لاعلم و جاہل رہنے سے خوش تھے، حالانکہ یہ بات منصب و استحقاق امامت اور عدل و مروت کے سراسر خلاف ہے اور اس سے بھی زیادہ صاف اور زیادہ بدتر وہ روایت ہے کہ جو صاحب محاسن (نام کتاب) نے امام کاظم سے روایت کی ہے، اَنَّهٗ قَالَ لَا تُعَلِّمُوْا اَهْلَ الْخَلْقِ اُصُوْلَ دِیْنِهِمْ (مخلوق کے اس طبقہ کو ان کے دین کے اصولوں کی تعلیم نہ دو) اس لغو حکایت و روایت کو کون تسلیم کرے گا کہ جن کا کام ہی دین سکھانا ہے، وہی جب مکلفین کے ایک طبقہ کو دین نہ سکھانے کی تلقین کریں گے تو دوسرا کون دین سکھائے گا۔ "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

پندرھویں:۔ اللہ کے احکام پر ترک عمل کے لئے یہ لوگ ائمہ کو خصوصاً امام باقر و امام صادق رحمۃ اللہ علیہا کو مورد الزام گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تقیہ پر عمل نہیں کرتے حالانکہ یہ خود ہی امام صادق سے یہ روایت بھی کرتے ہیں کہ التقیہ دین آبائی (تقیہ میرے آباء کا دین ہے)، تو پھر ان حضرات نے اپنے باپ دادا کے دین میں ایسے کیا عیب دیکھے کہ اس کو خیر باد کہہ دیا۔

سولہویں:۔ ایسے امور کی نسبت ائمہ کی طرف کرتے ہیں جو کتاب اللہ کے احکام کے صریح خلاف ہے اور غرض یہ ہوتی ہے کہ ثقلین۔ کتاب اللہ و عترت رسول میں اختلاف پیدا اور لوگ دین کے معاملہ میں حیرت و پریشانی کا شکار ہوں چنانچہ کہتے ہیں کہ جو سونا چاندی سکوں کی شکل میں نہ ہو تو ائمہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور نہ ائمہ نے اس کی زکوٰۃ خود دی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی وعید اَلَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (جو سونا چاندی جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ آخر آیت تک)، کا ائمہ کو مصداق ٹھیرائیں۔

سترھویں:۔ کہتے ہیں کہ بیٹے اور دوسرے اعزہ کی موت پہ نوحہ، شور و شیون اور کپڑے پھاڑنا مرد و عورت سب کے لئے ائمہ جائز سمجھتے تھے۔ اس اتہام سے ان کا مقصد ان بزرگان دین کو بے صبروں اور رونے پیٹنے والوں میں شمار کرکے ان کو اس بشارت قرآنی سے محروم کرنا ہے جو صبر کرنے والوں کی شان میں آئی ہے، اور لَیْسَ مِنَّا مَنْ شَقَّ الْجُیُوْبَ (جس نے دامن چاک کیا وہ ہم میں سے نہیں) کی وعید میں ان کو داخل کرنا ہے،

اٹھارویں:۔ حکم قصاص سے نابینا کو یہ مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، جو نص قرآنی کے صریحاً خلاف ہے، اور نسبت اس کی بھی

اماموں ہی کی طرف کرتے ہیں۔

انیسویں ا۔ اگر کسی ذمی نے مسلمان کو قتل کر دیا ہو تو اس کی اولاد کو غلام بنا لینے کے حکم کو بھی اماموں کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی کے شرعی قاعدہ کے بالکل خلاف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

یا یوں آیا ہے۔ لَا یُجْنِیْ عَلٰی وَلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰی وَالِدِہٖ (نہ باپ بیٹے کے بدلے کوئی سزا بھگتے گا نہ بیٹا باپ کے بدلے)، اس لئے کہ اگر اس قسم کا انتقام شرعاً جائز ہو جائے۔ تو شرع محمدی اور قانون چنگیزی میں پھر فرق کیا رہ جائے گا۔
البتہ کافر حربی کی ایسی اولاد کو غلام بنانا جائز ہے جس سے یہ خطرہ ہو کہ اس میں جنگ کی صلاحیت ہے وہ بھی اس مصلحت سے کہ اہل حرب کی آبادی کم ہو۔ اور قاتل ذمی کی اولاد نہ تو لڑائی کے قابل ہے اور نہ وہ اہل حرب آبادی میں داخل ہے وہ تو مسلمانوں کی ذمہ داری میں رہنے والی پر امن آبادی ہے، ان کو کس جرم کی بنا پر غلام بنانا جائز ہے، برخلاف اس کے کہ یہ تو کھلم کھلا عہد شکنی ہے جس کی تمام ادیان و مذاہب مخالفت کرتے اور ایفائے عہد کو سب ہی واجب قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ یہ بات قرآنی حکم اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ (بے شک جان کا بدلہ جان) کے بھی خلاف ہے،

بیسویں:۔ حضرات ائمہ سے یہ بات منسوب کر کے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یوم قتل سے جو ان کے خیال میں ۹ ربیع الاول کو ہوا دو روز بعد تک کسی کے اعمالنامے میں کوئی گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ نہیں لکھا جاتا اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اعمال نامے لکھنے والے سارے فرشتوں کو دشمنان فاروق اور ان کے قاتل۔ اور قتل کی سازش میں شریک لوگوں کے اعمالنامے سیاہ کرنے پر لگا دیا ہوگا کہ ان کا جرم اتنا شدید تھا اور فرد جرم اتنی طویل تھی کہ دو روز اس کی تکمیل میں لگ گئے ہوں گے ن) گویا یہ کہہ کر وہ اماموں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے تین دن تک لوگوں کو گناہ حتی کہ کفر تک کی اجازت دیدی کہ ان دنوں میں جو چاہو کرو نامہ اعمال سادہ کے سادہ رہیں گے۔

اکیسویں ا۔ ان پاک اور برگزیدہ ہستیوں کی طرف یہ بات بھی منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے استنجے کے پانی کو پینے کے کام کے لئے یا طہارت اور دیگر ضروریات میں استعمال کو جائز قرار دیا ہے،

بائیسویں ا۔ حضرات ائمہ سے روایت کرتے ہیں کہ امت مرحومہ کا لقب امت ملعونہ ہے۔ صیرفی نے ابی عبداللہ رح سے اس کی روایت کی ہے۔ بعض اور جناب صادق رح سے یہ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے امت مصطفویہ کو خنازیر سے تشبیہ دی ہے یہ روایت کلینی نے امام صادق رح سے نقل کی ہے۔ حالانکہ قرآن نے اس امت کو خیر امت کے لقب سے سرفراز کیا اور ان ہی کی شان میں اُمَّةً وَّسَطًا" فرمایا۔

تحریر بالا کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ اس ساری ہفوات کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ ثقلین۔ جو حوض پر پہنچنے تک متحد و متفق رہیں گے۔ ان میں مخالفت، جدائی اور افتراق کی راہ نکالی جائے۔ تاکہ سر رشتہ دین ہاتھ سے جاتا رہے اور مادر پدر آزاد ہو کر چوپایوں اور درندوں کی زندگی بسر کرنے کا سنہرا موقعہ مل جائے، اس لئے کہ جب ایک طرف کتاب اللہ میں تحریف، کمی بیشی، تغیر و تبدل، کے سبب تمسک کے قابل نہ رہے اور دوسری طرف عترت بھی مجروح ہو کر رہنمائی کے قابل نہ رہے تو انسانی اور دینی زندگی کی تصدیق کون کرے گا جب ثقلین سے گلو خلاصی کرالی، تو اب حیوانی زندگی کے سوا مخلوق کے پاس کیا ہے۔ اسی کو تو جنگل کا قانون کہا جاتا ہے جس کا جو چاہے کرلے، کوئی بندش نہیں کوئی پابندی

نہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں جس کی چاہو جان لے لو، جس کی اور جب چاہو آبرو ریزی کر ڈالو۔ اب آپ دیکھ لیں، حدیث ثقلین کی پاسداری کون کر رہا ہے اور اس کی تحقیر و توہین، کون،

اس اہم فائدہ کے اختتام پہ ایک ذیلی فائدہ کا ہم اور اضافہ کر رہے ہیں کہ اس کا مضمون بہت عمدہ اور نفیس ہے،

ذیلی فائدہ واضح رہے کہ شیعہ پیشواؤں نے اماماں محترم سے جو کچھ روایات بیان کی ہیں اور ان کی تائید میں عترت رسول کے جو اقوال و افعال بیان کئے ہیں ان سب کی ائمہ کے فرزندوں سگے اور چچیرے بھائیوں نے شد و مد اور تکرار و اصرار کے ساتھ تردید و تکذیب کی ہے،

اور یہ بات ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے کہ انسان کے اقوال و افعال پر جس طرح اس کے بیٹے، بھائی، خویش اقربا جتنے واقف ہوتے ہیں، دوسرے لوگ اتنے واقف نہیں ہوتے، اور پھر وہ بیٹے بھائی اور عزیز ان کے ہمدم و ہمسایہ ہم مشرب اور طریق بود و ماند و رسم و آئین میں ان کے ہم جنس بھی ہوں اور ان کی تردید و تکذیب صحیح روایات کی صورت میں خود ان کی کتابوں میں بھی موجود ہو، اس کے مقابلہ میں ایسے لوگ جنہیں ائمہ کی صحبت گاہے بگاہے ہی نصیب ہو ان اقربا کے مقابلہ میں اعتماد میں کیسے بڑھ سکتے ہیں۔

ہم یہاں دو ایک مسائل بطور نمونہ تحریر کرتے ہیں وہ بھی اس لئے تاکہ ان کے جھوٹ کا پول اچھی طرح کھل جائے مثلاً حضرت زید شہید رحمہ اللہ علیہ، جو حضرت امام سجاد رحمہ اللہ علیہ کے فرزندوں میں سے ہیں، اور علم و تقویٰ نیکی و پارسائی اور بزرگی میں سربلند و ممتاز، انہوں نے امام موصوف کے راویوں کی بہت سی روایات کو جھٹلایا اور ان کی تکذیب کی ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام پر ائمہ کی فضیلت والی روایات، اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم پر تبرا کرنے اور ان کی شان میں دریدہ دہنی اور گستاخی کرنے پر ان کو گمراہ قرار دیا ہے،

ہم یہاں مختصر طور پہ مسئلہ امامت پہ گفتگو کرنا یوں ضروری خیال کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان کے نزدیک اہم اور اہل بیت کے ایسے اجماعی اور متواتر مسائل میں شمار کیا جاتا ہے، جن سے اس عالی خاندان کے ہر فرد کو پورے طور پہ واقف ہونا لازم اور ضروری ہے، روی الکلینی عن ابان قال اخبرنی الاحول ان زید بن علی بعث الیہ وھو مختف فاتیتہ فقال یا ابا جعفر ما تقول ان طرقک طارق منا اتخرج معہ قال لہ فقلت لہ ان کان ھو اباک او اخاک خرجت معہ فقال لی ارید ان اخرج فاجاھد ھؤلاء القوم فاخرج معی فقلت لا افعل جعلت فداک فقال اترغب بنفسک عنی فقلت انما ھی نفس واحدۃ فان کان للہ فی الارض حجۃ فالمتخلف عنک ناج والخارج معک سواء قال فقال یا ابا جعفر کنت اجلس مع ابی فی الخوان فیلقمنی البضعۃ السمینۃ ویبرد اللقمۃ حتی تبرد شفقۃ علی من حر النار اذا اخبرک ولم یشفق علی بخبرنی قال فقلت خاف علیک ان لا تقبل فتدخل النار واخبرنی فان قبلت نجوت وان لم اقبل لم یبال ان ادخل النار۔ کلینی ابان سے روایت کرتا ہے کہ ابان کو احول نے بتایا کہ زید بن علی نے جن دنوں وہ پوشیدہ تھے اس وقت کسی شخص کے ذریعہ مجھے بلوایا جب میں گیا تو فرمایا اے ابو جعفر کیا خیال ہے کہ اگر ہمارے پاس کا کوئی آدمی اچانک تمہارے پاس پہنچے تو کیا تم اس کے ہمراہ نکل کھڑے ہوگے، نہیں نکلو گے نا۔ میں نے کہا اگر وہ آپ کے باپ، بھائی ہوں تو میں ضرور ہی نکلوں گا۔ تب آپ نے بتایا کہ میرا ارادہ اس قوم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور جہاد کرنے کا ہے، تو تم بھی میرا ساتھ دو۔ میں نے کہا قربانت شوم میں ایسا نہیں

کر سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا تو کیا میرے بغیر زندگی چاہتے ہو؛ اس پر میں نے کہا اچھا اٹھیے۔ یہ ایک جان ہے جو حاضر ہے۔ اگر زمین میں اللہ کے لئے حجت ہے تو آپ کے ساتھ چلنے اور نہ چلنے والا دونوں برابر ہیں اس کے بعد انہوں نے کہا ابو جعفر میں اپنے باپ کے دستر خوان پر ہوتا تھا وہ مجھ کو بہتر چیز کا لقمہ کھلاتے اور مجھ پر شفقت کر کے گرم لقمہ کو ٹھنڈا کر کے کھلاتے، تو کیا دوزخ کی آنچ سے بچانے کے لئے ان کی شفقت میرے ساتھ نہ رہی ہوگی کہ اس معاملہ کی تجھے تو خبر دی اور مجھے نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر آپ نے ان کی وہ بات نہ مانی تو آپ دوزخ میں چلے جائیں گے اور مجھے اس لئے خبر دی کہ میں اسے مان لوں گا، تو نجات پا جاؤں گا، اور انکار کر دوں گا۔ تو مجھے دوزخ میں جلنے کا اتنا ڈر بھی نہیں ہے)۔

دراصل بات یہ تھی کہ احول کا کہنا تھا کہ جناب زید کے مقابلہ میں ان کے والد نے محمد باقر کو امام متعین کیا ہے اور اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت زید شہید نے امام باقر کی تعیین کی روایت کو جھٹلایا ہے،

اب امام صادق جو امام محمد باقر کے بیٹے اور فرزند ہیں ان کی دوسری روایت کو بھی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ وہ جناب زید شہید کی تائید کر رہی ہے یا اس بھینگے (احول) کے قول کی قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں فضیل بن یسار کے حالات لکھتے ہوئے امالی شیخ ابن بابویہ سے فضیل کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا کہ جب زید بن علی رحمہ اللہ علیہ، کی شام کے باغی لشکر سے لڑائی ہوئی تو میں ان کے ہمراہ تھا حضرت زید کی شہادت کے بعد میں مدینہ حضرت صادق رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گیا تو آپ نے مجھ سے پوچھا فضیل تم شامیوں کے ساتھ لڑائی میں ہمارے چچا کے ساتھ تھے میں نے کہا ہاں، پوچھا تم نے کتنے آدمی مارے؛ میں نے کہا چھ؛ پھر پوچھا کہ تمہارے دل میں یہ شک تو نہیں کہ تم نے ان کو ناحق مارا؛ میں نے کہا یہ شک ہوتا تو ان کو مارتا ہی کیوں اس وقت میں نے آپ کو یہ الفاظ فرماتے سنا اَشْرَكَنِيَ اللّٰهُ فِي تِلْكَ الدِّمَاءِ وَاللّٰهِ زَيْدٌ عَمِّيْ حَضُوَ وَاَصْحَابُهُ شُهَدَاءُ مِثْلَ مَا مَضٰى عَلٰى عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ وَاَصْحَابِهِ انتہی بلفظہ، (اللہ مجھے بھی ان خونوں میں شمار فرمائے اللہ کی قسم میرے چچا زید اور ان کے ساتھی ایسے ہی شہید ہیں، جیسے حضرت علی بن ابو طالب اور ان کے ساتھی شہید ہیں۔ اس کے الفاظ ختم ہوئے)

اب حق گو امام صادق رحمہ اللہ علیہ کے کلام میں جو تشبیہ ہے وہ غور طلب ہے، یہ تو ظاہر ہے، کہ جناب صادق رحمہ اللہ علیہ کے اعتقاد میں حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کا حال جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے حال کے مماثل، ہم مرتبہ اور ہم جنس ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت زید اپنے اعتقاد کے مطابق دشمن کے مقابلہ میں بنفس نفیس خود بخود جانے میں حق بجانب ہوں گے یہ نہیں ہوا کہ اپنے کسی مناسب نائب کو مقرر کیا ہو اگر ایسا ہوتا اور آپ شریک نہ ہوتے تو آپ کی شہادت کی گواہی اور اس شہادت کو امیر المومنین کی شہادت کے مماثل قرار دینے والی گواہی بے معنی اور بے فائدہ ہوگی اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ احول نے امام زادے کے متعلق جو بکواس کی اور بے وفائی کو اس کا سبب قرار دیا وہ چند وجوہ سے لغو، پوچ اور بے معنی ہے،

اول:۔ اس صورت کو اگر درست مانا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اپنے والد کے معاملہ میں ترک اصلح کا الزام آئے گا کہ انہوں نے ان کو دین کی دعوت ہی کیوں دی کہ جس کا انکار کر کے وہ دوزخ میں چلے گئے ممکن ہے شیعہ اسے تسلیم نہ کریں کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے ایمان کے قائل ہیں تو چلئے ہم یہی بات آزر کے متعلق کہتے ہیں

جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرورش کیا اور وہ بمنزلہ باپ کے تھے اسی لئے قرآن میں جابجا اب کے لفظ سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ تو ان کے معاملہ میں یہ رویہ کیسے روا رکھا۔

اور یہ بات یہیں ختم نہیں ہوگی تمامی پیغمبران حق کہ نبی رحمت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی اور ان پر بھی اس ظلم ناروا اور قطع رحمی کے ارتکاب کا الزام آئیگا (نعوذ باللہ) کیونکہ ان تمام گرامی قدر حضرات نے اپنے اعزہ و اقارب کو دین کی دعوت دی مثلاً حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ابولہب کو دعوت دین دی اور اس نے اسے قبول نہ کیا۔ حالانکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنی تمامی امت کی حیات ابدی کا سبب اور اس پر ماں باپ سے زائد مہربان، شفیق اور ہمدرد تھے اور کل عالم و عالمیان کے لئے مجسم رحمت ان تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے تعین امام کی مصلحت محسوس نہ فرمائی بلکہ اس پر سکوت فرمایا۔ چنانچہ ملا عبداللہ مشہدی نے اظہار الحق میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ قَالَ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَسْتَخْلَفْتَ۔ قَالَ اِنِ اسْتَخْلَفْتُ عَلَیْکُمْ فَعَصَیْتُمُوْہُ عُذِّبْتُمْ وَلٰکِنْ مَا حَدَّثَکُمْ حُذَیْفَۃُ فَصَدِّقُوْہُ وَمَا اَقْرَاَکُمْ عَبْدُ اللّٰہِ فَاقْرَءُوْہُ (ابو حذیفہؓ کہتے ہیں کہ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا آپ نے کوئی خلیفہ مقرر فرمادیا ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں تم پر کسی خلیفہ کو مقرر کردوں اور تم اس کی نافرمانی کرو تو عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے، ہاں ابو حذیفہ جو تم سے کہے اسے سچ جانو اور جو عبداللہ تم کو پڑھائے اس کو پڑھو!)

پھر آخر یہ کیا ہوا کہ آپ نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی امارت کا حکم صریح فرمادیا اور اس کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا گویا اپنے تئیس سال مدت تک کے تمام ساتھیوں اور جانثاروں کو جنکو آپ نے آئین اسلامی سکھا کر راہ راست پر لگایا تھا ابدی ہلاکت میں ڈال کر سب کو دوزخی بنا گئے، اور ان کی دیکھا دیکھی ساری ہی امت بہک کر قعر ضلالت میں جا گری۔

دوسرے:۔ امامت تو اصول واجبات میں سے ہے تو اس سے ناواقفیت عذر کب بن سکتی ہے اگر جناب زید کے والد بزرگوار نے ان کو اصل اعتقاد ہی سے باخبر نہ کیا تھا تو انہوں نے بغیر علم و اطلاع کے نام کر کے دوزخی بننا کیوں چاہا۔ پھر یہی نہیں کہ جناب زید صرف جہل پر ہی قانع رہے ہوں بلکہ امام باقر کی امامت کے منکر بھی ہوئے اور اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اگر اس قسم کا جہل بھی عذر بن سکتا ہے تو کبار صحابہ بلکہ نواصب کے ناجی ہونے میں کیا شک رہ جائے گا۔ کیونکہ ان کو بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نصوص قطعی اور تواتر سے نہیں پہنچیں، اور جو پہنچیں وہ صحیح روایات کے معارض تھیں چنانچہ کلینی نے ایک طویل حدیث کے ذیل میں مقرن سے اور اس نے ابی عبداللہ سے یہ روایت بیان کی، اَنَّہٗ قَالَ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ عَرَفَنَا وَعَرَفْنَاہُ وَلَا یَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا مَنْ اَنْکَرَنَا وَاَنْکَرْنَاہُ جنت میں وہی داخل ہوگا جس نے ہم کو پہچانا اور جس کو ہم نے پہچانا اور دوزخ میں صرف وہی جائے گا جس نے ہم کو نہ پہچانا اور جس کو ہم نے نہ پہچانا۔

تیسرے:۔ جناب زیدؒ کا قول، اور مذہب ہے کہ ان کے والد نے تو ان کو یہ تک نہ بتایا کہ دنیا میں ایک امام کا ہونا بھی ضروری ہے جو قیادت کبریٰ کا مالک ہو اور زمین پر اللہ کی حجت بنے یہی نہیں بلکہ تعیین امام اور ائمہ کی تعداد سے بھی باخبر نہ کیا۔ اور پہلی بات اگر ان کے والد بتاتے تو اس میں تو قبول نہ کرنے کا کوئی خوف بھی نہ تھا۔ لہٰذا اس بھیگے احول نے جو جواب جناب زیدؒ کو دیا وہ خطا بر خطا ہے کہ ان کے والد بزرگوار نے امام کی پوشیدہ باتیں کیوں نہ بتائیں کہ وہ خود ہی سمجھ جاتے کہ فلاں ہے، میں نہیں ہوں حالانکہ اثنا عشریوں کے نزدیک جو خاص نشانیاں اور خصوصیات ہوتی ہیں مثلاً ختنہ شدہ اور ناف بریدہ ہونا کہ یہ دوسرے میں نہیں ہوتیں اور جناب زید کا صفحہ ہستی ان نشانیوں سے سادہ تھا۔

چوتھے ا۔ یہ کہ امام چونکہ نبی کا قائم مقام ہے اس پر بھی یہ فرض ہے کہ ہر مکلف کو وہ جو بھی ہو ضروریات دین سے واقف کرے کہ اس کا فیض عام ہو، یہاں باپ کا پیار، بیٹے کی محبت کو دخل انداز نہ ہونا چاہیئے اور اپنے پرایوں میں فرق کرنا شان نبوت وامامت کے سراسر خلاف ہے، بلکہ اپنوں کو پرایوں سے پہلے اور زیادہ ڈرانا چاہیئے چنانچہ ارشاد ربانی ہے وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (آپ اپنے کنبہ والوں کو ڈرائیے) یا فرمایا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا (تاکہ وہ اہل مکہ اور گردونواح کے لوگوں کو ڈرائے)

پانچویں ا۔ شیعوں کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ بارہ اماموں کی تعیین اور ان کی ترتیب جناب رسالتماب صلے اللہ علیہ وسلم سے بحکم صریح منقول ہی نہیں بلکہ منزل من اللہ ہے۔ جب یہ بات ہے تو پھر باپ کے قول کو قبول کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں،

ان کو تو چاہیئے تھا کہ یہ حکم بھی تمام احکام دین کی طرح ان تک پہنچاتے کہ جان کے ساتھ اس کو بھی قبول کرتے،

چھٹے ا۔ یہ کہ باپ کی تبلیغ کی اس میں ضرورت ہی کیا تھی جب کہ یہ نص تمام عالم میں شہرت پا چکی تھی کیونکہ یہ متواتر تھی، خصوصاً اہل بیت میں کہ وہ وہاں تو اس قدر مشہور اور معروف تھی کہ ہر گھر کی لڑکی پڑھتی پڑھاتی رہتی تھی مثلاً رکعات نماز کی گنتی اور اس کے اوقات، کیونکہ امام پر مسائل خفیہ کی تعلیم موقوف ہوتی ہے نہ ان نصوص متواترہ کی جو صاف ظاہر ہیں۔

اور پھر تمام مذاہب وادیان میں یہ بات مشہور و معروف اور رائج ہے کہ سن بلوغ سے پہلے بچوں کو دینی مسائل کے اصول سکھائے جاتے ہیں، تو یہ مسئلہ جو دین کے اہم مسائل میں سے ہے تو حضرت سجاد نے کس طرح اپنے فرزند دلبند سے چھپائے رکھا۔ حالانکہ جناب زید باتفاق شیعہ وسنی سعادتمند بیٹوں میں سے تھے، اپنے والد بزرگوار کے ہردم رفیق صحبت اور زندگی بھر والد کے نقش قدم پر چلے، تو ایسے فرزند سے انکار و تکذیب کا کیا خطرہ۔

ساتویں ا۔ اگر جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ جناب زید؟ کو نہ بھی بتایا ہو تب بھی امام وقت نے تو بہر حال اپنی امامت کی دعوت دی ہوگی خواہ انہوں نے یہ دعوت قبول کی ہو یا نہ کی ہو، لہذا اس کا خبر نہ دینا بالکل عبث رہا۔ حالانکہ حضرت ائمہ کا دامن ان تمام لغو اور بے فائدہ حرکات سے پاک ہے،

بعض ناسمجھ شیعہ اس معاملہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب پر قیاس کرتے ہیں کہ وہاں بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے آپ کو منع فرما دیا تھا۔ کہ بھائیوں کو خواب نہ سنانا کہیں وہ حسد میں آکر کوئی ایذا نہ پہنچائیں حالانکہ یہ قیاس بالکل ہی غلط اور فاسد ہے کیونکہ دونوں صورتیں ایک نہیں ہیں، وہاں خواب کا بیان کرنا نہ حضرت یوسف علیہ السلام پر واجب اور ضروری تھا نہ حضرت یعقوب علیہ السلام پہ اور نہ وہ اصول دین تھا، نہ مسائل شرعیہ میں کا کوئی مسئلہ، وہ محض ایک بشارت جو حضرت یوسف علیہ السلام کی علو شان کو ظاہر کرتی تھی۔ اور بشارت کا ظاہر کرنا پیغمبر پر واجب نہیں بلکہ بہت سے مواقع پر تو اس سے روکا گیا ہے، تاکہ صاحب خواب کے لئے باعث عجب وخود بینی اور سامع کے لئے باعث حسد نہ ہو،

چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث صحیح ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر قریش کے اترا جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو اللہ کے ہاں ان کی جو خوبیاں ہیں انہیں فاش کر دیتا" اسی طرح آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اس شخص کے جنت میں داخل ہونے کی خوشخبری سنائی جو صدق دل سے کلمہ پڑھ لے، تو اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں اس

خوشخبری کا چرچا نہ کرنا کہیں لوگ اس پہ اعتماد کر کے نہ بیٹھ رہیں" اور عمل چھوڑ بیٹھیں،
اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت اس خواب کی تعبیر پر موقوف بھی نہ تھی، برخلاف آنے والے اماموں کی امامت کے کہ وہ پوری کی پوری ائمہ سابقہ کی نص اور تبلیغ پر موقوف ہے، اور مکلف کے لیئے اس کے بغیر علم حاصل کرنا محال و ناممکن ہے،

غرضیکہ عترت پاک سے تمسک کا جو طریقہ شیعوں کا ہے اس کا حال واضح ہوگیا اور کتاب اللہ ان کے خیال و گمان کے مطابق پہلے سے ہی قابل تمسک نہیں ہے لہذا دین کی دونوں مضبوط رسیاں (حبل المتین) ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں اور یوں یہ میدان گمراہی میں حیران و پریشان رہ گئے (اور آج تک ہیں اور انشاء اللہ تاقیام قیامت رہیں گے)۔

اگر شیعہ یہ کہیں کہ گو ہم بعض ائمہ کو کافر، یا گمراہ کہتے اور بعضوں کی برائیاں اور عیوب بیان کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کے اقوال و افعال کو اپنے لیئے حجت بناتے ہیں بخلاف اہل سنت کے۔

اور تمسک کے معنی بھی یہی ہیں کہ کسی شخص کے قول و فعل کو اپنے لیئے ہدایت کا نمونہ بنایا جائے خواہ وہ تعظیم کی صورت میں ہو یا اہانت و تحقیر کے پیرائے میں مثلاً اگر کوئی شخص خدانخواستہ کتاب اللہ کو کوڑی پہ پھینک دے یا اپنے پیرومرشد کے پاؤں میں رسی باندھ کر جھانکروں میں گھسیٹے، مگر اسی کے ساتھ قرآن مجید کے احکام کی بجاآوری اور مرشد کے قول و فعل کی بجاآوری میں سرمو فرق نہ آنے دے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اقوال و افعال دونوں کے ساتھ تمسک کیا بخلاف اس کے کہ قرآن کی تعظیم تو خوب کریں اسے سر پہ اٹھائیں آنکھوں سے لگائیں۔ پر اس کے ساتھ اس کے احکام کی پوری خلاف ورزی کریں،۔

ایسے ہی پیرومرشد کی تعظیم و تکریم تو حد سے زیادہ کریں مگر اس کے قول کو ٹھکرادیں تو اس وقت اس کو تمسک نہ کہا جائے گا۔ ان کے اسی قول کی تردید میں کتاب میں پانچ ابواب کا اضافہ مناسب سمجھا گیا کہ عقائد و فقہ کے ہر مسئلہ میں ثقلین سے جہاں جہاں مخالفت کی ہے اس کو ان ہی کی معتبر کتابوں میں درج صحیح و مستند روایات سے بیان کیا جائے کہ ان کا منہ بند ہو اور ان کا طریقہ تمسک روز روشن کی طرح سامنے آجاتے،۔

پانچواں باب : مسائل الٰہیات

عقیدہ (۱): ان مسائل میں سب سے پہلا اللہ تعالیٰ کی معرفت میں غور و فکر کے وجوب کا ہے، اور اس میں اہل سنت اور اہل تشیع مختلف الخیال ہیں۔

امامیہ کہتے ہیں کہ اس میں غور و فکر کا وجوب عقلی ہے، شرعی نہیں ہے۔ یعنی قطع نظر اللہ تعالیٰ کے حکم کے صرف عقل کا یہ تقاضا ہے کہ ہر مکلف اللہ تعالیٰ کو جانے اور اس کی صفات کو پہچانے۔

جب کہ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شرعی وجوب ہے عقلی نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے قطع نظر کر کے محض عقل سے اس پر غور و فکر واجب نہیں اور اسی مسئلہ پہ کیا مختصر کسی بھی دینی معاملہ میں عقل کو حاکم و حکم نہیں سمجھنا چاہیئے اور نہ اس کے حکم کی پیروی کرنی چاہیئے۔

اس معاملہ میں عقل پر انحصار کر کے امامیہ نے "ثقلین" کی مخالفت کی ہے کتاب اللہ کی مخالفت کا ارتکاب تو اس طرح کہ کتاب اللہ میں فرمایا گیا ہے، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (حکم صرف خدا ہی کا ہے) اَلَا لَهُ الْحُكْمُ۔ (سن لو حکم صرف اسی کا ہے) لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (اس کے حکم کو ٹھکرانے والا کوئی نہیں) يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے)، وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (ہم جب تک رسول نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیتے۔

اگر بتقاضائے عقل کوئی چیز واجب ہوتی تو رسول کے بھیجے جانے سے قبل اس پر عذاب دیا جاسکتا تھا۔

اور عترت کی مخالفت اس طرح کہ کلینی نے کافی (کتاب) میں امام ابی عبداللہ رحمہ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ اَنَّهٗ قَالَ لَيْسَ لِلّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ اَنْ يَعْرِفُوْهُ وَلِلْخَلْقِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُعَرِّفَهُمْ (انہوں نے کہا مخلوق پر خدا کا یہ حق نہیں کہ وہ اسے پہچانیں البتہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا یہ حق ہے کہ وہ ان کو معرفت بخشے۔

لہٰذا اگر بحکم و بتقاضائے عقل معرفت واجب ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے معرفت دینے سے قبل ہی معرفت واجب ہوتی اور ایسا سمجھنا جناب صادق (ابی عبداللہ) رحمہ اللہ علیہ کے قول کے خلاف ہے۔

عقیدہ (۲) :- یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، واحد و یکتا ہے۔ حی ہے سمیع ہے۔ بصیر و علیم ہے اور قدیر ہے، اس کے برخلاف اسمٰعیلیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ موجود ہے نہ معدوم، نہ زندہ ہے، نہ مردہ۔ نہ سننے والا، نہ دیکھنے والا نہ اندھا ہے نہ بینا، نہ عالم ہے نہ جاہل، نہ قادر ہے نہ عاجز، نہ ایک ہے نہ کئی،

اس عقیدہ میں "ثقلین" کی مخالفت اتنی ظاہر و عیاں ہے، کہ کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں قرآن مجید کی ہزاروں آیات اور ائمہ کی سینکڑوں احادیث اس عقیدے کی کھلی تردید کرتی ہے،

عقیدہ (۳) :- اللہ ایک ہے اس عقیدہ کا قرآنی آیات اور احادیث ائمہ ثبوت سے ظاہر و باہر ہونے کے باوجود خطابیہ خمیسیہ، اثنینیہ اور مقنعیہ خدا تعالیٰ کی کثرت کے قائل ہیں۔ اور یہ سب شیعوں کے فرقے ہیں۔

عقیدہ (۴) :- یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت ابدیت (ہمیشگی) میں یکتا اور اکیلا ہے کوئی اور دوسرا اس میں اس کیساتھ شریک نہیں۔ کیونکہ اس کی ذات و صفات کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ فانی اور نو پید ہے۔ مگر امامیہ کے فرقے کاملیہ عجلیہ، نزرامیہ، قرامطہ اور نزاریہ کہتے ہیں، کہ آسمان و زمین بھی ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے ان کا یہ عقیدہ بھی ثقلین کا مخالف ہے! حالانکہ قرآنی آیات ان کی پیدائش بالترتیب کو ظاہر کرتی ہیں،

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ (وہ وہ ذات ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں تخلیق کیا، قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ (آپ ان سے پوچھئے کیا یہ اس ذات کا انکار کرتے ہیں جس نے زمین کو دو یوم میں پیدا کیا)

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (پھر آسمان کی طرف بلند ہوا، اور آسمان دھواں دسا لگتا) ہے) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (اور اس کے بعد زمین کو بچھایا)

ان قرآنی آیات کے علاوہ امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے خطبوں مندرجہ نہج البلاغہ میں اس کی تصریح و وضاحت ہے۔ کہ ازل میں اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہر شے کو کتم عدم سے عالم وجود میں لایا اس کے علاوہ مذکورہ بالا فرقے عالم کو بھی ابدی مانتے ہیں۔ منصوریہ، معمریہ فرقے بھی اس عقیدہ میں ان کے ہم نوا اور

شریک ہو گئے۔ حالانکہ ائمہ کی صحیح و متواتر روایات آسمان و زمین کے فنا ہونے پر ناطق ہیں اور قرآنی آیات میں تو اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے، ارشاد ہے، اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا) اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان کھل جائے گا) وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ (جس دن آسمان مع ابر کے شق ہو جائے گا) وَكُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (اس پر جو کچھ بھی ہے فانی ہے) وَكُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز مٹ جانے والی ہے)

عقیدہ (۵) یہ کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ساتھ زندہ علم کے ساتھ عالم اور قدرت کے ساتھ قدرت والا ہے اور اسی طرح اور صفات بھی اس میں موجود ہیں جس طرح اس کے نام اس کی ذات پر اطلاق ہوتے ہیں،

امامیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صفات سے عاری ہے۔ البتہ ان صفات کے مشتقات اس کی ذات پر بولے جا سکتے ہیں، مثلاً یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ حی ہے عالم ہے سمیع ہے، بصیر ہے قدیر ہے، اور قوی ہے! مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے لئے حیات ہے، علم ہے، قدرت ہے، سمع ہے و بصر ہے،

ان کا یہ عقیدہ عقل کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ ثقلین کے بھی مخالف ہے قرآن کی مخالفت تو اس طرح ہے کہ بہت سی آیات ان صفات کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتی ہیں، مثلاً وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ (وہ اس کے علم کا کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتے) اَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ (اس کو اتارا علم کے ساتھ)

عترت کی مخالفت اس طرح کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ان خطبوں میں جو نہج البلاغہ میں درج ہیں جا بجا اللہ تعالیٰ کی صفات مذکور ہیں،

مثلاً عَزَّتْ قُدْرَتُهُ (اس کی قدرت غالب ہے) وَسِعَ سَمْعُهُ الْأَصْوَاتَ (اس کا سننا آوازوں پر حاوی ہو گیا)۔

علاوہ ازیں ائمہ سے بطریق تواتر یہ صفات مروی ہیں۔

عقیدہ (۶)۔ یہ ہے کہ ذات باری کی صفات قدیم ہیں، وہ کسی بھی وقت عاجز و جاہل نہ تھا۔

مگر زرارہ بن اعین، سلیمان جعفری، محمد بن مسلم۔ جو امامیہ فرقہ کے مقتدا اور پیشوا اور ان کی احادیث کے راوی ہیں اور جن کو وہ وجوہ الطائفہ اور عیون الطائفہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ازل میں نہ عالم تھا نہ سمیع و بصیر۔ یہاں تک کہ جب تمام مخلوقات کو یہ صفات بخشے تو خود کو بھی علم و سمع و بصر کی صفات سے متصف فرمایا۔

اب اس عقیدہ کی مخالفت کتاب اللہ سے تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ جا بجا كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا، عَزِيْزًا حَكِيْمًا، سَمِيْعًا بَصِيْرًا فرمایا۔

اور عترت سے مخالفت سو وہ اس طرح کہ کلینی نے ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے اَنَّهُ قَالَ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرُهُ، وَلَمْ يَزَلْ عَالِمًا، انہوں نے فرمایا ایک وقت ایسا تھا کہ اللہ تھا اور کوئی چیز اس کے ساتھ نہ تھی، اور وہ ہمیشہ سے عالم ہے))

ایسے ہی کلینی اور دوسرے امامیہ مختلف طرق سے ائمہ سے روایت کرتے ہیں اَنَّهُمْ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ

سُبْحَانَهٗ لَمْ يَزَلْ عَالِمًا سَمِيْعًا بَصِيْرًا (کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے سمیع و بصیر ہے)

عقیدہ (۷) اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے۔ جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، مگر اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر و مختار نہیں ہے۔ وہ جس چیز کو پسند کر لیتا ہے، وہ چیز بے اختیار اس طرح موجود ہو جاتی ہے جس طرح سورج نکلنے پر شعاع موجود ہو جاتی ہے،

یہ عقیدہ کتاب اللہ کے یوں مخالف ہے کہ قرآن میں ارشاد فرمایا وَرَبُّكَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ تیرا رب جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس کرنے میں وہ مختار ہے يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (جو چاہتا ہے کرتا ہے) قَادِرًا عَلٰى اَنْ يُّنَزِّلَ وہ نازل کرنے پر قادر ہے) بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ بے شک ہم اس پر قادر ہیں کہ برابر کریں انگلیاں کو) ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں،

اور عترت کی مخالفت اس طرح ہے کہ امامیہ نے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے، اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُرِيْدُ وَلَا يُحِبُّ (انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اور نہیں پسند کرتا) مزید انشاء اللہ آگے آئیگا

اگر مخلوقات کے وجود کے لئے بغیر ارادہ و اختیار کے دخل کے صرف پسند کافی ہوتی تو مکلفین کے ہر ہر فرد میں ایمان وطاعت، احسان و عدل موجود ہوتے، اس کے خلاف صفات موجود نہ ہوتیں، کیونکہ ان صفات کا محبوب خدا ہونا ایسا ہی یقینی ہے جس طرح ان کی مخالف صفات کا مبغوض خدا ہونا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

عقیدہ (۸) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

مگر شیخ ابو جعفر طوسی، شریف، اور امامیہ کی ایک جماعت نے اس عقیدہ کی مخالفت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مقدور بندہ پر قادر نہیں ہے، ان لوگوں کے اس خیال باطل کی تردید کے لئے، کتاب اللہ کی یہ آیت کافی ہے، وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

عقیدہ (۹) اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کے وجود سے پہلے جانتا ہے۔ یہی معنی تقدیر کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کا اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ ایسی یا ویسی ہوگی، چنانچہ وہ اپنے مقررہ وقت پر اسی کے مطابق وجود میں آتی ہے۔

احول طاق کے متبعین جو فرقہ شیطانیہ کہلاتا ہے، اس کا مخالف ہے وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چیزوں کے وجود میں آنے سے پہلے نہیں جانتا۔

فرقہ حکیمہ اور اثنا عشریہ کے متقدمین و متاخرین کی ایک جماعت جن میں کنز العرفان کا مصنف مقداد بھی شامل ہے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کو ان کے وجود سے پہلے نہیں جانتا۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن میں تو ارشادات خداوندی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (اللہ ہر چیز کو جانتا ہے) قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (اس نے ہر چیز کا احاطہ علم سے کر رکھا ہے)، مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا

نہیں پہنچتی کوئی مصیبت خواہ وہ زمینی ہو یا تمہارے نفسوں میں مگر ہمارے ظاہر کرنے سے پہلے ہی وہ کتاب میں موجود ہے) اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (ہم نے ہر چیز کو اندازے کے موافق پیدا کیا) جَعَلَ اللهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (مطلب:- اللہ تعالیٰ نے کعبہ، شہر حرام، ہدی، اور قلائد کو اپنی نشانیاں (اور تمہارے لئے جلب منفعت اور دفع مضرت کا ذریعہ) اس لئے بنائیں کہ تم جان جاؤ کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کا علم اللہ کو ہے)۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (ہر خشک و تر کتاب مبین میں موجود ہے) الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ (رومی نزدیکی زمین (یعنی شام) میں مغلوب تو ہو گئے مگر اس غلبہ کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے) اور یہ آیت فارس پر روم کے غالب ہو جانے سے پہلے کی ہے،

ان کے علاوہ قرآن مجید میں جا بجا اہل جنت و اہل نار کی گفتگو ہے و حالات کی خبریں موجود ہیں، اور مصحف فاطمہ بھی آنے والی خبروں سے بھرا ہوا ہے اور پھر یہ بھی تواتر سے ثابت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور اہل سنت نے آنے والے فتنوں اور واقعات کی خبر دی ہے اور ظاہر ہے ان حضرات کو یہ علم وحی اور الہام کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوا۔

یہ فرقہ اپنے عقیدہ کے لئے قرآن مجید کی جو ایسی آیات بطور دلیل بیان کرتا ہے جن سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ اشیاء کے وجود کے تحت ہی علم الٰہی کا وجود ہوا جیسے لِيَعْلَمَ الصَّابِرِيْنَ (تاکہ صابروں کو جان لے) یا وہ آیات جو امتحان یا جانچ پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً لِيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ (تاکہ اپنی دی ہوئی چیزوں میں تمہارا امتحان کرے اور لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (تاکہ تمہیں آزمائے کہ عمل میں کون اچھا ہے،

تو ان کی یہ دلیل بالکل ہی غلط ہے اس لئے کہ یہاں علم کے حقیقی معنے مراد نہیں ہیں بلکہ ظاہر میں چیز کا اظہار اور ممتاز نہ ہونا مراد ہے، کیونکہ کسی شئے کا پیدا کرنا بغیر اس کے علم کے یہ تو محال عقلی ہے۔ جیسا کہ خود فرمایا اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (بھلا وہی نہ جانے گا جو پیدا کر رہا ہے وہ تو بہت باریک بین اور باخبر ہے،

عترت کے یہ عقیدہ اس طرح مخالف ہے کہ سنی اور شیعہ ہر دو فریق نے جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے، اَنَّهُ قَالَ وَاللهُ لَمْ يَجْهَلْ وَلَمْ يَتَعَلَّمْ۔ اَحَاطَ بِالْاَشْيَاءِ عِلْمًا فَلَمْ يَزِدْ بِكَوْنِهَا عِلْمًا عِلْمُهُ بِهَا قَبْلَ اَنْ يُكَوِّنَهَا كَعِلْمِهِ بَعْدَ تَكْوِيْنِهَا۔ فرمایا اللہ جاہل نہیں ہے اور نہ وہ کسی سے سیکھا ہوا ہے اس کا علم سب کو گھیرے ہوئے ہے اشیاء کے وجود میں آنے سے اس کے علم میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی ان کی پیدائش کے بعد کا علم بعینہٖ وہی علم ہے جو ان کی پیدائش سے پہلے تھا،

اور اثنا عشریہ میں سے علی بن ابراہیم قمی نے منصور بن حازم سے اس نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بایں الفاظ روایت کی ہے، قَالَ سَاَلْتُهُ هَلْ يَكُوْنُ شَيْءٌ الْيَوْمَ لَمْ يَكُنْ فِيْ عِلْمِ اللهِ بِالْاَمْسِ قَالَ لَا مَنْ قَالَ هٰذَا فَاَخْزَاهُ اللهُ قُلْتُ اَرَاَيْتَ مَا كَانَ وَهُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَلَيْسَ فِيْ عِلْمِ اللهِ بِالْاَمْسِ قَالَ بَلٰى قَبْلَ اَنْ تَخْلُقَ۔

میں نے آپ سے پوچھا کہ کیا آج کوئی ایسی شئے وجود میں آتی ہے جو کل تک اللہ کے علم میں نہ تھی۔ آپ نے فرمایا جو ایسا کہتا ہے۔ اللہ اسے ذلیل و رسوا کرے۔ میں نے کہا یہ بتائیے کہ جو کچھ ہو چکا اور اب قیامت تک جو ہونے والا

ہے یہ کل اللہ تعالیٰ کے علم میں نہ تھا، فرمایا ہاں علم میں تھا ان کی پیدائش سے پہلے)، اسی جیسی اور بھی روایات ہیں اب ذرا لفظ اخزاہ اللہ۔ پر غور فرمالیں کہ وہ کتنا شدید خوفناک ہے۔ تعجب ہے کہ ان کے علماء پھر بھی معصوم کی بددعا سے نہ ڈرے اور اس بیہودہ عقیدہ کو اپنے لئے پسند کیا۔ اور پھر اوپر سے عترت کے اقوال سے تمسک کا دعویٰ بھی ہے، کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (یہ کتنی بھاری اور بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، یہ جو کہتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں)

عقیدہ (۱۰) ا۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اس میں تحریف یا کمی زیادتی نہ اب تک ہوئی ہے نہ آئندہ ہوسکے گی۔

مگر امامیہ میں سے اثنا عشری کہتے ہیں کہ یہ قرآن مجید جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے یہ تمام منزل من اللہ نہیں ہے، بلکہ اس میں لوگوں نے کچھ الفاظ زائد بڑھا دیئے ہیں۔ یہ پورا کا پورا نہ پیغمبر علیہ السلام پر نازل ہوا اور نہ آپ کی زندگی میں باقی تھا، اس کی بہت سی آیات اور سورتیں ساقط و خارج کردی گئی ہیں، چنانچہ کلینی کی وہ روایات جو اس نے ہشام بن سالم اور محمد بن جہم ہلالی سے نقل کی ہیں آپ اوراق گذشتہ میں ملاحظہ کرچکے ہیں کتاب اللہ سے اس عقیدہ کی مخالفت سابقہ تحریر سے بھی زیادہ ظاہر و باہر ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (باطل نہ اس کے پاس سامنے سے بھٹک سکتا ہے، نہ پیچھے سے۔ یہ حکیم وحمید کی طرف سے اتارا ہوا ہے)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم ہی نے ذکر قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں)، تو جس چیز کا خدا خود حافظ و نگہبان ہو اس میں کیسے تغیر و تبدل ہوسکتا ہے، اور پھر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ واجب تھا کہ بعینہ اسی قرآن کی تبلیغ فرماتے جو نازل ہوا تھا، چنانچہ فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (اے رسول آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو اتارا گیا اس کو پہنچاؤ اور اگر تم نے تبلیغ نہیں کی)، اور پھر یہ واقعہ بھی یقینی طور پر معلوم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جو بھی مسلمان ہوتا پہلے قرآن پڑھتا اور پھر دوسروں کو پڑھانے لگتا۔ تاآنکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزاروں کو قرآن پڑھایا، بعض لڑائیوں میں ستر ستر حفاظ قرآن شہید ہوئے اور اس عہد کے بعد سے آجتک شہر شہر قریہ قریہ اس کی تلاوت کو تمام مسلمان قرب الٰہی کا ذریعہ اور بڑا سبب جانتے ہیں اور نہ صبح وشام نماز میں نماز سے باہر اس کی تلاوت میں لگے ہوئے ہیں اور بچہ جب سیانا ہوجاتا ہے اور اسے مکتب میں بٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے اسی کے یاد کرانے پر لگاتے ہیں۔ یہ قرآن ہے کلینی کی کتاب یا تہذیب نہیں کہ بطور تقیہ گھر کے کسی کونہ میں صندوق میں مقفل پڑی ہو اور تنہائی کے وقت غیروں سے لرزاں و ترساں کہ کوئی تو رائی نہ دیکھ پائے اس کے ایک دو صفحے پڑھ لیتے ہوں۔ جب اس قسم کی کتابوں میں تغیر و تبدل کو راستہ نہیں ملتا تو قرآن میں اس کی گنجائش کہاں!

اور عترت کی یہ عقیدہ یوں مخالفت کرتا ہے کہ امامیہ کی تمام روایات میں یہی موجود ہے کہ اہل بیت اسی قرآن کو پڑھتے اسی کے عام و خاص اور وجوہ نظم سے تمسک کرتے اور اسی کو دلیل اور شہادت میں پیش کرتے اور ان ہی آیات کی تفسیر کرتے تھے، چنانچہ وہ تفسیر جو جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے اسی قرآن کی تو ہے اس سے اس کا لفظ لفظ ملتا ہے علاوہ ازیں اپنے بچوں، بچیوں، کنیزوں اور خادموں اور اہل وعیال کو اسی قرآن کی

تعلیم دیتے تھے، اور نماز میں اسی کو پڑھنے کا حکم فرماتے تھے، یہی وجوہ اور امور تھے جن کے پیش نظر شیخ ابن بابویہ اپنی کتاب الاعتقادات میں اس جھوٹے عقیدہ سے دست بردار ہو گیا اور خط تنسیخ کھینچ دیا اور فارغ خطی دیدی۔

عقیدہ (۱۱) اور، اللہ تعالیٰ ارادۂ قدیم کا مالک ہے۔ ازل میں ہر ہر چیز کے متعلق جملہ امور طے کر کے ان کو خاص اوقات کے ساتھ معین کیا، کہ اس میں آگے پیچھے تقدیم و تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ہر چیز اپنے اپنے وقت میں اس کے ارادہ کے موافق پیدا ہوتی اور ظہور میں آتی ہے،

یہ بات گزشتہ اوراق میں آچکی ہے کہ شیعوں میں سے اسماعیلی اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے صاف منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے، جیسے آفتاب کے لئے روشنی یا آگ کے لئے گرمی، اس عقیدہ کی تردید کے لئے سارا قرآن کافی ہے۔ سارے امامیہ اور زیدیہ کے آٹھوں فرقے جن کے نام و لقب باب اول میں مذکور ہوئے۔ خدا تعالیٰ کے ارادہ کو حادث جانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ تمام کائنات کو شامل نہیں بہت سے موجودات اس کے ارادہ کے بغیر وجود میں آتے ہیں، مثلاً فتنہ و فساد کفر و معصیت، اس عقیدہ کی تردید میں بھی قرآن آیات موجود ہیں۔

مثلاً وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (اور اللہ جس فتنہ کا ارادہ کرے اس میں اللہ کی طرف سے آپ کا کوئی دخل نہیں، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ وہ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا) اگر اس کے بعد ان کے ایمان کا ارادہ کرے تو وہ تناقض لازم آئے گا لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کا ارادہ نہیں تھا ارادہ تو تھا مگر منفی اس وجہ سے وہ ایمان سے محروم ہوئے اور ان کے دل پاک نہیں ہوئے جو کچھ ہوا اسی کے ارادہ سے ہوا)

اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ (اگر اللہ تمہارے گمراہ کرنے کا ارادہ کرے) اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا (اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ اس سے ان کو دنیا میں عذاب دے) وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً (جب ہم کسی بستی کو برباد کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ (واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے) اس کے علاوہ بھی بے شمار آیات پیش کی جا سکتی ہیں،

اسی طرح عترت کے اقوال بھی اس عقیدے کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ کلینی نے محمد بن ابی بصیر سے یوں روایت کی ہے۔ قَالَ قُلْتُ لِاَبِي الْحَسَنِ الرِّضَا اِنَّ بَعْضَ اَصْحَابِنَا يَقُوْلُ بِالْجَبْرِ وَبَعْضُهُمْ يَقُوْلُ بِالْاِسْتِطَاعَةِ فَقَالَ لِي اُكْتُبْ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِمَشِيَّتِي كُنْتَ اَنْتَ (میں نے ابی الحسن رضا سے کہا کہ ہمارے بعض اصحاب جبر کے قائل ہیں اور بعض استطاعت کے پس آپ نے فرمایا بسم اللہ کے بعد لکھو کہ علی بن حسین کہتا ہے کہ میری مشیت اور ارادہ ہی سے تو تو ہے،

پھر کلینی ہی نے سلیمان بن خالد سے اور اس نے ابی عبداللہ سے روایت کی، اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَيْرًا نَكَتَ فِي قَلْبِهٖ نُكْتَةً مِنْ نُوْرٍ وَفَتَحَ مَسَامِعَ قَلْبِهٖ وَوَكَّلَ بِهٖ يُسَدِّدُهٗ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ سُوْٓءًا نَكَتَ فِي قَلْبِهٖ نُكْتَةً سَوْدَاءَ وَسَدَّ مَسَامِعَ قَلْبِهٖ وَوَكَّلَ بِهِ الشَّيْطَانَ يُضِلُّهٗ (جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے

ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک نورانی نکتہ لگا دیتا ہے اور اس کے دل کے کان کھول دیتا ہے اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کو بھلائی پہ ثابت قدم رکھتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل پہ ایک سیاہ نکتہ لگا دیتا ہے اور اس کے دل کے کان بند کر دیتا ہے اور اس پر شیطان مسلط کر دیتا ہے اور وہ اس کو گمراہ کرتا ہے،

پھر یہ آیت پڑھی وَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا۔ (اللہ تعالیٰ جس کی ہدایت کا ارادہ کرتا ہے اسلام کے لئے اس کا سینہ کھول دیتا ہے اور جس کے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سینہ کو تنگ اور سخت بنا دیتا ہے)

نیز کلینی اور صاحب المحاسن نے علی بن ابراہیم ہاشمی سے روایت کی ہے قَالَ سَمِعْتُ اَبَا الْحَسَنِ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُوْلُ لَا يَكُوْنُ شَيْءٌ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ اَرَادَ (میں نے ابو الحسن رحمہ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہی چیز وجود میں آتی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کا ارادہ کرے،

اور کلینی نے فتح بن زید جرجانی سے روایت کی اور اس نے ابی الحسن رحمہ اللہ علیہ سے جس میں صراحت سے یہ فرمایا ہے کہ بندہ کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے پہ غالب نہیں آسکتا چاہے وہ ارادہ خواہش کی حد تک ہو یا اس سے بڑھ کر عزم بالجزم ہو جائے،

اور کلینی نے ثابت بن عبد اللہ سے بھی روایت کی اور اس نے ابی عبد اللہ سے جو اس کی تصریح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو گمراہ کرنے کا ارادہ بالجزم کرتا ہے تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی اور ثابت بن سعید نے بھی اس قسم کی روایت کی ہے۔

پھر اس اصل عقیدہ، کی کئی شاخیں ہو گئی ہیں امامیہ تو سب کے سب اور زیدیہ کے آٹھ فرقے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی بات کا حکم دیتا ہے، جس کا وہ ارادہ کرتا ہے، اور صرف اسی سے روکتا ہے جس کا ارادہ نہیں کرتا۔

ان لوگوں کا خیال یہ بھی باطل اور ثقلین، کے خلاف ہے، کتاب اللہ کی مخالفت تو یوں کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے، وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ (اگر وہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لئے کوئی تیاری کرتے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا نکلنا ناپسند فرمایا پس ان کو اپنی جگہ پہ ہی برقرار رکھا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو) لہٰذا معلوم ہوا کہ اس جماعت کا نکلنے کا ارادہ ہی نہ تھا، اس لئے کہ ناپسندیدگی ارادے کی ضد ہے، حالانکہ وہ نکلنے کے لئے بلاشبہ مامور و مکلف تھے۔ ورنہ پھر ان کو ملامت و عتاب کیوں کیا جاتا۔ یا فرمایا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ (اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے) حالانکہ ایمان کا حکم ان کو بھی دیا گیا تھا۔ ایسے ہی کافروں کے ایمان نہ چاہنے پر قرآن کی بے شمار آیات دلالت کرتی ہیں، حالانکہ وہ مامور بایمان تھے،

اور عترت کی مخالفت اس طرح ہے کہ خود شیعوں کی روایات سے بطریق تواتر ایسا ثابت ہے جو ان کے اس خیال کی ضد ہے، اور اس کی مخالفت کرتا ہے اور یہ مخالفت ایسی ہے کہ نہ اس میں تاویل کی گنجائش ہے اور نہ انکار کی ان میں سے ایک روایت تو وہی ہے جو برقی نے محاسن میں اور کلینی نے کافی میں علی بن ابراہیم ہاشمی سے روایت کی ہے اور

جس کا حوالہ گزر چکا ہے۔

ایک اور روایت وہ ہے جو کلینی نے حسن بن عبدالرحمان حمانی سے اور اس نے ابی الحسن موسیٰ بن جعفر سے کی ہے، اَنَّهٗ قَالَ اِنَّمَا تَكُوْنُ الْاَشْيَاءُ بِاِرَادَتِهٖ وَمَشِيَّتِهٖ (کہ اشیاء اللہ تعالیٰ کی مرضی اور ارادہ سے وجود میں آتی ہیں)۔

ایک دوسری روایت جو کلینی اور دوسروں نے عبداللہ بن سنان سے اور اس نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کی کہ اَنَّهٗ قَالَ اَمَرَ اللّٰهُ وَلَمْ يَشَأْ وَشَاءَ وَلَمْ يَأْمُرْ اَمَرَ اِبْلِيْسَ بِالسُّجُوْدِ لِاٰدَمَ وَشَاءَ اَنْ لَّا يَسْجُدَ وَلَوْ شَاءَ لَسَجَدَ وَنَهٰى اٰدَمَ عَنْ اَكْلِ الشَّجَرَةِ وَشَاءَ اَنْ يَّاكُلَ وَلَوْ لَمْ يَشَأْ لَمْ يَاكُلْ (اللہ تعالیٰ نے حکم دیا مگر اس کو چاہا نہیں اور چاہا مگر حکم نہیں دیا۔ چنانچہ ابلیس کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کا حکم دیا مگر یہ نہیں چاہا کہ وہ سجدہ کرے۔ اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ سجدہ کر لیتا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کے کھانے سے منع تو کیا مگر یہ چاہا کہ وہ اسے کھالیں اور اگر وہ نہ چاہتا تو وہ اس کو نہ کھاتے)۔

امامیہ اور زیدی فرقوں کا قول اسی کے موافق ہے، وہ کہتے ہیں کہ بعض ارادہ کی ہوئی چیزیں واقع نہیں ہوئیں اور شیطان و کافروں کی چاہی ہوئی باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں،

اس عقیدہ میں کیسانیہ بھی ان ہی کے ساتھ ہیں۔ بخلاف اہل سنت کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا اور اللہ کے ارادہ کے خلاف کسی کا ارادہ نہیں چل سکتا ہے اور نہ ہی وقوع پذیر ہو سکتا ہے جو اس نے چاہا ہو گا جو نہ چاہا نہیں ہوا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امامیہ اور زیدیوں نے یہ عقیدہ زندیق مجوسیوں سے چرایا ہے، جنہوں نے خیر و شر کے الگ الگ خدا بنا رکھے ہیں ایک کو یزدان کہتے ہیں تو دوسرے کو اہرمن اور پھر واقعات عالم کو تقسیم کر کے ہر ایک کی طرف علیحدہ علیحدہ واقعات کی نسبت کرتے ہیں۔

اور کبھی ایک کو دوسرے پر غالب بھی مانتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام عیوب سے پاک ہے،

اور امامیہ و زیدیہ کا یہ قول بھی اسی طرح کا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ایسی چیز کا بھی ارادہ کرتا ہے جو ہونے کے قابل نہیں۔ العیاذ باللہ! ان کے اس ناپاک عقیدہ کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ گویا اللہ تعالیٰ کی بیوقوفی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ بہت ہی پاک ہے، ان باتوں سے جو یہ ظالم اس پر لگاتے ہیں،

امامیہ اور زیدیہ کے آٹھوں فرقوں کا یہ قول بھی قول سابق ہی کی مثل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کا ارادہ کرتا ہے مگر شیطان اور گمراہ کرنے والے انسان اس کو گمراہ کر دیتے ہیں گویا نعوذ باللہ ان لعینوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی کچھ نہیں چلتی۔ حالانکہ قرآن کی آیت مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔) اس خیال کو صاف جھٹلا رہی ہے،

اور عترت کی روایات میں سے وہ روایت بھی امامیہ وغیرہ کے مخالف ہے، جو کلینی نے ثابت بن سعید سے اور اس نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ

قَالَ يَا ثَابِتُ مَا لَكُمْ وَلِلنَّاسِ كُفُّوْا عَنِ النَّاسِ وَلَا تَدْعُوْا اَحَدًا اِلٰى اَمْرِكُمْ وَاللّٰهِ لَوْ اَنَّ

انہوں نے ثابت سے کہا کہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا لوگوں کو نہ چھیڑو اور کسی کو اپنے کام کی طرف نہ بلاؤ اللہ کی قسم

اَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَاَهْلَ الْاَرْضِ اِجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يُّضِلُّوْا عَبْدًا يُرِيْدُ اللّٰهُ هِدَايَتَهٗ مَا اسْتَطَاعُوْا اَنْ يُّضِلُّوْهُ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ السَّمٰوٰتِ وَاَهْلَ الْاَرْضِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّهْدُوْا عَبْدًا يُرِيْدُ اللّٰهُ ضَلَالَتَهٗ مَا اسْتَطَاعُوْا اَنْ يَّهْدُوْهُ۔

زمین و آسمان والے سارے مل کر بھی یہ کوشش کریں کہ اس شخص کو گمراہ کردیں جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کا ارادہ کرتا ہے تو سب اس کے گمراہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔اسی طرح اگر زمین و آسمان والے سارے مل کر بھی کسی کو ہدایت کریں۔ اور اللہ اس کی ہدایت نہ چاہے تو وہ اس کو سارے مل کر بھی ہدایت نہ کر پائیں گے"

عقیدہ (۱۲) "اللہ تعالیٰ جسم نہیں رکھتا، نہ طول و عرض اور عمق، نہ ہی وہ شکل و صورت رکھتا ہے" مگر امامیہ کے فرقوں میں حکمیہ، سالمیہ، شیطانیہ، اور میثمیہ، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم رکھتا ہے،

اس کے ثبوت کے لئے کلینی کی یہ روایت ملاحظہ ہو جو اس نے ابراہیم بن محمد ہمدانی سے کی ہے: قَالَ كَتَبْتُ اِلَى الرَّجُلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّ مَنْ قِبَلَنَا مِنْ مَوَالِيْكَ قَدِ اخْتَلَفُوْا فِي التَّوْحِيْدِ فَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ جِسْمٌ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ صُوْرَةٌ۔ میں نے آپ سے متعلق ایک شخص کو لکھا کہ آپ کے جو دوست ہمارے پاس ہیں وہ مسئلہ توحید میں مختلف العقیدہ ہیں بعض اپنا یہ عقیدہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم والا ہے اور بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ اس کے صورت شکل بھی ہے"۔

اور سہل بن زیادہ سے بھی ایک روایت ہے کہ اس نے کہا "میں نے ابی محمد رح کو لکھا کہ اے سردار ہمارے ساتھی عقیدہ توحید میں مختلف القول ہیں، بعض اس کو جسم ٹھیراتے ہیں اور بعض صورت"

ان روایات سے مختصراً یہ تو ثابت ہو گیا کہ ان میں ایسے لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کے لئے جسم، صورت شکل مانتے تھے اب ان ترسایان امامیہ کے اس لچر مذہب کی تفصیل دیکھئے،

حکمیہ:۔ کہتے ہیں کہ وہ طول، عرض اور عمق، رکھنے والا ایک جسم ہے، جس کے ہر سہ اطراف مذکورہ برابر ہیں اور اس کے ہاتھ بھی ہیں، وہ پگھلی ہوئی چاندی کی طرح سفید ہے ہر طرف چمکتا ہوا، وہ رنگ بھی رکھتا ہے بو بھی مزہ بھی اور محبت بھی! وہ اپنے بالشت سے سات بالشت قد کا ہے۔ عرش سے بغیر فاصلہ کے چپٹا ہوا ہے،

کلینی نے علی بن حمزہ سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم (پیشوائے حکمیہ) کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ٹھوس جسم ہے، جس کا پہچاننا ضروری ہے،

اس کے علاوہ محمد بن حکم، یونس بن ظبیان اور حسن بن عبد الرحمٰن سے بھی مختلف سندوں کے ساتھ اس قسم کی روایت لایا ہے،

سالمیہ:۔ کہتے ہیں کہ وہ (اللہ تعالیٰ) انسان کی شکل کا ایک جسم ہے، جو چہرہ، آنکھ، کان، ناک، منہ اور ہاتھ پاؤں رکھتا اس کے حواس خمسہ بھی ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ کان کی تو (ہ) تک اس کے سیاہ بال بھی ہیں،

کلینی نے محمد بن خرج سے روایت کی ہے کہ ہشام بن حکم کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے اور ہشام بن سالم (سالمیہ فرقہ کا بانی) اس کو صورت و شکل والا کہتا ہے ناف تک کھوکھلا۔ اور باقی ٹھوس۔ شیطانیہ، اور میثمیہ بھی سالمیہ کے ہم خیال وہم عقیدہ ہیں،

کلینی نے ابن الخزار اور ابن الحسین سے روایت کی ہے کہ میثمی کہتا ہے کہ وہ کھوکھلا ہے ناف تک اور باقی ٹھوس ہے اور یہی قول عبر الیقی اور صاحب الطاق کا بھی ہے،

اب ظاہر ہے کہ امامیہ کا یہ عقیدہ مضحکہ خیز تو ہے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ ثقلین کے بھی مخالف ہے۔
کتاب اللہ تو کہتی ہے لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْئٌ (اس کے مثل کوئی چیز نہیں) اور عترت کی مخالفت یوں کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے حوالہ سے یہ الفاظ روایت کئے گئے ہیں اَنَّهٗ قَالَ لَا یُوْصَفُ بِشَیْئٍ مِنَ الْاَجْزَاءِ وَلَا بِالْجَوَارِحِ وَالْاَعْضَاءِ (آپ نے فرمایا کہ اس کی صفت نہ اجزاء سے بیان کی جا سکتی ہے نہ اعضاء بدنی ہاتھ پاؤں وغیرہ سے نہج البلاغہ میں بھی اسی طرح ہے اور کلینی نے بھی ابراہیم بن محمد بن الخزار اور محمد بن الحسین سے اسی طرح روایت کی ہے وہ کہتے ہیں۔

دَخَلْنَا عَلٰی اَبِی الْحَسَنِ الرِّضَا وَقُلْنَا اِنَّ هِشَامَ بْنَ سَالِمٍ وَصَاحِبَ الطَّاقِ وَالْمِیْثَمِیَّ یَقُوْلُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اَجْوَفُ اِلَی السُّرَّةِ وَالْبَاقِیْ صَمَدٌ فَخَرَّ لِلّٰهِ سَاجِدًا ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَكَ كَیْفَ طَاوَعَتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ شَبَّهُوْكَ بِغَیْرِكَ اَللّٰهُمَّ لَا اَصِفُكَ اِلَّا بِمَا وَصَفْتَ بِهٖ نَفْسَكَ وَلَا اُشَبِّهُكَ بِخَلْقِكَ اَنْتَ اَهْلٌ لِكُلِّ خَیْرٍ فَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ،

(ہم جناب ابی الحسن رضا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے کہا کہ ہشام بن سالم، صاحب الطاق اور میثمی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ناف تک پولا اور کھوکھلا ہے اور باقی ٹھوس۔ (یہ سن کر توبہ توبہ کرتے ہوئے) آپ سجدہ میں گر گئے۔ اور فرمایا اے اللہ تو پاک ہے یہ لوگ اپنے نفسوں کے کتنے مطیع ہو گئے ہیں کہ تیرے غیر سے تجھے مشابہ کرنے لگے اے میرے اللہ میں تیری صفت اسی کے ساتھ کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے اپنی صفت بیان کی ہے اور تیری مخلوق کے ساتھ تجھ کو ہرگز تشبیہ نہیں دیتا تو ہر بھلائی کا مستحق ہے تو مجھ کو ان ظالموں کے ساتھ شامل نہ فرما،)

پھر اسی سلسلہ میں کلینی نے حسن بن عبد الرحمن الحمانی سے بھی روایت کی ہے کہ اس نے کہا قُلْتُ لِاَبِی الْحَسَنِ الْکَاظِمِ اِنَّ هِشَامَ بْنَ الْحَکَمِ یَزْعَمُ اَنَّ اللّٰهَ جِسْمٌ قَالَ قَاتَلَهُ اللّٰهُ مَا عَلِمَ اَنَّ الْجِسْمَ مَحْدُوْدٌ مَعَاذَ اللّٰهِ وَاَبْرَأُ اِلَی اللّٰهِ مِنْ هٰذَا الْقَوْلِ۔ میں نے جناب ابی الحسن کاظم سے کہا کہ ہشام بن حکم کا گمان ہے کہ اللہ جسم ہے فرمایا اللہ اس کا ناس کرے کیا اسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ جسم حدوں میں گھرا ہوا (ہوتا ہے) خدا کی پناہ۔ میں اللہ کے سامنے اس قول سے مکمل برأت ظاہر کرتا ہوں، کلینی نے اسی ذیل میں کافی کی کتاب التوحید میں بھی محمد بن فرج زنجی سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا۔

کَتَبْتُ اِلٰی اَبِی الْحَسَنِ اَسْاَلُهٗ عَمَّا قَالَ هِشَامُ الْحَکَمُ فِی الْجِسْمِ وَهِشَامُ ابْنُ سَالِمٍ فِی الصُّوْرَةِ فَکَتَبَ دَعْ عَنْكَ حَیْرَةَ الْحَیْرَانِ وَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ لَیْسَ الْقَوْلُ مَا قَالَ الْهِشَامَانِ۔

(میں نے جناب ابی الحسن کو ایک خط لکھا جس میں ہشام بن حکم کا مذہب اللہ کے جسم ہونے میں اور ہشام کا خیال اللہ کی صورت ہونے میں پیش کر کے اس بارے میں آپ سے استفسار کیا۔ تو آپ نے مجھ کو جواب لکھا تو اس حیرانی میں کیوں پڑ گیا شیطان سے اللہ کی پناہ مانگ دونوں ہشاموں کا قول لغو ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا)

عقیدہ (۱۳) :- اللہ تعالیٰ کے لئے مکانیت نہیں ہے نہ اوپر نیچے کی طرح اس کے لئے کوئی طرف یا سمت ہے، یہ اہل سنت

کا مذہب و عقیدہ ہے مگر امامیہ میں سے حکمیہ اور یونسیہ کہتے ہیں کہ عرش اس کا مکان ہے،
حکمیہ:۔ کا خیال ہے کہ عرش سے چپٹا ہوا ہے اس فرش کی طرح جو تخت پر بچھایا جاتا ہے کہ اس کے اور عرش کے درمیان کوئی فاصلہ یا حائل نہیں ہے اور وہ جسامت میں عرش کے برابر ہے «زیادہ نہ بے زیادہ»۔
یونسیہ:۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح برقرار نہیں ہے جس طرح کوئی تخت پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے، بلکہ وہ تخت برقرار کے وقت کھڑا بھی ہوتا ہے بیٹھتا بھی ہے اور حرکت بھی کرتا ہے اور اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں اگرچہ وہ ان سے قوی تر بھی ہے اور بزرگتر بھی، جیسا کہ کلنگ د جانور، کو اس کے پاؤں اگرچہ بڑائی اور قوت میں کم تر ہیں اٹھائے ہوئے ہیں،
سالمیہ، شیطانیہ، اور میثمیہ کہتے ہیں کہ اس کا مکان آسمان میں ہے مگر مستقر نہیں وہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں، ایک آسمان سے دوسرے آسمان میں منتقل ہوتا رہتا ہے، اترتا ہے، چڑھتا ہے، کھڑا ہوتا ہے، بیٹھتا ہے، حرکت کرتا ہے، سکون میں آجاتا ہے ربعیہ کہتا ہے کہ اس کی قیام گاہ آسمان میں ہے لیکن موسم بہار میں گلزار و لالہ زار مقامات اور شگوفہ ہائے رنگارنگ کی سیر کے لئے زمین پر آتا ہے اور پھر آسمان پر چڑھ جاتا ہے «جیسے ہند کا بادشاہ جہانگیر کہ اس کی قیام گاہ تو آگرہ میں تھی مگر موسم میں بہار کی سیر کے لیے کشمیر جایا کرتا تھا۔
اس بکواس کی مخالفت کتاب اللہ اور عترت رسول سے بین و ظاہر ہے، اس لئے کہ قرآن میں لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ فرمایا گیا ہے اور امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض خطبات میں یوں روایت ملتی ہے لَا فِي الْمَكَانِ فَيَجُوْزَ عَلَيْهِ الْاِنْتِقَالُ، (وہ کسی مکان میں نہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال ممکن ہو)۔
اور ایک خطبہ میں یوں ہے، لَا يُقَدِّرُهُ الْاَوْهَامُ بِالْحُدُوْدِ وَالْحَرَكَاتِ (ہمارے وہم و گمان حدود و حرکات سے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے،

> «پھر آپ ہی کے ایک اور خطبہ میں یوں آیا ہے، کہ اس کو ایک حالت دوسری حالت سے غافل نہیں رکھتی نہ اس کو کوئی مکان گھیرتا ہے»

یہ سب کچھ نہج البلاغہ میں موجود ہے!۔
امامیہ میں سے حکمیہ، سالمیہ، شیطانیہ اور میثمیہ جہت و طرف کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے لئے اوپر کی جہت ثابت کرتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اس کی قرار گاہ عرش اور آسمان کو اوپر کی طرف مانا ہے البتہ اتنا ہے کہ جب وہ آسمان دنیا پر ہوتا ہے تو اوپر کے آسمانوں پر رہنے والے فرشتے، حاملان عرش، خازنین کرسی، اور جنت میں بود و باش رکھنے والے حور و غلمان، سالمیہ، شیطانیہ اور میثمیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے اوپر ہو جاتے ہیں اور وہ جہت و طرف میں ان سے نیچے ہو جاتا ہے، لیکن زمین پر رہنے والوں سے تو ہمیشہ اونچا ہی رہتا ہے،۔
اور ربعیہ کے نزدیک وہ کوئی جہت نہیں رکھتا کبھی اوپر رہتا ہے اور کبھی نیچے، حالانکہ نہج البلاغہ میں سب شیعوں کے نزدیک ثابت ہے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا لَا يُحَدُّ، (اس کو کسی حد میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔
اب اس قول سے نیز ان اقوال سے جو اس کے مکان میں ہونے کی نفی کرتے ہیں جہت کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ جہات مکان کے اطراف و حدود ہی کا تو نام ہے،۔

اثنا عشری شیعہ ان لغویات و خرافات کو سن کر چیں بجبیں ہوتے ہیں اور اس طور پر یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ جب ہم ان تمام اقوال و مذاہب کو مردود و باطل قرار دیتے ہیں، تو ان میں ان خرافات کا الزام کیوں دیا جاتا ہے۔ حقیقت میں تو ایسا ہی ہے، لیکن ہمارا روئے سخن تمام شیعوں کی طرف ہونے سے مراد سارے کے سارے امامیہ ہیں گو ان میں اثنا عشری شیعہ نہ ہوں البتہ اثنا عشریوں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ جب تم ان اہل مذاہب کو صحابہ پر طعن کرنے اور مسئلہ امامت میں اپنا مقتدا و پیشوا اور معتمد علیہ اور مسند بنانے ہو اور انہیں کی روایت اور نقل سے اپنا پسندیدہ اعتقادات ثابت و مقرر کرنے ہو تو مسئلہ توحید کے معاملہ میں ان بزرگوں کی روایات کی کیوں ذرہ برابر قدر نہیں کرتے اور نہ ان کو خاطر میں لاتے ہو،

اور پھر جب کہ یہ لوگ روایات حضرات ائمہ ہی سے نقل کرتے ہیں۔ اور اگر ان سے گریز و کنارہ کشی کا سبب یہ ہے کہ ان روایات کی ائمہ نے تکذیب فرمائی ہے تو ان حضرات نے ان روایات کی بھی تو تکذیب و تردید کی ہے۔ جو طعن صحابہ اور مسئلہ امامت پر مشتمل ہیں۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان روایات کی تکذیب میں دوسرے شیعوں نے بھی ائمہ سے روایت کی ہے اور ائمہ کی تکذیب نقل کی ہے، اور طعن صحابہ و مسئلہ امامت میں تکذیب کی روایات ائمہ سے صرف اہل سنت نے نقل کی ہے۔ اور یہ تو واضح عقلی بات ہے کہ جب ایک شخص کسی بزرگ سے کوئی روایت کریگا تو خود وہ اس کی تکذیب کیوں روایت کریگا۔ ایسا وہ ہرگز نہیں کریگا۔ اس سے تو اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑے گا اور اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہوگی۔

مثلاً حکمیہ، سالمیہ اور میثمیہ جب اللہ تعالیٰ کے جسم و صورت کی روایت کرتے ہیں تو یہ ہی اس کی تکذیب و تردید کی روایت کیوں نقل کریں گے اگر یہ ایسا کریں گے تو ان کے مذہب کی تعمیر انہیں کے سروں پہ نہ آپڑیگی اور یہ اپنی موت آپ نہ مرجائیں گے۔

چنانچہ تمام امامیہ جب اپنی اغراض فاسدہ یا کسی غلط فہمی کے سبب ان ہی حضرات سے طعن صحابہ یا مسئلہ امامت کی روایت لیتے اور قبول کرتے اور نقل کرتے ہیں تو اب ان سے توقع رکھنا کہ یہی اس کی تکذیب کی روایت بھی نقل کریں عقل سے بہت دور کی بات ہے،

اگر کوئی عقل مند ان کی سچائی اور جھوٹ پرکھنا اور جانچنا چاہے تو لا محالہ اسے دوسرے فرقہ کی روایات کو دیکھنا چاہیئے۔

چنانچہ اہل عقل کے ہاں یہی طریقہ اور اسلوب رائج و جاری ہے اور وہ اسی طور ان جیسے معاملات کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ جب کسی خبر دینے والے کی خبر کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔ تو اسی مخبر سے اس کی روایات کے خلاف روایت کا مطالبہ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اپنی بات کی پیچ یا اغراض کے ماتحت سخن پروری ہی کرے گا کبھی اپنی غلطی یا جعل کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ بلکہ وہ دوسروں سے جو موقع و محل پہ موجود تھے واقعہ کی تحقیق کرتے ہیں،

دین کے معاملہ کو دنیا کے معاملہ سے ہلکا نہیں سمجھنا چاہئے اور نہ اس میں سستی و غفلت کو روا رکھنا چاہیئے، اور اس سے قطع نظر خود شیعوں نے کہیں کہیں طعن امامت کے بارے میں روایت کرنے میں اپنے معتقدات

ومرویات کے بھی خلاف کیا ہے، باب مطاعن وامامت میں انشاء اللہ ان کا سب ذکر آئے گا۔ اور جھوٹوں کا تو وطیرہ اور قاعدہ یہی ہے کہ اگر کھلم کھلا صاف طور سے ان کی روایت کے خلاف روایت کا مطالبہ کیا جائے تو وہ اس سے انکار کرتے اور راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب کسی دوسرے سلسلے میں وہ خود اس روایت کو بیان کر بیٹھتے اور ایسی بات ظاہر کر دیتے ہیں جو خود ہی ان کی تکذیب وتردید کر دیتی ہے،

اور دوسری گزارش اثنا عشری حضرات سے یہ ہے کہ جب حضرات ائمہ نے اس جماعت کی تکذیب فرمائی اور اس شد ومد سے اور اس حد تک برائی فرمائی کہ ان کے لئے۔ قاتله الله - اخزاه الله ولا تجعلني مع القوم الظالمين اور واستعذ بالله من الشيطان جیسے سخت الفاظ استعمال فرمائے، تو پھر ایسے رسواد ذلیل لوگوں ہی کی روایات دین وایمان کے بارے میں لانا اور ان روایات پر اعتماد کر لینا۔ آخر اس کو کیا سمجھا جائے! معمولی سے معمولی ذہن کا آدمی یہی کہے گا کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، اور یہ حقیقت سے بعید بھی نہیں،

ہٹ دھرم امامیہ یہ عذر بھی تراش سکتے ہیں کہ اہل سنت کی روایات حضرات ائمہ سے تقیہ پر محمول ہیں اور امامیہ کی روایات بیان واقع پر!۔

تو ہم کہیں گے کہ ابھی تو حضرات ائمہ کے تقیہ کا معاملہ ہی زیر تصفیہ اور حل طلب ہے، اس لئے کہ ان کے تقیہ کی روایات بھی شیعہ حضرات نو کرتے ہیں، تو پھر کلام کی توجیہ ان ہی کی روایات پر کرنا نامناسب اور بے لطف ہے اس کنایہ کو عقلمند خوب سمجھتے ہیں۔

اور پھر دوسری بات بھی محتاج بیان وتشریح ہے کہ تقیہ، مسئلہ کن کا ہے؟ شیعوں کا یا اہل سنت کا اگر ان روایات میں کسی کو انہی اشخاص کی روایت سے ترجیح دی جائے تو پھر وہی بات ہوگی، کہ دعوی بھی شیعوں کا اور حجت بھی شیعی روایات سے اور اگر ترجیح دوسری روایات سے ہے تو ان کو بیان کیا جائے۔

یہاں یہ بحث چونکہ ضمناً ہے اس لئے ہم اس کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتے اس لئے بحث کا رخ پھر اصل مقصد کے آغاز کی طرف موڑتے ہیں۔

واضح رہے کہ ان دو مذکورہ بالا عقیدوں میں سے بہت سی شاخیں نکلتی ہیں، اور ان لوگوں نے ہر ایک میں ثقلین کی مخالفت کی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے لئے اجزاء ہیں جو خارج ہیں، ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہیں، مثلاً سر، ہاتھ، پاؤں، لمبائی، چوڑائی اور گہرائی حالانکہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لَا يُوصَفُ بِشَيْءٍ مِنَ الْأَجْزَاءِ وَلَا بِالْجَوَارِحِ وَالْأَعْضَاءِ وَلَا بِعَرَضٍ مِنَ الْأَعْرَاضِ وَلَا بِالتَّجْزِيَةِ وَالْانْبِعَاضِ وَلَا يُقَالُ لَهُ حَدٌّ وَلَا نِهَايَةٌ وَلَا انْقِطَاعٌ وَلَا غَايَةٌ كَذَا فِي نَهْجِ الْبَلَاغَةِ وَرَوَى الْكُلَيْنِيُّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَكِيمِ قَالَ وَصَفْتُ لِأَبِي إِبْرَاهِيمَ قَوْلَ هِشَامٍ الْجَوَالِيقِيِّ

اللہ کی اجزاء بدنی، ہاتھ، پیر، اعضائے انسانی غرض جزء جزء کرنے یا ٹکڑے کرنے سے صفت بیان نہیں کی جاسکتی نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے لئے کوئی حد ونہایت ہے یا اس کے لئے خاتمہ یا غایت ہے نہج البلاغہ میں اسی طرح ہے،

أَنَّهُ صُورَةٌ وَحَكَيْتُ قَوْلَ هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ أَنَّهُ جِسْمٌ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ لَا يُشْبِهُهُ شَيْءٌ أَيُّ فُحْشٍ وَخَنَاءٍ أَعْظَمُ مِنْ قَوْلِ

مَنْ يَصِفُ خَالِقَ الْاَشْيَاءِ بِجِسْمٍ اَوْ صُوْرَةٍ اَوْ بِخِلْقَةٍ وَتَحْدِيْدٍ وَاَعْضَاءٍ۔

اور کلینی نے محمد بن حکم سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے کہ ابی ابراہیم کے سامنے ہشام جوالیقی کا یہ کلام بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ شکل و صورت رکھتا ہے اور ہشام بن حکم کے اس قول کا بھی ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے تو ابی ابراہیم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کسی کے مشابہ نہیں ہے۔ اس سے بُرا اور قابل نفرت قول کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کا پیدا کرنے والا ہے، اس کی صفت صورت و شکل جسم اعضائے جسم حد اور اس کی مخلوق کے حوالہ سے بیان کی جائے،

عقیدہ (۱۴)ا۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی چیز میں سرایت کرتا ہے نہ کسی بدنی قالب میں حلول کرتا ہے یا نمودار ہوتا ہے" مگر غالی شیعہ ائمہ کے اجساد و ابدان میں اللہ تعالیٰ کے حلول کے قائل ہیں، یہاں تک کہ زوامیہ فرقہ نے ابو مسلم مروزی صاحب الدعوۃ کے بدن میں اللہ تعالیٰ کو پیرا ہوا مانا ہے۔ اور تعجب و حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ ابن مطہر حلی نے دعویٰ ہمہ دانی کے علی الرغم نہج الحق رکتاب میں عقیدہ حلول کو صوفیائے اہل سنت کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ حضرات اہل حق تو حلول کا عقیدہ رکھنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں، دراصل یہ ساری خرابی اور جہل اور کلام نہ سمجھنے کے سبب سے ہے، اس نے مسئلہ وحدت الوجود سے دھوکہ کھایا اور اس کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اسے حلول پر محمول کر بیٹھا یہیں سے ان کے علماء کے فہم و تدبر کا پول کھلتا ہے، اور رسائی فہم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور جب ائمہ کرام کے کلام میں ایسے گہرے اور دقیق مطالب آئے تو انہوں نے اپنی کم فہمی بلکہ کج فہمی کے سبب ان کو مسخ کر ڈالا اور اپنی ناقص سمجھ کی وجہ سے ان مطالب میں نامحمود تبدیلی کر ڈالی۔

غالیوں کے بعض فرقے۔ بنانیہ، نصیریہ اور اسماقیہ حلول کے بجائے اتحاد کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اتحاد تو حلول سے بھی زیادہ باطل اور غلط ہے اور اس کا بطلان نہایت واضح بدیہات میں سے ہے اور شیخ حلی اپنی اسی ناقص و باریک سمجھ کی وجہ سے اتحاد کی نسبت بھی سالکین اہل سنت کی طرف کر بیٹھا ہے، حالانکہ ان بزرگوں کے نزدیک اتحاد سے حقیقی معنی مراد ہی نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں معنی مراد ہیں اوّل یہ کہ بروقت ظہور و تجلی نور حق بندے کی خودی کا مٹ جانا اور رست و کمزور ہو جانا مراد ہے جس طرح آفتاب کی روشنی کے وقت چراغ کی حالت ہوتی، چنانچہ نور کی تجلی کے وقت بندے کی یہ کیفیت پیدا ہو جانے کا ثبوت قرآن سے بھی ہے، اور اقوال عترت سے بھی بالکل ظاہر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے، فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اسے پاش پاش کر ڈالا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے) یا فرمایا فَلَمَّا جَاءَهَا نُوْدِيَ اَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ پس جب وہ آیا اس کے پاس تو ندا دی گئی اس کو کہ برکت دیا گیا وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو اس کے آس پاس ہے اور سارے جہاں کا رب اللہ پاک ہے،

اور اقوال عترت سے اس کا ثبوت یوں ہے کہ بروایت کلینی سابق جناب صادق ابو بصیر کے ساتھ گفتگو میں کہتے ہیں کہ وہاں مومن اللہ تعالیٰ کو قیامت سے پہلے اس دنیا میں دیکھیں گے کیا تو اس کو اس وقت نہیں دیکھ رہا؟"

اسی معنی و مطلب کو شیخ ابن فارغ مصری رحمہ اللہ علیہ نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے،

وَجَاءَ حَدِيْثٌ فِيْ اِتِّحَادِيْ ثَابِتٌ ۔۔۔ رِوَايَتُهٗ فِي النَّقْلِ غَيْرُ ضَعِيْفَةٍ

يُشِيْرُ بِحُبِّ الْعَبْدِ بَعْدَ تَقَرُّبٍ ... إِلَيْهِ بِنَفْلٍ أَوْ أَدَاءِ فَرِيْضَةٍ
وَمَوْضَعُ تَشْبِيْهِ الْإِشَارَةِ وَاضِحٌ ... بِكُنْتُ لَهُ سَمْعًا كَنُوْرِ الظَّهِيْرَةِ

(وہ حدیث جس سے اتحاد ثابت ہے، وہ ضعیف نہیں ہے، جو بندے کے ساتھ محبت کرنے کا پتہ دیتی ہے، جب وہ اپنے اللہ کی طرف فرائض و نوافل سے تقرب ڈھونڈتا ہے، اور "میں اس کے لئے کان بن جاتا ہوں"، سے جو اشارہ ہے وہ تشبیہ کی طرف واضح ہے دوپہر کی دھوپ کی طرح)۔

ان اشعار میں جس حدیث کا ذکر ہے وہ یہ صحیح ہے حدیث قدسی ہے،

لَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا۔ (میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب ڈھونڈتا ہے تاآنکہ وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے اور جب وہ میرا دوست ہو جاتا ہے تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں کہ وہ اس سے سنتا ہے میں اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے میں اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے میں اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے)

اور دوسرے معنی یہ مراد لیتے ہیں کہ بندہ خود کو حق کا آئینہ اور مظہر جانتا ہے، اس طرح کہ بعض احکام ظاہر کے مظہر کی طرف اور بعض مظہر کے ظاہر کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں،

لیکن وہ صفت جو پاکی ذاتِ ظاہر کے لئے نامناسب ہو وہ مظہر ہی میں رہتی ہے اور ظاہر کی طرف صعود نہیں کرتی اور وہ صفت جو ذات ظاہر ہی کے لئے زیبا ہو وہ ظاہر ہی رہتی ہے مظہر کی طرف نزول نہیں کرتی یہ معنی بھی کتاب اللہ اور اقوال عترت سے ظاہر الثبوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)، إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (بے شک تم سے بیعت کرتے ہیں وہ گویا اللہ سے بیعت کر رہے ہیں،

اور یہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا خطبہ الافتخار یا خطبہ البیان جو امامیہ کی کتب میں مشہور و معروف ہیں اس پہ دال ہیں، شیخ حلی اگر جان بوجھ کر اتحاد کے اس صحیح و مفہوم معنی سے جاہل بنا رہنا چاہتا ہے تو بنا رہے دوسرے عاقل شیعوں نے اس کو عقل کی ترازو پہ تول کر اس کی صحت تسلیم کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں خواجہ نصیر الدین طوسی کا کلام شرح مقامات العارفین میں بحوالہ کتاب اشارات، اور صدرا شیرازی کا کلام شواہد الربوبیۃ اور اسفار میں نیز ابن جمہور اور اس فرقہ کے دوسرے متاخرین کا کلام دیکھنا چاہئیے اور اگر ان کا بھی اعتبار نہ ہو کہ انہوں نے تصوف و شریعت اور فلسفہ میں گڑبڑ کر دی ہو تو ہم مقداد کا کلام نقل کرتے ہیں کہ جو علوم دینیہ میں ان کا مانا ہوا پیشوا اور برگزیدہ ہے اور رجہ قواعد کا شارح اور کنز العرفان فی تفسیر احکام القرآن کا مصنف، اس نے شرح الفصول فی علم الاصول میں ان حالات کے ذیل میں جو سالک کو پیش آتے ہیں کہا ہے کہ ؎

اَلْمُرَادُ مِنَ الْاِتِّحَادِ هُوَ اَنْ لَا يَنْظُرَ اِلَّا اِلَيْهِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّتَكَلَّفَ وَيَقُوْلُ مَا عَدَاهُ قَائِمٌ بِهٖ	اتحاد سے مراد یہ ہے کہ نہ نظر رکھے مگر اسی پر بلا تکلف کے اور کہے کہ اس کے سوا جو کچھ ہے اسی کے ساتھ قائم

فَيَكُوْنُ الْكُلُّ وَاحِدًا مِنْ حَيْثُ أَنَّهُ اِنْعِكَاسٌ لِمَصْدَرٍ نُوْرٍ تَجَلِّيْهِ لَا بِعَيْنِهِ إِلَّا ذَاتَهُ لَا الرَّائِي وَلَا الْمَرْئِيُّ

پس اس لحاظ سے سب ایک ہی ہوں گے کہ جب وہ شخص اس کے نور کی تجلی دیکھنے والا ہوگیا تو نہیں دیکھے گا مگر اسی کی ذات کو نہ دیکھنے والے کو اور نہ دیکھے گئے کو،،۔

عقیدہ (۱۵)،۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نظر آنے والے اعراض کے ساتھ متصف نہیں اس لئے رنگ و بو یا ان جیسی دوسری کیفیات، جیسے حواس خمسہ وغیرہ نہیں رکھتا،، مگر امامیہ کے فرقوں میں سے حکمیہ اس کے لئے مزہ رنگ و بو وغیرہ ثابت کرتے ہیں،

اور اس کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور غالی شیعہ تو ان سے بھی آگے بڑھ گئے ائمہ کے ابدان میں اللہ تعالیٰ کے حلول کو مان کر نہ ان کیفیات بالا ہی کا عقیدہ رکھتے ہیں بلکہ وہ تو اس کے لئے بھوک، پیاس بول و براز، جیسی ضروریات اس کی ذات کے لئے جائز رکھتے ہیں۔

اس کی تردید میں ابھی اوپر جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بیان کیا جا چکا ہے کہ "وہ کسی بھی عرض سے متصف نہیں،،

عقیدہ (۱۶)) اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کسی بھی چیز میں چھپ نہیں سکتی اور نہ وہ سایہ رکھتی ہے،

مگر سارے ہی غالی شیعہ کہتے ہیں کہ وہ سایہ رکھتی ہے اور پانی و آئینہ میں چھپتی ہے، مغیرہ عجلی۔ جو فرقہ مغیرہ کا سرگروہ ہے کہتا ہے،

لَمَّا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ تَكَلَّمَ بِاِسْمِهِ الْاَعْظَمِ فَطَارَ فَوَقَعَ تَاجًا عَلٰى رَاسِهِ وَذٰلِكَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ثُمَّ كَتَبَ عَلٰى كَفِّهِ اَعْمَالَ الْعِبَادِ فَغَضِبَ مِنَ الْمَعَاصِيْ فَعَرِقَ فَحَصَلَ مِنْ عَرَقِهِ بَحْرَانِ اَحَدُهُمَا مِلْحٌ مُظْلِمٌ وَالْاٰخَرُ حُلْوٌ نَيِّرٌ ثُمَّ اَطْلَعَ فِي الْبَحْرِ النَّيِّرِ فَاَبْصَرَ فِيْهِ ظِلَّهُ فَانْتَزَعَ بَعْضَ الشَّمْسِ مِنْهُ فَخَلَقَ مِنْهُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَاَفْنٰى بَاقِيَ الظِّلِّ نَفْيًا لِلشَّرِيْكِ وَقَالَ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ يَكُوْنَ اِلٰهٌ اٰخَرُ ثُمَّ خَلَقَ الْخَلْقَ مِنَ الْبَحْرَيْنِ فَالْكُفَّارُ مِنَ الظُّلْمَةِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ مِنَ النُّوْرِ۔

ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے کہ پیدا کرے مخلوق کو تو اس نے اسم اعظم پڑھا وہ اڑ کر اس کے سر کا تاج بن گیا۔ اور سبح اسم ربک الاعلیٰ الذی خلق فسویٰ کے یہی معنے ہیں پھر اپنی ہتھیلی پہ بندوں کے اعمال لکھے اور ان کے گناہوں اور نافرمانیوں سے اس قدر غیض و غضب میں آیا کہ پسینے پسینے ہوگیا اس کے پسینے سے دو دریا پھوٹے ایک کھاری اور تاریک، دوسرا میٹھا اور روشن، پھر روشن دریا پر آکر اس میں اپنا عکس دیکھا اس میں سے تھوڑی روشنی لی، اور اس سے چاند سورج بنائے باقی عکس کو مٹا دیا تاکہ شریک مٹ جائے عکس مٹاتے وقت یہ کہا کہ شریک نہیں ہونا چاہیئے پھر ساری مخلوق کو ان دو دریاؤں سے پیدا کیا، کھاری و تاریک سے کافر بیٹھے اور روشن سے مومن،،

اس عقیدہ کا غلط ہونا تو بالکل ظاہر ہے کیونکہ چھپنا، اور عکس کا پڑنا کثیف اجسام میں سے ہے اور یہ غلاۃ تو صرف اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ وہ تو اس کی ذات پاک کو تمام نفسانی کیفیات متصف مانتے ہیں، مثلاً رنج کینہ حسد، غمی و خوشی وغیرہ اس لئے کہ وہ ائمہ میں اللہ تعالیٰ کے حلول کو مانتے ہیں،

ائمہ تو بہر حال و بلاشک ان صفات سے متصف ہیں لیکن یہ ظلم تو ان اوصاف سے بھی آگے بڑھ کر تمام حیرانی

صفات کے ساتھ بھی اس کی ذات کو متصف کہتے ہیں، مثلاً، کھانا، پینا، نیند، اونگھ، جماہی، چھینک، پیشاب پاخانہ کرنا مذکر و مؤنث ہونا وغیرہ وغیرہ اور یوں یہ بدبخت اللہ تعالیٰ کو اسی کی بنائی ہوئی مخلوق کے مماثل اور مشابہ مانتے اور اپنی عاقبت خراب کرتے رہے،

اس عقیدہ کی مخالفت ثقلین سے اظہر من الشمس ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ) وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (وہ کھلاتا ہے، خود نہیں کھاتا) كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ (وہ دونوں (حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام) کھانا کھاتے تھے) وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (اس کی کوئی بیوی نہیں) وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا (اس نے کسی کو اپنا لڑکا نہیں بنایا)

نہج البلاغہ میں روایت ہے کہ جناب امیر نے فرمایا۔

لَمْ يَلِدْ فَيَكُوْنَ لِلْغَيْرِ شَارٍ، كَا وَلَمْ يُوْلَدْ فَيَكُوْنَ مُوْرِثًا هَالِكًا لَا يُبْصِرُ بِعَيْنٍ وَلَا يُحَدُّ بِاَيْنٍ وَلَا يُوْصَفُ بِالْاَزْوَاجِ وَلَا يَخْلُقُ بِعِلَاجٍ (کسی کو اس نے نہیں جنا کہ وہ اس کا شریک بنے نہ وہ خود جنا گیا کہ مورث چھوڑ کر خود مرنا پڑے نہ وہ آنکھ سے دیکھتا ہے نہ کسی جگہ سے گھرتا ہے۔ نہ اس کے بیوی ہے اور نہ وہ ہاتھ سے مخلوق تراشتا ہے)،

نیز فرمایا۔ جَلَّ عَنِ اتِّخَاذِ الْاَبْنَاءِ وَطَهُرَ عَنْ مُلَامَسَةِ النِّسَاءِ (وہ بیٹے بنانے اور عورتوں کو چھونے سے بالاتر ہے)،

اثنا عشریہ میں سے خواجہ نصیر الدین طوسی اور صاحب یاقوت اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ لذت عقلیہ کے ساتھ متصف ہے انہوں نے گویا غائب کو ظاہر پر قیاس کیا۔

ان کا یہ عقیدہ بھی کتاب اللہ وعترت رسول اللہ کے خلاف ہے قرآن تو اس کی جڑ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ فرما کر کاٹ دیتا ہے، اور عترت رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا اس کو نہج البلاغہ نے یوں روایت کیا ہے اَنَّهٗ قَالَ هُوَ اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ لَمْ يَبْلُغِ الْعُقُوْلُ تَحْدِيْدَهٗ فَيَكُوْنَ مُشَبَّهًا وَلَمْ يَقَعْ عَلَيْهِ الْاَوْهَامُ فَيَكُوْنَ مُمَثَّلًا (آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سچا اور صاف بادشاہ ہے عقلیں اس کی حد بندی تک رسائی پیدا نہ کر سکیں کہ اسے تشبیہ دی جاتی نہ وہم اس تک پہنچ سکے کہ اس کی مثال دی جاتی)،

اور نہج البلاغہ میں امیر المومنین سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں، انه قال ما وحد من كيفه ولا اياه عنى من شبهه (آپ نے فرمایا جس نے اس کی کیفیت بیان کی اس نے اس کی توحید نہ کی اور جس نے اس کی تشبیہ دی اس نے مجھ میں (مخلوق میں) اور اس میں کوئی فرق نہیں کیا)۔

اور کلینی میں جناب رضا رح سے مروی ہے۔ تیری ذات پاک ہے، یہ اپنے نفسوں کے کیسے غلام ہیں کہ تجھے تیری مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں"

اور اسی نے ابی ابراہیم سے یہ بھی روایت کی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کسی شے کے مشابہ نہیں ہے"

عقیدہ (۱۷) اللہ تعالیٰ کے لئے "بدا" کی نسبت جائز نہیں" بدا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کا ارادہ فرمائے پھر اسے کسی دوسری چیز میں کوئی مصلحت نظر آئے جو پہلے سے معلوم نہ ہو سکی لہذا پہلے ارادہ سے دست بردار ہو کر دوسرے

ارادہ کر اختیار فرمالے۔ یہ خیالی عقیدہ اسی بات کو چاہتا ہے کہ گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ ناعاقبت اندیش اور امور کے نتائج سے ناواقف ہے، اللہ تعالیٰ کی شان اس گندے خیال سے بہت بالاتر ہے،

زراریہ، سالمیہ، بدائیہ اور دوسرے امامیہ فرقے، مثلاً مالک جہنی، دار بن حکم، ریان بن صامت اور ان کے علاوہ ابدار کو مانتے ہیں، اور ائمہ سے اس کے بارے میں روایات بیان کرتے ہیں، چنانچہ کلینی ہی زرارہ بن اعین سے روایت ہے کہ ائمہ میں سے کسی ایک سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بداء سے اچھی کوئی چیز نہیں ہشام بن سالم نے ابی عبد اللہ سے روایت کی مَاعَظَمَ اللہ بمثل البدء اور بداء سے عظیم اللہ تعالیٰ کسی اور چیز کو نہیں جانتا) اور ریان بن صامت کہتا ہے کہ میں نے جناب رضا کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ

"اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو کبھی نہیں بھیجا مگر یہ کہ شراب کو حرام کرنے کے لئے اور بداء کا اقرار کرنے کے لئے"۔

زرارہ اور ہشام بن سالم کے حال سے تو آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ تو وہ ہیں کہ جنہوں نے ائمہ سے جسم اور صورت تک کی روایت بیان کر دی ہیں، مگر اثنا عشری بداء کے مسئلہ میں اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں جس سے اس کے منسوخ ہونے کا اشارہ ملتا ہے، تاکہ طعن و تشنیع کی گنجائش نہ رہے۔ لہٰذا ہم مجبوراً رسالہ اعلام الہدیٰ فی تحقیق البداء سے مناسب مقام چند عبارات اور ترجمہ پیش کرتے ہیں،

يُقَالُ بَدَا لَهُ إِذَا ظَهَرَ لَهُ رَأْيٌ مُخَالِفٌ لِلرَّأْيِ الْأَوَّلِ وَهُوَ الَّذِي حَقَّقَهُ الشَّيْخُ فِي الْعُدَّةِ وَأَبُو الْفَتْحِ الْكَرَاجِكِيُّ فِي كَنْزِ الْفَوَائِدِ وَالَّذِي حَقَّقَهُ الْمُرْتَضَى فِي الذَّرِيعَةِ وَيُشْعِرُ بِهِ كَلَامُ الطَّبْرَسِيِّ وَهُوَ أَنَّ مَعْنَى قَوْلِنَا بَدَا لَهُ تَعَالَى أَنَّهُ ظَهَرَ لَهُ مِنَ الْأَمْرِ مَا لَمْ يَكُنْ ظَاهِرًا إِلَى آخِرِ مَا نَقَلَ۔

بداء اس وقت بولا جاتا ہے کہ اس کے لئے پہلی رائے کے خلاف کوئی رائے ظاہر ہو، چنانچہ شیخ نے عدۃ (کتاب) میں اور ابو فتح کراجکی نے (کتاب) کنز الفوائد میں اسی کی تحقیق کی ہے اور اس کو حق ٹھہرایا ہے اور مرتضیٰ نے ذریعہ (کتاب) میں جس کو حق ثابت کیا ہے، طبرسی کا کلام بھی اس کی طرف تائیدی اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے اس قول بدا لہ تعالیٰ کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی معاملہ میں وہ بات ظاہر ہوگئی جو پہلے ظاہر نہ تھی"۔

اسی طرح کی اور نقلیں بھی اس کتاب میں درج کی ہیں اس کے بعد امام مہدی کا مصنف کہتا ہے،

اَلْحَاصِلُ أَنَّ عِلْمَهُ سُبْحَانَهُ بِالْحَوَادِثِ حَادِثٌ عَلَى مَا دَلَّ عَلَيْهِ الْأَحَادِيثُ وَالْآيَةُ الْمَذْكُورَةُ وَنَظَائِرُ مَا صَرَّحَ بِهِ الْمُرْتَضَى وَالطَّبْرَسِيُّ وَالْمِقْدَادُ قَدَّسَ اللّٰهُ أَرْوَاحَهُمْ،

حاصل کلام یہ ہے کہ حوادث کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم نہیں ہے چنانچہ احادیث اور آیت مذکورہ اور ان جیسی بہت سی چیزیں اس بات پہ دلالت کرتی ہیں اور مرتضیٰ طبرسی اور مقداد نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے اللہ ان کی روحوں کو پاک کرے"

پھر بداء کے اقسام کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد کہتا ہے،

وَمِنْ جُمْلَتِهَا تَحْوِيلُ الْأُنْثَى ذَكَرًا كَمَا رَوَاهُ فِي الْكَافِي

اور ان میں سے ایک عورت کو مرد کی شکل میں تبدیل

عَنِ الْحَسَنِ ابْنِ جُهْمٍ عَنِ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي بَابِ بَدْءِ خَلْقِ الْإِنْسَانِ فِي كِتَابِ الْعَقِيقَةِ
نے یہ روایت جناب رضا سے کی ہے،
آگے کہتا ہے کہ۔

کردہا ہے، جیساکہ حسن بن جہم سے کافی کی کتاب العقیقہ کے باب بدء خلق الانسان میں روایت کیا گیا ہے اور اس

وَالثَّانِي الْبَدَاءُ فِي الْأَخْبَارِ، وَصَرَّحَ الطَّبْرَسِيُّ بِسَنَدِهِ وَمَا رَوَى فِي الْكَافِي وَالْأَمَالِي الصَّدُوقُ عَنْ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ قَوْلِهِ لَوْلَا آيَةٌ فِي كِتَابِ اللهِ تَعَالَى لَأَخْبَرْتُكُمْ بِمَا يَكُونُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يُرِيدُ بِالْآيَةِ قَوْلَهُ تَعَالَى يَمْحُو اللهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَمَا رَوَاهُ عَلِيُّ ابْنُ إِبْرَاهِيمَ فِي تَفْسِيرِ قَوْلِهِ تَعَالَى الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّومُ وَمَا رَوَاهُ الصَّدُوقُ فِي عُيُونِ أَخْبَارِ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّهُ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ آبَائِهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ أَوْحَى إِلَى نَبِيٍّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ الخ وَمَا رَوَاهُ صَاحِبُ الْكَافِي فِي بَابِ أَنَّ الصَّدَقَةَ تَدْفَعُ الْبَلَاءَ مِنْ كِتَابِ الزَّكٰوةِ فِي قِصَّةِ الْيَهُودِيِّ وَمَا رَوَاهُ فِي الْأَمَالِي فِي الْمَجْلِسِ الْخَامِسِ وَالسَّبْعِينَ مِنْ قِصَّةِ مُرُورِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ بِقَوْمٍ مُجَلِّبِينَ وَمَا رَوَاهُ الرَّاوَنْدِيُّ فِي قِصَصِ الْأَنْبِيَاءِ فِي أَخْبَارِ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّ وَرَشَانًا كَانَ يُفَرِّخُ فِي شَجَرَةٍ وَكَانَ رَجُلٌ يَأْتِيهِ إِذَا أَدْرَكَ الْفَرْخَانِ فَيَأْخُذُ الْفَرْخَيْنِ فَشَكَا ذٰلِكَ الْوَرَشَانُ إِلَى اللهِ تَعَالَى فَقَالَ سَأَكْفِيكَ قَالَ فَأَخْرَجَ الْوَرَشَانُ وَجَاءَ الرَّجُلُ وَمَعَهُ رَغِيفَانِ فَصَعِدَ الشَّجَرَةَ وَعَرَضَ لَهُ سَائِلٌ فَأَعْطَاهُ أَحَدَ الرَّغِيفَيْنِ ثُمَّ صَعِدَ وَأَخَذَ الْفَرْخَيْنِ فَسَلَّمَهُ اللهُ تَعَالَى لِمَا تَصَدَّقَ تَدُلُّ بِأَجْمَعِهَا عَلَى وُقُوعِ الْبَدَاءِ فِي الْأَخْبَارِ

دوسرا بداء اخبار میں، اس کو طبرسی نے صراحت سے ردکیا ہے (بداء اخبار کے سلسلہ کی) ایک وہ روایت ہے جو کافی اور امالی میں امیرالمومنین سے بطریق صدوق مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم کو قیامت تک ہونے والی باتوں کی خبر دیتا آپ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے، یَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ آخر آیت تک اور ایک وہ روایت ہے جو آیت الم غلبت الروم کی تفسیر کے ذیل میں علی بن ابراہیم سے منقول ہے پھر وہ روایت ہے جو عیون اخبار الرضا میں بطریق صدوق منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھ سے والد نے اور ان سے ان کے باپ دادا نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں میں سے کسی نبی کے پاس وحی بھیجی۔ اور روایت جو صاحب کافی نے کتاب الزکوٰۃ کے باب ان الصدقۃ تدفع البلاء میں ذکر کی ہے اور وہ روایت جو امالی کی مجلس ۷۵ میں اس قصہ کے دوران کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قوم مجلبین پر گزر رہے ہیں، بیان کی ہے اور وہ روایت جو راوندی نے قصص فی اخبار بنی اسرائیل میں جناب صادق سے کی ہے کہ ایک پرندہ ایک درخت پر انڈے بچے دیا کرتا تھا وہاں ایک آدمی آتا اور بچے اٹھا لے جاتا اس پرندے نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تیری شکایت جلد دور کردوں گا۔ چنانچہ پرندے نے پھر بچے دیئے اور وہ آدمی پھر آیا اور اپنے ساتھ دو روٹیاں بھی لایا، جب وہ درخت پر چڑھنے لگا تو ایک سائل آگیا، اس کے سوال پر اس شخص نے ایک سائل کو روٹی دیدی پھر درخت پر چڑھ کر بچوں کو لے گیا تو اس صدقہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سزا سے بچا لیا،

لہٰذا یہ ساری روایات مل کر یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ اخبار میں بدا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ امامیہ کے متاخرین نے بدا کے قول کی برائی محسوس کر کے بدا کو اللہ تعالیٰ کے مخفی علوم کے ساتھ مختص کیا ہے اور کہا ہے وہ علم جو اللہ تعالیٰ فرشتوں یا اہل بیت تک پہنچائے اس میں بدا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو جھوٹا کرنا نہیں چاہتا، مگر نظام الدین جیلانی صاحب رسالہ علم الہدیٰ جو اثنا عشریوں کا بڑا محقق گزرا ہے اس تخصیص کو نہیں مانتا اور اس بارے میں ان کو جھٹلاتا ہے، اور کہتا ہے کہ:

لَا يَخْفَىٰ عَلَيْكَ أَنَّ مَا نَقَلْنَاهُ عَنْ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ قَوْلِهٖ لَوْلَا آيَةٌ الخ وَمَا نَقَلْنَاهُ مِنَ الْكَافِيْ فِيْ قِصَّةِ الْيَهُوْدِيِّ وَعَنِ الْأَمَالِيْ فِيْ قِصَّةِ عِيْسٰى وَمَا رَوَاهُ أَيْضًا صَاحِبُ الْكَافِيْ فِيْ كِتَابِ النِّكَاحِ فِيْ بَابِ اللِّوَاطَةِ فِيْ تَضَاعِيْفِ حَدِيْثٍ رَوَاهُ بِالْإِسْنَادِ عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ وَهٰذَا مَوْضِعُ الْحَاجَةِ مِنْهُ قَالَ لَهُمْ لُوْطٌ يَا رُسُلَ رَبِّيْ فَمَا أَمَرَكُمْ رَبِّيْ فِيْهِمْ قَالُوْا أَمَرَنَا أَنْ نَأْخُذَهُمْ بِالسَّحَرِ قَالَ فَلِيْ إِلَيْكُمْ حَاجَةٌ قَالُوْا وَمَا حَاجَتُكَ قَالَ تَأْخُذُوْهُمُ السَّاعَةَ فَإِنِّيْ أَخَافُ أَنْ يَّبْدُوَ فِيْهِمْ لِرَبِّيْ الخ وَأَيْضًا مَا رَوَاهُ صَاحِبُ الْكَافِيْ فِيْ بَابِ بَدْءِ خَلْقِ الْإِنْسَانِ مِنْ كِتَابِ الْعَقِيْقَةِ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لِلْمَلَكَيْنِ الْخَلَّاقَيْنِ اُكْتُبَا عَلَيْهِ قَضَائِيْ وَقَدَرِيْ وَنَافِذَ أَمْرِيْ وَاشْتَرِطَا لِيَ الْبَدَاءَ فِيْمَا تَكْتُبَانِ وَمَا رَوَاهُ الصَّدُوْقُ بِالْإِسْنَادِ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ طَلْحَةَ قَالَ قُلْتُ لِلرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ أَتَأْتِي الرُّسُلُ عَنِ اللّٰهِ بِشَيْءٍ ثُمَّ تَأْتِيْ بِخِلَافِهٖ قَالَ نَعَمْ إِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ وَإِنْ شِئْتَ أَتَيْتُكَ بِهٖ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ اُدْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ الْآيَةَ فَمَا دَخَلُوْهَا وَدَخَلَ أَبْنَاءُ أَبْنَائِهِمْ وَقَالَ عِمْرَانُ إِنَّ اللّٰهَ وَعَدَنِيْ أَنْ يَّهَبَ لِيْ غُلَامًا فِيْ سَنَتِيْ هٰذِهٖ وَشَهْرِيْ هٰذَا ثُمَّ غَابَ وَوَلَدَتْ امْرَأَتُهٗ مَرْيَمَ فَقَامَ لِذٰلِكَ لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ أَكْذَبَ فِيْهَا النَّبِيَّ وَعِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَشَاهَدَ عَلَى الْمَلَائِكَةِ الْبَدَاءَ الخ

تم پر واضح ہے جو کچھ ہم نے امیر المومنینؓ سے نقل کیا ان کا قول آیت لولا آیۃ آخر تک اور جو کچھ نقل کیا کافی سے یہودی کے قصہ کے سلسلہ میں اور امالی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں اور وہ روایت بھی جو صاحب کافی نے کتاب النکاح کے باب لواطت میں ایک حدیث کے سلسلہ میں اپنے رواۃ کی سند سے ابی جعفر سے بیان کی ہے۔ اس کا ضروری اختصار یہاں کرنا ضروری ہے لوط علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کہ میرے رب نے ان لوگوں (قوم لوط) کے بارے میں کیا حکم فرمایا ہے؟ فرشتوں نے کہا کہ ہمیں یہ حکم ہے کہ صبحدم ان کو آگھیریں۔ لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم سے میری ایک درخواست ہے کہ تم ان کو ابھی گھیر لو مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں میرے رب کو بدا نہ ہو جائے، علاوہ ازیں صاحب کافی نے کتاب العقیقہ کے باب بدء خلق الانسان میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے جو تخلیق انسان پر مامور ہیں کہتا ہے کہ اس پر میرا فیصلہ، میرا اندازہ اور مرا چلنے والا حکم لکھو اور اس لکھے پر میرے لئے بدا کی شرط کا مزید اضافہ کرو"

اور وہ روایت جو بطریق صدوق حسن بن محمد بن ابی طلحہ سے مروی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے جناب رضاؒ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو احکامات و ہدایات ملتی ہیں، اس کے خلاف بھی آپ سے کوئی چیز ملتی ہے انہوں نے کہا ہاں۔ تم کہو تو اس کے ثبوت میں آپ بیان کروں اور کہو تو حدیث سے ثابت کروں اور یہ دیکھو آیت میں ہے کہ جو سرزمین مقدس تمہارے لئے لکھدی گئی ہے اس میں داخل ہو جاؤ۔ مگر وہ تو اس میں داخل

نہیں ہوئے ان کے پوتے داخل ہوئے۔ اور دیکھو کہ عمران نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اسی سال اور اسی ماہ لڑکا دینے کا وعدہ کیا ہے، پھر وہ تو غائب ہو گئے مگر ان کی عورت نے لڑکے کے بجائے لڑکی کو جنا۔

پس یہ ساری روایات و واقعات اس خیال کی جو امامیہ کے متاخرین کا ہے،، تردید کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا پڑوا دیا اور یہ کہ فرشتوں پر شرط لگائی،،

خلاصہ کلام یہ کہ اس سلسلہ میں شیعوں کی تمام روایات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بدا کے تین اقسام یا معنے ہیں، اول علم میں بدا کہ اپنے پچھلے اور سابقہ علم کے خلاف انکشاف ہو دوسرے ارادہ میں بدا۔ کہ پہلے ارادہ کے خلاف نظر آئے، اور تیسرے حکم میں بدا، کہ پہلے ایک بات کا حکم دیا جائے پھر اسی کے خلاف حکم دیا جائے،

شیعوں کے نزدیک تینوں قسم کا بدا اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود و ثابت ہے،

تیسرے قسم کا بدا جو نسخ سے ملتا جلتا ہے اسے یہ اہل سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ یہ لوگ اسے مانتے ہیں۔ ان کی اصطلاح میں پہلا بدا۔ بدا فی الاخبار کہلاتا ہے دوسرا بدا فی التکوین اور تیسرا، بدا فی التکلیف،

یہاں قابل غور اور لائق توجہ بہت باریک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ آخری بدا نہ تو نسخ ہے اور نہ ہی اہل سنت کی اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے اس مسئلہ کی تحقیقی صورت یہ ہے کہ اہل سنت اور شیعہ ہر دو فریق اس پر تو متفق ہیں کہ جب نسخ کو روکنے والے شرائط ثابت و متحقق ہو جائیں تو نسخ جائز نہیں وہ شرائط اہل سنت کے نزدیک چار ہیں،

(۱) کلام (۲) وجہ (۳) وقت اور (۴) مکلف کا ایک ہونا۔ نسخ کے جواز کے قائل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو بطور دلیل و ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ان کا ذبح منسوخ کیا گیا، اور ان کی جگہ مینڈھا ذبح کر دیا گیا۔ تو یہ دلیل و حجت غلط و باطل ہے، اس لئے کہ یہ صورت نسخ کی ہرگز نہیں ہے یہ تو اصل پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں بدل کو اسی کی جگہ قائم کرنے کی بات ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو حتی الوسع چھری تیز کر لی تھی، اور چلانے میں بھی کوئی کمی نہیں کی تھی، لیکن خرق عادت یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی رگ ہائے گلو اور نرخرہ نہ کٹنے کی وجہ سے ارادہ پورا کرنے میں بے بس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بےبسی دیکھتے ہوئے مینڈھا بھیجا۔ اور اصل کی جگہ بدل قائم کرنے کو کوئی بھی نسخ نہیں کہتا۔ مثلاً وضو کی جگہ تیمم وضو کے لئے نسخ نہیں۔ اسی طرح پچاس نمازوں کا نسخ جس کے مخاطب صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم تھے امت کو تو اس کا پتہ بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ مکلف بھی نہ ہوئے،

شیعوں کے اہل تحقیق مذکورہ چار شرائط پائے جانے کے باوجود بھی نسخ کو جائز بتاتے ہیں، اور ایک پانچویں شرط کا مزید اضافہ کرتے ہیں اور وہ یہی بدا فی التکلیف ہے، جیسا کہ صاحب علم الہدی کہتا ہے۔

وَنَحْنُ نَقُوْلُ الْبَدَاءُ فِی التَّکْلِیْفِ اِنَّمَا یَمْتَنِعُ اِذَا اجْتَمَعَ مَعَ الشُّرُوْطِ الْاَرْبَعَۃِ الْمَذْکُوْرَۃِ شَرْطٌ خَامِسٌ وَھُوَ اَنْ یَکُوْنَ حُسْنُ التَّکْلِیْفِ وَالْاَمْرِ مُسَبَّبًا عَنْ مَصْلَحَۃٍ عَائِدَۃٍ اِلَی الْمَامُوْرِبِہٖ وَاَمَّا اِذَا کَانَ حُسْنُ الْاَمْرِ لِمَصْلَحَۃٍ عَائِدَۃٍ اِلَی الْاٰمِرِ نَفْسِہٖ فَلَا یَمْتَنِعُ الْبَدَاءُ فَالْمُرَادُ بِالْبَدَاءِ الْمُجَوَّزِ عِنْدَنَا مَا اجْتَمَعَ فِیْہِ الْاَرْبَعَۃُ

ہم کہتے ہیں کہ بدا فی التکلیف اس وقت منع ہے جب کہ مذکورہ چاروں شرطوں کے ساتھ پانچویں شرط بھی پائی جائے وہ یہ کہ حکم اور تکلیف دینے کی بہتری اس شخص کی مصلحت سے وابستہ ہو جس کو حکم دیا گیا ہے لیکن جب کہ اس کے خلاف خود حکم دینے والے کی مصلحت کی طرف وہ بہتری عائد ہوتی ہو تو اس وقت وہ بدا فی التکلیف منع نہیں، لہذا ہمارے

دُوْنَ الْخَامِسِ وَكَوْنُ اِطْلَاقِ الْبَدَاءِ عَلَيْهِ مَجَازًا اَلَا وَقْعَ لَهٗ بَعْدَ النُّصُوْصِ الْمُتَوَاتِرَةِ مِنَ الْعِتْرَةِ الطَّاهِرَةِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ وَاِذَا اجْتَمَعَتِ الشَّرَائِطُ الْخَمْسَةُ فَلَا رَيْبَ فِي امْتِنَاعِ الْبَدَاءِ كَمَا نَقَلْنَاهُ عَنِ الشَّهِيْدِ انْتَهٰى

نزدیک بدا کی جائز شدہ صورت یہ ہے کہ چاروں شرطیں اگرچہ پائی جائیں مگر پانچویں شرط نہ ہو، اب اگر اس پر مجازاً ابدا کا اطلاق ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جب کہ عترت پاک سے اس بارے میں متواتر نصوص موجود ہیں جب پانچویں شرط پائی گئی تو بدا کے منع ہونے میں کوئی شک نہیں جیسا کہ ہم نے شہید سے نقل کیا،"

یہاں اس بات کا پتہ چلا کہ بدائی التکلیف بدائی الارادہ کا مقتضی ہے کیونکہ اگر کوئی نئی مصلحت سامنے نہ آئے تو حکم کو بدائی التکلیف کیوں لاحق ہونے لگا اور اسی طرح بدائی الارادہ، بدائی العلم کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ علم کے بغیر ارادہ ہوتا ہی نہیں جب تک علم میں تبدیلی نہ ہو ارادہ میں تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا اگر امامیہ بدائی العلم کے منکر ہوں اور باقی دو کو مانیں تو ان کا یہ انکار بے معنی اور بے کار بات ہوگی،

اسی کے ساتھ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یہ لوگ بدا میں حکم کے نسخ کو مانتے ہیں اس طرح کے کسی مصلحت کی بنا پر حکم اول حکم ثانی سے بدل جاتا ہے اس پر ہم پوچھتے ہیں کہ یہ مصلحت صرف اسی وقت ظاہر ہوئی یا پہلے بھی ظاہر تھی، پہلی صورت میں ہمارا مدعا حاصل ہوگیا کہ بدائی العلم ضروری ہوا جس کا وہ انکار کرتے ہیں دوسری صورت میں یہ فعل لا یعنی عبث ہوا کیونکہ نسخ مختلف اوقات کے اعتبار سے مکلفین کی مصلحتوں کے بدل جانے سے ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی مصلحت غیر ظاہر تھی، اب ظاہر ہوگئی،

کیونکہ تغیر و تبدل کا حکم تو ہمارے لحاظ سے ہوتا ہے کہ ہم جہالت کے غاروں میں پھنسے ہوئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو ہر حکم کی ایک مدت اور اس کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اسی مدت یا وقت تک باقی ہے اب اس آیت يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ میں محو سے اعمالناموں سے گناہوں کا مٹانا اور اس میں توبہ کا اثبات ہے یا فاسد کو مٹانا اور کائنات کا ملائکہ کے صحف میں ثبت کرتا ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ محو و اثبات ہے۔ اس لئے کہ آیت کے آخری جز میں فرمایا گیا ہے وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ یعنی کہ اصل کتاب اس کے پاس ہے،

اس بارے میں انہوں نے جو حدیثیں بیان کی ہیں، وہ سب کی سب موضوع اور گھڑی ہوئی ہیں جن کے راوی جھوٹے اور حدیثیں گھڑنے والے ہیں اور جب عقلی اور شرعی دلائل قطعی موجود ہیں تو ان کے مقابلے میں ان جھوٹی باتوں پر کان دھرے جائیں تو کیوں؟

ان سب سے قطع نظر گزشتہ اوراق میں یہ معلوم ہوچکا ہے کہ ائمہ سے ایسی صریح و متواتر روایات منقول ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اللہ کا علم سب کو شامل ہے اور اس کے لئے اشیاء کے وجود سے پہلے اور بعد کا علم یکساں ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ انہی کا شیخ صدوق (سچا)، اپنی کتاب التوحید میں آیت وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ سے اسی خیال پر دلیل لایا ہے،

یہیں سے ان کے اہل علم کے معیار فہم و عقل کی قلعی بھی کھل جاتی ہے کہ جب اس قرآن مجید کے سمجھنے میں قسم قسم کی غلطیوں کے شکار ہوئے اور جگہ جگہ ٹھوکریں کھائیں جس کی تفسیر و خدمت میں ساری مخلوق لگی ہوئی ہے تو ائمہ کے اس کلام کے سمجھنے میں تو معلوم نہیں کہاں کہاں منہ کے بل گرے ہوں گے جو انہوں نے اپنی پہیلیوں اور

صندوقوں میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں، اور جن کی ہوا تک کسی کو نہیں دیتے!

اگر کسی کے دل میں یہ شبہ ہو کہ شیعوں کی اپنے ائمہ سے منقول کی ہوئی روایات کے مطابق خود صحیح بخاری میں بھی نواقرع، ابرص اور اعمیٰ سے بھی تو روایات موجود ہیں جن میں بَدَا اللّٰہُ اَنْ یَّبْتَلِیَھُمْ کے الفاظ آئے ہیں اس کو اہل سنت کس معنے پر محمول کرتے ہیں، تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر یہ جملہ ان روایات میں اپنی صحیح جگہ استعمال ہوا ہے اور وہ روایات صحیح الاسناد بھی ہیں تو بدا کے مجازی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے افعال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ ہر طرف سے اسباب ان کے وجود کے متقاضی ہوں دوسرے وہ کہ ان کے وجود کا مطالبہ کرنے والے کچھ اسباب بھی موجود نہ ہوں بلکہ وجود اسباب کے موانع موجود ہوں تو دوسری قسم میں لفظ بدا بطور استعارہ اور تشبیہ استعمال ہوتا ہے، اور صرف بدا ہی نہیں جس میں مجاز برتا گیا ہو احادیث و آثار میں سینکڑوں ایسے الفاظ ہیں جن میں مجاز برتا گیا ہے، مثلاً امتحان، ابتلا، ضحک، اور تردد کہ یقیناً ان کے حقیقی معنے مراد نہیں ہیں یا صفات کی وہ تمام آیات جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے وجہ، یدین، اصابع اور یمین وغیرہ کا ذکر ہے کہ یہ سب کے سب مجازی معنی پر محمول ہیں اور پھر ائمہ نے بعض آثار میں بدا، کا لفظ صرف لوگوں کو فہمائش کرنے کی غرض سے استعمال کیا ہے۔ حقیقت میں وہ بدا نہیں۔!

ان کی روایت میں قصہ عمران کے سلسلہ میں ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے وَعَدَنِیْ رَبِّیْ غُلَامًا اس لئے کہا کہ ان کی بیوی اپنے پیٹ کی اولاد کی نذر مان چکی تھیں،

اور آیت کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ سے کسی خاص وقت و زمانہ کے خاص حاضرین مراد نہیں، بلکہ سارے بنی اسرائیل مراد ہیں۔

اور فرشتوں کے خطاب کے سلسلہ میں بدا کی شرط فرشتوں کے علم کے لحاظ سے تھی اسی طرح یزید کے قصہ میں صرف کفایت وہ مدد کا وعدہ ہے اس میں وقت کی تعیین نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ بھی وہ شخص بچ بے جا سکا، جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم، کو خواب میں بتایا گیا کہ آپ اور آپ کے صحابہؓ مسجد میں داخل ہوں گے اور اس سے آپ نیز آپ کے اصحاب یہی سمجھے کہ داخلہ اسی سال ہوگا،

حالانکہ فی الواقعہ اتنی عجلت مراد نہ تھی، لہذا یزید کے معاملہ میں وعدہ کفایت سے عجلت سمجھ لی جائے تو تعجب کی کیا بات ہے۔ یہاں بدا ہوا بھی تو علم میں ہوا واقع اور نفس الامر میں واقع نہیں ہوا۔ اسی طرح دوسری روایات میں غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ کیا مراد ہے،

عقیدہ (۱۸) :۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کے کفر و گمراہی سے خوش و راضی نہیں ہوتا؛ جیسے فرمایا وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ (وہ اپنے بندوں کے کفر پر خوش نہیں)۔

مگر شیعہ کہتے ہیں وہ شیعوں کے علاوہ دوسروں کے کفر پر راضی ہے۔

چنانچہ صاحب محاسن نے جناب موسیٰ کاظم رحمہ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ لَا تُعَلِّمُوْا ھٰذَا الْخَلْقَ اُصُوْلَ دِیْنِھِمْ وَ کَرِھُوْا لَھُمْ بِمَا رَضِیَ اللّٰہُ لَھُمْ مِنَ الضَّلَالِ (اس مخلوق کو اپنے دین کے اصول نہ سکھاؤ اور جس طرح اللہ تعالیٰ ان کی گمراہی پر راضی ہوا تم بھی راضی رہو) اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو اہل سنت کے لئے

تو بڑی خوشخبری ہے، اس لئے کہ وہ بقول ائمہ اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق بسر کر رہے ہیں جب ہی تو اللہ ان سے راضی ہے، اور رضائے الٰہی جو اہل دین کی دلی مراد ہے گویا انہیں ائمہ کی گواہی سے حاصل ہے،

اب علمائے شیعہ کو چاہیئے کہ وہ اس روایت کی بھی تکذیب کر دیں جس طرح صورت و شکل اور جسم والی روایات کو جھٹلا دیا ہے۔ کیونکہ عقلی دلائل اور خود ان کے اصول شرعیہ کے یہ خلاف ہے دراصل یہ روایت ایک طرف تو امامت کی غرض کا قلع قمع کرتی ہے اور وجوب اصلح و انفع و الطف کے بھی منافی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے طے شدہ اصول کہ "اللہ تعالیٰ شر و برائی کفر و گناہ کو نہیں چاہتا" کی بیخ کنی کرتی ہے!

عقیدہ (۹۱):- "اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں"۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے، مگر سارے شیعہ اس پر متفق القول ہیں کہ بتقاضائے عقل اللہ تعالیٰ پر بہت سی چیزیں واجب و لازم ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ضرور و لابدی انجام گویا عقل کارخانہ قدرت کی بڑی شریک کار ہوئی اور اللہ تعالیٰ محکوم عقل ہو گیا حالانکہ اس کی ذات اس سے کہیں بلند و بالاتر ہے!

یہ عقل سے پیدل اتنا بھی سمجھنے سے عاجز ہیں کہ بادشاہ اگر رعایا کا محکوم ہو جائے تو یہ عیب اس کی شہنشاہیت پر بٹہ لگاتا ہے،

اسی طرح کائنات کے مالک، خالق اور بادشاہ کو اسی کی مخلوق کا محکوم بنا دینا اس کے مرتبہ کے کتنے بڑے نقصان کا اقرار ہے، ایسا خیال ربوبیت اور الوہیت کے مرتبہ کے ہرگز شایان شان نہیں ایک بندہ عاجز اور ذرہ حقیر کی یہ تاب یہ مجال کہاں کہ وہ اپنے مالک حقیقی پر کوئی چیز واجب و لازمی ٹھیرائے جو کچھ وہ عطا فرماتا ہے وہ اس کی مہربانی ہے اور جو نہیں دیتا وہ اس کا عین عدل و انصاف ہے وہ ہر فعل پر قابل تحسین ہے، چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ جو آپ نے صفین کے موقعہ پر دیا نہج البلاغہ میں درج ہے جس میں آپ فرماتے ہیں،

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِيْ عَلَيْكُمْ حَقًّا بِوَلَايَةِ اَمْرِكُمْ وَجَعَلَ لَكُمْ عَلَيَّ مِنَ الْحَقِّ مِثْلَ الَّذِيْ عَلَيْكُمْ وَالْحَقُّ اَوْسَعُ الْاَشْيَاءِ فِي التَّوَاصُفِ وَاَضْيَقُهَا فِي التَّنَاصُفِ لَا يَجْرِيْ لِاَحَدٍ اِلَّا جَرٰى عَلَيْهِ وَلَا يَجْرِيْ عَلٰى اَحَدٍ اِلَّا جَرٰى لَهٗ وَلَوْ كَانَ لِاَحَدٍ اَنْ يَّجْرِيَ لَهٗ وَلَا يَجْرِيْ عَلَيْهِ لَكَانَ ذٰلِكَ خَالِصًا لِلّٰهِ سُبْحَانَهٗ دُوْنَ خَلْقِهٖ لِقُدْرَتِهٖ عَلٰى عِبَادِهٖ وَعَدْلِهٖ فِيْ كُلِّ مَا جَرَتْ عَلَيْهِ صُرُوْفُ قَضَائِهٖ وَلٰكِنَّهٗ سُبْحَانَهٗ جَعَلَ حَقَّهٗ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يُّطِيْعُوْهُ وَجَعَلَ جَزَاءَهُمْ عَلَيْهِ مُضَاعَفَةَ الثَّوَابِ تَفَضُّلًا مِّنْهُ وَتَوَسُّعًا بِمَا هُوَ مِنَ الْمَزِيْدِ اَهْلُهٗ انتہٰی بالفظ المقدس۔

پس اللہ تعالیٰ نے تم پر میرا حق رکھا ہے اس لئے کہ مجھ کو تمہارے کاموں کی ولایت سپرد کی ہے اور اسی طرح مجھ پر تمہارا حق رکھا اور حق تمام چیزوں میں بیان کے اعتبار سے کشادہ تر ہے، اور تقاضوں کے لحاظ سے تنگ تر جب ایک پر دوسرے کا یا دوسرے پر ایک کا حق ہوتا ہے تو یہ حق پھر لوٹتا ہے اور اگر کہیں یہ حق نہیں لوٹتا تو وہ صرف اللہ سبحانہ، کی ذات مقدس ہوتی ہے جو اپنے بندوں پر قادر ہے اور اپنے ہر فیصلہ میں انصاف پسند مخلوق کا معاملہ ایسا نہیں ہے، ہاں اس نے بندوں پر اپنا یہ حق قائم کیا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں اور اس اطاعت کا بطور مہربانی و فراخدلی چند در چند ثواب دینا اپنے ذمہ کیا ہے اور وہ اس سے زیادہ مہربانی و بخشش کا بھی اہل ہے،،

اب ذرا ان واجبات کی فہرست بھی دیکھ لیجئے جو یہ بزعم خود و بخیال خام اپنے پروردگار پر لازم و واجب قرار دیتے ہیں۔

کیسانیہ، زیدیوں کے آٹھوں فرقے اور امامیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر یہ واجب ہے کہ وہ مکلفین کو امر و نہی فرمائے۔ اور رسولوں کے ذریعہ بندوں کے لئے واجبات و محرمات مقرر کرے۔

حالانکہ یہ عقل کا تقاضا نہیں۔ کہ کافر کو ایمان کی اور فاجر کو اطاعت کی تکلیف دی جائے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کو کیا فائدہ ہو گا۔ جب کہ دوسری طرف بندہ کے حق میں یہ سراسر خسارہ اور دائمی ہلاکت اور محض ضرر و نقصان ہے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے کام کے نتیجہ کو جانتا ہے اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کون حکم قبول کرے گا کون نہیں تعمیل کرے گا یا نہیں تو پھر جان بوجھ کر بندہ کو ہلاکت اور تلف کے خطرہ میں ڈالنا جبکہ اس کی خود ذات کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچتا کونسی عقل اور سمجھ کا تقاضا ہے۔ عاقل تو کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا کہ دوسرے کو تو اس سے نقصان پہنچے اور اس کو خود کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ خاص طور پر ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے ساری عمر تو ایمان واطاعت میں بتادی اور مرے تو کفر کی حالت میں، جیسے بلعم باعور اور امیہ بن الصلت وغیرہ کہ دنیا میں عبادت و اطاعت کی کٹھنائیوں سے گزرے اور آخرت میں دوزخ کا کندہ بنے اور اللہ تعالیٰ کو ان کی تکلیف سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اور پھر اللہ تعالیٰ پر تکلیف دینا واجب ہوتا تو چاہیئے تھا کہ رسولوں کا سلسلہ نہ ٹوٹتا، بلکہ ہر شہر، ہر قریہ اور ہر گاؤں میں پے درپے رسول آتے رہتے اور زمین کا چپہ چپہ رسولوں کی آمد سے معمور ہوتا کوئی آبادی خالی نہ رہتی اس لئے کہ تکالیف معلوم کرنے اور جاننے کے لئے بالاجماع عقل کافی نہیں۔ رسول ہی ایک ذریعہ ہے جس سے یہ کچھ معلوم ہو سکتا ہے،

حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہند و سندھ، خراسان، ماوراء النہر، ترکستان، خطا و ختن، چین و حبش کے بسنے والے صدیوں تک رسول کے مفہوم سے نا آشنا رہے نہ ان کی تاریخ اس کا پتہ دیتی ہے کہ کوئی اللہ کا رسول ان کے پاس آیا ہو کوئی معجزہ ان کو دکھایا اور اللہ کا پیغام ان تک پہنچایا۔

اور پھر یہ بھی ہوتا کہ نبی کی وفات کے بعد ایک نڈر جری امام غالب کو بھیجتا اور واضح نشانیوں اور زبردست خرق عادات واقعات سے اس کی تائید کرتا کہ وہ بیدھڑک ہو کر احکام کی تبلیغ میں مصروف ہوتا اور مکلفین کو شرعی احکام سے غافل نہ ہونے دیتا اور پہاڑوں کی چوٹیوں تک پر بسنے والے کو دعوت پہنچاتا اور فریضہ امامت کو عوام کالانعام کے ہاتھوں میں نہ دیتا کہ وہ بے چارے احکام واقعیہ شرعیہ کے اظہار کو کیا جانیں،

ایسا کرنے کے بجائے ان غریبوں نے تو دوسرے کافروں و ظالموں کی طرح خود بھی تقیہ میں اپنی ساری زندگی گزار دی اور یہی کیسانیہ، زیدیہ، اور امامیہ، سب کے سب اللہ تعالیٰ پر لطف و عنایت کو بھی واجب قرار دیتے ہیں اور لطف کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ وہ بندہ کو طاعت سے نزدیک اور معصیت سے دور کرنا ہے جو مجبور کرنے کی حد تک پہنچے۔

عقلاً ان کا یہ خیال و عقیدہ بھی غلط لغو اور باطل ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر گنہگار کو نافرمانی کے اسباب و ذرائع

میسر نہ ہوتے۔ اور فرمانبرداروں اور اطاعت کیشوں کو اسباب طاعت ہر وقت فراہم رہتے، حالانکہ مشاہدہ اس کی سراسر تکذیب کررہا ہے، کہ اکثر صاحب ثروت، کثرت مال، دبدبہ لشکری اور قوت وطاقت کے گھمنڈ میں ظلم وستم ڈھاتے، اور نادار مفلس، افلاس وبے سروسامانی کے باعث عبادت سے محروم رہتے ہیں، کتنے طالب ہیں کہ جن کو نہ معلم نصیب ہے، نہ فراغت وروزی میسر ہے، اور کتنے بندگان ہوا وہوس اور شر پسند ہیں، جن کے چاروں طرف فسق وعصیان کے ڈھلے ڈھلائے لوازمات واسباب موجود ہیں،

اور پھر یہ عقیدہ ثقلین (کتاب اللہ وعترت) کے بھی مخالف ہے۔ کتاب اللہ کے تو یوں کہ وہاں یہ ارشاد فرمایا گیا، وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت نصیب کرتے لیکن ہمارا یہ قول کرسی نشین ہے کہ میں جہنم کو جن وانس سب سے بھروں گا)

دوسری جگہ ارشاد ہے، وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک وسرشت پر ایک، امت بنا دیتا، مگر وہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے،

اور یہ بھی ارشاد ہے، خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں کو مہر بند کردیا اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔

ان کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں۔ جو تدبیر الٰہی ڈھیل اور ایمان وطاعت سے دور کردینے پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً وَلَٰكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ (اور مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے نکلنے کو پسند نہیں کیا تو ان کو بوجھل کردیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو)، اور بھی اس نوع کی بہت سی آیات ہیں،

اور عترت کی مخالفت اس طرح ہوئی کہ کلینی میں جناب صادق رحمہ اللہ علیہ سے ایک روایت منقول ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے،

قَالَ إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِعَبْدٍ سُوءًا نَكَتَ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةً سَوْدَاءَ وَسَدَّ مَسَامِعَ قَلْبِهِ وَوَكَّلَ بِهِ شَيْطَانًا يُضِلُّهُ وَيُغْوِيهِ (جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگاتا ہے اور دل کے کان بند کردیتا ہے اور ایک شیطان کو اس پر مسلط کردیتا ہے جو اس کو بہکاتا اور بھٹکاتا رہتا ہے

اور کیسانیہ امامیہ اور زیدیہ کے سب فرقے، اللہ تعالیٰ پر اصلح کو اختیار کرنا بھی واجب قرار دیتے ہیں، یہ عقیدہ بھی مذکورہ بالا بیان سے باطل ہوگیا اس کے علاوہ قابل غور یہ بات بھی ہے کہ اگر اصلح کی رعایت اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتی تو شیطان کو انسان پر مسلط کیوں کرتا جو اس کا قوی دشمن ہے اور انسان کی جنس سے بھی نہیں ہے انسان اس کو دیکھ نہیں سکتا کہ اس سے بچ سکے اور اپنے سے اسے دور رکھے جب کہ وہ انسان کو خوب دیکھتا ہے انسان میں وسوسے ڈالنے پر بھی قادر ہے اور اعضائے انسانی تو رہے اپنی جگہ رئیس الاعضاء قلب پر بھی اس کو پورا پورا اختیار حاصل ہے اب شیطان کا پیدا کرنا، پھر اس میں اور انسان میں باہم عداوت ڈالنا، اس کو برقرار رکھ کر اور ڈھیل دے کر بنی آدم کے گمراہ کرنے پر اس کو قدرت دے دینا اور ہر انسان کے دل کو اس کے تصرف میں دے دینا عقیدہ اصلح کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکتا ہے،

اسی نوعیت سے بنی اسرائیل کے حق میں اصلح یہ تھا، کہ اول تو سامری حضرت جبرائیل ؑ کو نہ دیکھتا نہ اس کو آپ کے گھوڑے کی ٹاپ کی خاصیت معلوم ہوتی، اور معلوم بھی ہوگئی تھی تو مٹی کے اٹھانے پہ قادر نہ ہوتا قادر بھی ہو گیا تھا تو اس کو ضائع کر دیا جاتا اور وہاں یہ سب چونکہ خلاف واقعہ تھا۔ اس میں اصلح کہاں رہا۔

اور پھر ایک اور رخ یہ بھی ہے کہ بیچارے فقیر و مسکین، رنج و غم اور دکھ کے مارے ہوئے کافر کے حق میں اصلح یہ تھا کہ وہ دوسرے سے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر پیدا ہو جاتا تو بچپن میں ہی مر جاتا۔ کہ آخرت کے ابدی عذاب سے بچ جاتا۔

اسی طرح اصحاب رسول اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اصلح یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حکم صریح نہ بھیجتا تاکہ سارے ہی اتفاق و اتحاد سے رہتے، اور کوئی بھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا،

پھر کتاب اللہ میں تو یوں آیا ہے، بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی، اگر بقول تمہارے اللہ پہ ہدایت واجب و لازم تھی تو وہ احسان کیوں جتا رہا ہے، ادائے واجب پہ کوئی احسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص کسی کا قرض ادا کر کے قرضخواہ پہ احسان رکھے تو سب لوگ اسے ملعون کریں گے۔

امامیہ کیسانیہ اور زیدیہ کے سب فرقوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہ بدلہ وصلہ بھی واجب ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو کسی غم، دکھ میں مبتلا کرتا ہے تو اس کے بدلہ اپنی مصلحت کے لحاظ سے کوئی نفع ضرور پہنچاتا ہے مثلاً زکوٰۃ وصدقہ فطر، یا کوئی ایسی عام چیز جس میں بندہ کے عمل کو کوئی دخل نہ ہو یا اگر کسی غیر عاقل مثلاً درندہ سانپ بچھو کو اس پر مسلط کرتا ہے تو اس کے ذمہ واجب ہوتا ہے کہ اس کو کوئی ایسا فائدہ پہنچائے جو تعظیم سے خالی ہو،

ان کا یہ عقیدہ خدا اور انسان کے درمیان مالک و ملکیت کے تعلق کو سمجھ لینے کے بعد سراسر باطل ہو جاتا ہے کیونکہ عوض و بدلہ تو اس وقت واجب ہوتا ہے جب غیر کی ملکیت میں تصرف کیا جائے اور یہاں سوائے خدا کی ملکیت کے کسی غیر کی ملک ہے ہی کہاں! ساری کائنات تو اسی کی ملکیت ہے۔ لہٰذا عوض و بدلہ کا سوال ہی نہیں،

درحقیقت جنت کی تمام نعمتیں، انواع ولذائذ محض اور صرف اس کی مہربانیاں ہیں، اگر کوئی شخص پوری زندگی اس کی عبادت میں کھپا دے تو اس کی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ خدا تعالیٰ پر اس کا عوض واجب ہو، اور یہ ایسی بات ہے جس کو گلستان کے ابتدائی دیباچہ پڑھنے والا مکتب کا طالبعلم بھی سمجھتا ہے۔ علماء و فضلاء تو رہے اپنی جگہ اور ان کے نزدیک تو ائمہ کی احادیث سے یہ مطلب بتواتر ثابت ہے اور ابن بابویہ قمی نے امالی میں علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ سے بطریق صحیح روایت کی ہے۔

اَنَّهٗ كَانَ يَدْعُوْا بِهٰذَا الدُّعَاءِ اِلٰهِيْ بِعِزَّتِكَ وَعَظْمَتِكَ وَجَلَالِكَ لَوْ اَنِّيْ مُنْذُ اَبْدَعْتَ فِطْرَتِيْ مِنْ اَوَّلِ الدَّهْرِ عَبَدْتُكَ دَوَامَ خُلُوْدِ رُبُوْبِيَّتِكَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ فِيْ كُلِّ طُرْفَةِ عَيْنٍ سَرْمَدَ الْاَبَدِ بِتَحْمِيْدِ الْخَلَائِقِ وَشُكْرِهِمْ اَجْمَعِيْنَ لَكُنْتُ مُقَصِّرًا فِيْ بُلُوْغِ شُكْرِ اَخْفٰى نِعْمَةٍ مِنْ

آپ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ قسم ہے تیری عزت اور تیرے عظمت و جلال کی کہ تو نے مجھ کو پیدا کیا اگر میں اسی لمحہ سے بال بال تیری عبادت میں لگ پڑتا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتا اور تیری ربوبیت کے دوام تک مخلوق کے ساتھ شکر و حمد میں لگا رہتا تب بھی تیری ایک ادنی نعمت

نعمتك ولو أني كربت معادن حديد الدنيا بأسناني وحرثت أرضها بأشفار عيني وبكيت من خشيتك مثل بحور السموات والأرضين دماً وصديداً لكان ذالك قليلاً من كثير ما يجب من حقك علي ولو أنك إلهي عذبتني بعد ذالك بعذاب الخلائق أجمعين وعظمت للنار خلقي وجسمي وملأت جهنم وأطباقها مني حتى لا يكون في النار معذب غيري ولا يكون لجهنم حطب سواي لكان بعد ذالك علي قليلاً من كثير ما استوجبته من عقوبتك۔

کے شکر بجالانے سے قاصر رہتا اگر میں دنیا کی لوہے کی کانوں کو اپنے دانتوں سے کھودوں اور اپنی پلکوں سے زمین کو پھاڑوں اور تیرے خوف میں خون و پیپ کے آنسو آسمانوں وزمینوں کے سمندر برابر بہاؤں تب بھی یہ اس حق سے کم تر ہوگا جو تیرا مجھ پر ہے اور اے خدا تو اگر اس کے بعد بھی مجھ کو عذاب دے تمام مخلوق کے عذاب جتنا اور آگ کے لئے میرے جثہ اور جسم کو اتنا بڑھا دے کہ وہ تمام طبقات جہنم کو گھیر لے اور میرے سوا جہنم میں نہ کوئی عذاب دیا جا رہا ہو اور نہ میرے جسم کے علاوہ جلنے کے لئے کوئی اور چیز ہو تو اس سب کے باوجود یہ اس سزا کا تھوڑا سا حصہ ہوگا جس میں تیری طرف سے مستحق ہوں "

اور نہج البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمایا ہوا درج ہے کہ "اس امت کا بہترین آدمی بھی اللہ کے عذاب سے امن میں نہ ہوگا"

عقیدہ (۷۰):۔ بندہ سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں یعنی ایمان وکفر، بھلائی برائی، اطاعت ونافرمانی وہ سب کے سب اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، ان کی پیدائش میں بندہ کو کوئی دخل نہیں ہاں کسب وعمل بندہ کی طرف سے ہے اور اسی کسب وعمل پر بندہ کو بدلہ ملے گا یہی اہل سنت کا مسلک ہے،

مگر کیسانیہ، امامیہ، اور سارے زیدی فرقے اس سچے اور درست عقیدہ کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے اعمال کو خود پیدا کرتا ہے اور بندہ ہی نہیں تمام پرندوں، چوپایوں کیڑوں، مکوڑوں اور ان تمام حیوانات کے افعال واعمال میں اللہ تعالیٰ کو کوئی دخل نہیں جو ارادہ رکھتے ہیں،

ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ کے بھی خلاف ہے اور عترت رسول کے بھی"!

کتاب اللہ کے اس طرح کہ ارشاد ربانی ہے۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (اللہ ہی نے تم کو اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا) خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ (وہ ہر چیز کا خالق ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں) أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ (کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو آسمانی فضا میں گھرے ہوئے ہیں فضا میں انکو اللہ کے سوا کوئی نہیں ٹھیراتا۔ أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ کیا انہوں نے نہیں دیکھا پرندوں کو پر پھیلاتے اور سمیٹتے ہوئے انکو نہیں روک سکتا مگر رحمٰن

اب عترت کی مخالفت اس طرح سے ہے کہ تمام امامیہ نے ائمہ سے یہ روایات بیان کی ہیں "بندوں کے عمل اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں" چنانچہ شارح عدۃ اور دوسروں نے ان روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں یہ لوگ خود اپنے خیال کے موافق ائمہ کے خلاف اعتقاد رکھتے ہیں، اور ان ہی جیسے چند دوسروں کی گواہی کے علاوہ ان کے پاس اعتراض سے بچاؤ اور پناہ کی کوئی جگہ نہیں،

یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا خالق مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ ثواب وعتاب اور جزا سب باطل وبیکار ہو جائیں کیونکہ بندوں کو اپنے اعمال میں اختیار کیا رہا اور کسی ایسے شخص کو ایسے فعل وعمل پر سزا دینا

جس میں اس کو کوئی دخل نہ ہو سراسر ظلم ہے،

اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا خالق مانتے ہوئے، ثواب و عقاب و جزاء کے معاملہ کو خود شیعوں کے اصول اور ائمہ کی روایات کے مطابق ہم دو طرح ثابت کئے دیتے ہیں،

طریق اوّل:- ہر شخص کے افعال و اعمال کی جزا اس علم و اندازہ الٰہی کے موافق ہے جو اس شخص کے حق میں ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ یہ خوب جانتے ہیں کہ اگر بندہ کے افعال و اعمال خود انہیں پر چھوڑ دوں اور ان اعراض کی پیدائش ان ہی کے سپرد کردوں تو فلاں شخص طاعت کرے گا اور فلاں معصیت فلاں ایمان لائے گا اور فلاں کفر کرے گا۔ اور اس علم و اندازہ الٰہی کی علامت و نشانی بندوں کو بھی بتادی اور وہ نفس انسانی کی خواہش اور رجحان ہے لہذا مومن ایمان کی طرف جھکے گا اور کافر کفر کی طرف۔

اہل طاعت:- طاعت کی طرف اور اہل فسق فسق کی طرف۔ ہر شخص اپنے دل میں وہی چاہتا ہے، جو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ سے کرانا چاہتا ہے تو گویا نیک و بد کی جزا علم الٰہی پر ہے، اگر بندوں کی ایجادات انہیں کے سپرد ہوتیں تو وہ اگرچہ حقیقتاً ان کے خالق نہ ہوتے تو تقدیراً تو ہوتے ہی۔ مثلاً اگر کافر کو افعال کی پیدائش کی قدرت ہوتی تو وہ کفر ہی پیدا کرتا اور اگر مومن کو قدرت بخشی جاتی تو وہ ایمان کی بنیاد ڈالتا۔ یہی حال دوسرے اعمال و افعال میں ہوتا۔ اور اپنے علم کے موافق بدلہ و صلہ دینا شیعوں کے نزدیک بھی ظلم نہیں ہے اس لئے کہ کفار کے بچوں کی جزا امامیہ کے نزدیک بالاتفاق اسی طریقہ کے موافق تو ہے جیسا کہ ابن بابویہ نے عبد اللہ بن سنان سے روایت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ طِفْلِ الْمُشْرِكِيْنَ قَبْلَ اَنْ يَبْلُغُوا الْحُنْثَ قَالَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا	میں نے ابو عبد اللہ سے پوچھا کہ وہ بچے جو مشرکین کے بالغ ہونے سے پہلے مر گئے ان کا حشر کیا ہوگا آپ نے فرمایا اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کرتے لہذا جہاں ان کے

باپ ہونگے وہیں اُوہ بھی پہنچیں گے،

اسی طرح وہب بن وہب نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ، کافروں کی اولادیں دوزخ میں ہیں"

تو جب معصوم بچوں کو عذاب صرف اس لئے ہوگا کہ وہ علم الٰہی میں کافر و نافرمان ہونے والا تھا، حالانکہ ابھی اس میں خواہش دل یا رغبت نفس کی کوئی نشانی ظاہر بھی نہ ہوئی تھی پھر بھی یہ عذاب ظلم قرار نہیں دیا گیا تو بندے کے اس فعل پر جس کو وہ اپنی خواہش اور ارادہ سے پیدا کرتا ہے اس لئے بندہ بھی بوقت قدرت اسی فعل کو پیدا کرتا ہے ظلم کیوں اور کس لئے ہوگا۔ ائمہ کی روایات میں یہ سب کچھ وضاحت سے آگیا ہے،

اور کلینی ابن بابویہ اور ان میں سے دوسرے حضرات ائمہ سے یوں روایت کرتے ہیں، إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ بَعْضَ عِبَادِهٖ سَعِيْدًا وَّ بَعْضَ عِبَادِهٖ شَقِيًّا لِعِلْمِهٖ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (اللہ نے بعض بندوں کو نیک بخت اور بعض کو بدبخت پیدا کیا اپنے اس علم کی وجہ سے جو ان کے آنے والے عملوں سے متعلق تھا، لفظ کانوا پر غور کرو کہ صاف فرض و تقدیر کو ظاہر کرتا ہے، پھر کلینی اور دوسرے امامیہ نے ابو بصیر سے جو روایت کی ہے وہ یہ ہے،

اَنَّهٗ قَالَ كُنْتُ بَيْنَ يَدَيْ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ	وہ کہتا ہے کہ میں ابی عبد اللہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک پوچھنے

جَالِسًا فَسَأَلَهُ سَائِلٌ فَقَالَ جُعِلْتُ فِدَاكَ يَا ابْنَ رَسُولِ اللهِ مِنْ أَيْنَ لَحِقَ الشَّقَاءُ بِأَهْلِ الْمَعْصِيَةِ حَتَّى حَكَمَ لَهُمْ بِالْعَذَابِ عَلَى عَمَلِهِمْ فِي عِلْمِهِ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ أَيُّهَا السَّائِلُ عِلْمُ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَقُومُ لَهُ أَحَدٌ مِنْ خَلْقِهِ بِحَقِّهِ فَلَمَّا حَكَمَ بِذَلِكَ وَهَبَ لِأَهْلِ مَحَبَّتِهِ الْقُوَّةَ عَلَى طَاعَتِهِ وَوَضَعَ عَنْهُمْ ثِقَلَ الْعَمَلِ بِحَقِيقَةِ مَا هُمْ أَهْلُهُ وَوَهَبَ لِأَهْلِ الْمَعْصِيَةِ الْقُوَّةَ عَلَى مَعْصِيَتِهِمْ لِسَبْقِ عِلْمِهِ فِيهِمْ وَمَنَعَهُمْ إِطَاعَةَ الْقَبُولِ مِنْهُمْ فَوَافَقُوا مَا سَبَقَ لَهُمْ فِي عِلْمِهِ تَعَالَى وَلَمْ يَقْدِرُوا أَنْ يَأْتُوا حَالًا تُنْجِيهِمْ مِنْ عَذَابِهِ لِأَنَّ عِلْمَهُ أَوْلَى بِحَقِيقَةِ التَّصْدِيقِ وَهُوَ مَعْنَى شَاءَ مَا شَاءَ وَهُوَ سِرُّهُ۔

والے نے ان سے پوچھا کہ ابن رسول اللہ میں آپ پر قربان گنہگاروں کو یہ بدبختی کیسے نصیب ہوئی کہ ان کو اللہ کے علم میں ان کے عملوں پر عذاب کا حکم لگایا گیا ابوعبداللہ نے جواباً کہا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ اس کے حق کی وجہ سے متعلق نہیں ہوتا پس جب اس نے حکم دیا تو اہل محبت کو ان کی طاعت کی قوت بخشی اور جس حقیقت کے وہ اہل ہیں اس کا بوجھ اس سے ہلکا کیا۔ اسی طرح اہل معصیت کو ان کی نافرمانی کی قوت نصیب کی اس علم کے باعث جو ان کے بارے میں پہلے سے قائم ہو چکا تھا اور قبول اطاعت سے ان کو روکا۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے آئندہ کے علم سے انحراف نہ کر سکے اور نہ ایسی حالت پیدا نہ کر سکے کہ اس کے عذاب سے ان کو چھٹکارہ مل سکے، کیونکہ اس کا علم تصدیق کی حقیقت کے بالکل مطابق ہے اور یہی معنی ہیں شاء ما شاء (جو چاہا) کے اور یہ ایک بھید ہے،

اور کلینی نے منصور بن حازم سے اور اس نے ابی عبداللہ سے روایت کی ہے کہ

أَنَّهُ قَالَ إِنَّ اللهَ خَلَقَ السَّعَادَةَ وَالشَّقَاوَةَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ خَلْقَهُ فَمَنْ خَلَقَهُ سَعِيدًا لَمْ يُبْغِضْهُ أَبَدًا وَإِنْ عَمِلَ سُوءًا أَبْغَضَ عَمَلَهُ وَإِنْ خَلَقَهُ شَقِيًّا لَمْ يُحِبَّهُ أَبَدًا وَإِنْ عَمِلَ صَالِحًا أَحَبَّ عَمَلَهُ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پیدا کرنے سے پہلے نیک بختی اور بدبختی کو پیدا کیا، پس جس کو اسنے نیک بخت کیا اس سے کبھی بغض نہ رکھا، اگر اس نے کوئی بُرا عمل کیا تو اس کے عمل کو بری نظر سے دیکھا، اس طرح جس کو بدبخت کیا تو اس سے کبھی محبت نہ کی اگر اس نے کوئی اچھا عمل کیا تو اس کے عمل کو اچھی نظر سے دیکھا"

اور اگر ایسے عمل کے پیدا کرنے پر جو بندہ کی خواہش کے مطابق ہو جزا دینا ظلم ٹھیرے تو چاہیئے کہ نفس اور اس میں اس کے قوتوں کی پیدائش اور پھر اس پر شیطان کا تسلط اور مہربانیوں اور قبول حق سے باز رکھنا بھی اس کے حق میں ظلم ہو حالانکہ اس کا ثبوت گزشتہ روایات کے ان الفاظ سے وَوَهَبَ لِأَهْلِ الْمَعْصِيَةِ الخ سے صاف ظاہر ہے،

اسی طرح جناب ابوعبداللہ کی مذکورۃ الصدر روایات سے جس میں یہ ہے کہ جب اللہ کسی بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے دل کے کان بند کر دیتا ہے"

پتہ چلتا ہے کہ بندے کے ساتھ ایسا معاملہ اس کو فعل معصیت پر مجبور و مضطر کرتا ہے اور اس سے طاعت و بندگی کی قوت سلب کر لیتا ہے،

دوسری بات یہ کہ جزا نفس کی خواہش اور میلان پر موقوف ہے جو ہر عمل کے ساتھ ہوتا ہے وہ عمل خیر ہو یا شر نہ کہ عمل پر، تاکہ اس میں بندہ کے عمل دخل کا سوال اٹھے اس لئے بھول چوک خطا اور مجبوری کو معاف فرمایا اگرچہ ان حالات میں شر بندہ ہی سے سرزد ہوا ہے، لیکن چونکہ میلان نفس اور خواہش نہیں ہوتی اس لئے جزا کا دارومدار خیر و

شر کی نیت پر رکھا۔ گو عمل نہ سرزد ہوا!۔

اور کافی میں سکونی سے ابو عبداللہ سے یوں روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهِ وَنِيَّةُ الْكَافِرِ شَرٌّ مِّنْ عَمَلِهِ (مومن کی نیت اس کے عمل سے بھلی ہے اور کافر کی نیت اس کے عمل سے بری ہے،) اور اسی خیر و شر پر جزا کا دار و مدار ہے)

اور اسی کتاب کافی میں ابو بصیر سے اس مضمون کی روایت کی گئی ہے کہ

إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْفَقِيرَ لَيَقُولُ يَا رَبِّ ارْزُقْنِي حَتَّى أَفْعَلَ كَذَا وَكَذَا مِنَ الْبِرِّ وَوُجُوهِ الْخَيْرِ فَإِذَا عَلِمَ اللهُ ذَالِكَ مِنْهُ بِصِدْقِ نِيَّتِهِ كَتَبَ اللهُ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ مَا يَكْتُبُ لَوْ عَمِلَهُ

ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک مومن بندہ فقیر اللہ تعالےٰ سے التجا کرتا ہے کہ تو مجھے مال و رزق فراخ عطا فرمائے تو میں یہ یہ بھلائی کے کام کروں جب اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کی نیت کی سچائی کو جان لیتا ہے تو اس کے لئے وہ اجر لکھ دیتا ہے، جو اس کے عمل پر لکھتا جب وہ عمل کر گذرتا"

اسی لئے ریا اور دکھاوے کو۔ عمل کا ضائع اور برباد کرنے والا کہا گیا ہے چنانچہ کلینی نے باب الریاء میں بڑی تفصیل و وضاحت سے بیان کیا ہے منجملہ ان کے ایک وہ روایت بھی ہے جو علیبد بن خلیفہ کے واسطہ سے ابو عبداللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ كُلُّ رِيَاءٍ شِرْكٌ إِنَّهُ مَنْ عَمِلَ لِلنَّاسِ كَانَ ثَوَابُهُ عَلَى النَّاسِ وَمَنْ عَمِلَ لِلّٰهِ كَانَ ثَوَابُهُ عَلَى اللهِ (ہر ریا اور دکھاوا شرک ہے جس نے لوگوں کے لئے عمل کیا تو اس کا ثواب (دنیا) لوگوں پر ہے اور جس نے اللہ کے لئے عمل کیا تو اس عمل کا اجر اللہ پر ہے۔)

اسی طرح ایک متفق علیہ روایت میں ندامت کو توبہ کہا گیا ہے، لہذا معلوم ہوا کہ عمل کی تاثیر کا دار و مدار قلبی خواہش پر ہے اور جب ندامت میں قلب کی خواہش باقی نہ رہی تو اس کا اثر بھی جاتا رہا اگرچہ طویل مدت اور بڑے نقصان کے بعد ایسا ہوا۔

اور کلینی میں خباب ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے آپ نے فرمایا،

إِنَّ الرَّجُلَ يُذْنِبُ فَيُدْخِلُهُ اللهُ بِهِ الْجَنَّةَ قُلْتُ يُدْخِلُهُ اللهُ بِالذَّنْبِ الْجَنَّةَ قَالَ نَعَمْ أَنَّهُ يُذْنِبُ فَلَا يَزَالُ مِنْهُ خَائِفًا مَاقِتًا لِنَفْسِهِ فَيَرْحَمُ لَهُ اللهُ فَيُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ

آدمی گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس گناہ کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے راوی نے تعجب سے پوچھا کیا گناہ کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کیا جاتا ہے کہا ہاں؛ وہ گناہ تو کر بیٹھتا ہے مگر پھر لرزتا کانپتا رہتا ہے اور اپنے آپ سے بیزار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس پر رحم آتا ہے اور اس کو جنت میں بھیج دیتا ہے

تو چونکہ جزا کا دار و مدار نیت میلان نفس اور دل کی رضا مندی پر ہوا لہذا اگر اللہ تعالیٰ بندہ کے ارادہ سے اور خواہش کے مطابق بندے کے افعال پیدا کرے اور اس پر جزا و بدلہ دے تو یہ ظلم کیسے ہوا۔

ہاں اس وقت تو ظلم ہو سکتا تھا کہ بندوں کے افعال ان کے ارادے اور خواہش سے پہلے وجود میں آجاتے جیسے جمادات کے افعال، مثلاً آگ کا جلانا، زہر کا قاتل ہونا، اور تلوار کا کاٹ کرنا اور جب کسی کے افعال خود ان کے ارادے کے تابع ہوں اور ان کے بعد وجود میں آئیں، تو ان میں صاحب ارادہ کا دخل ہو گیا تو ان کو جزا کی شکل میں اس کا مزہ بھی

چکھنا پڑا اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے، کہ کسب و اختیار سے یہی معنی مراد ہیں،

اب بحث طلب یہ بات ہے کہ یہ خواہش اور میلان کس کی ایجاد ہے ظاہر ہے بندہ تو قوت ایجاد سے محروم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ اس خواہش کو بھی پیدا کرے تو وہ اس خواہش پر گرفت کیوں کرے اور اس پر جزا کیوں دے اس کا جواب یہ ہے کہ شبہ تو اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جبکہ بندوں کے افعال کا خالق بندوں کو مانیں، جیسا کہ شیعوں کا خیال ہے اب اس کے جواب کی فکر شیعوں کو بھی کرنی چاہیئے اس لئے کہ سب کے نزدیک یہ ظاہر ہے کہ تمام اسباب صدور بلکہ فعل کے سرزد ہونے کے جملہ اسباب ، خواہ قدرت، خواہ قوت خواہ حواس و اعضا حتی کہ خود بندہ کی ذات بھی جو ان افعال و اعمال کا سرچشمہ اور مرکز ہے اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں بندہ کا ان میں کوئی دخل نہیں،

اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جب کسی فعل میں اختیار کا دخل ہو گیا وہ فعل اختیاری ہو گیا اور اضطرار و مجبوری کی حد سے نکل گیا اور جب اختیاری ہو تو تعریف و برائی کا ہدف بنا اور ثواب و عقاب کا سبب قرار پایا اور اختیار کا خود اپنے اختیار سے پیدا ہونا درحقیقت محال و ناممکن ہے ورنہ تسلسل لازم آئے گا،

اب جب کہ کسی دوسرے میں اختیار پیدا کرنے کی قدرت بظاہر نظر نہیں آتی تو عقل کے لئے محض قیاس کے ذریعہ یہ سمجھ لینا دشوار ہوا البتہ وہم کی آلودگیوں اور طبعی بندشوں سے نجات پا کر وہ اتنا ضرور کرتی ہے کہ فعل کی اختیاریت وجود اختیار پر موقوف ہے نہ کہ ایجاد فعل یا ایجاد اختیار پر، مثلاً کسی کا غلام فرار ہونا چاہتا ہے دوسرا آدمی خواہ غلام کے حکم و دباؤ سے یا خود کسی ذریعہ سے اس کی بھنک پا کر اس غلام کو اس کی منزل مقصود پہ پہنچا دیتا ہے، تو یہ فرار عقلاً تو اس غلام کی طرف منسوب ہوگا، اگرچہ اس فعل کا وجود و تکمیل دوسرے کی مدد سے ہوئی، مگر خواہش قلب تو بہر حال غلام ہی کی تھی،

اب اہل سنت و اہل تشیع کے اعتقاد میں فرق اس قدر ہے کہ اہل سنت بندہ کے اختیار کو اوپر نیچے ہر دو جانب سے فعل الٰہی سے گھرا ہوا مانتے ہیں، اوپر سے یوں کہ اختیار، ارادہ، خواہش اور میلان نفس کی پیدائش بھی اسی کی طرف سے مانتے ہیں، اور نیچے سے یعنی فعل کی پیدائش بھی اسی کی جانب سے ، اور شیعہ اوپر کی جانب میں تو اہل سنت سے متفق ہیں مگر فعل کے بارے میں مختلف الخیال ہو کر کہتے ہیں کہ فعل تو اسی کا کام ہے،

یہاں اگر کسی کام میں عقل ہو تو ذرا گہرائی میں اتر کر غور کرے کہ جب اختیار دوسرے کے ہاتھ میں آ گیا تو یہ کھلا جبر ہوا اور جزاء، ثواب و عقاب میں وہی اشکال پھر لوٹ آیا تو پھر اس میں کیا مزیداری ہے کہ ادھر کے حکم صریح کو چھوڑا جو ممکن سے ایجاد فعل کو محال بتاتا ہے ادھر اسی شیطانی دلدل میں پھر غوطے کھانے لگے۔

اوراق ماسبق میں صاحب محاسن برقی اور کلینی کی یہ روایت جناب ابی الحسن الکاظمؒ سے بیان ہو چکی ہے کہ لَا یَکُوْنُ شَیْئٌ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ وَاَرَادَ ، (کوئی چیز اللہ کی مشیت وارادہ کے بغیر نہیں ہوتی)

اور تعجب تو علماء امامیہ کی علم و دانش پہ آتا ہے کہ قرآن کی واضح اور صاف آیات سے آنکھیں بند کر لیں، ائمہ کی صحیح احادیث سے منہ موڑا اور اپنے اعتقاد کی بنیاد رکھی بھی تو ایک جاہل شاعر کے قول پر اور یوں قرآن کی اس آیت کے صحیح مصداق بنے وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوُوْنَ شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں،

شریف مرتضیٰ نے غرر والدرر میں ثوری سے اور اس نے ابی عبیدہ سے اس مضمون کی روایت کی ہے کہ،

قَالَ اِخْتَصَمَ رُؤْبَةُ وَذُو الرُّمَّةِ عِنْدَ هِلَالِ ابْنِ اَبِیْ بُرْدَةَ فَقَالَ رُؤْبَةُ وَاللّٰهِ مَا فَحَصَ طَائِرٌ فُحْصًا وَلَا تَقَرْمَصَ سَبُعٌ قَرْمُوْصًا اِلَّا بِقَضَاءٍ مِّنَ اللّٰهِ وَقَدَرِهٖ فَقَالَ لَهٗ ذُو الرُّمَّةِ وَاللّٰهِ مَا قَدَّرَ اللّٰهُ عَلَى الذِّئْبِ اَنْ یَّاْكُلَ حَلُوْبَةَ عِيَالٍ جِيْرَانِكَ قَالَ رُؤْبَةُ اَفَبِقُدْرَتِهٖ اَكَلَهَا هٰذَا اَكْذِبُ عَلَى الذِّئْبِ فَقَالَ ذُو الرُّمَّةِ اَلْكَذِبُ عَلَى الذِّئْبِ خَيْرٌ مِّنَ الْكَذِبِ عَلٰى رَبِّ الذِّئْبِ قَالَ الْمُرْتَضٰى هٰذَا الْخَبَرُ صَرِيْحٌ فِیْ قَوْلِهٖ بِالْعَدْلِ وَاحْتِجَاجِهٖ عَلَيْهِ وَنَصْرِهٖ لَهٗ۔ اِنْتَهٰى كَلَامُ الْمُرْتَضٰى۔

رؤبہ اور ذوالرمہ (دو شاعر) ہلال بن ابی بردہ کے پاس بیٹھے ہوئے آپس میں جھگڑ پڑے، رؤبہ نے کہا کہ خدا کی قسم نہ کوئی درندہ بھٹ بناتا ہے نہ کوئی پرندہ گھونسلا مگر خدا کے حکم و اندازہ کے ساتھ۔ اس پر ذوالرمہ بولا خدا کی قسم اللہ نے یہ تقدیر نہیں کی کہ بھیڑیا تیرے پڑوسی کے بال بچوں کی دودھ دینی بکریاں پھاڑ کھائے۔ رؤبہ نے کہا تو کیا پھر بھیڑیا ان کو اپنے اختیار سے کھا گیا؟ یہ تو بھیڑیئے پر جھوٹ لگانا ہوا۔ اس پر ذوالرمہ نے جواب دیا کہ بھیڑیئے پر جھوٹ باندھنا بھیڑیئے کے رب پر جھوٹ باندھنے سے بہتر ہے، مرتضیٰ نے کہا کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اس نے انصاف کو ماننا حجت کو تسلیم کیا اور اس مدد کو باور کیا"

اب یہاں غور کرنے کی بات ہے کہ شیعوں کے عاقلوں اور دانشمندوں نے ذوالرمہ کے لغو اور پوچ اور سراسر بکواس پر کیسے کان دھر لیا اور دل میں اس کو جگہ دے لی اور اس بکواس اور بڑبڑ پر اس کی مدح سرائی کیسے کی اور شاباش کیوں دی وہ اتنا نہیں سمجھے کہ ذوالرمہ ایک دیہاتی شاعر کو جسے بول و براز صحیح طریقہ پر کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ ایسے گہرے الٰہی مطالب سے کیا واسطہ اور کیا مناسبت!

اور اتنے اہم اعتقادی مسائل میں اعتماد کر کے اس کو اپنا پیشوا بنانا کس حد تک سزاوار ہے۔ جبکہ اس کا کلام درحقیقت نہایت بے بنیاد اور بے معنی ہے کیونکہ بکریوں کے گوشت کو بھیڑیئے کی غذا بنانا بکریوں کو شکار کرنے کی طاقت اس کو بخش کر ایسے قوی و خونخوار کو ایسے کمزور پر مسلط کرنا بکریوں کو مار ڈالنے اور زخمی کر دینے کا جذبہ اس کے دل میں پیدا کرنا اور پھر اس کو اس قدر دوڑنے کی قدرت دینا آخر یہ سب کس کا کام ہے اور شیعوں کے اصول پر یہ سب کھلا ظلم ہے۔

اور پھر شریف مرتضیٰ نے اصمعی سے اور اس نے اسحاق بن سوید سے روایت کی ہے کہ ذوالرمہ نے مجھ کو یہ شعر سنایا۔

وَعَيْنَانِ قَالَ اللّٰهُ كُوْنَا فَكَانَتَا ۔ فَعُوْلَانِ بِالْاَلْبَابِ مَا يَفْعَلُ الْخَمْرُ فَقُلْتُ فَعُوْلَيْنِ خَبَرَ الْكَوْنِ فَقَالَ اَوْ سُبْحَتْ اَوْ بَخْتَ ۔ اِنَّمَا قُلْتُ عَيْنَانِ فَعُوْلَانِ وَصَفْتُهُمَا بِذٰلِكَ ۔ قَالَ الْمُرْتَضٰى اِنَّمَا تَحَرَّزَ ذُو الرُّمَّةِ بِهٰذَا الْكَلَامِ مِنَ الْقَوْلِ بِخِلَافِ الْعَدْلِ ۔ اِنْتَهٰى كَلَامُهٗ۔

(ترجمہ شعر۔ اور دونوں آنکھوں کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہو جاؤ تو وہ ہو گئیں، عقلوں میں شراب کا سا کام کرنے والیاں، (راوی کہتا ہے) میں نے اس سے کہا فعولین ہو کر یہ کون کی خبر ہے (جو منصوب ہونی چاہیئے) تو اس نے جواب دیا۔ کہ تو اگر بوڑھا ہوتا (تجربہ کار) تو تجھے اس شک پر ملامت کی جاتی۔ پھر کہا میں نے فعولان کو عینان کی صفت باندھا ہے اس پر مرتضیٰ نے کہا کہ ذوالرمہ اس تاویل سے ناحق بات سے بچ گیا۔)

شریف مرتضیٰ پر حیرت ہے اور سخت حیرت، کہ اس نے ذوالرمہ کے اس کلام سے یہ عقیدہ سمجھا حالانکہ ذوالرمہ

کا مقصد یہ ہے کہ اگر فعولین کو بیں کان کی خبر بناتا تو کلام کی غرض بظاہر یہ معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے محبوب کی دونوں آنکھوں کو فتنہ ساز جادوگر اور عقل ربا بنایا ہے، حالانکہ یہ معنی یہاں پیش نظر نہیں اور جس صورت میں کان کو تامہ لایا اور فعولان کو عینان کی صفت ٹھیرایا تو کلام کی غرض بالاصالت محبوب کی دونوں آنکھوں کی فتنہ پردازی جادوگری اور عقل ربائی بنی،

اور یہ معنی مد نظر ہیں اور مطلب میں بھی بلند پایہ! اور اس تاویل عبارت سے اس کا ارشاد بھی ملا کہ محبوب کی دونوں آنکھوں کے نہ تو مادے میں یہ صلاحیت تھی کہ یہ صورت از خود اختیار کرے اور نہ مصور قدرت میں یہ طاقت کہ اس صورت کی نقش نگاری کر سکے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت خاص سے اور اپنے تکوینی امر سے بنفس نفیس ان کو پیدا کیا۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ شعر فہمی میں) کس جنگل میں بھٹک رہا ہے اور اسی سے اس بلند پایہ عالم کی شعر سنجی کا بھرم بھی کھلا، پھر فعولین لانے پر بھی خلاف عدل سے بچا جا سکتا تھا، کیونکہ اس صورت میں بھی فتنہ اور سحر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں بلکہ محبوب کی آنکھوں کی طرف ہے اور جادوگر یا فتنہ پرداز کو جادوگر یا فتنہ پرداز بنانا کسی کے نزدیک خلاف عدل نہیں، اگر خلاف عدل ہے تو وہ جادوگری اور فتنہ پردازی ہے، اور اگر بنظر غائر دیکھیں تو رفع کی صورت میں بھی ان کے اعتقاد کے بموجب باعتبار معنی خلاف عدل لازم آتا ہے، کیونکہ کوئی نہیں کہتا کہ شراب نشہ کے لئے خالق ہے اور محبوب کی آنکھ عاشق کے دل میں عشق و جنون کی خالق۔ مگر بے شک شریف مرتضیٰ کی فہم بتاتی ہے کہ شراب اور محبوب کی آنکھ جو اعراض کی موجودات ہیں ہیں خالق ہیں۔ اور یوں یہ دونوں چیزیں پروردگار کی شریک کار ہوگئیں، حالانکہ امامیہ بھی حیوانات میں اشراک کے قائل ہیں نہ جمادات میں۔ شاعر کا کلام صرف مبالغہ آرائی ہے، حقیقی معنوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ یہاں مراد ہیں،

یہاں شریف مرتضیٰ کا یہ کلام لانا اور اس پر رد و قدح کرنا گو بیکار سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مقصد ہے کہ ان کے بزرگوں اور بزرگواروں کی فہم و دانش سے پردہ اٹھایا جائے اور ان کی دقیقہ سنجی سے سب کو باخبر کر دیا جائے کہ یہ ایک دیہاتی کے ایک شعر کے سمجھنے میں کتنے بے دست و پا ہو کر کیسی دلدل میں پھنس گئے ہیں، اور پھر اس پر ایسی دور از کار گفتگو کی جسے نرم سے نرم الفاظ میں مضحکہ خیزی کہا جا سکتا ہے،

اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ اسی کو سارے شیعوں نے علم الہدیٰ کے خطاب سے نوازا اور اپنے دین و ایمان کی بنیاد اسی کی عقل و رائے پر رکھی،

حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ عقیدہ مجوسی زندیقوں سے لیا گیا ہے۔ جو شر و برائی کا خالق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مانتے اور اس کو الوہیت میں خدا کا شریک جانتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ مجوس نے صرف ایک ہستی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا اور یہ ہر چیونٹی اور ناپاک کتے اور گدھے تک کو بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ خلق و ایجاد میں شریک قدرت جانتے ہیں، اللہ ایسی بد عقیدگی سے اپنی پناہ میں رکھے،

اور شیعوں میں سے مفوضہ فرقہ اسکا قائل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور علی رضی اللہ عنہ۔ دنیا کی پیدائش میں اس کے شریک کار ہیں جیسا کہ تفصیلاً باب اول میں گزر چکا ہے اور اسماعیلیہ فلاسفہ کی طرح ایجاد عالم میں عقول و نفوس

کا واسطہ بتاتے ہیں، مگر ان کا طرز بیان کچھ اور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کو تمام (مکمل) پیدا کیا اور اسے کمالات سے بالفعل متصف کیا اور نفس کو ناتمام کیا اور کمالات سے بالفعل غیر متصف کیا نفس کو کمال حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوا اور چاہا کہ حرکت میں آکر عقل سے کمالات حاصل کرے اور حرکت چونکہ آلات کے بغیر متصور نہیں اس لئے اجسام عالم بالا کو پیدا کر کے دوروبیہ (چکر) حرکت میں لایا۔ پھر اس حرکت سے طبائع بسائط اور ان سے طبائع مرکبات وجود میں آئیں اور اصول مرکبات کی اصل تین قسموں پر منقسم ہے معدنیات، نباتات اور حیوانات، پھر ان میں سے حیوانات افضل ہیں اور حیوانات میں سے انسان اشرف و اعلیٰ۔

ان کا یہ عقیدہ کتاب و عترت کے واضح طور پر خلاف ہے، کتاب سے اس طرح کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (اس نے زمین و آسمان اور جو ان کے درمیان ہے، چھ دن میں پیدا کیا پھر قائم ہوا عرش پر)، خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (جو کچھ زمین میں ہے سب ان کے لئے پیدا کیا پھر چڑھ گیا آسمان پر اور برابر کئے سات آسمان)

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ (کیا اللہ کے سوا اور بھی کوئی خالق ہے) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ (اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے)

عترت کی مخالفت یوں ہے کہ شیعوں میں سے امامیہ اور اہل سنت میں سے ابن ماجہ نے بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَا خَلَقْتُ الْخَلْقَ وَخَلَقْتُ الْخَیْرَ وَالشَّرَّ فَطُوْبٰی لِمَنْ قَدَّرْتُ عَلٰی یَدِهِ الْخَیْرَ وَوَیْلٌ لِمَنْ قَدَّرْتُ عَلٰی یَدِهِ الشَّرَّ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے مخلوق کو پیدا کیا اور خیر و شر کو بھی میں نے پیدا کیا اور اس شخص کے لئے یہ خوشی کی بات ہے جس کے لئے میں نے خیر مقدر کیا اور اس کے لئے خرابی اور رنج کی بات ہے جس کے لئے میں نے شر مقدر کیا)

اور شیعوں کے لئے اہل سنت کی اس روایت میں شرکت عدم اعتبار کا باعث ہو تو خالص شیعی روایات ملاحظہ کریں جو کلینی نے کافی میں اور دیگر امامیہ نے بحوالہ معاویہ بن وہب جناب ابو عبداللہ سے نقل کی ہے،

اَنَّهُ كَانَ یَقُوْلُ مِمَّا اَوْحَی اللّٰهُ تَعَالٰی اِلٰی مُوْسٰی وَاَنْزَلَ عَلَیْهِ فِی التَّوْرٰىةِ اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا خَلَقْتُ الْخَلْقَ وَخَلَقْتُ الْخَیْرَ وَاَجْرَیْتُهُ عَلٰی یَدِ مَنْ اُحِبُّ فَطُوْبٰی لِمَنْ اَجْرَیْتُهُ عَلٰی یَدَیْهِ وَاَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا خَلَقْتُ الشَّرَّ وَاَجْرَیْتُهُ عَلٰی یَدِ مَنْ اُرِیْدُهُ وَوَیْلٌ لِمَنْ اَجْرَیْتُهُ عَلٰی یَدِهِ الشَّرَّ۔

ان چیزوں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی وحی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھیجی اور توراۃ میں بھی موجود ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں ہی خدا ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں نے مخلوق کو پیدا کیا اور خیر کو بھی اور خیر کو اس شخص کے ہاتھ پر جاری کیا جس کو میں نے پسند کیا پس مبارک ہو اس کے لئے جس کے ہاتھ پر میں نے خیر کو جاری کیا۔ اور میں ہی خدا ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں نے مخلوق کو پیدا کیا اور شر کو بھی اور اس کو اس کے ہاتھ پہ جاری کیا جس کے بارے میں میں نے چاہا اور خرابی اس کے لئے جس کے ہاتھ پر میں نے شر کو جاری کیا،

اور صاحب التفسیر علی بن ابراہیم بن ہاشم ابوالحسن قمی نے عبدالمومن بن قاسم انصاری سے اور اس نے جناب ابو عبداللہ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ ہمارے پروردگار کا ارشاد ہے اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا خَالِقُ الْخَیْرِ وَالشَّرِّ (میں ہی خدا ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں خیر و شر کا پیدا کرنے والا بھی میں ہی ہوں) اسی طرح کلینی نے بھی محمد بن مسلم

سے اس سند جناب ابی جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض کتابوں میں فرمایا ہے اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا خَلَقْتُ الْخَیْرَ وَالشَّرَّ فَطُوْبٰی لِمَنْ اَجْرَیْتُ عَلٰی یَدَیْہِ الْخَیْرَ وَوَیْلٌ لِمَنْ اَجْرَیْتُ عَلٰی یَدَیْہِ الشَّرَّ۔ ترجمہ اوپر مذکور ہوا۔

اسی طرح کی اور بہت سی صحیح روایات ہیں جو ان لوگوں کی کتابوں میں موجود ہیں جن کو یہ حضرات امامیہ شمار کرتے ہیں ان روایات میں آپ نے دیکھ لیا کہ ائمہ کرام ان کتابوں کی روایات کے مضامین کو کتنی صفائی سے بجیثیت کلام الٰہی نقل فرماتے ہیں۔

لیکن امامیہ ہر قسم کا ہر پھیر کر آنکھ بند کر کے ان سب روایات کے علی الرغم شر و معاصی کفر و شرک کو ابلیس اور جن و انس کا پیدا کردہ مانتے ہیں اور کاش وہ اسی پر بس کرتے، وہ تو تمام خیرات و حسنات اور طاعات و بھلائیوں کو بھی اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں اور یوں تمام چیزوں سے خالق کائنات کو بے دخل کر دیتے ہیں، سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

ان کے دانشمندوں اور علماء نے ان روایات کی تاویلات میں بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے ہیں لیکن ان کو کتاب و عترت کی مخالفت کے سمندر سے نکلنا اور نجات کا کنارہ پانا نصیب نہیں ہوا ان میں کے ایک محقق کا کلام بطور نمونہ یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ ان کی خوش فہمی اور مبلغ علمی عالم آشکارا ہو جائے۔

وہ کہتا ہے کہ خیر سے مراد مرغوب طبع اور شر سے مراد مکروہ طبع ہے، ایمان و کفر اور طاعت و معصیت نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اول تو اس بات کو خود کلام کا آخری حصہ رد کرتا ہے، اس لئے کہ فرمایا ہے فَطُوْبٰی لِمَنْ اَجْرَیْتُ الخ تو یہ خیر و شر بندوں کے ہاتھ پر کس طرح جاری ہو سکتے ہیں، اور پھر چلئے مان بھی لیں تو پھر اس قسم کے خیر و شر پر طوبیٰ اور ویل کے الفاظ کیا معنے رکھتے ہیں۔

اگر کسی کے گھر میں کوئی حسینہ پری جمال ہو اور وہ مرغوب طبع ہو گئی ہو تو صاحب خانہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خوش حال اور مبارکباد کا مستحق کیوں ہے اگر کسی بادشاہ کے سامنے کوئی حبشی اور کریہہ المنظر شخص جو مکروہ الطبع ہو تو اس کی وجہ سے وہ بادشاہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ویل ہلاکی اور عقوبت کا کیوں سزاوار قرار پائے۔

دوسری بات یہ کہ گناہ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مرغوب الطبع ایک مکروہ الطبع کسی حسینہ سے زنا میں دل خوش اور راغب ہوتا ہے۔ جب کہ کریہہ المنظر لڑکے سے فسق ہم جنس میں دل نفرت کرتا ہے اسی طرح نفرت و حسنات بھی دو قسم کی ہوتی ہیں مثلاً موسم گرما میں ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل باعث فرحت ہوتا ہے مگر کڑاکے کی سردی یخ پانی سے وضو اور غسل سے طبیعت بھاگتی ہے، تو پھر خیر و شر کی مذکورہ تفسیر و تاویل سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا نہ کوئی مزید نکتہ سمجھا گیا ان کے جو معنے پہلے سمجھے جاتے تھے تاویل کے بعد بھی وہی سمجھے گئے، اور جو اعتراض و اشکال یا شک پہلے تھا، وہ اب بھی باقی ہے ان دونوں لفظوں کا مفہوم، طاعت و معصیت کفر و ایمان کے ضد تو نہ ہوا کہ اس مفہوم کے ارادے سے ان کی نفی ہو جائے بلکہ یہ معنی تو ان سے عام ہیں اور عام معنے کا مراد لینا معنی خاص کو اس حکم میں داخل کر دیتا ہے جس کا تعلق عام سے ہے۔

ان کے علماء اپنے جہال کو بہلانے کے لئے الفاظ کے اسی قسم کے طوطے مینا بناتے ہیں، تاکہ معاش کا سلسلہ جاری رہے۔

فائدہ: فقہائے اہل سنت کے سرگروہ اور امام اعظم جناب ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ۔

قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ یَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ هَلْ فَوَّضَ اللّٰهُ الْاَمْرَ اِلَی الْعِبَادِ فَقَالَ اللّٰهُ اَجَلُّ مِنْ اَنْ یُّفَوِّضَ الرُّبُوْبِیَّةَ اِلَی الْعِبَادِ فَقُلْتُ هَلْ جَبَرَهُمْ عَلٰی ذٰلِكَ فَقَالَ اللّٰهُ اَعْدَلُ مِنْ اَنْ یُّجْبِرَهُمْ عَلٰی ذٰلِكَ فَقُلْتُ فَکَیْفَ ذٰلِكَ فَقَالَ بَیْنَ بَیْنَ لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلَا کُرْهَ وَلَا تَسْلِیْطَ۔

میں نے جناب ابو عبداللہ جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ اے ابن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ نے کام کو بندوں کے سپرد کر دیا ہے؟ آپ نے جواباً فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ وہ اپنی ربوبیت کا کام بندوں کے سپرد کرے اس پر میں نے پوچھا تو کیا اس نے ان کو اس پہ مجبور کیا ہے؟ تو فرمایا کہ یہ اس کے عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ وہ ان کو مجبور کرے! میں نے کہا اس کے علاوہ کیا صورت ہے، فرمایا صورت بیچ بیچ کی ہے کہ نہ بالکل مجبور کیا ہے اور نہ بالکل انہی کے سپرد کر دیا ہے۔

چنانچہ اہل سنت کے مذہب کی بنیاد یہی روایت ہے وہ تخلیقی امور کی بندوں سے نفی، اور کسب و عمل ان کے لئے ثابت کرتے ہیں اور یہ اعتقاد جناب صادق رحمہ اللہ علیہ کے ارشاد بالا کے عین مطابق ہے

اب اس روایت کو اثنا عشری شیعوں کی کتابوں سے بھی جانچ لیجئے تاکہ اہل سنت کا جھوٹ سچ کھل جائے محمد بن یعقوب کلینی نے جناب ابی عبداللہ رحمہ اللہ علیہ سے روایت کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، اِنَّهٗ قَالَ لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ (انہوں نے فرمایا نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ معاملہ بین بین کا ہے نیز کلینی نے ابراہیم سے اور اس نے ابی عبداللہ رحمہ اللہ علیہ سے یہی روایت بیان کی ہے، اور کلینی ہی نے ابی الحسن محمد بن رضا رحمہ اللہ علیہ سے جو روایت کی ہے وہ بھی ایسی ہی ہے،

چونکہ یہ تمام روایات اہل سنت کی روایت سے واضح طور پر متفق ہیں اس لئے شیعوں کے عالموں نے ان پہ تاویلات کا کلہاڑا چلا کر اپنے مطلب کے مطابق بنانا چاہا ہے اس لئے کہتے ہیں امر بین الامرین سے مراد قوت و قدرت کا پیدا کرنا ہے اور فعل پر جتا دینا ہے، نہ یہ کہ وہ افعال کی ایجاد میں دخل انداز ہو مگر یہ بھولے بادشاہ اتنا نہیں دیکھتے کہ سائل نے پوچھا کیا ہے، جو بغیر سوچے سمجھے جواب کی کھینچ تان کر کے کہیں کا کہیں لے جانے کی سعی ناکام کر رہے ہیں کیونکہ قوت و قدرت کے خلق کو سپرد کرنے نہ کرنے کا سوال کوئی عقلمند کر ہی کیسے سکتا ہے یہ تو سامنے کی چیز اور ظاہر البطلان ہے، جو کچھ جھگڑا یا بحث ہے وہ خلق فعل میں ہے اس توجیہ و تاویل سے تو وہ جناب ابی عبداللہ کے جواب باصواب کو لغو اور مہمل بنا رہے ہیں، اور اس توجیہ سے اس تفویض میں بحث و اعتراض کی خلش جوں کی توں موجود ہے اور آپ کے وہی الفاظ اللہ اعدل من ذٰلک بھی پیش نظر ہیں اور یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے مثلاً ایک شخص اپنے دشمن کو جو اسے قتل کر دینا چاہتا ہے پا بہ زنجیر کر کے ایک مکان میں قید کر کے دیتا ہے، اب دوسرا شخص آتا ہے، اسے قید سے نکالتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں آزاد کرتا ہے اور اسے کہتا ہے تو اپنی مرضی کا مختار اور آزاد ہے کوئی پابندی تجھ پر نہیں یہی نہیں اپنا ایک خادم بھی اس کے ساتھ کر دیتا ہے کہ شخص اول کے قتل میں پوری پوری مدد دے جذبات سرد پڑ جائیں تو انہیں گرمائے اور قتل پر بھڑکائے ایسی صورت میں دوسرا شخص پہلے شخص کے حق میں کھلا ظالم ہے،

اور ان سے بھی قطع نظر اہل سنت تو خود شیعوں کی کتابوں سے واضح اور صاف روایات فراہم کر کے وہ ہتھیار اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں جو ان کے شجر تاویلات کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ ڈالتا ہے ان میں سے ایک وہ روایت ہے جو امامیہ

ایک عالم صاحب الفصول نے فصول کتاب میں ابراہیم بن عیاش سے نقل کر کے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے، اور وہ یہ ہے،

اَنَّهٗ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ اَيُكَلِّفُ اللّٰهُ الْعِبَادَ مَالَا يُطِيْقُوْنَ فَقَالَ هُوَ اَعْدَلُ مِنْ ذٰلِكَ قَالَ فَيَقْدِرُوْنَ عَلَى الْفِعْلِ كَمَا يُرِيْدُوْنَ قَالَ هُمْ اَعْجَزُ مِنْ ذٰلِكَ۔

(اس نے کہا کہ ایک شخص نے جناب رضا سے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالتا ہے آپ نے فرمایا وہ اس سے زیادہ منصف ہے (ایسا نہیں کرتا) تو اس نے پھر پوچھا تو کیا بندے اپنے ارادہ کے مطابق کسی فعل پہ قدرت رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ عاجز و بے بس ہیں، یعنی مرضی کے مطابق فعل پہ قادر نہیں،

اس روایت میں تو نفی قدرت نہایت واضح اور صاف طور پہ موجود ہے اسی طرح نثر الدرر کتاب میں تحریر ہے،

سَاَلَ الْفَضْلُ بْنُ سَهْلٍ عَلِيَّ بْنَ مُوْسَى الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ مَجْلِسِ الْمَامُوْنِ فَقَالَ يَا اَبَا الْحَسَنِ الْخَلْقُ يُجْبَرُوْنَ قَالَ اللّٰهُ اَعْدَلُ اَنْ يُجْبِرَ ثُمَّ يُعَذِّبَ قَالَ فَمُطْلَقُوْنَ قَالَ اللّٰهُ اَحْكَمُ مِنْ اَنْ يُهْمِلَ عَبْدَهٗ وَيَكِلَهٗ اِلٰى نَفْسِهٖ۔

خلیفہ مامون کی مجلس میں فضل بن سہل نے جناب موسیٰ رضا رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابوالحسن کیا مخلوق مجبور ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تو بہت ہی عادل ہے وہ مجبور بھی کرے اور پھر عذاب بھی دے (یعنی مخلوق مجبور نہیں) اس نے کہا تو پھر کیا آزاد ہے۔؟ آپ نے فرمایا اللہ بڑی حکمت والا ہے وہ اپنے بندہ کو بیکار چھوڑ کر اس کے نفس کے حوالہ کیسے کرے)

کاش ان کے دانشوروں عالموں کو عقل سلیم سے بھی کچھ حصہ مل سکتا کہ گہری نظر سے یہ دیکھ لیتے کہ بندہ کو شر پہ قدرت دے کر اس کو عذاب دینا تو ظلم ہے نیز یہ بھی سمجھ لیتے کہ خلق فعل اور خلق قدرت بر فعل میں کوئی فرق ہے یا نہیں،

اگر کوئی شخص یقین سے جانتا ہے کہ حامد محمود کا جانی دشمن ہے اس کو قتل پہ تلا ہوا ہے ہتھیار کی جستجو میں ہے کہ کہیں سے مل جائے تو محمود کو بے دھڑک قتل کر دے یہ سب کچھ جانتے بوجھتے وہ شخص حامد کو تلوار دے دیتا ہے اور حامد اس سے محمود کو قتل کر دیتا ہے تو یہ شخص بلا شک محمود کے حق میں صریح ظلم کا مرتکب ہوگا۔

جب ان کے اس عقیدہ کی مخالفت حضرات ائمہ کے عقیدہ سے انہیں کی معتبر کتابوں سے ہر ممکن پہلو سے واضح اور آشکارا ہو گئی تو ان کی ہی معتبر کتابوں سے ان کے کچھ القاب و خطابات بھی سن لیجئے جو اس مخالفت کے سبب حضرات ائمہ کے کلام ارشاد التیام پہ مشتمل دو ایک روایات گوش گزار کر لیجئے تاکہ بات مزید وضاحت و انکشاف سے سامنے آجائے

محمد بن بابویہ قمی کے کتاب التوحید میں صحیح اسناد کے ساتھ ابی عبد اللہ رحمہ اللہ علیہ سے یوں روایت کی ہے،

اَنَّهٗ قَالَ الْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَرَادُوْا اَنْ يَّصِفُوا اللّٰهَ بِعَدْلِهٖ فَاَخْرَجُوْهُ مِنْ سُلْطَانِهٖ وَفِيْهِمْ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ۔ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۔

آپ نے فرمایا قدریہ (ایک فرقہ جو قدر کا منکر ہے) اس امت کے مجوسی ہیں، انہوں نے چاہا کہ اللہ کی صفت عدل سے بیان کریں (تو اس کوشش) میں انہوں نے اس کے اختیارات سلطنت ہی سلب کر لئے انہیں جیسے لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس دن یہ منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے (تو کہا جائے گا) اب دوزخ کا عذاب چکھو ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کیا تھا،

اور کلینی نے ابو بصیر سے روایت کی ہے قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ شَاءَ وَ اَرَادَ وَ قَدَّرَ وَ قَضٰی قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَاَحَبَّ قَالَ لَا ۔ (وہ کہتا ہے کہ میں نے ابی عبداللہ سے کہا۔ کیا اللہ نے چاہا، ارادہ کیا اندازہ لگایا اور حکم دیا؟ فرمایا ہاں۔ پھر میں نے کہا کیا پسند بھی کیا۔ فرمایا نہیں،

عقیدہ (۲۱) :۔ اللہ تعالیٰ سے بندہ کا قرب مکانی یا جسمانی حاصل ہونا متصور نہیں اس سے قرب و نزدیکی محض درجہ رضامندی اور خوشنودی کی ہے" یہی اہل سنت کا مذہب و مسلک ہے اور سابق میں عترت رسول سے شیعوں کی صحیح روایات نقل کی گئی ہیں جن میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے مکان اور اتصال مکانی کا انکار کیا ہے،

امامیہ کے اکثر فرقے مکانی نزدیکی اور قرب ظاہری کے قائل ہیں، اسی لئے معراج کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات جسمانی متعارف پر محمول کرتے ہیں چنانچہ ابن بابویہ نے کتاب المعراج میں حمران بن اعین سے اور اس نے جناب ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے،

(آپ نے اللہ تعالیٰ کے کلام ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی کی تفسیر میں کہا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنے سے اتنا قریب کیا کہ درمیان میں موتی کے پنجرے کے سوا جس میں سونے کا چمکدار فرش تھا کچھ نہ تھا، تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک صورت دکھا کر پوچھا اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) جانتے ہو یہ کس کی صورت ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی صورت ہے،

عقیدہ (۲۲) یہ کہ اللہ تعالیٰ رویت ہو سکتی ہے اور آخرت میں مومنین اس کے دیدار سے شرفیاب ہوں گے مگر کافر و منافق اس نعمت سے محروم رہیں گے" اہل سنت کا یہی عقیدہ و مذہب ہے،

شیعوں میں مجسمیہ کے علاوہ سب ہی متفق الخیال ہیں کہ اللہ دکھ ہی نہیں سکتا۔ ان کا یہ عقیدہ کتاب و عترت دونوں کے خلاف ہے،

کتاب اللہ میں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (آج کے دن بہت سے ہشاش بشاش چہرے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوئے ہوں گے)

اور کفار کے بارے میں ارشاد ہے، کَلَّا اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (آگاہ رہو وہ اپنے رب سے اس دن حجاب میں ہوں گے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَ اَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے ایمان کو معمولی سی قیمت پر بیچ دیتے ہیں ان کے لئے آخرت میں (بھلائی کا) کوئی حصہ نہیں اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا ان کے لئے تو دردناک عذاب ہو گا،

لہذا معلوم ہوا کہ مومن اور صالح بندے اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے بھی اور اس سے کلام بھی کریں گے اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں،

باب دوم میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ رویت کے بارے میں انکار کی کوئی دلیل نہیں سوائے اس کے کہ

وہ از روئے عقل اس کو بعید کہتے ہیں۔ یہ غائب کو نظر آنے والی چیز پر قیاس کرتے ہیں اور یہ وہی جو عادتاً اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں، اور ظاہری الثبوت چیزوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، اور یہ کتنی بڑی جسارت اور گستاخی ہے کہ آیات قرآنیہ کی اپنی عقل نارسا و ناکارہ کے ذریعہ تاویل کرتے اور ان کو ظاہری معنے سے پھیر دیتے ہیں، اور ان کے معانی و مطالب میں غور و فکر کی نوبت نہیں آنے دیتے۔

آیت لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ میں ادراک کی نفی ہے ادراک کے معنے دریافت کے ہیں رویت کی نفی اس آیت میں نہیں اور ایک عامی بھی جانتا ہے کہ ادراک اور ہے رویت اور اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی ان ظاہری آنکھوں سے دریافت نہیں ہوتی بلکہ عقل، اور غور و تامل سے ہوتی ہے،

اور بفرض محال ادراک کے معنے رویت ہی کے لیں تو یہ نفی رویت بطور عادت کے ہے کہ جو کوئی چاہے اور جب چاہے اس کو دیکھ لے اس کی نفی ہے بلکہ جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ دکھائے کوئی نہیں دیکھ سکتا، اور عادت کی مطلقاً بغیر قید کے نفی کلام الٰہی میں موجود ہے،

جیسے اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۔ بے شک وہ اس کے افراد کنبہ تم کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ تم اس کو نہیں دیکھتے، شیاطین اور جنوں کا دیکھنا عادت کے خلاف سب کے نزدیک ثابت ہے ہی۔

لہٰذا جب کفار نے فرشتوں کو دیکھنے کی درخواست کی تو اس کو بڑے اچنبے کی اور بڑی انوکھی بات ظاہر فرمایا حالانکہ انبیاء و صلحاء اور مومنین بھی ان کو دیکھتے ہیں،

اور عزت سے اس عقیدہ کی مخالفت اس طرح ہے کہ ابن بابویہ کی ایک روایت بسند ابو بصیر پہلے گزر چکی ہے، جس میں ایک سائل نے جناب ابی عبداللہ رح سے پوچھا تھا کہ قیامت کے دن مومن بندے اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے تو آپ نے جواباً فرمایا تھا ہاں اس کے علاوہ اس مضمون کی اور بھی روایات ان کے ہاں موجود ہیں،۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ کلام اللہ اور ائمہ کے اقوال میں جہاں رویت کا لفظ آتا ہے یہ اس نے علم یقینی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام اللہ میں نظر کا صلہ الیٰ آتا ہے، اور اس صورت میں رویت حقیقی کے سوا کوئی اور معنے ہو ہی نہیں سکتے اور ائمہ کے کلام میں رویت کا لفظ سوال پوچھنے والوں کے جواب میں آیا ہے جو قیامت کے روز کی رویت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں حصول علم یقینی کا کوئی سوال ہی کیوں کرنے لگا،

اور علم یقینی کو یوم قیامت سے خصوصیت ہی کیا ہے کیا دنیا میں مومن کو ذات و صفات کے بارے میں علم یقینی نہیں بلکہ اہل سنت کے نزدیک تو ذات و صفات باری کا علم یقینی ضروریات ایمان میں سے ہے شیعوں کو شاید حاصل نہ ہوتا ہو تب ہی المرء یقیس علی نفسہ کے مطابق کر دوسروں کو اپنے اوپر قیاس کرنا ہے،! شیعوں نے بھی اہل سنت کو علوم حصول علم یقینی میں اپنے جیسا سمجھ لیا ہو تو کیا تعجب،

چھٹا باب

انبیاء علیہم السلام پر ایمان اور ان کی نبوت کی بحث

عقیدہ (۱) یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ امامیہ کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ پر یہ بات واجب و لازم ہے کہ بندوں کو اوامر ونواہی کی تکالیف کا مکلف کرے اور مکلف بنانا بغیر انبیاء کی بعثت کے کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں لہذا پیغمبروں کو بھیجنا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب اور ضروری ہے،

اس عقیدہ کی برائی اور خرابی کوئی ڈھکی چھپی نہیں بالکل واضح اور ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بات کوئی چیز واجب نہیں، اور پھر یہ بات مرتبہ الوہیت اور ربوبیت کے شایان شان بھی نہیں ہاں پیغمبروں کی بعثت اور بندوں کو مکلف ٹھیرانے کا عمل اس کا محض فضل وکرم ہے جو وقوع میں آتا ہے۔ ایسا اگر وہ کرتا ہے تو عین عنایت ہے نہ کرے تو شکایت کا حق کوئی کسی کو نہیں، اہل سنت کا یہی عقیدہ و مذہب ہے،

اگر انبیاء کی بعثت اللہ تعالیٰ کے لئے لازم ہوتی، تو وہ آیات قرآنیہ میں بعثت پر اپنا انعام واحسان ظاہر نہ فرماتا کیونکہ ادائے فرض و واجب پر احسان وانعام کا موقعہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر رسول بھیجکر ان پر احسان فرمایا ہے،

پھر دوسری بات یہ ہے کہ بعثت اگر واجب ہوتی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذریت میں رسول مبعوث کرنے کی درخواست نہ کرتے کیونکہ جب چیز کا واقعہ ہونا لازمی وضروری ہو تو اس کے لئے طلب اور دعا کے کیا معنے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے الفاظ یوں نقل فرمائے وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ - ان میں انہی میں سے رسول بھیج۔

امامیہ کے عقیدہ کے مطابق جب نبی یا اس کے قائم مقام وصی کی بعثت اللہ تعالیٰ کے ذمہ لازم وضروری ہوئی تو اس کا تقاضا ہے، کہ کوئی وقت کوئی زمانہ ان سے خالی نہ ہونا چاہیئے حالانکہ اسماعیلیہ میں سے فرقہ سبعیہ ایک زمانہ میں نبی یا وصی کی بعثت اللہ پر واجب کہتے ہیں، یہ بات ان کے مذہب کے بیان میں پہلے گزر چکی دوسرے فرقے مفضلیہ اور عجلیہ ہر زمانہ میں نبی کی بعثت کو واجب کہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک نبوت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل بھی گزر چکی۔

ورنہ اہل سنت تو وہ دوسرے سے اللہ تعالیٰ پر کسی بھی بات کو واجب نہیں کہتے!

یہ شیعی عقیدہ بھی کتاب وعترت کے خلاف ہے، کتاب اللہ کے تو اس طور پر کہ بہت سی قرآنی آیات ایسے زمانہ کا پتہ دیتی ہیں جب نہ کوئی نبی موجود تھا اور نہ آثار نبوت ہی پائے جاتے تھے اس کے علاوہ قرآنی آیات ختم نبوت پر بھی صاف صاف دلالت کرتی موجود ہیں، مثلاً وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ - اس کے علاوہ یوحنا کی انجیل صحاح ۱۴ میں یہ ہے کہ

قَالَ عِيْسٰى لِلْحَوَارِيِّيْنَ وَاَنَا اَطْلُبُ لَكُمْ مِنْ ——— حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے کہا کہ میں اپنے

رَبِّیْ یَمْنَحُکُمْ وَیُعْطِیْکُمْ فَارْقَلِیْطَ لِیَکُوْنَ مَعَکُمْ دَائِمًا اِلَی الْاَبَدِ ۔ رب سے تمہارے لئے سوال کروں گا کہ وہ تم کو فارقلیط بخشے اور عنایت کرے کہ وہ ابد تک ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔

عبرانی لغت میں فارقلیط سے روح حق ویقین مراد ہے، جو یقینا ہمارے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسم گرامی ہے یہود ونصاریٰ کی ایک جماعت جو اسلام لائی انہوں نے اس بات کی شہادت دی اور تصدیق کی ہے ان میں سے ایک ابو علی یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلۃ الطبیب ہے، جو فن طب میں کتاب التقویم اور منہاج کا مصنف ہے۔ دراصل تو یہ نصرانی تھا مگر بعد میں مسلمان ہوگیا۔ رد نصاریٰ میں بھی اس نے ایک کتاب تصنیف کی، اس توریت کی آیات اور انجیل کی وہ عبارات جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اور آپ کے ظہور پر نور کے متعلق تھیں اور جن کو خود اس نے پڑھا تھا، سب جمع کر دی تھیں

اس کے علاوہ اس مسئلہ میں ائمہ کی بے شمار احادیث بھی موجود ہیں،

امامیہ کے پاس اس کی بس وہی ایک دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ لطف ومہربانی واجب ہے اور بعثت بھی لطف ہی کا ایک شعبہ ہے لہذا یہ بھی واجب ہے؟ اس خیال کی خرابی اور تردید کلام ماسبق میں گزر چکی۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں!۔

اسمٰعیلیہ نے اس مسئلہ میں اپنے خیال کی بنیاد ان چند نکات شعریہ پر رکھی ہے، جو انہوں نے فلاسفہ سے چرائے ہیں، اور اس سلسلہ میں اپنے عقلی گدھے یوں چلاتے ہیں کہ "جس طرح عالم علوی میں ایک عقل کامل کلی اور نفس ناقص کلی ہے جن سے کائنات کا صدور ہوتا ہے، اسی طرح عالم سفلی میں بھی ایک عقل کامل کلی اور ایک نفس ناقص کلی چاہیئے، اور شرع میں رسول کا وہی مرتبہ ہے جو ایجاد میں عقل کامل کلی کا۔ اسی طرح وصی کی شرع میں وہی حیثیت ہے جو ایجاد میں نفس ناقص کلی کی۔ اور جیسے افلاک کی حرکت عقل ونفس پر موقوف ہے، ایسے ہی نجات وتکمیل درجات کے لئے نفوس انسانیہ کی حرکت کا دارومدار رسول وصی پر ہے اور ہر زمانے اور ہر دور میں عالم سفلی میں عقل ونفس کے یہ دونوں خلیفہ موجود رہتے ہیں،،

ہر ہوشمند اور ذی عقل وشعور کو یہ اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ یہ سب کچھ اوہام باطل کی زٹلیات اور فلسفہ ناقص کی خرافات ہیں، کیونکہ اول تو عالم علوی میں عقل ونفس کا وجود ہی پایہ ثبوت کو کہاں پہنچا جو اس کی مثال پر عالم سفلی میں بھی یہ نقشہ جمایا جائے اور پھر جناب امیر المومنین سے کتب امامیہ میں بطریق تواتر درود شریف کے یہ الفاظ منقول وثابت ہیں اَللّٰھُمَّ دَاحِیَ الْمَدْحُوَّاتِ وَدَاعِمَ الْمَسْمُوْکَاتِ اِجْعَلْ شَرَائِفَ صَلَوَاتِکَ وَنَوَامِیَ بَرَکَاتِکَ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ الْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ ۔ اے میرے خدا ساری چیزوں کو بچھانے والے بلند بیوں کو بے ستون قائم کرنے والے اپنی شریف ترین درود اور اور بلند ترین برکتیں اپنے بندے اور رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل فرما جو گذشتہ سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں،

نیز امامیہ کے نزدیک آپ کے بعض خطبوں میں جو متواتر الثبوت ہیں یہ الفاظ موجود ہیں۔ اَرْسَلَہٗ عَلٰی فَتْرَۃٍ مِّنَ الرُّسُلِ وَطُوْلِ ھَجْعَۃٍ بَیْنَ الْاُمَمِ اِلٰی اَنْ قَالَ وَاَمِیْنُ وَحْیِہٖ وَخَاتَمُ رُسُلِہٖ وَبَشِیْرُ رَحْمَتِہٖ وَنَذِیْرُ نِقْمَتِہٖ ۔ (ان کو بھیجا رسولوں کا سلسلہ منقطع ہوجانے پر امتوں میں بے راہ روی بڑھ جانے کی وجہ سے،

یہاں تک کہ آپ نے فرمایا وہ اللہ کی وحی کے امین ہیں۔ خاتم رسل ہیں، اس کی رحمت کی بشارت دینے والے اور اس کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں،۔

یہ خطبات جس طرح نبوت کے ختم ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح سلسلہ رسالت کے منقطع ہونے پر بھی واضح اور صاف طور پر دال ہیں اور فترت کے معنے لامحالہ یہی ہیں کہ وہ زمانہ جس میں نہ نبی ہو نہ اس کا قائمقام وصی اور اگر فترت سے نبی کا نہ ہونا مراد لیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے لئے وہ زمانہ فترت کا تھا۔

عقیدہ (۲): مخلوقات میں انبیاء کرام علیہم السلام سب سے بہترین اور معزز ترین ہستیاں ہیں، دوسرا کوئی انسان عنداللہ ثواب یا قرب و رتبہ میں ان کا ہمسر نہیں چہ جائیکہ ان سے افضل ہو!۔

امامیہ کو چھوڑ کر تمام اسلامی فرقوں کا یہی مذہب وعقیدہ ہے،

امامیہ اس مسئلہ میں بڑے پریشان خیال ہیں ہاں اس پر اجماع ضرور کرتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور دیگر اولوالعزم انبیاء کرام کو چھوڑ کر باقی تمام نبیوں سے جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ افضل ہیں اور اولوالعزم انبیاء سے مرتبہ کی درجہ بندی پر ابن مطہر حلی اور بعض دوسرے امامیہ خاموش ہیں جب کہ بعض دوسرے امامیہ ان کو برابر کا درجہ دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں زیدیہ نے ان کا بہت سخت رد کیا ہے، اس کے علاوہ خود انہیں کی متواتر روایتیں بھی ان کی تردید کرتی ہیں مثلاً مَنْ قَالَ اِنَّ اِمَامًا مِنَ الْاَئِمَّةِ اَفْضَلُ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ فَهُوَ هَالِكٌ (جو کوئی یہ کہے کہ ائمہ میں سے کوئی امام انبیاء سے افضل ہے وہ ہلاک و برباد ہونے والا ہے)

پھر خود ان کی کتابوں میں حضرت علی، جناب حسن و حسین رضی اللہ عنہم سے اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ اہل سنت کو مزید اقوال عترت رسول سے نقل کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کتاب میں شروع ہی سے ہر مسئلہ پر خود کتب امامیہ سے کچھ نہ کچھ حوالہ نقل کرنے کی پابندی جاتی رہی ہے اس لئے یہاں بھی مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمالیجے۔

رَوَى الْكُلَيْنِيُّ عَنْ هِشَامِ الْاَحْوَلِ عَنْ زَيْدِ بْنِ عَلِيٍّ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ اَفْضَلُ مِنَ الْاَئِمَّةِ وَاَنَّ مَنْ قَالَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَهُوَ ضَالٌّ (کلینی نے ہشام احول کے حوالہ سے جناب زید بن علی سے روایت بیان کی کہ انبیاء ائمہ سے افضل ہیں، اور جو اس کے خلاف کہے وہ گمراہ ہے، نیز ابن بابویہ نے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے ان الفاظ میں روایت بیان کی اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ عَلِيٍّ اللہ تعالیٰ کو جناب علی سے انبیاء زیادہ محبوب ہیں، مزید انشاء اللہ آگے بیان ہوگا۔

اب رہا اس عقیدہ کا مخالف کتاب ہونے کا معاملہ تو وہ روز روشن کی طرح بالکل عیاں اور واضح و صاف ہے کہ سارا قرآن مجید ہی اس پر دلالت کرتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو تمام عالم میں سے چنا اور انتخاب کیا گیا ہے

اور عقل کی بھی اس پر دلالت روشن تر اور صاف و واضح ہے، اس لئے کہ نبی کو واجب الاطاعت قرار دینا اس کی طرف وحی کرنا اس کو اوامر و نواہی کا مختار اور حاکم کل بنانا، اور خلیفہ و امام کو اس کا نائب اور تابع ٹھہرانا بغیر اس کے کہ نبی کو امام سے افضل مانا جائے متصور ہی نہیں ہو سکتا۔

یہ اسباب فضیلت ہر نبی میں موجود اور ہر نائب و امام میں مفقود ہیں، تو اس کا صرف ایک نتیجہ ہی نکلتا ہے کہ لامحالہ ہر نبی ہر نائب و امام سے افضل و برتر ہوا۔

حالانکہ تمام امامیہ تمام ائمہ کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ تمام انبیاء سے افضل ہیں،
اس کے علاوہ قرآن کریم میں جابجا صدیقین، شہداء اور صالحین پر انبیاء کی فضیلت جو ثابت ہے وہ بھی صراحت کے ساتھ اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے،

امامیہ کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ فروعات میں اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ اصول کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ جاتا ہے، چنانچہ الٰہیات میں بندوں کی طرفداری میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ خالق العباد پر وجوب اللطف کو جائز قرار دے دیا اور بدی و برائی اور بندوں کے افعال کی تخلیق کو بندوں کی طرف منسوب کرکے مرتبہ الوہیت و ربوبیت کو درہم برہم کر ڈالا اور اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی قدرت عامہ اور اس کی کامل بے نیازی کو اس کے انصاف سے مٹا ڈالا۔

اسی طرح شرائط امامت کے تحت جو بالاجماع نبوت کی نائب اور اس کی فرع ہے، ائمہ کے مدائح اور مناقب کو اس قدر بڑھایا چڑھایا کہ منصب نبوت کو بے وقار اور حقیر کر دیا اور جناب امیر المومنین اور آپ کی ذریت رضی اللہ عنہم کی تعریف و توصیف میں جو اگرچہ ایمان و شریعت کا ایک شعبہ ہے اتنے مبالغہ سے کام لیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان ہی ہاتھ سے جاتا رہا۔

اور اس کے عوض ان کی تحقیر و تذلیل کا الزام اپنے سر منڈھ لیا حالانکہ خود ہی یہ کہتے بھی ہیں کہ امامت نبوت کی فرع و نائب ہے تو یہ نبوت کے درجہ کے برابر یا اس سے بالا و برتر کیسے ہو سکتی ہے،

اس بارے میں ان کی تمام تر حجت وہ شبہات ہیں جو ان کے چند مقتداؤں و پیشواؤں کے کلام سے پیدا ہوئے ہیں۔ جو وہ اپنی کتابوں میں لکھ کر چل بسے اور اپنے پیرودں کو ان کا حکم دے گئے،

اس سلسلہ میں کہنے کی پہلی تو بات یہ ہے کہ ان کی روایات اور راویوں کے حالات نیز اپنے علماء سے روایت کردہ روایات کو صحیح قرار دینے کا جو طریقہ رہا ہے وہ ناظرین کتاب ہذا پر گزشتہ اوراق میں بخوبی واضح ہو چکا ہے،
لہذا ہم پر انہیں روایات کو ثبوت میں پیش کرنا اصولی قواعد کے مناسب نہیں کیونکہ از روے اجماع قطعی وہ ظہور مخالف سے پہلے معارض ہیں، نیز ان کے ظاہری الفاظ پر عمل ممکن نہیں، البتہ تاویل کی جاسکتی ہے،

دوسری بات یہ کہ یہ روایات بعض دوسری روایات سے ٹکراتی ہیں مثلاً کلینی کی روایات جناب زید بن علی رضی سے یا ابن بابویہ کی روایات جناب صادق رحمہ سے اور اسی طرح اور بھی بہت سی روایات ہیں اور بالفرض یہ روایات باہم نہ بھی ٹکرائیں تو بھی چونکہ یہ ظنی ہیں، اس لئے معتقدات میں ان سے تمسک جائز نہیں علاوہ ازیں خود امامیہ کے اکثر محققین کے نزدیک بھی مثلاً ابن زہرہ ابن ادریس ابن براج اور شریف مرتضیٰ بلکہ ان کے اکثر قدماء کے نزدیک بھی وہ قابل حجت نہیں اور ان کے پچھلوں نے بھی اس مذہب کو اختیار کرکے نہ صرف یہی کہ اخبار احاد کو دلائل میں شمار نہ کیا بلکہ ان کی تردید کو خاص کر اعتقادات کے معاملات میں واجب و ضروری قرار دیا چنانچہ ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب مبادی الوصول الیٰ علم الاصول میں یوں لکھا ہے، اِنَّ خَبَرَ الْوَاحِدِ اِذَا اقْتَضٰى عِلْمًا وَلَمْ يُوْجَدْ فِى الْاَدِلَّةِ الْقَاطِعَةِ مَا يَدُلُّ عَلَيْهِ وَجَبَ رَدُّهٗ، (جب خبر واحد سے کسی اعتقاد کا ثبوت ملتا ہو اور اس ثبوت پر دلالت کرنے والی قطعی دلیل موجود نہ ہو تو خبر واحد کو رد کر دینا

واجب ہے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ان ظنی روایات کے مضمون کا دلائل قطعیہ سے کوئی سراغ و ثبوت نہیں ملتا بلکہ ان سے تو الٹی اس کی تردید ملتی ہے،

پھر ان تمام امور سے قطع نظر یہ روایات بھی ثبوت مدعا پر کوئی دلالت نہیں کرتیں اس سلسلہ میں ہم ان کی چند روایات بطور نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان شبہات کو بھی آشکار کرتے ہیں جو ان کو روایات سے مطلب اخذ کرنے میں پیش آئے۔

پہلا شبہہ :- کہ علم میں جب ائمہ انبیاء سے افضل ہیں تو مرتبہ میں بھی افضل ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ذکر کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوتے ہیں دیعنی نہیں ہوتے،

اور راوندی نے جناب ابی عبداللہ سے اس مضمون کی روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا،

قَالَ اِنَّ اللّٰہَ فَضَّلَ اُولِی الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ بِالْعِلْمِ وَوَرَّثَنَا عِلْمَہُمْ وَفَضَّلَنَا عَلَیْہِمْ وَعَلَّمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا لَا یَعْلَمُوْنَ وَعَلَّمَنَا عِلْمَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَتَلٰی قَوْلَہٗ تَعَالٰی قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

کہ اللہ نے اولوالعزم رسولوں کو انبیاء پر فضیلت دی اور ہم کو ان کا وارث ٹھہرایا اور ان پر فضیلت بخشی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ علم نصیب فرمایا جس کو وہ پچھلے رسول نہیں جانتے تھے، پھر آپ کا علم ہم کو بخشا اور انہوں نے آیت قل ھل یستوی الذین الخ پڑھی"

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اگر صحیح الاسناد فرض کی جائے تو صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ائمہ علم و وسعت علم میں مرسلین سے بالا ہیں کیونکہ پیچھے آنیوالا پہلے جاننے والے کے علم سے پورا پورا واقف اور باخبر ہوتا ہے جب ایک شخص بعد کے زمانہ میں ہوگا تو وہ بلاشبہ سابقہ حضرات کے تمام علوم پر لحاظ کر سکتا ہے بخلاف سابقہ حضرات یا ہم عصر یا ہم زمانہ افراد کے کہ وہ آئندہ آنیوالوں کے علم کا احاطہ کر سکتے ہیں یہ ایک پہلو سے برتری علم پوری فضیلت ثابت نہیں کرتی چہ جائیکہ تمام صفات میں برتری ثابت کرے اس کی ایک مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ مثلاً ہمارے زمانہ کا ایک نحوی عالم جو کافیہ، لباب وافیہ اور تصانیف ابن مالک، ابن ہشام اور ازہری یا دیگر علماء نحو کے کلام پر عبور رکھتا ہو تو بلاشبہ ان مسائل میں اس کا علم سابقہ علماء نحو میں سے ہر ایک سے زیادہ اور برتر ہوگا کیونکہ یہ سابقین خود آپس میں ایک دوسرے کے نکالے ہوئے مسائل اور باریکئ طبع سے ناواقف تھے اور یہ ثابت شدہ بات ہے کہ عقول و افکار کے اجتماع سے علوم کی تکمیل ہوئی ہے، اور اس موجود نحوی عالم نے ان تمام مسائل پر اطلاع پالی، لیکن اس کے باوجود وہ ان سابقہ علماء میں سے کسی ایک کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ پھر فضیلت کہاں رہی اس لئے کہ کسی علم سے واقفیت حاصل کر کے اس میں غور و فکر کرنا عقل و شعور اور فکر و فہم سے مسائل کو جانچنا پھر مسائل کو دلائل سے سمجھنا اور ہر ایک کی اصل و بنیاد دریافت کرنا اور نادر مسائل کو اپنی قوت تحقیق و تفتیش سے کلام عرب سے از خود ماخوذ کرنا اور ترتیب دینا ہی وہ فضیلت ہے جس کے مقابلہ میں صرف ان مسائل کو رٹ لینے اور ازبر کر لینے کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح اس زمانہ کے کسی منطقی کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ارسطو، ابوالفرج، فارابی، اور بوعلی سینا سے برتر و بلند مرتبہ ہے، اگرچہ یہ ان سب کے بیان کردہ مسائل پر واقفیت رکھتا ہے، جب کہ ان میں سے ہر ایک کو یہ بات حاصل نہ تھی۔

اسی طرح کوئی بچہ اگر عروض سیفی پڑھ گیا، ہو تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خلیل بن احمد پر فوقیت لے گیا،

اور پھر تھوڑی دیر کو اسے برتری مان بھی لیں تو علم کی کثرت سے ثواب و صلہ کی کثرت لازم نہیں آتی اللہ تعالیٰ

کہ یہاں فضیلت کا معیار کثرت ثواب ہے کثرت علم نہیں، ورنہ تو ماننا پڑے گا کہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فضیلت میں برتر تھے اور یہ بات بالاجماع صحیح نہیں،

اور پھر اگر یہ بھی مان لیں کہ کثرت علم ہی کثرت ثواب کو مستلزم ہے تو اس سے وہ علم مراد ہے جس پر اعتقاد و عمل کا دارومدار ہے علوم زائدہ اس سے مراد نہیں اور آیت قرآن هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ میں بھی علم عقیدہ و عمل مراد ہے،

اور ہر نبی کو یہ علم بدرجہ کمال و تمام حاصل ہوتا تھا، اگر ائمہ کو یا دوسرے علماء کو ان سے علم میں زیادتی یا برتری ہوگی تو وہ دوسرے علوم ہوں گے یہ نہیں، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر نبی کو یہ اعتقادی و عملی علم بدرجہ کمال نصیب نہ ہو تو وہ تبلیغی اور دینی احکام رسانی کی ذمہ داریوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکے گا، اور پھر بعثت کی غرض کیسے اور کیوں کر پوری ہوگی،

دوسرا شبہ ا۔ مسئلہ بالا کی دلیل میں یہ لوگ حسن بن کبش کی ایک روایت بحوالہ ابی ذر یوں بیان کرتے ہیں،

قَالَ نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ وَقَالَ هٰذَا خَيْرُ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ مِنْ أَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِينَ۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف نظر اٹھا کر فرمایا کہ یہ آسمانوں اور زمینوں کے اگلوں اور پچھلوں میں سب سے افضل ہیں،

پھر انہوں نے اسی حسن بن کبش کی ایک اور روایت بحوالہ ابی وائل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"مجھ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریئل کا یہ کہنا بیان فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ) تمام انسانوں میں افضل ہیں، جس نے اس سے انکار کیا وہ کافر ہوا"

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ان روایات میں سے ہے جسکی روایت کرنے میں امامیہ منفرد اور تنہا ہیں کسی اور نے یہ روایت نہیں کی اور ان کے راوی جیسے کچھ ہیں ان کا حال صفحات ماسبق میں بیان ہو چکا اور خود امامیہ کے نزدیک بھی یہ دونوں روایات سند ٹھیک نہ ہونے کے سبب نظر اعتبار سے گر چکی ہیں کیونکہ ان روایات کے رجال کی تحقیق پر حسن بن کبش اور اس کے بعد کے راوی مجہول الحال اور ضعیف ثابت ہوئے،

اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی ان روایات سے ان کا مدعا اور مقصد ثابت نہیں ہوتا کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اس قسم کی عام اور مطلق عبارات میں انبیاء کا مستثنیٰ ہونا ایک مشہور و معروف بات ہے اگر کسی ایک مقام پر استثناء نہ ہو تو اسے دوسرے مقام پر قیاس کریں گے، اور وہ عام جس کی تخصیص کر لی گئی ہو قابل حجت نہیں اور پھر یہ حجت ظنی ہے معتقدات میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اگر عموم کو تسلیم بھی کر لیں تو عموم فی الاوقات یعنی ہر زمانے میں، قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر بلاشک و نزاع بالکل نہ تھی۔ آپ اپنے زمانہ میں اولین و آخرین میں داخل ہوتے ہوئے، بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل و برتر تھے، لہذا آپ کے زمانہ کے علاوہ کوئی اور زمانہ مراد ہوگا یعنی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ تو اس زمانہ میں بے شک آپ سب سے افضل و برتر تھے اور اسے اہل سنت بھی مانتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی خرابی ہے نہ جھگڑا۔

تیسرا شبہ ا۔ اس شبہ کے ثبوت میں یہ لوگ ایک روایت تو سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی کی پیش کرتے ہیں،

جو اس نے جناب ابی جعفر کے حوالہ سے کتاب قصاص میں نقل کی ہے، اور دوسری روایت محمد بن یعقوب کلینی کی ہے جو اس نے اپنی کتاب کافی میں بحوالہ جناب ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نقل کی ہے، دونوں روایات اللہ تعالیٰ کے فرمان قل الروح من امر ربی کی تفسیر کے ذیل میں بایں الفاظ بیان کی گئی ہیں، هُوَ خَلْقٌ عَظِيْمٌ مِنْ جِبْرَئِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ لَمْ يَكُنْ مَعَ اَحَدٍ مِمَّنْ مَضٰى غَيْرَ مُحَمَّدٍ وَهُوَ مَعَ الْاَئِمَّةِ يُوَفِّقُهُمْ وَيُسَدِّدُهُمْ وہ جبرئیل و میکائیل علیہما السلام سے بھی بڑی مخلوق ہے جو سوا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے انبیاء سابقین کے ساتھ نہیں تھی، اور وہ ائمہ کے ساتھ ہے وہ ان کو توفیق دیتی ہے اور مضبوط رکھتی ہے،

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ پہلی روایت کی سند میں ہشام بن سالم ہے جس کو سب جانتے ہیں کہ کٹر مجسمیہ تھا اور حضرات ائمہ کی طرف سے پھٹکارا اور لعنت کیا ہوا ہے اور دوسری روایت میں ابو بصیر ہے جو ائمہ پر جھوٹ بولنے کا خود معترف ہے، اور ان کے رازوں کے افشا کا اقراری مجرم ہے،

اور بالفرض محال اس روایت کو درست بھی تسلیم کر لیں تو اس روایت کا مضمون جناب پیغمبر علیہ السلام اور ائمہ کی عصمت کے صریح خلاف ہے اور منافی ہے اس لئے کہ اتالیق اور مؤدب کا محتاج وہ ہو سکتا ہے جو خود معصوم نہ ہو۔ اسی لئے فرشتے اتالیق و مؤدب کے اسی لئے محتاج نہیں کہ وہ معصوم ہیں، لہٰذا اس صورت میں انبیاء سابقہ کے مقابلہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی ذات میں ایک واضح نقص ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام تو گویا خود بخود بتمام و کمال معصوم تھے کہ ان کو نہ کسی توفیق رساں کی حاجت تھی نہ وہ کسی مضبوط کرنے والے کے ضرورت مند تھے بخلاف اس کے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمہ اتالیق کے ایسے محتاج تھے کہ جو ان کو ہر وقت راہ راست پر رکھے اور بیدار! اس فاسد گمان و خیال سے اللہ اپنی پناہ میں رکھے!

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی روح کا ہونا ان کی عصمت کے لئے شرط ہے یا نہیں ان دو ہی صورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں اب اگر تمہارا جواب اثبات میں ہو تو یہ لازم آتا ہے کہ انبیاء سابقین علیہ السلام غیر معصوم تھے کیونکہ یہ روح ان کے ساتھ تم نہیں مانتے اور یہ بات بالاجماع غلط اور باطل ہے اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی عصمت کی نفی ہوتی ہے کہ وہ معصوم نہ تھے (نعوذ باللہ) اس لئے ایک اتالیق کے محتاج ہوئے اور دوسرے پہلو سے تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کی افضلیت حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمہ پر ثابت ہوتی ہے کہ وہ تو اپنی عصمت کے لئے اس روح کے محتاج نہیں تھے اور آں جناب صلے اللہ علیہ وسلم روح کی وجہ سے معصوم تھے،

اب یہاں شیخ ابن بابویہ کی ایک تعلی قابل تماشا ہے، اس نے اپنی کتاب الاعتقاد میں بڑی بلند آہنگی سے یہ لکھا،

اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَخْلُقْ خَلْقًا اَفْضَلَ مِنْ مُحَمَّدٍ وَالْاَئِمَّةِ وَهٰؤُلَاءِ اَحَبُّ اَحِبَّاءِ اللّٰهِ وَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهُمْ اَكْثَرَ مِنْ غَيْرِهِمْ وَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهُمْ اَكْثَرَ مِنْ جَمِيْعِ خَلْقِهٖ وَبَرِيَّتِهٖ۔

اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق محمد صلے اللہ علیہ وسلم، اور ائمہ سے افضل پیدا نہیں کی اور یہ اللہ کو سب دوستوں میں زیادہ محبوب اور غیروں سے زیادہ پیارے ہیں اپنی تمام مخلوق سے بڑھ کر ان کو دوست رکھتا ہے،،

پھر یہی حضرت اپنی دوسری کتاب الامالی میں صحیح روایت سے ایک لمبی حدیث میں جو جناب امیر اور بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی کے قصہ پر مشتمل ہے۔ یہ روایت جناب صادق رضی اللہ عنہ سے نقل کرتا ہے،

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ لِسُکَّانِ الْجَنَّةِ مِنَ الْمَلٰئِکَةِ وَاَرْوَاحِ الرُّسُلِ وَمَنْ فِیْهَا اِلَّا اِنِّیْ زَوَّجْتُ اَحَبَّ النِّسَاءِ اِلٰی مَنْ اَحَبُّ الرِّجَالِ اِلَیَّ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ۔

اللہ تعالیٰ نے جنت میں بسنے والے فرشتوں اور ارواح رسل اور جو کوئی بھی وہاں تھے سب سے کہا کہ آگاہ رہو میں نے ایک محبوب ترین عورت کا نکاح ایک ایسے شخص سے کیا ہے جو انبیاء کے بعد مجھ کو محبوب ترین انسان ہے،

یہ روایت بہانگ دہل کہہ رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک انبیاء کرام جناب امیر سے محبوب تر ہیں اب جناب بابویہ کی اس اختلاف بیانی اور تناقض کلامی کو کیا کہا جائے دروغ گو را حافظہ نباشد شاید مزید سچ ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ان کے ہاں تو مذہب و دلائل میں یہ تناقض اور اختلاف بیانی شروع سے آخر تک ہے اور یہ بابویہ تو اس فن کے ماہر اور سب کے استاد مانے جاتے ہیں،

مزید بات آگے بڑھانے سے پہلے اسی مسئلہ زیر بحث کی ایک مثال پیش کر کے اس اختلاف بیانی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً تمام امامیہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سوائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام انبیاء سے زیادہ اللہ کو پہچانتے ہیں، اور اس بارے میں شیخ ابن بابویہ نے جناب ابی عبداللہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ:۔

اَنَّهٗ قَالَ لِعَلِیٍّ یَا عَلِیُّ مَا عُرِفَ اللّٰهُ اِلَّا اَنَا وَاَنْتَ وَلَا عَرَفَنِیْ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنْتَ وَلَا عَرَفَکَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَا۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے علی اللہ کو مجھ سے اور تجھ سے بڑھ کر کسی نے نہیں پہچانا اور اور مجھ کو سوائے اللہ کے اور تیرے کسی نے نہیں پہچانا اور تجھ کو سوائے اللہ کے اور میرے کسی نے نہیں پہچانا"۔

اور پھر خود شیخ بابویہ کتاب المعراج میں ایک طویل روایت میں بحوالہ ابوذر رضی اللہ عنہ لکھتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَنَّهٗ قَالَ لَمَّا عُرِجَ بِیْ اِلَی السَّمٰوٰتِ جَاءَتْنِیْ مَلٰئِکَةُ کُلِّ سَمَاءٍ وَسَلَّمُوْا عَلَیَّ وَقَالُوْا اِذَا بُعِثْتَ اِلَی الْاَرْضِ فَاَقْرِءْ عَلِیًّا مِنَّا السَّلَامَ وَاَعْلِمْهُ اَنَّ شَوْقَنَا اِلَیْهِ طَوِیْلٌ فَقُلْتُ لَهُمْ یَا مَلٰئِکَةَ رَبِّیْ هَلْ تَعْرِفُوْنَنَا حَقَّ الْمَعْرِفَةِ قَالُوْا لِمَ نَعْرِفُکُمْ اِلٰی اٰخِرِ الْحَدِیْثِ

جب مجھے آسمانوں کی طرف معراج ہوئی تو ہر آسمان کے فرشتے میرے پاس آئے اور مجھے سلام کیا پھر مجھ سے کہا کہ جب آپ زمین پر واپس ہوں تو علی کو ہمارا سلام پہنچائے اور فرمائے کہ آپ کے لئے ہمارا اشتیاق بہت بڑھ چکا ہے تو میں نے فرشتوں سے کہا کہ اے میرے رب کے فرشتو کیا تم ہم کو خوب جانتے ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کو کیوں نہیں پہچانینگے۔ الیٰ آخرہ"

اس روایت سے واضح اور صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر آسمان کے فرشتے جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسا پہچانتے تھے جو پہچاننے کا حق ہے، تو پھر روایت بالا میں جو دو مرتبہ حصر آیا ہے وہ تو غلط ثابت ہو گیا۔ یہاں بھی شیخ بابویہ کو دروغ گو را حافظہ نباشد کا ہی اعزاز دیا جا سکتا ہے،۔

اور پھر روایت اول میں صراحت سے اس بات کا بھی پتہ چلا کہ انبیاء ورسل کو بظاہر اصل معرفت اور در پردہ حق معرفت حاصل نہ تھی اور جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت جیسا کہ معرفت کا حق ہے حاصل نہ ہو وہ نبوت و رسالت کے قابل کب اور کیسے ہوگا۔ اور روایت مذکور اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ائمہ اطہار مثلاً جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کے بعد کے لوگوں کو حق معرفت نصیب نہ تھی حالانکہ یہ بات خود ان کے مذہب کے بھی خلاف ہے،

انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمہ کی تفضیل کے سلسلہ میں ان کے شبہات بطور نمونہ بیان کرنے کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ کے متعلق جو غلو اور حد سے تجاوز ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور انبیاء کی تحقیر و اہانت یہ کرتے ہیں رسالہ کی مناسبت سے مختصراً اس کو بھی بیان کر دیا جائے تاکہ بندہ مومن کو ان سے میل جول اور نشست و برخاست کے سبب قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے شرمندگی نہ ہو اور ائمہ و اولیاء و صلحائے امت کے حق میں جو اعتقاد رکھتا ہے، اس میں جادۂ اعتدال سے نہ ہٹ جائے،

پہلا غلو ۱:۔ ائمہ کے حق میں غلو اور انبیاء کرام کی نسبت تحقیر کی باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کی پیدائش ائمہ کے ضمن میں ہے اور عارضی ہے، اصل مقصد تو ائمہ کی پیدائش ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ اصل کو طفیلی کا نائب مقرر کریں اور کہیں کہ اصل کا تقرر محض نائب کے تقرر کی وجہ سے ہے، حالانکہ یہ بات خلاف عقل ہے اس غلو کے حق میں دلیل وہ روایت ہے، جو شیخ مفید یعنی محمد بن نعمان استاد شریف مرتضیٰ اور شیخ ابو جعفر طوسی نے محمد بن الحنفیہ سے نقل کی ہے۔

انہوں نے کہا کہ ؛۔

قَالَ قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلے اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَنَا سَیِّدُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتَ سَیِّدُ الْاَوْصِیَاءِ لَوْلَا اَنَا لَمْ یَخْلُقِ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ یَا عَلِیُّ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَلَا الْاَنْبِیَآءَ۔	امیر المومنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نبیوں کا سردار ہوں اور تم وصیوں کے اگر میں نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ نہ جنت پیدا کرتا نہ فرشتوں کو اور نہ انبیاء کو"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ روایت اس قوم کی من گھڑت روایتوں میں سے ایک ہے کیونکہ لفظ لَوْلَا کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کے ممتنع یعنی ناممکن الوقوع ہونے پر دوسری چیز بھی ناممکن الوقوع ہو اور یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک چیز موقوف و محتاج ہو دوسری چیز کی ورنہ پھر ایک کا امتناع دوسری پر کس طرح متصور ہوگا، اور یہاں ایسا نہیں ہے یعنی تمام انبیاء کا وجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف نہیں ہے اگر کسی قسم کا توقف ہو سکتا ہے، تو انہیں حضرات کے باپ دادا یا ان پیغمبروں کی نسبت ہو سکتا ہے جو اسی سلسلہ میں ہیں، اور یہ توقف بھی نسبی سلسلہ میں ہو سکتا ہے نہ نبوت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی پیدائش سے صرف نسل جاری ہو جائے اور وہ پیغمبر نہ ہوں اور فرشتوں کے حق میں تو اتنے کا بھی امکان نہیں زیادہ سے زیادہ وہ فرشتے جو آپ کی حفاظت، نصرت و امداد پر مامور ہیں، یا اعمالنامہ لکھنے پر متعین ہیں یا جنت میں اس جگہ کے فرشتے جو آپ کے یا آپ کے متعلقین کے لئے نامزد ہیں پیدا نہ کئے جاتے لہٰذا اول تو یہ حدیث صحیح نہیں پھر اگر صحیح بھی ہوتی تو اس کے حقیقی معنے مراد نہ ہوتے بلکہ غرض محض اللہ تعالیٰ کی عنایت بیان کرنا ہوتا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور جناب امیر رضی اللہ

عنہ پڑھتی ہے۔

اب چونکہ مخلوق کی ہدایت و رشد کے دو راستے ہیں ظاہر و باطن، ظاہر کا سرچشمہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام رفقاء اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہیں اور باطن کے اکثر طرف اور سلسلوں کا مرجع جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ہر دو طریق کا منبع و سنگم آنحضرت صلے اللہ وسلم ہیں،

اور یہ سب کچھ انبیاء و اولیاء سے پہلے ہی مقدور ہو چکا تھا تو یہ چیز صرف جناب امیر رضی اللہ عنہ کی انبیاء پر فضیلت ثابت نہیں کرتی، کیونکہ مجموعہ کی مجموعہ پر تفضیل آپس میں آحاد کی تفضیل کو مستلزم نہیں، تو آحاد کی تفضیل مجموعہ پر کیسے مستلزم ہو سکتی ہے

دوسرا غلو :۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ائمہ کی ولایت کی تصدیق اور ان کی اطاعت پر فرشتوں اور انبیاء سے عہد لیا تھا ان کی یہ بات بھی عقل کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ ایسی صورت میں جب کہ ائمہ کے زمانہ میں انبیاء کا موجود نہ ہونا قطعی طور پر معلوم ہے، ایسا عہد لینا بیکار محض ہے، جب وہ موجود ہی نہیں تو ایفائے عہد سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کیونکہ کسی عہد کی اکثر و بیشتر غرض نصرت و حمایت اور اعانت و امداد ہوتی ہے یا محاسن اور خوبیوں کا بیان یا اشاعت اور جب زمانہ ہی دونوں کا ایک نہ ہو تو عہد بیکار اور لغو رہا۔ اب اگر کسی کو اس پر شبہ ہو کہ حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کی توصیف و مدح پر بھی تو انبیاء سابقین سے عہد لیا گیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصریح اور آپ کے محاسن و مدائح آسمانی کتابوں میں بڑی تصریح کے ساتھ نازل ہو چکی تھیں اور ضرورت کے وقت ان کو ظاہر کرنے کے لئے اہل کتاب کا موجود ہونا بھی قطعی الثبوت تھا۔ لہذا ان انبیاء سے عہد لیا گیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق آسمانی کتب میں جو نازل کیا گیا ہے ان امور کے متعلق اپنی امت کو بتاؤ اور ان کی ان میں تبلیغ کرو اور ان کو تاکید کرو عہد لے کر ان کو پابند کرو کہ نسل در نسل اور پشت در پشت بلا کم و کاست ان نصوص کی حفاظت کریں ان کو تازہ رکھیں۔ اور جب ان کے ظاہر کرنے کا وقت آئے تو پوری سچائی سے ان کو ظاہر کریں لیکن امامت ائمہ کا معاملہ ایسا نہیں ہے نہ وہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں نازل ہوئی نہ ہی امم ماسبق میں وہ رائج ہوئی اور نہ ہی اس کے اظہار کی کبھی ضرورت پیش آئی اس لیئے کہ امامت و خلافت کو نبوت کی نیابت اور نائب ہے یہ تو نبی کے حکم سے ثابت ہوتی ہے اہل کتاب کی طرف اس کے ثبوت و اثبات کے لئے رجوع کرنے کی تک ہی کیا ہے اور ضرورت کونسی ہے اور اگر اہل کتاب از خود اس معاملہ میں لب کشائی کریں تو اس کا کوئی اعتبار نہیں،

اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ امامت کے لئے عہد ضروری ہے تو پھر ایسا ہوتا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے عہد و میثاق لیتے ان سے دست برداری تحریر کرا کر اپنی مہر سے اسے مؤکد ترین فرما کر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالہ فرماتے،

یہ کیا بات ہوئی کہ موجود و متعلق حضرات کو نظر انداز کر کے غیر متعلق و غیر موجود و غیر موثر حضرات سے عہد لیا گیا جنکو خود اور نہ ان کے پیرو کاروں کو معاملات امامت و خلافت کے غصب و تسلیم سے کوئی تعلق اور کچھ سروکار نہیں،

اور اس لغو و بیہودہ غلو کی دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن حسن صفار نے محمد بن مسلم سے اور انہوں نے جناب ابی جعفر سے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ اَخَذَ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ بِوِلَايَةِ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ ۔ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے

ولایت علی بن ابی طالب کا عہد لیا ہے، اس کے علاوہ محمد بن بابویہ کی اس روایت سے بھی یہ سند لاتے ہیں جو اس نے داؤد رقی کے حوالہ سے ابی عبداللہ سے اپنی کتاب کتاب التوحید میں ایک طویل روایت کے ذیل میں بیان کی ہے جو یہ ہے،

لَمَّا اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّخْلُقَ الْخَلْقَ نَثَرَهُمْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَقَالَ مَنْ رَّبُّكُمْ فَكَانَ اَوَّلَ مَنْ نَطَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْاَئِمَّةُ فَقَالُوْا اَنْتَ رَبُّنَا فَحَمَّلَهُمُ الْعِلْمَ وَالدِّیْنَ ثُمَّ قَالَ لِلْمَلٰئِكَةِ هٰؤُلَاءِ حَمَلَةُ عِلْمِیْ وَدِیْنِیْ وَاَمَانَتِیْ مِنْ خَلْقِیْ ثُمَّ قَالَ لِبَنِیْ اٰدَمَ اَقِرُّوْا لِلّٰہِ بِالرُّبُوْبِیَّةِ وَلِهٰؤُلَاءِ النَّفَرِ بِالطَّاعَةِ فَقَالُوْا نَعَمْ رَبَّنَا اَقْرَرْنَا۔

جب اللہ تعالیٰ نے خلق مخلوق کا ارادہ کیا تو ان کو اپنے سامنے پھیلا یا اور ان سے پوچھا میں کون ہوں جواب میں سب سے پہلے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم امیر المومنین اور ائمہ بولے آپ ہمارے رب ہیں! پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و دین کا حامل بنایا۔ اور فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میری مخلوق میں یہی وہ ہیں جن کو میں نے علم دین اور امانت کا حامل بنایا پھر بنی آدم سے کہا اللہ کی ربوبیت تسلیم کرو، اور ان لوگوں کی اطاعت مانو تو سب نے عرض کیا اے ہمارے رب ہم اس کا اقرار کرتے ہیں،،

ان دونوں روایتوں میں فرشتوں سے عہد کا ذکر نہیں، دوسری روایت میں فرشتوں کے سامنے ان حضرات کے صرف فضل و شرف کا اظہار کیا ہے، ویسے بھی ملائکہ سے عہد لینا قرین قیاس بھی نہیں اسی لئے فرشتے کسی میثاق میں داخل نہیں اس لئے کہ میثاق تو دراصل مکلفین سے ہوتا ہے، جن سے طاعت و نافرمانی ہر دو کا احتمال ہوتا ہے فرشتوں میں تو صرف اطاعت و فرمانبرداری ہی کا پہلو ہے وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتے کہ ان کی صفت لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَهُمْ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادی ہے اس لئے ان سے عہد لینے کی ضرورت ہی کیا رہی،

اس مذکورہ بالا دوسری روایت میں انبیاء علیہم السلام سے بھی میثاق کا ذکر نہیں بلکہ بنی آدم سے جو سب کو شامل ہے عہد لیا ہے اور یہ بات بطور قاعدہ مشہور ہے کہ کوئی ایسا کام عام نہیں جس سے بعض کی تخصیص نہ کی گئی ہو اس کے علاوہ اس عہد میں صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور ائمہ کی اطاعت پر انحصار معلوم ہوتا ہے اور دیگر اولوالعزم پیغمبروں کی جو اطاعت بلاشبہ واجب ہے اس کو غالباً بطور بدا کسی دوسرے وقت پر مصلحتاً اٹھا رکھا ہو،

اب ان کے مفید مطلب وہ خاص روایت ملاحظہ فرمایئے جو شیخ بابویہ ہی کی زنبیل سے نکلی ہے یہ روایت بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کی گئی ہے روایت طویل ہے اس کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کیجیے،

اَنَّهٗ لَمَّا اُسْرِیَ بِهٖ وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ بَعْدَ كَلَامٍ اِنَّكَ رَسُوْلِیْ اِلٰی خَلْقِیْ وَاِنَّ عَلِیًّا وَلِیُّ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَخَذْتُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ وَمَلٰئِكَتِیْ وَجَمِیْعِ خَلْقِیْ بِوِلَایَتِهٖ۔

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معراج حاصل ہوئی آپ کا رب آپ سے ہمکلام ہوا تو گفتگو کے بعد فرمایا بے شک آپ میری مخلوق کے لئے رسول ہیں اور علی ولی امیر المومنین ہیں میں نے نبیوں، اپنے فرشتوں اور اپنی ساری مخلوق سے اس کی ولایت پر عہد لیا ہے۔)

اب صفار ابن بابویہ اور ان کے راوی خصوصاً محمد بن مسلم کا جو حال ہے اور جو خطاب و القاب ان کو علماء رجال کی طرف سے ملے ہیں وہ روشن و ظاہر ہیں اس کے علاوہ ایسی روایات کے الفاظ کی کمزوری خود ان کے کذب و افتراء پر عادل گواہ ہے،

اور پھر خدا کے فضل و کرم سے اہل سنت کو کسی کد و کاوش کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ ان روایات کی توہین یا تضعیف کریں یا ان من گھڑت روایات کی تاویل و توجیہہ میں اپنا وقت، اپنی توانائی ضائع کریں۔ کیونکہ شریف مرتضیٰ نے جو شیعوں کی طرف سے عَلَم الہُدیٰ کے خطاب سے متصف ہے اپنے لقب کی شرم رکھتے ہوئے اپنی کتاب الدرر والغرر میں ان روایات میثاق کی بڑے شد و مد اور سختی سے تکذیب و تردید کی ہے اور آخر میں ان کے افتراء و کذب کا قطعی فیصلہ دیا ہے، وَکَفَی اللہُ المؤمنین القتال (لڑائی میں مومنوں کے لئے اللہ ہی کافی ہے)۔

تیسرا غلو:- یہ کہتے ہیں کہ انبیاء نے ائمہ کے انوار سے اقتباس کیا ہے اور ان ہی بزرگوں کے نقش قدم پر چلے ہیں بھلا یہ بات عقل میں آنے والی ہے کہ پہلے والا پچھلے کی اقتدا کرے اور اس سے انوار حاصل کرے اگر یہ کہا جائے کہ ان کو وحی و الہام سے ائمہ کے حالات معلوم ہوتے تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ اتنے گھماؤ پھراؤ کی کیا ضرورت تھی اصالۃً ان کو طریقت کی تعلیم کیوں نہ ہوئی اس طول عمل میں مصلحت کیا تھی کہ فلاں فلاں آئندہ ایسا کریں گے تم بھی ان کی اتباع کرو۔ سیدھے سیدھے یہ کہا جا سکتا تھا، کہ فلاں فلاں طاعت انجام دو۔

ہر عقلمند پر یہ بات روشن ہے کہ کسی کی اتباع کرنا یا اس سے اقتباس انوار کا مطالبہ اس وقت کیا جا سکتا ہے کہ بے واسطہ راہ نجات کی معرفت اور درجات تک وصولی اس کو نصیب نہ ہو اور جب کہ ان انبیاء سے وحی کا رابطہ تھا ان سے پیغام و گفتگو جاری تھی ان پر کتابیں حکم احکام سب براہ راست نازل اور پہنچ رہے تھے تو پھر کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو غیر کی اتباع کا حکم دیا اور پھر کسی تاریخ سے یا کسی شرعی و صحیح خبر سے یہ ثابت نہیں کہ کسی نبی نے روزہ نماز زکوٰۃ حج اور دوسری عبادات و معاملات کو نجم الدین ابو القاسم کی یا جامع عباسی عاملی کی شریعت کے مطابق جو ان کے نزدیک ائمہ کے آئین و طریقہ کے مطابق ہیں انجام دی ہوں۔ اور نہ ان انبیاء کی امتوں میں یہ طریقہ رائج تھا ان حالات میں انبیاء کرام کا ائمہ کی اتباع کیا معنے رکھتے ہے،

اس غلو کے لئے بھی حجت ابن بابویہ ہی کی زنبیلی روایت سامنے آتی ہے یہ جناب ابی محمد حسن عسکریؒ کا ایک خط ہے لعبدابن بابویہ کے علاوہ دوسرے امامیہ نے بھی اس کی روایت کی ہے، وہ یہ ہے،

اَعُوْذُ بِاللہِ مِنْ قَوْمٍ حَذَفُوْا مُحْکَمَاتِ الْکِتٰبِ وَنَسُوْا رَبَّ الْاَرْبَابِ وَالنَّبِیَّ وَسَاقِیَ الْکَوْثَرِ یَوْمَ الْحِسَابِ وَتَلَظِّیَ الطَّامَّۃَ الْکُبْرٰی وَنَعِیْمَ دَارِ الْمُتَّقِیْنَ فَنَحْنُ السَّنَامُ الْاَعْظَمُ وَفِیْنَا النُّبُوَّۃُ وَالْوِلَایَۃُ وَالْکَرَمُ نَحْنُ مَنَارُ الْهُدٰی وَالْعُرْوَۃُ الْوُثْقٰی وَالْاَنْبِیَاءُ کَانُوْا یَقْتَبِسُوْنَ مِنْ اَنْوَارِنَا وَیَقْتَفُوْنَ آثَارَنَا وَسَیَظْهَرُ حُجَّۃُ اللہِ عَلَی الْخَلْقِ وَالسَّیْفُ الْمَسْلُوْلُ لِاِظْهَارِ الْحَقِّ

میں اللہ سے اس قوم سے پناہ مانگتا ہوں جس نے قرآن کی ظاہر الثبوت آیات کو ترک کیا، اپنے رب، نبی، ساقی کوثر یوم حساب، آتش دوزخ جو بڑی آفت ہے اور پرہیزگاروں کی نعمت کے گھر کو بھلا دیا پس ہم بڑی شان و مرتبہ کے لوگ ہیں نبوت ہم میں ہے ولایت و کرم ہم میں ہے، ہم ہدایت کے مینار اور مضبوط سہارا ہیں انبیاء ہمارے انوار سے اقتباس کرتے تھے اور ہمارے نقش قدم پر چلتے تھے عنقریب اظہار حق کے لئے اللہ کی حجت اور ننگی تلوار مخلوق پر ظاہر ہوگی،،

خط کی یہ عبارت من گھڑت ہے، اپنی طرف سے جناب عسکریؒ کی طرف منسوب کر دی، اس سلسلہ میں اس فرقہ کی زود اعتقادی کا یہ حال ہے کہ جھوٹوں بھی سن لیتے ہیں کہ یہ فلاں امام کا خط ہے تو بے کھٹکے فوراً اعتماد کر بیٹھتے

ہیں، اور اس سے دینی مسائل نکالنے شروع کر دیتے ہیں، اتنا نہیں سوچتے کہ خط ہی ایسی دستاویز ہے جن میں جعل سازی اور دھوکہ بازی عام بات بھی ہے، اور آسان بھی ہے۔ خصوصاً ایسے بزرگوں کے خطوط میں جو خود موجود نہ ہوں کہ ان کو جھٹلا سکیں نہ ہی ان کے خطوط کی کمیابی کے سبب ان کی پہچان اور شناسائی کی کوئی مہارت اور شیخ ابن بابویہ پہ حیرت ہوتی ہے، کہ اپنی کتاب الاعتقاد میں بڑی بڑی قسمیں اٹھا کر اہل سنت پہ جھوٹ کا طومار باندھتے ہیں، کہ وہ ہمارے لئے یہ کہتے ہیں کہ ہم (شیعہ) کتاب اللہ میں تحریف کرتے ہیں اور اس کی آیات و سورتوں کو ساقط کرتے ہیں اور پھر خود ہی ایسی موضوع روایت کو جس کا مضمون اوپر مذکور ہوا اپنی کتابوں میں نقل بھی کرتا ہے اس کے لئے یہاں بھی وہی دروغ گو را حافظہ نباشد والا عذر ہی مناسب ہے ناظرین کو ہمیشہ اسے یاد رکھنا چاہیئے،

چوتھا غلو:- یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جناب امیر رضی اللہ عنہ آگے آگے ہوں گے اور انبیا کرام علیہم السلام ان کے پیچھے! اس کی دلیل میں وہ روایت پیش کرتے ہیں، جو محمد بن یعقوب کلینی نے کافی میں ابی الصامت حلوانی کے واسطہ سے جناب ابی جعفر سے منقول ہے کہ:

"امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے آگے سوائے احمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہ ہو گا"

اور دوسری روایت وہ ہے جو فضل بن شاذان نے کتاب القائم میں بسند صالح بن حمزہ عن حسن بن عبداللہ عن ابی عبداللہ بیان کی ہے،

قَالَ قَالَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مِنْبَرِ الْكُوْفَةِ وَمَا يَتَقَدَّمُنِيْ اِلَّا اَحْمَدُ صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ وَاَنَّ جَمِيْعَ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّسُلَ وَالرُّوْحَ خَلْفَنَا،

فرمایا امیر المومنین نے کوفہ کے منبر پہ کہ میرے آگے سوائے احمد صلے اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہ ہو گا اور سب فرشتے رسول اور روح ہمارے پیچھے ہوں گے،

اس مضمون کی ان دو روایتوں کے علاوہ اور بھی بہت سی گھڑ رکھی ہیں، جو ساری کی ساری ان کی خود ساختہ و پرداختہ ہیں، اگر کوئی بھی انبیاء سے بلند درجہ ہوتا تو قرآن مجید میں اس کی تعظیم و توقیر کی اور اس کے مرتبہ پر ایمان لانے کی دعوت کھلے اور واضح الفاظ میں دی جاتی۔

چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں یہ عمل برتا گیا ہے ورنہ تو ترک لطف لازم آتا ہے، کہ مکلفین کو ایسے شخص کے مرتبہ اور درجہ سے ناواقف اور تاریکی میں رکھا گیا ہے اور یہ بے چارے بے خبری میں نہ اس پہ ایمان لا سکتے ہیں اور نہ ان کی کماحقہ توقیر و تعظیم بجا لاتے ہیں،

اب ایسی آحاد روایات کہ جن کو سوائے ان چند جھوٹوں کے کوئی نہیں جانتا ایسے اعلیٰ و اشرف مقاصد اور اصول عقائد میں کیسے کافی ہو سکتی ہیں اور ان گپ بازیوں یا کاغذی گھوڑوں سے مکلفین پر حجت کیسے قائم ہو سکتی ہے۔

پانچواں غلو:- اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جناب امیر و ائمہ کا درجہ انبیاء سے بلند و بالاتر ہو گا شیخ ابن بابویہ نے اسی باب میں بھی معانی الاخبار میں چند روایات بیان کی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جو خالد بن یزید نے امیر المومنین سے بیان کی ہے، قَالَ اَنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى الدَّرَجَةِ الرَّفِيْعَةِ دُوْنَ دَرَجَةِ النَّبِيِّ وَاَمَّا الْاَنْبِيَاءُ وَالرُّسُلُ فَدُوْنَنَا عَلَى الْمَرَاقِيْ (آپ نے فرمایا میں قیامت کے دن نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے نیچے سب

سے بلند درجہ پر ہوں گا اور باقی انبیاء و رسل ہم سے نیچے زینوں پر ہوں گے،

اور امالی میں جناب ابی عبد اللہ اپنے دادا امیر المومنین سے یوں روایت کرتے ہیں کہ

قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَلِیُّ اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَنْتَ اَقْرَبُ الْخَلَائِقِ اِلَیَّ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فِی الْمَوْقِفِ بَیْنَ یَدَیِ الْجَبَّارِ۔

مجھ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ اے علی تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے، اور قیامت کے دن جبار کے سامنے کھڑے ہونے میں تو مجھ سے تمام مخلوق سے زیادہ قریب ہوگا،،

اور روایت کی سعد نے اربعین میں ابی صالح سے اور اس نے سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) سے اور انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے کہا،

"جب قیامت کا دن ہوگا تو آپ کے لئے منبر عرش کے دائیں جانب کیا جائے گا اور باقی انبیاء کے لئے بائیں جانب اور اس کے سامنے آپ کے پہلو میں بطور اعزاز و اکرام جناب علی کی کرسی لگائی جائے گی،،

اسی طرح کی اور بھی بہت سی روایات جو من گھڑت ہیں ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں بالفرض ان روایات کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی یہ روایات انبیاء پر ائمہ کی فضیلت ثابت کرنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتیں اس لئے کہ ان روایات کا زیادہ سے زیادہ مقصد اور فائدہ یہی ہے کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے صدقہ اور طفیل میں آپ کی ذریت کے بعض افراد کو بعض مقامات پر تمام مخلوق پر تقدم حاصل ہوگا اور اس قسم کے ضمنی تقدم اور تفوق سے کسی برتری کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً بالاجماع یہ تسلیم شدہ بات ہے، کہ امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم تمام امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی اور ہر نبی اپنی امت کے ساتھ ہوگا تاکہ پل صراط کی تنگ گھاٹی سے بحفاظت ان کو گذار لیجائے۔

لہٰذا اس پہلو سے ساری امت محمدیہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیغمبر علیہ السلام کے طفیل دیگر انبیا اور ان کی امتوں سے دخول جنت میں تقدم حاصل ہوگیا تو اب چاہیئے کہ اس امت کے ہر ہر فرد کو انبیاء پر برتری و فضیلت ہو حالانکہ سب ہی کے نزدیک ساری امت انبیاء سے افضل نہیں ہے اور یہ فضیلت نہ عقل کی رو سے درست ہے نہ بلحاظ شرع و عرف مثلاً شاہی قلعہ میں اگر ایک امیر اپنے خدام کے ساتھ دوسرے امراء سے پہلے داخل ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس امیر کے خدام کو پہلے داخل ہو جانے کے سبب دوسرے شاہی امراء پر تفوق و برتری حاصل ہوگئی،

عقیدہ (۳۱) انبیاء علیہ السلام گناہوں سے پاک ہیں۔ اور یہی اہل سنت کا عقیدہ و مذہب ہے البتہ بطور تشریح تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا قصداً کسی نبی سے سرزد نہیں ہوتا البتہ بھول چوک سے ایسے معمولی امور پیش آجاتے ہیں جن کو زلہ کہتے ہیں، یعنی قدم پھسلنا ان کی طرف گناہ کی نسبت صحیح نہیں اس وقت ان کی کیفیت اس راہ رو کے مشابہ ہوتی ہے جو راہ راست پر ہونے کے باوجود راستہ کے روڑے یا پھسلن پر نظر نہ کر سکنے کے سبب ٹھوکر کھالے یا پاؤں رپٹ جائے،

اس قسم کے مسائل میں ایک بات تو ہر دم یہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ساتھ جو بھی معاملہ کرے یا کسی انداز و الفاظ میں ان کو یاد کرے اس نے مخلوق کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ ان الفاظ کو نبی کے لئے استعمال کریں، اللہ تعالیٰ کو یہ سولہ آنے حق ہے کہ وہ جس کا چاہے جو نام رکھے جس لفظ سے چاہے خطاب کرے ہمیں اس کی

رسیں کی اجازت نہیں۔ وہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کے لئے "عصا آدم" کہہ سکتا ہے مگر کسی بندہ کو ایسا کہنے کی نہ اس نے اجازت دی نہ حق! یوسف علیہ السلام نے بھائی کی خرجی میں خود ہی پیالہ رکھ دیا اور پھر خود ہی قافلہ والوں پر چوری کا الزام لگایا بظاہر تو یہ نازیبا بات تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کذٰلک کدنا لیوسف یہ تدبیر ہم ہی نے یوسف کو بتائی تھی تو اب اسے کون نازیبا بات کہہ سکتا ہے سورۂ منافقون کی شروع آیت پڑھئے یہ منافق آپ کے پاس آکر بتاکید شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ بھی جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں،

تو یہاں سچی بات کی گواہی دینے والے کو کوئی جھٹلا نہیں کہہ سکتا مگر اللہ تعالیٰ کو اس کا حق ہے،

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو جس طرح بھی مخاطب کرے بندوں کو اس کی نقل جائز نہیں بندوں کو یہی اعتقاد رکھنا چاہیئے کہ ہر وہ بات جس پر شرعاً گناہ کا اطلاق ہو سکے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، قصداً و عمداً ہو، بھول چوک سے انبیاء علیہم السلام ان سے پاک اور معصوم ہیں نعمانی)

پھر اہل سنت نے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی معمولی باتیں جو خسّت یا دنائت طبع کے سبب ہوں وہ انبیاء کرام علیہم السلام سے بھول چوک سے بھی سرزد نہیں ہوتیں کہ ان کی وجہ سے بعثت کی غرض و غایت پر حرف آسکتا ہے اور لوگوں کو ایسی صورت میں اتباع میں تنفر ہو سکتا ہے،

مرتبہ نبوت اور مقصد بعثت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو اس اعزاز سے مشرف کئے جائیں، وہ معصوم عن الخطاء ہوں گناہوں کے صدور سے ان کو پاک رکھا اور مانا جائے کیونکہ اگر ان سے گناہوں کا صدور ممکن مانا جائے تو،

(۱) یہ ان کی دعوت و تبلیغ میں قولی فعلی تناقض ثابت کرتا ہے۔ کہ امت کو گناہوں سے بچنے اور اپنے اتباع کی دعوت کے ساتھ خود ایسا نہیں کرتے۔

(۲) گناہ پر بندے مستحق عذاب ہوتے ہیں، بلکہ مقربین کو تو دو چند عذاب کی وعید ہے ایسی صورت میں ان کا مستحق عذاب ہونے والا کام کرنا منصب نبوت کے خلاف اور منافی ہے کیونکہ نبی تو اپنی امت کی نیکی و بدی کا گواہ اور ان کا شفیع ہوتا ہے، اور جب وہ خود ہی اپنے کام میں قاصر ہوا تو کیسے شفاعت کرے گا اور کیسی گواہی دے گا۔

(۳) اگر نبی سے بھی صدور گناہ مان لیا جائے تو پھر وہ جابر حاکموں کے مانند ہو جائیں گے کہ لوگوں کو تو بداطواریوں پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور سزائیں دیتے ہیں، مگر خود انہیں بداعمالیوں کے مرتکب ہوتے ہیں حالانکہ جابر حاکم اور نبی کی روش میں فرق ہونا چاہیئے،

(۴) اگر وہ بھی گناہ کریں۔ تو اللہ کی طرف سے گناہ کی جو عقوبت اور سزا ہے، اس کا مستحق بننے سے کیسے بچینگے۔

(۵) اگر یہ گناہ کریں تو جب وہ امت پر ظاہر ہوں گے تو وہ ان کی اطاعت کہاں کریگی اس کی دل میں جو عزت و وقار ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔ وہ پھر ان کی کسی بات کی بھی تصدیق نہ کریگی۔

یہ چند ظاہری وجوہ ایسی ہیں، کہ ان کا تقاضا ہے کہ نبی، ہر قسم کے گناہوں اور لغزشوں سے پاک اور معصوم ہو۔ اور اہل سنت ہمہ جہت نبی کو معصوم اور گناہوں سے پاک مانتے ہیں،

مگر امامیہ کا ایک فرقہ یعفوریہ اس کا قائل ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صدور جائز ہے یہ فرقہ جس عقیدہ کا اظہار کھلے الفاظ میں کرتا ہے بقیہ تمام امامیہ در پردہ وہ ہمنوائی کرتے اور اپنی کتابوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے

میں ناپاک کاموں اور گندے اعمال کی روایات نقل کرتے ہیں عنقریب اپنے موقعہ پر اس کی تفصیل گوش گزار کی جائے گی
عقیدہ (۴) :- انبیاء کرام علیہم السلام، دروغ گوئی اور بہتان بازی سے بہر حیثیت و حالت پاک ہیں، سہواً بھی اور عمداً بھی، قبل نبوت بھی اور بعد نبوت بھی،

لیکن امامیہ کہتے ہیں، کہ انبیاء کے لئے کذب جائز ہے، بلکہ بلحاظ تقیہ واجب ہے؛ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول انی سقیم کو اسی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ ان حضرات کے متعلق کذب جائز ہو گو بطور تقیہ ہی سہی تو ان پر سے اعتماد اور بھروسا اٹھ جائے اور بعثت کی غرض ہی جاتی رہے اور اگر تقیہ کو انبیاء کے لئے جائز مان لیا جائے تو تبلیغ احکام ناقابل عمل ہو جائے کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی عہد میں جب کوئی حامی و مددگار نہ تھا، آپ اگر تقیہ فرماتے، کہ تقیہ کی ایسے وقت ہی زیادہ احتیاج ہوتی ہے، اور قوم کی ایذا رسانی سے خوف زدہ ہو کر حکم الٰہی کے خلاف ظاہر کرتے تو حکم الٰہی کے معلوم ہونے کی پھر کیا صورت رہ جاتی چنانچہ اس مسئلہ کی تحقیق انشاء اللہ عنقریب معلوم ہو جائیگی،

رہی یہ بات کہ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ لَمْ یَکْذِبْ اِبْرَاهِیْمُ اِلَّا ثَلَاثَ کِذْبَاتٍ تو اس میں کذب کے حقیقی معنے مراد نہیں ہیں، بلکہ اشارات و استعارات مراد ہیں، جس کو کم سمجھ اور کم فکر آدمی جھوٹ سمجھ لیتا ہے اور ان کو شکلی مشابہت کے سبب لفظ کذب سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اس کی کافی شافی بحث باب دوم میں گزر چکی۔

عقیدہ (۵) :- انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے واجبات ایمان کا علم قبل و بعد نبوت ضروری ہے، جبکہ عقائد میں جہالت و لاعلمی کفر و زندیقیت ہے تو انبیاء پر اس کیفیت کے کسی لمحہ کا تصور کیسے درست ہو سکتا ہے، ہاں وحی الٰہی کے نزول سے پہلے احکام شرعی سے لاعلمی ہوتی ہے۔ اور عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ آپ کو وہ علم سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے، میں اسی کی طرف اشارہ ہے، مسلمان اور اکثر یہود و نصاریٰ اس عقیدہ کو بالاجماع صحیح و درست مانتے ہیں، اور جا بجا نصوص قرآنیہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً وَكُلًّا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ہم نے ہر ایک کو علم و حکمت بخشی، وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ہم نے بچپن ہی میں حکم سے سرفراز کیا، وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ہم نے ان کو حکمت اور فصل خطاب عطا کی، اسی مضمون پر دلالت کرنے والی اور بھی بہت سی آیات ہیں بعض مقامات پر اس مضمون کے بعد بعثت، رسالت، وحی اور نزول کتاب کا ذکر آیا ہے، بلکہ حضرت لقمان کے حق میں حکمت کا لفظ استعمال فرمایا جن کے پاس نہ وحی آئی نہ ان کو نبوت ملی تو معلوم ہوا کہ یہ علم قبل نبوت اور قبل نزول وحی بھی حاصل ہوتا ہے،

مگر امامیہ اس کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ بعثت کے وقت بلکہ اپنے رب سے مناجات اور مکالمہ کے وقت جو اللہ تعالیٰ سے بشری قرب کا اعلیٰ مقام ہے انبیاء کو اصول عقائد کی معرفت نہیں ہوتی،

ان کی اس بد عقیدگی کی سند وہ روایت ہے جو محمد بن بابویہ قمی نے عیون میں اخبار رضا رحمۃ اللہ علیہ میں اور کتاب التوحید میں بحوالہ علی بن موسیٰ رضا بسند باپ دادا امیر المومنین رضی اللہ عنہ تک پہنچائی۔ اور جسے محمد بن یعقوب کلینی نے کافی میں ابی جعفر سے بیان کی کہ اِنَّ مُوْسٰى بْنَ عِمْرَانَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِ سَاَلَ اللّٰهَ تَعَالٰى فَقَالَ يَا رَبِّ اَبَعِيْدٌ اَنْتَ مِنِّيْ فَاُنَادِيْكَ اَمْ قَرِيْبٌ فَاُنَاجِيْكَ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے رب آپ مجھ سے دور ہیں کہ میں آپ کو پکاروں یا میرے قریب ہی ہیں کہ میں سرگوشی کروں، یہ روایت بتاتی ہے کہ مناجات و مکالمہ کے وقت تک موسیٰ علیہ السلام کو یہ پتہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قرب و بُعد مکانی سے پاک ہے ا

ان لوگوں کی مذکورہ بالا روایت کی اصلیت وحقیقت یہ نہیں ہے جو انہوں نے بیان کی ہے، بلکہ سوال وجواب کا یہ واقعہ ایک اعرابی کا ہے۔ جس نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پوچھا یَا مُحَمَّدُ اَبَعِیْدٌ رَبُّنَا فَنُنَادِیْہِ اَمْ قَرِیْبٌ فَنُنَاجِیْہِ۔ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کیا ہمارا رب دور ہے کہ ہم اسے آواز سے پکاریں یا قریب ہے، کہ سرگوشی کریں، اعرابی نے تو اپنی فہم وسمجھ کے مطابق ایک عام سا سوال کر دیا تھا، مگر اس سوال کے جواب کے بہت سے نازک اور دقیق گوشے بھی تھے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم پہ واضح تھے اور آپ کے جواب کا تعلق صرف اسی اعرابی تک محدود نہیں تھا بلکہ صاحبان فہم وشعور حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم جو حاضر تھے یا جن تک یہ جواب پہنچتا ان سے بھی اس کا تعلق تھا اس لئے آپ نے فوری جواب دینے میں کچھ تامل فرمایا۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب اپنے ذمہ لے کر فرمایا، وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ جب میرا بندہ آپ سے میرے متعلق سوال کرتا ہے تو میں ان سے قریب ہوتا ہوں) اس آیت سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے دور نہیں نزدیک ہی ہیں، گو یہ نزدیکی مکانی نہ ہو اس لئے نزدیکی مکانی کے جو فوائد وآثار مرتب ہوتے ہیں وہ یہاں بھی حاصل ہیں، اسی لئے اس سے آگے خود فرماتا ہے، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں اپنے پکارنے والے کی پکار کو جب وہ مجھے پکارتا ہے سنتا ہوں۔

اگرچہ یہاں ان الفاظ کے حقیقی معنے مراد نہیں لیکن خدا تعالیٰ کی ہدایت کا طریقہ یہی ہے کہ وہم کے قیدیوں کو انہیں کی معلومات اور اوہام کے مطابق جواب دیتا اور تسلی خاطر کرتا ہے یہ اعرابی چونکہ وہم کا قیدی اور حواس کی بندشوں میں جکڑا ہوا تھا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے قرب وبعد کو بھی اسی پیمانے سے ناپتا تھا، جیسے دوسری اشیاء کو حواس کے سامنے تھیں اس لئے کہ جب ایک موجود شئی کا مقابلہ دوسری موجود شے سے کیا جائے تو وہ یا اس کے قریب ہو گی یا بعید اس کی محدود سمجھ میں یہ بات کسی طرح آ ہی نہیں سکتی تھی کہ شے موجود بھی ہو اور اس قسم کے مکان وجہت اور قرب وبعد سے پاک بھی ہو،

تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کے اوہام ومعلومات کے مطابق جواب دیا، کہ اس کی تشفی ہو جائے اس کو معقولات کی طرف ترقی کرنے پہ مجبور کرنے والا جواب مرحمت نہیں فرمایا جیسے کسی کم سن بچی سے سوال کیا گیا۔ اَیْنَ اللہُ اللہ کہاں ہے، اس نے جواب دیا فی السماء (آسمان میں)، تو اس پہ سکوت فرمایا۔

تو یہ ہی قصہ تھا جس کو امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے بھی بیان فرمایا اب ان کے راویوں کی قوت حافظہ کا کمال کہئے یا اندرونی خبث وشرارت کہ ایک اعرابی کی جگہ ایک اولوالعزم پیغمبر کا نام ٹانک دیا اور یوں قعر ذلت وضلالت میں جا پڑے اور اہل فہم ودانش دیکھ لیں کہ اہل سنت کی روایات میں اور ان کی روایات میں جو فرق ہے وہ یہی ہے اور اسی خاش غلطی سے ہی بآسانی یہ نتیجہ نکل آتا ہے، دعائے صنمی قریش اور صحابہ کرام کی دوسری برائیوں والی روایات میں بھی انہوں نے ناموں اور القاب میں اس قسم کا ردو بدل اور رشائل وصفات میں اسی نوعیت کی تحریفات کر کے بات کہاں سے کہاں لے جانے کی سعی نا مشکور کی ہے! یہ عامد کی ٹوپی محمود کے سروالی کہاوت کے عملی ونمونہ ہیں،

اور یہ سب کچھ دین ودیانت سے غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے اس فرقہ نے اسی غفلت اور لاپرواہی سے ہر کس وناکس کو دین سے استفادہ کا اہل گردانا۔ اور اس کی باتوں اور روایتوں کو امتحانی کسوٹی پہ نہیں دیکھا کہ کھرا کھوٹا خالص اور ناخالص ایک دوسرے سے جدا وممتاز ہو جاتے!

اسی طرح کی ایک روایت ان کے ہاں حضرت یونس کے متعلق بھی ہے جو کلینی نے ابی عبداللہؑ سے روایت کی ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ۔

إِنَّ يُونُسَ كَانَ يَقُولُ فِي سُجُودِهِ أَتَرَاكَ مُعَذِّبِي وَقَدْ عَفَّرْتُ لَكَ فِي التُّرَابِ وَجْهِي أَتَرَاكَ مُعَذِّبِي وَقَدْ أَظْمَأْتُ لَكَ نَهَارِي أَتَرَاكَ مُعَذِّبِي وَقَدْ أَسْهَرْتُ لَكَ لَيْلِي۔ أَتَرَاكَ مُعَذِّبِي وَقَدِ اجْتَنَبْتُ لَكَ الْمَعَاصِي قَالَ فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ أَنِ ارْفَعْ رَأْسَكَ فَإِنِّي غَيْرُ مُعَذِّبِكَ فَقَالَ إِنْ قُلْتَ لَا أُعَذِّبُكَ ثُمَّ عَذَّبْتَنِي كَانَ مَاذَا أَلَسْتُ عَبْدَكَ وَأَنْتَ رَبِّي فَأَوْحَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ ارْفَعْ رَأْسَكَ فَإِنِّي غَيْرُ مُعَذِّبِكَ وَإِنِّي إِذَا وَعَدْتُ وَعْدًا أَوْفَيْتُ بِهِ۔

حضرت یونس سجدہ میں پڑے کہہ رہے تھے کہ کیا تو مجھے عذاب دے گا جب کہ میں نے تیرے لئے اپنا چہرہ گرد آلود کیا۔ کیا تو مجھے عذاب دینا پسند کرے گا جب کہ میں نے اجر و ثواب کی خاطر خود کو پیاسا مارا۔ کیا تو مجھے عذاب دینا گوارا کرے گا جب کہ میں نے تیری خوشنودی کی خاطر اپنے اوپر رات کی نیند حرام کرلی کیا تو مجھے عذاب دینا جائز سمجھے گا جبکہ میں نے تیرے خوف کے سبب گناہوں سے پرہیز کیا (راوی کہتا ہے) اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کی کہ اپنا سر اٹھا میں تجھے عذاب نہیں دوں گا۔ تب حضرت یونس نے کہا کہ تو کہتا ہے کہ عذاب نہیں دوں گا مگر اس کے باوجود عذاب دیدیا تو پھر کیا ہوگا؟ کیا میں تیرا بندہ اور تو میرا رب نہیں ہے اسپر اللہ تعالیٰ نے پھر وحی فرمائی کہ تو سر اٹھا میں تجھے عذاب نہیں دوں گا جب میں وعدہ کرتا ہوں تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اس روایت صحیحہ سے دو باتوں کا ثبوت ملتا ہے کہ اول. حضرت یونس علیہ السلام کو یہ معلوم نہیں تھا کہ خلاف وعدگی بری بات ہے، اور علامات نفاق سے ہے، اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے،

دوسرے یہ کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے۔ ایک معصوم کو عذاب دینا اس لئے ناممکن ہے ورنہ اپنے متعلق عذاب سے خوفزدہ کیوں ہوتے "

لیکن اگر یہی بات ہوتی کہ حضرت یونس علیہ السلام اصول کے اعتقادی مسئلہ سے ناواقف ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں یہ فرماتے کہ ہم مطیع و فرمانبردار کو عذاب نہیں دیا کرتے، اس کے بجائے وعدہ والی بات نہ فرماتے یہ بات تو اسی لئے فرمائی کہ یونس علیہ السلام اس کو جانتے اور مانتے تھے کہ خلاف وعدہ برا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے،

خلاصہ کلام یہ کہ یہ روایت بھی ان کی من گھڑت اور جعلسازی کا ایک نمونہ ہے اور انہیں کے خیال و گمان کے موافق بھی وہ قطعی دلائل سے باطل اور ناقابل سماع ہے،

ان کی ساری ہی روایتوں کا یہی حال ہے کہ وہ خود ہی بزبان حال والفاظ آپ ہی اپنی تردید ہوتی ہیں،

عقیدہ (۶) : انبیاء کرام علیہم السلام ایسے گناہوں سے پاک ہیں، جن کی پاداش میں موت یا ہلاکت ہو، مگر امامیہ اس عقیدہ میں بھی اختلاف کرتے ہیں۔ اور بعض انبیاء علیہم السلام کے متعلق درج ذیل قسم کی روایات بیان کرتے ہیں،

چنانچہ کلینی نے ابن ابی یعفور کے حوالہ سے جناب ابی عبداللہ سے یہ روایت بیان کی ہے،

قَالَ سَمِعْتُ أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ يَقُولُ وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ رَبِّ لَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ أَبَدًا وَلَا أَقَلَّ مِنْ ذَالِكَ فَمَا كَانَ بِأَسْرَعَ مِنْ أَنْ

وہ کہتا ہے کہ میں نے ابی عبداللہ کو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے یہ کہتے سنے کہ اے میرے رب مجھے پلک جھپکنے یا اس سے بھی کم مدت کے لئے میرے نفس کے حوالہ نہ کر یہ الفاظ پوری

تحدّر الدّمع من جوانب لحیتہٖ ثمّ اقبل علیّ فقال یا ابن ابی یعفور انّ یونس ابن متّی وکلہ اللہ الی نفسہٖ اقلّ من طرفۃ عین فاحدث ذالک قلت فبلغ بہٖ کفرًا اصلحک اللہ فقال لا ولکنّ الموت علی تلک الحال کان ھلاکًا

طرح ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور داڑھی کے اطراف گرنے لگے پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے ابن ابی یعفور اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو پلک جھپکنے سے کم مدت کے لئے ان کے نفس کے حوالہ کر دیا تھا کہ یہ آفت و امتحان در پیش ہو گیا میں نے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے کیا وہ کفر تک پہنچ گئے تھے آپ نے فرمایا نہیں لیکن اس حالت پر موت آجاتا ہلاکی و بربادی ہوتی''

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق واضح رہنا چاہیئے کہ ان کا ذکر قرآن مجید میں جو آیا ہے، وہ اسی قدر ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر ہی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اسی پر یہ ابتلا پیش آیا دوسری بات یہ تھی کہ قوم کو بددعا دینے میں انتظار کم کیا، اور ان کی ایذا رسانی اور تکذیب پر صبر و تحمل کی باگ ہاتھ سے جلد ہی چھوٹ گئی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں سرے سے گناہ ہی نہیں تو کبیرہ ہونے کا کیا سوال،

بات یہ تھی کہ آپ اپنی تبلیغ بلیغ کے باوجود اپنی قوم کی ناہنجاری کے سبب سے بعض قوی قرائن سے یہ سمجھ چکے تھے کہ اب ان کے ایمان لانے کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں اس لئے ان کے حق میں بددعا کی اور جب یہ دیکھا کہ اس قوم پر آیا ہوا عذاب ٹل گیا تو اندیشہ ہوا کہ اب تو یہ میری تکذیب میں اور بھی نڈر اور بے دھڑک ہو جائیں گے ہو سکتا ہے ایذا رسانی میں اور بڑھ جائیں گے اور تمسخر بھی اڑائیں گے کہ بددعا بھی رائیگاں گئی۔ یہی سوچ کر قوم کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، وحی الٰہی اور اجازت ربانی کا انتظار نہیں کیا، اور جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے، کے تحت ذرا سی بات پر خاصے سخت عتاب اور تادیب کے مورد بنے،

حضرت یونس علیہ السلام کے سارے قصہ میں کہیں ان کے کسی فعل و عمل سے نافرمانی کا ثبوت نہیں ملتا۔ بس اندیشوں میں گھر کر گھبراہٹ کا شکار ہو گئے اور اجازت ربانی کی ضرورت سے توجہ ہٹ گئی اگر تھوڑا صبر کر لیتے تو سارے اندیشے بھی دور ہو جاتے اور اس کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی کہ قوم پر آیا ہوا عذاب کیوں ٹل گیا تھا۔ ہوا یہ کہ آپ کی بددعا کے بعد عذاب کے آثار دیکھ کر قوم کو تنبہ ہوا وہ نادم ہو کر توبہ استغفار میں لگ گئی اللہ تعالیٰ سے اپنی خطاؤں اور گناہوں کی معافی مانگی اور آئندہ حضرت یونس علیہ السلام کی فرمانبرداری و اطاعت کا سچے دل سے اقرار کیا،

مگر ان ساری باتوں کا علم ہونے سے پیشتر ہی حضرت یونس علیہ السلام شہر چھوڑ گئے تھے اگر وہ انہیں میں کچھ اور رہ جاتے تو ان کی قوم آپ ہی کے وسیلے اور توسط سے توبہ استغفار پیش کرتی،

اب قرآن مجید میں جو ان کے متعلق فظنّ ان لن نقدر علیہ آیا ہے تو اس میں قدر، قدرت سے مشتق نہیں ہے، جس کی وجہ سے آپ کو فساد عقیدہ کا الزام دیا جائے بلکہ اس کے معنے یہاں ضیق اور تنگی کے ہیں، جیسے اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر (اللہ جس کا چاہتا ہے، رزق فراخ کر دیتا ہے جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے) اور ان معنوں کے مراد لینے کا قرینہ یہ ہے کہ اسی کے متصل فرمایا فنادی فی الظلمٰت اس ندا اور فریاد کو بعد میں لانا قدرت کے معنے کے مناسب نہیں، یہاں اول معنے ہی بخوبی چسپاں اور موزوں ہیں اس صورت میں یہ معنے ہوں گے، کہ اس نے گمان کیا کہ ہم اس کی عتاب سے گرفت نہ کریں گے پس بامید قبولیت توبہ کی اور استغفار بجا لایا اور حضرت یونس علیہ السلام کا

اقرار ظلم میں اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ کہنا اللہ تعالیٰ کی جناب میں صرف کسر نفسی اور انتہائی تضرع و زاری کا اظہار ہے فرمانبردار بندوں کی عادت اور وطیرہ یہی ہوتا ہے، کہ اعتراف قصور کے وقت اپنی معمولی بات کو بھی بڑا قصور ظاہر کرتے ہیں یا ایسا اس بنا پر کہا کہ انبیاء کے لئے ترک اولیٰ ایسا ہی ظلم ہے جیسے عوام کے حق میں گناہ ظلم ہے،

عقیدہ (۷): "ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام حسد، بغض اور نافرمانی پر اصرار، اور کجی رہنے سے پاک تھے"

اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے، چنانچہ ارشادات ربانی ہیں، ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی۔ پھر اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا، اس کی توبہ قبول کی اور ہدایت دی،

فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔ پس آدم نے اپنے رب سے توبہ کے چند کلمے سیکھ کر ان کو ادا کیا پس اس کی توبہ قبول ہو گئی، بلاشک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے،

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم و نوح اور آل ابراہیم کو عالم والوں پر برگزیدہ کیا،

بخلاف امامیہ کے وہ اپنے باپوں کے باپ کے حق میں شرمناک ناخلفی کا ثبوت دیتے ہیں، اور انتہائی گستاخی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کو حسد بغض اور دوسری نازیبا خصلتوں سے متصف کرتے اور یہ گمان بد کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور عدول حکمی پر بضد تھے اور ابلیس کا حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جو رویہ رہا کہ اس نے حسد کر کے سجدہ کے حکم کو ٹھکرایا خدا کے عہد کو ترک کیا اور ابدی لعنت کا مستحق ہوا۔

وہ کہتے ہیں یہی رویہ حضرت آدم علیہ السلام کا ائمہ کے ساتھ تھا کہ ان سے حسد کیا، ان کی ولایت کا عہد کر کے گویا اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی کی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پاداش میں ان پر غصہ کیا اور ہمیشہ غضبناک ہی رہا۔ کوئی حد ہے اس دریدہ دہنی کی پناہ بخدا۔

محمد بن بابویہ نے عیون اخبار الرضا میں علی بن موسیٰ الرضا سے روایت کی کہ انہوں نے فرمایا۔

اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ اٰدَمَ لَمَّا اَكْرَمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِاِسْجَادِ الْمَلٰٓئِكَةِ لَهٗ وَبِاِدْخَالِهِ الْجَنَّةَ قَالَ فِیْ نَفْسِهٖ اَنَا اَكْرَمُ الْخَلْقِ فَنَادَی اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِرْفَعْ رَاْسَكَ یَا اٰدَمُ فَانْظُرْ اِلٰی سَاقِ عَرْشِیْ فَرَفَعَ اٰدَمُ رَاْسَهٗ فَوَجَدَ فِیْهِ مَكْتُوْبًا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰهِ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَزَوْجَتُهٗ فَاطِمَةُ سَیِّدَةُ نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَقَالَ اٰدَمُ یَا رَبِّ مَنْ هٰٓؤُلَآءِ فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ ذُرِّیَّتِكَ وَهُمْ خَیْرٌ مِّنْكَ وَمِنْ جَمِیْعِ خَلْقِیْ وَلَوْلَاهُمْ مَا خَلَقْتُكَ وَمَا خَلَقْتُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ وَلَا السَّمَآءَ وَلَا الْاَرْضَ

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ عزت بخشی کہ فرشتوں سے ان کو سجدہ کرایا اور جنت میں رکھا تو انہوں نے دل میں سوچا کہ میں مخلوقات میں سب سے زیادہ باعزت ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم ذرا اپنا سر تو اٹھاؤ اور میرے عرش کے پایہ کو دیکھو، حضرت آدم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس پر یہ لکھا دیکھا کوئی معبود اللہ کے سوا نہیں محمد اللہ کے رسول ہیں، علی اللہ کے دوست اور امیر المومنین ہیں اور ان کی زوجہ فاطمہ سارے عالم کی عورتوں کی سردار اور حسن حسین اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہیں حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا اے میرے رب یہ کون لوگ ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تیری اولاد میں سے ہیں جو تجھ سے

فایاک ان تنظر الیہم بعین الحسد فاخرجک عن جواری فنظر الیہم بعین الحسد فسلط علیہ الشیطان حتی اکل من الشجرۃ التی نھی اللہ تعالی عنھا۔

اور میری ساری مخلوق سے بہتر ہیں، اگر وہ نہ ہوتے تو نہ تجھ کو پیدا کرتا نہ جنت و دوزخ اور آسمان و زمین کو اور خبردار تم ان کو حسد سے نہ دیکھنا ورنہ تم کو اپنے قرب سے دور کر دوں گا۔ تو حضرت آدم نے ان پر حسد کی نظر ڈالی اور اللہ نے ان پر شیطان کو مسلط کر دیا یہاں تک کہ انہوں نے اس درخت کو کھایا جس سے روکا تھا،

اور ابن بابویہ نے معانی الاخبار میں مفضل بن عمر سے اور اس نے ابی عبداللہ سے بھی یہ روایت بیان کی ہے،

قال لما اسکن اللہ عزوجل آدم وزوجتہ الجنۃ قال لھما کلا منھا رغدا حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین فنظرا الی منزلۃ محمد وعلی وفاطمۃ والحسن والحسین والائمۃ من بعدھم فوجداھا اشرف المنازل من منازل اہل الجنۃ فقالا ربنا لمن ھذہ المنزلۃ فقال اللہ عزوجل ارفعا رءوسکما الی ساق عرشی فرفعا رءوسھما فوجدا اسماء محمد وعلی وفاطمۃ والحسن والحسین والائمۃ مکتوبۃ علی ساق العرش بنور من نور الجبار جل جلالہ فقالا یا ربنا ما اکرم ھذہ المنزلۃ علیک وما احبھم الیک وما اشرفھم لدیک فقال اللہ جل جلالہ لولاھم ما خلقتکما ھؤلاء خزنۃ علمی وامنائی علی سری ایاکما ان تنظرا الیھم بعین الحسد وتتمنیا منزلتھم عندی ومحلھم من کرامتی فتدخلا من ذلک فی نھیی وعصیانی فتکونا من الظالمین فوسوس الیھما الشیطان فدلاھما بغرور وحملھما علی تمنی منزلتھم فنظرا الیھم بعین الحسد فخذلا لذلک۔

"جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو جنت میں ٹھیرایا تو ان سے کہا کہ جنت میں جہاں سے اور جو جی چاہے خوب سیر ہو کر کھاؤ مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ جب انہوں نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم)، علی فاطمہ حسن حسین (رضی اللہ عنہم) ان کے بعد ائمہ کے درجے کو دیکھا تو اس کو اہل جنت کے تمام درجوں سے اشرف و اعلیٰ پایا۔ بولے اے میرے رب یہ درجہ کس کا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے عرش کے پایہ کو تم ذرا سر اٹھا کے دیکھو انہوں نے جب سر اٹھایا تو وہاں جبار کے نور سے پایہ عرش پر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) علی فاطمہ، حسن و حسین اور ائمہ (رضی اللہ عنہم) کے اسمائے گرامی لکھے ہوئے دیکھے اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ اے ہمارے رب آپ کے نزدیک باعزت محبوب اور اشرف اس مرتبہ کو کس نے بنایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔ یہ میرے علم کے خزانے ہیں، اور میرے بھید کے رازدار تم حسد کی نظر سے ان کو دیکھنے سے بچو۔ اس مرتبہ کی تمنا کرو جو ان کو میرے حضور میں حاصل ہے، نہ اس عزت کی جگہ کی آرزو رکھو جو ان کو میرے دربار میں میسر ہے کہ ایسا کرنے سے تم میری نافرمانی اور عدول حکمی کے مرتکب ہوگے اور تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا، پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور فریب سے اپنے قابو میں کر کے ان کو درجوں کی تمنا پر اکسایا تو انہوں نے ان کو حسد سے دیکھا اور اس کی وجہ سے خوار ہوئے،"

اب اگر کوئی عقلمند ان دونوں روایتوں پر غور کر کے دیکھے تو وہ دیکھے گا کہ ان میں حضرت آدم علیہ السلام کے شان میں تحقیر و اہانت میں یہ حد سے بھی گزر گئے۔ سب جانتے ہیں کہ اول تو حسد ویسے ہی تمام ادیان و مذاہب میں بری اور نازیبا صفت شمار ہوتی ہے، اور پھر بزرگوں اور برگزیدہ بندوں کے نزدیک تو وہ بڑے سے بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے اس کے

باوجود بھی وہ اس کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کس ڈھٹائی سے کررہے ہیں اور وہ بھی جناب باری کی طرف سے انتہائی تاکید و ممانعت کے بعد۔ گویا ان کے مذہب میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس میں کوئی فرق نہ رہا ابلیس نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا، وہی انہوں نے اپنی اولاد کی برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ کیا۔

بلکہ آپ کا فعل ابلیس سے بھی بدتر ہوا، کہ ابلیس کا تو حضرت آدم علیہ السلام سے کوئی تعلق نہ تھا بخلاف حضرت آدم علیہ السلام کے کہ ان کا تو ان بزرگوں سے باپ بیٹوں کا رشتہ تھا، اور یوں قطع رحمی کا الزام بھی آیا اور پھر اولاد سے حسد کرنا جو فطرتاً محالات میں سے ہے، سب سے پہلے پیغمبر، مسجود ملائک اور جنت میں رہنے والے کی طرف منسوب ہوا کوئی حد ہے، بدبختی کی العیاذ باللہ!۔

امامیہ کے مذہب میں حضرت آدم علیہ السلام کا بندوں کے ساتھ معاملہ میں تو یہ عقیدہ ہے۔ اب ذرا یہ دیکھئے کہ آدم علیہ السلام کے اللہ تعالےٰ کے ساتھ معاملہ میں ان کی خباثت کیا گل کھلاتی ہے اور وہ کس طرح اپنی بددینی اور بے ایمانی پر مہر تصدیق بدست خود ثبت کرتے ہیں اس کے لئے یہ روایت ملاحظہ فرمایئے،

محمد بن صفار نے ابی جعفر سے یوں روایت کی ہے،

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ لِاٰدَمَ وَذُرِّیَّتِہٖ اَخْرَجَھَا مِنْ صُلْبِہٖ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ وَھٰذَا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَعَلِیٌّ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَوْصِیَائُہٗ مِنْ بَعْدِہٖ وُلَاۃُ اَمْرِیْ وَاَنَّ الْمَھْدِیَّ اَنْتَقِمُ بِہٖ مِنْ اَعْدَائِیْ وَاُعْبَدُ بِہٖ طَوْعًا وَّکَرْھًا قَالُوْا اَقْرَرْنَا وَشَھِدْنَا وَاٰدَمُ لَمْ یُقِرَّ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ عَزْمٌ عَلَی الْاِقْرَارِ بِہٖ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت سے جس کو اس نے انہیں کی پشت سے نکالا تھا سوال کیا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں اور یہ محمد اللہ کا رسول علی امیر المومنین اور ان کے بعد ان کے وصی میرے حکم کو نافذ کرنے والے، اور البتہ مہدی نے میرے دشمنوں سے بدلہ لیا۔ اور اس کی وجہ سے میری عبادت کی جائے گی خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے جواب دیا۔ کہ ہم اقرار کرتے اور گواہ ہوتے ہیں، اور حضرت آدم علیہ السلام نے نہ اقرار کیا اور نہ اقرار کا ارادہ رکھتے تھے،،

اس روایت میں ان کا خبث کھل کر سامنے آگیا، اور حضرت آدم علیہ السلام پر کفر صریح کا الزام عائد کردیا کیونکہ جحود وانکار، کفر صریح ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اس پیغمبر کو کافر ٹھیرایا جس کو اس نے دونوں ہاتھوں سے بنایا اپنی روح خاص اس میں پھونکی اور جس کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی اٰدَمَ۔ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو برگزیدہ کیا) اور فرشتوں کو اسے سجدہ کرنے کا حکم فرمایا ہو دین و ایمان سے کس قدر دور ہے۔

ان امور کے بارے میں شریف مرتضیٰ نے خاص حمیت اسلامی کا مظاہرہ کیا اور اپنی کتاب الغرر والدرر میں حدیث میثاق کی صحت سے صاف انکار کیا، اور کہا کہ یہ حدیث من گھڑت اور موضوع ہے، اور اسی وجہ سے ابن صفار اور شیوخ نے اس کو دائرہ ایمان سے خارج قرار دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تعصب میں اتنے اندھے کیوں ہوگئے ہیں کہ قرآن مجید کو کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں، یا پھر یہ اتنے جاہل ہوگئے اور بدعقل ہیں، کہ قرآن مجید سے اتنی بات کا ان کو پتہ نہیں چل سکا کہ حضرت آدم علیہ السلام

پر عتاب محض درخت سے کچھ کھالینے کے سبب تھا، جو بالاجماع گناہ کبیرہ نہیں ہے اور اگر عتاب کا سبب وہ امور ہوتے جن کا یہ ذکر کرتے ہیں، تو ان ہی کو قرآن میں سبب عتاب ٹھیرایا جاتا۔ آخر کیا بات تھی کہ ان کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا جاتا۔ ان امور کے ذکر کرنے سے یہ بھی فائدہ ہوتا کہ جناب حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کو بھی عبرت ہو جاتی اور وہ بھی بسلسلہ امامت برائیوں سے بچ جاتے اور براہ راست بلا فصل بہت جلد حقداروں کو ان کا حق مل جاتا

اور دین و شرع کا تو یہ معاملہ ہے ہی، عقل سلیم بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے، مثلاً ایک شخص نے خواہ مہمان بن کر یا جبراً گھر میں گھس کر ایک شخص کے لڑکے کو مار ڈالا، اس کے حکم کی بھی نافرمانی کی اور اس کے گھر کے درخت کا پھل بھی توڑ کھایا۔ اب مواخذہ کرنے والا وہ شخص سارے قصوروں کو ایک طرف کر کے درخت کے چند پھلوں کے کھانے پر تو واویلا مچا رہا ہے، مگر نہ لڑکے کے قتل کا ذکر کرتا ہے نہ اس کی عدول حکمی کا اور نہ کسی اور بات کا۔ تو عقل سلیم اس کو کب گوارا کر سکتی ہے،۔

اور ترک عہد کے سلسلہ کی ایک اور روایت بھی ان کے ہاں ملتی ہے چنانچہ صفار مذکور آیت وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ کے ذیل میں لکھتا ہے کہ۔

"اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ان کے بعد ائمہ کے بارے میں عہد لیا مگر انہوں نے عہد کو ترک کیا اور نہ ان کے خیال میں وہ ایسے تھے"۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ صفار، مجوسی تھا۔ اس کے دادا کا نام فرخ تھا۔ اور یہ خود کو موسیٰ بن عیسیٰ اشعری کا غلام کہتا تھا، مجوسیت کی ناپاکی اس کی اہل نسل میں ابھی تک رچی بسی تھی، شیعوں کے مہیا کردہ ہتھیار تقیہ سے کام لیتے ہوئے، مذہب شیعہ پر بھی پردہ ڈالے رکھتا تھا، اور درپردہ یہ اسلام دشمنی کے ساتھ ساتھ ائمہ کرام کا بھی چھپا دشمن تھا، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی روایات سب ایسی ہی ہیں، جو یہ ائمہ سے بیان کرتا ہے، کہ ان سے خود ائمہ کا وقار مجروح اور ان کی شان میں بٹہ لگتا ہے، اور ان کی عزت پر حرف آتا ہے، مثلاً یہی مذکورہ بالا روایات کہ اہل مذاہب کے تمام طبقات خواہ یہودی ہوں، نصرانی ہوں یا مسلمان حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام کی بزرگی اور کرامت پر جو ان کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاصل تھی متفق الخیال، اور تمام عالم والوں میں ان کی برگزیدگی پر متفق الرائے ہیں، ایسی صورت میں جب اس قسم کی روایات ائمہ سے منسوب ہو کر تمام عالم میں پھیلیں گی تو سارے انسان استحقاق امامت تو رہا ایک طرف ان کی ذاتی خوبی زیادتی دیانتداری اور بزرگی سے ہی منکر و بدعقیدہ ہو جائیں گے۔

اور اسلامی فضا میں ہلچل مچ جائے گی اور یوں ان مجوسیوں کی دلی آرزو پوری ہو جائے گی،

الحمد للہ اہل سنت پر ان کی بددیانتی بے ایمانی اور خیانت فاش ہو گئی انہوں نے ان کی روایات کو گندے، نجس اور ناپاک چیتھڑوں کی طرح کوڑی پر پھینکدیا، ہاں شیعہ شیطان کے پھندے میں آ گئے، اس نے بٹ ماری اور راہزنی کر کے ان کا اور ان کے شیوخ ضلالت مآب کا رخ ان کی طرف پھیر دیا کہ انہوں نے اپنے دین وایمان کا مدار ان بے دین و بدمذہب مجوسیوں یہودیوں کی روایات پر رکھا۔ اور اپنا ایمان ابلیس نما مفتریوں اور جعل سازوں اور کذابوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ سچ ہے مَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (جس کو اللہ گمراہ کرتا ہے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں)۔

عقیدہ (۸) "کسی نبی نے فرائض رسالت کی ادائیگی سے معافی نہیں چاہی اور نہ احکام الٰہی کی بجاآوری سے کبھی معذرت کی" اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ بعض اولوالعزم رسولوں نے رسالت کی ذمہ داریوں سے نہ صرف سبکدوشی حاصل کرنی چاہی بلکہ ٹال مٹول اور حیلے حوالے سے کام لیا اور عذر پیش کئے ان میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جب ان کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست حکم دیا۔ اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ظالم قوم قوم فرعون کے پاس پہنچو۔

تو آپ نے جواب دیا کہ مجھ کو اس کام سے معافی دیجئے اے میرے رب مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تکذیب نہ کریں اور میں ان کی چہ میگوئیوں سے تنگ دل نہ ہو جاؤں۔ اور لکنت کی وجہ سے ادائیگی مطلب سے قاصر نہ ہو جاؤں اور پھر میں اس قوم کا مجرم ہوں کہ ان کا ایک آدمی میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے کہیں اس کی پاداش میں مجھے قتل نہ کر دیں بہتر ہے میرے بھائی ہارون کو وہاں بھیجد یجئے اور مجھے معافی دیجئے"

یہ لوگ یہ مضمون قرآنی آیات سے اخذ کر کے اسے کلام الٰہی سمجھتے ہیں، حالانکہ رسالت سے معافی دراصل وحی کو ٹھکرانا اور اللہ کے حکم کو نہ ماننا ہے اور انبیاء اس سے معصوم ہیں،

امامیہ کے لئے آیات قرآنی سے تمسک کا کوئی راستہ نہیں، بلکہ اگر آیات میں غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان آیات میں انہیں پر الزام عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ آیات میں یہ بات کہ مجھ کو اس کام سے معافی دیجئے، اور میرے بھائی کو میری بجائے رسالت سے نوازیئے،، بالکل مذکور نہیں۔

یہ سب کچھ اس فرقہ کی نا سمجھی کا کرشمہ ہے۔ ہاں ادائے رسالت سے قبل قوم فرعون کی تکذیب کا اندیشہ اور یہ ڈر کہ وہ ان کو مار ڈالیں اور ان کی کبیدہ خاطری اور لکنت زبانی یہ سب کچھ جو آپ نے فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ آپ ٹال مٹول کر رہے یا معافی کے خواستگار تھے، بلکہ احکام کی بجاآوری میں مددگاری کی درخواست کر رہے تھے اور اعذار و اندیشے تو اس درخواست مددگاری کی تمہید کے طور پر پیش کئے تھے تو یہ تو قبول رسالت کی دلیل ہے، انکار کی نہیں،

مثلاً ایک بادشاہ کسی کو ایک مہم سپرد کرتا ہے وہ شخص اپنے ساتھیوں کی کمی، دشمنوں کی کثرت اور شان و شوکت بیان کر کے ان کے مقابلہ میں اپنی کمزوری قالاً و حالاً بیان کرتا ہے تو اس سے اس کی غرض یہ ہے بادشاہ اس کو مزید مدد سے سرفراز کرے اور آزمودہ کار افراد سے اس کو مزید طاقتور بنائے تو اس شخص کا یہ کلام قبول حکم پر دلالت کرتا ہے انکار پر نہیں اور آیت وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ (میرے اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا۔ اس سے میری پشت مضبوط کر اور میرے کام میں اس کو شریک کر) اس کی تفسیر مبہم ہے۔ آپ کی غرض یہ ہے کہ اس عزت و مرتبہ والے کام میں میرے بھائی کو بھی شریک فرما۔ یہ نہیں کہ رسالت کو خود سے ٹال کر۔ ہارون کو اپنا قائم مقام بنائیں اسی طرح اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنَ (میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں)،

یہ سب درخواست تھی کہ ان اندیشوں کو دور فرما مجھے اپنی پناہ میں لے لے نہ کہ مرتبہ رسالت کو اپنے سے ٹالنا چاہا ہو۔ انبیاء خصوصاً اولوالعزم نبی سے اس قسم کی سوء ظنی اور بدفہمی سے خدا کی پناہ ۔

عقیدہ (۹) خسرو پرویز کے عہد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام بنی نوع انسان کی طرف حضرت محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب (صلے اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے تھے، علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نہیں اور یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی کے معاملہ میں اللہ کے امین تھے اپنی طرف سے وحی نہیں لائے تھے انہوں نے پیغام رسانی میں کوئی خیانت نہیں کی اور وہ ہر معاملہ خصوصاً ان اہم ترین مسائل میں ہر قسم کی بھول چوک سے پاک ہیں اس وحی کے لانے میں نہ ان سے کوئی غلطی و کوتاہی ہوئی اور نہ کسی قسم کا اشتباہ پیش آیا،

مگر فرقہ غرابیہ جن کا حال باب اول میں گزر چکا ہے اس عقیدہ میں اختلاف کرتا ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام پر لعنت بھیجتا ہے،

ایسے کم فہموں اور ناہنجاروں کے سامنے قرآنی آیات اور ائمہ کی روایات لانا بے کار و بے فائدہ سی بات ہے اور نہ مدمقابل کو خاموش کرنے میں اس سے مدد مل سکتی ہے اس لئے کہ جب جبرائیل علیہ السلام ہی متہم کر دیئے گئے تو پوری شریعت اور قرآن ان کے لئے تو بے اعتبار ہو گیا اور پھر اہل بیت اپنے جد امجد کے مرتبہ کے خلاف کیوں لب کشائی کریں کہ ان کا تو شرف ہی ان کی وجہ سے ہے، اس لئے جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کے لئے مجبوراً غیروں سے مدد لی جا رہی ہے اور ان کے باطل عقیدہ کے رد کے لئے توریت و انجیل سے حوالے پیش کئے جاتے ہیں، کیونکہ غالباً غرابیہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں اس پیش بندی کے معتقد تو نہیں ہوں گے کہ ان کتابوں میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ اس دور اندیشی سے رکھدیئے ہوں کہ آگے چل کر کبھی ان سے میرا واسطہ پڑیگا اور اگر ان کی موٹی عقل میں یہ شک پیدا بھی ہو تو ان پر واضح رہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر وحی اکثر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر ہی آتی رہی ہے، خصوصاً توریت کو بیک وقت بلا واسطہ (غیرہ کوہ طور پر زبرجد کی تختیوں پر لکھی ہوئی عنایت ہوئی اسمیں حضرت جبرائیل کا کیا دخل،

چنانچہ توریت کے سفر ۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے،

اِنَّ هَاجَرَ تَلِدُ وَيَكُوْنُ مِنْ وُلْدِهَا مَنْ يَدُهٗ فَوْقَ الْجَمِيْعِ وَيَدُ الْجَمِيْعِ مَبْسُوْطَةٌ اِلَيْهِ بِالْخُشُوْعِ - البتہ ہاجرہ کے ہاں اولاد ہوگی اور اس کی اولاد میں وہ شخص ہوگا جس کا ہاتھ سب کے ہاتھوں سے بالاتر ہوگا اور سب کے ہاتھ اس کی طرف عاجزی سے دراز ہوں گے۔

یہ حوالہ جس نسخہ توریت سے منقول ہے وہ یہود کے قبضہ میں ہے مسلمانوں کی اس تک دسترس نہیں اور نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا اس میں دخل ہے۔ یہود تو حضرت جبرائیل سے عداوت رکھتے تھے، اور یہ بات بلا کسی شک و شبہ کے ظاہر ہے کہ حضرت ہاجرہ کی اولاد میں اس صفت کا شخص جس کے ہاتھ سب سے بالاتر ہوں اور جملہ اہل عصر اس کے سامنے عاجزی سے جھکیں، سوائے محمد بن عبد اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، کے کسی بھی وقت کوئی بھی نہیں ہوا اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد میں، مغلوب، خائف، مغصوب، اور مظلوم زندگی بسر کرتے رہے۔ اور جب خود ان کا زمانہ آیا۔ تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ، باغیوں اور خارجیوں کی طرف سے خشوع کی جو فضا پیدا ہوئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں،

اور اسی توریت کے سفر ۵ میں یوں ہے يَامُوْسٰى اِنِّيْ مُقِيْمٌ لِبَنِيْ اِسْمٰعِيْلَ نَبِيًّا مِنْ بَنِيْتِي اَجْرُهُمْ وَاَجْرِيْ قَوْلِيْ فِيْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ لَهُمْ مَا اٰمُرُتُ بِهٖ - اے موسیٰ میں اولاد اسمٰعیل میں اپنے گھر سے ایک نبی بھیجوں گا جو ان کو

رواں کرے گا۔ اور میں اپنے کلام کو اس کے منہ کے ذریعہ رواں کروں گا، اور وہ ان سے وہی کہے گا جو میں اس کو حکم دونگا)
اب اس امر الٰہی کے مطابق اس قسم کا نبی اولاد اسمٰعیلؑ میں ہونا ضرور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو چونکہ امر الٰہی بالاستقلال رواں نہیں کیا اور نہ خدا کا کلام اصالۃً ان کے منہ سے جاری ہوا بلکہ انہوں نے تو خود کو ہمیشہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا تابع اور شاگرد جانا، تو لامحالہ وہ تو وہ نبی ہوئے نہیں لہٰذا وہ معمور نبی سوائے محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کون ہو سکتا ہے،

اور یوحنا کی انجیل کی چودھویں صحاح میں اس طرح آیا ہے،
اَمَّا فَارَقْلِيطُ رُوحُ الْقُدُسِ الَّذِيْ يُرْسِلُهُ اِلَىَّ بِاِسْمِيْ هُوَ يُعَلِّمُكُمْ وَيَمْنَحُكُمْ جَمِيْعَ الْاَشْيَاءِ وَهُوَ يُذَكِّرُكُمْ مَا قُلْتُهُ لَكُمْ۔
فارقلیط روح القدس کو بھیجتا میری طرف۔ میرے نام سے جو تم کو تعلیم دے گا اور سب چیزیں تمکو عطا کرے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اس کی وہ یاد دہانی کرے گا،
اور انجیل یوحنا کی چھٹی صحاح میں بھی اسی طرح ہے، اَلْكِنِّيْ اَقُوْلُ لَكُمُ الْاٰنَ حَقًّا وَيَقِيْنًا اَنَّ انْطِلَاقِيْ عَنْكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ فَاِنْ لَّمْ اَنْطَلِقْ اِلٰى اَبِيْ لَمْ يَاْتِكُمْ فَارَقْلِيْطُ وَاِنِ انْطَلَقْتُ اَرْسَلْتُ بِهٖ اِلَيْكُمْ فَاِذَا مَا جَآءَ هُوَ يُعَبِّدُ اَهْلَ الْعَالَمِ وَيُدِيْنُهُمْ وَيُوَبِّخُهُمْ وَيُوْقِفُهُمْ عَلَى الْخَطِيْئَةِ وَالْبِرِّ۔ (لیکن میں سچائی اور یقین کے ساتھ تم سے کہتا ہوں کہ میرا تمہارے پاس چلا جانا بہتر ہے، اگر میں اپنے باپ کے پاس نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے اور اگر چلا جاؤں تو تمہارے پاس اس کو بھیج دوں جب وہ آجائے گا تو سب اہل عالم کو عبادت گزار دیندار بنا دیگا۔ جھڑکے گا ان کو اور واقف کرے گا ان کو خطا اور بھلائی سے،
اور اسی انجیل میں یہ بھی درج ہے اِنَّ لِيْ كَلَامًا كَثِيْرًا اُرِيْدُ اَنْ اَقُوْلَهُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تَقْدِرُوْنَ عَلٰى قُبُوْلِهٖ وَالْاِحْتِفَاظِ بِهٖ وَلٰكِنْ جَآءَ رُوْحُ الْحَقِّ يُرْشِدُكُمْ وَيُعَلِّمُكُمْ وَيُؤَيِّدُكُمْ بِجَمِيْعِ الْخَيْرِ لِاَنَّهٗ لَيْسَ يَتَكَلَّمُ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِهٖ۔ (میرے پاس کہنے کی باتیں بہت ہیں، جو میں بہت تم سے کہنا چاہتا ہوں، لیکن نہ تم کو ان کے یاد رکھنے کی قدرت ہے نہ ان کو قبول کرنے کی ہمت لیکن روح القدس تمہارے پاس آئے گا جو تم کو ہدایت کریگا اور تعلیم دے گا اور تمام بھلائیاں تم تک پہنچائے گا اس لئے کہ وہ اپنے دل سے کچھ نہ کہے گا،
اور زبور میں تو صراحت سے آپ کا اسم مبارک بھی آچکا ہے جو سارے احتمالات اور اشتباہات کی بیخ کر دیتا ہے چنانچہ اس زبور میں جو یہود کے پاس محفوظ ہے، یوں تحریر ہے،

يَا اَحْمَدُ فَاضَتِ الرَّحْمَةُ عَلٰى شَفَتَيْكَ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ اُبَارِكُ عَلَيْكَ فَتَقَلَّدِ السَّيْفَ فَاِنَّ بَهَاءَكَ وَحَمْدَكَ الْغَالِبُ وَبُوْرِكَ كَلِمَةُ الْحَقِّ فَاِنَّ نَامُوْسَكَ وَشَرَائِعَكَ مَقْرُوْنَةٌ بِهَيْبَةِ يَمِيْنِكَ سِهَامُكَ مَسْنُوْنَةٌ وَالْاُمَمُ يَخِرُّوْنَ تَحْتَكَ كِتَابُ حَقٍّ جَآءَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْيَمَنِ وَالتَّقْدِيْسِ مِنْ جَبَلِ فَارَانَ وَامْتَلَاَتِ الْاَرْضُ مِنْ

اے احمد ابل پڑی تیرے منہ سے رحمت اس لئے میں تجھ کو برکت دیتا ہوں پس تو تلوار باندھ، کیونکہ تیری روشنی اور تعریف غالب ہے اور کلمہ حق کو برکت نصیب ہوئی بے شک تیرا قانون وشریعت تیرے ہاتھ کے دبدبہ سے ملحق ہے تیرا تیر تیز ہے امت تیرے زیر فرمان ہوگی، سچی کتاب ہے جو اللہ نے یمن و تقدیس کے ساتھ جبل فاران سے بھیجی اور

تَمْلِيْئِ اَحْمَدَ وَتَقْدِيْسِهٖ وَمَلَكَ الْاَرْضَ وَرِقَابَ الْاُمَمِ۔ زمین احمد کی تقدیس و تعریف سے بھر گئی اور وہ زمین کا فرمانروا اور امتوں کا مالک بنا۔

اور زبور میں ہی ایک جگہ یہ درج ہے، لَقَدِ انْكَسَفَتِ السَّمَاءُ مِنْ بَهَاءِ اَحْمَدَ وَامْتَلَأَتِ الْاَرْضُ مِنْ حَمْدِهٖ (اور احمد کی روشنی سے آسمان گہنا گیا۔ اور زمین اس کی تعریف سے پر ہوگئی)

اور اہل کتاب آپ کی جائے پیدائش، مقام بعثت، آپ کا نسب، آپ کی علامات و خوبیاں، کفار کا آپ کو وطن سے نکالنا اور مقام ہجرت، ان سب باتوں کی خبریں اپنی کتابوں کے حوالہ سے دیتے ہیں جن میں امتیازات وقیودات کی وجہ سے شرکت یا پوشیدگی کا کوئی احتمال یا شک نہیں بلکہ سب کا اشارہ ذات واحد نبی آخر الزمان حضرت محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور مسعود کے وقت ان تمام اوصاف کو آپ پر منطبق بلکہ منحصر پاکر کچھ اہل کتاب تو آپ پر فوراً ایمان لاکر آپ کے اطاعت گزار اور فرمانبردار بن گئے اور کچھ نے وقت آنے پر نصرت وامداد کا پختہ وعدہ کیا۔ پھر یہ اور بات ہے کہ وقت آنے سے پیشتر ہی حکم قضا وقدر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اور پیدائش مبارک کے وقت ان علامتوں کو اور نشانیوں کا ظہور کہ پتھر و درخت بول پڑے۔ نجومیوں نے خبریں دینا شروع کیں جنوں نے غائبانہ آوازیں دیں، بت اور شیطان چلا پڑے اور اسی طرح بعثت کے وقت جو کچھ رونما ہوا یہ ساری باتیں دوسرے تمام احتمالات کا خاتمہ کردیتی ہیں،

اس کے بعد معجزات کا ظہور، دعاؤں کی قبولیت، باری تعالیٰ عزاسمہ کی طرف سے مسلسل اور پے بہ پے آپ کو نیز آپ کے پیروکاروں کو امداد و نصرت کا حصول اور آپ کی وہ برکتیں اور انوار جو اقصائے عالم میں پھیل گئے اور اب تک باقی ہیں یہ سب کی سب اسباب کی نشانیاں ہیں کہ وہ ذات ستودہ صفات آپ ہی ہیں، صلے اللہ علیہ وسلم اور پھر ان ساری باتوں کے علی الرغم حضرت جبرائیل علیہ السلام کی غلطی اور اشتباہ کا وہم وخیال اس وقت ہو سکتا تھا، کہ جب وحی کا دارو مدار محض صورت بتا دینے پر ہوتا، اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا نام، نشان آپ کی تعریف آپ کے اوصاف اور خوبیاں بیان نہ کی جاتیں اور اللہ تعالیٰ بھی اس اشتباہ و غلط فہمی کے ازالہ کرنے پر قادر نہ ہوتا۔

لہذا معلوم ہوگیا کہ یہ سارے احتمالات اور شکوک بالکل ظاہر البطلان ہیں، اور پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہم شکلی اور حلیہ کی یکسانیت کی جو خبریں شیعہ وغیر شیعہ بتواتر نقل کرتے ہیں، وہ بالکل بے اصل اور سراسر بے معنی و غلط ہیں ان پر اگر غرابیہ اور ذبابیہ کوئی شوشہ لگائیں یا حاشیہ آرائی کریں تو وہ ایک لغو اس ہے ناقابل التفات

عقیدہ (۱۰۵) ؛ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سلسلہ نبوت کے آخری نبی ہیں، نبوت آپ پر ختم اور مکمل ہوگئی، آپ کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا، اب کوئی نبی نہیں، سارے ہی اسلامی فرقے یہی عقیدہ رکھتے ہیں، مگر شیعوں کے فرقوں میں سے خطابیہ معمریہ، منصوریہ، اسحاقیہ، مفضلیہ اور سبعیہ، ایسے ہیں جو اس عقیدہ کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں۔ جیسا کہ باب اول میں مذکور ہوا۔

اور امامیہ اگرچہ بظاہر تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کو مانتے ہیں، مگر در پردہ ائمہ کی نبوت کے بھی قائل ہیں، بلکہ وہ ائمہ کو انبیا سے برتر اور بزرگتر مانتے ہیں، جیسا کہ اوراق ماسبق میں بیان ہوا اور کسی چیز کو حلال وحرام قرار

دینے کے اختیارات جو خاصہ نبوت بلکہ اس سے بھی بالاتر ہیں وہ ائمہ کے سپرد و حوالہ کرتے ہیں یعنی جو چیز اللہ و رسول نے حرام و حلال نہیں کی اس کو حلال و حرام قرار دینے کا ائمہ کو اختیار ہے اس عقیدہ کی موجودگی میں وہ بھی ختم نبوت کے منکر ہوئے،

اس سلسلہ کی یہ روایت ملاحظہ کیجئے، جس کو حسین بن محمد ابن جمہور قمی نے کتاب نوادر میں بحوالہ محمد بن سنان، ابی جعفر سے بیان کی ہے۔

قَالَ كُنْتُ عِنْدَهٗ وَاَجْرَيْتُ اِخْتِلَافَ الشِّيْعَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَمْ يَزَلْ مُنْفَرِدًا بِالْوَحْدَانِيَّةِ ثُمَّ خَلَقَ مُحَمَّدًا وَعَلِيًّا وَفَاطِمَةَ وَالْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ فَمَكَثُوْا اَلْفَ دَهْرٍ فَخَلَقَ الْاَشْيَاءَ وَاَشْهَدَهُمْ خَلْقَهَا وَاَجْرٰى طَاعَتَهُمْ عَلَيْهَا وَفَوَّضَ اُمُوْرَهَا اِلَيْهِمْ يُحِلُّوْنَ مَا يَشَاؤُوْنَ وَيُحَرِّمُوْنَ مَا يَشَاؤُوْنَ۔

ابن سنان کہتا ہے کہ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے اختلاف شیعہ کا ذکر چھیڑا تو آپ نے فرمایا اے محمد اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے وحدانیت کے ساتھ تنہا ہے پھر اس نے محمد علی، فاطمہ، حسن و حسین کو پیدا کیا۔ اور یہ ہزار زمانے تک ٹھیرے رہے پھر تمام اشیاء کو پیدا کیا اور ان کو ان اشیاء کی پیدائش دکھائی اور ان کی اطاعت ان سب پر واجب قرار دی، اور ان کے کام انہیں کے سپرد کئے کہ ان پر جو چاہیں حلال کریں اور جو چاہیں حرام کریں۔"

اس کے علاوہ دوسری روایت وہ ہے، جو کلینی نے محمد بن حسن میثمی سے اور اس نے ابی عبد اللہ سے روایت کی ہے،

قَالَ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَدَّبَ رَسُوْلَهٗ حَتّٰى قَوَّمَهٗ عَلٰى مَا اَرَادَ ثُمَّ فَوَّضَ اِلَيْهِ دِيْنَهٗ فَقَالَ مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا فَمَا فَوَّضَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى رَسُوْلِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ فَوَّضَهٗ اِلَيْنَا۔

اس نے کہا میں نے ان کو (ابی عبد اللہ کو) کہتے سنا کہ اللہ نے ادب سکھایا رسول کو یہاں تک کہ ان کو اپنی منشا تک لے آیا پھر اس کو اپنا دین سپرد کیا اور کہا کہ جو کچھ تم کو رسول دے وہ لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو سونپا وہی کچھ ہم کو بھی سونپا،

یہ دونوں روایات موضوع اور گھڑی ہوئی ہیں، اس لئے کہ حسین بن محمد ضعیف راویوں سے روایت بیان کرتا ہے اور اپنی کتاب میں زیادہ تر مراسیل نقل کرتا ہے چنانچہ نجاشی نے اپنے اصحاب کے حوالہ سے اس کی تصدیق کی ہے اور محمد بن حسن میثمی تو فرقہ مجسمیہ سے ہے۔ وہ مومن ہی کہاں ہے تو اس کی روایت کیسے قابل اعتبار مانی جا سکتی ہے،

اگر یہاں اس کی روایت تسلیم ہو تو پھر چاہیئے کہ مسئلہ تجسیم کو بھی مانیں کہ اس کی روایت بھی اس نے ائمہ ہی سے کی ہے،

اوّل تو یہی بات محل کلام ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو حلت و حرمت کا اختیار سپرد ہوا ہے، یا نہ۔ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کا کیا ذکر چنانچہ مذہب صحیح یہ ہے کہ شریعت کا مقرر کرنا پیغمبر کے سپرد نہیں ہے، کہ ان کا کام خدا تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانا ہے خدا کی نیابت اور اس کے کارخانہ میں وہ شریک نہیں ہیں اللہ تعالیٰ کے احکام بندوں تک پہنچانا ہے اللہ تعالیٰ جس کو حرام و حلال قرار دیتا ہے رسول اس کی تبلیغ کرتے اور بندوں کو اس کی خبر دیتے ہیں اپنی طرف سے اس میں ترمیم و تبدیلی کا ان کو حق نہیں اس لئے کہ اگر رسول کے دین کا معاملہ سپرد ہوتا کہ ان سے کسی معاملہ میں باز پرس یا فہمائش نہ ہوتی، مثلاً بدر کے قیدیوں کے فدیہ میں، تحریم ماریہ قبطیہ میں، یا غزوہ تبوک سے منافقین

کے پیچھے جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ دیگر بعض اور امور کہ ان میں بائیں پر سخت انداز کی ہوئی،

اور وہ مسائل جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی حکم کے بیان کے دوران کسی سوال پر، یا کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر بغیر انتظار وحی آپ نے کوئی استثناء یا تخصیص فرمائی مثلاً الا الاذخر رسول اللہ اذخر کے، یا تجزی عنك ولا تجزی عن احد بعدك (تیرے لئے کافی ہے تیرے بعد کسی اور کے لئے نہیں) یا آپ کا یہ ارشاد لو قلت نعم لوجبت (میں ہاں کہہ دیتا تو حج واجب ہو جاتا۔ ان الفاظ سے تفویض کے قائل جو استدلال کرتے ہیں، کہ آپ کو حلال وحرام کے اختیارات تفویض ہیں،) وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ حقیقت میں یہ تفویض کی صورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ اجتہاد کی شکلیں ہیں، کہ عام میں داخل وشامل ہونے کے سبب یا اس نفی کی بنا پر آپ اس کا استنباط فرماتے اور اس طرح سائل کی تشفی فرماتے تھے اور نبی کا اجتہاد امت پر عمل کو واجب کر دیتا ہے، لہذا تفویض کی اس صورت میں کہ قواعد کلیہ سے احکام کا استنباط کر کے فتویٰ دیا جائے کوئی قباحت نہیں، تمام مجتہدین یہی تو کرتے ہیں،

اور امور دنیا میں اگر یہ تفویض مان بھی لیں گو یہ مذہب کمزور ہے تب بھی اس معاملہ میں ائمہ کو پیغمبر کے برابر اور ہمسر قرار دینا اجماع کے خلاف ہے۔

ورنہ یہ لازم آئے گا کہ ائمہ اور پیغمبر علیہ السلام ہر دو سے منقولہ روایات پر عمل یکساں ہو جس پر چاہیں عمل پیرا ہو جائیں کیونکہ اس صورت میں دونوں صاحب شرع ہوں گے،

پھر متعارض اور باہمی ٹکراؤ والی روایات کو ایک کو دوسری میں تطبیق دینے کی کون تکلیف گوارا کرے گا یا یہ صورت ہوگی کہ ائمہ سے مروی روایات اور پیغمبر علیہ السلام سے منقول روایات کسی پر عمل جائز نہ رہے کیونکہ ہر ایک اپنی قومی، شخصی یا زمانی مصلحت کے پیش نظر ہی احکام شرع کی بنیاد رکھیں گے، اور وہ مصالح چونکہ امت سے پوشیدہ ہوں گے اس لئے دوسرے مقامات پر مختلف احکام کا استنباط غیر ممکن ہو جائے گا۔ اور یوں احکام شرع بغیر عمل کے رہ جائیں گے اور یہ مذکورہ لوازم امامیہ کے نزدیک بھی باطل ہیں، لہذا لوازم کے ساتھ ملزوم بھی باطل ہوا۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اور امر دین ائمہ یا پیغمبر علیہ السلام کے سپرد ہوتے تو یہ ضروری تھا کہ وہ حکم کے مختلف پہلوؤں پر اجتہاد کر کے اولیٰ وارجح کو معین کرتے مگر امامی شیعوں کے نزدیک نبی یا امام کے لئے اجتہاد بھی جائز نہیں اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ائمہ حلال وحرام کی روایات اپنے باپ دادا سے بیان کرتے ہیں، اور تفویض کی شکل میں اکہ وہ خود ہی صاحب شرع ٹھیرے) کسی روایت کی ضرورت ہی کیا پڑتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تفویض ایسا لغو اور بے معنی اصول ہے، کہ از سرتا پا واہیات امور اور برائیوں کا سرچشمہ ہے، اس کو مان لینا ایسا ہی ہے، کہ جیسے ختم نبوت کا انکار کر دینا جس کے امامیہ بھی قائل نہیں،

عقیدہ نمبر (۱) معراج حق ہے اور حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص اہل عصر میں سے سیر ملکوت السماوات والارض میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی شریک نہیں، یہی اہل سنت کا مذہب ہے اور کتاب اللہ اور عترت رسول اللہ ہر دو کی نصوص سے ثابت ہے قرآن میں ارشاد ہے، سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔ وہ پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا،

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (بے شک اس نے اس کو ایک بار اور بھی دیکھا ہے) لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (البتہ اس نے اپنے رب کی عظیم الشان نشانیاں دیکھیں)۔

اور معراج کے بارے میں عترت رسول کے اقوال تو امامیہ کی کتب میں حد تواتر تک پہنچے ہوئے موجود ہیں طول کلام سے بچنے کے لئے یہاں ان کے نقل کرنے سے احتراز کیا گیا،

لیکن اس کے باوجود شیعوں کے اکثر فرقے اس عقیدہ کے مخالف ہیں، اسمٰعیلیہ، معمریہ اور رامویہ تو سرے سے معراج کو مانتے ہی نہیں اور فلسفیانہ شبہات اور تیزی حرکت اور عادتاً آسمانوں کے پھٹنے کو محال سمجھتے ہوئے اپنے انکار کی دلیل بناتے ہیں۔ حالانکہ نص قرآن ان سب امور کی تردید کرتی ہے چنانچہ صورت نمل میں سرعت حرکت پر بلقیس کے تخت کا یمن سے شام تک آناً فاناً آجانا صراحتہً اس پر دال ہے، اور آسمان کے پھٹنے پر بھی بہت سی آیات صاف صاف دلالت کرتی ہیں، اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب کہ آسمان پھٹ جائے گا) اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب کہ آسمان پاش پاش ہو جائے گا) پھر آسمان کے پھٹنے کا سوال تو اس وقت اٹھے گا جب آسمان میں دروازوں کا وجود تسلیم نہ کیا جائے جب کہ آسمان میں دروازوں کی موجودگی مذاہب ثلاثہ مذکورہ بالا میں متفق و طے شدہ امر ہے کہ انہیں دروازوں سے فرشتے اور ارواح امت آتی جاتی رہتی ہیں، تو اصول اسلامیہ کا کیا کہنا۔

اور منصوریہ معراج کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ماننے سے انکار کرتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں منصور عجلی خود اس مادی جسم کے ساتھ جیتا جاگتا آسمان پر گیا اور اللہ تعالیٰ سے دو بدو باتیں کر کے آیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے سر پہ ہاتھ بھی پھیرا۔ باب اول میں بھی اس کا بیان گزر چکا۔

اور یہ منصور عجلی وہی گمنو سالہ ہے جس کو جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلس سے نکال دیا تھا اور اس کے کذب پر مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ پھر یہ خود ہی امام بن بیٹھا اور طرح طرح کے بہتان تراشے،

پھر امامیہ بعض اور ضمنی باتوں میں بھی باہم مختلف الخیال ہیں،

بعض کہتے کہ جناب امیر المومنین بھی معراج میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو بعض دوسرے کہتے ہیں کہ آپ ساتھ تو نہیں تھے تو زمین ہی پر مگر زمین ہی پہ آپ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم آسمانوں پہ ملاحظہ فرما رہے تھے! جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی جس مقام پہ ساختہ دینے سے جبرائیل امین جیسے فرشتے عاجز رہ گئے ہوں وہاں کسی بشر کی کیا تاب کہ حضور کے ہمرکاب ہو۔ اور اگر یہ سب کچھ زمین پہ بیٹھے دیکھنا ممکن ہوتا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اتنے دور دراز سفر کی تکلیف کی ضرورت ہی نہ تھی نہ خدانخواستہ بینائی مبارک میں کوئی عارضہ لاحق تھا، کہ دور سے ملاحظہ نہ فرما سکتے۔

ان کے مغالطہ کی دلیل ابن بابویہ کی وہ روایت ہے، جو اس نے اپنی کتاب المعراج میں ایک طویل حدیث کے سلسلے میں بیان کی ہے، اس میں وہ کہتا ہے اِنَّ عَلِيًّا كَانَ لَيْلَةَ الْمِعْرَاجِ فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنَّهٗ رَاٰى مِنْ مَلَكُوْتِ السَّمَآءِ مَا رَاٰهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (علی معراج کی رات زمین پر تھے، لیکن انہوں نے ملکوت سما میں وہ سب کچھ دیکھا جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا۔ پہلے یہ گزر چکا کہ یہ روایت انہیں کی دوسری روایات صحیحہ سے ٹکراتی ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ عَلِيًّا كَانَ عَلٰى نَاقَةٍ مِنْ نُوْقِ الْجَنَّةِ وَبِيَدِهٖ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَحَوْلَهٗ شِيْعَتُهٗ۔ کہ علی جنت کی اونٹنیوں

میں سے ایک اونٹنی پر سوار تھے ان کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا تھا۔ ان کے ارد گرد ان کے شیعہ تھے)

یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔ وہاں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ دونوں روایات باہم ٹکراؤ کی وجہ سے ساقط ہو گئیں۔ اور یوں ناقابل عمل قرار پائیں، اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو اس کے مطابق سارے شیعوں کو بھی معراج میں ان کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس روایت کو ترجیح دیں۔

امامیہ کے فرقہ امور یہ کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ نبوت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے اور ان کی نسبت آپ سے ایسی ہی ہے جیسی ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ۔ حالانکہ تمام امامیہ کے نزدیک خاتم النبیین کا لفظ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بطریق تواتر منقول ہے۔

تو اس عقیدہ کی بنا پر ختم نبوت کہاں ہوئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ تیس سال بقید حیات رہے، اور یہ تو امر محال ہے کہ نبی کبھی معزول بھی ہو سکتا ہے،

عقیدہ (۱۲) ۔ "قرآن کریم کی تمام نصوص اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث ظاہری معنی پر محمول ہیں"۔

مگر شیعوں کے تمام فرقے مثلاً خطابیہ، منصوریہ، معمریہ، قرامطہ باطنیہ زرامیہ، اور اسمٰعیلیہ میں سے سبعیہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کہ کتاب و سنت میں جو کچھ آیا ہے مثلاً وضو، تیمم، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، جنت، دوزخ، قیامت، اور حشر وغیرہ یہ سب امور ظاہری معنے پر محمول نہیں ہیں، بلکہ ایسے دوسرے معنوں پر محمول ہیں جن کو امام معصوم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس عقیدہ کی بنا پر اس فرقہ کے نزدیک سب سے بڑی ثقلین یعنی کتاب اللہ قابل تمسک نہ رہی،

چنانچہ سبعیہ کہتے ہیں کہ وضو امام کے ساتھ دوستی کا نام ہے تیمم امام کے غائب ہو جانے کے بعد ماذون سے استفادہ کرنا۔ نماز سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو ناطق نبی ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ، (البتہ نماز (یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) روکتی ہے برائی اور نازیبا بات سے)

اور زکوٰۃ نفس کو معارف حقہ کے ذریعہ پاک کرنے کا نام ہے۔ کعبہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، دروازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، صفا و مروہ، حضرت حسن و حسین (رضی اللہ عنہ) میقات سے لوگ مراد ہیں، تلبیہ اجابت دعوت، کعبہ کے سات طواف سے ساتوں ائمہ کی محبت و دوستی کی طرف اشارہ ہے جو شریعت کے حامل ہیں، اور اگلی شریعت کو آنے والی شریعت تک باقی رکھنے کے ذمہ دار! احتلام سے مراد، نااہلوں کے سامنے آئمہ کے اسرار کو بغیر قصد کے افشا کر دینا ہے اور غسل سے ائمہ سے پھر تازہ عہد استوار کر لینے کی طرف اشارہ ہے۔ جنت تکالیف شرعیہ سے راحت پا لینے کا نام ہے، اور دوزخ تکالیف برداشت کرنے اور ظاہر پر عمل کرنے کا نام۔

قرامطہ اور باطنیہ بھی اس قسم کی خرافات اور بکواس لگاتے ہیں، اور ظاہر پر عمل کرنے کے سخت مخالف ہیں، اسی لئے انہوں نے حاجیوں کو عین حرم شریف میں قتل کیا ان کا مال لوٹا اور حجر اسود اکھاڑ کر لے گئے اور کوفہ میں لے جا کر کسی کوڑی پر ڈال دیا۔ یہ سب حرام چیزوں کے جائز ہونے کے قائل ہیں،

بزیغیہ سا کنز انبیاء علیہم السلام کے کا انکار ہی نہیں ان پر لعن بھی کرتے ہیں،

باطنیہ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سب خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ساختہ پرداختہ باتیں ہیں، رمضان کے روزے حضرت عمرؓ کی نکالی ہوئی بدعت ہے، خطابیہ، منصوریہ، معمریہ اور رمنا بیہ کہتے ہیں،

کہ مذکورہ فرائض ان لوگوں کے نام ہیں جن کی دوستی کا ہم کو حکم ہے۔
،اور محرمات ان لوگوں کے نام ہیں، جن کے ساتھ دشمنی رکھنے پر ہم مامور ہیں،
منصور یہ اور زرامیہ جنت سے مراد امام لیتے ہیں اور دوزخ سے مراد ان کے دشمن مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما
معمریہ۔ کہتے ہیں کہ جنت دنیا کی نعمتوں کا نام ہے اور دوزخ دنیا کی تکلیفوں کا۔ اور یہ کہ دنیا کو فنا نہیں معطیع باللہ کے دور میں اس فرقہ نے اس سمجھ بوجھ پر بھی پورا تسلط اور غلبہ پالیا اور ایک دنیا کو گمراہ کر ڈالا۔ کہ عقلمندوں کے لئے عبرت کا باعث ہوا۔

آخر چنگیزیوں کے ہاتھوں پروردگار کے غضب کا شکار ہو کر کیفر کردار کو پہنچے اور اس خلفشار میں سب خشک و تر جل گیا، اور کردہ، وناکردہ، سب اس کی لپیٹ میں آگئے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے ، وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (اس فتنہ سے ڈرو جو صرف انہیں کو لپیٹ میں نہیں لے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو گا۔

عقیدہ (۱۲) حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی کے پاس بھی کوئی فرشتہ پیغام رساں بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی وحی نازل ہوئی نہ ہی کسی نے فرشتہ کی صرف آواز ہی سنی، بغیر اس کی صورت دیکھے،،

لیکن امامیہ کہتے ہیں، جناب امیر کو یہ مرتبہ حاصل تھا اور آپ کے پاس وحی آتی تھی آپ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی میں اتنا فرق تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ دکھائی دیتا اور جناب امیر صرف اس کی آواز سنتے تھے، دیکھتے نہیں تھے، چنانچہ کلینی نے کافی میں جناب سجادؑ سے یہ الفاظ روایت کئے ہیں
إِنَّ عَلِيَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ كَانَ مُحَدَّثًا وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ اللهُ إِلَيْهِ الْمَلَكَ يُكَلِّمُهُ وَيَسْمَعُ الصَّوْتَ وَلَا يَرَى الصُّوْرَةَ۔

کہ حضرت علی بن ابی طالب محدث تھے۔ اور جناب محدث وہ ہوتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے جو اس سے کلام کرتا ہے، وہ آواز سنتا ہے صورت نہیں دیکھتا۔

یہ سب کچھ اس قوم کی من گھڑت باتیں اور جھوٹی روایات ہیں اور پھر یہ ائمہ کی ان روایات سے بھی ٹکراتی ہیں جو خود انہیں کی کتابوں میں موجود ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَيُّهَا النَّاسُ لَمْ يَبْقَ بَعْدِي مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ (اے لوگو نبوت تو میرے بعد باقی نہیں رہے گی، مگر مبشرات باقی رہیں گی،

اور انہیں کے ہاں یہ روایت بھی موجود ہے کہ
،، حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر سونے کی مہروں سے مہر شدہ ایک کتاب نازل ہوئی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ کتاب جناب امیرؑ کو دی آپ نے حضرت حسنؑ کو دی اور اسی طرح وہ دست بدست ہوتی ہوئی جناب مہدی تک پہنچی۔ ہر اگلا پیچھے آنے والے کو یہ وصیت کرتا گیا کہ وہ ایک مہر توڑے اور اس کے مضمون پر عمل پیرا ہو چنانچہ ائمہ کا علم اسی کتاب سے ماخوذ ہے،،

لہذا جب صورت حال یہ ہے تو اب فرشتہ بھیج کر اس کی آواز سنوانے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی اور بیکار کام کا وجود کارخانہ قدرت میں محال ہے،

امامیہ کا ایک اور گروہ مصحف فاطمہ کے وجود کا مقر و معترف ہے، وہ کہتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال

کے بعد بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے پاس وحی آتی تھی، اور ان کو بلا کر کے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے مصحف فاطمہ کو مرتب کیا تھا، بعد میں پیش آنے والے اکثر واقعات اور اس امت کے فتنے اس میں درج ہیں، اور اسی مصحف کی روشنی میں ائمہ لوگوں کو غیب کی خبروں سے مطلع کیا کرتے تھے۔

شیعوں میں سے مختاریہ فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مختار ثقفی کے پاس وحی آتی تھی، باب اول میں اس کے متعلق بیان آچکا ہے۔

اور اسمٰعیلیہ میں سے سبعیہ، مفضلیہ، مغیریہ، اور عجلیہ، اپنے پیشواؤں کی نبوت اور ان پر نزول وحی کا دعویٰ علی الاعلان صاف الفاظ میں کرتے ہیں یہ بیان بھی باب اول میں سپرد قلم ہو چکا ہے۔

عقیدہ (۱۴) "نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد نہ تو تکالیف شرعیہ (عبادات وغیرہ) ختم کی گئیں نہ ختم کی جائیں گی۔"

مگر اسماعیلیوں میں سے معمریہ، منصوریہ، اور جمیریہ فرقوں کا عقیدہ ہے کہ امام وقت کے حکم سے یہ تمام تکالیف شرعیہ اٹھائی اور منسوخ کی جا سکتی ہیں، چنانچہ ابوالخطاب نے جس کا نام معمر تھا، (معمریہ اس نسبت سے اس فرقے کا نام ہے) اپنے ماننے والوں کے ذمہ سے تمام تکالیف کو اٹھا دیا اور تمام حرام چیزوں اور باتوں کو حلال کر دیا فرائض کے ترک کر دینے کا حکم جاری کیا۔

منصوریہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی امام سے ملاقات ہو گئی تمام تکالیف خود بخود اس کے ذمہ سے ساقط ہو گئیں اب وہ مادر پدر آزاد ہے، جو چاہے کرے، کیونکہ ان کے نزدیک جنت امام ہی کا نام ہے اور جنت میں پہنچ جانے پر کوئی تکلیف باقی نہیں رہتی!

جمیریہ کہتے ہیں کہ امور شرعیہ (دین) حجت وقت کے سپرد ہیں، تکالیف شرعیہ کا معاف کرنا یا ان میں کمی بیشی کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ حسن بن ہادی بن نزار بن مستنصر نے جو پانچویں صدی ہجری میں گزرا اور جس کو یہ لوگ "حجت وقت" جانتے اور مانتے ہیں، تکالیف شرعیہ کو کسی مصلحت کے تحت ساقط کر دیا تھا، اور تمام حرام چیزوں کے حلال ہونے اور فرائض کو چھوڑ دینے کا حکم نافذ کر دیا تھا۔

عقیدہ (۱۵) "کسی امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ شرعی احکام میں سے کوئی ادنیٰ سا حکم بھی منسوخ یا تبدیل کر سکے۔"

مگر اثنا عشریہ، بلکہ سارے ہی امامیہ اور جمیریہ اس کے قائل ہیں کہ امام کو ایسا کرنے کا حق ہے،

ان لوگوں کا یہ عقیدہ عقلاً بھی غلط ہے، کیونکہ امام کا بحیثیت نائب نبی یہ کام ہے کہ وہ نبی کی شریعت کو پھیلائے اس کی تعلیم کو رائج کرے اس پر عمل درآمد کی نگرانی کرے اگر اس کو ان احکام میں ردو بدل کا کوئی حق ہو گا تو وہ نائب پیغمبر تو نہ ہوا مخالف پیغمبر ہو گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ شارع (شریعت بنانے والا) نہ نبی ہے نہ امام بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ خود ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے، شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا، تمہارے لئے وہ (بات) دین مقرر کی گئی جس کا نوح کو حکم کیا گیا تھا، یا ارشاد ہوا لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا۔ (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے گھاٹ اور راہیں مقرر کیں) اور پھر جا بجا ان لوگوں کے حق میں جنہوں نے اپنی سمجھ اور عقل سے بحری اور جنگلی (حلال جانوروں) اور دوسری کھائی جانے والی حلال چیزوں کو حرام ٹھیرایا یا مردار اور اس جیسی حرام چیزوں کو حلال

قرار دیا قرآن مجید میں عام الفاظ میں ان پر عتاب فرمایا جس میں بلا تخصیص دوسرے بھی شامل ہیں،

پس جب نبی ہی کو کوئی حکم منسوخ کرنے کا حق نہیں تو امام کو یہ حق کہاں سے اور کیسے ملے گا ورنہ تو پھر امامت نبی کی نیابت نہ ہوئی بلکہ الوہیت میں شرکت ہو گئی،

اپنے اس عقیدہ بالا کے ثبوت میں بھی اثنا عشریوں نے ائمہ سے چند بناوٹی اور من گھڑت روایات نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت وہ ہے جو محمد بن بابویہ قمی نے ابی عبداللہؒ سے کی ہے، اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی آخَا بَیْنَ الْاَرْوَاحِ فِی الْاَزَلِ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ الْاَجْسَادَ بِاَلْفَیْ عَامٍ فَلَوْ قَدْ قَامَ قَائِمُنَا اَھْلِ الْبَیْتِ وَرِثَ الْاَخَ مِنَ الَّذِیْ آخَا بَیْنَھُمَا فِی الْاَزَلِ وَلَمْ یُوَرِّثِ الْاَخَ مِنَ الْوِلَادَۃِ۔

"آپ نے کہا کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے اجسام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل روحوں میں بھائی چارہ کرایا تھا، اگر اہل بیت میں سے کوئی حاکم ہو تو وہ اپنا وارث اس بھائی کو ٹھیرائے جس سے ازل میں بھائی چارگی پیدا ہو چکی ہے، ماں کے پیٹ کے بھائی کو وارث نہ بنائے"

اس روایت کے غلط اور جھوٹ ہونے پر صاف دلیل یہ ہے کہ تکالیف شرعیہ کا تعلق چونکہ عام لوگوں سے ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کا مدار ان ظاہری علامات اور واضح امور پر ہو جن تک انسانی علوم کی رسائی ہو سکے مثلاً پیدائش و نکاح کے سلسلہ کی قرابت؛ اس کے خلاف ازلی بھائی چارگی تو ایسی بات ہے کہ کسی پہلو سے بھی اس تک عقل کی رسائی نہیں مثلاً یہ کیسے معلوم ہو کہ اس قسم کی اخوت کس کے ساتھ ہے؛ اس کی جگہ کہاں ہے؛ اور اس ازلی بھائیوں کی تعداد کیا ہے، اور یہ کہ اخوت میں قرب و بعد کے لحاظ سے ان کے مراتب کیا ہیں، تاکہ بعض کو بعض پر ترجیح دی جا سکے اور ضعیف کو قوی کے مقابلہ میں محروم کیا جائے، اگر اس بارے میں ہر ہر فرد سے متعلق امام کا حکم صریح تلاش کیا جائے تو یہ بھی ناقابل عمل بات ہے لہذا میراث کا معاملہ تو اس صورت میں نفاذ پذیر ہی نہ ہو سکے گا۔ پھر تو لوگوں کے تمام اموال بحق بیت المال ضبط کئے جانے کے لائق ہو گئے۔

ساتواں باب

امامت کا بیان

معلوم رہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کے وہ مسائل جو مختلف فیہ ہیں ان میں پہلا مسئلہ یہ ہے۔

مسئلہ (۱):۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ مکلفین کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک رئیس (خلیفہ، امیر) کا انتخاب کریں اور پھر شریعت کی روشنی میں اس کی اتباع اپنے اوپر لازم جانیں، اور شرعی امور میں اپنے رئیس کی ہر طرح مدد اور اعانت کریں یوں تو ہر فرقہ اپنے فطری جذبہ کے تحت اپنے لئے ایک رئیس منتخب کرتا ہے مگر شارع نے ایسے رئیس کے لئے اوصاف اور شرائط و لوازمات متعین اور بیان کر دیئے ہیں تاکہ ان شرائط و لوازمات کی وجہ سے ریاست فساد و بدانتظامی کا شکار نہ ہو۔ اور یہی شریعت کا قانون ہے اس کا انسان کے فطری امور کی تعیین و تخصیص

میں کوئی دخل نہیں بلکہ ان امور کے عموم اوصاف اور شرائط ولوازم ان کی وضاحت کرتا ہے، جو صلاح و فلاح عالم کا باعث ہوں اور جن سے انتظام کی حفاظت میسر ہو۔

اور تعیین و تخصیص کو عقل کے حوالہ کیا گیا ہے خواہ وہ عقل انفرادی یعنی شخص متعلق کی ہو یا عقل اجتماعی کنبہ برادری یا پنچایت کی۔

مثلاً نکاح کے بارے میں یہ تو بیان کیا گیا ہے کہ جس سے نکاح کیا جائے اس میں کیا اوصاف ہوں اور شرائط نکاح مثلاً کفاءت وہم نسبی، ولایت شہادت اور مہر نیز اس کے لوازمات مثلاً نان ونفقہ جائے رہائش وغیرہ مگر منکوحات کی تعیین سے مثلاً فلاں سے فلاں کا نکاح ہو اور فلاں سے فلاں کا کوئی تعرض نہیں کیا گیا اس کو عقل انفرادی یا اجتماعی کے حوالہ کر دیا گیا ہے،

اور یہی حال تمام معاملات کا ہے، بلکہ دینی امور میں بھی یہ تو فرمایا گیا ہے کہ :- فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اگر تم نہ جانتے ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھ لو) مگر اہل علم و مجتہدین کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی کہ فلاں عالم یا مجتہد سے پوچھو۔

ہاں اگر پیغمبر علیہ السلام کی زندگی و موجودگی میں کسی شخص میں ریاست کبریٰ کی قابلیت حاصل ہوئی یا اس کو فتویٰ و اجتہاد کا درجہ نصیب ہوا اور پیغمبر علیہ السلام کو بذریعہ وحی یا رسائی طبع یا قرائن سے اس کا علم ہوا پھر آپ نے اس شخص کے استحقاق واہلیت کو بیان فرمایا تو پھر اس کے کیا کہنے یہ تو نورٌ علیٰ نور کا معاملہ ہو گیا، جیسا کہ خلفائے اربعہ اور بعض دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہوا۔

اس مسئلہ میں امامیہ اختلاف کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ رئیس عام کا مقرر کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہے حالانکہ الٰہیات کے باب میں گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کے واجب ہونے کے کوئی معنے نہیں یعنی اس پر کوئی چیز واجب ولازم نہیں بلکہ اس پر کسی چیز کا واجب ہونا اس کی الوہیت اور ربوبیت کے منافی ہے،

بلکہ تمام تکلیفات سیاست، مثلاً نظام سیاست کا اجراء، دشمنوں سے جہاد عسکری تیاری مال غنیمت، خمس فیٔ کی تقسیم، احکام کا نفاذ وغیرہ وغیرہ رئیس عام کے وجود سے وابستہ ہیں۔ تو پھر اس کا تقرر انہیں کے ذمہ ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ پر اسے کیوں واجب ولازم کیا جائے۔ اس لئے کہ واجب کا مقدمہ (پیش خیمہ) اسی پر واجب ولازم ہوتا ہے جس کی طرف اس واجب کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے نہ کہ کسی دوسرے پر! مثلاً وضو کرنا ستر کو چھپانا قبلہ کی سمت رخ کرنا کپڑے، جائے نماز کا پاک رکھنا، جو تکلیفات دینیہ و شرعیہ ہیں، یہ سب نمازی کے ذمہ ہیں اللہ تعالےٰ کے ذمہ نہیں،

لہٰذا امام وخلیفہ اور رئیس کا مقرر کرنا جو بہت سے واجبات کا پیش خیمہ ہے جو مکلفین پر واجب ہیں تو یہ بھی ان مکلفین ہی پر واجب ہوگا نہ اللہ تعالیٰ پر!

اور اگر اس معاملہ میں ذرا غور سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رئیس کا تقرر بہت سے فسادات کا سبب ہے، اس لئے کہ اہل عالم کی آراء اور نفوس انسانی کی خواہشات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا پورے عالم کے لئے دائمی تابقائے دنیا امام وحاکم کی حیثیت سے تقرر فتنوں کو ہوا دینے کا باعث ہوگا۔

اور بے اختیار رکھنے پیدا ہو سکتے ہیں ایسا کرنا امر امامت کو لغو و بیکار کر دینے کا سبب ہوگا۔ اور سرکشوں کے غلبہ کا باعث ہوگا۔ اور خود صاحبان امر کے مایوس ہو جانے اور تقیہ کرنے کا سبب ہوگا۔ بلکہ ان کو معرض خطر و ہلاکت میں ڈالنے کا باعث کیونکہ ان حالات میں یہ حضرات رؤساء، امراء ہر دم خوف زدہ، دبے دبے اور چھپے رہیں گے، چنانچہ جن حضرات کے بارے میں یہ امامت کا اعتقاد رکھتے ہیں، وہ حالات مذکورہ بالا سے دوچار ہوئے نہ کھل کر حکومت کر سکے نہ نفاذ احکام کی جرأت ہوئی نہ لوگوں میں نظم و ضبط قائم کر کے فتنوں کا سدباب کر سکے۔

بلکہ وہ تو اتنے مجبور اور دبے رہے کہ ان لوگوں کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکے جو علی الاعلان ان پر افتراء اور بہتان کے طومار باندھتے اور اس جھوٹ و جعلسازی کو دھڑلے سے دنیا میں پھیلاتے رہے، وہ تقیہ فرما کر گوشہ نشین رہے! اور کاروبار وہ لوگ چلاتے رہے، جو اہل نہ تھے۔

تقرر امامت و خلافت کو لطف خداوندی کہہ کر اس کو خدا کے ذمہ کرنے کی بات گو ایسی ہے کہ سرسری عقل اس کو باور کر لیتی ہے، مگر غور و فکر اس کو کبھی گوارا نہیں کرتے،

ہاں رئیس کا تقرر اس شکل اور اس شرط کے ساتھ ضرور لطف الٰہی قرار پا سکتا ہے کہ امام و حاکم کی تائید کی جائے نصرت و اعانت کے ساتھ اس کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں اور اس کو غلبہ و برتری حاصل رہے، اس کے دشمن اور مخالف خائب و خاسر، ذلیل و رسوا رہیں ورنہ تو وہی فتنہ، فساد، غدر و بغاوت گلے کا ہار بنتے ہیں اور جب تائید کے بجائے سازش ہو اور غلبہ کے بجائے مقہوری مقسوم ہو تو پھر اس منصب کو لطف کہنا خلاف عقل ہی نہیں عقل کا ماتم ہے،

اس سلسلہ میں امامیہ بطور جواب یہ کہتے ہیں کہ امام کا وجود ایک مہربانی (لطف) ہے، اور اس کی مدد کرنا با تصرف و اختیار سے نوازنا دوسری مہربانی۔ اور غلبہ و تصرف اگر حاصل نہ ہو تو یہ بندوں کا قصور اور ان کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے اماموں کو اتنا ڈرایا دھمکایا کہ ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اظہار امامت سے پہلو تہی کرنے لگے رفتہ رفتہ نوبت غیبت کبریٰ کی آ گئی، اور پھر سوائے نام و نشان کچھ نہ رہا، لہٰذا جب بندوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے ان کی مدد چھوڑ دی تو اس میں خدا کے ذمہ کی کیا قباحت لازم آئی۔ اور دشمنوں سے چھپنا یا ان سے خوفزدہ ہونا تو انبیاء اور اوصیا کی خاص سنت ہے، چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی کفار کے خوف سے غار میں پوشیدہ رہے،

امامیہ کے اس جواب میں ان مقدمات سے سراسر غفلت اور چشم پوشی برتی گئی ہے جو اعتراض میں ذکر کئے گئے تھے، اس لئے کہ کہا یہ گیا تھا کہ امام کا وجود بشرط تصرف و نصرت نہ ہوگا تو نتیجہ وہی فساد ہوگا، لہٰذا جواب میں مجیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان فسادات کے لزوم کی دلیل کے ساتھ تردید کرے، اس کے بغیر وہ جواب محض بک بک ہوگا اور یہاں مجیب کے اس جواب میں فسادات کے لزوم و عدم پر توجہ ہی نہیں دی گئی،

اور بندوں کی مدد ترک کرنے کی جو بات کہی ہے، وہ بھی ناقابل تسلیم ہے، اس لئے کہ اہل سنت اور شیعوں خصوصاً زیدیوں، واقفیوں، اور ناؤسیوں اور افطحیوں کے مورخین میں سے کسی نے نہ یہ لکھا نہ اس کا ذکر کیا، ملوک و سلاطین میں سے کسی نے بھی اپنے امام وقت کو ڈرایا ہوتا اور پھر ایسا ڈرایا جو چھپنے کا سبب ہو وہ ڈرانا تو قتل ہی کا ہو سکتا ہے، اور ائمہ کے لئے قتل کی دھمکی نہ چھپنے کا سبب ہے نہ خوف کا بلکہ وہ دھمکی تو ان کے لئے بے معنی اور

فضول سی بات ہے، اس لئے کہ ائمہ تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں، جب موت ان کی اپنی مرضی پر موقوف ہوئی تو پھر قتل سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں، جب تک ان کی مرضی نہ ہو کوئی ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا چنانچہ کلینی نے اس قاعدہ کو بہت سی روایات سے ثابت کیا ہے اور اس کے لئے ایک مستقل باب علیحدہ سے باندھا ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ ائمہ، حکم الٰہی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تو ان کی یہ روپوشی بھی حکم خداوندی کے مطابق ہوگی اور یہ روپوشی بھی حکم الٰہی سے ہوئی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت گزر گئی، اور ان کی روپوشی کے دوران اتنا بڑا فساد اور انقلاب رونما ہو گیا کہ دین وایمان کی نہ صرف شکل ہی بگڑ گئی بلکہ اس کا شیرازہ اتنا پریشان اور ایسا بکھرا کہ اس میں اصلاح کی بھی گنجائش نہ رہی تو یہ منصب لطف کہاں رہا۔ دوسری بات یہ کہ جب ان کی روپوشی امر الٰہی سے ثابت ہو گئی تو ان انبیاء واوصیا کو آپ کیا کہیں گے جو روپوش نہ ہوئے، بلکہ ثبات قدمی کے ساتھ دین وایمان کے بقا وسلامتی کی خاطر اپنی جان دیدی۔

مثلاً حضرت یحییٰ علیہما السلام اور حضرت سبط نبی حسین رضی اللہ عنہ، یہ تو پھر آپ کے خیال وعقیدہ کے مطابق نعوذ باللہ واجب کے تارک ہوئے،

اچھا آپ اگر اسے یعنی روپوشی کو واجب نہیں مندوب ومستحب ہی کہیں تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ روپوش ہونیوالے حضرات نے ایسے امور کا ترک کیا جو یقیناً ان کے لئے واجب تھے مثلاً اقامت دین اور تبلیغ احکام تو ایک مندوب ومستحب کام کی خاطر ترک فرض وواجب کیا ان ذی شان حضرات کے شایاں شان تھا؟ یہ بات تو ان حضرات کے لئے پچھلی بات سے بھی زیادہ سخت ہوگی،

اور اگر پیچھا چھڑانے کے لئے کوئی یہ کہے کہ امر الٰہی مختلف نوع پر آئے تارکین کے حق میں تو وہ مندوب ومستحب تھے اور روپوشوں کے حق میں وجوب وفرضیت کی شان ہیں تو پھر یہاں بھی یہ اشکال رہا کہ ہر دو میں سے کسی ایک فریق کے لئے اللہ تعالیٰ نے ترک اصلح کیا اور یہ صورت بھی شیعوں کے نزدیک غلط اور باطل ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ ائمہ کی روپوشی قتل کے ڈر سے تو نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جیسا کہ ابھی ہم سطور ماسبق میں بتا چکے ہیں کہ ائمہ بمرضی خود فوت ہوتے ہیں ان کی مرضی کے خلاف کوئی انہیں موت سے ہمکنار نہیں کر سکتا اور اپنی مرضی وپسند کی موت خوف وڈر کا باعث نہیں ہوا کرتی۔ تو پھر ڈر اور خوف کا سبب کوئی جسمانی ایذا ہوگی لیکن اس میں یہ خرابی ہے کہ گویا ائمہ عبادات ومجاہدات اور صبر ومشقت کے اجر جزیل سے بھی اباد نفور کرتے ہوں گے کیونکہ خدا کی راہ میں اذیت ومشقت کی برداشت تو اپنے اندر بہت بڑے اجر وثواب رکھتی ہے اور جہاد تو نام ہی سزا یا مشقت کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کے بلندی درجات مسلم الثبوت ہیں،

اور پھر ائمہ تو بڑے بلند مراتب کے لوگ ہیں، ان کی عبادات تو عام بندوں سے اعلیٰ وارفع ہوتی ہے اور ان میں خاص طور پر صاحب الزمان کا چھپنا تو بالکل ہی ناقابل فہم اور بے معنی بات ہے اس لئے کہ ان کو تو یقین سے یہ بات معلوم ہے کہ جب تک عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے نزول تک زندہ رہوں گا نہ مجھے موت آسکتی ہے نہ کوئی مجھے مار سکتا ہے اور یہ میں تو سر بر آرائے سلطنت شرق وغرب ہوں گا تو وہ کیسے اور کیوں مخالفین اور دشمنوں کی طعن وتشنیع اور تخویف وتکذیب کی وصولیس میں آگئے وہ ان سے کیوں ڈرتے ہیں، اور کھلم کھلا علی الاعلان دین کی دعوت اور اس کی اقامت کا

فریب نہ کھیں اور انہیں کرتے۔ اور ان بزرگوں کی مصیبت و شکست کیوں برداشت نہیں کرتے اور ان بزرگ کے ائمہ سابقہ خصوصاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے طرز کے کیوں خلاف کرتے ہیں کہ وہ صابر اور ثابت قدم رہے کہ ظالموں اور ناہنجاروں نے ان کو ستایا اور خود ان کو یہاں تک کہ بالآخر نوبت شکست و خروج تک آگئی مگر وہ ڈٹے رہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ بجا لاتے رہے۔ ان کو تو اپنی جان و عمر کی بھی پرواہ نہ تھی۔ حالانکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ ان کا استیلا اور تسلط ہو گا بھی کہ نہیں، انہوں نے نہ صرف ادائے فرض اور رضائے الٰہی کی خاطر ہر قسم کی اذیت اور تکلیف خواہ بدنی تھی یا مالی، بخندہ پیشانی برداشت کی۔ اور اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔

انہیں اور اس جیسی نرمی عقلی باتوں اور فہم و دانش کی گفتگو سے آگاہ ہو کر ہی شریف مرتضیٰ اپنی کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ میں لکھا ہے کہ صاحب الزمان اور ان کے آبائے کرام کے مابین فرق ہے اور وہ یہ کہ ان کو تو اس بات کا پتہ ہے کہ وہ مہدی قائم ہیں۔ اور نیزہ و سنان، تیغ و تفنگ کے دھنی ہیں، دشمنوں کو زیر و زبر کر کے رہیں گے اور ظالمین سے انتقام لینے والے ان کے ائمہ دولت کو صفحہ ہستی سے مٹانے والے لہٰذا ان کو وہ خوف و ڈر ہے جو دوسروں کو نہیں تھا،

مگر شریف مرتضیٰ کی گفتگو بڑی گفتگو ہی ہے، بلکہ جنون کی بڑ اور یاوہ گوئیوں کی تکرار بھی کہیں زیادہ ہے اس سے زیادہ صاحبان عقل و شعور اسے کوئی عنوان نہیں دیں گے کیونکہ کتنی مرتبہ یہ بات دہرائی گئی ہے کہ ان کو اپنے قتل کا ہرگز خوف نہ ہونا چاہئے ان کو یہ یقین ہے کہ مجھ کو کوئی قتل نہیں کرے گا میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے ملاقات کروں گا۔ ان کی نماز کی امامت کروں گا دجال سے نبرد آزما ہوں گا، لوگوں کو چار و ناچار عبادت پر لگا دوں گا اپنے اور اپنے اسلاف کے دشمنوں سے پورا پورا بدلہ لوں گا۔ پھر ان تمام امور سے نمٹ کر طبعی موت مروں گا۔

تو پھر ان اسباب امن و اطمینان کو کیوں خاطر میں نہیں لاتے، اسباب خوف کو ہی جو محض وہم کی پیداوار ہیں، کیوں ہر دم پیش نظر رکھ کر کیوں اپنے آپ وسواس کرتے ہیں! حالانکہ حقیقت میں یہ اسباب خوف بھی بالکل خلاف واقعہ ہیں۔ کیونکہ صاحب الزمان تو امام ہیں ان کو تو جو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے سب کا علم ہو گا۔ اور کم از کم زمان غیبت میں کسی شیعہ سے جس کی ان تک رسائی ہو گئی ہو گی سنا ہو گا کہ مخالفین ان کے دعویٰ مہدویت کو ہزار سال سے زائد مدت تک طول کھینچنے کو قبول و تسلیم نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ مخالفین کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ آثار قیامت تیسری ہجری سے بارہ سو برس گزر جانے کے بعد نمودار ہوں گے، ان کے مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ مہدی صدی کے اوائل میں ظہور کریں گے وسط صدی میں نہیں اور یہ ظہور بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متصل ہو گا۔

کچھ زمانی فاصلہ سے کر نہیں، اور ان کے سر پر وقت ظہور ابر کا سایہ ہو گا سرداب سر من رائے کا نہیں۔ ان کے ظہور کی جگہ مکہ مکرمہ کا حرم شریف ہو گا، سر من رائے نہیں،

اور امامت کا دعوے عمر کے چالیس سال گزرنے کے بعد کریں گے، بچپن یا بڑھاپے میں نہیں۔

لہٰذا مذکورہ علامات و نشانیوں کے برعکس ظاہر ہو جائیں اور کسی وقت علماء و مشائخ کے بھیس میں دین کی دعوت اور احکام شرع کی تبلیغ کریں اور کرامات دکھائیں تو یقین ہے کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے گا خصوصاً شیعہ کہ وہ تو دل و جان سے اس کے متمنی اور شیدائی ہیں، اور خدا سے اس کے لئے مرادیں مانگتے رہتے ہیں۔

نیز ان کو یہ خبر نہیں ملی ہوگی کہ باقریہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مہدی موعود تو جناب باقر ہیں، اور ناؤسیہ یہ ہانکتے ہیں کہ اس منصب پہ جناب جعفر صادق فائز ہیں، اور فطحیہ اس مسند پر موسیٰ بن جعفر کو بٹھاتے ہیں، اور ان لوگوں کے یہ دعوے امت میں شائع اور مشہور ہیں، پھر بھی ان بزرگوں کے پیچھے کوئی نہیں پڑا۔

اور نہ مہدویت کی وجہ سے کسی نے ان کو ڈرایا دھمکایا تو صاحب الزماں کو کیوں ڈرائیں گے، اور ان کے پیچھے کیوں پڑیں گے۔ اسی طرح جونپور کے سید محمد نے بیانہ دہلی مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اور افغان، دکن، اور راجپوتانہ کے ایک ہجوم غفیر نے اپنا لقب مہدویہ رکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا اور ان کا اتباع کیا۔ اور کسی نے بھی ان کو قتل نہیں کیا۔ نہ کوئی سزا دی۔

خصوصاً ۹۰۵ھ؁ کہ عراق و خراسان پر خاندان صفوی کا تسلط ہوا ادھر دکن میں سلاطین بہمنیہ اور عادل شاہیہ جو مذہب شیعیت میں صد درجہ شدت اور غلو رکھتے تھے برسر اقتدار آئے اور ہند و سندھ اور بنگال جو اس عہد میں بظاہر نور جہانگیر بادشاہ کے زیر نگیں لیکن دراصل نور جہاں کے زیر نقاب تھے، اس لئے کہ حکمرانی درحقیقت اس کے عراق و خراسانی اقارب کر رہے تھے، اور امراء و وزراء اور صوبہ دار کٹر شیعہ تھے۔ تو ایسے زریں موقعہ کو کیوں ہاتھ سے جانے دیا اور اسی وقت ظہور کیوں نہ فرمالیا، اور اپنے دوستوں کو محض بے بنیاد وہم کی وجہ سے ماوراء النہر کے خانوں اور روم کے قیصروں کے لطف و کرم اور فوائد سے کیوں محروم رکھا یہ ان سے کون کہتا تھا کہ آپ اپنے ان علاقوں کو چھوڑ کر جو ان کے شیدائیوں اور جاں نثاروں سے بھرے پڑے ہیں، بخارا و سمرقند یا اسلامبول میں ظاہر ہوں اور خواہ مخواہ لوگوں کے ڈراوے اور خوف کا شکار ہوں کیا ان کو یہ وسیع ممالک اور کشادہ زمین مناسب نظر نہ آئی؟۔

اور شریف مرتضیٰ نے جو یہ کہا ہے کہ صاحب الزماں شروع شروع میں دوستوں سے تو مل ملا لیتے اور ان پر ظاہر ہو جاتے، صرف دشمنوں ہی سے چھپے رہتے تھے مگر بعد میں دوست دشمن سب ہی سے غائب ہو گئے خطرہ یہ تھا کہ نادان دوست، ”دانا دشمنوں“ پر ان کے راز فاش نہ کر دیں، اور یوں دشمنوں کو بھڑکانے کا ذریعہ نہ بن جائیں،

یہ ایسی فسانہ طرازی ہے جس سے شاید تاریخ سے ناواقف لوگوں کو تو فریب دیا جا سکے، لیکن تاریخ دان تو اس ”انکشاف“ کو خندہ استہزاء سے زیادہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں کسی بھی مورخ نے آج تک کبھی یہ نہیں لکھا کہ کوئی گروہ یا جماعت محمد بن حسن عسکری کی تلاش میں سراغرساں بنی گھروں میں تانکتی جھانکتی پھری ہو یا اس وقت ان کی جستجو بغداد یا سر من رائے یا لوگوں میں موضوع گفتگو بنی ہو یا اس زمانہ کے خلفاء و ملوک کے دل میں اس کا خیال بھی آیا ہو، سوائے اثنا عشریہ کے انہوں نے البتہ ان کی غیبت کی توجیہ کرتے وقت یہ موہوم اور فرضی احتمالات ذکر کیے ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی نہ ان سے واقف نہ آشنا۔ بلکہ اب تک تاریخ اس بات کا ثبوت دینے سے قاصر ہے کہ اس میں کہیں یہ ذکر بھی آیا ہو کہ جناب حسن عسکری کے گھر اس شکل و شباہت اور اوصاف کا کوئی بچہ پیدا ہوا جس کو مہدی موعود جان کر لوگ اس کے درپے آزار اور درپے قتل ہوئے ہوں،

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ان بزرگوار کی غیبت صغریٰ کا عرصہ ستر سالوں سے زیادہ رہا اس دوران اس عہد کے کئی خلفاء و ملوک سب ختم ہو گئے ان کی سلطنتیں خراب و خیال ہو گئیں تو اس بات کو کون عقلمند درست و صحیح مانے گا کہ ان خلفاء و ملوک کے عہد میں چار یا پانچ سال کا ایک بچہ امامت کا دعویٰ کرتا ہے، اور پھر اپنے دعویٰ

کے مطابق معجزہ بھی پیش کرتا ہے اور اسی وقت سے اس عصر کے ملوک و خلفاء و امراء اس کی تکذیب کر کے اس کے ڈرانے اور ایذا رسانی کے درپے ہو گئے ہوں، جگہ جگہ جاسوس منتشر کر دیئے ہوں اور پہرا بٹھا دیئے ہوں اور سینکڑوں برس گزرنے کے باوجود بھی ان خلفاء و ملوک کے جانشین اس کی تلاش سے نہ تھکے ہوں نہ نچلے بیٹھے ہوں بلکہ پیش از پیش تندہی سے تلاش و تجسس میں ہی لگے رہتے ہوں، ایسی صورت میں بار بار روپوشی اور غیبت کو جائز کا عذر کیسے قابل پذیرائی ہو سکتا ہے،

اور پھر یہ وہم بھی ایسے زمانہ میں جب کہ کوئی ان عالی مقام کی ایذا رسانی کا خواہاں نہ ہو مثلاً یہی صفر یہ کہ اس دور میں تو لوگ ان کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے ہوئے تھے، ان کے دیدار کے مشتاق تھے، جان و مال اس مجرب سہارے کی آمد پہ نثار کرنے کے لئے کمربستہ تھے اور سب کے سب ایک زبان ہو کر نالہ و زاری فریاد و فغاں میں مشغول رہ کر یہ ا لگا رہے تھے کہ امام زماں ہماری فریاد سنو اور اپنی زیارت سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی کیجئے اور یہ کوئی یکہ و تنہا فرد بھی نہ ہو بلکہ مور و ملخ کی ایک جماعت اور جم غفیر ہو، اس پر بھی یہ حضرت محض چند تورانی اور رومی اور باشوں کے ڈر سے اس قدر بزدلی سے کام لیتے ہوئے خود کو ظاہر نہ کریں بلکہ روز بروز پہلے سے بھی زائد چھپنے اور پوشیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوں تو ان امام عالی مقام کا یہ عمل درجہ امامت کے عدد رجہ منافی ہوگا، کیونکہ امامت کی بنیاد تو دلیری و بہادری پہ استوار ہے،

باوجود اس کے کہ جان کا خوف بالکل نہیں ہے کہ خود کی درازی عمر کا علم ہے اس لئے کہ اثنا عشریہ کے نزدیک گزشتہ و آئندہ کا علم ان کے لئے لازمی ہے تو ان کو شیعوں کا آشیانہ ملک عراق و خراسان، ہندو سندھ خصوصاً پورب اور بنگالہ، دکن، لکھنؤ و فیض آباد میں ان کو بالتفصیل معلوم ہوگا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے مخلص معتقدوں کے پاس کتنی فوجیں اور آلات حرب و ضرب ہیں، اور انگریزوں سے کتنی زبردست ساز باز ہے یہ سب ہی ان پر منکشف ہوگا ان سب حالات کے ہوتے ہوئے بھی خود کو روپوش رکھنا اور ڈرنا کہ کہیں مجھ کو بھی مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کوئی دھوکہ سے قتل نہ کر دے حالانکہ مارا جانا مقدر نہیں تو آخر کس معقول عذر پر محمول کیا جا سکتا ہے،

اور پھر سراست رسالت و دین میں بیشتر انبیاء اولیاء گذرے، ان کے دشمن بھی ہوئے اور وہ درپے آزار بھی رہے بلکہ ہتک عزت کے ساتھ ساتھ جسمانی آزار و نقصان پہنچانا بھی اور ان کو ہلاکت تک پر قدرت پا گئے، اس پر بھی ان حضرات نے اپنے جسم کو مصائب پر قربان کر دیا اور صبر کو اپنی ہمت کا پیش خیمہ بنایا اور چھپنے یا روپوش ہونے یا میدان عمل سے بھاگنا گوارہ نہ کیا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے، وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (اور بہت سے نبی ایسے ہیں کہ اللہ والوں نے ان کی معیت میں جہاد کیا اور اللہ کے راستہ میں ان کو جو کچھ در پیش ہوا اس پہ نہ وہ سست پڑے نہ کمزوری دکھائی نہ فریاد و التجا کی اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے) حالانکہ ان حضرات کو نہ اپنی موت پہ اختیار تھا. نہ اپنی درازی عمر غلبہ و تسلط کا یقین تھا۔

سارے ہی شیعوں کا یہ دینی طرز عمل حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ غم اور فکر کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کفار و مشرکین کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے جب کہ آیت واللہ یعصمک من الناس وانہ تعالیٰ

لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا، کا مژدہ سمع مبارک نبوی تک نہیں پہنچا تھا تو ان کو قابل طعن نظر آتا ہے، اور وہ اسے بزدلی کہتے ہیں مگر اس سخت خوف کو جو بزدلی کی حدوں سے بھی کئی درجہ بڑھا ہوا ہے، خود اپنے خیال خام میں امام زماں کے بارے میں ثابت کرتے ہیں اور انہیں ہوش نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس کے متعلق کہہ رہے ہیں بات دراصل فہم و فراست کی نہیں تعصب اور اندھے پن کی ہے، اور طرز فکر کی بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسروں پہ وہ بات تھوپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، جو ان کے اپنے بزرگواروں کے قامت پر راست آتی ہے،

ان مسکینوں کو یہ پتہ نہیں کہ غم چیزے دیگر ہے اور خوف شے دیگر اور بزدلی ان دونوں ہی سے الگ چیز ہے۔

ابن مطہر حلی نے کہا ہے۔ اَلْجَبَانُ لَا یَصْلُحُ لِلْاِمَامَۃِ (بزدل امامت کا مستحق نہیں) اور یہ حقیقت بھی یہی ہے اس لئے کہ اس سے مقاصد امامت حاصل نہیں ہوتے اب اگر وہ غم اور خوف کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارنے سے انہیں کون روک سکتا ہے اس لئے کہ امامیہ کے تمام راویان اخبار نے ابی حمزہ سے اور اس نے علی بن حسین رحمہ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے،

قَالَ اَبُوْحَمْزَۃَ قَالَ لِیْ عَلِیُّ بْنُ حُسَیْنٍ کُنْتُ مُتَّکِئًا عَلَی الْحَائِطِ وَاَنَا حَزِیْنٌ مُتَفَکِّرٌ اِذْ دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ حَسَنُ الثِّیَابِ طَیِّبُ الرَّائِحَۃِ فَنَظَرَ فِیْ وَجْہِیْ قَالَ مَا سَبَبُ حُزْنِکَ قُلْتُ الْخَوْفُ مِنْ فِتْنَۃِ الزُّبَیْرِ قَالَ فَضَحِکَ ثُمَّ قَالَ یَا عَلِیُّ هَلْ رَاَیْتَ اَحَدًا خَافَ اللّٰہَ فَلَمْ یُنْجِہٖ قُلْتُ لَا قَالَ یَا عَلِیُّ هَلْ رَاَیْتَ اَحَدًا سَاَلَ اللّٰہَ فَلَمْ یُعْطِہٖ قُلْتُ لَا ثُمَّ نَظَرْتُ فَلَمْ اَرَ قُدَّامِیْ اَحَدًا فَتَعَجَّبْتُ مِنْ ذٰلِکَ فَاِذَا بِقَائِلٍ اَسْمَعُ صَوْتَہٗ وَلَا اَرٰی شَخْصَہٗ یَقُوْلُ یَا عَلِیُّ هٰذَا الْخِضْرُ۔

ابو حمزہ کہتا ہے کہ مجھ سے علی بن حسین نے فرمایا کہ میں غمگین حالت میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ایک خوش پوشاک شخص جس نے خوشبو بھی لگا رکھی تھی آموجود ہوا اور میرے چہرہ پہ نظریں ڈال کر کہنے لگا کہ تیرے غم کی کیا وجہ اور سبب ہے؛ میں نے کہا کہ ابن زبیر کے فتنہ کا خوف! تو وہ شخص ہنس پڑا، اور کہنے لگا، اے علی کیا تو نے کسی ایسے آدمی کو دیکھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے نہ بچایا ہو، میں نے کہا نہیں پھر اس نے کہا کہ کیا تو نے کسی ایسے آدمی کو دیکھا ہے، کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہو اور اس نے اس کا سوال پورا نہ کیا ہو۔ میں نے کہا نہیں، اب جو میں جواب دے کر دیکھتا ہوں تو وہ شخص میرے سامنے سے غائب تھا، مجھے اس پر بہت تعجب ہوا کہ ناگاہ غیب سے کسی آواز دینے والے نے آواز دی جو میں نے سنی تو لیکن صاحب آواز کو نہیں دیکھ سکتا تھا، کہ اے علیؓ یہ خضرؑ تھے"

اس خبر سے چند مفید مطلب باتیں حاصل ہوئیں۔ اول تو یہ کہ غم اور دشمنوں کا خوف بزدلی کی نشانی نہیں ورنہ جناب سجاد امامت کے مستحق نہ ہوتے جیسا کہ حلی نے بزدل کو امامت کا مستحق نہ مان کر ان کی امامت کی نفی کرنی چاہی ہے۔ جو از روئے اجماع غلط ہے۔

دوسرے یہ کہ ائمہ بھی بعض اوقات حضرت خضر علیہ السلام کی نصیحت، ہدایت، اور تنبیہ کے محتاج رہے ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کا یہ مرتبہ ہے کہ وہ ائمہ کو نصیحت و ہدایت اور تنبیہ کر سکیں،

جب حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق یہ بات تسلیم کر لی گئی تو پھر یہ بات از خود ثابت ہو گئی کہ حضرت خضر علیہ السلام سے افضل نہیں ہیں، نیز بالاجماع یہ بات بھی طے ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام یا تو انبیا علیہ السلام سے باعتبار درجہ

کم ہوتے، یا مساوی، لہٰذا ائمہ کی افضلیت انبیاء کرام پر ثابت نہ ہوئی۔

اب رہا یہ قصہ کہ سید الانام صلے اللہ علیہ وسلم بھی کفار کے ڈر سے غار میں مقیم ہوئے، تو یہ بات مسئلہ سے بالکل بے جوڑ ہے، اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا غار میں قیام دعوائے نبوت کو چھپانے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ آپ اپنے ہجرت کے پروگرام کو کفار سے چھپانا چاہتے تھے کہ وہ اس سے آگاہ ہو کر اس پروگرام میں مزاحم نہ ہوں اور کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کر دیں، اور یہ ماجرا تین راتوں میں ختم ہو گیا کفار آپ کی تلاش سے ہار تھک کر اور کوئی اثر نہ پا کر گھروں واپس لوٹ گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ہجرت مدینہ طیبہ کی جانب روانہ ہو گئے تو آپ کے غار میں تین شبانہ قیام کو ائمہ کی غیبت صغریٰ و کبریٰ پر قیاس کرنا سفاہت ہی کہلا سکتا ہے، ہاں آپ کے اس قیام کے وقت یا مسند شرع و مسند دین، تبلیغ احکام اور اظہار نبوت میں سے کسی بھی چیز کا تعطل پڑتا یا وہ درہم برہم ہو جاتی تو اس پر قیاس درست مان بھی لیا جاتا بلکہ یہاں تو تاریخ و سیرت کی کتابیں موجود ہیں، انہیں اٹھا کر دیکھ لیا جائے کہ وہ کونسی جسمانی و روحانی ایذا و صنف ہے جو ان بدبخت کفار کے ہاتھوں نہ اٹھانا پڑا، اور وجہ موجودات صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ پہنچی ہو، مگر آپ ایک لمحہ کے لئے بھی ادائے فرض اور اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رہے،

اور اگر اس لطیف نکتہ کو کسی کی عقل نارسا اور فہم کج میں بار نہ مل سکے تو اس سے قطع نظر ایک اور ظاہر و بین فرق ان دونوں صورتوں میں ایسا ہے کہ معمولی عقل و شعور رکھنے والا بھی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ اس پوشیدگی میں جو ظہور و غربت و چھپنے، کا پیش خیمہ ہو اور اس اختفاء اور پوشیدگی میں جس کا لازمی نتیجہ گمنامی بجھ جانا اور ترک دعویٰ ہو زمین و آسمان کا فرق ہے، چنانچہ سید الابرار صلے اللہ علیہ وسلم نے تو تین راتوں میں بد اندیشوں کی بیخ و بن اکھاڑ ڈال اور خیر اندیشوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچا دی لہٰذا یہ قیام تو مقصد کے لئے ایک تدبیر تھی،

کہ ارباب عزم ابتدائے عمل میں ان سے کام لیتے ہیں اور حصول مقصد کا بہترین سبب شمار کرتے ہیں، یہ وہ پوشیدگی تو نہیں تھی جس کا فسانہ شیعہ حضرات بنام صاحب الزمان دنیا کو سنا رہے ہیں، کہ ظاہرہ طور پر اس سے بزدلی ہویدا ہے اور وعدے دست برداری اور نعمت امامت سے خود کو دور کرنا صاف آشکارا ہے، انہوں نے اس غیبت کے دوران کس فرقہ و طبقہ کو متاثر تابع اور متفق کیا، کس ملک و سلطنت کی بنا قائم کی!۔

اگر صاحب الزمان کو تین راتوں کے بجائے تین سو سال ملتے اور غار ثور کے بجائے سرداب سر من رائے اور مدینہ منورہ کے بجائے دار المؤمنین قم یا دار الایمان کاشان، اور بجائے انصار نبی کے فارس و عراق کے شیعہ جو انصار سے کثرت سامان میں ہزار گونہ زائد ہیں، اس وقت یہ خبر دار کرتے کہ میں ہر طرح سے چوکس ہو کر امت کی اصلاح احوال کے لئے ظہور کروں گا تو اہل سنت اور دیگر مسلمان ان شرائط کی فراہمی پر ان کو معذور سمجھتے کہ آخر امام کا رتبہ پیغمبر سے تو کم ہی ہوتا ہے مگر ستم ظریفی تو دیکھئے کہ ہزار سال سے زائد گزر گئے، اتنی لمبی مدت ملی اور اکثر بلاد اسلامی میں مذہب کا چرچا ہوا اور وسیع و پر فضا دیار و امصار دوستوں کے قبضے میں آئے اکہ ان میں سے ہر ایک رشک جابرصا اور جابلقا اور حیرت مینوارم ہے۔ اور انصار و اعوان نے وہ قوت پکڑی جو کسی اور مذہب کو نہ ملی۔ اس سب کے باوجود آپ نے ظاہر ہونے کا میلان یا اس کا خیال نہ کیا، اور روز بروز اختفاء اور پوشیدگی میں قدم آگے ہی بڑھتا گیا۔ تو ایسے دشوار پسند اور مشکل طلب امام کے ہاتھوں نہ جانے اور کیا کیا بھگتنا ہے کہ ابتدا ہی میں امت میں طاقت برداشت سے زیادہ تکلیفیں ڈال دیں

یہ تو امامت نہ ہوئی قیامت ہوگئی۔ ان ہی باتوں کو دیکھ اور ان پر غور کرکے متاخرین شیعہ کے شیخ کنز العرفان کے مصنف مقداد نے شریف مرتضیٰ اور متقدمین کے راستہ سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کیا اور کہا۔ اِنَّمَا کَانَ الْاِخْتِفَاءُ لِحِکْمَۃٍ اِسْتَاثَرَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَہٗ پوشیدگی ایک حکمت پر مبنی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب میں اپنے لیے پسند کیا، ظاہر ہے کہ یہ نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس طرح تو ہر چیز کے بارے میں جب اس کو خلاف لطف و مہربانی کہہ سکتے ہیں تو پھر کسی بھی چیز میں لطف ثابت نہ ہوگا مثلاً تقرر امام وغیرہ اور اس احتمال کی وجہ سے شیعوں کا سررشتہ کلام مختل ہو جائے گا کیونکہ ان کی دلیلوں کی بنیاد اسی قول پر تو ہے کہ فلاں امر لطف ہے اور لطف اللہ پر واجب ہے، لہٰذا اس بحث کو غور و فکر سے سمجھنا چاہیے اور پھر اس مردآزما سمندر میں ان کا ہاتھ پاؤں مارنا دیکھنا چاہیے، کہ یہیں سے ان کی عقل و دانش کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مسئلہ (۲): امام کو ظاہر ہونا چاہیے پوشیدہ اور روپوش نہ ہونا چاہیے یہی اہل سنت کا مذہب ہے کہ وہ ظہور کو امامت کی شرط قرار دیتے ہیں مگر شیعہ اس شرط کو نہیں مانتے اور یوں وہ عقل و نقل دونوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں عقل کی خلاف ورزی تو اس طرح ہوتی ہے کہ امام و خلیفہ کے تقرر کی تو غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ سدود و ثغور اور سرداروں کا انتظام کرے، فوجوں اور لشکروں کو تیار کرے اسلام کی قوت کی حفاظت اور نظم و ضبط برقرار رکھے اسلام و شریعت کا بول بالا کرے، اوامر و نواہی کا نفاذ کرے برائیوں اور گناہوں پر لوگوں کو سزائیں دے منتظمین اور افسروں کی تقرری عمل میں لائے اور یہ امور بغیر اس کے کہ امام عالم ظہور میں آئے فساد پیشہ لوگوں پر اس کا رعب و دبدبہ چھا جائے دوسروں پر اس کے نفاذ و قہر کا سکہ بیٹھ جائے اور اس کی حکومت و سلطنت کا اقبال قائم ہو جائے میسر نہیں آسکتے اگر یہ امور حاصل نہ ہوں تو امام کا ہونا نہ ہونا برابر ہے بلکہ بیکار ہے اور کارخانہ قدرت میں بیکار شے کا وجود محال ہے امام و خلیفہ کا ظاہر ہونا عقل کے نزدیک اتنا ظاہر و باہر ہے کہ اہل مذہب امتیں ہی نہیں ہیں بلکہ مذہب مجوسی بھی اسے جانتے ہیں چنانچہ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں انہیں کا یہ قول نقل کیا ہے،

نزیبد بہر پہلوی تاج و تخت ٭ بباید یکے شاہ فرخندہ بخت ٭ کہ باشد برو فرہ ایزدی ٭ بتابد ز گفتار او بخردی

ہر پہلوی کو تاج و تخت زیب نہیں دیتا اسکے لیے تو ایک مبارک بخت کا بادشاہ چاہیے کہ جس سے شان ایزدی ہویدا ہو اور جسکی گفتگو میں عقل کی روشنی جھلکتی ہو، اور نقل کی خلاف ورزی تو یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ اِلٰی قولہ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے ان سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ کیا تھا اور ان کو اپنے پسند فرمودہ دین پر تمکن و اقتدار عطا فرمائے گا اور ان کے خوف کو دور کرکے اس خوف کو امن سے بدل دے گا نیز فرمایا اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کو زمین میں تمکن و قدرت و اختیار عطا کریں تو یہ نظم، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں بھلے کاموں کا حکم کریں برے (اور نامعقول و ناگوار) کاموں سے روکیں لہٰذا معلوم ہوا کہ خلیفہ بنانے کی یہ اغراض و مقاصد ہیں، انکے ذریعہ پسندیدہ دین کا استحکام و اشاعت اہل خیر کی امن و صلاح، نماز یا جمعہ جماعت عیدین کا قیام و التزام زکوٰۃ صدقات کی وصولی اور پھر مستحقین میں اسکی تقسیم اور امر بالمعروف نہی عن المنکر چنانچہ کتاب الجہاد کتاب الاحتساب کتاب الحدود و القصاص والجنایات انہیں دو کلوں (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کی تشریح و تفصیل ہیں، امور مذکورہ کے علاوہ بھی خلافت کے مقاصد ہو سکتے ہیں جیسا کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَابْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہمارے لیے ایک بادشاہ بھیجیے کہ ہم اس کے زیر علم، اللہ کے راستہ میں قتال کریں تو معلوم ہوا کہ بادشاہ و خلیفہ کے تقرر کی ایک غرض جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے پھر ارشاد ہوا وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہدایت کرتے تھے ہمارے حکم کی جب صبر کیا انہوں نے تو معلوم ہوا لوگوں کو ہدایت کرنا اور ان کو ہدایت کرنے میں تکالیف پیش آئیں ان پر صبر کرنا بھی امامت کے لوازمات میں سے ہے۔

قاعدہ عقلیہ یہ ہے کہ، جب کسی چیز سے وہ کام نہ لیا جائے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی یا اس سے کوئی مقصد حاصل نہ ہو تو وہ بیکار ہو جاتی ہے نیز اہل عقل کے نزدیک یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جب کوئی چیز موجود ہو تو وہ اپنے تمام لوازمات کیساتھ موجود ہوتی ہے ورنہ وجود و عدم برابر ہوتے ہیں،

شیعہ عقیدہ عقل و نقل کیخلاف ہونیکے ساتھ عترت کے بھی مخالف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بروایت صحیح بطریق تواتر نہج البلاغہ میں یہ روایت مذکور ہے

اِنَّهٗ قَالَ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بِرٍّ اَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِيْ اِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَيَسْتَمْتِعُ فِيْهَا الْكَافِرُ وَيُبَلِّغُ فِيْهَا الْاَجَلَ وَيَامَنُ فِيْهَا السُّبُلَ وَيُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتّٰى يَسْتَرِيْحَ بِرٌّ وَيُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ۔

آپ نے فرمایا لوگوں کیلئے ایک امیر ضروری ہے وہ نیک ہو یا بد کہ اسکے زیر فرمان مومن کام کرے اور کافر فائدہ اٹھائے اور اسکی حکومت میں اپنی مدت پوری کرے اسکی امارت میں راستے محفوظ و مامون ہوں طاقتور سے کمزور کا حق دلائے نیک امن سے رہیں اور بدوں سے ان کی حفاظت ہو،

اور جناب امیر کے اس کلام کو تقیہ پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ نہج البلاغہ میں اس کی تصریح ہے کہ آپ نے خوارج کی یہ بات لَا اِمْرَةَ (کوئی حکومت نہیں ہے) سنکر یہ کلام فرمایا تھا، اور خوارج کے مقابلہ میں تقیہ کا کیا سوال اور کیا جواز!۔

مسئلہ (۳۳):- امام (خلیفہ) کا علم و اجتہاد میں خطا سے پاک ہونا ضروری نہیں اور ہر گناہ سے معصوم ہونا امامت کی شرط ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ تقرر کے وقت کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو اور صغیرہ پر مصر نہ ہو کیونکہ یہ عدالت کے خلاف ہے، اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے،

مگر شیعہ خصوصًا امامیہ اور اسمٰعیلیہ کہتے ہیں کہ علم میں غلطی سے پاک ہونا اور عمل میں گناہ سے کہ ان کا صدور اس سے ممتنع ہو ان کے نزدیک انبیاء کی طرح امام بھی ہوتا ہے، ان کا یہ عقیدہ بھی کتاب و عترت کے خلاف ہے،

کتاب اللہ کے تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (بے شک اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا کر بھیجا۔) لہذا طالوت واجب الاطاعت امام ہوئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ تھے حالانکہ یہ بالاجماع معصوم نہیں تھے،

بلکہ ان کا جو معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوا اس سے تو ان کی عدالت پر بھی حرف آتا ہے، عصمت تو بعد کی بات ہے، پھر دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے، اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (میں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کر رہا ہوں) تو حضرت آدم علیہ السلام نبوت سے پیشتر ہی خلیفۃ اللہ فی الارض ہو گئے اور بالاجماع ان سے لغزش ہوئی، وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (پس آدم نے نافرمانی کی اپنے رب کی وہ بہک گئے،) اور یہ قصہ خلافت و امامت کے زمانہ کا ہے نبوت کے وقت کا نہیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے، ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى پس اس کے رب نے اس کو چنا، اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت دی،

اور عترت کی مخالفت اس طرح کہ ایک تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ قول جو بحوالہ نہج البلاغہ ابھی مذکور ہوا۔ دوسرے کلینی کی کافی میں بروایت صحیح یہ مذکور ہے کہ جناب امیر اپنے دوستوں سے فرما رہے تھے، لَا تَكُفُّوْا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ اَوْ مَشْوَرَةٍ بِعَدْلٍ فَاِنِّيْ لَسْتُ اٰمَنُ اَنْ اُخْطِئَ الخ۔ (تم حق بات کہنے سے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو، کیونکہ میں مطمئن نہیں ہوں کہ غلطی مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتی)، یہ پوری روایت باب مطاعن میں انشاء اللہ بیان کی جائے گی،

یہاں شیعوں کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ۔ تم اپنے دنیاوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو، پر قیاس کر کے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے کلام کو دنیوی مشورہ پر محمول کریں،۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہاں دو جملے ارشاد فرمائے۔ عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ۔ اَوْ مَشْوَرَةٍ بِعَدْلٍ اس میں آخری جملہ کو دنیاوی مشورہ پر محمول کریں، تو پہلے جملے کو کہاں لے جائیں۔

پھر امامیہ میں سے صاحب الفصول نے ابو مخنف سے یوں روایت کی ہے کہ اَنَّهٗ قَالَ كَانَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ يُبْدِيْ فِي الْكَرَاهَةِ لِمَا كَانَ مِنْ اَخِيْهِ الْحَسَنِ مِنْ صُلْحِ مُعَاوِيَةَ وَيَقُوْلُ لَوْ جُزَّ اَنْفِيْ كَانَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا فَعَلَهٗ اَخِيْ۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت حسین بن علی حضرت حسن (رضی اللہ عنہم) سے صلح پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے اور کہتے تھے اگر میری ناک کٹ جاتی تو مجھے یہ پسند تھا، بمقابلہ اس کے جو میرے بھائی نے کیا،۔

اور جب ایک معصوم، دوسرے معصوم، کی کسی معاملہ میں گرفت کرے تو لا محالہ ان دونوں میں سے ایک کی خطا ضروری ہوگی کیونکہ دو مختلف چیزوں یا باتوں کا جمع کرنا محال و ناممکن ہے،

اور جناب سجاد کے اس صحیفے میں جو امامیہ کے نزدیک بطریق صحیح ثابت ہے، اس طرح مروی ہے، قَدْ مَلَكَ الشَّيْطَانُ عِنَانِيْ فِيْ سُوْءِ الظَّنِّ وَضُعْفِ الْيَقِيْنِ وَاِنِّيْ اَشْكُوْ سُوْءَ مُجَاوَرَتِهٖ لِيْ وَطَاعَةَ نَفْسِيْ لَهٗ (بے شک بد گمانی اور یقین کی کمزوری میں میری باگ شیطان کے ہاتھ میں آگئی اور میں فریاد کرتا ہوں اس کی ہمسائیگی سے اور اس بات سے کہ میرے نفس نے اس کی پیروی کرلی۔ اور ظاہر ہے کہ اس کلام کو سچ مانیں یا جھوٹ، عصمت کے خلاف ضرور ہے،

اب امامیہ اور اسمٰعیلیہ کے پاس کتاب و عترت سے تو کوئی دلیل ہی نہیں ان کے استدلال کا مدار شبہات عقلیہ پر رہ جاتا ہے، لہٰذا ہم مجبوراً اس پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اور ان میں جہاں غلط فہمی ہوئی ہے، اس کو بھی واشگاف کرتے ہیں،،

شبہ (۱)۔ اگر امام معصوم نہ ہو تو تسلسل لازم آتا ہے، اس لئے کہ امت کے لئے جو امام کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ محض اس لئے کہ امت سے علم و عمل میں غلطی سرزد ہونا جائز ہے پس اگر امام سے بھی خطا و غلطی کا صدور مان لیا جائے تو اس کی تصحیح کے لئے پھر ایک اور امام کی ضرورت ہوتی ، اور احتیاج ہوگی اور یہ سلسلہ یونہی دراز ہوتا رہے گا، کہیں بھی ختم نہیں ہوگا، (یہی تسلسل ہے جو محال ہے)

ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ امت سے چونکہ خطا سرزد ہو سکتی ہے اس لئے اس کی درستگی کے لئے، امام کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ امام کے تقرر کے جو فوائد و اغراض ہیں وہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی احکام کا نافذ کرنا فساد دہشت گردی تخریب اور بدنظمی کو دور کرنا اور سرزمین اسلام کی حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ اور ان اغراض کے حصول اور ان امور کی انجام دہی کے لئے عصمت ضروری نہیں۔ اجتہاد و عدل کافی ہیں،

اور جب اجتہاد میں غلطی ہو جانے سے امام پر اور ان کے متبعین پر کوئی مواخذہ نہیں، تو خطا کا جواز و عدم دونوں برابر ہوئے،،

اور اگر اس شبہ کو تسلیم بھی کرلیں تو ہم اس سلسلہ میں تسلسل کو نہیں مانتے اس لئے کہ عصمت کا سلسلہ بالاتفاق

نبی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ان کے بعد کوئی معصوم نہیں، اور اگر بالفرض اس کا اجرا تسلیم کریں تب بھی ان کا یہ شبہ اس مجتہد جامع شروط سے ٹوٹ جاتا ہے، جو امامیہ کے نزدیک امام کی روپوشی کے وقت ان کا نائب مقرر ہوتا ہے اس لئے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ یہ نائب غلطی کر سکتا ہے، اب یہاں ان کا جو جواب ہوگا امام کے بارے میں وہی ہمارا جواب ہے!!

شبہ (۲) ۱- امام شریعت کا نگہبان ہوتا ہے، اگر اس سے غلطی کا صدور جائز مان لیں تو وہ شریعت کی حفاظت کس طرح کرے گا،

ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ مفروضہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ امام نگہبان شریعت ہے وہ صرف احکام شرع کی ترویج دینے اور اوامر و نواہی کا نفاذ کرنے والا ہے۔ شریعت کی نگہبانی علماء اسلام کا کام ہے اور انہیں سے متعلق ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ (اور اہل اللہ اور اہل علم کہ ان سے کتاب اللہ کی حفاظت کی توقع کی گئی تھی، اور وہی اس پر گواہ تھے) نیز دوسری جگہ ارشاد ہے كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ (تم اللہ والے بن جاؤ بسبب اس کے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیا کرتے اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہتے تھے، اور جب فترت کے زمانہ میں (کہ اماموں کا سلسلہ رک جانے سے عبارت ہے) امامیہ کے نزدیک بھی شریعت کی حفاظت علماء کے ذمہ ہے تو اسی طرح حضور روپوشی امام کے وقت بھی شریعت کی حفاظت علماء کے ذریعہ ہوگی،

چنانچہ ابن مطہر حلی نے کشف الکرامہ میں لکھا ہے، اِنْ حَصَلَ بَيْنَ الْاِمَامِ الْمُتَّصِلِ بِالنَّبِيِّ الْمُتَّصِلِ بِاللهِ فَتْرَةٌ مِنَ الزَّمَانِ اِلٰى وَصِيٍّ اٰخَرَ حَفِظَ اللهُ تِلْكَ الْوَصِيَّةَ بِرِجَالٍ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اگر نبی سے متصل امام اور اللہ سے واصل نبی کے درمیان اور دوسرے وصی کے درمیان زمانہ فترت اور خلا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی وصیت کی حفاظت مومنین کے ذریعہ کراتا ہے)

اور اگر ان کا شبہ تھوڑی دیر کو مان بھی لیں تو امام شریعت کی حفاظت و نگہبانی، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت کے ذریعہ سے کرتا ہے بذات خود نہیں، ان تینوں ذرائع حفاظت شریعت میں خطا و غلطی جائز و درست نہیں ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زمرۂ اجتہاد میں شامل ہے، زمرہ شریعت میں نہیں اس لئے اس کی نگہبانی کی بھی امام کے لئے چنداں ضرورت نہیں،

ان شبہات کی صحت کی صورت میں یہ اعتراض پیش کیا جا سکتا ہے، کہ اگر امام کے لئے معصوم ہونا اس لئے ضروری ہو تاکہ وہ غلطی اور خطا سے بچاتا رہے تو پھر یہ چاہیئے تھا کہ ہر ملک بلکہ ہر شہر میں ایسا ایک شخص موجود ہوتا کیونکہ صرف ایک آدمی اکیلا معصوم، پوری دنیا کو غلطی و خطا سے نہیں بچا سکتا اس لئے کہ مکلفین تو شرق سے غرب تک پھیلے ہوئے ہیں، اور پھر ہر ایک اپنی حاجتوں اور ضروریات میں گھرا ہوا ہے، ہر ایک کو اتنی فرصت کہاں کہ اپنی غلطیاں امام سے درست کرانے ان کی خدمت میں حاضر ہو اور نہ باعتبار حقیقت ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ عادۃً محال ہے، اور اگر امام سے دوری کے سبب امام ہر شہر ہر قریہ میں اپنا نائب مقرر کرے تو اس میں عصمت نہ ہونے کی وجہ سے غلطی جائز ہوگی اور امام سے دوری کے سبب امام اس کی غلطی پر مطلع بھی نہ ہو سکے گا خصوصاً دور دراز کے

نت نئے واقعات اور گوناگوں مسائل اور نہ رکنے والے حوادث پیش آنے کے سبب تو ایسا ممکن نہیں کہ غلطی سے بچ بچ کر چلتا رہے، خاص طور پر غیبت کبریٰ کے زمانہ میں تو اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں، پھر امام اگر نائب کی غلطی پر مطلع بھی ہو جائے تو بالمشافہ اس کو ٹوکنے اور اصلاح کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں،

بجز اس کے کہ یا قاصد کے ذریعہ مطلع کرے یا بذریعہ مراسلات۔ اور قاصد چونکہ معصوم نہیں ہوگا تو وہ خطا و غلطی سے محفوظ نہ رہا۔ لہذا غیر معتبر ٹھہرا اور مراسلات و تحریرات میں جو دھوکے بازی اور جعل سازی چل رہی ہے اس کے پیش نظر اس میں بھی غلطی کا احتمال موجود ہوگا۔

پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اگر نائب کو تحریر کا مطلب سمجھنے یا قاصد کی گفتگو کے ذریعہ امام کا مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری اگر پیش آگئی تو وہ اپنی رائے اور قیاس کے اصول کو کام میں لائے بغیر اس کو حل نہ کر سکے گا اور ان سب صورتوں میں شبہات غلط کی گنجائش ہے، لہذا خطا سے حفاظت کی اس کے بغیر کوئی صورت ہی نہیں کہ ہر ہر ملک اور ہر ہر شہر میں ایک معصوم "مقرر ہو"،

مسئلہ (۴) ۱۔ یہ ضروری نہیں کہ امام کے تقرر کے وقت خدا کا صریح حکم بھی آئے، کیونکہ اس تقرری کی ذمہ داری تو مکلفین پر ہے، وہ ضرورت کے وقت، حالات کے تحت اپنی مصلحت اور تقاضائے زمانہ کے موافق اپنے میں سے ایک رئیس چن لیں۔ اور چونکہ یہ ان کا اپنا انتخاب ہوگا اس لئے اس کی لاج رکھیں گے اور پاسداری کرتے ہوئے، اس رئیس کی اطاعت میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے اور اگر اس کا تقرر خدا کی طرف سے کسی نص کے ذریعہ ہو تو دیگر تمام احکام شرعیہ کی طرح اس کے متعین و مقرر کرنے میں غفلت اور سستی پیش آئے گی اور خلیفہ و امام کے مقرر کرنے سے جو غرض تھی وہ ہاتھ نہ آئے گی، اگر مکلفین ایسے ہی بھلے مانس ہوتے کہ ان کے لئے صرف فرمان الٰہی کافی ہوتا تو قرآن کی اطاعت کرنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرامین کی کونسی کمی باقی رکھی یا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کونسی کسر اٹھا رکھی اور ان مکلفین نے ان کے ساتھ کیا کیا!

امام و خلیفہ کا تقرر و نصب اسی لئے تو ہوتا ہے کہ مکلفین کی نیند توڑی جائے احکام شریعت میں ان کی سستی و کاہلی کا توڑ کی جائے اور جن کا بھوت باتوں سے نہ اترتا ہو ان کو لاتوں کی مار دی جائے اور لوگوں کو چاروناچار طریقت شریعت سے ادھر ادھر نہ کی جائے ان کو باندھ کر رکھا جائے وہ اپنے کو مادر پدر آزاد نہ سمجھیں۔

اور اگر خود امام و خلیفہ بھی دیگر شرعی احکام کی طرح کی ایک کڑی ہوتا تو وہ بھی دیگر احکام شرع کی طرح غفلت و سستی کا شکار ہوتا۔ لہذا مکلفین کے حق میں یہی اصلح ہے کہ انتخاب امیر کی ذمہ داری انہیں کی عقلوں پر ڈالی جائے،

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ امام کا تقرر خدا پر واجب ہے لہذا خدا کی طرف سے تقرر نامہ آنا چاہئے، حالانکہ ان کا یہ عقیدہ بھی عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے، عقل کے خلاف ہونا تو سطور بالا سے معلوم ہوگیا۔ نقل کے خلاف اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جا بجا انسانوں کے بعض فرقوں مثلاً بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً (ہم نے ان کو امام بنایا) وَنُرِيدُ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ (ہم چاہتے ہیں کہ ان کو امام بنائیں اور وارث کریں) اور یہ بھی فرمایا وَجَعَلَكُمْ مُلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا اور وہ کچھ جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیا تھا)، اور یہ بھی ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ اور وہی ذات

ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا)۔

اور ان مختلف فرقوں کے ملوک اماموں اور خلفاء میں سے کسی ایک نام کی بھی تصریح نہیں فرمائی۔ بلکہ ہوتا یہ رہا کہ ان فرقوں کے ارباب اختیار خود ہی اپنے عقل و تدبیر اور سمجھ بوجھ سے کسی ایک فرد کو زمام ریاست سپرد کرتے یا وہ خود اپنی شوکت و غلبہ سے سب پر مسلط ہو جاتا اور سب اس کے حلقہ اطاعت میں آجاتے،

لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے امام و خلیفہ بنانے کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے ان لوگوں کے دلوں میں جنکی کچھ بڑی بات و وقعت اور اعتبار رکھتی تھی، یہ بات جاگزیں کر دیتا تھا کہ فلاں شخص کو رئیس بنالو، تاکہ وہ تعالےٰ تائید آسمانی اور شوکت غیبی سے اس کو مخلوق پر تسلط عطا فرمائے،

اب اگر وہ ریاست و سیادت کا اہل ہے تو امام عادل ہے، ورنہ امام جابر!

مسئلہ (۵):- امام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک تمام اہل زمانہ سے افضل ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو اپنے حکم سے خلیفہ بنایا جب کہ پیغمبروں میں حضرت داؤد اور حضرت شمویل علیہما السلام موجود تھے، جو بلا ریب و شک ان سے افضل تھے اور عند اللہ برتر تھے۔ ہاں اگر امیر و خلیفہ کا چناؤ اہل حل و عقد کی بیعت سے ہو تو اس کا اہتمام ہونا چاہیئے کہ حکمرانی کے اوصاف سرداری کے شرائط میں جو بلند و افضل ہو، اس کو منتخب کریں دوسرے امور میں افضل و برتر ہونے کا لحاظ نہ کریں۔ اس لئے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

کہ ذاتی طور پر ایک شخص ولی کامل، عالم متبحر، اور نجیب الطرفین ہو مگر وہ اپنے اکیلے گھر کا بھی انتظام نہ چلا سکتا ہو، تو وہ اپنے ملک کی سرداری کے فرائض کیسے پورے کر سکے گا، لہٰذا یہاں دوسری ہی قسم کی صلاحیت و فضیلت ہونی چاہیئے،

اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ امامیہ نرے بدھو بھی نہیں ہیں کہ یونہی الل ٹپ عقیدہ گھڑ لیتے ہوں یہ بڑے کائیاں اور منصوبہ باز لوگ ہیں، یہ کوشش تو یہی کرتے ہیں کہ زخم کاری سے ہی کئے لگے، مگر بیچارے مکافات عمل کے قانون کی زد میں ہاتھ پاؤں اپنے ہی تڑوا بیٹھتے ہیں، اس عقیدہ میں بھی یہ تینوں شرائط (معصوم ہونا، منصوص ہونا، اور افضل ہونا) بڑی چالاکی اور بدنیتی سے بڑھائے ہیں کہ عقیدہ کے پردہ ہی میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کا انکار کر دیں اور اہل سنت کو علیحدہ جواب نہ دینا پڑے اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم نہ معصوم ہیں نہ منصوص علیہ اور افضلیت میں بھی بحث کا میدان خاصا وسیع ہے لہٰذا ہم بھی یہاں ان شروط کو نظر انداز کرتے ہیں اپنی مرضی کے میدان یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کے اثبات کے موقع پر ان کے یہ ہتھیار بھی پرکھیں گے اور ان شرائط کے انشاء اللہ پرخچے اڑائیں گے،

لیکن امامیہ نے اپنی کتابوں میں سارے مسائل کی اصل و بنیاد انہیں شرائط کو ٹھیرایا ہے اور اس میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں، اس لئے مجبوراً مقام کی مناسبت سے ان شرائط کی جدا جدا نفی بیان کر دی گئی لیکن تسلی بخش کلام کے لئے اصل محل و مقام تک پہنچنے تک کا انتظار کر لیا جائے،

مسئلہ (۶):- رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے نائب بلا فصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے

مگر شیعہ اس عقیدہ کے سب سے جدا انداز میں مخالف ہیں، شیعوں کے تمام فرقوں میں قدر مشترک	اور نکتہ

خیال جس میں سب متفق ہوں، یہ ہے کہ امام بلا فصل بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں، -
اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (خاکم بدہن)، غاصب خلافت تھے کہ حیلہ حوالہ اور اپنے اثرات سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب امامت سے محروم کرکے خود اس پر فائز ہوئے اس خیال پر دنیا جہاں کے سارے ہی شیعہ متفق ہیں، ان میں اختلاف تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد پر ہے کہ ان کے بعد امام برحق کون ہے،

اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت سے امام ہیں جب ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی اس سے پیشتر آپ امام نہیں تھے ہاں امت کا استحقاق حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی سے تھا اور اس استحقاق سے کسی نے بھی کبھی انکار نہیں کیا، خود حضرات خلفاء ثلثہ رضوان اللہ علیہم بھی اس استحقاق کو مانتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ امام ہوئے اس کے بعد دوسرے ائمہ بھی استحقاق تو رکھتے تھے لیکن چونکہ بعض سے تو اہل حل وعقد نے بیعت نہیں کی اور بعض تزکیہ باطن اور اشاعت علم ہی میں مشغول رہ کر امامت کے دعوے دار نہ بنے اس لئے وہ امام نہ ہوئے،

نیز یہ بھی واضح رہے کہ اہل سنت کے نزدیک امام پیشوائے دین کو بھی کہتے ہیں، اور اس معنے کے لحاظ سے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ جو فقہ میں پیشوا تھے، امام غزالی، امام رازی رحمہما اللہ کو جو عقائد و کلام میں پیشوا تھے اور نافع و عاصم رحمہما اللہ کو جو فن قرأت میں پیشوا تھے امام کہتے ہیں، اور ائمہ اہل بیت اطہار ان تمام علوم و فنون میں پیشوا تھے خصوصاً ہدایت باطن اور ارشاد طریقت میں کہ اس میں ان کو درجہ انتہا حاصل تھا لہذا اسی نقطہ نظر سے اہل سنت بھی عام طور سے ان کے لئے امام کا لقب استعمال کرتے ہیں، امام بمعنی خلیفہ کے نہیں، کیونکہ خلافت کے لئے ان کے نزدیک زمین پر اقتدار، استحقاق امامت، غلبہ و شوکت اور حکم کا نفاذ ضروری ہے اسی وجہ سے انہوں نے خلافت کو صرف پانچ حضرات پر منحصر و محدود رکھا ہے،

اور کبھی بادشاہت و ریاست پر بھی لفظ امامت استعمال کرتے ہیں، گو بادشاہ خوش سیرت نہ ہو لیکن بہت سے دینی امور میں وہ پیشوا ہوتا ہے مثلاً جہاد میں غنیمتوں کی تقسیم میں جمعہ وعیدین کے قائم کرنے میں لہذا ان تینوں معانی کو جدا جدا ذہن نشین کر لینا چاہیئے، اگرچہ ان سب معانی میں لفظ مشترک ایک ہی ہے،

اور وہ یہ کہ امور دینیہ میں جس کی پیروی اور اقتدا کی جائے، وہ امام ہے، یہاں تک کہ امیر الحج کو وہ بھی ایک لحاظ سے مقتدا اور امام ہے، اور اسی لئے تو پیشوائے نماز کو امام کہتے ہیں،

اور جب دین کے تمام ظاہری و باطنی امور میں کسی کو پیشوائی نصیب ہو تو وہ خلافت حقہ کا مستحق ہے یہ خلافت صرف پانچ حضرات میں منحصر ہے اور اہل سنت کا یہ خیال محض ہوائی نہیں ارشادات قرآنی پر مبنی ہے کہ اس میں ان پیشواؤں کو جو بظاہر اقتدار نہیں رکھتے تھے، ائمہ کہا ہے مثلاً - وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا - (ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہمارے احکام کی تبلیغ کرتے تھے) اور ہر شخص کو یہ دعا سکھائی وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا (اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا) اور خلافت میں ہر جگہ زمین کی قید لگائی، مثلاً فرمایا لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ - یا - فَجَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ یا هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ اسی طرح کی اور آیات،

اور اس کی وجہ کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کیوں کی جب کہ اس وقت،

آپ کی ذات عالی صفات استحقاق امامت میں مخصوص و ممتاز تھی، اور فریق ثانی کی بے استحقاقی واضح اور روشن تھی، یہ ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ واقف تھے، اور جانتے تھے، کہ خلافت کا زمانہ ختم ہوا کٹکھنے بادشاہوں کا وقت آپہنچا اور ظلم و ستمگری کا دور دورہ شروع ہوا اگر میں بھی ریاست کا مدعی بنا رہا اور تقدیر میں چونکہ ہے نہیں تو ریاست انتظام پذیر نہ ہوگی اور فتنہ و فساد، غضب و عناد رونما ہوں گے اور امامت کے جو مصالح ملحوظ و منظور ہونے چاہئیں، وہ یکسر فوت ہو جائیں گے، لہذا مجبوراً ریاست و سیادت سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور امور ریاست حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیئے جو اس وقت ریاست کی اہلیت رکھتے تھے اور یہ صلح و تسلیم کسی خامی، کمزوری یا ذلت کی وجہ سے نہیں تھی اس لئے کہ امام کے ہمراہ جانثاروں اور جانبازوں کی ایسی مستعد فوج موجود تھی جو یکدلی اور یکجہتی سے امام کی مدد کے لئے تیار تھی اور تعداد کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہ تھی لیکن چونکہ مدت امامت جو پورے تیس سال تھی ختم ہو چکی آپ نے اس کو ترک ہی فرما دیا۔

اس سلسلہ میں امامیہ کے صاحب فصول نے جو یہ لکھا ہے کہ رؤساء لشکر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساز باز کر لی تھی اور جناب امام کو اس کا علم یقینی ہو چکا تھا کہ وہ اپنے اس فاسد ارادے پر تلے ہوئے ہیں، کہ آپ کو گرفتار کرکے ان کے سپرد کر دیں،

یہ محض افترا ہے، اس لئے کہ امامیہ ہی نے اپنی کتابوں میں حضرت امام کا خطبہ نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اِنَّمَا فَعَلْتُ مَا فَعَلْتُ شَفَقَةً عَلَيْكُمْ (میں نے جو کچھ کیا وہ تم پر ترس کھا کر کیا) اور ایک دوسرے خطبہ میں جس کو شریف مرتضی اور صاحب الفصول ہر دو نے نقل کیا ہے یوں ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے اس وقت جب کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا پختہ ارادہ کر چکے تھے فرمایا۔ اِنَّ مُعَاوِيَةَ قَدْ نَازَعَنِيْ حَقًّا لِّيْ دُوْنَهٗ فَنَظَرْتُ الصَّلَاحَ لِلْاُمَّةِ وَقَطْعَ الْفِتْنَةِ وَقَدْ كُنْتُمْ بَايَعْتُمُوْنِيْ عَلٰى اَنْ تُسَالِمُوْا مَنْ سَالَمَنِيْ وَتُحَارِبُوْا مَنْ حَارَبَنِيْ وَرَاَيْتُ اَنَّ حَقْنَ دِمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ مِّنْ سَفْكِهَا وَلَمْ اُرِدْ بِذٰلِكَ اِلَّا صَلَاحَكُمْ، البتہ معاویہ نے میرے ساتھ اس حق میں جھگڑا کیا جس کا حقدار میں تھا، وہ نہیں تھے مگر میں نے فتنے کی بیخ کنی اور امت کی بھلائی کو پیش نظر رکھا اور تم نے مجھ سے اس بات پر بیعت کر لی تھی کہ جس نے مجھ سے صلح کی تم بھی اس سے صلح کرو گے اور جو مجھ سے لڑائی لڑے گا تم بھی اس سے لڑو گے اور میں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت ان کی خونریزی سے اچھی ہے تو دگویا) اس سے تمہاری صرف ریاست ملک و تصرف کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دینے اور ان سے دست بردار ہونے کا سبب کمزوری و بے بسی نہ تھا، بلکہ آپ نے اس مصلحت کی بنا پر صلح فرمائی جس کی رعایت آپ ہی کے شایان شان تھی اور خطبہ ثانی سے صاف طور پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریق ثانی، حضرت معاویہ اور آپ کے ساتھی بھی مسلمان تھے، کیونکہ کفار و مرتدین سے فتنہ و فساد کے خوف سے بھی صلح جائز نہیں بلکہ ان سے نہ لڑنا اور ان کے غلبہ کو نہ روکنا ہی عین فتنہ ہے، جیسا کہ ارشاد ربی ہے، وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (ان سے اتنا لڑو کہ فتنہ نابود ہو جائے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے)

اور علمائے امامیہ میں سے صاحب الفصول نے ابی مخنف سے جو روایت کی ہے اور جو صفحات ماسبق میں گزر چکی ہے جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے برادر اکبر پر اس صلح کے سلسلہ میں اظہار ناراضگی فرمایا تھا بلکہ یہ تک

فرمایا کہ مجھے اپنی ناک کٹا لینا اس صلح سے زیادہ پسند تھا۔

آپ کے اس فرمان اور طرز عمل سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے مجبور ہو کر صلح نہیں کی تھی۔ کیونکہ مجبوری کی صورت میں نہ ملامت کی جاتی ہے نہ شکایت۔

یہ ایک مشہور قاعدہ ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کلام سعادت فرجام جو کتب شیعہ میں مذکور ہے، اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امام وقت کے کسی فعل پر اپنی سمجھ میں آنے والی کسی مصلحت کے خلاف ہو کر نکیر کرنا یا ناخوشی ظاہر کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مصلحت وقت اور رعایت حال کی بنا پر اکابرین امت میں بھی اختلاف رونما ہوا ہے، اور وہ ناخوشی و ناراضگی کا سبب بھی بنا ہے، مگر ایک دوسرے کے خلاف بدگوئی اور برا بھلا کہنے کا باعث نہیں ہوا ان دو عمدہ فائدوں کو بڑی احتیاط سے حافظہ میں تازہ رکھنا چاہیئے کہ یہ بہت سی جگہ کام آئینگے۔

یہاں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ بعض جاہل امامیہ انتہائی عناد و تعصب کی بنا پر کہتے ہیں کہ اہل سنت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں، یہ قول انتہائی بے شرمی اور رشوخ چشمی پر مبنی ہے، اور اس کو منہ پر جھوٹ بولنا کہتے ہیں، ورنہ معمولی پڑھا لکھا فارسی خواں جس نے اہل سنت کے مولانا عبد الرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ عقائد نامہ فارسی پڑھا یا دیکھا ہے یقین سے جانتا ہے کہ اہل سنت سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ابتدائے امامت سے لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے معاملہ امامت حوالہ کرنے تک وہ حق پر نہیں تھے بلکہ باغی جیسا کردار ادا کر رہے تھے اس لیے کہ امام وقت کی اطاعت چھوڑ بیٹھے تھے امام حسن رضی اللہ عنہ نے جب امامت سپرد کی تو اسوقت وہ بادشاہ ہوئے یا ان کی حیثیت کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ ایک عام بادشاہ تھے تمام اسلامی ممالک کے فرمانروا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے کسی ناگزیر مصلحت کے سبب ان کی سلطنت کی وسعت کو گوارہ کر لیا تھا، اور وہ امام کی اتباع جیسا کہ چاہیئے نہ کرتے تھے،

جس طرح بعض صوبیداروں کا رویہ اپنے بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے، یا جیسے ہمارے زمانہ کے بادشاہ شاہ عالم کے مختار کار، کہ بادشاہ کے علم میں لائے بغیر امور سلطنت انجام دیتے ہیں اور سوائے مقررہ روزینہ کے پہنچانے، اس کی طرف عرضیاں لکھنے یا اس سے القاب و خطابات حاصل کرنے کے اپنے بادشاہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ لہذا ان حالات کے ماتحت وہ بادشاہ تھے جو بظاہر امام کی رائے اور رضا مندی کے تحت سلطنت حاصل کر چکے تھے، اس لئے اہل سنت ان کو پہلا بادشاہ اسلام کہتے ہیں،

اب رہا یہ شک کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کردار باغیانہ تھا اور وہ ناحق غلبہ حاصل کرنے والے تھے تو ان پر لعن کیوں نہیں کرتے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب پر لعن جائز نہیں اور چونکہ بغاوت بھی گناہ کبیرہ ہے اس لئے اس پر بھی لعن منع اور ناجائز ہے

اہل سنت اپنے اس دعوی کی دلیل بھی قرآن و عترت سے لاتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (اپنی لغزش سے اگر کبھی ہو جائے اور مومن مرد و عورت کے گناہوں سے اللہ کی

بخشش طلب کرو) کتاب اللہ کی یہ آیت صاف دلالت کرتی ہے کہ شارع (اللہ تعالیٰ) کی غرض اہل ایمان کے حق میں استغفار ہے لعن نہیں اس لئے کہ قاعدہ اصولیہ کے مطابق جس کو امامیہ بھی مانتے ہیں، ایک چیز کے لئے حکم دینا اس کے مخالف سے انکار کا مرادف ہے، لہٰذا استغفار کا حکم اس کے مخالف (لعن) کے انکار کا متقاضی ہے!

اور پھر گناہ کبیرہ کا مرتکب شیعہ وسنی ہر دو کے نزدیک ایمان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتا وہ مومن رہتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا۔ (اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں میں صلح کرا دو) لہٰذا لعن سے ممانعت ثابت ہو گئی، ہاں اہل کبائر متصف بالوصف پر خود کتاب اللہ میں لعنت آئی ہے، اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔ (خبردار رہو کہ ظالم پر اللہ کی لعنت ہے) فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (پس ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔ مگر یہ لعنت دراصل صفت پر ہے موصوف پر نہیں اور بالفرض اگر مان لیں کہ لعنت موصوف پر ہی ہے تو یہاں ایمان تو مانع لعنت ہو رہا ہے اور صفت کذب وظلم کا وجود لعنت کو جائز قرار دے رہا ہے تو اس سلسلہ میں امامیہ شیعوں کے اصول میں یہ طے شدہ امر ہے کہ جب ایک صفت کسی حکم کو چاہے اور وہ مانع حکم کے ساتھ جمع ہو تو حکم رک جاتا ہے لہٰذا یہاں بھی صرف صفت کے پائے جانے پر لعنت کا حکم ثابت نہ ہو گا تاوقتیکہ اس کا مانع ایمان نہ اٹھ جائے جس طرح کافر کے حق میں جب اس کی موت یقینی کفر پر ہوئی ہو اس میں اچھے صفات پائے جاتے ہیں کے! [illegible] اس کے لئے جائز نہیں ہو گا۔

اور [illegible] وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (جو لوگ ان کے بعد آئے وہ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کی عداوت نہ پیدا کر اے ہمارے رب بے شک تو مہربان اور رحم والا ہے)

اس آیت مبارکہ میں مغفرت کی طلب اور بغض وعداوت پیدا نہ کرنے کی بنا پر محض ایمان پر رکھی گئی ہے اس میں عمل کی کوئی قید مذکور نہیں لہٰذا یہ دونوں معاملات برتنا، یعنی ترک بغض وعداوت اور لعنت سے احتراز جو طلب مغفرت کا لازمہ ہے، ہر مومن کے ساتھ ضروری ہوتے ہیں۔

جستجو اور تلاش کی جائے تو اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات قرآن مجید میں ملیں گی۔

اور بحوالہ عترت اس سے استدلال یوں ہے کہ کتب امامیہ سے بطریق تواتر یہ بات ثابت ہے، کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اہل شام پر لعنت کرنے سے روکا اور منع فرمایا ہے،

اہل سنت تو بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منع کی ہوئی بات کے ارتکاب کی جرأت نہیں کر سکتے یہ تو شیعہ ہی ہیں جو ادھر ادھر بات کو گھما پھرا کر یا جھوٹی سچی تاویلات کا سہارا لے کر خلاف ورزی کی صورت پیدا کرنے میں ماہر ہیں، چنانچہ یہاں بھی جناب امیر کی اس ممانعت کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اہل شام پر آپ نے لعنت سے اس لئے منع نہیں فرمایا تھا کہ وہ لعنت کے مستحق نہ تھے، بلکہ ممانعت اپنے دوستوں کو تہذیب اخلاق اور حسن کلام کا سبق سکھانے کے لئے آپ نے ایسا فرمایا تھا، چنانچہ روایت کے الفاظ اس کی گواہی دے رہے ہیں، فَاِنِّيْ اَكْرَهُ لَكُمْ اَنْ تَكُوْنُوْا سَبَّابِيْنَ (میں تمہارے لئے پسند نہیں کرتا کہ تم گالی دینے والے بنو)۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ امام نے جو چیز ہمارے لئے ناپسند کی کیا ہم اس کو پسند کر سکتے ہیں، اور پسند ہی نہ کریں بلکہ اس کو وجہ قرب و عبادت بھی سمجھیں ہمارا کام تو امام کے احکام کی بجا آوری ہے جس بات کو آپ نے مکروہ و برا سمجھا ہم بھی اسے مکروہ ہی سمجھیں اور رہے سبب و علت کا معاملہ امام پر چھوڑ دیں، خواہ مخواہ کے قیاسی گھوڑے دوڑا کر خسران آخرت کا خطرہ کیوں مول لیں اس کے علاوہ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شیعہ حضرات نہج البلاغہ کی اس دوسری روایت سے آنکھیں کیوں چراتے ہیں، جس میں لعنت کی ممانعت اسلامی وابائی اخوت و شرکت کی بنا پر کی گئی ہے،

وہ روایت یہ ہے کہ آنَّهُ لَمَّا سَمِعَ لَعْنَ اَهْلِ الشَّامِ مِنْ اَصْحَابِهٖ خَطَبَ وَقَالَ اَصْحَبْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانِنَا فِی الْاِسلام عَلٰی مَا دَخَلَ فِیْهِ مِنَ الزَّیغِ وَالْاِعْوِجَاجِ وَالشُّبْهَةِ وَالتَّاوِیْلِ رجب آپ نے اپنے ساتھیوں کو اہل شام پر لعنت کرتے سنا تو آپ نے ان سے خطاب فرمایا کہ ہماری اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑائی اس لئے ہے کہ بعض اسلامی امور میں بے راہ روی، کجی شبہات اور تاویلات داخل ہو گئی ہیں،

امامیہ کی کتابوں میں دونوں روایات موجود ہیں، یہ بھی اور اس سے پہلے والی بھی پہلی روایت اگر لعنت سے ممانعت کا یہ سبب بتاتی ہے کہ زبان درازی اور خلاف ادب گفتگو کے عادی نہ بنیں تو ہم اس روایت کو اس بات پر محمول کرتے ہیں کہ یہ روایت ان لوگوں کے حق میں ہے جو لعن بالوصف کرتے ہیں اور جو شرعاً جائز ہے،

اب یہ بات ایسے اشخاص کے لئے تو ناگزیر ہوتی ہے جو شریعت کو پہنچانے والے ہیں، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کہ ان اوصاف کی برائی لوگوں کے سامنے لائے اور ان کے ذہن نشین کرنے کی خاطر متصفین صفات مذمومہ پر لعن فرمائیں مگر انبیاء کرام کے علاوہ جو دوسرے ہیں، اور اس منصب پر فائز نہیں ہیں وہ بڑے بے لگام ہوتے ہیں ان کے لئے اب ایسا کرنا جائز نہیں، ورنہ لعن و طعن کی عادی زبانیں اور بہانہ جو طبائع ان لوگوں پر بھی لعن کرنے لگیں گے جو اس کے مستحق نہ ہوں گے اور لعن اللہ السارق لعن اللہ شارب الخمر۔ وغیرہ وغیرہ ان کا ورد بن جائے گا اور بات بے بات گلی کوچوں میں یہ لعنتی نعرے گونجاتے رہیں گے،

اور دوسری روایت میں ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے جو اسلام و ایمان کا لحاظ کئے بغیر اہل شام کی تعیین و تخصیص کر کے خصوصیت سے لعنت کرنے لگے

اسی طرح جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دونوں روایات پر عمل کی صورت نکل آئی اور کلام عترت بھی کلام اللہ کے موافق ہو گیا بحمد للہ کتاب اللہ و عترت رسول اللہ کے فہم اور تطابق میں اہل سنت کا یہی وطیرہ طریقہ اور روبہ ہے،

اب یہاں بعض دانشمندان شیعیان کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بھی لعنت اسی کافر پر جائز ہے جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ کفر پر مرا ہے اور ہمارے اصول کا بھی یہ تقاضا نہیں کہ باغیوں پر جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں، لعنت کریں لیکن یہ ایسے ہی لوگوں سے متعلق ہے جو جناب امیر کے ساتھ نہ لڑیں کیونکہ ان سے لڑنے والے کافر ہیں اور ایسا اسی حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں جو شیعہ اور سنی دونوں میں متفق علیہ ہے اور دونوں کے نزدیک صحیح بھی کہ جناب رسول اللہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا حَرْبُكَ حَرْبِیْ (تیرے ساتھ لڑنا میرے ساتھ لڑنا ہے

اسی لئے خواجہ نصیر طوسی نے تجرید میں جناب امیر کے محض مخالفوں اور ان سے لڑنے والوں میں فرق کرتے

ہوئے کہا ہے، مُخَالِفُوْہُ فَسَقَۃٌ وَمُحَارِبُوْہُ کَفَرَۃٌ اُن کا مخالف فاسق ہیں، اور ان سے لڑنے والے کافر ہیں،

اگر طوسی اپنی بات مشہور مذہب پر اعتماد کر کے کہتا تو اس فرق کی بھی اس کو شاید ضرورت نہ پڑتی کیونکہ عام امامیوں کے نزدیک منکر امامت، منکر نبوت جیسا ہے اور ظاہر ہے منکر نبوت کافر ہے تو اس بنیاد پر مخالف اور محارب دونوں ہی کافر قرار پاجاتے مگر طوسی نے مشہور قول کے خلاف ایسا اس لئے کہا کہ کافی اور شیعوں کی دوسری صحاح میں ائمہ سے ایسی روایات جو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ہماری امامت سے انکار کرنے والا کافر نہیں ہے، تا وقتیکہ یہ انکار عداوت و دشمنی کی شکل اختیار نہ کرلے اور ہماری خونریزی کو حلال نہ سمجھے اور انہیں روایات میں منکر امامت کی نجات کا حکم بھی ہے،

چنانچہ فاضل کاشی کے کلام میں جو باب دوم میں مذکور ہے ان روایات کی تفصیل موجود ہے،

یہ حضرات مزید یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہی فرقوں کی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے، کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل عبا سے فرمایا، اَنَا سِلْمٌ لِمَنْ سَالَمْتُمْ وَحَرْبٌ لِمَنْ حَارَبْتُمْ (جن سے تم صلح کرو میری اس سے صلح ہے اور جن سے تم جنگ کرو اس سے میری بھی جنگ ہے،) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جنگ بلاشبہ کفر ہے تو دیگر ائمہ حضرات سے جنگ بھی لامحالہ کفر ہوگی،

اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہاں الفاظ و کلام کے حقیقی معنے مراد نہیں ہیں، بلکہ مقصد ان حضرات سے لڑائی پر ڈرانا اور دھمکانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ ان سے لڑنا بہت ہی سخت جسارت اور ناروا بات ہے اور یہ گناہ کبیرہ کی سخت ترین شکل ہے،

اور اس کی دلیل امامیہ کی وہ صحیح روایات ہیں جن میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کا یہ صریح حکم موجود ہے، کہ اہل شام میں ایمان باقی ہے اور ان کے ساتھ اسلامی بھائی چارگی کا تعلق قائم ہے اگر اس حدیث کے وہ معنی مراد ہوتے جو شیعوں یا نصیر طوسی نے سمجھے ہیں تو پھر جناب امیر نے جو سمجھا خدانخواستہ وہ غلط ثابت ہوتا ہے،

لہذا ہمیں تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ہی سمجھ پر اعتماد کرنا اور وہی سمجھنا ہے جو انہوں نے سمجھا ہے اور انہیں کی اتباع کرنی اور انہیں کے فہم کے مطابق عمل کرنا ہے نہ کہ خواجہ نصیر یا دوسروں کی سمجھ پر! کیونکہ طوسی نہ معصوم ہے، نہ امام۔ اور پھر جو فرق ان دونوں میں ہے وہی فرق ان دونوں کے متبعین میں بھی ہوگا۔

پھر ایک اور بات اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جو خبر آحاد کے درجہ کی ہے، اس میں امیر کی لڑائی کو صرف رسول اللہ کی لڑائی کہا گیا ہے مگر قرآن مجید میں جو یقینی متواتر ہے اس میں سود خور کو اللہ و رسول دونوں سے جنگ کرنے والا بتایا ہے،

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر اللہ و رسول سے تمہاری جنگ ہے اور اگر باز آجاؤ تو تم کو تمہارا راس المال مل جائے گا،

تو یہاں طوسی کی فہم سود خوری پر کفر کا فتویٰ کیوں نہیں لگاتی جو سود خوری سے توبہ نہیں کرتا اور اس سود خوری کو اسباب کفر کیوں قرار نہیں دیتی اور اس کو تمام کبائر سے مستثنیٰ نہیں کرتی،

اسی طرح اللہ نے جو رہزنوں کے متعلق فرمایا ہے، اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ تو

یہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بھی خدا اور رسول دونوں ہی کے ساتھ لڑنے والے ٹولے ہیں، لہٰذا اس سے یہ معلوم ہو گیا سخت کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی صورت میں اللہ و رسول سے لڑائی تو لازم آتی ہے مگر ایمان باقی رہتا ہے یہ بحث یہاں چونکہ ضمناً آگئی، اس لیے اس پر اکتفا کر کے اصل مسئلہ کی طرف لوٹتے ہیں،

اس فرقہ کو یہ اشتباہ پیش آنے کا راز یہ ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے مروانی و عباسی اپنے آپ کو خلیفہ کہلاتے تھے اور خود بھی کہتے تھے۔ اور یہ صرف ان کاموں میں ظاہری مشابہت کی وجہ سے تھا جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ در کھتے تھے،

مثلاً جہاد کا سرانجام کرنا، شہروں کی فتح، فوجوں اور لشکروں کی تیاری، غنائم اور صدقات کی تقسیم اور کفار کی دست و برد سے دارالاسلام کی حفاظت۔ اور علماء اہل سنت بھی کاموں کی اسی ظاہری مشابہت کی وجہ سے ان کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں،

اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہر فرقہ خلیفہ کے القاب یا نام خود ان کی اپنی مرضی و اصلاح کے مطابق ہوتے ہیں، دوسروں کو ان میں الجھنے کی کیا ضرورت! چنانچہ آج کل جو شخص کربلا جا کر ملا نصیر اور اخوان باقر سے کتاب شرائع پڑھ کر آتا ہے تو اس فرقہ کے نزدیک وہ مجتہد کہلاتا ہے اسی طرح ان کے زمانے میں خلیفہ کا لفظ کافی معروف اور کثیر الاستعمال تھا اس لئے اس کو امام کا مرادف سمجھ کر اختیار کر لیا، اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اہل سنت ان حضرات کو خلفائے اربعہ کی طرح برحق جانتے ہیں، ایسا سمجھنے والوں کی غلط فہمی ہے محققین اہل سنت تو اس معاملہ میں زیادہ محتاط تھے وہ ان حضرات کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے، چنانچہ حدیث صحیح اَلْخِلَافَۃُ بَعْدِیْ ثَلٰثُوْنَ سَنَۃً (خلافت کا زمانہ میرے بعد تیس سال ہے) کے ایک راوی سعید بن جمہان سے امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ مروانیوں کو بھی تو خلیفہ کہتے ہیں، تو اس نے کہا بنو الزرقاء یعنی بنو امیہ کا خیال غلط ہے وہ تو بادشاہ ہیں بادشاہ بھی شریر،!

اور ابو بکر بزار رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا شمار اہل سنت کے چوٹی کے محدثین میں ہوتا ہے۔ حضرت عبیدۃ ابن الجراح رضی اللہ عنہ سے بطریق حسن روایت کی ہے،

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ دِیْنِکُمْ بَدَءَ نُبُوَّۃً وَّرَحْمَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ خِلَافَۃً وَّرَحْمَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ مُلْکًا وَّجَبْرِیَّۃً

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے دین کی ابتداء نبوت و رحمۃ کے سایہ میں ہوئی پھر اس کو خلافت کا دور نصیب ہوگا وہ بھی رحمت ہی ہوگا اس کے بعد وہ بادشاہت و جبریت دیکھے گا،)

خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ خلافت حقہ بلاشبہ تیس برس تک جاری رہی اور ۵ جمادی الاولی ۴۱ھ کو امام حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ سے صلح پر ختم ہوگئی،

اور ان کے نزدیک خلفاء کی وہی ترتیب حق صحیح و درست ہے جو عملاً پیش آئی اس میں کسی تقدم و تاخر کا کوئی سوال نہیں، گویا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں، اہل سنت کے پاس اپنے اس قول کی کتاب و سنت کے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ کتاب ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں کتاب و سنت

اجماع امت، اور اقوال عترت سے ہزاروں دلائل اس پیرایہ اور اس انداز و طرز سے بیان کئے گئے ہیں جو دانشمندان روزگار کے لیے سرمایہ مسرت و ذریعہ طمانیت ہیں اور اس کتاب کے مصنف کو جو پرانی دہلی میں سکونت پذیر تھے آیت الٰہی اور معجزہ نبوی ہی کہا جاسکتا ہے۔ کاتب حروف بھی بارہا ان کی زیارت سے شرفیاب ہوا اور ان کی رنگین بیانی سے دامن میں گل چینی کی اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے! آمین۔

مذکورہ بالا دعوی کی دلیل میں اب چند قرآنی آیات اور احادیث شریفہ پیش کی جاتی ہیں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ فرقہ جو ثقلین کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے اور شیعیت کی بنیاد اس پر رکھے ہوئے ہے کس طرح ثقلین کی مخالفت کرتا ہے، اللہ ہی سے مدد و توفیق کی امید ہے اور اسی سے سیدھی راہ تک پہنچنے کی التجا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا جو سورۂ نور کے نزول کے وقت ایمان لائے تھے اور نیک کام کئے تھے کہ ان میں سے ایک جماعت کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا، اور تسلط نصیب کرے گا جس طرح ان کے پہلوؤں کو خلافت سے نوازا مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں ارشاد ہے کہ

يَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا) اسی طرح دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے بارے میں بھی خلافت کے وعدہ کے علاوہ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ ان کے اس دین کو جو اللہ تعالیٰ کو پسندیدہ و مرغوب ہے زمین میں تمکن اور رواج عطا فرمائے گا یعنی اسے رواج و شہرت بخشے گا نیز وعدہ فرمایا کہ انہیں جو خوف اس وقت لاحق و درپیش ہے اس کو کامل امن و سکون سے بدل دے گا۔

یہ وہ مواعید ہیں جو آیت بالا میں اللہ تعالیٰ نے فرمائے اور اس کی شان لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ہے اس لئے ان کا وقوع پذیر ہونا ضروری ہے، ورنہ وعدہ خلافی لازم آئیگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارے وعدے پورے فرمائے اور ان امور کا وقوع پذیر ہونا ضروری ہے، ورنہ وعدہ خلافی لازم آئے گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارے وعدے پورے فرمائے اور ان امور کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد مبارک کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ امام مہدی سورہ نور کے نزول کے وقت موجود ہی نہ تھے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ گو موجود تھے، لیکن شیعوں کے گمان کے مطابق اللہ کا پسندیدہ و مرغوب دین اس وقت رائج نہ ہوسکا جس کے بارے میں شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جناب امیر اور ان کے شیعوں نے اپنے دین کو ہمیشہ پردہ اخفاء میں رکھا، اور مخالفین کے دین کے زیر سایہ اپنی زندگی گزاری ان کو مکمل امن اور پوری بیخوفی بھی نصیب نہ ہوسکی کیونکہ اکثر شہروں اور دور دراز ملکوں مثلاً شام مصر و مغرب میں آپ کی امامت تسلیم نہ ہوسکی چہ جائیکہ آپ کے احکام قبول کئے جاتے آپ کے لشکر اور احکام ہمیشہ شامی افواج سے خائف و ہراساں رہے پھر جناب امیر اس جماعت کے جس سے وعدہ خلافت ہوا ایک فرد ہیں اور ایک شخص پر جماعت کا لفظ بولنا اصول شیعہ کے خلاف ہے کم از کم تین افراد تو ہوں کہ ان پر جمع کا اطلاق صحیح ہو،

اب رہے وہ ائمہ جو جناب امیرؓ کے بعد پیدا ہوئے وہ اس سلسلہ میں قابل ذکر ہی نہیں کہ بوقت وعدہ نہ خود موجود تھے۔ نہ ان کا زمین پر تسلط ہوا۔ اور نہ ان کا پسندیدہ دین بقول شیعوں کے رائج ہی ہوا اور نہ ان کو زندگی بھر امن وسکون ہی نصیب ہوا بلکہ وہ ہمیشہ خوف زدہ اور روپوش ہی رہے،

ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خلافت فی الارض کا وعدہ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے تھا، اور وہ دین جو ان حضرات کے زمانہ میں رائج اور شائع ہوا وہی خدا کا پسندیدہ اور مرغوب دین تھا، یہی خلافت حقہ ہے جو امامت کے مرادف ہے،

اور ملا عبداللہ مشہدی نے بہت ہاتھ پاؤں مار کر اور بڑی چھان بین کے بعد اظہار الحق نامی کتاب میں کہا ہے کہ احتمال ہے کہ خلیفہ سے بمعنی لغوی مراد ہو، یعنی استخلاف سے مطلب صرف ایک شخص کو دوسرے کے بعد لانا ہو جیسا کہ بنی اسرائیل کے حق میں آیا ہے، عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ (قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنا دے)

اور یہ خاص معنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کی پیدا کردہ اصطلاح ہو، اور اس اصطلاح نے اہل سیر، محدثین، اور مورخین کے اقوال میں سید عالم و عالمیان صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد کے بعد اور مسلمانوں میں اسم امامت کے وجود میں آنے کے بعد مذکورہ مکتوبہ معنوں میں مشہور ہوا ہو،

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ کب کہا ہے کہ استخلاف بمعنی لغوی کلام میں مستعمل نہیں لیکن یہ تو خود شیعوں کا اپنا اصولی قاعدہ ہے کہ الفاظ قرآنی کو حتی الامکان شرعی اصلاحی معانی پر محمول کیا جائے لغوی معنوں پر محمول نہ کیا جائے ورنہ تمام شریعت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور دینی احکام میں سے کسی کا ثبوت نہ مل سکے گا، مثلاً قرآن مجید میں جہاں کہیں ایمان کا لفظ آئے وہاں اس کے لغوی معنے تصدیق مراد لیں یا صلوٰۃ سے دعا، حج سے قصد اسی طرح دوسرے احکام تو کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہ ہو گا اس لئے نماز حج اور ایمان سے شرعی اصلاحی معنے ہی مراد لئے جائیں گے،

اب رہی یہ بحث کہ خلیفہ کے یہ معنے شرعی اصطلاح ہیں یا بعد کے نکالے ہوئے، تو اس بارے میں ہم خود شیعوں ہی کو پنچ بناتے اور کہتے ہیں کہ وہ چاہیں تو اس حدیث سے تمسک کرکے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت ثابت کریں وہ حدیث یہ ہے، اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی تو میرے لئے ایسا ہے جیسے موسیٰ کے لئے ہارون اور اس حدیث کے ساتھ قرآن کی یہ آیت لگانا نہ بھولیں کہ اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ میری قوم میں تو میرا خلیفہ ہو جا)

یا چاہیں تو اس حدیث سے ایسا کر دکھائیں یَا عَلِیُّ اَنْتَ خَلِیْفَتِیْ مِنْ بَعْدِیْ۔ اے علی تو میرے بعد میرا خلیفہ ہے اس کوشش ناکام کے بعد وہ خود ہی کہہ اٹھینگے کہ حقیقت وصداقت کیا ہے اور یہی نہیں پھر ان کو لفظ امام سے امامت کے اصلاحی معنی ثابت کرنا بھی بہت دشوار ہو جائے گا، کیونکہ قرآن مجید بایں معنی مستعمل نہیں،

اور خدا اپنی پناہ میں رکھے کہ اگر نواصب قرآن کی دو چار آیات بطور شہادت تلاوت کرکے لفظ امام کے خراب معنے مراد لیں تو ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا مثلاً وہ آیت پڑھ دیں، فَقَاتِلُوْا اَئِمَّةَ الْکُفْرِ (سرداران کفر سے لڑو) یا وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ (ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف)،

اور جو شخص بھی قرآن مجید میں غور وفکر سے کام لے کر اس کا مطالعہ کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن

مجید میں غور و فکر سے کام لے کر اس کا مطالعہ کریگا، تو اسے معلوم ہو جائے گا، کہ قرآن مجید میں لفظ امام بمعنی رئیس عام میں مستعمل نہیں ہے بلکہ بمعنی نبی، رشد یا ہادی کے استعمال ہوا ہے، بخلاف لفظ خلیفہ کے کہ وہ ہر جگہ لفظ فی الارض کے ساتھ متصل ہے، جو تصرف عام پر دلالت کرتا ہے،

اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی صحت خلافت پر ہم صرف لفظ استخلاف سے دلیل نہیں لائے کہ اس میں بحث کی گنجائش ہو بلکہ ہمارا نکتہ استدلال تو استخلاف کی وہ نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، لہذا جب استخلاف لغوی معنے کے ساتھ حق جل مجدہ کی طرف منسوب ہو گا تو وہ لامحالہ استخلاف شرعی ہی ہو گا،

اور ہم اس سلسلہ میں علمائے شیعہ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں، کہ وہ یہ بتائیں کہ بنی اسرائیل کو آل فرعون کے بجائے صاحب تخت و تاج بنانا اور آل فرعون و عمالقہ کے بجائے زمین مصر و شام میں تصرف عام ان کے ہاتھ میں دیدینا حق تھا، یا باطل و ناصواب، اب ان کی مرضی ہے کہ جواب میں وہ کونسی شق اختیار کرتے ہیں، ہمارا مقصد ہر حال میں حاصل ہوتا،

اور اگر ملا جی کا دل خوش کرنے کو ہم ان سب سے قطع نظر کرلیں تب بھی ان کا مدعا و مقصد حاصل نہیں ہو گا بلکہ شگاف اور گہرا اور زیادہ وسیع ہو جائے گا، کیونکہ استخلاف لغوی تو تمام امت کو شامل ہے جو بھی ایمان و عمل صالح رکھتا ہو گا وہ اس میں داخل اور اس کا مصداق ہو گا۔ اور خلفائے ثلاثہ ملا جی کے نزدیک بھی ایمان و عمل صالح کے حامل تھے تو وہ بھی اس استخلاف لغوی میں داخل ہوئے،

پھر دوسرے ذرا زیادہ باریک بین اور دقیقہ سنج شیعوں نے بھی اس آیت کے مفید مطلب معنے متعین کرنے میں بہت زور لگایا ہے، اور ان کی اس سعی و جہد کا حاصل چند توجیہات کی شکل میں سامنے آیا ہے " اول یہ کہ آیت میں من بیان کے لئے ہے تبعیض کے لئے نہیں ہے، اور استخلاف کے معنے کسی زمین کو وطن بنانے کے ہیں "

اس پر ہم کہتے ہیں کہ جب من ضمیر پہ داخل ہو تو اس کو بیانیہ کہنا اہل عرب کے استعمال کے خلاف ہے اور یہ مان بھی لیں تو پھر عملوا الصالحات کی قید لغو اور بیکار ثابت ہوتی ہے کیونکہ زمین میں وطنیت جس طرح نیک عمل والے کو حاصل ہے اسی طرح برے اعمال والے کو بھی ہے، بلکہ اس کو تو بڑے اچھے اور خوب تر نوعیت کی وطنیت حاصل ہے، اور یہی نہیں اس صورت میں تو ایمان کی قید بھی بیکار ہو گی کیونکہ وطنیت تو کفار کو بھی حاصل ہے، اور لغو و بیکار کلام کی قرآن مجید میں موجودگی محال و باطل ہے،

اور دوسرے یہ کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، اور جمع کا صیغہ بطور تعظیم ہے یا آپ اور آپ کی اولاد یعنی ائمہ مراد ہیں"،

اس پر ہم کہیں گے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی دین کی برقراری و ثبات اور خوف سے امن نصیب نہ ہوا تو وعدہ خلافی لازم آئی اور واللہ لا یخلف المیعاد!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں خلیفہ بنانا، دین پسندیدہ الٰہی کو رواج دینا خوف کا زائل ہونا اور ریا و شرک سے پاک عبادات کا رواج پانا، ان سب باتوں کا مومنین صالحین کی جماعت کے لئے اللہ تعالیٰ کا وعدہ

ہے، اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ اس امت کی پوری زندگی میں یہ امور معرض وجود میں نہیں آئے، لہٰذا مجبوراً ایسے زمانے اور ایسے چند اشخاص کی تعیین لازم ہے کہ جن میں یہ سب باتیں بیک زمانہ و وقت موجود ہوں اور یہ مذکورہ بالا اجتماعات اس جگہ بیکار و لغویات ثابت ہوتے ہیں، پس اہل سنت نے اس آیت کے صحیح مصداق کی تعیین میں جو اللہ تعالیٰ کے سچے اور پکے وعدہ پر مشتمل ہے، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام کی طرف رجوع کیا جو نہج البلاغہ میں مذکور ہے نہج البلاغہ ان کے نزدیک بلاشک وشبہ اصح الکتب اور متواتر شمار ہوتی ہے تو اس میں مذکور آپ کے بابرکت کلام نے اس اختلاف و نزاع کی جڑ ہی کاٹ دی آپ کا فیصلہ ہے کہ یہ جماعت خلفائے ثلٰثہ اور ان کے معاونین و مددگاروں کی ہے، اور آپ نے خود کو بھی انہیں مددگاروں میں شمار فرمایا ہے،

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

ایمان حضرات کو چاہیئے کہ آپ کے اس کلام صدق نظام کو دل کے کانوں سے سنیں، اور اپنی عقل خام کو پس پشت پھینکدیں۔ کہ اب اس معاملہ میں لیت و لعل کی آپ نے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی،

نہج البلاغہ میں یوں ذکر ہے کہ جب اہل فارس کی جمع شدہ افواج کے مقابلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بنفس نفیس شریک ہونے کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو آپ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ لَمْ يَكُنْ نَصْرُهُ وَلَا خِذْلَانُهُ بِكَثْرَةٍ وَلَا بِقِلَّةٍ وَهُوَ دِينُ اللّٰهِ الَّذِي أَظْهَرَهُ وَجُنْدُهُ الَّذِي أَعَدَّهُ وَأَمَدَّهُ حَتّٰى بَلَغَ مَا بَلَغَ وَطَلَعَ حَيْثُ طَلَعَ وَنَحْنُ عَلٰى مَوْعُودٍ مِنَ اللّٰهِ حَيْثُ قَالَ عَزَّ اسْمُهُ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ الخ وَاللّٰهُ مُنْجِزٌ وَعْدَهُ وَنَاصِرٌ جُنْدَهُ وَمَكَانُ الْقَيِّمِ مِنَ الْإِسْلَامِ مَكَانُ النِّظَامِ مِنَ الْخَرَزِ فَإِنِ انْقَطَعَ النِّظَامُ تَفَرَّقَ وَذَهَبَ ثُمَّ مُتَفَرِّقٌ لَمْ يَجْتَمِعْ وَالْعَرَبُ الْيَوْمَ وَإِنْ كَانُوا قَلِيلًا فَهُمْ كَثِيرُونَ بِالْإِسْلَامِ عَزِيزُونَ بِالْاِجْتِمَاعِ فَكُنْ قُطْبًا وَاسْتَدِرِ الرَّحٰى بِالْعَرَبِ وَأَصْلِهِمْ دُونَكَ نَارَ الْحَرْبِ فَإِنَّكَ إِنْ شَخَصْتَ مِنْ هٰذِهِ الْأَرْضِ انْتَقَضَتْ عَلَيْكَ الْعَرَبُ مِنْ أَطْرَافِهَا وَأَقْطَارِهَا حَتّٰى يَكُونَ مَا تَدَعُ وَرَاءَكَ مِنَ الْعَوْرَاتِ أَهَمَّ إِلَيْكَ مِمَّا بَيْنَ يَدَيْكَ وَكَانَ قَدْ إِنَّ الْأَعَاجِمَ إِنْ يَنْظُرُوا إِلَيْكَ غَدًا يَقُولُوا هٰذَا أَصْلُ الْعَرَبِ فَإِذَا قَطَعْتُمُوهُ اسْتَرَحْتُمْ

بے شک یہ وہ دین ہے جس کی نصرت و بے نصرتی کثرت و قلت پر مبنی نہیں اور یہ دین اللہ کا وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا اور وہ فوج ہے جس کو اللہ نے عزت دی اور اس کی مدد فرمائی یہاں تک کہ وہ اس اوج تک پہنچا جہاں اسے پہنچنا تھا اور اتنا بلند و ظاہر ہوا جتنا اس کو بلند و ظاہر ہونا تھا، اور ہم اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر ہیں جو اس نے فرمایا تھا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا سے خوفهم امنا تک اور اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے اور اپنی فوج کا مددگار اور اسلامی رئیس کا مرکز قیام گاہ، موتی کی لڑی کی طرح ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو سارے موتی بکھر جائیں، اور بہت سی بکھری ہوئی چیزیں اکٹھی نہیں ہوا کرتیں، اور آج عرب گو افرادی اعداد سے کم ہیں، مگر اسلام کی قوت سے بہت ہیں اور اتفاق و اتحاد کے سبب قوت غالب! پس تم تو قطب بنے مرکز پر جمے رہو اور اردگرد عرب کی چکی چلنے دو اور انہی کو لڑائی کی آگ سے نمٹنے دو

يَكُونُ ذَلِكَ أَشَدَّ لِكَلَبِهِمْ عَلَيْكَ وَطَمَعِهِمْ فِيكَ فَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ مَسِيرِ الْقَوْمِ إِلَى قِتَالِ الْمُسْلِمِينَ فَإِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ هُوَ أَكْرَهُ لِمَسِيرِهِمْ مِنْكَ وَهُوَ أَقْدَرُ عَلَى تَغْيِيرِ مَا يَكْرَهُهُ وَأَمَّا مَا ذَكَرْتَ مِنْ عَدَدِهِمْ فَإِنَّا لَمْ نَكُنْ نُقَاتِلُ فِيمَا مَضَى بِالْكَثْرَةِ وَإِنَّمَا كُنَّا نُقَاتِلُ بِالنَّصْرِ وَالْمَعُونَةِ انتهى بلفظه

خود کو اس میں نہ ڈالو اگر تم مرکز چھوڑ کر اس زمین سے نکل کھڑے ہوئے تو اس کے اطراف و جوانب سے عرب مرکز (تم پر) ٹوٹ پڑیں گے، یہاں تک سرحدی خطرات جو تم اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ گے اتنے زیادہ اہم ہوں گے جو تمہاری سامنے کی مہم کے خطرہ سے بھی زیادہ ہوں گے اور کل جب عرب تم کو مرکز سے ہٹا دیں گے تو کہیں گے کہ "خلاصہ عرب" یہی ہے، اس پہ قابو پا کر مٹا ڈالو گے تو آرام سے بیٹھو گے اس لئے تمہارا مرکز سے ہٹنا ان کی دلیری اور جرأت کا تمہارے متعلق لالچی سوچ کا سبب ہو گا،

اور یہ جو تم نے کہا ہے کہ قوم عجم مسلمانوں سے لڑنے نکل پڑی ہے تو ان کا نکلنا تم سے زیادہ اللہ کو ناگوار ہوا ہے ناپسندیدہ چیز بدل دینے پر زیادہ قادر ہے اور تم نے جو کثرت تعداد کا ذکر کیا ہے تو ماضی میں ہم کثرت کی بنا پر کبھی نہیں لڑے ہم تو اللہ کی مدد و نصرت کے بھروسے اور اعتماد پر لڑا کرتے تھے"

یہ عبارت سراسر ہدایت ہے اس سے تمام شبہات کا حل اور پوری تسکین و دلجمعی حاصل ہوتی ہے اور اللہ کے وعدہ کی سچائی ظہور پذیر ہوئی،

اسی سلسلہ بالا کی ایک دوسری آیت یہ ہے، جو خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہ کی صحت خلافت پہ دال ہے مگر شیعہ جس کی مخالفت کرتے ہیں،

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

ان اعراب سے کہو جو (حدیبیہ کے موقعہ پر ساتھ نہ تھے) پیچھے رہ گئے تھے کہ عنقریب تمکو ایک بڑی جنگ جو قوم سے (لڑنے کے لئے) دعوت دی جائیگی تم ان سے لڑو گے یا وہ (بغیر لڑے) مسلمان ہو جائیں گے، پس اگر اس وقت تم نے اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تم کو بہت اچھا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تم نے (اس دعوت سے) پہلوں کی طرح روگردانی کی تو پھر تم کو بڑا دردناک عذاب دیا جائے گا"

یہ آیت بعض عرب قبائل مثلاً اسلم، جہنیہ، مزینہ، غفار، اور اشجع کے بارے میں ہے، جو سفر حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب نہ تھے،

اور دونوں فرقوں کے مورخین اسپر متفق ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سوائے غزوہ تبوک کے کوئی ایسی جنگ پیش نہیں آئی جس میں تمام عرب کو دعوت قتال دی جاتی اور غزوہ تبوک تو بہر حال یہاں مراد ہے ہی نہیں اس لئے کہ اس لڑائی کے لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ یا تو اپنے دشمنوں سے لڑو گے یا وہ اسلام لے آئیں گے اور غزوہ تبوک میں ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی وقوع پذیر نہیں ہوئی نہ قتال ہوا نہ مخالفین اسلام لائے، لہٰذا وہ کوئی اور ہی لڑائی ہے اس لئے اس کو کسی اور زمانہ میں تلاش کرنا چاہیے اور وہ زمانہ لامحالہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی خلیفہ کا ہی ہو گا چنانچہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کے عہد میں عرب کو قتال مرتدین کے لئے دعوت دی گئی اور اہل فارس و روم سے لڑنے کے لئے دعوت خلیفہ اول و خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دی گئی،

بہر حال خلیفہ اول کی خلافت قابل تسلیم قرار پائی اس لئے کہ ان کی دعوت کی اطاعت پر اچھے اجر کا وعدہ کیا گیا اور عدم اطاعت پر عذاب الیم کی دھمکی دی گئی۔ اور جو واجب الاطاعت ہو وہی امام و خلیفہ ہے،

اس آیت کے متعلق شیخ ابن مطہر حلی نے بڑی تنگ و دو کے بعد ایک جواب گھڑا ہے کہ داعی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ممکن ہے کہ آپ نے دوسری لڑائیوں میں جن میں قتال نہ ہوا ہو دعوت دی ہو، لیکن وہ نقل و بیان میں نہ آئی ہو،

اس جواب کا لغو و لچر ہونا بالکل سامنے کی بات ہے کہ اخبار و سیر اور تواریخ میں محض احتمالات سے تمسک و استدلال عقلمندوں کا شیوہ نہیں، ورنہ تو ہر بات میں احتمال نکالا جا سکتا ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے غدیر خم کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت منسوخ و موقوف کر کے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کا حکم فرمایا ہو، اور لوگوں کو اس پر اہمیت کی ساتھ تاکید کی ہو، اس طرح کے اور بھی معاملات ہو سکتے ہیں،

اور بعض شیعہ کہتے ہیں کہ داعی حضرت امیر ہیں، کہ جنہوں نے عہد شکنوں، بدکاروں اور مرتدین کے قتال کے لئے دعوت دی،

یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کے جواب میں بہت غور و خوض کی ضرورت پڑے، جواب صاف ظاہر ہے کیونکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا قتال طلب اسلام کے لئے نہ تھا بلکہ وہ محض انتظام امامت کے لئے تھا، اور عرف قدیم و جدید میں یہ کہیں منقول نہیں کہ امام کی اطاعت اسلام ہے، اور اس کی مخالفت کفر ہے،

اور اس کے علاوہ خود شیعوں نے صحیح روایات سے نقل کیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا۔ اِنَّكَ يَا عَلِيُّ تُقَاتِلُ عَلٰى تَاوِيْلِ الْقُرْاٰنِ كَمَا قَاتَلْتُ عَلٰى تَنْزِيْلِهٖ (اے علی تم تاویل قرآن پر لڑو گے جس طرح میں اس کے نزول پر لڑا) اور ظاہر ہے کہ مخالفین سے تاویل قرآن پر لڑنا قبول تنزیل قرآن پر لڑنے سے بعد میں ہوا۔ اور قبول تنزیل قرآن اسلام کے بغیر متصور نہیں بلکہ وہ عین اسلام ہے گویا تاویل قرآن پر مقاتلہ اور اسلام پر مقاتلہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ بالکل ظاہر بات ہے،

اسی سلسلہ کی ایک اور روایت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۤئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۤءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

"اے ایمان والو۔ تم میں جو کوئی دین سے پھر جائے گا تو جلد ہی اللہ تعالیٰ ان کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کو اللہ تعالیٰ بھی پسند کرتا ہو گا اور وہ بھی اللہ سے محبت کرتے ہوں گے، جو مسلمانوں سے دبنے والے ہوں گے اور کافروں کو دبانے والے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں گے ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈریں گے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے،،

اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف ہے جنہوں نے مرتدین سے قتال کیا، ایسے بلند اوصاف سے کی ہے جن سے بالاتر اوصاف اصطلاح قرآن میں نہیں۔

پہلا وصف، ان کے درجہ قرب اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ، کہ وہی اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے بھی وہ محبوب ہوں گے، گویا وہ محبوب الٰہی بھی ہوں گے اور محب الٰہی بھی،

دوسرا وصف۔ مومنین کے ساتھ ان کا معاملہ۔

تیسرا وصف۔ کفار کے ساتھ ان کا رویہ اور طرز عمل،

چوتھا وصف۔ منافقین اور ضعیف الایمان سے ان کا برتاؤ،

اور ظاہر ہے کہ امام کا معاملہ یا خدا کے ساتھ ہوتا ہے یا خلق کے ساتھ۔ اور خلق، مومن ہوگی یا کافر یا منافق اور ضعیف الایمان اور جب امام چاروں معاملوں میں خدا کا پسند فرمودہ ہو اور اس کا عمل بھی راست و درست ہو تو وہی امام برحق ہے اسی لئے اخیر آیت میں اپنے فضل و رحمت کی نوید ذکر فرمائی،

اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ مرتدین کی جنگ خلیفہ اول اور آپ کے پیروکاروں سے ہوئی کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد کے آخر میں تین گروہ مرتد ہوئے،

(۱) اسود عنسی ذوالخمار کی قوم بنی مدلج جس نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور فیروز دیلمی کے ہاتھوں مارا گیا،

(۲) مسیلمہ کذاب کے ساتھی بنو حنیفہ۔ مسیلمہ خلیفہ اول کے عہد میں وحشی کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔

(۳) طلیحہ بن خویلد متنبی کی قوم بنو اسد حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی سرکوبی کو بھیجا وہ ان کے ڈر سے شام بھاگ گیا۔ آخر میں ایمان لے آیا۔

اور خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں سات گروہ مرتد ہوئے،

(۱) عیینہ بن حصن کی قوم بنو فزارہ،
(۲) قرہ ابن سلمہ کی قوم غطفان،
(۳) ابن عبد یالیل کی قوم بنو سلیم،
(۴) مالک بن نویرہ کی قوم بنو یربوع
(۵) سجاح بنت المنذر کی قوم بنو تمیم (یہ مسیلمہ کذاب کی زوجہ تھی اور متنبیہ)
(۶) اشعث بن قیس کندی کی قوم بنو کندہ
(۷) بنو بکر یہ بحرین میں رہتے تھے!

مرتدین کے ان تمام فرقوں کو خلیفہ اول نے بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور سب کو اسلام میں واپس لائے مؤرخین کا ان واقعات پر اجماع ہے!

خلیفہ دوم کے عہد میں ایک گروہ مرتد ہو کر نصاریٰ سے جا ملا،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرتدین کے ساتھ لڑنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا اس سلسلہ میں خود آپ فرماتے

ہیں، اُبْتُلِیْتُ بِقِتَالِ اَھْلِ الْقِبْلَۃِ میں تو اہل قبلہ کے ساتھ لڑائی میں مبتلا ہو گیا)، آپ کا یہ فرمان امامیہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے،

اور اگر امامیہ منکرین امامت کو جنہیں جناب امیر اہل قبلہ فرما رہے ہیں مرتدین میں شمار کریں تو ہم کہیں گے کہ عرف قدیم وجدید میں اصل دین سے انکار کرنے والے کو مرتد کہتے ہیں، اگر غلط تاویل سے کسی اسلامی عقیدہ کا منکر ہو جائے تو ایسے شخص کو مرتد کہنا عرف عام میں رائج نہیں اور قرآن کے معانی کو بالاجماع لغوی عرف پر محمول کرنا چاہیئے ہر قوم کے الگ الگ اصطلاحی معنوں پر نہیں۔

اور پھر من دینکم کے لفظ کی واضح دلالت یہی بتاتی ہے کہ اصل دین اور پورے دین سے جو منکر ہو وہ مرتد ہے کسی ایک مسئلہ سے انکار پر نہیں،

اور خلیفہ اول کے عہد میں مانعین زکوٰۃ کو جو مرتد کہا گیا تو اس لئے کہ وہ زکوٰۃ کی فرضیت کے منکر تھے اور جو ضروریات دین میں سے کسی ضرورت کا انکار کرے وہ گویا اصل (بنیاد) دین کا منکر ہے اور امامت کو خود شیعہ بھی ضروریات دین میں سے نہیں مانتے جس کے انکار کی وجہ سے کوئی مرتد کہلا سکے یا کافر ہو جائے اس سلسلہ میں فاضل کاشی کا کلام بحوالہ روایات کافی وغیرہ باب دوم میں مذکور ہو چکا۔

اور ملا عبداللہ مصنف اظہار الحق، کی ایک تحریر جو سوال وجواب کی شکل میں اس موقعہ کے بہت مناسب ہے ملاحظہ فرمائیے وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں امامیہ کے پاس کوئی صریح نص نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے پڑتے ہیں، اور اگر نص صریح ہے تو پھر جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی وہ مرتد ہونگے،

اس کے جواب میں وہ رقمطراز ہے کہ نص صریح کے انکار سے کفر اس وقت لازم آتا ہے، جب منصوص شدہ امر کے متعلق باطل ہونے کا اعتقاد رکھے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس نص کے بارے میں (معاذ اللہ) تکذیب کرے،

لیکن اگر نص کو، حق اور درست تسلیم کرے، مگر دنیوی اغراض، یا حب مال وجاہ کے سبب اس کو ترک کرے اس پر عمل نہ کرے تو یہ فسق وعصیان تو ہوگا مگر کفر نہ ہوگا،

مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی پر قرآن وحدیث میں حکم صریح موجود ہے اور یہ باجماع امت فرض ہے اب اگر کوئی اس کی فرضیت کا انکار کر دے تو کافر ہوگا، لیکن اگر فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے مال کی محبت، طبعی بخل، یا کسی ایسی ہی وجہ سے ادائیگی نہ کرے اور اپنے ذمہ اسے باقی رکھے تو یہ گنہگار ہوگا۔ اور وہ لوگ جو خلیفہ اول کی خلافت پر متفق ہوئے یہ نہیں کہتے کہ اس پر پیغمبر نے نص فرمائی ہے لیکن یہ جھوٹ ہے۔ بلکہ بعض اوقات بعض اشخاص نے نص کے تحقیق سے انکار کیا ہے مگر دور از کار تاویلات سے کام لے کر ملا کا کلام ختم ہوا۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں (جس کا حوالہ آ بھی چکا ہے) جو امامیہ کے نزدیک بطریق صحیح مروی ہے فرمایا ہے، اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِی الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِیْہِ مِنَ الزَّیْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ وَالشُّبْھَۃِ وَالتَّاوِیْلِ۔ ہم اپنے اسلامی بھائیوں سے اس لئے لڑ بیٹھے کہ اسلام میں کجی بے راہ روی اور شبہات

دتاویلات کا عمل دخل ہونے لگا تھا)

پھر یہ بات بھی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے سے لڑنے والوں کو سب وشتم کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ رضی نے نہج البلاغہ میں بیان کیا ہے۔ حالانکہ مرتدین پر دشنام منع نہیں ہے۔

اور اگر ان سب باتوں کے علی الرغم یہ مان بھی لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مرتدین سے اپنے عہد میں جہاد کیا۔ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے آخر اور خلیفہ اول کے اول عہد میں جو افراد یا قبیلے، مرتد ہو گئے تھے ان سے بھی تو کسی نے قتال کیا ہو گا، تو وہ جنگ کرنے والا بھی اس تعریف و توصیف میں شریک ہوا اور مدعا ثابت ہو گیا)۔

اور یہ اصولی قاعدہ طے شدہ ہے کہ جب حرف مَنْ شرط و جزا میں واقع ہوتا ہے، تو اس سے عام معنے مراد ہوتے ہیں، مَنْ دَخَلَ حِصْنَ كَذَا فَلَهٗ كَذَا (جو کوئی اس قلعہ میں داخل ہو اس کے لئے یہ یہ ہے) میں دیکھا جا سکتا ہے،

لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو کوئی مرتد ہو گا اس کے لئے مذکورہ اوصاف سے متصف ایک قوم پیدا ہو گی،

خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب سلسلہ ارتداد بہت تیزی سے بڑھا، اس وقت ان اوصاف کی کسی قوم کا وجود تسلیم نہ کریں تو اس سے دو خرابیاں لازم آتیں ایک تو یہ کہ مرتدین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا۔ اور دوسرے یہ کہ اس صورت حال سے وعدہ الٰہی کے خلاف بات ثابت ہو جاتی (مگر چونکہ اوصاف قرآنی کی حامل قوم موجود تھی انہوں نے مرتدوں کا قلع قمع کر ڈالا اور باقی کو اسلام میں لوٹا لائے) اس قوم کی تعیین میں سوال اٹھے کہ وہ کون تھی۔ جس نے صدر اول میں مرتدین سے قتال کیا؟ تو یہ بات تو بلا شک وشبہ کہی جا سکتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو ان کا مقابلہ نہیں کیا وہ اس وقت اس پوزیشن ہی میں نہیں تھے، اس لئے لا محالہ یہ کارنامہ خلیفہ اول اور آپ کے پیروکاروں کے چار و ناچار سب کو ماننا ہی پڑے گا،

اس وقت ایک تو جناب امیر رضی اللہ عنہ مدافعت کی پوزیشن میں نہیں تھے، دوسرے ان کے دوست ساتھی اور لشکری بھی ان صفات سے متصف نہ تھے، کیونکہ ان کے متعلق جو شکایت جناب امیر رضی اللہ عنہ کو تھی اس کی ایک جھلک آپ گزشتہ اوراق میں بحوالہ نہج البلاغہ ملاحظہ فرما چکے ہیں، اور کوئی حرج نہیں کہ اس موقع پر بھی بات کو پختہ تر کرنے کی خاطر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دیگر فرمودات جو نہج البلاغہ میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں پیش کر دیئے جائیں، یہ تو ایسی باتیں ہیں کہ ان کی تکرار سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ کیونکہ مشک کو جتنی مرتبہ بھی سونگھو وہ خوشبو ہی دے گی،

نہج البلاغہ میں ہے کہ جناب امیر نے اپنے ساتھیوں، دوستوں، کی شکایت کرتے ہوئے کہ وہ ان کی دعوت قبول نہیں کرتے اور ان کے وعظ و نصیحت پر کان نہیں دھرتے وہ عبارات ذیل سے تفصیلا بیان کی ہے،

اَمَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَیَظْهَرَنَّ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمُ عَلَیْكُمْ لَا اَنَّهُمْ اَوْلٰی بِالْحَقِّ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لِاِسْرَاعِهِمْ اِلٰی	خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے سن لو کہ یہ قوم (مخالف) تم پر ضرور غالب آکر رہے گی اس لئے،

بَاطِلِ صَاحِبِهِمْ وَاِبْطَائِكُمْ عَنْ حَقِّي وَلَقَدْ اَصْبَحَتِ
الْاُمَمُ تَخَافُ ظُلْمَ رُعَاتِهَا وَاَصْبَحْتُ اَخَافُ ظُلْمَ رَعِيَّتِي
اِسْتَنْفَرْتُكُمْ لِلْجِهَادِ فَلَمْ تَنْفِرُوْا وَاَسْمَعْتُكُمْ فَلَمْ
تَسْمَعُوْا وَدَعَوْتُكُمْ سِرًّا وَجَهْرًا فَلَمْ تَسْتَجِيْبُوْا وَنَصَحْتُ
لَكُمْ فَلَمْ تَقْبَلُوْا اَشُهُوْدٌ كَغُيَّابٍ وَعَبِيْدٌ كَاَرْبَابٍ اَتْلُوْا
عَلَيْكُمُ الْحِكَمَ فَتَنْفِرُوْنَ وَاَحُثُّكُمْ عَلَى جِهَادِ اَهْلِ
الْبَغْيِ فَمَا اٰتِي عَلَى اٰخِرِ قَوْلِي حَتّٰى اَرَاكُمْ مُتَفَرِّقِيْنَ
اَيَادِيَ سَبَا تَرْجِعُوْنَ اِلَى مَجَالِسِكُمْ وَتَتَخَادَعُوْنَ عَنْ
مَوَاعِظِكُمْ اُقَوِّمُكُمْ غُدْوَةً وَتَرْجِعُوْنَ اِلَيَّ عَشِيَّةً
كَظَهْرِ الْحَيَّةِ عَجَزَ الْمُقَوِّمُ وَاَعْطَلَ اَيُّهَا الشَّاهِدَةُ
اَبْدَانُهُمْ الْغَائِبَةُ عَنْهُمْ عُقُوْلُهُمْ الْمُخْتَلِفَةُ
اَهْوَاؤُهُمْ الْمُبْتَلٰى بِهِمْ اُمَرَاؤُهُمْ صَاحِبُكُمْ يُطِيْعُ
اللّٰهَ وَاَنْتُمْ تَعْصُوْنَهٗ وَصَاحِبُ اَهْلِ الشَّامِ يَعْصِي
اللّٰهَ وَهُمْ يُطِيْعُوْنَهٗ لَوَدِدْتُ وَاللّٰهِ اَنَّ مُعَاوِيَةَ
صَارَفَنِي بِكُمْ صَرْفَ الدِّيْنَارِ بِالدِّرْهَمِ وَاَخَذَ
مِنِّي عَشَرَةً مِنْكُمْ وَاَعْطَانِي رَجُلًا مِنْهُمْ،

نہیں کہ وہ تم سے زیادہ حق پر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ
اپنے سردار کے غلط حکم کو بجا لانے پر ہر دم چاق و چوبند
اور تند و تیز ہیں۔ تمہاری طرح میرے احکام حق کی بجا آوری
میں کم ہمت و سست اور ڈھیلے نہیں، دوسری ساری
قومیں تو اپنے امراء اور سرداروں کے ظلم سے ڈرتی ہیں،
اور میرا یہ حال ہے کہ میں اپنی ہی رعایا کے ظلم سے خائف
ہوں میں نے تم کو جہاد کے لئے نکالنا چاہا مگر تم نہ نکلے
تم کو کچھ سنانا چاہا، مگر تم نے سن کے نہ دیا میں نے تم
کو ڈھکے کھلے ہر طرح بلایا مگر تم نے سنا ہی نہیں میں نے
تم کو کوئی نصیحت کی تو تم نے قبول نہ کی تم حاضر تو ہو مگر
غائب (دماغ والے)، ہو تو غلام مگر مالکانہ انداز کے
میں تمہیں حکمت کی باتیں سناتا ہوں مگر تم فرار ہو جاتے
ہو میں تم کو جہاد کی ترغیب دلا رہا ہوتا ہوں اور بات ختم
بھی نہیں کر پاتا کہ تم رفوچکر ہو جاتے ہو تم
بھی تم سبا کی طرح ہو کر مجلسوں میں تو گھسے رہتے ہو
مگر نصیحتوں کے ساتھ فریب بازی کرتے ہو صبح میں تم کو
سیدھا کرتا ہوں مگر شام کو تم پھر سانپ کی پیٹھ کی طرح ٹیڑھے ہو جاتے ہو تم کو سیدھا کرنے والا بھی عاجز اور لاچار
ہو جاتا ہے، اسے لوگو! جن کے جسم تو موجود ہیں، مگر عقل و شعور غائب، اور ان کی خواہشات اختلاف کا شکار ان کی
وجہ سے ان کا امیر آزمائش میں پڑ گیا ہے، تمہارا امیر تو اللہ کا مطیع ہے مگر تم امیر کے نافرمان، اور اہل شام کا امیر
تو اللہ کا نافرمان ہے مگر اس کی قوم اس کی مطیع، خدا کی قسم میرا دل چاہتا ہے کہ دینار و درہم میں کمی بیشی کے سودے
کی طرح میں معاویہ سے تمہارا سودا کر لوں کہ وہ تم میں سے دس نفر لے کر اپنا ایک پیروکار مجھے دیدے۔"

اور جب آپ کے دونوں عامل و حاکم، جناب عبداللہ بن عباس و جناب سعید بن عمران، واپس لوٹ آئے
اور آپ کو یہ خبر سنائی کہ اس علاقہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے امیر بسر بن ارطاۃ نے اس لئے تسلط و قبضہ
جما لیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کمک نہیں پہنچی، حالانکہ جناب امیر نے حکام یمن کو پہلے ہی سے بڑی تاکید
اور سختی سے یہ لوگوں کو مدد کے احکام دے دیئے تھے، مگر لشکریوں نے سنی ان سنی کر دی، حتی کہ معاملہ ہاتھ سے نکل
گیا اور حکام اپنا اپنا مستقر چھوڑ کر چلے آئے، اس وقت آپ نے فرمایا

اُنْبِئْتُ اَنَّ بُسْرًا قَدِ اطَّلَعَ الْيَمَنَ وَاِنِّي وَاللّٰهِ لَاَظُنُّ
هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ سَيُدَالُوْنَ مِنْكُمْ بِاجْتِمَاعِهِمْ عَلَى بَاطِلِهِمْ
وَتَفَرُّقِكُمْ عَنْ حَقِّكُمْ وَبِمَعْصِيَتِكُمْ اِمَامَكُمْ فِي الْحَقِّ

"مجھے خبر ملی ہے کہ بسر یمن پر مسلط ہو گیا ہے خدا
کی قسم میں جانتا ہوں کہ یہ قوم تم پر فتحیاب ہو گی کیونکہ
وہ باطل پر ہوتے ہوئے بھی متحد ہیں، اور تم حق پر بھی،

وَبِطَاعَتِهِمْ إِمَامَهُمْ فِي الْبَاطِلِ وَبِأَدَائِهِمُ الْأَمَانَةَ إِلَى صَاحِبِهِمْ وَخِيَانَتِكُمْ وَبِصَلَاحِهِمْ فِي بِلَادِهِمْ وَفَسَادِكُمْ فَلَوِ ائْتَمَنْتُ أَحَدَكُمْ عَلَى قَعْبٍ لَخَشِيتُ أَنْ يَذْهَبَ بِعَلَاقَتِهِ اَللّٰهُمَّ إِنِّي قَدْ مَلِلْتُهُمْ وَمَلُّونِي وَسَئِمْتُهُمْ وَسَئِمُونِي فَأَبْدِلْنِي بِهِمْ خَيْرًا مِنْهُمْ وَأَبْدِلْهُمْ بِي شَرًّا مِنِّي اَللّٰهُمَّ مِثْ قُلُوبَهُمْ كَمَا يُمَاثُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ لَوَدِدْتُ وَاللّٰهِ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ أَلْفَ فَارِسٍ مِنْ بَنِي فِرَاسِ بْنِ غَنْمٍ لَوْ دَعَوْتَ أَتَاكَ مِنْهُمْ فَوَارِسُ مِثْلُ أَرْمِيَةِ الْحَمِيمِ۔

منتشر اور بکھرے ہوئے ہو تم اپنے امام کی حق بات بھی نہیں مانتے اور نافرمانی کرتے ہو، مگر وہ ناحق بات میں بھی اپنے امام کی تابعداری کرتے ہیں وہ اپنے سردار کے نیک خواہ ہیں اور تم خیانت کا برتاؤ کرتے ہو وہ شہروں میں امن پھیلاتے ہیں اور تم فساد۔ اگر میں تم سے کسی کے پاس کوئی پیالہ امانت رکھوں تو مجھے ڈر ہے وہ اس کا کنڈا ہی نہ لے جائے، اے میرے اللہ میں ان سے بھر گیا یا یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں ان سے سیر ہو گیا تو مجھے ان سے بہتر یہ روکار عطا فرما۔ اور ان کو مجھ سے بدتر امیر، اے اللہ تو ان کو اس طرح گھلا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے، خدا کی قسم میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ تمہارے بدلے میرے پاس بنی فراس بن غنم کے صرف ایک ہزار سوار ہوتے کہ تو ان کو بلائے، تو کف اچھالتی موجوں کی طرح فوراً حاضر ہو جائیں"

اور ایک دوسرے خطبہ میں جس کا کچھ حصہ پہلے باب سوم میں گذر چکا یوں فرماتے ہیں،

اَيْمُ اللّٰهِ لَظَنِّي بِكُمْ لَوْ حَمِشَ الْوَغٰى وَاسْتَحَرَّ الْمَوْتُ قَدِ انْفَرَجْتُمْ عَنِ ابْنِ أَبِي طَالِبٍ انْفِرَاجَ الرَّأْسِ (خدا کی قسم تمہارے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ میدان کارزار میں موت کی گرم بازاری شروع ہو جائے تو تم ابن ابی طالب سے اس طرح الگ ہو جاؤ گے جس طرح سر سے بال،

پھر ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں۔ اَحْمَدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا قَضٰى وَقَدَّرَ مِنْ فِعْلٍ وَعَلَى ابْتِلَائِي بِكُمْ أَيَّتُهَا الْفِرْقَةُ الَّتِي إِذَا أَمَرْتُ لَكُمْ تُطِعْ وَإِذَا دَعَوْتُ لَمْ تُجِبْ ثُمَّ قَالَ بَعْدَ كَلَامٍ وَإِنِّي بِصُحْبَتِكُمْ مَلَلْتُ وَبِكُمْ غَيْرُ كَثِيرٍ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ فرمایا اور جو کام اس نے مقدر فرمایا میں اس پہ اس کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور اس پر بھی کہ اس نے مجھ کو تمہارے ساتھ مبتلا کیا، اے لوگو جب میں تم کو حکم دیتا ہوں تو تم اس کو نہیں مانتے اور جب بلاتا ہوں تو آتے نہیں، پھر اور باتیں فرما کر فرمایا بے شک میں تم سے بیزار ہوں اور تمہارے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتا ہوں۔

اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ حضرت معاویہ کے لشکر نے شہر انبار کو نہس نہس کر دیا ہے تو خود بنفس نفیس مکان سے نکل کر موضع نخیلہ تک جا پہنچے جو شہر کوفہ سے باہر تھا آپ کے پیچھے کچھ دوست بھی دوڑے آئے اور کہنے لگے آپ کے بدلے ہم کافی ہیں، تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم تم تو اپنی جانوں کو ہی نہیں سنبھال سکتے دوسرے کے لئے تم کیا کافی ہو گے، کوئی رعایا اگر اپنے حاکم سے شاکی ہے تو میں اپنی رعایا سے نالاں ہوں گویا میں تو ان کا تابع ہوں اور وہ میرے امیر، اور میں تو متعین شدہ ہوں اور وہ میرے تعین کرنے والے۔ تب آپ کے دوستوں کے گروہ میں سے دو افراد آگے بڑھے اور عرض کیا اے امیر المومنین میں اپنے اور اپنے بھائی کی جانوں کا مختار و ذمہ دار ہوں آپ حکم دیجئے ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے آپ نے فرمایا میرے مقصد کے لئے تم دونوں

کیا کام آؤ گے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قسم کے بیانات وخطابات بہت ہیں، جو سب کے سب نہج البلاغہ کے حاشیہ پر درج ہیں یہ کتاب شیعوں کے ہاں بڑی معتبر اور اصح الکتب اور متواتر شمار ہوتی ہے اس کے مندرجات سے کسی شیعہ کو انکار کی مجال نہیں،

اس بیان صادق سے صاف صاف عیاں ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مرتدین سے لڑنے والوں کے جو اوصاف بیان کئے ہیں، حضرت امیر کے لشکریوں میں ان کا موجود ہونا تو دور کی بات ہے ان کو تو اس کی ہوا بھی معلوم ہوتا ہے نہیں لگی تھی، وہ خائن تھے، اور چور بھی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ اور پھر وہ فساد پیشہ بھی تھے جن کے لئے ارشاد باری ہے، اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ اور انہوں نے اولوالامر کی اطاعت بھی نہیں کی جو خدا کا محب محبوب ہونے کا ذریعہ ہے، قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اللہ سے دوستی کا دعویٰ ہے تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تمکو اپنا دوست بنائے گا) اس طرح وہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کے تحت نہ آسکے نہ اس کا مصداق بن سکے اور وہ جناب امیر کی اطاعت کے بدلے، جناب امیر پر از راہ تکبر وسرکشی حکم چلاتے تھے، آپ کو ایذا اور صدمات پہنچاتے اسلئے تو وہ مرتدین کے بجائے) مومنین بلکہ امیرالمومنین پر غلبہ کرتے والے ہوئے، اور چونکہ باغیوں اور خارجیوں سے خوفزدہ اور ڈرتے تھے تو اَذِلَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (کافروں سے دبنے والے) ہوئے اور جہاد سے جان چرانے کے باعث يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے دور جا پڑے اور بجائے لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، کے لَا يَسْمَعُوْنَ نَصِيْحَةَ نَاصِحٍ (ناصح کی نصیحت نہیں سنتے تھے کی عبارت ان کے حال کی زیادہ ترجمانی کرتی ہے، کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی نصیحت پر کان ہی نہ دھرتے تھے،

الغرض وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں بیان فرمائے ہیں، ان کا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں پر چسپاں ہونا ناممکن اور محال ہے، کیونکہ دو ضدیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں،

پھر آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی جدوجہد سے ارتداد کا فتنہ ختم ہو جائے گا اور دین اصلاح پذیر ہو جائے گا اس لئے کہ سلسلہ کلام مومنین کی تسلی اور تقویت کے لئے ہے اور ان کے دلوں سے مرتدین کا خوف نکالنا ہے۔

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کی لڑائیاں تو اصلاح کا سبب بنیں اور نہ ان کو غلبہ حاصل ہو سکا۔ اور باغیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا، اور فساد نے دین میں جڑ پکڑلی،

پس ثابت ہو گیا کہ کتاب اللہ کی مذکورہ بالا تینوں آیات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت وامامت کی واضح گواہ ہیں، اور اپنے اندر وہ قیود وامتیازات رکھتی ہیں کہ بلحاظ اصول عقلیہ کسی غیر کا احتمال نہیں چھوڑتیں اور اگر عقلی قواعد سے ہٹ کر کوئی شیعہ عالم انجان بنتے ہوئے کوئی دور از کار احتمال ذکر کرے تو وہ احتمال اس لئے لائق جواب اور قابل توجہ نہیں کہ ہمارا روئے سخن اور خطاب اہل عقل ودانش سے ہے، وہم پرست اور اور انجانوں کی طرف نہیں،

اب جس کسی کو ان تمام استدلات کی تفصیل درکار ہو، اور اس بحث کی تکمیل مدنظر: اور دوسری آیات سے

جو اسی ذیل میں وارد ہیں، استدلات کر کے بحث کا تمام اطراف و جوانب سے احاطہ کرنا چاہتا ہو، تو اسے کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ اس میں یہ موضوع حد اتمام و تکمیل تک پہنچا ہوا ہے، اور کتاب اللہ کے ظاہر و باطن معنے کو وا انکشاف کیا گیا ہے، اس کے مصنف تمام امت کی طرف سے قابل داد ہیں،

اور چونکہ یہاں اصل مقصد یہ ہے کہ ہر اصولی اور فروعی مسئلہ میں شیعوں نے جو مخالفت کی ہے اس کی تردید "ثقلین" (کتاب اللہ و عترت رسول اللہ) سے واضح و آشکارا کی جائے اور اس کے ثبوت کے لئے کتاب اللہ کی ایک آیت ہو یا سدہا آیات باعتبار شہادت و گواہی یکساں اور برابر ہیں اس لئے طوالت کلام اور درازی بیان سے بچتے ہوئے جو بیان ہو چکا اسی پر اکتفا کی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں بطریق اہل سنت عترت کے اقوال بے حد و شمار منقول ہیں، ان کی تفصیل بھی "ازالۃ الخفاء" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے البتہ ہم نے اس کتاب میں چونکہ یہ اہتمام کیا ہے اور پابندی برتی ہے کہ کسی بھی معاملہ میں سوائے شیعوں کی روایات کے کوئی دلیل نہیں پیش کرتے اس لئے یہاں بھی انہیں کی روایات اور صحیح کتب کے حوالہ سے عترت رسول کے وہ اقوال نقل کرتے ہیں جن کو انہوں نے معتبر سمجھ کر درج کیا ہے،

ان میں سے ایک روایت یہ ہے جس کو رضی بحوالہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نہج البلاغہ میں بیان کرتا ہے کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں،

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ بَیْعَتِیْ لَزِمَتْکَ وَاَنْتَ بِالشَّامِ فَاِنَّہٗ بَایَعَنِی الْقَوْمُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا اَبَا بَکْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ عَلٰی مَا بَایَعُوْھُمْ عَلَیْہِ فَلَمْ یَکُنْ لِلشَّاھِدِ اَنْ یَّخْتَارَ وَلَا لِلْغَائِبِ اَنْ یَّرُدَّ وَاِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَّسَمَّوْہُ اِمَامًا کَانَ لِلّٰہِ رِضًی فَاِنْ خَرَجَ مِنْھُمْ خَارِجٌ بِطَعْنٍ اَوْ بِدْعَۃٍ رَدُّوْہُ اِلٰی مَا خَرَجَ مِنْہُ فَاِنْ اَبٰی قَاتَلُوْہُ عَلَی اتِّبَاعِہٖ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَوَلَّاہُ اللّٰہُ مَا تَوَلّٰی وَصَلَّاہُ جَھَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیْرًا۔

بعد حمد و صلوٰۃ! اے معاویہ تم پر میری بیعت لازم ہو گئی گو کہ تم شام میں مقیم ہو کیونکہ مجھ سے ان لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے بیعت کی تھی اور اسی شرط پر مجھ سے بیعت کی ہے جس پر انہوں نے ان تینوں سے بیعت کی تھی اور جو موجود ہیں، ان کو تو اس میں اختیار کی اور جو غیر حاضر ہیں ان کو انکار کی کوئی مجال نہیں رہی البتہ مشورہ کا حق مہاجرین و انصار کو حاصل ہے یہ اگر کسی آدمی پر متفق الرائے ہو کر اسے امام تسلیم کریں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہوگا، پس اگر کسی طعن یا بدعت کے سبب کوئی اختلاف کرنے والا اس سے اختلاف کر بیٹھے تو اس کو اسی کی طرف لوٹا لاؤ جس سے وہ پھٹا (جدا) ہوا ہے اگر نہ آئے تو اس سے جنگ کرو کیونکہ اس نے مومنین کے خلاف راستہ اختیار کر لیا ہے اللہ اسے وہاں پہنچائے جہاں سے وہ لوٹا ہے اور داخل کرے اسے جہنم میں اور واپسی کا وہ بہت برا ٹھکانا ہے،

اب قابل غور و توجہ یہ بات ہے کہ ایسی پاک صاف اور واضح تحریر کو جو "امام معصوم" کے قلم سے نکلی علماء امامیہ اس کی کھینچ تان میں لگ پڑے وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریر ایک الزامی دلیل ہے جس کو اصطلاحاً مجارات خصم کہتے ہیں، اور یہ دلیل ان مقدمات سے مرکب ہوتی ہے جن کو (خصم) فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہو چاہے،

استدلال کرنے والا ان مقدمات کو تسلیم نہ کرتا ہو!۔

اب ذرا اس دور از کار تاویل، بلکہ تحریف اور بلکہ تکذیب پر نظر غور و فکر ڈال لینی چاہئیے،

اول تو "معصوم" کے کلام کو خلاف واقعہ معنے پر محمول کرنا جو خلاف عقل ہے،

پھر کلام کے ماله وما علیہ کو نظر انداز کرنا بھی ہے کہ اگر جناب امیر کو صرف الزام دینا ہی مقصود ہوتا تو وہ بیعت کی حد تک کافی تھا اس سے آگے کی عبارت فاذا اجتمعوا الخ کو الزام سے کوئی تعلق نہیں، اور امام معصوم بے فائدہ جھوٹے اپنی زبان پر لانا کیسے گوارہ کر سکتا ہے، پھر وہ جھوٹے بھی خدا پر بالفاظ کان اللہ رضی" اور وہ بھی تاکید و تکرار کے ساتھ، العیاذ باللہ!

اور اگر ان باتوں سے قطع نظر بھی کریں تو الزامی دلیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے مقدمات کو فریق مخالف بھی تسلیم کرے ورنہ وہ تو الزامی دلیل نہیں رہیگی، اور یہاں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ مقدمات کب اور کس موقعہ پر تسلیم کئے تھے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ، کو ان پر الزام رکھنے کے لئے ان مقدمات کے ترتیب دینے اور تسلیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

بہر حال جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں جناب معاویہ رضی اللہ نے جو لکھا، اور جو امامیہ اور زیدیہ کی کتابوں میں درج ہے، اس سے ان کا جو مذہب اور مسلک بابت خلافت و امامت معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ۔

ہر قریشی مسلمان، خواہ مہاجرین اولین میں سے ہو یا بعد والوں میں سے ہو وہ اگر احکام نافذ کرنے پر قادر، کفار سے جہاد، ریاست کے انتظام و انصرام، تیاری لشکر ملک اسلام کی دیکھ بھال سرحدوں کی حفاظت اور فسادات کو فرو کرنے پر متمکن و قادر ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس سے بیعت کر لے خواہ وہ عراقی ہوں خواہ شامی یا اہل مدینہ تو وہ شخص امام ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو،

اسی نظریہ کے تحت وہ اپنی امارت کا دعویٰ کرتے تھے وہ اس بات کے مدعی نہیں تھے کہ ان کو مہاجرو انصار میں سے کسی نے چنا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع سے گریز اور ان کی امامت سے انکار کا سبب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کے قاتلین کی حمایت کے الزامات ہیں، جو ان کے نزدیک فساد فی الارض کے مترادف تھے، اصلاح احوال کے نہیں،

اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فسادات کے رفع دفع کرنے، حدود اسلام کی حفاظت کرنے اور حکم قصاص کے نافذ کرنے پر، جو بلند مرتبہ قدر شرعی احکام ہیں، قادر نہیں سمجھتے تھے اور مہاجرین و انصار کی بیعت بھی ان کے علم میں تھی اگر وہ اس کو فدہ برابر وقعت دیتے تو اپنی مجالس اور خطوط میں ان کی برائیوں کو اشکارا نہ کرتے بلکہ وہ تو اس کے ساتھ یہ بھی کہتے تھے، کہ مہاجرین و انصار نے بیعت کر کے غلطی کی ہے،

یہی ان کا مذہب معروف اور مسلک مشہور رہا ہے، اسی بنا پر وہ اپنے زمانہ امارت میں بار بار انصار کی شکایت کرتے رہے، اور طعنہ و تعریض بھی ان کے مقابلہ میں مہاجرین و انصار کی بیعت کا ذکر کرنا دلیل تحقیقی ہے جو مقدمات

خفیہ وانیعہ سے مرکب ہوتی ہے، چاہے وہ مقدمات فریق ثانی کو تسلیم ہوں یا نہ ہوں لہٰذا علماء امامیہ کی یہ تاویل صحیح نہیں کہ یہ الزامی دلیل ہے،

منجملہ اقوال عترت کے ایک قول یہ ہے، جس کو رضی ہی نے اپنی کتاب نہج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، مگر طبعی مقتضیٰ، اور اپنے مذہب کے پاس کی خاطر بس اتنی سی تحریف کردی ہے کہ جناب امیرؓ نے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام لیا تھا مگر اسنے وہاں "فلاں" بنادیا، تاکہ اہل سنت اس سے استدلال نہ کرلیں، مگر اس کو بھول گیا کہ بعض اوقات اشارہ کنایہ تصریح سے بھی زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور وہی بات یہاں بھی ہے کہ جناب امیر کے اس بیان میں جو اوصاف بیان ہوئے وہ بذات خود اسی شخصیت کی طرف پکار پکار کر اشارہ کر رہے ہیں جس کو رضی نے فلاں کے پردہ میں روپوش کرنا چاہا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے،

آنہ قَالَ لِلّٰہِ بِلَادُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلَقَدْ قَوَّمَ الْاَوَدَ وَدَاوَی الْعَمَدَ وَاَقَامَ السُّنَّۃَ وَخَلَّفَ الْبِدْعَۃَ ذَهَبَ نَقِیَّ الثَّوْبِ قَلِیْلَ الْعَیْبِ اَصَابَ خَیْرَهَا وَاَسْبَقَ شَرَّهَا اَدّٰی اِلَی اللّٰہِ طَاعَتَہٗ وَاتَّقَاہُ بِحَقِّہٖ رَحَلَ وَتَرَکَهُمْ فِیْ طُرُقٍ مُتَشَعِّبَۃٍ لَا یَهْتَدِیْ فِیْهَا الضَّالُّ وَلَا یَسْتَیْقِنُ الْمُهْتَدِیْ،

آپؓ نے فرمایا (ابوبکر) فلاں قابل تعریف ہیں کہ کجی کو سیدھا کیا اور راہوں کو ہموار سنت قائم کی بدعت کو ملیامیٹ کیا وہ پاکدامن تھے کم عیب والے خلافت کی بھلائی حاصل کرلی اور برائی سے آگے بڑھ گئے اللہ کی اطاعت کی، اور کما حقہ پرہیزگاری برتی خود تو چل بسے مگر دوسروں کو دور لے پر چھوڑ گئے نہ گمراہ کو راستہ ملتا ہے، نہ راہ یاب کو یقین۔"

اب نہج البلاغہ کے شارحین امامیہ اس بات میں مختلف الرائے ہیں کہ "فلاں" سے مراد کون ہے، بعض نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔ اور بعض نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مگر اکثریت قول اول کی موید ہے اور یہی صحیح وظاہر ہے،

اس عبارت سراپا ہدایت وبشارت، میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دس بڑے اوصاف سے متصف فرمایا ہے اور اس کو قسم کھا کر پختہ اور موکد کیا ہے،

(۱) سنت کو قائم کرنا (۲) بدعت سے بچنا (۳) حسن تدبیر سے فتنوں کا قلع قمع۔ (۴) دنیا سے پاکدامن جانا (۵) عیوب کی کمی۔ (۶) امامت وخلافت کا مقصد اصلی، عدل۔ اور ترویج دین الٰہی کا ان کے ذریعہ انجام پانا (۹) طاعت الٰہی بجالانا۔ (۱۰) آخر عمر تک تقویٰ ودینداری پر کاربند رہنا۔

اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جس نوعیت کی امامت وخلافت بشہادت جناب امیر وقوع پذیر ہوئی اگر اس کو معراج خلافت وامامت کہیں تو بیجا نہیں۔

اور یہ مقام ہے جہاں شیعہ حضرات کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، اور ساری چوکڑیاں بھول جاتے ہیں، گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں ایسی رکیک اور نازیبا تاویلات کا سہارا لے کر خفت دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا نہ ذکر کرنا ہی بھلا ہے ہاں جن توجیہات میں کچھ معقولیت فہم وشعور کی کوئی رمق ہو ان میں سے چند اپنے ناظرین کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ بھی اس فرقہ کے دانشمندوں کی قوت فکر وفہم کا اندازہ

لگالیں۔
ایک توجیہ یہ پیش کرتے ہیں، کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کبھی کبھی حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی تعریف اور خوبیاں محض اس لئے بیان کر دیا کرتے تھے کہ لوگوں کی دلجوئی ہو جائے اور رعایا میں سے جو طبقہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت حسنہ پر دلدادگی کی حد تک فریفتہ تھا، اور اس بات کا معتقد تھا کہ امور دین کے انتظام میں ان حضرات کا عہد مبارک زریں دور تھا ان کو اپنی طرف مائل کر لیں، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق جناب امیر کا یہ بیان اور اسی نوعیت کا ہے،

لیکن ہر انصاف پسند صاحب عقل و شعور سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ کیا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شان ان کے نزدیک بس یہی ہے کہ آپ نے دس اوصاف قسم کھا کر جو بیان کئے ہیں ان کو آپ لوگ جھوٹا قرار دیں اور وہ بھی صرف دنیا کے حقیر لالچ کے خاطر کہ چند لوگوں کی دلجوئی ہو جائے ادھر سے ٹوٹ کر کچھ لوگ ادھر کو آجائیں تاکہ ان کے ذریعہ انتظام ریاست درست ہو جائے حالانکہ اس کا بھی کوئی یقین نہیں تھا، بلکہ اس سے تو ایک حد تک سابقین کے طرز عمل کی وجہ سے مایوسی ہو چکی تھی اتنی معمولی باتوں کے خاطر اور حقیر دنیا کے لالچ میں زمانہ سازی اور دروغ گوئی کا الزام آپ کے شیعہ اور ساتھی، لگائیں تو لگائیں اہل سنت تو ایسی باتوں کے تصور سے بھی ہزار بار اللہ کی پناہ چاہتے ہیں،

اور اسی کے ساتھ یہ عقل سے پیدل یہ نہیں سوچتے، کہ ہم جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کہاں کھینچے لے جا رہے ہیں اس توجیہ و تاویل سے تو دین کی غرض و غایت ہی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے کہ اس قسم کے فراعنہ جابرہ" کی مدح سرائی کرنا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صریح نافرمانی پر اتر آئے ہوں اور "ارتداد" کی حد تک پہنچ چکے ہوں اور کتاب اللہ کی "تحریف" کی ہو اور "دین خدا" کو بدل ڈالا ہو کہاں تک جائز ہے حالانکہ انہوں نے یہ حدیث صحیح ضرور سنی ہوگی، اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ (جب فاسق کی تعریف کی جائے تو اللہ تعالیٰ کا غضب ٹوٹ پڑتا ہے، لہذا یہ سب کچھ دین و دیانت اور عقل و فراست سے کتنی بعید بات ہے جو یہ نادان دوست جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔

آخر ایسی کونسی ضرورت تھی جس کی وجہ سے اتنی تاکیدات مبالغے اور سخت قسموں سے کام لیا گیا اور اگر ان کی مدح و تعریف کا مقصد اتنا ہی تھا کہ ایک آسان ترین مصلحت سے امور خلافت حسن انتظام سے انجام پا سکیں تو پھر ان دس جھوٹ" بصورت توصیف و تعریف بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کیلئے تو اتنا کہنا بھی کافی ہو سکتا تھا۔ لِلّٰہِ بَلَادُ فُلَانٍ قَدْ جَاهَدَ الْكَفَرَةَ وَالْمُرْتَدِّيْنَ وَشَاعَ بِسَعْيِهٖ الْاِسْلَامُ فِي الْبُلْدَانِ وَوَضَعَ الْجِزْيَةَ وَبَنَى الْمَسَاجِدَ وَلَمْ تَقَعْ فِي خِلَافَتِهٖ فِتْنَةٌ (صرف اللہ ہی کے لئے تعریف ہے فلاں شہروں کی البتہ جہاد کیا اس نے کافروں و مرتدوں سے اور اس کی کوشش سے شہروں میں اسلام پھیل گیا اس نے جزیہ مقرر کیا، مساجد بنوائیں اور اس کی خلافت میں کوئی فتنہ رونما نہ ہوا) یا اس جیسی کوئی اور عبارت!

پھر یہ مضامین جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی عبارت میں درج ہیں اور آپ کے دوسرے مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہے ور ایک معصوم" سے یہ نہیں ہو سکتا کہ باطل و ناحق کو اتنا سراہے اور اپنے بیان سے اپنے متبعین

کو گمراہ کرے اور "کافروں" اور "فاجروں" کی تعریف کرکے اوران کی اصلاح باطن اور قرب مدارج کا حکم لگا کر اپنے اوپر الزام لگائے جانے کا سبب بنے بلکہ آنجناب کو تو یہ چاہیئے تھا، اور واجب تھا کہ ایسی جماعت کے عیوب اور برائیاں" تفصیل وار منظر عام پر لاتے تاکہ لوگ ان کی اقتدا اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھنے سے باز رہتے اور گمراہی کے بھنور میں نہ پھنس جاتے بمطابق حدیث صحیح اُذْکُرُوا الْفَاسِقَ بِمَا فِیْہِ یَحْذَرُہُ النَّاسُ، فاسق کا کچا چھٹا کھولو کر لوگ اس سے دور بھاگیں)۔

اگر اسی قسم کی حقیر و معمولی دنیاوی اغراض ان پاک طینت حضرات کی نظر میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت رکھتیں تو پھر جھوٹے مکر پیشہ اور دنیا طلب لوگوں میں جو ریاست و سیادت کی طمع میں اس قسم کے ناز یبا امور کے مرتکب ہوتے ہیں اور خوشامد اور مفسدوں کی مدح سرائی میں جو ریاست میں لگے رہتے ہیں اور ان پاک باز، پاک طینت حضرات میں فرق ہی کیا رہ جاتا خدا جناب امیرؓ کے پاک دامن کو ان نجس د پاک دھبوں سے پاک صاف اور بچائے رکھے جو یہ نادان دوست غلط سلط تاویلات و توجیہات کے ذریعہ ان پر لگانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں،

اور بعض دوسرے عقلمندوں نے کہا ہے کہ اس عبارت سے آپ کا اشارہ کسی اور صحابی کی طرف تھا اور جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی میں فوت ہو گئے اور فتنہ رونما ہونے سے پیشتر ہی جہان سے سدھار گئے تھے۔ راوندی نے اسی قول کو پسند کیا اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے،

واقعی ان لوگوں کی عقل و دانش پہ قربان ہو جانا چاہیئے جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"

یہ لوگ تو آنکھ بند کرکے جو منہ میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں مگر جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دانش و بینش اور عقل و شعور سے کچھ حصہ ملا ہے اسے تو بہر حال کوئی بات قبول یارد کرنے میں غور و فکر ہی سے کام لینا چاہیئے اور اسی لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ اوصاف مذکورہ دربیان جناب امیرؓ شخص مذکورہ پر منطبق ہوتے بھی ہیں یا نہیں،

اول تو یہ کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حیات نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا، آپ موجود تھے تو اعمال کی ناہمواری، کجی کی درستی اور سنت کا قیام، یہ آپ کے علاوہ دوسرا کوئی کس استحقاق کی بنا پر کرتا اور کیوں کرتا اور اگر کرتا تو گمنام اور بے نشان کیوں رہتا، کسی کو اس کا نام د نشان کیوں معلوم نہیں ہوا اور کون عقلمند یہ بات باور کرلے گا، کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص مرے اور لوگوں کو مختلف اطراف میں پھٹنے والے چوراہے پر چھوڑ جائے جو گمراہوں کی حیرانی کا باعث ہو تو اہل ہدایت کے لئے طلب یقین کا، حالانکہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود ہیں، وحی کا نزول جاری ہے، فیض الٰہی دمبدم دین کی تکمیل اور نعمت کے اتمام میں شد و مد سے مصروف کار!۔

اور بعض امامیہ نے کہا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی غرض اس بیان سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تعریض کرنا ہے اور اس بات پہ سرزنش کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت پہ نہ چلے اور ان کے زمانہ میں فتنہ وفساد پیدا ہوا یہ توجیہ و تاویل پچھلی دو توجیہات سے بھی زیادہ لچر دلغو ہے،

اول۔ تو اس وجہ سے کہ اگر تعریض ہی مقصود تھی تو اس سے بہتر عبارت سے بھی ہو سکتی تھی یہ دس قسم کے جھوٹ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی، دوسرے یہ کہ سیرت شیخین اگر پسندیدہ ہے تو ان کی خلافت

برحق ثابت ہو گئی اور اگر پسندیدہ نہیں تھی تو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس کے ترک پر سرزنش کیوں ہو رہی ہے، تیسرے اس عبارت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شیخین رضی اللہ عنہما سے مخالفت ہرگز ظاہر نہیں ہوتی نہ ظاہراً نہ اشارۃً، پھر یہ کہ عبارات کوفہ کے خطبوں میں اس وقت بیان ہو رہی ہیں، جب نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موجود تھے نہ ان کو فساد و فتنہ بلکہ ظاہر ہے اپنے زمانہ میں امور خلافت کے پورے طور پر سرانجام نہ پانے پر حسرت و افسوس ہے، اس خیال کے پیش نظر کہ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی تدبیر تقدیر کے کیسے موافق رہی کہ سارے کام پوری آسانی سے بے کھٹکے ظہور پذیر ہوتے رہے،

اور پھر اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ڈانٹ ڈپٹ ہی مقصود تھی تو لاگ لپیٹ کے بغیر صاف صاف یوں کیوں نہ فرمایا کہ انہوں نے ایسا ایسا کیا، اور ایسا نہ کرنا چاہیے تھا،

کیونکہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توبیخ سے اگر کوئی خطرہ تھا تو وہ اہل شام ہی سے تھا کیونکہ وہی اپنے آپ کو ان کا مددگار گنتے تھے، اور وہ خطرہ تو ویسے خود ہی بڑھ رہا تھا اور پھر جب اہل شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی نسبت یقینی طور پر آنجناب رضی اللہ عنہ کی طرف کرتے تھے تو خطرہ کی کوئی بات ہی نہ تھی، بمصداق اس مثل کے کہ میں تو ڈوبا ہوا ہوں مجھے تری کا کیا ڈر!

اقوال عترت کے منجملہ ایک وہ قول بھی ہے جس کو امامیہ نے جناب ابی محمد حسن عسکری سے ان کی تفسیر میں نقل کیا ہے،

اَنَّہٗ قَالَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ اللّٰہُ مُوْسٰی ابْنَ عِمْرَانَ وَاصْطَفَاہُ نَجِیًّا وَفَلَقَ لَہُ الْبَحْرَ وَنَجّٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ وَاَعْطَاہُ التَّوْرٰىۃَ وَالْاَلْوَاحَ رَاٰی مَکَانَہٗ مِنْ رَبِّہٖ عَزَّ وَجَلَّ فَقَالَ یَا رَبِّ لَقَدْ اَکْرَمْتَنِیْ بِکَرَامَۃٍ لَمْ تُکْرِمْ بِہَا اَحَدًا قَبْلِیْ فَہَلْ فِیْ اَنْبِیَآئِکَ عِنْدَکَ مَنْ ہُوَ اَکْرَمُ مِنِّیْ فَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی یَا مُوْسٰی اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ مُحَمَّدًا اَفْضَلُ عِنْدِیْ مِنْ جَمِیْعِ خَلْقِیْ فَقَالَ یَا رَبِّ اِنْ کَانَ مُحَمَّدٌ اَفْضَلَ عِنْدَکَ مِنْ جَمِیْعِ خَلْقِکَ فَہَلْ فِیْ اٰلِ الْاَنْبِیَآءِ اَکْرَمُ مِنْ اٰلِیْ قَالَ عَزَّ وَجَلَّ یَا مُوْسٰی اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ فَضْلَ اٰلِ مُحَمَّدٍ عَلٰی اٰلِ جَمِیْعِ النَّبِیِّیْنَ کَفَضْلِ مُحَمَّدٍ عَلٰی جَمِیْعِ الْمُرْسَلِیْنَ فَقَالَ یَا رَبِّ اِنْ کَانَ فَضْلُ اٰلِ مُحَمَّدٍ عِنْدَکَ کَذٰلِکَ فَہَلْ مِنْ صَحَابَۃِ الْاَنْبِیَآءِ اَکْرَمُ عِنْدَکَ مِنْ اَصْحَابِیْ قَالَ یَا مُوْسٰی اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ فَضْلَ صَحَابَۃِ مُحَمَّدٍ عَلٰی صَحَابَۃِ جَمِیْعِ الْمُرْسَلِیْنَ کَفَضْلِ اٰلِ مُحَمَّدٍ عَلٰی اٰلِ جَمِیْعِ النَّبِیِّیْنَ فَقَالَ

انہوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرما کر اپنی ہمکلامی کے لئے انتخاب فرمایا ان کے لئے دریا میں راستے کھول دیئے۔ بنی اسرائیل کو نجات بخشی اور تختیوں کی شکل میں توریت عنایت فرمائی اور انہوں نے اپنے رب سے اپنا قرب جان لیا تو عرض کی کہ اے میرے رب تو نے مجھے وہ عزت بخشی جو مجھ سے پہلے کسی کو نہ بخشی تو کیا تیرے انبیا میں ایسا ہے جو مجھ سے زیادہ باعزت ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ کیا تم کو معلوم نہیں کہ محمد میرے نزدیک تمام مخلوقات سے زیادہ افضل ہیں، حضرت موسیٰ نے کہا کہ اگر محمد تیرے نزدیک تمام مخلوقات سے افضل ہیں تو کیا انبیا کی اولاد میں کوئی ایسا ہے جو میری اولاد سے زیادہ بزرگ ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم کو پتہ نہیں کہ محمد کی اولاد تمام انبیاء کی اولاد سے بزرگ تر ہے اس پر موسیٰ بولے کہ اگر محمد کی اولاد تیرے نزدیک

مُوْسٰى اِنْ كَانَ فَضْلُ مُحَمَّدٍ قَالَ مُحَمَّدٌ وَاَصْحَابُ مُحَمَّدٍ كَمَا وَصَفْتَ فَهَلْ فِيْ اُمَمِ الْاَنْبِيَاءِ اَفْضَلُ عِنْدَكَ مِنْ اُمَّتِيْ ظَلَّلْتَ عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْتَ عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى وَفَلَقْتَ لَهُمُ الْبَحْرَ فَقَالَ اللّٰهُ يَا مُوْسٰى اِنَّ فَضْلَ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ عَلٰى اُمَمِ جَمِيْعِ الْاَنْبِيَاءِ كَفَضْلِيْ عَلٰى خَلْقِيْ۔

ایسی افضل ہے تو کیا انبیاء کے ساتھیوں میں کوئی ایسا ہے کہ میرے ساتھیوں سے زیادہ باعزت ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمکو خبر نہیں کہ محمد کے ساتھی تمام رسولوں کے ساتھیوں سے افضل ہیں جیسے ان کے ارلاد تمام انبیا کی اولادوں سے، موسیٰ بولے کہ اگر محمد ان کی اولاد ان کے ساتھیوں کی فضیلت ایسی ہے جیسی آپ نے فرمائی تو انبیاؤں میں سے کسی کی امت ایسی ہے جو تیرے نزدیک میری امت سے افضل ہو جن پر تو نے ابر کا سایہ فرمایا ان پر من وسلویٰ نازل کیا اور دریا میں ان کے لئے راستے بنائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ محمد کی امت کی فضیلت تمام انبیا کی امتوں پر ایسی ہے جیسی میری ذات کی فضیلت تمام مخلوق پر۔"

اب ان بزرگ امام کی اس روایت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دو طریقوں سے ثبوت ملتا ہے،

اوّل :۔ اس طرح کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کی مصاحبت ازروئے کتاب واجماع اہل سنت وشیعہ قطعی الثبوت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ جب کہ انہوں نے اپنے ساتھی سے فرمایا تو غم نہ کر۔ اور یہاں سے صاحب سے مراد بالاجماع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں، اور پھر یہ بھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت، خصوصیت اور ہمرازی اس قدر مشہور زمانہ ہوئی کہ ہر خاص ساتھی اور محرم راز کو بطریق ضرب المثل ان ہی کی صفت سے یاد کیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کا رفیق غار ہے" لہٰذا ان کی افضلیت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب پر صفت محبت میں ثابت ہو گئی اور یوں وہ کم از کم تمام انبیاء کے ساتھیوں سے تو قطعاً افضل ہوئے اور جو انبیا کے تمام اصحاب میں افضل ہو وہ ہی خلافت وامامت کے لائق ہو گا اس لئے کہ ان میں بھی تو اس لیاقت وقابلیت کے بہت سے گزرے ہیں مثلاً کالب یوقنا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ اور حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے اور آصف بن برخیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں تھے اور اس قابلیت کے مالک،

اور اگر ان امور سے قطع نظر بھی کریں تو ان کے ہاتھ سے عام مسلمانوں پر ظلم چہ جائیکہ عترت رسول پر یا ان کے حقوق غصب کرنا تو سرزد ہو ہی نہیں سکتا ورنہ تو پھر افضلیت کجا فضیلت بھی ہاتھ سے جاتی رہیگی،

دوم :۔ اس طرح کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جملہ پیغمبروں کے اصحاب سے افضل قرار پائے تو اہل سنت رسول اللہ پر جور وظلم ان کی حق تلفی اور اس عالی قدر وعالی مرتبہ خاندان کی تحقیر واہانت وہ کس طرح کریں گے جب کہ سارے پیغمبروں کے اصحاب میں سے کسی نے ایسی حرکت کبھی نہ کی ہو،

اگر یہ حضرات دیگر انبیاء کے اصحاب کے ہم رتبہ بھی ہوتے تب بھی ضروری ہوتا کہ ایسے ناشائستہ کام ان سے سرزد نہ ہوں چہ جائیکہ ان سے افضل ہوں اور پھر بھی ان سے ان امور کا ارتکاب ہو۔

اس مرتبہ کے لحاظ سے امام فخرالدین رازی، رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بحث بڑی دلچسپ اور ذہن نشین کرنیکے

لائق ہے۔ وہ فرماتے ہیں، کہ میرے نزدیک رافضیوں کا فرقہ عقل اور اپنے رسول کے ساتھ نیک اعتقادی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی سے بھی گیا گذرا ہے، کیونکہ اس چیونٹی نے تو اپنے ماتحت افراد سے یوں خطاب کیا، یَآاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اے چیونٹیوں اپنے ٹھکانوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو سلیمان اور ان کے لشکری ان جانے میں تم کو روند ڈالیں،

گویا وہ چیونٹی اتنا تو سمجھتی تھی کہ فوجی اور لشکری، ظلم و ستم ڈھانے میں جری بے باک اور بے درد سرکش ہوتے ہیں، مگر سلیمان علیہ السلام کے فوجی ان کی صحبت کی تاثیر سے اتنے مہذب ہوگئے ہیں اور نبی کی سرپرستی سی صحبت ان پر اس حد تک اثر انداز ہوگئی ہے کہ دیدہ و دانستہ ایک چیونٹی پر بھی ظلم نہ کریں گے بلکہ پاؤں تلے بھی نہ روندیں گے اور یہ رافضی اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اتنا سمجھنے سے قاصر رہے کہ سرتاج الانبیاء حضرت خاتم المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت ہمہ دم نے ان کے اصحاب حاضر باش اور آپ کے یار غار اور رفیق غمگسار پر اتنا بھی اثر نہ کیا ہو، اور خیانت، شرارت اور شیطنت ان سے مٹا ڈال ہو۔

کیا صحبت پیغمبر سے انہوں نے منفی اثر لیا تھا اور ناشائستہ باتوں نے دوسرے لوگوں کی نسبت ان پر زیادہ تسلط جما لیا تھا جو یہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نور نظر ان کے داماد اور نواسوں کو بحالت بے کسی رنج پہنچاتے ان پر ظلم ڈھاتے ان کے گھروں کو نذر آتش کرتے اور ان کو بے وسیلہ و بے قدر کرتے ان کے باغ و زمین ضبط کرتے ان کے روزینے روکتے رہے اور ہمیشہ ان کی ایذا رسانی کی فکروں میں لگے رہے تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

اقوال عترت میں سے ایک اور قول وہ ہے جس کو علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثنا عشری نے اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفۃ الائمہ میں نقل کیا ہے۔

اَنَّهٗ سُئِلَ الْاِمَامُ اَبُوْ جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ حِلْيَةِ السَّيْفِ هَلْ يَجُوْزُ فَقَالَ نَعَمْ قَدْ حَلَّى اَبُوْ بَكْرِ الصِّدِّيْقُ سَيْفَهٗ بِالْفِضَّةِ فَقَالَ الرَّاوِيْ اَتَقُوْلُ هٰكَذَا فَوَثَبَ الْاِمَامُ عَنْ مَكَانِهٖ فَقَالَ نَعَمْ صِدِّيْقٌ نَعَمْ صِدِّيْقٌ نَعَمْ صِدِّيْقٌ فَمَنْ لَمْ يَقُلْ لَهُ الصِّدِّيْقُ فَلَا صَدَّقَ اللّٰهُ قَوْلَهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

جناب ابو جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ جائز ہے یا نہیں آپ نے فرمایا جائز ہے اس لئے کہ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار پہ چاندی جڑوائی ہوئی تھی راوی نے حیرت سے پوچھا کیا آپ ایسا (یعنی صدیق) کہتے ہیں؟ یہ سن کر آپ اچھل پڑے، اور فرمایا ہاں صدیق ہاں صدیق ہاں صدیق! اور جس نے آپ کو صدیق نہ کہا اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے،،

مذہب و دین اور قرآن کریم کے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں انبیاء کے بعد صدیقین کا درجہ ہے اور یہ تمام امت میں افضل شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں آیات ذیل ملاحظہ ہوں،

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

پس یہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا (وہ انعام یافتہ حضرات) انبیاء صدیق شہداء اور صالحین ہیں اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں،

(۲)۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ وَاُمُّهٗ

عیسیٰ بن مریم اور کچھ نہیں ہیں، مگر رسول اور ان

صدیقہ۔ کی والدہ صدیقہ ہیں،

(۳) وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ۔

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پہ ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہدا ہیں ان کے لئے ان کا اجر ہے،

اور اس افضلیت سے قطع نظر بہت سی دیگر آیات اور احادیث سے یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ صدیق کا لقب تعریفی لقب ہے جو باعتبار مرتبہ شہید و صالح سے برتر ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو یہ لقب دیا۔ یوسف ایھا الصدیق اور خود امامیہ کی کتابوں میں مروی اور ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے لئے یہ لقب استعمال فرمایا۔ انا الصدیق الاکبر (میں صدیق اکبر ہوں) بلکہ مستقبل میں آنے والوں کے مقابلہ میں اسے اپنے اندر ہی منحصر قرار دیا، لا یقولھا بعدی الا کذاب (یہ لقب میرے بعد وہی استعمال کرے گا جو کذاب ہو گا) یہی سبب ہے کہ ائمہ نے اپنے لئے یہ لقب استعمال نہیں کیا اور کہیں استعمال ہوا بھی ہو تو وہ حقیقی معنی میں نہیں بلکہ بطور مجاز ہو گا،

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے من بعدی فرمایا اس سے صاف طور پر معلوم ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ اس امت میں آپ سے پہلے بھی کوئی صدیق گذر چکا ہے جس کا یہ لقب مشہور تھا اور اس کی صفت صدیقیت برحق اور قابل تسلیم تھی،

اگر کوئی یہ کہے کہ انحصار صدیقیت پر نہیں، اکبریت پر ہے، کہ کوئی صدیق تو ہو سکتا ہے مگر مجھ سے اکبر نہیں ہو گا، تو اس کے باوجود بھی لفظ بَعۡدِیۡ سے صدیقیت کبریٰ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے لئے قرار پاتی ہے،

حاصل کلام یہ کہ جس شخص کے لئے "امام معصوم" لفظ صالح استعمال فرمائیں تو جور و فسق، ظلم و غضب کا احتمال اس شخص صالح سے بالکل جاتا رہتا ہے ایسا نہ ہو تو "امام معصوم" پہ دروغ گوئی کا الزام آئے گا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس کسی شخص کو ایک "امام معصوم" نے اس قدر شدید تاکید سے نہ صرف صدیق کہا ہی ہو، بلکہ اس کی صدیقیت کا اعتقاد تمام مکلف مخلوق پر واجب قرار دیا ہو اور اس کا انکار کرنے والے کو بددعا دی ہو تو ایسے شخص کے متعلق کیا خیال اور کیا گمان کرنا چاہیئے،

اگر ایسے شخص کی امامت و خلافت نہ مانی جائے یا ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ انہوں نے حقدار امامت (بزعم خود) کی امامت غصب کر لی تو یہ تو ان کی صدیقیت کا انکار ہو گا اور اس سے تو "امام معصوم" بھی بددعا میں شریک ہو جائیں گے۔

علمائے امامیہ اس روایت کی بحث سے زچ اور لاجواب ہو کر اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ اس روایت ہی سے انکار کر دیں کیونکہ اس روایت کو تقیہ پر محمول کر کے بھی پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ کیونکہ کشف الغمہ کوئی نایاب کتاب نہیں جہاں تہاں دستیاب ہے اور اگر کوئی تعصب و عناد سے مجبور ہو کر کسی ایک کتاب (یا ایک ایڈیشن) سے اس روایت کو حذف بھی کر دے تو دوسرے نسخے (اور سابقہ ایڈیشن) اس کی خود تردید کریں گے،

پیچھا چھوٹنے کی البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ چونکہ اہل سنت نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے، اس لئے فرقہ امامیہ کے پرہیزگار علماء، شریک روایت علماء اہل سنت کی کم مائیگی علم (یعنی اپنے مقابلہ میں ہیٹا سمجھ کر) روایت سے انکار کر دیں تو ان سے یہ کچھ بعید بھی نہیں، مگر یہ ذہن نشین کر لیں کہ پھر اس اصول کی تمام دینی اور شرعی امور میں پابندی کرنی ہوگی، اور یوں ان کا کلمہ، نماز اور بہت سے امور شرع اس انکار کی نذر ہو کر ختم ہو جائیں گے، اور ان سے متعلق ساری روایات سے دست بردار ہونا پڑے گا کیونکہ ان میں بھی اہل سنت شریک روایت ہیں،

چنانچہ روایت بالا کو اہل سنت میں سے دار قطنی نے سالم بن ابی حفصہ سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا۔

دَخَلْتُ عَلٰی اَبِیْ جَعْفَرٍ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتَوَلّٰی اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ - اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ فِیْ نَفْسِیْ غَيْرَ ذَالِكَ فَلَا نَالَتْنِیْ شَفَاعَةُ مُحَمَّدٍ صلے اللہ علیہ وسلم يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قَالَ سَالِمٌ اَرَاهُ قَالَ ذَالِكَ مِنْ اَجَلِیْ -

جب میں ابی جعفر (رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں حاضر تھا تو آپ نے فرمایا اے اللہ (تو گواہ رہ) میں ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھتا ہوں اے اللہ اگر میرے دل میں اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ پایا جاتا ہو تو قیامت کے دن محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے مجھے محروم رکھ سالم کہتا ہے کہ میرا خیال ہے آپ نے ایسا میری وجہ سے کہا،

تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ سالم بن ابی حفصہ شیعہ تھا، اور یہ روایت بھی اس کی شیعیت کو ثابت کرتی ہے، اور جناب ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سنانے کے لئے ہی یہ الفاظ فرمائے کہ ممکن ہے یہ میرے خیالات اور عقائد سن کر ہی اپنے غلط و بے کار عقیدہ اور گمان باطل سے تائب ہو جائے،

یہ روایت یہاں اس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ جناب امام کے کلام میں تقیہ کا احتمال نہ رہے کیونکہ یہاں آنجناب نے اس سلسلہ میں شرط و جزاء ذکر کر کے اپنے خدا سے اپنے لئے کفر کی دعا فرمائی اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بالاجماع کافر ہی محروم ہوگا اور امام معصوم کی دعا مقبول ہی ہوتی ہے، اگر شرط پوری ہو جائے تو جزا پوری ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا:

اب اسی امر زیر بحث پر اہل سنت کی روایات ملاحظہ فرمائیے!

دار قطنی نے عروہ بن عبداللہ سے روایت کی ہے،

قَالَ سَاَلْتُ اَبَا جَعْفَرٍ عَنْ حِلْيَةِ السَّيْفِ فَقَالَ لَا بَاْسَ فَقَدْ حَلّٰی اَبُوْبَكْرِ الصِّدِّيْقُ سَيْفَهٗ قَالَ قُلْتُ تَقُوْلُ الصِّدِّيْقُ قَالَ نَعَمْ صِدِّيْقٌ نَعَمْ صِدِّيْقٌ نَعَمْ صِدِّيْقٌ مَنْ لَمْ يَقُلِ الصِّدِّيْقُ فَلَا صَدَّقَ قَوْلَهٗ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ -

کہتا ہے میں نے ابی جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں کیونکہ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار پر جڑاؤ کرایا تھا، میں نے آپ سے کہا آپ ان کو صدیق کہہ رہے ہیں، فرمایا ہاں صدیق ہاں صدیق (اور) ہاں صدیق جو ان کو صدیق نہ کہے، دنیا و آخرت میں اس کے قول کی کوئی تصدیق نہ کرے گا،

اور علامہ ابن جوزی رح کی کتاب صفوۃ الصفوہ میں جو روایت بیان ہوئی ہے اس میں یہ الفاظ زائد ہیں فَوَثَبَ وَثْبَۃً وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَۃَ" (پس وہ اچھل پڑے اور قبلہ رخ ہو کر لہذا یہ روایت جو کشف الغمہ کی روایت کے مطابق ہے بددعا کو ظاہر کرتی ہے، اور تقیہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتی،

اور شیعوں کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ جناب ابو جعفر اور جناب جعفر صادق رحمہما اللہ سونے کی مہروں سے مہر شدہ کتاب کی رو سے تقیہ سے روک دیئے گئے تھے، اس لئے ان کی روایات کو تقیہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور یہ بات انشاء اللہ اپنے موقعہ پر ان کی معتبر کتابوں کے حوالہ سے بیان کی جائے گی،

اور دارقطنی ہی نے ایک اور روایت جناب ابی عبد اللہ ابن محمد بن صادق کے حوالہ سے بھی بیان کی ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم سے بیان کی ہے،

اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلٰی اَبِیْ زَیْنِ الْعَابِدِیْنَ عَلِیِّ ابْنِ الْحُسَیْنِ فَقَالَ اَخْبِرْنِیْ عَنْ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ فَقَالَ عَنِ الصِّدِّیْقِ قَالَ وَتُسَمِّیْہِ الصِّدِّیْقَ قَالَ فَلِلّٰہِ ثَکَلَتْکَ اُمُّکَ قَدْ سَمَّاہُ الصِّدِّیْقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْمُہَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ وَمَنْ لَّمْ یُسَمِّہٖ صِدِّیْقًا فَلَا صَدَّقَ اللّٰہُ قَوْلَہٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اِذْھَبْ فَاَحِبَّ اَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ۔

ایک شخص میرے والد زین العابدین رحمہ اللہ کے پاس آ کر بولا مجھے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق کچھ بتایئے آپ نے کہا صدیق کے بارے میں، وہ بولا آپ بھی انہیں صدیق کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تجھے تیری ماں روئے، خدا کی قسم ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا لقب دیا اور مہاجرین و انصار نے ان کو صدیق نام سے پکارا، اور جو ان کو صدیق نہ کہے اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے جا اور ابو بکر و عمر سے محبت کر (رضی اللہ عنہما)۔

اب جب اس مسئلہ میں واضح و صاف آیات اور عترت پاک کے غیر مبہم اقوال کے بیان سے فارغ ہو چکے تو بجائے اس کے کہ نتیجہ مرتب کرنے کے لئے مقدمات کی ترکیب یا اشکال کی ترتیب میں لکھیں جو اس مدعا پر دلالت کرتے ہیں لگے ہاتھوں بعض ایسے دلائل بھی یہاں ذکر کئے دیتے ہیں، جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں اور ادنیٰ تامل و تفکر سے ناظر و قاری کو مقصد و مدعا تک پہنچا دیتے ہیں،

(۱) اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی اس جماعت کو جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے وقت موجود تھی اور امور خلافت میں آپ کی معین و مددگار تھی، مختلف القابات سے سرفراز فرمایا کہیں انہیں اُولٰئِکَ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ (وہی کامیاب و کامگار ہیں، فرمایا تو کہیں رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے) ایک جگہ جنت کے وعدے اور اجر عظیم کی خوشخبری کا شرف بخشا تو دوسری جگہ بلندی درجات اور اپنی رحمت و عنایت اور رضامندی کی بشارت سے خوشدل!

اب بھلا کوئی یہ بتائے۔ کہ ایسی معزز، مکرم اور انعامات الٰہیہ کی مورد، اور جنت اور رضا الٰہی کی حقدار جماعت کسی ایسی بات پر متفق ہونے کا سوچ بھی سکتی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کے صریح مخالف ہو اور اس سے آپ کا عہد ٹوٹتا ہو ہرگز نہیں، وہ تو ایسی کسی بات کا تصور تک نہیں کر سکتی، جو قرآنی بشارات کی تکذیب یا رسول اللہ کے کسی ادنیٰ حکم کی نافرمانی کا موجب بنے!

(۲) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی توصیف میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ الفاظ فرمائے،

حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّهَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ۔ تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت پیوست کردی تمہارے دلوں کو اس سے مزین و روشن کیا اور کفر بدکاری و بد عملی اور گناہ کی نفرت و کراہت تمہارے دل میں ڈال دی۔

اب اسے کون مان سکتا ہے کہ اس شان کے افراد با جماعت باہم متفق ہو کر کفر و فسق اور عصیان کا ارتکاب کریں گے اور یہ ایک دو دن ماہ، سال نہیں بلکہ زندگی بھر ایسا ہی کرنے پر بضد رہیں گے،

(۳) تقسیم فئے والی آیت میں فقراء مہاجرین کے ذکر کے بعد اولٰئک ھم الصادقون (وہی سچے ہیں) فرمایا ہے، اور سارے ہی مہاجرین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کہتے تھے اب اگر کوئی ان کو خلیفہ برحق نہ مانتے تو گویا وہ ان مہاجرین کو جھوٹا کہتا ہے جن کو خدا نے سچا کہا تھا، (اب وہ اپنی اوقات خود پہچان لے)۔

(۴) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان حضرات نے بیعت کی تھی جو دینی معاملات میں اپنے بیٹوں بھائیوں باپوں اور عزیز و اقارب کسی کا بھی پاس و لحاظ نہ کرتے تھے، موقع آتا تو دینی تقاضے کی خاطر اپنے یاروں کو اپنے ہاتھ سے جام مرگ پلا دیتے تھے، جہاد کی سختیوں پر وہ صابر تھے مشقت برداشت کرتے تھے، کسی مخالفت سے نہ ڈرتے نہ دبتے! اور دین کی خاطر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے بار بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھے دشمن کے رو در رو ہوتے۔ اور یہ خواہش کرتے کہ اللہ تعالیٰ یہ جان کا نذرانہ جان قبول کرے اور دشمن کا کوئی وار کام کر جائے،

اور یہ سب وہ ہیں جن کی خود امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبات میں شہادت دی ہے، جو انشاء اللہ باب مطاعن الصحابہ میں بیان ہونگی ایسی حالت اور اوصاف والی جماعت اگر کسی بات پر اتفاق کرلے تو یقیناً وہ امر خلاف شرع ہرگز نہیں ہوگا،

(۵) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہ نے اتفاق کیا اور جس بات پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اتفاق کرلیں وہ حق ہے اور اس کے خلاف بات باطل ہوگی، اس دلیل کی پختگی کے لئے اب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا وہ کلام ملاحظہ کریں جو نہج البلاغہ جیسی کتاب میں جسے تمام شیعہ بہت ہی معتبر و صحیح سمجھتے ہیں روایت کیا گیا ہے، آپ نے ایک گفتگو کے دوران فرمایا۔

اَلْزَمُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّ یَدَ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَةَ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ لِلشَّیْطَانِ کَمَا اَنَّ الشَّاذَّ مِنَ الْغَنَمِ لِلذِّئْبِ، سواد اعظم میں شامل رہو، کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور دیکھو پھوٹ اور تفرقہ سے بہت بچو کیونکہ جماعت سے بچھڑ کر اکیلا رہ جانے والا شیطان کا ایسا ہی شکار ہے، جیسے ریوڑ سے علیحدہ ہو جانے والی بکری بھیڑیے کا،

نہج البلاغہ کی جو شرح امامیہ نے لکھی ہے اس میں تحریر ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے

متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے، کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ تحریر ارسال کی۔

اَلَا اِنَّ لِلنَّاسِ جَمَاعَةٌ يَدُ اللّٰهِ عَلَيْهَا وَغَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى مَنْ خَالَفَهَا فَنَفْسَكَ نَفْسَكَ قَبْلَ حُلُوْلِ الْغَضَبِ۔ — آگاہ رہو کہ لوگوں کی جمعیت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس جماعت کے مخالف پر اللہ کا غضب پس اپنے آپ کو اس کا غضب نازل ہونے سے پہلے بچا لو۔

اس کا کچھ حصہ رضی شریف نے بھی نقل کیا مگر (اپنی عادت سے مجبور ہو کر) اس کا بالائی حصہ کھا گیا ہے، کیونکہ وہ اس کے مذہب سے ٹکراتا تھا، جو سراسر تفرقہ پر مبنی ہے، اور اس کا آخری حصہ بیان کر دیا ہے کہ۔

اِتَّقِ اللّٰهَ فِيْمَا لَدَيْكَ وَانْظُرْ فِيْ حَقِّهٖ عَلَيْكَ۔ — جو تمہارے قبضہ میں ہے، اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور اس کا حق جو تم پر ہے ذرا دھیان سے اس کی دیکھ بھال کرو،

اور انہیں امامیہ و معتزلہ کی شرح نہج البلاغہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھے ہوئے خطوط میں سے ایک خط کا مضمون یہ ہے،

مَا كُنْتُ اِلَّا رَجُلًا مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَوْرَدْتُ كَمَا اَوْرَدُوْا۔ وَاَصْدَرْتُ كَمَا اَصْدَرُوْا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَجْمَعَهُمْ عَلَى الضَّلَالِ۔ — میں بھی مہاجرین کا ایک فرد تھا، جیسے وہ آئے میں بھی آیا اور جیسے وہ لوٹے میں بھی لوٹا۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ ضلالت و گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا،

رضی نے پورے خط کو باقی رکھ کر کسی ایک جگہ نقل نہیں کیا، بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی کو کہیں کسی کو کہیں، بیان کیا۔ اسی خط کے ایک ٹکڑے کو اس نے نہج البلاغہ میں یوں درج کیا ہے،

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ وَرَدَ عَلَيَّ كِتَابُ امْرِئٍ لَيْسَ لَهٗ بَصَرٌ يَهْدِيْهِ وَلَا قَائِدٌ يُرْشِدُهٗ۔ — میرے پاس ایک ایسے شخص کا خط آیا ہے جس کے پاس نہ آنکھیں کہ راستہ دیکھ سکے نہ اس کا کوئی راہبر ہے جو اس کو راستہ پر لگاتے،

اور اسی خط کو ایک دوسرے خط کا سرنامہ بنا دیا اور اس کی یہی عادت اور فطرت ہے یہ شخص جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبوں اور خطوں کا یہی حشر کرتا ہے اپنے مذہب کے مطابق ان کی قطع برید کر کے ان کا حلیہ بگاڑتا اور ان کی تحریف کرتا ہے،

(۶) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے گذشتہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق استفسار کیا گیا تو آپ ان کا وہ وصف بیان فرمایا جو ولایت کو لازم ہے، آپ نے فرمایا۔

كَانُوْا اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ هَمَلَتْ اَعْيُنُهُمْ — ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے سامنے ذکر الٰہی

حَتّٰی تَبُلَّ جِبَاهُهُمْ مَاءٌ وَكَمَا يَمِيْلُ الشَّجَرُ يَوْمَ الرِّيْحِ الْعَاصِفِ خَوْفًا مِّنَ الْعِقَابِ وَرَجَاءً

کیا جاتا تو ان کی آنکھیں برس پڑتیں حتی کہ ان کے چہرے تر ہو جاتے اور وہ خوف عتاب اور امید ثواب سے اس طرح کانپنے لگتے جس طرح سخت آندھی میں درخت جنبش کرتا ہے،

پھر ایک اور مرتبہ انہیں حضرات صحابہ کے متعلق فرمایا،

اَحَبُّ اللِّقَاءِ اِلَيْهِمْ لِقَاءُ اللهِ وَاَنَّهُمْ يَتَقَلَّبُوْنَ عَلٰى مِثْلِ الْجَمْرِ فِيْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ

ان کو سب سے محبوب چیز اللہ سے ملاقات تھی اور وہ آخرت کے ذکر پر چنگاری کی طرح پہلو بدلتے تھے بے چینی کا اظہار کرتے تھے،

تو ایسی جماعت یا اس کے ایک فرد کا کسی باطل امر یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کے خلاف اصرار کرنا محالات میں سے ہے،

(۷) صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ایک ثبوت اس جماعت کا آپ کی بیعت کرنا ہے، جنکی تعریف میں جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں مناجات کرتے وقت کہ جو بندگان خاص کے ساتھ راز و نیاز کا وقت ہے رطب اللسان ہیں، بلکہ ان کے متبعین کے حق میں بھی طویل طویل دعائیں ان الفاظ میں فرماتے تھے،

اَللّٰهُمَّ وَاَوْصِلْ اِلَى التَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ خَيْرَ جَزَائِكَ الَّذِيْنَ قَصَدُوْا سَمْتَهُمْ وَتَحَرَّوْا وِجْهَتَهُمْ وَمَضَوْا فِيْ قَفْوِ اٰثَارِهِمْ وَالْاِئْتِمَامِ بِهِدَايَةِ مَنَارِهِمْ يَدِيْنُوْنَ بِدِيْنِهِمْ عَلٰى شَاكِلَتِهِمْ لَمْ يَثْنِهِمْ رَيْبٌ فِيْ قَصْدِهِمْ وَلَمْ يَخْتَلِجْ شَكٌّ،

اے اللہ ان کے ان متبعین کو بہترین صلہ اور جزا عطا فرما جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی اور جو اپنی دعاؤں میں کہتے تھے اے ہمارے رب ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گذرے مغفرت فرما، جنہوں نے اپنا رخ ان کے رخ پر رکھا اور ان کی طرف کا قصد رکھا اور ان کے نشان قدم پر چلے اور ان کی قائم کردہ علامات ہدایت کو قبول کیا انہیں کے طریقہ پر ان کا دین اختیار کیا کوئی شک ان کو نہ اپنے ارادہ سے باز رکھ سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی شک ان کے دل میں کھٹکتا تھا۔ الی آخرہ،،

اب امام معصوم" جن کے متعلق اپنی تعریف فرمائیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جناب میں مناجات کے وقت جو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے، کہ ایسے وقت تقیہ کا خیال بھی کفر اور باطل پر اصرار ہے تو ان کے مراتب کا کیا ٹھکانا۔

اس لئے کہ امام کے متعلق یہ سوچنا اور خیال کرنا محال و ممتنع ہے کہ انہوں نے حق کو چھپایا یا رواداری برتی ہو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خاندان پر ظلم و غضب کو روا رکھا ہو۔

(۸) کلینی نے باب السبق الی الایمان میں بحوالہ ابو عمرو زبیری جناب ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے

قُلْتُ لِاَبِيْ عَبْدِ اللهِ اِنَّ لِلْاِيْمَانِ دَرَجَاتٍ وَّمَنَازِلَ يَتَفَاضَلُ الْمُؤْمِنُوْنَ فِيْهَا عِنْدَ اللهِ قَالَ

میں نے ابی عبداللہ سے پوچھا کہ کیا ایمان کے بھی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں، کہ اس کی وجہ سے مومنین اللہ تعا

لَعَمْ قُلْتُ صِفْهُ لِي رَحِمَكَ اللهُ حَتّٰى اَفْهَمَهُ قَالَ اِنَّ
اللّٰهَ سَبَقَ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ كَمَا يُسْتَبَقُ بَيْنَ الْخَيْلِ
يَوْمَ الرِّهَانِ ثُمَّ فَضَّلَهُمْ عَلٰى دَرَجَاتِهِمْ فِي السَّبْقِ فَجَعَلَ
كُلَّ امْرِءٍ مِنْهُمْ عَلٰى دَرَجَةِ سَبْقِهِ لَا يَنْقُصُهُ فِيْهَا مِنْ
حَقِّهِ وَلَا يَتَقَدَّمُ مَسْبُوْقٌ سَابِقًا وَلَا مَفْضُوْلٌ فَاضِلًا
تَفَاضَلَ بِذٰلِكَ اَوَائِلُ الْاُمَّةِ وَاَوَاخِرُهَا وَلَوْ لَمْ يَكُنْ
لِلسَّابِقِ اِلَى الْاِيْمَانِ فَضْلٌ عَلَى الْمَسْبُوْقِ اِذًا لَلَحِقَ اٰخِرُ
هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا نَعَمْ وَلَتَقَدَّمُوْهُمْ اِذَا لَمْ يَكُنْ لِمَنْ
سَبَقَ اِلَى الْاِيْمَانِ الْفَضْلُ عَلٰى مَنْ اَبْطَاَ عَنْهُ وَلٰكِنْ
بِدَرَجَاتِ الْاِيْمَانِ قَدَّمَ اللّٰهُ السَّابِقِيْنَ وَبِالْاِبْطَاءِ
عَنِ الْاِيْمَانِ اَخَّرَ اللّٰهُ الْمُقَصِّرِيْنَ لَا تَجِدُ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
مِنَ الْاٰخِرِيْنَ مَنْ هُوَ اَكْثَرُ عَمَلًا مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَاَكْثَرُهُمْ
صَلٰوةً وَصَوْمًا وَحَجًّا وَزَكٰوةً وَجِهَادًا وَاِنْفَاقًا وَلَوْ
لَمْ يَكُنْ سَوَابِقُ يَفْضُلُ بِهَا الْمُؤْمِنُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا
عِنْدَ اللّٰهِ لَكَانَ الْاٰخِرُوْنَ بِكَثْرَةِ الْعَمَلِ مُقَدَّمِيْنَ عَلَى
الْاَوَّلِيْنَ وَلٰكِنْ اَبَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ يُدْرِكَ اٰخِرُ
دَرَجَاتِ الْاِيْمَانِ اَوَّلَهَا وَيُقَدِّمَ فِيْهَا مَنْ اَخَّرَ اللّٰهُ اَوْ
يُؤَخِّرَ فِيْهَا مَنْ قَدَّمَ اللّٰهُ قُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَمَّا نَدَبَ اللّٰهُ
عَزَّ وَجَلَّ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلَيْهِ مِنَ الْاِسْتِبَاقِ اِلَى الْاِيْمَانِ
فَقَالَ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَسَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ وَقَالَ وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ
اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ وَقَالَ وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ
الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ فَبَدَاَ بِالْمُهَاجِرِيْنَ
عَلٰى قَدْرِ دَرَجَةِ سَبْقِهِمْ ثُمَّ ثَنّٰى بِالْاَنْصَارِ ثُمَّ ثَلَّثَ
التَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ فَوَضَعَ كُلَّ قَوْمٍ عَلٰى قَدْرِ
دَرَجَاتِهِمْ وَمَنَازِلِهِمْ عِنْدَهُ ثُمَّ ذَكَرَ مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ
اَوْلِيَاءَهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ تِلْكَ الرُّسُلُ

کے نزدیک باعتبار درجات گھٹتے بڑھتے ہوں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! میں نے کہا آپ پر اللہ مہربانی فرمائے مجھے اس کی ذرا تفصیل تو بتائیے کہ میں بھی اس کو سمجھ لوں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنین میں باہم ایک دوسرے کو اسی طرح سبقت دی ہے، جس طرح گھڑدوڑ میں گھوڑوں کو ایک دوسرے پہ سبقت دی جاتی ہے، پھر سبقت کے درجہ کے لحاظ سے ان کو فضیلت مرحمت فرمائی، لہذا ان میں سے ہر آدمی کو اس کی سبقت کے درجہ پہ رکھا اس میں سے اس کا حق بالکل کم نہیں کرتا نہ پیچھے رہ جانے والا آگے بڑھ جانے والے
آگے ہو سکتا ہے، نہ مفضول درجہ پر فضیلت دیگئی افاضل پر فضیلت پا سکتا ہے اس طرح سے امت کے اگلوں اور پچھلوں میں باعتبار سبقت گھٹت بڑھت ہوئی ہے اور اگر ایمان میں پیچھے رہ جانے والوں پر فضیلت نہ رکھتا تو اس امت کے بعد والے مراتب میں پہلے والوں پر فضیلت نہ صرف جا ہی ملتے بلکہ آگے بھی نکل جاتے اگر ایمان میں پہل کرنے والوں کو اپنے بعد ایمان لانے والوں پر نہ دے دی گئی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے درجات ایمان میں سابقین کو آگے بڑھایا اور ایمان میں تاخیر کر کے پیچھے رہ جانے والوں کو پیچھے رکھا، مومنین میں بلحاظ عمل تم پچھلوں کو اگلوں سے زیادہ نہیں پاؤ گے نہ نماز روزہ میں نہ حج وزکوٰۃ میں نہ جہاد میں نہ راہ خدا میں خرچ کرنے میں اگر یہ سابقتیں نہ ہوتیں کہ جن کی وجہ سے ایک دوسرے سے اللہ کے نزدیک بڑھا ہوا ہے تو بعد والے عمل کے لحاظ سے اگلوں سے آگے نکل جاتے لیکن اللہ تعالےٰ نے اسے پسند نہیں فرمایا کہ بعد والا پہلے والے جتنے درجات ایمان پالے یا اللہ نے جسے پیچھے ڈالا ہو وہ آگے بڑھ جائے یا جس کو اللہ تعالیٰ نے آگے بڑھایا ہے وہ پیچھے رہ جائے راوی نے کہا مجھے اس سے بھی مطلع فرمائیے کہ

فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ الٰى اٰخر الاٰية۔ وقال وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ وقال اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وقال وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا الٰى اٰخر الحديث۔ وقال فِيْ اٰخِرِهٖ فَهٰذَا ذِكْرُ دَرَجَاتِ الْاِيْمَانِ وَمَنَازِلِهٖ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔

وہ سبقت ایمانی کیا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے مومنین کو رغبت دلائی ہے، تو آپ نے فرمایا وہ اللہ کا قول (و سابقوا الی مغفرۃ من ربکم الخ) ہے اور سبقت کرو اللہ کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف جس کا عرض (چوڑائی) آسمان اور زمین کے برابر ہے جو اللہ و رسول اللہ پر ایمان لانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اور پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں اور وہی مقرب ہیں۔ نیز فرمایا (اللہ نے) کہ پہل کرنے والوں میں اولین مہاجرین و انصار اور ان کے مخلص پیروکار و متبعین، ہی وہ ہیں جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ راضی ہوئے اللہ سے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کا ذکر ان کے درجہ سبقت کے لحاظ سے پہلے کیا، دوسرے درجہ پر انصار کا ذکر فرمایا اور درجہ سوم پر تابعین کا ذکر کیا، جنہوں نے صدق دل سے اپنے پہلوں کی اتباع کی۔ پس اللہ کے نزدیک جس گروہ کا جو درجہ مقرر ہے اس نے اس کو اسی درجہ پر رکھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا کو باہم دِگر جو فضیلت دی اس کا ذکر کیا اور فرمایا یہ رسول ہیں کہ جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام فرمایا۔ اور بعض کے درجات بلند فرمائے الخ اور فرمایا بے شک ہم نے بعض انبیا کو بعض دوسروں پر فضیلت بخشی اور فرمایا دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دی، اور ارشاد فرمایا آخرت اپنے درجات اور فضیلت میں بہت بڑی ہے الخ۔

اختتام حدیث پر کہا یہ ہے ان درجوں اور مرتبوں کا ذکر جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان میں قائم ہیں"
اس روایت سے صاف پتہ چل گیا کہ درجہ ایمانی میں مہاجرین و انصار سب سے بلند و بالا تر ہیں، ان کے بعد والا کوئی ان سے ہمسری نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ذیل میں درج شدہ آیات قرآنی بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں،

(۱) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ پکے مومن وہی ہیں،

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبت ہیں،

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ فتح مکہ سے قبل خرچ کرنے والے یا لڑنے والے کے کو برابر نہیں،

اب ایسا شخص جو اتنا عظیم المرتبت ہو وہ ایسے ناشائستہ امور پر اصرار کرتا یا ان پر اجماع و اتفاق کرے محال در محال ہے!

(۹) نہج البلاغہ کے شارحین نے اپنے ہاں ایک خط نقل کیا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا۔ اس خط میں حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ذکر کے بعد ان کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرمائے،

لعمری ان مکانهما فی الاسلام لعظیم وان المصاب بهما لجرح فی الاسلام شدید رحمهما الله وجزاهما باحسن ما عمل،

میری جان کی قسم ان دونوں کا اسلام میں بہت بڑا مقام ہے، اور ان دونوں کا اٹھ جانا اسلام کے لئے بڑا کاری زخم ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں پر اپنی رحمت فرمائے اور ان دونوں کے اعمال کی بہترین جزا مرحمت فرمائے،

اگر شیعوں کے بقول یہ حضرات "ظالم وغاصب" تھے تو ایک "امام معصوم" ان کی ایسے شاندار الفاظ میں مدح وتوصیف کیسے کر سکتے تھے،

تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ یہ خط صاحب نہج البلاغہ نے خود بھی نقل کیا مگر اسی خبث باطنی کے ساتھ جو اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے، یعنی تحریف سے یہاں بھی باز نہیں رہا، الفاظ وعبارت کو آگے پیچھے تو کیا ہی ہے کوئی بات جو اس کے مذہب پر چوٹ لگاتی تھی، اس کو اس نے عبارت سے ساقط بھی کر دیا ہے چنانچہ اس کتاب کے تمام شارحین نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس خط کی نقل میں رضی سے ایسی بے ربطی اور بے ترتیبی عمل میں آئی ہے کہ عبارت میں ایسی گڑبڑ اور مطلب میں ایسی گنجلک پیدا ہو گئی ہے کہ شراح اس کی توجیہ اور عبارت کی ترکیب سے عاجز آ گئے،

بحث امامت بلا فصل

اہل تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے لئے بہت سی دلیلیں بیان کرتے ہیں جن کی چھان پھٹک اور تحقیق وتفتیش کی گئی، تو معلوم ہوا کہ بہت روایتیں تو ایسی ہیں، جو موضوع بحث سے بالکل ہی ہٹی ہوئی ہیں، اور بہت سی روایتیں ایسی ہیں جو موضوع اہل سنت کے ذخیرہ علمی ودینی سے چرائی گئی ہیں، اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو،

اس سلسلہ میں ان کے دلائل تین قسم کے ہیں،

(۱) وہ آیات واحادیث جو حضرت علی واہل بیت رضوان اللہ علیہم کے مناقب وفضائل میں وارد ہوئی ہیں۔ یہ سب اہل سنت کی ذکر کردہ ہیں جو انہوں نے خوارج اور نواصب کے مقابلہ میں لکھی اور بیان کی کیونکہ یہ لوگ حضرت علی واہل بیت رضوان اللہ علیہم کی شان میں لعن وطعن کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے رہتے تھے، اب یہ شیعوں کی بے وقوفی ہی ہے، کہ وہ جناب امیر کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے دلائل کے طور پر ان کو اہل سنت ہی کے مقابلہ پر لے آئے،!

ان کے اگلوں نے جب علم کلام واصول میں اہل سنت ومعتزلہ کی شاگردی کر کے کچھ شد بد حاصل کر لی اور کچھ سمجھداری آگئی اور دلائل مرتب کرنے سے بھی کچھ واقف ہو گئے تو انہوں نے ان مقدمات علمی میں کچھ الٹ پھیر اور چند من گھڑت کلمات کا ان میں اضافہ کر کے اپنے مفید مطلب بنا لیا حالانکہ وہ پھر بھی ان کے مفید مطلب نہ تھے، مگر خیر بزعم خود وہ اپنے کو یہی سمجھتے تھے، تب انہیں دلائل کی تہذیب واصلاح کے لئے ان کی ایک کتاب بنا

"کتاب الالفین" کے نام سے تصنیف ہوئی،

ظاہر ہے ان حالات کے تحت اہل سنت کے لئے ان دلائل کے جوابات دینا نہ مفید ہے، نہ مناسب البتہ ان کے یہ دلائل اس مقصد سے نقل ضرور کئے جائیں گے کہ ان بزرگواروں کی دانشمندی اور خوش تقریری بے نقاب ہو، اور مصنوعی کلمات اور زبردستی کے بڑھائے ہوئے مقدمات پر واقفیت حاصل ہو،

(۲) وہ دلائل ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استحقاق خلافت بحیثیت خصوصی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک وقت و مدت خاص و معینہ میں خلیفہ برحق اور امام مطلق ہیں،

یہ دلائل بھی وہ ہیں، جو اہل سنت ان خوارج و نواصب کے مقابلہ میں بیان کرتے تھے جو آپ کی خلافت و امامت کے منکر تھے اور آپ کے مرتبہ امامت میں رد و قدح کرتے تھے،

ان دلائل سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ صرف یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلافت راشدہ کے مستحق ہیں اور آپ کی خلافت شارع کی پسندیدہ ہے نہ ان میں وقت و زمانہ کی تعیین ہے نہ اس بات کی تشریح کہ ان کا زمانہ خلافت زمانہ نبوت سے متصل ہے یا منفصل،

یہ بات تو چونکہ اہل سنت کے مذہب کے مطابق اور ان کے مطلب کا خلاصہ ہے، اس لئے ان روایات کے جواب کی طرف وہ کیوں متوجہ ہوں! ہاں کہیں کہیں ان مقدمات پر تنبیہ و تنقید ضرور ہوگی، جو انہوں نے بے ضابطہ طور پر گھڑ گھڑ کر دلائل میں شامل کر لئے ہیں اور اپنے خیال خام میں اس پر بڑے خوش کہ کارے کردم،

(۳) وہ دلیلیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت پر بلا تفصیل دلالت کرتی ہیں، یا آپ کے غیر سے امامت سلب کرتی ہیں، یہی وہ دلیلیں ہیں کہ جن پر مذہب شیعہ کی بنیاد قائم ہے اور ان کی روایت و نقل میں، یہ تنہا ہیں، اس قسم کی دلیلیں اول تو بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی تو ان کے مقدمات ناقابل تسلیم ہیں، کیونکہ ان کی تردید کے لئے بصورت ثقلین "کتاب اللہ، و عترت رسول اللہ جیسے سچے گواہ اور عادل شاہد موجود ہیں"،

لہذا اس کتاب میں موقع کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ بحث تینوں قسم کے دلائل پر کی جائے گی البتہ قسم آخر کو ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا، اور بنار غلطی اور موقع شک پر ضرور تنبیہ کی جائیگی، تاکہ ان کی دلیلوں کی حقیقت الم نشرح ہو جائے،

اس بحث میں ضابطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اتنی بات تو ضروری ہونی چاہیئے کہ ان دلائل کے مبادیات اور اور مقدمات ایسے ہوں جو اہل سنت کے ہاں بھی قابل تسلیم ہوں اس لئے کہ ان دلائل سے مقصود اہل سنت ہی کو تو الزام دینا ہے، ورنہ اپنی جگہ تو سارے ہی بادن گزے بنتے ہیں،

شیعوں کی وہ روایات اور اصول جو ابواب ماسبق میں تفصیلاً مذکور ہوئے وہ تو اہل سنت کے نزدیک ذرہ برابر نہ قابل قدر ہیں نہ لائق توجہ البتہ وہ دلائل جو آیات قرآنی پر مشتمل ہوں یا احادیث متفق علیہا پر یا پھر وہ عقلی دلائل جن کے مقدمات طرفین کے نزدیک مسلم ہوں یا پھر وہ طعن آمیز اقوال جو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کے انکار کے سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں، موضوع گفتگو بن سکتے ہیں، ہم نے چونکہ باب

مطاعن کو مستقل طور پر کتاب ہذا کا جزء بنایا ہے، اس کو چھوڑ کر باقی کے تین اصناف دلائل پہ یہاں گفتگو کرتے ہیں،

ان کی طرف سے پہلی آیت یہ ہے،

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ

بے شک تمہارا ولی، اللہ ور رسول اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اس حال میں کہ رکوع کئے ہوئے ہیں،

اس آیت کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے حالت رکوع میں ہی ایک سائل کو اپنی انگشتری دی تھی،

پھر انما کا کلمہ حصر چاہتا ہے اور ولی سے مراد اوامر چلانے والا یا نافذ کرنے والا ہے اور ظاہر ہے یہاں وہ تصرف عام مراد ہے جو سب مسلمانوں پر ہے، اور جو امامت کا مرادف ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان کی ولایت کو خدا اور رسول کی ولایت کے ساتھ ذکر کیا ہے لہذا آپ کی امامت ثابت ہوگئی اور آپ کے علاوہ دوسروں کی امامت کی نفی، کیونکہ انما حصر پر دلالت کرتا ہے اور یہی مدعا ہے،

اس کا جواب چند صورتوں میں دیا جا سکتا ہے، اول بطریق نقض، کہ یہ دلیل آپ کے بیان کے مطابق جناب امیر کے پہلے والے ائمہ کی جس طرح نفی کرتی ہے اسی طرح آپ کے بعد کے ائمہ کی تردید بھی یہی آیت ساتھ ساتھ ہی کر رہی ہے، اور آپ کی اسی تقریر سے بعد میں آنے والوں کی امامت کی نفی بھی اس سے نکلتی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما، اور بعد کے ائمہ کی امامت برحق نہ ہو، اگر شیعہ اس انکار کے لئے تیار ہیں، تو چشم ما روشن دل ما شاد بلا کھٹکے اس دلیل سے ضرور استدلال کریں،

خلاصہ کلام یہ کہ یہ استدلال جس وجہ سے اہل سنت کے مقابل لایا گیا ہے کلمہ حصر پر مبنی ہے اور حصر جس طرح اہل سنت کے لئے مضر ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شیعوں کے لئے مضر ہے، کیونکہ اس صورت میں اگر جناب امیر سے قبل کے ائمہ کی تردید ہوتی ہے تو بعد کے ائمہ کی بدرجہ اولیٰ ہوتی ہے، گو مذہب اہل سنت باطل قرار پاتا ہے مگر شیعہ مذہب کی عمارت بھی زمین بوس ہوئی جا رہی ہے، اس کا باطل ہونا تو حقیقت سے ہے ہی اسی کے ساتھ اس کی بنیاد ہی نیست و نابود ہوئی جا رہی ہے اگر اہل سنت کے تین اماموں پہ زد پڑتی ہے تو شیعوں کے تو بارہ امام ہاتھ سے جا رہے ہیں، تین اور بارہ کا فرق امید ہے وہ بھی بخوبی سمجھتے ہوں گے، جناب امیر تو دونوں فریق کے نزدیک امام و خلیفہ ہیں، باقی سب اگلے پچھلے اس اعزاز سے محروم ہوں گے،

(ترجمہ شعر) گو میری تو مشت خاک ہی برباد ہوئی، مگر خوشی اس کی ہے کہ رقیب تو نامراد گیا،

اگر وہ نقض کا جواب یہ دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت وقت کے ایک حصہ میں منحصر ہے یعنی اپنے عہد امامت میں نہ حضرات حسنین وائمہ مابعد کے وقت میں، تو ہم اس اتفاق پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، ہمارا عقیدہ و مذہب بھی تو یہی ہے کہ آپ کی ولایت عامہ ایک محدود وقت کے ساتھ مخصوص

تھی۔ یعنی جب آپ خلیفہ مقرر ہوئے اس سے پہلے نہیں کہ وہ خلفائے ثلاثہ کا دور تھا،

اگر وہ یہ کہیں ، کہ جناب امیر خلفاء ثلاثہ کے عہد میں اگر ولایت عامہ سے خالی مانے جائیں تو ان کے لئے ان کی ذات میں نقص لازم آئے گا بخلاف سبطین کی امامت کے وقت کہ اس وقت آپ زندہ ہی نہ تھے، کسی دوسرے کا امام ہونا اس وقت آپ کی ذات میں نقص شمار نہیں ہوگا کیونکہ موت تمام دینوی احکام و ذمہ داریوں سے بری الذمہ کر دیتی ہے، تو ہم کہیں گے ، یہ ایک دوسرا مستقل استدلال ہوا آیت سے تو استدلال نہ رہا، کیونکہ یہ استدلال مذکور دو مقدمات پر استوار ہے ایک یہ کہ صاحب ولایت عامہ کا کسی دوسرے کی ولایت میں ہونا خواہ کسی وقت میں بھی ہو نقص کا سبب ہے دوسرے یہ کہ صاحب ولایت عامہ میں کسی طرح بھی اور کسی وقت بھی نقص پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو یہ دونوں مقدمات آیت سے کہاں سمجھے جاتے ہیں، یہ صورت اصطلاح مناظرہ میں فرار کہلاتی ہے کہ ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری جا پکڑنا ، جب کہ پہلی دلیل کے مقدمات کا جھگڑا نہ اقرار سے نہ اثبات سے طے ہوا ہو،

اور اگر ہم جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کی خاطر اس فرار کو نظر انداز کر دیں اور نئے استدلال کے مقدمات کی طرف توجہ دیں تو ہم کہیں گے کہ یہ دونوں مقدمات ہی غلط ہیں، اور یہ استدلال ہی اس وجہ سے باقی نہیں رہتا کہ اس صورت میں حضرات حسنین ولایت مستقل سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ جناب امیر کی موجودگی میں ان کی ولایت میں تھے اور پھر خود جناب امیرؓ کی ولایت سے بھی یہ استدلال ختم ہو جاتا ہے، کہ وہ بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مستقل ولایت نہیں رکھتے تھے بلکہ حضور کی ولایت کے زیر سایہ تھے،

لہذا معلوم ہوا کہ صاحب ولایت کا دوسرے کی ولایت میں کچھ عرصہ کے لئے رہنا نقص نہیں ہے اور اگر نقص ہے تو صاحب ولایت عامہ میں یہ کوئی عیب نہیں ہے تو وہ استدلال ہی مع مقدمات کے غلط ہوا جس کی طرف چھلانگ لگائی تھی

ایک دوسرا جواب جناب شیخ ابراہیم کردی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اہل سنت نے یہ دیا ہے کہ الذین امنو میں بوقت خطاب ولایت مراد نہیں کہ خطاب کا زمانہ نبی کا زمانہ اور عہد تھا، اور امامت نبی کے بعد نبی کی نیابت ہے اس کے حین حیات نہیں تو لا محالہ بعد ہی کا زمانہ مراد ہوگا اور بعد کی کوئی حد نہیں، وہ ایک منٹ بعد ہو سکتا ہے تو ایک یا چند سال بھی ہو سکتا ہے، لہذا یہ دلیل بھی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی اور یوں شیعوں کا مدعا امامت بلافصل غتربود ہو گیا۔

اور اگر ان کی دلیل کے مقدمات پر تفصیلی نظر ڈالیں تو اجماع مفسرین کا ان کا دعویٰ بھی غلط اور ناقابل تسلیم ہے اس لئے کہ علماء تفسیر تو اس آیت کے نازل ہونے کے سبب میں مختلف الرائے ہیں، ابوبکر نقاش جو ان کے ہاں کی مشہور تفسیر کا مصنف ہے جناب ابوجعفر محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ نزلت فی المھاجرین والانصار، (یہ آیت مہاجرین و انصار کے بارے میں نازل ہوئی) ، کسی کہنے والے نے کہا کہ ہم نے تو سنا ہے یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی تو انہیں میں سے تھے ، اور یہ روایت الذین اور جمع کے صیغوں یقیمون ، یؤتون ، وھم راکعون کے بہت مناسب اور موزوں ہے،

اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ عکرمہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی اور اس آیت کا ربط پچھلی آیت سے جو مرتدین کے قتال کے بارے میں ہے اسی قول کی تائید کرتا ہے،

اب یہ قول کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اتری، اور بحالت رکوع سائل کو انگوٹھی دینے کا یہ قصہ؛ تو یہ روایت تنہا ثعلبی نے روایت کی ہے، اور سارے ہی محدثین اس روایت کو رتی بھر اہمیت نہیں دیتے اور اس کو "حاطب اللیل" کہہ کر پکارتے ہیں، اس لئے کہ اسے خشک و تر میں کوئی تمیز نہیں، غلط سلط ہر بات روایت کر دیتا ہے، یہ تفسیری روایات کلبی سے لیتا ہے، ابی صالح کہتا ہے کہ تفسیری روایات میں اس کی روایت سب سے زیادہ رکیک ہوتی ہے،

قاضی شمس الدین بن خلکان نے کلبی کے حال میں لکھا ہے کہ یہ عبداللہ بن سبا یہودی کے ان ساتھیوں میں سے ہے جو کہتے تھے کہ علی بن ابی طالب مرے نہیں اور وہ دنیا میں پھر آئیں گے،

ثعلبی کی بعض روایات کا سلسلہ محمد بن مروان اسدی الصغیر پر ختم ہوتا ہے جو کٹر رافضی تھا اور سلسلہ کذب و وضع کی ایک کڑی کے طور پر جانا جاتا ہے،

لباب التفسیر کا مصنف کہتا ہے کہ یہ آیت عبادہ بن الصامتؓ کے حق میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے حلفائے یہود سے بیزاری و نفرت ظاہر کی۔ جب کہ عبداللہ بن ابی (مشہور منافق) نے بیزاری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی حمایت و خیر خواہی پر تلا رہا،

یہ قول آگے آنے والی آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ (مومنو یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ) سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔

پھر مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جناب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو علماء یہود میں سے تھے جب اسلام لے آئے تو ان کے پورے قبیلے نے ان کا بائیکاٹ کر دیا انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں اس کی اطلاع بایں الفاظ فرمائی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ قَوْمَنَا ھَجَرُوْنَا (یا رسول اللہ ہماری قوم نے ہمیں چھوڑ دیا) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور قواعد فن حدیث کی رو سے یہ قول بہ نسبت دوسرے تمام اقوال کے زیادہ صحیح ہے،

آیت مذکورہ بالا متعلقہ امامت کے سلسلہ کا دوسری طرح سے جواب یہ ہے کہ لفظ ولی۔ محب، ناصر، صدیق اور صاحب تصرف سب معانی کے لئے آتا ہے اور ان سب میں مشترک ہے

اور مشترک لفظ سے کوئی خاص معنے اسی وقت مراد لئے جا سکتے ہیں، جب اس کے لئے کوئی خارجی وجہ موجود ہو۔

اور یہاں اس آیت سے اگلا کلام اس آیت میں ناصر کے معنے کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہ آیت مومنوں کی تسلی، دلی تقویت اور مرتدوں سے ان کے خوف کو دور کرنے کی خاطر نازل ہوئی اور آنے والا کلام محب و صدیق کے معنے کو متعین کرتا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ

اے ایمان والو ان کو جو تمہارے دین کو مذاق و کھیل بناتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی یا وہ کافر ہوں دوست مت بناؤ۔

معلوم ہو گیا کہ یہاں اولیاء کے معنے محب و صدیق کے متعین ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ اور کافر کو کوئی مسلمان امام نہیں بناتا اور نہ ہی وہ آپس میں ایک دوسرے کو اپنا امام بناتے ہیں،

پھر کلمہ حصر اِنَّمَا بھی انہیں معنے کو چاہتا ہے، کیونکہ قاعدہ کے مطابق حصر کی وہیں ضرورت پیش آتی ہے جہاں کسی نزاع، شک اور شرکت کے اعتقاد کا احتمال ہو۔ اس امر پر اجماع ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت امامت اور ولایت تصرف کے سلسلہ میں نہ کوئی جھگڑا تھا نہ شک بلکہ نصرت و امداد اور محبت کا مسئلہ درپیش تھا،

تیسرے طریقہ سے جواب یہ ہے کہ اس اصولی قاعدہ کے مطابق جو سنی و شیعہ دونوں میں متفق ہے عموم لفظ کا لحاظ ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں۔ لہذا آیت کا مقصد یہ ہوگا کہ ولایت عامہ چند اشخاص میں منحصر کر دی جائے اور ان اشخاص میں جناب امیر بھی داخل ہیں، کیونکہ جمع کے صیغے اور کلمہ الذین کے الفاظ عمومی ہیں یا بقول مرتضیٰ و ابن مطہر جو ان بعد اور نہایہ نامی تصنیف میں مذکور ہے۔ الفاظ عمومی کے مساوی ہیں، ایسی صورت میں جمع کو واحد پر محمول کرنا دشوار ہے اور اسی طرح عام کا خاص پر محمول کرنا خلاف اصل ہے کہ بغیر ضرورت ایسا نہیں کیا جا سکتا۔

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ یہاں ایسا کرنے کی ضرورت ہے کہ رکوع کی حالت میں سائل کو صدقہ دینے کا واقعہ ایک شخص سے صادر ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس آیت سے اس قصہ کا پتہ کہاں چلتا ہے جس کی وجہ سے لفظ کو عموم پر محمول نہ کر سکیں بلکہ وھم راکعون ایک عطفی جملہ ہے، جو اگلے جملوں پر معطوف ہے اور موصول کا صلہ ہے، یعنی الذین ھم راکعون، یا یقیمون الصلوٰۃ سے حال ہے، بہر صورت یہاں رکوع سے خشوع مراد ہے اصطلاحی رکوع نہیں!

اس پر اگر شیعوں کو یہ اعتراض ہو کہ رکوع سے خشوع مراد لینا، خود شارع کے کلام میں لفظ کو غیر شرعی معنے میں استعمال کرنے کے مرادف ہے جو خلاف اصل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ رکوع، خشوع کے معنے میں آیا ہے، اور استعمال ہوا ہے،

چنانچہ ارشاد ہے۔ وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر) حالانکہ یہ بالاجماع ثابت ہے کہ پہلے کی امتوں کی نماز میں اصطلاحی رکوع موجود نہیں تھا، یا فرمایا وَخَرَّ رَاكِعًا (پس گر پڑا رکوع کرتے ہوئے) اور ظاہر ہے اصطلاحی رکوع میں خر اور سقوط نہیں ہوتا اب جب کہ رکوع کے مشہور معنی مجازی خشوع کے ہو گئے تو طے شدہ قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو بلا ضرورت بھی محمول کر سکتے ہیں،

بلکہ ہم تو الٹ کر یہ کہتے ہیں کہ يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ سے سائل کو انگشتری صدقہ کر دینے کے معنے سمجھنا لفظ رکوع کو غیر شرعی معنی پر حمل کرنے کی مانند ہے، اب جو تم اس کا جواب دو وہی ہمارا جواب بھی رکوع

میں سمجھ لو بلکہ اقامت صلوٰۃ کے بعد رکوع کا ذکر ہمارے خیال کی تائید ہے تاکہ بے جا تکرار لازم نہ آئے، اور صلوٰۃ کے بعد زکوٰۃ کا ذکر کرنا تمہاری تردید کرتا ہے کہ قرآنی عرف میں جہاں کہیں زکوٰۃ صلوٰۃ سے متصل بیان ہوئی ہے اس سے فرض زکوٰۃ مراد ہوتی ہے نہ کہ مطلقاً صدقہ!

اور اگر رکوع کو اس کے حقیقی معنے پر ہی محمول کریں تب بھی دو یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ سے حال واقع ہوگا اور تمام مومنین کو شامل ہوگا۔ اس لئے کہ مومنوں کی نماز کو یہود کی نماز سے جدا کرنا ہے جس میں بہر رکوع نہیں ہوتا اس صورت میں بعد والی آیت میں جو یہود سے ترک موالات کا حکم ہے بہت چسپاں ہوتا ہے،

اور اگر یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ سے حال واقع ہو تو معنے کے لحاظ سے یہ نہ صفت ہوگا نہ تعریف بلکہ یہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں نقص کا باعث ہوگا اس لئے کہ نماز کا درست اور تعریف تو یہ ہے کہ وہ اس عمل سے پاک ہو جس کا تعلق نماز سے نہیں، خواہ وہ عمل قلیل ہو یا کثیر، فرق صرف اتنا ہے کہ عمل قلیل مفسد نماز نہیں جب کہ عمل کثیر مفسد نماز ہے، بہر حال اقامت صلوٰۃ کے معنی میں دونوں ہی صورتیں کسی نہ کسی مقدار کا نقص پیدا کرتے ہیں، اور کلام الٰہی کو ناقص پر محمول کرنا جائز نہیں۔ اور پھر اسی کے ساتھ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ امامت کی حقیقت میں اس قید کو دخل بھی نہیں۔ کہ جس میں یہ صفت ہو وہ امام ہو اور جس میں نہ ہو وہ قابل امامت نہیں۔

لہٰذا اگر امامت کے حکم کو اس قید کے ساتھ معلق یا موقوف کیا جائے تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کا کلام بے کار ثابت ہوگا یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ تمہاری بادشاہت کے قابل وہ شخص ہے جس کے کپڑے سرخ ہوں تو کیا بات ہوئی۔

اور اگر ان سب باتوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی یہ آیت اگر حضرت امیرؓ کی امامت کے حصر کی دلیل ہوگی تو دوسری آیات اس کے متعارض ہوں گی، اور شیعوں کو بھی ان معارض آیات سے خلفاء ثلاثہؓ کی امامت سے بھی استدلال کرنا پڑے گا اور کوئی دلیل قابل استدلال اسوقت ہوتی ہے جب معارضات سے محفوظ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے متعلق آیات اوپر بیان ہو چکیں،

اور تعجب تو ملا عبداللہ صاحب اظہار الحق پر ہوتا ہے کہ وہ اس گروہ کا کچھ سمجھدار اور پڑھا لکھا لگتا ہے، مگر وہ بھی اس استدلال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بڑی کوشش اور تگ و دو میں پڑ گیا اور چند بے سرو پا باتوں کے سوا کوئی پُر مغز علمی بات نہ لا سکا۔

ہم صرف اس غرض سے کہ اس فرقہ کی ممتاز شخصیات کے مبلغ علمی اور ان کی دانشمندی روشنی میں آجائے ان کی باتیں نقل کرتے ہیں۔ اور جہاں جہاں ان کو غلطی لگی اس کی نشاندہی بھی ساتھ ساتھ کرتے جا رہے ہیں،

ایک بات ملا عبداللہ نے یہ کہی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ محبت اور دوستی کا حکم وجوبی ہے تو جو مومن ان اوصاف سے متصف ہوں ان کے ساتھ بھی محبت و دوستی کا حکم وجوبی ہو جانا چاہیئے کیونکہ کلام بھی ایک ہے، اور قصہ بھی ایک، اور جس کا موضوع ایک ہو، اور محمول بھی ایک اور کئی صورتوں میں ایک دوسرے پر معطوف بھی ہوں تو یہ جائز نہیں کہ ایک جگہ تو حکم کو بطریق وجوب مانیں اور دوسری جگہ بطریق ندب (مستحب) اور ایک لفظ کو ایک ہی استعمال میں دو معنوں کے لئے لینا یہ بھی جائز نہیں، لہٰذا اس آیت کے مفاد اور مطلب

کے بموجب مومنین متصفین بصفات مذکورہ کی ولایت اور دوستی واجب ہوگی، اور ان کی دوستی مطلقاً بغیر کسی قید و جہت کے ہونے میں خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پہ ہوگی، اب اگر مومنین سے سارے مسلمان مراد ہوں اور پوری امت اس اعتبار سے کہ سارے مسلمان ان صفات سے متصف ہو سکتے ہیں، تو یہ ناقابل عمل ہے کیونکہ ہر شخص پہ سب سے تعارف ہی دشوار ہے چہ جائیکہ ان سے دوستی رکھنا یہ تو اس سے بھی دشوار تر ہے،

پھر بعض وجوہ سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مومن کی دوسرے مومن کے ساتھ دشمنی مباح ہو جاتی ہے بلکہ واجب لہٰذا یہاں اس آیت میں مراد حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) ہی ہوں گے" ملاجی کی بات ختم ہوئی،

ان کی اس تحریر میں عقلمندوں کو تھوڑا سا غور و فکر کرنا پڑے گا، تب ہی اس فرقہ کے علماء کی "فہم عالی" کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تمام مومنین کے ساتھ محبت و دوستی بسبب صفت ایمانی کسی قید و جہت سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے، جیسے موالات ایمانی کہتے ہیں، اگر کسی سبب سے عداوت مباح کیا واجب بھی ہو تب بھی موالات ایمانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس معاملہ میں ہم فیصلہ کا حق شیعہ حضرات کو ہی دیتے ہیں وہ بتائیں کہ شیعہ باہم ایک دوسرے سے دوستی اور محبت اتحاد مذہب شیعیت کی ہی وجہ تو رکھتے ہیں اور یہ دوستی کسی قید کے ساتھ مقید بھی نہیں اور نہ کسی جہت سے مخصوص اسی کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات میں چپقلش اور عداوت بھی ہو جاتی ہے تو کیا اسوقت محبت مذہبی ختم ہو جاتی ہے؟ یا اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے؟۔

اور اگر اس آیت کو سمجھنے میں انہیں کوئی مشکل پیش آ رہی ہے یا اسے سمجھنا محال خیال کر رہے ہیں تو پورے قرآن سے یہ کیسے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔ ایک دوسری آیت دیکھئے۔

اَلْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَیُطِیْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ۔

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے باہم دوست ہیں۔ اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور منکرات سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ عنقریب ان پر رحم فرمائے گا،

اور اگر ایمانی دوستی سب مومنین سے عام اس سے کہ وہ مطیع ہوں یا نافرمان خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پہ ہو تو اس میں کونسی عقلی خرابی لازم آتی ہے ہاں خرابی اسوقت ہے کہ یہ تینوں دوستیاں ایک درجہ اور مرتبہ کی ہوں اور جب خدا کی محبت اصل ہوئی اور رسول کی محبت اس کے تابع اور مومنین و عام مسلمانوں کی اس کے تابع تو یہ تینوں محبتیں برابر کب ہوئیں اور موضوع و محمول کے اتحاد کا قضیہ یہاں متحقق نہیں یہ تو ملا جی کی ایک دھونس ہے جو اہل سنت کے جاہل لوگوں کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کے لئے، یہ منطقی اصطلاحیں بولنے لگا ہے کہ لوگ اس کو منطقی سمجھ کر اس کے کلام میں رد و قدح کرنے کی جرأت نہ کریں۔

پھر کچھ ہوش آیا تو "متعدد ہوں" مگر ایک دوسرے پہ معطوف" کا ٹکڑا لگا دیا مگر اتنا نہیں سمجھ سکا،

کہ بصورت تعدد و عطف یہ مقدمہ نا قابل تسلیم ہے، کیونکہ عطف حکم کی شرکت کے لئے ہوتا ہے جہت کی شرکت کے لئے نہیں عقلیات میں سے اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً یہ کہیں،

إِنَّمَا الْمَوْجُودُ فِي الْخَارِجِ الْوَاجِبُ وَالْجَوَاهِرُ وَالْأَعْرَاضُ، البتہ خارج میں موجود ہونیوالی چیزیں واجب جواہر اور اعراض ہیں،

حالانکہ واجب کی طرف وجود کی نسبت جہت وجوب کے ساتھ ہے، کیونکہ اس کا وجود ضروری ہے اور دائمی ہے، بخلاف جواہر و اعراض کے کہ ان کا وجود ممکن ہو سکتا ہے واجب نہیں، دگو حکم وجود میں سب برابر ہیں)۔

اور شرعیات میں اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے،

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ آپ کہئے یہ میری راہ ہے اللہ کی طرف اعتماد سے بلاتا ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی،

حالانکہ دعوت الی اللہ پیغمبر پر تو واجب ہے اور دوسروں پر مندوب اسی لئے اصولیوں نے کہا ہے کہ قرآن فی النظم قرآن فی الحکم کا موجب ہے، بلکہ اس قسم کے استدلال کو مسالک مردودہ میں سے لکھا ہے،

اور اگر اس کو بھی جانے دیں تو یہ تو ظاہر ہے کہ صرف وجوب محبت میں شرکت سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی جو کچھ خرابی ہے وہ اصالت اور تبعیت کے درجہ و مرتبہ کے اتحاد و یکسانیت میں ہے،

پھر ملاجی نے تمام مومنین سے من حیث الایمان محبت رکھنے کو خصوصیت کے ساتھ ہر مومن کو پہچاننے پر موقوف ٹھیرایا ہے، حالانکہ ایسی کوئی کثرت نہیں جس کو عنوان اور عدد سے نہ پہچانا جاسکے! اگرچہ وہ غیر تناہی کیوں نہ ہو۔ پھر تناہی کا کیا ذکر! مثلاً کل عدد فهو نصف مجموع حاشیه۔ ہر عدد اپنے کناروں کا نصف ہے) اس حکم سے تمام اعداد کی طرف اجمالی توجہ تو ہو گئی، حالانکہ مراتب اعداد بلا شبہ غیر تناہی ہیں یا مثلاً یوں کہیں کل حیوان حساس (ہر حیوان احساس رکھتا ہے اس میں تو جنس حیوان کے ہر فرد کے لئے ذی حس ہونے کا حکم لگا گیا ہے۔ حالانکہ حیوان کی تمام انواع بھی ہم کو معلوم نہیں اصناف و افراد کا علم تو کیسے ہو سکتا ہے،

یہ بیچارہ ملا۔ کہ اسے اجمالی ملاحظہ کا بھی پتہ نہیں چلا جسے ایک عامی سے عامی بھی جانتا ہے اور یہ مسکین عنوان و معنون کے فرق سے بھی آگاہ و آشنا نہیں،

اور اگر اس بحث کو جو علم معقول سے تعلق رکھتی ہے، نا قابل توجہ قرار دے کر تسلیم نہ کریں تو ہم دینی مسلمات کے متعلق ان سے پوچھیں گے اور کہیں گے کہ مثلاً تمام کفار سے بحیثیت کفر ترک موالات کرنا اور ان سے دشمنی رکھنا واجب ہے یا نہیں۔ اگر یہ کہدیں کہ واجب ہے تو وہی خرابی لازم آئے گی کہ سب کی پہچان اور معرفت حاصل نہیں اگر کہیں کہ واجب نہیں تو پھر یزید و مروان سے ان کی دشمنی کس طرح ثابت ہوگی اور قرآنی آیات کا کیا جواب دیں گے فرقہ ہائے مومنین میں تو معرفت ایمانی کی مدد سے ہم امتیاز کر بھی سکتے ہیں مگر انواع کفر کا تو ہمیں بالکل پتہ ہی نہیں تھا کہ ان میں نوعی امتیاز کر سکیں۔ اشخاص و افراد کا امتیاز تو بعد کی بات ہے،

اور پھر ان کا اعتراض موالاۃ علویہ (اولاد علی) سے بھی ٹوٹتا ہے جو ان کے اعتقادات میں داخل ہے کیونکہ علوی حضرات اور ان کی گنتی معلوم کرنا جب کہ وہ اکناف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں عام مومنین ہی کی طرح کی مشکل سے کم نہیں،

ملا عبد اللہ کی مندرجہ بالا بات کی طرح ان کی ایک اور بات یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ خود اہل سنت کی بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے گذارش کی کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد فرما جائیں چنانچہ مشکوٰۃ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی گئی ہے،

قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ لَوِ اسْتَخْلَفْتَ قَالَ لَوِ اسْتَخْلَفْتُ عَلَيْكُمْ فَعَصَيْتُمُوهُ عُذِّبْتُمْ وَلٰكِنْ مَا حَدَّثَكُمْ حُذَيْفَةُ فَصَدِّقُوهُ وَمَا أَقْرَأَكُمْ عَبْدُ اللهِ فَاقْرَؤُوهُ رَوَاهُ التِّرْمِذِي

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اچھا ہوتا کہ آپ کسی کو خلیفہ مقرر فرما دیتے آپ نے ارشاد فرمایا میں اگر کسی کو خلیفہ بناتا اس کے بعد تم اس کی نافرمانی کرتے تو اس کی وجہ سے تمکو عذاب دیا جاتا لیکن (اس سلسلہ میں) ابو حذیفہ جو حدیث تم کو سنائے اس کو سچ جانو۔ اور جو چیز (جس طرح) تمکو عبد اللہ پڑھائے اسکو پڑھو رواہ الترمذی،

اسی طرح آپ سے اس شخص کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا جو خلافت و امامت کے لائق ہو اس کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنو وہ روایت فرماتے ہیں،

قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ مَنْ نُؤَمِّرُ بَعْدَكَ قَالَ إِنْ تُؤَمِّرُوا أَبَا بَكْرٍ تَجِدُوهُ أَمِينًا زَاهِدًا فِي الدُّنْيَا رَاغِبًا فِي الْآخِرَةِ وَإِنْ تُؤَمِّرُوا عُمَرَ تَجِدُوهُ قَوِيًّا أَمِينًا لَا يَخَافُ فِي اللهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَإِنْ تُؤَمِّرُوا عَلِيًّا وَلَا أَرَاكُمْ فَاعِلِينَ تَجِدُوهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا يَأْخُذُ بِكُمُ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ رَوَاهُ أَحْمَدُ۔

آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم آپ کے بعد کس کو امیر بنائیں؟ آپ نے فرمایا اگر ابو بکر کو اپنا امیر بنالوگے تو اسے امین پاؤگے۔ دنیا سے بیزار آخرت کے طلبگار، اور اگر عمر کو امیر بنالوگے تو اسے مضبوط امانتدار پاؤگے جو اللہ کے معاملہ در راستہ میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا اور اگر تم علی کو امام بناؤگے، اور میرا خیال ہے تم ایسا نہیں کروگے تو اس کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ پاؤگے تم کو سیدھے رستے پر لگائے گا۔ رواہ احمد۔

یہ التماس اور استفسار بتاتا ہے کہ نزول آیت کے وقت بموجودگی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم امر امارت میں تردد موجود تھا تو اس صورت میں انما کے معنی باطل نہ ہوئے تمت کلامہ،

یہاں بھی بات غور و فکر کی ہے، اس لئے کہ محض سوال و دریافت، تردد کا تقاضہ نہیں کرتا ہاں جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا جواب سننے کے بعد باہمی مشورہ کرنے اور امیر بنانے میں ایک دوسرے سے مختلف الخیال ہوتے اور نزاع و جھگڑا کرتے تو البتہ انما کے معنے متحقق ہوتے اس وقت یہ کہہ سکتے تھے کہ ان میں تردد و شک پایا جاتا تھا، صرف التماس و استفسار انما کی ضرورت نہیں، یہ موقع تو انّ کا ہے جیسا کہ علم معانی کے ابتداء میں بحث موکدات اسناد میں اس کا ذکر ہے، کہ ایسے موقعہ پر انّ کا استعمال ہوتا ہے انما کا نہیں۔ آہ بے چارے ملا جی! کہ ان کو ابھی تک انّ اور انما میں بھی تمیز کرنا نہ آیا،

اور اگر ان کا دل رکھنے کی خاطر، تردد کی موجودگی مان بھی لیں تو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ یہ تردد نزول آیت سے پہلے تھا یا بعد میں پیدا ہوا ہو، اگر پہلے تھا تو متصل تھا یا کچھ فاصلہ سے، اگر متصل تھا تو یہ اتصال اتفاقی تھا یا یہ واقعہ آیت کے نزول کا سبب بھی تھا، یہ تمام امور سند صحیح کے ساتھ ہنوز تشنۂ بیان ہیں اور مقام استدلال میں خالی خولی احتمالات کی کوئی گنجائش نہیں دوسرے اسباب نزول کوئی عقلی امر نہیں، بغیر خبر صحیح کے محض احتمالات پر کوئی کیوں کان دھرے ان سے کس طرح ثبوت فراہم کرے اس کو تو مفسرین ہر دو فرقہ میں سے کسی نے بھی سبب نزول قرار نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ نزول آیت کے متصل نہیں تھا ممکن ہے بعد کا واقعہ ہو بہر صورت یہ ان کے مفید مطلب بالکل نہیں،

اور طرفہ تماشا یہ کہ جو حدیث بیان کی ہے وہ کلمہ انما کے ساتھ واضح خلاف اور منافات رکھتی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب اس سوال کے ذیل میں ہے کہ لائق خلافت و امامت کون ہے اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اشخاص میں سے ہر ایک کو استحقاق خلافت ہے لیکن ترتیب اسما میں درحقیقت شیخین کو مقدم رکھنے کی طرف اشارہ ہے،

تو اس حدیث میں حضور کے جواب اور سائل کے سوال میں صاف منافات نکلی کیونکہ آیت میں تو انما خلافت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر رہا ہے اب اگر آیت کو حدیث سے مقدم مانیں تو رسول اللہ کا فرمان قرآن کے مخالف ہوتا ہے اور اگر آیت حدیث سے بعید ہے تو قرآن سے نبی کریم کے قول کی تردید و تکذیب لازم آتی ہے اور اس بات کی یہاں گنجائش نہیں کہ یہ کہدیں کہ ایک نے دوسرے کو منسوخ کر دیا، کیونکہ حدیث و آیت دونوں باب اخبار سے ہیں اور اخبار میں نسخ جائز نہیں، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ چونکہ ان میں سے ایک کا دوسرے پر تقدم و تاخر معلوم نہیں تو منافات کے سبب، ہر دو کا عمل ساقط ہوا۔

اگر وہ یہ کہیں کہ حدیث خبر واحد ہونے کی وجہ سے مسئلہ امامت میں قابل تمسک نہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر یہ تردد اور اثبات نزاع میں بھی قابل استدلال نہیں رہے گی،

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ خود آیت کے ساتھ استدلال بھی تردد و نزاع کے ثبوت پر موقوف ہے اور وہ ثبوت سے نہیں تو شیعوں کا اس آیت سے استدلال بھی غلط ہوا کیونکہ مسئلہ امامت میں ایسی آیت سے بھی استدلال جائز نہیں جس کی خبر واحد پر موقوف ہو،

اور پہلی حدیث میں استخلاف کو امت کے حق میں ترک اصلح فرمایا پس اگر آیت انما ولیکم اللہ استخلاف پر دلالت کرے تو جناب الٰہی سے ترک اصلح کا صدور لازم آئے گا، جو محال ہے لہذا پہلی حدیث ان کو منع کرتی ہے کہ اس مسئلہ میں اس آیت سے استدلال نہ کریں،

یہ ان کے چیدہ اور برگزیدہ علماء کی باتیں ہیں کہ علمی جلالت شان رکھتے ہوئے بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کہہ سکتے پھر ان کی دوسری بادر ہوا باتیں جو ان کے منہ سے بے سوچے سمجھے نکلتی ہیں ہم نقل کرنے بیٹھ جائیں تو خواہ مخواہ وقت کا ضیاع ہوگا اور بات بے فائدہ لمبی ہو جائے گی،

ان کے بعض اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ آیت،

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا - اے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے نجاست دور کرکے تم کو پورا پورا پاک کردے،

کے بارے میں سارے مفسرین متفق القول ہیں کہ یہ آیت حضرت علی بی بی فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی اور تاکیدی پہلو کے لحاظ سے ان کی عصمت کا ثبوت دیتی ہے، اور غیر معصوم امام نہیں ہوتا۔

یہاں بھی مقدمات گڑبڑ ہیں۔ اول تو اجماع مفسرین ان کے اتفاق قول کا دعویٰ ہی غلط ہے، اس لئے کہ ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی ہے، اور ابن جریر عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ علی الاعلان کوچہ و بازار میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے بارے میں اتری ہے، اور سیاق و سباق آیت کے لحاظ سے یہ ہی بات ظاہر وصحیح ہے، کیونکہ يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ سے اطعن بلکہ والحکمۃ تک ازواج مطہرات ہی سے خطاب ہے اور امر و نہی کا تعلق انہیں سے ہے، تو اب ایک سلسلہ کلام میں دوسروں کا حال لے آنا اس تنبیہ کے بغیر کہ پہلا کلام ختم دوسرا شروع، طریقہ بلاغت کے خلاف ہے جس سے قرآن مجید کو پاک جاننا اور ماننا چاہیئے پھر بیوتکن کا لفظ بڑھا کر بیوت ازواج مطہرات کی طرف اشارہ کرنا بھی اسپر دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اہل بیت سے ازواج مطہرات ہی مراد ہیں اس لئے کہ ازواج مطہرات کے بیوت کے علاوہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اور کون سا بیت تھا یا ہو سکتا تھا،

ملا عبد اللہ کہتا ہے کہ بیوتکن میں بیوت کو جمع کی صورت میں لانا اور اہل بیت میں واحد کی صورت میں یہ بتاتا ہے کہ ان کے بیوت بیت نبوت کے علاوہ ہیں اگر وہ اہل بیت ہوتیں تو کلام یوں ہوتا واذکرن ما یتلی فی بیتکن بجائے بیوتکن کے۔

اب ذرا انصاف سے کام لے کر دیکھیں کہ یہ پڑھے لکھے عالم و دانشمند ملا جی کتنی بے مغز اور پوچ بات کہہ رہے ہیں۔ اہل بیت میں بیت کو جو اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل وکثیر سب پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے کہ اس کی نسبت و اضافت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے مفرد لائے کہ ازواج مطہرات کے سب گھر اس اضافت کے اعتبار سے ایک گھر کی جگہ ہیں اور بیوتکن میں چونکہ اضافت ازواج مطہرات کی طرف ہے اور وہ متعدد ہیں، اس اعتبار سے جمع کا صیغہ لائے

اور ملا عبد اللہ نے جو یہ کہا ہے کہ معطوف معطوف علیہ میں فاصلہ لانا اگرچہ طویل ہو کوئی حرج کی بات نہیں اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں یہ واقع ہے اَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ پھر آیت کے ختم پر فرمایا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ مفسرین کا قول ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ کا عطف اطیعوا الرسول پر ہے تمت کلامہ

ان کا یہ قول پہلے قول سے بھی زیادہ لچر اور پوچ ہے اس لئے کہ معطوف علیہ و معطوف میں فاصلہ ایسے اجنبی امر سے جو نحوی اعراب کے اعتبار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو بے شک جائز ہے لیکن یہ فاصلہ

ہمارے لئے موجب نقص نہیں اس لئے کہ ہماری بحث کا تعلق اس اجنبیت اور مغائرت میں ہے جو اگلی پچھلی آیات کے موقع و محل کے اعتبار سے پیدا ہوتی ہے اور بلاغت کے خلاف یہ صورت ہے وہ نہیں،

اور یہ بات جو انہوں نے بعض مفسرین کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ اطیعوا الرسول پر معطوف ہے صریحا غلط ہے اس لئے کہ اقیموا الصلوٰۃ کے بعد پھر اطیعوا الرسول آیا ہے، اس صورت میں عطف الشئ علی نفسہٖ (کسی چیز کا عطف خود اسی چیز پر) لازم آتا ہے،

اور اس سے بھی زیادہ لچر اور مضحکہ خیز بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ "آیات میں مغائرت انشائی اور خبری کا ہے، کیونکہ آیت تطہیر جو جملہ ندائیہ اور خبریہ ہے اور اس کے قبل و بعد امر و نہی ہے۔ یہ انشائیہ ہے اور انشائیہ کا عطف خبریہ پر قطعاً ممنوع ہے"

اول تو آیت تطہیر میں حرف عطف ہے ہی کہاں بلکہ وہ تو اَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ میں جو اطاعت کا امر ہے اس کی علت ہے اور انشائیہ کو خبریہ کی علت ٹھیرانا، پورے قرآن و حدیث اور فصحا و بلغاء عرب کے کلام میں مشہور اور رائج ہے مثلاً یہ کہتے ہیں، اِضْرِبْ زَیْدًا اِنَّہٗ فَاسِقٌ یا اَطِعْنِیْ بِاَعْلَمُ اِنَّمَا اُرِیْدُ اَنْ اُکْرِمَکَ اور اگر وَاذْکُرْنَ کا عطف مراد لیتا ہے، تو اس کے معطوف علیہ، اَطِعْنَ قَرْنَ اور دوسرے سابق حکم ہیں نہ کہ اِنَّمَا۔

یہیں سے ان کے علماء کی عربی دانی کی پول بھی کھل جاتی ہے اور نحو و صرف میں اتنی واضح کوتاہی کے باوجود چاہتے یہ ہیں کہ کلام اللہ کے مفسر بنیں، شاید خواب میں کسی چوہے کو اونٹ بنتے دیکھ لیا ہو گا یا ہلدی کی گرہ پا کر پنساری بننے کا خواب دیکھنا چاہتے ہوں گے،

اور عنکم میں مذکر کے صیغہ کا استعمال اھل کے لفظ کے لحاظ سے ہے اہل عرب کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ایسی چیز کو جو حقیقت میں مؤنث ہو مذکر لفظ سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جیسے قرآن مجید کی اس آیت میں

اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔	اللہ کے حکم سے جو تم پر رحمتیں اور برکتیں ہیں تو اے اہل بیت کیا تم ان پر تعجب کرتی ہو۔ اللہ بے شک تعریف کیا ہوا بزرگ ہے،

اور ترمذی نیز صحاح کی دوسری کتابوں میں جو یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چار افراد کو اپنے کمبل کی کُبکل میں لے کر یہ دعا فرمائی،

اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاَذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا	اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ناپاکی دور کر اور ان کو پورا پورا پاک فرما دے۔

اور جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسوقت آئیں اور کہا کہ مجھے بھی ان میں شریک فرما لیجئے تو آپ نے فرمایا۔ اَنْتِ عَلٰی خَیْرٍ وَّاَنْتِ عَلٰی مَکَانِکِ (تم تو میری ہو ہی اور تمہارا تو خود ایک مقام ہے یہ واقعہ صاف طور پر اس بات کی دلیل کہ آیت تطہیر ازواج مطہرات ہی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور یہ

چاروں جونکہ آپ کے جگر پارے اور عزیز تھے مگر آیت کا مصداق نہ تھے اس لئے آپ نے ان کو بھی اس وعدہ الٰہی میں شریک کرنے کی خصوصی دعا فرمائی اگر آیت انہیں کے حق میں اتری ہوتی تو اس اہتمام سے دعا کی کیا ضرورت تھی اور ایک حاصل شدہ بات کی خاطر آپ دوبارہ کیوں کوشش فرماتے اور اسی لئے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اس میں شریک نہیں فرمایا کہ ان کے لئے تو وعدہ الٰہی نازل ہو چکا تھا اس لئے ان کے حق میں یہ دعا تحصیل حاصل ہوتی،

اور اہل سنت کے محقق علماء کا یہ خیال ہے کہ گو یہ آیت خطاب تو ازواج مطہرات سے کر رہی ہے لیکن چونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں اس لئے تمامی اہل بیت اس بشارت میں داخل ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو چار افراد کے لئے دعا فرمائی وہ کسی سبب خاص کی بنا پر فرمائی،

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے سیاق و سباق کلام یا کسی قرینہ سے یہ محسوس فرما لیا ہو کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے لئے ہی خاص ہے۔ دیگر اہل بیت اس سے مراد نہیں تو آپ نے خصوصیت کے ساتھ چار اشخاص کے لئے دعا فرمائی۔ اور بیہقی کی صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی معاملہ آپ نے اپنے محترم چچا حضرت عباس اور آپ کی اولاد کیلئے بھی فرمایا، بیہقی نے ابی السید الساعدی سے یہ روایت بایں الفاظ نقل کی ہے

قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ یَا اَبَا الْفَضْلِ لَا تَرِمْ مَنْزِلَکَ اَنْتَ وَبَنُوکَ غَدًا حَتّٰی اٰتِیَکُمْ فَاِنَّ لِی بِکُمْ حَاجَةً فَانْتَظَرُوْہُ حَتّٰی جَاءَ بَعْدَ مَا اَضْحٰی فَدَخَلَ عَلَیْہِمْ وَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ فَقَالُوْا وَعَلَیْکَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ قَالَ کَیْفَ اَصْبَحْتُمْ قَالُوْا اَصْبَحْنَا بِخَیْرٍ نَحْمَدُ اللّٰہَ تَعَالٰی فَقَالَ لَہُمْ تَقَارَبُوْا فَتَزَاحَفَ بَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ حَتّٰی اِذَا اَمْکَنُوْہُ اِشْتَمَلَ عَلَیْہِمْ بِمُلَاءَتِہٖ ثُمَّ قَالَ یَا رَبِّ ھٰذَا عَمِّیْ وَصِنْوُ اَبِیْ وَھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ اُسْتُرْھُمْ مِنَ النَّارِ کَسَتْرِیْ اِیَّاھُمْ بِمُلَاءَتِیْ ھٰذِہٖ قَالَ فَاَمَّنَتْ اُسْکُفَّةُ الْبَابِ وَحَوَائِطُ الْبَیْتِ وَقَالَتْ اٰمِیْنَ اٰمِیْنَ اٰمِیْنَ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عباس بن عبد المطلب سے فرمایا اے ابو الفضل کل جب تک میں تمہارے پاس نہ آؤں تم اور تمہارے لڑکے باہر گھر سے نہ جائیں مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ پس وہ آپ کے منتظر رہے یہاں تک کہ آپ چاشت کے بعد تشریف لے آئے، اور ان کے پاس پہنچ کر السلام علیکم فرمایا ان سب نے جواب میں و علیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ کہا پھر آپ نے فرمایا صبح کیسی گزری سب نے کہا خدا کا شکر ہے خیریت سے گزری پھر آپ نے فرمایا قریب قریب آ جاؤ وہ سب کھسک کر آپ کے قریب مل جل کر بیٹھ گئے تب آپ نے ان سب کو اپنی چادر مبارک کی بغل میں لے لیا اور فرمایا اے میرے رب یہ میرے چچا ہیں، میرے باپ کے سگے۔ اور یہ میرے اہل بیت۔ تو ان کو آتش دوزخ سے اس طرح آڑ میں لے لے جس طرح میں نے ان کو اپنی چادر کی اوٹ میں لے لیا ہے راوی کا بیان ہے کہ آپ کی اس دعا پر گھر کے در و دیوار بام و در سب نے تین مرتبہ بآواز بلند آمین کہی۔"

ابن ماجہ نے بھی یہ روایت مختصراً اپنے ہاں بیان کی ہے اور دوسرے محدثین نے بھی یہ قصہ متعدد طریقوں سے اعلام النبوۃ میں روایت کیا ہے۔"

"ملا عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ بیت سے مراد بیت نبوت ہے، اور اس میں تو شک نہیں کہ اہل بیت کا لفظ باعتبار لغوی معنی ازواج کو بھی شامل ہے بلکہ اس فرد پر بولا جاتا ہے جو اس گھر میں رہتا بستا ہو۔ مثلاً خدام غلام وغیرہ۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ یہ وسیع لغوی معنے مراد نہیں لہذا اس سے مراد خمسہ آل عبا ہوں گے جن کی تخصیص حدیث کسا نے کی"

اس کی یہ بات بھی پہلے بیان شدہ باتوں جیسی ہی ہے۔ کیونکہ اس وسیع لغوی معنے کے مراد لینے میں جو قباحت ان کو لازم آتی ہے، وہ عصمت کی عمومیت ہے اگر یہ سب کو مراد لے لیتے ہیں، تو سب کو "معصوم" بھی ماننا پڑے کیونکہ وہ اہل بیت کی معصومیت پر اس آیت ہی سے تو استدلال کرتے ہیں،

اور جب اہل سنت شیعوں کے ساتھ اس بات میں متفق نہیں کہ اس آیت سے عصمت سمجھی جاتی ہے اور خمسہ آل عبا۔ اور ازواج مطہرات میں عصمت (معصومیت) کے قائل نہیں، تو اس عمومی معنے مراد لینے میں ان سے کیوں متفق ہونگے یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے وسیع دائرہ کو تنگ کرنا ہوگا،

پھر اگر وہ وسیع لغوی معنی مراد نہ بھی ہوں تب بھی وہ اس لحاظ سے کہ اگلی پچھلی آیات کے قرائن مراد کو متعین کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ باعتبار عرف عقل بھی اس لفظ کو ان لوگوں کے لئے مخصوص کرتی ہے، جو گھر میں سکونت پذیر ہوں اور عادۃً ان میں انتقال، تحول اور تبدل کا سلسلہ جاری نہ ہو مثلاً ازواج و اولاد نہ کہ خادم، غلام اور کنیزیں! کہ یہ تبدیلی، ردو بدل کا نشانہ بنے رہتے ہیں

خادم نوکری چھوڑ کر دوسرے کے پاس چلا جا سکتا ہے غلام و کنیز کی ملکیت بدل سکتی ہے وہ بک کر کسی اور مالک کے پاس چلے جا سکتے ہیں، یا بخشش کے طور پر کسی کو دیئے جا سکتے ہیں یا آزاد ہو کر یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں، اور حدیث کسا۔ اہل بیت کے ساتھ ان چند اشخاص کو اس وقت مخصوص کرتی جب اس تخصیص کا کوئی اور فائدہ نظر نہ آتا۔ حالانکہ یہاں اس کا دوسرا فائدہ یہ پیش نظر ہے کہ صرف ازواج مطہرات کے مخاطب ہونے کے سبب یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ چند اشخاص اہل بیت میں نہیں۔

کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ پورا عالم اسلام، کیا سنی یا شیعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے ذکر کے وقت ہمیشہ ان کی تفضیلی لقب مطہرات، سے یاد کرتا ہے، چنانچہ نور اللہ شوستری اور ملا عبداللہ مشہدی اور ان کے دوسرے علماء کی تحریروں میں ہزاروں جگہ لکھا دیکھا گیا ہے اور ظاہر ہے یہ لقب اسی آیت تطہیر سے لیا گیا ہے اور لفظ مطہرات بلا ریب و شک اور بے دغدغہ ان کے منصف لوگوں کی زبانوں پر جاری ساری رہتا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی ان سے یہ کہدے کہ آیت تطہیر ازواج نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طہارت و تطہیر کا پتہ دیرہی ہے، تو ان کی رگ پھول جاتی ہے،۔ اور لڑاکا مرغ کی طرح (بحث و جدال میں) الجھ پڑتے اور جھگڑنے لگتے ہیں،

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ آیت عصمت پر دلالت کرتی ہے یا نہ، تو یہ چند بحثوں پر مبنی ہے ایک تو یہ کہ کلمہ لیذھب عنکم الرجس" ترکیب نحوی میں کیا واقع ہوا ہے۔ آیا یہ یرید کا مفعول لہٗ ہے یا مفعول بہ دوسرے اہل بیت سے کیا مراد ہے، اور تیسرے رجس سے کیا مراد ہے۔

ان تینوں امور میں بحث وگفتگو کی بڑی گنجائش ہے، اس پر کی گئی بحثوں کے لئے بڑی بڑی کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، ردوکد کے بعد اگر نتیجہ یہ نکلے کہ لیذھب مفعول بہ ہے اور اہل بیت کا انحصار انہیں چار اشخاص میں ہے۔ اور رجس سے مراد مطلق گناہ ہیں۔ پھر بھی اس آیت کی عصمت پر دلالت قابل تسلیم نہیں بلکہ یہ اس وقت بھی عدم عصمت پر ہی دلالت کریگی۔ کیونکہ کسی پاک چیز کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اس کو پاک کرنا چاہتے ہیں زیادہ سے زیادہ اس ارادہ کے وجود میں آنے کے بعد ان چند اشخاص کا گناہ سے محفوظ رہنا ثابت ہوگا اور یہ حفاظت بھی اہل سنت کے اصول کے ماتحت ہوگی، شیعہ اصول کے بموجب نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ارادۂ الٰہی، مراد الٰہی کے وقوع کے لئے لازم نہیں۔ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزوں کا ارادہ کرتا ہے مگر شیطان یا بنی آدم اس کو وقوع میں نہیں آنے دیتے، اس کی تفصیل باب الٰہیات میں گزر چکی، اور اگر مقصود الٰہی عصمت ہی ظاہر کرنا ہوتا تو اس کے لئے یوں عبارت لائی جاتی،

اِنَّ اللّٰہَ اَذْھَبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ وَطَھَّرَکُمْ تَطْھِیْرًا اور یہ ایسی صاف وظاہر بات ہے جسے غبی اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے چہ جائیکہ ذکی، اور علامہ!

اور پھر اگر یہ کلمہ عصمت کو ثابت کرتا ہوتا تو پھر تمام صحابہ بالعموم اور اصحاب بدر بالخصوص سب کے سب معصوم ہوتے اس لئے کہ ان کے حق میں تو یہ کلمہ کئی مرتبہ فرمایا گیا ہے، مثلاً۔

وَلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔	اور لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اتمام نعمت کرے تاکہ تم شکر بجالاؤ،
وَیُذْھِبَ عَنْکُمْ رِجْسَ الشَّیْطٰنِ۔	اور دور کردے تم سے شیطانی گندگی کو۔

ان دو لفظوں سے جن سے عصمت کا اظہار ہوتا ہے ان آیات میں تو صحابہ کے لئے اتمام نعمت کی مہربانی وعنایت مزید ثابت ہوگئی کیونکہ اتمام نعمت تو اس وقت تک تصور میں بھی نہیں آسکتا جب تک گناہوں اور شر شیطان سے حفاظت نہ کی جائے،

اب وہ تخصیصات جو لفظ تطہیر اور اذہاب رجس سے بطریق احتمال وشک ثابت کی جا رہی تھیں، کہاں گئیں وہ تو غبار کی طرح ہوا میں اڑ گئیں،

تیسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ غیر معصوم امام نہیں ہوتا ان کا یہ خیال بھی سراسر باطل اور ناقابل تسلیم ہے۔ کتاب اللہ اور عترت رسول دونوں اس کی تردید کرتی ہیں،

پھر اگر اسے مان بھی لیں تو اس دلیل سے جناب علی رضی اللہ عنہ کی صرف امامت ثابت ہوئی لیکن یہ کہ وہ امام بلافصل تھے یہ کیسے ثابت ہوا۔

کیا یہ جائز ہے کہ سبطین محترمین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عین حیات امام ہو سکتا ہے! اگر نہیں۔ تو اس طرح یہ کیسے جائز وممکن ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت اگرچہ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے بعد ہو مگر وہ ہوں "امام بلافصل" ایسی بات سے استدلال کرنا جس کا کوئی قائل ہی نہ ہو علم وعقل سے عاجزوں کا کام ہے، کیونکہ معترض کا جب کوئی مذہب نہ ہو تو وہ اعتراض سے کیسے

بخش دے گا،

ان کے سابقہ سلسلہ کے مسائل میں سے ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

- قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔ آپ کہئے کہ میں تبلیغ دین الٰہی کے سلسلہ میں بجز اپنے قرابتداروں سے محبت کے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔

اس وقت سب نے پوچھا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کے وہ قرابتدار کون ہیں، جن کی محبت ہم پر واجب کی گئی ہے، آپ نے فرمایا۔ علی۔ فاطمہ اور ان کے دو بیٹے (رضی اللہ عنہم) واضح رہے کہ یہ آیت تو اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ نواصب کے مقابلہ میں اہل بیت کی محبت کو واجب ثابت کرنے کی غرض سے پیش کرتے ہیں، چنانچہ علامہ قرطبی اور دوسرے اہل سنت جو شام کے نواصب سے مناظرہ کرتے تھے اس آیت کو اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے، شیعوں نے اسے ان کی کتابوں سے چرایا اور خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کی نفی کی دلیل بنا بیٹھے اور دلیل میں دو تین کلمے اپنی طرف سے بڑھا کر یوں کہنے لگے "کہ اہل بیت کی محبت واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہو اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے گویا یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب ہوئی، اور یہی امام ہونے کے معنے ہیں۔ اور ان کے علاوہ کسی کی محبت واجب نہیں لہذا اطاعت بھی واجب نہیں"

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی مراد کیا ہے اس میں مفسرین کا زبردست اختلاف ہے طبرانی اور امام احمد رحمہما اللہ۔ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت اسی طرح کی ہے لیکن اکثر محدثین نے اس روایت کو کمزور ثابت کیا ہے کیونکہ یہ آیت سورہ شوریٰ کی ہے اور پوری کی پوری سورہ شوریٰ مکی ہے جب کہ حضرات حسنین کی پیدائش کا تو کیا سوال بی بی فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت علی سے منسوب تک نہ ہوئی تھیں،

پھر اس سند میں کٹر شیعہ بھی گھسے ہوئے ہیں محدثین میں سے جس کسی نے اس شیعہ کو سچا سمجھا ہوگا وہ اس کے ظاہری حالات کو دیکھ کر اور اس کے عقیدہ سے ناواقف ہوتے ہوئے کہا ہوگا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس شیعہ نے بھی جھوٹ نہیں بولا ہوگا بلکہ روایت بالمعنی کی ہوگی،

حدیث میں لفظ اہل بیتی ہوگا اس نے اپنے عقیدہ کے مطابق اہل بیت کی تشریح انہیں چار سے کر دی چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت جوں کی توں بیان کی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں۔ اَلْقُرْبٰى مَنْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّبِيِّ صلے اللہ علیہ وسلم قَرَابَةٌ (قربیٰ وہ ہیں جس کے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان قرابت ہو)

اور قتادہ، سدی کبیر اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے وثوق سے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں، "کہ میں تم سے دینی دعوت اور تبلیغ مذہبی کا کوئی صلہ نہیں مانگتا لیکن تم سے اپنے ساتھ دوستی چاہتا ہوں اس قرابت کی بنا پر جو تمہارے ساتھ رکھتا ہوں"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بخاری میں یہ روایت تفصیل سے مذکور ہے کہ قریش میں کا کوئی خاندانی سلسلہ ایسا نہ تھا، جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا رشتۂ قرابت نہ ہو، لہذا آپ نے اس کی یاد دہانی فرمائی اور اس قرابت کے حق کی ادائیگی چاہی کہ کم از کم ایذا رسانی سے تو باز رہیں، جو صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اس صورت میں یہ استثنا منقطع ہے،

چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ علیہ اور تمام مفسرین متاخرین نے اس معنی کو پسند کیا ہے اس لئے کہ پہلے معنی شان نبوت کے مناسب نہیں یہ تو دنیا داروں کی خصلت ہے کہ جب کوئی کام کرتے ہیں، تو اس کا صلہ اولاد و اقارب کے لئے چاہتے، اگر انبیا کی بھی یہی روش ہو تو ان کے اور عام دنیا داروں کے مابین فرق و امتیاز کیا رہ جائے اور پھر ان کے اقوال و افعال میں لوگوں کی شک و شبہ کرنے کا بہانہ بھی ہاتھ آسکتا تھا، اور یوں بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا،

اور پھر ان معنوں کے مطابق یہ آیت بہت سی دوسری آیات کے منافی بھی ہو جاتی جیسے کہ دوسری جگہ ارشاد ہے،

مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ ـ	جو اجر میں تم سے چاہوں وہ تمہارے لئے میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے،
أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ـ	کیا تم ان سے اجر مانگو گے یہ تو آپ ہی ڈنڈ سے بوجھل ہو رہے ہیں،

اور سورہ شعراء میں تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اجرت طلبی سے انکار نقل فرمایا ہے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو افضل الانبیاء ہیں، کب اجر طلب فرما سکتے تھے کیا اس صورت میں آپ کا مقام ان انبیاء کرام سے نیچا نہ ہو جاتا۔ حالانکہ ایسا ہونا خلاف اجماع ہے،

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ مفروضہ تسلیم نہیں کرتے کہ جو واجب المحبت ہو وہ واجب الاطاعت بھی ہو اور نہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو واجب الاطاعت ہو وہ امام یعنی رئیس عام بھی ہو،

پہلی صورت کی یہ دلیل ہے کہ اگر محبت کا واجب ہونا اطاعت کے واجب ہونے کو لازم ہوتا تو یہ ضروری ہوتا کہ تمام علوی حضرات واجب الاطاعت ہوں اس لئے کہ شیخ بابویہ نے اپنی کتاب الاعتقاد میں لکھا ہے کہ باجماع امامیہ علوی کی محبت واجب ہے،

اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس دلیل کی بنا پر بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بھی امام ہوں حالانکہ یہ خلاف اجماع ہے، اور اس کی بنا پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ چاروں حضرات حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی امام ہوں اسی طرح جناب حسنین رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی امام ہوں حالانکہ یہ صورت بالاتفاق غلط اور باطل ہے،

دوسری صورت یہ کہ اگر ہر واجب الاطاعت خلافت کبریٰ کا مالک ہے تو ہر نبی کو بھی خلافت کبریٰ کا مالک ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس لئے کہ مثلاً حضرت شمویل نبی واجب الاطاعت تھے، اور حضرت طالوت

خلافت کبریٰ کے مالک ۔ خود قرآن ارشاد میں فرمایا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا ۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ کرکے بھیجا۔

ہماری طرف سے ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ محبت صرف ان ہی چار حضرات کی واجب ہے بلکہ دوسرے بھی اس میں شریک ہیں، چنانچہ حافظ ابوطاہر سلفی نے اپنی مشیخت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم حُبُّ اَبِیْ بَکْرٍ وَشُکْرُہٗ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ اُمَّتِیْ ۔ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی محبت اور ان کا شکر یہ میری ساری امت پر واجب ہے،

ابن عساکر نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابوطاہر سلفی جیسی روایت نقل کی ہے، اور ایک دوسرے طریقہ سے سہل بن سعد ساعدیؓ سے یہ روایت مروی ہے، اور حافظ عمر بن محمد خضر الملا اپنی سیرت میں یوں روایت کرتا ہے،

عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی فَرَضَ عَلَیْکُمْ حُبَّ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِیٍّ کَمَا فَرَضَ عَلَیْکُمُ الصَّلٰوۃَ وَالزَّکٰوۃَ وَالصَّوْمَ وَالْحَجَّ ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ابوبکر، عمر، عثمان، اور علی رضی اللہ عنہم، کی محبت اسی طرح فرض کی ہے جس طرح نماز، روزہ زکوٰۃ اور حج تم پر فرض کئے،

ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ قَالَ حُبُّ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ اِیْمَانٌ وَبُغْضُھُمَا نِفَاقٌ ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض نفاق،

اور ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے،

اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ حُبُّ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ مِنَ الْاِیْمَانِ وَبُغْضُھُمَا کُفْرٌ ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان کا جز ہے اور ان سے بغض کفر

اور ترمذی نے روایت کی،

اَنَّہٗ اُتِیَ بِجَنَازَۃٍ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْہِ وَقَالَ اِنَّہٗ کَانَ یُبْغِضُ عُثْمَانَ فَاَبْغَضَہُ اللّٰہُ ۔ ایک جنازہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا آپ نے اس کی نماز نہیں پڑھی اور یہ فرمایا یہ عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا تو اللہ نے بھی اس سے بغض رکھا

یہ روایات اگرچہ اہل سنت کی کتابوں سے مذکور ہیں لیکن چونکہ شیعہ اہل سنت کو الزام دینا چاہتے ہیں، اس لئے اس سلسلہ کی تمام روایات کو پیش نظر رکھے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اپنے مطلب کی ایک آدھ روایت سنا دینے سے وہ دھونس میں نہیں آسکتے،

اور اگر شیعہ اہل سنت کو تنگ کرنے سے باز نہ آئیں تو کتاب اللہ اور عترت رسول کے اقوال سے بھی ان کو جواب دے کر ان کا منہ بند کیا جاسکتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یحبھم ویحبونہ۔ یہ بالاجماع مرتدین سے لڑنے والوں کے حق میں ہے اور دنیا جانتی ہے کہ خلفائے کرام ان کے سرگروہ تھے اور اللہ تعالیٰ جس سے دوستی رکھے وہ واجب المحبت ہے اسی طرح اور بھی آیات ہیں،

خلافت بلافصل کے سلسلہ میں ان کی طرف سے آیت مباہلہ بھی پیش کی گئی ہے،

قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ الخ — کہئے کہ آؤ ہم تم بلائیں اپنے اپنے بیٹوں عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو۔

شیعہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لئے گھر سے نکلے اور علیؓ فاطمہؓ، اور حسنین کو ساتھ لیا تو معلوم ہوا کہ ابناء سے مراد حضرت حسن حسین رضی اللہ عنہما اور النفس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، گویا جناب امیر نفس رسول ٹھیرے اور یہ تو ظاہر ہے کہ نفس کے حقیقی معنے مراد لینا تو محال ہے، لامحالہ مساوی کے معنے ہوں گے اب جو مساوی رسول ہو تو وہ یقیناً دوسروں سے افضل اور اولی بالتصرف ہوگا اس لئے کہ افضل واولی بالتصرف کا مساوی بھی افضل واولی بالتصرف ہوگا تو وہ امام ہوگا کیونکہ امام وہی تو ہے جو افضل واولی بالتصرف ہو۔ نک سک سے درست اور نظم و ترتیب کے ساتھ دلیل کی یہ تقریر ہمارے لفظوں میں ہے خود شیعہ علماء میں اتنا سلیقہ بھی نہیں کہ وہ اپنا مافی الضمیر قاعدہ، ضابطہ میں پیش کر سکیں دراصل ان پر اس کتاب کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان کی اکثر بے ترتیب، غیر منظم دلیلوں کو مناسب ترتیب اور مدلل اور بہ تقریر سے آراستہ و پیراستہ کیا اگر کسی کو ہماری یہ بات ماننے میں تامل ہو تو وہ ان کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھ لے۔ کہ ان کا کلام کسقدر پراگندہ، بے ربط و بے جوڑ ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطلب بھی واضح نہ کر سکے۔

یہ آیت بھی دراصل اہل سنت کی دلیل ہے جس سے انہوں نے نواصب کے مقابلہ میں استدلال کیا سبب استدلال تو ظاہر ہے کہ جناب امیر اور دیگر افراد کو بوقت مباہلہ ساتھ لے جانا کسی وجہ اور سبب ترجیح پر مبنی ہے اور وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ ان حضرات کو عزیز و پیارا جانتے تھے مقصد یہ تھا کہ جب ان کو مباہلہ کے وقت جو بظاہر خطرۂ ہلاکت سے خالی نہ تھا لے آئیں گے تو مخالف کو آپ کی نبوت کی صداقت پر پورا وثوق اور اعتماد پیدا ہوگا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں جس کی آپ خبر دے رہے ہیں ہرگز شک نہ کریں گے کیونکہ کوئی بھی عقلمند جب تک اپنے دعویٰ کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہو خود کو اور اپنے پیاروں کو معرض ہلاکت میں نہیں ڈالا کرتا نہ اس پر قسم کھاتا ہے۔

اکثر اہل سنت و شیعوں نے یہ وجہ پسند کی ہے۔ اور ملا عبد اللہ نے اظہار الحق میں اس کو پسند کر کے ترجیح دی ہے،

اس بنا پر اس آیت سے ان حضرات کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عزیز و محبوب ہونا ثابت ہوگا چونکہ پیغمبر حب و بغض نفسانی سے پاک ہوتا ہے اس لئے لامحالہ ان سے محبت دین، تقویٰ و صلاح پر مبنی ہوگی تو ان حضرات میں یہ صفات ثابت ہوئیں اور چونکہ نواصب کا مذہب اس کے خلاف ہے اس

کے خلاف ہے، اس لئے یہ آیت ان کے مقابلہ میں کار آمد و مفید رہی۔

یا ان حضرات کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ و مقصد یہ تھا، کہ یہ حضرات بھی نجران کے کافروں پر بددعا میں شریک ہو جائیں۔ اور آپ کی بددعا پر آمین کہیں۔ کہ ان کی آمین کے سبب جلد درجہ قبولیت کو پہنچے، اکثر شیعوں نے یہ احتمال اور وجہ بیان کی ہے، ملا عبداللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اس صورت میں بھی ان بزرگوں کے دینی مرتبہ کی بلندی اور ان کا مستجاب الدعوات ہونا ثابت ہوتا ہے، اور نواصب کے مقابلہ میں یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

نواصب نے دونوں وجوہ پر رد و قدح کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ان حضرات کو اپنے ہمراہ لے جانا نہ وجہ اول کی بنا پر تھا نہ وجہ ثانی کی بنا پر بلکہ مخالف کے لئے الزامی پہلو مدنظر تھا، کیونکہ کفار کے نزدیک یہ تسلیم شدہ اور ثابت شدہ امر تھا کہ جب تک قسم کے وقت اولاد و داماد کو حاضر نہ کریں اور ان کی ہلاکی پر قسم نہ کھائیں قسم معتبر نہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بغرض الزام یہی صورت اختیار فرمائی اور ظاہر ہے کہ اولاد و اقارب کیسے بھی ہوں بہر حال لوگوں کے خیال میں غیروں سے زیادہ عزیز و پیارے ہوتے ہیں گو اس شخص کی نظر میں وہ ایسے نہ ہوں"

ہماری طرف سے شیعوں کے استدلال کے سلسلہ میں یہ جواب ہے کہ اس طرح مباہلہ کرنا اور اولاد کی قسم کھانا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مسلم نہ تھا اگر ہوتا تو شریعت میں ایسی قسم آئی ہوتی حالانکہ شریعت میں تو اس پر ممانعت وارد ہوئی، یعنی اولاد کو حاضر کر کے قسم نہ کھائیں نتیجہ یہ نکلا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سب کچھ مخالف کو خاموش اور لاجواب کرنے کے لئے کیا،

اسی طرح دوسری وجہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ نجرانی وفد کی ہلاکی و تباہی کوئی بڑی اہم بات نہ تھی نہ کوئی سنگین امر تھا، اس سے زیادہ اور سخت تر حوادث سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم دوچار ہوئے مصائب و دکھ جھیلے مگر کبھی بھی ان پیاروں سے دعا میں مدد کے خواستگار نہ ہوئے،

اور یہ متفق علیہ امر ہے کہ کفار کے ساتھ مقابلے اور معارضہ میں پیغمبر کی دعا مقبول ہوتی ہے ورنہ تو پھر پیغمبر کی تکذیب لازم آتی ہے اور بعثت کی غرض فوت ہوتی ہے اور پیغمبر کو خود اپنی دعا کے قبول ہونے میں کس طرح شک لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی آمین کی مدد لیتے۔ لہذا یہ وجہ بھی باطل و فاسد و غلط ثابت ہوئی،

اس موقع پر اس بحث کو طول دینا نامناسب سمجھتے ہوئے اسے یہیں ختم کرتے ہیں حاصل بحث یہ ہے کہ ثبوت مدعا کے لئے دراصل یہی آیت دلیل ہے شیعہ از راہ تعصب خواہ مخواہ اہل سنت کے مقابلہ میں یہ دلیل پیش کر بیٹھے۔

شیعوں کے اس آیت سے استدلال میں بہت سی خامیاں اور قابل گرفت باتیں پائی جاتی ہیں، اول یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ انفسنا سے مراد جناب امیر ہیں، بلکہ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس مراد ہیں،

اس قول کو غلط ثابت کرنے کے لئے علماء شیعہ نے یہ احتمال وشبہ بیان کیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہیں بلایا کرتا ان کی یہ بات تو اس گاؤدی کی بات کی طرح ہے کہ کسی گاؤں سے چلا آرہا تھا کہ کسی عالم نے پوچھا کہ میاں یہ تو بتاؤ کہ کیا اس گاؤں میں ہل بھی چلاتے یا ہل بھی گھومتے ہیں، تو وہ کہنے لگا، ارے بھائی کچھ سوچ کے تو بات کرہل کو نہ وہ چلاتے ہیں نہ وہ چلتے ہیں، بیلوں کو چلاتے ہیں اور وہی چلتے ہیں،

پھر عرف قدیم وجدید میں یہ محاورات ہمیشہ استعمال میں آتے رہتے ہیں،

دَعَتْهُ نَفْسُهٗ اِلٰی کَذَا اَدْعُوتُ نَفْسِیْ اس کے نفس نے اس کو اس طرف بلایا میں نے اِلٰی کَذَا۔ اپنے نفس کو اس طرف بلایا۔

یا قرآن مجید کی یہ آیت،

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ۔ رغبت دلائی اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل کی۔،

یہ بھی بولتے ہیں اَمَرْتُ نَفْسِیْ۔ میں نے اپنے نفس کو حکم دیا یا۔ شَاوَرْتُ نَفْسِیْ میں نے اپنے نفس سے مشورہ کیا۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے استعمالات فصحاء کے کلام میں پائے جاتے ہیں پس نَدْعُ اَنْفُسَنَا کے حاصل معنی تحفہ آنفسنا کے ہوئے یعنی حاضر کریں ہم اپنے نفسوں کو،

پھر ایک قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے انفسنا سے جناب امیرؓ مراد ہوں تو کفار کی جانب سے انفسکم کا مصداق کون ہوگا، حالانکہ ندع میں بحیثیت فریق ثانی وہ بھی شریک ہیں، اور یہ معنے ہو نہیں سکتے کہ ہم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اور ان کے بیٹوں کو بلائیں۔ جب کہ آپ تعالوا فرما چکے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ جناب امیر، حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کی طرح ابناءنا میں حکماً نہ حقیقتہً داخل ہیں، اور عرف میں داماد کو بیٹا ہی شمار کیا جاتا ہے،

اور نفس، قریب، شریک نسب دین وملت کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آیا ہے تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَهُمْ مِنْ دِیَارِ ہم نکالتے ہیں وہ اپنے نفسوں کو شریک مذہب لوگوں کو) اپنے

یا۔ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ۔ مت نام دھرو اپنے نفسوں کا (اپنے شریک دین بھائیوں کا)

یا۔ وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا جب یہ بات مومنوں اور مومنات نے سنی تھی تو اپنے نفسوں کے ساتھ گمان نیک کیوں نہیں کیا ہم ملت افراد کے ساتھ)،

لہذا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اتصال نسبی، قرابتی اور مصاہرت حاصل تھا اور اتحاد دینی، ملی، وہم صحبتی اس قدر زیادہ حاصل تھا کہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے حق میں یہ تک فرمایا علی منی وانا من علی۔ تو آپ کو نفس سے تعبیر کیا تو یہ کون اچنبھے کی بات ہے اور اس سے مساوات کب لازم آتی ہے، جیسی آیات بالا میں نہیں آتی،

دوسرے یہ بات بھی ہے کہ اگر تمام صفات میں مساوات مراد لیں تو ضروری ہے کہ جناب امیر تمام پیغمبر

خصوصیات میں بھی آپ کے شریک ہوں۔ مثلا نبوت رسالت خاتمیت تمام مخلوق کی طرف بعثت چار بیویوں سے زائد نکاح کا جواز قیامت کے دن ارفع و اعلیٰ درجہ پر فائز ہونا شفاعت کبریٰ کا حصول مقام محمود کا حصول وحی کا نزول وغیرہ وغیرہ حالانکہ ان اوصاف میں، شرکت بالاجماع باطل ہے، اور اگر بعض اوصاف میں مساوات مراد لیں تو اس سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ افضل و اولیٰ بالتصرف کے ساتھ بعض صفات میں مساوات افضل و اولی بالتصرف نہیں بناتی، ظاہر بات ہے،

اور اس آیت کو امامت کی دلیل ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حیات بھی امام ہوں، اور یہ بات بالاتفاق غلط ہے، اور اگر کسی خاص وقت کی قید لگائیں، کہ اس وقت نہیں اس وقت! تو اگرچہ اس پر بھی کوئی لفظی دلیل آیت میں نہیں مگر پھر بھی مدعا ثابت نہیں ہوگا کیونکہ کسی نہ کسی وقت کی خلافت و امامت تو اہل سنت بھی مانتے اور ثابت کرتے ہیں، ان کا مدعا بلا فصل تو ثابت نہ ہوا۔

ان کی ایک اور دلیل یہ آیت ہے،

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ البتہ آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر ایک قوم کے لئے ایک ہدایت دینے والا ہے،

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک متفق علیہ روایت ان الفاظ میں منقول ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صلے اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ قَالَ اَنَا الْمُنْذِرُ وَعَلِيٌّ الْهَادِيْ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں ڈرانے والا ہوں اور علیؓ ہادی ہیں،

یہ روایت بسلسلہ تفسیر ثعلبی کی روایت ہے اور اس کی سرویات ساری ہی درجہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں، اور یہ آیت بھی انہیں دلائل میں سے ایک ہے جو اہل سنت نے نواصب کی تردید میں بیان کئے ہیں، یہ آیت نہ اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہے اور نہ دوسروں کی امامت سے انکار پر اس لئے کہ کسی کا ہادی ہونا اس کے امام ہونے کا ہرگز متقاضی نہیں۔ اور نہ ہی دوسرے کی ہدایت کی نفی کو مستلزم اور اگر صرف ہدایت امامت پر دلالت کرے تو یہ اصطلاحی امامت ہوگی جو اہل سنت کے ہاں پیشوائے دین کے معنوں میں مستعمل ہے، اس میں کوئی جھگڑا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد۔

وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہماری احکام کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں جب انہوں نے صبر کیا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے اچھی باتوں کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے

اسی قسم کی اور بھی آیات اس سلسلہ کی موجود ہیں،

ان کے دلائل میں کی ایک دلیل یہ آیت ہے وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ انہیں روکے رکھو ان سے پوچھ پاچھ ہوگی۔

اس کے بارے میں یہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ انہوں

نے کہا وَقِفُوهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ عَنْ وِلَايَةِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ،

دراصل یہ تمسک تو پھر روایت سے ہوا۔ آیت سے تو نہیں ہوا اور ان کی روایات کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اہل سنت کے نزدیک سب بے اعتبار ہیں، خصوصاً یہ روایت جو مسند فردوس دیلمی میں بیان کی گئی ہے اور یہ وہ کتاب ہے جو خصوصیت کے ساتھ ضعیف اور بے اصل روایت سے بھری ہوئی ہے اور پھر یہ روایت کہ اس کی سند میں تو خاص طور پر ضعیف اور مجہول الحال راوی ہی بھرے ہوئے ہیں جو ہرگز کسی درجہ میں بھی قابل حجت نہیں اور اصول مسائل میں تو بالکل بھی نہیں،

اور پھر قرآن کا نظم بھی اس روایت کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ اس میں مشرکین کے حق میں خطاب ہے، وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور مشرکین سے پہلا سوال تو شرک اور غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں ہوگا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ولایت سے نہیں ہوگا نظم قرآنی دلالت کرتا ہے کہ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ذکر نہیں کیا ہوگیا کہ مدد نہیں کرتے اکا سوال اس جملہ استفہامیہ کے مضمون سے ہے، جو محض ڈانٹ ڈپٹ، اور غیرت دلانے کی غرض سے ہے، کسی اور مقصد سے نہیں اسی لئے عالمان قرأت کا اس پر اجماع ہے کہ آیت تلاوت کے وقت مسئولون پر وقف نہ کیا جائے،

پھر اگر روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے اور نظم قرآنی میں بے ربطی کا سوال نہ بھی اٹھایا تب بھی ولایت سے مراد محبت ہوگی۔ ریاست کبریٰ تو اس صورت میں مراد نہیں ہوگی جو محل نزاع ہے اور چلو وہ ہی مراد لے لیں تب بھی مفید مقصد نہیں کیونکہ آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے اس عقیدہ کو واجب کرتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہیں، اور بالکل یہی عقیدہ اہل سنت کا ہے،

واحدی نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ عن ولایۃ علی واھل البیت ظاہر ہے سارے کے سارے اہل بیت تو امام نہیں تھے، شیعہ بھی اس کے قائل نہیں،

ایسی صورت میں تو ولایت کو محبت پر محمول کرنا یقینی ہوگیا۔ اس لئے کہ ولایت ایک مشترک لفظ ہے اور خارجی قرائن اور اندازوں سے اس کے ایک معنی متعین ہوگئے،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی محبت اور نفس امامت کا جہاں تک تعلق ہے سب اس پر متفق الخیال و عقیدہ ہیں، اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے، بحث تو دراصل جناب امیر رضؓ کے خلیفہ بلا فصل ہونے میں کھٹی اور یہ بات کہ آپ کے علاوہ کوئی اور صحابی مستحق امامت نہیں اس آیت کا اس موضوع سے کوئی تعلق سرے سے ہی نہیں ہے،

موضوع بالا کے سلسلہ کی ایک یہ آیت بھی یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ — پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں وہی مقرب ہیں،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے،

اَنَّهٗ قَالَ اَلسَّابِقُوْنَ ثَلٰثَةٌ فَالسَّابِقُ اِلٰى مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يُوْشَعُ بْنُ نُوْنٍ وَالسَّابِقُ — انہوں نے کہا سابق تین ہیں، موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے یوشع بن نون اور عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے

اِلیٰ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ صَاحِبُ یٰسٓ وَالسَّابِقُ اِلیٰ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ ۔ — صاحب یسین اور جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کے لحاظ سے جناب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

پہلی بات تو یہ کہ استدلال بھی حدیث سے ہوا آیت قرآنی سے نہیں، یہ حدیث طبرانی اور مردویہ کے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور دیلمی کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لیکن سندوں کا مدار ابوالحسن اشقر پر ہے جو بالاجماع ضعیف ہے عقیلی نے کہا ہے کہ وہ شیعہ ہے جس کی روایت ناقابل قبول ہے اور یہ حدیث منکر ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں بلکہ اس میں بناوٹی اور گھڑی ہوئی ہونے کی علامات پائی جاتی ہیں، اس لئے کہ صاحب یسین حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ آپ کے رسولوں (قاصدوں) پر اول ایمان لانے والوں میں سے ہے جس کا پتہ نص سے چلتا ہے،

اب جو حدیث اخبار و قصص میں مدلول کتاب سے متناقض و خلاف ہو اور اس سے ٹکرائے وہ محدثین کے طے شدہ اصولوں کے اعتبار سے موضوع اور گھڑی ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ سابق کا انحصار صرف تین میں خلاف عقل ہے، کیونکہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی ایک سابق ہوگا اور پھر رد کر، یہ کیا ضروری ہے کہ ہر نبی کا سابق ریاست عظمیٰ کا مالک ہو، اور مقرب امامت کا مستحق قرار پائے اور پھر اگر روایت صحیح بھی قرار پائے تو یہ صریح آیت کے تناقض ثابت ہوتی ہے، کیونکہ انہیں سابقین کے متعلق فرمایا ہے،

ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ — ایک جماعت ہے پہلوں سے اور تھوڑے ہیں پچھلوں سے

ثُلَّۃ جمع کثیر کے معنے میں بولا جاتا ہے جو دو آدمیوں پر نہیں بولا جاتا اسی طرح ایک کو قلیل نہیں کہہ سکتے نتیجہ ظاہر ہے کہ آیت میں سبق (پہل) حقیقی مراد نہیں، بلکہ سبق عرفی یا اضافی مراد ہے، جو جماعت کثیر کو شامل ہے اس کی دلیل ایک دوسری آیت ہے

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ — اور سابقین اولین مہاجرین و انصار سے۔

اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے قاعدہ معروف و مشہورہ ہے!

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شیعوں اور سنیوں دونوں کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اسلام لائیں۔ اور اگر ایمان میں سبقت ہی امامت کے لئے کافی ہے تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ وہ بھی امامت کے قابل ہوں اور یہ بات بالاجماع غلط ہے اگر یہ کہا جائے کہ وہ عورت ہیں، تو ہم کہیں گے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت میں بھی کوئی مانع ہوا ہوگا اور وہ ان کی امامت کے وقت کا ابھی نہ آنا تھا جب یہ مانع نہ رہا تو امام آپ ہو گئے اور وہ مانع خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم ہیں (کہ ان کا زمانہ پہلے تھا) اور جو آپ کی نسبت جمہور اہل سنت کے نزدیک اصلح تھے، یا خلفاء ثلاثہ کے بعد آپ کا باقی رہنا۔ اور ان حضرات کی موت آپ سے پہلے ہونا۔ یہ توجیہ تفضیلیہ کی ہے، اس لئے کہ وہ کہتے ہیں،

لَوْ كَانَ اِمَامًا عِنْدَ وَفَاةِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ — اگر وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت امام

وسلم لَمۡ یَبۡقَ اَحَدٌ مِّنَ الۡخُلَفَآءِ اِذۡ مَا مَتَهٗ وَمَا تُوۡا فِیۡ عَهۡدِهٖ وَقَدۡ سَبَقَ فِیۡ عِلۡمِ اللّٰهِ اَنَّ الۡخُلَفَآءَ اَرۡبَعَةٌ فَلَزِمَ التَّرۡتِیۡبُ عَلَی الۡمَوۡتِ

ہوتے تو خلفاء میں سے کسی کو امامت نہ ملتی اور وہ انہیں کے عہد میں وفات پاتے حالانکہ علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ خلفاء چار ہوں گے اس لئے موت میں ترتیب لازم ہوئی،

حاصل گفتگو یہ ہے کہ آیات قرآنیہ سے شیعوں کے سارے کے سارے تمسکات اور استدلالات ایسے ہی اونگے بونگے ہیں۔ اور کتاب النعین کا مصنف بھی اسی طرح کی بہت سی آیات اپنے مدعا کی دلیل میں بیان کرتا ہے یہ تو ان کے چیدہ اور برگزیدہ اہل علم کا حال ہے باقی کا جو حال ہوگا اس کا ان پر قیاس کیا جاتا ہے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

ان کے دعاوی اور نفقہ برات کا اصول کلی یہ ہے کہ آیات پر ان کے استدلالات اسوقت تک پورے نہیں اترتے اور نہ احتمالات اور شکوک دور ہوتے ہیں جب تک ان کی گھڑی ہوئی، بناوٹی ناقابل تسلیم ناقابل عمل اور مردود روایات کو بطور لاحقہ ان کے ساتھ شامل نہ کریں،

اس لئے ان کے استدلالات میں کوئی علمی لطیفہ یا دلچسپی بھی نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کی چشم بصیرت پر تعصب کا گہرا اور دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، اس لئے ان کی اچھے اور برے میں تمیز کی حس ہی نہ رہ گئی ان کو تو اپنی من گھڑت اور بناوٹی باتیں ہی دنیا جہاں کے علوم اور باتوں سے اچھی معلوم ہوتی ہیں

آیات کا معاملہ تو آپ نے ملاحظہ فرما لیا اب وہ احادیث ملاحظہ فرمائیے جو یہ اپنے مدعا و مقصد کے حاصل کرنے میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں، اور ایسی احادیث کی تعداد کل بارہ [۱۲] ہے۔

(۱) ان میں سے پہلی حدیث غدیر خم ہے کہ ان کی کتابوں میں جس کا ذکر بڑے دھوم دھڑکے اور آن بان سے آتا ہے اور یہ بزعم خود اس کو اپنے مدعا کے لئے نص قطعی خیال کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ بروایت بریدہ بن الحصیب اسلمی حجۃ الوداع سے واپسی پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم نامی ایک مقام پر جو مکہ و مدینہ کے درمیان پڑتا ہے فروکش ہوئے، تو آپ نے شریک سفر ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا اور ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا۔

یَا مَعۡشَرَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ اَلَسۡتُ اَوۡلٰی بِکُمۡ مِنۡ اَنۡفُسِکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی۔ قَالَ مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنۡ وَالَاهُ وَعَادِ مَنۡ عَادَاهُ

اے مسلمانوں کی جماعت کیا میں تمہاری جانوں سے زیادہ تمہارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوں سب نے عرض کیا بلاشک (ایسا ہی ہے) فرمایا میں جسکا مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں، اے اللہ جو علی کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

اس روایت کے نتیجہ کے طور پر بات جو یہ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف ہے اور اسی کو امام کہتے ہیں،

اس طریق استدلال وحجت میں پہلی خرابی اور خامی تو یہ ہے کہ سارے کے سارے اہل زبان (عرب) اس کے

منکر ہیں کہ اولیٰ کے معنے مولیٰ ہوں۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مفعل بمعنی افعل کسی جگہ اور کسی بھی مادہ میں استعمال نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس خاص مادہ میں ابو زید لغوی اسے جائز کہنے والا اکیلا ہے اور دلیل میں ابو عبیدہ کا قول بیان کرتا ہے جس نے ھی مولٰکم کی تفسیر اولیٰ لکم سے کی ہے لیکن عام اہل زبان عربوں نے اس کے مذہب اور تمسک کو غلط بتایا ہے، اور کہا ہے کہ اگر اس کا قول صحیح ہو تو ہمیں فلان اولیٰ منک کی جگہ فلان مولیٰ منک کہنا چاہئے حالانکہ یہ غلط اور بالاجماع نامقبول ہے اسپر یہ کہا گیا ہے کہ ابو عبیدہ کی تفسیر حاصل معنی بیان کرتی ہے۔ مولکم کی تفسیر اولیٰ سے کرنے کا یہ مطلب ہے کہ آگ تمہارا ٹھکانا ہے جائے باز گشت اور وہ جگہ جو تمہارے لائق ہے یہ نہیں کہ مولیٰ بمعنے اولیٰ ہے۔

دوسری بات یہ کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ ہو بھی تو بالتصرف سے اس کا صلہ ٹھیرانا کس لغت سے ثابت ہو سکتا ہے، اولیٰ بالمحبت یا اولیٰ بالتعظیم مراد ہو! اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں کہیں اولیٰ کا لفظ سنیں اس سے اولیٰ بالتصرف مراد لے لیں۔ مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ بے شک ابراہیم علیہ السلام) سے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی اور اس نبی کی پیروی کی اور جو ایمان لائے،

اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے متبعین اولیٰ بالتصرف نہیں ہیں،

تیسری بات یہ کہ روایت کے بعد کے الفاظ اللھم وال الخ صاف پتہ دیتے ہیں، کہ لفظ خواہ مولیٰ ہو خواہ اولیٰ، ولایت سے مراد محبت ہے کیونکہ مولیٰ اگر متصرف فی الامر کے معنے میں ہوتا یا اولیٰ سے اولیٰ بالتصرف مراد ہوتا تو یوں فرمانا قرین قیاس تھا، کہ "اے خدا اس کو دوست رکھ جو اس کے تصرف میں ہو اور اس کو دشمن رکھ جو اس کے تصرف سے باہر ہو"، دوستی اور دشمنی کا ذکر اس بات کی صاف دلیل ہے کہ مقصد دوستی کو واجب ٹھیرانا ہے اور دشمنی سے ڈرانا تصرف و عدم تصرف، مقصد ہی نہیں۔

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے معمولی واجبات ہی نہیں بلکہ سنن نشست و برخاست اکل و شرب وغیرہ کے آداب تک اس خوش اسلوبی سے بیان فرمائے ہیں کہ ان کے مرادی معنے ہر اس شخص کی سمجھ میں بے تکلف آجاتے ہیں جو عربی زبان سے واقفیت رکھتا ہو خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور در حقیقت بلند معیار بلاغت بھی یہی ہے اور منصب ارشاد و ہدایت بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے،

اتنے اہم اور اعلیٰ پایہ کے مسئلہ میں بھی اگر آپ اسی قسم کے کلام پہ اکتفا فرمائیں کہ باعتبار لغت عرب اس کے معنی و مفہوم تک بھی رسائی نہ ہو سکے۔ تو نعوذ باللہ یہ تو آپ صلے اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت کے قصور کا اقرار ہوا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر تبلیغ و ہدایت کے معاملہ میں سستی روا رکھنے کا الزام لگاتا ہو اجس کا کوئی ادنیٰ مسلمان بھی تصور نہیں کر سکتا،

لہذا معلوم ہوا کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہی معنی ہیں جو آپ کے کلام سے بے تکلف سمجھ میں آتے ہیں کہ جیسے پیغمبر کی محبت تم پر فرض ہے ایسے ہی علی رضی اللہ عنہ) سے دشمنی رکھنا بھی حرام ہے یہی اہل سنت کا مذہب ہے،

اور اہل سنت کی سخن فہمی بھی اس کی تائید کرتی ہے، چنانچہ ابونعیم نے جناب حسن مثنیٰ بن امام حسن سبط رسول رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آیا حدیث من کنت مولاہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس سے خلافت مراد لیتے تو لوگوں کے ذہن نشین کرنیکے کے لئے اس کو وضاحت سے بیان فرماتے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ فصیح اور واضح البیان (صاف گو) تھے، اس مراد کے لئے آپ یوں فرماتے،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ هٰذَا وَلِيُّ أَمْرِي وَالْقَائِمُ عَلَيْكُمْ بَعْدِي فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوهُ، — اے لوگو یہ میرے معاملہ کے مختار کار ہیں اور میرے بعد تم پر نگران۔ پس ان کی بات سننا اور ان کی اطاعت کرنا،

پھر جناب مثنیٰ نے کہا خدا کی قسم اگر خدا و رسول، جناب علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لئے منتخب کرتے اور جناب علی، اس حکم کی پاسداری نہ کرتے اور اس پر کاربند نہ ہوتے تو خدا اور رسول کی عدم پیروی کے سبب امت کے سب سے بڑے خطاکار شمار ہوتے،

اس پر ایک شخص بولا کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔ تو آپ نے فرمایا سنو میاں، خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس قول سے مراد خلافت ہوتی تو وضاحت کے ساتھ صاف فرما دیتے جس طرح نماز روزہ کی وضاحت فرمائی اور یوں ارشاد فرماتے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ عَلِيًّا وَالِيُ أُمُورِكُمْ مِنْ بَعْدِي وَالْقَائِمُ فِي النَّاسِ بِأَمْرِي، — لوگو! علی میرے بعد تمہارے امور کے مختار ہوں گے اور لوگوں میں میرے معاملات کے نگران۔

پھر اس صورت میں یہ حدیث ایک زمانہ میں دو ولایتوں کے جمع ہونے کی کھلی دلیل ہے کیونکہ اس میں لفظ بعد کی قید نہیں ہے (یعنی جب اور جس وقت، جس کا مولا ہوں، علی بھی اسی وقت اس کے مولا ہیں) بلکہ سلسلہ کلام جیسا کہ ظاہر ہے ہر دو ولایتوں کی مساوات و برابری بہر حیثیت و بتمام وقت، کو چاہتا ہے حالانکہ یہ بڑی واضح بات ہے کہ جناب امیر کی شرکت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ولایت میں آپ کے عین حیات ممتنع و محال و ناممکن ہے،

لہٰذا یہ اس بات کی دلیل اول ہے، کہ مراد وجوب محبت ہے، اور دو محبتوں کے جمع ہونے میں نہ کوئی اشکال ہے نہ قباحت (مثلاً تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں) بلکہ ایک محبت دوسری محبت کا تقاضا کرتی ہے، البتہ دو تصرفات کے بیک وقت جمع ہو جانے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں،

اور اگر کلام (کو) اس قید کے ساتھ مقید کریں کہ اس سے امامت فی الوقت اور فوری مراد نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ کچھ وقت ٹھہر کر مراد ہے تو پھر یہ "اتفاق مومناں مبارک ہو" کیونکہ اہل سنت خود آپ کے عہد میں (وبعد بیعت خلافت) آپ کی خلافت و امامت کے قائل ہیں،

اب رہی یہ بات کہ اس طرز کلام کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو کیوں مخصوص فرمایا تو اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عہد مرتضوی

میں فتنہ و فساد اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے گی اور کچھ لوگ آپ کی خلافت سے منکر ہو جائیں گے تو اسی لئے آپ کو مخصوص فرمایا۔

اور ایک طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان کے بعض علما اس بات کے ثابت کرنے ہیں کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف ہے، حدیث کے ابتدائی الفاظ الست اولیٰ بالمومنین من انفسھم سے دلیل لاتے ہیں، یہ وہی بات ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، کہ ان کو جہاں اولیٰ کا لفظ نظر آتا ہے تو فوراً ہی وہاں بالتصرف کا دم چھلہ لگاتے دوڑ پڑتے ہیں یہاں کون سا داعیہ ہے کہ اس سے اولیٰ بالتصرف کے ہی معنی لیں بلکہ یہاں بھی معنی محبت مراد لینا ہی جچتا ہے۔ کہ دکیا میں مومنوں کو ان کی اپنی جانوں سے زیادہ پیارا نہیں) اس لئے یہاں کا اولیٰ ولایت بمعنے محبت سے مشتق ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ "کیا میں مومنوں کو ان کی جانوں سے زیادہ محبوب و پیارا نہیں" تاکہ اجزاء کلام اور ایک سلسلہ میں منسلک جملوں میں تناسب اور ربط برقرار رہے، اور حسن کلام دوچند ہو۔ پھر اس خطبہ کا اصل مطلب یہ ہوگا،

"اے گروہ مسلماناں! یہ تو ہے ہی کہ تم مجھ کو اپنی جانوں سے زیادہ دوست رکھتے ہو، تو جو کوئی مجھ کو دوست رکھتا ہے وہ علی کو بھی دوست رکھے اے اللہ جو اس کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ"

عقلمند وہی ہے جو اس کلام کے ربط کو ملحوظ رکھ کر کلام کے تسلسل کو دیکھے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد الست اولی بکم من انفسکم" آیت قرآنی سے ماخوذ ہے۔ اسی لئے اس کو اہل اسلام کی تسلیم کردہ بات کو بنیاد بنا کر اس پر آئندہ کے کلام کو موقوف فرمایا۔ اور قرآن میں یہ لفظ ایسے موقعہ اور جگہ پہ آیا ہے جہاں اولیٰ بالتصرف کے معنے مناسب ہی نہیں لگتے،

النَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ۔	نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی ازواج مسلمانوں کی مائیں ہیں از روئے کتاب اللہ رشتہ دار باہم ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مومنین کے،

لہٰذا اس آیت کا سلسلہ کلام بتا رہا ہے کہ اس میں متبنّٰی کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے انکار ہے یعنی زید بن حارثہ کو زید بن محمد نہیں کہنا چاہیئے اس لئے کہ آپ کی نسبت تمام مسلمانوں سے ایک شفیق باپ کی سی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور آپ کی ازواج مطہرات اہل اسلام کی ماؤں کے بمنزلہ ہیں اور اہل قرابت نسبت کرنے میں غیروں سے زیادہ حقدار ہیں، اور بہتر بھی؛ اگرچہ مشفقت اور تعظیم میں دوسرے ہی زیادہ ہوں،

لہٰذا نسبت کا دارومدار قرابت پہ ہوا جو تبنّی میں موجود نہیں، اس کا مدار شفقت و تعظیم پر نہیں؛ یہ ہے کتاب اللہ اور حکم خدا کا مفہوم و مطلب اب اس میں اولیٰ بالتصرف" کو کسی نوع کا بھی دخل نہیں لہٰذا یہاں وہی معنے مراد ہوں گے جو حدیث میں ہیں،

اور اگر حدیث کی ابتدائی عبارت میں اولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف لیں تو بھی مولیٰ، اولیٰ بالتصرف سے

کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اس صورت میں یہ عبارت مخاطبین کی توجہ اور بیداری کے لئے ہوگی کہ پوری توجہ اور ہمہ تن گوش ہو کر آئندہ آنے والی بات سنیں اور اس فرمودہ کو حکم واجب جان کر اس کی اطاعت پر کمر بستہ ہو جائیں، جس طرح ایک باپ بیٹے کو وعظ و نصیحت کے وقت کہتا ہے کہ کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں بیٹا اس سوال سے چوکنا ہو جاتا ہے، کہ باپ کہنا کیا چاہتا ہے، کہ ایسے یقینی تعلق کو سوال بنا رہا ہے وہ اقرار کرتا ہے تو باپ جو باتیں کہنا چاہتا ہے، کہدیتا ہے، تاکہ جس تعلق کا اس نے ابھی اقرار کیا ہے اس کا پاس خاطر کرتے ہوئے تعمیل حکم کرے اور اطاعت شعاری کا ثبوت دے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو۔

پس اس جگہ الست اولی بالمومنین من انفسکم، الست رسول اللہ الیکم" یا الست نبیکم"، کے مثل ہے آئندہ کے کلام سے ایک لفظ کے ذریعہ نسبت ڈھونڈنا اور چاہنا نہایت بے وقوفی ہے، اس عبارت سے سارے کلام کو جو ربط ہے، وہی کافی ہے،

اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے بعض باریک بین لوگ محبت و دوستی کے معنے مراد نہ ہونے کی دلیل میں کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوستی اس آیت۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ مومن اور مومنات باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، کے ضمن میں ثابت ہے۔ یہ حدیث بھی اگر اس معنی کا فائدہ دے تو کلام بے فائدہ اور لغو ہو جائے گا،

یہ "زیرک لوگ" اتنا بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک شخص کی دوستی کا ثبوت سب کے ضمن میں اور چیز ہے، اور اسی شخص کی دوستی کا وجوب خصوصی پہلو سے کچھ اور چیز اگر کوئی شخص اللہ کے سارے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لاتا ہے مگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر نہیں لاتا تو اس کا ایمان معتبر نہیں یہاں، خاص جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ذات سے دوستی منظور ہے اور آیت میں دوستی وصف ایمانی کے باعث، جو عام ہے مقصود تھی؛ پھر اگر آیت و حدیث کا مضمون مل بھی گیا تو اس میں قباحت کی کیا بات ہے پیغمبر کا کام یہی ہوتا ہے کہ مضامین قرآن کی بار بار تاکید اور اس کی یاد دہانی کرتا رہے خصوصاً جہاں کہیں کہ مکلفین کی طرف سے احکام قرآنی میں غفلت و سستی یا عمل میں کوتاہی روغما ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اور نصیحت کرتے رہئے کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے

اور قرآن مجید میں کوئی مضمون ایسا نہیں جس کی تاکید کئی آیات میں نہ کی گئی ہو۔ پھر پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس کی تاکید مزید کرائی گئی، تاکہ بندوں پر حجت کو لازم اور ان پر نعمت کو پورا فرمائیں جس نے قرآن پڑھا اور اسے سمجھا ہوگا وہ ایسے کلام کو پوچ نہیں کہہ سکتا، ورنہ پھر روزہ نماز زکوٰۃ و تلاوت قرآن کے بارے میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تاکیدات بھی سب یوں ہی ہوں گی،

اور خود شیعوں کے نزدیک جناب امیر کی امامت کی نص کو بار بار دہرانا اور اس پر تاکید کرنا بھی لغو اور بیکار ٹھیریگا۔

اور اہل تاریخ و سیر کے کلام کی روشنی میں اگر اس خطبہ کا سبب و مقصد معلوم کرنا چاہیں تو صاف معلوم ہوگا کہ یہاں پیش نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دوستی اور محبت کا ثبوت ہے اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ

عنہم کی وہ جماعت جو ملک یمن کی مہم میں آپ کے ہمرکاب تھی انہوں نے سفر سے واپسی پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے آپکی چند شکایات کا چرچا کیا جو بے جا تھیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرما کر کہ یہ باتیں لوگوں کی زبانوں پر آگئی ہیں اگر دو چار کو روکوں گا تو خاطر خواہ اثر نہ ہوگا ممکن ہے کوئی نا عاقبت اندیش اسے جانبداری اور پاسداری تعلق پر محمول کرے اور وہ بات ختم نہ سمجھے لہذا آپ نے انفرادی فہمائش کے بجائے خطبہ عام دیا اور اور السّت اولی بالمومنین من انفسہم کے کلمہ سے شروع فرمایا جو نص قرآن سے تھا۔ یعنی جو کچھ کہہ رہا ہوں از راہ خیر خواہی وشفقت ہے، اسے جانبداری یا پاسداری پر محمول نہ کریں اور نہ میرے تعلق خاطر کا باعث سمجھیں۔ چنانچہ محمد بن اسحاق اور دیگر اہل سیر کے اس قصہ کو بتفصیل بیان کیا ہے۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری حدیث وہ ہے جو بخاری مسلم میں جناب براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بیت کی مستورات و بچیوں پر خلیفہ مقرر فرمایا اور خود غزوہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اسوقت جناب امیر رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ۔

اَتُخَلِّفُنِیْ فِی النِّسَاءِ وَالصِّبْیَانِ ۔ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں پر خلیفہ بنا رہے ہیں،

آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ مِنْ بَعْدِیْ کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے ہارون موسیٰ (علیہما السلام) کے لیے تھے ہاں مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں،

اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ منزلۃ" اسم جنس ہے جو متکلم کی طرف منسوب ہے اس لئے تمام منازل کو عام ہوگا۔ تاکہ اس سے استثنٰے صحیح ہو سکے۔ اور جب مرتبۂ نبوت کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تو اب وہ تمام منازل و مراتب جو حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے ثابت تھے وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لئے بھی ثابت ہوں گے۔ اور ان میں سے امامت کا صحیح ہونا اور ان کی اطاعت کا فرض ہونا بھی شامل ہے، اگر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہتے تو جو مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حین حیات حاصل تھا۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد وہ محروم قرار پائیں تو یہ ان کا نبوت سے معزول ہونا کہا جائے گا اور نبی کا نبوت سے معزول ہونا جائز نہیں کیونکہ اس میں توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ لہذا یہ مرتبہ جناب امیر رضؓ کو بھی حاصل ہوا اور یہی امامت ہے"

در اصل یہ حدیث بھی اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ جناب امیر کی فضیلت اور آپ کے عہد میں آپ کی امامت کے اثبات میں پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رضؓ امامت کا استحقاق رکھتے تھے،

اب ہم اس موضوع پر کہ آپ کے علاوہ کوئی امام نہ تھا اور جناب امیر بلا فصل امام تھے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ یہ بات اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتی،

گو نواصب نے اہل سنت کے استدلال پر رد و قدح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ (عورتوں بچوں کی) خلافت

وہ خلافت ہی نہیں تھی جو ہمارے تمہارے درمیان زیر بحث ہے کہ اس خلافت کی سپردگی سے اس خلافت کا ثبوت بہم پہنچ سکے کیونکہ باجماع اہل سیر سے یہ بات ثابت ہے کہ اسی موقعہ پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا صوبہ دار سباع عرفطہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا کوتوال اور جناب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد کا امام نماز بنایا اگر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت عام ہوتی تو پھر ان امور کے کیا معنے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ خلافت محض امور خانگی کی غور و پرداخت اور اہل و عیال کی دیکھ بھال سے عبارت تھی جب کہ اس قسم کی دیکھ بھال ایسے آدمی سے سرانجام پا سکتی ہے جو محرم ہو اور اندرون خانہ کے حالات سے آگاہی رکھتا ہو اسی وجہ سے ایسے کاموں کے لئے لڑکے داماد یا ان جیسوں کو ہی مقرر کیا جاتا ہے، بہر حال ایسا استخلاف خلافت کبریٰ کو نہیں چاہتا،

بفضلہ تعالیٰ اہل سنت نے ان تمام اعتراضات کے شافی اور مسکت جوابات اپنی کتابوں میں دیدیئے ہیں جو اپنی جگہ اور مقام پر موجود ہیں،

شیعوں کے اس حدیث سے طریق استدلال کو جس انداز میں ہم نے ترتیب دے کر بیان کر دیا ہے اس سے درحقیقت ان کی بات سمجھ میں آنے کے قابل ہو گئی ہے ورنہ ان کی اپنی کتابوں میں اگر دیکھا جائے تو یہی استدلال عبارت ایسی واہی تباہی اور پراگندہ باتوں پر ختم ہوتی ہے جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

بہر حال ان کا یہ استدلال بھی کئی خرابیوں کا مجموعہ ہے اول یہ کہ اسم جنس جو علم کی طرف مضاف و منسوب ہو وہ تمام اصولیوں کے نزدیک الفاظ عموم سے نہیں بلکہ اس کی تصریح کی ہے کہ وہ عہد کے لئے ہے مثلاً غلامُ زیدٍ وغیرہ کہ اس میں خاص غلام مراد ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر ان مثالوں میں کوئی کیا کہے گا۔

رَکِبْتُ فَرَسَ زَیْدٍ (میں زید کے گھوڑے پر سوار ہوا۔) لَبِسْتُ ثَوْبَ زَیْدٍ" (میں نے زید کے کپڑے پہنے) اور رَاَیْتُ ابْنَ زَیْدٍ (میں نے زید کے لڑکے کو دیکھا) کہ ظاہر ہے کہ یہاں عموم باطل ہے،

اور کلام زیر بحث میں بھی خصوصیت کا قرینہ موجود ہے اور وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا قول اتخلفنی فی النساء والصبیان" ہے،

یعنی جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے جب وہ کوہ طور پر تشریف لے گئے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوہ تبوک پر تشریف لے جانیکے بعد خلیفہ تھے، اور وہ استخلاف جو غیر موجودگی کی مدت کے ساتھ مقید ہو، وہ مدت کے ختم ہو جانے کے بعد ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کے حق میں بھی ختم ہو گیا۔ اور استخلاف کے اس صورت میں ختم ہونے کو معزول ہونا نہیں کہتے جو کسی کی اہانت کا سوال پیدا ہو،

اب رہا استثناء تو اس میں عموم اس وقت پایا جاتا ہے، جب کہ استثناء متصل ہو اور یہاں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے لفظی اور معنوی قرائن اس کی تائید کرتے ہیں،

لفظی تو یہ کہ لا نبی بعدی جملہ خبریہ ہے جس کو منازل حضرت ہارون سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے اور اگر جملہ کی تاویل مفرد سے کریں تو الا کے داخل ہونے سے الا کا حکم عدم النبوت ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ عدم النبوت آپ کے منازل میں سے ہے نہیں جو استثناء صحیح ہو۔

اور معنوی یہ کہ منجملہ منازل حضرت ہارون عؑ میں سے ایک ان کا عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا ہونا ہے دوسرے یہ کہ بلحاظ زبان ان سے گویائی میں فصیح تر تھے تیسرے یہ کہ نبوت میں ان کے شریک تھے چوتھے یہ کہ وہ باعتبار نسب ان کے حقیقی بھائی تھے اور یہ تمام منازل، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہیں تھے لہذا اگر استثناء کو متصل ٹھیرائیں اور منزلۃ کو عموم پر محمول کریں تو معصوم کے کلام پر حرف آتا ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ہم اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ منازل ہارون علیہ السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی خلافت بھی تھی، اس لئے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ بھی رہتے تو تبلیغ و ہدایت میں وہ مستقل رسول ہوتے اور یہ مرتبہ ان کے ہاتھ سے کبھی نہ جاتا اور یہ مرتبہ خلافت سے منافات رکھتا ہے کیونکہ خلافت تو اس مرتبہ کی نیابت ہے اور اصل، اصل ہے۔ نیابت، نیابت، باہم نیابت کو اصل سے کیا علاقہ!۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ اس طرز تقریر و استدلال سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت پایۂ ثبوت کو ہرگز نہیں پہنچتی،

تیسرے یہ جو بات کہی گئی ہے، کہ یہ مرتبہ اگر حضرت ہارون علیہ السلام سے زائل ہو جاتا تو یہ ان کی معزولی ہوتی اور نبی کا معزول ہونا جائز نہیں، اس کے متعلق ہمارا کہنا یہ ہے کہ کام کے ختم ہونے کو عزل کہنا عرف کے خلاف تو ہے ہی لغت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ شاہ و حکام اپنے دار السلطنت سے باہر جاتے وقت نائبوں اور اپنے گماشتوں کو اپنا جانشین مقرر کر جاتے ہیں، اور ان کی مراجعت و واپسی کے بعد ان کی جانشینی ختم ہو جاتی ہے تو اسے کوئی بھی معزولی نہ کہتا ہے نہ سمجھتا ہے اور ان کے حق میں نہ اسے اہانت کا سبب مانا جاتا ہے، اور دل ہی دل سے کوئی عزل ہی سمجھتا رہے تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام نبوت کے مستقل درجہ سے سرفراز ہوئے جو خلافت سے ہزار درجہ اعلیٰ و ارفع ہے تو پھر ان کے حق میں توہین و تحقیر کیوں ہونے لگی بلکہ وہ تو اس طرح کا ہوتا کہ ایک وزیر کے مرنے کے بعد نائب کو عہدہ نیابت سے ہٹا کر مستقل وزیر بنا دیا جائے، یہاں تو اعزاز بڑھتا ہے تحقیر و توہین کا کیا کام!

بات کا ایک پہلو اور ہے کہ جب حضرت امیرؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی اور یہ معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں غیر موجودگی کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے خلیفہ ہوتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا خلیفہ ہوئے تو اس سے لازم آیا جناب امیرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عین حیات آپ کی غیر موجودگی میں تو آپ کے خلیفہ ہوں مگر وفات کے بعد نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تاکہ تشبیہ پوری پوری صحیح ہو سکے۔ کیونکہ کلام رسول میں موجود تشبیہ کو ناقص قرار دینا تو رسول کی شان میں انتہائی بے ادبی ہے،

اور اگر ان سب باتوں سے صرف نظر بھی کر لی جائے تو اس حدیث سے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کی نفی کیسے ثابت ہوئی اور وہ کبھی ثابت نہیں تو اصل مدعا کہاں حاصل ہوا۔ بہت کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کی جا سکتی ہے وہ جناب امیرؓ کی خلافت کا استحقاق ہے اور بھی کسی وقت اور اسے تو اہل سنت پہلے ہی سے مانتے ہیں،

(۳) تیسری حدیث وہ ہے جو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ۔

اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْ عَلِيٍّ وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ بَعْدِيْ۔

جناب رسالتماب صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے اور وہ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہیں،

یہ حدیث باطل اور ناقابل استناد ہے کیونکہ اس کی سند میں اجلح نامی ایک شخص ہے جو شیعہ تھے اور روایات میں گڑبڑ کا اتہام اسپر لگا ہوا ہے، جمہور علماء نے اسے ضعیف کہا ہے لہذا اس کی روایت حجت میں پیش نہیں کی جا سکتی۔

دوسری بات یہ کہ اس کے الفاظ مشترک میں سے ہیں، تو کیا قرینہ ہے اور کیا ضروری ہے اس سے اولی بالتصرف ہی مراد ہیں دوسرے معنے بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور پھر ایک بات یہ کہ وہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اہل سنت کا مذہب پہلے معلوم ہو ہی چکا کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر کسی وقت ضرور واجب الاطاعت امیر تھے،

(۴) چوتھی حدیث استدلال وہ ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے،

اَنَّهٗ كَانَ عِنْدَ النَّبِيِّ صلے اللہ علیہ وسلم طَائِرٌ قَدْ طُبِخَ لَهٗ اَوْ اُهْدِيَ اِلَيْهِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ ائْتِنِيْ بِاَحَبِّ النَّاسِ اِلَيْكَ يَاْكُلُ مَعِيَ هٰذَا الطَّيْرَ فَجَاءَهٗ عَلِيٌّ۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے خوان نعمت پر ایک پرندہ تھا جو آپ کے لئے لگایا گیا تھا، یا ریکا پکایا بطور ہدیہ پیش ہوا تھا، اس وقت آپ نے فرمایا اے اللہ اپنے اس بندہ کو جو سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو میرے پاس بھیج تاکہ وہ اس پرندہ کے تناول میں میرے ساتھ ہو اس وقت حضرت علی تشریف لے آئے،

پہلی بات تو یہ کہ اس بھنے ہوئے پرندہ کے بارے میں روایات مختلف اللفظ ہیں بعض میں سمانی ہے جو ایک پرندہ کا نام ہے، بعض میں حباری یعنی چوزہ ہے، اور بعض میں حجل کا لفظ ہے یعنی چکور،

اس روایت کو اکثر محدثین نے موضوع قرار دیا ہے، اس کے موضوع ہونے کی تصریح کرنے والوں میں حافظ شمس الدین جزری کا نام بھی ہے اور امام حدیث شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد دمشقی ذہبی (معروف بہ علامہ ذہبی) نے اپنی کتاب تلخیص میں لکھا ہے،

لَقَدْ كُنْتُ زَمَانًا طَوِيْلًا اَظُنُّ اَنَّ حَدِيْثَ الطَّيْرِ لَمْ يُحْسِنِ الْحَاكِمُ اَنْ يُّوْدِعَهٗ فِيْ مُسْتَدْرَكِهٖ فَلَمَّا عَلَّقْتُ هٰذَا الْكِتَابَ رَاَيْتُ الْقَوْلَ مِنَ الْمَوْضُوْعَاتِ الَّتِيْ فِيْهِ،

بہت دنوں تک میرا بھی خیال رہا کہ حاکم نے اپنی کتاب میں حدیث طیر کو ذکر کر کے اچھا نہیں کیا جب میں نے اس کتاب پر حاشیہ لکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اسے موضوعات کے زمرہ میں رکھا ہے،

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ روایات ان حضرات کے لئے مفید مطلب بھی نہیں کہ قرینہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم طعامی کے لئے جناب امیر اللہ تعالی کے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے تھے اور بے شک جناب امیر ایسے ہی تھے کیونکہ بیٹے کا یا جو بمنزلہ بیٹے کے ہو اس کا شریک طعام ہونا

کھانے کے لطف کو دو بالا کر دیتا ہے اور اگر مطلقاً احب بھی مراد لیں تو بھی مدعا کو ثابت کرنے میں قاصر رہینگے۔ کیونکہ مخلوق میں خدا کا محبوب ترین ہونے کے لئے یہ لازم و ضروری نہیں کہ وہ ریاست عامہ کا مالک بھی ہو۔ بہت سے اولیاء کبار اور انبیاء عالی مقدار مخلوق میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین تھے، مگر ریاست عامہ کے مالک نہ ہو سکے،

مثلاً حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام بلکہ حضرت شمویل علیہ السلام بھی، کہ جن کے زمانہ میں جناب طالوت ریاست کے مالک تھے جیسے قرآنی آیت شاہد ہے،

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ منورہ میں رہتے ہوں اور یہ دعا خاص حاضرین کے بارے میں ہو نہ کہ غائبین کے بارے میں۔ اس کی دلیل آپ کا اَتنی فرمانا ہے اس لئے کہ غائب شخص کو دور دراز کی مسافت سے ایک لمحہ میں ہمطعامی کے لئے خرق عادت کے طریقہ سے لے آنا بیان متصور نہیں، اور انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ سے خرق و معجزہ کا سوال صرف کفار کے مطالبہ کے وقت ہی کرتے ہیں، ورنہ پھر جنگ و جہاد یا کسی اور کام کے لئے اسباب ظاہری کی تیاری کی کیا ضرورت تھی تمام امور خرق عادت سے انجام فرمالیا کرتے،

اور یہ ممکن ہے اس سے مراد ایسی ہی ہو جیسے عام بول چال میں لوگوں کی ہوتی ہے جیسے یہ کہنا مَنْ اَحَبُّ النَّاسِ اِلَیْکَ۔ تیرے نزدیک سب لوگوں میں محبوب ترین کون ہے: اور یہ استعمال بہت رائج اور مشہور ہے اسی طرح اہل زبان کا یہ قول فلان اعقل الناس وافضلھم (لوگوں میں فلاں بڑا عقلمند اور ان سے افضل ہے)۔

اور بالغرض یہ مدعا کے لئے دلیل ہو بھی تو یہ ان صریح و صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو کھلے اور صاف الفاظ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً۔

اِقْتَدُوْا بِالَّذَیْنِ مِنْ بَعْدِیْ اَبُوْبَکْرٍ وَّ عُمَرَ۔ میرے بعد دین کے معاملہ میں ابوبکر اور عمر کی پیروی کرنا

(۵) پانچویں حدیث وہ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں،

یہ حدیث بھی خرابیوں سے خالی نہیں یحییٰ بن معین نے کہا، اس کی کوئی اصل نہیں امام بخاری نے کہا یہ "منکر" ہے۔ ترمذی نے کہا کہ "منکر غریب ہے" ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید نے کہا کہ علماء حدیث نے اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا شیخ محی الدین نووی، حافظ شمس الدین ذہبی، اور شیخ شمس الدین جزری نے اس کو موضوع بتایا ہے،

لہٰذا ایسی روایت سے جو موضوع ہو اور جسے اہل سنت نے احتجاج و تمسک کے دائرہ سے باہر کر دیا ہو، استدلال و تمسک کرنا اور وہ بھی اہل سنت ہی کو الزام دینے کے لئے علماء شیعہ کی دانشمندی کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں،

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی شخص نے اپنے ملازم کی بد دیانتی، خیانت اور غلطیوں سے آگاہ ہو کر ملازمت اور گھر سے نکال دیا ہو اور منادی عام کے ذریعہ اعلان بھی کرا دیا ہو کہ اس کو فلاں فلاں قصوروں اور غلطیوں کی بنا پر نکال دیا گیا ہے اب اس سے میری ذمہ داری پر کوئی لین دین نہ کرے میں اس کی کسی بات و معاملہ کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ پھر بھی کوئی احمق جس کی اس نوکر سے شناسائی ہو وہ اس سے لین دین کرے اور تقاضے کے لئے مالک کو پکڑے، تو کون اس احمق کو عقلمند کہے گا،

اور پھر یہ روایت ان کے مفید مطلب بھی نہیں، چلو مان لیا کہ جناب امیرؓ شہر علم کا دروازہ ہیں مگر یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ریاست عامہ کے مالک ہوں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلا فصل بھی، زیادہ سے زیادہ آپ کے لئے جو بات ثابت ہوگی وہ یہ کہ شرائط امامت میں سے ایک شرط بوجہ اکمل آپ میں پائی گئی اور پھر ایک شرط پائی جانے سے تو مشروط کا وجود لازم نہیں آتا۔ تا۔ جب اس کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ وہی شرط یا اس سے بھی زیادہ دوسروں میں بروایت اہل سنت ثابت ہو۔ مثلاً حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا صَبَّ اللّٰهُ شَيْئًا فِي صَدْرِي اِلَّا وَقَدْ صَبَبْتُهٗ فِي صَدْرِ اَبِي بَكْرٍ	اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ میں کوئی چیز نہیں ڈالی جو میں نے ابوبکر کے سینے میں نہ ڈالدی ہو،
یا مثلاً لو کان بعدی نبی لکان عمر	میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

اگر اہل سنت کی روایات کا اعتبار کرنا ہے تو ہر جگہ کریں ورنہ ان کے منہ ہی نہ آنا چاہیئے کیونکہ یہ ایک آدھ روایت سے مات کھانے والے نہیں،

(۶) اس حدیث کو امامیہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے،

اَنَّهٗ قَالَ مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى اٰدَمَ فِي عِلْمِهٖ وَاِلٰى نُوْحٍ فِي تَقْوَاهُ وَاِلٰى اِبْرَاهِيْمَ فِي حِلْمِهٖ وَاِلٰى مُوْسٰى فِي بَطْشِهٖ وَاِلٰى عِيْسٰى فِي عِبَادَتِهٖ فَلْيَنْظُرْ اِلٰى عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ۔	آپ نے فرمایا جو آدم کے علم کو، نوح کے تقوی کو ابراہیم کے علم کو موسیٰ کی سختی کو عیسیٰ کی عبادت کو دیکھنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ علی بن ابی طالب کو دیکھ لے،

اس حدیث سے ان کا طریق استدلال یوں ہے کہ اس روایت سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جناب امیر کی ہم صفتی ظاہر ہوئی۔ اور انبیاء دوسروں پر افضل ہیں اور افضل کا مساوی بھی خود افضل ہوتا ہے لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے افضل ہوئے، اور امامت کا حقدار افضل ہی ہوتا ہے دوسرا کوئی نہیں،۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عقل کی نعمت دی ہے تو وہ اس استدلال و تمسک کی زبردست خرابیاں کھلی آنکھوں دیکھ سکتا ہے اول تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی احادیث میں سے نہیں۔ ابن مطہر نے اپنی کتابوں میں کبھی تو اس کو بیہقی کی طرف منسوب کیا ہے اور کبھی بغوی کی طرف حالانکہ ان دونوں کی تصانیف میں اس روایت کا نشان تک نہیں، افترا و بہتان سے اہل سنت کو الزام دینے کا طریقہ ان کا قدیم حربہ ہے،

جب کہ اس طریقہ سے نہ ان پر الزام آسکتا ہے، نہ وہ اس دعویٰ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اہل سنت کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ ایسی حدیث حجت و تمسک کے لائق نہیں جو ائمہ حدیث نے اپنی کتاب میں درج تو کیا ہو مگر صاحب کتاب نے کتاب میں مندرج احادیث کی صحت کا التزام و اہتمام نہ کیا ہو جیسا کہ امام بخاری، مسلم اور دیگر اصحاب صحاح نے التزام کیا ہے۔ اور اس حدیث کی نہ صاحب کتاب نے بالخصوص تصریح کی ہے اور نہ کسی ثقہ اور محدث نے:

اسی محدثین کی وہ جماعت جو پچھلے طبقہ میں گذری ہے مثلاً دیلمی، خطیب، ابن عساکر وغیرہ جب انہوں نے دیکھا کہ محدثین سلف احادیث صحاح و حسان کو خوب جانچ پرکھ کر مرتب کر گئے اور اس کوشش میں کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا تو انہوں نے ضعیف و موضوع روایات پر توجہ دی یا ان روایات پر جن کی اسانید یا متون میں الٹ پھیر کیا گیا تھا، اور بیاض کی صورت میں ان کو جمع کیا تاکہ ان پر نظر ثانی کریں اور موضوعات کو حسان سے الگ کرلیں۔ لیکن فرصت کی کمی اور عمر کی کوتاہی کے سبب اس اہم کام کو سر انجام نہ دے سکے اور یہ کام ان کے بعد والوں نے انجام دیا اور ان میں فرق کرنے اور تمیز دینے کی ذمہ داری کو پورا کیا چنانچہ علامہ ابن جوزی نے موضوعات کو علیحدہ کیا اور اس کے مقابلہ میں حسان لغیرہا کو مقاصد حسنہ میں جدا لکھا۔

ادھر علامہ سیوطی نے تفسیر در منثور کی شکل میں کام کیا۔

اور اس قسم کے مجموعوں کے مرتبین نے اپنی کتابوں کے مقدمات میں یہ بات صاف لکھدی کہ یہ مجموعہ کس غرض کے لئے مرتب کئے گئے اور ان میں کس کس طرح کی روایات ہیں۔ لہذا ان کتابوں کا حال و حیثیت خود مرتبین سے معلوم ہوجانے کے بعد ایسی روایات سے استدلال و تمسک کہاں تک جائز ہے اسی لئے صاحب جامع الاصول نے یہ بات نقل کی ہے کہ خطیب بغدادی نے شریف مرتضیٰ سے جو رضی کا بھائی تھا شیعی روایات کو لیا ہے اور اس غرض سے ان کو یکجا و مرتب کیا کہ ان کی جانچ کرکے اور بحث کرکے یہ پتہ چلائے کہ ان کی کوئی اصل بھی ہے یا نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ حدیث زیر بحث تو ایسی بھی نہیں جو اہل سنت کی کسی کتاب میں مروی ہو گو بطریق ضعیف ہی ہو!

دوسرے یہ کلام محض تشبیہ کے طور پر ہے کہ جناب امیرؓ کی بعض مقامات کو انبیائے مذکورین کے بعض صفات سے تشبیہ دینا مقصود ہے، اور تشبیہ جس طرح مشہور ہے حروف تشبیہ کاف کَاَنَّ مثل نحو کے ساتھ ہوتی ہے،

اس طرح بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ علم بیان میں طے شدہ ہے کہ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّنْظُرَ اِلَی الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی وَجْہِ فُلَانٍ کا کلام بھی تشبیہ میں داخل ہے یعنی لیلۃ البدر میں چاند دیکھنا چاہے اسے چاہیے کہ فلاں کا چہرہ دیکھ لے،

اور یہ شعر بھی تشبیہ ہے،

لَا تَعْجَبُوْا مِنْ بَلَا غَلَا لَتِہٖ   قَدْ زَرَّ اَزْرَارَہٗ عَلَی الْقَمَرِ

(اس کے جامہ کتان کے پھٹ جانے پر تعجب نہ کرو یہ تو چاند پر تکمہ لگا ہوا ہے)

اور متنبی کے یہ دو شعر بھی تشبیہ کے ہیں۔

نَشَرَتْ ثَلٰثَ ذَوَائِبَ مِنْ خَلْفِهَا	فِیْ لَیْلَةٍ فَاَرَتْ لَیَالِیَ اَرْبَعًا
وَاسْتَقْبَلَتْ قَمَرَ السَّمَاءِ بِوَجْهِهَا	فَاَرَتْنِیَ الْقَمَرَیْنِ فِیْ وَقْتٍ مَعًا

(۱) بوقت شب معشوقہ نے پیچھے کی طرف اپنے تین گیسو بکھیر دئے تو لوگوں کو تین راتیں یکجا دکھائیں،

(۲) اور اپنے چہرے سے آسمانی چاند کے سامنے آئی تو مجھ کو دو چاند ایک ساتھ دکھائے!

اور اگر اس سے بھی قطع نظر کریں تو یہ استعارہ ہوگا جس کی بنا تشبیہ پر ہے اور تشبیہ یا استعارہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ مساوی جاننا پرلے درجہ کی بے وقوفی ہے،

چنانچہ اشعار میں یہ بات عام ہے کہ بادشاہوں کے صحن کی خاک کو مشک کے ساتھ اور وہاں کے سنگریزوں کو مروارید و یاقوت سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان دونوں میں مساوات کو کوئی بھی نہیں مانتا۔

یہ شعر دیکھئے۔

اَرَاهِیْ بَارِقًا بِالْاَبْرَقِ الْفَرْدِ یُوْمِضُ	فَیَکْشِفُ جِلْبَابَ الدُّجٰی ثُمَّ یَغْمِضُ
کَاَنَّ سُلَیْمٰی مِنْ اَعَالِیْهِ اَشْرَفَتْ	فَمَدَّ لَنَا کَفًّا خَضِیْبًا وَتَقْبِضُ

(۱) میں دیکھتا ہوں کہ بجلی تنہا مٹی کے تودہ پہ چمکتی ہے تو اندھیری کا پردہ چاک کر دیتی ہے اور پھر چھپا دیتی ہے،

(۲) گویا کہ سلیمی اس ٹیلہ کی طرف متوجہ ہے پس مہندی لگی ہتھیلیاں کو کھول دیتی ہے اور پھر بند کر لیتی ہے

اب اس شعر کے مضمون سے یہ لازم نہیں آتا کہ سلیمی کا مہندی لگا ہاتھ چمک اور درخشندگی میں بجلی کے برابر ہو۔

اہل سنت کی احادیث صحیحہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی ہے،

لیکن چونکہ فرقہ اہل سنت عقل خداداد سے بہرہ ور ہے اس لئے وہ اس تشبیہ کو انبیاء مذکورین کے ساتھ ان اصحاب گرامی کے برابر ہو جانے پر محمول نہیں کرتے مشبہ کو اپنے مقام پہ اور مشبہ بہ کو اپنے مرتبہ پہ رکھتے ہیں،

بلکہ اس قسم کے کلمات میں تشبیہ سے اس طرف اشارہ خاص ہے کہ پیغمبر کے مختص اوصاف میں سے اس شخص میں جو وصف ہے وہ اس درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہے،

بدر کے قیدیوں کے متعلق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جب مشورہ طلب فرمایا تو اس کا قصہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہے۔

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا — انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تقولون في هؤلاء، إن مثل هؤلاء كمثل إخوة لهم كانوا من قبلهم قال نوح رب لا تذر على الأرض من الكافرين ديارا وقال موسى ربنا اطمس على أموالهم واشدد على قلوبهم الآية وقال إبراهيم فمن تبعني فإنه مني ومن عصاني فإنك غفور رحيم وقال عيسى إن تعذبهم فإنهم عبادك وإن تغفر لهم فإنك أنت العزيز الحكيم،

تم ان کے بارے میں کیا کہتے ہو. بے شک ان کی مثال ان کے ان بھائیوں کی سی ہے جو ان سے پہلے تھے (یعنی جس طرح بعض انبیاء صفات جمال و لطف مظہر ہیں اور بعض صفات جلال و قہر کے۔ اسی طرح ابوبکرؓ صفات جمال کا مظہر ہیں اور عمر صفات جلال کا مظہر) نوح علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پروردگار، زمین پر بسنے والے کسی کافر کو بھی نہ چھوڑ! اور موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پروردگار ان کے مال ناپید کر اور ان کے دلوں پر سختی ڈال، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا پس جس نے میری نافرمانی کی تو پس تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تو ان کو عذاب دے گا تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دیگا تو ان کو پس تو غالب اور حکمت والا ہے،

یہ روایت حاکم نے بیان کی اور اس کی تصحیح کی ہے،

اور حضرت ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

أن النبي صلى الله عليه وسلم قال له يا أبا موسى لقد أعطيت مزمارا من مزامير آل داود

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اے ابو موسیٰ تم کو حضرت داود علیہ السلام کی خوش آوازیوں میں سے خوش آوازی مرحمت ہوئی ہے،

نیز فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے۔

من سره أن ينظر إلى تواضع عيسى ابن مريم فلينظر إلى أبي ذر رضہ۔

جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی تواضع کا نمونہ دیکھے تو اسے چاہیے کہ ابی ذر کو دیکھے

اسے استیعاب میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے،

ترمذی نے اسی کو مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے یعنی،

قال ما أظلت الخضراء ولا أقلت الغبراء أصدق لهجة من أبي ذر شبيه عيسى ابن مريم يعني في الزهد

فرمایا نیلگوں آسمان نہیں سایہ فگن ہوا کسی پر اور نہ اٹھایا کسی کو زمین نے اپنی پشت پر جو زیادہ راست گو ہو ابی ذر (رضی اللہ عنہ) سے جو زہد میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے مشابہ ہیں،

تیسرے یہ کہ افضل کی کسی ایک صفت میں مساوات و برابری افضلیت کا سبب نہیں کیونکہ اس افضل میں اور جو صفات ہیں ان کی وجہ سے وہ افضل ہی رہا،

پھر یہ بات جیسے ہم بار بار دہرا چکے ہیں کہ افضلیت کا تقاضا ریاست کبریٰ کو کب ہے،

چوتھے یہ کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت تینوں خلفاء پر اس وقت تو ثابت

ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ان باتوں جیسی صفات میں مساوی نہ ہوں اور اس سے انکار بہت ہی مشکل ہے۔ بلکہ اگر اہل سنت کی کتابوں کی واقعی چھان بین کی جائے تو جناب ابوبکر و جناب عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام سے مشابہت کی اتنی حدیثیں ملیں گی کہ ان کا کوئی ہم عصر اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

اسی لئے محققین صوفیہ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کمالات نبوت کے حامل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت کے حامل۔ چنانچہ انبیاء کے کام یعنی کفار سے جہاد، احکام شریعت کو رواج دینا، ملت کی اصلاح، بحسن و خوبی شیخین رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سرانجام پائے اور اولیا کے کام مثلاً تعلیم طریقت ارشاد حال و مقامات سالکین، نفس کے امور سے آگاہی اور دنیا میں زہد کی ترغیب زیادہ تر حضرت علیؓ سے مروی و منقول ہے۔

اور یہ بات عقل سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ملکات کا سراغ ان افعال کے صدور سے لگ سکتا ہے جو ان کے ساتھ مخصوص ہے،

مثلاً اگر ایک شخص میدان کارزار میں ثابت قدمی دکھاتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں تیغ زنی اور نیزہ بازی میں بازی لیجاتا ہے، تو یہ اس کی شجاعت نفسی کی واضح دلیل ہے۔ بلکہ محبت و عداوت، خوف و امید اور دوسرے باطنی امور بھی انہیں معاملات و افعال کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں،

اسی قیاس پر کسی شخص کے کمالات باطنی کے پتہ لگانے میں کہ آیا وہ کمالات نبوت کا حامل ہے یا کمالات اولیاء کا۔ اس کے خارجی افعال سے جو انہیں دو عمدہ اوصاف سے تعلق رکھتے ہیں، امتیاز حاصل ہوتا ہے اور شیعوں کی خود اپنی کتابوں سے منقول اس حدیث سے کہ اِنَّکَ یَا عَلِیُّ تُقَاتِلُ لِلنَّاسِ عَلٰی تَاوِیْلِ الْقُرْاٰنِ کَمَا قَاتَلْتُھُمْ عَلٰی تَنْزِیْلِہٖ۔ میں واضح اشارہ ہے اسی تفرقہ و امتیاز کی طرف ہے کیونکہ شیخین رضی اللہ عنہما کی جنگ و جہاد تنزیل قرآن پر تھی گویا ان کا عہد، عہد نبوت کا ہی بقایا حصہ ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہما کا دور، دور ولایت کا آغاز ہے اسی لئے شیوخ طریقت اور ارباب معرفت و حقیقت آنجناب کو باب ولایت محمدیہ کا فاتح اور ولایت مطلقہ انبیاء کا خاتم لکھتے ہیں، یہی سبب ہے کہ اکثر اولیاء اللہ کے فرقوں کے سلسلے آنجناب ہی پر ختم ہوتے ہیں، اور وہ سب ندیوں کی طرح آپ کی ہی ذات بحر صفات سے پھوٹتے ہیں،

بالکل اسی طرح جس طرح فقہاء شریعت و مجتہدین ملت کی شاگردگی کے سلسلے حضرات شیخینؓ یا ان کے متبعین تک پہنچتے ہیں مثلاً عبداللہ بن مسعود و معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور ان ہی کے قطرات علمیہ سے سب کے سب سیراب ہوتے ہیں،

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں جس معنی کی امامت باقی رہی اور بس۔ کہ۔ لیے وہ ایک دوسرے کو وصی بناتے رہے وہ ارشاد و ولایت کے قطب اور سرچشمہ ہونے کے معنی میں تھی گویا آپ ہی کی طرح آپ کی ذریت بھی ارشاد و ولایت کا چشمہ فیض بنی رہی اور یہی وجہ ہے کہ اس امر کا تمام مخلوق پہ لازم ہونا ان ائمہ کرام سے مروی نہیں بلکہ وہ اپنے چیدہ اور منتخب دوستوں اور برگزیدہ مصاحبوں کو اس فیض خاص سے مشرف

فرماتے اور ان کی استعداد کے موافق اس دولت سے نوازتے۔ اور ان میں کے نا سمجھ ان تمام اشارات کو ریاست عامہ اور امور ملک و مال میں استحقاق و تصرف پر ڈھالتے رہے اور یوں گمراہی کے بھنور میں ڈبکیاں کھاتے رہے،

اور یہی راز ہے کہ جناب امیر اور آپ کی ذریت کرام رضی اللہ عنہم کو پوری امت پیروں، مرشدوں کی طرح مانتی اور عقیدت رکھتی ہے۔ اور دنیا کے کاموں کو ان سے وابستہ سمجھتی ہے اور فاتحہ درود نذر و منت ان کے نام سے اسی طرح رائج ہیں جس طرح پیروں اور مرشدوں اور دیگر اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتا ہے مگر ان معاملات میں شیخین رضی اللہ عنہما کا نام کوئی نہیں لیتا، اور نہ نذر و منت، مجالس و اعراس میں ان کو شریک کرتے ہیں نہ اس قسم کے دنیاوی کاموں سے انہیں وابستہ کرتے ہیں، گو ان سے محبت و عقیدت رکھتے اور ان کے فضل و کمال کے معتقد ہیں،

(۷) ساتویں حدیث وہ ہے جس کی روایت جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں کہ مَنْ نَاصَبَ عَلِيًّا لِخِلَافَةٍ فَهُوَ كَافِرٌ۔ جس نے خلافت کے لئے حضرت علیؓ سے جھگڑا کیا وہ کافر ہے، اہل سنت کے ہاں اس روایت کا کوئی اتہ پتہ، نام و نشان مطلق نہیں!

ابن مطہر حلی نے اس روایت کی نسبت اخطب خوارزم کی طرف کی ہے اول تو خود ابن مطہر نقل روایات میں بدنامی کی حد تک خائن ہے، اور پھر اخطب کٹر زیدیہ ہے،

پھر اس کی کتاب جو مناقب امیر المومنین میں ہے اس روایت کے وجود سے خالی ہے، باوجود تلاش اس کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا۔ اور اگر ہو بھی تو وہ اس لئے غیر معتبر ہوگی کہ یہ ان احادیث صحیحہ کے مخالف ہے جو خود امامیہ کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ ہی کا یہ قول نہج البلاغہ میں موجود ہے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے،

اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِي الْاِسْلَامِ عَلٰى مَا دَخَلَ فِيْهِ مِنَ الزَّيْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ۔

اور اگر اس حدیث کو معتبر بھی مان لیں تو اس حدیث کا مضمون اس وقت متحقق ہو سکتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے کسی وقت مطالبہ خلافت کیا بھی ہو، اور اس وقت کسی دوسرے نے ان سے اسے چھیننا چاہا ہو حالانکہ ایسا واقعہ کسی زمانہ میں بھی پیش نہیں آیا،

خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے زمانہ میں تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا مطالبہ ہی نہیں کیا جیسا کہ امامیہ کی اپنی کتابوں میں موجود ہے۔ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم آپ کو وصیت فرما گئے تھے کہ اگر کوئی مددگار نہ ہو تو اس معاملہ میں سکوت اختیار کریں چنانچہ اسی وصیت کی پاسداری میں آپ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی خلافت کے زمانہ میں خاموش رہے اور جب آپ نے خلافت کا مطالبہ کیا۔ اس وقت بھی حضرت طلحہ، زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم نے بھی خلافت چھیننے کی نہ کوئی کوشش کی نہ مطالبہ کیا۔ ان حضرات کا مطالبہ تو صرف اتنا تھا کہ اب آپ باقتدار امیر ہیں تو، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین کی تفتیش اور ان کے بارے میں قصاص کا جلد بندوبست فرمائیں۔ مگر سازشوں کی درپردہ مساعی سے رفتہ رفتہ یہ معاملہ جانبین کے قصد و ارادہ کے علی الرغم جنگ و جدال کی شکل اختیار کر گیا۔ چنانچہ کتب سیر اور جناب امیر کے خطبات اس پر گواہ ہیں،

پھر اگر یہ بھی تسلیم کرلیں تو لفظ کفر سے (حقیقی کفر نہیں بلکہ) کفران نعمت مراد ہے اس لئے کہ اس پر سب متفق ہیں، کہ آپ کے عہد میں آپ کی خلافت اتنی بڑی نعمت تھی جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور اس پر دلیل لفظ خلافت ہے کیونکہ خلافت بالاجماع زمین میں تصرف کے ساتھ مشروط ہے اور یہ تصرف آپ کو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد میں ملا ہی کہاں (جو کوئی اسے چھینتا یا انکار کرتا) اسی لئے حدیث میں لفظ امامت نہیں آیا۔ اور اگر اس کو مان بھی لیں۔ تو قرآن مجید کی آیت استخلاف میں خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے منکر کو بھی کافر فرمایا ہے اور آیت کو اسی پر ختم بھی فرمایا ہے،

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَالِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ (اور جو کوئی اس آیت کے سننے اور اس کا علم ہو جانے پر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے اس کے بعد انکار کرے وہی کامل فاسق ہے)

اور محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ اخطب زیدی کی ساری روایات مجہول الحال ضعیف راویوں سے منقول ہیں اور یہ کہ اس کی اکثر روایات منکر اور موضوع ہیں اسی لئے فقہائے اہل سنت اس کی روایات سے کوئی حجت و دلیل نہیں دیتے اور اسی وجہ سے علماء اہل سنت سے اس کا نام پوچھا جائے تو کوئی اسے نہیں پہچانتا۔

ان حالات میں اہل سنت کو اس زیدی کی روایت کے حوالہ سے الزام دینا بالکل اسی قصہ کے مطابق ہے کہ ایک بوڑھا سنی عاشورہ کے دنوں میں کہیں جارہا تھا، راستہ میں ایک سانپ دکھائی پڑا یہ اپنے بڑھاپے کے سبب سانپ کو مار نہ سکتا تھا، اتفاقاً وہاں سے ایک شیعہ نوجوان گزر رہا تھا۔ اس کو آواز دیکر بلایا اور کہا اے شیعہ بھائی تجھے عثمان غنی رض کا واسطہ اس سانپ کو مار ڈال۔ یہ سنکر شیعہ جوان واویلا کرنے اور فریاد کرنے لگا کہ مسلمانو میری فریاد سنو، دیکھو یہ کس کو، کس کا واسطہ دیکر کن دنوں میں، کس جانور کو مارنے کے لئے کہہ رہا ہے!

(۸) وہ حدیث جس کی ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَنَا وَعَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ نُوْرًا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ اٰدَمَ بِاَرْبَعَةِ عَشَرَ اَلْفَ عَامٍ فَلَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ قَسَّمَ ذَالِكَ النُّوْرَ جُزْئَيْنِ فَجُزْءٌ اَنَا وَجُزْءٌ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ	میں اور علی بن ابی طالب بشکل نور اللہ تعالےٰ کے سامنے چودہ ہزار سال رہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اس نور کے دو حصے کئے بس ایک حصہ میں اور ایک حصہ علی بن ابی طالب ہیں،

اہل سنت کے نزدیک یہ روایت بالاجماع موضوع ہے۔ اس کی اسناد میں ایک راوی محمد بن خلف مروزی ہے یحییٰ بن معین نے اسے کذاب کہا ہے۔ دار قطنی نے اسے متروک کہا ہے اور اس کے جھوٹا ہونے کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس روایت کا ایک دوسرا سلسلہ سند بھی ہے جس میں ایک راوی جعفر بن احمد ہے۔ یہ متعصب رافضی اور جھوٹی روایات کرنے والا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی برائی اور ان کی سب وشتم کے سلسلہ میں روایات گھڑا کرتا تھا،

اور اگر اسے کسی درجہ میں قابل لحاظ مان لیں تو یہ ایک دوسری روایت کے مخالف ہے جو اس سے فی الجملہ بہتر ہے اس کی سند میں کوئی جھوٹا اور وضاع نہیں ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كُنْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ قَبْلَ اَنْ يَّخْلُقَ اٰدَمَ بِاَلْفِ عَامٍ فَلَمَّا خَلَقَ اَسْكَنَنَا ظَهْرَهٗ وَلَمْ نَزَلْ نَنْتَقِلُ فِي الْاَصْلَابِ الطَّاهِرَةِ حَتّٰى نَقَلَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى صُلْبِ عَبْدِ اللّٰهِ وَنَقَلَ اَبَابَكْرٍ اِلٰى صُلْبِ اَبِيْ قُحَافَةَ وَنَقَلَ عُمَرَ اِلٰى صُلْبِ الْخَطَّابِ وَنَقَلَ عُثْمَانَ اِلٰى صُلْبِ عَفَّانَ وَنَقَلَ عَلِيًّا اِلٰى صُلْبِ اَبِيْ طَالِبٍ۔

میں، ابوبکر، عمر، عثمان و علی تخلیق آدم سے ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے تھے جب ان کو پیدا کیا تو ہمیں ان کی پشت میں قائم فرمایا اور یوں ہم پاک پشتوں میں منتقل ہوتے رہے حتیٰ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے عبداللہ کی صلب میں منتقل کیا اور ابوبکر کو ابو قحافہ کی، عمر کو خطاب کی، عثمان کو عفان کی اور علی کو ابی طالب کی صلب میں منتقل فرمایا۔

اس حدیث کی موید ایک دوسری مشہور حدیث بھی ہے، وہ یہ ہے،

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ مَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ

ارواح فوج در فوج جمع تھیں وہاں آپس میں جن جن کی شناسائی ہوئی ان میں دنیا میں بھی الفت رہی اور جن میں ناآشنائی تھی وہ دنیا میں بھی باہم انجان رہے۔

• اور ساری تگ و دو اور رد و کد کے بعد بھی یہ روایت ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جناب امیرؓ کی نور نبوی میں شرکت بھی ان کی امامت بلافصل ثابت نہیں کرتی ان ہر دو کے درمیان تلازم اس طرح ثابت ہونا چاہیئے کہ اعتبار کا غبار بھی اسے نہ چھو سکے مگر اس کے ثبوت میں مشکلات کے مراحل حائل ہیں۔ جناب امیر کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے جو قرب حاصل تھا، اس میں تو کوئی کلام نہیں کلام تو اس میں ہے کہ یہ قرب امامت بلافصل کا سبب ہے، یا نہیں؛ اگر قرب نسبی ہی صرف امامت کا سبب ہوتا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ امامت و خلافت کے زیادہ حقدار تھے کیونکہ آپ چچا بھی تھے اور والد بزرگوار کے شریک اصل بھی: اور ظاہر ہے چچا، چچا زاد بھائی سے عرفاً و شرعاً اقرب ہے،

اور اگر کوئی یہ کہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نور سے محروم تھے اس لئے لیاقت امامت سے محروم ہو گئے کیونکہ نور عبدالمطلب حضرت عبداللہ اور جناب ابوطالب میں بٹ گیا دوسرے بیٹوں کے حصہ میں نہیں آیا تو ہم یہ کہیں گے کہ اگر نور کی قوت و کثرت پر مدار تقدم ہے تو پھر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما قوت و کثرت ہر دو جہت سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بھی امامت میں احق اولیٰ ہوں گے باعتبار قوت تو اس طرح کہ جب نور بٹا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حصہ حضور ہی کو ملا اور وہی نور حضرات حسنینؓ کو تقسیم ہوا۔ بخلاف جناب امیر کے کہ آپ اصل نور میں ہی شریک تھے، نور پیغمبر میں تو شریک نہیں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حصہ کا نور دوسرے کے نور سے زیادہ قوی ہے،

اور بلحاظ کثرت اسطرح کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اپنے اندر نور مصطفوی اور نور مرتضوی دونوں رکھتے تھے، اور دو نور ایک نور سے قطعاً زیادہ اور اکثر ہے!

(۹) وہ حدیث جو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کے دن آپ نے فرمایا۔

لَاُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا يُّحِبُّ اللّٰهَ وَ

کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ و رسول سے

وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ۔ محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول اس کو محبوب رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پہ فتح دے گا۔

یہ حدیث صحیح تر بھی ہے اور قوی الروایت بھی، یہ اہل سنت کے سر کا جھومر اور آنکھوں کی روشنی ہے اور خوارج و نواصب کے اقوال کو رد کرنے کی خاطر اپنی کتابوں میں بڑے اعتماد و وثوق سے درج بھی کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ شیعوں کا مدعا اس روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ خدا اور رسول کا محب محبوب ہونا بھی اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ امام بلا فصل بھی ہو۔ (اور اگر انہیں اس پہ اصرار ہی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جو خدا و رسول کو محبوب تھے وہی امام بلا فصل ہوئے یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کیونکہ ان دو صفتوں کا کسی ایک شخص کے لئے ایک کلام میں ثابت کرنا دوسروں سے ان صفات کی نفی نہیں کرتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ، خود حضرت ابوبکر اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا ہو یا اہل بدر کے حق میں ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار ہیں،

اور اس میں کوئی شک نہیں اللہ جسے دوست رکھے اس کا رسول بھی ان کو دوست رکھتا ہے اور مومنوں میں جو اللہ کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے رسول کا بھی محب ہے۔!

اور اہل مسجد قبا کی شان میں ارشاد فرمایا ہے،

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت کو بہت پسند کرتے اور اللہ تعالیٰ طہارت پسند لوگوں کو محبوب رکھتا ہے،

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنِّیْ اُحِبُّكَ (میں تم کو دوست رکھتا ہوں)۔

وَلَمَّا سُئِلَ مَنْ اَحَبُّ النِّسَاءِ اِلَيْكَ قَالَ عَائِشَةُ قِيْلَ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ اَبُوْهَا۔ اور جب آپ سے پوچھا گیا (اہل بیت مستورات میں سے) آپ کو کونسی زیادہ محبوب ہیں، تو آپ نے فرمایا عائشہ پوچھا گیا کہ مردوں میں سے کون؟ فرمایا ان کے والد۔

اگر شیعوں کو یہ اشکال ہو کہ جب خدا اور رسول کا محب و محبوب ہونا دوسروں میں بھی پایا گیا تو پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے اس کی تخصیص نہ رہی حالانکہ یہاں (واقعہ خیبر میں) تخصیص ہونی چاہیئے تو اس کے جواب میں یہ کہا جائیگا کہ یہاں تخصیص باعتبار مجموع صفات کے ہے یعنی بلحاظ يفتح الله على يديه اور چونکہ علم الٰہی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پہ اس کی فتح مقدر تھی، اس لئے وہ سب صفات مجموعی حیثیت سے جناب امیر رض کے ساتھ مخصوص ہوئیں گو علیحدہ علیحدہ دوسروں میں پائی جاتی ہیں۔

پھر اس صفت کا ذکر جو دوسروں میں بھی مشترک ہے۔ یہاں ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وہ یہ کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی مدد و تائید فاجر شخص سے بھی کرا دیتا ہے)

لہٰذا اگر صرف قلعہ کی فتح جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پہ بیان کر دی جاتی تو وہ آپ کی فضیلت و بزرگی کا سبب نہ ہوتی، اسی وجہ سے ان صفات کو پہلے ذکر فرمایا۔

دوسرا جواب تخصیص کا یہ ہے کہ کلام عرب بلکہ تمام فرقوں کی گفتگو میں پہلے ایک خبر بطور تمہید ہوتا ہے اور مقصود اس کے بعد کا حصہ ہے۔ جیسے رجلا کا لفظ اس حدیث میں۔ یا جیسے کہتے ہیں زید ایک مرد عقلمند ہے۔ تو یہاں زید کا مرد ہونا بیان میں مقصود نہیں بلکہ اس کا عقلمند ہونا مقصود بیان ہے۔ اسی طرح یہاں بھی مقصود تو یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ سے آپ کی تخصیص ہے اور رَجُلًا اور یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَیُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ محض تمہید بیان ہے۔

(۱۰) یہ حدیث، رَحِمَ اللّٰہُ عَلِیًّا اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُ دَارَ (اللہ علی پر رحم کرے اے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھما وہ جدھر گھومے۔

اہل سنت بھی اس حدیث کو سر آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ شیعوں کا مدعا یعنی امامت بلا فصل اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ یہ حدیث اس مدعا سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی یوں تو جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے، اَلْحَقُّ مَعَ عَمَّارٍ حَیْثُ دَارَ۔ (حق عمار کے ساتھ ہے وہ جدھر بھی گھومے) بلکہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو حضرت عمر کے ساتھ حق کی معیت کی خبر دی جا رہی ہے بخلاف جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کہ وہاں ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جا رہی ہے کہ حق ان کے ساتھ گھومتا رہے۔ اب اخبار و دعا کا فرق جو ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ خاص طور پر شیعوں کے طے شدہ اصول کے مطابق کیونکہ وہ نبی کی ہر دعا قبول ہونا ضروری خیال نہیں کرتے چنانچہ ابن بابویہ قمی نے ایک روایت بحوالہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیان کی ہے، کہ آپ نے اپنے رب سے دعا کی کہ آپ کے سب اصحاب کو آپ کی محبت پر جمع کر دے الی آخر الروایت۔ (یہ روایت پہلے گزر چکی ہے)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں بعدی بھی فرمایا جس سے آپ کی امامت کے صحیح ہونے اور ہر اس شخص کی صحت امامت کا جس کو آپ امام سمجھیں خفیف اشارہ نکلتا ہے۔

اگر شیعوں کی طرح اہل سنت کا بھی یہ عقیدہ و مذہب ہوتا کہ نبی کے علاوہ بھی کوئی اور معصوم ہو سکتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عصمت پر یہ پہلی دلیل ہوتی مگر چونکہ یہاں شیعوں کے پیش نظر اہل سنت کی روایات سے تمسک اور ان کو الزام دینا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی تمام روایات کو قبول کریں۔

اہل سنت کے بعض ظریف الطبع حضرات نے شیعوں کے مقابلہ میں حدیث ادر الحق معہ حیث دار" سے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر معاملہ میں ان کے ساتھ تھے بیعت میں ساتھ تھے ان کی متابعت فرماتے، جمعہ و جماعت میں ان کے ہمراہ نماز کی ادائیگی میں امور ریاست میں مشورہ دیتے میں ان کے دست راست لہٰذا اس سے قیاس مساوات بنتا ہے

کہ حق علیؓ کے ساتھ ہے اور علی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، لہٰذا حق بھی ابوبکر و عمرؓ کے ساتھ ہے اور مقدمہ اجنبیہ جو اس قیاس میں صحت کا نتیجہ کا مدار ہے سچا ہے اس لئے کہ مقارن کا مقارن مقارن ہوتا ہے،

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ استدلال اپنی جگہ بہت مضبوط اور ٹھوس ہے گو ذکر کرنے والے نے بطور لطیفہ وظرافت اس کو بیان کیا ہے اس لئے کہ شیعوں کی اس روایت کے مطابق ہے جو نہج البلاغہ میں ہے یہ کتاب ان کے نزدیک اصح الکتب اور متواتر ہے چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتنہ نہاوند کے فرو کرنے کے لئے خود بنفس نفیس جانا چاہا تو مشورہ میں صحابہ کی آرا مختلف ہوئیں، بعض نے اس اقدام کی حمایت کی اور بعض نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا، تب آپ نے جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا وہ ہم تفصیل سے باب ہفتم کے عقیدہ ششم میں تحریر کر آئے ہیں وہاں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے،

جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ دل و جان سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ناصر ومعین ناصح و امین تھے۔ اگر معاذ اللہ آپ دل میں ان کی طرف سے کوئی گرہ رکھے ہوتے تو اس سے زیادہ اچھا موقعہ کب آسکتا تھا، کہ ان کو عجم کی طرف جانے کا مشورہ دیتے اور جب وہ اور ان کے عساکر جنگ میں الجھ جاتے یا شکست سے دوچار ہو آپ حجاز میں جو اسلام کا دار السلطنت تھا۔ صاحب تصرف قرار پا جاتے تو لوگ چار و ناچار آپ کی اتباع کے لئے سر جھکا دیتے مگر آپ کے قلب مبارک میں نہ کوئی کھوٹ تھا اور نہ آپ اپنے کو ان حضرات کے زمرہ سے علیحدہ شمار فرماتے تھے، بلکہ اس روایت سے تو واضح اشارہ اسی بات کا ملتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو زمرہ ابوبکر و عمر میں شمار فرماتے تھے، اسی لئے آپ نے یہ ارشاد الفاظ ارشاد فرمائے و نحن علی موعود من اللہ۔

اور نہج البلاغہ ہی میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے غزوہ روم کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تو آپ نے فرمایا۔

مَتیٰ تَسِیْرُ اِلیٰ ھٰذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ فَتَكْسِرُ وَتَنْكُبْ لَا تَكُنْ لِلْمُسْلِمِیْنَ كَانِفَةٌ دُوْنَ اَقْصٰی بِلَادِهِمْ وَلَیْسَ بَعْدَكَ مَرَاجِعٌ یَرْجِعُوْنَ اِلَیْهِ فَابْعَثْ اِلَیْهِمْ رَجُلًا مُجَرَّبًا وَاحْفِزْ مَعَهٗ اَهْلَ الْبَلَاءِ وَالنَّصِیْحَةِ فَاِنْ اَظْهَرَ اللّٰهُ فَذَالِكَ مَا تُحِبُّ وَاِنْ تَكُنِ الْاُخْرٰی كُنْتَ رِدْءً لِلنَّاسِ وَمَثَابَةً لِلْمُسْلِمِیْنَ

ترجمہ "آپ بنفس نفیس دشمن سے مقابلہ کے لئے جائیں گے اور اگر شکست کھا کر واپس ہوں گے تو مملکت کے آخری سرے سے لے کر یہاں تک مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی نہ آپ کے بعد کوئی ایسا ٹھکانہ ومرکز ہوگا کہ لوگ وہاں جمع ہو جائیں لہٰذا ایک آزمودہ کار آدمی ان کے مقابلہ کے لئے بھیجئے اور ساری اونچ نیچ سمجھا کر اس کا حوصلہ وہمت بلند کیجئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے غلبہ و فتح عطا فرمائی تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر نتیجہ برعکس نکلا تو آپ لوگوں کے لئے پشت پناہ اور جائے امن ثابت ہوں گے"،

اور مزے کی بات یہ ہے کہ شیعہ اس قسم کی روایات کو جو ان کی اصح اور متواتر الروایت کتابوں میں موجود ہیں، پڑھتے اور سنتے ہیں، تو ان دیکھی اور ان سنی خیال کر کے گذر جاتے ہیں، اور جھوٹوں کی گھڑی ہوئی افترا آمیز روایتوں کو حد درجہ کی مخالفت اور منافقت کی بنا پر باہم روایت کرتے اور پھیلاتے ہیں ان کے مقابلہ کی ان صحیح

روایات کو دیکھ کر اوسان خطا ہو جاتے ہیں، تو آئیں بائیں کرتے ہوئے کبھی تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ جناب امیر کی یہ پیروی اور متابعت شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں محض اس وجہ سے تھی کہ آپ کے معاون اور مددگار کم تھے اور پھر جب خود اپنی صحیح السندوہ روایات دیکھتے ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی قوت غلبہ اور اعوان و انصار کی کثرت پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں، تو شرمندہ اور نادم ہوتے ہیں مثلاً وہ روایت جو ابان بن ابی عباس نے سلیم بن قیس ہلالی سے کی ہے۔ یا اس کے علاوہ کچھ اوروں نے بعض دوسروں سے نقل کی ہے کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

وَاللہِ لَئِنْ لَمْ تُبَایِعْ اَبَا بَکْرٍ لَاَ قْتُلَنَّکَ قَالَ لَہٗ عَلِیٌّ لَوْلَا عَھْدٌ عَھِدَہٗ اِلَیَّ خَلِیْلِیْ لَسْتُ اَخُوْنُہٗ فَعَلِمْتَ اَیُّنَا اَضْعَفُ نَاصِرًا وَاَقَلُّ عَدَدًا

خدا کی قسم اگر تم نے ابو بکر کی بیعت نہ کی تو میں تمکو قتل کردوں گا جواب میں جناب علی نے فرمایا اگر وہ عہد نہ ہوتا جو مجھ سے میرے خلیل نے لیا ہے اور جس کو میں توڑنا نہیں چاہتا تو پتہ چل جاتا کہ ہم میں سے کس کے مددگار کمزور یا عدد میں کم ہیں،

یہ روایت ڈنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے کہ جناب امیر کا سکوت محض اسبابت کی وجہ سے تھا جو آپ اپنے خلیل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ خلافت بلا فصل اول ابو بکر کا حق ہے، پھر عمر کا (رضی اللہ عنہم) اور اس بات پر کہ عہد مذکور یہی ہے اصول شیعہ کے موافق برہان عقلی بھی ہے۔ کہ اگر امامت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہوتا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم، باوجود انصار و اعوان کے جیسا کہ اس روایت سے آشکارا ہے آپ کو شیخین رضی اللہ عنہما سے جھگڑا نہ کرنے کی وصیت فرما جاتے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ امر الٰہی کو معطل چھوڑ دینے کی وصیت فرما گئے ہوں کیونکہ اس صورت میں جناب امیر کو" اہل باطل کے اتباع کی وصیت فرما گئے اور امت کو لطف سے محروم فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا، یاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ اے نبی مومنوں کو لڑائی پر ابھاریئے اس وقت کہ دس کافروں کے مقابل ایک مسلمان ہونا تھا، جناب رسالتماب صلے اللہ علیہ وسلم بڑی تاکیدات سے جہاد پر آمادہ فرماتے تھے، اور جب دین مکمل ہوا اور اتمام نعمت ہو چکا تو آپ شیر خدا جیسے شخص کو بزدلی اور خوف کا سبق دیں تبلیغ احکام کو ترک کرائیں فتنہ فساد، تحریف کتاب اللہ اور تبدیل دین کو روا رکھیں العیاذ باللہ شان نبوت و رسالت کو اس وصیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (کیا تمہارے مسلمان ہونے کے بعد وہ تم کو کفر کا حکم دیتے ہیں)۔

اور کبھی شرمندگی مٹانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ جھگڑے سے کنارہ کشی اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ساتھ موافقت، وفاداری اور صلح جوئی میں محض افعال الٰہی کی اقتداء مد نظر تھی۔ یہ توجیہ ابو جعفر طوسی کے پوتے ابن طاؤس کی ذہنی اختراع ہے جسے دوسروں نے بھی سینوں سے لگا لیا ہے حالانکہ یہ ایسی توجیہ ہے کہ نہ اس کا سر ہے نہ پیر کیونکہ افعال الٰہی کی اقتداء واجب تو کیا ہوتی جائز بھی نہیں البتہ امتثال اوامر ضروری ہے خدا تعالیٰ کا فعل تو بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کافر کی مدد کرتا ہے اور مسلمان صالح کو نکال دیتا ہے حالانکہ یہ کسی مسلمان کے لئے بھی جائز نہیں، کہ کافر کی مدد کرے اور مسلمان کو قتل کر دے شان بندگی تو یہی ہے کہ اپنے مالک و آقا حکم کی

تعمیل کرے اور اسے قبول کرے نہ یہ کہ اس کے افعال کی نقل کرنے لگے اس دنیا میں تعلقات بندگی و آقائی میں جو سراسر مجاز در مجاز ہیں اس قسم کا رویہ معیوب بھی ہے اور ملعون بھی، چہ جائیکہ حقیقی بندگی و آقائی ہیں۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اطمینان سے کام لینا اور کام میں جلدی نہ کرنا قابل تعریف ہے تو یہ بات اچھے اور نیک کاموں کے بارے نہیں اس لئے کہ مثلاً آقا اپنے رسولوں پیامبروں اور غلاموں کو فوری حکم صادر کرے اور وہ دھیما پن دکھائیں یا سستی کریں تو وہ کھلم کھلا نافرمانی کے داغ سے داغدار ہوں گے جیسا کہ فرمایا۔ وَإِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَيُبَطِّئَنَّ البتہ تم میں سے بعض ایسے ہیں جو نکلنے میں دیر لگاتے ہیں، اور جلد بازوں کی تعریف میں فرمایا اُولٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ (یہی ہیں جو اچھے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی سبقت لے جانے والے ہیں، اسی لئے مثل مشہور ہے نیک کام میں سوچ بچار کی حاجت نہیں! (در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست)

اور امام کے لئے دھیما پن کس طرح جائز ہو سکتا ہے جبکہ مخلوق کی ہدایت اور گمراہوں کی رہنمائی اس کے ذمہ لازم ہے کیونکہ سستی اور دھیمے پن سے بہت سے واجبات ہاتھ سے نکل جائیں گے اور پھر اطمینان کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے پچیس سال کا عرصہ کوئی اطمینان میں نہیں گزارتا۔

اگر اس پر یہ کہا جائے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی یہ آہستہ روی امر الٰہی کی وجہ سے تھی اس لئے ترک واجب لازم نہیں آتا تو ہم کہیں گے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جناب امیر کی امامت وجود میں نہیں آئی ہوگی ورنہ امام کا مقرر کرنا اور حکم دینا کہ آہستگی برتے اور لوازم امامت کو معطل رکھے، دونوں باتیں باہم متضاد و مخالف ہیں اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو قاضی مقرر کرے اور کہے کہ پچیس سال تک اپنی قضا کا اظہار نہ کر کوئی مقدمہ اپنے سامنے پیش نہ ہونے دے اور دعاوی کے بارے میں لب نہ ہلا۔ یہ الفاظ تو واضح طور پر ایک ہی بات ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی صرف قضا کا وعدہ ہے، قاضی کا تقرر عمل میں نہیں آیا۔ پچیس سال بعد وہ قاضی ہوگا۔

اگر اس کو ظاہر پر محمول کریں تو یہ کھلا تناقض ہوگا۔ اور قاضی کے تقرر سے جو غرض و مقصد مدنظر ہوتا ہے اس کا فوت ہونا لازم آئے گا یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوگی اس کی قباحت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور بالا و برتر ہے

اور ایک بات اس سے یہ بھی نکلتی ہے کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آہستگی برتنے کے لئے مامور ہوئے، اور آپ نے دعوائے امامت قطعاً ظاہر بھی نہ فرمایا تو لامحالہ مکلفین آپ کی اتباع اور پیروی نہ کرنے میں معذور ہوں گے۔ اب اگر وہ دین و دنیا کے اہم کاموں کو انجام دینے کے لئے اس درمیانی مدت میں کسی اور کو نامزد کر لیں تو وہ عتاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا،

(۱۱) یہ حدیث جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِعَلِيٍّ اِنَّكَ تُقَاتِلُ عَلَى تَاوِيْلِ الْقُرْاٰنِ كَمَا قَاتَلْتُ عَلَى تَنْزِيْلِهِ

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب علی سے فرمایا کہ تم تاویل قرآن پر لڑو گے جیسا کہ میں تنزیل قرآن پر لڑا۔

یہ حدیث بھی اثبات مدعا سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ حدیث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ تم کسی وقت تاویل قرآن پر قتال کرو گے۔ اہل سنت کا مسلک بھی یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنی لڑائیوں میں حق بجانب

تھے اور آپ کے مخالفین خطا کار! اس حدیث میں وہ کونسی وجہ ہے جس سے آپ کی امامت بلا فصل ثابت ہو سکے۔ بلکہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ تاویل قرآن پر قتال اور امامت بلا فصل میں ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی وجہ سے بھی کوئی تلازم نہیں، لہٰذا اس حدیث کو اہل سنت کے مقابلہ میں لانا انتہائی ناسمجھی کی بات ہے،

ہاں اس کو اہل سنت کے مذہب کی دلیل ٹھہرائیں تو یہ درست ہوگا۔ کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہوں گے، اور تاویل قرآن پر قتال فرمائیں گے اور ان کے قتال کا وقت معلوم ہی ہے کہ کب تھا۔

اور پھر یہ حدیث اہل سنت کے اس دعوے کی دلیل بھی ہو سکتی ہے کہ حق۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف تھا اور آپ کے مخالف خطا پر تھے، کہ قرآن کے معانی سمجھنے میں ان سے خطا ہوئی اور ایک اجتہادی غلطی کے شکار ہوئے۔

یہ شیعوں کی بدقسمتی ہے کہ بے وقوفی کے سبب اس قسم کی احادیث کو اس مقام پر لاتے اور اپنی ندامت و شرمندگی کا سامان اپنے ہاتھوں کرتے ہیں، کیونکہ یہ احادیث تو ان کی تائید کے بجائے علی الاعلان ان کی تردید کرتی ہیں ظاہر ہے کہ تاویل قرآن بالاجماع کفر نہیں اگر قرآن کے ظاہری معنے سے غلط فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ تاویل کرلے اور اصلی معنوں تک رسائی نہ ہونے کے سبب انکار کر بیٹھے تو اس کے کفر میں بھی کلام ہے نہ کہ جو معنی خفی یعنی تاویل سے منکر ہو۔ حالانکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ سے لڑنے والے کافر ہیں، جیسا کہ طوسی کی تجرید العقائد میں صاف موجود ہے،

(۱۲) بارہویں حدیث وہ ہے جو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي اَحَدُهُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْآخَرِ۔ كِتَابُ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي۔

نبی رحمت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو مرکز ثقل چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان دونوں کو تھامے رہو گے تو میرے بعد بھی گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک دوسری سے بڑھ کر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترت)

یہ حدیث بھی احادیث ماسبق کی طرح اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی آخر وہ ایسی کونسی مجبوری اور ضرورت ہے کہ مالک ریاست کبریٰ ہی سے تمسک واستدلال ہو اور اگر اسے مان لیں تو اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی تو حدیث صحیح ہے کہ،

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ مِنْ بَعْدِي تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔

تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت میرے بعد لازم ہے اسے تھام لو اور مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑ لو۔

اور پھر چلو تمہارا کہا ہی سہی لیکن لغت عرب میں عترت اقارب کے معنے میں آتا ہے۔ اگر اس کی دلالت امامت پر ہو گی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام اقارب ائمہ واجب الاطاعت ہونے، لازم ہوں گے، خصوصًا عبداللہ بن عباس، محمد بن الحنفیہ، زید بن علی، حسن مثنیٰ، اسحاق بن جعفر صادق رحمہم اللہ اور ان جیسے، دیگر اہل بیت!۔

اور صحیح حدیث میں یہ بھی ہے کہ خُذُوْا شَطْرَ دِیْنِکُمْ عَنْ ھٰذِہِ الْحُمَیْرَاءِ (اپنا آدھا دین اس حمیراء سے لو. یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے)

وَاھْتَدُوْا بِھَدْیِ عَمَّارٍ وَتَمَسَّکُوْا بِعَھْدِ ابْنِ اُمِّ عَبْدٍ (عمار سے روش ہدایت سیکھو، اور عبد اللہ بن مسعودؓ کی وصیت کو مضبوطی سے تھام لو)

وَرَضِیْتُ لَکُمْ مَا رَضِیَ لَکُمْ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ وَاَعْلَمُکُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ۔ عبد اللہ بن مسعود تم سے جس بات پر خوش ہوں میں بھی اس پر خوش ہوں۔ اور تم میں معاذ بن جبلؓ حلال وحرام کا زیادہ علم رکھنے والے ہیں)

اسی طرح کی اور بھی بے شمار احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ خصوصاً آپ کا یہ فرمان اِقْتَدُوْا بِالَّذَیْنِ مِنْ بَعْدِیْ اَبَابَکْرٍ وَعُمَرَ (میرے بعد دین میں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو) اور یہ حدیث تو شہرت وتواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے تو اب یہ لازم آیا اور ضروری ہوا کہ سب ہی اشخاص امام ہوں۔

اس کے علاوہ اگر یہ حدیث عترت دلیل امامت ہو تو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے، اور جسے شیعہ متواتر مانتے ہیں کہ اِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ۔ کس طرح ٹھیک ثابت ہوگی،

اور اسی طرح حدیث مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ فِیْکُمْ مَثَلُ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجٰی وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ (تم میں میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے کہ جو اس میں سوار ہوگیا نجات پاگیا اور جو پیچھے رہ گیا ڈوب گیا) صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فلاح وہدایت ان سے محبت ودوستی سے وابستہ ہے اور ان کی اتباع پر موقوف، اور ان کی محبت ودوستی سے روگردانی ہلاکت وتباہی کا باعث!۔

اور بفضلہ تعالیٰ سارے فرق اسلامیہ میں سے اہلسنت ہی کو یہ سعادت نصیب ہے اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں صرف انہی کے مذہب ومسلک کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے تمام اہل سنت کی محبت کی رسی کو پورے طور پر تھام رکھا ہے، اس طرح نہیں کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کتاب کی ایک بات مانتے ہیں، اور کچھ کا انکار کرتے ہیں)

بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ایمان کے بموجب کہ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ (ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے ساتھ فرق نہیں کرتے) بعض سے محبت یا ان پر ایمان اور بعض سے عداوت یا کفر اختیار نہیں کرتے،

اور ان شیعوں کا یہ حال ہے کہ ان میں کا کوئی فرقہ تمام اہل بیت کو دوست نہیں رکھتا، بعض ایک طائفہ سے دوستی رکھتے ہیں تو باقیوں سے بغض عداوت۔ اور بعض دوسرے طائفہ سے! یہی حال ان کے اتباع وپیروی کا ہے، بخلاف اہل سنت کے کہ کسی ایک پر انحصار کریں سب سے روایات لیتے ہیں، اور ان سے تمسک واستدلال کرتے ہیں چنانچہ ان کی کتب تفسیر وفقہ وحدیث اس پر گواہ ہیں، اگر کتب اہل سنت کا اعتبار نہ کریں تو پھر مرویات شیعہ کا کیا جواب ہے جن کو اس کتاب میں نقل کیا ہے اور جو عقائد الٰہیہ سے لے کر فروع فقہیہ تک اہل سنت کے مذہب کے موافق ہیں،

اس موقعہ پر بعض خوش طبع شیعہ، دلفریب تقریر جھاڑتے ہیں، ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو یہاں نقل کرکے

ان کی مذہب بازی کو واضح کر دیں،

وہ کہتا ہے کہ اس حدیث میں اہل سنت کی سفینۂ نوح سے تشبیہ اشارہ کرتی ہے کہ تمام اہل بیت کی محبت اور سبکی اتباع نجات و فلاح کے لئے ضروری نہیں، اس لئے کہ اگر ایک شخص نے کشتی کے ایک کونے میں اپنی جگہ پکڑلی تو بلا شبہ اس کو ڈوبنے سے نجات مل گئی ساری کشتی میں چکر لگاتے پھرنا کبھی اس کونہ میں کبھی اس کونہ میں، نہ اس کا کوئی عادی ہوتا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے، لہٰذا جب شیعہ نے کسی اہل بیت سے تعلق رکھا اور ان کی اتباع کو اپنا مقصد ٹھیرایا تو بلا شبہ اسے راہ نجات مل گئی۔ اور اہل سنت کا یہ الزام کہ انہوں نے بعض کی اطاعت ترک کی، صحیح نہ رہا۔

بحمد اللہ اہل سنت اس کا شافی جواب دے سکتے ہیں، اور دو طرح سے۔ اول بطریق نقض و الزام۔ کہ اگر یہی بات ہے تو امامیہ کو چاہیئے کہ زیدیوں، کیسانیوں، ناؤسیوں اور افطحیوں میں سے کسی کو نہ گمراہ کہیں نہ ان کی تکفیر و تفسیق کریں بلکہ ان کو ناجی اور بامراد خیال کریں، کیونکہ ان میں سے ایک ہر فرقہ نے اس وسیع کشتی کا ایک گوشہ پکڑا ہوا ہے اور اس کو اپنا ٹھکانا بنا لیا ہے، اور بقول تمہارے ایک گوشہ ہی ڈوبنے سے بچانے کے لئے کافی ہے، بلکہ اس صورت میں تو بارہ اماموں کی تعین بھی خطرہ میں پڑ جائے گی کیونکہ کشتی کا تو ایک کونہ ہی نجات کے لئے کافی ہے، بارہ گوشوں کی کیا ضرورت ہے۔

اور امام وہی ہے جس کی اتباع نجات آخرت کی موجب ہو، اور پھر یوں تو اثنا عشریہ ہی نہیں پورا سلسلہ امامیہ ہی زیر و زبر اور درہم برہم ہو جائے گا، یہی بات زیدیہ کہیں تو یہی بات ان کے خلاف بھی جائیگی گویا اس صورت میں شیعوں کے فرقوں میں سے کوئی فرقہ اپنے لئے، کوئی خاص مذہب مخصوص نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کو چاہیئے کہ اپنے سب ہی مذاہب کو مبنی برحق اور صواب و درست سمجھیں۔ حالانکہ ان کے مذاہب میں باہم جو تناقض اور تضاد ہے اس کو معلوم کرنے کے لئے کسی علمی گہرائی میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اجتہادیات کے علاوہ تناقض کے دونوں اطراف کو حق جاننا اجتماع نقیضین کا قائل ہونا ہے جو محال ہے،

دوسرا جواب بطریق حل ہے وہ یہ کہ ایک کونہ میں جگہ پکڑ لینا اس وقت ڈوبنے سے بچا سکتا ہے کہ دوسرا کونہ اس کی تخریب کاری سے محفوظ رہے اور وہ وہاں سوراخ نہ کرنے لگے اگر ایک کونہ میں مقیم رہ کر دوسرے کونہ میں سوراخ کرے گا تو ہرگز ڈوبنے سے نہ بچ سکے گا اور شیعی فرقوں میں ایک بھی فرقہ ایسا نہیں جو ایک کونہ میں بیٹھا ہو اور دوسرے کونہ میں سوراخ نہ کر رہا ہو،

ہاں اہل سنت اگرچہ دوسرے گوشوں میں بھی چلت پھرت رکھتے ہیں مگر ان کی کشتی اس کے باوجود محفوظ و سالم ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے کسی گوشہ میں سوراخ نہیں کیا کہ ادھر سے موج دریا کشتی میں داخل ہو جائے اور کشتی کو ڈبو دے،

اور یہ مقام شکر ہے کہ اہل سنت کی اس روش کے سبب نواصب و خوارج کے اشکالات و اعتراضات کا دفعیہ بھی آسان و سہل ہوا کہ انہوں نے عقلی دلیل سے ان دونوں احادیث کا انکار کیا ہے اور ان میں کمزوریاں نکالی ہیں، اور کہا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مطلب ممتنعات عقلیہ کی تکلیف کو روا رکھنا ہے جو بالبداہت محال و

ناممکن ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اگر تمام اہل بیت سے تمسک کیا جائے تو ان کے آپس کے عقائد و فروع میں تناقض کی حد تک اختلاف کے سبب امت کو نقیضین کے جمع کرنے کی تکلیف دینا ہے جو بالکل ہی محال ہے اور اگر تمام کی جگہ بعض سے تمسک کریں تو تعیین سے ہوگا یا بلا تعیین کے اگر پہلی صورت ہو تو بغیر مرجح کے ترجیح لازم آتی ہے، یعنی جب سب اہل بیت فوقیت میں برابر ہیں تو ایک کو دوسرے پر ترجیح کیسی، اور پھر ان میں بھی ہر ایک کو تعیین حق کی روایات میں سخت اختلاف پیش آیا۔ لہٰذا پھر وہی اجتماع النقیضین یا ترجیح بلا مرجح کا الزام لگتا ہے،

دوسری صورت میں مختلف عقائد اور مختلف شریعتوں کا ایک دین میں خلاف شارع سما جانا لازم آجاتا ہے جس کی صاف تردید اس کلام الٰہی سے ہوتی ہے، لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک دین اور ایک راستہ بنایا) اور ضرورت دینیہ کی وجہ سے اس کا محال ہونا لازم آتا ہے،

ان اشقیا کے ان اشکالات و اعتراضات سے پوری ملت شیعہ عہدہ بر آ نہیں ہوسکتی تا آنکہ اہل سنت کی روش اختیار نہ کریں،

اور شیعوں کے عقلی دلائل کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ حد شمار سے بھی باہر ہیں "الفین" اور دوسری کتابوں نے ان کا احاطہ کیا ہے،

یہاں اہل سنت کے لئے مفید قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے وہ ان کی ہر دلیل کا توڑ اور ہر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں پہلے تو یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ اس مدعا پر جو عقلی دلیل ہوگی وہ تین حال سے خالی نہیں (۱) اس کے سب مقدمات عقلی ہوں گے جیسے اس کتاب میں بیان کردہ دلائل میں پانچویں دلیل (۲) یا بعض عقلی ہوں گے بعض نقلی (جیسے دلیل اول یا (۳) سب نقلی ہوں گے، (جیسے دلیل دوم) یہ اصطلاح گو مشہور اصطلاح کے خلاف ہے، کہ دلیل عقلی وہ ہے، جو محض مقدمات عقلیہ سے مرکب ہو۔ اور دلیل نقلی وہ جس کا ایک مقدمہ نقلی ہے،

بہرحال ہر سہ عقلی دلائل، یقینی طور پر ماخوذ ہوں گے شرائط امامت سے، یا موانع امامت اور طرق تعیین سے تو گویا اس صورت میں تمام دلائل کی بنیاد امامت کی بحث قرار پائے گی اور امامت کی بحث، نبوت کے تابع ہے جس کی وہ (امامت) نائب ہے، اور وہ خود یعنی بحث نبوت فرع ہے الٰہیات کی جس کی وہ بھی نائب ہے کیونکہ نبوت خدا کی رسالت کا نام ہے۔

پس جب شیعوں کے اصول اور ان کے مسلمات کا تینوں مباحث میں، کتاب اللہ عترت رسول اور عقل، کے خلاف ہونے کے سبب قلع قمع کر دیا گیا تو گویا ان کے دلائل تینوں مرحلوں میں مسدود کر دیئے گئے اور ان کے شبہات کا نسب نامہ تین پشتوں تک مجروح کر دیا گیا،

اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ مثلاً یہی مقدمہ جو ان کے دلائل میں بہت آیا ہے کہ امام کا منصوص علیہ ہونا (یعنی اس کی امامت پر نص کا وارد ہوا ہو) واجب ہے، اس کی اصل اور بنیاد ان کا یہ عقیدہ ہے، نَصْبُ الْإِمَامِ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ۔ (امام کا مقرر کرنا اللہ پر واجب ہے)

اور اس بنیاد (اصل) کی بنیاد یہ عقیدہ ہے، بَعْثُ النَّبِيِّ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ (نبی کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ اور اس اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے اَلتَّكْلِيفُ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰهِ (بندوں کو مکلف کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے

اور اس اصل کی اصل کی اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے، اَللُّطْفُ وَاجِبٌ عَلَى اللّٰہِ لطف و مہربانی اللہ تعالیٰ پر واجب ہے)۔

جب ان مذکورہ بالا چار مباحث کو عقل نے کتاب اللہ اور عترت رسول جیسے دو معتبر و عادل گواہوں کی شہادت و گواہی سے باطل و غلط ثابت کر دیا تو اس مقدمہ کے باطل و غلط ہونے میں کون سا شبہ باقی رہ جاتا ہے یا رہ سکتا ہے۔ لہذا اس قاعدہ کی رو سے ان کے تمام دلائل کی حالت باعتبار مقدمات و مواد کے عقلمند کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے، اور پھر ان کے اشکال مکڑی کی تلوار کا کھلونا جو بچوں کا دل بہلاوا ہو، یا شیر کی کھال ثابت ہوتی ہے جس کو بوڑھے بھی روندتے پھرتے ہیں۔ اسی لئے درحقیقت ان کے دلائل کے بیان سے اس کتاب میں بفضلہ تعالیٰ کوئی گھبراہٹ یا دغدغہ نہیں ہے البتہ ان کے وہ چند دلائل جن کو یہ عروۃ الوثقیٰ (مضبوط کھونٹا) یا "عمدۃ القوی" (چیدہ قوت، خیال کرتے ہیں، ہم بطور نمونہ یہاں قلمبند کرتے ہیں، تاکہ ان کے باقیماندہ دلائل کی حقیقت بھی کھل جائے جن سے وہ بھی کما حقہ واقف نہیں ہیں، ایسی دلیلیں کل چھ ہیں،

پہلی دلیل:۔ یہ کہ امام کے لئے واجب ہے کہ معصوم ہو، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی معصوم نہیں لہذا وہی امام ہوں گے کوئی اور نہیں اور یہی مدعا ہے،

اس دلیل میں صغریٰ و کبریٰ دونوں ناقابل تسلیم ہیں۔ صغریٰ اس لئے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے صراحۃً فرمایا اِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ۔ (مشورہ کا حق مہاجرین وانصار ہی کو ہے، اور ظاہر ہے کہ مہاجرین و انصار کی جماعت میں جس نے ان کو خلیفہ چنا کوئی معصوم نہ تھا اور یہ بھی ہے کہ جب آپ نے خوارج کا یہ کلام سنا کہ لا امرۃ (خلافت کوئی چیز نہیں) تو آپ نے فرمایا لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِیْرٍ بَرًّا اَوْ فَاجِرٍ (لوگوں کے لئے کوئی امیر ضروری ہونا چاہئے خواہ وہ نیک ہو یا بد۔) نہج البلاغہ میں بھی یہ روایت موجود ہے،

لیکن اس کو اگر تسلیم بھی کر لیں تو نبی کے سوا کسی دوسرے اور شخص کا معصوم ہونا معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ علم و معلومات کے تین ہی تو اسباب ہیں۔ حواس سلیمہ۔ عقل، اور خبر صادق ہے ظاہر ہے کہ عصمت چونکہ اس ملکہ کا نام ہے جو گناہوں اور برائیوں کے صدور کو روک دے تو یہ حس میں نہیں آسکتی، رہی عقل تو وہ بھی افعال و آثار کی مدد کے بغیر اس ملکہ کا پتہ نہیں چلا سکتی، اور افعال و آثار کی رہنمائی یہاں نصیب نہیں، اس لئے کہ اول تو شخص معین و مخصوص کے تمام افعال و آثار کا معلوم کرنا دائرۂ امکان سے باہر ہے خصوصاً دل کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی نیتوں وارادوں مثلاً عقائد، فاسدہ حسد و بغض و جذبہ خود پسندی ریا اور دوسرے نازیبا اخلاق وغیرہ۔

اور پھر اگر اس کے تمام اچھے افعال و آثار موجودہ کا پتہ کسی طرح لگ بھی جائے تو اس کے ماضی و مستقبل کی کون ضمانت دے گا۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ صبح وہ کچھ ہے تو شام کو کچھ، نفس اس کے ساتھ لگا ہوا ہے شیطان سا دشمن دم کے ساتھ ہے، برے ہمدموں میں گھرا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ صبح وہ مومن ہے تو شام کو ایمان کو خیر باد کہہ چکا ہو! برصیصا، اور بلعم باعور کے قصے اس جگہ عبرت کے لئے بہت کافی ہیں، دوسری طرف دعائے ماثورہ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ وَطَاعَتِکَ (اے دلوں کو لوٹ پلٹ کرنے والے میرے دل کو اپنے دین اور اپنی طاعت پر جمادے اس بیماری کے کھٹکے سے بچانے کے لئے بڑی اکسیر ہے،

اور بفرض محال یہ سب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو حقیقت عصمت کا پتہ کیسے چلے گا، یعنی یہ کہ گناہ کا اس سے سرزد ہونا ممتنع و محال ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کریں گے کہ معلوم کر لیں کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوا جس کو محفوظیت کا مرتبہ کہتے ہیں، جو عصمت کے لئے کافی نہیں تاوقتیکہ اس کا گناہوں کا امتناع معلوم نہ ہو۔

اب رہی خبر صادق تو وہ دو قسم کی ہوتی ہے متواتر، اور خبر خدا اور رسول۔ ظاہر ہے متواتر کو یہاں کوئی دخل نہیں اسلئے کہ حس کی شرط کے ساتھ انہا علم ضروری کو مفید نہیں اور غیر محسوسات میں جو زیر بحث ہیں غیر مفید ورنہ پھر فلاسفہ کی عالم کے قدیم ہونے کی خبر علم ضروری کو مفید ہوگی جو بالاجماع باطل ہے۔ اور خدا اور رسول کی خبر یہاں اصول شیعہ کے مطابق علم کی موجب نہیں اول تو یوں کہ اخبار میں بدآ جائز ہے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایک شخص کی عصمت کی خبر دیں اور دوسرے وقت میں اسی شخص کے فسق کی، اور اس کی ایک خبر ہم تک پہنچے اور دوسری نہ پہنچے اسی طرح ارادہ میں بھی بصورت باجماع شیعہ جائز ہے کہ ایک وقت میں ایک شخص کی عصمت سے ارادہ متعلق ہوا اور دوسرے وقت میں اس کے فسق سے!۔

لہذا ایسی حالت میں اطمینان و اعتماد اٹھ گیا اور اس پر سے اعتماد جاتا رہا۔ کہ یہ شخص آخر وقت تک عصمت پر قائم رہے گا بھی!

دوسرے یہ کہ خدا اور رسول کی خبر (اطلاع)، مکلفین کو یا تو معصوم کے ذریعہ پہنچیگی یا بواسطہ تواتر کے پہلی صورت میں دور لازم آئے گا۔ کیونکہ اس کی عصمت بھی تو اسی خبر سے ہم ثابت کرتے ہیں اگر اس خبر کو بھی عصمت سے ثابت کریں تو یہ ایک چیز کا خود اپنے پر موقوف ہونا ہوگا۔

دوسری صورت میں یہ سقم ہے کہ خود شیعوں کے نزدیک ہر تواتر علم یقینی کو مفید نہیں مثلاً، موزوں پر مسح کا تواتر، وضو میں پاؤں دھونے کا تواتر اور رأی المرافق اور امة هي اربي من امة الفاظ قرآن کا تواتر اور قعدہ نماز میں التحیات کے صیغہ کا تواتر اور اسی طرح کے اور بہت سے تواتر کہ شیعہ ان سب تواتروں سے انکار کرتے ہیں پس کسی خاص تواتر کی تعیین درکار ہوگی مگر وہ بھی غیر مفید ہے کیونکہ تواتر سے علم یقینی ناقلین کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے اور جب ایک دو بار تو نہیں جھوٹ کھل گیا تو سارے اقسام سے اعتماد جاتا رہیگا۔

اب رہا دلیل کا مقدمہ کبریٰ۔ (یعنی سوائے جناب امیرؓ کے کوئی معصوم نہیں تھا)، تو وہ اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ آنجنابؓ نے اپنے دوستوں سے خود یہ فرمایا۔

لَا تَكُفُّوا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ وَمَشْوَرَةٍ بِعَدْلٍ فَإِنِّي لَسْتُ بِفَوْقِ أَنْ أُخْطِئَ وَلَا آمَنُ مِنْ ذَالِكَ فِي فِعْلِي۔	تم حق بات کہنے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو اس لئے میں خطاو لغزش سے بالاتر نہیں ہوں نہ اپنے فعل میں ایسی باتوں سے مامون ہوں۔

بحوالہ نہج البلاغہ۔

ظاہر ہے کہ ایک معصوم ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا خصوصاً اسی کلام کے یہ آخری الفاظ۔

اِلَّا اَنْ يَكْفِيَ اللّٰهُ فِي نَفْسِي مَا هُوَ اَمْلَكُ بِهٖ مِنِّي	مگر یہ کہ ڈالدے وہ میرے دل میں وہ چیز جس کا وہ مجھ سے بہتر مالک ہے۔

یہ الفاظ ان کی عدم عصمت پہ واضح دلیل ہے۔ کیونکہ معصوم کو تو اللہ تعالیٰ اس کے نفس کا مالک بنا دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کَانَ اَمْلَکَکُمْ لِاِرْبِہٖ ان کو اپنے نفس پر تم سے زیادہ قابو تھا)
علاوہ ازیں جناب امیر سے بطور دعا یوں بھی منقول ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا تَقَرَّبْتُ بِہٖ اِلَیْکَ ثُمَّ خَالَفَہٗ قَلْبِیْ (اے اللہ تو میرے اس عمل کو بخش دے جس کے ذریعہ میں نے تیرا قرب ڈھونڈنا چاہا مگر میرے دل نے اس کی مخالفت کی)۔

یہ سارا کلام نہج البلاغہ میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے،

دوسری دلیل :- یہ کہ امام کو چاہیئے کہ اس نے کبھی کفر نہ کیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا اور کافر ظالم ہے کیونکہ فرمایا ہے وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (اور کافر ہی ظالم ہیں) یا ارشاد فرمایا اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (بے شک شرک بڑا ظلم ہے) اور سوائے حضرت امیر کے سب نے بت پرستی کی ہے لہذا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہ ہوگا اور آپ امامت کے لئے متعین ہوئے،

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ امامت کی یہ شرط نہ کسی شیعہ نے اپنی کتب کلامیہ میں لکھی ہے نہ کسی سنی نے نہ قرآن کی کسی آیت میں اس کا ذکر ہے، نہ کسی حدیث میں اس کا حوالہ ہے،

یہ صرف شیعی علماء نے حضرات خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کی امامت وخلافت سے انکار کرنے کے سلسلہ میں تراشی ہے اس کا وجود ان کے سینہ پر کینہ کے علاوہ کہیں نہیں ملتا،

ظاہر ہے کہ شرعی اور دینی امور میں سے کسی دینی امر میں کفر سابق کا کسی نہج اعتبار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایمان لانے کے بعد سو سال کا بوڑھا کافر اور پشتینی مسلمان جس کی ستر پشتیں اسلام پہ گزری ہوں دونوں برابر ہیں تو پھر اس میں یہ شرط کیوں ملحوظ رکھی جاتی اور آیت لاینال الخ سے اس جگہ استدلال مضحکہ خیز ہے اور مغالطہ دینے کی کوشش ناتمام کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ شرعی ریاست ظالم کو نصیب نہیں ہوتی اس لئے کہ عدل وانصاف امامت کبریٰ، قضا، احتساب اور عمارت تمام شرعی درجات میں شرط ہے تاکہ ان منصوبوں پہ فوائد مرتب ہوں اور امارت وریاست میں ظالم کا تقرر چند در چند فسادات کا باعث ہوتا ہے لہذا کفر وظلم اور امامت میں منافات ثابت ہوئی اور دو منافی و مخالف باتیں ایک ذات میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں علیحدہ زمانوں اور وقتوں میں جمع ہو سکتی ہیں،۔ چنانچہ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ بوقت امامت امام کے لئے یہ چاہیئے کہ وہ مسلمان ہو اور عادل ہو نہ یہ کہ اس نے امامت سے پہلے کفر وظلم نہ کیا ہو، اسی لئے اس شخص کو جو پہلے کفر میں مبتلا رہا ہو یا ظلم پیشہ ہو۔ ایمان لانے کے بعد اسے کافر وظالم کہنا نہ لغت وعرف میں اور نہ شرع میں ہرگز جائز نہیں۔

اور اصول میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جس میں مبداء فی الحال قائم ہو اس پہ مشتق کا اطلاق حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز اور وہ مجاز بھی مطرد نہیں کہ ہر جگہ ہو جو موقع مشہور ومعروف ہوں وہیں ان کو بولنا چاہیئے جیسا کہ اپنے مقام پہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ مجاز ہر جگہ استعمال نہیں ہوتا ورنہ پھر انسان کے علاوہ ہر طویل کو کھجور کا تنہ کہہ سکیں گے، اور ہر بوڑھے کو بچہ! یہ بڑا سخت مغالطہ ہے۔ اسی طرح سونے والے کو

جاگنے والا غنی کو فقیر، پیٹ بھرے کو بھوکا، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کہہ سکیں گے۔

علماء حنفیہ میں سے ابو الحسن زاہد نے معالی العرش الی معالی الفرش میں ایک طویل حدیث میں کہا ہے،

اِنَّ اَبَا بَکْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم بِمَحْضَرٍ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَعَیْنِكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَمْ اَسْجُدْ لِصَنَمٍ قَطُّ فَنَزَلَ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْهِ السلام وَقَالَ صَدَقَ اَبُوْ بَكْرٍ۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ آپ کی عمر کی قسم میں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا اسوقت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا کہ ابو بکر نے سچ کہا۔

اہل سیر و تواریخ نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے کبھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ لہٰذا الحمد للہ کہ اس شرط کی رو سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت پر بھی اجماع ہوا۔

تیسری دلیل :- یہ کہ امام کی امامت نص سے ثابت ہونی چاہیئے اور نص سوائے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کسی کے حق میں نہیں۔ لہٰذا آپ کے علاوہ کوئی امام نہ ہوگا۔

یہاں بھی صغریٰ و کبریٰ دونوں ناقابل تسلیم ہیں۔ صغریٰ تو اس لیے کہ امیر المومنین کا کلام بابت مشورہ ابھی گزرا ہے، اس کا آخری جز یہ ہے فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَسَمَّوْهُ اِمَامًا كَانَ لِلّٰهِ رِضًى (مشورہ کا حق مہاجرین و انصار کو ہے وہ اگر کسی شخص کو چن کر اس کو امام کہیں تو یہ رضائے الٰہی اور خوشنودی رب کا ذریعہ ہوگا۔)

اور کبریٰ اس سبب سے ناقابل تسلیم ہے کہ اگر کوئی نص وارد ہوئی تو وہ قرآن میں ہوتی یا حدیث میں اور ہر دو کا حال پورا معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایسی نص نہیں ہے اور پھر یہ بھی بات قابل لحاظ ہے کہ نص اگر وارد بھی ہوتی تو لامحالہ متواتر ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اصول اور بنیادی عقائد میں خبر واحد کا کوئی اعتبار نہیں اور کوئی جانتا نہ جانتا اہل بیت کرام اس سے ضرور واقف ہوتے حالانکہ وہ اس کا انکار فرماتے ہیں،

اور اگر نص وارد ہوتی تو بھی اماموں کے حق میں ہوتی جب کہ حال یہ ہے کہ ہر امام کی وفات کے بعد ان کی اولاد دعوائے امامت میں باہم مختلف ہوئی،

اگر نص ہوتی تو یہ اختلاف اور سر پھٹول کیوں ہوتی، اور کیوں ایک دوسرے کو ناحق اور نااہل بتاتے۔

اگر نص ہوتی تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ابلاغ کی دو صورتیں ہوتیں یا تو اس کو لوگوں کو بحد تواتر اس کی تبلیغ فرماتے، یا نہیں: پہلی صورت میں وہ حاملین نص (جن کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ علم ہوگیا) موقع آنے تک یا تو اسے چھپائے رکھتے یا ظاہر کر دیتے دوسری شق لامحالہ بالاجماع باطل ہے (کہ وہ اگر تھی تو ظاہر نہیں ہوئی اور پہلی شق ہو تو پھر وہ تواتر سے اعتماد اٹھا دیتی ہے۔ اور متواترات میں کذب کا دخل لازم آتا ہے اور نبی کریم کی تبلیغ کی دوسری صورت میں کہ آپ اس کو حد تواتر تک نہ پہنچائیں مکلفین سے حجت اٹھ جاتی ہے اور نص کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے، بلکہ نعوذ باللہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ترک تبلیغ کا الزام آتا ہے،

چوتھی دلیل :- کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ ہمیشہ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ستم رسیدہ رہے اور ان سے شاکی رہے اور خود کو ہمیشہ مظلوم و مقہور ہی ظاہر فرمایا اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ آپ سے امامت چھین لی گئی تھی تو امامت آپ کا حق ہوئی نہ کسی اور کا کیونکہ آپ کی صداقت کو سب بالاجماع مانتے ہیں،

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایات بھی اس لئے ناقابل تسلیم ہیں کہ اہل سنت کو تلاش و جستجو کے باوجود ان روایات کا کوئی اتہ پتہ کھوج سراغ نہیں مل سکا بلکہ اس کے برخلاف ایسی متواترہ حدیثوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے جو ان میں باہم موافقت و خیر خواہی، دعا و ثنا، اور ایک دوسرے کی طرف مدد و تعاون کا ہاتھ بڑھانا ثابت کرتی ہیں،

اس سلسلہ میں امامیہ کی روایات دو طرح کی ہیں۔ ان میں اکثر اہل سنت کی روایات سے موافق ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے حین حیات ان کے موافق، و خیر اندیش و ہمدرد رہے اور کبھی اپنے نیک مشوروں سے دریغ نہ کیا۔ چنانچہ خلیفہ ثانی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ کا قصہ بحوالہ نہج البلاغہ صفحات ماسبق میں بیان ہو چکا ہے۔

اسی طرح ان حضرات ثلاثہ کی وفات کے بعد بھی آپؓ ان کے ثناخواں رہے اور ان کے اعمال کو سراہتے رہے ان کی بھلائی، عافیت اور نجات پر شہادت دیتے رہے۔ جیسا کہ ﷲ در ابی بکر والی عبارت کا پورا خطبہ جو بحوالہ نہج البلاغہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہوا اس پر صاف اور واضح دلالت کرتا ہے،

اور شیعوں کی بہت سی روایات، اہل سنت کی روایات کے خلاف بھی ہیں، لہٰذا اہل سنت نے متفق علیہ روایات کو لے لیا اور مختلف فیہ کو جن کو شیعہ حضرات اپنے راویوں کے کچے چٹھے سے واقف ہونے کے باوجود روایت کرتے ہیں نظر انداز کر دیا، کیونکہ شیوۂ عقلا و دانشمنداں یہی ہے کہ وہ متفق علیہ کو لیتے اور مختلف فیہ سے کنارہ کش رہتے ہیں،

اس سلسلہ کی شیعی روایات نہج البلاغہ، کشف الغمہ اور صحیفہ کاملہ سے اوراق ماسبق میں کافی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں، رہیں اہل سنت کی روایات تو وہ بھی اس سلسلہ میں حد و شمار سے باہر ہیں،

اب ہم کتاب الموافقہ ابن سمان سے جو اسی مقصد کے تحت تصنیف ہوئی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں ایک روایت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جو معاملہ امامت زیر بحث کی پوری وضاحت کرتی ہے اگر کوئی ماہر لسان عرب حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی اس عبارت کو اس عبارت سے جو نہج البلاغہ کی روایت میں ہے ملائے اور موازنہ کرے تو اس میں سر مو فرق نہ پائے گا۔ یہ ہمارا ذمہ ہے،

اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام میں کوئی بناوٹ نہیں کر سکتا۔ اس کو جانچنے اور دیکھنے کے لئے البتہ عربی میں مہارت اور متکلم کے بارے میں سلیقہ شناسی ضرور درکار ہے یہ نہیں کہ عربی لغات سے اجنبی محض بلاغت کلام سے متاثر ہو کر فریفتہ ہو جائے، اور اسے پرکھ اور تمیز کا مادہ نصیب نہ ہو،

رَوَی الْحَافِظُ اَبُوْ سَعْدِ بْنُ السَّمَّانِ وَغَیْرُہٗ مِنَ الْمُحَدِّثِیْنَ اَیْضًا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِیْلِ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّہٗ لَمَّا قُبِضَ اَبُوْ بَکْرِ الصِّدِّیْقُ وَسُجِّیَ عَلَیْہِ ارْتَجَّتِ الْمَدِیْنَۃُ بِالْبُکَآءِ کَیَوْمِ قُبِضَ فِیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَآءَ عَلِیٌّ بَاکِیًا مُسْتَرْجِعًا وَّھُوَ یَقُوْلُ اَلْیَوْمَ انْقَطَعَتْ خِلَافَۃُ النُّبُوَّۃِ فَوَقَفَ عَلٰی بَابِ الْبَیْتِ الَّذِیْ فِیْہِ اَبُوْ بَکْرٍ سُجِّیَ فَقَالَ رَحِمَکَ

ترجمہ: حافظ ابو سعید بن سمان اور دوسرے محدثین نے بھی محمد بن عقیل بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور آپ کو چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ تو پورا مدینہ آہ و بکا سے لرز اٹھا اور وہی کیفیت لوگوں پر طاری تھی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت پیش آئی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ با چشم گریاں بر زبان انا للہ تشریف لائے اور کہنے لگے آج

اللہ یا ابا بکر کنت الف رسول اللہ وانیسہ
ومستراحہ وثقتہ وموضع سرہ ومشاورتہ
کنت اول القوم اسلاما واخلصھم ایمانا و
اشدھم یقینا واخوفھم للہ واعظمھم غناء فی دین
اللہ عز وجل واحوطھم لرسولہ واشفقھم علیہ و
احدبھم علی الاسلام وایمنھم علی اصحابہ واحسنھم
صحبۃ واکثرھم مناقب وافضلھم سوابق وارفعھم
درجۃ واشبھھم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ھدیا وسمتا ورحمۃ وفضلا وخلقا واشرفھم عندہ
منزلۃ واکرمھم علیہ واوثقھم عندہ جزاہ اللہ
عن الاسلام وعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وعن المسلمین خیرا کنت عندہ بمنزلۃ السمع و
البصر صدقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین
کذبہ الناس فسماک اللہ فی تنزیلہ صدیقا
فقال عز من قائل والذی جاء بالصدق وصدق
بہ اولئک ھم المتقون فالذی جاء بالصدق
محمد صلی اللہ علیہ وسلم وصدق بہ ابوبکر و
آسیتہ حین بخلوا وقمت معہ عند المکارہ حین
عنہ قعدوا وصحبتہ فی الشدۃ احسن الصحبۃ ثانی
اثنین وصاحبہ فی الغار والمنزل علیہ السکینۃ
ورفیقہ فی الھجرۃ وخلیفتہ فی دین اللہ عز وجل وفی
امتہ احسنت الخلافۃ حین ارتد الناس وقمت
بالامر ما لم یقم بہ خلیفۃ نبی نھضت حین وھن
اصحابک وبرزت حین استکانوا وقویت حین ضعفوا
ولزمت منھاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی
اصحابہ اذ کنت خلیفۃ حقا ولم تنازع ولم تقدع
برغم المنافقین وکبت الکاذبین وکرہ الحاسدین
وصغر الفاسقین وغیظ الباغین قمت بالامر حین
فشلوا ونطقت حین تعتعوا ومضیت بنور اللہ اذ وقفوا

نبوی خلافت کا خاتمہ ہوگیا، پھر اس گھر کے دروازہ پر جس میں
حضرت ابوبکر ملفوف تھے کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے اے
ابوبکر اللہ تم پر رحم فرمائے تم رسول اللہ کے مسکن الفت و انس
راحت و اعتماد تھے اور آپ کے اسرار کی قرار گاہ آپ کی امت
میں تم اسلام سے مشرف ہونے والے پہلے فرد تھے ایمان میں
سب سے زیادہ پر خلوص، تقویٰ میں سب سے زیادہ مضبوط
سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے سب سے زیادہ
اللہ کے دین کی مدد پر کمر بستہ، ان کے رسول کا سب سے
زیادہ لحاظ کرنے والے، ان پر ان سب سے زیادہ شفیق
سب سے زیادہ اسلام کے غمخوار، ان کے اصحاب کے لئے
سب سے زیادہ، قابل بھروسہ، باعتبار صحبت سب سے
زیادہ محبوب تر، فضیلتوں میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے
باعتبار سبقت سب سے افضل، باعتبار درجہ سب سے
بالاتر، سب سے زیادہ رسول اللہ سے مشابہ باعتبار طرز و
روش، رحمت و بزرگی میں، عادت و خصلت میں رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ میں اشرف
ان سے زیادہ باعزت آپ کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ
میں اشرف ان سے زیادہ باعزت آپ کے نزدیک سب سے
زیادہ قابل بھروسہ آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ ان کو اسلام
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی طرف سے جزائے
خیر عطا فرمائے،

تم ان کے لئے کان اور آنکھ کی طرح تھے، جب لوگوں نے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو تم نے تصدیق
کی اسی لئے قرآن میں تمہارا نام صدیق رکھا ایس فرمایا صاحب
عزت نے، یہ قول، جو سچ بات لایا۔ اور جس نے اس کی
تصدیق کی وہ سب تقویٰ والے ہیں،

تو سچ بات لانے والے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور
جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ابوبکر ہیں۔

تم نے رسول اللہ کے ساتھ اس وقت ہمدردی کی

فاتبعوك فنهضوا وكنت اخفضهم صوتاً واعلاهم فوتاً واقلهم كلاماً واصوبهم منطقاً واطولهم صمتاً وابلغهم قولاً واكبرهم رأياً واشجعهم واعرفهم بالامور واشرفهم عملاً كنت والله للدين يعسوباً اولاً حين نفر الناس عنه واخراً حين فشلوا كنت للمؤمنين اباً رحيماً اذ صاروا عليك عيالاً تحملت اثقال ما ضعفوا عنه ورعيت ما اهملوا واحفظت ما اضاعوا وعلوت اذ هلعوا وصبرت اذ جزعوا وادركت اوطار ما طلبوا ورجعوا الى رشدهم برأيك فظفروا ونالوا بك ما لم يحتسبوا وجليت عنهم فابصروا وكنت على الكافرين عذاباً صباً وللمؤمنين رحمة وانساً وحصناً فطرت والله بعبابها وفزت بحبابها وذهبت بفضائلها وادركت سوابقها لم تفلل حجتك ولم تضعف بصيرتك ولم تجبن نفسك ولم يزغ قلبك كالجبل لا تحركه العواصف ولا يزيله القواصف كنت كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امن الناس عليه في صحبتك وذات يدك وكما قال ضعيفاً في بدنك قوياً في امر الله متواضعاً في نفسك عظيماً عند الله جليلاً في اعين المؤمنين كبيراً في انفسهم لم يكن لاحد فيك مغمز ولا لقائل فيك مهمز ولا لاحد فيك مطمع الضعيف الذليل عندك قوي عزيز حتى تاخذ بحقه والقوي العزيز عندك ضعيف ذليل حتى تاخذ منه الحق القريب والبعيد عندك سواء اقرب الناس اليك اطوعهم لله واتقهم له شانك الحق والصدق والرفق وقولك حكم وحتم وامرك حلم وحزم ورأيك علم وعزم فابلغت والله لهم السبيل وسهلت العسير واطفأت النيران واعتدل بك الدين وقوي الايمان وثبت الاسلام والمسلمون

جب لوگوں نے ان سے جان چرائی تم نے ان کی مصیبتوں میں اسوقت پشت پناہی کی جب لوگ ان کی مدد سے بیٹھ رہے تھے تم سختی کے زمانہ میں آپ کے اچھے ساتھی بنے رہے، تم دو میں کے دوسرے اور غار میں ان کے ساتھی تھے جس پہ سکینت اتری تم ہجرت میں ان کے رفیق تھے اللہ عز و جل کے دین اور آپ کی امت میں تم ان کے خلیفہ تھے جب لوگ مرتد ہوگئے تو تم نے خلافت کے امور بہترین انداز میں نبھائے اور امور ریاست کو ایسا سنبھالا کہ کسی نبی کے خلیفہ کے ہاں اس کی مثال نہیں، جب تمہارے ساتھی سست پڑے تو تم مضبوطی کے ساتھ قائم رہے جب وہ تھک گئے تو تم سامنے آئے جب انہوں نے کمزوری دکھائی تو تم نے قوت کا مظاہرہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں تم رسول کے راستہ پر رہے اس لئے کہ تم خلیفہ برحق تھے نہ تم نے کسی سے جھگڑا کیا نہ کوئی تمہارے مقابل آیا منافق ناخوش کافر ذلیل، حاسد رنجیدہ، فاسق خوار، باغی گمراہ رہے جب لوگوں نے بزدلی دکھائی تم نے کام سنبھالا جب لوگ گنگ ہوگئے تو تم ہی بولے جب اور لوگ کھڑے رہ گئے تو تم چل نکلے، اس لئے سب نے تمہاری پیروی کی تو ہدایت پائی، تم پست آوازی میں سب سے زیادہ اور پیش روی میں سب سے بلند، ان سے زیادہ کم گو، ان سے زیادہ راست گو ان سے زیادہ سکوت پسند ان سے زیادہ گفتگو میں اثر انداز رائے و بندگی میں سب سے بڑھ کر کاموں کی انجام دہی میں سب سے زیادہ بہادر کاموں کو ان سے زیادہ پہچاننے والے ان سے زیادہ کام میں شرافت پسند، اللہ کی قسم تم پیشوائے دین تھے اول جب لوگ اس سے بھاگے اور آخر میں جب لوگ بزدل ہوئے، تم مومنوں کے لئے شفیق باپ کی طرح تھے جب وہ بال بچوں کی طرح تمہارے سایہ عاطفت میں آپڑے تو تم نے ان کے کمزوروں کا وہ بوجھ اٹھایا جس کو وہ نہ اٹھا سکے جس کی وہ حفاظت نہ کر سکے اس کی تم نے حفاظت کی

فَظَهَرَ أَمْرُ اللهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ فَسَبَقْتَ وَاللهِ سَبْقًا بَعِيْدًا وَأَتْعَبْتَ مَنْ بَعْدَكَ إِتْعَابًا شَدِيْدًا وَفُزْتَ بِالْخَيْرِ فَوْزًا عَظِيْمًا فَجَلَلْتَ عَنِ الْبُكَاءِ وَعَظُمَتْ رَزِيَّتُكَ وَهَدَّتْ مُصِيْبَتُكَ الْأَنَامَ فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ،

جس کو انہوں نے ضائع کیا اس کی تم نے نگہبانی کی جب وہ مصیبت سے بے قرار ہوئے تو تمہاری بیقراری ان سے بھی زیادہ رہی، جب وہ دل چھوڑ بیٹھے تو تم صبر پر ڈٹے رہے۔ وہ جو ڈھونڈتے رہے اور نہ پایا تم نے اسے پا لیا تم نے اپنی رائے سے ان کی رہنمائی کی تو وہ کامیابی سے ہم کنار ہوئے اور تمہارے طفیل ان کو وہ کچھ ملا جس کا ان کو وہم گمان بھی نہ تھا۔ تم نے ان پر ہر چیز ایسی واضح کی کہ ان کو بینائی مل گئی تم کافروں پر اک عذاب تھے تو مومنوں کے لئے سراپا رحمت و انس اور فراخی؛ اللہ کی قسم تم ان مراتب کی بلندی پر اڑے رہے پھر اس کے قرب سے کامیاب ہوئے تم نے برگزیدہ درجے حاصل کئے اور ان سے آگے کے مراتب پائے۔ نہ تمہاری حجت کمزور رہی نہ تمہاری سوجھ بوجھ میں ضعف آیا۔ نہ تمہارا نفس بزدل ہوا، نہ تمہارا دل بہکا گویا تم ایک پہاڑ تھے جس کو نہ طوفان ہلا سکتا تھا، نہ ہوا کے جھونکے اس کو اپنی جگہ سے ڈگمگا سکتے تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تم زیادہ احسان کرنے والے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر اپنی رفاقت اور دولت نثار کرنے میں۔ اور آپ صلے اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق تم ضعیف بدن مگر اللہ کا حکم بجالانے میں قوی تر۔ نفس میں تواضع پسند، اللہ کے نزدیک بلند، مومنوں کی نظر میں بزرگ، ان کے دلوں میں باوقعت کسی کو تم پر طعن کرنے کی نہ تاب و مجال اور نہ کسی کہنے والے کو تمہارے بارے میں ناز یبا گفتگو کرنے کی ہمت نہ کسی کو طمع کا ایسا موقع کہ تم پر قابو پا سکے کمزور ذلیل تمہارے نزدیک قوی و عزیز تھے جب تک ان کا حق نہ دلا دیتے اور قوی و عزیز تمہارے نزدیک کمزور و ذلیل تھے تا وقتیکہ تم اس سے کسی کا حق نہ لے لیتے دور و نزدیک تمہارے لئے برابر تھے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کا زیادہ مطیع تھا وہی سب سے زیادہ تمہارے قریب تھا تمہارا کام حق پرستی راست گوئی اور نرمی تھا۔ اور تمہارا قول حکمت آمیز، دلنشین اور مضبوط، اور تمہارا حکم بردباری اور دانائی پر مبنی تھا، پس اللہ کی قسم تم نے ان کو راہ راست پر لگایا ان کے مشکل راستوں کو آسان بنایا۔ فتنہ کی آگ بجھائی تمہاری وجہ سے دین ٹھیک ہو گیا اور ایمان طاقتور اسلام اور مسلمان نے اپنے قدم جما لئے احکام الٰہی ظاہر ہوئے گو کافر اس پر کڑھے، اللہ کی قسم تم بہت آگے بڑھ گئے اور اپنے بعد والوں کو تھکا مارا تم نے کھلم کھلا بھلائی حاصل کی اور تم اس سے بالاتر ہو کہ تم پر کوئی روئے اگر تمہاری جدائی کی مصیبت بہت سنگین ہے اور اس نے لوگوں کو جھنجوڑ ڈالا ہے، إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فصیح و بلیغ خطاب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ستائش میں ہے گویا آپ کی طرف سے ہدیہ تحسین و عقیدت کا اظہار انتہائی بلند معیار سے اظہار ہے،

اگر آپ کے ان تمام خطبات و کلمات کو جو آپ نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں ارشاد فرمائے اور جو اہل سنت کی کتب میں بطریق وثوق و عدالت، بلکہ بطریق تواتر و شہرت منقول ہیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور ایک مستقل دفتر رضی کی نہج البلاغہ کے برابر مرتب ہو سکتا ہے،

ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں یہ سوال اٹھے کہ شکایت و ظلم سے متعلق جو روایات شیعہ کتب میں مروی ہیں اگر ان سب کی سب کو ان کے پیشواؤں کی من گھڑت اور بناوٹی کہا جائے تو یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ اتنی بڑی جماعت

ساری کی ساری جناب امیر پر افتراء باندھنے پر تل جائے۔ لہذا اس میں کہیں نہ کہیں، کوئی غلطی لگی ہے، آخر وہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات اوراق ماسبق میں گزر چکی ہے کہ ان کے ناسمجھ راویوں نے تجسیم و بداء وغیرہ میں ائمہ پر جھوٹ تھوپا ہے۔ اور ائمہ نے ان کی تکذیب کی ہے۔ حالانکہ عقائد الہیہ کا رتبہ کہاں اور عقائد صحابہ کہاں البتہ ان روایات کی تکذیب بھی دوسرے شیعوں کے ذریعہ ان تک پہنچی لیکن مسائل متعلق صحابہ کے سلسلہ میں تو کوئی تکذیب ان تک نہیں پہنچی اگر پہنچی بھی ہو تو ان کے خیال میں اس کی تکذیب صراحت سے نہ آئی ہو، جیسا کہ نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کے حوالہ سے سب کچھ تفصیلا بیان ہو چکا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب چونکہ صحابہ سے بغض رکھنے اور ان کے متعلق عقائد بد رکھنے میں متفق الخیال ہیں، اس لئے وہ تکذیب کی روایت کر کے خود اپنی تردید کیونکر کرنے لگے، اس کو ظاہر کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی کیوں مارنے لگے۔ اس لئے یہ اپنے پچھلوں کے جھوٹ کو پالتے پوستے رہے بلکہ بلی کے گو کی طرح چھپاتے رہے اور یوں یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اس فرقہ کے متفق علیہ جھوٹ کی شکل اختیار کر گیا، اور یہ جھوٹ اتنے زور شور اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے بولا گیا کہ وہ ان کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا، کہ نگلے گا تو اندھا اگلے گا تو کوڑھی۔ یہ جھوٹ ان کی زندگی و موت کا مسئلہ بن گیا اور اپنے ہاتھ سے کون اپنی قبر کھودنے لگا) اور عقائد الہیہ سے متعلق جھوٹ ایسا نہیں اس لئے اس کے متعلق دونوں کی طرح روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اس لئے دونوں طرح کی روایت ملتی ہیں،

اس کے باوجود بھی ان سب کی غلطی کا ایک منشا بھی ہے وہ یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے وہ خطابات جو رضی نے نہج البلاغہ میں جمع کئے ہیں ان میں اور دوسرے خطبوں میں جو جناب امیر کی صحیح مراد کو ظاہر کرتے ہیں اور شیعوں کے خیال و گمان کی تردید کرتے ہیں، جن کو حذف اور ساقط کیا۔ مثلاً یہی خطبہ مذکورہ بالا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ستائش میں گزرا اس میں جناب امیر قریش کی شکایت فرماتے ہیں، اور ان کے حق میں بددعا فرماتے ہیں مگر یہ فرقہ اپنی بدگمانی اور دلی بغض کے سبب سمجھتا ہے کہ ان قریش سے خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم مراد ہیں اور ان کے مددگار، حاشا و کلا ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ آپ کا اشارہ ان نوجوانان قریش کی طرف ہے جن کا شمار صحابہ کرام میں نہ تھا بلکہ خلیفہ اول و دوم کے عہد خلافت میں یہ سن بلوغ و عمر تمیز تک بھی نہ پہنچے تھے اور عہد امیر المومنین میں عقل و رشد ناقص حاصل کیا اور بڑے بڑے کاموں میں دخل در معقولات کرنے لگے اور انہوں نے جناب امیر اور آپ کے رفیقوں دوستوں مثلاً حضرت طلحہ حضرت زبیر اور ام المومنین رضی اللہ عنہم میں شکر رنجیاں اور ناراضگیاں پیدا کیں اور ایک بڑے زبردست فساد برپا کرنے کا سبب بنے اور پھر خود آنجناب کی مدد و معاونت سے بھی دستکش ہو گئے اور آپ کے اوامر و نواہی ماننے سے بھی منکر ہو کر بیٹھ رہے اور سستی کا مظاہرہ کیا۔ اور یہ ان کی ہی روش سے ہوا کہ مخالف کے لشکر سارے شہروں پر قابض ہو گئے اور جناب امیر کا اقتدار صرف کوفہ عراق اور خراسان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے کشتگان جنگ جمل پر گزر کیا تو ان میں عبدالرحمن بن عتاب ابن اسید جو ام المومنین رضی اللہ عنہا کے طرفداروں میں سے تھے کو کشتہ دیکھا تو آپ نے صد درجہ افسوس کا اظہار فرمایا اور رو کر یوں فرمایا۔ هٰذَا يَعْسُوْبُ قُرَيْشٍ ثُمَّ قَالَ جَدَعْتُ اَنْفِيْ وَ شَفَيْتُ نَفْسِيْ، (یہ قریش کا سردار ہے میں نے اپنی ناک کاٹ لی اور اپنے آپ کو تسلی دی)۔

شیعوں کا حالت یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام کو اپنے معتقدات اور اپنے گمراہ پیشواؤں کے جذبات

پر ڈھال لیتے ہیں، بلکہ آیات و احادیث کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں تو اس بیماری کا کیا علاج ہے ورنہ یہ تو قیامت تک بھی ممکن نہیں کہ صحابہ کرام جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں،

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا، — اور ان کو تقویٰ کی ملت پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق بھی ہیں، اور اہل بھی،

(۲) اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ — وہ کافروں پر سخت اور مومنوں پر مہربان :

(۳) حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ — اللہ تعالیٰ نے تمکو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق و عصیان سے تم کو نفرت دے دی،

ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت یا آپ کے خاندان کی ایذا رسانی سرزد ہوسکے اگر کسی کا یہ عقیدہ ہوگا تو وہ قرآن وحدیث متواترہ کی تکذیب کا مرتکب ہوگا،

پانچویں دلیل :- حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے امامت کا دعویٰ بھی کیا اور بطور تائید معجزہ بھی دکھایا مثلاً خیبر کا دروازہ اکھاڑنا چٹان کو اٹھا لینا۔ یا جنوں سے جنگ ومقاتلہ کرنا اور سورج کو لوٹا لانا اس لئے وہ اپنے دعوے میں سچے ہوں گے اور امام ہوں گے،

ان لوگوں کا یہ کلام اہل سنت کے اس استدلال سے ملتا جلتا ہے جو وہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں پیش کرتے ہیں، مگر یہ مشابہت صرف اسلوب بیان میں ہے مقدمات کی صحت میں نہیں ہے

اول تو اسی میں کلام ہے کہ امامت کا اثبات معجزہ سے ہوتا ہے کیونکہ معجزہ تو نبوت کے ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے، امامت، قضا، احتساب، افتاء، اجتہاد، کسی کی سلطنت، لشکر کی امارت اور وزارت یا دیگر شرعی عہدوں کے لئے نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے ہوتی ہے، اس لئے اس کا اثبات معجزہ کی شکل میں خدا کی طرف سے تصدیق کئے بغیر ممکن نہیں۔ بخلاف امامت کے کہ وہ نبی کے فرمان اور آپ کے سونپنے سے ثابت ہوتی ہے،

پھر یہ بات بھی ہے کہ معجزہ سے نبوت کا ثبوت بھی محض عادت الٰہی کی بناء پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں ہے، ان کے علاوہ کسی سے متعلق بھی یہ عادت نہیں رہی اس لئے اس کی دلالت بھی انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص رہے گی،

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص مدعی بن کر کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا دعویٰ دائر کرے اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش کرے تو شرعاً اس کا یہ ثبوت بالکل معتبر نہیں کیونکہ شریعت میں ثبوت دعویٰ کا ایک طریقہ گواہ وشاہد ہے معجزہ کا اظہار نہیں، یہی حال تمام دعاوی اور معاملات کا ہے۔ جب امامت بھی پیغمبر علیہ السلام کے متعین کرنے یا ارباب حل وعقد کے انتخاب سے وجود میں آئی ہو تو اس پر معجزہ کس طرح دلیل بن سکے گا،

دوسرے یہ بات بھی غلط ہے کہ تینوں خلفاء کے زمانہ میں آپ نے امامت کا دعویٰ کیا جبکہ خود امامیہ کی روایات بھی افراد قرار دے کر تردید کرتی ہے۔ اور تقیہ کا واجب سمجھنا بھی اس کو باطل قرار دیتا ہے اور آنحضرت صلے اللہ

علیہ وسلم کی اس پر سکوت کی وصیت اس دعوے کے سراسر منافی ہے، اور یہ سب امور امامیہ کے نزدیک آسمان سے نازل ہونے والی وحی کی طرح ثابت ہیں،

تیسرے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے خوارق عادات اور کرامات کا صدور و ظہور بالکل قابل تسلیم ہے لیکن یہ امر تو خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم نیز دیگر صحابہ و اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے بھی بطریق تواتر و شہرت ثابت ہے، رہا باب خیبر کا قصہ تو یہ واقعہ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کا ہے، اس وقت امامت کے دعوی کا امکان اور گنجائش ہی کہاں!

اب رہی جنات سے لڑائی تو کتب اہل سنت سے تو اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا یہ محض شیعوں کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق کے لئے روانہ ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام نے راستہ میں خبر دی کہ فلاں کنوئیں میں جن اکٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے لشکر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کو بھیجا اور آپ نے ان کو قتل کیا"!

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو بھی معجزہ تو یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا ہوگا البتہ کرامت جناب امیر کی ہوگی مگر جس وقت امامت کا وجود ہی نہ تھا تو اس کے لئے یہ شہادت کیسی، کیونکہ معجزہ کے لئے دعوی کی شرط بالاجماع ہے، علی بن عیسیٰ اردبیلی نے کشف الغمہ میں لکھا ہے کہ یہ مقاتلہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھا، تو اس سے معاملہ ہی صاف ہوگیا کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اور چٹان کے اٹھا لینے والی بات کا بھی اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں صرف شیعہ امامیہ اور زیدیہ کی کتابوں میں اس کی روایت ملتی ہے، اخطب خوارزم جو زیدی ہے اپنی کتاب میں یوں بیان کرتا ہے کہ "جناب امیرؓ جب جنگ صفین کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں ساتھیوں کو سخت پیاس لگی مگر پانی آس پاس دستیاب نہ تھا جناب امیر نے اس وادی میں واقع ایک گرجا کے قریب اشارہ فرمایا یہاں کھدائی کرو دوران کھدائی سامنے ایک چٹان آگئی جس کو اکھاڑنے اور ہلانے سے سب عاجز آگئے، تو اس کی اطلاع آپ کو دی گئی چنانچہ آپ خود اس گڑھے میں اترے اور اس چٹان کو وہاں سے اٹھا کر دور پھینک دیا اس کے نیچے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ نکل آیا ساری فوج نے وہ پانی پیا اور خوب سیراب ہوئے۔ جب گرجا کے راہب نے یہ کرشمہ دیکھا تو ایمان لے آیا۔ اور کہنے لگا کہ ہم نے اپنی پرانی کتابوں میں لکھا دیکھا ہے، کہ ایک شخص ان ان اوصاف کا اس گرجا کے قریب پڑاؤ کرے گا اور اس چٹان کو اٹھالے گا وہ دین حق پر ہوگا۔

اس کلام کا حاصل بس اتنا ہی تو نکلا کہ اگر یہ کرامت ثابت بھی ہو تو آپ کی اور کرامتوں کی طرح یہ بھی ایک کرامت ہوگی امامت کے دعوے کا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں، نہ اہل شام کے مقابلہ میں یہ قصہ پیش آیا اگر ایسے موقعہ پر یہ واقعہ پیش آتا بھی تو وہ اہل سنت کے لئے راحت قلب ہوتا شیعوں کے دعوے سے اس کو کیا تعلق ہوتا کیونکہ اس وقت تو بالاجماع جناب امیرؓ کی امامت، امامت حق تھی۔ اور مد مقابل مخالف اور ناحق!

اور رہا سورج کا لوٹنا تو اکثر محدثین (رحمہم اللہ) جو اہل سنت ہیں مثلاً طحاوی وغیرہ نے اس قسم کی روایت کو صحیح تسلیم کیا ہے اور یہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا بلاشبہ ایک معجزہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی نماز عصر فوت ہونے کے اندیشہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعا سے یہ واقعہ پیش آیا۔ تو آپ نے نماز عصر ادا فرمائی۔ اس وقت

امامت کا دعویٰ کہاں تھا، اور کون ان کا مخالف اور منکر تھا،

چھٹی دلیل ۱:- یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی موافق یا مخالف نے کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی جس میں آپ پر طعن، و قدح ذاتی طور پہ وارد ہوتا ہو، بخلاف خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے ان کے بارے میں موافق و مخالف ہر دو نے ایسی بہت سی روایات بیان کی ہیں جو ان کی ذات میں قدح و برائی کا سبب ہیں اور ان کے استحقاق امامت کو سلب کرتی ہیں، لہذا جناب امیر جو امور مخالفت امامت سے بری اور صاف ہیں امامت کے لئے مخصوص ہوئے،

اس دلیل میں عجیب انداز کی گڑبڑ اور مغالطہ آمیزی کی گئی ہے، اس لئے کہ اہل سنت اور معتزلہ جو ان تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم کی امامت کے قائل اور موافق ہیں، ان سے ہرگز کوئی ایسی روایات مروی نہیں، جو ان حضرات کی خردہ گیری ظاہر کرتی ہو، رہے شیعہ تو وہ چونکہ ان حضرات ثلاثہ سے بغض و عناد شدید رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے ضرور اپنی روایات میں ان کو نشانۂ ملامت و طعن بنایا ہے۔ حالانکہ ان میں بھی کوئی طعن کی بات نہیں، ہے آگے چل کر باب مطاعن میں ہم انشاء اللہ ان کا پول کھولیں گے،

اگر ان امور کو جو انہوں نے اپنی روایات میں طعن کا سبب بنایا ہے، موجب طعن مانیں تو لازم آتا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں بھی طعن و قدح پیدا کریں۔ بلکہ اگر کوئی شیعی کتب کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرے تو ان کو انبیاء کی شان میں طعن آمیز باتوں سے پُر اور بھری ہوئی پائے گا، اس بحث کا اچھا خاصہ حصہ تو اوراق ماسبق میں بیان بھی ہو چکا ہے،

اور ان کا یہ کہنا کہ جناب امیر کے بارے میں کسی موافق یا مخالف نے قادح و عیب روایت بیان نہیں کی دوسرا مغالطہ ہے، کیونکہ اہل سنت اگر مخالف ہیں تو یہ ان کا سفید جھوٹ ہے کیونکہ وہ تو آپ کی صحت امامت کے معتقد ہیں وہ تو مخالف ہیں ہی نہیں، وہ ایسی روایات بیان ہی کیوں کرنے لگے اور اگر مخالف سے مراد نواصب اور خوارج ہیں تو انہوں نے تو اس سلسلہ میں اتنے لمبے چوڑے افتراء اور طومار باندھے ہیں کہ ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے اور ایسی خرافات و لغویات بک کر اپنے منہ کالے کئے ہیں کہ ہم اس کتاب میں سوء ادب کے خیال سے ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتے لیکن معاملہ ایسی قوم سے بحث کا ہے جو لغویات و خرافات اور لعن طعن میں ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ تو نقل کفر کفر نباشد کے مصداق ان کی کتابوں سے بقدر قلیل بطور نمونہ یہاں درج کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ عبدالحمید ناصبی مغربی کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق طعن آمیز باتیں (مطاعن)، دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کی روایات میں نواصب تنہا ہیں، اہل سنت اور شیعہ دونوں ان روایات کا انکار کرتے ہیں، ایسی روایات نہ قابل اعتبار ہیں اور نہ ایسی کہ ان کی وجہ سے کوئی الزام عائد کیا جا سکے اس لئے کہ وہ محض افتراء اور جھوٹ و بہتان پہ مبنی ہیں۔ مثلاً قتل عثمان غنیؓ میں آپ کی شرکت، یا قذف حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا میں آپ کا حصہ لینا اور یہ آیت نازل ہونا۔

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُمْ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔ — ان منافقوں میں سے جو اس بہتان عظیم کا ذمہ دار بنا ہے اس کے لئے عذاب عظیم ہے،

دوسری قسم وہ جو اہل سنت اور شیعوں کی کتابوں میں سے جو اس بہتان عظیم کے ساتھ منقول و مروی ہیں،

اس قسم کے مطاعن واقعی قابل توجہ اور جواب طلب ہیں،
چنانچہ اہل سنت اور شیعہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ ان کے جوابات دیئے ہیں۔
شیعوں میں رضی نے "تنزیہ الانبیاء والائمہ" نامی کتاب میں۔ اور اہل سنت میں سے ابن حزم نے اپنی کتاب کتاب الفیصل میں۔ اس قسم کے بہت سے مطاعن کا جواب دے کر ان کا رد کیا ہے،
ان میں ایک یہ ہے کہ قتل عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے اموال و اسلحہ پر جناب امیرؓ خود قابض و متصرف ہو گئے ہر چند ان کے وارثوں نے مانگا مگر آپ نے نہ دیا۔ حالانکہ مسلمان کا مال کسی طرح حلال نہیں۔ چنانچہ ولید بن عقبہ نے اس بارے میں چند اشعار کہے ہیں،

(۱) اَلَا مَا لِلَّیْلِیْ لَا تَغُوْرُ کَوَاکِبُہٗ　　　اِذَا اٰفِلٌ نَجْمٌ لَاحَ نَجْمٌ یُرَاقِبُہٗ
(۲) بَنِیْ هَاشِمٍ رُدُّوْا سِلَاحَ ابْنِ اُخْتِکُمْ　　　لَا تَنْهَبُوْهُ لَا تَحِلُّ مَنَاهِبُہٗ
(۳) بَنِیْ هَاشِمٍ لَا تَعْجِلُوْا بِاِقَادَۃٍ　　　سَوَاءٌ عَلَیْنَا قَاتِلُوْهُ وَ سَالِبُہٗ
(۴) وَاِنَّا وَاِیَّاکُمْ وَمَا کَانَ مِنْکُمْ　　　کَصَدْعِ الصَّفَا لَا یَرْاَبُ الصَّدْعَ شَاعِبُہٗ
(۵) بَنِیْ هَاشِمٍ کَیْفَ التَّعَاقُدُ بَیْنَنَا　　　وَعِنْدَ عَلِیٍّ سَیْفُہٗ وَحَرَائِبُہٗ
(۶) لَعَمْرُکَ لَا اَنْسَی ابْنَ اَرْوٰی وَقَتْلَہٗ　　　وَهَلْ یَنْسَیَنَّ الْمَاءَ مَا عَاشَ شَارِبُہٗ
(۷) هُمْ قَتَلُوْهُ کَیْ یَکُوْنُوْا مَکَانَہٗ　　　کَمَا غَدَرَتْ یَوْمًا بِکِسْرٰی مَرَازِبُہٗ

(۱) خبردار! یہ میری رات کو کیا ہوا کہ اس کے ستارے ڈوبتے ہی نہیں جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کے مقابل دوسرا ستارہ ظاہر ہو جاتا ہے،
(۲) اے بنی ہاشم اپنے بھانجے کے ہتھیار واپس کر دو، اور ان کو نہ لوٹو مت ان کا لوٹنا جائز نہیں،
(۳) اے بنی ہاشم ہم سے جلد بازی نہ کرو ہمارے نزدیک ان کے قتل کرنے والے اور ان کو لوٹنے والے برابر ہیں،
(۴) ہم تم اور جو کچھ تمہاری طرف سے ہوا ہے پتھر کا وہ شگاف ہے جسے کوئی بھرنے والا بھر نہیں سکتا،
(۵) اے بنی ہاشم ہم میں اور تم میں صلح کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ علی کے پاس ان کا تیر و تلوار ہے،
(۶) تیری جان کی قسم میں نہ عثمان کو بھولوں گا اور نہ ان کے قتل کو اور کیا پانی کے پینے والا تا زندگی اس کو بھول سکتا ہے۔
(۷) انہوں نے اس کو اس لئے قتل کیا کہ اس کی جگہ لے لیں۔ جیسا کہ کسریٰ کے ساتھ ایک دن اس کے امیروں نے کیا تھا۔

ایک دوسرا طعن یہ کہ آپ نے امہات الاولاد (وہ باندیاں جن کے اولاد ہو جائے) کے بارے میں اپنے مختلف مذاہب ظاہر فرمائے اور کسی ایک پر نہیں جمے! پہلے ان کی فروخت کے قائل تھے، پھر عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں جب ان کی فروخت کے حرام ہونے پر اجماع ہوا تو آپ اس اجماع سے متفق ہو گئے۔ پھر اپنی خلافت کے زمانہ میں ان کی فروخت صحیح ہونے پر فتویٰ صادر فرمایا اسی لئے قاضی شریح نے آپؓ سے دو بدو گفتگو کی اور کہا: رَأْیُکَ فِی الْجَمَاعَۃِ اَحَبُّ اِلَیْنَا مِنْ رَأْیِکَ وَحْدَکَ (آپ کی وہ رائے جو جماعت کے ساتھ ہے ہمیں آپ کی

تمہاری رائے سے زیادہ پسند ہے) حالانکہ آپ نے خود یہ فرمایا تھا کہ اَلَا اِنَّ یَدَ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَغَضَبَ اللّٰہِ عَلٰی مَنْ خَالَفَہَا خبردار جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو اس کی مخالفت کرے اس پر اللہ کا غصہ ہے) اور قرآن میں یہ ارشاد موجود ہے،

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ (آخر آیت تک) لہٰذا آپ نے صاف طور پر اجماع کی مخالفت فرمائی ان مطاعن میں سے ایک اور یہ ہے کہ آپ نے دادا کے حصۂ وراثت میں مختلف فیصلے صادر فرمائے اور کسی پر بھی برقرار نہ رہے حالانکہ خود ہی یہ بھی ارشاد فرمایا مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّتَقَحَّمَ جَرَاثِیْمَ جَہَنَّمَ فَلْیَقُلْ فِی الْجَدِّ (جو جہنم میں جانے کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ مسئلہ جد میں کلام کرے) ان ہی میں سے ایک وہ ہے جس کی بخاری نے بایں الفاظ روایت کی ہے اِنَّ عَلِیًّا اُتِیَ بِزَنَادِقَۃٍ فَحَرَّقَہُمْ بِالنَّارِ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ زندیق لائے گئے تو آپ نے ان کو آگ میں جلوا دیا۔

یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بہت بری لگی اور جناب امیر کو بھی ندامت ہوئی،
آگ سے جلا دینے کا یہ قصہ شیعی کتب میں بھی موجود ہے شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں روایت کی ہے، اِنَّ عَلِیًّا حَرَّقَ رَجُلًا اَتٰی غُلَامًا فِیْ دُبُرِہٖ (جناب علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جس نے اغلام کیا تھا، جلوا دیا۔

حالانکہ حدیث لَا تُعَذِّبُوْا بِالنَّارِ (آگ سے عذاب نہ دو) کی صحت پر اجماع ہے!

ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے شراب پینے کی سزا میں بطور حد ایک شخص کے اسیٔ کوڑے لگوائے اور جب وہ مر گیا تو اس کی دیت (خون بہا) بھی ادا فرمادی اور فرمایا اِنَّمَا وَدَیْتُہٗ لِاَنَّ ہٰذَا شَیْئٌ فَعَلْنَاہُ بِرَاْیِنَا (ہم نے یہ خون بہا اس لئے دیا کہ یہ فعل ہم نے اپنی ذاتی رائے سے کیا تھا) حالانکہ خود عہد عمر رضی اللہ عنہ میں شراب کی حد کے سلسلہ میں آپ نے ہی ان کو مشورہ دیا تھا کہ اس حد میں اسی کوڑے ہونے چاہئیں اور دلیل یہ تھی کہ اِذَا سَکِرَ ہَذٰی وَاِذَا ہَذٰی اِفْتَرٰی (جب مستی چھائے گی تو اول فول بکے گا۔ اور جب بکواس کرے گا تو افترا باندھے گا) گویا آپ کو اپنے اجتہاد میں شک و تردد ہو گیا۔

ایک طعن یہ ہے کہ ولید بن عقبہ کے آپ نے چالیس کوڑے لگائے اور یوں آپ نے حد شرعی میں لحاظ مروت اور رواداری سے کام لیا۔ کیونکہ ولید بن عقبہ کا حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ سے رشتہ قرابت تھا۔

ایک طعن یہ ہے کہ ایک شخص پر اس کے اقرار کی وجہ سے حد قصاص لازم ہوتی تھی آپؓ نے وہ حد معاف فرما دی۔ حالانکہ یہ خلاف شرع ہے۔ حکم تو اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ (جان کا بدلہ جان) کا ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ مولاۃ حاطب پر رجم کرایا حالانکہ وہ کنیز (باندی) تھی جس پر رجم نہیں ہوتا۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مکاتب (قسم غلام) کے معاملہ میں آپ کو الزام دیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر غلام کے ذمہ زر مکاتبت میں سے ایک درہم بھی باقی ہے تو وہ پورا غلام باقی ہے، مگر جناب امیرؓ کا خیال تھا کہ وہ جتنی ادائیگی کر دیگا اس کے قدر آزاد ہو جائے گا۔ اور مابقی کے برابر غلام رہے گا جیسا کہ صحاح میں منقول ہے،

اور ایک طعن یہ ہے کہ پہلے تو آپ دو ہنچوں کے فیصلہ پر راضی ہو گئے پھر فرمانے لگے لَقَدْ عَثَرْتُ عَثْرَةً لَا أَجْبُرُ لَهَا وَسَوْفَ أَكِيسُ بَعْدَ هَا أَجْمَعُ الْأَمْرَ (میں نے ایسی ٹھوکر کھائی ہے، جس کی کوئی تلافی نہیں اب اس کے بعد بہت ہوشیاری سے کام لوں گا) حالانکہ پنچایت کا حکم ٹھکرانا جائز نہیں۔"

ایک طعن یہ بھی کہ بمطابق روایت شعبی إِنَّ عَلِيًّا قَطَعَ يَدَ السَّارِقِ مِنْ أُصُولِ الْأَصَابِعِ (حضرت علی نے چور کا ہاتھ انگلی کی جڑوں سے کاٹا) گویا آپ حد سارق سے ناواقف تھے، اور جو شخص اقامت حدود ہی سے ناواقف ہو وہ امامت کے لائق نہیں۔"

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے بچوں میں بعض کی بعض کے خلاف گواہی کو قبول فرمایا حالانکہ بات صاف صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ (اور گواہ بنالو، دو گواہ مردوں میں سے)

ایک طعن یہ ہے کہ آنکھ کی دیت میں، نصف دیت کا لینا، قصاص لینے والے کا نے (جس کی ایک آنکھ پھوڑ دی گئی ہو) کو مقرر فرمایا، حالانکہ حکم اَلْعَيْنُ بِالْعَيْنِ (آنکھ کے بدلے آنکھ) کا ہے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپؓ نے بچہ پر سرقہ کی حد جاری فرما دی جیسا کہ کتب شیعہ میں موجود ہے حالانکہ آپ نے خود روایت فرمائی ہے کہ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلٰثَةٍ عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَبْلُغَ (تین سے قلم اٹھا لیا گیا (یعنی وہ مکلف نہیں ہیں) بچہ سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے)

ان میں سے ایک یہ ہے جس کی روایت محمد بن بابویہ قمی نے الفقیہ میں کی ہے۔

أَنَّهُ جَاءَ رَجُلٌ إِلٰى أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ وَأَقَرَّ بِالسَّرِقَةِ إِقْرَارًا يُقْطَعُ بِهِ الْيَدُ فَلَمْ يَقْطَعْ يَدَهُ۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے چوری کا اقرار کیا جس سے قطع ید کی حد لگنی چاہیے تھی مگر آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔ حالانکہ حدود قائم نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے،

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جب نجاشی شاعر عین رمضان میں شراب نوشی کے جرم میں پکڑا ہوا آیا تو آپ نے حد شرعی سے بیس کوڑے سے زیادہ اس کے لگائے۔ جب کہ حد شرعی پر زیادہ جائز نہیں،

ایک طعن یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ نے "تنزیہہ الانبیاء والائمہ" میں یہ روایت بیان کی ہے کہ أَنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أُتِيَ بِمَالٍ مِنْ مُهُوْرِ الْبَغَايَا فَقَالَ إِنْ عَزَلُوهُ حَتّٰى يَجِيئَ عَطَاءُ غَنِيٍّ وَبَاهِلِهِ (امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب فاحشہ عورتوں کی کمائی کا مال پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا اسے اٹھائے جاؤ تاآنکہ مالداروں اور اس کے اہل کی عطایا وصول ہوں) حالانکہ فاحشہ عورتوں کی اجرت حرام ہے،

ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے دراہم میں سود کا حکم دیا جو حکم رسول کی صریح مخالفت ہے، جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے لَا تَبِيعُوا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ (درہم کو درہم کے بدلے نہ بیچو)

ایک طعن یہ ہے کہ آپ کی بعض باتوں سے دعوائے الوہیت ظاہر ہوتا ہے مثلاً خطبۃ البیان جو رجال شیعہ میں سے اصبغ بن نباتہ سے منقول ہے أَنَا أَخَذْتُ الْعَهْدَ عَلَى الْأَرْوَاحِ فِي الْأَزَلِ أَنَا الْمُنَادِي

نَفْخَۃُ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ - ازل میں روحوں سے میں نے ہی عہد لیا اور میں نے ہی انہیں پکار کر کہا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ اسی طرح آپ کا قول۔ اَنَا مُنْشِئُ الْاَرْوَاحِ ارواح کا پیدا کرنے والا میں ہی ہوں، یا خطبۃ الافتخار میں آپ کا وہ قول جس کی روایت رجب بن محمد بن رجب برسی حلی نے اپنی کتاب مشارق انوار الیقین فی الکشف عن امیر المومنین میں بایں الفاظ کی ہے، اَنَا صَاحِبُ الصُّوْرِ۔ اَنَا مُخْرِجُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (میں صاحب صور ہوں اور میں ہی اہل قبور کو قبروں سے نکالنے والا ہوں)

یا آپ کا یہ قول۔

اَنَا حَیٌّ لَا یَمُوْتُ۔ اَنَا جَاوَزْتُ بِمُوْسَی الْبَحْرَ وَاَغْرَقْتُ فِرْعَوْنَ وَجُنُوْدَہٗ اَنَا اَرْسَیْتُ الْجِبَالَ الشَّامِخَاتِ وَفَجَّرْتُ الْعُیُوْنَ الْجَارِیَاتِ اَنَا ذَالِکَ النُّوْرُ الَّذِیْ اِقْتَبَسَ مُوْسٰی مِنْہُ الْھُدٰی

حی لا یموت میں ہی ہوں میں نے ہی موسیٰ کے لیے دریا میں راستے بنائے اور میں نے ہی فرعون کو اور اس کے لشکر کو غرق دریا کیا۔ اونچے پہاڑ اور بہتے چشمے میں نے ہی قائم و جاری کیئے، میں ہی وہ نور ہوں جس سے موسیٰ کو ہدایت کی روشنی ملی۔

ایک طعن یہ ہے کہ یمن، عراق اور عمان میں تو اپنے اعزہ و اقارب کو حاکم مقرر فرمایا مگر کوفہ و بصرہ پر طلحہ و زبیر (رضی اللہ عنہما) کی حاکمیت گوارا نہ فرمائی حالانکہ امارت کی سپردگی میں یہ زیادہ حقدار اور زیادہ بہتر تھے،

ایک طعن یہ بھی ہے کہ قاتلان عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) پر حد قصاص جاری کرنے میں تاخیر اور بے دلی دکھائی حالانکہ اسباب قتل حضرت عثمان پر ثابت نہ ہو سکے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) کی اہانت کی۔ ان کا مال لوٹا، اور ان کے گھر کو نذر آتش کیا اور جناب ابو مسعود انصاری (رضی اللہ عنہ کی بھی توہین کی،

ایک طعن یہ ہے کہ واقعہ افک کو تسلیم کرنے والوں میں سے آپ بھی تھے چنانچہ بخاری کی یہ روایت وَکَانَ عَلِیٌّ مُسَلِّمًا فِیْ شَانِھَا (اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تسلیم کرنے والوں میں سے تھے،

حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ - تو گویا ایمانی تقاضے کے خلاف کیا۔

ان میں سے ایک طعن یہ بھی ہے کہ اول تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل سے پوری بریت ظاہر کی جب اس پر قاتلان عثمان ؓ کبیدہ خاطر اور آزردہ دل ہوئے تو فرمایا۔ قَتَلَہُ اللّٰہُ وَاَنَا مَعَہٗ (ان کو اللہ تعالیٰ نے قتل کیا اور میں اس کے ساتھ ہوں)۔

امامت کو باطل قرار دینے کے لئے ان بدبختوں کے شبہات و اعتراضات اتنے طویل الذیل ہیں کہ اس مختصر کتاب میں ان کا اور ان کے جوابات کا بیان خواہ مخواہ طوالت کا باعث ہو گا ویسے وہ اس کتاب کے موضوع سے بھی خارج ہیں، بحمد للہ اہل سنت کی بڑی کتابوں میں ان خرافات کی بڑی تفصیل سے خاطر خواہ تردید کی جاتی رہی ہے،

اصول اہل سنت کے مطابق ان مطاعن کا جواب اجمالی طور پر بالکل ظاہر ہے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اسلحہ جات اور اموال جو آپ اپنے تصرف میں لائے تو وہ اس لئے کہ وہ اموال وغیرہ ایسے ہوں گے جن کا تعلق بیت المال سے ہوگا جناب شہید رضی اللہ عنہ کی ذاتی ملکیت نہ ہونگے اور ایسا ہونا لوازم خلافت میں سے ہے کہ جو خلیفہ ہوتا ہے وہی ایسے اموال پر قابض و متصرف ہوتا ہے۔

ہمارے دور میں بھی اس کی مثال شاہی تخت، چھتر، ہاتھی گھوڑے وغیرہ ہیں کہ وہ آنے والے بادشاہ کے قبضہ و تصرف میں آتے ہیں وارثان شاہ میں تقسیم نہیں ہوتے۔ اسی طرح اس قسم کے اموال خلیفہ اول کے بعد خلیفہ ثانی کے تصرف میں آئے خلیفہ اول کے وارثوں کو نہیں ملے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ورثا اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے اس لئے انہوں نے مطالبہ پیش کر دیا۔

(۲) اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق جناب امیر رضی اللہ مجتہد بھی تھے، اور مجتہد کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کرلے اور ایسا بھی ہوا ہے (یہاں مذہب سے مراد مجتہدانہ رائے ہے مذہب بمعنی دین نہیں)، چنانچہ شیخین رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے واقعات کا صدور ہوا ہے۔

(۳) عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں امہات الاولاد پر جو اجماع تھا وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے نقطۂ خیال سے قطعی نہ ہوگا، بلکہ ظنی ہوگا اسی لئے آپ نے اس کی مخالفت کی اور نہ اجماع ظنی، اور اجماع سکوتی کی مخالفت ہو سکتی ہے پھر اصولیوں کے نزدیک اجماع کے حجت کے لئے یہ شرط ہے کہ اہل اجماع اپنے قول پر قائم و برقرار رہیں اور چونکہ جناب امیر بھی اہل اجماع میں سے تھے، جب آپ کا اجتہاد بدلا تو اس وقت وہ اجماع آپ کے لئے حجت نہیں رہا۔

(۴) جد کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق اور جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہما باہم مختلف الخیال تھے چنانچہ عہد فاروقی میں اس مسئلہ پر کافی بحث و مناظرہ ہوتا رہا۔ اگر مجتہدین کسی نقطۂ نظر سے اختلاف کریں اور ایک مجتہد مختلف اوقات میں حکم کی مختلف جواب کو ترجیح دے تو کوئی مضائقہ نہیں،

آپ کے کلام من اسماد ان یتقحم کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ جد مختلف فیہا ہے ترجیح کے لئے ہر جانب وجوہ قائم ہیں اور اس میں کوئی نص وارد نہیں لہٰذا ان حالات میں اگر کوئی اس میں حکم قطعی ہے تو وہ بے باک ہوگا اور بے احتیاط بھی محتاط علماء اور ماہرین فضلاء کی شان یہی ہے کہ مختلف فیہ اجتہادی مسائل میں کسی ایک طرف جزم و یقین نہیں رکھتے،

(۵) زندیق اور مرتکب اغلام کو جلانے کا جو واقعہ تھا وہ بھی اجتہادی تھا۔ جب آپ کو خبر صحیح معلوم ہوئی تو آپ نے اظہار ندامت فرمایا اور اجتہاد میں تمام اخبار پر تفصیلی نظر رکھنا شرط نہیں، اسی لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ابتداءً میراث جد کا علم نہ تھا جب جناب مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے اس کی خبر دی تو آپ نے اس کو تسلیم فرمایا حالانکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باجماع نواصب و خوارج مجتہد تھے۔

(۶) اسی طرح شرابی پر حد لگانے کے بعد دیت دینا بھی بطور احتیاط تھا۔ اجتہاد میں کسی شک کی بناء پر نہیں تھا، اور احتیاط کے پہلو پر عمل کرنا انتہائی تقویٰ اور پرہیزگاری کی علامت ہے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ جیسی ہستیوں کے شایان شان ہے،

(۷) اور ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے اس لئے لگائے کہ اس سے متعلق شہادت میں شبہ پیدا ہو گیا تھا، ایک شخص نے شراب پینے پر شہادت دی تھی اور دوسرے نے شراب کی قے پر، گو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حد میں اس شبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی (جب کہ ان کے دور میں ایسا واقعہ ہوا) اور فرمایا وَمَا تَقَيَّأَهَا إِلَّا وَقَدْ شَرِبَهَا اس سے اسی لئے

تو شراب کی قے کی کہ اس نے شراب پی، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ نے احتیاط کے طور پر دو حدوں میں سے جو حد کم تھی اس پر اکتفا کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ قرابت عثمان کا حد کے اجراء میں لحاظ فرماتے جب کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آپ نے نہایت تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ حدود پوری پوری نافذ کی جائیں، چنانچہ سیرت و تاریخ کی وہ کتابیں جن کی صحت پر اہل سنت و نواصب دونوں متفق ہیں اس پر واضح اور صاف دلالت کر رہی ہیں،

(۸) اور قصاص آپ نے معاف نہیں کیا تھا بلکہ مقتول کے ورثا کی جانب سے معافی ہوئی تھی، البتہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ اس میں ضرور شامل تھا معتبر کتابوں میں یہ قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو عداوت کی بنا پر ایک ویرانے میں قتل کیا اور بھاگ گیا مقتول کے ورثا قاتل کی تلاش میں نکلے تو اس ویرانے سے متصل ایک اور ویرانہ تھا۔ وہاں انہوں نے ایک شخص کو پیشاب کرتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری بھی تھی کپڑے بھی خون آلود تھے لوگوں نے اسے شبہ میں پکڑ کر جناب امیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے سارے حالات اپنے خلاف پاکر اقرار جرم کر لیا اور کہا کہ جو شرعی سزا ہو مجھے دے دی جائے کیونکہ آلہ قتل بھی میرے پاس ہے، گواہ بھی سچے ہیں، میں پایا بھی مقتول کے قریب ہوں اب میرے لئے کہنے کو کیا رہ گیا ہے اسی اثنا میں جب اصل قاتل کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ناکردہ گناہ نے اس کا جرم اپنے سر لیا ہے، تو وہ بھاگا ہوا جناب امیر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کہا کہ اصل قاتل میں ہوں اور یہ شخص بے گناہ ہے لہذا اسے رہا کیجئے اور قصاص مجھ سے لیجئے، امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے پہلے آدمی سے پوچھا کہ تو بتا تیرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا جو تو قتل کا اقراری ہو گیا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تھی، چھری پر اسی کا خون تھا کپڑوں پر بھی اسی کا خون لگا تھا، ذبح کے بعد کھال اتارنا ہی چاہتا تھا کہ پیشاب نے زور کیا تو میں فراغت کے لئے ویرانہ میں جا گھسا وہاں ایک لاش کو دیکھ کر ڈر گیا اور اس کے برابر والے ویرانے میں جاکر پیشاب کر رہا تھا کہ مقتول کے وارثوں نے آپکڑا اور آپ کے پاس لے آئے سارے حالات میرے خلاف تھے، کچھ کہتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا لہذا میں نے اقرار کر لیا، اس پر جناب امیر نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اور اصل اقراری قاتل کو شاباش دی کہ گو تو نے ایک آدمی قتل کیا ہے مگر دوسرے کی جان بھی بچائی تو آکر اقرار نہ کرتا تو ایک بے گناہ قصاص میں مارا جاتا تو اس قابل ہے کہ تیرا خون بہا معاف کیا جائے مقتول کے وارثوں نے جب آپ کی یہ بات سنی تو قصاص سے لادعویٰ ہو گئے اور قاتل کو معاف کر دیا۔ لہذا اس صورت میں طعن کی کہاں گنجائش ہے۔

(۹) رجم مولاۃ حاطب، اگر اس کی آزادی کے بعد ہوا تو جائز ہوا، اور ممکن ہے آپ کو اس کے کنیز ہونے کی اطلاع نہ ہو۔

(۱۰) آپ کے ساتھ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مناظرہ کرنا اور ایک مسئلہ میں آپ کو الزام دینا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی حقارت کا باعث نہیں۔ حق کی پیروی تو اولیا کی شان ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ایک عورت کی بات کے قائل ہو گئے اور برملا یہ الفاظ فرمائے، كُلُّ النَّاسِ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ حَتَّى الْمُخَدَّرَاتِ فِي الْحِجَالِ۔ (عمر سے تو سبھی لوگ زیادہ سمجھدار ہیں حتیٰ کہ پردہ نشین خواتین بھی)۔

(۱۱) پنچایت کی خلاف ورزی تو اس وقت لازم آتی ہے جب کہ دونوں پنچوں نے غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا ہو۔ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پنچ نے مد مقابل کے پنچ کو گڑبڑا دیا اور اس کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تو یہ

پنچایت کہاں ہوئی جو اس کی خلاف ورزی کا الزام دیا جائے۔

(۱۲) چور کا ہاتھ انگلیوں کی جڑوں تک کاٹنا یہ جلاد کی غلطی تھی، آپؓ کا حکم نہیں تھا جو آپ کی لاعلمی لازم آئے،

(۱۳) اور بچوں میں باہم ایک دوسرے کی گواہی قبول کرنا جب کہ وہ امور ہی ایسے ہوں جو بچوں میں چلتے رہتے ہیں اب بھی امام مالک رحمہ اللہ علیہ کے یہاں مقبول ہے، اور آیت فاستشھدوا میں بچے داخل نہیں کیونکہ بچوں کے باہم کھیل کود میں بالغوں کی موجودگی نہیں ہوا کرتی اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کافروں میں بعض کی گواہی بعض کے لئے مان لی جاتی ہے، لہٰذا جب یہ مجتہدین کا مسلک ہوا تو طعن کا سوال نہ رہا۔

(۱۴) اور یک چشم کی آنکھ کی آدھی دیت لینا یہ فقہ کی باریک بینی اور نکتہ رسی ہے کیونکہ کانے کی صرف ایک ہی آنکھ ہے جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی ہے۔ لہٰذا اگر قصاص لینے والے نے اس کی اس آنکھ کو پھوڑا جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی تھی تو گویا اس نے اپنے حق سے تجاوز کیا اور ایک زائد آنکھ پھوڑ دی۔ تو اس پر دیت لازم ہو گئی البتہ قرآنی نص العین بالعین کے پیش نظر اس سے قصاص لینا لازم ہو گا۔ لہٰذا اس جگہ حقیقت اور شبہ حقیقت دونوں پر عمل ہوا اگرچہ یہ کسی مجتہد کا مسلک نہیں ہے لیکن قواعد شرعیہ سے اس کے نظائر پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً زکوٰۃ میں بنت مخاض (ایک سال کی اونٹنی) کی جگہ بنت لبون (دو سال کی اونٹنی) لینا اور بقدر زائد کی قیمت دیدینا جائز ہے،

حاصل کلام یہ کہ اجتہادی مسائل میں کسی پر طعن فضول اور کار بے ثواب ہے!

(۱۵) اور نابالغ بچہ پر اگر پوری حد سرقہ لگانا ثابت بھی ہو تو وہ سیاست خلافت پر مبنی ہو گا حکم شرع کی بنا پر نہیں بچوں پر گو قلم شرع اٹھا لیا ہے، مگر خلفا کی سیاست اور تادیبی سزا ان پہ لاگو ہو سکتی ہے حدیث صحیح موجود ہے کہ اضربوھم علیھا وھم ابناء عشر سنین۔ (وہ دس برس کے ہوں تو نماز نہ پڑھنے پر انہیں مار لگاؤ)

(۱۶) اور محمد بن بابویہ کی روایت کہ چوری کا اقرار کر لینے والے پر حد نہ لگائی، یا رمضان میں شراب خوری والے پر مقررہ حد سے بیس کوڑے زائد لگائے، ناقابل قبول ہے لہٰذا اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کی کبھی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ یہ زیادتی بربنائے سیاست تھی!۔

(۱۷) رہا فاحشہ عورتوں کی اجرت کا معاملہ، تو اہل سنت کی کتابوں میں تو اس کا وجود ہے نہیں اس لئے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ روایت جھوٹی ہے جب کہ اہل سنت کے ہاں تو اس کے خلاف ایک صحیح روایت استیعاب میں موجود ہے،

رَوَی اَبُوْسَلَمَۃَ مُوْسَی ابْنُ اِسْمَاعِیْلَ عَنْ اَبِیْ عُوَانَۃَ عَنْ مُغِیْرَۃَ عَنْ ثَابِتِ بْنِ ھُرْمُزْ قَالَ حَمَلَ الْمُخْتَارُ مَالاً مِنَ الْمَدَائِنِ مِنْ عِنْدِ عَمِّہٖ اِلٰی عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ فَلَمَّا فَرَغَ اَخْرَجَ کِیْسًا فِیْہِ خَمْسَۃُ عَشَرَ دِرْھَمًا فَقَالَ ھٰذَا مِنْ اُجُوْرِ الْمُوْمِسَاتِ فَقَالَ عَلِیٌّ وَیْلَکَ مَالِیْ وَلِاُجُوْرِ الْمُوْمِسَاتِ ثُمَّ قَامَ الْمِنْبَرَ وَعَلَیْہِ مَقْطَعَۃٌ لَّہٗ حَمْرَاءُ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ

ابو سلمہ موسیٰ بن اسمٰعیل نے ابی عوانہ سے، اس نے مغیرہ سے اس نے ثابت بن ہرمز سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مختار ثقفی، مدائن سے اپنے چچا کے پاس سے کچھ مال لا کر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا۔ جب مال کی سپردگی سے فارغ ہو گیا تو ایک تھیلی نکالی جس میں پندرہ درہم تھے اور کہنے لگا کہ یہ فاحشہ عورت کی کمائی میں سے ہے جناب علیؓ نے فرمایا تیرا ناس جائے میرا

عَلِیٌّ مَالَهٗ قَاتَلَهُ اللّٰهُ لَوْ شُقَّ عَنْ قَلْبِهِ الْاٰنَ لَوُجِدَ مَلْاٰنَ مِنْ حُبِّ اللَّاتِ وَالْعُزّٰی۔ اس کمائی سے کیا واسطہ! مختار یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا اس وقت وہ سرخ کپڑا پہنے ہوا تھا۔ اس نے جب حضرت علیؓ کو رخصتی سلام کیا تو آپ نے فرمایا دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے، اس پر اللہ کی پھٹکار ہو، اس وقت اگر اس کا دل چیر کر دیکھا جائے تو وہ لات و عزیٰ کی محبت سے لبریز نظر آئے گا،

لہٰذا معلوم ہوا کہ شیعوں نے جو روایت بیان کی ہے وہ مختار ثقفی کے افتراء اور بہتان پر مبنی ہے جس کو مختار نے ایسا مال ہضم کرنے اور شرمندگی مٹانے کی خاطر گھڑنت کر کے عام لشکریوں اور اپنے پیروکاروں تک پہنچائی اور بالآخر رفتہ رفتہ شہرت پا گئی،

(۱۸) دراہم کے سود کے متعلق صورت یہ ہے کہ وہ دراہم جن میں کھوٹ اتنی زیادہ ہو کہ ان کا چلن بند ہو جائے اور سکہ کی حیثیت ختم ہو جائے، ایسے دراہم (سکوں) کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت شافعیہ کے نزدیک جائز ہے حرام نہیں ہو سکتا ہے کہ جن دراہم میں جناب امیر نے زیادہ کو جائز رکھا ہو، وہ اس قسم میں ہوں، اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں درہم سے مراد وہ ہے جو خالص چاندی کا ہو یا اگر کھوٹ ہو بھی تو اتنی نہ ہو کہ اس کے چلن میں حارج ہو، اور اس کی قیمت کی حیثیت باقی ہو،۔

(۱۹) اور خطبۃ البیان اور خطبۃ الافتخار کا اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں، بلکہ ان کے ہاں یہ موضوعات میں شامل ہیں ان کے راوی امامیہ ہیں اور جھوٹے ہیں لہٰذا ایسی افتراء اور بہتان کی بات کو آڑ بنا کر طعن کرنا پرلے درجہ کی سفاہت اور بے وقوفی ہے اور بالفرض ان کو صحیح مان بھی لیں تو یہ غلبہ حال و سرمستی کی کیفیت ہو گی چنانچہ بعض اوقات اولیاء اللہ پر یہ حالات طاری ہو جاتے ہیں اور ان کے زیر اثر ان کی زبان سے ایسے کلمات کا صدور ہو جاتا ہے اور شرع میں حال کی ایسی مستی اور ایسے غلبہ پر معذور رکھا گیا ہے، توبہ کے سلسلہ میں صحیح حدیث میں اس کی مثال موجود ہے، کہ کوئی بندہ یوں کہہ بیٹھا۔ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّكَ۔ اَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ (تو میرا بندہ میں تیرا رب، خوشی کی شدت میں وہ ایسی غلطی کر بیٹھا)۔

پھر یہ کلام زبان حال کی حکایت ہے جیسے کہتے ہیں، قَالَتِ الْاَرْضُ لِلْوَتَدِ لِمَ تَشُقُّنِیْ قَالَتْ لَا تَسْأَلْنِیْ وَاسْأَلْ مَنْ یَدُقُّنِیْ (زمین نے میخ سے کہا تو مجھے کیوں پھاڑ رہی ہے میخ بولی مجھ سے نہ پوچھ اس سے پوچھ جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ (کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟)، یعنی زبان اشارہ سے ورنہ زبان عبادت کا امت کو پتہ ہونا غیر ممکن ہے، کہ وہ اس کو جان سکیں،

(۲۰) اور امارت، اور عہدوں کے لئے ایسے اقارب اور عزیز زیادہ بہتر ہیں جو واجبی اطاعت سے سرمو انحراف نہیں کرتے بہ نسبت ان اجنبیوں اور عزیزوں سے جنکا شعار ہی نافرمانی اور حکم عدولی بن گیا ہو، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی یہ طرز اختیار فرمایا۔

(۲۱) اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے میں دیر، اور پس و پیش اس لئے تھی کہ قاتل کی تعیین نہ ہو سکی تھی اور قاتل کی تفتیش اور سراغ رسانی خلیفہ کے ذمہ نہیں بلکہ وارثوں کے ذمہ ہے،

(۲۲) اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی اہانت مالک اشتر اور اس کے غلاموں نے کی اور کوفہ میں کی ان کا گھر بغیر امیر رضی اللہ عنہ کے حکم کے جلا ڈالا اور آپ کو اس کی اطلاع تک نہ ہوئی، تاریخ طبری میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے اور جناب ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی اہانت کا سبب ان کی باغیوں کی طرفداری اور جانبداری تھی۔

(۲۳) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں واقعہ کی تسلیم آیت براۃ نازل ہونے سے پہلے پہلے تھا اور اس میں بظاہر خرابی اس لیے نہیں کہ محض خبر سچ اور جھوٹ دونوں پہلو رکھتی ہے،

(۲۴) اور آپ کا یہ کہنا قَتَلَہُ اللّٰہُ وَاَنَا مَعَہٗ۔ بطور توریہ کے تھا، کہ ضرورت کے وقت آپ اس کو کام میں لائے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے حضرت سارہ علیہا السلام کے حق میں ھٰذِہٖ اُخْتِیْ نکلا۔ اور ضرورت یہ تھی کہ مبادا قاتلان عثمان ؓ لشکر میں بلوہ اور فتنہ و فساد برپا کریں۔ بلکہ خطرہ یہ بھی تھا، کہ خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہی قتل کے درپے نہ ہو جائیں،

خلاصہ کلام یہ کہ شیطان نے نواصب اور شیعہ ہر دو کی راہ ماری اور ان کو خدا کے دوستوں کی عیب جوئی کی راہ پہ ڈال دیا جو اس کی عین آرزو اور مقصد وجود ہے اور یوں اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنا لیا (خدا جسے رسوا کرنا چاہتا ہے اس کا میلان طبع نیک لوگوں پر طعنہ زنی کی طرف کر دیتا ہے،)

امامت کی بحث کا خاتمہ

شیعوں کے تمام فرقوں میں قدر مشترک وہ نکتہ خیال جس پر سب متفق ہیں۔ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ و امام بلا فصل تھے اور تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم کی خلافت غلط اور بے بنیاد تھی اس قدر مشترک پر اہل سنت کے ساتھ ان کا جو نزاع اور بحث تھی وگذشتہ اوراق میں بڑی تفصیل اور واضح انداز میں گزر چکی اور اسی کے ساتھ شیعی فرقوں، ان کی شاخوں بلکہ ڈالیوں نے اس سلسلہ میں کتاب اللہ، عترت رسول اللہ سے جو مخالفت کی ہے وہ بھی وضاحت سے سامنے آ چکی۔

لیکن اس قدر مشترک کے باوجود بھی ان کے فرقوں میں باہم بڑے سنگین اختلافات ہیں، حتیٰ کہ بعض نے بعض دوسروں کو کافر و گمراہ تک کہنے میں کوئی باک نہ کیا۔ ایک دوسرے کو طعن کرنا تو معمولی سی بات ہے،

اس کتاب میں اختلافات کا ذکر گو ضروری تو نہ تھا کیونکہ اس کا موضوع شیعہ و سنی کی آپس میں گفتگو و بحث ہے نیز ان کے باہمی اختلاف سے اہل سنت کا کچھ نقصان بھی نہیں لیکن اس نقطہ نظر سے کہ کسی چیز میں زیادہ اختلاف ہونا اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے، مسائل شروط امامت، معنی امامت اور تعیین ائمہ میں ان کے اقوال نقل کرنا موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اس مذہب کے جھوٹ ہونے کی علامت مختلف پہلوؤں سے واضح ہو جائیں اور ان کا یہ طعن کہ اہل سنت فقہ میں بہت اختلاف کرتے ہیں، انہیں پر لوٹ جائے کیونکہ ان کا اختلاف تو اصول میں ہے جس سے مذہب کی بیخ و بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے اور اہل سنت کا اختلاف فروعات میں ہے جو رحمت ہے گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان بھی اصول میں متفق رہے ہیں، گو فروعات میں اختلاف رہا چنانچہ شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا (الی آخر الآیت) اس پر گواہ ہے

لہٰذا وہ دین جو اپنے اندر اصولی اختلاف رکھتا ہو، ایک کرشمہ ہی ہے جس کی نظر انبیاء سابق کے ادیان تک میں

نہیں ملتی چہ جائیکہ اسلام میں اس کی گنجائش ہو۔

شروط امامت میں اختلاف: غالی شیعوں کے نزدیک امامت محض اوامر نواہی کے احکام کے اجراء و نفاذ کا نام ہے، شئون الٰہیہ میں سے ایک شان۔ ان غلاۃ کے علاوہ باقی فرقے کہتے ہیں کہ امامت دین و دنیا کے امور میں پیغمبر کی نیابت ہے سارے زیدی امام میں عصمت کی شرط کے قائل نہیں، اور اسے بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ اس کے لئے کوئی نص وارد ہو،

اور نہ ہی امام کے لئے افضلیت کو لازم سمجھتے ہیں، بلکہ امامت کی شرطوں میں سے بہترین شرط تلوار تھام کر نکل آنے کو مانتے ہیں اور اپنے سب دعوؤں کی دلیل پیش کرتے ہیں،

اسمعیلیہ:۔ سب کے سب علاوہ فرقہ نزاریہ کے عصمت کو امامت کے لئے شرط قرار دیتے ہیں نزاریہ اس معاملہ میں خاموش ہیں، نہ انکار کرتے نہ ہاں کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ امام کو فروع کے لئے مکلف ہی نہیں کیا گیا وہ جو بھی حرام کاری کرے اسکے لئے سب کی سب جائیز ہیں،

شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی۔ نے اپنے شیخ ابو عبداللہ محمد بن نعمان بغدادی جو شیخ مفید کے لقب سے مشہور ہیں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابو الحسن ہارونی، ابتداء میں شیعہ مذہب رکھتے اور امامت کے قائل تھے لیکن امامیہ کے شدید اختلاف کی وجہ سے انہیں راہ ہدایت کا ہی پتہ نہ چل سکا اور انہوں نے ان کی روایات کو آپس میں مختلف متناقص اور متعارض دیکھ کر شیعیت ہی پر تین حرف بھیجے اور توبہ کر کے شافعی مذہب اختیار کر لیا اور وہ لوگ جو آپ کے شاگرد یا صحبت یافتہ تھے۔ اور عمر بھر ان سے استفادہ کرتے رہے تھے، انہوں نے بھی اپنے شیخ کی پیروی میں اس مذہب سے اظہار بیزاری کیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی گہرائی میں اتر کر اس مذہب پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے اقوال و اخبار کے پریشان کن اختلاف سے آگاہ ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس مذہب میں راہ نجات ہی غائب ہے اور تعارض کی راہ تنگ اور راہ اخلاص معدوم و مفقود ہے تو مجبور ہو کر اس مذہب کو خیر باد کہتا اور دوسرا کوئی مذہب اختیار کر لیتا ہے،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں سے متعارض روایات بیان کرتے ہیں اور ہر امام سے دوسرے کے خلاف بھی روایات لاتے ہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جو قرآن و حدیث کے بھی مخالف ہوتی ہیں،

اور اس تعارض و تناقض میں نسخ کا کوئی احتمال ہے ہی نہیں، کیونکہ ایک نبی کے کلام کو دوسرا نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے، امام کو یہ حق ہی کہاں ہے وہ خدا اور رسول کے احکام کو منسوخ کر سکے ورنہ امام امام ہی نہ رہے گا کیونکہ وہ تو نبی کا نائب ہے نہ اس کا مخالف ہے نہ مستقل نبی اور بفرض محال نسخ کو مان لیں تو بعد میں آنے والا امام امام اول کے احکام کا ناسخ ہو گا اس صورت میں مدار عمل بعد والے امام کی روایات پر ہو گا حالانکہ اس فرقہ نے امام اول کی روایات پر اجماع کیا ہے،

پھر اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ احکام موبدہ ہیں جن میں ایک دوسرے سے تاکید ہو نسخ جائز نہیں ورنہ

معصوم کی تکذیب لازم آئے گی۔ حالانکہ ان کی روایات کا اختلاف احکام موریہ میں بھی چلتا ہے لہذا نسخ کا احتمال سرے سے زائل ہو گیا۔

اور رہی یہ بات کہ رواۃ کے وثوق کے اعتبار سے ایک خبر کی دوسری خبر پر ترجیح کا معاملہ تو اس کا راستہ ہی بند ہے۔ کیونکہ انہوں نے چند کتابوں کو کتب سماوی سمجھ رکھا ہے اگر کوئی ان میں سے ایک روایت لاتا ہے تو دوسرے کے نزدیک اس کی حیثیت خاک کے برابر ہے،

لہذا اگر ان کے عوام کے نقطہ نظر سے سبھی کو قابل وثوق سمجھ لیں تو ایک کو دوسری پر ترجیح کس طرح دے سکیں گے اور اگر بعض راویوں کے اقوال کو بعض دوسروں کے مقابلہ میں قبول کر کے دوسروں پر طعن و تشنیع اور جرح شروع کر دیں تو سارے کے سارے مجروح ہو کر رہ جائیں گے اور اس صورت میں ترجیح کی کوئی شکل بھی متصور نہیں تو پھر ساری روایات ساقط اور ناقابل عمل ہو کر احکام معطل اور بیکار رہ جاتے ہیں،

اس قسم کی روایات ان کے ایک فرقہ اثنا عشریہ کی ہیں کہ ان کا ہر عالم ایک ایسی روایت بیان کرتا ہے جو دوسرے کی روایت سے ٹکراتی ہے مثلاً ایک جماعت بطریق صحیح یہ روایت بیان کرتی ہے کہ اَلْمَذِیُّ لَا یَنْقُضُ الْوُضُوْءَ۔ مذی وضو نہیں توڑتی) تو دوسری جماعت صحیح سند سے یوں بیان کرتی ہے کہ (اَلْمَذِیُّ یَنْقُضُ الْوُضُوْءَ۔ مذی وضو توڑ دیتی ہے) ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز میں سجدہ سہو واجب نہیں تو دوسری روایت کرتی ہے کہ سجدہ سہو واجب ہے اور ائمہ نے سجدہ سہو کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ شیر خوار سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، تو بعض کہتے ہیں کہ وضو نہیں ٹوٹتا،

ایک جماعت کہتی ہے کہ بحالت نماز ڈاڑھی یا دیگر اعضا بدنی سے کھیلنا نماز میں خرابی پیدا نہیں کرتا تو دوسری جماعت یہ روایت کرتی ہے کہ عضو مخصوص اور اس کے معلقات سے کھیلنا بھی نماز میں جائز ہے، اور یہ حالت دو چار اخبار ہی میں نہیں تمام اخبار (روایات) میں ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب مَنْ لَا یَحْضُرُہُ الْفَقِیْہُ اس پر گواہ ہے،

اور اگر شیعوں کے تمام فرقوں کی روایات و اخبار پر نظر ڈالیں تو ان کے تمام اصول و فروع میں بے ربطی اور گڑبڑ کا ایسا طوفان امڈتا دکھائی دیتا ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ان کے بعض علماء نے ان سب روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے درحقیقت عجیب جادوگری دکھائی ہے ان میں سب کا پیشوا اور سردار شیخ للطائفہ محمد بن الحسن الطوسی ہے جو تہذیب و استبصار کا مصنف ہے، اس کی کوشش کی یہی معراج ہے کہ وہ ان کو تقیہ پر محمول کر گیا ہے کہ وہ مخالفین میں سے کسی کا مذہب نہیں ہے یا اگر ہے تو ضعیف کم ایک دو آدمیوں سے زائد کسی نے اسے اختیار نہیں کیا۔

ظاہر ہے کہ ائمہ عظام اس قدر بزدل اور خوفزدہ تو نہ تھے کہ صرف اس وہم و شبہ کی وجہ سے کہ شاید کوئی یہ مذہب رکھتا ہو اور اس وقت موجود بھی ہو اپنی عبادت کو باطل و خراب کر دیں ان ائمہ اور اولیاء کے متعلق ایسی بدعقیدگی کے تصور سے بھی خدا کی پناہ!

اور پھر بعض جگہ خبر روایت کے ایک جملہ کو تقیہ پر محمول کیا ہے اور دوسرے جملہ کو کہ وہ بھی اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے جوں کا توں چھوڑ دیا ہے اگر یہی تقیہ ہے تو پھر یہ کیسا تقیہ ہے کہ ایک جملہ میں تقیہ ہے اور دوسرا جملہ صاف صاف اور کھلم کھلا۔ کیا یہ اپنے ائمہ کو عقل سے کورا ہی سمجھتے ہیں اس کی مثال حضرت علی کی یہ روایت ہے،

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِغَسْلِ الْوَجْهِ مَرَّتَيْنِ وَبِتَخْلِيلِ أَصَابِعِ الرِّجْلَيْنِ عِنْدَ غَسْلِهِمَا۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو منہ دو مرتبہ دھونے کا حکم دیا اور پاؤں دھوتے وقت ان میں انگلیوں سے خلال کرنے کا۔

حالانکہ منہ کا دو مرتبہ دھونا نہ شیعوں کا مذہب ہے نہ سنیوں کا۔ کیونکہ (بطور سنت) دونوں کا تین مرتبہ دھونے پر اجماع ہے، اور پاؤں کا دھونا سنی مذہب کے موافق ہے، شیعوں کے نزدیک تو مسح کرنا ان کا مذہب ہے لہٰذا اس حدیث میں تقیہ و اظہار دونوں کا جمع کرنا لازم آیا۔

بعض جگہ ایسی رکیک اور پوچ تاویلات کرتے ہیں کہ امام کے کلام فصیح و بلیغ کو بازاریوں کے مہمل اور لغو کلام کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک وہ تاویل ہے جو یہ جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ کے کلام میں کرتے ہیں، جب کہ آپ دعا فرما رہے ہیں إِلٰهِيْ عَصَيْتُ وَظَلَمْتُ وَتَوَانَيْتُ۔ (میرے اللہ میں نے نافرمانی کی ظلم کیا اور سستی کی) یہاں یہی دعا ان کی کتابوں میں دوسرے ائمہ سے بھی مروی ہے، اب یہ روایات خواہ سچ ہوں یا جھوٹ ہر صورت عصمت کے خلاف ہیں، پھر یہ تقیہ کا موقع بھی نہیں۔ کیونکہ یہ معاملہ تو اس ذات کے ساتھ مناجات کا ہے، جو ہر ظاہر و پوشیدہ بات کو جاننے والی ہے،

اب اس دعا میں ان کی تاویل دیکھئے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ۔

إِلٰهِيْ إِنَّ شِيْعَتَنَا عَصَوْا وَظَلَمُوْا وَتَوَانَوْا لٰكِنَّ رَضِيْنَا بِهِمْ شِيْعَةً وَرَضُوْا بِنَا أَئِمَّةً فَحَالُنَا حَالُهُمْ وَحَالُهُمْ حَالُنَا۔

اے میرے اللہ! ہمارے شیعوں نے نافرمانی کی اور ظلم کیا اور سستی کی لیکن ہم ان کے شیعہ ہونے پر راضی ہیں اور وہ ہمارے امام ہونے میں راضی ہیں، پس ہمارا حال ان کا حال ہے اور ان کا حال ہمارا حال ہے،

اس یگانگت و اتحاد کے کیا کہنے۔ اگر شیعوں اور ائمہ میں اس قسم کی یگانگت و اتحاد ثابت ہے تو شیعوں کی نافرمانی ظلم اور سستی تو ائمہ میں اثر کر گئی مگر ائمہ کا عدل، طاعت، عبادت و قنوت شیعوں پر مطلق اثر نہ کر سکی گویا شیعوں کے احکام تو ائمہ پر غالب آگئے مگر ائمہ کے احکام شیعوں پر بے اثر رہے، کوئی حد ہے اس بدعقیدگی کی عرب و عجم کے محاورات میں اس قسم کی لغو تاویل کی کوئی نظیر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی،

پھر باعتبار فن نحو اس میں جو رکاکت ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں کہ واحد متکلم کی "تا" کو جمع پر محمول کیا اور متکلم کو غائب پر! اور متکلم کا غیر کے فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی لازم آیا بغیر کسی وجہ تعلق سببیت وغیرہ کے! اور ایسے لغو و فاسد کلام کو ایسے لوگوں کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے جو بلاغت کی انتہا پر پہنچے ہوئے تھے،

اور پھر اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ اپنی ذات مقدس کو اس نسبت سے آلودہ کیا ظلم و عصیان کی نسبت براہ راست ان شیعوں ہی کی طرف کیوں نہ کی۔ اور جو ان کی عصمت کے منکر تھے ان کے لئے اپنے ہاتھوں یہ دستاویز کیوں مہیا کی اور خواہ مخواہ زائد ضرورت کلمات کہہ کر بہت بڑی جماعت کی گمراہی کا سبب کیوں بنے۔

اور پھر اسلام کے صدر اول اور ابتدائی صدیوں میں فروعی مسائل میں کافی سخت اختلافات رونما ہوئے خود اہل سنت میں بھی فروعی مسائل میں باہم یکدگر خاصے اختلافات تھے مگر فروعی مسائل کے اس اختلاف کو کسی نقصان کا سبب نہیں

سمجھا۔ نہ اس کے باعث آپس میں طعن وعتاب اور سب وشتم سے کام لیا زبانی گفتگوؤں اور بحث ومناظرہ کا البتہ رواج رہا ہر شخص اپنا مذہب ظاہر کرتا اور اس پر دلائل قائم کرتا۔ عہد صحابہ سے لے کر عباسی دور تک آپس کی یہ مناظرہ بازی اور باہم چوٹیں چلتی رہیں، ہر مسئلے پر بلا کھٹکے اور دھڑلے سے اجتہاد کرتے مسائل استنباط کرتے اپنے اقوال کی ترجیح کے دلائل ثابت کرتے اور فریق ثانی کے قول کو ضعیف وکمزور بتاتے۔ ایسے ماحول میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ائمہ کرام کو تقیہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام کو ظاہر کرنے سے کیوں پہلوتہی کی، حالانکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم وسوم کے عہد میں امہات اولاد، حج تمتع اور دوسرے مسائل پر کافی زوردار بحث کی اور جانبین میں خاصی سختی ودرشتی کی نوبت بھی آئی، مگر اس کے باوجود کسی نے بھی جدل ونزاع نہیں کیا خصوصاً خلیفہ دوم کہ ان کو تو شیعہ بھی اس معاملہ میں بہت نرم مزاج اور قبول حق میں ضرب المثل مانتے ہیں، ان کے سامنے قرآن وسنت سے جو بھی دلیل پیش کی جاتی بلا کسی پس وپیش کے قبول فرماتے خواس کی بات تو رہی الگ عام مسلمانوں میں ایک عورت نے ایک مسئلہ میں جب معقول بات کہی تو آپ نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ یہ الفاظ فرمائے کل الناس افقہ من عمر حتی المخدرات (سب آدمی عمرؓ سے زیادہ دین کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے حتی کہ پردہ نشیں مستورات بھی)

ایسے حالات میں جناب امیر رضی اللہ عنہ تقیہ کیوں فرماتے اور وہ بھی فروعی مسائل میں اور منزل من اللہ کے اظہار سے جو آپ پر واجب تھا کیوں باز رہتے،

اسی طرح بعد میں آنے والے ائمہ مثلاً جناب سجاد، باقر، صادق، کاظم اور رضا رحمہم اللہ علیہم اجمعین جو علماء اہل سنت مثلاً زہری امام ابو حنیفہ، امام مالک رحمہم اللہ کے مقتداء وپیشوا رہ چکے ہیں، اور ان ہی بزرگوں سے ان حضرات کو تلمذ وشاگردی کا اعزاز بھی حاصل رہا اور اس وقت کے صوفیائے کرام مثلاً معروف کرخی رحمہ اللہ وغیرہ نے آنجناب ہی کے فیض سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور مشائخ طریقت نے ان ہی کے سلسلہ کو سلسلۃ الذھب کہا ہے اور پھر محدثین اہل سنت نے انہیں بزرگوں سے ہر فن خصوصاً تفسیر، سلوک اور حدیث میں دفتر کے دفتر روایت کئے ہیں تو کیا ایسے حالات میں ان محترم ائمہ کرام کے لئے یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ یہ اپنے معتقدین شاگردوں اور عقیدتمندوں سے ڈر گئے ہوں اور ان سے تقیہ کیا ہو،

اگر ایسے لوگوں سے تقیہ کیا جا سکتا ہے تو پھر رجال شیعہ سے تو بدرجہ اولیٰ تقیہ کرنے کا احتمال ہونا چاہیے

دیکھئے زور بیان میں ہم کہاں سے کہاں نکل گئے، بات یہ چل رہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد امامیہ اور شیعوں کے دوسرے فرقوں میں اصل امامت کے سلسلہ میں اتنا شدید اختلاف ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔ اور یہی اختلاف آگے چل کر روایات کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوا خیر آمدم برسر مطلب۔

واضح رہے کہ اسمٰعیلیہ کے تینوں فرقوں کی طرح امامیہ بھی ائمہ کی تعداد کو خاص تعداد کے ساتھ محدود کرتے ہیں، مگر اس مد تعداد میں بھی باہم مختلف ہیں، بعض یہ تعداد پانچ کہتے ہیں اور بعض سات بتاتے ہیں، بعض دوسرے آٹھ اور بعض بارہ کے قائل ہیں، تو بعض تیرہ کے غلاۃ ائمہ کی اور بہت مانتے ہیں ان میں پہلا نام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا پھر حضرت علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کا پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہوں جناب جعفر بن محمد رحمہ اللہ تک گویا یہ سب چھوٹے خدا ہیں اور دوسرے خداؤں کو تسلیم کرنے والے پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہو وہ ان کا جانشین ونائب ہے،

غلاۃ ہی کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ اس امت میں امام صرف دو ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

پھر حضرت علی رضؓ کی اولاد میں جو نیابت کے لائق ہو وہ آپ کا نائب اور جانشین ہے،

حلولیہ :۔ کہتے ہیں کہ امام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ حلول کرے۔ ان کا اختلاف باب اول میں مذکور ہوا۔

کیسانیہ :۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضؓ کو امام مانتے ہیں پھر محمد بن الحنفیہ رحؒ کو۔

کیسانیہ ہی کی شاخ مختاریہ، اس کے قائل ہیں کہ حضرت علی کے بعد حضرت حسن امام ہیں پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ، پھر ان کے بعد محمد بن الحنفیہ۔

ان میں سے ہر فرقہ اپنے تسلیم کردہ امام سے احکام شرعیہ میں احادیث وروایات نقل کرتا ہے، اور ان سب کے متواتر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے،۔

کیسانیہ کا پہلا فرقہ کہتا ہے کہ جناب محمد بن الحنفیہ نے اپنے والد کی وفات کے بعد امامت کا دعویٰ کیا اور ان کے والد ان کی امامت کا حکم دے گئے تھے،۔

اسی کیسانیہ کا دوسرا فرقہ مختاریہ کہتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد محمد بن علیؓ نے امامت کا دعویٰ کیا۔ اور ان سے متعلق بہت سی خرق عادات بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کیں،۔

اور سارے امامیہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد بے شک محمد بن علی رحؒ نے امامت کا دعویٰ کیا لیکن آخر میں اپنے دعویٰ سے رجوع فرما کر اپنے بھتیجے جناب زین العابدین کی امامت کے قائل ہو گئے،

راوندی نے جناب سجاد کے معجزات کے بارے میں حسین بن ابی العلاء اور ابی المسفر حمید بن المثنیٰ ہر دو سے روایت کی ہے، یہ روایت انہوں نے ابی بصیر سے اور اس نے ابی عبداللہ رحؒ سے بیان کی کہ وہ فرماتے ہیں،

جَاءَ مُحَمَّدُ بْنُ الْحَنَفِيَّةِ إِلَى عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ فَقَالَ يَا عَلِيُّ أَلَسْتَ تُقِرُّ أَنِّيْ إِمَامٌ عَلَيْكَ فَقَالَ يَا عَمِّ لَوْ عَلِمْتُ ذٰلِكَ مَا خَالَفْتُكَ وَإِنَّ طَاعَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلَى الْخَلْقِ مَفْرُوضٌ يَا عَمِّ أَمَا عَلِمْتَ أَنِّيْ وَصِيٌّ وَابْنُ وَصِيٍّ وَتَشَاجَرَا سَاعَةً فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ بِمَنْ تَرْضٰى حَتّٰى يَكُوْنَ بَيْنَنَا حَكَمًا فَقَالَ مُحَمَّدٌ بِمَنْ شِئْتَ فَقَالَ أَتَرْضٰى أَنْ يَكُوْنَ بَيْنَنَا الْحَجَرُ الْأَسْوَدُ فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ أَدْعُوْكَ إِلَى النَّاسِ وَتَدْعُوْنِيْ إِلَى حَجَرٍ لَا يَتَكَلَّمُ فَقَالَ عَلِيٌّ بَلٰى يَتَكَلَّمُ إِنَّهُ يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَهُ عَيْنَانِ وَلِسَانٌ وَشَفَتَانِ يَشْهَدُ عَلٰى مَنْ أَتَاهُ بِالْمُوَافَاةِ فَنَدْعُوْا أَنَا وَأَنْتَ فَنَدْعُوا اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يُنْطِقَهُ اللّٰهُ آيَتُنَا

ترجمہ :۔ محمد بن حنفیہ علی بن حسین کے پاس آئے اور کہا کہ اے علی کیا تم میری امامت کا اقرار نہیں کرتے۔ وہ بولے چچا جان میں اگر صحیح جانتا تو آپ کی مخالفت کیوں کرتا بلکہ (صورت یہ ہے کہ) آپ پر اور تمام مخلوق پر میری اطاعت فرض ہے چچا جان آپ کو پتہ نہیں کہ میں وصی بھی ہوں اور وصی کا بیٹا بھی غرض کچھ دیر کی بحثا بحثی کے بعد علی بن حسین نے کہا کہ تم کس ثالث کو پسند کرو گے وہ ہمارے درمیان ثالثی کرے محمد نے کہا جسے آپ پسند کریں علی نے کہا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ حجر اسود ہمارا ثالث ہو محمد نے جواب دیا۔ سبحان اللہ میں آپ کو لوگوں کی طرف بلاتا ہوں اور آپ مجھے پتھر کی ثالثی پر بلاتے ہیں، جو بول نہیں سکتا علی نے کہا بے شک وہ بولے گا،

حُجَّةُ اللهِ عَلٰى خَلْقِهٖ فَانْطَلَقَا وَصَلَّيَا
عِنْدَ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ وَدَنَوَا مِنَ الْحَجَرِ
الْاَسْوَدِ وَقَدْ قَالَ مُحَمَّدُ ابْنُ الْحَنَفِيَّةِ
لَئِنْ لَّمْ يُجِبْكَ اِلٰى مَا دَعَوْتَنِيْ اِلَيْهِ
اِنَّكَ اِذًا لَمِنَ الظَّالِمِيْنَ فَقَالَ لِمُحَمَّدٍ
يَا عَمِّ تَقَدَّمْ اِلَيْهِ فَاِنَّكَ اَسَنُّ مِنِّيْ
فَقَالَ مُحَمَّدٌ لِلْحَجَرِ اَسْاَلُكَ بِحُرْمَةِ اللهِ
وَحُرْمَةِ رَسُوْلِهٖ وَحُرْمَةِ كُلِّ مُؤْمِنٍ
اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنِّيْ حُجَّةٌ عَلٰى عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ
فَانْطِقْ بِالْحَقِّ وَبَيِّنْ لَنَا فَلَمْ يُجِبْهُ ثُمَّ
مُحَمَّدٌ قَالَ لِعَلِيٍّ تَقَدَّمْ فَاسْاَلْهُ فَتَقَدَّمَ عَلِيٌّ
فَتَكَلَّمَ بِكَلَامٍ خَفِيٍّ ثُمَّ قَالَ اَسْاَلُكَ بِحُرْمَةِ
اللهِ وَحُرْمَةِ رَسُوْلِهٖ وَحُرْمَةِ
اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيٍّ وَبِحُرْمَةِ الْحَسَنِ
وَالْحُسَيْنِ وَفَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ اِنْ كُنْتَ
تَعْلَمُ اَنِّيْ حُجَّةُ اللهِ عَلٰى عَمِّيْ فَانْطِقْ بِذٰلِكَ
وَبَيِّنْ لَهٗ حَتّٰى يَرْجِعَ عَنْ رَاْيِهٖ فَقَالَ الْحَجَرُ بِلِسَانٍ
عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ يَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ اِسْمَعْ وَاَطِعْ
لِعَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ لِاَنَّهٗ حُجَّةُ اللهِ عَلَيْكَ وَ
عَلٰى جَمِيْعِ خَلْقِهٖ فَقَالَ ابْنُ الْحَنَفِيَّةِ عِنْدَ
ذٰلِكَ سَمِعْتُ وَاَطَعْتُ وَسَلَّمْتُ۔

قیامت کے دن اسکی دو آنکھیں ہوں گی ایک زبان اور دو ہونٹ
وہ اس کے متعلق گواہی دے گا جو اچھے خاتمہ کے ساتھ اسکے
پاس آئے گا لہذا میں اور تم اسکے پاس چلتے ہیں وہاں اللہ تعالٰی سے
دعا کریں گے کہ وہ گویا ہو کر بتائے کہ ہم میں کون اللہ کی مخلوق پر اللہ کی
حجت ہے، چنانچہ دونوں گئے دونوں نے مقام ابراہیم پر دوگانہ ادا
کیا اور پھر حجر اسود کے قریب گئے محمد بن حنفیہ یہ کہہ چکے تھے کہ تم مجھے
جسکے پاس لے جا رہے ہو وہ نہ بولا تو تم ظالم قرار پاؤ گے پھر علی
نے کہا چچا جان پہلے آپ اسکی طرف بڑھئے کہ آپ باعتبار عمر مجھ سے
بڑے ہیں چنانچہ محمد نے حجر اسود سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ
میں اللہ ور رسول اور ہر مومن کی حرمت کو واسطہ ٹھہرا کر تجھ سے
پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں علی بن حسین پر حجت ہوں تو حق
بات کہہ اور ہمیں ثابت کر دکھا کہ کون اللہ کی حجت ہے، پھر محمد نے علی
سے کہا کہ اب تم آگے بڑھو اور اس سے پوچھو چنانچہ علی نے آگے بڑھ
کر پہلے تو کچھ آہستہ سے کہا پھر کہا کہ میں اللہ رسول اللہ امیر المومنین
علی حسن حسین اور فاطمہ بنت محمد کی حرمت کا واسطہ دیکر تجھ سے
پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں اپنے چچا پر اللہ کی حجت ہوں تو
ان کو بتا، اور ثابت کر دکھا تاکہ وہ اپنی رائے سے رجوع کریں اس
وقت حجر اسود بزبان عربی صاف طور پر گویا ہوا کہ اے محمد بن علی سنو اور
علی بن حسین کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تم پر اور اللہ کی سب مخلوق
پہ اللہ کی حجت ہیں تب محمد بن حنفیہ بول اٹھے میں نے سن لیا اور
اور میں نے اطاعت کی اور میں نے یہ بات تسلیم کر لی،

کیسانیہ اس دعوے کی تو تصدیق کرتے ہیں مگر شہادت کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہادت اس کے الٹ تھی کہ
کہ حجر اسود نے محمد بن حنفیہ کے حق میں ان کی دعا پر گواہی دی تھی، اور علی بن حسین نے محمد کی امامت مان لی تھی نیز کہتے ہیں کہ
علی بن حسین کا طرز عمل اسپر سچا گواہ ہے، کہ اس کے بعد وہ امامت کا نام تک اپنی زبان پر نہ لائے اور مکمل خاموشی اختیار
کر لی، اور اس سکوت کے امامیہ بھی قائل ہیں،

محمد بن حنفیہ نے مختار ثقفی، اور کوفہ کے شیعوں سے جو اس وقت مروانیوں سے نبرد آزما تھے خط
و کتابت کا رابطہ قائم کیا چنانچہ انہوں نے بھی آپ سے تعلقات استوار کر لئے، علی سے رابطہ و میل ملاپ
نہیں رکھا حالانکہ دونوں ایک جگہ ہی شہر مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے،

اور پھر کوفہ میں شیعوں کے نذرانے بھی محمد کو ہی پہنچائے جاتے نہ کہ علی بن حسینؒ کو، اور نہ ہی شیعان کوفہ علی کو اپنے پاس بلاتے تھے!

قاضی نور اللہ شوشتری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ جب محمد بن الحنفیہ نے وفات پائی تو ان کے شیعوں نے ان کے صاحبزادے ابو ہاشم کی امامت کو تسلیم کیا۔ جو بڑے مرتبہ والے تھے۔ اور شیعہ پہلے ہی سے ان کے معتقد تھے اور مطیع و فرمانبردار تھے۔ خود محمد بن الحنفیہ نے ان کی امامت کے لئے وصیت کی تھی۔

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ محمد بن الحنفیہ اپنے دعوے سے آخر تک نہیں پھرے تھے، اسی لئے امامت اپنے خاندان کے سپرد کی۔

قاضی نور اللہ نے محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ خط بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے مختار اور کوفہ کے شیعوں کو لکھا تھا جسکی عبارت کچھ یوں تھی۔

"اے مختار! مکہ سے کوفہ جا۔ اور ہمارے شیعوں سے کہہ کہ امام حسین (رضی اللہ عنہ) کے خون کا بدلہ لینے کے لئے نکل کھڑے ہوں اور کوفیوں سے (ہماری) بیعت لے"۔

کہتے ہیں کہ جب مختار نے یہ خط کوفیوں کو دکھایا تو کوفہ کے اکثر لوگ سلیمان سے برگشتہ ہو کر منہ موڑ گئے۔ سلیمان نے اپنے شیعوں سے کہا ٹھیک ہے تم بے شک محمد بن الحنفیہ کی حمایت میں خروج کرو کوئی مضائقہ نہیں مگر ہمارے امام تو علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں۔

لہٰذا کوفیوں کا سلیمان سے برگشتہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعویٰ سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔

اور قاضی نور اللہ، ابوالموید خوارزمی سے بھی جو زیدی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا یہ روایت بیان کرتا ہے کہ مختار ثقفی نے امرائے شام کے سر فتح کی خوشخبری اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہ ہی کے پاس بھیجے تھے نہ کہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس۔ اور انہوں نے اس فتح کی نعمت کی شکر گذاری میں دوگانہ ادا فرمایا اور شامیوں کے سروں کو سرعام لٹکانے کا حکم دیا۔ مگر جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا ان کو دفن کرادو!

اس واقعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہوگئی کہ مختار محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا معتقد تھا۔ اس لئے اس کو اس وقت کوئی خوف وخطرہ نہ تھا، کہ وہ دل سے تو جناب سجادؒ کی امامت کا معتقد ہوتا اور کسی ضرورت کے تحت بطور تقیہ جناب محمد بن علیؒ کو امام کہتا۔ اب ذرا قاضی نور اللہ کا ایک دوسرا بیان دیکھئے، اور غور فرمایئے کہ اس سے مدعا کیا برآمد ہوتا ہے، وہ مختار کا حال لکھتے ہوئے علامہ حلی کے حوالہ سے کہتا ہے کہ شیعوں کو مختار کی حسن عقیدت میں تو کوئی کلام نہیں، البتہ اس کے بعض ناشائستہ اعمال ان کو قابل اعتراض لگتے تو انہوں نے اس کو اعتراضات و مذمت اور سب وشتم کا ہدف بنایا۔ اس کی خبر جب جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو آپ نے مختار پر اعتراضات کرنے سے شیعوں کو منع کر دیا اور کہا کہ اس نے ہمارے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ہمیں روپیہ پیسہ بھی بھیجا"۔

یہاں عقلمندوں کو غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں! کہ اس کا واضح اور صاف مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی امام وقت کا منکر ہو تو یہ مناسب نہیں کہ اس کی دیگر خدمات اور خاندان سے دلی محبت کو نظر انداز کر کے اس کو برا بھلا کہا جائے۔

اب رہیں اس کی ذاتی بداعمالیاں جو اس سے سرزد ہوتی رہی ہیں، تو ان کی پردہ پوشی ہی طریق احسن ہے۔ اس نتیجہ کے پیش نظر کہنے والی بات یہ ہے کہ اہل سنت کا بھی تو یہی مذہب ہے وہ بھی حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے متعلق یہی کہنا چاہتے ہیں کہ گو وہ امام وقت کی امامت کے منکر تھے مگر باایں ہمہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے تھے۔ اللہ و رسول کے دشمنوں کے

قلع وقمع کی خاطر مصروف جہاد رہتے تھے۔ اللہ کے نام کا بول بالا کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ رسول اللہ کے اہل بیت کی روپیہ پیسہ سے اعانت کرتے تھے۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو داد و دہش میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ تو ان پر زبان درازی کا کیا جواز رہا۔

بات پھیر دور نکل گئی۔ اور بات سے بات نکل آئی۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ کیسانیہ ان شواہد و دلائل کی بنا پر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جناب محمد بن علی الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دعوائے امامت سے پھر گئے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کیسانیوں نے جناب محمد بن علیؒ کی کرامات کا اتنا طوار روایت کیا ہے کہ جو حد و تصورات سے بھی ماوراء ہی۔ اور قیاس وعقل سے بھی باہر ہیں، اور پھر ان سب کو متواتر بھی خیال کرتے ہیں۔ وہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ جناب محمد بن علیؒ کے بعد آپ ہی کی ہدایت و حکم سے آپ کے بیٹے ابوہاشم امام ہوئے۔ البتہ ان کے بعد باہم اختلاف ہو گیا کہ کون امام ہے، یہ سب تفصیلات باب اول میں بیان ہو چکیں۔

زیدیہ فرقہ کہتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد زید بن علی بن حسین (رضی اللہ عنہم) امام ہوئے۔ وہ علی بن حسین رحمہا اللہ کی امامت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک تو "ملے سو میر" کے مصداق جو تلوار لے کر میدان میں آجائے وہی امام ہے، یہی ان کے ہاں شرط امامت ہے۔ سکوت اور تقیہ چونکہ اس کے خلاف ہے، اسلئے وہ کسی گوشہ نشین، اور تقیہ پر عامل کو امام تسلیم نہیں کرتے۔

نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جناب زید اپنے باپ، دادا، اور جناب امیرالمومنین رضی اللہ عنہم سے اپنی امامت کے متعلق نصوص اور بشارات بھی نقل کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض روایات کو وہ متواتر بھی بتلاتے ہیں۔

جناب زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ امامیہ کے تمام معتقدات سے انکار اور ان کی تردید کیا کرتے تھے اور اس انکار کی روایات امامیہ اور خود زیدیہ بھی نقل کرتے ہیں۔ ہشام کے قصہ میں بحوالہ کلینی اس کی نقل اوراق ماسبق میں بیان ہو چکی ہے۔ باقریہ فرقہ کا یہ اعتقاد ہے کہ امام باقر ہی مہدی موعود ہیں۔ وہ حی لایموت ہیں اور نظروں سے اوجھل ہیں۔

ناوسیہ فرقہ یہی اعتقاد جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت رکھتے ہیں، اور آپ سے یہ متواتر روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

لَوْ رَأَيْتُمْ رَأْسِيْ تَدَهْدَهُ عَلَيْكُمْ مِنْ هٰذَا الْجَبَلِ فَلَا تُصَدِّقُوْهُ فَإِنَّ صَاحِبَكُمْ صَاحِبُ السَّيْفِ۔

اگر تم میرے سر کو اس پہاڑ سے لڑھکتا ہوا اپنے پاس آتا دیکھو تو بھی اس کی موت کا یقین نہ کرو کیونکہ تمہارا صاحب (سردار۔ امام) بہت طویل عمر والا ہے۔

اسمٰعیلیہ، جناب اسمٰعیل بن جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ہدایت بتواتر روایت کرتے ہیں کہ إِنَّ هٰذَا الْأَمْرَ فِي الْأَكْبَرِ مَا لَمْ يَكُنْ بِهِ عَاهَةٌ (یہ امر امامت بڑے بیٹے کو پہنچتا ہے جب تک اس میں کوئی خرابی رونما نہ ہو) اور جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے دعوائے امامت کو جھٹلاتے ہیں، اور انہیں برائی سے یاد کرتے ہیں کہ انہوں نے نص متواتر کے خلاف کیا جس طرح حضرت ابوبکر (صدیق رضی اللہ عنہ) نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیا۔

قرامطہ جناب اسمٰعیلؒ کے بعد ان کے بیٹے محمدؒ کو امام مانتے ہیں مگر افطحیہ جناب صادقؒ کے بعد عبداللہ بن جعفر کو امام بلافصل مانتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ اسمٰعیل کے حقیقی بھائی تھے۔ اور یہ بھائی جب جناب صادق کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ تو چونکہ نص اسمٰعیلؒ کے حق میں تھی، لامحالہ باپ کی وفات کے بعد بطریق میراث اس نص کا مصداق حقیقی بھائی ہوا نہ کہ سوتیلے بھائی۔ اور اسمٰعیل وعبداللہ کی والدہ فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم) تھیں لہذا دونوں بھائی دونوں جانب سے حسینی سید تھے،

موسویہ کہتے ہیں کہ جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی نص و ہدایت کے مطابق آپ کے بعد جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ امام ہیں۔

ممطوریہ آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حی لایموت ہیں اور قائم منتظر بھی وہی ہیں، اور ثبوت میں جناب امیرالمومنین رضی اللہ عنہ سے یہ نص متواتر نقل کرتے ہیں۔

سَابِعُهُمْ قَائِمُهُمْ سَمِيُّ صَاحِبِ التَّوْرَاةِ۔ (ان کا ساتواں ان میں قائم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم نام ہے)

اثنا عشریہ نے جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی امامت پر اتفاق کیا ہے ان کے بعد جعفریہ (فرقہ) نے جناب جعفر بن علی کو امام مانا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکری لاولد تھے۔ دلیل یہ ہے کہ آپ کی میراث جعفر بن علی نے لی۔ یہ بالاجماع ثابت ہے اگر ان کے کوئی بیٹا ہوتا تو جعفر کو کیسے پہنچتی!

مگر بعض کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکریؒ کے بیٹا تھا جو باپ کی زندگی میں کمسن فوت ہوگیا کلینی نے زرارہ بن اعین سے بحوالہ ابی عبداللہ روایت کی ہے۔

إِنَّهُ قَالَ لَابُدَّ لِلْغُلَامِ مِنْ غَيْبَةٍ	آپ نے کہا لڑکے کے لئے غائب رہنا ہی ضروری ہے
قُلْتُ وَلِمَ، قَالَ يَخَافُ قُلْتُ وَمَا يَخَافُ	میں نے کہا کیوں؟ آپ نے کہا خوف کھاتا ہے۔ میں نے کہا کس بات سے ڈرتا ہے؟
فَأَوْمَىٰ بِيَدِهِ إِلَىٰ بَطْنِهِ۔	آپ نے جواب میں اپنے ہاتھ سے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اثنا عشریہ نے اس اشارہ کا مطلب سمجھا کہ لوگوں کو ان کی ولادت میں شک پڑ جائے گا، بعض کہیں گے کہ حمل ساقط ہوگیا۔ بعض کہیں گے سرے سے حمل تھا ہی نہیں۔

لیکن عقلمند سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ "مایخاف" کے جواب میں اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرنا ان کے سمجھے ہوئے معنی کو صاف طور پر غلط بتا رہا ہے اس لئے کہ پیٹ کے بچہ کو خوف نہیں ہوا کرتا۔ اور اگر ہو بھی تو اس سے لوگوں کا اختلاف دور نہیں ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ بیان کرنے کا مقصد "کہ ان کے فرقے آپس میں مختلف ہیں، اور ہر ایک اپنی من مانی بات پر تواتر کا مدعی ہے" یہ ہے کہ ان کے جھوٹ اور افترا پر دلیل و حجت قائم کی جائے! اگر ایک ہی فرقہ کی خبر متواتر ہوتی تو یہ اختلاف ہرگز رونما نہ ہوتا۔ خصوصاً جناب محمد بن حنفیہ نہ جناب زین العابدین سے جھگڑتے، نہ حجر اسود کی ثالثی تک نوبت پہنچتی۔ نہ جناب زید بن علی کو جناب باقر سے نہ جناب جعفر بن علی کو جناب محمد بن مہدی سے کوئی پرخاش ہوتی۔ کیونکہ اہل بیت ہی اپنے اندرونی معاملات کو زیادہ جانتے ہیں۔ یہیں سے عقلمند کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ ان تمام فرقوں کے جھوٹ کو سمجھے اور یہ جان لے کہ یہ سب کچھ اس فرقہ کی افترا پردازی ہے کہ ہر وقت کی مصلحت کے مطابق ایک امام اپنے خیالات کے مطابق مقرر کر لیا کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ اپنے بنائے ہوئے امام کی آڑ میں اپنے پیرکاروں سے خمس، نذر و نیاز اور فتوح وصول کیا کریں اور عیش اڑائیں اور بعد والے اپنی اندھی تقلید کی وجہ سے گمراہی کے بھنور میں جا گرے۔ سچ ہے۔

إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ۔	انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا پس وہ ان ہی کے قدموں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔

آٹھواں باب

متعلق، آخرت

امور معاد میں کتاب وعترت سے شیعی مخالفت

عقیدہ (۱) مرنے کے بعد اجسام وارواح کے لئے ایک اور عالم، عالم آخرت درپیش ہوگا، جہاں سب حساب وکتاب جزا وسزا، ثواب وعقاب کے لئے جمع کئے جائیں گے۔ اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ مگر شیعوں کے بہت سے فرقے مثلاً زرامیہ، کاملیہ، منصوریہ، حمیریہ، باطنیہ، قرامطہ، جناحیہ، خطابیہ، معمریہ، میمونیہ، مقنعیہ، خلفیہ اور جنابیہ کہتے ہیں کہ حشر اجساد بالکل نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی ارواح کے لئے موجودہ عالم کے سوا کوئی اور ٹھکانہ ہے بلکہ ان کا اسی عالم دنیا میں تناسخ الٹ پھیر اور لوٹ پلٹ ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں

ان کے اس عقیدہ کی تردید و مخالفت، کتاب اللہ، انبیاء کرام کی نصوص اور ائمہ کے کلام سے اتنی ظاہر و باہر ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ کتاب اللہ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔

(۱) فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ۔
پس وہ اچانک قبروں سے (اٹھ کر) اپنے رب کی طرف بڑھیں گے۔

(۲) فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ
جب یہ سوال اٹھائیں کہ ہم کو کون لوٹائے گا تو آپ کہدیجئے، وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا۔

(۳) وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۔
ہم پر اعتراض کرتا ہے اور اپنی اوقات بھول گیا، کہتا ہے بوسیدہ ہڈیوں میں کون جان ڈالے گا۔ آپ کہدیجئے وہی ان کو زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

(۴) ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُحْشَرُونَ
پھر اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جاؤگے!

(۵) وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۔
اور اسی کی طرف لوٹوگے۔

(۶) رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۔ وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ
اے میرے رب مجھے دوبارہ (دنیا میں) لوٹا دے۔ تاکہ جو رادھورے کام) چھوڑ آیا ہوں ان کو تیری پسند کے مطابق انجام دے سکوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اب تو قیامت تک اس عالم کے درمیان پردہ حائل ہو چکا۔

اس غلط اور فاسد عقیدہ میں ان فرقوں کا استدلال وتمسک ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے فلسفیوں سے سیکھی ہیں۔ حالانکہ شریعت کے نزدیک وہ قطعاً غلط اور سراسر بے بنیاد ہیں، مثلاً آسمان کی کرویت (کرہ کی شکل) اور خلا کا محال ہونا۔ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر

اس موجودہ عالم کی طرح کا کوئی دوسرا عالم بھی ہوگا تو لامحالہ وہ بھی کروی شکل کا ہوگا۔ اور ایک جیسے دو کُرے، باہم چسپاں نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو، اور فاصلہ ہونے کی صورت میں خلا لازم ہے۔ (جو فلاسفہ کے نزدیک محال ہے)

اس استدلال میں ان کو کئی جگہ غلطی لگی اور دھوکہ ہوا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ کیا ضروری ہے کہ عالم پورے کا پورا کُرہ ہو۔ اسلئے کہ وہ ہندسی دلائل جو کرویت پر قائم کئے گئے ہیں افلاک متحرکہ کی کرویت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ افلاک متحرکہ پورے عالم کا ایک حصہ ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ خلا کے محال ہونے کا دعویٰ ناقابل تسلیم ہے کیونکہ اس پر جتنی بھی دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ سب پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اگر ہم دو کروں کو اوپر نیچے یا برابر رکھیں تو البتہ فاصلہ ضرور ہوگا لیکن اگر ایک کرہ دوسرے کرہ کی موٹائی میں دھنسا ہوا، گڑا ہوا یا سمایا ہوا ہو۔ جس کی موٹائی ایک دوسرے کے برابر ہو اور اس کا قطر ان کے قطر کے برابر۔ یا اس کی موٹائی اور قطر ان کی موٹائی اور قطر سے زائد ہوں۔ جیسا کہ فلاسفہ کے نزدیک تدویرین افلاک خوارج کی موٹائی میں گڑھی ہوئی ہیں تو فاصلہ ہرگز لازم نہیں آتا۔ اس لئے کہ فاصلہ کی جگہ تو گھیرنے والے کُرہ کی موٹائی سے بھری ہوئی ہے۔

خود فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ مریخ کی تدویر کا قطر مثلاً، سورج کے قطر سے بڑا ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ عالم کے یہ سب کُرات جو ہم کو معلوم ہیں اپنی جگہ خود ایک ہی کُرہ ہوں۔ جو کسی دوسرے کرہ کی موٹائی میں سمائے ہوئے ہیں اور یہی حال دوسرے عالم کا بھی ہو۔

چوتھی بات یہ کہ کیا ضروری ہے کہ معاد کا عالم، اسی عالم جیسا دوسرا ہی ہو، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی عالم میں تغیر و تبدل ہو جائے کل عناصر ناریت میں بدل جائیں اور افلاک سب کے سب باغ و بہشت کی شکل میں۔ اسی عالم میں فلکی اور عنصری مادے دوسرا رنگ اور دوسری صورت میں ظاہر ہو جائیں کہ مرکبات، کانیں، نباتات، حیوانات اور انسان افلاک میں پیدا ہوں۔ گویا ہر آسمان باغ و بہشت بنے۔ اور زمین دوزخ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔	جس دن یہ زمین دوسری زمین و آسمانوں میں بدل دی جائیگی۔ اور اللہ واحد و غالب کے حکم سے مردے نکل آئیں گے۔

اور حشر نشر سے پہلے جنت و دوزخ کا وجود، انبساط و امتداد کے منافی نہیں انکی کیفیات اس وقت بھی ایسی ہی ہوں گی جیسی اب ہیں۔

عقیدہ (۲) ——— قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر بندوں کو اٹھانا واجب نہیں کہ اس کے ترک پر کوئی عقلی قباحت لازم آئے، ہاں اس نے چونکہ اس کا وعدہ کیا ہے اس لئے وعدہ کے مطابق ان کا اٹھانا اور جمع کرنا ایک ہونے والا، اور وقوع میں آنے والا واقعہ ہے تاکہ وعدہ خلافی لازم نہ آئے یہی اہل سنت کا عقیدہ و مذہب ہے۔

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ بندوں کا اٹھانا از روئے عقل اللہ تعالیٰ پر واجب اور ضروری ہے۔ حالانکہ بہت سی آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ بعث و معاد وعدہ الٰہی سے وابستہ ہیں اور پھر ایسی آیات کے آخر میں۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) یا اسی طرح کی اور عبارات کا آنا ان کے عقیدہ کی کھلی تکذیب کرتی ہیں۔

اور الٰہیات کی بحث میں یہ گذر چکا ہے کہ خدا تعالیٰ پر کسی چیز کا واجب ہونا بے معنی سی بات ہے۔ امامیہ اس مسئلہ میں بھی چند ناقص

عقلی گدے، لڑاتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اوامر و نواہی کا مکلف کیا ہے تو اگر طاعت پر ثواب نہ دے اور نافرمانی پر عقاب میں نہ جکڑے، تو ظلم لازم آتا ہے اور ظلم ہر ایک ہی کے لئے قبیح اور برا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو قبیح تر ہوگا۔ اور ثواب و عقاب بعث کے بغیر متصور نہیں تو لامحالہ اللہ تعالیٰ پر بعث واجب ہوا۔

ان کا یہ استدلال بھی چند وجوہ ظاہر البطلان ہے۔

اوّل:۔ یہ کہ خالق و مالک کے متعلق ظلم کی نسبت کا تصور ہی غلط ہے اس لئے کہ وہ اپنی ملک میں جس طرح کا چاہے تصرف کرے۔ اسے حق ہے اور اسے ظلم نہیں کہہ سکتے!

دوسرے:۔ جن سے ظلم کا تصور ہو سکتا ہے مثلاً مالکان مجازی ان کے حق میں بھی فرمانبرداری پر انعام نہ دینا ظلم نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ایک آقا اپنے غلام کو معاشی ضروریات سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ اور اس سے کام بھی اس کی طاقت کے مطابق ہی لیتا ہے اب وہ غلام جو کام انجام دیتا ہے وہ اس کا فرض منصبی ہے اب اگر وہ آکے وہ انعام مانگے تو دنیا کا کون عقلمند کہیگا کہ مالک پر انعام دینا واجب ہے۔ وہ انعام نہ دے تو کوئی اسے ملامت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح معصیت اور گناہ پر بالکل ہی باز پرس نہ کرنا تو ظلم ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ تو عفو و احسان یا اپنا حق معاف کر دینا کہلاتا ہے۔ اس کو ظلم خیال کرنے والا تو بیوقوف ترین بلکہ عقل سے پیدل ہی ہوگا۔

پھر الٰہیات کے بیان میں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور جناب سجاد رحمہ اللہ علیہ سے بطریق تواتر یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ " اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار بندہ کو سب سے سخت کافر والا ہمیشگی کا عذاب بھی دیدے تو وہ عدل ہے ظلم نہیں"۔

حاصل کلام یہ کہ شیعہ حضرات اس مسئلہ میں بھی حسب عادت و دستور افراط و تفریط میں پھنس گئے، کہ امامیہ افراط کے راستہ پر پڑ گئے کہ اللہ تعالیٰ پر بعث و معاد واجب کہنے لگے اور دوسرے فرقے جن کا ذکر باب اوّل میں ہوا۔

تفریط کی راہ میں بھٹک گئے۔ کہ سرے سے معاد کا ہی انکار کر دیا۔ اور استدلال دونوں ہی کا عقلی ناقصات پر مشتمل ہے۔ امامیہ کا حال تو آپ ابھی پڑھ چکے اب ان دوسروں کی بھی سنئے۔

یہ کہتے ہیں کہ بعث و معاد اگر واقع ہو تو مومن صالح کے بعض یا کل بدنی اجزاء کو عذاب دینا یا کٹر کافر کے بعض یا کل اجزائے بدنی کو نعمت سے نوازنا لازم آتا ہے حالانکہ یہ عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔ اور اس لزوم کی صورت یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کو بطور غذا کھالیا۔ حتی کہ اس غذا سے نطفہ بنا، اور اس نطفہ سے بچہ پیدا ہوا۔ اب اس بچہ کے اجزائے بدنی کو یا عذاب دیا جائے گا۔ یا انعام سے نوازا جائے گا عذاب کی شکل میں اجزائے غذائی عذاب سے متاثر ہوں گے اور نعمت کی صورت میں نعمت سے، گو پہلی صورت میں عذاب کے مستحق نہ ہوں اور دوسری صورت میں نعمت کے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کھانے والے کے بدن کو اس مدت تک تحلیل ہونے سے محفوظ رکھے جب تک اجزائے غذا بالکل فضلہ ہو کر نہ نکل جائیں یا کھانے والے کو اتنی مدت تک نامرد کر دے کہ اس سے نطفہ پیدا ہی نہ ہو، اور اگر پیدا ہو تو احتلام یا کسی اور طرح نکل جائے اور اس بچہ سے متعلق ہی نہ ہو۔

پھر ایسے شخص کا وجود کہ اس نے مدت دراز تک انسان کا گوشت کھایا ہو اور اس سے لڑکا بھی پیدا ہو گیا کس دلیل سے معلوم، خالی خولی امکانی ہوائیوں سے کام تو نہیں چلتا کیونکہ یہ دلیل معارضہ کی شکل میں ہے (دوسرے کی دلیل کو کاٹنا معارضہ کہلاتا ہے) اور معارض کو دلیل چاہیئے احتمال اس کو کافی نہیں۔ اور وقوع ممنوع ہے۔ یہ طریق دلیل بازی (جدل) ہے۔ تحقیق کلام یہ ہے کہ بدن انسانی کے بعض

اجزاء غذا نہیں بن سکتے، جیسے روح ہوائی کہ عرف عام میں اسی کے نکل جانے کا نام موت ہے یہ جزو بدن ہونے کے باوجود غذا نہیں بن سکتی اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہ کسی دوسرے بدن کا جز بن سکتی ہے اور پھر بہت سے غذائی اجزاء کھانے سے پہلے ہی بطریق تحلیل جدا ہو کر چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ سارے اجزاء ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ بوقت حشر ان سب کو جمع کر کے روح ہوائی کا کنکشن ان سے جوڑ کر ان کو انسانی بدن کی شکل میں تبدیل فرمادے گا۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ دکھ، سکھ کا اصلی تعلق روح سے ہے اس لئے عذاب سے وہی دکھ پاتی ہے اور نعمت سے لطف اندوز ہوتی ہے، بدن کا واسطہ البتہ ضرور ہوتا ہے اور بدن بغیر روح کے ایک پتھر ہے، اسی لئے اس کا دکھ پانا یا لطف اندوز ہونا متصور نہیں۔ اور دکھ دینے بالذات پہنچانے میں ہمارا بدن کافی ہے۔ لہٰذا اگر اس کا پہلا بدن باقی ہے اور اس کو ثواب وعقاب کا مورد بنانے میں کوئی قباحت نہیں تو اسی بدن پر اکتفا کیا جائے گا ورنہ دوسرا بدن پیدا کیا جائے گا، اب وہ خواہ پہلا ہی بدن ہو یا وہ ہو جو کھانے والے کے کھانے سے پہلے خلل پذیر ہو چکا تھا۔ پھر اس پر ثواب وعقاب ہوگا۔

یہ شکل تناسخ کی نہیں ہے کیونکہ تناسخ کا تو یہ مطلب ہے کہ دنیاوی ابدان میں روحیں لطلب کمال منتقل ہوتی رہتی ہیں اور یہاں بحث اس بدن کی ہے جو آخرت میں جزا و سزا کے لئے پیش ہوگا۔ اسی بعینہٖ بدن کی حفاظت جزا کے لئے ضروری نہیں کیونکہ ابدان میں زیادتی کمی کے ساتھ گھٹنا بڑھنا، احادیث متواترہ سے ثابت ہے بلکہ قرآن کی نصوص سے بھی ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ	جب ان کی کھالیں جل جایا کریں گی تو ہم ان کی کھالیں بدل
جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ	دیں گے تاکہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔

مشاہدات میں اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص سے لباس پوشی کی حالت میں کوئی جرم سرزد ہوا اور وہ اسی حالت میں گرفتار ہو گیا تو وہ اسی حال میں سزا پائے گا لیکن اگر گرفتاری کے وقت وہ بے لباس عریاں تھا۔ تو بقدر ستر عورت اس کے بدن پر لباس ڈال کر سزا دیں گے۔ گویا روح سے بدن کی نسبت ایسی ہے جیسے کسی شخص کی لباس کی نسبت ہے

شخص صاحب لباس راچہ خلل ہر دمبدم گر شود لباس بدل

(لباس اگر بار بار بھی بدلا جائے تو اس سے صاحب لباس کی شخصیت میں کیا فرق پڑے گا)

اسی لئے عرف میں، بچپن سے لیکر بڑھاپے تک باوجود اجزائے بدن کے بدل جانے اور باوجود امراض، یا شخصی محنت ومشقت کے سبب خلل پذیر ہونے کے وہ شخص باقی رہتا ہے اور کسی کے دل میں یہ وہم تک نہیں آتا کہ بوڑھا وہ نہیں ہے جو ستر سال پہلے بچہ تھا۔ پھر باوصف ان تبدیلیوں کے، انعام وعقاب کے احکام اس پر بلا کسی انکار کے بدستور جاری رہتے ہیں۔

بعض امامیہ اپنے مذکورہ دعویٰ پر ان آیات سے دلیل لاتے ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ آخرت میں جزا اعمال سے وابستہ ہے مثلاً۔

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ	یہ ان عملوں کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔
يَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ۔	جس دن ہر نفس کو اس کے عمل کے سبب بدلہ دیا جائے گا
لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ	اس دن ظلم بالکل نہیں ہوگا۔
فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ	جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ بھی اس کی نظر کے سامنے ہوگی۔

یہ آیات ثبوت میں پیش کر کے بعض امامیہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جزاء کا سبب عمل ہے۔ تو گویا مطیع و فرمانبردار کو ثواب اور

نافرمان کو گناہ کے بدلے عذاب دینا واجب ہوا۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ گو آیات جزا کے وقوع پذیر ہونے اور اعمال پر ثواب و عقاب مرتب ہونے پر تو دلالت کرتی ہیں، مگر خدا تعالیٰ پر اس وجوب کو کسی طرح بھی نہیں بتاتیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو نہ تو باقاعدہ نوکر رکھتا ہے اور نہ اس کی خدمت و تقصیر پر باقاعدہ کوئی قول و قرار کرتا ہے ایسی صورت میں اگر وہ خدمت پر انعام یا تقصیر پر سزا دے تو یہ تو کہا جائے گا کہ اسے انعام یا سزا اس کی خدمت یا تقصیر کے بدلہ میں ملے مگر یہ دونوں باتیں نوکر رکھنے والے پر کسی قاعدہ سے بھی واجب نہیں کہی جائیں گی۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر گناہوں پر سزا دینا واجب ہوتا۔ تو گناہ کبیرہ کے سلسلے میں یہ وجوب ہو سکتا تھا۔ مگر نص قرآنی میں وقوع کے اعتبار سے اس کے واجب نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے چہ جائیکہ اس کے عقلی وجوب کی بات کی جائے۔

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۔ — اللہ کے ساتھ جو شرک کرے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں کریگا ہاں اس کے علاوہ جس کی چاہے گا مغفرت فرمائے گا۔

عقیدہ (۳) :۔ کہ عذاب قبر حق ہے۔ اہل سنت کا یہی مسلک ہے۔ مگر شیعوں کے اکثر فرقے حتیٰ کہ زیدیہ بھی عذاب قبر سے انکاری ہیں حالانکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات قبر کے عذاب اور اس کی راحتوں پر دلالت کرتی ہیں جیسے فرمایا گیا۔

مِمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا ۔ — اپنے گناہوں کی بدولت غرق کئے گئے اور پھر دوزخ میں ڈالے گئے

اور حرف " فا " ایک چیز کے بلا وقفہ بعد میں آنے کو بتاتا ہے اور صیغہ چونکہ ماضی کا ہے اسلئے معلوم ہوا کہ ڈوبتے ہی بلا وقفہ و فاصلہ کے وہ زمانہ ماضی میں دوزخ میں ڈالے گئے۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۔ صبح و شام ان کا سامنا و سابقہ آگ سے پڑتا ہے۔

اس آیت میں عذاب قیامت کا عطف اس پیش ہونے والے عذاب پر مدعا کی صداقت پر صاف دال ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیز آئمہ سے اخبار احادیث بطریق تواتر اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

اسی طرح قبر کی نعمتوں اور راحتوں کا ذکر بھی بہت سی آیات میں آیا ہے مثلاً

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ — جو اللہ کے راستہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے انہیں رزق ملتا رہتا ہے۔

یا ارشاد ہوا۔

يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ۔ — کاش مری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے خدا نے میری مغفرت فرما دی۔ اور مجھے عزت داروں میں سے بنا دیا۔

یہ واقعہ یقیناً قیامت سے پہلے کا ہے کیونکہ قیامت کے دن تو ہر ایک ہی کو اس کا حال اور اس کی مغفرت اور اعزاز و اکرام معلوم ہو جائیگا قبر کی جزا سزا کے منکر بطور دلیل سمعی و عقلی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۔ — انہیں موت کا مزہ قبر میں پہلی موت ہی کے وقت چکھنا ہوگا۔

کہ اگر قبر میں زندگی ہوتی تو لازماً اس زندگی کی موت بھی ہوتی کیونکہ قیامت کے دن زندہ کئے جانے کا ثبوت تو بالاجماع ہے تو اس صورت میں دو موتوں کا مزہ چکھنا ظاہر ہوتا ہے حالانکہ قرآنی آیت میں ایک ہی موت کے مزہ کا ذکر ہے "۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قبر کی زندگی و موت حقیقی طور پر متحقق نہیں، بلکہ روح و جسم کے ایک تعلق کا نام ہے کہ روح جب اس بدن پر اپنی شعاعیں ڈالتی ہے تو بدن سے ربط قائم ہو جاتا ہے اور قبر سے مناسب ماحول میں بدن کو تازگی ملنے لگتی ہے۔ ایسی زندگی نہیں جیسی دنیا میں تھی کہ وہاں بدن غذا کھاتا اور بڑھتا تھا۔ بلکہ وہ تعلق مثال کے طور پر ایسا ہوتا ہے جیسا محب و محبوب کا یا آقا و غلام کا۔ یا گھر والے اور گھر کا۔

اور اتنا تعلق، رنج پہنچانے یا راحت دینے میں کافی ہوتا ہے اور یہ صورت بھی اسی وقت ہوتی ہے جب قبر میں بدن صحیح وسالم موجود ہو اور اسے دفن کیا گیا ہو۔ ورنہ عذاب وعیش سب روح کا ہوگا یعنی نفس مجردہ کا کہ اس کا حقیقی بدن روح ہوائی ہے جس کا تعلق دوسرے کسی بدن سے جو عالم مثال کا ہو، یا اجزائے جمادیہ سے اسی ماہیت وشکل میں ترتیب دیا گیا ہو کہ دیکھنے والے کو اس بدن مثالی، یا جمادی میں اور دنیاوی بدن میں کوئی فرق وتمیز نہ معلوم ہو! اور یہ تناسخ کی شکل نہیں ہے کیونکہ تناسخ تو اسے کہتے ہیں کہ روح ایک بدن سے نکل کر دوسرے بدن کی تدبیر میں مصروف ہو اور غذا حاصل کرنا اور بدن کا بڑھنا بھی جاری رہے۔ اور یہ زیر بحث تعلق ایک احساسی تعلق ہے کہ جس کے سبب وہ دکھ یا راحت محسوس کر سکے!

چنانچہ طبرسی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں اپنی سند سے علی بن مہزیار سے وہ قاسم بن محمد سے اور وہ حسین بن احمد سے اور وہ یونس بن ظبیان سے روایت کرتا ہے۔

قَالَ كُنْتُ عِنْدَ أَبِي عَبْدِ اللّٰهِ جَالِسًا فَقَالَ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ فِي أَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِيْنَ قُلْتُ يَقُوْلُوْنَ فِي حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ فِي قَنَادِيْلَ تَحْتَ الْعَرْشِ فَقَالَ أَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْمُؤْمِنُ أَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ أَنْ يَّجْعَلَ رُوْحَهٗ فِي حَوْصَلَةِ طَائِرٍ غَيْرِ مَأْنُوْسٍ اَلْمُؤْمِنُ إِذَا قَبَضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى صَيَّرَ رُوْحَهٗ فِي قَالِبٍ كَقَالِبِهٖ فِي الدُّنْيَا فَيَأْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُوْنَ فَإِذَا قَدِمَ عَلَيْهِمُ الْقَادِمُ عَرَفَهُمْ بِتِلْكَ الصُّوْرَةِ الَّتِيْ كَانَتْ فِي الدُّنْيَا وَعَنْهُ عَنْ أَبِي عُمَيْرٍ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ أَبِي بَصِيْرٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ أَرْوَاحِ الْمُؤْمِنِيْنَ فَقَالَ فِي الْجَنَّةِ عَلٰى صُوَرِ أَبْدَانِهِمْ لَوْ رَأَيْتَهٗ لَقُلْتَ فُلَانٌ۔ اِنْتَهٰى۔

(ترجمہ) وہ کہتا ہے کہ میں ابی عبداللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، انہوں نے مجھ سے پوچھا ارواح مومنین کے متعلق لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں اور وہ عرش کے نیچے قندیلوں میں! ابوعبداللہ نے کہا سبحان اللہ! اللہ کے نزدیک مومن پرندوں کے پوٹوں میں رکھے جانے سے زیادہ باعزت ہے جن سے وہ غیر مانوس ہے۔ درحقیقت جب اللہ تعالیٰ مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اسے اسی قالب میں واپس اتارتا ہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھا۔ پس وہ کھاتے ہیں اور پیتے ہیں جب کوئی آنے والا ان کے پاس آتا ہے تو وہ ان کی دنیاوی صورت کی وجہ سے ان کو پہچان لیتا ہے۔ اسی طرح اس نے ابی عمیر سے اس نے حماد سے اس نے ابی نصیر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ابوعبداللہ سے مومنوں کی ارواح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ جنت میں اپنے دنیاوی شخص کی حالت میں ہیں کہ تو اگر اس کو دیکھے تو کہہ اٹھے یہ فلاں شخص ہے"

بہرحال بدن سے روح کا تعلق اس طرح کا ہو یا اس طرح کا عرف میں اسی تعلق کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور دو صورتوں (انشا) کی درمیانی مدت میں جب یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اسے موت کے نام سے یاد کیا ہے۔ رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ الخ (اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا۔ دو مرتبہ زندہ کیا) یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی موت سے موت کا ایک فرد مراد ہو، اور ممکن یہ بھی ہے کہ مراد جنس موت ہو! جو زندگی بہشت سے پہلے ہے خواہ ایک بار ہو خواہ دوبارہ۔ اس صورت میں ان کا استدلال اصل سے باطل ہوا۔

الاصدر الشیرازی کی شواہد الربوبیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

اِعْلَمْ اَنَّ الْاَرْوَاحَ مَادَامَتْ اَرْوَاحًا لَا یَخْلُوْ عَنْ تَدْبِیْرِ اَجْسَامٍ وَالْاَجْسَامُ قِسْمَانِ قِسْمٌ تَتَصَرَّفُ فِیْهِ النُّفُوْسُ تَصَرُّفًا اَوَّلِیًّا ذَاتِیًّا مِنْ غَیْرِ وَاسِطَةٍ وَقِسْمٌ تَتَصَرَّفُ فِیْهِ تَصَرُّفًا ثَانَوِیًّا بِالْعَرْضِ بِوَاسِطَةِ جِسْمٍ اٰخَرَ قَبْلَهٗ وَالْقِسْمُ الْاَوَّلُ لَیْسَ مَحْسُوْسًا بِهٰذِهِ الْحَوَاسِّ الظَّاهِرَةِ لِاَنَّهٗ غَائِبٌ عَنْهَا فَاِنَّهَا اِنَّمَا یَحِسُّ بِالْاَجْسَامِ الَّتِیْ مِنْ جِنْسِ مَا یَحْمِلُهَا مِنْ هٰذِهِ الْاَجْرَامِ كَالْقُشُوْرِ وَیُؤَثِّرُ فِیْهِمَا سَوَآءٌ كَانَتْ بَسِیْطَةً كَالْمَآءِ وَالْهَوَاءِ اَوْ مُرَكَّبَةً كَالْمَوَالِیْدِ وَسَوَآءٌ كَانَتْ لَطِیْفَةً كَالْاَرْوَاحِ الْبُخَارِیَّةِ اَوْ كَثِیْفَةً كَهٰذِهِ الْاَبْدَانِ اللَّحْمِیَّةِ الْحَیَوَانِیَّةِ وَالْاَجْسَادِ النَّبَاتِیَّةِ فَاِنَّ جَمِیْعَهَا مَا یَسْتَعْمِلُهَا النُّفُوْسُ وَیَتَصَرَّفُ فِیْهَا بِوَاسِطَةٍ وَاَمَّا الْقِسْمُ الْاَوَّلُ الْمُتَصَرَّفُ فِیْهَا النُّفُوْسُ فَهُوَ مِنَ الْاَجْسَامِ النُّوْرِیَّةِ الْاُخْرَوِیَّةِ بِحَیٰوةٍ ذَاتِیَّةٍ غَیْرِ قَابِلَةٍ لِلْمَوْتِ وَهِیَ اَجَلُّ رُتْبَةً مِنْ هٰذِهِ الْاَجْسَامِ الْمُشِفَّةِ الَّتِیْ تُوْجَدُ هٰهُنَا وَمِنَ الرُّوْحِ الَّتِیْ یُسَمّٰی بِالرُّوْحِ الْحَیَوَانِیِّ فَاِنَّهٗ مِنَ الدُّنْیَا وَاِنْ كَانَ شَرِیْفًا لَطِیْفًا بِالْاِضَافَةِ اِلَی الْغَیْرِ وَلِهٰذَا یَسْتَحِیْلُ وَیَضْمَحِلُّ سَرِیْعًا وَلَا یُمْكِنُ حَشْرُهٗ اِلَی الْاٰخِرَةِ وَالَّذِیْ كَلَامُنَا فِیْهِ مِنْ اَجْسَامِ الْاٰخِرَةِ وَهِیَ تُحْشَرُ مِنَ النُّفُوْسِ وَیَتَّحِدُ مَعَهَا وَیَبْقٰی بِبَقَآئِهَا۔ اِنْتَهٰی۔

(ترجمہ) یہ سمجھ لو کہ روحیں جب تک روحیں ہیں اجسام کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہیں اور جسم دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں نفوس ذاتی، اوّل اور بغیر کسی واسطے کے تصرف کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن میں وہ ثانوی، بالعرض اور دوسرے جسم کے واسطے سے تصرف کرتے ہیں جو اس سے پہلے ہے۔ قسم اول ان حواس ظاہرہ سے محسوس نہیں ہوتے کیونکہ وہ اس ان حواس کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ حواس تو انہیں اجسام کو محسوس کر سکتے ہیں جو ان اجرام کی قسم سے ہوں۔ جیسے کھال۔ اور یہ اجسام ان اشیاء میں اثر و تصرف کرتے ہیں جو ہوا و پانی کی طرح بسیط ہوں خواہ مرکب جیسے موالید ثلاثہ۔ اور خواہ ارواح بخاریہ کی طرح لطیف ہوں خواہ کثیف جیسے گوشت پوست کے حیوانی بدن اور نباتاتی اجسام کیونکہ ان سب میں نفوس بالواسطہ تصرف کرتے ہیں۔ بلا واسطہ ان کو استعمال نہیں کرتے۔ اور اجسام کی قسم اول جن میں نفوس تصرف کرتے ہیں تو وہ اجسام نوری اُخروی ہیں جن کو حیات ذاتی نصیب ہے، جو موت کو قبول نہیں کرتی۔ یہ بلند رتبہ ہیں۔ ان شفاف اجسام سے جو یہیں پائے جاتے ہیں اور اس روح سے جسکو حیوانی روح کہتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں ہے اگرچہ وہ دوسرے کے لحاظ سے شریف تر و لطیف تر ہے اسی لئے وہ جلد تغیر حاصل کر لیتی ہے اور نابود ہو جاتی ہے اور اس کا حشر بھی آخرت میں ممکن نہیں۔ اور ہمارا کلام جس میں ہے وہ آخرت کے اجسام ہیں اور ان کا نفوس کے ساتھ حشر ہوتا ہے اور ان کے ساتھ متحد رہتے ہیں اور ان کے باقی رہنے تک باقی رہتے ہیں» (بات ختم ہوئی)

اس سلسلہ میں ان کی عقلی دلیل یہ ہے کہ سوال و جواب، بات چیت، لذت والم، اور ادراک یہ سب حیات پر موقوف ہیں اور حیات اس ڈھانچہ کی شکست و ریخت اور بدنی مزاج کے مختل و باطل ہونے کے بعد ممکن نہیں۔ لہٰذا ان امور کا میت کو لاحق ہونا امکان سے خارج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے بدن مردہ ہے روح نہیں، اور ٹوٹ پھوٹ اور مزاج کا بطلان اور اس کے تغیرات بدن پر واقع ہوتے ہیں روح پر نہیں۔ ہاں جسمانی لذت اور دکھ پانے کے لئے اور حواس کے اعمال کے لئے یا تو اس کے اپنے بدن سے تعلق کر دیا جاتا ہے، یا اس مثالی بدن سے جو تدبیر و تصرف اور غذا و نمو حاصل کرنے سے بالاتر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جب روح بدن سے جدا ہوئی تو قوائے نباتی بھی اس کے ساتھ جدا ہوئے قوائے نفسانی اور جسمانی وحیوانی جدا نہیں نہیں ہوئے اگر قوائے نفسانی وحیوانی کا وجود بطور فیضان یا بطور بقا قوائے نباتی و مزاج کے ساتھ مشروط ہو تو یہ لازم آئے گا کہ فرشتے، شعور و ادراک حسی حرکت غضب و دفع منافرے سے محروم ہوں۔ لہٰذا ارواح قبروں میں فرشتوں کی طرح ہیں کہ وہ شکل و بدن کے توسط سے کام کرتے ہیں اور حیوانی ونفسانی افعال کا ان سے صدور ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ان میں نفس نباتی کار فرما ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرشتوں کو بلحاظ اعمال، نعمت و عذاب سے کوئی واسطہ نہیں، اور روحوں کو ان کے اعمال کی بنا پر یا نعمت سے نوازا جائے گا یا عذاب سے دکھ دیا جائے گا۔

اور اس سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مردہ جو زمین پر پڑا ہوا ہے یا سولی دیا ہوا کوئی انسان جو کسی درخت پر لٹکا ہوا مدت تک اسے یونہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اعضا و اجزا شکستہ و ریختہ ہو کر ختم ہو جائیں، اب نہ اس میں زندگی ہے نہ قیام و قعود ہے۔ نہ حرکت نہ گفتگو، نہ سوال و جواب اور نہ ہی ان امور کے آثار ہی پائے جاتے ہیں۔ بلکہ ہم نے اس کے سینہ پر رائی کے دانے بھی ڈالے، مگر وہ اسی طرح پڑے رہے اسی طرح کافر مردہ کے بدن کو دیکھا بھالا، مگر اس میں چلنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

اس شبہ کا جواب گذشتہ تقریر سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس میت کی روح کو اس انداز کے موافق کہ وہ ادراک کر سکے اور دکھ سے متاثر ہو سکے یا تو انہی عنصری ابدان سے جوڑ دیتا ہے یا دوسرے ابدان مثالیہ مخترعہ سے۔ اور یہ کام انجام دیتا ہے۔

اب رہا ان حرکات کا محسوس نہ ہونا تو یہ ان کے سرے سے نہ ہونے اور واقع نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ حرکات تو حرکات ہم فرشتوں اور جنوں کی ذاتوں اور اشخاص کو بھی حواس سے ادراک نہیں کر سکتے حالانکہ سنی و شیعہ ہر دو مذاہب میں ان کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک سونے والا سوتے میں کسی عورت سے پورے طور پر لذت اندوز ہوتا ہے کہ خارج میں اس کا ثبوت بصورت احتلام ظاہر بھی ہوتا ہے لیکن کوئی پاس بیٹھنے والا اس کے بدن پر ان لذتوں کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں کرتا۔

نیز حکما اور فلاسفہ ستاروں کی حرکات کے قائل ہیں اور ان کی روحانیات کی مدد کو بھی مانتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ ثابت بن قرہ کے حوالے سے یہ بات باب دوم میں نقل کی جا چکی ہے۔ اور خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ ادھر تو رائی کے دانوں کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھے اور اُدھر میت کی روح کو بدن سے پیدا کردہ تعلق کے ذریعہ نعمت سے لطف اندوز یا عذاب سے دکھی رکھے، زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بعید از وقوع بات ہے۔ مگر اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ جب ایک چیز عقلاً ممکن ہو اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر بھی دیں تو وہ بات واجب القبول ہو خواہ وہ عادت و تجربہ کے موافق ہو یا نہ ہو۔ جیسے سرد ممالک کے حالات گرم ممالک کے باشندوں کے لئے اچنبھا اور انہونی لگتی ہے اور وہ اسے بعید الوقوع سمجھتے ہیں۔

حالانکہ ان کا وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ ایک مجوسی خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مردوں کی تین کھوپڑیاں لئے ہوئے آیا اور کہنے لگا کہ تمہارے رسول نے فرمایا ہے کہ جو دنیا سے بے ایمان جاتا ہے اس کو آگ سے جلاتے ہیں، آپ نے فرمایا بے شک ایسا ہی فرمایا ہے تو وہ کہنے لگا۔ یہ کھوپڑیاں میرے ماں، باپ اور بھائی کی ہیں، ان پر ذرا ہاتھ رکھ دیکھو کیا ان میں حرارت و گرمی ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوہے کا ایک ٹکڑا اور پتھر مجوسی کے سامنے رکھ کر کہا ذرا ان پر ہاتھ تو پھیرو کوئی حرارت محسوس ہوتی ہے مجوسی نے ہاتھ پھیر کر کہا نہیں! پھر آپ نے لوہے کو پتھر پہ مارا تو چنگاری نکلی، تو اس سے پوچھا یہ آگ کہاں سے نکل پڑی؟ وہ کہنے لگا کہ لوہے پتھر کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ رگڑنے سے ظاہر ہو گئی آپ نے فرمایا پھر تو کیسے انکار کرتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ان کھوپڑیوں میں بھی آگ چھپی ہوئی ہو اور تیرے ہاتھ کو محسوس نہ ہوتی ہو۔ مجوسی بات کی تہ کو پہنچ گیا اور توبہ کر کے مسلمان ہو گیا۔

دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ لوہے و پتھر میں چھپی ہوئی آگ تو ان کے رگڑنے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر کافر کے بدن کی آگ کچھ ایسی چھپی

ہوئی ہے کہ بالکل ہی معلوم و محسوس نہیں ہوتی۔ اور ایسا یوں ہے کہ جن وانس پر غفلت کا پردہ پڑا رہے! اور ایمان بالغیب کی اہمیت کم نہ ہو۔

اور پھر اس مریض کے بارے میں کوئی کیا کہیگا جس کے دل یا دیگر اعضا میں گرم گرم بخارات یا بھڑنے والا مادہ حرارت پیدا کرتا رہتا ہے جیسا درد والے یا دوسرے مریضوں کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے حالانکہ اوپر والے پر بدن پر گرمی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا۔ اور جب قبر جزاء وسزاء کی پہلی منزل ہے تو اس کے اسرار و بھید کو اس عالم دنیا میں آشکارا اور بے نقاب کرنا ایمان بالغیب کے منافی ہے اور اس دار التکلیف دنیا کے مخالف وضد۔ جس کی بنیاد سراسر عقل کے امتحان پر ہے نہ ظاہر اور حس پر!! اس کے باوجود مکلفین کو چونکانے اور تنبیہ کرنے کی غرض سے کبھی کبھی لوگوں پر قبر کے حالات بھی منکشف ہو جاتے ہیں اور خواب میں کبھی جاگتے میں بھی بعض مردوں کے اچھے یا بُرے حالات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لہذا عقلاء کے اکثر و بیشتر فرقوں کے نزدیک بعد از موت عذاب و ثواب کی حقیقت قطعی اور یقینی ہے یہی وجہ ہے کہ کیا کافر کیا مسلمان ہر فرقہ اپنے مردوں کی امداد و اعانت کے لئے اپنے اپنے طور ایصال ثواب کے مختلف طریقے اختیار کرتے اور بڑے صدق قول سے ان میں مشغول و مصروف رہتے ہیں اگر اس عالم آخرت کے خوف و امید کی کوئی اصلیت و حقیقت نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کس لئے ہوتا۔

عقیدہ (۴) —— قرآن و حدیث میں جو کچھ آتا ہے کہ قیامت کے دن سوال و جواب ہوگا۔ اعمال تولے جائیں گے اچھے بُرے اعمال نامے لوگوں کے ہاتھوں میں تھمائے جائیں گے صراط قائم ہوگی۔ حوض موجود ہوگا۔ شفاعت ہوگی وغیرہ وغیرہ یہ سب ظاہر معنی پر محمول ہیں۔ ان کے معنوں میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ اسی طرح جنت و دوزخ کا وجود برحق ہے اور جنت و دوزخ کے اندرون کی جو کچھ تفصیل آئی ہے مثلاً حور و قصور و غلمان، نہریں، درخت، فواکہ و اثمار، یا سانپ، بچھو، آگ، وادی اور کھائیاں۔ کھالوں کا پکنا اور ان کی جگہ دوسری کھالوں کا پیدا ہو جانا وغیرہ وغیرہ سب صحیح درست اور برحق ہیں۔ اہل سنت کا یہی مذہب و مسلک و اعتقاد ہے مگر رافضیوں کے اکثر فرقے مثلاً زیدیہ و اسماعیلیہ وغیرہ ان چیزوں سے انکار کرتے اور ان میں تاویلات کے پیوند لگاتے ہیں۔

ان کی تردید و تکذیب جس انداز میں قرآنی آیات و احادیث رسول، جیسے دو گواہ عادل کر رہے ہیں وہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔

عقیدہ (۵) —— کہ تناسخ غلط اور باطل ہے۔ مگر شیعوں کے اکثر فرقے مثلاً قرامطہ، کاملیہ، منصوریہ اور مفضلیہ وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا ہے وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں آتی جاتی رہتی ہیں اور روحوں کی اسی آمد و رفت کا نام معاد (آخرت) ہے۔

کامل الاعتقاد و الطاعات افراد کی روحیں ایسے اشخاص کے اجسام میں منتقل ہوتی ہے جو صاحب نعمت و ثروت ہوں، صاحب عافیت و صحت ہوں مثلاً سلاطین امراء حکام وغیرہ اور اس روح کی جنت یہی ہے اور گھٹیا اور گناہ آلود افراد کی روحیں ان اشخاص کے بدنوں میں گھستی ہیں جو بھوکے ننگے، بے نوا، گداگر ہوں، یا مریض اور صدموں کا مارا ہوا ہو۔ یا کبھی ان حیوانوں کی جون چلی جاتی ہیں جو باعتبار اوصاف ان کے ہم رنگ ہوں مثلاً حریص کے لئے، چیونٹی، بہادر متکبر کے لئے شیر، چیتا وغیرہ یا بزدل کے لئے خرگوش، عیار و مکار کے لئے لومڑی، مسخرے کے لئے بندر چور کے لئے ریچھ اور خود پسند کے لئے مور (طاؤس) کے ابدان باعتبار اوصاف، جائے قیام بنتے ہیں۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ دراصل ہندوؤں سے مانگا تانگا ہے اور کچھ ان کی قرآنی تحریف کا کارنامہ ہے کہ بعض آیات میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے اپنے عقیدہ کی پیوندکاری کرتے ہیں۔ مثلاً۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ
يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ۔

حالانکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ جانور، چرند، پرند، بنی آدم ہی کی طرح جداگانہ انواع پر مشتمل ہیں کہ ان میں ہر ایک کو اس کی خلقت کے مناسب خاص خاص احکام و اوصاف عطا کئے گئے ہیں اگر یہ آیت تناسخ کی طرف اشارہ کرتی ہو تو یہ لازم تھا کہ جانوروں کی پہلی پیدائش نہ ہوتی۔

اور وہ سب کے سب افراد حیوانی ہوں، جو حقیقت میں تو آدمی تھا مگر تناسخ کی وجہ سے جانور بن گیا ہے حالانکہ جو تناسخ مانتے بھی ہیں ان کا بھی یہ مذہب نہیں ۔ یا یہ آیت كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا ۔ کہ یہ ان دوزخیوں کے حق میں ہے جو عذاب میں جکڑے ہوئے ہیں ان ارواح کے بارے میں نہیں ہے جو دنیا میں مشکل ہوتی رہتی ہیں ۔ یا یہ آیت كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا ۔ کہ اس میں ضمیر صاف طور پر آخرت کی آگ پر پھرتی ہے کہ جب وہ نار جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو واپس ہی دھکیل دئے جائیں گے ۔ اسی طرح کا معاملہ ان احادیث کا ہے جو قیامت کے دن صورتوں کی تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں یا اس بات پر کہ حشر کے دن لوگوں کو مختلف صورتوں پر اٹھایا جائے گا ۔ ان احادیث کا تناسخ سے دور پرے کا واسطہ بھی نہیں، کیونکہ تناسخ تو یہ ہے کہ عالم دنیا میں ایک روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہو ۔ عالم آخرت کی منتقل سے تناسخ بحث ہی نہیں کرتا ۔ اور ان احادیث کی دلالت عالم آخرت پر ہے ۔ عالم دنیا پر نہیں ۔

اور پھر تناسخ کی تعریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دوسرا بدن اپنے تمام اجزاء میں پہلے بدن کا مغائر ہو ۔ یہ نہیں کہ بدن تو پہلا ہی ہو شکل و صورت بھی وہی ہو مگر اجزائے بدن میں انبساط، یا پھیلاؤ وغیرہ ہو جائے ۔ تناسخ والے بھی اس کو نہیں مانتے اور اسی کے ساتھ قابل لحاظ ایک بات یہ بھی ہے کہ قطعی دلائل سے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ اعمال کا بدلہ تناسخ کی شکل میں ناممکن و محال ہے کیونکہ بدلہ پانے کے وقت کسی عمل کی تکلیف محال ہے اور تکلیف سابق کے بغیر بدلہ کا تصور محال ہے اور تناسخ کے وقت یہ دونوں محالات لازم آتے ہیں اور اس کا ثبوت ہے کہ یہ محالات لازم آتے ہیں اور یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اچھے یا برے عمل کئے، اور مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے انسانی بدن میں منتقل ہوئی یہ حالت ایسی ہوگی کہ وہ مکلف بھی ہے اور جزا یافتہ بھی ۔ کیونکہ ہر فرد انسانی بغیر مکلف کئے ادھر میں نہیں لٹکایا جاتا ۔ اس کی حیات کا ایک ایک سیکنڈ عالم تکلیف میں ہوتا ہے اور اگر اس روح کی منتقلی کسی ایسے بدن میں ہوئی جو غیر مکلف ہے جیسے بچہ، یا مجنون یا کوئی حیوان ۔ اب اس بدن کی موت کے بعد روح لامحالہ یا تو کسی مکلف انسانی بدن میں منتقل ہوگی یا غیر مکلف اور حیوانی بدن میں، اور اس کو اس بدنی زندگی میں راحت بھی پیش آئے گی ۔ اور تکلیف بھی تو یوں وہ جزا یافتہ ہوا ۔ حالانکہ اس سے پہلے کی زندگی میں اس کو مکلف ہی نہیں کیا گیا تھا ۔ اور یہ دکھ سکھ محض اتفاقی ہو کسی عمل کے سلسلہ میں نہ ہو تو پھر جزا، جزا ہی نہ رہی کیونکہ جزا تو عبرت و تنبیہ کے لئے ہوتی ہے جب گناہگاروں کی طرح بے گناہ بھی اس کے شریک ہوئے تو پھر یہ جزا عبرت کیسے ہوئی اور محل عمل خلط ملط ہوگیا ۔ اور جو باتیں مطیع و فرمانبردار کو پیش آتی تھیں وہ غیر مطیع و نافرمان کو بھی پیش آئیں تو مطیع اعزاز و اکرام سے محروم ہوگیا ۔

اور ایک نکتہ قابل غور یہ بھی کہ اگر مومنین، صالحین بلکہ انبیاء و آئمہ کی ارواح عیش پرست، فاسق و فاجر سلاطین و امراء کے بدن میں منتقل ہوں تو یہ لازم آتا ہے کہ موت ثانی کے بعد بزرگوں کی روحیں عذاب پائیں گی ۔ اور ان کی نیک بختی، بدبختی سے بدل جائے گی اور عزت و تکریم کے بجائے ذلت و اہانت سے دوچار ہوں گے ۔ اور اگر اس کا الٹ ہو کر امراء و حکام ۔ و سلاطین انبیاء و صلحاء کے اجسام میں نمودار ہو، تو یہ ضروری ہے کہ انبیاء و صلحاء زمانہ ماسبق کے انبیاء و صلحا سے کمتر نہ ہوں، اوصاف میں زائد ہوں گے یا کم از کم برابر و ہم رتبہ ۔ اور وہ سب کے سب بشکل انبیاء و صلحا ۔ عیش پرست اور آسودہ حال ہوں گے ۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے ۔ نیز روح کی بدن سے وابستگی کے بعد بدن کتنا بھی نعمت و آسودگی سے مالامال ہو ۔ وہ رنج و الم سے بچا نہیں رہ سکتا ۔ مثلاً بھوک، درد، بیماری یا اسی جیسی تکالیف اس کو کیسے معاف کردیں گی ۔ تو اس صورت میں فرمانبرداروں، انبیاء و ائمہ کو دکھ دینا لازم آیا جو صاف ظلم ہے اور اسی طرح روح کے بدن سے منسلک ہو جانے کے بعد اسے کتنے ہی رنج و الم پیش آئیں ۔ راحت و خوشی سے بھی وہ محروم نہ ہوگی گو وہ کسی قدر اور کسی وقت ہو سو ایسی صورت میں سرکشوں اور جابروں کا نعمت سے لطف اندوز ہونا لازم آیا ۔

ایک اور بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر ابدان غیر متناہی ہیں تو نوع انسانی کا قدیم ہونا لازم آتا ہے ۔ بلکہ ہر زمانہ میں انسانی ابدان کا

اگلے زمانہ سے کم ہونا محال ہوگا اور اگر وہ کسی حد پر ختم ہو تو آخر کی طرف ختم ہونے سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مکلف بدلہ پانے سے بچ جائے۔ اور مشرق کی طرف ختم ہونے سے لازم آتا ہے کہ بغیر تکلیف کا جزا پائے! اور اگر یہ کہیں کہ نوع انسانی کے خاتمہ پر جزا و سزا کا معاملہ آخرت پر اٹھا رکھیں اور وہ وہیں جزا پائیں گے۔ تو ہم کہیں گے کہ اگلے اعمال کی جزا آخری بدن کے اعمال پر ختم ہوئی اور رک گئی ثواب آخری بدن کے اعمال کی جزا آخرت میں ابدی ہوگی اور ہمیشہ ہمیش باقی رہے گی۔ لہذا اگر پہلی جزا عدل پر مبنی تھی تو دوسری جزا سراسر ظلم ہوئی۔ اور اگر دوسری جزاء بمقتضائے انصاف تھی تو پہلی جزا ناقص و ادھوری ثابت ہوئی۔

اور اگر یہ کہیں کہ نوع کے ابتدائی درجہ میں عیش و الم محض اتفاقی تھا جزا کے طور پر نہیں تھا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ پھر بعد میں آنے والے طبقات پر ظلم ہوا کہ وہ اتفاقی عیش و راحت سے محروم رہے۔ اسی طرح اگلے طبقوں کے حق میں بھی ظلم ہوا کہ قصور کے بغیر رنج و الم بھگتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ تناسخ کو جزا کا ذریعہ کہنا عقلی و عرفی ہر دو کے قواعد کے صاف و صریح طور پر مخالف و غلط ہے اور یہاں اس قسم کے تناسخ کا بطلان مقصود ہے۔

عقیدہ (۶):- قیامت سے پہلے مردوں کی دنیا میں واپسی نہیں ہوگی۔ مگر امامیہ تو سب کے سب اور رافضیوں کے کچھ فرقے واپسی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ "پیغمبر، وصی، سبطین، اور ان کے دشمن یعنی خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم، اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید مروان اور دوسرے ائمہ اور ان کے قاتلین، حضرت مہدی کے ظہور کے بعد زندہ ہوں گے اور حادثہ دجال سے پیشتر ان تمام قصور واروں کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے قصاص لیا جائے گا پھر وہ مرجائیں گے اور قیامت میں پھر زندہ اٹھائے جائیں گے۔

ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ کے صریح خلاف ہے کہ بہت سی آیات واپسی کی تردید کرتی ہیں ان میں سے ایک آیت ہے۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

اے میرے پروردگار تو مجھے دنیا میں لوٹا دے کہ وہ کام کرلوں، جو میں نے ترک کردیے تھے ہرگز نہیں۔ یہ یونہی کہنے کی بات ہے جو کہنے والا کہہ رہا ہے۔ اب تو (اس زندگی میں) قیامت تک ایک پردہ حائل رہے گا۔

اس آیت کے آخری جزء "ومن ورائہم" سے شیعہ اپنے دعوی کا اثبات کرتے ہیں مگر اس آیت کی موجودگی میں تو ان کو اتنا کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ چلو نیک اعمال کے لئے واپسی محال ہے، مگر اجرائے حدود و تعزیرات کے لئے واپسی محال نہیں کیونکہ آیت کا آخری حصہ ہی تو مطلقاً واپسی کو رد کرتا ہے۔

شریف مرتضی نے ناصریہ (کتاب) میں کہا ہے کہ عہد مہدی میں، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ایک درخت پر سولی دی جائے گی۔ پھر اس درخت کے متعلق بعض تو یہ کہتے ہیں کہ وہ سولی سے پہلے سرسبز ہوگا مگر سولی کے بعد خشک ہو جائے گا تو بہت سے لوگ بہک کر یہ کہنے لگیں گے کہ یہ بیچارے بے گناہ تھے کہ ان کو خواہ مخواہ سولی دی گئی۔ تب ہی تو یہ سرسبز درخت سوکھ گیا اور بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ پہلے یہ درخت ٹنڈ منڈ سوکھا ہوگا سولی کے بعد ہرا بھرا ہو جائے گا اور اس سبب سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہو جائے گی اب اس ذہنیت پر ماتم کیجئے یا تعجب کہ اس جھوٹ میں بھی تو باہم مختلف ہیں،

اور جابر جعفی جو اس فرقہ کے قدماء میں سے ہے کہ کہتا ہے کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس دنیا میں واپس آئینگے اور قرآن مجید میں قرب قیامت جس دابۃ الارض (زمینی چوپایہ) کے نکلنے کا ذکر ہے اس سے مراد آپ ہی ہیں۔ سبحان اللہ کیا حسن عقیدت ہے! ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو!

اور زیدیہ سب کے سب دنیا میں پھر واپسی کا سختی سے انکار کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اس عقیدہ کو ائمہ کرام کے حوالہ سے بڑے اچھے طریقے پر رد کیا ہے لہذا اہل سنت کو ان خرافات کی تردید کی اب کیا ضرورت! وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ (مومنوں کی طرف سے لڑنے کے لئے اللہ ہی بہت ہے) هُوَ الَّذِیْ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ـــــ

(وہ ذات وہ ہے جسنے تمکو پیدا کیا پھر تمکو مارے گا پھر تمکو زندہ کرے گا پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤگے)

اصول امامیہ کے موافق اس عقیدہ کو باطل ثابت کرنے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کو حد قصاص کی صورت میں دنیا کے ختم ہونے سے پہلے عذاب دیا جائے اور آخرت میں پھر دوبارہ ان کی پکڑ کی جائے تو یہ سراسر ظلم اور کھلی زیادتی ہے اسلئے لامحالہ آخرت میں عذاب سے وہ بری ہوں گے ۔ اور اس صورت میں وہ آخرت کے بڑے اور دائمی عذاب سے چھٹکارا پالیں گے ۔ اور وہاں کی ابدی راحت سے بہرہ ور ہوں گے اور یہ بات سخت خیانت اور بڑے جرم کے سراسر منافی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ۔ (بے شک آخرت کا عذاب بڑا سخت اور باقی رہنے والا ہے) اور اگر دنیا کے عذاب سے مقصد دکھ دینا اور ایذا رسانی ہے تو یہ سب کچھ تو عالم قبر میں ہو ہی رہا ہے اس کے لئے ان کو زندہ کرنا عبث و بیکار ہے اور عبث فعل کا صدور برا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس سے پاک ہونا چاہیئے اور اگر دنیا کے عذاب سے غرض لوگوں کو ان کی خیانت سے باخبر کرنا ہے تو اس کی ضرورت تو ان لوگوں کو تھی جو ان کے عہد میں موجود اور ان کی خلافت کے حق ہونے کا عقیدہ رکھنے والے تھے ۔ اور ان کے معین و مددگار بنے ہوئے تھے ۔ بلکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جناب امیر اور حضرات سبطین رضی اللہ عنہم کو اپنے اپنے عہد میں انتقام کی قدرت دی جاتی تاکہ بعد میں آنے والی امت گمراہی میں نہ پڑتی ۔ اور ان کے کاموں اور کرداروں سے بروقت آگاہ ہو کر ان سے بیزار ہوتی ، انتقام میں اتنی دیر لگانا کہ امت کا اکثر حصہ گذر چکا اور گزرنے والوں کو ان کی " بدکرداریوں " کی برائی کا پتہ تک نہ ہو سکا حکمت کے خلاف اور صلاح کے منافی ہے تو گویا اصلح کا ترک لازم آیا اور کاش یہ آخرت میں ہوتا کہ اگلے پچھلے سارے جمع ہوتے اور سب کے سب اس جزا اور قصاص پر مطلع ہوئے تو وجہ جواز بھی ہوتی ۔ امت کے بیشتر حصہ عمر میں یہ تعزیری واقعہ پیش نہیں آیا اور آخرت کے مجمع عظیم کے سامنے وہ پاک صاف اٹھائے جائیں گے ۔ اب جب دنیا کا دم واپسیں ہے اس وقت کے چند حاضرین ان کی خیانت و گناہ پر مطلع بھی ہوئے تو اس سے حاصل کیا ہوا ۔ وہ اس کو بھی دیگر انقلابات کی طرح کا ایک انقلاب جانیں گے اور کوئی عبرت نہ پکڑیں گے اور پھر ان کو اس وقت زندہ کریں گے تو یہ تمیز و فرق کون کر سکے گا کہ یہ ابوبکر ہیں ۔ یہ عمر ہیں اور یہ معاویہ ہیں (رضی اللہ عنہم) سب کو یہی خیال ہوگا کہ چند لوگوں کے یہ نام رکھ لئے ہیں ۔ جیسے اب بھی ایام عاشورہ میں کسی کا نام یزید ، کسی کا نام شمر رکھ کر ان کی پٹائی کرتے ہیں اور یوں اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں (کتنے شریر تھے یہ یزید و شمر کہ شیعوں کو خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں پٹوانے کا شوشہ چھوڑ گئے کیونکہ ان کا تو نام ہی استعمال ہوا ہے ہڈیاں تو درحقیقت ان کے اپنوں ہی کی ٹوٹتی ہیں ۔ ان کو مار نہیں لگتی ۔ ن)

اور اگر مہدی یا دیگر ائمہ کا یہ کہہ دینا کافی ہو کہ یہ عمر ہیں یہ ابوبکر ہیں (رضی اللہ عنہما) تو پھر ان کا یہ کہنا کیوں کافی نہ ہوا کہ ان کی خلافت ناحق و باطل تھی یا وہ ظلم و غصب کے مرتکب ہوئے ان کو زندہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ۔ پھر اس صورت میں پیغمبر ، وصی اور ائمہ کو عام لوگوں کے مقابلہ میں ایک زائد موت کا مزہ کیوں چکھایا جا رہا ہے موت کے برابر تو کوئی دکھ اور الم نہیں اللہ تعالیٰ کو یہ کب گوارا ہوگا کہ ایک فعل عبث کی خاطر اپنے دوستوں کو الم شدید سے دوبارہ دوچار کرے ۔

اور یہ صورت بھی تو پیش آسکتی ہے کہ جب ان کو زندہ کریں تو وہ قرائن سے یہ جان جائیں کہ ہمیں تعذیب اور قصاص کے لئے زندہ کیا گیا اور سابقہ زندگی میں ہم ناحق اور ائمہ برحق تھے ۔ تو اس تنبیہ کے بعد ہو سکتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرلیں (کیونکہ ظاہر ہے اس وقت تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہوگا) تو پھر ان پر عذاب کا کیا جواز باقی رہے گا (التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ) اور پھر انہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اس صورت میں جناب امیر اور سبطین رضی اللہ عنہم کی کتنی سبکی اور اہانت لازم آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ اتنے ناقدرے تھے کہ ان کے لئے ان کے دشمنوں سے انتقام بھی نہ لیا ۔ اور نہ انہیں کو ان پر حاوی کیا کہ یہ خود ہی اپنا انتقام لے لیتے اور جب سینکڑوں صدیاں گزر جانے پر مہدی پیدا ہوئے تو ان کی فریاد قبول ہوئی اور انتقام لیا ۔

غرضیکہ اس عقیدہ کے مفاسد اتنے ہیں کہ آدمی لکھتا لکھتا تھک جائے مگر ان کا عدد شمار ختم نہ ہو! اس رجعت کا سب سے پہلا قائل عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ یہ شوشہ اسی کا چھوڑا ہوا ہے البتہ وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کا قائل تھا۔ دوسری صدی کے شروع میں، جابر جعفی نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی اس رجعت میں شریک کردیا، مگر اس نے اس رجعت کا کوئی وقت و زمانہ متعین نہیں کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ سفیان بن عُیَیْنَہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ہم جابر جعفی کے گھر گئے تو ہم نے اس سے ایسی باتیں سنیں کہ ہمیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم پر چھت نہ آپڑے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر سے زیادہ جھوٹا، اور عطاء سے زیادہ سچا کوئی نہیں دیکھا۔ اور جب تیسری صدی کا آغاز ہوا تو اس زمانہ کے رافضیوں نے اپنے بغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے تمام آئمہ اور ان کے دشمنوں کی رجعت کا عقیدہ گھڑ لیا۔

عقیدہ (۷) :- اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں میں سے جس کو چاہے گا عذاب دے گا اسے کسی فرقہ کا پاس یا لحاظ نہ روک سکے گا۔ جیسا کہ فرمایا۔ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ (جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے)۔

مگر امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی بھی امامی شیعہ کو نہ گناہ صغیرہ پر عذاب ہوگا نہ گناہ کبیرہ پر اور نہ آخرت میں عذاب ہوگا نہ عالم قبر میں۔ ان کا یہ عقیدہ ان کے ہاں مسلم اور اجماعی ہے۔ اسی لئے یہ ترک واجبات اور ارتکاب معاصی میں انتہائی بے باک ہوتے ہیں۔ اور اس عقیدہ کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خلاصی اور نجات کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کافی ہے لیکن یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ صرف محبت تو (بلا عمل) خدا اور رسول کی بھی کافی نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس فرقہ کا کوئی شخص کشمیر میں کسی حمام پر گیا۔ حمام والے نے پوچھا آغا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کلب علی (علی کا کتا) وہ بولا کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ غلام علی کی جگہ کلب علی نام رکھ لیا۔ وہ بولا کہ اس نیت سے کہ ممکن ہے علی کا کتا سمجھ کر بہشت میں جانے سے کوئی نہ روکے! وہ بولا کہ یہ ٹھیک تو ہے مگر جب خدا کا کتا بہشت میں نہیں پھٹک سکتا تو علی کے کتے کی کیا حیثیت کہ اسے جنت میں گھسنے دیا جائے۔

اگرچہ یہ عقیدہ خود ان کے اصول کے بھی خلاف ہے اور ان کی روایات کے بھی، لیکن چونکہ ہر نا جائز کو جائز کرنا، ترک طاعات اور تکالیف شرعیہ سے کنارہ کشی مدنظر ہے اس لئے بڑی ڈھٹائی سے اسے سینے سے لگا رکھا ہے۔ گویا اس معاملہ میں ان کا نفس امارہ ان کے علم و عقل پر غالب آگیا ہے یہ عقیدہ ان کے اصول کے تو یوں خلاف ہے کہ اگر کسی امامی نے کبیرہ کا ارتکاب کیا ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو سزا نہ دے تو اللہ تعالیٰ پر ترک واجب کا الزام آتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے! بلکہ اس طرح عذاب دینے کو یہ عدل کہتے ہیں جیسا کہ اپنے موقعہ پر پہلے بیان ہوا۔ اور روایات کے یوں مخالف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ، جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر آئمہ سے بذریعہ روایات صحیحہ ایسی دعائیں منسوب ہیں کہ وہ بارگاہ الٰہی میں رو، رو کر مانگتے تھے، تقصیرات پر عذر خواہ ہوئے اور اس کے عذاب سے پناہ چاہتے تھے، اور ان میں حرمت رسول، حرمت کعبہ و قرآن کے واسطے دیتے تھے۔ جب یہ بزرگان محترم خود اس قدر عالی مرتبہ رکھنے کے باوجود، بادشاہ عمل سے لرزتے، ڈرتے اور کانپتے تھے تو خالی محبت (وہ بھی دشمنی نما) کے مدعیوں کی یہ مجال و تاب کہاں کہ وہ اس پر غراتے پھریں، اور اس پر تکیہ کر کے دھڑلے سے ارتکاب مناہی و معاصی کئے جائیں۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۔ فَكَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۔

کہ ہمیں تو چند دنوں سے زیادہ آگ چھوئے گی بھی نہیں اور یہ دھوکہ ان کو ان باتوں کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے دین میں جھوٹ کے طور پر شامل کرلی تھیں۔ تو اس وقت ان کا کیا حال ہوگا۔ جب ہم ان کو ایک یقینی دن (قیامت) میں اکٹھا کر کے ہر ایک کے اعمال کا بلا کم و کاست پورا پورا بدلہ دیں گے۔ اور ان پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں ان کے پاس وہ چند دلچسپ روایات ہیں جو ان کے روساء نے احمقوں کو بہلانے کے لئے تراش لی ہیں۔ ان میں ایک روایت وہ ہے جو ابن بابویہ قمی نے بیان کی ہے، واضح رہے کہ قمی بدنامی کی حد تک جھوٹ بولنے اور روایات گھڑنے میں شہرت یافتہ ہے۔ یہ ایسے کھوٹے سکوں سے تھیلیاں بھری رکھتا ہے اور موقعہ بموقعہ ان سے بیوپار کرتا رہتا ہے۔

علل الشرائع میں مفضل بن عمر سے یوں روایت کرتا ہے۔

قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ لِمَ صَارَ عَلِیٌّ قَسِیْمَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ قَالَ لِاَنَّ حُبَّهٗ اِیْمَانٌ وَّبُغْضَهٗ کُفْرٌ وَاِنَّمَا خُلِقَتِ الْجَنَّةُ لِاَهْلِ الْاِیْمَانِ وَالنَّارُ لِاَهْلِ الْکُفْرِ فَهُوَ قَسِیْمُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ لَا یَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا مُبْغِضُوْهُ۔

میں نے ابی عبداللہ سے پوچھا کہ یہ علی (رضی اللہ عنہ) جنت دوزخ بانٹنے والے کیسے بن گئے؟ تو کہا کہ دراصل ان کی محبت ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے اور جنت اہل ایمان کے لئے اور دوزخ اہل کفر کے لئے پیدا کی گئی اور چونکہ جنت میں وہی داخل ہوگا جو ان سے محبت کرتا ہوگا اور دوزخ میں وہی جائے گا جو ان سے بغض رکھتا ہوگا۔ اور اس طرح وہ جنت و دوزخ بانٹنے والے ہوئے۔

اس روایت کے جھوٹ ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ حضرات ائمہ قرآن و شریعت کے خلاف ہرگز کچھ نہ فرماتے۔ کیونکہ اگر ایسا کرتے تو نہ صرف اپنی ہی تردید کرتے بلکہ اپنے باپ دادا کی تکذیب بھی کرتے۔ اور اس روایت میں بچند وجوہ شریعت کے مقرر کردہ قواعد کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

اوّل:۔ اگر کسی کی محبت ایمان اور اس سے بغض کفر بھی ہو تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جنت و دوزخ کا بانٹنے والا بھی ہو۔ دیکھو تمام انبیاء اور رسولوں، ائمہ اور حضرات سبطین کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہے مگر وہ جنت و دوزخ کے بانٹنے والے نہیں ہیں۔

دوم:۔ اگر حب علی ہی کامل ایمان ہو تو توحید، نبوت، آخرت، اور شیعوں کے دوسرے اہم اور ضروری عقائد سب باطل و بے کار ہو جائیں گے۔ اور دوسرے ائمہ کے متعلق بدگوئی و بدزبانی اور ایذا رسانی کا جواز پیدا ہو جائے گا اور اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا تو معلوم ہوا حب علی ایمان کامل نہیں۔ لامحالہ وہ جزو ایمان ہوگی۔ اور یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ جزو ایمان جنت کے داخلے کے لئے کافی نہیں۔

تیسرے اس جملہ کا لَا یَدْخُلُ النَّارَ اِلَّا مُبْغِضُوْهُ۔ بتاتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر جیسے فرعون، ہامان، نمرود، شداد، عاد و ثمود۔ کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا کیونکہ علی رضی اللہ عنہ سے ان کو کوئی بغض نہیں تھا۔ اور یہ بات بالاجماع غلط اور باطل ہے۔

چوتھے:۔ یہ کہ اگر یہ سب کچھ صحیح بھی مان لیں تو اس کا اصل مقصد و مدعا سے کوئی علاقہ و تعلق نہیں اسلئے کہ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا مُحِبُّوْهُ کا مقصد و منشا صرف اتنا ہی ہے کہ محبین کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائے گا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر محب جنت میں جائے گا، ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے اسے معمولی سمجھ والا بھی جانتا ہے۔

پانچویں:۔ یہ کہ اگر ان سب سے قطع نظر کرلیں تو اس صورت میں رافضیوں کے تمام فرقے مثلاً غلاۃ، کیسانیہ، ناوسیہ، افطحیہ، قرامطہ اور باطنیہ بھی جنت کے مستحق ہوں گے حالانکہ یہ امامیہ کے مذہب کے بھی خلاف ہے۔

جب اس روایت کا نشانہ بھی صحیح نہ بیٹھا اور مقصد برآری ہوتے نہ دیکھی تو زنبیل کذب سے یہ بابویہ ایک اور روایت نکال لایا

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَاءَنِیْ جِبْرَئِیْلُ وَهُوَ مُسْتَبْشِرٌ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ اللّٰهَ الْاَعْلٰی یُقْرِئُكَ السَّلَامَ وَقَالَ مُحَمَّدٌ نَبِیٌّ وَرَحْمَتِیْ وَعَلِیٌّ حُجَّتِیْ لَا اُعَذِّبُ مَنْ وَّالَاهُ وَاِنْ عَصَانِیْ وَلَا اَرْحَمُ مَنْ عَادَاهُ وَاِنْ اَطَاعَنِیْ۔

ترجمہ:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام میرے پاس خوش خوش آئے، اور کہا اے محمد اللہ جل شانہٗ نے آپ کو سلام کہا ہے، اور کہا ہے کہ محمد میرے نبی اور میری رحمت ہیں اور علی میری حجت! جس نے ان سے دوستی کی میں اس کو عذاب نہیں دوں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرے اور جس نے ان سے دشمنی رکھی میں اس پر رحم نہیں کروں گا اگرچہ

اس روایت کے جھوٹا ہونیکی دلیل یہ ہے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں درحقیقت نبوت ثابت کی جارہی ہے کیونکہ طاعت کا سوخت منکر انبیاء کا خاصہ ہے ۔ نبی کے انکار کرنے والے کی طاعات حبط ہوتی ہیں ۔ نیز اس روایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی لازم آتی ہے کہ وہ تو اللہ کی محبت ہیں مگر حضور نہیں ۔ کہ آپ کا نافرمان تو نافرمانوں میں کا ایک ہے اور مطیع ، اطاعت گذاروں کے منجملہ ایک ۔ مگر حضرت علی رضی کو دوست رکھنے والا حب علی کے اثر سے نافرمانی سے بے خوف ہے اور آپ سے بغض رکھنے والا بغض کے باعث طاعت کے اجر سے محروم نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز ، روزہ ، طاعت و بندگی سب منسوخ اور بے کار محض ہیں اور گناہ خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ انکی حرمت خاک بن کر ہوا میں اڑگئی ۔ اسلئے کہ جزائے نیک و بد کا معیار تو حب و بغض علی ہوگیا ہے

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن جو مخلوق کو گمراہی سے بچانے کے لئے اترا تھا اس میں ہدایت کی صفت ہی نہیں اسلئے کہ جو کام و نجات کی بات ہے یعنی حب علی و بغض علی وہ تو قرآن میں مذکور ہی نہیں ۔ اور اگر مذکور ہوا بھی تو اس پیرایہ میں ہرگز نہیں جو ہر مکلف کے ذہن نشین ہوسکے ۔ اور معمہ بجھانے کی ہر ایک میں استعداد و طاقت نہیں ۔ گویا قرآن مجید اسی چیز کی دعوت دیتا ہے جو آخرت کے لئے کسی کام کی نہیں ۔ سوائے مشقت و رنج و کلفت و ملال اس سے کچھ حاصل نہیں ۔ آخرت میں جو بات کام آتی قرآن اسی سے خالی ہے (نعوذ باللہ)

اور پھر ایسی باتیں نفس و شیطان کو مغرور و سرکش اور نافرمان بناتی ہیں اور ان جذبات کو قوی کرتی ہیں ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انبیاء و اوصیاء جو نفس و شیطان کا راستہ روکنے کے لئے بھیجے گئے ہیں وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں نکالیں ۔ اب ان روایات کے تجزیہ کے آشکار ہونے کے بعد اسی سلسلہ میں ان کی معتبر کتابوں کی ایک اور روایت سنئے تاکہ ان کا باہمی تعارض و تناقص سمجھنے میں مدد ملے ۔

یہ روایت ان کے سردار اور پیشوا حسن بن کبش نے بحوالہ ابی ذر رضی اللہ عنہ) بیان کی ہے

نَظَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عَلِيِّ بْنِ اَبِي طَالِبٍ ترجمہ :- وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب کی طرف دیکھ کر

فَقَالَ هٰذَا خَيْرُ الْاَوَّلِيْنَ وَخَيْرُ الْاٰخِرِيْنَ مِنْ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَاَهْلِ الْاَرْضِ هٰذَا سَيِّدُ الصِّدِّيْقِيْنَ وَسَيِّدُ الْوَصِيِّيْنَ وَاِمَامُ الْمُتَّقِيْنَ قَائِدُ الْغُرِّ الْمُحَجَّلِيْنَ اِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كَانَ عَلٰى نَاقَةٍ مِّنْ نُوْقِ الْجَنَّةِ قَدْ اَضَاءَتْ عَرْصَةُ الْقِيَامَةِ مِنْ ضَوْءِهَا عَلٰى رَاْسِهٖ تَاجٌ مُّرَصَّعٌ مِّنَ الزَّبَرْجَدِ وَالْيَاقُوْتِ فَتَقُوْلُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ وَيَقُوْلُ النَّبِيُّوْنَ هٰذَا نَبِيٌّ مُّرْسَلٌ فَيُنَادِي الْمُنَادِيْ مِنْ تَحْتِ بُطْنَانِ الْعَرْشِ هٰذَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ هٰذَا وَصِيُّ حَبِيْبٍ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ فَيَقِفُ عَلٰى مَتْنِ جَهَنَّمَ فَيُخْرِجُ مِنْهَا مَنْ يُّحِبُّ وَيُدْخِلُ فِيْهَا مَنْ يُّبْغِضُ وَيَاْتِيْ اَبْوَابَ الْجَنَّةِ[1]

فرمایا کہ یہ آسمانوں اور زمین کے بسنے والے سب اگلوں پچھلوں سے بہتر ہے یہ صدیقوں کا سردار ہے اور وصیوں کا بھی ۔ پرہیزگاروں کا پیشوا ہے اور محجلین (جن کے چہرے اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں) کا رہبر ! قیامت کے دن یہ جنت کی کسی اونٹنی پر سوار ہوگا جسکی روشنی سے میدان قیامت جگمگا اٹھے گا ۔ اس کے سر پر زبرجد اور یاقوت سے جڑا ہوا تاج ہوگا پس ملائکہ کہیں گے یہ ایک مقرب فرشتہ ہے اور نبی کہیں گے یہ نبی مرسل ہے اس وقت بطنان عرش کے نیچے سے آواز آئیگی کہ یہ صدیق اکبر ہے یہ حبیب کا وصی ہے یعنی علی بن ابی طالب پھر یہ پشت جہنم پر جا کھڑا ہوگا اس میں سے اپنے دوستوں کو نکالے گا اور دشمنوں کو جھونکے گا پھر جنت کے دروازہ پر آئے گا اور اس میں جسے چاہے گا بے حساب داخل کریگا ۔

اس روایت سے واضح پر معلوم ہوگیا کہ محبان علی بھی اپنے گناہوں کی پاداش میں جہنم رسید ہوں گے اور عذاب بھگتنے کے بعد آپ ان کو اس سے نکالیں گے ۔ تو یہ محبان علی وہاں کیوں اور کیسے چلے گئے ۔ ان پر تو آتش دوزخ حرام تھی ؟ ۔

ابن بابویہ قمی کی بحوالہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک اور روایت سنئے ۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عَبْدًا مَكَثَ فِي النَّارِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا كُلُّ خَرِيْفٍ

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بندہ جہنم میں ستر خریف تک ہر خریف ستر سال کا ۔ ہوگا ۔ داخل رہے گا فرمایا پھر وہ

---

[1] يُدْخِلُ فِيْهَا مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔

مَبْعُوْثَ سَنَةً قَالَ ثُمَّ اِنَّهٗ سَأَلَ اللّٰهَ تَعَالٰى بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ اَنْ يَّرْحَمَهٗ فَاَخْرَجَهٗ مِنَ النَّارِ وَغَفَرَ لَهٗ ۔

محمد اور ان کی آل کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ وہ اس پر رحم فرمائے ۔ تو اللہ تعالیٰ جہنم سے اسے نکالدے گا اور اس کی مغفرت فرمادے گا ۔

اب اگر یہ شخص محب علی تھا تو اتنی مدت تک یہ دوزخ میں کیا کرتا رہا ۔ اور دشمن علی تھا تو اس کی معافی اور دخول جنت ! یہ کیوں ؟

ان روایات کا آپ شیعوں کی طرف سے حسب دستور قدیم یہی جواب سمجھ لیں کہ دروغ گورا حافظہ نباشد! حقیقت اور بالکل ظاہر بات یہی ہے کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدہ کا مخالف ہوگا اس کو ان کی زبانی کلامی بلکہ دلی محبت بھی ہرگز ہرگز کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیگی جب کہ وہ آپ کے طریقہ اور راستہ چھوڑ کر گمراہوں، شیطانوں، جھوٹوں اور روایات کا کاروبار کرنے والوں کے پیچھے چل پڑا ہو ۔ اور صراط المستقیم گم کر بیٹھا ہو !

اس صورت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ خاتون جنت، جناب سبطین اور دیگر ائمہ کی ولایت کا انکاری مگر جناب امیر کی محبت کا دم بھرنے والا بھی جنتی ہو اور دوزخ کا عذاب اسے چھو بھی نہ سکے ! حالانکہ اسی معلم نے کہ جسکو یہ مفید کے لقب سے یاد کرتے ہیں اپنی کتاب المعراج میں یوں روایت کی ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ يَا مُحَمَّدُ لَوْ اَنَّ عَبْدًا عَبَدَنِيْ حَتّٰى يَصِيْرَ كَالشَّنِّ الْبَالِيْ ثُمَّ اَتَانِيْ جَاحِدًا بِوِلَايَةِ مُحَمَّدٍ وَّعَلِيٍّ وَّفَاطِمَةَ وَالْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ مَا اَسْكَنْتُهٗ فِي الْجَنَّةِ ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد میرے کسی بندہ نے میری اتنی زیادہ عبادت بھی کی ہو کہ وہ پرانی مشک کی طرح ہوگیا ہو پھر اگر وہ میرے پاس اسی حالت میں آئے کہ محمدؐ علی، فاطمہ، حسن وحسین کی ولایت کا منکر ہو تو میں اسے جنت میں گھسنے بھی نہیں دوں گا ۔

تو معلوم ہوا کہ کیسانیہ، سبطین رضی اللہ عنہما کی ولایت کے انکار کے باوجود، اور غُلاۃ جناب امیر کے عقیدہ کے مخالف ہونیکے باوصف ناجی اور بہشتی ہوں گے (اس وقت امامیوں پر کیا گذریگی)

اگر امامیہ یہ کہیں کہ اس روایت میں پانچوں کا انکار ولایت مراد ہے اور ان میں جناب امیر بھی ہیں، تو شاید اس شخص کی عبادت انہیں کے سبب نامقبول ہوئی ہو کہ وہ جناب امیر کی ولایت سے انکار کرتا تھا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ اس صورت میں ولایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کرنا بھی جو بالاجماع کفر ہے ۔ اعمال کے سوخت ہو جانے کے لئے کافی ہوگا۔ اور انکار ولایت علی کا اس میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ اس روایت میں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ انکار ولایت مقصود ہے ۔ اور یہ ہمارے مدعا کے لئے کافی ہے ۔

ابتک ہمارا روئے سخن اثنا عشریوں کے علاوہ دیگر فرقوں کی طرف رہا ہے ۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اثنا عشریوں کے متعلق بھی کچھ بیان کریں ۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اثنا عشریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے علاوہ شیعوں کے تمام فرقے دائمی طور پر جہنمی ہیں، ناجی صرف وہی ہیں ۔ یہ ان کا مشہور خیال ہے ۔ ابن مطہر حلی شرح تجرید میں لکھتا ہے کہ ان فرقوں کے بارے میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے ۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کیونکہ وہ جنت کا استحقاق نہیں رکھتے ۔

بعض دوسرے کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لایا جائے گا ۔

ابن نوبخت اور بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ دوزخ سے تو نکلیں گے کہ بہر حال کافر نہیں ہیں لیکن جنت میں بھی نہ جاسکیں گے اس لئے کہ ایمان صحیح نہیں رکھتے جو استحقاق ثواب جنت کا سبب ہے ، بلکہ اعراف میں پڑے رہیں گے ۔

صاحب التقویم نے جو امامیہ کے بڑے علماء میں سے ہیں کہا ہے کہ صرف شیعوں میں بہتر فرقے ہیں جن میں نجات پانے والے صرف اثنا عشری ہیں۔ باقی شیعی فرقے کچھ مدت دوزخ کا عذاب بھگتیں گے پھر جنت میں چلے جائیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ یہ ہمیشہ کا عذاب یا کچھ مدت کا۔ محبان جناب امیر کے لئے یقیناً ثابت کرتے ہیں۔ ہاں صاحب تقویم یہ بھی کہتا ہے کہ باقی کے تمام اسلامی فرقے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوگیا کہ ان کے نزدیک اہلسنت باوجود محبت جناب امیر کے ہمیشہ اور دائماً دوزخی ہیں۔ اس سے ان کا قاعدہ واصول جناب امیر کا اثباتی اور منفی پہلو سے ٹوٹ گیا۔

اب ان کے اس مذہب کو ذہن میں محفوظ رکھ کر توجہ سے ان کی روایات سنیئے۔

روی ابن بابویہ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال والذی بعثنی لایعذب بالنار موحد ابداً

ابن بابویہ نے بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قسم سے مجھے مبعوث کرنے والے کی کہ موحد کبھی دوزخ کا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

اور طبرسی نے کتاب احتجاج میں حسن بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے۔

انہ قال من اخذ بما علیہ اھل القبلۃ الذی لیس فیہ اختلاف ورد علم ما اختلف فیہ الی اللہ سلم ونجی من النار ودخل الجنۃ۔

انہوں نے کہا کہ جس نے وہ راہ اختیار کی جس میں اھل قبلہ کا کوئی اختلاف نہیں اور اختلافی بات کو اللہ کے حوالہ کیا وہ محفوظ رہا اور دوزخ سے نجات پالی اور جنت میں جا پہنچا۔

اور کلینی نے بحوالہ زرارہ بسند صحیح یوں روایت کی۔

قال قلت لابی عبد اللہ اصلحک اللہ ارءیت من صلی وصام وحج واجتنب المحارم وحسن ورعہ ممن لایعرف ولا ینصب قال ان اللہ یدخلہ الجنۃ برحمتہ۔

اس نے کہا کہ میں نے ابی عبد اللہ سے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے اس شخص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جس نے روزہ رکھا نماز پڑھی حج کیا حرام سے بچا پرہیزگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا، ائمہ کا نہ اقرار کرتا ہے نہ دشمنی رکھتا ہے آپ نے کہا اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔

یہ تینوں روایات اہلسنت کے ناجی ہونے پر صاف دلالت کرتی ہیں۔ اگر ائمہ کی معرفت نہ رکھتے ہوں۔ چہ جائیکہ ان کو مستحق امامت جانتے، ان کو اپنا پیشوا مانتے اور ان سے محبت ظاہر کرتے ہوں۔

اور ان کے مطالعہ سے ہر سمجھدار پر ظاہر ہوگیا ہے کہ یہ روایات جمہور شیعہ اور صاحب التقویم کے قول کی سختی کے ساتھ تردید کرتی ہیں۔

اور ابن نوبخت نجومی، مجوسی کا قول بالکل ہی باطل اور بے بنیاد ہے۔ یہ تو اب تک قواعد اسلام سے نابلد اور ناآشنا ہے۔ اسے یہ پتہ ہی نہیں کہ اعراف تو ایک عارضی قیامگاہ ہے، ہمیشہ رہنے کی جگہ وہ ہے ہی نہیں اصحاب اعراف تو آخر میں بہشت میں بھیجدیئے جائیں گے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہی بات صحیح ہے۔

نواں باب ـــــ احکام فقہیہ

جن میں شیعوں نے ثقلین سے اختلاف کیا ہے

اس باب میں ان فقہی احکام سے بحث کی جائیگی، جن میں شیعوں نے کتاب اللہ اور عترت سے مخالفت کی ہے۔ اس سلسلہ میں فرمان خداوندی۔ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ۔ (کیا ان کو کوئی شریک مل گیا ہے جو ان کے لئے دین کی ایسی راہ نکالتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی) کا مضمون ان پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔

شیعی فرقوں میں سے کیسانیہ اور غلاۃ کے فقہی مسائل و احکام بابوں، فصلوں میں مرتب اور تصنیف شدہ نہیں ملتے۔ اس لئے کہ اب ان کے اہل علم بھی نہیں ملتے اور انکی تصانیف بھی دستیاب نہیں لیکن یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ مختار ثقفی نے کافی کچھ احکامات نکالے اور ان کو شریعت قرار دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جبرئیل میرے پاس آتے اور وحی لاتے ہیں، اسی کی روشنی میں اندازہ لگالیا جائے کہ اس کی فقہی احکام کی کیا حقیقت ہوسکتی ہے۔

زیدیوں کے مجتہدین نے شریعت کے بہت سے احکام مثلاً طور پر ترتیب دے لئے ہیں یمن کے اکثر شہروں میں ان کے علماء بھی ملتے ہیں اور کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ کتاب الاحکام انکی مشہور و معروف کتاب ہے۔

عبیدیوں کے ظہور سے پہلے اسمٰعیلیہ اکثر مسائل میں امامیہ سے متفق تھے ان کے خروج کے بعد بہت سے دوسرے مسائل بھی گھڑے گئے چنانچہ ان کے کچھ مسائل اوراق ماسبق میں بیان بھی ہوئے ہیں۔

قرامطہ اور باطنیہ، نے تو شرائع و احکام کو سرے سے ختم ہی کرنا مقصد قرار دیا ہے اسی لئے ظاہر پر عمل نہ کرنا ہی اپنا شعار بنایا ہے۔ لہٰذا فقہ اور شریعت کے درحقیقت اصلی دشمن یہی ہیں۔ اسوقت ہمارے دیار و امصار میں اثناعشری فرقہ کے علاوہ کوئی اور فرقہ ایسا نہیں جس کے احکام و مسائل مدون انداز میں تصانیف کی صورت میں ملتے ہوں۔

یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ ان کی کتب فقہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے اور ان کا اسلوب شرعی اسلوب کے جسقدر مخالف یا ہٹا ہوا ہو اس کو واضح اور ظاہر کیا جائے۔ تاکہ اہل دانش و بینش انکی دروغگوئی افتراپردازی بناوٹ اور گھڑنت سے آگاہ ہوکر اس کا پورا پورا کھوج لگا سکیں۔ مسائل فقہیہ میں گو اہل سنت کے ہاں بھی اختلاف ہے لیکن ہر ایک کا اعتماد و استدلال قرآن و حدیث و آثار پر ہی ہے۔ لیکن چونکہ ہر ایک کا طریق معانی فہمی جدا ہے اور علل شرائع بھی جدا اس لئے اختلاف ناگزیر ہوا۔ بخلاف ان حضرات کے کہ ان کی خاص شرائع قرآن و حدیث کے اسلوب سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔ ان کے متعلق آدمی یہی سوچتا ہے کہ یہ یہودی شریعت ہے یا نصاریٰ کی۔ یہ ہندوؤں کا دید اور شاستر ہے یا صابیوں کی وساتیر۔ یہ بحث چونکہ نہایت طویل الذیل ہے۔ اس لئے مجبوراً بطور نمونہ مختصر سا بیان کرتے ہیں کہ عقلمند کو اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔

ان کے احکام میں پہلا حکم صحابہ اور خلفائے ثلاثہ۔ نیز ان چند امہات المومنین کو جو بالاجماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ترتھیں کافر ٹھہرانا ہے۔ اس حکم کا کتاب اللہ کے مخالف ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

دوسرا حکم۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ پر لعنت۔ اللہ کے ذکر سے بھی افضل ہونا ہے۔ حالانکہ کسی بھی دین و شریعت میں ابلیس تک پر جو گمراہی کا اصل الاصول ہے لعنت کرنے کو طاعت و عبادت شمار نہیں کیا گیا۔ چہ جائیکہ اسکو سب سے بڑی اور افضل الطاعت مانا جائے! قرآن مجید میں صاف آتا ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے)

تیسرا حکم۔ ہر نماز پنجگانہ کے بعد کبار صحابہ مہاجرین وانصار، خلفائے ثلاثہ، اور عشرہ مبشرہ (رضوان اللہ علیہم) کی اکثریت پر لعنت بھیجنا واجب اول قرار دینا ہے۔ یہ حکم بھی تمام ادیان و شرائع کے اسلوب کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے دشمن گذرے ہیں۔ مثال کے طور پر فرعون کو ہی لے لو کہ سالہاسال بنی اسرائیل اس کے مظالم کا تختۂ مشق بنے رہے۔ کون سی ایذا تھی جو انکو نہ دی گئی، قرآن مجید میں یہ آیت دیکھئے۔
وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ۔ اور جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دلائی جو تم کو سخت عذاب سے ستاتے تھے، اور تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے اور تمہاری لڑکیاں زندہ رہنے دیتے۔
یا فرمایا وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ۔ (اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیطان آدمی بھی رکھے)
اس سب کے باوجود کسی بھی ملت و شریعت میں نبیوں اور رسولوں کے دشمنوں میں سے کسی پر بھی لعنت کو فرض و واجب قرار نہیں دیا گیا۔ نہ بعد نماز اسکو وظیفہ مقرر کیا۔ فرض و واجب تو رہے الگ مستحب بھی نہیں بنایا۔ اور نہ اس پر اجر و ثواب رکھا۔

چوتھے۔ یعید غدیر کے نام سے ایک نئی عید اختراع کرلی۔ جو ۱۸ ذی الحجہ کو مناتے ہیں اسے عید الفطر و عید الاضحی پر بھی فضیلت دیتے ہیں اور اسے عید اکبر کہتے ہیں۔ یہ حکم بھی شرع کے صریحاً مخالف ہے۔

پانچویں۔ ایک اور عید بنام بابا شجاع الدین۔ مقرر کرلی۔ یہ ان کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قاتل ابولولوء کا لقب ہے۔ جو آتش پرست مجوسی تھا۔ ان کے گمان کے مطابق اس عید کا دن ۹ ربیع الاول ہے۔ روایت ملاحظہ ہو۔
رَوٰی عَلِیُّ بْنُ مُظَاهِرِ الْوَاسِطِیُّ عَنْ اَحْمَدَ بْنِ اِسْحٰقَ اَنَّهٗ قَالَ هٰذَا الْیَوْمُ یَوْمُ الْعِیْدِ الْاَکْبَرِ وَیَوْمُ الْمُفَاخَرَةِ وَیَوْمُ التَّبْجِیْلِ وَیَوْمُ الزَّکٰوةِ الْعُظْمٰی وَیَوْمُ الْبَرَکَةِ وَیَوْمُ التَّسْلِیَةِ۔ علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحاق سے روایت کی اس نے کہا کہ یہ دن عید اکبر کا دن ہے۔ یہ دن بغلیں بجانے اور تعظیم کا دن ہے۔ یہ دن بڑی زکوٰۃ کا دن ہے یہ دن برکت اور تسلی واطمنان کا دن ہے۔
احمد بن اسحاق ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے شیعوں کے لئے یہ عید مقرر کی۔ بعد والوں نے یہ لکیر پیٹی۔ اور چند دنوں میں اس عید کے منانے کی نسبت کا رخ ائمہ کی طرف کردیا۔ حالانکہ دراصل یہ عید مجوسیوں کی تھی کہ ان کے ایک فرد نے اسلام کا ایک ستون منہدم کردیا تھا، اور جسکی خبر سنکر انہوں نے اظہار فرحت و شادمانی کا جشن منایا تھا۔ اور اس دن کو انتقام کا دن فخر کا دن اور تسلی کا دن کہا۔ اس لئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ان پر ان کے دین پر اور ان کی سلطنت پر جو آفت ٹوٹی تھی وہ ظاہر ہی ہے۔ اس لئے وہ تو اس دن کو یوم العید بناتے ہی۔ رہا تاریخ کا معاملہ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت بلا اختلاف ۲۸ ذی الحجہ کو واقع ہوئی اور یکم محرم کو آپ مدفون ہوئے! اگر ان کے بقول ائمہ یہ عید مناتے تھے۔ تو تاریخ کی تبدیلی کیوں کی؟ ویسے شیعہ خود بھی اس کے معترف ہیں کہ ائمہ کے زمانہ میں اس عید کا وجود نہ تھا اس کا موجد اول احمد بن اسحاق ہی ہے۔

چھٹے۔ نوروز کے دن کی تعظیم۔ کہ یہ بھی مجوسیوں کی عید ہے۔ ابن فہد نے مہذب نامی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سب دنوں میں بڑا دن ہے اور اس تعظیم کا مقصد اسلام میں محض جاہلیت کی رسوم رائج کرنا ہے۔
بطریق صحیح امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کوئی شخص نوروز کے دن حلوہ و فالودہ لایا۔ آپ نے دریافت فرمایا آج کیا خاص بات ہے جو یہ لائے ہو، اس نے کہا آج نیروز کا دن ہے اس پر آپ نے فرمایا نَیْرُوْزُنَا کُلَّ یَوْمٍ۔ وَمَهْرَجَانُنَا کُلَّ (ہمارا ہر دن نیروز ہے، ہمارا سورج ہر دن طلوع ہوتا ہے)
یہ دراصل ایک دقیقہ کی طرف اشارہ ہے، کہ نوروز کی ایک ہی بات تو نئی ہے کہ آفتاب اپنی حرکت و رفتار خاص سے معدل النہار سے عرض شمالی میں رہنے والوں کی طرف رخ کرتا ہے، اور ان سے نزدیک تر ہوتا ہے۔ اسکی وجہ سے ابدان واجسام میں گرمی و حرارت پیدا ہوتی ہے اور قوت نامیہ بھڑک اٹھتی ہے اور نفس نباتی تازگی حاصل کرتا ہے۔ مگر یہی بات روزانہ طلوع آفتاب کے وقت زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ آفتاب حرکت اولی

سے جو سب سے تیز اور سب سے ظاہر حرکت ہے دائرہ اُفق سے گذر کر اہالیان اُفق پر نورافشانی کرتا ہے۔ قوت بصر کو جلا بخشتا ہے۔ روح میں تازگی و بشاشت پیدا کرتا ہے۔ اور بہت سے انسانی منافع مثلاً زراعت تجارت، صنعت و حرفت میں بہتری کا باعث ہوتا ہے۔ گویا موت کے بعد آثارِ حیات نمودار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ لَكُمُ النَّهَارَ نُشُورًا۔ رات کو تمہارے لیے لباس، نیند کو آرام وسکون اور دن کو پھیلانے والا بنایا۔ یا فرمایا۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا۔ ہم نے تمہاری نیند کو آرام رات کو لباس اور دن کو معاش بنایا۔

تو اگر اس میں عید بنانے کی کوئی بات ہے ہی تو اس وقت کو بناؤ۔ کیونکہ یہ منافع ہر روز، اسی وقت فیض عام کی طرح نوع بشر کو حاصل ہوتے ہیں اگر عقلمند اس معاملہ میں غور کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ دن رات کے ایک چکر میں سال میں آنے والے چاروں موسموں کی کیفیات پائی جاتی ہیں، کہ صبح سے کر دوپہر تک فصل ربیع کی کیفیت ہے کہ سبزہ ترو تازہ اور پھول کھلے ہوتے ہیں حیوانی مزاج نشاط و فرحت میں ہوتے ہیں۔ جب آفتاب نصف النہار پر پہنچا تو گویا اپنی حرکت خاص سے رأس سرطان پر آیا۔ موسم گرما کی کیفیت کا آغاز ہوا۔ پژمردگی رونما ہوئی۔ پیاس، یبوست و خشکی جسموں میں غالب آنے لگی۔ اور جب غروب کی طرف جھکا تو گویا میزان میں آیا کہ فصل خریف کی کیفیات شروع ہوئیں اور جب آدھی رات ہوئی اور گھٹاؤ سے بڑھاؤ کی طرف رواں ہو تو گویا اب راس جدی پر آیا اور موسم سرما کی کیفیات کا آغاز ہوا۔ شبنم برف کی طرح برسنا شروع ہوئی۔

ساتویں۔ جابر وظالم بادشاہوں کیلئے سجدہ جائز قرار دینا آخون باقر مجلسی اور ان کے دوسرے علماء نے اسے جائز رکھا ہے۔ حالانکہ قواعد کلیہ شرعیہ کے یہ بات صریحاً خلاف ہے جیسا کہ فرمایا لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ چاند سورج کو سجدہ مت کرو، سجدہ اسی ذات اللہ کو کرو جس نے ان کو پیدا کیا۔ اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہو۔ یا ارشاد فرمایا۔ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ۔ اس اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے۔ اور ہر اس کو بھی جانتا ہے جو تم چھپا کر یا علانیہ کرتے ہو۔

غرض بہت سی آیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ سجدہ خاص طور پر شریعت مصطفوی میں اسی ذات برحق اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے جو طاقت والا ہے اور ہر پوشیدہ وظاہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اور یہاں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کرنے سے استدلال یکسر غلط اور بے اصل بات ہے۔ اس لئے کہ انسانوں کے احکام کو فرشتوں کے معاملہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ (اس کے علاوہ وہاں خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا حکم صریح تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، وہ تعمیل حکم الٰہی تھی۔ اور کسی دین ومذہب اور شریعت کا اسوقت نہ کوئی وجود تھا اور نہ یہ مکلفین کا سجدہ اصطلاحی تھا۔ ن) اسی طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کا سجدہ بھی نظیر نہیں بن سکتا کہ وہ اول تو اصطلاحی سجدہ نہ تھا۔ دوسرے سابقہ شریعتوں سے تمسک اسوقت درست ہوسکتا ہے کہ ہماری شریعت میں اسے منسوخ نہ کیا گیا ہو۔ اور یہ سجدہ ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ منسوخ قرار نہ دیا گیا ہوتا۔ تو پھر اس کے زیادہ حقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم، جناب امیر اور جناب سبطین ودیگر ائمہ ہوسکتے تھے۔ یہ جابر وظالم شاہ عباس وطہماسپ کیوں حقدار ہوئے۔

اب احکام کے ذکر کے بعد ہم مسائل فقہیہ کو لیتے ہیں۔

(۱) ان کے نزدیک وہ پانی پاک ہے جس سے استنجا کیا گیا ہو۔ اور ابھی محل استنجا بھی پاک نہ ہوا ہو، اور اجزائے نجاست پانی میں تحلیل ہوگئے ہوں تاآنکہ پانی کا وزن بھی بڑھ گیا ہو۔،،

یہ مسئلہ قواعد شرع کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ شرعی حکم وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ۔ (یہ نبی تم پر گندی اور پلید چیزیں حرام کرتا ہے)، اور یہ مسئلہ ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے۔ جیسا کہ قرب الاسناد نامی کتاب کے مرتب نے علی بن جعفر سے انہوں نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے روایت

کی ہے۔ اور جیسا کہ ابو جعفر طوسی نے عبداللہ بن سنان اور ابی بصیر دونوں سے اور ان دونوں نے ابی عبداللہ سے روایت کی۔ اور جس طرح کتاب المسائل میں علی بن جعفر سے روایت کہ۔ انّهٗ قَالَ سَاَلْتُ اَخِیْ مُوْسیٰ بْنَ جَعْفَرٍ عَنْ جَرَّةٍ فِیْهَا اَلْفُ رِطْلٍ مِّنْ مَّاءٍ وَّ وَقَعَ فِیْهِ اُوْقِیَّةُ بَوْلٍ هَلْ یَصْلُحُ شُرْبُهٗ اَوِ الْوُضُوْءُ مِنْهُ قَالَ لَا اَلنَّجِسُ لَا یَجُوْزُ اسْتِعْمَالُهٗ۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے اس مٹکے کے بارے میں پوچھا جس میں ایک ہزار رطل پانی ہو مگر اس میں ایک اوقیہ پیشاب پڑ گیا ہو کہ کیا ایسا پانی پینا جائز اور اس سے وضو صحیح ہو جائیگا آپ نے فرمایا نہیں۔ وہ نجس ہے اس کا استعمال جائز نہیں۔

اور اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ اثنا عشری مذہب اسی کے موافق بھی ہے۔ کہ جب پانی ایک گز سے کم ہو تو وہ نجاست پڑ جانے سے ناپاک ہو جاتا ہے، مگر اسکے باوجود معلوم نہیں استنجا کے پانی میں مقعد کے اس بار و بر و ہو جانے کے بعد وہ کون سے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں کہ اسکی نجاست پڑ جانے کے بعد بھی پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ نیز عنقریب آنے والے دوسرے مسائل سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک انسانی براز ایسا ہی پاک ہے جیسا ہندوؤں کے ہاں گائے کا گوبر پاک ہے!

اگر کوئی اثنا عشری اس مسئلہ سے انکار کرے تو ابن مطہر حلی کی کتاب منتہی ابھی دنیا سے نابود نہیں ہوئی۔ ان کے کتب خانوں میں یقیناً موجود ہوگی اسے کھول کر دیکھ لیں جس میں اس نے استنجے کے پانی کی پاکی بیان کر کے دوبارہ اس کے استعمال کے جواز پر پورے فرقہ کا بیان کیا ہے،

دوسرا مسئلہ شراب کی طہارت کا ہے جس کے متعلق ابن بابویہ جعفی اور ابن عقیل کی نصوص موجود ہیں کہ پاک ہے!

یہ مسئلہ بھی صریح قرآنی آیت کے خلاف ہے۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ۔ شراب، جوا، بت، اور پانسے نجس اور کار شیطان ہیں۔

لغت میں رجس سخت نجاست کو کہتے ہیں۔ (ان اشیاء و اعمال میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی نجاستوں کا ذکر ہے) اسی لئے خنزیر کے بارے میں فرمایا فَاِنَّهٗ رِجْسٌ۔ (بلاشبہ وہ مجسمہ نجاست ہے)

اور پھر یہ ائمہ کی ان روایات کے بھی خلاف ہے جو خود شیعوں کی کتابوں میں موجود و مذکور ہیں۔ صاحب قرب الاسناد اور صاحب کتاب المسائل دونوں نے یہ روایات بیان کی ہیں۔ اور ابو جعفر طوسی نے ابو عبداللہ سے یوں روایت بیان کی ہے۔ اَنَّهٗ قَالَ لَا تُصَلِّ فِی الثَّوْبِ قَدْ اَصَابَهُ الْخَمْرُ (جس کپڑے پر شراب لگ گئی ہو اس سے نماز مت پڑھو)

تیسرا مسئلہ مذی کا ہے کہ یہ اسے پاک کہتے ہیں جو صحیح اور متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے۔ راوندی نے موسیٰ بن جعفر سے انہوں نے اپنے باپ دادا سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ فرمایا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا جس کو یہ بات پیش آئے وہ حشفہ کو دھوئے۔

اور ابو جعفر طوسی اگرچہ مذی کی نجاست پر صریح روایت بیان کرتا ہے مگر نہ اس پر فتویٰ دیتا ہے نہ اس پر عمل رکھتا ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے ہاں مذی کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ حالانکہ خود ہی ائمہ سے اس کے خلاف روایات بیان کرتے ہیں۔

طوسی نے یعقوب بن یقطین سے اس نے ابی الحسن سے روایت کی کہ اَلْمَذْیُ مِنْهُ الْوُضُوْءُ۔ (مذی نکلنے سے وضو کرنا چاہیئے۔

اور راوندی نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ۔ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ ذَرٍّ سَلِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمَذْیِ فَسَاَلَ فَقَالَ یَتَوَضَّأُ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلٰوةِ۔ آپ نے کہا میں نے ابو ذر سے کہا کہ نبی کریم صلی علیہ وسلم سے مذی کے متعلق پوچھنا، انہوں نے پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی وجہ سے وضو کرو ایسا وضو جو نماز کے لئے کرتے ہو۔

پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ یہ ودی کو بھی پاک کہتے ہیں جو گاڑھے پیشاب کو کہتے ہیں۔ اور پیشاب تینوں شریعتوں کے اجماع کے مطابق ناپاک ہے۔ بلکہ دوسرے باطل دینوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

چھٹا مسئلہ یہ کہ ودی کے نکلنے سے بھی ان کے ہاں وضو نہیں ٹوٹتا حالانکہ یہ ائمہ کی روایات کے خلاف ہے۔ راوندی نے حضرت علی رضی اللہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ اَلْوَدِیُّ فِیْہِ الْوُضُوْءُ (ودی کے نکلنے سے وضو کیا جائے) اس کے علاوہ بھی لوگوں نے ابی عبداللہ سے اسی قسم کی روایات بیان کی ہیں۔

ساتواں۔ یہ کہتے ہیں کہ پیشاب کرنے کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھٹک دو، اس کے بعد جو کچھ اس سے نکلے وہ پاک ہے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا یہ مسئلہ بھی صریحاً خلاف شرع ہے۔ کیونکہ ہر دو راستوں سے نکلنے والی ہر چیز ناپاک بھی ہے اور وضو کو توڑنے والی ہے۔ اور اس سے پہلے عضو کے جھاڑنے کو بعد کی طہارت اور وضو نہ ٹوٹنے میں کیا دخل ہے۔ اور کیا واسطہ۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو صابیوں کے دساتیر میں پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لے تو درمیان نماز وضو توڑنے والی کوئی بات پیش آجائے تو اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اسکی مثال تو اس شخص سے ملتی جلتی ہے جس نے کسی کی ملاقات کی خاطر فرش فروش کا اہتمام کیا، لباس آرائش کا بھی خیال کیا، مگر جب وہ ملاقاتی آیا، تو فرش فروش بھی اٹھا دیا اور خود بھی ننگا ہو کر اس سے ملا۔ اور یہ توجیہ کرنے لگا کہ یہ سب اہتمام تو اس کے اعزاز میں تھا۔ اب دوران ملاقات میں ننگا ہو گیا تو کیا ہوا،

اور پھر یہ بات ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے۔ کہ ابن عیسیٰ نے ابی جعفر سے روایت کی ہے۔ اَنَّہٗ کَتَبَ اِلَیْہِ ھَلْ یَجِبُ الْوُضُوْءُ اِذَا خَرَجَ مِنَ الذَّکَرِ شَیْءٌ بَعْدَ الْاِسْتِبْرَاءِ قَالَ نَعَمْ۔ کہ ان سے تحریراً یہ پوچھا گیا کہ پاکی کے بعد اگر عضو مخصوص سے کوئی چیز نکلے تو کیا وضو واجب ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں!

(۸) خانگی مرغا مرغی کی بیٹ کو بھی یہ پاک کہتے ہیں حالانکہ ائمہ کی نصوص سے اسکی نجاست و ناپاکی ثابت ہے۔ اور ان کی معتبر کتب میں یہ لکھا ہوا بھی ہے۔ مثلاً محمد بن حسن طوسی کی روایت بحوالہ فارس یوں ہے۔ اَنَّہٗ کَتَبَ رَجُلٌ اِلٰی صَاحِبِ الْعَسْکَرِ یَسْاَلُہٗ عَنْ ذَرْقِ الدَّجَاجِ یَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ فِیْہِ فَکَتَبَ لَا۔ جناب حسن عسکری سے ایک شخص نے لکھ کر فتویٰ پوچھا کہ مرغ کی بیٹ کا کیا حکم ہے اس کے ملوث کپڑے سے نماز جائز ہے۔ آپ نے جواب لکھا۔ نہیں۔ اور ویسے بھی یہ بات خود ان کے قاعدہ کے بھی خلاف ہے۔ کہ حلال جانور کی بیٹ ناپاک ہے،، ابن مطہر نے منتہیٰ میں اس پر نص نقل کی ہے۔ ان سب کے باوجود مرغوں اور مرغیوں میں کیا خوبی پیدا ہو گئی کہ ان کی بیٹ پاک ہو گئی!

(۹) وضو میں ان کے نزدیک تمام چہرہ کا دھونا فرض نہیں۔ حالانکہ نص قرآنی فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ۔ صراحتاً پورے چہرہ کو دھونے پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے حد فرض اس فاصلہ سے مقرر کی ہے جو انگوٹھے اور بیچ کی انگلی میں ہے جبکہ ان کو پیشانی کے اوپر والے حصہ سے لے کر نیچے تک کھینچیں اس اندازہ کی نہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہے نہ ائمہ سے اس قسم کی کوئی روایت منقول ہے۔ جناب امیر المومنین نے ایک مرتبہ جبکہ آپ مسجد کوفہ کے برآمدہ میں بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی نقل کر کے لوگوں کو دکھا رہے تھے، پورا چہرہ دھویا۔ اور حاضرین نے اسے دیکھا اور اس کی روایت کی۔ اس کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کو کشادہ کر کے اور پھیلا کر اوپر سے نیچے کی جانب کھینچیں گے تو ٹھوڑی کے متصل آکر وہ دونوں جانب سے گلے کا حصہ بھی گھیریں گی تو گویا گلے کے اتنے حصہ کا دھونا بھی فرض ہوگا۔ حالانکہ گلے کو چہرہ میں کوئی شامل نہیں کرتا۔ اور اگر ہر دو انگلیوں کو پیشانی کے مقابلہ میں پھیلائیں اور آہستہ آہستہ تنگ کرتے جائیں تو تنگ کرنے کی حد کیا ہے، یہ معلوم نہیں ہوئی۔ اور شرعی اندازے تو مکلفین کو بتانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ چھپانے کے لئے!

(۱۰) کہتے ہیں کہ غسل جنابت کے ساتھ وضو حرام ہے۔ ان کا یہ مسئلہ بھی حدیث کے صریح خلاف ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس غسل سے پہلے وضو فرماتے اور پھر تمام بدن پر پانی ڈالتے یہ سنت تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اور ان کی یہ بات ائمہ کی روایت کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ کلینی نے محمد بن میسّر کے حوالہ سے ابی عبداللہ سے روایت کی، اور حسن بن سعد نے حضرمی سے اور اس نے ابی جعفر سے! دونوں نے کہا کہ پہلے وضو کرے پھر غسل کرے۔ جب آپ سے غسل جنابت کی کیفیت معلوم کی گئی!

(۱۱) یہ غسل نوروز کو بھی سنت کہتے ہیں۔ ابن فہد نے بھی یہی کہا ہے۔ یہ بھی دین میں ان کا گھڑا ہوا اور بناوٹی مسئلہ ہے، جس کو ان کی کتابوں میں کسی نے بھی جناب پیغمبر علیہ السلام یا جناب امیر رضی اللہ عنہ یا دوسرے ائمہ سے روایت نہیں کیا۔ کہ انہوں نے نوروز کے دن غسل کیا ہو! نہ عرب اس نوروز کو جانتے تھے، جانتے بھی کیسے یہ تو کافر مجوسیوں کی عید کا دن تھا۔ (جب ان کے صحیح جانشین پیدا ہوگئے تو انہوں نے ڈھٹائی سے اپنے ہاں اسکو رواج دے لیا۔ مسلمانوں کو مجوسیوں کی عید سے کیا سروکار ؟)

(۱۲) تیمم میں یہ دو ضربوں کے بجائے ایک ضرب بتاتے ہیں۔ حالانکہ ائمہ کی روایات اس کے خلاف بول رہی ہیں۔ علاء نے محمد بن اسلم سے روایت کی کہ اس نے اپنے دادا سے تیمم کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ ایک مرتبہ چہرہ کے لئے اور ایک مرتبہ دونوں ہاتھوں کے لئے ضرب لگائے لیث مرادی نے ابی عبداللہ، اور اسمٰعیل بن حزم نے جناب رضا سے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔ اس روایت میں پیشانی پر مسح کا اضافہ بھی کر دیا ہے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

(۱۳) ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے۔ موزہ، ٹوپی، ازار بند، پائتابہ، کمر بند (پٹکا) اور عمامہ اور جو کچھ نمازی کے بدن پر ہو، جسکی چوڑائی پر نماز جائز نہ ہو، اگر اس پر نجاست لگ جائے چاہے وہ خفیفہ ہو یا غلیظہ، جیسے انسانی براز، تو نماز جائز ہے، نماز میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی حکم قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ وہاں تو حکم ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اپنے کپڑے پاک کرو) اور ظاہر ہے کہ تمام چیزیں عرف و شرع میں لباس و کپڑوں کے زمرہ میں شمار ہوتی ہیں۔

(۱۴) ایک مسئلہ یہ ہے کہ نمازی کے بدن کے کپڑے مثلاً ازار، کرتہ، پاجامہ خون و پیپ میں بھر جائیں، تو بھی نماز جائز ہے۔ حالانکہ خون و پیپ اپنا ہو یا دوسرے کا۔ بلاشبہ نجاست اور ناپاک ہے۔

(۱۵) ایک مسئلہ یہ کہ نفل نماز میں نمازی خواہ کھڑا ہو، یا بیٹھا، اور ایسے ہی سجدہ تلاوت کہ ان میں قبلہ کی سمت کے خلاف رخ کرنا جائز ہے دین میں ان کی طرف سے یہ ایسا اضافہ ہے جسکی اجازت شریعت نے نہیں دی، سواری اور سفر کا استثنا تو شریعت میں ہے مگر اور کسی حالت میں قبلہ سے رخ ہٹانے کی اجازت نہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کی روایات میں ان دو حالتوں کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ تم جدھر سے نکلو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرو۔ اور تم جہاں بھی ہو اپنا منہ اسی طرف رکھو۔ اب اس عموم میں سے پیغمبر علیہ السلام جس صورت کو مستثنٰی اور علیحدہ فرما دیں وہی قابل تسلیم ہوگی۔ آپ کے علاوہ کسی کی یہ تاب اور مجال نہیں کہ اپنی عقل سے کوئی استثنا کر سکے۔ اس مسئلہ میں ان کے شیخ مقداد نے کچھ انصاف سے کام لیا ہے اور اپنی تصنیف کنز العرفان فی احکام القرآن میں اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

(۱۶) ایک مسئلہ یہ کہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں خشک انسانی غلاظت بچھی ہوئی ہے اگر وہ غلاظت نمازی کے کپڑوں یا بدن پر نہ چپٹے تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ حالانکہ نماز کی جگہ کا پاک ہونا شریعت کے تسلیم کردہ اور مقرر کردہ مسائل میں سے ہے!

(۱۷) مسئلہ اگر کوئی دونوں ہاتھ کہنیوں تک اور دونوں پاؤں گھٹنوں تک ایسے نالہ اور چوبچہ میں داخل کردے جس میں بول و براز بھرا ہوا ہو، تو غلاظت صاف کرکے بغیر ہاتھ پاؤں دھوئے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح ایسے ہی غلاظت سے پُر حوض میں غوطہ لگا کر، اور

غلاظت کو بدن سے اتار کر بغیر بدن دھوئے بھی نماز پڑھنا جائز ہے ! ظاہر ہے ایسی صورت میں پانی سے دھوئے بغیر بدن پاک نہیں ہو سکتا جرم (دل) نجاست بدن سے اتار دینے سے پاکی حاصل نہیں ہوتی نہ ناپاکی کا اثر زائل ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے پانی بتایا ہے۔ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ (اور آسمان سے پانی اتارتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تم کو پاک کرے) اور فرمایا وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا۔ (اور نازل کیا آسمان سے پاک کرنے والا پانی)

(۱۸) مسئلہ اگر کوئی نمازی نماز سے فارغ ہو کر یہ دیکھے کہ اس کے کپڑوں پر خشک پاخانہ، یا کتّے بلی کی غلاظت، یا خون و منی لگی ہوئی ہے تو اس کی نماز درست ہو گئی۔ طوسی نے کتاب تہذیب میں یہ ... ہے، اور دوسروں نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے شرع میں کپڑوں کا پاک ہونا فرائض و شرائط نماز میں سے ہے۔

(۱۹) مادر زاد برہنہ صرف عضو مخصوص اور اس کے معلقات پر گیلی مٹی لگا کر، بلا ضرورت و مجبوری۔ نماز پڑھے تو ان کے ہاں جائز ہے، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ شرع میں عام حالات، خصوصاً، نماز، وعبادات اور مناجات میں ستر عورت کی کتنی تاکید ہے۔ اسی وجہ سے ان کے متاخرین میں سے ایک جماعت نے اس کی قباحت اور برائی محسوس کر کے جمہور کا قول تسلیم نہیں کیا۔ اور ائمہ و اہل بیت کے آثار سے دلیل لا کر اسکو غلط اور باطل ثابت کیا ہے۔

(۲۰) مسئلہ اگر کوئی شخص، داڑھی، مونچھ۔ بدن اور اپنے کپڑوں کو مرغ کی بیٹ سے لتھیڑ لے یا اس کی داڑھی، مونچھ یا رخسارہ پر اس کے پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں، یا عضو مخصوص کو پیشاب کرنے کے بعد تین مرتبہ جھٹک لے۔ یا مذکورہ جگہوں پر مذی مل لے۔ تو ایسی صورت میں دھوئے دھلائے بغیر نماز درست اور جائز ہو گی۔

(۲۱) نماز کی حالت میں چل کر ایسے خمیر کو جسے کہ ٹکیہ کھانا چاہتے ہوں اٹھا کر دسترس سے باہر جگہ پر رکھ دینا جائز ہے، اگرچہ چلنے کی مسافت شرعی دس گز کے برابر ہو، اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ فعل کثیر خصوصاً ایسا کام جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو باجماع روایات شرعیہ نماز کو باطل کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ اللہ کی حاضری میں سکون سے کھڑے ہو اگر کوئی خوف کی حالت ہو تو پیدل یا سواری پر جیسا موقعہ ہو نماز پڑھ لو۔ اور جب امن کی حالت ہو تو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے اس کے مطابق نماز پڑھو۔

(۲۲) یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں کے پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورہ السجدہ۔ اور تین سورتیں اور۔ حالانکہ قرآن مجید میں آیت۔ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ۔ (قرآن کا جو حصہ آسان رہا ہو پڑھو) عموم پر ناطق ہے۔ اور خود یہ فرقہ بھی اپنے ائمہ سے ایسی روایت بیان کرتا ہے کہ نماز ہر سورت سے جائز ہے۔ اور مزے کی بات یہ کہ یہ اس نماز کو بھی جائز بتاتے ہیں جس میں نمازی کوئی قرأت پڑھے اور دل میں یہ سمجھتا جائے کہ یہ قرآن منزل کا حصہ نہیں ہے بلکہ عثمان (رضی اللہ عنہ)، اور ان کے دوستوں کے تحریف کردہ قرآن کا حصہ ہے

(۲۳) ان میں کے بعض عین حالت نماز میں کھانا پینا جائز بتاتے ہیں چنانچہ ان کے ایک معتبر فقیہہ ابوالقاسم نجم الدین نے شرائع الاحکام میں بصراحت اس کو بیان کیا ہے۔ حالانکہ متفق علیہ احادیث میں نماز کی حالت میں کھانے پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے۔ اور اس پر تو اس فرقہ کا اجماع ہے کہ اگر کسی رات کی صبح کو روزہ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس رات کو عین وتر کی نماز میں تشنگی محسوس ہو تو پانی پینا جائز ہے۔

(۲۴) اگر کوئی کسی حسینہ سے بغلگیر ہو جائے اور اس حالت میں انتشار ہو، اور وہ عضو کو مقابل کے عضو کے مقابلہ میں رکھے اور اس کی وجہ سے مذی اس کی پنڈلی تک بہ آئے تو ایسی حالت میں بھی نماز جائز ہے۔ طوسی، ابوجعفر اور ان کے دوسرے مجتہدین کا یہی فتویٰ ہے ! یہ ایسی حرکت ہے جو مقاصد شرع کی کھلم کھلا تردید کرتی ہے اور مناجات باری کی حالت کے صاف منافی ہے۔

(۲۵) اگر کوئی نمازی عین حالت نماز میں عضو مخصوص اور معلقات کے ساتھ مشغول رہے حتیٰ کہ تندی وانتشار کی نوبت بھی آجائے اور اس کی وجہ سے مذی بھی بہ نکلے تو نماز میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔

(۲۶) ان میں کے بعض نے ائمہ کی قبور کی طرف ثواب وتقرب کی نیت سے رخ کر کے نماز پڑھنا جائز کہا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِ ھِمْ مَسَاجِدَ۔ (اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا)۔

(۲۷) انہوں نے ظہر وعصر اور مغرب عشاء کی نمازوں کو بغیر عذر اور بغیر سفر کے جمع کرنے کو جائز قرار دیا ہے جو صراحتاً قرآنی فرمان کے خلاف ہے۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی۔ (اپنی نمازوں کی حفاظت کرو خاص کر درمیانی نماز) اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ (مومنوں پر نماز اوقات کی تعیین کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

۲۸ امام غائب" کے خروج کے انتظار میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء چاروں نمازوں کو ملا کر پڑھنا ان کے نزدیک مستحب ہے۔

(۲۹) عام یا تجارتی سفر میں پوری نماز پڑھنے کا حکم لگاتے ہیں مگر روزہ چھوڑنے سے منع کرتے ہیں حالانکہ شریعت میں نماز روزہ کا ایک ہی حکم ہے۔ (یعنی رعایت دونوں عبادتوں میں ہے) ابن ادریس، ابن معلم اور طوسی وغیرہ نے اس فرق کی تصریح کی ہے، حالانکہ ان کی کتابوں میں ائمہ کی ایسی روایات موجود ہیں جن سے فرق نہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ معاویہ بن وھب نے ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے۔ اَنَّہٗ قَالَ فَاِذَا قَصَرْتُ اَفْطَرْتُ وَاِذَا اَفْطَرْتُ قَصَرْتُ۔ (میں جس حالت میں نماز قصر کرتا ہوں تو روزہ نہیں رکھتا اور جب روزہ نہیں رکھتا تو نماز میں قصر کرتا ہوں)

(۳۰) یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو قیام کم اور سفر زائد درپیش ہو جیسے سواری کو کرایہ پر چلانے والا کشتیوں کے ملاح وغیرہ یا وہ تجار جو پیشوں اور منڈیوں کی تلاش میں ہر وقت پابرکاب رہتے ہوں ان سب کے لئے جائز ہے کہ دن کی نمازیں قصر کریں اور رات کی پوری پڑھیں، اگرچہ دوران سفر پانچ ہی دن کے قیام کی نوبت آئے چنانچہ ابن زہرہ، ابن سراج اور ابو جعفر طوسی نے نہایہ اور مبسوط میں اس کے متعلق نص بیان کی ہے۔ حالانکہ اس صورت کے خلاف ائمہ کی روایات ان کے علم میں آچکی ہیں۔ کہ انہوں نے دن رات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ محمد بن بابویہ نے اپنی صحیح میں ایک امام کی یہ روایت بیان کی ہے۔ قَالَ الْمُکَارِیْ وَالْمَلَّاحُ اِذَا جَدَّ بِھِمَا سَفَرٌ فَلْیَقْصُرْ۔ (کرایہ پر کام کرنے والا اور ملاح اگر ان کو سفر کی عجلت ہو تو وہ قصر کریں) عبدالملک نے بھی جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

(۳۱) نماز جن سفروں میں قصر کی جاتی ہے ان میں سفر مکہ، مدینہ، کوفہ اور کربلا کو شامل نہیں کرتے ان کے جمہور کا یہی مذہب ہے۔ (کہ ان چار مقامات کے سفر میں قصر نہ کریں) اور مختار مرتضیٰ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ مشاہد ائمہ کے لئے سفر کا یہی حکم ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ آیت قرآنی فَاِذَا ضَرَبْتُمْ کے خلاف ہے کہ اس میں سفر مطلق ہے اور جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ بھی تمام اسفار میں قصر کرتے تھے۔ اور اوپر محمد بن بابویہ کی جو روایت بیان ہوئی وہ بھی اطلاق پر دلالت کرتی ہے۔

(۳۲) ان کے ہاں امام کی عدم موجودگی میں نماز جمعہ چھوڑ دینے کا حکم ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ مسلمانوں جب نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔ اس آیت میں امام کی موجوگی کی کوئی قید نہیں۔

(۳۳) اگر کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی مر جائے تو اس کے لئے جزع وفزع کرنے اور کپڑے پھاڑنے کو جائز قرار دیا ہے، اور عورت کے لئے

توہر میت پر ایسا کرنا جائز ہے، حالانکہ تمام شرائع میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی گئی اور رونا پیٹنا، اور واویلا، حرام کہا گیا ہے اور صحیح احادیث میں تو یوں آیا ہے لَیْسَ مِنَّا مَنْ حَلَقَ وَ سَلَقَ وَخَرَقَ (وہ ہم میں سے نہیں جو کسی کی موت پر) سر منڈائے، یا نوحہ کرے اور کپڑے پھاڑے اور ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے لَیْسَ مِنَّا مَنْ خَرَقَ الْجُیُوْبَ وَ لَطَمَ الْخُدُوْدَ. (وہ ہم میں سے نہیں جو گریبان پھاڑے یا گال پیٹے)

(۳۴) پانی میں غوطہ لگانے سے ان کے ہاں روزہ ٹوٹ جاتا ہے. حالانکہ روزہ توڑنے والی چیزیں کھانا پینا اور جنسی فعل، بالاجماع ہیں. اسی لئے ان میں سے بہت سوں نے جب صحیح آثار اس مسئلہ کے خلاف پائے تو روزہ نہ ٹوٹنے کے قائل ہو گئے.

(۳۵) ایک عجیب وغریب مسئلہ ان کے ہاں یہ بھی ہے جنکو ان کی اکثریت مانتی ہے کہ لڑکے کے ساتھ خلاف وضع فطری عمل کیا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا. حالانکہ ائمہ سے اس کے خلاف مروی ہے. اور اس بات پر تمام امت کا اجماع ہے کہ جو فعل وحرکت انزال کا موجب ہو وہ مفسد روزہ بھی ہے. چاہے کسی راستہ سے ہو!

(۳۶) ان میں سے بعض کے نزدیک جانور کی کھال کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس کا کھانا بھی جائز ہے بعض کہتے ہیں پتے کھانے (مثلاً پان) سے روزہ میں خلل نہیں پڑتا. بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جو چیزیں عادتاً نہیں کھائی جائیں ان کے کھانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا. اور اس کے باوجود غوطہ زن پر قضا اور کفارہ دونوں باتیں واجب قرار دیتے ہیں. اگرچہ غوطہ کے وقت اس کی ناک اور گلے میں ایک بوند پانی بھی نہ گیا ہو. اس افراط وتفریط کے کیا کہنے! یہ صورت تو شریعت کے مقاصد اور احکام کے اسباب وعلل سے دور جا پڑنے کی ہے.

(۳۷) ان کے نزدیک عاشورہ کے دن کا روزہ عصر تک رکھنا مستحب ہے. حالانکہ کسی شریعت میں بھی روزہ کے معاملہ میں دن کے ٹکڑے نہیں کئے گئے، کہ بعض وقت میں روزہ ہو اور بعض میں نہ ہو. یہ تو مسلمانوں کا روزہ نہ ہوا ہندوؤں کا برت ہو گیا، کہ وہ دن میں بعض چیزیں کھانا جائز سمجھتے ہیں. یہ ضروری نہیں کہ سارے دن کا روزہ رکھیں.

(۳۸) ۱۸ ذی الحجہ کو روزہ رکھنا ان کے نزدیک سنت موکدہ ہے، حالانکہ کسی پیغمبر، یا امام نے خصوصیت کے ساتھ نہ اس دن کا روزہ رکھا نہ اس دن کے روزہ کا کوئی ثواب بیان کیا.

(۳۹) ان کے نزدیک اعتکاف صرف ان مساجد میں جائز ہے جن میں نبی، یا وصی نے جمعہ قائم کیا ہو ان کے علاوہ دیگر مساجد میں جائز نہیں. یہ مسئلہ بھی قرآن مجید کے صریحاً خلاف ہے کہ قرآن مجید میں وَاَنْتُمْ عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ. (اور تم مسجدوں میں اعتکاف کرتے ہو) آیا ہے کہ اس میں ہر مسجد شامل ہے. پھر اعتکاف کرنے والے کے لئے خوشبو سونگھنا، عطر لگانا بھی ان کے ہاں سخت ناجائز ہے! حالانکہ مساجد میں جانے کے لئے خوشبو لگانا بالاجماع سنت ہے! اور معتکف تو خوشبو لگانے کا زیادہ حقدار اور مستحق ہے. کہ وہ مسجد میں قیام کرتا ہے جو فرشتوں کی ہمنشینی کی جگہ ہے. اور فرشتوں کو خوشبو سے اُنس اور بدبو سے وحشت ونفرت ہے. اور یہ بات جملہ شرائع سے ثابت ہے.

(۴۰) زکوٰۃ کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ سونا چاندی اگر سکوں کی شکل میں نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں. اور اگر سکوں کی شکل میں بھی ہو مگر وہ رائج نہ رہے ہوں، دوسرے ان کی جگہ رواج پا گئے ہوں تو ان سکوں پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں. اس سلسلہ میں ان کے ہاں حیلہ کی یہ شکل بھی جائز ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی سونے کا بہت سا سکہ ہو اور آخر سال تک وہ اسکی ملکیت میں بھی ہے، اگر سال ختم ہونے سے ایک دو دن پہلے بھی وہ ان سکوں کا زیور، کھلونے، برتن یا کوئی سامان آرائش بنوالے تو ان سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی.

ان مسائل میں اگر غور وتدبر سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ مقاصد شرع سے یہ کتنے دور جا پڑے اور نص صریح کی مخالفت پر کتنے جری اور دلیر ہو گئے ہیں. قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے.

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ — جو لوگ سونے چاندی کو جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک اور سخت عذاب کی بشارت دیجئے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا ائمہ کے کلام میں جہاں کہیں زکوٰۃ کی فرضیت کا ذکر آتا ہے وہاں سونے چاندی ہی کا نام آتا ہے۔ دراہم ودنانیر کا نام نہیں آتا۔ (اس لئے جس چیز میں بھی چاندی سونا پایا جائے گا اس پر وہ فرضیت لاگو ہوگی)۔

(۱۴۱) اموال تجارت پر بھی ان کے ہاں زکوٰۃ واجب نہیں، جب تک، لین دین، رد وبدل اور الٹ پھیر میں ان کی نقدی (بصورت سکہ) نہ بنجائے! اور ایسے مال میں بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں کہتے جس کا کوئی عورت یا مرد مالک ہوا اور پھر اس نے اسے اپنا سرمایہ قرار دے لیا۔ اور نہ اس مال میں زکوٰۃ ہے جو کمائی کی خاطر خریدا مگر پھر اسے سرمایہ بنانے کی نیت کرلی۔ یا اس کے برعکس۔ حالانکہ شارع علیہ السلام کا حکم "اَدُّوْا زَکٰوۃَ اَمْوَالِکُمْ" (اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو) صاف ہے، اور ان مذکورہ چیزوں کے مال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

(۱۴۲) اگر کوئی نادار فقیر، مستحق زکوٰۃ۔ زکوٰۃ کے پیسہ پر، قابض، مالک اور متصرف ہونے کے بعد امیر ہو جائے تو ان کے نزدیک وہ زکوٰۃ واپس لے لینے کا حکم ہے۔ (چاہے وہ دینا نہ چاہتا ہو) حالانکہ کسی کا مال رضامندی کے بغیر لینا کسی بھی شریعت میں جائز نہیں۔ زکوٰۃ لیتے وقت اس کا مستحق ہونا شرط ہے۔ تمام عمر کے لئے یہ شرط نہیں!

(۱۴۳) ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اتنی رقم ہے کہ سفر حج اور آمد ورفت کے تمام اخراجات نیز اہل خانہ کے تا واپسی اخراجات بخوبی پورے ہوسکتے ہیں مگر اسکو یہ گمان ہے کہ واپس گھر آکر مزید ایک ماہ۔ سے زائد یہ رقم پوری نہیں پڑے گی تو اس پر حج فرض نہیں۔ ابوالقاسم نے شرائع میں اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے۔ حالانکہ شارع نے حج کو استطاعت کی شرط سے مقید کرکے فرض فرمایا ہے اور استطاعت کی تفسیر یہ کی کہ اس کا پیسہ، سفر خرچ، سواری خرچ، اور آمد ورفت کی مدت میں اس کے اہل خانہ کے خرچ کو کافی ہوسکے۔ اگر واپسی پر پیسہ ختم ہو جائے تو اس سے استطاعت میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر ہے واپس آکر ہر شخص اپنی سابقہ یا نئی معاش میں لگ جاتا ہے۔ بیکار نہیں بیٹھتا۔ (صرف استطاعت کا رخ بدلے گا پہلے خرچ کرنیکی استطاعت میں لگا ہوا تھا۔ اب کمانے کی استطاعت میں مشغول ہوسکیگا)

(۱۴۴) ان کے بعض کہتے ہیں کہ حج میں ستر عورت فرض نہیں ہے۔ ایام جاہلیت کی طرح برہنہ ہو کر طواف کرنے کو بھی جائز کہتے ہیں مگر یہ شرط لگاتے ہیں کہ اپنی شرمگاہ کو مٹی یا کسی چیز سے اتنا لتھیڑ لے کہ کھال نظر نہ آئے گو اسکی شکل دکھتی رہے اس میں کوئی حرج نہیں (کیا ننگے ہندو جوگیوں، سے سرقہ تو نہیں؟)، اس طرح تو انہوں نے رسم جاہلیت کو زندہ کیا ہے، ملت حنفیہ سے اس کا کیا ربط و تعلق۔ حالانکہ قرآن مجید میں خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ۔ (مسجد میں جاتے وقت اپنا لباس لے لو) کا صاف حکم ہے۔ اور روایات بھی اس مسئلہ کے خلاف موجود ہیں۔ اور خانہ خدا کے طواف کے وقت تو ادب کا انتہا سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہیئے وہاں ننگا ہو کر خانہ خدا کی بے حرمتی اور اپنی رسوائی نہ کرے۔ اور اہل جاہلیت کی مشابہت اختیار کرکے شیطان کی سواری نہ بنے!

اسی کے ساتھ طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ اگر احرام کی حالت میں زنا سرزد ہوجائے تو اثنا عشریہ کے نزدیک حج میں کوئی نقصان اور خلل نہیں ہوتا اور ننگوں میں یہی نہ ہوگا تو پھر کیا ہوگا۔ جب کوئی بے حیائی پر کمر باندھ لے تو جو چاہے کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان واضح اور صاف ہے کہ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ۔ (حج میں نہ جماع ہے نہ بدکاری اور نہ دنگا فساد) اور زنا سے بڑھ کر رفث اور کیا ہوگا۔

(۱۴۵) احرام کی حالت میں اگر شکار عمداً کیا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، اور اگر دوبارہ پھر ایسا ہی کیا تو کفارہ نہیں۔ یہ ان کا مسئلہ ہے حالانکہ دوسری مرتبہ میں تو پہلے کی نسبت قصور زیادہ ہے کہ اس میں اصرار اور ڈھٹائی کا تاثر ملتا ہے۔

(۶ ہم) ان کے ہاں جہاد صرف پانچ اوقات کے ساتھ مخصوص ہے۔ (۱) سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں۔ (۲) جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں۔ (۳) حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح سے پیشتر کے وقت۔ (۴) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہمرکابی میں۔ (۵) امام مہدی کی سرکردگی میں۔ (حضرت علی اور جناب سبطین رضی اللہ عنہم کی ہمراہی میں انہوں نے جیسا جہاد کیا اس کا کچا چٹھا آپ اوراق گذشتہ میں ملاحظہ فرما چکے اب امام مہدی کے ساتھ یہ کیسا جہاد کرتے ہیں دیکھا چاہیئے)

ان مذکورہ پنج اوقات یا زمانوں کے علاوہ ان کے نزدیک جہاد عبادت تو کیا جائز بھی نہیں۔ حالانکہ جہاد سے متعلق یہ نص۔ اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ (جہاد قیامت تک جاری ہے) بتواتر ثابت ہے! اس کے علاوہ قرآن مجید کی وہ آیات جو جہاد کی ترغیب وتاکید کے لیے وارد ہوئی ہیں ان میں کسی وقت اور زمانہ کی قید نہیں۔ بعض آیات تو ایسی ہیں جو صراحۃً اسباب پر دلالت کرتی ہیں کہ جہاد ان اوقات خمسہ کے علاوہ بھی عبادت اور اجر عظیم کا باعث ہے۔ مثلاً خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے رفقاء کے حق میں یہ آیت یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (کہ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں) اور خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے لشکر کی شان میں یہ آیت سَتُدْعَوْنَ اِلٰی قَوْمٍ الخ

اب یہ دیکھیے کہ جب ان کے نزدیک پنج اوقات کے علاوہ جہاد فاسد ہے تو فاسد جہاد کے مال غنیمت کی تقسیم بھی شرعی لحاظ سے درست نہ ہوگی۔ تو ایسی صورت میں جو لونڈیاں کسی کے قبضہ میں ہونگی وہ نہ انکی ملک ہوں گی اور نہ ان سے نفع اٹھانا جائز ہوگا۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے انہوں نے ایک انوکھا فتویٰ گھڑا ہے۔ صاحب رقعہ مزورہ نے اس فتویٰ کی نسبت امام صاحب الزمان کی طرف کی ہے کہ یہ لونڈیاں سب امام کی ملک ہیں۔ اور ائمہ اپنی لونڈیوں کو اپنے شیعوں کے لیے حلال سمجھتے تھے۔ گویا اس حیلہ سے گرفتار شدہ باندیاں شیعوں کے لیے حلال ہوئیں! کتنے رکیک اور واھیات ہیں یہ حیلے کہ حیلہ گروں پر زمین و آسمان سے پھٹکار پڑنی چاہیے! اور بے حیائی اور بے باکی تو دیکھیے کہ جن فقہی کتابوں میں دین وایمان کی باتیں مزوّدن ہوتی ہیں ان میں ایسی شرمناک باتیں اپنا دین وملّت بتا کر انہوں نے درج کی ہیں۔

اس سلسلہ میں جب اہل سنت ان کو کہتے ہیں کہ اگر ان اوقات کے علاوہ جہاد جائز ہی نہ تھا تو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے جہاد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسیر ہونیوالی خولہ بنت جعفر یمامیہ پر جنکے لطن سے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا تصرف کیسے درست تھا۔ کہ نہ تو بقول تمہارے وہ جہاد کا وقت درست تھا، اور نہ ہی خلیفہ وقت کی تقسیم درست تھی۔ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ بروایت صحیح ثابت ہے کہ جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کرکے پھر عقد کیا تھا۔ لیکن یہ اتنا نہیں جانتے کہ مالک ہوئے بغیر آزاد کرنے کی تک ہی کیا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لہٰذا پہلے آپ اس کے مالک ہوئے پھر آزاد کیا۔ اور آزاد کرنا خود ایک تصرف ہے۔ لہٰذا مدعا ثابت ہوا۔

(۷ ہم) ان کے نزدیک عقد نکاح یا معاملات خرید وفروخت صرف عربی زبان میں جائز ہیں کسی اور زبان میں جائز نہیں۔ حالانکہ کسی بھی شریعت میں دنیاوی معاملات میں لغات کا ہرگز اعتبار نہیں کیا اور نہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں خراسان اور فارس کے لوگوں کو اس کی تکلیف دی کہ وہ اپنے معاملات عربی زبان میں طے کیا کریں، بلکہ نکاح اور خرید وفروخت کے معاملات جو وہ اپنی زبانوں میں طے کر رہے تھے ان کو بدستور جاری اور نافذ وجائز رکھا۔ اور یہ بات عقل میں بھی نہیں آتی کہ ان معاملات نکاح وخرید وفروخت۔ طلاق کی صحت میں عربی زبان کا کسی قسم کا دخل ہو۔ کیونکہ ان معاملات میں اصل مقصد تو دلی منشا ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ عادتاً ہر قوم اپنی ہی زبان میں کرتی ہے،

(۸ ہم) ان کے ہاں باپ کی موجودگی میں چھوٹے بچے کے مال کا مختار دادا، ہوتا اور وہی ولایت کا حق رکھتا ہے حالانکہ شرع اور عرف دونوں

میں یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر معاملہ میں ولی اقرب کے ہوتے ہوئے ولی ابعد کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔

(۴۹) ایک مسئلہ یہ ہے کہ تجارت میں مومن سے منافع لینا مکروہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ۔ (اللہ نے بیع حلال کی)، اور اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ۔ (مگر یہ کہ وہ تجارت تمہاری باہمی رضا مندی سے ہو) اس میں مومن وغیر مومن دونوں برابر ہیں کیونکہ تجارت کی بنیاد اور خرید و فروخت کا مقصد منافع ہی ہوتا ہے۔ اور پھر ہر عہد اور ہر شہر میں ساری امت کا عمل بھی سراسر اس کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شخص دار الاسلام میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا چاہے تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ تجارت کر سکے۔ اور اس طرح ایران، خراسان، عراق، عرب اور یمن جیسے ملک تو تجارت کے فائدہ سے محروم ہوں گے۔ حالانکہ انبیاء و ائمہ نے مومنین کے درمیان تجارتی معاملات قائم کئے اور نفع لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(۵۰) کہتے ہیں کہ رہن شدہ چیز پر مرتہن کا قبضہ ہوئے بغیر ہی رہن جائز ہے حالانکہ شرع میں قبضہ کو رہن کی ضروریات اور لوازمات میں سے شمار کیا گیا ہے فَرِھٰنٌ مَّقْبُوْضَۃٌ۔ ارشاد ربانی ہے۔ قبضہ کے بغیر وہ فائدہ مرتب نہیں ہوتا جو رہن سے مقصود ہے، اس لئے کہ رہن رکھنے والے کو رہن شدہ رقبہ میں دخل نہیں، وہ ملک تو راہن کی ہے، اس کی اجازت کے بغیر مرتہن کوئی فائدہ و نفع نہیں اٹھا سکتا۔ جو کچھ ہے یہی قبضہ تو ہے کہ جس کے ذریعہ بوقت ضرورت قرض وصول کر سکتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو رہن کا فائدہ کیا ہے اس کے علاوہ یہ مسئلہ ائمہ کی روایات صحیحہ کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ محمد بن قیس نے جناب باقر و صادق رحمۃ اللہ ہر دو سے یوں روایت بیان کی ہے۔
اِنَّھُمَا قَالَا: لَا رَھْنَ اِلَّا مَقْبُوْضًا۔ (ان دونوں نے فرمایا رہن قبضہ کی صورت ہی میں صحیح ہے)

(۵۱) اگر کسی شخص نے کسی کی لونڈی رہن رکھی تو ان کے نزدیک اس سے ہمبستری جائز ہے، حالانکہ یہ کھلا زنا ہے۔

(۵۲) ان کے ہاں اگر کوئی اپنی حرم یعنی مملوکہ لونڈی کو جس کے بطن سے بچہ پیدا ہو چکا ہو اور جسے فقہاء کے عرف میں ام ولد کہتے ہیں کسی کے پاس رہن رکھے تو یہ جائز ہے۔ بلکہ یہ تک جائز ہے کہ رہن رکھنے والے کو اجازت دیدے کہ وہ اس کے آگے پیچھے جس راہ سے چاہے جنسی فعل کر سکتا ہے۔ اب اس پر کیا تبصرہ کیا جائے، اس مسئلہ میں جو قباحت ہے یا یہ قواعد شرع کے جسقدر مخالف ہے وہ سب پر روشن ہے حقیقت یہ ہے کہ ایسے یہی فرقہ اپنے ماتھے کا جھومر بنا سکتا ہے۔

۵۳ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اپنا قرض کسی دوسرے پر اتار دے (کہ یہ ادا کرے گا) تو دوسرا اسے مانے یا نہ مانے ہر حال میں ادائیگی قرض اس پر واجب ہے! ابو جعفر طوسی اور اس کے استاد ابن النعمان نے اس پر نص کی ہے۔ اس حکم کا انوکھا پن یہی ہے کہ کسی شریعت میں یہ دھاندلی اور زبردستی پن نہیں ہے کہ ایک کا قرض دوسرے کے قبول کئے بغیر اس کے سر تھوپ دیا جائے، اگر کہیں اس مسئلہ پر عملدرآمد شروع ہو جائے تو ایسی بڑبونگ اور شورش برپا ہوگی کہ باید و شاید۔ ہر فقیر اپنے قرضداروں کو مارکیٹوں اور ساہوکاروں کے حوالہ کر جائے، اور صاحب ثروت تاجروں، ساہوکاروں کا مال کنگلے فقیروں کے قرضوں میں لٹ جائے تو کتنا عجیب تماشا ہوگا۔

(۵۴) ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے کسی کا مال چھین جھپٹ کر، یا دھوکہ فریب سے غصب کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیا۔ اور پھر امانت رکھوانے والا مر گیا، تو امین (امانت رکھنے والا) پر واجب ہے کہ وہ اس امانت سے انکاری ہو جائے۔ حالانکہ امانت سے انکار کی اللہ تعالیٰ نے بڑی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ غصب کا گناہ تو غاصب کے سر ہے اس امانتدار کو امانت کا انکار کس طرح جائز ہوگا۔ جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر وہ آخرت کی جوابدہی اور پکڑ سے کس طرح بچے گا۔ اور دنیا میں اس کے لئے یہ جائز ہی کہاں ہوگا۔

(۵۵) یہ بھی ان کا مسئلہ ہے کہ اس غصب شدہ مال کا مالک ایک سال کی تلاش و جستجو کے باوجود نہ مل سکے تو یہ مال فقیروں کو خیرات کر دیا جائے، حالانکہ غیر کے مال میں بغیر مالک کی اجازت خیرات کرنا شرع میں جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹاؤ۔
اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ۔ (جس نے تجھے امین بنایا اس کی امانت اسے لوٹا۔ اور جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر) ابن مطہر حلی نے بھی اس حدیث کی صراحتاً تصحیح بیان کی ہے۔

(۵۶) مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کا مال غصب کیا، اور اپنے مال میں رلا ملا دیا کہ دونوں کی پہچان یا علیحدگی ممکن نہ رہی، مثلاً دودھ، دہی، گھی، گیہوں، شکر اور پانی وغیرہ تو حاکم کو چاہیئے کہ غاصب کا مال رلا ملا مال اس شخص کے حوالہ کردے جس کا مال غصب ہوا تھا سبحان اللہ! اس عدل وانصاف کے کیا کہنے! یہ تو غاصب پر کھلم کھلا ظلم ہے کیونکہ جس کو غاصب کا مال دیا جا رہا ہے، اس کا غاصب کے مال میں کیا حق پہنچتا ہے؟ کیونکہ اس سارے مال میں غاصب کا بھی تو مال شامل ہے۔ اور پھر ظلم کا علاج یا تدارک ظلم سے نہیں کیا جا سکتا۔

(۵۷) ایک مسئلہ ان کا یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی لونڈی کسی کے پاس رہن رکھی اور اسکو اجازت دی کہ جب چاہے اس سے لطف اندوز ہو تو یہ جائز ہے۔ امانتدار کو یہ حق ہو جاتا ہے کہ خوب آزادی سے گلچھرے اڑائے۔ اسی طرح اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اس لونڈی کے تمام منافع تیرے لیے بحال کئے تو دوسرے شخص کے لئے اس لونڈی سے لطف اندوزی حلال طیب ہو جاتی ہے، اور ان کے ہاں شرمگاہ کو اس کے نام کی شرح یا تمام منافع کی آڑ میں عاریتاً دینا جائز ہے اور ام ولد کو ہمبستری کے لیے عاریتاً دینا بھی روا ہے۔ یہ تمام مسائل قرآن مجید کے احکامات کے بالکل مخالف ہیں اس لئے کہ قرآن مجید میں تو یہ فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ۔

اور وہ لوگ، جو اپنی شرمگاہوں کی محرمات سے، حفاظت کرتے ہیں ہاں مگر اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں پر استعمال کرتے ہیں۔ تو ان پر ملامت نہیں ہے اور جو کوئی ان کے علاوہ کوئی اور صورت چاہے تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں۔

(۵۸) یہ کہتے ہیں ہوشیار اور سمجھدار بچہ اپنے وارثوں سے بھٹک کر کسی کے پاس پہنچ جائے تو اسے اپنی نگرانی میں لینا اور اپنے گھر میں اس کی نگہداشت اپنے گھر میں کرنا جائز نہیں۔ (شاید اس لئے کہ ہوشیار بچہ ان کے نزدیک بھٹک نہیں سکتا ہوگا)۔ حالانکہ ہوشیار بچہ بھی گم ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس کی نگرانی و حفاظت نہ کرنا اس کی ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی کم عمری کے سبب نہ نقصان رساں چیز کا دفاع کر سکتا ہے، اور نہ اپنی بقا کا منافع حاصل کر سکتا ہے، لہٰذا اسکو اپنی حفاظت و نگہداشت میں لینا جانوروں کی نگہداشت سے زیادہ اہم و ضروری ہے۔

(۵۹) ان کے نزدیک اجارہ عربی زبان میں اس کا معاملہ کئے بغیر معتبر نہیں۔ (اجرت پر کوئی چیز لینا مثلاً سواری کے لئے کوئی گاڑی یا جانور وغیرہ، یا مثلاً رہنمائی کے لئے کوئی گائیڈ وغیرہ)

(۶۰) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ اگر کوئی شخص کافروں سے جہاد کرنے کے لئے لشکر میں بھرتی ہو جائے یا ڈاکوؤں کے قلع قمع میں پولیس و سیکورٹی میں نوکر ہو جائے تو امام مہدی کی عدم موجوگی کے سبب وہ تنخواہ کا مستحق نہیں۔ کیونکہ امام کی غیر موجودگی کے سبب جہاد فاسد ہے، صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا تنخواہ کا معاہدہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔

(۶۱) ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شیعہ نے اپنی ام ولد لونڈی کو کسی شخص کے پاس گھریلو کاموں وغیرہ کے لئے نوکر رکھا یا۔ اور اسکی شرمگاہ کو کسی دوسرے شخص کے لئے حلال کر دیا۔ تو اس کی گھریلو خدمات ایک شخص کے لئے ہونگی اور جنسی خدمات دوسرے شخص کے لئے۔

(۶۲) ان کے نزدیک ہبہ عربی زبان کے بغیر درست نہیں۔ اب کوئی لاکھ بار کہے کہ میں نے تجھے یہ چیز بخشدی، یا دیدی وہ ہبہ معتبر نہیں ہوگا۔

(۳) ان کے نزدیک اپنی زرخرید (مملوکہ) لونڈی کو جنسی تلذذ کے لئے کسی کو بخشنا درست ہے اور شرمگاہ عاریتاً دینا بھی جائز ہے!

(۴) ان کے اکثر کے ہاں صدقہ واپس لے لینا جائز ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ۔ (اپنے صدقے باطل مت کرو) کا حکم ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلْعَائِدُ فِي صَدَقَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِي قَيْئِهٖ (اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لینے والا ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کو چاٹ لے)

(۵) ان کے ہاں بلی کو وقف کرنا جائز ہے۔ اب خدا جانے بلی میں وہ کونسا نفع نظر آیا یا فائدہ دیکھا کہ اس کا وقف جائز قرار دیا۔

(۶) ان کے ہاں کا ایک متفقہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ لونڈی کی شرمگاہ کا وقف جائز ہے، اگر وہ لونڈی کرائے پر چلے، یا کسی کے ساتھ متعہ میں جائے تو جس کے لئے وہ وقف کیگئی ہے اسکو وہ کمائی کھانا جائز ہے۔ شیر مادر کی طرح ہضم کر سکتا ہے (یہ قحبہ گری شریعت کے نام پر اس لعنتی مذہب کے سوا کسی مذہب میں کاہے کو ملیگی)

(۷) ایک مسئلہ یہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ خواہش اور ضرورت ہونیکے باوجود نکاح نہ کرنا مستحب ہے۔ یہ مسئلہ انبیاء و اولیاء کی سنت کے صریحاً خلاف ہے۔ ان حضرات نے خود بھی نکاح کئے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا۔ انہوں نے چونکہ خواہشات کو پورا کرنے کا شیطانی طریقہ شرمگاہوں کو کرایہ پر چلا کر، یا ہبہ کر کے یا عاریت دے کر اختراع کر لیا ہے۔ اس لئے یہ کیوں نکاح کا جھنجھٹ پالیں گے یا اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں گے۔

(۸) ان کا کہنا ہے جن ایام میں چاند برج عقرب میں ہو، یا تحت الشعاع، ان ایام میں نکاح مکروہ ہے۔ حالانکہ یہ امور مقاصد شرع کے خلاف ہیں جس کا مقصد نجوم پرستی کی بیخ کنی ہے! یہ بات ملت حنیفہ کے تو خلاف ہے البتہ صابئین کے موافق ہے۔

(۹) ان کے ہاں نو برس کی عمر تک لڑکی نہ پہنچ جائے خواہ وہ کتنی ہی تگڑی اور جسم و جان والی ہو اس سے صحبت حرام ہے۔ شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اسے حرام کہہ کر مذہب کا رنگ دینا۔ انہیں کا کام ہے۔

(۱۰) یہ کہتے ہیں کہ حلال نکاح میں شرط کے طور پر زمانہ متعین میں جماع کی تعداد مقرر کرنا جائز ہے۔ مثلاً یہ کہ دن رات اتنی مرتبہ یا ایک ماہ میں اتنی مرتبہ یہ فعل کروں گا۔ اور پھر ہر دو پر شرط کے موافق مطالبہ و مواخذہ کا حق ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (ان سے کوئی خفیہ وعدہ نہ کرو جو کچھ طور و طریق کے موافق کہو)۔ انہوں نے منکوحہ، مملوکہ، مانگی ہوئی، وقف کی ہوئی، اور امانت رکھی ہوئی، یا متوعہ لونڈی کے ساتھ خلاف وضع فطری فعل کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن میں حیض کی حالت میں صحبت کی ممانعت ہے، اور علت ممانعت نجاست و گندگی بتائی ہے۔ جب حیض کے راستہ کی حرمت کا باعث گندگی ہے تو پاخانہ کی گندگی و نجاست کے باعث اس کے راستہ کی حرمت کیوں نہ ہوگی۔ کہ اس کی ناپاکی تو اس راستہ کے آنتوں کے ہر وقت متصل رہنے اور ان میں اور ان میں نجاست کے بھرے رہنے سے زیادہ قابل حرمت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ جو شخص عورت سے غیر فطری راستہ کے ذریعہ یہ فعل کرے اس پر لعنت مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتَى امْرَاَةً فِيْ دُبُرِهَا۔ اور یہ بھی فرمایا اِتَّقُوْا مَحَاشَّ النِّسَآءِ (عورت کے غیر فطری راستہ (میں عمل) سے بچو) یہ وہ حدیث ہے جس پر سب کا اتفاق ہے متقدمین نے بھی اس کی تصریح و تائید کی ہے۔ نیز اس حدیث میں وجہ حرمت کی طرف بھی اشارہ ہے محشہ کے لغوی معنی بیت الخلا کے ہیں، تو اس لفظ کا اشارہ یہ ہے کہ یہ جگہ بھی بیت الخلا کی طرح گندی، نجس، ناپاک اور قابل احتراز ہے! اسی طرح آپ کا یہ قول بھی ہے۔ اِنَّ الْحُشُوْشَ مُحْتَضَرَةٌ (بیت الخلا، حشوش بھنے کی جگہیں ہیں) فن تشریح سے ناواقف بعض لوگوں کے دل میں یہ بات کھٹک سکتی ہے کہ پیشاب بھی تو ناپاک و نجس ہے۔ اس کے راستہ کو حلال کیوں کیا گیا۔ تو سطور ذیل سے انکی تشفی ہو سکتی ہے۔ فن تشریح میں یہ بات طے شدہ ہے کہ عورت

کی جائے مخصوص بناوٹ کے لحاظ سے تین سوراخوں پر مشتمل ہے۔ اوپر کا سوراخ وہ ہے جس کا سلسلہ مثانہ تک پہنچتا ہے اور اسی سوراخ سے پیشاب خارج ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرا باریک سوراخ اور ہے جو آنتوں سے ملا ہوا ہے جس سے کبھی کبھی ہوا خارج ہوتی ہے اور ان دونوں سے نیچے تیسرا کشادہ سوراخ ہے جنسی فعل اسی میں ہوتا ہے۔ یہ رحم سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ بچہ، اور حیض و نفاس کا خون اسی سے نکلتا ہے۔ اور یہ راستہ اسی وقت نجس و ناپاک ہوتا ہے جب حیض کا خون جاری رہتا ہے۔ اور اسی زمانہ میں جنسی فعل بھی حرام ہے، اس کے علاوہ یہ راستہ ایسا نجس نہیں رہتا کہ جنسی فعل جس وجہ سے نہ انجام دیا جاسکے۔ بخلاف پاخانہ کے مقام کے کہ اس کا راستہ ایسی آنتوں سے ملا ہوا ہے جو ہر وقت گندگی و بول و براز سے بھری رہتی ہیں، اس لئے یہ راستہ جنسی فعل کے لئے دائماً ممنوع ہے،

(۲۷) یہ متعہ دَوریہ کو بھی جائز کہتے ہیں، ہمارے ملک اور زمانہ کے اثناعشری گو اس کے جواز کا انکار کرتے ہیں مگر ان کے محققین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں اس کے جواز کا ثبوت موجود ہے۔ اس متعہ کی صورت یہ ہوتی ہے، کہ ایک پوری جماعت کسی ایک عورت سے متعہ کر لیتی ہے اور ان میں سے ایک شخص اپنی باری مقرر کر لیتا ہے۔ اور اپنی باری میں اس سے جنسی فعل کرتا ہے۔ حالانکہ کسی بھی مذہب میں ایک رحم میں دو نطفوں کا جمع کرنا درست قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ آدمی کو حیوانات سے جدا اور ممیز کرنے والی چیز در اصل نسب کی حفاظت ہی ہے۔ اسی لئے نسب کی حفاظت کو بھی، ان پنج ضروری اور اہم تحقیقات میں شامل کیا گیا ہے جن کی حفاظت کا حکم ہر ملت و مذہب نے دیا ہے جو یہ ہیں، (۱) حفاظت نفس (جان) (۲) حفاظت دین (۳) حفاظت عقل۔ (۴) حفاظت نسب۔ (۵) حفاظت مال۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شریعت میں، قصاص، جہاد، حدود قائم کرنے، نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھیرانے۔ زناکاری کا انسداد کرنے، متعہ، چوری اور غصب، ان کے متعلق بڑے سخت اور تاکیدی احکام ہیں۔ ان سب کا تعلق تحفظات خمسہ بالا سے ہے۔ وہ بالکل کھلا اور صاف ہے۔ اور متعہ کی صورت میں تحفظ نسب کی اہمیت اور ضرورت کا صاف انکار ہوتا ہے۔ پھر حیا، عفت، غیرت، عزت، اور ناموس، جو تمام ملتوں اور مذہبوں میں پسندیدہ اوصاف مانے جاتے ہیں۔ سب کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اور بُری اور ناپسندیدہ باتوں کو پنپنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور اگر کوئی ہوشمند متعہ کی گہرائی میں جھانکے تو اسے وہ تمام مفاسد اور برائیاں نظر آجائیں گی جو اس عقد فاسد کی تہ میں پوشیدہ ہیں اور جو سب کی سب شرع کے خلاف اور حکم الٰہی کی ضد ہیں۔ مثلاً

الف:۔ یہ فعل اولاد کو ضائع بلکہ ہلاک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص، محلہ، محلہ، یا بستی، بستی اور ملک ملک متعہ کرتا پھرے گا۔ تو ظاہر ہے اول تو اسے پتہ نہ چلے گا کہ اس کے نطفہ کے گل بوٹے، کہاں کہاں کھلے، پتہ چل بھی جائے تو سب کو اپنے زیر تربیت رکھ کر ان کی حفاظت کیسے کریگا! اور ان کو یہ کیسے یقین ہوگا کہ وہ اس کی اولاد ہے، لامحالہ ایسے بچے آوارہ گردوں کی طرح پلیں بڑھیں گے۔ اور اس کے لئے ان کی غور و پرداخت کے لئے ان تک پہنچنا ناممکن ہوگا۔ ایسے حالات میں، ان کے ضیاع اور ہلاکت میں کیا شبہ رہا۔ اور اگر وہ بچہ لڑکی ہوئی تو اور بھی رسوائی کا باعث ہوگا۔ ان کے لئے ہمقوم اور ہم نسل اور ہم کفو شوہر ملنا تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

ب:۔ متعہ کی صورت میں باپ یا بیٹے کی ممتوعہ سے ہمبستری کا واقعہ خارج از امکان نہیں۔ بلکہ خطرہ تو اس بات کا بھی ہے کہ بیٹی، پوتی، نواسی، بہن، بھانجی، اس راستہ میں نہ ٹکرا جائیں۔ جو سب کی سب محرمات میں سے ہیں!! اور ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں۔ خصوصاً ایک طویل مدت گذرنے کے بعد، اس لئے کہ ایک آدھ ماہ تک تو حمل قرار پاجانے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور پھر اگر متعہ دوران سفر ہو، اور سفر بھی طویل ہو، ہر منزل پر ایک متعہ ہو، اور ہر متعہ میں نطفہ قرار پائے اور ان سے لڑکیاں پیدا ہوں۔ اور دس، پندرہ، بیس سال، بعد یہی شخص یا اس کا بیٹا یا بھائی انہیں منزلوں میں سفر پہ نکلیں، تو ہو سکتا ہے ان محرمات میں سے کسی سے مڈبھیڑ ہو جائے، اور وہ متعہ یا نکاح کرے!

ج :۔ جس نے بہت سے متعہ کئے ہوں گے اس کی میراث کی تقسیم ناقابل عمل ہوگی، کیونکہ یہی پتہ نہ ہوگا کہ کون کون وارث ہیں اور وہ کہاں کہاں ہیں، اور جب تک یہ معلوم نہ ہوگا وارث کا معاملہ نفاذ سے رکا رہے گا۔

د :۔ اسی طرح متعہ سے پیدا ہونیوالی اولاد کی میراث بھی تقسیم نہیں ہو سکے گی کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ اس کے باپ، یا بھائی، کون کون، کہاں کہاں ہیں۔ اور جب تک تمام ورثا کی تعداد کا پتہ نہ لگے میراث کیسے تقسیم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ان ورثاء کی جنس کا حال ہے کہ کون عورت ہے۔ کون مرد، اور کون میراث کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا حاجب ہے یا ایک دوسرے کو کون محروم کرتا ہے۔ یہ ساری تفصیلات جب تک معلوم نہ ہوگی وارثوں کے حصے مقرر نہیں ہو سکتے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ متعہ کے حلال ہونے کی صورت میں نظام شریعت خصوصاً نکاح اور میراث کے معاملات سارے کے سارے درہم برہم ہو جائیں اس کی پوری تفصیل جاننے کے خواہشمند حضرات فوائد القلوب مطالعہ فرمائیں جو اہل سنت کے ایک محقق عالم کی تصنیف ہے!

اور لونڈیوں یا امہات الاولاد کے حلال کر دینے میں متعہ سے بھی زیادہ خرابیاں لازم آتی ہیں اور یوں ان کے حلال کرنے سے پوری نوع انسانی میں عظیم فساد برپا ہو جاتا ہے، اور اسی فساد کی پیش بندی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں جماع حلال کے صرف دو طریقے مقرر فرمائے، ایک علی الاعلان، بموجودگی گواہاں نکاح صحیح دوسرے ملک یمین کی شکل، یعنی شرعی طریقہ سے مملوکہ لونڈی۔ کہ ان دونوں طریقوں اور عقدوں سے عورت کا کسی مرد سے خصوصی تعلق و رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور اسکی نگرانی اور حفاظت میں ہوتی ہے، اولاد اور وارثوں کی مناسب دیکھ بھال، حفاظت و نگہداشت عمل میں آتی ہے چنانچہ اسی مضمون کو تاکید کے ساتھ دو سورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔

یعنی سورہ مومنون اور سورہ معارج میں، ارشاد ہے۔ اِلَّا عَلٰٓی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ۔ اور دونوں جگہ ان آیات کے آخر میں یہ ٹکڑا بھی جوڑا ہے۔ فَمَنِ ابۡتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ۔ اور ظاہر بات ہے کہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی ہے ورنہ اس کے لئے لوازم زوجیت، میراث، طلاق، عدت، نان و نفقہ، سب واجب ہوتے، اور نہ ہی ایسی عورت ملک یمین میں داخل ہے ورنہ خرید و فروخت، ہبہ، اور عتاق (آزاد کرنے) کے احکام اس پر لاگو ہوتے اور اس کا اقرار تو خود شیعہ کرتے ہیں کہ متعہ کی صورت میں مابین عورت و مرد زوجیت کے تعلقات و احکامات متحقق نہیں۔ ابن بابویہ کی کتاب اعتقادات میں واضح طور پر یہ لکھا موجود ہے کہ ہمارے نزدیک عورت کے حلال ہونے کے صرف چار اسباب ہیں۔ نکاح، ملک یمین، متعہ، تحلیل، اور اللہ تعالیٰ نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ کئی بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو، یا اپنی خواہشات ان لونڈیوں سے پوری کرو جو تمہاری ملک ہیں"، قاعدہ ہے کہ بیان صریح کے مقام پر سکوت ہو تو وہ حصر کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں یہ مقام چاہتا تھا کہ ان تمام صورتوں کا ذکر ہو جاتا جنمیں عدل و انصاف واجب نہیں۔ مگر سکوت بتاتا ہے کہ حلال صورتیں بس دو ہی ہیں، اور عدل کا تعلق صرف نکاحی بیویوں سے ہے۔ اگر حصر مقصود نہ ہوتا تو متعہ اور تحلیل کا بیان سب سے پہلے ہوتا۔ کیونکہ نکاح اور ملک یمین میں تو کچھ نہ کچھ حقوق قائم و واجب ہوتے ہیں جن کے ترک سے ظلم متصور ہے، بخلاف متعہ کے کہ اس میں تو اجرت مقررہ کے کچھ اور واجب ہی نہیں ہوتا۔ رہا تحلیل تو وہ حلوہ بے دود ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ حلال کرنے والے کا احسانمند ہونا پڑتا ہے، اس کے سوا واجب کچھ ہوتا ہی نہیں اللہ تعالیٰ فرمایا۔

وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ۔ اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے انہیں چاہیئے کہ وہ پاکدامن رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں صاحب استطاعت کر دے!

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو اللہ تعالیٰ عفت و پاکدامنی کا حکم کیوں دیتا۔ یہ حکم تو اسی لئے دیا کہ وہ حلال راستوں کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اور صرف وہی راستے تھے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ــ الی قولہ ــ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ـ

اور جس میں یہ استطاعت نہ ہو کہ وہ پاکدامن مؤمن عورت سے شادی کرسکے تو اپنی مملوکہ لونڈی سے نکاح کرے اور یہ ایسے شخص کے لئے ہے کہ جو زنا میں مبتلا ہونے کا، ڈر رکھتا ہو۔ اور اگر صبر کرسکو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو لونڈیوں کے نکاح میں ڈر، خوف اور صبر کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو کہتے ہیں کہ آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً۔ پس تم نے ان سے جو فائدہ اٹھایا ہے تو اب ان کو ان کا مہر بطور فرض کے ادا کرو۔

متعہ کے بارے میں نازل ہوئی، غلط ہے۔ اسکی روایت بحوالہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، یا دوسرے صحابہ سے کرنا کھلا جھوٹ اور افترا ہے۔ گوکہ بعض غیر معتبر تفاسیر اہل سنت میں یہ روایت نقل کی گئی ہے مگر چونکہ یہ بات نظم قرآن کے خلاف ہے۔ اور جو تفسیر بھی نظم قرآنی کے خلاف ہو وہ اگرچہ صحابی سے مروی ہو سننے اور قبول کرنے کے لائق نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اول محرمات کا بیان حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (تمہاری مائیں تم پر حرام کی گئیں)، سے اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تک کیا۔ پھر فرمایا اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (ان محرمات کے سوا تمہارے لئے حلال کی گئیں)، مگر ان شرائط کے ساتھ کہ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (مہر و نان و نفقہ میں اپنے مال خرچ کرو)، اور ان شرطوں کی وجہ سے تحلیل فروج، یا مانگے میں دینا دونوں صورتیں غلط اور باطل ہوگئیں اس لئے کہ یہ تو مفت کا سودا ہے۔ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری!

پھر آگے فرمایا مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ (ان کو اپنے لئے مخصوص کرلو، دوسرے سے ربط ضبط پیدا نہ کرلیں اسکی نگہداشت رکھو، یہ نہیں کہ شہوت رانی کا تقاضا پورا کرنا اور کرٹوا پانی نکالنا مقصود ہو! تو اس شرط سے متعہ بھی باطل ہوا کیونکہ متعہ میں احتیاط و اختصاص قطعاً منظور نہیں ہوتا کیونکہ متعہ والی عورت تو کسی ایک کی ہوکر رہتی ہی نہیں۔ آج اس کی بغل میں تو کل کسی دوسرے کی! پھر نکاح کے حلال ہونے پر بنا رکھتے ہوئے فرماتے ہیں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ الخ یعنی جب تم نے نکاح میں مہر مقرر کیا، اور لطف صحبت بھی اٹھا لیا تو اب تم پر پورا مہر لازم آگیا۔ اگر صحبت نہ ہوتی تو نصف مہر لازم ہوتا۔

اب اس نظم قرآنی کے خلاف اس آیت کو پہلی عبارت سے کاٹ دینا اور ابتدائے کلام پر محمول کرنا باعتبار عربیت قطعاً و صریحاً غلط و باطل ہے۔ حرف فا، قطع اور ابتدائے کلام سے مانع ہوتی ہے۔ وہ تو پچھلے کلام اگلے کلام سے ربط قائم کرنے کے لئے لائی جاتی ہے، یہ ایک روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت میں مِنْهُنَّ کے بعد اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى کا اضافہ کرکے پڑھتے تھے، تو اس میں پہلی بات تو یہ کہ اس روایت کی صحت میں ہی کلام ہے۔ کسی معتبر کتاب میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر روایت ثابت بھی ہو تو یہ قرأت منسوخہ ہوگی اور احکام کے ثبوت میں قرأت منسوخہ کام نہیں دیتی کیونکہ منسوخ ہونے کے بعد وہ قرآن رہی نہ حدیث! خاص کر اس صورت میں جبکہ اس کے صریح مخالف دوسری آیات موجود ہوں۔ اور اگر سب باتوں کو نظر انداز کرکے مان لیں تو بھی یہ روایت متعہ پر دلالت نہیں کرتی اس لئے کہ الی اجل مسمی، استمتاع سے متعلق ہے عقد سے نہیں! اور متعہ میں مدت کا تعین نفس عقد سے ہوتا ہے، استمتاع کے ساتھ نہیں۔ تو گویا پھر معنے یوں ہونگے کہ پس اگر اپنی منکوحہ عورتوں سے ایک مدت معین تک لطف اندوز ہولیں تو تمام مہر ادا کریں۔،، اس قید کے بڑھانے کا اسوقت یہ مطلب ہوگا کہ کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ جب نکاح کی تمام مدت گذر جائے گی جب مہر واجب ہوگا۔ جب کہ رواج اور عرف میں یہ مشہور ہے کہ ایک تہائی مہر معجل (بروقت ادائیگی کے قابل) رکھتے ہیں اور دو تہائی کو موجل تا بقائے نکاح، یہ تاخیر عورت کی تصرف و اختیار سے حاصل ہوتی ہے ورنہ شریعت کے لحاظ سے تو ایک مرتبہ کی صحبت کے بعد عورت کو مہر کا مطالبہ کرنے کا حق ہے، اگر الی اجل مسمی کی قید کو عقد سے متعلق مانینگے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ شیعوں کے

نزدیک متعہ مدت العمر تک درست نہ ہو، حالانکہ یہ شیعوں کے اجماع سے درست ہے! اور آیت وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا کا سیاق بھی نکاح ہی ہے۔ یعنی اگر اتنی مالی استطاعت نہ رکھتے ہوں کہ آزاد عورتوں کا مہر اور نان ونفقہ برداشت کر سکیں تو اپنی ہم مذہب لونڈی سے نکاح کر لیں، اب مسلسل و مربوط کلام کو بیچ سے کاٹ کر درمیانی عبارت کو متعہ پر محمول کرنا تو کلام اللہ کی کھلی تحریف ہے، اور اگر آیت کے سیاق پر غور کیا جائے تو اس سے متعہ کی حرمت صاف معلوم ہو جائیگی۔ اس لئے کہ آیت میں لونڈی کے نکاح میں اکتفا کی ہے اگر اگلے کلام میں متعہ کو حلال کرنا ہوتا تو پھر وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا کیوں فرمایا جاتا۔ کیونکہ آزاد عورتوں کے نکاح پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں، متعہ کی وجہ سے جنسی خواہش پورا کر لینے میں رکاوٹ ہی کیا تھی، بلکہ وہ تو ہر نئی چیز نئی لذت دیتی ہے" کے مصداق یہ صورت تو بہتر اور خوب تر تھی۔ پھر لونڈیوں سے نکاح کو اس قید و پابندی کے ساتھ حلال کرنے کی کیا ضرورت تھی!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پانچ مذکورہ بالا آیات قرآنی متعہ کی حرمت پر صاف اور واضح دلالت کرتی ہیں، اور ایک آیت جسے شیعہ اپنے خیال و گمان کے مطابق متعہ کے حلال ہونیکی دلیل بناتے ہیں سطور بالا میں اسکی حالت بھی واضح ہوگئی۔ کہ درحقیقت معاملہ اُلٹا ہے۔

پھر ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اس معاملہ میں شیعوں کا رخ استدلال ہے جبکہ مخالف کا انکار! اور منکر کے لئے احتمال و شک ہی کافی ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا خیال ظاہر اور سمجھ میں آنے والا بھی ہو۔

رہا استدلال تو اگر اسے احتمال و شک کی ہوا بھی لگ جائے تو اسے نا معتبر اور باطل کر دیتی ہے چہ جائیکہ وہ قوی اور غالب سمجھا جائے۔

(۷۲) رضاع کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ بچہ پندرہ مرتبہ پے درپے بلا فاصلہ دودھ پیئے تو حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ پے درپے نہ ہو تو حرمت ثابت نہیں۔ حالانکہ شریعت میں ابتداءً دس مرتبہ کا جو حکم تھا وہ بھی اجماع امت سے منسوخ ہوگیا، پانچ کی مزید تعداد اور پے درپے کی قید تو سرے سے تھی ہی نہیں، یہ اسی فرقہ کا گھڑا ہوا اضافہ ہے اور منسوخ شدہ حکم کو باقی رکھنا اپنی طرف سے شریعت بنانا ہے۔ اور حکم الٰہی کی مخالفت ہے، حالانکہ یہ خود ہی اپنے ائمہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ "مدت رضاع میں مطلقاً دودھ پینا حرمت کا سبب ہے خواہ دس مرتبہ ہو خواہ اس سے کم"۔ جبکہ یہ احتیاط کا مقام ہے، اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ احتیاطاً زیادہ والی صورت پر عمل کرنا چاہیئے۔ حرمت نکاح کا معاملہ ہے برأت ذمہ یقینی طور پر ثابت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ان کے شیخ مقداد نے کنز العرفان میں کفارہ کی بحث کے تحت اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس صورت میں زیادہ احتیاط والی جانب پر عمل کرنا واجب ہے۔

(۷۳) ایک مسئلہ ان کے ہاں یہ ہے کہ طلاق عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں دینے سے واقع نہیں ہوتی۔ یہ ایسا ظاہر البطلان مسئلہ ہے کہ محتاج بحث ہی نہیں! لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے اَنْتِ مُطَلَّقَةٌ (تجھ کو طلاق دی گئی ہے) یا اَنْتِ طَالِقٌ (تجھے طلاق ہے) تو بھی ان کے نزدیک طلاق نہیں ہوتی جبتک طَلَّقْتُكِ (میں نے تجھ کو طلاق دی) نہ کہے۔ حالانکہ شریعت نے ان دونوں صیغوں کو بھی طلاق شمار کیا ہے، اس میں شاید یہ شبہ نکالیں کہ یہ دونوں صیغے وضع اصلی کے لحاظ سے اخبار (خبر دینے) کے لئے ہیں، "تو طلقتک۔ بھی ایسا ہی ہے۔ بلکہ ان معاملات میں انشائی صیغے کسی ترکیب میں وضع ہی نہیں ہوتے۔ ہر جگہ یہی اخباری الفاظ کام میں آتے ہیں۔ مثلاً اَنْتِ حُرٌّ، یا اَنْتِ عَتِيْقٌ (تو آزاد ہے) اور پھر یہ خود بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے پوچھے ھل طلقت فلانۃ (کیا تونے فلاں کو طلاق دی) اور وہ جواب میں نعم (ہاں) کہے تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے حالانکہ یہاں تو صاف طور پر اخبار ہی مراد ہے۔ انشاء نہیں۔ ورنہ استفہام کے جواب میں یہ کیسے استعمال ہوتا۔ کیونکہ انشاء سے استفہام کا جواب نہیں ہوتا۔

(۷۴) یہ کہتے ہیں کہ گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی جس طرح نکاح نہیں ہوتا۔ حالانکہ شریعت نے بوقت طلاق گواہوں کی موجودگی کو لازم اور ضروری قرار نہیں دیا۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لیکر ائمہ کے زمانہ تک پوری امت کا اسی پر عمل

رہا کہ بروقت طلاق کبھی گواہوں کی تلاش نہ کی گئی، اور ان کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا گیا، البتہ طلاق رجعی اور مطلق طلاق کے وقت دو گواہوں کی موجودگی کو مستحب سمجھا گیا اور وہ بھی رفع نزاع کی خاطر۔ کہ اس کا موقع نہ آسکے! اس لئے نہیں کہ نکاح کی طرح دو گواہوں کے بغیر طلاق اور رجعت صحیح نہ ہو۔ اور نکاح وطلاق میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ نکاح میں اعلان اس لئے ضروری ہے کہ زنا سے امتیاز پیدا ہو اور کسی کو شک کی گنجائش نہ رہے۔ اور اعلان کی کم سے کم حد دو گواہ مقرر کی گئی۔ بخلاف طلاق کے کہ اس میں نہ کسی چیز سے تمیز دینے کی ضرورت ہے نہ اس میں کسی قسم کی تہمت کا خدشہ! اس لئے اعلان کی بھی ضرورت نہیں۔ ترک صحبت وجماع ہی کو تو طلاق کہتے ہیں اس میں تہمت کی کون سی بات ہے۔ پس طلاق کا معاملہ بھی خرید وفروخت، اجارہ، اور دوسرے معاملات کا سا ہے، اگر بنظر احتیاط کہ کوئی فریق معاملہ سے مکر نہ جائے گواہ کرلیں تو کوئی حرج بھی نہیں کہ کل کلاں مقدمہ وغیرہ کی نوبت آجائے تو گواہ گواہی دے سکیں۔ اور عدالت میں عقد ومعاملہ کا اثبات ہو سکے۔ ورنہ بطور شرط ضروری نہیں!

(۵) اگر شوہر موجود ہو تو ان کے ہاں کنایات سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ شوہر کی حاضری وعدم حاضری کی تفریق سراسر خلاف شرع ہے کیونکہ شرع میں شوہر کی حاضری وعدم حاضری کا تعلق طلاق نہ ہونے میں ہرگز نہیں کیا گیا۔ یہ فرق پیدا کر کے اپنی طرف سے انہوں نے نئی شرع بنائی ہے۔

(۶) مقطوع الذکر، موجود الخصیتین شخص نے اگر کسی عورت سے شادی کرلی اور خلوت صحیحہ کے بعد اسکو طلاق دے دی تو ان کے ہاں ایسی مطلقہ کی عدت نہیں ہے۔ حالانکہ یہ خود اس شخص سے ثبوت نسب کے قائل ہیں۔ کہ اگر اس عورت کے کوئی بچہ ہو جائے تو ان کے نزدیک وہ مقطوع الذکر کا ہوگا جبکہ نطفہ قرار پانے کا احتمال ثابت ہوگیا۔ تو اس صورت میں عدت کیوں واجب نہیں ہوگی؟ کیونکہ عدت تو ہے ہی نطفہ قرار پانے کی معلومات کے لئے۔ تاکہ نسب مخلوط نہ ہو۔

اور طبی قواعد سے ایسے شخص سے نطفہ قرار پانے کا امکان ثابت اور صحیح ہے، اسوجہ سے کہ محل منی تو خصیتین ہیں اور وہ صحیح و سالم ہیں۔ اس لئے باہمی رگڑ سے اخراج منی کا احتمال ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ رگڑ کے وقت منی مرد کے سوراخ سے نکل کر عورت کے رحم کے منہ میں پہنچ جائے اور وہ اسے جذب کرے اور اسی سے بچہ پیدا ہو جائے! بخلاف اس صورت کے کہ اگر خصیتین کٹے ہوئے ہوں تو تولید منی کا امکان ہی نہیں، گو عضو مخصوص صحیح وسالم ہو۔

(۷) اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اذیت دینے اور ضرر پہنچانے کی غرض سے جنسی فعل ترک کر دے تو ظہار ان کے نزدیک واقع نہیں ہوتا۔ حالانکہ شارع کا مقصد تو ظہار کا کفارہ واجب کرنے سے یہی ہے کہ ایذا وضرر رسانی کا دروازہ بند کیا جائے۔ لہذا ضرر پہنچانے کے وقت بھی کچھ واجب نہ ہو تو شارع کے مقصود کے خلاف لازم آتا ہے۔ اور پھر ایسا سمجھنا، نص کتاب اللہ احادیث رسول اللہ اور آثار ائمہ سے بھی ٹکراتا ہے۔ کیونکہ ان میں ایسی کوئی قید نہیں۔ اور یہ ساری روایات ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں۔

(۸) یہ کہتے ہیں کہ ظہار کرنے والا اگر کفارہ کی ادائیگی سے قاصر ہو اور اٹھارہ روزے رکھ لے تو اس کے لئے کافی ہے۔ اس مسئلہ کا کوئی تعلق نہ اللہ کی کتاب سے ہے اور نہ ہی شرع میں اس کی کوئی اصل وبنیاد ہے بلکہ نص قرآنی تو اس کے خلاف ہے۔ اس لئے ظاہر ہے یہ تو خود دین گھڑتا ہے!

(۹) یہ لعان (زنا کی تہمت لگانا) میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ بیوی مدخول بہا ہو" حالانکہ زنا کی تہمت میں جو عار وشرمندگی مدخول بہا کو ہوتی ہے، غیر مدخول بہا، کو اتنی نہیں ہوتی۔ اور لعان ہوتا ہی اس تہمت کی شرمندگی دور کرنے کے لئے! علاوہ ازیں یہ بات قرآنی نص کے بھی خلاف ہے قرآن مجید میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ

(جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے اور کوئی گواہ نہیں، تو اس میں تو مدخول بہا کی کوئی قید نہیں۔ اس فرقہ کے ایسے ہی الٹے پلٹے اور واہی تباہی مسائل واحکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جب اور جہاں مقاصد شریعت کو سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر رہے، تو از خود اپنی عقل ناقص و نارسا سے غلط سلط مسائل تراش لیے۔

(۸۰) کہتے ہیں کہ لفظ عتق سے بھی عتق واقع نہیں ہوتا۔ (عتق بمعنی غلام کا آزاد کرنا) اس حکم کو مضحکہ خیز کے علاوہ کیا کہا جائے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ فک رقبہ سے بھی غلام آزاد نہیں ہوتا، حالانکہ قرآن مجید میں چند جگہ فک رقبہ سے عتق کو تعبیر کیا گیا ہے گویا اس کی حقیقت شرعی بھی یہی قرار پائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے فَکُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ (یعنی غلام آزاد کرنا، یا دن میں کھانا کھلانا)

(۸۱) کہتے ہیں لونڈی غلام اگر اثنا عشری نہ ہوں تو ان کا عتق صحیح نہیں! کتاب وسنت میں تو اسکی کوئی اصل نہیں۔ اور آئمہ کی روایات ما سبق کی رو سے بھی یہ غلط ہے کیونکہ ان کی رو سے اہل سنت کا ایمان بھی صحیح ہے۔ اور نجات کی بشارت دینے والا بھی، اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو ان کا تعصب اور بغض ہی ہو سکتا ہے۔

(۸۲) ایک مسئلہ یہ ہے کہ غلام اگر جذام کی بیماری میں مبتلا ہو جائے، یا اندھا، یا اپاہج ہو جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، مالک کے آزاد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ حالانکہ یہ قاعدہ شرعیہ کے خلاف ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ناقص یا عیب دار مال مالک کی اجازت وارادہ کے بغیر اس کی ملک سے نکل جائے۔ پھر یہ مقاصد شرع کے بھی خلاف ہے کیونکہ اعتاق غلام کے نفع کی خاطر ہوتا ہے، اور صورت بالا میں تو اس کی آزادی اس کی بربادی اور ہلاکت کے مترادف ہوگی، اس لیے کہ ان جسمانی عوارض کی وجہ سے تو وہ کسب معاش اور تلاش روزگار کے قابل نہیں رہا۔ اور کھانا کپڑا جو مالک کے ذمہ تھا، اب اس کے ذمہ آپڑا۔ اب ایسی حالت میں وہ بیچارہ کہاں جائے اور کیا کریگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا نفع یہ ہے کہ وہ خدمت سے چھوٹ گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی معذوری اور لاچاری کی حالت میں مالک کو خدمت لینے کا حق ہی کہاں پہنچتا ہے۔ روٹی کپڑا تو اس کی ملک کا معاوضہ ہے۔ یہ خدمت کا بدلہ نہیں ہے۔ بہت سے لونڈی غلام دائمی امراض یا کسی اور عارضہ کی بنا پر خدمت سے تھک بھی تو جاتے ہیں ہاں یہ حکم نوکر ومزدور پر تو لاگو ہو سکتا ہے کہ جب تک وہ خدمت انجام نہ دے اسکو مزدوری اور تنخواہ نہیں دیتے جب کام سے رہ جاتا ہے موقوف کر دیتے ہیں تو یہ حکم غلام پر چسپاں نہیں ہوتا۔

(۸۳) کہتے ہیں کہ لونڈی کے پیٹ سے آقا کا نطفہ گر جائے تو وہ ام ولد ہو جاتی ہے، یہ عجیب مسئلہ ہے کیونکہ اس صورت میں تو ہر لونڈی جس کے ساتھ ہمبستری کی گئی ہو ام ولد بن جائے گی۔ کیونکہ جو عورتیں حمل اور بچہ کی تولید نہ چاہیں وہ صحبت کے بعد نطفہ گرا دیتی ہیں اور یہ بات تجربہ کی ہے کہ رحم میں تو بقدر تولید ہی نطفہ ٹکتا ہے باقی گر جاتا ہے۔ یہ اتنا نہیں جانتے کہ نطفہ کا نکلنا اگر دلیل بن سکتا ہے تو اس بات کی کہ نطفہ نے رحم میں قرار نہیں پکڑا۔ اور جب نطفہ ہی رحم میں نہیں ٹھہرا تو وہ لونڈی ام ولد کیسے ہو گئی۔ اس کا ام ولد ہونا تو رحم میں نطفہ کے قرار پکڑنے پر ہے۔ ورنہ صرف قرار پکڑنے پر بلکہ اس کی پوری خلقت پر۔ اگر کسی کے پاس کسی چیز کا کوئی جز ہے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے پاس پوری چیز ہے۔

(۸۴) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی لونڈی گروی رکھدی اور اس نے اس کے ساتھ جنسی فعل کیا اور اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو گیا تو وہ لونڈی مرتہن کی ام ولد ہو گئی۔ حالانکہ مرتہن کا فعل تو صاف زنا تھا کہ اسے نہ حق ملکیت حاصل تھا، نہ حق تحلیل۔ اور تحلیل کا حق ہو تب بھی یہ حق اسے ام ولد نہیں بناتا۔ جسے یہ فرقہ بھی تسلیم کرتا ہے،

(۸۵) یہ کہتے ہیں کہ ایسے فعل پر جو نہ واجب ہو اور نہ اس سے کوئی فعل قبیح ترک کرنا منظور ہو بیٹے کی قسم باپ کی اجازت کے بغیر اور

بیوی کی شوہر کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ بھی قرآنی احکام کے صریحاً خلاف ہے، کہ ان آیات یمین میں اس قید کا کوئی ذکر نہیں۔ مثلاً:۔ وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْاَيْمَانَ۔ لیکن وہ تمہاری پکی قسموں پر مواخذہ کریگا ہاں تورات میں یہ ذکر ہے کہ "بیوی کی نذر خاوند کی اجازت کے بغیر اور چھوٹے بچے کی نذر بغیر باپ کی اجازت کے منعقد نہیں ہوتی"،
اس حکم کے متعلق یہ بھی پتہ نہیں کہ تحریف شدہ ہے یا غیر تحریف شدہ! اگر اصلی بھی ہو تو بالغ و نابالغ کے یمین، نذر و نیاز میں بہت بڑا فرق ہے۔ لیکن جب قرآن مجید پہلی آسمانی کتابوں کا ناسخ ہے تو قرآن کے خلاف توریت سے دلیل لانا یہودیت کے سوا اور کیا ہے! اس فرقہ کے نزدیک تو عورت کی نفل نذر بھی شوہر کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے جو اطلاق قرآن کے مخالف ہے۔ قرآن مجید میں وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ۔ (اپنی نذریں پوری کرو) اور يُوفُونَ بِالنَّذْرِ (اپنی نذریں پوری کرتے ہیں) فرمایا ہے۔ اور اس میں کوئی کہیں قید و شرط نہیں۔

(۸۶) ایک مسئلہ یہ ہے کہ پا پیادہ حج کی نذر مانی تو یہ نذر ساقط ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ بات بھی نص قرآنی کے خلاف ہے۔

(۸۷) نذر کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ دل کے ارادے سے لازم ہو جاتی ہے، چاہے نذر کے الفاظ ظاہر و پوشیدہ زبان سے ادا نہ کیے جائیں اس کا نام انہوں نے نذر ضمیر رکھا ہے، حالانکہ شریعت میں وہ امور جو اقوال سے رکھتے ہوں دلی ارادہ سے لازم نہیں ہوتے، مثلاً یمین، نکاح، طلاق، عتق، رجعت، بیع، اجارہ، ہبہ، اور صدقہ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں متفق علیہ صحیح حدیث بھی موجود ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا وَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں سے درگذر فرمائی جو ان کے سینوں میں کھٹکتے رہتے ہیں تاآنکہ وہ ان پر عمل نہ کرلیں یا زبان پر نہ لے آئیں۔

(۸۸) یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ حدود میں قاضی کا حکم نافذ نہیں ہوتا، اس کے نفاذ کے لئے "امام معصوم" ہونا چاہیئے، لہٰذا امام کی غیر موجودگی میں، یا امام کا تسلط نہ ہونیکی صورت میں۔ جیسا کہ اکثر اوقات یا پورا زمانہ ایسا ہی گزرا کسی امام کا تسلط قائم نہ ہوسکا۔ حدود کا ناقابل نفاذ رہ جانا لازم آیا۔ اور اگر امام معصوم ہو بھی تو وہ سر من رائے، کربلائے معلی اور نجف اشرف میں ہوگا۔ فیض آباد۔ اور بنگالہ میں کون حدود تمام کرے گا۔ اور اگر کوئی ان کا نائب ہو جو ان کی تقرری اور اجازت سے حدود جاری کرسکے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی بلا واسطہ اجازت میں آخر کون سی بات ہے یا کون سی کمی رہ گئی ہے کہ حدود کا نفاذ نہ ہوسکے۔ ارشاد ہے۔ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً۔ (ان کو اسّی کوڑے مارو) یا اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (زانی مرد و عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ) یا فرمایا اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا (چور مرد ہو یا عورت ہر ایک کے ہاتھ کاٹ ڈالو) اور شریعت کے دیگر تمام عبادات، معاملات، اور کفارات میں جب امام کی موجودگی ضروری نہیں تو حدود ہی کے نفاذ میں ان کی حضوری کیوں لازمی قرار دی جاتی ہے کیونکہ یہ حدود بھی مکان شہر و ملک کے حق میں عبادات ہی ہیں۔ اور حد زدہ شخص کے حق میں کفارات۔ انہیں امام کی موجودگی سے وابستہ کیوں کیا جائے! اور عبادت و کفارہ سے کیوں محروم رکھا جائے۔

(۸۹) یہ قاضی کے لئے پڑھا لکھا ہونیکی شرط بھی لگاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت میں انکی یہ زائد کردہ شرط پر کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ اس کے خلاف پر دلیل ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ فیصلہ صادر فرمانے اور اسے نافذ کرنے کا منصب بھی رکھتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں کوئی خامی، کوئی کمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھی اس دلیل سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللهُ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف کتاب حق اس لئے نازل فرمائی کہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔ حالانکہ اُمّی تھے علم کتابت نہیں سیکھا تھا جیسا کہ قرآن مجید خود شاہد! وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (آپ نے اس کتاب قرآن مجید) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھی تھی نہ آپ کے دائیں ہاتھ نے کبھی قلم پکڑا تھا۔ پھر ضامنی نامے، قاضی کے مہری خطوط، وغیرہ لکھنا پڑھنا دار القضاء کے منشیوں کا کام ہے اگر قاضی خود یہ کام نہ کر سکے تو اس کی قضا میں کونسا فرق آتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے محدثین نے خود اپنے ائمہ سے ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علم کتابت قضا میں ضروری نہیں ہے،

(۹۰) ان کی کتاب الدعویٰ میں بڑے انوکھے اور عجیب مسائل ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عورت جسکی لڑکی مر چکی ہو عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ میں نے اپنی لڑکی کے پاس فلاں فلاں سامان، خادم وغیرہ بطور امانت سپرد کئے تھے تو ان کے نزدیک یہ دعویٰ بلا گواہ و ثبوت قابل قبول ہے۔ ابن بابویہ نے تو اس پر نص کی ہے۔ حالانکہ یہ بات قواعد شرع کے صاف خلاف ہے۔ اس لئے کہ بلا گواہ کوئی دعویٰ قابل سماعت نہیں۔ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (یہ اپنے دعویٰ پہ چار گواہ کیوں نہیں لائے۔ پس جب یہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں)

شریعت کا مقصد گواہوں سے اقوال و حقوق کا تحفظ ہے۔ اور اس صورت میں یہ مقصد ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کسی دشمن نے کسی پر زنا کی تہمت لگائی، اور گواہ پیش نہ کر سکا تو کہتے ہیں کہ اسے قسم لے کر چھوڑ دینا چاہیئے، اس پر قذف کی حد نہ لگانی چاہیئے ان کے شیخ مقتول نے اپنی کتاب مبسوط میں نص بیان کی ہے۔ حالانکہ شریع نے حدود میں قسم کا کوئی اعتبار نہیں کیا۔ اور مدعی حد زنا پر گواہ پیش نہ کر سکنے صورت میں حد قذف لگانا واجب قرار دیا ہے۔ قرآن میں اس پر حکم موجود ہے اور اس صورت میں تو دشمنی، تہمت اور دروغگوئی پر وزنی دلیل ہے۔ تو اس سے چشم پوشی کیسے کی جا سکتی ہے اور اس سے حسن ظن کس طرح قائم ہو سکتا ہے،

(۹۱) کتاب الشہادات میں بھی اسی طرح کے "عجائب" "غرائب" جمع کئے ہوئے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ دس سالہ نابالغ لڑکے کی شہادت قصاص سے متعلق معتبر ہے۔ حالانکہ نابالغ بچہ کسی مقدمہ میں بھی شہادت کا اہل نہیں۔ چہ جائیکہ قصاص کا معاملہ جس میں ایک جان کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے کسی بچہ کی شہادت کیسے قبول ہو سکتی ہے قرآن مجید کہتا ہے۔ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ (اپنے مردوں میں سے دو کی گواہی طلب کرو)

(۹۲) کتاب الصید والذبائح میں قرآنی حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اہل کتاب کے شکار کو حرام کہتے ہیں۔ اور اہل سنت کے ذبیحہ کو بھی مردار کہتے ہیں۔ اور ذبح کے وقت اگر قبلہ رو نہ ہوں تو اس ذبیحہ کو بھی حرام کہتے ہیں۔ ان امور پر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں نصوص کا عموم ان کی اس زائد شرط کی تردید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ جو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، اسکو کھاؤ اگر اس کی آیات پر تمہارا ایمان ہو!

(۹۳) کہتے ہیں کہ اگر غیر رواجی آلات سے کوئی شکار کرے تو وہ شکار اسکی ملکیت میں نہیں آتا، حالانکہ اس میں رواجی اور غیر رواجی ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔

(۹۴) کتاب الاطعمہ بھی عجائب کا مجموعہ ہے۔ مردار جانور کے دودھ اور بچہ دانی کو حلال کہتے ہیں۔ اس گیہوں کی روٹی کو حلال جانتے ہیں جس کا آٹا نجس پانی سے گوندھا گیا ہو۔ اور وہ نجس پانی اس آٹے میں اتنا مل گیا ہو کہ آٹا پتلا ہو گیا ہو اور آٹے کے تمام اجزاء میں پانی کے سب اجزاء سرایت کر گئے ہوں۔ چنانچہ حلی نے کتاب تذکرہ میں اسی طرح لکھا ہے!! اسی طرح وہ کھانا جس میں مرغی کی بیٹ گر کر

گھل مل گئی ہو، یا وہ شوربہ، فالودہ شربت، جس کو عورت یا مرد کے استنجے کے پانی سے تیار کیا گیا ہو، یا ان میں مرغی کی کچھ بیٹ پڑ گئی ہو، یہ سب چیزیں ان کے نزدیک پاک وطیب اور کھانے کے قابل ہیں، اسی طرح اس کر میں (یہ ایک بڑا پیمانہ ہے جس میں بارہ وسق وزن آجاتا ہے) جس میں بے شمار آدمیوں نے استنجا کیا ہو، حیض ونفاس کا خون بھی کہیں پڑا ہوا ہو، مذی ودی، مرغی کی بیٹ بھی اس میں پڑی ہو اور سب گھل مل کر یک جان ہو چکے ہوں کتے کا پیشاب بھی اس میں پڑ گیا ہو، اگر ایسے پانی سے جوس، فالودہ، تیار کریں اور اس سے روزہ افطار کریں تو یہ حلال وطیب ہے۔ اور اگر اسکو صرف افطار کے وقت پیئیں یا اس کا شربت بنائیں تو بھی جائز وحلال ہے۔ اگر تین پاؤ کے قریب آش ریتلا حریرہ وغیرہ) پکائیں اور پاؤ بھر دم مسفوح (بہنے والا خون) ڈالدیں۔ یا اس میں گھوڑے گدھے کا پیشاب پڑ جائے تو بھی حلال ہے، حالانکہ قرآنی احکام میں یہ سب چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبَائِثَ۔ اور حرام کرتا ہے ان پر گندی ونجس چیزیں۔

(۹۵) ایک شخص بھوکا ہے۔ دوسرے آدمی کے پاس کھانا ہے، مگر وہ معمول کی قیمت سے زیادہ قیمت طلب کرتا ہے، اور بھوکے پاس بوجہ امیر ومالدار ہونیکے اتنی دولت ہے کہ وہ یہ مہنگا کھانا بآسانی خرید سکتا ہے، پھر بھی اگر وہ زبردستی اس سے چھین کر وہ کھانا کھائے تو اس کے لئے جائز ہے۔ اور حلال بھی!

(۹۶) مسائل فرائض (میراث) میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے پوتے کی موجودگی میں یا دوسری اولاد ہونے کی صورت میں دادا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ان اخبار وروایات کے خلاف ہے جو انکی اپنی کتابوں میں موجود ہیں چنانچہ سعد بن خلف نے اپنی صحیح میں جناب ابی الحسن کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے۔ سَاَلْتُہٗ عَنْ بَنَاتِ الْاِبْنِ وَالْجَدِّ قَالَ لِلْجَدِّ الثُّلُثُ وَالْبَاقِیْ لِبَنَاتِ الْاِبْنِ۔ میں نے آپ سے دادا اور پوتیوں کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے کہا ایک تہائی حصہ دادا کا ہے اور باقی پوتیوں کو ملے گا۔

(۹۷) یہ مقتول کی دیت میں سے ماں کی طرف سے جو بھائی بہن ہوں ان کو حصہ نہیں دیتے، اور بیوی کو زمین یا زمین کی قیمت میں سے بھی حقدار نہیں سمجھتے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے ترکہ اور اسکی دیت سے وراثت کا حصہ دیتے ہیں، خواہ اس نے غلطی اور شبہ میں پڑ کر اسے قتل کیا ہو حالانکہ اَلْقَاتِلُ لَا یَرِثُ (قاتل کو ورثہ نہیں ملتا) حکم عام ہے۔ اسی طرح آیات قرآنیہ سے بیوی) اور بھائی بہنوں کو ورثہ ملنے کا بھی حکم عام ہے زمین، اور دیت کی تخصیص اس میں کہاں سے ثابت ہے؟ میت کے ترکہ میں قرآن، تلوار، انگوٹھی اور اسکی پوشاک، بغیر کسی حق اور معاوضہ کے بڑے بیٹے کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ (اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں سمجھتے) حالانکہ یہ بھی قرآنی حکم کے خلاف ہے۔ اور اس بیٹے کی میراث سے باپ کو محروم کرتے ہیں جس نے ایک میراث یا قصور سے بادشاہ قاضی یا کوتوال کے روبرو فاش غلطی دیدی ہو، یا درحقیقت یہ شرع کا حکم نہیں بلکہ قانون تورہ چنگیز خانی ہے۔ اور بعض چچاؤں، چچا زادوں اور دادیوں کو مطلقاً میراث سے محروم رکھتے ہیں۔

(۹۸) اور وصایا کے مسائل میں مظروف کو ظرف کے تابع کرتے ہیں مثلاً ایک شخص نے وصیت کی میرا فلاں صندوق فلاں شخص کو دیا جائے۔ تو اگر اس صندوق میں کچھ مال واسباب نقدو زیورات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ تو ان کے نزدیک وہ سب اشیاء وصیت میں داخل ہوں گی۔

(۹۹) لونڈی کی شرمگاہ کی تحلیل سال دو سال کے لئے جائز بتاتے ہیں۔

(۱۰۰) مجنون اور پاگل پر حدود کا اجراء ان کے واجب ہے جبکہ اس نے عاقل عورت سے زنا کیا ہو۔ حالانکہ اس کے خلاف متفق علیہ صحیح حدیث موجود ہے۔ رُفِعَ الْقَلَمُ عَلٰی ثَلَاثَۃٍ عَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یُفِیْقَ۔ تین افراد سے قلم اٹھالیا گیا (وہ غیر مکلف ہیں) مجنون وپاگل سے جب تک

وہ اچھا نہ ہو جائے ،

(۱۰۱) اس عورت پر بھی رجم واجب کہتے ہیں جو اپنے شوہر سے ہمبستری کے بعد کسی باکرہ عورت سے رگڑ کرے جس سے وہ حاملہ ہو جائے ۔ اور اس باکرہ (کنواری) عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں ۔ حالانکہ رگڑ کو کسی نے بھی زنا میں شمار نہیں کیا اور نہ شرعاً وہ زنا سمجھا گیا ہے ۔

(۱۰۲) اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے کو ابن زانیہ کہہ کر پکارے ۔ گو اس کی ماں کافرہ ہو ، تو اس پر حد قذف کو واجب کہتے ہیں ۔ حالانکہ قرآنی حکم میں حد قذف محصنات کے معاملہ کے ساتھ مخصوص ہے ، اور کافر عورت محصنہ نہیں ہوتی ، اس کے مسلمان بیٹے کی حرمت تعزیر کا سبب تو ہوگی مگر حد جاری کرنے کا سبب نہیں بنے گی ۔

(۱۰۳) اگر کوئی نابینا مسلمان کسی کو بے خطا بے قصور ، قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس نابینا سے قصاص نہیں لیا جائے گا ۔ حالانکہ قصاص کی آیت بینا و نابینا سب کو شامل ہے ۔

(۱۰۴) ایک آدمی بھوکا ہے ۔ دوسرے مسلمان کے پاس کھانا ہے ۔ مگر وہ اس بھوکے کو نہیں دیتا ۔ تو ان کے نزدیک اس بھوکے کو حق ہے کہ کھانا رکھنے والے مسلمان کو قتل کر کے اس سے کھانا لے اور کھا جائے ! اس فعل کی وجہ سے نہ اس پر قصاص واجب ہے نہ دیت ! حالانکہ دنیا کی کسی شریعت میں بھی کھانا نہ دینا قتل کے جواز کی وجہ نہیں ہے !

(۱۰۵) اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کو قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس ذمی کا تمام مال و اسباب مسلمان مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے ! رہی ذمی کی ذات ، تو مقتول کے وارثوں کو یہ اختیار ہے کہ چاہے اسے غلام بنائیں چاہے قتل کریں ۔ ان کا یہ مسئلہ بھی شرع کے خلاف ہے ۔ کیونکہ شریعت میں صرف قصاص کا حکم ہے ۔ نہ اس کا مال لینا جائز ہے نہ اسکو غلام بنانا ۔ اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی ذمی کی چھوٹی اولاد کو مقتول کے ورثا اپنا لونڈی غلام بنا لیں گے حالانکہ یہ قرآنی آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی ۔ (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا) کے سراسر خلاف ہے ۔ حاصل تحریر یہ کہ دینی احکام و مسائل میں بہت سے مسئلے ان کے دماغی اختراع اور من گھڑت ہیں ۔ نمونہ کے طور پر صفحات گذشتہ میں جو تحریر کیا گیا وہ اس مدعا کے ثبوت کے لئے ۔ کافی ہے ! صاحب فہم و شعور ، اور اہل عقل و دانش پر ان کے دین و ایمان ، اور اصول و فروع کی حقیقت پوری منکشف ہو جائے گی ۔ اور یہ بھی بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا کہ ان اصول کو جو سراسر دروغ اور فروع بے فروغ کی نسبت آئمہ کرام کی طرف کرنا ۔ اور ان جلیل القدر ہادیان شرع و دین کا مذہب بتانا ، چوٹی کے جھوٹ اور اعلیٰ درجہ کے بہتان و افتراء کے سوا کچھ نہیں ۔ اور لطف یہ کہ ان کا یہ خود ساختہ مذہب اور روایات کے بھی مخالف ہے جو خود ان کے نزدیک ان کے راویوں کے حوالہ سے انہیں کی کتابوں میں منقول و مروی ہیں !

باب ۱۰ خلفائے ثلاثہ و کبار صحابہؓ پر مطاعن

کا بیان ـــــ اور ـــــ جوابات

تلاش بسیار ، اور جستجوئے بجد کا حاصل یہ معلوم ہوا کہ اس عالم دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے حق میں بدزبانوں اور بدگویوں اور عیب جوؤں نے زبان طعن و قدح دراز نہ کی ہو !

دہریوں نے ذات الٰہی جل شانہ تک میں کلام کیا ۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کے انکار میں معتزلہ نے حضرت آدم السلام سے لے کر

شخصی مرتبت نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم تک کو موضوع کلام بنایا۔ اور چھوٹے سے لے کر بڑے گناہ تک ان سے منسوب کئے! اور مزہ کی بات یہ کہ ثبوت میں قرآن واحادیث کے حوالے دیئے! یہودی فرقہ عصمت ملائکہ کے معاملہ میں اسی غلط روش پر چلا! نواصب وخوارج نے جناب امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں یہی وطیرہ رکھا، اور آخر میں ابن سبا یہودی اور اس کے پیروؤں نے جو مختلف فرقوں اور ناموں سے موسوم ہوتے رہے، خلفائے ثلاثہ، کبار صحابہ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی اعلیٰ وارفع شان میں مطاعن کا دروازہ کھولا ہے۔ اور اپنی ناقص وناکارہ عقل اور گمان فاسد میں حوالوں کے لئے اہل سنت کی کتابوں کو سامنے لائے! لیکن دانشوروں اور عقلمندوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ سب کچھ ایسا ہے جیسے چاندنی پر کتے بھونک رہے ہوں جس سے ان عالی قدر ومنزلت اور عالم وعالمیاں کے نزدیک مقدس وبزرگ اور محترم شخصیات کی عزت وقدر اور احترام میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آتی۔ کسی شاعر نے کہا ہے،

اِذَا اَتَتْكَ نَقِيْصَتِيْ مِنْ نَاقِصٍ ۔ فَهِيَ الشَّهَادَةُ لِيْ بِاَنِّيْ كَامِلٌ ۔ (جب کسی کمینے سے تو میری برائی سنے تو سمجھ لے کہ وہ میرے لئے اس بات کی گواہی ہے کہ میں کامل ہوں) ان خلفائے کرام صحابہ عظام اور امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہم کی عظمت، بزرگی اور بڑائی کی سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ باوجود انتہائی عناد اور پرلے درجہ کا کینہ رکھنے کے باوجود یہ دریدہ دہن اب تک صرف یہی چند شبہات سامنے لاسکے، جو غور وفکر کے ابتدائی مرحلہ میں ہی غبار بن کر ہوا میں اڑجاتے ہیں۔ اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا حالانکہ ان بزرگوں کی عیب جوئی کے مواقع کی تلاش میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور مقدور سے بڑھ کر سعی وکوشش کر ڈالی۔ اور پھر ایسا شخص جو گوشہ نشین نہیں تھا ریاست عامہ کا بار اس کے کندھوں پر تھا، مخلوق خدا کے ساتھ طرح طرح اور نوع بنوع معاملات سے اس کا ربط وضبط تھا۔ اور وہ لاکھوں کی تعداد رکھنے والی ایک امت کا والی ونگران تھا، اس کا سابقہ دوستوں کے ساتھ دشمنوں سے بھی تھا۔ وہ امن وجنگ دونوں حالتوں سے گذرا اس نے اپنی زندگی میں صرف دس بارہ کام ایسے کئے ہوں جن پر دشمنوں اور بدزبانوں نے انگشت نمائی کی ہو، اور گرفت پائی ہو۔ جبکہ دوران بحث وہ قابل گرفت باتیں بھی محل طعن نہ بن سکی ہوں۔ تو کیا دنیا کے لئے اسکی عظمت کے اعتراف کے لئے اتنا کافی نہیں ہے۔ دنیا تو اس کے گن گاتی اور اسے سراہتی ہے جو ایک گھر بستی کا مالک ہو اور زندگی بھر وہ روزانہ دوچار غلطیوں کے علاوہ اپنے سارے کام اور انتظام ٹھیک ٹھیک چلاتا ہو، تو کیا ستم کی بات نہیں کہ اسکو قابل ستائش سمجھنے کے بجائے نشانہ طعن بنایا جائے جو اتنی بڑی ملت کی سیاست کاری اور انتظام امور میں مشغولیت کے باوجود دس پانچ غلطیوں اور وہ بھی موسوم سے زیادہ نہ کرسکا جن پر دشمنوں نے انگلی دھری۔

مطاعن ابو بکر صدیقؓ یہ کل پندرہ ہیں

اعتراض کہتے ہیں کہ ایک روز آپ خطبہ دینے ممبر پر چڑھے تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما نے کہا اے ابو بکر (رضی اللہ عنہ) ہمارے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ممبر سے اتر جاؤ،، ان کے قول سے معلوم ہوا کہ آپ اس کے اہل نہ تھے!۔

جواب جناب حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش رمضان ۳ھ اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شعبان ۴ھ کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ۱۱ھ کے ابتدا میں ہوا۔ اسی لئے عہد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ حضرات بالاجماع کمسن تھے یہی چھ سات سال کے! اب یہاں دو صورتیں ہیں، یا تو شیعہ ان حضرات کے اقوال وافعال کو اس کم عمری کے باوجود معتبر تسلیم کریں گے، اور ان پر اپنے احکام کی بنا رکھیں گے، یا صغر سنی کے سبب ان کو اہمیت نہ دیں گے، اور نہ ان سے احکام نکالیں گے۔

پہلی صورت میں ترک تقیہ لازم آتا ہے جو ان کے نزدیک واجب ہے (کہ حضرت حسینؓ خاموش کیوں نہ رہے جھگڑا کیوں پڑے)۔ اور پھر

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت بھی لازم آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہار شنبہ سے لیکر دوشنبہ تک جناب صدیق رضی اللہ کو پنجوقتہ نمازوں میں اپنا خلیفہ بنایا اور اس اثنا میں آپ جمعہ وخطبہ کے فرائض بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں انجام دیتے رہے!

اسی طرح جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی مخالفت بھی لازم آئے گی کہ آپ بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کی جمعہ وخطبہ کی نیابت کو بھی تسلیم کیا! اور دوسری صورت میں نہ کوئی نقص لازم آتا ہے، اور نہ کوئی قباحت کی بات ہی ہے۔ بچوں کا یہ قاعدہ ہے، کہ وہ اپنوں کی جگہ، کسی دوسرے کو دیکھتے ہیں، تو ناسمجھی میں ایسی ہی بات کہتے اور کرتے ہیں۔ تو ان کے قول وفعل سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

اور ہر چند انبیاء کرام اور ائمہ، کمالات نفسانیہ اور مراتب ایمانیہ میں عام مخلوق سے ممتاز ہوتے ہیں۔ مگر احکام بشری، خواص صغر سنی اور خصائص طفولیت ان میں بھی کارفرما رہتے ہیں۔ اسی لئے مقتدا بننے کے لئے کمال عقلی کی حد تک پہنچنا ضروری قرار دیا گیا ہے، چالیس سال سے قبل شاذونادر مثالوں کو چھوڑ کر۔ منصب رسالت کسی کو عطا نہیں ہوا۔ عربی میں ایک مثل ہے۔ اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ نَبِیًّا۔ (بچہ بچہ ہی ہے اگرچہ وہ نبی ہو)

اعتراض (۲) دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ مالک بن نویرہ، کی خوبصورت بیوی سے نکاح کے لالچ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امیر الامراء تھے مالک بن نویرہ کو جو مسلمان تھے نہ صرف قتل کیا بلکہ قتل ہی کی رات کو اس عورت سے نکاح کر کے فعل زوجیت بھی کیا۔ اور اس کی عدت پوری ہونے کا بھی انتظار نہ کیا، کیونکہ عدت میں نکاح جائز نہیں اور یوں گویا زنا کے مرتکب ہوئے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ ان پر حد لگائی نہ قتل کا قصاص لیا جبکہ دونوں سزائیں کالفاظ ان پر واجب تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس پر ناراض بھی ہوئے اور فرمایا اگر میں امیر ہوتا تو تم سے قصاص لیتا

جواب:۔ دراصل جو واقعہ پیش آیا اسکی تعبیر ان لوگوں نے صحیح بیان نہیں کی! اور جب تک صحیح حالات معلوم نہ ہوں اس وقت تک اعتراض کی بے وقعتی ظاہر ہے۔ سیرت وتاریخ کی معتبر کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مدعی نبوت طلیحہ بن خویلد اسدی کی مہم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب فارغ ہو کر نواح بطاح (ایک مقام کا نام) کی طرف متوجہ ہوئے تو اطراف وجوانب کی طرف فوجی دستے روانہ کئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور طریقے کے مطابق ان کو ہدایت کی کہ جس قوم، قبیلہ، گروہ پر چڑھائی کرو، وہاں سے اگر تمہیں اذان سنائی دے تو وہاں قتل وغارتگری سے باز رہو۔ اور اگر اذان کی آواز نہ سنائی دے تو اسے دارالحرب قرار دے کر پوری فوجی کاروائی کرو! اتفاقاً اس دستہ میں جناب ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مالک بن نویرہ کو پکڑ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس لائے۔ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بطاح کی سرداری ملی ہوئی تھی۔ اور اس کے گرد ونواح کے صدقات کی وصولی بھی اسی کے سپرد تھی جناب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اذان سننے کی گواہی دی۔ مگر اسی دستہ کی ایک جماعت نے کہا کہ ہم نے اذان کی آواز نہیں سنی۔ مگر اس سے پیشتر گرد ونواح کے معتبرین کے ذریعہ یہ بات حتمی اور ثبوتی طور پر معلوم ہو چکی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ کے اہل خانہ نے خوب جشن منایا، عورتوں نے ہاتھوں میں مہندی رچائی ڈھول بجائے، اور خوب فرحت وشادمانی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کی اس مصیبت پر خوش ہوتے۔ پھر مزید ایک بات یہ ہوئی کہ مالک بن نویرہ سے سوال وجواب کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے جس کے کفار ومرتدین اپنی گفتگو میں عادی تھے، اور استعمال کرتے تھے یعنی قَالَ رَجُلُکُمْ اَوْصَاحِبُکُمْ (تمہارے آدمی یا تمہارے ساتھی نے ایسا

کہا علاوہ ازیں یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ نے وصول شدہ صدقات بھی اپنی قوم کو یہ کہہ کر واپس کر دیئے تھے کہ اچھا ہوا "اس شخص" کی موت سے تم نے مصیبت سے چھٹکارا پایا۔ ان حالات اور اپنے سامنے اس کی گفتگو کے انداز سننے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا یقین ہوگیا اور آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ اُدھر جب مدینہ میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچی۔ پھر جناب ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بھی آپ سے ناراض ہو کر دارالخلافہ پہنچے۔ اور قصوروار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی ٹھہرایا تو ابتداً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہی خیال تھا کہ خون ناحق ہوا اور قصاص واجب ہے۔ مگر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو طلب فرما کر تفتیش حال کی، ان سے پورا واقعہ پوچھا اور حالات واقعات کا سارا راز آپ پر منکشف ہوا، تو آپ نے ان کو بے قصور قرار دیکر ان سے کچھ تعرض نہیں کیا اور ان اسی سابقہ عہدہ پر بحال رکھا۔ اب اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اور فقہی مسئلہ میں غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر زنا و قتل کی حد کیسے واجب ہو سکتی ہے! اب رہی یہ بات کہ حربی عورت کو بھی ایک حیض بقدر عدت گذارنی ضروری ہے۔ اور اتنا انتظار بھی نہیں ہوا۔ تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر واقعہ صحیح بھی ہے تو یہ اعتراض حضرت خالدؓ پر ہوتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ پھر حضرت خالدؓ نہ معصوم تھے، نہ امام عام! لیکن بات یہ نہیں۔ دراصل یہ قصہ ہی من گھڑت ہے۔ اسی لئے کسی مستند و معتبر کتاب میں اس کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ بعض غیر معتبر کتابوں میں یہ روایت ملتی بھی ہے تو اس کا جواب بھی ساتھ ساتھ اسی روایت میں موجود ہے، کہ مالک بن نویرہ نے اس عورت کو ایک عرصہ سے طلاق دے رکھی تھی اور رسم جاہلیت کی پائیداری میں ایسے یوں ہی گھر میں ڈال رکھا تھا۔ اسی رسم جاہلیت کے توڑنے پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ۔ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں روکے نہ رکھو! لہٰذا اس عورت کی عدت تو کب کی پوری ہو چکی تھی۔ اور نکاح حلال ہو چکا تھا۔ تو اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فوری نکاح کر لیا تو اعتراض کی کیا بات ہے! فقہاء اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔

اسباب ہیں چونکہ اعتراضات اہل سنت پر کئے جا رہے ہیں، اور انہیں کے مذہب اور روایات سے اعتراضات کو ثابت کرنا بھی مقصود ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اہل سنت ہی کی روایات، اور مسائل کا لحاظ رکھا جائے۔ ورنہ تو مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ (کوئی شیعہ اپنی روایات، اپنے مسائل پیش کر کے اہل سنت پر اعتراض کا کیا حق رکھتا ہے جبکہ وہ ان کو صحیح و حق تسلیم ہی نہ کرتا ہو۔) استیعاب کا ایک حوالہ ملاحظہ کیجئے،

وَأَمَّرَهُ أَيْ خَالِدًا أَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيقُ عَلَى الْجُيُوشِ فَفَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْيَمَامَةَ وَغَيْرَهَا وَقُتِلَ عَلَى يَدَيْهِ أَكْثَرُ أَهْلِ الرِّدَّةِ مِنْهُمْ مُسَيْلَمَةُ الْكَذَّابُ وَمَالِكُ بْنُ نُوَيْرَةَ الخ

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو یعنی خالدؓ کو امیر لشکر بنایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ یمامہ اور دوسرے مقامات فتح کرائے اور ان کے ہاتھوں بہت سے مرتدین قتل کرائے ان میں سے مسیلمہ کذاب اور مالک بن نویرہ بھی تھے۔

دوسرا جواب:- چلو مان لیا کہ مالک بن نویرہ مرتد نہ تھا۔ مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا شبہ تو پیدا ہو گیا تھا۔ اور وَالْقِصَاصُ تَنْدَرِئُ بِالشُّبُهَاتِ (اور شبہ کی صورت میں قصاص ختم ہو جاتا ہے)

تیسرا جواب:- جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ تھے۔ سنیوں یا شیعوں کے خلیفہ تو نہیں تھے کہ ان کی فرمائش اور خواہش کے مطابق کام انجام دیتے) وہ جس ذات اقدس کے خلیفہ تھے ان کا اسوہ ان کے سامنے تھا، انہیں اسی کی پیروی کرنی

اور انہیں کی سنت پر عمل کرتا تھا۔ اور اسی ذات محترم و مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں اسی قسم کے مشتبہ افراد کو قتل کیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تعرض نہ فرمایا۔ چنانچہ اہل سیرت و تاریخ کا اس قصہ کی صحت پر اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ تو آپ نے ایک قوم پر چڑھائی کی۔ وہ لوگ اسلام تو لے آئے تھے لیکن قواعد و تعلیمات اسلام سے ابھی روشناس نہیں ہوئے تھے جب ان پر حملہ ہوا تو اپنے اسلام کے اظہار کے لیے، یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے صَبَانَا صَبَانَا (ہم صابی ہیں ہم صابی ہیں۔ صابی بمعنی بے دین) ان کا مطلب تو یہ تھا کہ اپنے سابق دین سے پھر گئے اور اسلام لے آئے

جناب خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ اسی لشکر میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایک دستہ کے سردار تھے، انہوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ ان کو قتل نہ کرو قید میں رکھو!

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو آپ بہت ملول اور رنجیدہ ہوئے۔ بہت افسوس ظاہر فرما کر یہ الفاظ فرمائے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ (اے اللہ میں تیری جناب میں خالد نے جو کچھ کیا اس سے بیزار ہوں) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر حد جاری کی، نہ کوئی قصاص و دیت دلائی۔ اس لئے اس نظیر کی موجودگی میں اسی قسم کے شبہ یا اس سے زیادہ شبہ کی صورت میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب خالد بن ولید سے کوئی تعرض نہیں کیا تو کونسا قصور کیا خصوصاً اس صورت میں کہ آپ نے بیت المال سے اس کی دیت دلا بھی دی ہو! آپ پر طعن و اعتراض وہی کر سکتا ہے جس کا دل بغض و کینہ کی آلائش سے آلودہ ہو!

چوتھا جواب :- کیوں جناب مالک بن نویرہ کا قصاص نہ لینا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لئے باعث طعن ہے۔ تو ذی النورین الشہید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص نہ لینے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اس لئے کہ ان کا قتل تو بلا وجہ بلا سبب تھا۔ نہ واقعہ میں کوئی سبب تھا نہ وہم گمان میں کوئی بات!

پانچواں جواب :- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا اسوقت واجب ہوتا جب مالک بن نویرہ کے ورثاء اس کا مطالبہ کرتے اور اس قسم کے مطالبہ کا بالکل کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ اس کے بھائی متمم بن نویرہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے بھائی کے مرتد ہو جانے کا اعتراف کیا۔ حالانکہ یہ بھائی وہ تھا جو اپنے بھائی مالک سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا، عمر بھر اسکی جدائی میں تڑپتا پھڑکتا رہا۔ ہمیشہ اس کے فراق میں چاک گریبان آہ و فغاں کرتا رہا۔ چنانچہ اس کے مرثیے عرب بھر میں ضرب المثل مانے گئے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں،

(۱) وَکُنَّا کَنَدْمَانَیْ جُذَیْمَةَ حِقْبَةً ۔ مِنَ الدَّھْرِ حَتّٰی قِیْلَ لَنْ یَّتَصَدَّعَا (۲) فَلَمَّا تَفَرَّقْنَا کَاَنِّیْ وَمَالِکًا ۔ لِطُوْلِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَیْلَةً مَعًا

(۱) عمر کے ایک حصے تک ہم دونوں بھائی جذیمہ کے دو مصاحبوں کی مانند تھے، کہ لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ ہرگز بھی باہم جدا نہ ہوں گے،

(۲) لیکن جب ہم جدا ہو گئے تو مجھ کو اور مالک کو اتنے عرصہ کی یکجائی کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ایک رات بھی ساتھ نہ گذاری ہو!

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی سابقہ رائے پر جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کی تھی متاسف اور نادم ہوئے آپ نے اس کا برملا اعتراف کیا کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ کیا وہ عین حق اور بالکل درست تھا۔ اور مبنی بر انصاف! اور اسکی سب سے بڑی اور واضح دلیل یہ ہے کہ آپ نے اپنے عہد میں جناب خالد رضی اللہ عنہ سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، نہ ان پر حد جاری کی، نہ قصاص لیا۔ حالانکہ حدود کے معاملہ میں آپ بہت سخت اور متشدد تھے، اور کسی رو رعایت سے

کام نہ لیتے تھے۔

اعتراض (۳) - تیسرا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے سلسلہ میں آپ نے تاخیری صورت اختیار کی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لشکر کو رخصت فرمایا تھا۔ لوگوں کا نام بنام تقرر فرمایا اور آخر وقت تک اس پر بہت زور دیتے اور تاکید فرماتے رہے۔ بلکہ اس کی تیاری کے سلسلہ میں یوں ارشاد فرماتے: جَهِّزُوْا جَيْشَ اُسَامَةَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ تَخَلَّفَ۔ (اسامہؓ کے لشکر کو سامان مہیا کرو۔ جو اس سے پیچھے ہٹے اس پر اللہ کی لعنت ہے)

جواب :۔ سب سے پہلے تو یہ بات متعین ہونا ضروری ہے کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کس حیثیت اور پہلو سے ہے، کیا اس وجہ سے کہ آپ نے اس کے لئے تیاری نہیں کی؟ یا یہ صورت تھی کہ آپ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ اگر مدنظر پہلی صورت ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے۔ وہاں تو صورت یہ تھی کہ آپؓ نے دیگر صحابہ کرام کے علی الرغم جیش اسامہؓ کی ہر پہلو سے تیاری کی، اس سلسلہ کی تفصیل اور صحیح صورت حال یوں تھی کہ ۲۶ صفر بروز دوشنبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ (حضرت) زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کا انتقام لینے اور رومیوں سے جہاد کی غرض سے لشکر ترتیب دیا جائے سہ شنبہ کے دن آپؐ نے جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا امیر مقرر فرمایا۔ (۲۸) صفر چہار شنبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض آخری لاحق ہوا۔ پر دوسرے روز علالت کے باوجود دست مبارک سے نشان (علم) تیار فرمایا، اور ارشاد فرمایا۔ اُغْزُ بِسْمِ اللّٰهِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَاتِلْ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ (اللہ کے نام سے اللہ کے راستہ میں غزوہ کرو۔ اور اللہ کے منکروں سے جنگ کرو) پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس علم کو لئے باہر نکلے اور جناب بریدہ الحصیب رضی اللہ عنہ کو دیا کہ انہیں لشکر کا علمبردار مقرر کیا گیا تھا۔ اور مدینہ سے چل کر بمقام جُرف میں آ ٹھہرے کہ سارے لشکر کی اجتماع گاہ یہی پہلی منزل تھی تاکہ جو آئے لشکر میں ملتا جائے۔ ادھر کبار صحابہ مہاجرین و انصار۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، عثمان غنی، سعد بن وقاص، ابوعبیدہ بن جراح، سعید بن زید، قتادہ بن نعمان، اور سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہم اجمعین، اس لشکر کے شایان شان تیاریوں میں مصروف تھے، خیمے اور دیگر سامان روانہ کر چکے تھے۔ اور خود بھی روانگی کے لئے بابرکاب تھے کہ چہار شنبہ کے غروب اور پنجشنبہ کی ابتدائی ساعتوں میں آپؐ کے مرض نے شدت اختیار کر لی، اور مدینہ میں بے چینی، جان نثاروں میں ہل چل مچ گئی۔ شب پنجشنبہ عشاء کی نماز کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانشین مقرر فرمایا اور اس خدمت کیلئے آپ کو نامزد فرما دیا۔ (اور جانشینی کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا) تاآنکہ ۱۰ ربیع الاول کی تاریخ اور دوشنبہ کا دن آیا کہ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں کچھ تخفیف معلوم ہوئی تھی! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کنار محبت و رحمت میں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ اور فی امان اللہ کہا۔ مگر یک شنبہ کو مرض میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ اُدھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ دوشنبہ کی صبح روانگی کا ارادہ کر چکے تھے اور روانہ ہونے ہی کو تھی کہ ان کی والدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کا قاصد یہ پیغام لایا کہ حضور صلی اللہ پر عالم نزع طاری ہے، حضرت اسامہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم، گرتے پڑتے واپس مدینۃ النبیؐ آئے۔ بریدۃ الحصیب نے وہ علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک کے دروازہ پر گاڑ دیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم منزل آخرین میں جاگزیں ہو چکے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مسند خلافت کے لئے منتخب کر لئے گئے تو آپ نے حکم دیا کہ علم اسامہؓ کے گھر کے دروازہ پر نصب کیا جائے۔ بریدہ کو حکم ہوا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر لشکر کو از سر نو ترتیب دیں۔ اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوچ کا حکم ملا۔ چنانچہ وہ مدینۃ النبی سے رواد ہوئے اور پہلا پڑاؤ جرف میں کیا۔

اسی دوران بعض قبائل عرب کے مرتد ہونے اور ان کے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تشویشناک خبر ملی۔ تو سارے صحابہ جناب صدیق

اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے، وقت بڑا نازک ہے، حالات دگرگوں نظر آتے ہیں، ایسے وقت اتنا بھاری لشکر دور و دراز کی مسافت پر بھیجنا خلاف مصلحت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عرب مدینہ خالی دیکھ کر شورش برپا کر دیں۔ اور فتنہ اٹھ کھڑا ہو، اور اہل مدینہ کسی آفت و مصیبت میں گھر جائیں۔ مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ قبول نہیں فرمایا۔ اور یہ فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اسامہؓ کے لشکر کی روانگی کے سبب میں مدینہ میں درندوں کا لقمہ بن جاؤں گا تب بھی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کے مقابلہ میں یہ صورت منظور ہوگی! البتہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے بصورت درخواست اتنا کہا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دے دو کہ مدینۃ النبی کی حفاظت و انتظام میں مجھے ان کے مشورہ کی ضرورت ہوگی چنانچہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی اجازت سے مدینۃ النبی واپس آگئے۔ اور باقی لشکر جوں کا توں یکم ربیع الثانی کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، روانہ ہوا، اور جہاں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس رخ چل پڑا تھا اس مقام کا نام اُبنیٰ تھا۔

یہ ہے اصل قصہ اور واقعہ جو روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب، حبیب السیر اور شیعوں و سنیوں کی دیگر معتبر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر مقصود اعتراض دوسری صورت ہے، کہ آپؓ رفاقت اسامہؓ سے بچھڑ گئے اور ان کا ساتھ نہ دیا۔ تو واقعہ اور صورت بالا کو مد نظر رکھا جائے تو اس اعتراض کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے تاہم اس کے چند جوابات ملاحظہ ہوں۔

(۱) رئیس وقت کو یہ اختیار ہے کہ اگر ایک آدمی کا تقرر اس نے کسی جگہ کیا ہے تو ضرورت کے وقت وہ کسی دوسرے منصب پر بھی اس کا تبادلہ و تقرر کر سکتا ہے۔ اور اس وقت اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ پہلی خدمت سے اس کو بری الذمہ کر دیا۔ یہاں یہی صورت یہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول یہ حکم فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ جیش اُسامہؓ میں شریک ہو کر جہاد کے لیے جائیں۔ وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے کہ آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہوئی کہ وہ میرے نائب نماز کی خدمت انجام دیں، تو وہ خدمت سپرد فرما دی۔ اس مطلب ہوا کہ لشکری خدمات سے آپ کو چھٹی مل گئی! اس صورت حال پر اعتراض وہی کر سکتا ہے جو یا تو عقل سے پیدل ہو یا اپنا بغض و کینہ نکالنے کے لیے اعتراض برائے اعتراض کا قائل ہو! شرعی نقطۂ نظر سے بھی یہ ثابت ہے کہ جہاد سے پہلے کی ابتدائی صورت فرض کفایہ ہے۔ اور لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری بھی اسی نوعیت کی تھی، اس لیے آپؓ کا لشکر اسامہؓ کے ساتھ نہ جانا کوئی قابل اعتراض نہیں اور نہ آپؓ پر کوئی الزام آتا ہے۔ دوسری طرف صورت حال یکسر بدل گئی تھی۔ آپ ولی الامر، خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے پوری ملت کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری آپ پر تھی۔ کفار و مرتدین کا جو فتنہ سر اٹھا رہا تھا اسکو فرو کرنا فرض عین تھا اس کو آپ کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ نے فرض عین کی آدائیگی کی خاطر فرض کفایہ کو ترک فرمایا یہی حکم شرعی بھی ہے۔ اور پھر اب تو پوزیشن بھی بدل گئی تھی: اب تو لشکر کی تیاری، ساز و سامان کی فراہمی لوگوں کو اس کی ترغیب دلانا۔ اور ہمہ قسم مدد و ضروریات کا خیال رکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہونے کی حیثیت سے آپؓ ہی کو سرانجام دینے تھے، اور ان سب کاموں کا سہرا اب تو آپ ہی کے سر تھا۔ اور ان کا اجر و ثواب آپ ہی کے نام لکھا جاتا تھا۔

(۲) دشمن کی سرکوبی کے لیے کسی امیر کی سرکردگی میں چند اشخاص کی نامزدگی سیاست تمدنی، و مدنی کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے جو حاکم وقت کی صوابدید سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ حکم منزل من اللہ نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس انتظام اور سیاست مدنی کا بوجھ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کاندھوں پر آیا۔ اب یہ امور آپ کی صوابدید سے وابستہ ہوئے کہ جس کو چاہیں جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ متعین کر دیں اور جس کو مناسب سمجھیں اپنے ساتھ رکھیں خود

شرکت کرنا چاہیں شریک ہوجائیں۔ نہ چاہیں تو نہ جائیں۔ ان کے اتنے ردوبدل سے فرمان اور حکم رسول کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ مخالفت تو تب ہوتی کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی جگہ کسی اور کو امیر لشکر مقرر فرماتے۔ یا یہ مہم اور لشکر کی روانگی کے ارادہ کو ترک کردیتے یا دشمنوں سے صلح کرلیتے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ملک و ملت اور دینی مصالح اور جزئی امور میں وقتی طور پر ردوبدل رئیس وقت، خلیفہ بادشاہ کی صوابدید سے متعلق و وابستہ ہوتے ہیں ان میں وہ اپنی عقل ورائے کو پورا دخل دینے کا پورا پورا مجاز ہے، اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نہ شرعی حیثیت سے تھے اور نہ ان سے متعلق کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔ رہا لعنت والا جملہ، تو اہل سنت کی کتابوں میں یہ موجود نہیں ہے۔ بالفرض اس کو صحیح مان لیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس مہم میں اسامہؓ کو تنہا چھوڑ دینا اور جناب زید بن حارثہؓ کے انتقام کے لئے رومیوں کے خلاف اس جہاد سے پہلوتہی کرنا اور شریک نہ ہونا حرام ہے اور جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خدمت امامت سے گراں بار ہوئے تو بلاشبہ ان تمام امور سے آپ مستثنیٰ قرار پائے (جس طرح اس لشکر کی روانگی کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شرکت کے علاوہ دیگر تمام امور کا انتظام فرمایا، ان کی انجام دہی کے لئے بتاکید اصرار فرمایا۔ اسی طرح عدم موجودگی کے سبب آپؓ کے نائب نے سوائے اپنی شرکت کے، یا حضرت اسامہؓ کی اجازت سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے رُک جانے کے تمام امور عین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا اور ان کے انتظامات کے مطابق یہ مہم روانہ فرمائی، اور ہر طرح کے سازوسامان جہاد کا ان کے لئے انتظام فرمایا۔ ن) چنانچہ شہرستانی نے اپنی کتاب "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ یہ لعنتی جملہ من گھڑت اور افتراء محض ہے، کسی فارسی میں نوشت وخواند کی صلاحیت رکھنے والے شخص نے محدثین اہل سنت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو اور وہ اپنی کتاب میں یہ جملہ نقل کرے تو اس سے اہل سنت کو الزام دینا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے کہ اہل سنت کے نزدیک وہی حدیث معتبر ہے جو محدثین کی معتبر کتب میں مدون ہو، اور جس کی صحت کا حکم بھی اس کے ساتھ مذکور ہو بے سند حدیث ان کے لئے نہ قابل توجہ ہے، اور نہ لائق اعتماد۔

(۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے منصب میں انقلاب آگیا پہلے ان کا شمار عام مومنین میں تھا، (خصوصیت یہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدیق اور یار غار تھے۔ وزیر و مشیر تھے۔ ن) لیکن اب امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب وجانشین ہیں۔ جب کسی شخص کے منصب میں انقلاب آجائے اور وہ ایک منصب سے دوسرے منصب پر فائز ہوجائے تو حکم شرع کے بموجب موجودہ منصب کے احکام جاری ہوتے ہیں، پہلی حیثیت و منصب والے نہیں۔ مثلاً جب پیٹ کا بچہ پیدا ہوجائے، پھر وہ جوان و بالغ ہوجائے، یا پاگل اچھا ہوجائے، مقیم مسافر ہوجائے، مسافر اقامت اختیار کرلے، غلام آزاد ہوجائے، رعیت حاکم بن جائے، عام آدمی قاضی و جج بن جائے، فقیر مالدار، مالدار فقیر ہوجائے، زندہ موت کی راہ لگ جائے، میراث و ولایت میں قریب تر رشتہ دار فوت ہوجائے۔ اور اسی قسم کے بے شمار ایسی نظیریں ہیں، کہ پہلی حالت گزرنے کے بعد اس پر دوسری حیثیت و حالت کے احکام نافذ ہوں گے۔ بچہ نابالغ ہے تب تک معصوم ہے۔ بالغ ہونے پر وہ مکلف ہوگا اب اس پر معصومیت کی حالت والے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ مکلف والے احکام جاری ہوں گے،

اب جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جانشین رسول، ہوئے، تو اب اسامہؓ کی ماتحتی والا حکم باقی نہیں رہا۔ اب اس لشکر کے ساتھ ان کا وہی رویہ ہونا چاہیئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات کے وقت تھا۔ اور اس معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کے ساتھ خود تشریف نہیں لے جارہے تھے، کہ ایک امر مسمی کا مرحلہ سامنے تھا۔ اور اب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی (گو دلی خواہش رہی ہو) اس لشکر کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے اس لئے کہ موجودہ منصب کا اب یہ تقاضا تھا کہ وہ مرکز کی حفاظت بنفس نفیس فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری تیاری اور اہتمام کے

ساتھ بہر صورت اس لشکر کی روانگی چاہتے تھے، اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرگردگی میں چاہتے تھے۔
جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا۔ اور لشکر کو پوری تیاری اور بڑے اہتمام کے ساتھ بہر صورت بھیجا۔ اور اسامہ ہی امیر لشکر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراضات و مشوروں کے باوجود جناب اسامہ کو امیر لشکر رکھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی رفقاء کے مشوروں، اور مصالح ملکی اور قوانین جنگ کے علی الرغم انکی امارت کو باقی رکھا۔ اور مشوروں کے جوابات میں یہ جواب مرحمت فرمایا کہ "ابو بکر کی کیا مجال کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ امیر کو ہٹادے (معنًا)۔ اس معاملہ میں کوئی ہوشمند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ والے معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی قابل اعتراض طرز عمل اختیار کیا ہو
(۴) بالفرض یہ مان ہی لیا جائے۔ کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے نہ نیابت نماز بھی باعث استثناء نہیں۔ نہ بہادہ خلافت کی مشغولی یا مدینہ اور ناموس رسول کی حفاظت کا عذر کام آسکتا ہے آپ اس پر مامور تھے کہ رومیوں کی لڑائی کے لیے جناب اسامہ کے ساتھ نکلیں۔ تاکہ تخلف کا الزام نہ آئے! اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہیں گئے؟
اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ آپ کی عصمت میں فرق آگیا، لیکن امامت میں عصمت شرط ہے کہاں عدالت البتہ ضروری ہے۔ تو چھوٹے موٹے ایک آدھ گناہ کے ارتکاب سے عدالت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ اور اسباب پرستی تو اعتقاد رکھتے ہی ہیں شیعہ بھی اس کے قائل ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نہ فاسق تھے اور نہ ان سے کبھی کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوا۔
(۵) پانچواں جواب یہ ہے کہ حضرات شیعہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے بعض دوسرے بزرگوں پر اہل سنت کے کیسہ علم سے ٹٹول ٹٹال کر دو چار روایات کے ذریعہ جو طعن و اعتراض کرتے وہ انہیں اول تو ثابت نہیں کرپاتے۔ اور بالفرض ان کے دو چار طعن ثابت بھی ہوں۔ تو ان کو یہ چاہیئے کہ پہلے تو جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب، اور جنت کے درجات عالیہ کی بشارت کی روایات کو جو اہل سنت بحوالہ آیات قرآن، احادیث رسول۔ اخبار ائمہ و دیگر اہل بیت سے ثابت کرتے ہیں جن میں سے بعض خود شیعوں کے نزدیک ان کی کتابوں میں بطریق صحیح منقول بھی ہیں۔ ایک پلڑے میں رکھیں، اور اس کے مقابلہ میں اپنے مزعومہ، من گھڑت اور افتراء پر مبنی مطاعن کی گٹھڑی رکھ دیں۔ پھر پلڑوں کا رخ دیکھ کر ہم سے جواب کا مطالبہ کریں۔
(۶) شیعوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم وجوب کے لئے متعین نہیں ہے، جیسا کہ مرتضیٰ نے کتاب ذرر اور غرر میں اس کی دلیل لکھی ہے۔ لہٰذا اگر خاص جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اسامہ کے ساتھ جائیں۔ اور وہ نہ جائیں تو انہیں کے قواعد کے مطابق کوئی خرابی لازم نہیں آتی ممکن ہے یہ حکم مندوب (مستحب) ہو، جس کا ترک موجب گناہ نہیں!! اب رہا لعنت والا جملہ، تو اس کا ایک جواب تو یہ جملہ ہماری کتابوں میں نہیں" اوپر گذر چکا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر موجود بھی ہو تو لفظ "من" عام ہے۔ شیعی کتب اصول میں اسکی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا اس وعید میں اکیلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نہیں جناب امیر المؤمنین اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی داخل ہوں گے۔ تو ان کے متعلق جو تمہارا جواب ہوگا وہی جواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہمارا بھی ہوگا۔ پھر اگر وہ کہیں، کہ یہ وعید تو ان لوگوں کے لئے ہے جو جیش اسامہ کے لئے نام بنام، نامزد کیئے گئے تھے تو ہم کہیں گے کہ "جھزوا جیش اسامہ" کا خطاب ان متعین اور نامزد حضرات کی طرف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جیش اسامہ ہی کو یہ کہا جائے کہ جیش اسامہ کے لئے سامان اکٹھا کرو، کیا بات ہوئی۔ لامحالہ ماننا پڑیگا کہ یہ خطاب عام تھا۔ اور سب مسلمان اس کے مخاطب تھے۔ اور لعنت کا جملہ اسی کے ساتھ چسپاں ہے۔ لہٰذا اس سے نامزد حضرات کی تخصیص

ثابت نہیں ہوتی!

(۷) جیسا کہ باب نبوت میں گزرا کہ شیعوں کے ہاں یہ ثابت ہے کہ حضرت آدم و حضرت یونس علیہما السلام نے اللہ تعالی کے بلاواسطہ براہ راست حکم کی خلاف ورزی کی (نعوذ باللہ)، تو اگر امام و خلیفہ سے رسول کے ایک حکم کی خلاف ورزی ہوگئی تو وہ وجہ طعن کیوں ہے، کہ نائب بہر حال نائب ہے وہ اصل سے بہر حال کمتر ہوتا ہے!

اعتراض (۴): — چوتھا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کبھی کوئی ایسا کام ذمہ نہیں کیا جو اقامت دین و شرع سے تعلق رکھتا ہو، اور جس شخص میں ایک بھی دینی امر کی ولایت کی قابلیت نہ ہو وہ ولایت عامہ کی قابلیت کیسے رکھ سکتا ہے۔

جواب: — اس اعتراض کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

(۱) ان کا یہ دعوی سراسر جھوٹ، بہتان اور محض فریب ہے دونوں فرقوں کی سیر و تاریخ کی کتابوں سے بالاتفاق یہ ثابت ہے، اور صحیح بھی ہے کہ احد کی شکست کے بعد جب یہ خبر ملی کہ ابو سفیان شکست و پسپائی پر بہت نادم ہے اور مدینۃ النبی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مقابلہ کے لئے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو متعین کر کے آپ کو رخصت کیا۔ چوتھے سال ہجرت، غزوہ بنی نضیر، میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ تشریف لے گئے۔ چھٹے سال جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بنی لحیان کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کی آمد کی خبر سنکر یہ قبیلہ پہاڑ کی چوٹیوں پر قلعہ بند ہو گیا۔ آپؐ نے دو ایک روز وہاں قیام فرما کر مختلف اطراف میں فوجی دستے روانہ فرمائے، ان میں سب سے اچھا دستہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے زیر کمان تھا، جو کراع الغمیم کی سمت روانہ ہوا۔ غزوہ تبوک کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم، نے اعلان فرمایا کہ لشکری مدینۃ النبی سے نکل کر ثنیۃ الوداع۔ مقام پر جمع ہوں اور ان کے امیر جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں چنانچہ آپ ہی کی صوابدید پر سارے کام انجام پائے! غزوہ خیبر کے موقعہ پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو درد شقیقہ لاحق ہوا، تو قلعہ کا محاصرہ کا معاملہ درپیش تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر قلعہ پر حملہ کا حکم دیا۔ اور اس دن جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی سخت لڑائی لڑی۔ ساتواں سال، آپؐ ہی کو بنی کلاب کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا۔ اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو مع، سالہ آپؐ ہی کی ہمرکابی میں رکھا پھر آپؐ نے بنو کلاب سے جنگ کی، ایک جماعت کو تہ تیغ کیا، ایک جماعت کو قیدی بنایا۔ اور بنو فزارہ پر بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی امیر لشکر تھے۔ چنانچہ حاکم رحؒ نے سلمہ بن اکوع رضؓ سے یہ روایت بیان کی کہ

اَمَّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَا بَكْرٍ فَغَزَوْنَا نَاسًا مِنْ بَنِيْ فَزَارَةَ فَلَمَّا دَنَوْنَا مِنَ الْمَاءِ اَمَرَنَا اَبُوْ بَكْرٍ فَعَرَّسْنَا فَلَمَّا صَلَّيْنَا الصُّبْحَ اَمَرَنَا اَبُوْ بَكْرٍ فَشَنَنَّا الْغَارَةَ اِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْثِ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا چنانچہ ہم نے بنو فزارہ سے جنگ کی جب ہم پانی کے قریب پہنچے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں وہاں شب بسری کا حکم دیا چنانچہ ہم نے وہاں رات گذاری۔ صبح کی نماز کے بعد جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہم نے حملہ کیا۔

معارج اور حبیب السیر میں مسطور ہے کہ غزوہ تبوک کے بعد ایک اعرابی (دیہاتی) نے حضور صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا، عربیوں کی ٹکڑی وادی الرمل میں مقیم ہے جو شبخون مارنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو حضور صلی اللہ وسلم نے جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا ان کو اپنا نشان دیکر اس ٹولی کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا۔

اسی طرح جب بنی عمرو و بنی عوف کی خانہ جنگی ہوئی تو حضور صلی اللہ کو اس کی اطلاع ظہر کے بعد ملی آپ فوراً ہی اصلاح احوال اور صلح و صفائی کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے اور جاتے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرما گئے، کہ نماز کے وقت میں نہ آسکوں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عصر کی نماز جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

نواں سال جب حج فرض ہوا تو اسی سال بعض وجوہ کی بنا پر حضورؐ کا تشریف لے جانا ملتوی رہا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ تاکہ وہاں جاکر خود بھی ادائیگی مناسک حج میں مشغول ہوں اور دیگر موجودہ افراد کو اس عظیم الشان عبادت کے قواعد سے آگاہ کریں، اور سنہ وفات کے ربیع الاول کے عشرہ اول کی، شب پنجشنبہ سے دوشنبہ کی صبح تک کی نمازوں کے لئے نائب مقرر فرمانا۔ تو اتنا مشہور واقعہ ہے کہ محتاج بیان نہیں۔

اب آپ غور کریں کہ وہ دینی امور جن کا تعلق رئیس امام، خلیفہ سے ہوسکتا ہے وہ جہاد، نماز اور حج یہ تین ہی تو ہیں۔ اور ان تینوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موجودگی میں خلیفہ اول جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا۔ اب وہ اور کونسا دینی امر رہ گیا ہے جس میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نیابت، ولایت، یا امامت کی لیاقت و قابلیت نہیں رکھتے تھے،

(۲) ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ جیسے یہ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میں ان کا منصب و درجہ وزیر و مشیر کا تھا۔ کہ اہم دینی امور کے فیصلہ کے وقت آپؐ ان کی موجودگی کو ضروری خیال فرماتے۔ اور ان کی موجودگی ہی میں اس قسم کے امور طے فرماتے اور رسم ریاست اور معمول سلطنت ہی یہی ہوتا ہے کہ بڑے پایہ کے امراء و وزراء کی حاضری دربار میں اہم اور ضروری خیال کی جاتی ہے ان کو عملداری اور فوجداری کے لئے نہیں بھیجتے۔ اور فوجی دستوں پر امیر نہیں کیا کرتے، اس لئے کہ اہم اور بلند مرتبہ امور ان کی غیر موجودگی کے سبب ابتری کا شکار ہوتے ہیں اور یہ وجہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائی۔ چنانچہ حاکم نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے یہ سنا کہ میں چاہتا ہوں کہ دور دراز کی جگہوں پر لوگوں کو دین کی تعلیم و ترویج کے لئے بھیجوں، جیساکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو بھیجا تھا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس توان کے پایہ کے افراد موجود ہیں مثلاً ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّہٗ لَا غِنیٰ لِی عَنْہُمَا اِنَّھُمَا مِنَ الدِّیْنِ کَالسَّمْعِ وَ الْبَصَرِ۔ بات یہ ہے کہ میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتا کیونکہ دین کے لئے یہ دونوں آنکھ، کان کی طرح ہیں۔

علاوہ ازیں حضور صلی اللہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار وزیر مرحمت فرمائے دو اہل زمین سے یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، اور دو آسمان سے یعنی جبرئیل و میکائیل علیہما السلام،

(۳) اگر کسی کی نااہلی کی دلیل ہی یہ ہے کہ اس کو کسی اہم کام کے لئے بھیجا نہ گیا ہو، تو یہ حضرت جناب حسنین رضی اللہ عنہما کے متعلق کیا کہیں گے؟ کہ ان کو بھی جناب امیر علی المرتضیٰ رضی اللہ نے کسی ذمہ داری کے کام سے باہر نہیں بھیجا۔ تو کیا ان کو بھی امامت کا نااہل سمجھتے ہیں؟ جبکہ ان کے علاتی بھائی جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سے کاموں پر مامور فرمایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے والد محترم، آپ ہی کو لڑائیوں اور خطرناک کاموں کے لئے کیوں بھیجتے ہیں اور حسنین رضی اللہ عنہما کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے، آخر اس میں کیا راز ہے؟ اس کا جواب انصاف پسند امام زادے نے اپنی شان شایاں دیا اور فرمایا کہ ہمارے باپ کی اولاد میں جناب حسنین رضی اللہ عنہما ان کے لئے ایسے ہیں جیسے انسان کے لئے دو آنکھیں۔ اور دوسری اولاد ان کے لئے ہاتھ پاؤں ہیں، تو جب تک ہاتھ پاؤں سے کام نکل سکے آنکھوں کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت! اور انسانی فطرت بھی یہی ہے کہ آنکھ پر کوئی

آفت آئے تو بلا اختیار ائمہ اس کی ڈھال بن جاتا ہے۔

اعتراض (۵)۔ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے امور کا متولی بنایا، اور پوری امت کا ان کو خلیفہ بنا دیا، حالانکہ حضور صلی اللہ کے عہد مبارک میں وہ صرف ایک سال کے لئے صدقات کی وصولی پر مامور ہوئے تھے۔ پھر اس خدمت سے معزول ہوئے، اور پیغمبر علیہ السلام کے معزول کردہ کو بحال کرنا اور خدمت سپرد کرنا پیغمبر علیہ السلام کی کھلم کھلا مخالفت ہے!

جواب:۔ یہ اوندھی منطق کسی انتہائی بے وقوف ہی کی طرف سے پیش کی جاسکتی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ معزول کیے گئے! یہ خود کہتے ہیں کہ ان کو وصولی صدقات کی خدمت ایک سال کے لئے سپرد کی گئی تھی۔ جب انہوں نے یہ خدمت ایک سال تک انجام دے کر وہ کام سرانجام دے دیا، اور اپنی ذمہ داری پوری کردی تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ معزول کر دئیے گئے۔ اگر معزول اسی طرح ہوتا ہے تو کیا یہ لوگ بعد موت انبیاء و ائمہ کو بھی معزول سمجھتے ہیں؟

(۲) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معزول ہی مانا جائے تو ان کی معزولی حضرت ہارون علیہ السلام جیسی ہوگی۔ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس تشریف لائے، تو یہ نیابت و خلافت سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن پھر جب مستقل نبی ہوئے تو اس سبکدوشی نے آپکی قابلیت ولیاقت امامت ونیابت میں کوئی نقص پیدا نہیں کیا۔ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں ایسا کیوں نہ سمجھا جائے جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ (میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے) معلوم ہوا کہ ان کی سبکدوشی ان کی لیاقت امامت وخلافت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوئی۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو اس وقت لازم آتی کہ آپ اس کی ممانعت فرما دیتے اور پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کو برسرکار کرتے، اور معاملہ ایسا ہے ہی نہیں۔ اس لئے مخالفت لازم ہی نہیں آتی۔ یہاں تو صورت یہ ہے کہ ایک کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد نہیں فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ ان کے سپرد کیا۔ اگر مخالفت رسول کے یہ معنی ہوں کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو، وہ دوسرے نے کر دیا تو نعوذ باللہ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبرد آزما ہونا بھی مخالفت ہوگی،

اعتراض (۶)۔ یہ اعتراض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں دونوں حضرات کو دیا۔ اگر یہ حضرات سرداری وریاست کی قابلیت رکھتے یا ان میں افضلیت اور اولیت ہوتی تو ان کو سردار بناتے اور دوسروں کو ان کا ماتحت کرتے۔

جواب:۔ اس طعن اور اعتراض کے رد میں کئی پہلوؤں سے گفتگو ہوسکتی اور جواب دیا جاسکتا ہے۔

اول:۔ ان حضرات کو امیر نہ بنانا ان کی عدم لیاقت اور عدم افضلیت کو ثابت کرتا ہے۔ تو لامحالہ ان کو امیر بنانا، ان کی قابلیت اور افضلیت کو ثابت کریگا۔ مگر پہلے تو ایک سوال درپیش ہے کہ کیا شیعہ حضرات عمرو بن عاص اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کی لیاقت امامت اور افضلیت کا اعتقاد رکھتے ہیں؟ اور اسے ماننے کو تیار ہیں؟ اگر ان کا جواب اثبات میں موجود ہو تو اہل سنت کو اس کے جواب کی ضرورت پڑیگی ورنہ نہیں۔

دوم:۔ مفضول کو افضل پر امیر بنانا نہ افضل میں کسی کوتاہی اور برائی کو ثابت کرتا ہے اور نہ مفضول میں افضلیت اور امامت کبریٰ کی لیاقت ہی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اکثر وبیشتر کسی خاص کام میں کسی کو سربراہ بنا دینا کسی خاص جزئی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

یعنی وہ خاص کام سفنتوں ہی کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے، انس کہ وہ شائد ان کا شایاں نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت عمرو بن عاص کی سربراہی میں ہوا۔ کیونکہ وہ جوڑ توڑ اور حیلہ تدبیر اور چکر دے کر کام نکالنے میں مشاق تھے۔ اور مقصد بھی یہی تھا کہ جنگی چالوں اور حیلہ و تدبیر سے دشمن کو مات دی جائے اور اس کا قلع قمع کر دیا جائے ایک دوسری بات یہ بھی کہ وہ دشمنوں کی عیاریوں، چالوں اور گھاتوں کو خوب سمجھتے اور ان کے پوشیدہ راستوں سے بخوبی واقف تھے۔ جبکہ افضل حضرات اتنے واقف نہ تھے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ چور پکڑنے یا راستہ کو خطرات سے پاک کرنے کے لئے، محافظوں اور فوجداروں ہی کا انتخاب ہوتا ہے، امیر الامراء وغیرہ کے سپرد ایسی خدمات نہیں ہوتیں۔ یا کسی خاص کام کی سربراہی میں سربراہ کیلئے تسلی وتشفی مقصود ہوتی ہے جیسے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں، کہ شامی اور رومی افواج کے ہاتھوں ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے، اس لئے ان کو اس مہم کا سربراہ بنایا گیا تاکہ اپنے ہاتھوں ان کا انتقام لیں، اور یوں ان کے دل کو صبر اور قرار آئے،

سوم:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر جن کو ملت اسلام کی سربراہی کی مسند آراستہ کرنی ہے، اور ہزاروں لاکھوں ماتحتوں سے سابقہ پیش آنا ہے، ان کو اس کی بھی تربیت ہو جائے کہ ماتحتی کے زمانہ میں کیا عالم ہوتا ہے، کیا جذبات ہوتے ہیں، کیا مراحل درپیش ہوتے ہیں، اور اپنے سربراہوں کے ساتھ کیا معاملات پیش آتے ہیں، زیردستوں اور ماتحتوں کی کس طرح دیکھ بھال، غور و پرداخت ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں اسی وقت معلوم ہوتی ہیں، جب آدمی خود بھی اس عالم سے گذرا ہو، اور خود بھی کسی کا ماتحت رہ چکا ہو! تو گویا یہ تابعداری اور ماتحتی ایک مرحلہ تربیت و تعلیم ریاضت و سلیقہ امارت تھی! تاکہ ایسے لوگوں کے جذبات وخیالات اور حالات سے واقفیت کی بنا پر آگے چل کر ان سے کام لینے، یا ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کمی و کوتاہی باقی نہ رہے، چنانچہ ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تربیت پائی تھی اسی کا طفیل تھا کہ ہر دو حضرات رضی اللہ عنہما اپنے امراء اور اپنے لشکریوں کو ایسی خوش اسلوبی اور حسن انتظام، کے ساتھ رکھتے تھے کہ جس سے بہتر سے بہتر انتظام اور اچھے ثمرات حاصل ہوتے تھے۔ پیادہ سے لے کر کمانڈر تک اپنے امیر کا وفادار اور ان کے حکم کی بجا آوری میں ہمہ دم مستود اور مشتاق رہتا۔ نہ امراء کے دماغ میں بغاوت و خود مختاری کے جذبات بھڑکتے نہ لشکریوں میں اپنے فرائض سے غفلت و کاہلی و سستی راہ پاتی۔ یا بے رغبتی ظاہر ہوتی۔ نہ امیر اپنے لشکریوں پر ظلم و تعدی کرتے نہ لشکری حکم عدولی کا تصور تک کرتے یا بغاوت کی سوچتے۔ رعایا امن چین سے تھی، اور مطمئن زندگی گذارتی تھی۔ غنائم و فتوحات میں روز بروز اضافہ اور زیادتی تھی۔ یہ حالات و واقعات واقفان فن سیرت پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اور اتنے ہی یقینی جیسے گذرا ہوا کل! ایسے امور واقعیہ میں شیعوں کی کوئی دھاندلی اور ایچ پیچ نہیں چلتے، ان کا زور تو دہمی باتوں یا شیخ چلی کی گھاتوں میں ہی چلتا ہے، کہ اگر یوں ہوتا خوب ہوتا ووں ہوتا تو بہتر ہوتا!

اعتراض (۱۷):۔ اعتراض ہے کہ انتخاب خلیفہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کے خلاف کیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ جبکہ باوجود اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے یہ جانتے تھے کہ کیا بات مصلحت ہے اور کیا فساد ہے، اور پھر آپ کو اپنی امت سے جس قدر شفقت و مہربانی اور رافت تھی وہ بھی ظاہر ہے، مگر اس سب کے باوجود آپ نے اپنی امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

جواب:۔ اول۔ تو یہ بات سفید جھوٹ ہے اور بہتان! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا، کیا شیعہ یہ نہیں کہتے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا۔ (یہ بغض ابوبکرؓ میں اتنے بدحواس ہوئے کہ اپنے پاؤں آپ کلہاڑی مارلی۔ اور بالواسطہ یہ مان گئے کہ جناب امیرؓ کو بھی حضور سے سند امامت حاصل نہیں۔ کیونکہ "کسی

میں جناب امیرؓ یقیناً شامل ہیں۔ ن) لہٰذا اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا تو ان شیعوں کو تو یہ کہتے ہوئے شرمانا چاہیئے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ یہ جواب تو شیعہ معتقدات کی بنیاد پر ہے، اور اگر گفتگو کی بنا معتقدات اہل سنت پر ہو تو محققین اہل سنت نماز و حج میں جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے قائل ہیں۔ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم جو اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رمز شناس آپ کے کاموں کے دقیقہ سنج اور آپ کے اشاروں کے رازدان تھے، ان کے لئے یہ اشارات کافی تھے۔ اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ کو تحریری شکل صرف اس لیے دی کہ آپ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ عرب و عجم کے نو مسلم تصریح و تنصیص کے اور بدون وفاقی عہد نامے کے اس سے واقف نہ ہو سکیں گے۔

دوسرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا صراحت کے ساتھ خلیفہ مقرر نہ کرنا اس بنا پر تھا کہ آپ وحی ربانی، اور الہام سبحانی سے بالیقین یہ جانتے تھے کہ آپ کے بعد جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ ہوں گے۔ برگزیدہ اصحاب اس پر اتفاق کریں گے اور کسی دوسرے کو اس میں دخل اندازی کی تاب و مجال نہ ہوگی۔ چنانچہ اہل سنت کی کتب صحیحہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً۔ فَاَبٰی عَلِیٌّ اِلَّا تَقَدُّمَ اَبِیْ بَکْرٍ (آپؐ نے ابو بکرؓ کی تقدیم کے سوا کوئی صورت قبول نہ کی) یا حدیث یَاْبَی اللّٰہُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَا بَکْرٍ (اللہ اور مسلمان ابو بکرؓ کے علاوہ کسی کو قبول نہ کریں گے)، یا حدیث فَاِنَّہُ الْخَلِیْفَۃُ مِنْ بَعْدِیْ۔ (میرے بعد وہی خلیفہ ہیں)۔ جب یہ یقین تھا تو پھر خلیفہ بنانے اور عہد نامہ لکھنے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ مرض آخری میں آپ نے جناب ابو بکرؓ اور ان کے صاحبزادے کو بلایا بھی تھا کہ اس سلسلہ میں ایک تحریر لکھوا دیں۔ مگر پھر فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اور مسلمان خود بخود سوائے (ابو بکر رضی اللہ عنہ) کے کسی اور کو خلیفہ نہیں بنائیں گے اب لکھنے کی حاجت کیا ہے۔ اس لئے آپ نے ارادہ ترک فرما دیا۔

بخلاف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کہ نہ آپ پر وحی اترتی تھی اور نہ آپ کو اس کا قطعی علم تھا۔ اور نہ ہی قرائن سے اس کا پتہ چلا سکتے تھے کہ لوگ بلا شک و شبہ میرے بعد جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیں گے۔ ہاں آپ اپنی سوجھ بوجھ سے یہ ضرور یقین رکھتے تھے کہ دین و ملت کے لئے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت اصلح اور مفید ہوگی۔ اس لئے یہ بات ان کے لئے بمنزلہ فرض ضروری تھی کہ جس بات میں امت کی بہتری اور صلاح ہے اسکو روبعمل لائیں۔ بحمد اللہ آپ کی عقل سلیم نے صحیح کام کیا کہ شوکت دین، انتظام امور سلطنت اور کافروں کی خواری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جسقدر ہوئی تاریخ عالم اسکی مثال و نظیر پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہے،

تیسرے یہ کہ خلیفہ نہ بنانا ایک الگ بات ہے، اور اس سے منع کرنا الگ بات مخالفت اس وقت تو ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلیفہ بنانے سے منع فرما دیتے اور جناب صدیق رضی اللہ اس کے باوجود خلیفہ مقرر فرماتے، یہ صورت مخالفت کی نہیں ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا وہ کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کر لیا۔ اس تسلیم نہ کرنے کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جناب حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے منتخب فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی ہو۔

اعتراض (۸) — اعتراض کرتے ہیں کہ ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کہتے تھے اِنَّ لِیْ شَیْطَانًا یَّعْتَرِیْنِیْ فَاِنِ اسْتَقَمْتُ فَاَعِیْنُوْنِیْ وَاِنْ زُغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔ (میرے ساتھ ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ہاتھ بٹاؤ، اور اگر ٹیڑھے راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو) اور جس کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہو اور اسے راہ بھٹکا دے وہ امامت کے قابل نہیں۔

جواب :— اول یہ ہے کہ یہ روایت اہل سنت کی معتبر کتابوں کی رو سے صحیح نہیں! اس لئے ایسی روایت سے ان کو الزام نہیں دیا

جا سکتا۔ بلکہ جو صحیح روایت ثابت شدہ ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ وہ یہ کہ اپنی وفات کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلا کر جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی وَاللّٰهِ مَا نِمْتُ فَحَلَمْتُ وَمَا شُبِّهْتُ فَتَوَهَّمْتُ وَإِنِّي لَعَلَى السَّبِيْلِ مَا زِغْتُ وَلَمْ آلُ جُهْدًا وَإِنِّي أُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللّٰهِ۔ بخدا میں نہیں سویا کہ خواب پریشان دیکھتا۔ نہ شبہ میں پڑا کہ توہمات میں الجھتا۔ میں یقیناً سیدھے راستہ پر ہوں، بہکا نہیں۔ میں نے کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میں تم کو بھی اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مسئلہ خلافت طے ہونے پر آپ نے پہلا خطبہ جو دیا وہ یہ تھا۔

"اے رسول کے ساتھیو میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ تو ہوں لیکن دو باتوں کی مجھ سے ہرگز امید نہ رکھنا۔ ایک وحی کی، دوسرے شیطان سے عصمت کی"، آپ کا یہ خطبہ مسند امام احمد، اور اہل سنت کی دوسری کتب میں موجود ہے، اس خطبہ کے آخر میں یہ بھی ہے کہ "و میں معصوم نہیں ہوں۔ پس تم پر میری اطاعت انہیں امور میں فرض ہے جو خدا کی شریعت اور پیغمبر کی سنت کے موافق ہوں۔ ان کے خلاف اگر میں کچھ کہوں تو اسے نہ مانو بلکہ مجھے ٹوکو" اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہے جو سراسر انصاف پرستی ہے۔ چونکہ لوگ ریاست پیغمبر کے عادی تھے، اور اپنی ہر مشکل وحی الٰہی کی طرف رجوع کر کے حل کرتے تھے، اور پیغمبر کی معصومیت کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات بے چون وچرا قبول کیا کرتے تھے، اس لئے اب بدلے ہوئے حالات میں خلفائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ ضروری تھا کہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ یہ دونوں خصلتیں پیغمبر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ انہیں میں پائی جاتی ہیں، ان کے علاوہ کسی میں نہیں۔ چاہے وہ ان کا نائب ہی ہو۔ اور نائب چاہے خود رسول اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا ہو یا امت نے انہیں اپنا امیر اور نائب رسول منتخب کیا ہو!

دوسری بات یہ کہ کلینی میں جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ بطریق صحیح روایات صحیحہ موجود ہیں، "کہ ہر مومن کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اسکو بہکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث میں یہ ارشاد بھی ملتا ہے۔ مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِيْنُهُ مِنَ الْجِنِّ۔ (تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ ایک جن مصاحب مقرر نہ کیا ہو) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کا بھی کوئی شیطان ساتھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں ہے تو پر اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھے غلبہ دیدیا ہے اس لئے میں اس کے شر سے بچا رہتا ہوں، اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور اس کی وجہ سے کار و منصب نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت میں کیوں فرق پڑیگا۔ کیونکہ خلیفہ و امام کا متقی ہونا ضروری ہے اور شیطانی خطرہ متقی کو بھی دامنگیر رہتا ہے۔ لیکن تقویٰ کی برکت سے وہ شیطان کی چالوں کو بھانپ جاتا ہے اور اس کے دام میں آنے سے بچ جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔ بے شک وہ لوگ جو متقی ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے وساوس پیش آتے ہیں تو وہ فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں

ہاں اس شخص کی خلافت و امامت کو ضرور نقصان پہنچتا ہے جو شیطان سے مات کھا جائے اور اس کے پیچھے لگ جائے! اپنی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے۔ اور جو وہ کہے کرے۔ اور پھر توبہ تلا کر کے تلافی بھی نہ کرے ارشاد ربانی ہے وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ۔ اور شیطان کے چیلے (قابو یافتہ کو) گمراہی میں گھسیٹے لئے جاتے ہیں۔ پھر وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ اور یہ مرتبہ ہے فسق و فجور کا جو لیاقت امامت و خلافت میں بالاجماع یقیناً خلل انداز ہوتا ہے!

تیسرے۔ اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا بھی ہو تو اس کے باوجود آپ کے منصب خلافت و امامت میں کوئی فرق نہ

آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، کیونکہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ تو بلا نزاع خلیفہ برحق ہیں اپنے ساتھیوں سے برملا اسی قسم کا کلام فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے یہ اقوال شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں موجود ہیں، ایک قول آپ کا اسی کتاب کے اوراق سابق میں ملاحظہ کر چکے ہیں یعنی

لَا تَكُفُّوا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ اَوْ مَشُورَةٍ بِعَدْلٍ فَاِنِّيْ لَسْتُ بِفَوْقِ اَنْ اُخْطِئَ وَلَا اٰمَنُ ذٰلِكَ مِنْ فِعْلِيْ

حق بات کہنے اور صحیح مشورہ دینے سے باز نہ رہو کیونکہ میں خطا کے صدور سے بالاتر نہیں ہوں اور نہ اپنے کاموں میں اس کے سرزد ہونے پر مطمئن ہوں

اور پھر اس سے کس کو انکار کی مجال ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا تھا۔ اور ان کے ذریعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ ان کے بہکاوے میں آنے کے سبب سے ہی تو آپ جنت سے اس خاکدان تیرہ و تار میں بھیج دیئے گئے تھے۔ حالانکہ وہ خلیفہ تھے اور خلیفہ رسول بھی نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے۔ ان کے پاس تو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی خدائی سند بھی تھی۔

اور کون حضرت داؤد علیہ السلام کے خلیفہ فی الارض ہونے سے منکر ہوگا کہ وہ خلافت پر یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ کی دلیل قاہر رکھتے تھے۔ پھر وہ بھی شیطان کی وجہ سے اوریا کی بیوی کے معاملہ میں کتنے پریشان ہوئے۔ بالآخر تنبیہ الٰہی کا نشانہ بنے اور توبہ استغفار کی نوبت آئی۔ اور کیا کہیں گے وہ راز خوان شیعہ جنہوں نے جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا صحیفہ کاملہ دیکھا ہوگا آپ کی دعا گوش ہوش سے سنی ہوگی کہ آپ اپنے لئے کیا ارشاد فرما رہے ہیں،

قَدْ مَلَكَ الشَّيْطَانُ عِنَانِيْ فِيْ سُوْءِ الظَّنِّ وَضَعْفِ الْيَقِيْنِ وَاِنِّيْ اَشْكُوْ سُوْءَ مُجَاوَرَتِهٖ وَاطَاعَةَ نَفْسِيْ لَهٗ

بدگمانی، اور یقین کی کمزوری کے معاملہ میں شیطان میری باگ پر قابض ہوگیا۔ اور میں اس کے برے پڑوس اور اپنے نفس کے اس کے پیچھے لگ لینے کی شکایت کرتا ہوں

اور اب دونوں حضرات کی عبارات کو میزان عدل میں تول لیجئے، ایک پلڑے میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ یَعْتَرِیْنِیْ اور اِنْ زُغْتُ کو رکھئے اور دوسرے میں جناب سجاد رحمۃ اللہ کے مَلَكَ عِنَانِيْ وَطَاعَةَ نَفْسِيْ رکھئے! اور اسی کے ساتھ اس قضیہ حملیہ کو بھی پیش نظر رکھئے جو آپ کے کلام میں واقع ہے جو نسبت بالجزم بین الطرفین سے وقوع طرفین پر دلالت کرتا ہے۔ (یعنی آپ کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی باگ شیطان نے قبضہ میں لے لی تھی، اور آپ کا نفس اس کی پیروی کرنے لگا تھا۔)

دوسری طرف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قضیہ شرطیہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اِنْ زُغْتُ جو وقوع طرفین کا ہرگز متقاضی نہیں۔ (یعنی آپ بطور شرط فرما رہے ہیں کہ اگر میں کج رو ہو جاؤں۔ اور "کج رو ہو جاؤں"، اور "کج رو ہو گیا" میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہ معمولی فہم شعور رکھنے والے سے بھی پوشیدہ نہیں۔) اور یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ صرف شیطان کے گھات میں لگنے سے کیا نقص و نقصان ہے جبکہ وہ مقصد میں ناکام رہے۔ (اگر آپ کی جیب محفوظ ہے تو کسی جیب تراش کے پیچھے لگنے سے آپ کا کیا نقصان ہے؟) بلکہ یہ تو فضیلت و تعریف کی بات ہے۔ (کہ آپ اتنے بیدار اور چوکنے اور اس کے حربوں سے اتنے واقف تھے کہ وہ عمر بھر سر ٹپکتا رہا مگر آپ کو انگلی تک نہ لگا سکا۔ آپ پر قابو پانا تو دور کی بات ہے۔) اور آخر میں سورہ یوسف میں ۱۳ پارہ کی پہلی آیت کا یہ حصہ اور دیکھ لیجئے وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ۔ میں اپنے نفس کو بری الذمہ نہیں کرتا وہ تو بے شک بری باتوں ہی کا حکم دینے والا ہے ہاں یہ کہ میرا رب رحم فرمائے۔ تقاضائے دین و دیانت تو یہی ہے کہ اس آیت کی موجودگی میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صرف اس کلمہ کے باعث آپ کو منصب خلافت سے نہیں گرانا، اور اس کو موجب طعن و اعتراض نہ بنانا چاہیئے۔ دیگر اسم کو ان سے وفا کی ہے امید۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

اعتراض (۹) نواں اعتراض یہ ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اَلَا اِنَّ بَیْعَۃَ اَبِی بَکْرٍ کَانَتْ فَلْتَۃً وَّقَی اللّٰہُ وَالْمُؤْمِنِیْنَ شَرَّھَا فَمَنْ عَادَ اِلٰی مِثْلِھَا فَاقْتُلُوْہُ۔ (بے شک ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک تھی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کے ضرر سے بچالیا۔ اب اگر دوبارہ کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو) صحیح بخاری کی روایت کے گو الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب ان کا بھی یہی ہے۔ لہٰذا یہ روایت صریح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت، اچانک، بے مشورہ اور بے تامل عمل میں آئی اور بغیر اس کے کہ ان کی بیعت کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی کوئی دلیل دی جاتی ان کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ گویا آپ کی خلافت کی کوئی بنیاد نہیں تھی اور یوں آپ خلیفہ برحق نہ ہوئے۔"

جواب :۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ عمرؓ اگر مر گئے تو میں فلاں شخص سے بیعت کر کے اس کو خلیفہ بناؤں گا، جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی تو شروع میں ایک دو حضرات نے بیعت کی تھی اور خلیفہ ہو گئے تھے اور پھر سارے مہاجرین و انصار ان کے پیچھے ہوئے! صحیح بخاری میں بھی یہ بات مذکور ہے۔ تو دراصل جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا کلام اس شخص کے جواب میں تھا۔ اور اس سے آپ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ایک دو آدمیوں کی اچانک بیعت بغیر غور و فکر اور ارباب حل و عقد سے مشورہ کے درست اور صحیح نہیں۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو ہوا وہ اگرچہ اچانک اور بلا رائے و مشورہ ہوا تھا۔ مگر نتیجۃً وہ متمکن و برقرار رہے اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا گویا حق بحق دار رسید کا معاملہ ہوا اور کوئی ناحق بات نہیں ہوئی،

رہا آپؓ کے معاملہ میں دلائل کا سوال وہ تو پہلے سے موجود تھیں، مثلاً نماز کی امامت سپرد کرنا، اور دوسرے حالی مقالی قرائن جو ان معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ برتتے تھے۔ اور جن سے تمام صحابہؓ پر آپکی افضلیت ثابت ہوتی تھی، ان امور کی وجہ سے کسی دوسرے آدمی کو آپؓ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اگر کوئی دوسرا ایسا کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے! کہ اس نے معروف طریقہ انتخاب کو جو واجب ضروری ہے نظر انداز کیا اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا سبب بنا۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کلام سے شیعوں نے دانستہ ایک جملہ نقل نہیں کیا کہ کہیں ان کے اعتراض کی کمزوری ظاہر نہ ہو جائے۔ آپؓ نے آخر میں وَاَیُّکُمْ مِثْلُ اَبُوْبَکْرٍ۔ (تم میں سے کون ابو بکرؓ کا ہمسر ہے۔) کہ ان سے افضلیت و نیکی و بھلائی میں بڑھا ہوا ہو، اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے حق میں بھی مشورہ، غور و فکر کی حاجت نہیں! پس معلوم ہوا کہ آپ کے الفاظ وَقَی اللّٰہُ شَرَّھَا، کے یہی معنی ہیں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں گو آپ کی خلافت میں عجلت کی گئی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس عجلت کے ضرر سے مسلمانوں کو بچالیا۔ اور یہ عجلت ہی رفع فساد کا سبب بن گئی۔ اور جو خطرہ درپیش تھا وہ وقوع میں نہ آسکا۔ یہ معلوم ہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد نیابت کے سلسلہ میں انصار مدینہ رضوان اللہ علیہم چاہتے تھے کہ یہ منصب انصار کے پاس رہے۔ اس وقت اگر گفتگو بحث و تمحیص، اور مشاورت کی راہ اختیار کی جاتی تو حالات بے قابو ہو جاتے،

یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بیدار مغزی، روشن ضمیری اور دانائی تھی کہ آپ نے فتنہ کے سدباب کے لئے وہ راہ اختیار کی کہ بعد میں موافق و مخالف سب نے اسے محسوس کیا، اسی کو راہ صواب مانا اور رضا و رغبت سے اس بیعت کو قبول کیا اور برقرار رکھا۔ کسی نے اسے ناحق نہیں کہا اور نہ کسی کے خیال و وہم میں یہ بات آئی کہ اس منصب پر کوئی نا اہل مقرر کر دیا گیا ہے۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس قول بالا سے یہ مراد تو ہرگز نہ تھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت صحیح نہ تھی کسی ناگزیر صورت سے بچنے کے لئے اس کو قبول کیا گیا، یا ان کی خلافت درست نہیں تھی۔ کیونکہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت عمرؓ نے

اور جناب ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما دو نوں ہی تھے۔ دوسروں نے پھر اس کے بعد بیعت کی۔ بیعت کے وقت ان دونوں حضرات نے کہا تھا انتَ خَیْرُنَا وَ اَفْضَلُنَا (آپ ہم میں سے بہترین اور افضل ترین ہیں)، اور کسی بھی مہاجر یا انصاری نے اس جملہ کو نہیں جھٹلایا بلکہ تسلیم کیا۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت، نیکی و بھلائی مسلم اور قطعی الثبوت تھی! اور انصار رضوان اللہ علیہم کا اختلاف بھی صرف اسبات پر تھا کہ خلیفہ انصار میں سے بھی ہونا چاہیے۔ اس پر نہ ان کو اعتراض تھا نہ خلاف کہ "ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت کے لائق نہیں"۔ چنانچہ اہل سنت کی صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس مجلس کے بعد آپ سے بیعت کر لی تھی اور خود جناب علی مرتضیٰ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی نہ صرف بیعت فرمائی بلکہ ابتدا میں عدم بیعت کا عذر بھی بیان فرمایا اور شکایت بھی کی کہ ہم سے مشورہ کیوں نہ لیا گیا۔ اور جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صورت حال کا تجزیہ کر کے بتایا کہ انصار کی پرخاش اور حالات کو دگرگوں ہونے سے بچانے کی خاطر یہ عجلت کی گئی تو ان دونوں حضرات نے اس کی تدبیر کی تحسین فرمائی اور اسے مان بھی لیا۔ اہل سنت کے تمام صحاح میں یہ قصہ بطور تواتر اسی طرح منقول و مشہور ہے اور اگر ان شیعوں کو جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر بہت پسند ہے تو تقاضائے شرافت و انصاف ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وہ تمام اقوال جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات یا خلافت کے بارے میں آپ نے فرمائے ہیں وہ بھی قبول کریں۔ انہیں سامنے رکھ کر موازنہ کریں کہ اس قول کو باقی اقوال سے کیا نسبت ہے! ایسی عجیب بات یہ اعجوبہ فرقہ ہی کہہ سکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے معتقد نہ تھے اور اسے درست نہ سمجھتے تھے۔

اعتراض (۱۰) دسواں اعتراض یہ ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ لَسْتُ بِخَیْرِکُمْ وَ عَلِیٌّ فِیْکُمْ۔ علی کی موجودگی میں میں تم میں کا اچھا نہیں ہوں اگر وہ اس قول میں سچے تھے تو قابل امامت نہ ہوئے کہ افضل کے ہوتے مفضول لائق امامت نہیں۔ اور اگر ان کا قول یہ جھوٹ تھا تو بھی قابل امامت نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فاسق امام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

جواب: پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی کسی کتاب میں بھی موجود نہیں۔ نہ بطریق صحیح نہ بطریق ضعیف۔ اب پہلے تو وہ اہل سنت کی کسی کتاب سے یہ روایت کھوج کھاج کے لائیں اور پھر جواب مانگیں۔ شیعوں کی من گھڑت غلط سلط روایات کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا نہ صرف انتہائی نادانی ہے بلکہ ایک قسم کا سفلہ پن بھی ہے۔

دوسری بات یہ کہ چلو شیعوں کی دلداری میں ہم اسے مان لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جناب سجاد رحمۃ اللہ نے اپنے صحیفہ کاملہ میں جو شیعوں کے نزدیک متعدد صحیح و معتبر طریقوں سے مروی ہے یوں فرماتے ہیں۔ اَنَا الَّذِیْ اَفْنَتِ الذُّنُوْبُ عُمْرَہٗ۔ میں وہ شخص ہوں جس کی تمام عمر گناہوں میں گذری۔ اب اگر آپ کا قول سچا ہے تو امامت کے قابل نہ رہے کیونکہ مرتکب گناہ فاسق امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور اگر اس قول میں جھوٹے ہیں تو بھی امامت کے لائق نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فاسق میں امامت کی صلاحیت نہیں۔ اب شیعہ حضرات اس کا جواب دیں اہل سنت کی طرف سے وہی جواب اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے متعلق روایت بالا میں بعض شیعہ علماء نے یہ الفاظ اضافہ کئے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اَقِیْلُوْنِیْ اَقِیْلُوْنِیْ بھی فرمایا جس کے معنے ہیں کہ اپنی بیعت مجھ سے واپس لے لو، گویا آپ خلافت سے استعفیٰ دے رہے ہیں اور جو امامت سے استعفیٰ دے وہ امامت کے قابل نہیں ہوگا۔

اور سرے کی بات یہ ہے کہ اس قول بالا کے ساتھ ساتھ شیعوں کا یہ اعتقاد بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت و نبوت سے استعفیٰ دیا اور یہ نبوت حضرت ہارون علیہ السلام کو سنبھلوا دی تھی۔ ایسی صورت میں اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خلافت سے

استعفیٰ مان بھی لیا جائے تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے استعفیٰ کی طرح ہو گا۔ بلکہ اس سے ہلکا ہی ہو گا کیونکہ نبوت و رسالت پر تو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے فائز ہوئے تھے اس لئے اس سے استعفیٰ زیادہ قبیح اور بُرا ہے، اس کے مقابلہ میں خلافت سے استعفیٰ میں کیا برائی رہ جائے گی جبکہ خود شیعوں کے بقول یہ خلافت لوگوں نے مصلحت وقت کے تحت آپ کو دیدی تھی۔ اور یہ حق بھی نہ تھی۔ خدا نے تو ان کو مامور نہیں فرمایا تھا۔ اور جو ریاست لوگوں کی سپرد کردہ ہو اسکو قبول کرنا اور ہمیشہ ہمیشہ اس پر فائز رہنا ضروری بھی تو نہیں۔ اور جن مسائل یعنی انصار مدینہ کی پرخاش کا دفیعہ مرتدین کا قلع قمع اور مدینۃ النبی کو اعراب کی شورش سے بچانا۔ کی وجہ سے یہ خدمت امامت سپرد ہوئی تھی جب خاطر خواہ ان میں کامیابی ہو چکی اس وقت استعفیٰ میں قباحت کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ امامت وخلافت کی ذمہ داریوں کے بوجھ ومشقت کو بلحاظ دنیا و آخرت برداشت کر لینا کوئی ہنسی کھیل بھی نہیں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مصالح امت کے پیش نظر یہ گرانباری برداشت کر لی تھی۔ فتنوں کے فرو ہو جائے اور امن چین کے بعد اگر انہوں نے چاہا کہ اپنا بوجھ ہلکا کریں اور کسی دوسرے کے کاندھے پر۔ یہ بوجھ ڈالیں اور خود آزادی کی زندگی بسر کریں۔ تو یہ موجب طعن کیوں ہو۔ شیعہ روایات کے مطابق تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بےطمعی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کو خلافت وامامت کا کوئی لالچ نہیں تھا آپ تو اسے اپنے سر سے ٹالنا چاہتے تھے مگر لوگ ہی اس پر راضی نہ تھے۔ عام وخاص سب ہی اس منصب کو آپؓ سے متعلق رکھنے پر مصر تھے۔ یہ بات نہ ہوتی تو آپؓ کی زبان پر یہ الفاظ کیوں آتے ورنہ اقتدار وریاست تو وہ چیز ہے کہ چھوٹوں بھی کسی کو مل جائے تو مر کر بھی اسے چھوڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہو۔ اس کے لئے تو لوگ قریبی تعلق اور رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں، بڑی سلطنت وریاست کی بات رہی الگ ایک گاؤں کی جاگیر بھی ہو تو بھی کوئی اپنی مرضی سے اسے چھوڑ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ ایسی ریاست جو آپ کو حاصل تھی اور دنیا و آخرت کے اعزاز کی حامل تھی، اس کو چھوڑنے اور دوسروں کو دیدینے پر آمادہ ہونا تو آپ کی انتہائی بےطمعی اور زہد کا نتیجہ تھا۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود شیعوں کی معتبر کتابوں اور صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہادت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد آپ خلافت کا منصب سنبھالنے پر تیار نہ تھے لوگوں کی انتہائی اصرار اور مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے بہت زور دینے پر آپؓ نے اسے قبول فرمایا۔ تو اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی لوگوں کی محبت، جانچنے اور اپنی خدمات پر لوگوں کے تاثرات وپسندیدگی معلوم کرنے کے لئے ایسا کیا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے آپ کے منصب خلافت میں کونسا نقص وقصور آگیا۔

اعتراض (۱۱) گیارہواں طعن یہ ہے کہ سورۃ برآت، جب نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مکہ جاؤ، اور حج کے اجتماع میں لوگوں کو یہ سورت سناؤ۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ سورۃ برآت سنانے کی خدمت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیجئے کہ یہ جا کر سنائیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے روانہ کیا اور فرمایا کہ ان سے برآت تم لے لو اور جا کر اہل مکہ کو سناؤ۔

پس جو شخص ایک حکم قرآنی کی آدائیگی کی قابلیت نہ رکھتا ہو اسکو تمام مخلوق کے حقوق کی آدائیگی پر یا پوری شریعت اور قرآن کی احکام رسانی پر کس طرح امین ٹھہرایا جا سکتا ہے اور اسکو امام مانا جا سکتا ہے“

جواب:۔ اس روایت میں عجیب خلط ملط، یا گڑبڑ ہے اس کی بڑی اچھی مثال یہ شعر ہے

چہ خوش گفتہ است سعدی در زلیخا۔ اَلَا یَا اَیُّهَا السَّاقِیُ اَدِرْ کَاسًا وَّنَاوِلْهَا۔ (مطلب شعر یہ ہے کہ زلیخا نامی کتاب میں الا یہا الخ والا مضمون شیخ سعدی نے بہت خوب کہا ہے مگر نہ زلیخا سعدی کی کتاب ہے اور نہ دوسرا مصرعہ اس میں ہے یہ حافظ شیرازی کا

مصرعہ ہے جو دیوان حافظ میں ایک غزل کا مصرعہ اولی ہے۔ (ن) یا اس کی مثال اس فتویٰ کی طرح ہے جو مشہور ہے۔ کہ خشتین معاویہ رضی اللہ عنہ کی تیں لڑکیوں کا کیا حکم ہے۔ اس اشارہ وکنایہ سے قطع نظر اس معاملہ کی تفصیل ملاحظہ ہو! کہ اہل سنت کی روایات اس بارہ میں مختلف ہیں۔ اکثر روایات اس مضمون کی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نیابت کے طور پر امیر حج مقرر فرما کر روانہ کیا تھا۔ اسوقت سورہ برأت نازل نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی روانگی کے بعد یہ سورۃ نازل ہوئی، جس میں مشرکین کے نقض عہد کا ذکر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سورۃ دے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے پیچھے روانہ فرمایا کہ ان تازہ احکامات کو بھی لوگوں تک پہنچا ئیں، اب بھلا اس سے کہاں معلوم ہوا کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول کیا گیا۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ دو کاموں کے لیئے دو حضرات کو نامزد فرمایا۔ ان روایات سے شیعوں کے تمسک کی گنجائش کہاں رہی کیونکہ تمسک کا دارومدار تو جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے معزول ہونے پر ہے اور جب اس کام کے لیئے ان کا تقرر ہوا ہی نہیں تو عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور بیضاوی، مدارک، زاہدی، تفسیر نیشاپوری، جذب القلوب اور مشکوٰۃ کی شروح میں اسی روایت کو اختیار کیا ہے اور اہل حدیث کے نزدیک بھی یہی قابل ترجیح ہے۔ اور تفسیر معالم، تفسیر حسینی، معارج، روضۃ الاحباب حبیب السیر، اور مدراج میں یوں مذکور ہے کہ

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس سورت کی تبلیغ وتلاوت کا حکم فرمایا تھا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کے لیئے نامزد فرمایا اس میں دو احتمال ہیں، اول یہ کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول فرما کر ان کی جگہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا! دوم۔ یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا شریک کار بنایا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں۔ چنانچہ روضۃ الاحباب بخاری ومسلم اور دوسرے تمام محدثین کی روایات اسی دوسری صورت کی روایات کو قوی بتاتی ہیں۔ کیونکہ ان سب نے اتنی بات متفقہ طور پر روایت کی ہے کہ یوم النحر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ جاکر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان و منادی کا حکم دیا تھا کہ لَا یَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا یَطُوْفُ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہیں آئے گا اور نہ کوئی ننگا ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کریگا۔ یہ روایت بتا رہی ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ معزول نہیں ہوئے تھے ورنہ دوسرے کے فرائض میں مداخلت نہ کرتے اور نہ اعلان کنندہ کا تقرر کرتے۔ لہٰذا اس شق میں عزل ثابت نہ ہوں گے سب شیعوں کو اس کا حوالہ دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ اب رہا احتمال اول کہ آپ کا فرمان لَا یُؤَدِّیْ عَنِّیْ اِلَّا رَجُلٌ مِّنِّیْ۔ (میرے ذمہ کی چیز کو وہی شخص ادا کریگا جو مجھ سے ہوگا) بظاہر اس احتمال کو تقویت دیتا ہے۔ نیز نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "سورہ برأت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر تم پڑھو"

تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معزول کرنا بے لیاقتی یا عدم قابلیت پر مبنی صحیح نہیں تھا۔ اس لیئے کہ بالاجماع یہ بات ثابت ہے کہ آپ ؓ امیر الحج بدستور تھے اس منصب سے آپ معزول نہیں ہوئے تھے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ میں جب حج کی سرداری کی لیاقت تھی جس میں ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے اور جس میں بہت سے احکام وفرائض کی ادائیگی سے سابقہ پڑتا ہے، خطبات دیئے جاتے ہیں بے شمار مسائل لکھائے جاتے ہیں، اور گوناگون، نوع بنوع معاملات پیش آنے پر برمہ وقت فتویٰ صادر کرنے پڑتے ہیں جس کے لیئے بہت ہی زیرکی اور سوجھ بوجھ اور وافر علم درکار ہوتا ہے ایسے اوصاف کے حامل میں چند آیات قرآنیہ کو با آواز بلند پڑھ کر سنانے کی قابلیت کیوں نہ ہوگی ایسی خدمت تو ہر قاری اور حافظ باسانی انجام دے سکتا ہے جناب صدیق اکبر ؓ کے اسوقت کے خطبات اور اقامت فرائض کا اسلوب جو آپ سے ظہور میں آیا صحیح نسائی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں متعدد اسناد طرق سے منقول ہے۔

اور اہل سیر کا اس پر اجماع ہے۔ کہ اس سفر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی۔ نمازیں آپ کی امامت میں پڑھیں، اور آدائیگی مناسک حج میں آپ کی پیروی کرتے رہے۔

سیرت واحادیث کی کتابوں میں صحت کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہے۔ کہ جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مدینۃ النبی سے بعجلت روانہ ہوئے اور منازل سفر تیز رفتاری سے قطع کرتے ہوئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جا ملے، تو آپؓ رسول اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کی آواز سن کر بے چین ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود تشریف لے آئے ہوں گے لشکر کو ٹھہرا لیا اور انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پہنچے تو بعد ملاقات دریافت فرمایا اَنْتَ اَمِیْنٌ اَوْ مَامُوْرٌ۔ (آپ بطور امیر آئے ہیں یا حیثیت ماموری قدم رنجہ فرمایا ہے) آپؓ نے فرمایا بطور مامور آیا ہوں۔ بس آپ روانہ ہوئے، اور ترویہ سے ایک روز پہلے (۷ ذی الحجہ) آپ نے خطبہ دیا۔ اور دین و شریعت کے مطابق مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم دی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آیات کی قرأت کا کام ان سے کسی اور وجہ سے واپس لیا ہوگا۔ عدم لیاقت وقصور قابلیت اس کا سبب نہیں ہو سکتا، کیونکہ آسان کام سے معزول کرنا اور اہم و جلیل القدر امور کی انجام دہی کے لئے امارت کا باقی رکھنا ایسی بات ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ والا بھی ایسا نہیں کرتا چہ جائیکہ ایسی ذات گرامی سے جو اعقل الناس تھی یہ وقوع پذیر ہوتی۔ یا حکم الٰہی بھی خلاف حکمت نازل ہوتا (معاذ اللہ)

اور وہ وجہ تھی! کہ عہد توڑنے یا معاہدہ کرنے، اور صلح و جنگ کی بنیاد رکھنے میں اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ ان چیزوں پر سردار قوم یا اسی کا ہم رتبہ، بیٹا داماد وغیرہ کی عدم موجودگی میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اور اسے نامعتبر جانتے۔ ان کے علاوہ کوئی بلند مرتبہ شخصیت بھی ہوتی تو اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے، اور یہ طریقہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری ہے۔ کہ دو گرہوں میں باہم کوئی مناقشہ کھڑا ہو جائے، اور لڑائی جھگڑے اسے نمٹانا ہو تو حالی موالی، دوست احباب، نوکر چاکر سب ہی شامل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر معاملہ صلح و صفائی اور عہد معاہدہ کا ہو تو وہ گروہ کے سردار کی ذاتی شرکت کے علاوہ نہ کوئی طے کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار و اعتماد ہوتا ہے۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ منٰی کی وسیع و عریض وادی میں جہاں لاکھوں کا اجتماع ہے، اور ہر شخص کے کانوں تک سورۃ برأت کے احکام پہنچانے ہیں کتنا سخت محنت اور جفا کشی کا کام تھا! اور یہ کام امیر حج سے کیسے انجام پا سکتا تھا۔ جبکہ ان کے ذمہ اعمال حج کی دیکھ بھال، لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے لوگوں کو بچائے رکھنے، اور احرام کے ٹوٹ جانے اور دیگر جنایات حج کے وقوع پذیری کی روک تھام جیسا اہم امور بھی ہوں اور پھر وقت بھی محدود ہو اور اسی محدود وقت میں قرآنی احکامات لوگوں کے کانوں میں پڑ بھی جاتے ہوں تو لامحالہ دوسرے آدمی کا ہونا لازمی و لابدی ہے۔ اور چونکہ یہ کام بھی اپنی جگہ مہتم بالشان ہے تو وہ دوسرا آدمی عظیم المرتبہ ہی ہونا چاہیئے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس کام کا امیر مقرر فرمایا۔ تاکہ دونوں مہمات بحسن و خوبی انجام پا جائیں۔ اور لوگوں کی نظروں میں یہ کام مقصود بالذات کی حیثیت رکھے۔ اگر برأت خوانی کا کام بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے منادوں سے لینے پر اکتفا کیا جاتا تو لوگوں کو خاص کر مشرک اعراب کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ عہد و پیمان کا مسئلہ پیغمبر علیہ السلام کے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری نہ تھا کہ اس کے لئے آپ نے کوئی مستقل آدمی مقرر نہ فرمایا۔

یہاں باریک بین علمائے اہل سنت نے ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے، کہ یہ موقعہ رحمت الٰہی، اور قہر الٰہی دونوں صفات کے ورود و ظہور کا تھا۔ حج کہ ورود رحمت الٰہی کا منبع و مورد تھا تو کفار کا نقض عہد قہر الٰہی کا مرجع،

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بفرمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ۔ آپ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں

سے امت پر سب سے زیادہ مہربان ہونے کے سبب مظہر صفت رحمت الٰہی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اسد اللہ ہونے کے باعث مظہر صفت قہر الٰہی تھے۔ اس لئے حج کی امارت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالہ ہوئی، تو کفار کے نقض عہد کے انجام بد سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری جناب علی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی تاکہ مجمع پر کہ جس میں مسلمان بھی تھے کفار بھی دونوں صفتوں جمال و جلال الٰہی کا فیضان ہو، مسلمان انوار جمال سے شرابور ہوں۔ تو کفار جلال الٰہی سے ہیبت زدہ، اور پھر مزے کی بات یہ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے بھی معاون و مددگار رہے جیسا کہ بخاری کی روایت بحوالہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ نے ابوہریرہؓ کو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ کیا ہی تھا مگر خود بھی گاہ بگاہ عملاً اس خدمت دین میں حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ ترمذی و حاکم میں بحوالہ ابن عباسؓ ثابت ہے کہ

كَانَ عَلِيٌّ يُنَادِيْ فَإِذَا أَعْيٰى قَامَ أَبُوْبَكْرٍ فَنَادٰى بِهَا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سورہ برأت کا اعلان فرماتے جب آپ تھک جاتے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اعلان کرنے لگتے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ فَإِذَا بَحَّ قَامَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ۔ جب آپ بیٹھ تو ابوہریرہؓ کھڑے ہو جاتے۔ حاصل کلام یہ کہ جناب ابوبکر رضی اللہ سے سورۃ برأت سنانے کی ذمہ داری لے لینے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مسئلہ نقض عہد کو عرب کے قاعدہ کے مطابق ہی انجام دیا جائے تاکہ ان کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو ہمارے آئین و رسم کے بموجب نقض عہد سے آگاہی نہ ہوئی کہ ہم اپنی راہ اختیار کرتے اور اپنا خیال آپ کرتے۔ چنانچہ معالم زاہدی، بیضاوی، شرح تجرید، مواقف، صواعق، شرح مشکوٰۃ اور دوسری کتابوں میں یہی وجہ لکھی ہے۔

اسی لئے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کے ایک ماہر انصاری کو معاہدہ لکھنے کیلئے طلب فرمایا تو سہیل بن عمرو نے جو مشرکین مکہ کا نمائندہ مصالحت تھا۔ بولا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم ہم کسی اور کے لکھے ہوئے معاہدہ کو قبول نہیں کرتے)، یہ معاہدہ تمہارے چچا زاد علی (رضی اللہ عنہ) کو لکھنا چاہیئے اس کا حوالہ مدارج و معالج اور سیرت کی دوسری کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سورہ برأت کی تبلیغ سے معزول فرما دیا۔ مگر ایسے صاحب عدالت کا معزول کرنا جس کی عدالت کی گواہی بیسوں جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قرآنی آیات نے دی ہو، کسی خاص مصلحت ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ یہ عزل ریاست و امامت کی عدم صلاحیت کی بنا پر ہرگز نہ تھا خصوصاً جبکہ اسے نہ وہ خدمت انجام دینے کا موقعہ ملا ہو اور نہ اس سے کوئی قصور یا خیانت سرزد ہوئی ہو، اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک فیصلہ ہے، کہ آپ نے عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو بحرین کی ولایت سے معزول کر دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب خاص تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھی اور حمایتی تھے ذاتی طور پر وہ بڑے عابد و زاہد، امین و عالم، فقیہ و متقی بھی تھے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بطور عذر ایک تحریر بھی دی جو ان شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ اور دوسری صحیح کتب میں موجود بھی ہے۔ کہ

أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّيْ وَلَّيْتُ النُّعْمَانَ بْنَ عَجْلَانَ الزُّرَقِيَّ عَلَى الْبَحْرَيْنِ وَنَزَعْتُ يَدَكَ بِلَا ذَمٍّ لَكَ وَلَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكَ فَقَدْ أَحْسَنْتَ الْوِلَايَةَ وَأَدَّيْتَ الْأَمَانَةَ فَاقْبَلْ غَيْرَ ظَنِيْنٍ وَلَا مَلُوْمٍ وَلَا مُتَّهَمٍ وَلَا مَأْثُوْمٍ۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ میں نے نعمان بن عجلان زرقی کو بحرین کا والی بنا دیا ہے اور تم سے یہ عہدہ لیا ہے لیکن (اس کا سبب) نہ تمہاری کوئی برائی ہے اور نہ تم پر کوئی الزام ہے تم نے حکومت بڑی اچھی طرح اور امانت داری سے چلائی پس تم آجاؤ نہ تم پر کوئی بدگمانی ہے نہ ملامت نہ تم ملزم اور نہ مجرم ہو

اور یہ بات یقینی طور پہ ثابت ہے کہ عمرو بن سلمہ باعتبار دین وحسب ونسب نعمان بن عجلان زرقی سے افضل تھے، کاروبار حکومت بھی انہوں نے بڑے اچھے طریقے اور نہایت دیانت کے ساتھ انجام دیا تھا۔ نہ ان کی کوئی غلطی تھی نہ قصور، نہ عدم قابلیت ! ظاہر ہے کہ اپنا عزل میں سے جب کوئی بات نہیں تھی اور جملہ عیوب وقصور ونقص سے وہ بری تھے تو کوئی خاص مصلحت ہی موجب عزل ہوگی، ادھر اگر جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک قرآنی حکم کی ادائیگی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے تو ایسی صورت میں ان کو امیر حج بنانا کیا معنے رکھتا ہے جبکہ بلحاظ عہدہ و مرتبہ یہ اہم اور عظیم تر منصب ہے۔ اور پھر ایسا کام پیغمبر معصوم صلے اللہ علیہ وسلم سے سرزد ہو۔ ناقابل تسلیم ہے۔ اگر آپ کا عزل واقع بھی ہوا ہے تو اس کی وجہ کوئی مصلحت خاص ہی ہو سکتی، قابلیت ولیاقت کا قصور ہرگز ہرگز نہیں۔

اعتراض (۱۲) بارہواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں سے ورثہ نہیں دیا۔ اس پر بی بی بتول الزہرا رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اے ابوقحافہ کے بیٹے تم تو اپنے باپ سے ورثہ پاؤ، اور میں اپنے بابا جان کا ورثہ نہ پاؤں یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اور آپ کو محروم کرنے کے لئے صرف ایک شخص کی (یعنی اپنی) روایت کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ "ہم انبیاء نہ کسی سے میراث لیتے ہیں اور نہ کوئی ہم سے میراث پاتا ہے" حالانکہ یہ حدیث نص قرآنی یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ۔ (اللہ تعالیٰ تمکو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے) کے خلاف ہے اس لئے کہ حکم قرآنی عام ہے کہ نبی وغیر نبی دونوں کو شامل ہے۔ اسی طرح دوسری نص یعنی کہ وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ (یعنی سلیمان داودؑ کے وارث ہوئے) بھی اسی کے خلاف ہے۔ یا ایک اور آیت وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ۔ (اپنی عنایت سے مجھے ایک ولی (بیٹا) بخشئے جو میرا بھی وارث بنے اور آل یعقوب کا بھی) ان سب سے معلوم ہو کہ انبیاء خود بھی وارث ہوتے ہیں اور ان کے وارث بھی ان سے میراث پاتے ہیں،،

جواب :- اس اعتراض کے دو رخ ہیں ایک ظاہر ایک پوشیدہ، ظاہر تو یہ کہ صرف اپنی روایت پر انحصار کرکے ان کو محروم کر دیا۔ اور پوشیدہ یہ کہ آپ نے بغض وعداوت کی وجہ سے خاتون جنت رضی اللہ عنہا کو ترکہ نہیں دیا یہ بات اعتراض میں کھلے الفاظ میں گو نہیں کہی گئی مگر اعتراض کی اصل بنیاد ان کے نزدیک یہی ہے تو جواب یہ ہے) یہ بات صحیح نہیں کہ آپ نے محض اپنی سنی ہوئی بات کو حجت بنا کر آپ کو میراث نہیں دی۔ یا آپ ان سے بغض وعداوت رکھتے تھے اس لئے ایسا کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ تقسیم ہوتا تو ازواج مطہرات کو بھی حصہ ملتا جس میں خود آپ کی لخت جگر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اپنے رفیق ودوست حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں، تو آپ کو دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن، یا اپنی اور اپنے دوست کی بیٹیوں، یا ان کے باپ بھائیوں سے عداوت تھی کہ ان کو بھی محروم رکھا۔ اور پھر نصف ترکہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آتا تھا۔ اور وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتداء ہی سے آپ کے رفیق ومشیر تھے۔ ان سے کیا عداوت تھی کہ ان کو بھی ترکہ نہ دیا۔ تو معلوم ہوا کہ بغض وعداوت کا الزام غلط، لغو اور ان کا من گھڑت ہے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ صرف اپنی روایت کی بنیاد پر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو ورثہ نہیں دیا ہے۔ بالکل جھوٹ اور صریح دروغگوئی ہے۔ اس لئے کہ اہل سنت کی کتابوں میں اس روایت کے راویوں میں ان حضرات کے اسمائے گرامی موجود ہیں۔ جناب حذیفہ بن الیمان۔ جناب زبیر بن العوام، جناب ابوہریرہ جناب عباس، جناب علی مرتضیٰ، جناب عثمان غنی، جناب عبدالرحمن بن عوف، اور جناب سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم

اجمعین۔ ان حضرات کی جلالت قدر اور عظیم المرتبی سے کون واقف نہیں، پھر ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنکا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے، انہیں عین حیات ہی جنتی ہونے کی بشارت مل چکی تھی! اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود ان کے ملا عبداللہ مشہدی نے اپنی کتاب اظہار الحق میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ مَاحَدَّثَكُمْ بِهٖ حُذَيْفَةُ فَصَدِّقُوْهُ۔ (حذیفہ تم سے جو حدیث بیان کرے اس کی تصدیق کرو۔ یعنی سچ سمجھو) اور ایک راوی ان میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ہیں، جو شیعہ اور سنی دونوں کے بالاجماع عقیدہ کے مطابق صادق ہیں! اگر عائشہ صدیقہ، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کی روایات اس معاملہ میں ان کے نزدیک معتبر نہیں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو یہ کیا کہیں گے؟

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مالک بن اوس بن حدثان النضری سے یوں روایت کی ہے

اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ قَالَ بِمَحْضَرٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ فِيْهِمْ عَلِيٌّ وَّالْعَبَّاسُ وَعُثْمَانُ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَّالزُّبَيْرُ بْنُ الْعَوَّامِ وَسَعْدُ بْنُ وَقَّاصٍ اُنْشِدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِيْ بِاِذْنِهٖ تَقُوْمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ قَالُوا اللّٰهُمَّ نَعَمْ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰى عَلِيٍّ وَّالْعَبَّاسِ فَقَالَ اُنْشِدُكُمَا بِاللّٰهِ هَلْ تَعْلَمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ ذٰلِكَ قَالَا اللّٰهُمَّ نَعَمْ۔

جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے ایک مجمع کو مخاطب کرکے جس میں حضرت علی، عباس، عثمان غنی، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام، اور سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم موجود تھے، کہا کہ میں تم کو اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان برقرار ہیں کہ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم میراث نہیں چھوڑتے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ سب نے فرمایا، بخدا ہاں! پھر آپ نے خصوصیت سے حضرت علیؓ و عباسؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا؟ دونوں حضرات نے جواباً فرمایا بخدا بے شک ایسا فرمایا"

پس معلوم ہوا کہ ان کی حدیث باعتبار قطعیت آیت قرآنی کے برابر ہے، کیونکہ مذکورۃ الذکر اصحاب بالا کی فرداً فرداً روایت موجب یقین ہے چہ جائیکہ اس پوری جماعت کی متفقہ حدیث خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں۔ اور ان کے نزدیک معصوم کی حدیث یقین کرنے میں قرآن کے برابر ہے۔ اور اس سے بھی قطع نظر خود شیعوں کی کتابوں میں ان کے تسلیم کردہ امام معصوم سے اسی قسم کی روایت موجود ہے۔ جنانچہ محمد بن یعقوب رازی نے کافی میں ابی البختری کے حوالہ سے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ وَذَالِكَ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرِثُوْا وَفِيْ نُسْخَةٍ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِرْهَمًا وَّلَا دِيْنَارًا وَّاِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِيْثَ مِنْ اَحَادِيْثِهِمْ فَمَنْ اَخَذَ بِشَيْءٍ مِّنْهَا فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔

بے شک علماء انبیا کے وارث ہیں کیونکہ پیغمبروں کی کوئی میراث نہیں۔ اور ایک نسخہ میں ہے کہ وہ میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے ان کی میراث تو ان کے فرامین و اقوال ہیں جس نے ان میں سے اگر کچھ لے لیا تو گویا بہت بڑا حصہ پالیا۔

اور کلمہ اِنَّمَا کے متعلق شیعہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ قطعاً حصر کے لئے ہوتا ہے جیسا اِنَّمَا وَلِيُّكُمْ کی بحث میں بیان ہو چکا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علم و احادیث کے سوا میراث میں کوئی اور چیز قطعاً نہیں چھوڑی۔ تو انہیں کے امام معصوم کے حوالہ سے ہی مدعا ثابت ہو گیا اور جواب ہی کے سلسلہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ جس شخص نے براہ راست بلاواسطہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث سنی وہ اس کے لئے علم یقینی کی موجب ہے اور اس کے لئے اپنے سنے ہوئے پر عمل کرنا لازم و ضروری ہے، خواہ وہ حدیث کسی اور سے بھی سنے یا نہ

سنے۔ چنانچہ سنی وشیعہ اصولی ہر دو کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث کی تقسیم متواتر وغیر متواتر اس شخص کے لئے ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہو اور آپ کی احادیث دوسروں کے واسطے سے سنی ہوں۔ اور جس نے آپ کی زیارت کی آپ کی زبان مبارک سے حادیث سنی اس کے لئے یہ تقسیم متواتر وغیر متواتر نہیں ہے اس کے لئے تو وہ فرمان متواتر سے بھی بہت اونچا ہے۔ تو اس معاملہ میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زبان نبوت سے براہ راست سن چکے تو اب تفتیش وتحقیق کی انہیں ضرورت ہی کیا رہی!

اب رہا یہ سوال کہ یہ حدیث آیت کے خلاف ہے! تو یہ بھی غلط اور جھوٹ ہے، اور معترض کی ناسمجھی کی دلیل۔ کیونکہ کمیں مخاطب امت ہے، پیغمبر نہیں۔ لہٰذا یہ حدیث تعین خطاب واضح کرنے والی ہوگی آیت کی مخصص نہیں! اور اگر مخصص بھی مانیں تو آیت کی تخصیص تو لازم آئیگی مگر مخالفت نہیں۔ پھر اس آیت سے پہلے ہی بہت سی چیزوں کی تخصیص ہو چکی مثلاً کافر اولاد وارث نہیں۔ رقیق وارث نہیں۔ اور قاتل وارث نہیں۔ اور یہ خود شیعہ بھی اپنے آئمہ سے ایسی روایت بیان کرتے ہیں جس سے بعض وارثوں کو باپ کے ترکہ کی بعض چیزوں سے محروم کر کے ان کو خود دے دیتے ہیں۔ مثلاً تلوار، مصحف، انگوٹھی، بدن کا لباس، کہ بڑا بیٹا ان کو بغیر تقسیم خود لے لیتا ہے۔ دوسرے وارثوں کا جو حصہ ان اشیاء میں بنتا ہے اس سے ان کو محروم کر دیتا ہے!

حالانکہ وہ اس روایت میں تنہا ہیں۔ اور اہل سنت کے نزدیک ان کی عصمت بھی ثابت نہیں۔ اور جناب امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر سلسلہ کے آخری امام تک تمام اہل بیت کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور ان کا عمل اس کی صحت پر مہر ہے! دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ جب ان حضرات کے ہاتھ میں آیا تو کسی بھی وارث کو اس کا حصہ نہیں دیا۔ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد محروم رہی! ازواج مطہرات بھی اپنا حصہ نہ پا سکیں۔ پس اگر پیغمبری ترکہ میں تقسیم میراث جاری ہوتی تو یہ محترم وگرامی قدر حضرات جو شیعوں کے نزدیک معصوم بھی ہیں، ایسی کھلم کھلا حق تلفی کیسے روا رکھتے! کیونکہ علماء حدیث، اور اہل سیر وتاریخ کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متروکہ مثلاً خیبر وفدک یا اور عہد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں حضرت عباسؓ وحضرت علی رضی اللہ عنہما کے دست تصرف میں رہے۔ پھر جناب عباسؓ سے حضرت علیؓ کے قبضہ میں آئے۔ پھر جناب حسنؓ بن علیؓ کے پاس پھر جناب حسینؓ بن علیؓ کے پاس، پھر علیؒ بن حسین اور حسن بن حسن کے پاس اور دونوں اس پر متصرف رہے! پھر زیدؒ بن علیؒ برادر حسن بن حسن کے پاس۔

پھر مروان کے امیر ہونے کے بعد اس کے قبضہ میں آئے، اور مروانیوں کے ہاتھوں منتقل ہوتے ہوئے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے قبضہ میں پہنچے، آپ غایت درجہ منصف مزاج تھے آپ نے صاف کہدیا کہ جس ترکہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری لخت جگر جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا میں اس کا مالک کس طرح ہو سکتا ہوں، میرا اس میں کوئی حق نہیں۔ پس آپ نے یہ ترکہ اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منتقل فرما دیا! پس "ائمہ معصومین" اور اہل بیت کرام کے عمل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ترکہ نبی صلی اللہ علیہ میں میراث کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور آیت میراث نے حدیث مذکور سے تخصیص پائی۔

اب ہم آیت وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ کی بحث کی طرف آتے ہیں، کہ بقول شیعہ یہ آیت اسبات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء خود بھی وارث ہوں۔ اور ان کی میراث تقسیم بھی ہو، مگر یہ مضمون اس حدیث قطعی کے خلاف ہے جو "آئمہ معصومین" سے ثابت ہے۔

اس مشکل گتھی کو حل کرنے کے لئے بھی ہم "قول معصوم" کی طرف رجوع ہوتے اور کتب شیعہ سے اس کا سراغ وجواب تلاش کرتے ہیں کلینی نے جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت بایں الفاظ نقل کی ہے۔ اِنَّ سُلَيْمَانَ وَرِثَ دَاؤدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا وَرِثَ سُلَيْمَانَ۔ سلیمان (علیہ السلام)، داؤد (علیہ السلام)، کے وارث ہوئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلیمانؑ کے وارث ہوئے۔

گویا معلوم ہوا کہ یہ وراثت کمالات نفسانی اور علم و نبوت کی وراثت ہے مال و اسباب متروکہ کی وراثت نہیں ہے۔ قرینہ عقلیہ بھی قول معصوم کی تائید کرتے ہوئے اسی وراثت کا پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ باتفاق مورخین حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس لڑکے تھے۔ قاعدہ میں تو سارے ہی آپ کے وارث ہوتے۔ حالانکہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت و امتیاز کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں حکم فرمایا، تو پتہ چلا کہ وراثت جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو امتیاز حاصل تھا اور دوسرے بھائی اس سے محروم تھے وہ وراثت علم نبوت کی تھی۔ یہ دوسرے بھائیوں کو کہاں نصیب تھی!

پھر ایک بات یہ کہ سب ہی کو معلوم تھا کہ ہر لڑکا اپنے باپ کی میراث پاتا ہے اور اس کے مال کا مالک بنتا ہے تو اس کی خبر دینا تو لغو ہے اور کلام الٰہی لغو پر مشتمل نہیں ہوسکتا وہ اس سے پاک ہے۔ اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسی عام بات بیان کرنا جو تمام عالم میں مشترک ہے ان کے لئے باعث اعزاز کب ہوسکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کو ان کے فضائل و مناقب کے طور پر بیان فرمائے۔ اور اسی آیت کا اگلا حصہ خود بتا رہا ہے کہ اس وراثت سے مراد وراثت علم ہے۔ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ۔ لوگو سنو! ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے! اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ علم کے لئے وراثت کا لفظ استعمال کرنا مجاز ہے اور مال کے لئے اصل و حقیقت تو بلا ضرورت ہم حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی کیوں مراد لیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضرورت سے کہ "معصوم" کا قول جھوٹا نہ پڑے، اس کے علاوہ ہم اسے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ وراثت مال کے حق میں حقیقت ہے، یہ تو فقہا کے ہاں کثرت استعمال کی وجہ سے اس معنے کے لئے مخصوص ہوگئی جیسے منقولات عرفیہ! ورنہ درحقیقت وراثت کا اطلاق علم و منصب پر ہی صحیح ہے اور مجاز بھی مان لیں تو یہ مجاز اتنا متعارف اور مشہور ہے خصوصاً قرآنی استعمال میں کہ وہ حقیقت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چنا تھا ان کو کتاب کا وارث بنایا!

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ۔ پس ان کے بعد والے ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث بنے!

اب آیئے آیت يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ، کی طرف تو بداہت عقلیہ بتاتی ہے کہ یہاں وراثت سے قطعی طور پر وراثت منصب مراد ہے۔ کیونکہ لفظ آل سے مجازاً خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذات مراد ہو تو یہ لازم آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا متروکہ مال و اسباب ان کے زمانہ سے لے کر حضرت ذکریا علیہ السلام کے زمانہ تک جو تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ ہے، غیر تقسیم شدہ باقی و برقرار ہو، اور اب حضرت ذکریا علیہ السلام کی وفات پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا حصہ ان کو پہنچے۔ اور یہ بڑا مغالطہ ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ مال حضرت ذکریا علیہ السلام کی وفات سے پہلے تقسیم شدہ ہو تو وہ مال تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہوا اور یرثنی میں داخل ہوا، اب آل یعقوب کا مال کہاں گیا جس کے یحییٰ علیہ السلام وارث ہوں گے! اور اگر آل یعقوب سے مراد اولاد یعقوب ہو تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل خواہ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں، سب کے وارث حضرت زکریا علیہ السلام ہوں۔ یہ مغالطہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا اس آیت کا حوالہ اس جگہ لانا اسی فرقہ کی جولانی طبع، یا حماقت کی نشانی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے سوال میں دو لفظ فرمائے ہیں۔ وَلِيًّا يَرِثُنِيْ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ایسا ولی طلب فرمایا جو صفت وراثت سے متصف ہو (یعنی اس میں وارث بننے کی قابلیت و صلاحیت بھی ہو) لہٰذا اگر یہاں خاص علمی وراثت مراد نہ ہوگی تو یہ صفت محض لغو و بے کار ثابت ہوگی۔ اور اس کے ذکر کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا۔ کیونکہ بیٹا تمام شریعتوں میں باپ کا وارث ہوتا ہی ہے۔ اور لفظ ولی سے وارث مال بلا تکلف سمجھ جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے نفوس قدسیہ کی تمام تر توجہات

اور مساعی اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول اور منعطف ہوتی ہیں، اس عالم فانی سے ان کے دل کا رشتہ کٹا ہوا ہوتا ہے اسی لیے متاع دنیا
کی طرف نام کو بھی راغب نہیں ہوتے۔ خاص طور پر حضرت زکریا علیہ السلام کی دنیا و متاع دنیا سے ان کی بے تعلقی اور بے اعتنائی
تو مشہور و معروف ہے! ان کے لیے عادتاً یہ محال تھا کہ وہ مال و متاع کی وراثت سے جسکی قدر ان کے نزدیک ذرہ خاک کے برابر بھی نہیں
تھی، خائف ہوں۔ اور اس کے صدمہ، ملال و اندوہ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی جانب میں کریں۔ (کہ اے اللہ مجھے ایسا بیٹا دے جو میرے
مال کا وارث بنے ورنہ یہ مال بے وارث رہ گیا تو غیر مستحقوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ ن) کیونکہ یہ عمل تو مال کی محبت
اور اس سے انتہائی دلی شغف کا پتہ دیتا ہے! (جس کا حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق کوئی بھول کر بھی تصور نہیں کر سکتا)
اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ ڈر اور خطرہ تھا کہ کہیں چچازاد بھائی مال و دولت کو بے جا خرچ نہ کر ڈالیں یا
واہیات اور فضول میں ضائع نہ کر ڈالیں تو اس ڈر اور خطرہ کا یہ موقع ومقام ہی نہیں کیونکہ جب آدمی کی آنکھ بند ہوئی مال وارثوں
کا ہوا۔ اب وہ اس مال کے مالک ہیں جا خرچ کریں یا بیجا۔ ساری ذمہ داری ان کے سر ہے۔ مرنے والے سے اس سے کوئی باز پرس
نہیں ہوگی نہ اسے کوئی سزا ملیگی، دوسرے اگر ان کے دل میں ڈر تھا تو جناب الٰہی میں اس کا عرض کرنا کیا ضروری تھا، اس کا
مداوا اور دفعیہ تو خود ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہ وفات سے پہلے بہت مال و دولت راہ خدا میں لٹا جائے۔ اور صدقہ وخیرات کر دیتے)
اور بدکار وارثوں کو محروم کر جاتے۔ اور انبیاء علیہم کو موت سے آگاہی دی جاتی ہے اور اختیار بھی ملتا ہے تو گویا اچانک موت
کا خطرہ بھی نہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا یہاں وراثت سے حضرت زکریا علیہ السلام کی مراد مال کی وراثت تھی ہی نہیں یہاں تو وہ منصب
کی میراث کے لئے وراثت ملنے کی التجا کر رہے ہیں۔ اور اس خطرہ کے پیش نظر کر رہے ہیں کہ کہیں میرے بعد بنی اسرائیل کے شریر و
بدقماش لوگوں کو (دوارث نہ ہونے کی وجہ سے) ایسا موقعہ اور غلبہ حاصل نہ ہو جائے کہ وہ احکام الٰہی کی تحریف کر ڈالیں ربانی شریعت
میں ترمیم و تنسیخ کرنے لگیں اور میرے علم کی حفاظت نہ کر کے اسپر عمل پیرا نہ ہوں۔ اور یوں دنیا میں عظیم فتنہ و فساد کا دروازہ
کھولدیں۔ اس لیے بیٹے کی دعا کی، کہ وہ میرا وارث بن کر میرے علوم نبوت کی پیروی و اشاعت کا سبب ہوگا احکام الٰہی اس کے ذریعہ
فروغ پائیں گے، خاندان میں یہ سلسلہ ایک نسل کم ازکم اور باقی رہے گا۔ اور یوں انعامات و احسانات الٰہیہ سے مزید بہرہ یاب ہونے
کی سعادت حاصل رہے گی! اجر بھی بڑھے گا۔ اور خاندان میں نبوت کی مدت بھی کچھ طویل ہوگی۔ جو یقیناً ایک اعزاز ہے۔ (معترض اپنی
سوچ اور جذبات پر نبی کی سوچ بوجھ کو قیاس کر کے اعتراض کرتا اور اپنی عاقبت تباہ کرتا ہے مال دولت، جاہ و اقتدار کسی دنیادار
کا مطمع نظر تو ہو سکتے ہیں لیکن نبی کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی ان کی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ نہ وہ مال و دولت کے جھگڑوں
میں الجھتا ہے۔ نہ ان کا طالب ہوتا ہے۔ نہ اسکو باقی رکھنے یا بڑھانے کی خاطر کسی کو جانشین بناتا ہے۔ اور نہ اس ذلیل و گھٹیا کام کے
لیے اللہ سے کوئی وارث طلب کرتا ہے۔ ن)

بعض سمجھ بوجھ سے عاری "علماء" یہ بحث بھی اس موقعہ پر چھیڑ دیتے ہیں کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کو میراث نہ ملتی تھی تو
امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو میراث میں مکان کیوں دے دیئے۔ مگر وہ اتنا بھی نہیں جانتے محترمات کو یہ مکان میراث میں نہیں ملے یہ تو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں نام بنام بنوا کر ان کو مرحمت فرمائے تھے ان کی حیثیت تو ہبہ بالقبض کی تھی۔ اور یہ آپ کی زندگی
میں ان مکانات پر حق ملکیت کے طور پر قابض تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد کسی نے ان کو میراث کے حصہ کے طور پر نہیں دیا تھا، انہیں
محترمات رضی اللہ عنہن کی طرح جناب سیدہ بتول الزہراء کا بھی ایک مکان تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنوا کر دیا تھا۔ ان ہی کی
طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھر بنوا کر دیا تھا۔ اور ان گھروں کے یہ سب حضرات نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حین وحیات مالک متصرف تھے۔

اس دعوے کی دلیل یہ ہے ۔ اور اس پر سنی وشیعہ دونوں کا اجماع ہے کہ جناب حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کی کہ مجھے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن ہونے کی اجازت دے دیں ۔ تو اگر وہ حجرہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت نہ ہوتا تو اجازت کی کیا ضرورت تھی ۔ اس کے علاوہ آیت قرآنی سے بھی ازواج مطہرات کی اپنے مکانوں کی ملکیت وقبضہ کا اشارہ بھی ملتا ہے ۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ ۔ (اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) اگر وہ گھران کے اپنے نہ ہوتے تو خطاب یوں ہوتا وَقَرْنَ فِي بيت الرَّسُوْلِ ۔ (رسول کے گھر میں ٹھہری رہو)

(دراصل بغض وعناد ایسی بیماری ہے کہ وہ آدمی کے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر پر مہر لگا دیتی ہے ۔ اس معاملہ پر اتنا بھی نہ سوچ سکے کہ جس ذات رفیع واعلیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ملک میں کبھی ایک درہم رکھنا بھی گوارا نہ فرمایا وہ ہزاروں کی جائیداد بصورت مکانات اپنی ملکیت میں کیسے رکھ سکتے تھے یا بعد وصال ان کو میراث بنانے کے لئے کیسے چھوڑ کر جا سکتے تھے ! ن) اس پر بات سے بات نکالنے کی عیاشی کرنے مگر بات کو نہ سمجھنے کا تہیہ کئے ہوئے علمائے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات تھی تو تلوار وزرہ اور دُلدل یا اسی طرح کی کچھ اور چیزیں جناب علی رضی اللہ عنہ کو کیوں دی گئیں ۔ لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ یہ عمل ہی یہ بات صاف کر رہا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ کے ترکہ میں میراث نہیں ہے ! اگر میراث ہوتی تو جناب علی رضی اللہ عنہ کس بنا پر حصہ پا سکتے تھے ۔ حصہ پاتیں تو سیدۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پاتیں یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پاتے ۔ یا امہات المومنین پاتیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو حصہ وترکہ پانے والوں میں تھے ہی نہیں ۔ اور آپؓ کو یہ سامان دیا وہ مال وقف کی حیثیت کا دیا ۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز وقف یعنی تمام مسلمانوں کا حق تھی ۔ جس کے لئے خلیفہ وقت کو یہ اختیار ہے کہ اس میں سے جس چیز کا کسی کو اہل یا حاجتمند دیکھے دے سکتا ہے ، لہٰذا جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کو ان اشیاء کا اہل سمجھ کر ان کو عنایت فرمادیں ۔ اسی طرح بعض چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی جناب زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ملیں اور کچھ اور جناب محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو عنایت ہوئیں ۔ یہ عمل بتاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ وارثوں میں تقسیم نہیں ہوا ۔ اور ان کی کم فہمی ہے کہ اعتراض وشبہ میں ایسی بات کہہ رہے ہیں جس سے اہل سنت کی دلیل اور مضبوط ہوتی ہے ۔

اب ان کا ڈھیٹ پن دیکھئے کہ پہلے تو طعن کرتے رہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میراث کا حق بنتے ہوئے بھی میراث نہیں دی اور جب ان کے ائمہ معصومین کے طرز عمل اور ان کی روایات سے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ متروکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری نہیں ہوتی تو اب پینترا بدل کر ایک اور دعویٰ تراشا اور ایک طعن کر ڈالا ۔ ملاحظہ ہو ۔

اعتراض (۳۲) کہ باغ فدک جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہبہ کر دیا تھا ۔ ان کے دعوی کو ناقابل سماعت قرار دے کر انہیں گواہ پیش کرنے کے لئے کہا ۔ اور جب جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے گواہی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کو پیش کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس گواہی کو رد کر دیا اور فرمایا ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ہونی چاہئیں ۔ اس پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض ہوگئیں اور آپؓ سے بول چال بند کر دی حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ (جس نے ان کو غصہ دلایا ۔ اس نے مجھے ناراض کیا)

جواب :- اس اعتراض کا یہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا دعوائے ہبہ اور گواہی میں جناب علی وام ایمن ، یا بروایت دیگر جناب حسنین رضی اللہ عنہم کو پیش کرنے کی روایات افتراء اور جھوٹ ہے ۔ کیونکہ اہل سنت کی کتابوں میں اس معاملہ کی کسی

عنوان کوئی روایت موجود نہیں۔ لہٰذا اس کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا اور ان سے جواب طلب کرنا نادانی اور دھاندلی ہے۔ اہل سنت کی کتابوں میں جو روایت ملتی ہے وہ اس کے برعکس، اور مخالف ہے، چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداؤد جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جناب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو تمام بنو مروان کو جمع کیا اور فرمایا۔

إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهٗ فَدَكٌ فَكَانَ يُنْفِقُ مِنْهَا وَيَعُوْدُ مِنْهَا عَلٰى صَغِيْرِ بَنِيْ هَاشِمٍ وَيُزَوِّجُ مِنْهَا اَيِّمَهُمْ وَاِنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا سَاَلَتْهُ اَنْ يَّجْعَلَهَا لَهَا فَاَبٰى فَكَانَتْ كَذٰلِكَ فِيْ حَيٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وَلِيَ اَبُوْ بَكْرٍ عَمِلَ فِيْهَا عَمَلَ بِمَا عَمِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَيٰوتِهٖ حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ فَلَمَّا اَنْ وَلِيَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَمِلَ فِيْهَا بِمَا عَمِلَا حَتّٰى مَضٰى بِسَبِيْلِهٖ ثُمَّ اَقْطَعَهَا مَرْوَانُ ثُمَّ صَارَتْ لِعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَرَاَيْتُ اَمْرًا مَنَعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ وَاِنِّيْ اُشْهِدُكُمْ اَنِّيْ رَدَدْتُهَا عَلٰى مَا كَانَتْ يَعْنِيْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا۔ آپ اسکی آمدنی خرچ فرماتے ہاشمی بچوں کی غور و پرداخت اور بیواؤں کے عقد وغیرہ میں صرف فرماتے۔ آپ کی بیٹی جناب فاطمہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ آپ فدک (کی آمدنی) میرے لیے مقرر فرمادیں۔ مگر آپؐ نے اس سے انکار فرمادیا۔ اور آپ کی حیات تک فدک کا معاملہ بدستور رہا۔ اور جب جناب ابوبکرؓ والی ہوئے تو انہوں نے بھی اس معاملہ کو اسی طرح رکھا جسطرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہوگیا۔ پھر جناب عمرؓ خطاب والی ہوئے تو آپ نے وہی راہ عمل اختیار کیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابوبکرؓ نے اختیار کی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مروان نے اسے جاگیر بنالیا، اور اب اسی صورت میں یہ میری تحویل میں آیا۔ تو میں نے سوچا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر کو نہیں دیا میرے لیے اس میں حصہ نہیں نہ میں اس کا مستحق ہوں لہٰذا میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسکی پہلی حیثیت بحال کردی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم وجناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں تھی۔

توجب ہبہ کی حقیقت ہی فی الواقع ثابت نہیں ہے تو دعویٰ کا پیش کرنا اور ایسے حضرات کی گواہی دلانا جو شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں اور ہمارے نزدیک بھی صادق و معتبر، ممکن ہی نہ رہا۔ اور اس کی کوئی گنجائش باقی رہی!

اس کا ایک جواب دوسرے پہلو سے یہ ہے کہ شیعہ وسنی دونوں کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ، ہبہ کی ہوئی چیز، جس کی ہبہ کی گئی ہو، وہ اس وقت تک اس کی ملکیت میں نہیں آتی جب تک اس کے قبضہ وتصرف میں نہ آجائے۔ اور یہ بات ہر گروہ کے اجماع سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فدک سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے قبضہ وتصرف میں نہیں آیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ وتصرف میں تھا اور آپؐ اس پر مالکانہ تصرف فرمایا کرتے تھے۔ پس جناب سیدہؓ نے دعویٰ کیا، تو جناب صدیقؓ نے اس کی تکذیب نہیں کی، بلکہ ایک مسئلہ فقہیہ بیان فرمایا کہ صرف ہبہ سے ملک ثابت نہیں ہوتی تاوقتیکہ قبضہ ثابت نہ ہو، قبضہ ثابت ہونے کی صورت میں کسی گواہ وشاہد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور بالفرض جناب امیر المؤمنین وام ایمن رضی اللہ عنہما نے بطریق اخبار اس ہبہ کا اظہار کیا ہوگا۔ تو اس کو شہادت کی تردید کہنا جہالت کی بدترین صورت ہے یہ ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ نہ کرنا ہے۔ ان کی شہادت رد کرنا نہیں ہے۔ اور شہادت تو یہ ہے کہ گواہ پر تہمت لگائیں اور اسے جھوٹا قرار دیں۔ شاہد کی تصدیق کرنا اور چیز ہے اور شہادت کے موافق حکم لگانا اور چیز ہے، یہاں جناب صدیقؓ نے شہادت کی تصدیق تو کی لیکن چونکہ شہادت نامکمل تھی اس

لئے فیصلہ شہادت کی صورت حال پر دیا۔ اور جو اتنا کودن اور بیوقوف ہو کہ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کر سکے اور حکم نہ کرنے کو گواہ یا مدعی کی تکذیب سمجھے، علماء کے نزدیک وہ قابل خطاب ہی کب ہے! قرآنی نص وحکم کے مطابق جب شرعی مسئلہ ہی یہ ہے کہ گواہوں میں دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں نہ ہوں تو کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ تو ایسی صورت میں۔ حکم شرع کی وجہ سے جناب صدیق رضی اللہ عنہ مجبور تھے! حکم وفیصلہ کیسے دے سکتے تھے!

اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کہ مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ۔ اس موقعہ پر لانا لغت عرب سے ناواقفیت اور نادانی کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ اغضاب (غصہ دلانا) یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنے قول یا فعل سے بالارادہ غصہ دلائے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی ایذا رسانی کا قصد تو کیا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، وہ تو بار بار ان الفاظ معذرت سے تعلق خاطر کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ وَاللهِ یا ابْنَةَ رَسُوْلِ اللهِ اِنَّ قَرَابَةَ رَسُوْلِ اللهِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَصِلَ قَرَابَتِیْ، (اللہ کی قسم ہے رسول اللہ کی لخت جگر صلہ رحمی کے لئے مجھے رسول اللہ کی قرابت اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے) جب غصہ دلانے کا آپ سے فعل سرزد ہی نہیں ہوا تو آپ اس وعید کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں! ہاں ہو سکتا ہے کہ بتقاضائے بشریت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا، کو غصہ آیا ہو، مگر وعید اغضاب پر مبنی ہے غضب پر نہیں، اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس سے کیا خوف خطر! اگر وعید کے یہ الفاظ ہوتے مَنْ غَضِبَ عَلَیْهِ غَضِبْتُ عَلَیْهِ (آپ جس پر غصہ ہوئیں میں بھی اس پر غصہ ہوا) تو البتہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے خوف کا مقام تھا۔

اس کے علاوہ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا خانگی معاملات میں کئی بار جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر غصہ ہوئیں۔ ان میں سے ایک موقعہ وہ تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی کو اپنے لئے نکاح کا پیغام دیا، تو سیدہ رضی اللہ عنہا افسردہ و گریاں بابا جان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شاکی ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معاملہ میں خطبہ دیا جس میں فرمایا اَلَا اِنَّ فَاطِمَةَ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ یُؤْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا وَیُرِیْبُنِیْ مَا رَابَهَا فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ (سنو! فاطمہؓ میرے بدن کا ٹکڑا ہیں جس نے اس کو ایذا پہنچائی اس نے مجھ کو ایذا پہنچائی جس نے ان کو فکر وتردد میں ڈالا مجھے فکر وتردد میں ڈالا جس نے ان کو غصہ دلایا اس نے مجھے غصہ دلایا۔ ایک دوسرا موقعہ وہ تھا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہؓ سے ناراض ہو کر گھر سے نکل کر مسجد میں جا کر بغیر کچھ بچھائے ننگی زمین پر سو گئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زہراؓ کے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا اَیْنَ ابْنُ عَمِّكِ (میرے چچا کے بیٹے کہاں ہیں)، جناب سیدہؓ رضی اللہ عنہا نے کہا غَاضَبَنِیْ فَخَرَجَ وَلَمْ یَقِلْ عِنْدِیْ (مجھ سے رنجش کی اور نکل گئے، گھر میں قیلولہ بھی نہیں کیا)۔ یہ دونوں صحیح التبوب اور متفق علیہ روایات ہیں۔ اور یہ بات تو بہت مشہور و واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بتقاضائے بشریت اتنا غضبناک ہوئے کہ بڑے بھائی اور رسول ہونے کے باوجود جناب ہارون علیہ السلام کے سر و ڈاڑھی کے بال پکڑ کر انکو جھنجھوڑ ڈالا۔ حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ دلانے کا کوئی قصد وارادہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ نبی کو غضبناک کرنا کفر ہے۔ اور یہ بات بلاشک درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غضبناک ہوئے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ غضبناک کرنے کا ہوتا تو معاذ اللہ حضرت ہارون علیہ السلام متصف بر رسالت کہاں رہتے!

ایک اور جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا میراث نہ ملنے یا دعویٰ ہبہ تسلیم نہ کئے جانے کے سبب ناراض ہوئیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات چیت بند کر دی۔ لیکن اسی کے ساتھ شیعوں اور سنیوں کی صحیح روایات میں یہ بات بھی تو ثابت ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ بات شاق گذری اور جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر تشریف

لے جاکر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا سفارشی بنایا تاآنکہ سیدہ رضی اللہ عنہا آپ سے خوش دل ہوئیں۔
اہل سنت کی روایات تو مدارج النبوت، کتاب الوفا بیہقی، اور شروح مشکوٰۃ میں موجود ہیں بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح مشکوٰۃ میں یہ مذکور ہے کہ قضیہ کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے (گرمی کا موسم) تھا دروازہ پر دھوپ میں کھڑے ہوئے اور معذرت پیش کی، اور سیدہ آپ سے راضی اور خوش ہوگئیں۔ ریاض النضرہ میں بھی یہ قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور فصل الخطاب بیہقی میں بروایت شعبیؒ یہ قصہ منقول ہے۔ اور ابن السمان نے کتاب الموافقہ میں اوزاعی رحمہ اللہ ... روایت بیان کی ہے کہ گرمی کے ایک دن جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت سیدہ بتول الزہراء رضی اللہ عنہا کے دروازہ پر تشریف لائے۔ اور فرمایا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نور نظر، لخت جگر میں دروازہ سے اسوقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک آپ مجھ سے راضی نہ ہونگی۔ اسوقت حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور آپ کو قسم دے کر کہا کہ ناراضگی ختم کردیں چنانچہ آپ نے اظہار خوشنودی فرمایا اور راضی ہوگئیں۔
اب رہے شیعہ تو ان میں سے زیدیہ بعینہ اہل سنت کی روایات کے مطابق روایت کرتے ہیں۔ اور امامیہ میں سے محجاج السالکین کے مصنف اور دیگر علمائے شیعہ یوں روایت کرتے ہیں۔

اِنَّ اَبَا بَکْرٍ لَمَّا رَاٰی اَنَّ فَاطِمَةَ اِنْقَبَضَتْ عَنْهُ وَ هَجَرَتْهُ وَلَمْ یَتَکَلَّمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِیْ اَمْرِ فَدَكٍ کَبُرَ ذٰلِكَ عِنْدَهٗ فَاَرَادَ اِسْتِرْضَاءَهَا فَاَتَاهَا فَقَالَ لَهَا صَدَقْتِ یَا ابْنَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِیْمَا ادَّعَیْتِ وَلٰکِنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقْسِمُهَا فَیُعْطِی الْفُقَرَاءَ وَ الْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ بَعْدَ اَنْ یُّؤْتِیَ مِنْهَا قُوْتَکُمْ وَالصَّانِعِیْنَ بِهَا فَقَالَتْ اِفْعَلْ فِیْهَا کَمَا کَانَ اَبِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَفْعَلُ فِیْهَا فَقَالَ ذٰلِكَ اللّٰهُ عَلَیَّ اَنْ اَفْعَلَ فِیْهَا مَاکَانَ یَفْعَلُ اَبُوْكِ فَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّ فَقَالَتْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ فَرَضِیَتْ بِذٰلِكَ وَاَخَذَتِ الْعَهْدَ عَلَیْهِ وَکَانَ اَبُوْبَکْرٍ یُعْطِیْهِمْ مِنْهَا قُوْتَهُمْ وَیَقْسِمُ الْبَاقِیَ فَیُعْطِی الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ۔

(یہ محجاج السالکین اور معتبر کتابوں کی عبارت ہے)

جب ابوبکرؓ نے دیکھا کہ فاطمۃ الزہراء نے مجھ سے کبیدہ خاطر ہو کر تعلقات توڑ لیے ہیں اور فدک کے معاملہ میں کوئی بات نہیں اٹھائی تو آپ پر یہ بہت شاق گذرا۔ آپ نے ان کو راضی کرنا چاہا، آپ ان کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ کی صاحبزادی، آپ اپنے دعوے میں سچی تھیں۔ لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی میں سے تم کو اور اس میں کام کرنے والوں کو دینے کے بعد باقی فقیروں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے اس پر جناب فاطمہ نے فرمایا کہ آپ بھی اسی طرح کریں جیسے میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے کہا خدا کی قسم میں تمہارے لئے وہ کام کروں گا جو کچھ تمہارے والد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے تو آپ بولیں بخدا تم ایسا ہی کروگے۔ ابوبکرؓ نے پھر فرمایا بخدا میں ضرور کروں گا اس پر سیدہ فاطمہؓ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ! پس آپ ان سے راضی ہوئیں۔ اور اس پر عہد لیا۔ پھر ابوبکرؓ اس کی آمدنی سے آپ کو دیا کرتے اور باقی کو فقیروں مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کرتے۔

ان کی اسی عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعوے کی تصدیق فرمائی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں تاحین حیات تصرف کرنا اور اس پر قبضہ نہ کرنا انہوں نے ملک کے مخالف سمجھا۔ جیسا کہ پوری امت کے نزدیک طے شدہ بات ہے۔ اب جب (انہیں لوگوں کے حوالہ کے مطابق) جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعویٰ

کی تصدیق فرمادی تو پھر ام ایمن اور جناب امیر رضی اللہ عنہا کے گواہ بنانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ (جس کو اپنے طعن میں بیان کیا) بفضلہ تعالیٰ امامیہ ہی کی روایات سے حق ظاہر ہوگیا، اور یہ لوگ جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر شہادت کے رد اور دعویٰ کے خارج کرنے کی تہمت لگاتے تھے سراسر جھوٹا ثابت ہوئی۔ وَاللّٰہُ یُحِقُّ الْحَقَّ وَیُبْطِلُ الْبَاطِلَ (اور اللہ تعالیٰ حق کو حق ثابت کرتا ہے اور باطل کو باطل) جب علمائے شیعہ نے یہ دیکھا کہ ہبہ والا شوشہ تو ناکام ہوگیا کہ قبضہ کے بغیر جب ملکیت نہیں ہوئی۔ تو اس شرعی مسئلہ پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو کیوں غصہ آیا، اور اس میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کیا قصور، تو ہمارے زمانہ کے شیعی علماء اس دعوے سے بھی منحرف ہوگئے اور ایک دوسرا دعویٰ گھڑ لیا۔ اور ایک اور اعتراض جڑ دیا جو یہ ہے۔

اعتراض ۴) "کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے لئے فدک کی وصیت فرمائی تھی مگر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو فدک پر قبضہ نہیں دیا۔ اور یوں انہوں نے پیغمبر صلی اللہ وسلم کی وصیت کی خلاف ورزی کی"

جواب:— اس کا کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے۔ اول تو معترض جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے وصیت کا دعویٰ، اس کے ثبوت میں اہل سنت یا شیعہ حضرات کی معتبر کتابوں سے بطور شہادت حوالہ سامنے لائیں پھر اس کے جواب کا مطالبہ کریں۔ دوسرے شیعوں اور سنیوں کا اس پر اجماع ہے کہ وصیت اور میراث دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ لہٰذا جس مال میں میراث جاری نہیں ہوگی اس میں وصیت کیسے چلے گی۔ اس لئے کہ وصیت اور میراث دونوں میں موت کے بعد ملکیت منتقل ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام بعد وصال کسی چیز کے مالک نہیں رہتے وہ ملکیت خدا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور بیت المال اس کا نگران ہوتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ۔

اَلْاَنْبِیَاءُ لَا یَشْھَدُوْنَ مِلْکًا مَعَ اللّٰہِ۔ (پیغمبر اللہ کے ہوتے کسی چیز کو اپنی ملک نہیں سمجھتے)، ان کے قبضہ و تصرف میں جو اشیاء ہوتی ہیں، اسے وہ عاریت سمجھتے ہیں اور اسے استعمال فرماتے ہیں، اسی لئے ان پر زکوٰۃ بھی فرض نہیں ہوتی نہ ان کے ترکہ سے قرضہ چکایا جا سکتا ہے۔ اور مال عاریت میں نہ وصیت نافذ ہوتی ہے نہ میراث۔ اور جب "ائمہ معصومین" کی روایت سے انبیاء کرام علیہم السلام کے اموال میں میراث کا جاری نہ ہونا قطعی طور سے ثابت ہوگیا، تو وصیت کا جاری نہ ہونا بطریق اولیٰ ثابت ہوا کیونکہ توریث تو وصیت سے بمراتب قوی تر ہے! اور وصیت اس سے ضعیف تر۔ تیسرے! کسی مخصوص فرد کیلئے وصیت اس وقت درست ہوتی ہے، جب وصیت کرنے والے سے اس سے قبل کوئی بات خلاف وصیت صادر نہ ہوئی ہو۔ اور اس معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی یہ فرما چکے تھے مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ (ہم جو بھی چھوڑیں وہ صدقہ ہے) اس لئے جو آپ کا مال تھا وہ فی سبیل اللہ وقف ہوا۔ اب اس میں وصیت کی گنجائش کہاں رہی۔ چوتھے! ہم وصیت کی بات کو درست بھی مان لیں تو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر یہ معلوم نہ ہوگی اور شاہدوں کے ذریعہ اس کا ثبوت نہ ہوا! تو آپ تو اس میں معذور بھی سمجھے جائیں گے، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے وقت کیا عذر ہو سکتا تھا، کہ آپ نے بھی اس وصیت پر عملدرآمد نہیں فرمایا اور بدستور اس کی آمدنی سابقہ مصارف پر ہی صرف فرماتے رہے! اگر آپؓ نے اپنا حصہ راہ خدا میں دے ڈالا تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کی بہنوں کو اپنی والدہ کی میراث سے کیوں محروم فرمایا

شیعوں نے اس کے چار جواب دیئے ہیں مگر چاروں میں سُقم اور خامیاں ہیں، ہم یہاں سے ان کو بیان کرتے ہیں۔

(۱) اہل بیت غصب کی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیتے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ذاتی مکان فتح مکہ کے بعد غاصب سے واپس نہیں لیا! مگر ان کا یہ جواب غلط اور مغالطہ آمیز ہے اس لئے کہ عہد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ علیہ میں خود انہوں نے جناب باقر رحمہ اللہ کے قبضہ میں فدک دیا۔ اور وہ انہی کے زیر تصرف رہا تا آنکہ خلفائے عباسیہ کا دور آیا اور وہ اس پر قابض و متصرف

ہوئے۔ پھر سنہ ۲۱۰ھ میں مامون عباسی نے اپنے عامل قثم بن جعفر کو لکھا کہ فدک اولاد فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے قبضہ میں دیدے۔ اس وقت امام علیؒ اس پر قابض و متصرف ہوئے، پھر متوکل عباسی نے اس پر قبضہ جمایا۔ تو پھر معتضد نے اپنے عہد میں واپس کر دیا جب مکتفی نے دوبارہ قبضہ کر لیا تو معتضد نے دوبارہ اسکو لوٹا دیا۔ چنانچہ قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے لہٰذا اگر ان شیعوں کا مذکورہ بالا جواب درست ہے تو اہل بیت کے ان قابل احترام بزرگوں نے اسے کیسے قبول کر لیا۔ اور ان کے پاس اس کا کیا جواب و جواز ہے کہ ان کے نزدیک فدک کی طرح خلافت بھی تو غصب کر لی گئی تھی، تو حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اسے کیوں قبول فرما لیا اور جناب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس مغصوبہ شے کو چھین لینے کی ایسی کوشش و سعی کیوں فرمائی کہ جس کے نتیجہ میں آپ کی شہادت تک کی نوبت پہنچی۔

(۲) دوسرا جواب ان کا یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتدا فرمائی کہ فدک سے فائدہ نہیں اٹھایا" یہ جواب بھی سراپا پر خلل ہے۔ کیونکہ دیگر ائمہ اہل بیت نے جناب امیر اور سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتدا کیوں نہیں کی اور فدک کو اپنے زیر تصرف لا کر اس سے کیوں نفع اندوز ہوئے۔ پھر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب سیدہ کی یہ اقتداء فرض تھی یا نفل۔ اگر فرض تھی تو دوسرے ائمہ نے یہ فرض کیوں ترک کیا۔ اور اگر نفل تھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے نفل کی خاطر فرض کیوں چھوڑا۔ یعنی حقدار کو حق پہنچانا۔ اور پھر اقتدا تو کسی شخص کے اختیاری افعال میں کی جاتی ہے نہ کہ اضطراری فعل میں، اگر سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا "ظلم و ستم" کے سبب فدک سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو وہ تو سراسر مجبور تھیں۔ اور مظلومیت و بے بسی میں کسی کی پیروی و اقتداء کے کیا معنی! اور اگر اقتدا بھی کرتے تو خود اس سے فائدہ نہ اٹھاتے، بچوں کو ان کی میراث اور حق سے تو محروم نہ فرماتے۔

(۳) تیسرا جواب، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؓ نے جو اس سلسلہ میں گواہی دی تھی وہ اپنے مفاد کی خاطر نہیں دی تھی بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لئے دی تھی، یہ جواب بھی قباحتوں سے پُر ہے! اول تو یہ کہ جو لوگ جناب امیرؓ کے متعلق اپنے دل میں بدگمانی رکھتے ہوں گے وہ وہی تو ہوں گے جنہوں نے ہبہ و وصیت میں آپ کی شہادت کو رد کیا ہوگا اور ایسے حضرات اب جناب امیرؓ کے عہد میں زندہ ہی کیا تھے! وہ کیسے جان سکتے تھے کہ آپؓ کا فائدہ نہ اٹھانا اس نقطۂ خیال پر مبنی تھا۔ دوسرے یہ کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اولاد اس سے منتفع اور مستفید ہو گئی، تو نواصب و خوارج کو تو یہ بدگمانی کرنے کا تو موقعہ مل جائے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ سب کچھ اپنی اولاد کی خاطر اور ان کو نفع پہنچانے کے لئے کیا۔ خاص کر زمین، ملک اور باغ میں تو انسان اپنے ذاتی نفع سے زیادہ اولاد کا مفاد پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں تقاضائے دور اندیشی یہ تھا کہ اولاد کرام کو وصیت فرما جائے کہ تم اس سے ہرگز ہرگز فائدہ نہ اٹھانا کہ کہیں میری شہادت و گواہی مجروح نہ ہو جائے! اسوقت اولاد کے سامنے بھی دو نظریں ہوتیں اور اسے قبول نہ کرنے کا داعیہ قوی ہوتا۔

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ تقیہ پر عمل کے طریق پر مبنی ہے" مگر اس جواب میں سقم اور خرابی یہ ہے کہ سارے ہی امامیوں کا یہ مذہب ہے کہ جب امام حالت جنگ و قتال میں ہو، یا خروج کے وقت میں ہو تو اس وقت قطعاً تقیہ حرام ہو جاتا ہے اسی لئے جناب حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی تقیہ نہیں کیا یہاں تک کہ راہ خدا میں جان ہار دی! لہٰذا اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تقیہ فرمایا یا تو وہ امامیوں کے نزدیک معاذاللہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے! اور پھر اگر ان تمام باتوں سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو شیخ ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب منہج الکرامہ میں ایک ایسی بات لکھدی ہے جو اس اشکال کی جڑ ہی اکھاڑ سکتی ہے،

اور پھر جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن واعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور وہ یہ ہے اَنَّہٗ لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَۃُ اَبَابَکْرٍ فِیْ فِدَکٍ کَتَبَ لَہَا کِتَابًا وَرَدَّہَا عَلَیْہَا۔ (جب حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فدک کے سلسلہ میں نصیحت فرمائی تو آپؓ نے ایک تحریر لکھ کر جناب سیدہ کو بھیجی اور فدک انہیں کو لوٹا دیا۔ اب اس روایت کو صحیح مان لینے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذمہ جو بھی دعویٰ ہو ہبہ کا ہو یا میراث ووصیت کا۔ ساقط ہو جاتا ہے اور شیعوں کا یہ منہ نہیں رہتا کہ اب وہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر کوئی طعن یا اعتراض کریں۔

البتہ دو شبہے اب بھی شیعہ وسنی دونوں کے دلوں میں کھٹکتے ہیں، اول تو یہ کہ مان لیا جناب سیدہؓ کا دعویٰ جناب صدیقؓ کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ لیکن جناب سیدہؓ کی اگر مرضی اس کو لے لینے میں تھی تو جناب صدیقؓ نے اتنا توقف کیوں کیا، اول ہی مرحلہ پر کیوں نہ دیدیا کہ بات اتنی نہ بڑھتی اور نوبت رنجش تک نہ پہنچتی۔ اور نہ صلح وصفائی کی ضرورت رہتی اس شبہ کو یوں دفع کیا جا سکتا ہے کہ اس مقدمہ میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے خلجان میں پڑ گئے تھے، اگر جناب سیدہؓ کی دلجوئی مقدم رکھتے ہیں تو دین میں دو بڑے رخنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ اس کے بعد لوگ یہ یقین کر لیں گے کہ امور مومنین میں خلیفہ فرق مراتب کرنے اور رعایت سے کام لیتے ہیں۔ کہ لحاظ والوں کو بغیر ثبوت دعوے ہی ان کا حق دیدیتے ہیں جبکہ عام لوگوں سے ثبوت دعویٰ کی خاطر گواہ طلب فرماتے ہیں، اور یہ بدگمانی دین میں اتنے بڑے فساد کا سبب بنتی کہ قیامت تک اس کا تدارک نہ ہو پاتا۔ بعد میں آنے والے حکام وقاضی اپنے دستور العمل میں اسی کو نظیر بنا کر من مانے فیصلے کیا کرتے اور جگہ جگہ ناحق، نرمی وسختی رعایت وجانبداری اس دستاویز کے پیش نظر عمل میں لاتے، دوسرے یہ کہ اگر سیدہ الزہراء رضی اللہ عنہ کو فدک دیدیتے تو لامحالہ آپ کو اس کا مالک بنا دیتے اور وارث کی ملکیت درحقیقت مورث کے ملک ہے۔ کیونکہ یہ اسی کا تو نائب ہے۔ تو اس صورت میں اس زمین کا خاندان نبوت میں واپس لے آنا ہوگا۔ حالانکہ بفرمان رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ۔ یہ صدقۂ رسول تھی۔ اور صدقہ کی واپسی کو آپ نے ایسا بُرا فرمایا ہے گویا کتے کا قے کر کے چاٹ لینا ہوگا۔ تو آپؓ سے ایسی سنگین چوک کیسے ہو سکتی تھی!

یہ دو دینی وجوہات آپ کے پیش نظر تھیں۔ اس کے علاوہ ایک دنیاوی وجہ بھی سامنے تھی کہ سیدۃ الزہراء کا مطالبہ پورا کر دینے کی صورت میں ایسی قسم کے مطالبات حضرت عباس وامہات المومنین رضی اللہ عنہم کی طرف سے بھی اگر پیش ہو جاتے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسی الجھن میں پڑ جاتے کہ کچھ بنائے نہ بنتا۔ ان ہی باتوں کے پیش نظر مجبوراً آپ نے بحکم حدیث نبوی۔ اَلْمُؤْمِنُ اِذَا ابْتُلِیَ بِبَلِیَّتَیْنِ اِخْتَارَ اَہْوَنَہُمَا۔ جب مومن دو بلاؤں میں گھر جاتا ہے تو وہ ان دونوں میں سے جو ہلکی ہو اسے اختیار کر لیتا ہے۔ یہی صورت اختیار فرمائی کہ گو وقتی طور پر ناگوار ہوگا مگر اس کا تدارک ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہو گیا، مگر دوسری صورت کا کوئی تدارک ممکن نہ تھا۔ اور پھر دین میں جو فساد پیدا ہوتا اسکی قیامت تک ذمہ داری آپ کی گردن پر رہتی۔ اس صورت میں یہ شرعی مسئلہ بھی طے ہو گیا کہ بغیر گواہوں کے دعویٰ قابل تسلیم نہیں، اور یہ بھی کہ پیغمبر کے مال میں میراث ووصیت نافذ وجاری نہیں ہو سکتی! اور اپنے اختیار شرعی سے بیت المال کی ملکیت بطور گذارہ بصورت فدک جناب سیدہؓ کو دے کر رنجش وناراضگی کا ازالہ بھی فرمالیا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ جب جناب ابوبکر صدیق وجناب سیدہ رضی اللہ عنہما میں باہمی صلح وصفائی ہو چکی تھی اور دونوں جانب سے کدورت مٹ چکی تھی جیسا کہ شیعہ وسنی دونوں کی روایات سے ثابت ہوا۔ تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ جناب سیدہؓ نے اپنے جنازہ پر جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا آنا گوارا نہ کیا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے آپ کو راتوں رات خاموشی سے دفن کر دیا۔

اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ جناب سیدہؓ کی یہ وصیت خصوصی نہیں تھی عمومی تھی، اور اس کا مبنی غایت جذبۂ ستر پوشی وحیا تھا۔ جیسا کہ صحیح

روایت سے اسکی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اس سے حیا آتی ہے کہ مرنے کے بعد میرا جنازہ (مردوں کی طرح) کھلا سب لوگوں کے سامنے لایا جائے، چنانچہ اس وقت جنازوں کا ایک سا معمول تھا۔ مرد و عورت کے جنازے ایک ہی طرح اٹھائے جاتے تھے۔ آپؓ کی یہ بات سنکر اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ وہاں جنازہ کو کھجور کی شاخوں سے کجاوہ کی طرح بناتے ہیں، جناب سیدہؓ نے فرمایا مجھے بنا کر دکھاؤ۔ جب اسماءؓ نے بنا کر دکھایا تو آپ بہت مسرور ہوئیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے کسی نے آپ کو اتنا مسرور اور اسطرح مسکراتا نہیں دیکھا تھا۔

آپؓ نے اسماءؓ کو وصیت کی کہ تم اور جناب علی رضی اللہ عنہ مجھ کو غسل دینا اور کسی کو میرے پاس نہیں آنے دینا۔ اسی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جنازہ پر کسی کو نہ بلایا۔ ایک قول یہ ہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نے چند اہل بیت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھ کر رات ہی دفن کر دیا، بعض روایات میں یہ ہے کہ دوسرے دن جناب شیخین اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تعزیت کے لئے گئے تو سب ہی نے شکایت کی کہ ہم کو آپ نے خبر کیوں نہ کی کہ ہم جنازہ کی شرکت کا ثواب حاصل کرتے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) وصیت کر چکی تھیں کہ جب میں دنیا سے جاؤں تو مجھے رات میں دفن کرنا تاکہ میرے جنازہ پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔ لہٰذا میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا، (اور کسی کو اطلاع نہیں کی) مشہور روایت یہی ہے۔

فصل الخطاب میں یوں روایت ہے کہ جناب ابوبکر، عثمان غنی، عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم نماز عشاء کے وقت تشریف لائے، اس سے قبل جناب سیدہؓ مغرب و عشاء کے مابین وفات پا چکی تھیں۔ یہ ۳ رمضان سہ شنبہ کی رات تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پورے چھ ماہ گذرے تھے۔ آپ کی عمر مبارک ۲۸ سال تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپؓ (جناب صدیق) پیش امام ہوئے اور چار تکبیروں کے ساتھ آپ نے یہ نماز ادا فرمائی۔

(اختلاف روایات آپ نے ملاحظہ فرمایا، آخری روایت کو اگر فریق ثانی بھی قبول کرے تو طعن و اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اعتراض برائے اعتراض کی روش رکھنے والے حضرات سے ایسی توقع کہ قبول حق کا کھلے دل مظاہرہ کریں۔ خیال خام ہوگا۔ (ن)

اور اس امر پر کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی جنازہ پر عدم حاضری محض وصیت ہی کی بنا پر تھی، کسی کدورت و رنجش کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ایک دلیل عقلی بھی شاہد ہے، کہ کدورت و ناراضگی اس کا سبب ہوتا تو یہی بات مد نظر ہو سکتی تھی کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ آپ کا جنازہ نہ پڑھائیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ باجماع مورخین ہر دو فرقہ شیعہ۔ و سنی۔ جناب حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ جب باہر لایا گیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جناب سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینہ کے عامل تھے اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر میرے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ سنت ہوتی کہ امام جنازہ امیر وقت ہو تو تم کو کبھی آگے نہ کرتا۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ جناب سیدہؓ نے آپؓ کو نماز کی خاطر وصیت کر کے آنے سے نہیں روکا تھا۔ جناب حسین رضی اللہ عنہ خلاف وصیت کیسے کرتے! اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب سعید رضی اللہ عنہ میں جو فرق مراتب ہے وہ ظاہر ہی ہے! اور پھر ابھی کچھ مہینہ ہی کی تو بات تھی کہ سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پدر بزرگوار صلے اللہ علیہ وسلم نے جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تمام انصار و مہاجرین کا پیش امام بنایا تھا۔ اور اس معاملہ میں بڑا اہتمام و تاکید فرمائی تھی! تو اس بات کا احتمال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس واقعہ کو فراموش فرما دیا ہو، اور باباجان صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ امام المسلمین کو اپنے جنازہ کی نماز پڑھانے سے منع فرمایا ہو۔ (یہ سوچ چار پانچ صدی بعد کے کسی امامی کی تو ہو سکتی ہے۔ خیر القرون کے بیت نبوت کے افراد تو کیا ایک عام مسلمان کی بھی نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ سوچے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنکو امام نماز بنایا ان سے نماز جنازہ نہ پڑھوائی جائے۔ ن)

اعتراض ۱۵ پندرھواں اور آخری طعن اصحاب کا یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو شرعی مسائل بھی معلوم نہ تھے۔ اور جس کو شرعی مسائل معلوم نہ ہوں وہ سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک قابل امامت نہیں کیونکہ ان دونوں کے ہاں احکام شرعیہ کا جاننا شرط امامت ہے۔ اور دعوی کے لئے وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) کہ آپ نے چور کے بائیں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور اتنا نہ سمجھ سکے کہ شرع میں حد کے طور پر دائیں ہاتھ کا کاٹنا متعین ہے۔

جواب :۔ اس دلیل کا یہ ہے کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے بائیں ہاتھ کے کاٹنے کا موقعہ دو بار آیا۔ ایک بار جبکہ چور تیسری بار چوری کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ نسائی نے حارث بن حاطب لخمی سے، اور طبرانی و حاکم نے روایت کی ہے، اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک حکم شرعی بھی یہی ہے، اور مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداؤد اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی گئی ہے۔

جِيءَ بِسَارِقٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّانِيَةَ فَقَالَ اقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّالِثَةَ فَقَالَ اقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ ثُمَّ جِيءَ بِهِ الرَّابِعَةَ فَقَالَ اقْطَعُوْهُ فَقُطِعَ۔

ایک چور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے کاٹنے کا حکم فرمایا پس کاٹا گیا۔ پھر دوبارہ لایا گیا آپ نے حکم دیا کاٹو چنانچہ کاٹا گیا۔ پھر تیسری مرتبہ لایا گیا اور آپ نے حکم دیا کہ کاٹو پس کاٹا گیا، پھر چوتھی مرتبہ لایا گیا تو آپ نے پھر کاٹنے کا حکم فرمایا چنانچہ کاٹا گیا۔

اور امام محی السنہ بغوی نے شرح السنہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے بارے میں فرمایا۔

اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا يَدَهٗ ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجْلَهٗ ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا يَدَهٗ ثُمَّ اِنْ سَرَقَ فَاقْطَعُوْا رِجْلَهٗ

کہ اگر کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر بھی چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹو، پھر چوری کرے تو اس کا (دوسرا) ہاتھ کاٹو، پھر (بھی) چوری کرے تو (دوسرا) پاؤں کاٹو۔

اور محی السنہ نے یہ بھی کہا ہے کہ!

اِتَّفَقَ اَهْلُ الْعِلْمِ عَلٰى اَنَّ السَّارِقَ اَوَّلَ مَرَّةٍ يُقْطَعُ مِنْهُ الْيَدُ الْيُمْنٰى ثُمَّ اِذَا سَرَقَ ثَانِيًا يُقْطَعُ رِجْلُهُ الْيُسْرٰى وَاخْتَلَفُوْا فِيْمَا سَرَقَ ثَالِثًا بَعْدَ قَطْعِ يَدِهٖ وَرِجْلِهٖ فَذَهَبَ اَكْثَرُهُمْ اِلٰى اَنَّهٗ يُقْطَعُ يَدُهُ الْيُسْرٰى ثُمَّ اِذَا سَرَقَ رَابِعًا يُقْطَعُ رِجْلُهُ الْيُمْنٰى ثُمَّ اِذَا سَرَقَ بَعْدَهٗ يُعَزَّرُ وَيُحْبَسُ۔ وَهُوَ الْمَرْوِيُّ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ وَهُوَ قَوْلُ قَتَادَةَ وَاِلَيْهِ ذَهَبَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَاِسْحٰقُ بْنُ رَاهَوَيْهِ۔

اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ پہلی مرتبہ چور کا سیدھا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، پھر جب دوسری بار چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جاتا ہے، اور اس کا ایک ہاتھ و پاؤں کاٹنے کے بعد پھر تیسری مرتبہ چوری کرے تو اس بارے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے مگر اکثریت کے نزدیک اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ اور جب چوتھی مرتبہ چوری کرے تو اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے۔ پھر اگر اس کے بعد بھی چوری کرے تو اسے زجر کے بجائے، سزا دی جائیگی اور قید کیا جائے گا ابوبکرؓ سے اسی طرح مروی ہے قتادہ کا یہی قول اور امام مالکؒ و شافعیؒ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مذہب ہے۔

پس جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم، فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہے تو طعن و اعتراض کی گنجائش کہاں رہی۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر فقہ حنفی کی آڑ میں الزام دینا حماقت کے سوا کیا ہے! اور دوسری مرتبہ آپ نے بایاں ہاتھ اسوقت کاٹنے کا حکم دیا جب آپ کے سامنے ایسا چور پیش ہوا جس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں چوری کی حد میں پہلے سے کٹا ہوا تھا اس واقعہ میں بھی اکثر علماء کا یہی مذہب ہے کہ اسوقت اس کا بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیئے! جناب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مؤطا میں بروایت

عبدالرحمٰن بن قاسم رحمہ اللہ نے یہ قصہ نقل کیا ہے، جنہوں نے اسے اپنے باپ سے سُنا۔ کہ یمن کا ایک شخص جس کا ایک ہاتھ، بایاں پاؤں کٹا ہوا تھا، جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بطور مہمان آیا اور آپؓ کے گھر پر ٹھہرا۔ یمن کے عامل کی شکایت کی کہ اس نے بلاقصور مجھ پر ظلم کیا اور میرا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالا، وہ رات کا اکثر حصہ نوافل و تہجد میں گذارتا۔ جسے دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ بھی کہہ اٹھے کہ تیری رات تو چوروں کی سی رات نہیں لگتی۔ انہیں دنوں آپؓ کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیسؓ کا ایک زیور گم ہوگیا۔ معلوم ہونے پر سب اہل خانہ اسکو تلاش کرنے لگے چراغ جلا کر کونے کھدرے دیکھے گئے کہ کہیں ادھر اُدھر نہ گر پڑا ہو، اور وہ لنجا، لنگڑا مہمان بھی تلاش کرنے والوں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ اور یہ بھی کہتا جاتا کہ خدا اس ظالم کو سزا دے جس نے چوری کر کے بھلے اور نیک لوگوں کے گھر کو غم و فکر سے بھر دیا۔ بالاخر تھک ہار کر اور مایوس ہو کر لوگوں نے تلاش ختم کردی۔ چند روز بعد وہی زیور ایک سنار کے ہاں پکڑا گیا، تفتیش پر اس نے بتایا کہ ایک لنگڑا لنجا شخص مجھے فروخت کر گیا ہے۔ آخر کار اس چور نے بھی اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ تب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کا اپنے آپ بددعا دینا مجھے اسکی چوری سے زیادہ ناگوار لگتا تھا! ان دو واقعات و روایات کے علاوہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہو۔ اور ان کے بارے میں بھی معلوم ہوگیا کہ آپ نے کوئی غلط حکم نہیں دیا تھا۔ اس لئے آپؓ پر طعن و اعتراض کا کوئی جواز نہیں۔ یہ سراسر تعصب و عناد پر مبنی ہے!

(۲) دوسری دلیل (طعن ۵ کے سلسلہ کی) یہ ہے، کہ آپ نے لواطت کے مجرم کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سزا زندہ جاندار کو آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے۔

جواب:— اس کا جواب مختلف عنوانات سے دیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ لوطی کو جلا دینے کا قصہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ روایت ضعیف ہے جس کو اہل سنت کو الزام دینے میں حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صحیح روایت وہ ہے جو سوید بن غفلہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔ اِنَّهُ اَمَرَ بِهٖ فَضُرِبَ عُنُقُهٗ ثُمَّ اَمَرَ بِهٖ فَاُحْرِقَ۔ آپ کے حکم سے اس کی گردن ماری گئی۔ پھر آپ نے حکم دیا تو اس کو جلا دیا گیا۔ اور مردہ کو عبرت کی خاطر جلا دینا درست ہے۔ جس طرح مردہ کو عبرت کی خاطر سولی پر کچھ عرصہ کے لئے لٹکا رہنے دینا۔ کیونکہ مردہ کو تو اس عذاب کا کچھ احساس نہیں ہوتا، دکھ درد کا مدار تو حیات پر ہے۔

اور مرتضیٰ کو جو شیعہ علماء میں چوٹی کا شمار ہوتا ہے اور علم الہدیٰ کے لقب سے مشہور ہے، اس روایت کے صحیح ہونے اور پہلی روایت کے غلط ہونے کا معترف ہے۔ تو جو روایت نہ اہل سنت کے نزدیک صحیح ہے نہ شیعوں کے نزدیک، ایسی روایت کو طعن کا مدار ٹھہرانا نہ دلیل اقناعی ہے (یعنی نہ دل کو تسکین دیتا ہے) نہ دلیل الزامی ہے،

دوم یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ایک خاص شخص کو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جلوا دیا۔ لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا، ایک واقعہ میں تو ایک پوری کی پوری جماعت کو آپؓ نے حوالہ آتش کرنے کا حکم فرمایا۔ دوسری مرتبہ زندیقوں کی ایک بڑی جماعت کو جلا دینے کا حکم دیا جن کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہوگئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے تھے چنانچہ اہل سنت کی اصح الکتب بعد کتاب اللہ، یعنی بخاری میں جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت ہے۔ اُتِیَ عَلِیٌّ بِزَنَادِقَةٍ فَاَحْرَقَهُمْ فَبَلَغَ ذٰلِكَ ابْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ لَوْ كُنْتُ اَنَا لَمْ اُحْرِقْهُمْ لِاَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰهِ۔ علی (رضی اللہ عنہ) کے پاس زندیق لائے گئے، آپ نے ان کو نذر آتش کر دیا۔ جب یہ خبر (حضرت) ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کو پہنچی تو آپ نے فرمایا، میں اگر ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کے عذاب کی طرح عذاب نہ دو! پھر ایک اور مرتبہ بھی ایسے دو آدمیوں کو زندہ جلوا دیا جو باہم لواطت کے جرم میں پکڑے گئے تھے۔

چنانچہ مشکوٰۃ میں بحوالہ رزین، جناب ابن عباس وجناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ۔ وہ لعنت زدہ ہے جس نے قوم لوط جیسا فعل کیا۔ اور ایک روایت میں جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اِنَّ عَلِیًّا اَحْرَقَهُمَا۔ (جناب علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو جلوا دیا۔

اور اس فرقہ کے بغض وعناد اور تعصب کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بعید بھی نہیں لگتا کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے متعلق اہل سنت کی ان روایات سے انکار ہی نہ کر بیٹھیں۔ حالانکہ خود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں ضعیف و مردود روایات کو بھی مدار طعن بنا ڈالا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ خود شیعوں ہی کی معتبر کتابوں سے اس مضمون کی روایات سامنے لائی جائیں۔ شریف مرتضیٰ نے جو ان کا علم الھدیٰ ہے کتاب تنزیہہ الانبیاء والائمہ میں ایک روایت بیان کی ہے۔ اِنَّ عَلِیًّا اَحْرَقَ رَجُلًا اَتٰی غُلَامًا فِیْ دُبُرِهٖ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو جلوا دیا جس نے ایک لڑکے کے ساتھ اغلام کیا تھا۔ اس روایت کے پیش نظر اب شیعوں کا کیا منہ ہے کہ وہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کریں۔ کیونکہ اب تو ان کے فعل کی ایک "معصوم" کے عمل سے تصدیق ہو گئی!

سوم:۔ روایات اہل سنت سے ثابت ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ اور کہنے سے لوطی کو جلایا تھا۔ چنانچہ بیہقی نے شعب الایمان میں اسکی تخریج کی۔ اور ابن ابی الدنیا سے صحیح اسناد سے محمد بن المنکدر سے اسکی روایت کی اور واقدی نے اپنی کتاب الرِّدَّۃ کے آخری ردہ بنی سلیم میں اس کو نقل کیا ملاحظہ ہو۔

اِنَّ اَبَا بَكْرٍ لَمَّا اسْتَشَارَ الصَّحَابَةَ فِیْ عَذَابِ اللُّوْطِیِّ قَالَ عَلِیٌّ اَرٰی تُحْرِقُ بِالنَّارِ فَاجْتَمَعَ رَأْیُ الصَّحَابَةِ عَلٰی ذٰلِكَ فَاَمَرَ بِهٖ اَبُوْ بَكْرٍ فَاُحْرِقَ بِالنَّارِ۔

جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو لوطی کی سزا کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ اسکو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس رائے پر متفق ہو گئے پس جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم صادر فرمایا اور وہ جلا دیا گیا۔

بعض شیعہ راویوں نے مغالطہ دینے کے لیے جو یہ کہا ہے کہ فجاۃ سلمی کو جو راہزن تھا جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلوا دیا اور وہ جل گیا۔ سراسر غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ شجاع بن زبرقان کو جو لوطی تھا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رائے سے جلا دینے کا حکم فرمایا تھا۔ اور اگر بالفرض بطور نظام مملکت راہزن کو جلا دینے کا حکم فرمایا تو یہ طعن کا سبب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کا فعل معصوم کے فعل کے مطابق تھا۔

(۳) تیسری دلیل انہوں نے یہ دی کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جدہ (دادی) اور کلالہ کا مسئلہ معلوم نہ تھا کیونکہ دوسروں سے معلوم کرتے۔

جواب:۔ یہ ہے کہ اعتراض وطعن اہل سنت پر موجب الزام نہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک بالفعل تمام احکام کا جاننا امامت وخلافت کے لیے شرط نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد اور ملکہ استنباط ضرور شرط ہے۔ اور مجتہد کا یہی کام ہے کہ اول وہ نصوص تلاش کرتا ہے احادیث کی چھان بین کرتا ہے، اگر نص موجود ہو تو اس کے مطابق فتویٰ صادر کرتا ہے۔ اگر نص موجود نہیں پاتا تو ملکہ استنباط سے کام لے کر مسائل مستنبط کرتا ہے، جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نصوص تدوینی شکل میں موجود نہیں تھیں اور احادیث کی روایات نے بھی شہرت نہیں پائی تھی اس لیے بوقت ضرورت مجبوراً صحابہ کی سنی ہوئی روایات کی جستجو فرماتے۔

قَالَ فِیْ شَرْحِ التَّجْرِیْدِ اَمَّا مَسْئَلَةُ الْجَدَّةِ وَالْكَلٰلَةِ فَلَیْسَتْ بِدْعًا مِنَ الْمُجْتَهِدِیْنَ اِذْ یَبْحَثُوْنَ عَنْ مَدَارِكِ

شرح تجرید میں بیان کیا ہے کہ جدہ اور کلالہ کا مسئلہ مجتہدین کے لئے کوئی انوکھا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دلائل احکام پر بحث کرتے

الاحکام ویسألون لوسن من احاط به علماً ولهذا رجع علیؓ فی بیع امہات الاولاد الی قول عمرؓ وذلک لا یدل علی عدم علمہ۔

رہتے ہیں اور جس کو کوئی بات معلوم ہو اس سے دریافت کرتے ہیں۔ اسی لیے حضرت علیؓ نے امہات الاولاد کی بیع کے معاملہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے قول کی طرف رجوع کیا۔ اور یہ آپ کی علمی کوتاہی پر دلالت نہیں کرتا۔"

جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی تحقیق وتفتیش تو یہ صاف بات بتاتی ہے کہ احکام دین میں آپ کو کتنی احتیاط ملحوظ تھی۔ اور یہ کہ آپ قوانین شریعت میں شرائط کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جدہ کا مسئلہ ظاہر کیا تو آپؓ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور بھی روایت ہے۔ یہ آپ کی احتیاط تھی ورنہ روایت میں تعدد شرط نہیں ہے۔ حقیقت میں تو یہ طرز عمل قابل ستائش تھا مگر برا ہو تعصب وعناد کا کہ ان کو تعریف و توصیف بھی قابل طعن نظر آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

چشم اندیش برکندہ باد؛ عیب نماید ہنرش در نظر! (بداندیشی کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے)

اگر اس سلسلہ میں کوئی شیعہ یہ کہے کہ امام کے لیے صرف اجتہاد کو کافی سمجھنا تو اہل سنت کا مذہب ہے ہمارے نزدیک تو تمام مسائل شرعیہ کا بالفعل جاننا امام کے لئے شرط ہے، تو ہم انہیں یاد دلائیں گے کہ جب تم نے مطاعن کی بنیاد اہل سنت کے مذہب پر رکھی ہے تو لامحالہ اس سلسلہ میں ان کی قرارداد بھی تسلیم کرنی چاہیئے، ورنہ پھر اہل سنت کے نزدیک جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نفی جو اس باب کا موضوع ہے ثابت ہی نہ ہو سکے گی! اور اس کی ساری تگ ودو لاحاصل رہیگی۔ اور اگر یہ زبردستی اور دھاندلی پر ہی اتر آئیں تو ہم انہیں کے اصول پر بھی ان کو جواب دے سکتے ہیں، لیجئے ملاحظہ کیجیئے!

جواب دوم:— اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مسئلہ جدہ وکلالہ معلوم نہیں تب بھی ان کی خلافت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ کیونکہ شیعی روایت کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے حالانکہ آپ بالاجماع امام برحق تھے۔

چنانچہ عبداللہ بن بشر نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ان علیاً سئل عن مسئلۃ فقال لا علم لی بھا ثم قال وابردھا علی کبدی سئلت عما لا اعلم۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ اور پھر فرمایا میں اپنے دل کو مطمئن پاتا ہوں کہ مجھ سے وہ بات پوچھی گئی جسے میں نہیں جانتا (یعنی مجھے اس سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی کہ جو مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا اس کا مجھے علم نہ تھا) سعد ابن نصر نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے! اسی طرح جناب امام ناطق بحق "جعفر صادق رحمہ اللہ علیہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے! جیسا کہ امامیہ میں کے صاحب قرب الاسناد نے اسمٰعیل بن جابر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے۔

قلت لابی عبد اللہ فی طعام اھل الکتب فقال لا تاکلہ ثم سکت ھنیھۃ ثم قال لا تاکلہ ثم سکت ھنیھۃ ثم قال لا تاکلہ ولا تترکہ الا تنزھا ان فی اٰنیتھم الخمر ولحم الخنزیر

میں نے ابی عبداللہؒ سے اہل کتاب کے کھانے سے متعلق بات کی تو آپ نے کہا مت کھاؤ، پھر تھوڑی دیر سوچا اور کہا مت کھاؤ، پھر کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا مت کھاؤ، اور یہ ترک طعام بطور احتیاط ہے، اس لئے کہ ان کے برتنوں میں شراب اور سور کا گوشت ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے طعام کے متعلق آپ کو حتمی جواب معلوم نہ تھا اسی لئے بہت غور وخوض کے بعد بھی حکم صریح معلوم نہ ہو سکا لہٰذا ناچار احتیاط پر عمل کرنے کو فرمایا!

مطاعن عمرؓ

سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر شیعوں نے گیارہ طعن توڑے ہیں۔ ان میں سے ان کے خیال میں قصہ قرطاس والا طعن بڑا وزنی ہے۔ آپ بھی دیکھئے!

اعتراض (۱) بروایت بخاری و مسلم (رحمہما اللہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری مرض میں بروز جمعرات وصال سے چار روز پیشتر مکان میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قلم دوات اور کاغذ میرے پاس لاؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھدوں جس سے تم میرے وصال کے بعد نہ بہکو! حاضرین اسکی تعمیل میں مختلف الرائے ہوئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (حاضرین سے مخاطب ہو کر) بولے ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب قرآن موجود ہے اور وہ ہم کو کافی ہے، اسوقت حضور صلے اللہ علیہ پر مرض کی شدت تھی۔ بعض حضرات نے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی تائید کی، اور بعض نے یہ کہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرما رہے ہیں تو لے آؤ۔ اس پر باہم جو گفتگو ہوئی اس میں بلند آواز کی وجہ سے شور و شغب کی صورت پیدا ہوئی۔ اسی گفتگو کے دوران بعض نے یہ بھی کہا کہ مرض کی شدت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمادیا، شاید کچھ اور فرمانا چاہتے ہوں گے، اس لیے بات کو واضح طور پر سمجھ لینے کی خاطر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس فرمان سے آپ کا کیا ارادہ ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تم میرے پاس سے اٹھ جاؤ، کیونکہ رسول اللہ کے روبرو شور شغب (بحثا بحثی) مناسب نہیں۔ غرض اسی بحثا بحثی اور تنازع کے سبب اس تحریر کا معاملہ آیا گیا ہو گیا۔ (اور بعد میں مرض کی کیفیت دگرگوں ہونیکے سبب اس کا موقعہ نہ آیا) تو یہ ہے اہل سنت کی صحیح روایات کے مطابق قصہ قرطاس جس میں اپنی عادت اور خواہش کے مطابق شیعوں نے رنگ آمیزی کر کے کیا سے کیا بنادیا۔ اس قصہ میں انہوں نے چند پہلو نکال کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر طعن و اعتراض کیے ہیں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد کیا جو بحکم آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ (وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے، وہ وہی فرماتے ہیں جنکی وحی کی جاتی ہے) سراسر وحی تھی، اور وحی کو ٹھکرانا سراسر کفر ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (جو خدا کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بھی کہا کہ آپ کو ہذیان اور اختلاط کلام کا عارضہ ہو گیا ہے! حالانکہ انبیاء کرام ان امور سے معصوم ہیں جنون انبیاء کرام کے لیے بالاجماع جائز نہیں ورنہ ان حضرات علیہم السلام کے قول و فعل سے اعتماد اٹھ جائیگا۔ حالانکہ ان کا قول و فعل تمام حالات میں قابل اعتماد اور لائق اتباع ہے۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو جھگڑا اور شور و شغب کیا، حالانکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور بلند آوازی گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔

اے مومنو، نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ ان سے چلا کر بولو جس طرح ایک دوسرے سے باہم چلا کر بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتہ تک نہ چلے۔

(۴) امت کی حق تلفی کی، اگر تحریر لکھ لی جاتی تو بعد میں امت گمراہی سے بچ جاتی۔ مگر اب ہر وادی میں لوگ سراسیمہ اور پریشان ہیں۔ اصول و فروع میں بے شمار اختلافات کا شکار ہیں! لہٰذا اس سارے اختلاف کا سارا وبال عمر (فاروق رضی اللہ عنہ) کی گردن پر ہے۔ یہ ہے اس طعن کی تقریر، جس کا ان کے ہاں زور و شور تو بہت ہے، مگر اس سلیقہ اور نظم و ترتیب کے ساتھ ان کی کسی کتاب میں

نہیں ملتا۔ (اور جس انداز اور بے سلیقہ وبے نظم ملتا ہے، اس سے کوئی صحیح طور سے ان کے مقصد دلی پر خاطر خواہ مطلع نہیں ہو سکتا بہرحال اب اس طعن کے سلسلہ کی ان باتوں کا جواب ملاحظہ فرمایئے!

جواب :۔ ان چاروں باتوں کا اجمالی جواب تو یہ ہے، کہ یہ سارے کام اکیلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سرزد نہیں ہوئے موجودین حجرۂ مبارک سب کے سب اس معاملہ میں دو گروہ ہو گئے تھے، جن میں حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ اب اگر یہ دونوں حضرات منع کرنے والوں میں تھے، تو گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق اور ان کے شریک تھے۔ ایسی صورت میں یہ حضرات بھی ان مطاعن کا نشانہ ہیں! اور اگر یہ اجازت دینے والوں میں تھے، تو پھر بھی بعض مطاعن سے یہ بھی نہیں بچتے۔ ان کا الزام ان پر بھی آئے گا۔ مثلاً ایسے نازک وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اونچی آواز سے بولنا۔ یا امت کی حق تلفی کا معاملہ! کہ ساتھیوں کے منع کرنے سے رُک گئے، نہ اس وقت لائے نہ بعد میں لائے، جبکہ موقعہ بھی تھا اور پوری فرصت بھی ملی تھی! اس وقت دوات قلم لاکر لکھوا لیتے۔ اس "وحی الٰہی" کے "رد" میں ایک طرح سے یہ بھی شریک ہو گئے! لہٰذا یہ طعن اکیلے عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر نہیں لگتا دوسرے سب شرکاء بھی شامل طعن ہیں! جن میں سے بعض بالاتفاق شیعہ وسنی مطعون نہیں ہو سکتے۔ تو جب طعن، مطعون اور غیر مطعون سب کو شامل ہو تو وہ غیر معتبر ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ طعن ہی غیر معتبر ہوا تو اس کے جواب کی ضرورت ہی کیا رہی۔ اور اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو طعن کی وجہ اول بھی سب میں مشترک ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب مبارک ایتونی بقرطاس سارے ہی حاضرین سے تھا۔ خاص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہیں تھا۔ لہٰذا آپؐ کا یہ حکم وجوب وفرضیت کی حیثیت سے تھا تو سارے کے سارے عدم تعمیل میں گناہ گار ہوئے اور شریعت کے فرمان کے مخالف قرار پائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نافرمانی کا سبب حضرت عمر فاروقؓ بنے اور دوسروں نے آپؓ کی بات مان کر حکم رسول کی بجا آوری سے منہ موڑا۔ مگر وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ کی وعید میں بہرحال سب ہی داخل ہوئے۔ گویا نعوذ باللہ عمرؓ کی مثال تو شیطان کی سی ہوئی کہ کافروں کو کفر پر اکساتا ہے اور دوسرے حضرات (رضوان اللہ علیہم) کی مثال کافروں کی مانند ہوئی یہ بات بالکل صاف ہے کہ طعن اکیلے شیطان پر نہیں کیا جاتا ورنہ تو سارے کافر معذور سمجھے جائیں گے کہ وہ بے قصور ہیں۔ بلکہ ماجور! حالانکہ یہ قرآن ہی کے خلاف نہیں، تمام شرائع سابقہ کے بھی خلاف ہے،

اور اگر آپ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم وجوب وفرضیت کے لئے نہیں بلکہ ارشاد وہدایت کے طور پر تھا۔ تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر موجودین رضی اللہ عنہم اس کے ترک کی بنا پر مورد طعن نہیں رہتے۔ اور نہ ہی کسی وجہ سے ان کو قابل ملامت کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ محض صلاح وارشاد پر مبنی احکام کی عدم تعمیل بالاجماع قابل گرفت نہیں ہوتی۔ جیسا آگے انشاءاللہ بیان کیا جائے گا۔ (اب طعن کی چاروں وجوہ کے جوابات علیحدہ ملاحظہ ہوں)

جواب وجہ (ا)۔ اس وجہ کا مدار اس مفروضہ پر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وحی کو رد کر دیا کیونکہ قول پیغمبر وحی ہوتے ہیں، جن پر آیت قرآنی دلیل ہے! مگر اس صورت کے دونوں مقدمے غلط ہیں۔ پہلی بات یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد نہیں کیا بلکہ انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو آرام وراحت پہنچانا چاہا۔ ان کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اس شدت مرض میں آپ کو کسی قسم کی مشقت ورنج پہنچایا جائے۔ (جس کی آنکھوں پر تعصب، بغض وعناد کی پٹی چڑھی ہو وہ معاملہ کا یہ دلآویز پہلو نہیں دیکھ سکتا۔ ن) ہر محبت اپنے محبوب کو ہر عالم میں راحت وآرام ہی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر وہ محبوب اپنوں کے ساتھ فطری دلبستگی انس ومحبت کے سبب بحالت شدت مرض وتکلیف ان کے فائدے اور مصلحت کی خاطر خود پر مشقت برداشت کرکے

کچھ کرنا چاہیے تو ہر محب چاہتا ہے کہ اسوقت ان کا دھیان ہٹا کر یا ٹال مٹول کر کے اس مشقت کے الم سے اس کو بچائے۔ اسوقت یہ کہنا کہ آپ کو اس مشقت کے اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہمیں جو کچھ بھی دیدیا ہے یا ہمارے لئے جو کچھ کر دیا ہے، ہمیں بہت ہے، کافی ہے۔ تو اسے عدم تعمیل کوئی شقی القلب اور خود غرض ہی کر سکتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ یہی رویہ اکثر و بیشتر رائج اور معمول یہ رہا ہے! پس یہاں بھی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ آپ اصحاب اور امت کے فائدہ کی خاطر چاہتے ہیں کہ شدید مرض کی تکلیف کے وقت بھی اپنے اوپر تعب و مشقت برداشت کر کے کوئی تحریر لکھوائیں یا بنفس نفیس خود لکھیں، تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید مشقت کے بار ڈالنے کو گوارا نہیں فرمایا۔ اور کمال ادب ملحوظ رکھتے ہوئے راہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے رفقاء و احباب سے کہا کہ اسوقت آپؐ کو اس مشقت میں ڈالنے اور مزید تکلیف پہنچانے کی کیا ضرورت ہے! مقصد یہ بھی تھا کہ حضور صلی اللہ کے گوش مبارک تک بھی یہ رائے اور مشورہ پہنچے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ جان جائیں کہ ایسی حالت میں مزید مشقت لاحاصل ہوگی!

حسبنا کتاب اللہ۔ کہہ کر آپؓ نے تکمیل دین و اتمام نعمت رب العلمین والی آیت کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا تھا اہل عقل کے نزدیک تو آپ رضی اللہ عنہ کی یہ دقت نظری قابل تحسین و صد آفرین ہونی چاہیئے تھی! نہ کہ موجب طعن! یہ آیت اس واقعہ سے تین ماہ پیشتر نازل ہو چکی تھی، اس میں فرمایا گیا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے بطور دین اسلام کو پسند کیا۔

گویا دین میں نسخ و تبدیلی، نقص و زیادتی کا دروازہ بالکل بند کر دیا اور اس پر اتمام و تکمیل کی مہر لگا دی۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا اشارہ اسی آیت کی طرف تھا، اب ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسی نئی چیز تو لکھنا یا لکھوانا نہ چاہتے ہوں گے جو کتاب و شریعت میں نہ آچکی ہو۔ کیونکہ یہ بات تکمیل دین کے وعدہ الٰہی کے مناسب نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ جو احکام سابق میں قرار پا چکے ہیں ان پر مزید تاکید فرمائیں۔ اگر ہم احکام خدا اور رسول پر عامل رہنا چاہیں تو جو جو تاکیدات فرمان الٰہی میں موجود ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تاکیدات وقتاً فوقتاً فرماتے رہے وہ ہمارے لئے کافی ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ مزید مشقت نہ فرمائیں اسوقت مناسب اور بہتر یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ سکون اور راحت میں رہیں۔ اور آپؓ کے یہ الفاظ۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسوقت مرض کی شدت غالب ہے

وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللّٰهِ حَسْبُنَا۔ — ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ہمیں کافی ہے!

اسی ارادہ کی گواہی ہے! لہٰذا معلوم ہوا اس واقعہ میں حکم رد کر دینے کی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا انتہائی کج فہمی، نادانی یا انتہائی عداوت و بغض و عناد پر مبنی ہے،

اور اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کے امور میں مصلحات کو مدنظر رکھنا یا مشورہ سے مدد کرنا صحابہ کرام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہمیشہ سے ایک معمول بہ طریق رہا ہے! اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو اس بارہ میں خاص خصوصیت اور جرأت کے مالک تھے۔ کہ بہت سے معاملات میں مثلاً منافق پر نماز جنازہ پڑھنی ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو پردہ نشین کرنے، غزوہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے اور مقام ابراہیم کو مصلّی بنانے اور اسی قسم کے دیگر امور میں آپ کے مشورہ کے مطابق وحی الٰہی نازل ہو چکی تھی، اور بیشتر مقدمات میں آپ کی صوابدید کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ بنظر استحسان دیکھتے۔ اگر اس قسم کے امر مصلحت کو پیش کرنے کے کام کو یہ شیعہ رد وحی، یا قول پیغمبر کا رد کہیں گے تو بات جناب فاروق رضی اللہ عنہ تک ہی نہیں رہیگی بلکہ بعض جگہ جناب

علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی آپؐ کے شانہ بشانہ اس الزام میں شریک نظر آئیں۔ چند مقامات دیکھئے تو۔

الف :۔ بخاری شریف میں بطریق متعدد مروی ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اور ان کو نیند سے بیدار کر کے ادائیگی تہجد کے لئے سخت تاکید فرمائی، قُوْمَا فَصَلِّیَا (دونوں اٹھو اور نماز تہجد پڑھو) جواب میں جناب امیر رضی اللہ نے فرمایا وَاللّٰہِ لَا نُصَلِّیْ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (اللہ کی قسم ہم نماز نہیں پڑھیں گے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کی ہیں) وَاِنَّمَا اَنْفُسُنَا بِیَدِ اللّٰہِ (اور ہمارے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں) وہ توفیق دیتا تو ہم تہجد بھی پڑھتے) یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان سے واپس چلے آئے اس وقت آپ اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے اور یہ فرماتے جاتے تھے وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا۔ (انسان بہت ہی جھگڑالو ہے) لہٰذا اس قصہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی جانب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرعی معاملہ میں جھگڑنا ثابت ہوتا ہے مگر چونکہ قرینہ صدق و راستی اور نیک نیتی پر گواہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامت نہ فرمائی۔

ب :۔ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ غزوہ حدیبیہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے مابین صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے لفظ "رسول اللہ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب کے بطور لکھ دیا۔ رؤسائے کفار نے اس لقب کے لکھنے پر اعتراض کیا، کہ اگر ہم ان کو رسول اللہ، مانتے تو پھر ہمارا جھگڑا ہی کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چند جناب علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ لقب کاٹ دو۔ مگر آپؓ اپنے جزو ایمان، لقب کو کیسے کاٹ دیتے، اس لئے نہیں کاٹا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو رد کر دیا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلحنامہ آپ کے ہاتھ سے لیکر خود مٹایا۔

لیکن اہل سنت اس قسم کے ردیہ کو نہ مخالف رسول جانتے ہیں نہ کہتے ہیں، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اس مخالفانہ طرز عمل پر ان پر طعن بھی نہیں کرتے۔! اس لئے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر وہ کیوں طعن کریں گے۔! اور اگر شیعہ اس قسم کے امور کو قول رسول کی تردید کہنے پر ہی اصرار کرتے رہے تو پھر وہ اپنے پاؤں پر گویا خود ہی کلہاڑی ماریں گے۔ اور قیل و قال کی راہ اپنے اوپر تنگ کریں گے کیونکہ اس فرقہ کی اپنی کتابوں میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق اس قسم کی مخالفت، اور مصلوت اور مشورے پیش کرنے کے واقعات موجود مرقوم ہیں۔ چنانچہ شریف مرتضیٰ نے جو ان کے ہاں علم الہدیٰ کے لقب سے مشہور ہے! اپنی کتاب الغرر والدرر میں جناب محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ کے حوالہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے روایت درج کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔

قَدْ اَكْثَرَ النَّاسُ عَلٰى مَارِيَةَ الْقِبْطِيَّةِ اُمِّ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ ابْنِ عَمٍّ لَهَا قِبْطِيٍّ كَانَ يَزُوْرُهَا وَيَخْتَلِفُ اِلَيْهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ هٰذَا السَّيْفَ وَانْطَلِقْ فَاِنْ وَجَدْتَّهٗ عِنْدَهَا فَاقْتُلْهُ فَلَمَّا اَقْبَلْتُ نَحْوَهٗ عَلِمَ اَنِّيْ اُرِيْدُهٗ فَاَتٰى نَخْلَةً فَرَقِيَ اِلَيْهَا ثُمَّ رَمٰى بِنَفْسِهٖ عَلٰى قَفَاهُ وَشَغَرَ بِرِجْلَيْهِ فَاِذَا بِهٖ اَجَبُّ وَاَمْسَحُ لَيْسَ لَهٗ مَا لِلرِّجَالِ لَا قَلِيْلٌ وَّلَا كَثِيْرٌ قَالَ فَغَمَدْتُّ السَّيْفَ وَرَجَعْتُ اِلٰى

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم (علیہ السلام) کی والدہ جناب ماریہ قبطیہؓ اور ان کے چچا زاد بھائی قبطی کے متعلق جس کی آپؓ کے ہاں آمد و رفت تھی لوگوں نے اتہام کے طور پر بہت باتیں بنائیں تو حضور صلی اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا یہ تلوار لو اور جاؤ، اگر وہ ان کے پاس ہو تو قتل کر ڈالو، میں وہاں گیا، وہ مجھے دیکھ کر اور میرا ارادہ بھانپ کر وہاں سے بھاگ کر کھجور کے درخت پر جا چڑھا۔ پھر وہاں سے گدی کے بل زمین پر اپنے آپ کو گرا کر دونو ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ تو میں نے دیکھا کہ اس کے تو مردانہ عضو ہے ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے تلوار میان میں ڈالی

النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَتْهُ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ يُصْرِفُ عَنَّا الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ .

اور رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آکر ساری صورت واقعہ عرض کی، تب آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہوئے فرمایا سب اللہ کے لئے ہے جو ہم اہل بیت سے ہر گندگی و برائی کو ٹالتا ہے ۔

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہ اہل بیت سے ہیں اور آیت تطہیر میں داخل ۔ اور خدا کا شکر ہے کہ رحمت سب کو شامل ہوئی اور نعمت سب پر عام۔ (اب یہ شیعہ بتائیں کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر نطق وحی واجب الاتباع ہے تو یہاں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیوں نہیں فرمایا۔ ہمارے نزدیک تو آپ کا یہ فعل عین حق تھا اور آپؓ پر کوئی طعن یا اعتراض نہیں ۔ البتہ شیعوں کے لئے لمحہ فکریہ ضرور ہے ۔ (ن) محمد بن بابویہ نے امالی میں اور دیلمی نے ارشاد القلوب میں یہ روایت بیان کی ہے !

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطٰى فَاطِمَةَ سَبْعَةَ دَرَاهِمَ وَقَالَ اَعْطِيْهَا عَلِيًّا وَمُرِيْهِ اَنْ يَّشْتَرِيَ لِاَهْلِ بَيْتِهٖ طَعَامًا فَقَدْ غَلَبَهُمُ الْجُوْعُ فَاَعْطَتْهَا عَلِيًّا وَقَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَكَ اَنْ تَبْتَاعَ لَنَا طَعَامًا فَاَخَذَهَا عَلِيٌّ وَخَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ لِيَبْتَاعَ طَعَامًا لِاَهْلِ بَيْتِهٖ فَسَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ مَنْ يُقْرِضُ الْمَلِيَّ الْوَفِيَّ فَاَعْطَاهُ الدَّرَاهِمَ .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کو سات درہم عنایت فرما کر فرمایا کہ یہ علی رضی اللہ عنہ کو دیدینا اور کہنا کہ اس رقم سے اپنے اہل وعیال کے لئے کھانا لے آنا کیونکہ وہ بھوک سے بہت پریشان۔ پس وہ رقم سیدہؓ نے جناب علی کو دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان سے ہمارے لئے کھانا خرید لائیں آپ وہ رقم لے کر گھر سے نکلے کہ اہل خانہ کیلئے کھانا لے آئیں کہ ایک آدمی کو یہ کہتے سنا کہ سچے وعدہ پر کون قرض دیتا ہے آپؓ نے وہ درہم اسے دے ڈالے“!

اس قصہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں (۱) رسول اللہ کی مخالفت (۲) دوسرے کے مال میں بلا اجازت تصرف (۳) اہل وعیال کی حق تلفی اور بہت ہی قریب، عزیزوں، یعنی بیوی بیٹوں کے ساتھ قطع رحمی۔ نیز یہ بات بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد و جگر کے ٹکڑوں کو بھوکا رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھ پہنچایا۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کے لئے اللہ کی طاعت میں تھا اور نیت بخیر تھی اس لئے مقبول اور قابل تحسین وتعریف ہوا ۔ اس پر کوئی عتاب یا ناراضگی کا اظہار نہیں ہوا ۔

اور قرائن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم تھی کہ اصحاب حقوق، یعنی بیوی بچے اس ایثار اور نیک کام پر رضامند اور خوش ہوں گے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسے جائز قرار دیں گے ۔

اب رہی بات دوسرے مقدمہ کی! کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وحی ہیں ۔ یہ دلیل عقلی اور نقلی دونوں لحاظ سے درست نہیں ۔ عقلی دلیل سے تو اس طور کہ ہر سمجھ دار بخوبی جانتا ہے کہ رسول کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں ۔ اور جب اسکی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے ”اللہ کا پیغام پہنچانے والا“ اب رسالت کے معنے صرف یہ ہوئے ۔ کہ ان کے پاس اللہ کا پیغام آئے اور ان کے ذریعہ وہ پیغام ہم تک پہنچے ۔ یہ معنے نہیں کہ ان کا ہر فرمان، اللہ کا پیغام! آیت وَمَا يَنْطِقُ الخ قرآن کے ساتھ خاص ہے ۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۔ اس کی دلیل ہے ۔ یہ آیت پیغمبر کے تمام اقوال کو شامل نہیں ۔ اس کی مثال دنیاوی امور میں ہمارے سامنے روزمرہ رہتی ہے، کہ کسی حاکم، عامل، یا بادشاہ کے ایلچی کی، ہر بات اور ہر قول بادشاہ کی طرف سے نہیں سمجھا جاتا، (یہاں ایک بات عزولہ ذہن نشین کرلی جائے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ حیثیت کے علاوہ ایک اور حیثیت منشائے الٰہی سمجھنے والے“ کی بھی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”رسول تمکو جو کچھ دے پس اسے لے لو، اور جس بات سے روکے اس سے رک جاؤ“، یہ آیت میرے خیال میں اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہونے کے ساتھ مقتدا و پیشوا، اور مصلح امت بھی ہیں ۔ اور امت پر

شفیق اور اس کے خیر خواہ بھی! اس کے پیش نظر یہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہر حکم خواہ اس کے ساتھ وحی کا حوالہ ہو یا نہ ہو، قابل اتباع ہو گا۔ البتہ اس کی حیثیت متعین کرنے کے لئے کہ وہ حکم الہی ہے۔ یا آپ کی رائے بطور مشورہ، یا وہ واجب الاتباع ہے، یا حکم استحسان اور مندوب، آپ سے استفسار کیا جانا معیوب، یا موجب طعن نہیں ہو گا۔ اور ایسے حکم کی عدم تعمیل کو جو مندوب ہو، یا قرائن سے معلوم ہو کہ یہ پہلو ملحوظ ہے یا اسرار رسول سے گنجائش معلوم ہوتی ہو، اسے رد وحی نہیں کہیں گے۔ نعمانی)

اور نقلی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال وحی منزل من اللہ کے درجہ کے ہوتے تو آپ کے بعض اقوال پر قرآن مجید میں گرفت اور سرزنش نہ ہوتی حالانکہ بعض مقامات پر تو سرزنش کا لہجہ خاصا سخت بھی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ۔ اللہ تعالی آپ کو معاف فرمائے۔ آپ نے ان کو کیوں اجازت دی۔ دوسری جگہ فرمایا۔

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ بنئے اللہ سے مغفرت طلب کیجئے، بے شک اللہ تعالی غفور بھی ہے رحیم بھی۔ اور جو لوگ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں آپ ان کی جوابدہی نہ کیجئے! ایک اور جگہ۔ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اگر اللہ تعالی کی طرف سے پہلے سے فیصلہ نہ لکھ دیا گیا ہوتا تو آپ نے ان سے جو کچھ لیا ہے پاداش میں دردناک عذاب کی صورت میں پکڑ ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو قبطی کے قتل کا حکم، طعام کی خرید، فقط رسول اللہ کے مٹانے اور تہجد کا حکم سارے منزل من اللہ ہوتے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ رد وحی کے مرتکب قرار پاتے اور اگر ایسا ہوتا تو پھر وشاورهم فی الامر۔ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم دینا بے معنی بات ہوئی، اور پھر بعض امور میں بعض صحابہ کی اطاعت کس معنی پر محمول کی جائے گی جسکی طرف آیت لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ۔ اگر وہ بہت سے کاموں میں تمہاری اطاعت کریں تو تم دشواری میں پڑ جاؤ گا ارشارہ کرتی ہے! اور پھر یہ بھی ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اہل وعیال کی حفاظت ونگہداشت پر مقرر فرمایا تو آپ نے معترضانہ لہجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

اَتُخَلِّفُنِيْ فِي النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ۔ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں! (یعنی کیا میری حیثیت آپ کی نظر میں ایسی رہ گئی ہے کہ میدان جہاد میں شرکت کے بجائے عورتوں بچوں کے ساتھ رہوں) تو یہاں وحی الہی کے مقابلہ میں اعتراض کرنا کب جائز ہوتا! اور اصول امامیہ کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں تو تمام اقوال رسول نہ وحی ہیں اور نہ ان کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال واجب الاتباع ہیں۔

لہٰذا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کے اس فاسد، باطل اور غلط مقدمہ کو جو نہ تو واقعہ کے مطابق ہے، اور نہ خود ان کے مذہب کے موافق اور نہ ہی مد مقابل کے مذہب کے موافق۔ اس طعن کی تکمیل وترویج کی خاطر ذکر کرنا تعصب وعناد، بغض وحسد کا بدترین مظاہرہ ہے،

اب ہم اس معاملہ کو اقوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی سطح پر رکھ کر تجزیہ کرتے اور کہتے ہیں کہ شیعہ وسنی ہر دو کے نزدیک مصلحت پیش کرنا۔ مشقت سے بچنے کی صورت نکالنا۔ اور حکم الہی بلا واسطہ کو جو قطعی طور پر وحی منزل من اللہ ہے، کے خلاف اصرار اور بار بار اس میں ترمیم کی درخواست رد وحی شمار نہیں ہوتا۔

چنانچہ شب معراج بسلسلہ نماز کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بمشورہ پیغمبر الوالعزم حضرت موسی علیہ السلام نو مرتبہ مراجعت فرمائی اور بارگاہ الہی میں عرض پرداز ہوئے، کہ اس حکم کو میری امت برداشت نہ کر سکیگی اس میں تخفیف فرما دیجئے،

یہ بات خود ابن بابویہ نے کتاب المعراج میں لکھی ہے۔ اگر یہ امر رد وحی ہوتا تو پیغمبران عظام علیہما الصلوٰۃ والسلام سے اس کا صدور کیسے ہوتا۔ لہٰذا ایسے امور کو رد وحی کہنا کسی مومن سے تو متوقع نہیں ایسا تو کوئی ملحد و زندیق ہی کہہ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بلا واسطہ حکم الٰہی میں سوال وجواب اور لوٹ پلٹ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خود قرآن مجید میں موجود ہے۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ قَوْمَ فِرْعَوْنَ اَلَا يَتَّقُوْنَ. قَالَ رَبِّ اِنِّىْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِىْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِىْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ. وَلَهُمْ عَلَىَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ. قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ.

جب موسیٰ (علیہ السلام) سے تمہارے رب نے واضح طور پر کہا کہ فرعون کی ظالم قوم کے پاس جاؤ وہ بڑا دلیر اور بے خوف ہو گئی ہے۔ تو موسیٰؑ نے کہا کہ اے میرے رب مجھے خطرہ ہے وہ مجھے جھٹلا دینگے۔ میرے سینہ کے اندر گھٹن بھی ہوتی ہے اور زبان بھی (بوجہ لکنت) نہیں چلتی، آپ ہارونؑ کے پاس بھی وحی بھیجیے اور ان کا ایک گناہ بھی مجھ پر ہے سو ڈرتا ہوں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان کی مجال نہیں! تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ اور سنتے ہیں۔

اور پھر یہ بات شیعوں کے ہاں اصولی طور پر طے شدہ ہے کہ رسول ہی نہیں بلکہ خدا کے بھی بلا واسطہ حکم کا تقاضا یقینی وجوب نہیں ہوتا اس میں مندوب ومستحب کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں شقوں میں سے ایک شق کی وضاحت وتعین کے لیے استفسار اور لوٹ پلٹ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرتضیٰ شریف کی الغرر والدرر میں اس کا ذکر موجود ہے! جب یہ بات ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس حکم کے بارے میں استفسار اور اس کو لوٹانے میں کیا قصور اور کون سا گناہ تھا۔ ان کی نیت وارادہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف ومشقت میں تخفیف تھا، اور ثبوت میں آیت قرآنی بھی پیش کر رہے تھے جس سے بھی بظاہر اس حکم کے مندوب ہونے کا پتہ چل رہا تھا۔

جواب وجہ (۲) ۔ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختلاط کلام (بہکی بہکی باتیں کرنا) کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی" اور یہ بات بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے، اور یقین کے وہ کونسے ذرائع ہیں جو یہ بتائیں کہ اَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْهُ (کیا یہ بات عجیب ہے پھر اسکو پوچھ لو) کے الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلے۔ اکثر روایات میں "قالوا" کا لفظ ہے جو کسی قائل کی تصریح نہیں کرتا۔ ممکن ہے یہ حامیان تحریر کے منہ سے نکلا ہو، اور استفہام انکاری کے طور پر اپنے قول کی تائید میں بولا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو طے شدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی بہکی بات نہیں نکلتی، لہٰذا تعمیل حکم کے لیے یہ پوچھ لیں کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ احتمال دوسرے پہلو کا بھی ہے کہ مخالفین تحریر نے یہ بات بطور استفہام انکاری کہی ہو، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہکی بات کیوں کہنے لگے مگر آپ کے اس فرمان کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا پھر پوچھ کر دیکھ لو کہ واقعی کچھ لکھنا لکھانا ہی مراد ہے یا کچھ اور مقصد ہے! اور بظاہر حالات بھی اس کلمہ کا نہ سمجھا جانا ہی محتمل تھا۔ کیونکہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ احکام الٰہی کو خدا کی طرف منسوب کر کے ذکر فرماتے اور یہاں آپ نے یہ نسبت ذکر کر کے یہ نہیں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِىْ اَنْ اَكْتُبَ لَكُمْ كِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِىْ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ جاؤں کہ میرے بعد تم بہک نہ سکو! مانعین تحریر اس شبہ میں پڑ گئے کہ ممکن ہے آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق ہی فرمایا ہو مگر ہماری سمجھ میں نہیں آیا لہٰذا تحقیق کر لینی چاہیئے! اور پھر یہ بات قطعی طور پر سب کے علم میں تھی، کہ آپ نے عمر بھر، نہ کوئی تحریر لکھی، نہ اسکی آپ کو مشق تھی۔ اور نہ ہی (بطور معجزہ سہی) یہ ہنر آپ سے کبھی ظہور میں آیا۔ آپؐ کے اُمّی ہونے کی تصدیق قرآن مجید نے بھی کی ہوئی تھی۔

پھر جو آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے کتابت کی نسبت اپنی طرف فرما کر یہ فرمایا کہ اکتب لکم کتابا۔ (کہ میں تمہارے لئے تحریر لکھوں) یہ اچھنبے کی بات تھی، کہ آخر اس کے کیا معنی ہیں۔ اسکو پوچھنا چاہیئے۔ کیونکہ کلام پیغمبر کو ہذیان تو کہہ نہیں سکتے!

علاوہ ازیں یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں لکھوایا کرتے تھے۔ بلکہ کسی اور تحریر کا پڑھنا پسند بھی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ توریت کا نسخہ کہیں سے لائے اور اسے پڑھنے لگے تو آپ نے منع فرما دیا! اور اس وقت آپ نے قرآن کے علاوہ کچھ اور بدست خود لکھنے کو فرمایا تو حاضرین کو بہت تعجب ہوا۔ اور اسے سلجھانے سے عاجز رہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ بطور استفہام انکاری یا تعجبی، کسی کی زبان پہ یہ لفظ آگیا ہو۔ اگر ان کو ہذیان کا یقین ہوتا یا آپ کے کلام پہ ہذیان لاحق ہونا ان کے وہم وگمان میں بھی ہوتا تو یہ کبھی نہ کہتے کہ پھر پوچھو! بلکہ یہ کہتے اس کے پیچھے مت پڑو یہ تو ہذیان ہے اس کا کیا اعتبار!

اب یہاں اس جملہ اہجر الخ کی تفصیل ملاحظہ ہو، لغت عرب میں ہجر کے معنے اختلاط کلام کے ہیں کہ بات سمجھی نہ جائے۔ اور یہ اختلاط دو قسم کا ہوتا ہے۔ گرفتگی آواز کی وجہ سے (گلا بیٹھ جانا) زبان پر خشکی کے غالب آجانے کے باعث، اعضائے تکلم وگفتگو کے کمزور پڑ جانے کے سبب، ایسا ہو جاتا ہے کہ الفاظ صحیح مخارج سے خاطر خواہ طور پہ نہ نکل سکیں، الفاظ بھی مرتب [illegible] یا ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوں یہ اختلاط کلام کی پہلی قسم ہے، یہ عارضہ پیغمبران کرام علیہم السلام کو بھی لاحق ہو سکتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر اس عارضہ کے لاحق ہونے سے کسی وصف پیغمبری میں کوئی نقص یا عیب ہرگز پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ مرض وبیماری کے اعراض وتوابع ہیں۔ باتفاق اہل سیر، مرض الوصال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتگی آواز کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ احادیث کتب صحیحہ میں یہ بات ملتی ہے۔

اختلاط کی دوسری قسم یہ کہ غشی (بیہوشی) کے سبب اور تپ ہائے محرقہ میں دماغ کی طرف بخارات کے صعود کے باعث اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بے ربط یا خلاف مقصود کلام زبان پر جاری ہو جائے۔ یہ کیفیت گو امور بدنیہ کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ روح اور قوت مدرکہ پر اثر انداز ہو جاتی ہے اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو یہ کیفیت لاحق ہوتے اور نہ ہوتے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے، جو حضرات اسے جنون پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے انبیاء کے لئے ممتنع قرار دیتے ہیں۔ اور جو حضرات اسے نیند پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے جائز سمجھتے ہیں، اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس اختلاط کا دوسرا سبب یعنی بے ہوشی انبیاء علیہم السلام کو بھی لاحق ہوتی ہے۔

فَخَرَّ مُوسٰی صَعِقًا ۔ (موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے) تو قرآن مجید میں بھی آیا ہے) اسی طرح صور قیامت پھونکے جانے کے وقت سوائے موسیٰ علیہ السلام کے سب کا بیہوش ہو جانا صحیح بھی ہے اور ثابت بھی۔ وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ ۔ اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے، مگر جسے اللہ چاہے۔ (وہ بے ہوش نہیں ہوگا) اور حدیث صحیح میں یوں آیا ہے کہ فَاَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ یُفِیْقُ فَاِذَا مُوْسٰی اٰخِذٌ بِقَائِمَۃٍ مِّنْ قَوَائِمِ الْعَرْشِ فَلَا اَدْرِیْ اَصَعِقَ فَاَفَاقَ قَبْلِیْ اَمْ جُوْزِیَ بِصَعْقَۃِ الطُّوْرِ ۔ سب سے پہلے ہوش میں آنے والا میں ہوں گا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نظر آئیں گے جو عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ وہ بیہوش ہوئے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے۔ یا ان کی طور کی بیہوشی آجکی بیہوشی کا بدل ہو گئی۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اپنی کرامت اور بزرگی کے ساتھ غشی وبیہوشی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ انبیاء علیہ السلام کو اپنی مرضی کے خلاف قول وفعل کے صدور سے بچائے رکھتا ہے (انکی عصمت اس حال میں بھی قائم وباقی اور فعال رہتی ہے)۔ ہر حال میں ان سے رضائے الٰہی ہی کی بات صادر ہوتی ہے! اور یہ بالکل ظاہر ہے ایسی حالت کو جنون پہ بالکل قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ جنون میں اول روح

کے قوائے مدرکہ میں اختلال پیدا ہو کر جم جاتا ہے، اور یہ اختلال جاری رہتا ہے زائل نہیں ہوتا۔ اسی لیے جنون کی حالت رہتی ہے بخلاف اس حالت کے کہ یہاں روح ہر اختلال سے بالکل محفوظ رہتی ہے البتہ اعضائے جسمانی مخالف اثر کے علیہ پانے کی وجہ سے اور اس کے دفعیہ کے لیے روح کا مصروف بکار ہونے کے سبب روح کے زیر فرمان نہیں رہتے اسی لیے یہ حالت نہ جمتی ہے اور نہ دیرپا ہوتی ہے۔ یہ بالکل نیند کے مانند ہے جو انبیاء کو لاحق ہوتی ہے۔ اور جاگنے میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ نیند میں ان حضرات کا قلب بیدار و آگاہ اور خبردار رہتا ہے، مگر بیہوشی میں بھی نیند کے وہ تمام آثار جو اعضائے جسمانی، آنکھ کان سے متعلق ہیں مرتب ہوتے ہیں اور نماز کا قضا ہو جانا یا وقت کے گذر جانے کی خبر نہ ہونا یہ حالت ان حضرات کرام کو بھی پیش آتے ہیں جیسا کہ کافی کلینی میں حدیث لیلۃ التعریس کے ضمن میں مذکور ہے۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی نمازوں میں سہو و نسیان لاحق ہوتا ہے چنانچہ امامیہ کی کتب صحاح میں انبیاء و ائمہ سے سہو و نسیان کی روایات بیان کی گئی ہیں۔

اس واقعہ میں بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دیگر کثیر خلاف عادت شریفہ باتیں ظہور میں آئیں، جسکی تفصیل ابھی مذکور ہوئی، ایسی حالت میں حاضرین میں سے کسی کو یہ وہم ہو گیا ہو کہ کہیں یہ کلام بھی اختلاط کلام کی قسم سے نہ ہو جو اس جیسی بیماری میں رونما ہو جاتا ہے تو اس میں بعید از عقل کیا بات ہے، اور نہ یہ محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آپ شدید درد سر اور دہکتے بخار میں مبتلا بھی ہوں۔ اور دوسری روایت سے تو یہ معنی اور تعجب صاف سمجھا جا سکتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ مَاشَانُهٗ اَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْهُ (آپ کا کیا حال ہے کیا اختلاط کلام ہے، ذرا پوچھو تو۔) اس پر کہنے والا ادب کی رعایت کرتے ہوئے اظہار یقین نہیں کرتا بلکہ بطور شک کہہ رہا ہے، ممکن ہے، ایسا نہ ہو اور ہم ہی آپ کا مفہوم نہ سمجھ پا رہے ہوں، دوبارہ دریافت کر کے بات کو واضح کرا لینا چاہیئے! اور یہ گفتگو تو اس تقدیر پر ہے کہ اختلاط کی دوسری قسم بیہوشی مراد لیں، اور اگر قسم اول مراد لیں (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کے مشورہ کی وجہ سے اپنے پاس سے اٹھ جانے کے متعلق جو ارشاد فرمایا اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ آپ پر بیہوشی طاری نہیں تھی بلکہ مرض کی شدت والی صورت تھی۔ ن) تو اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ شدت مرض کی وجہ سے آپ کے فرمان کے الفاظ ممکن ہے ہم پورے طور پر نہ سمجھ سکے ہوں، آپ سے استصواب کر کے مراد متعین کرالیں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل پورے اور صحیح طور پر انجام دے سکیں اس صورت میں کوئی اشکال نہ رہا۔

جواب وجہ (۳)۔ یہ وجہ سراسر غلط فہمی اور حق سے چشم پوشی پر مبنی ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا بے شک ممنوع اور ناجائز ہے مگر اس قصہ میں تو کسی سے بھی یہ حرکت سرزد نہیں ہوئی، نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہ کسی اور سے! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی گفتگو کی آواز بلند ہو ہی جاتی رہی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ آیت قرآن مجید سے تو اُس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز اونچی کرنے کی ممانعت ہے۔ اگر آپ کی مجلس میں باہمی گفتگو میں بلندی آواز ممنوع ہوتی تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے لَا تَرْفَعُوا اَصْوَاتَكُمْ بَيْنَكُمْ عِنْدَ النَّبِيِّ۔ (نبیؐ کے پاس بیٹھ کر باہم بلند آواز سے نہ بولا کرو)

دراصل آیت کا مفہوم صحیح طور پر متعین کر لیا جائے تو یہ اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ میرے خیال میں آیت کا مفہوم یہ ہے۔ کہ (۱) جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو فرما رہے ہوں تو آواز پر اپنی آواز بلند کر کے آپ کی گفتگو میں خلل نہ ڈالو، کہ اس سے دوسرے لوگوں تک آپ کی آواز پہنچنے میں رکاوٹ ہوگی۔ اور پورے مجمع تک آپؐ کی آواز صحیح طور پر نہ پہنچنے کے سبب احکام کی صحیح تبلیغ میں

نقص واقع ہوگا۔ اسی لئے آپ کی آواز پر آواز کا بلند کرنا گناہ کبیرہ اور حرام قرار پایا۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو میں اس کا خیال رکھو کہ جس میانہ روی سے آپ گفتگو فرما رہے ہوں حاضرین کو بھی آپ سے گفتگو اسی لہجہ اور انداز میں کرنی چاہیئے۔ آپؐ نے کوئی بات مدھم لہجہ میں فرمائی تو آیت کہتی ہے تم جواب بھی مدھم لہجہ میں دو، یہ نہیں کہ ایسے لہجہ میں بولو جو حضور کے لہجہ سے بلند ہو کَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ سے ایک طرف تو مفہوم بالا کی تائید ہوتی ہے تو دوسری طرف باہم بلند آوازی کا جواز بھی نکلتا ہے۔ توضیح بالا اگر مدنظر رہے تو طعن کے لیئے اس وجہ کا کوئی جواز نہیں رہتا، اس لیئے کہ واقعہ بالا میں نہ تو کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران بول کر آپ کی آواز دبا کر اپنی آواز بلند کی۔ اور نہ کوئی آپس کی طرح حضورؐ سے بولا'

رہا شوروشغب تو مختصر سی جگہ جب کئی آدمی اکٹھے ہو کر معمول کی آواز میں بھی بحث مباحثہ کریں گے، تو وہ بھی شوروشغب ہی لگے گا۔ اور پھر اس وقت آپؐ بیماری اور درد والم کی جس حالت سے دوچار تھے، اس میں تو دس بارہ آدمیوں کی سرگوشی بھی شور شغب ہی کی طرح باعث تکلیف ہوتی ہے! رہی یہ بات کہ اول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کی یا جھگڑا شروع کیا، تو یہ بات کیسے معلوم ہوئی، اُن کو یہ بات پہلے دلیل سے ثابت کرنی چاہیئے، پھر زبان طعن دراز کریں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا لَا يَنْبَغِي عِنْدِي تَنَازُعٌ (میرے پاس بیٹھ کر جھگڑنا مناسب نہیں) بھی اسی مدعا کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بلند آوازی ترک اولیٰ کے ضمن میں آتی ہے کیونکہ لا ینبغی کا لفظ حرام یا گناہ کبیرہ کے لیئے استعمال نہیں کیا جاتا، کوئی یہ نہیں کہتا کہ زنا کرنا مناسب نہیں! شرع میں اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کیا ہوگی۔ اور قُومُوا عَنِّي (میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو) وہ مرض کی کیفیت کے پیش نظر تھا۔ بیمار آدمی عموماً گفتگو سے دل تنگ ہوتا ہے، گفتگو کی نوبت بھی آئے تو وہ چاہتا ہے کہ اہم ضروری کام کی بات ہو کر جلد یہ سلسلہ ختم ہو، اگر ایسی حالت میں کوئی بات سرزد ہو تو کسی دوسرے کے حق میں وہ طعن ہرگز نہیں ہوسکتی خصوصاً جبکہ خطاب عام ہو جس میں رائے کے موافق و مخالف سب شریک ہوں! (شیعوں کو تم یا عمرؓ اس میں کون سی خوردبین سے نظر آگیا۔ اور تم یا علیؓ کو وہ خوردبین کیوں نہ دکھا سکی۔ کہیں تعصب کی عینک تو آنکھوں پر چڑھی ہوئی نہ تھی ن) بروایت صحیح مروی ہے کہ اس بیماری کے دوران آپؐ کو لَدُوْد (دوا) کھلائی گئی تھی، افاقہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَبْقَى اَحَدٌ فِي الْبَيْتِ اِلَّا لُدَّ اِلَّا الْعَبَّاسَ۔ (گھر میں سب کو لُدود کھلایا جائے۔ مگر عباسؓ کو چھوڑ کر) فَاِنَّهٗ لَمْ يَشْهَدْكُمْ (کیونکہ وہ تم میں موجود نہیں تھے) (غالباً صورت حال یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند خاطر نہ ہونے کے باوجود اہل خانہ نے بطور علاج لدود کھلایا تھا۔ ان میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اس کے کھلانے کے خلاف ہوں گے۔ بعد افاقہ حضور نے گھر میں اسوقت موجود سب ہی افراد کو لدود کھلوایا، چاہے اس نے کھلانے کی رائے دی ہو، خواہ نہ کھلانے کی۔ حضرت عباسؓ اس لیے مستثنٰی ٹھہرے کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھے نہ شریک رائے تھے۔ ن) بیماری سے دل تنگی، ایسی بات نہیں ہو شان پیغمبری میں کسی قسم کے نقص کا سبب بنے اس لیئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس معاملہ میں انبیاء کرام کے متاثر نہ ہونے کا عقیدہ رکھا جائے، امراض میں بدنی ضعف بھی تو ہو جاتا ہے اس سے ان کی شخصیت میں کیا نقص ہوتا ہے۔ البتہ جسم و روح اس سے محفوظ و مصوُن رہتے ہیں کہ ان کے فرائض و وظائف شرعی و دینی میں بیماری کے سبب کوئی خلل واقع ہو۔

جواب وجہ (۴) یہ وجہ بھی خیال باطل پر مبنی ہے، حق تلفی اس وقت تو ہوسکتی تھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نئی بات آئی ہوئی ہوتی اور وہ امت کے حق میں نافع ہوتی اور پھر اسکو روک دیا جاتا۔ اور الیوم اکملت الخ کے نزول کے بعد یہ قطعی طور

پر معلوم تھا کہ اب کوئی دین و شریعت کی نئی بات نہیں ہوگی، محض مشورہ اور مصلحت ملکی پر کوئی بات تھی اور یہ وقت بھی وصیت کا تھا۔ اور یہ کون عقلمند باور کرے گا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جو زمانہ تھا جس میں تیئیس سال تک آپ قرآن مجید اور بے شمار احادیث کی تبلیغ فرماتے رہے۔ اور پھر عام خلق اللہ اور خصوصاً اپنی امت پر جو شفقت ورافت اور ہمدردی آپ فرماتے رہے۔ اس وقت جو بات آپ نے نہ فرمائی وہ ایسے تنگ ونازک وقت میں آپ فرمانا یا لکھوانا چاہتے ہوں۔ اور وہ بھی ایسی بات جو دفع اختلاف کے لئے بمنزلہ تریاق ہو اور اس کو محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے پر باز رہے ہوں! اس کے بعد بھی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ روز حیات رہے، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو موجود نہ تھے۔ اہل بیت ہی کی آمد ورفت رہی وہی زیادہ تر آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس وقت ان حضرات ہی کو وہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم تحریر فرما کر عنایت فرما دیتے یا ان کو لکھوا دیتے۔ کیا ان کا یہ عقیدہ تو نہیں ہے کہ اسوقت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غائبانہ ناراضگی کے خیال سے آپ نے ایسا نہیں فرمایا؟

اس خیال کے باطل اور لغو ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس تحریر کے لکھنے یا لکھوانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی اور یقینی طور پر مامور ہوتے اور وقت وفرصت پانے کے باوجود کہ پنجشنبہ کا کچھ حصہ، جمعہ تا یکشنبہ، مزاج مبارک بعافیت رہا اس کے باوجود آپ نے اس طرف توجہ نہ فرمائی کیا اس سے آپ کے فرض تبلیغ میں تساہل کا الزام نہیں آتا۔ اور کون ایسا بدبخت ہے جو ایسی بات آپ کی طرف منسوب کرنے کا خیال تک اپنے دل میں لائے۔ اسے تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیئے! یہ بات تو آپکی عصمت کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

اے رسول آپ کے رب کی طرف آپ پر جو نازل کیا گیا اس کی تبلیغ فرمایئے، اگر آپ نے ایسا نہ فرمایا تو آپ نے رسالت رب کا ابلاغ نہ فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

پھر ایسے وقت کہ وقت وصال سامنے تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال سے وعدہ الٰہی پر جو عصمت و محافظت کے لیے وارد ہوا عدم اطمینان کا اظہار نہیں۔ ہم اس کے تصور سے بھی خدا کی پناہ چاہتے ہیں! اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طور پر کوئی تحریر لکھنا یا لکھوانا چاہتے تھے، تو اب یہ سوال ہے کہ آپ نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا، یا نہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو اب جناب فاروق رضی اللہ عنہ پر طعن کا سرے سے سوال ہی نہ رہا۔ بلکہ دیگر موافقات عمری کے ساتھ ایک یہ صورت بھی شامل ہوگئی جو آپؓ کی عزت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی منقبت قرار پائیگی۔ اور آپ پر طعن کرنے والوں کے لئے موجب ذلت و بدبختی ہوگی۔ دوسری صورت میں لازم آئے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نافع اور مفید شے ترک فرما دی، آپؐ تو امت پر شفیق، مہربان اور غایت درجہ ہمدرد تھے۔ ایسا کیسے فرما سکتے تھے۔ آپ کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ۔ بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایک رسول آئے ان پر تمہاری تکلیف شاق گذرتی ہے اور تمہارے نفع کے لیے وہ بہت حریص ہیں مومنوں کے حق میں مہربان رحم دل ہیں!

دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تحریر لکھوانا چاہتے تھے وہ (۱) سابق تبلیغ پر اضافہ اور کوئی نئی بات تھی! (۲) اسکی ناسخ یا مخالف تھی یا (۳) اسکی تائید کرنے والی تھی! پہلی اور دوسری صورت میں تو آیت (الیوم اکملت الخ) کی تکذیب لازم آتی ہے، اور تیسری صورت میں امت کی کوئی حق تلفی لازم نہیں آتی۔ خدا کی تاکید اس سے بالاتر تھی! تو جب یہ امت

اللہ تعالیٰ کی تاکید کو خاطر میں نہیں لاتی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید کی کیا قدر کرتی ۔ اور اس خیال کے غلط و باطل ہونیکی نقلی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث قرطاس میں حضرت سعید بن جُبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما صحیحین میں موجود ہے،

اِشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجْعُهٗ فَقَالَ ایْتُوْنِیْ بِکَتِفٍ اَکْتُبْ لَکُمْ کِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ فَتَنَازَعُوْا فَقَالُوْا مَا شَانُهٗ اَهَجَرَ اِسْتَفْهِمُوْهُ فَذَهَبُوْا یَرُدُّوْنَ عَلَیْهِ فَقَالَ دَعُوْنِیْ فَالَّذِیْ اَنَا فِیْهِ خَیْرٌ مِّمَّا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ وَاَوْصَاهُمْ بِثَلَاثٍ قَالَ اَخْرِجُوا الْمُشْرِکِیْنَ مِنْ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ وَاَجِیْزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا کُنْتُ اُجِیْزُهُمْ وَسَکَتَ عَنِ الثَّالِثَةِ اَوْ قَالَ نَسِیْتُهَا وَفِیْ رِوَایَةٍ وَفِی الْبَیْتِ رِجَالٌ مِّنْهُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ قَدْ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَکُمُ الْقُرْاٰنُ حَسْبُکُمْ کِتَابُ اللّٰهِ ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد (سر) شدید تھا آپ نے فرمایا شانہ کی ہڈی، میرے پاس لے آؤ تاکہ اس پر کچھ لکھوں تاکہ میرے بعد تم نہ بھکو۔ پس وہ (حاضرین جن سے خطاب فرمایا تھا) باہم بحث پڑے، اور کہنے لگے، یہ آپ کی کیا کیفیت ہے؟ کیا (درد کی وجہ سے) اختلاط کلام تو نہیں، (فرمان کی وضاحت کے لیے) آپ سے پوچھو تو، پس وہ آپ سے سوال و جواب کرنے لگے، جس پر آپ نے فرمایا" میرے حال کی فکر چھوڑ دو، تم جس حالت کو میری طرف منسوب کر رہے ہو میں اس سے بہتر حال میں ہوں (تم کو جو کہتا ہوں سنو) پھر آپ نے تین باتیں بطور وصیت فرمائیں۔ (۱) مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کر دو (۲) ایلچیوں کو میری طرح انعام دینا جاری رکھو۔ (راوی کہتے ہیں کہ) تیسری بات پر آپ خاموش ہوگئے۔ یا یہ کہا کہ میں بھول گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ گھر میں اسوقت جو لوگ تھے ان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے فرمایا آپ درد کی شدید تکلیف میں ہیں۔ (اپنی بحث سے آپ کو تنگ نہ کرو) تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔ (گمراہی اور بھکنے سے بچانے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) وہ کافی ہے"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بولنے سے پہلے ہی لوگ بحث میں الجھ گئے تھے اور اپنے سوال و جواب سے حضور کی تکلیف میں زیادتی کا موجب ہو رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصہ مختصر کرنے کے لیے ان کو تنبیہہ فرما کر جو بات فرمانا چاہتے تھے فرمادی۔ دوبارہ ان سے یہ نہیں فرمایا کہ دوات قلم کاغذ لاؤ۔ اگر وہ کوئی وحی یا قطعی بات ہوتی اور آپ اس سے سکوت فرماتے تو یہ خلاف عصمت ہوتا، شیعہ خود اس کے اقراری ہیں کہ اس قصہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزید پانچ روز بقید حیات رہے۔ اور رفیق اعلیٰ سے دوشنبہ کو واصل ہوئے، تبلیغ وحی کے لیے اس مدت میں آپ کو کافی وقت اور فرصت ملی۔ نیز یہ بات بھی اس روایت سے معلوم ہوگئی، کہ آپ جو تحریر فرمانا چاہتے تھے وہ دینی امور میں سے کوئی بات نہ تھی بلکہ سیاست مدنیہ، مصالح مملکت اور دنیوی تدابیر کی قسم کی چیز تھی۔ (یہ محسوس فرما کر کہ یہ حضرات کچھ کا کچھ سمجھ کر نئی الجھنوں کی طرف چل پڑے ہیں آپ نے تحریر کے قصہ کو برطرف کر کے اپنا مقصد) بطور وصیت زبانی ہی ارشاد فرمادیا۔ اور تیسری جس کا اس روایت میں ذکر رہ گیا۔ یا راوی اسے بھول گئے جیش اسامہ کی تیاری کے متعلق تھی جس کی صراحت دوسری روایت میں موجود ہے۔

اس دعویٰ کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ موجود صحابہ کرام نے جب دوسری بار دوات و ہڈی کے لیے پوچھا تو آپ نے فرمایا تم مجھے جس کام میں مشغول کرنا چاہتے ہو میں اس وقت اس سے بہتر اور بالاتر کام میں مشغول ہوں۔ یعنی مشاہدہ حق، اور قرب و مناجات الٰہی

ہیں! اگر وہ تحریر دینی امور سے متعلق ہوتی، یا کسی وحی کی تبلیغ کا معاملہ ہوتا تو وہ تو آپ کی نظر میں سب سے بہتر اور خیر و بھلائی، نیز فرض منصبی تھا۔ اس کو تا نوی درجہ میں کیسے رکھ سکتے تھے! علماء امامت کا اس پر اجماع ہے، کہ انبیاء کے حق میں تبلیغ وحی اور دینی احکام کی ترویج سے بڑھ کر کوئی عبادت بہتر نہیں۔ اس روایت سے یہ بھی عیاں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار اصحابؓ کرام کے سامنے اس عالم سے بے تعلقی اور وارستگی کا اظہار فرمایا تو حاضرین پر تاسف و حسرت اور مایوسی غالب آنے لگی، ان کی تسلی خاطر کے لیے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عتاب آمیز خطاب کسی غصہ و ناراضگی کی بنا پر نہیں بلکہ شدت تکلیف کے سبب ہے۔ تم دل تھوڑا نہ کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذریعہ دین و احکام الٰہی کا جو ذخیرہ بشکل کتاب اللہ تمہارے پاس ہے، تمہاری تربیت ہدایت اور تمہارے دین و ایمان کی حفاظت و پاسبانی کے لئے کافی ہے! تو دراصل جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کلام اس گفت و شنید کے بعد حاضرین کی تسلی و تشفی کے لئے ہے اور ان کے اس گمان کے ازالہ کے لیے ہے کہ کہیں ہماری گفتگو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ناراض نہ ہوگئے ہوں۔ اور اس گمان کا قرینہ وہی ہے کہ آپ نے تحریر کے لئے دوبارہ قلم دوات طلب نہیں فرمائی۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، کتابت سے روکنے کی غرض سے یہ کلام نہیں فرمایا تھا۔

بطور تتمۂ کلام یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں فرقوں کے اہل سیر کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قصہ کے وقت وہاں موجود تھے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ ان حضرات پر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شدت تکلیف میں مزید مشقت اور تکلیف سے بچانے کی خاطر کسی تحریر کے حق میں نہ تھے، نہ اس وقت نہ آئندہ ان کی زندگی میں نہ بعد وفات جب آپ مسند خلافت پر متمکن تھے کوئی اعتراض و نکیر نہیں فرمائی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی روایت کسی سنی یا شیعی سے آپ کی جانب منسوب ہو کر بیان کی گئی۔ لہٰذا اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے، تو آپ بھی ان کے ہمنوا تھے! آپ نے بھی اسے درست و جائز قرار دیا۔ سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے، جو ہنوز کم سن تھے، کسی سے افسوس اور حسرت کا اظہار منقول نہیں۔ اگر اس معاملہ میں کسی مہتم بالشان معاملہ سے محرومی کی بات ہوتی تو اصحاب کبار خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ خود اس کا ذکر فرماتے بطور اعتراض نہ سہی بطور تاسف ہی حرف شکایت زبان پر لاتے اگر یہاں کسی کے دل میں یہ شبہ سر ابھارے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کسی اہم دینی بات کے تحریر کرانے کا نہ تھا تو آپ نے لن تضلوا بعدی کے الفاظ کیوں فرمائے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تحریر کے ذریعہ امت کو گمراہی میں پڑنے سے بچانا چاہتے تھے اور گمراہی کے معنے یہی ہیں کہ دین میں کوئی خلل رونما نہ ہو۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ لغت عرب میں ضلال عام ہے جس طرح دینی گمراہی کے لئے اسے استعمال کرتے ہیں دنیوی معاملات میں بد تدبیری کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے، کلام الٰہی میں اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت کہا ان ابانا لفی ضلال مبین اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو مضبوط جتھہ ہیں ان کو نظر انداز کر کے ایک اکیلی جان یوسف (علیہ السلام) کو اتنی اہمیت دیتے ہیں تو ان کا یہ رویہ معاملات دنیوی کے لحاظ سے درست نہیں۔ دوسری جگہ منہ در منہ کہا انک لفی ضلٰلک القدیم۔ (آپ اپنی پرانی   ) اور ان کے خیال میں دنیاوی لحاظ سے یہ روش یوں غلط تھی کہ دنیا میں بڑے اور طاقتور جتھہ دار بیٹے ہی باپ کا دست و بازو ہوتے ہیں، دشمنوں سے وہی نمٹتے ہیں اور آڑے وقت وہی باپ کا سہارا بنتے ہیں۔ ظاہر ہے برادران یوسف (علیہ السلام) کافر تو تھے نہیں کہ اس لحاظ سے ایسے عالی مرتبت پیغمبر باپ کو دین سے گمراہ بتاتے یا ایسا اعتقاد رکھتے، ان کی مراد دنیاوی بے تدبیری ہی ہوسکتی ہے، کہ کام کاج کے لائق لڑکوں کو جو ہر وقت خدمت کے لئے کمربستہ ہیں پیار نہیں کرتے، دوست نہیں رکھتے، اور کم عمر محنت و خدمت سے قاصر بیٹے کو محبت سے زیادہ عشق

کی حد تک چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں بھی تضلوا- سے تدابیر ملکی میں خطا کاری ہے نہ دینی گمراہی - (چنانچہ بطور وصیت جو تین باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں وہ مدنی، و ملکی معاملات سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ مشرکین عرب کو جزیرہ سے نکالنا، ایلچیوں اور سفراء کو انعامات سے نوازنا اور جیش اسامہ کی تیاری، یہ سب باتیں مصالح ملکی و مدنی تھے۔ اور ایسی تدابیر تھیں جن کا براہ راست فائدہ ملک و مملکت کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ پہلا، مشرکین عرب کی نال کہیں اور کہاں گڑی تھی کہ وہاں سے نکل کر شاد و آباد رہتے! نہ کہیں ان کی ننھیال و ددھیال تھی نہ سسرال کہ وہاں جاکر سر چھپا لیتے۔ یا وہاں کے لوگ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے، لامحالہ انہیں عرب ہی میں رہنا تھا لہٰذا فی دین اللہ افواجا۔ فوج در فوج مسلمان ہوئے۔ سفراء کی آؤ بھگت، انعام اکرام سراسر مملکت کے فائدہ کی تدبیر تھی کہ ان پر اچھا تاثر قائم ہوگا تو منہ سے تعریف ہی نکلے گی اپنی اپنی مملکتوں میں جاکر وہ مسلمانوں کے لطف و عنایت، خاطر تواضع اور جود و سخا ہی کی تعریف کریں گے، جس کے ذریعہ غیروں کے دلوں میں نفرت و عداوت کے بجائے انس و محبت کی راہ کشادہ ہوگی، کم از کم ان کی ریشہ دوانیوں سے تو مملکت بچی رہیگی۔ جیش اسامہ والی تدبیر تو استحکام ملکی کے لئے اتنی موثر تھی کہ عرب و غیر عرب سب پر دھاک بیٹھ گئی، اور بدخواہ و بداندیش جو منصوبے رکھتے تھے سب خاک میں مل گئے۔ اگر جیش اسامہ بروقت روانہ نہ ہوتا تو خلافت راشدہ کے استحکام کا تو کیا سوال مکہ و مدینہ میں مسلمانوں کا ٹکنا محال ہو جاتا۔ نعمانی)

اور اس پر دلیل قطعی یہ ہے کہ جب تیئیس سال تک وحی کا نزول قرآن و حدیث کی تبلیغ ان کی ہدایت کے اور ان کی گمراہی دور کرنے کے لئے کافی نہ ہوئے، تو یہ چند سطور کی تحریر ان کی گمراہی اور بہکنے سے کیسے کافی ہو جاتی! پھر یہاں بکار خویش ہوشیار قسم کے لوگوں کے دل میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کے متعلق کوئی تحریر لکھوانا چاہتے ہوں اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مداخلت سے یہ اہم کام کھٹائی میں پڑگیا۔ تو ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے لئے خلافت ہی کی بات منظور خاطر مبارک ہوتی تو اسکی دو ہی صورتیں ہوتیں یا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا معاملہ ہوتا، یا جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا!

پہلی صورت کے متعلق اسی مرض کے دوران ایک اور مرتبہ آپ کے قلب مبارک میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ارادہ بھی فرمایا مگر پھر خود ہی اسکو ترک فرماکر معاملہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور کے حوالہ فرمایا۔ اس ارادہ کے التوا میں نہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا دخل ہوا نہ کسی اور کا۔ آپ کے علم میں یہ ایک ہونے والی بات تھی، اس لئے اس کے لکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی۔ حدیث کی معروف و مشہور کتاب صحیح مسلم میں ہے کہ اسی بیماری کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا،

ادْعِي لِي أَبَاكِ وَأَخَاكِ أَكْتُبُ لَهُمَا كِتَابًا فَإِنِّي أَخَافُ أَنْ يَتَمَنَّى مُتَمَنٍّ وَيَقُولُ قَائِلٌ وَلَا وَيَأْبَى اللَّهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ

تم اپنے والد اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ کہ ان کے لئے ایک تحریر لکھوادوں، مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آرزومند، اسکی آرزو کر رکھے اور کہے کہ میں اسکا حقدار ہوں کوئی دوسرا نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر کے علاوہ قبول نہیں کریں گے۔

یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہاں تھے کہ انہوں نے اس وصیت کی تحریر سے روک دیا ہو۔

دوسری صورت ہوتی تو اس کے لئے کسی تحریر کی حاجت نہ تھی، کیونکہ اس واقعہ سے پہلے میدان غدیر خم میں ہزاروں افراد کے مجمع میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی ولایت پر خطبہ دے چکے تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ہر مومن مرد و عورت کا مولیٰ قرار فرما چکے تھے

اور یہ قصہ مشہور عوام اور زبان زد خلق تھا۔ اگر اتنی پابندی، تاکید، شہرت اور تواتر کے باوجود بھی عمل نہ کریں تو چند حضرات کے سامنے لکھی ہوئی نجی تحریر ان پر کیا اثر ڈالتی۔

حاصل کلام یہ کہ کسی بھی صورت میں اس تحریر سے روک دینے سے امت کی حق تلفی نہیں ہوتی، نہ مہمات دینی پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ ان کا یہ خیال باطل بھی امام مہدی کی غیبت کے لغو خیال کا چربہ ہے۔ کہ اسکی حقیقت بھی وسوسہ اور وہم کے سوا کچھ نہیں، اور وہم کی بیماری کا علاج کسی کے پاس بھی نہیں، حتیٰ کہ لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں۔

اعتراض (۲) دوسرا طعن و اعتراض یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا مکان جلا دیا۔ اور آپ کے پہلوئے مبارک میں تلوار کا کچوکا دیا کہ اس کے صدمہ سے آپ کا حمل ساقط ہوگیا، یہ قصہ سراسر بہتان اور بدترین افترا اور جھوٹ ہے اسکی کوئی اصلیت نہیں۔ اس لئے امامیہ حضرات کی اکثریت اس قصہ کی قائل ہی نہیں۔ اتنا کہتے ہیں کہ گھر جلانے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ ارادہ عمل میں نہیں آسکا۔ حالانکہ قصد و ارادہ دل کی کیفیت ہے جس پر خدا کے سوا کوئی مطلع نہیں ہوسکتا۔

اگر ان کی مراد یہ ہو کہ آپ نے زبانی طور پر ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ میں اسکو جلا دوں گا تو یہ ڈراوا اور دھمکی بھی ان لوگوں کے لئے تھی جو جناب سیدہ کے مکان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرتے، جو ہر خائن کا ملجا اور جائے پناہ تھا اور جسے انہوں نے حرم مکہ کا درجہ دے رکھا تھا، اور خلیفہ اول کی خلافت کے خلاف فساد انگیز مشورے کرتے اور منصوبے بناتے اور فتنہ و فساد بپا کرنے کی تدبیریں سوچتے۔ خود جناب سیدہ زہرا ان کی نشست اور فساد انگیز حرکات سے شاکی اور نالاں تھیں۔ مگر حسن خلق کے سبب کھلم کھلا ان کو اپنے یہاں آنے سے منع نہ کرسکتی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان حالات کا علم ہوا اور حقیقت واقعہ سے آگاہی ہوئی، تو آپ نے ان جمع ہونے والے فسادیوں سے کہا کہ اگر تم اپنی فساد انگیز حرکات سے باز نہ آئے تو گھر سمیت تم کو جلا دوں گا۔ جلانے کی دھمکی کی تخصیص ایک لطیف و باریک استنباط پر مبنی ہے جو آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے فرمایا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو نماز کی جماعت میں شریک نہیں ہوتے اور امام کی اقتدا نہیں کرتے تھے اسی قسم کی دھمکی دی تھی کہ اگر یہ لوگ ترک جماعت کرتے رہے اور اس سے باز نہ آئے تو میں ان کو مع ان کے گھروں کے جلا دوں گا۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے مقرر فرمودہ پیش امام تھے، اور یہ سازشی لوگ امام حق کی اقتدا چھوڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور مسلمانوں کی جماعت سے رشتہ رفاقت توڑنے پر کام کر رہے تھے اس لئے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تہدید کے مستحق قرار پائے۔ لہٰذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے ملتا ہے جو فتح مکہ کے وقت ظہور میں آیا تھا۔ جب فتح مکہ کے دن آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ابن خطل (جو کفار کا شاعر تھا جس نے بارہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجو میں اشعار کہے اور روسیاہ ہوا) حرم کعبہ میں جا چھپا ہے اور اس کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا وہ جہاں چھپا ہے وہیں اسکو قتل کر دو اور کسی بات کا لحاظ نہ کرو۔ تو ایسے لعنتی اور پھٹکار مارے راندۂ درگاہ الٰہی لوگوں کو خانۂ خدا میں بھی پناہ نہیں تو خانہ زہرا رضی اللہ عنہا میں ان کو امان کیسے مل سکتی ہے۔ اور جناب زہرا رضی اللہ عنہا کو ایسے فسادیوں کی سزا پر تکدر کیوں ہونے لگا۔ علاوہ ازیں خود ان سے بھی ایسی صحیح روایات منقول ہیں کہ جناب زہرا رضی اللہ عنہا خود بھی ان لوگوں کو اس طرح جمع ہونے سے منع فرماتی تھیں! اور اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فعل سے بدرجہا کم ہے، کہ شہادت ذوالنورین جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب آپ مسند آرائے خلافت ہوئے تو وہ لوگ جو آپ کی خلافت کا تختہ الٹنے کے

منصوبے اپنے ذہنوں میں رکھتے تھے، مدینہ منورہ سے بھاگ کر حرم مکہ میں جا پہنچے۔ قاتلین عثمان سے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کے ہمنوا ہو گئے اور حرم محترم جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گئے تو ایسے لوگوں کو آپ نے قتل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور اپنی ماں، بلکہ ام المؤمنین کی حرمت و عزت کا کوئی پاس نہ کیا۔ اس سلسلہ میں حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ تکلیف پہنچی، اور جو اہانت و ذلت۔ اٹھائی واظہر من الشمس ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو صواب و درست ہی کہیں گے۔ کیونکہ اس قسم کے اہم امور میں جو عام فتنہ و فساد کا سبب بن سکتے ہوں انفرادی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا اور فتنہ کے مبادی و مقدمات کو نظر انداز کر دینا ان کے دفعیہ کی کوشش نہ کرنا دین و دنیا کے معاملات میں بے تدبیری سمجھی جائے گی۔ تو جس طرح سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی جائے قیام و سکونت لائق عزت تھی، اسی طرح ام المومنین جو حرم محترم رسول، آپکی محبوب زوجہ، اور محبوبۂ الٰہی بھی تھیں۔ آپ بھی واجب الاحترام اور لائق تعظیم تھیں بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو ڈرانے کی غرض سے اور تہدید و ترہیب کی بنا پر محض قول ہی صادر ہوا تھا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو اس کو عمل کی بھی آخری حد تک پہنچا دیا۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق زبان طعن دراز کرنا تعصب و عناد پر مبنی ہے! حالانکہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا قول جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فعل سے باعتبار درجہ بہت ہی کم اور ہلکا تھا۔

اب اگر اہل سنت پر الزام دینے کی خاطر فرق پیدا کر کے یہ کہا جائے کہ چونکہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق تھی لہٰذا انتظام مملکت کی حفاظت ضروری اور اولیت رکھتی ہے، اس کے مقابلہ میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کا پاس اور حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ وہاں ساقط ہو گا۔ اور خلافت جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ ناحق تھی اس لئے خلافت فاسدہ" کے انتظام کے تحفظ کے لئے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے احترام کا لحاظ نہ کرنا وبال اور قابل اعتراض بات ہوگی۔ تو یہ فرق ہمارے نزدیک انتہائی حماقت، نادانی اور بے عقلی کی بات ہے، اس لئے کہ اہل سنت تو دونوں خلافتوں کو برابر سمجھتے اور برحق مانتے اور جانتے ہیں خصوصاً ایسے وقت کہ اعتراض حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر کیا جارہا ہے کیونکہ ان کے نزدیک تو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حقیقت خلافت متعین ہو چکی تھی اور اس وقت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا مخالف اور ہمسر بھی میدان میں دعوائے خلافت کے ساتھ موجود نہ تھا جس کی مخالفت کچھ بھی اہمیت رکھتی ہو تو منظم اور برحق خلافت کے خلاف سازشیں کرنا اور منصوبے بنانا خصوصاً جبکہ جوش اسلام کی نشوونما ہو رہی تھی اور دین وایمان کے پودے نے جڑ ہی پکڑی تھی سوائے قتل کو واجب کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے سازشیوں کو اسوقت قتل بھی کر دیتے تو یہ جائز اور حق تھا۔ انہوں نے تو صرف ڈرا دھمکا کر ہی جان بخشی کر دی! اور تعجب تو ان شیعہ فضلاء پر ہوتا ہے جنہوں نے اس واقعہ کو نمک مرچ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر اپنا خبث و بغض سب پر عیاں کر دیا ہے کہ جن جوانوں کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ڈرا دھمکایا تھا ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی جناب زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور اس کے بعد جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا نے بنی ہاشم کے نوجوانوں اور زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر پر مجلس برپا کرنے اور اکٹھے ہونے سے منع فرمایا!

سبحان اللہ! کیا انوکھی منطق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف جناب زبیر رضی اللہ عنہ فساد کے منصوبے بنائیں تو وہ معصوم بے خطا اور واجب التعظیم ہوں۔ اور جب یہی زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص طلب کرنے میں لہجہ تند و درشت رکھیں تو واجب القتل قرار پائیں! جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہ کے مکان میں جب لوگ فتنہ و فساد برپا کرنے کے منصوبے بنائیں۔ سازشیں کریں تو وہ مقبول و پسندیدہ ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب زوجہ

جو بلا شبہ ام المؤمنین تھیں۔ کی قیادت و سرکابی میں قصاص کا دعویٰ یا قاتلین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شکایت میں زبان کھولیں تو نا مقبول اور مردود القول قرار دیئے جائیں! ایسا لچر اور واہیات فرق اصول شیعہ ہی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اہل سنت پر اپنے ہی اصولوں سے الزام تھوپنا چاہیں، تو سیدھا سیدھا کہیں، اس ایچ پیچ کی کیا ضرورت ہے! جب رسول اللہ علیہ وسلم نے ترک جماعت پر جو سنت مؤکدہ تھی، اور اس کا دائرہ صرف مکلفین تک محدود تھا۔ اس کے ترک سے عامۃ المسلمین کو کوئی خطرہ یا نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ اس سبب کے باوجود ان تارکین جماعت کے گھروں کو جلانے کی تہدید فرمائی۔ تو ایسے فتنہ و فساد پر جس سے پوری ملت اسلامیہ کے متاثر اور خونچکاں ہونے کا خطرہ ہو، اور دین کو ملیا میٹ کرنے کا سامان ہو، تو ایسی سازش گاہ کو جلانے کی دھمکی کیوں جائز نہ ہو!

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان میں اس وقت تک داخل نہ ہوں جب تک دروازہ پر کے منقش و باتصویر پردہ نہ اتار لیا جائے۔ یا خانۂ خدا حرم کعبہ میں اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں جب تک وہاں موجود حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مجسمے نہ نکلوا دیں۔ تو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی متبرک اور مکرم مقام کو جہاں فتنہ انگیز تدابیر سوچی جا رہی ہوں، حاضرین سمیت جلا دینے کی دھمکی دیں تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ ادب کی رعایت نہ کرنے کی ہو سکتی ہے تو یہ معلوم ہو گیا ایسے اہم اور مہتم بالشان امور میں ادب کی رعایت اور لحاظ نہیں کیا جا سکتا، جناب امیر رضی اللہ عنہ کا اپنا رویہ اس کا ثبوت اور دلیل ہے۔ کیا یہ شیعہ لوگ دنیا کو یہ باور کرانا اور جناب امیرؓ پر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ آپ محبوبۂ رسول ام المومنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ادب نہیں فرماتے تھے اور آپ کی نظر میں آپ کے لئے کوئی اعزاز کوئی احترام نہیں تھا! دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود آپ کا رویہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے ہمراہیوں کے ساتھ جو درشت ہوا تو وہ نظم مملکت کی حفاظت کا تقاضا تھا۔ اس کو اہانت و بے قدری صدیقہؓ محمول شیعہ ذہن ہی کر سکتا ہے! لہٰذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسا فعل سرزد ہو جو فعل معصوم سے ملتا ہو تو وہ کس منطق سے محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے!

اعتراض (۳) بطور طعن یہ کہتے ہیں کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا انکار کیا، اور قسم کھائی کہ آپؐ کا وصال نہیں ہوا، یہاں تک کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (تم بھی مرو گے اور وہ بھی مریں گے)۔

یہاں بھی بات سمجھ کے پھیر کی یا بغض و عناد کی ہے۔ یا پھر اعتراض برائے اعتراض کا معاملہ ہے! ورنہ کیا ایسے شخص پر ایسی حالت میں طعن کیا جا سکتا ہے جو محبت رسول میں سرتاپا غرق ہو، اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کی شدت کے مشاہدہ اور اچانک رحلت کی اندوہناک خبر اور آپؐ کے فراق کے صدمہ سے اپنے ہوش و حواس عقل و فہم سے اتنا بیگانہ ہو گیا ہو کہ اسے اپنی سدھ بدھ بھی نہ رہی ہو حتیٰ کہ اسے اپنا اور اپنے باپ کا نام بھی یاد نہ آرہا ہو نہ وہ یہ سمجھ پا رہا ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اگر ایسی مدہوشی و بے خبری میں انتہائے محبت کے باعث محبوب کی موت سے انکار کر بیٹھا ہو تو یہ طعن کا موقعہ نہیں تعریف کا مقام ہے!

(ایسی آنکھ پھوڑ دینے کے لائق ہے جو ہنر کو عیب دکھائے) اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی حالت میں آیت بالا ذہن میں حاضر نہ کر پائے ہوں تو یہ کونسے تعجب کی بات ہے بہت سے لوگوں کو غم و اندوہ اور جزع فزع کے عالم میں آیات قرآنی یاد نہیں رہتیں لیکن بحکم بشریت یہ مستحق طعن اور لائق ملامت نہیں ہوتے! خود انہیں شیعوں کی صحیح روایات سے جو سابقاً بیان ہو چکی ہیں

یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کے وقت یہ بھی بھول گئے کہ وہ قریب ہے اور مکانیت سے پاک اور بری ہے ! حالانکہ آپؑ اسوقت حیرت و مدہوشی کی کیفیت سے دوچار بھی نہ تھے !

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسی حالت میں جو ان کے نزدیک قیامت سے کم نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے جواز سے بے خبری ہو گئی تو اس میں کونسا گناہ ہوگیا ! نسیان و ذہول لوازم بشریت سے ہیں، یا دداشت ایک صدمہ عظیم کے سبب سُن اور غیر مؤثر ہو گئی تھی، ذہول و نسیان تو ہوش و حواس اور پوری بیداری ذہن کی حالت میں بھی محترم و مقدس حضرات سے وقوع پذیر ہوا ہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام بالاجماع نبی معصوم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاکید کے باوجود مچھلی کے دریا میں چلے جانے کے واقعہ کو بھول گئے ! اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود جناب خضر علیہ السلام سے پختہ وعدہ کر لینے کے پیش آمدہ واقعہ کی مذمت کے سبب اپنا قول یاد نہ رکھ سکے ! اور ایک دفعہ نہیں تین مرتبہ ایسا ہوا۔ اور ابو البشر اور اصل انبیاء علیہم السلام حضرت آدم کے نسیان پر خود قرآن مجید میں شہادت موجود ہے، اور نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نسیان لاحق ہونے کا بیان و ثبوت تو خود ان کی کتاب کافی کلینی میں موجود ہے۔ اور ابو جعفر طوسی اور دیگر امامیہ نے اسکو صحیح درست بتایا ہے ! اس کے علاوہ ابو جعفر طوسی نے عبد اللہ حلبی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ۔

اِنَّ الامامَ عَبْدَ اللّٰهِ كَانَ يَسْهُوْ فِيْ صَلَاتِهٖ وَيَقُوْلُ فِيْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ. بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلَّمَ

امام عبد اللہ اپنی نماز میں بھول جاتے تھے اور سجدہ سہو میں بجائے تسبیح، بسم اللہ و باللہ وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنے لگتے !

پس اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سانحۂ قیامت خیز و ہوش ربا میں ایک آیت بھول گئے تو طعن کی کیا بات ہے۔

اعتراض (۴) اعتراض یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض ایسے شرعی مسائل سے ناواقف تھے، جن کا جاننا خلافت و امامت کے اہم امور میں سے ہے ! ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ آپؓ نے ایک حاملہ عورت کو حالت حمل میں رجم کرنے کا حکم دیا۔ اس پر جناب علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو منع کیا اور فرمایا۔ اِنْ كَانَ لَكَ عَلَيْهَا سَبِيْلٌ فَلَيْسَ لَكَ عَلٰى مَا فِيْ بَطْنِهَا سَبِيْلٌ۔ اگر آپ کو اس عورت پر قابو ہے تو جو اس کے پیٹ میں ہے اس پر تو قابو نہیں ! یہ سنکر آپ نادم ہوئے اور فرمایا لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ۔ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا تھا) دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آپ ایک پاگل عورت کو رجم کرنا چاہتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا۔ اور یہ حدیث پڑھی۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَبْلُغَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يُفِيْقَ.

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین شخصوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔ سونے والے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے، پاگل سے جبتک وہ اچھا نہ ہو جائے،

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپؓ نے اپنے صاحبزادہ ابو شحمہ رضی اللہ عنہ پر جو دوران حد فوت ہو گئے تھے بحالت مردگی، بھی بقیہ کوڑے لگوائے حالانکہ مردہ کو حد لگوانا خلاف عقل بھی ہے اور خلاف شرع بھی !

چوتھا مسئلہ یہ کہ آپؓ کو شراب پینے کی حد کا بھی علم نہ تھا، وہ آپ نے لوگوں کے صلاح مشورہ سے مقرر کی ! ان باتوں سے پتہ چلا کہ آپ کو تو شریعت کی ظاہری باتوں کا بھی علم نہ تھا تو خلافت کی کیا لیاقت رکھتے ہوں گے !

جواب :- ان اعتراضات کا یہ ہے کہ یہاں بھی یہ خیانت کی عادت بد سے باز نہیں آئے قصہ کا ایک ٹکڑا اٹھایا، اور باقی کو ہضم کر گئے محض اس لیئے کہ طعن کر کے خبث باطن ظاہر کرنے کا موقعہ ہاتھ سے نہ نکل جائے اور یہ رویہ متعصب معاندہی کا ہو سکتا ہے جیسا کہ یہود کہتے تھے ۔ اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ (اللہ تو فقیر ہے ہم مالدار ہیں)

حاملہ کے رجم کا قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ تھا۔ اور ظاہر ہے حمل کا اظہار پورے دنوں، ولادت کے قریب ہی ہوتا ہے ۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم تھا۔ تو آپؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کیفیت سے مطلع فرمایا تو آپ نے بطور تشکر یہ کلمات فرمائے۔ کہ اگر میں اسباب سے ناواقف رہتا اور عورت وبچہ اس حد کے اجراء سے ہلاک ہو جاتے تو بیٹ کے اس بچہ کی ہلاکت پر مجھے اتنا افسوس اور صدمہ ہوتا جو میری ہلاکت کے برابر ہوتا۔ اگر علی رضی اللہ عنہ، بروقت مجھے اطلاع نہ دیتے تو میں اندوہ وغم سے ہلاک ہو جاتا! اب یہ بات باتفاق شیعہ وسنی امام پر لازم نہیں کہ زانیہ کے خود اقرار، یا گواہوں کی شہادت کے بعد زانیہ سے یہ پوچھے تو حاملہ ہے یا نہیں ۔ بلکہ یہ عورت کو خود چاہیئے کہ وہ حاملہ ہو تو اس کو ظاہر کر دے، تو ایسا حکم جو حقیقت حال سے ناواقفیت کی بنا پر صادر ہو، اور اصل حقیقت کچھ اور ہو جس کا تقاضا اس کے خلاف ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت حال سے لاعلمی تو کہہ سکتے ہیں جو نہ امامت وخلافت میں نقص کا باعث ہے نہ نبوت میں۔ اسے جہل ونادانی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا!

دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بے خبری ہی کی بنا پر اپنے بھائی کی داڑھی پکڑی، سر کے بال کھینچے ۔ اور ان پر غصہ ہوئے۔ اور ان کی اہانت کی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے بھائی کی عزت وتکریم کے حکم سے جاہل نہ تھے! اور خود سرور عالم وعالمیان صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے تھے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَّ اِنَّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَاِنَّ بَعْضَکُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَمَنْ قَضَیْتُ لَہٗ بِحَقِّ اَخِیْہِ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃً مِّنَ النَّارِ۔

بے شک میں بشر ہوں، تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو تم میں سے بعض دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اگر میں اس سے متاثر ہو کر اسکو اسکے بھائی کا حق دیدوں تو یہ سمجھنا کہ میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ جب ابیض بن حمال رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے کانِ نمک عطا فرمانے کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے اطلاعی کے سبب اسے مرحمت فرمادی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کان تو تیار ہے بغیر کسی عمل و کاریگری کے اس سے تو نمک بنا بنایا، نکل رہا ہے تو آپؐ نے اسے یہ خیال فرما کر واپس لے لیا کہ یہ تو تمام مسلمانوں کا حق ہے اور سب کا مفاد اس سے وابستہ ہے کسی ایک شخص کی ذاتی ملکیت میں آنا مناسب نہیں! اسی طرح جامع ترمذی میں بروایت صحیح وائل بن حجر کندی سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک مسماۃ نماز میں شرکت کے لیے گھر سے نکلیں، گلی میں کسی نے اس کو پکڑ کر بالجبر زنا کیا۔ اس کے شور مچانے پر زانی تو بھاگ گیا۔ مگر کسی دوسرے راہگیر کی طرف عورت نے اشارہ کر دیا کہ اسی نے زبردستی مجھے بے آبرو کیا ہے، لوگ ان کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کا حکم جاری فرما دیا۔ رجم شروع ہی ہونے والا تھا کہ اصل مجرم اقراری ہو گیا۔ اور کہنے لگا یارسول اللہ، یہ شخص بے گناہ ہے زنا میں نے کیا تھا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے قصور سے معذرت فرمائی اور اصل مجرم کو رجم کا حکم فرمایا۔ پھر ایک اور حدیث متفق علیہ جو دونوں فرقوں کی کتابوں میں مذکور ہے یوں مروی ہے،

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَرَ عَلِیًّا بِاِقَامَۃِ الْحَدِّ عَلٰی اِمْرَأَۃٍ حَدِیْثَۃٍ بِنِفَاسٍ فَلَمْ یُقِمْ عَلَیْھَا الْحَدَّ خَشْیَۃَ اَنْ تَمُوْتَ فَذَکَرَ ذٰلِکَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَحْسَنْتَ دَعْھَا حَتّٰی یَنْقَطِعَ دَمُھَا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا اس عورت پر حد جاری کرنے کا جو نفاس کی حالت میں تھی۔ مگر آپ نے اس ڈر سے کہ کہیں وہ مر نہ جائے اس پر حد نہیں لگائی۔ اور اس کا اظہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا تم نے اچھا کیا۔ اسے خون کی مدت گذر جانے اور خون بند ہو جانے تک ملتوی رکھو!

ان سب کے علاوہ نواصب نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر بھی اسی قسم کے طعن و اعتراض ثابت کئے ہیں مثلاً آپؓ نے شراحہ ہمدانیہ پر دونوں حدود (رجم اور درّے) بیک وقت جاری کیں۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھیں۔ اور آپؓ کا یہ فعل شریعت کے دونوں خلاف ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز اور غامدیہ کو رجم کیا۔ اور عقل کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ جب رجم کی سزا جو سخت ترین ہے اس پر جاری ہونی واجب ہے تو اس سے ہلکی سزا درّے کیوں لگائے جائیں۔ اہل سنت تو اس معاند فرقہ کو یہ جواب دیتے ہیں کہ ابتداً اس کے شادی شدہ ہونے کا علم نہیں تھا اس لئے کوڑے لگوائے، مگر جب معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے تو سنگسار کرایا۔ (مگر شیعوں کے مذکورہ بالا طعن کی موجودگی میں ان کا کیا منہ ہے کہ وہ معاند کو کوئی مسکت جواب دے سکیں۔) تو اسے دو حدود کا جمع کرنا نہیں کہہ سکتے!

حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت حال سے لاعلمی اور چیز ہے اور شرعی مسئلہ کا نہ جاننا اور چیز، اور جو شخص اتنا جاہل ہو کہ وہ ان دونوں میں فرق کرنے کی بھی تمیز نہ رکھے وہ قابل خطاب ہی کب ہے! اور یہی صورت پاگل عورت کو رجم کرنے میں درپیش تھی کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کے پاگل ہونے کا علم نہ تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ بحوالہ عطاء بن سائب رحمہ اللہ علیہ ابو ظبیان جنبی رحمہ اللہ علیہ سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ لوگ ایک عورت کو بجرم زنا پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لائے ثبوت جرم کے بعد آپؓ نے اسے رجم کی سزا دی، لوگ باگ اسے پکڑ کر سزا کے لئے لے جا رہے تھے کہ اتفاقاً حضرت علی رضی اللہ عنہ مل گئے، آپ نے پوچھا کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ لوگوں نے بتایا کہ رجم کے لئے! آپؓ نے ان سے عورت کا ہاتھ چھڑایا اور خود اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے اور فرمایا میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، یہ پاگل ہے اور فلاں قبیلہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجنون پر احکام تکلیف جاری نہیں ہوتے۔ یہ حال معلوم ہونے پر جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے رجم کا حکم موقوف فرما دیا! معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسئلہ تو جانتے تھے، مگر اس کے پاگل پن سے واقف نہ تھے اس لئے اسکی حالت کا علم ہوتے ہی آپ نے اسکی سزا موقوف کر دی! بہت سے پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ پاگل پنے کی کوئی حرکت نہ کریں بظاہر نارمل اور سمجھ دار نظر آتے ہیں اس لئے کہ صورت تو پاگل و عاقل کی ایک سی ہی ہوتی ہے، حس اور عقل سے کسی کا جنون معلوم نہیں ہوتا۔ یہ عورت پکڑ دھکڑ سے لے کر اثبات جرم کے مرحلے اور سزا کا حکم جاری ہونے تک کی دوران سے گذری اور اس کی کسی بات اور کسی حرکت سے اس کا جنون ظاہر نہیں ہوا، تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیوں مطعون ہوتے، اور یہ مسئلہ اپنی جگہ طے ہے کہ امور عقلیہ و حسیہ سے عدم واقفیت نبوت کے لئے بھی نقص نہیں تو خلافت امامت میں کیسے نقص ہوگا،

اور اوراق ماسبق میں شریف مرتضیٰ شیعی کی کتاب الغرر والدرر سے یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ قبطی کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا کہ وہ سالم العضو ہے، یا مقطوع العضو! جو جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آتا تھا۔ (اور ان کا چچا زاد بھائی تھا) اسی طرح اس عورت کے متعلق بھی یہ علم نہ تھا کہ وہ تازہ زچہ ہے اور ایام نفاس میں ہے۔

تو اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کسی عورت کے حاملہ یا پاگل ہونے کا علم نہ ہو سکا تو خلافت و امامت کی کونسی شرط

میں فرق آگیا۔ خلافت کی شرط احکام شرعی کا جاننا ہے حسیات اور عقلیات جزئیہ کا جاننا شرط نہیں! اور بالفعل احکام شرعیہ کا
کا جاننا نہ نبوت میں شرط ہے نہ خلافت و امامت میں، ہاں نبی کو احکام شرعیہ بذریعہ وحی معلوم ہوتے ہیں۔ اور امام کو اجتہاد سے
اور اجتہاد میں کبھی غلطی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ترمذی کے حوالہ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت گزر چکی
جس کا ماحصل یہ تھا۔ کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مرتدوں کو جلوا دیا تھا، اسکی خبر حضرت عبداللہ بن عباس رضی
اللہ عنہما کو ہوئی تو آپ نے اس پر نکیر فرمائی کہ ان کو قتل کرنا چاہیئے تھا جلانا نہیں چاہیئے تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
مرتد کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور آگ کے عذاب سے منع فرمایا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کہنے کی اطلاع ہوئی تو آپ
نے فرمایا ابن عباس نے سچ فرمایا، معلوم ہوا کہ اس قسم کی اجتہادی غلطی بھی موجب طعن و اعتراض نہیں نہ اس پر ملامت کی گنجائش
ہے۔ چہ جائیکہ بے خبری، عدم علم وہ بھی ایسے موقعہ پر جہاں اس سے واقف و باخبر ہونا ضروری نہیں۔ کیسے ملامت وطعن کا
محل بن سکتے ہیں!

یہاں ایک بڑی پیچیدہ اور مشکل صورت حال کا سامنا ہے! خاص کر شیعوں کے لئے کیونکہ نواصب کو بہانہ ہاتھ آگیا ہے وہ کہتے ہیں
کہ تین مرفوع القلم لوگوں کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود روایت بیان فرماتے ہیں مگر دوسری طرف کتب شیعہ میں یہ روایت ہے کہ
اِنَّ عَلِیًّا کَانَ یَأْمُرُ بِاِقَامَۃِ حَدِّ السَّرِقَۃِ عَلَی الصَّبِیِّ قَبْلَ اَنْ یَّحْتَلِمَ۔ (جناب علی رضی اللہ عنہ) نابالغ لڑکے پر چوری
کی حد جاری کرنے کا حکم فرماتے تھے! محمد بن بابویہ قمی نے اپنی کتاب "مَنْ لَا یَحْضُرُہُ الفقیہ" میں یہ روایت بیان کی ہے!
آپ کا یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے صریح خلاف ہے۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ نافذ ہو بھی جاتا تو ایک مخصوص
پاگل عورت ہی اس کی زد میں آتی، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے تو ہر بچہ کا ہاتھ چوری کی سزا میں کاٹا جائے گا اور یوں
ہزاروں بچے لنجے ہو جائیں گے۔ اب اس کا وبال شیعوں پر ہے۔ وہ کیا جواب دیتے ہیں وہ جانیں، اتنا ضرور ہے کہ یہاں وہ تقیہ کی
آڑ بھی نہیں لے سکتے کیونکہ بچوں پر حد عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کا مذہب نہیں تھا۔ ہاں اگر پاگل عورت کو سزا دیتے تو تقیہ کا عذر چل
سکتا تھا۔ مگر وہاں تو خود آپ ہی نے حق ظاہر فرما کر ان کو رجم سے روک دیا! ہاں اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہاں کوئی اشکال
نہیں اس لئے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس شیعی روایت کو تسلیم ہی نہیں کرتے، بلکہ اسے افتراء اور بہتان قرار دیتے ہیں،
اور ان کے نزدیک ابن بابویہ کا اس روایت کو بیان کرنا ہی اس کے کذب اور غلط ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اور اتنا نواصب بھی
جانتے ہیں۔ (نہ جانتے ہوں تو جان لیں) کہ شیعی روایات کے حوالہ سے وہ اہل سنت کو الزام نہیں دے سکتے!

رہا مردہ پر حد لگانے کا معاملہ تو وہ تو سرتاپا جھوٹ اور افتراء کی پوٹ ہے! اہل سنت کے ہاں اس کے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی
اس لئے اس کے جواب کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ صحیح روایات یہ ہیں کہ ابو شحمہ رضی اللہ عنہ حد لگائے جانے کے بعد بھی زندہ رہے۔
البتہ دوران حد اُن پر بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اسی کو کسی نے مرنا سمجھ لیا ہو۔

اور ان کا یہ اعتراض کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شراب نوشی کی حد کا علم نہیں تھا آپ نے دوسروں سے پوچھ پاچھ کر اس کی حد مقرر کی۔
یہ ایک عجیب قسم کا طعن ہے کیونکہ جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کا نہ جاننا کوئی عیب یا نقص کی بات نہیں جبکہ شرع میں اس کی حد
بندی بھی نہ کی گئی ہو۔ اس لئے کہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ (جب ایک چیز موجود ہی نہیں تو اس کا علم کیسے ہوگا۔) حضور اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں شراب کی حد معین نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہی بلا تعین، چابک، بٹی ہوئی چادر جوتیوں یا ہاتھ کی چھڑی
سے چند ضربات لگاتے تھے۔ جناب صدیق اکبر کے عہد میں جب چند اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا تخمینہ لگایا تو گنتی چالیس تک پہنچی

اور جب خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہونے لگے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشورہ کے لئے جمع کئے گئے اور ان سے مشورہ طلب کیا گیا حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ اور بعض روایات کے مطابق جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کہ آپ بھی جناب امیر کے ہم رائے تھے۔ دونوں حضرات نے تجویز فرمایا کہ شراب نوشی کی حد کو حد قذف کے برابر یعنی اسی کوڑے رکھی جائے، اس لئے کہ شراب پی کر آدمی مست ہو جاتا ہے، اسی مستی میں وہ عقل سے بیگانہ ہو کر واہی تباہی بکتا ہے گالی بھی دیتا ہے اور تہمت بھی لگاتا ہے۔

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس لطیف استنباط کو پسند کیا اور اسی حد پر سب کا اجماع ہو گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ شراب نوشی کی حد کے بانی مبانی تو خود جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ آپ کو حد خمر کا پتہ ہی نہ تھا انتہا درجہ کی بے عقلی کی دلیل ہے، خود امامیہ کے نزدیک بھی یہ قصہ اسی طرح ثابت ہے چنانچہ شیخ ابن مطہر حلی نے منہج الکرامہ میں اس کو نقل کیا ہے۔ یہیں سے ان کے دوسرے اعتراض کا بھی جواب معلوم ہو گیا کہ یہ کہتے ہیں کہ شراب نوشی کی حد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل و رائے سے حد خمر میں اضافہ کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں تو صرف چالیس کوڑے تھے۔ تو اگر یہ اضافہ اور زیادتی ہی ہے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد اور مشورہ اور تمام صحابہ کے اتفاق سے ہے۔ تو اکیلے عمر رضی اللہ عنہ ہی ہدف طعن کیوں؟ (انہوں نے تو ایک "معصوم" کی رائے سے یہ حد مقرر فرمائی تھی۔ کیا یہ اس طرح بالواسطہ سہی جناب امیر رضی اللہ عنہ پر طعن کے مرتکب نہیں ہوئے۔ (ف)

بعض کتب شیعہ میں اس طعن کو دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد خمر میں اسی سے زیادہ کوڑے لگوائے" اول تو یہ روایت صحیح نہیں۔ بالفرض صحیح بھی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی حد خمر میں سو کوڑے لگوائے۔ یعنی اسی پر بیس کا اضافہ فرما کر! چنانچہ محمد بن بابویہ قمی نے کتاب "لایحضرہ الفقیہ" میں ایک روایت بیان کی ہے کہ جب نجاشی حارثی شاعر کو عین رمضان المبارک کے ایام میں شراب نوشی کرنے پر پکڑ کر لایا گیا۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو سو کوڑے لگوائے بیس کوڑے رمضان المبارک کی حرمت کے سبب اضافہ کرکے،

اہل سنت بہر طور ان دونوں واقعات کا صرف یہی جواب دیتے ہیں کہ امیر المومنین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ انتظاماً یا قدر واجب شرعی میں خیانت و بے حرمتی کے سبب اضافہ کر سکتا ہے! جس پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا فعل واضح اور کھلی دلیل ہے! لہٰذا اب صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ طعن کی گنجائش ہے اور نہ کوئی وجہ جواز!

اعتراض (۵) یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد میں سو کوڑے مارنے کے لئے درخت کی ایسی ٹہنی جس میں سو شاخیں تھیں مارنے کا حکم دیا جو سراسر شریعت کے مخالف ہے۔ کیونکہ از روئے حکم قرآن مجید میں سو کوڑے مارنے کی ہدایت ہے، فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

جواب یہ ہے کہ (اس اعتراض کا مقصد عناد و تعصب اگر نہیں ہے تو جہالت تو یقینی ہے اس لئے) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل کے موافق ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں نیز شرح السنہ میں جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ وہ ایک ناقص الخلقت بیمار شخص کو اس جرم میں کہ وہ محلہ کی ایک لونڈی سے زنا کر رہا تھا پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لئے درخت کی ایک لمبی چھڑ لاؤ جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے ایک بار مارو۔! ابن ماجہ نے بھی اسی جیسی ایک روایت بیان کی ہے۔ اور ایسے مریض کے متعلق جس کی صحت کی امید نہ رہی ہو اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

اَلْمَرِيْضُ اِذَا وَجَبَ عَلَيْهِ الْحَدُّ اِنْ كَانَ الْحَدُّ رَجْمًا   مریض پر اگر حد واجب ہو اور وہ رجم کی شکل میں ہو تو فی الوقت

يُقَامُ عَلَيْهِ لِلْحَالِ وَإِنْ كَانَ جَلْدًا لَا يُقَامُ عَلَيْهِ حَتّٰى يَبْرَأَ أَوْ يَصِحَّ إِلَّا إِذَا كَانَ مَرِيضًا وَقَعَ الْيَأْسُ عَنْ بُرْئِهِ فَحِينَئِذٍ يُقَامُ عَلَيْهِ كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّةِ وَلَوْ كَانَ الْمَرَضُ لَا يُرْجٰى زَوَالُهُ كَالسِّلِّ أَوْ كَانَ خِدَاجًا ضَعِيفَ الْخِلْقَةِ فَعِنْدَنَا يُضْرَبُ بِعِثْكَالٍ فِيهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ فَيُضْرَبُ دَفْعَةً وَلَا بُدَّ مِنْ وُصُولِ كُلِّ شِمْرَاخٍ إِلٰى بَدَنِهِ كَذَا فِي فَتْحِ الْقَدِيرِ.

جاری کردی جائے۔ اور اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو فوراً نافذ نہ کی جائے تاوقتیکہ وہ بیماری سے نجات نہ پالے اور تندرست نہ ہو جائے۔ اگر بیماری ایسی ہو کہ اس کے ازالہ اور صحت کی طرف سے ناامیدی ہو تو حد اسی وقت جاری کی جائے جیسے دق و سل کا مریض۔ یا اگر وہ ناقص الخلقت اور ضعیف البدن ہو تو ہمارے نزدیک سو شاخوں والی چھڑی کی ایک ہی ضرب اسطرح ماری جائے کہ ہر شاخ اس کے بدن سے چھوئے ضرور۔ (فتح القدیر میں ایسا ہی مذکور ہے)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی حد جسکو لگائی وہ ضعیف الخلقت (پیدائشی کمزور) ہی تھا! قرآن مجید میں بھی ایسے حیلہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ (حضرت ایوب علیہ السلام جب اپنی قسم توڑنے نہ توڑنے کی فکر میں تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ ترکیب بتائی) خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ۔ ایک مٹھا سینکوں کا لو اور اس کو مارو، اور اپنی قسم نہ توڑو۔

اعتراض (۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ بھی اعتراض ہے کہ آپ نے جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر چار گواہوں کی گواہی کے باوجود زنا کی حد لگانے سے درگزر کیا۔ اور ایک گواہ کو ایسا کلمہ سکھا دیا کہ اس کے بعد حد جاری و ثابت نہ ہو سکی۔ یعنی جب چوتھا گواہ گواہی کے لئے آیا تو اس سے کہا أَرٰى وَجْهَ رَجُلٍ لَا يَفْضَحُ اللّٰهُ بِهِ رَجُلًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ (میں ایک ایسے شخص کا چہرہ دیکھ رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں کے ایک شخص کو رسوا نہ کریگا)

جواب:- اس طعن کا جواب یہ ہے کہ حد سے درگذر یا اسے ٹالنا اس وقت کہسکتے ہیں جب ثبوت مکمل ہو گیا ہو، چونکہ چوتھے گواہ کی گواہی صحیح نہیں تھی اس لئے حد ثابت ہی نہیں ہوئی، تو اسے ٹالنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے رہا گواہ کو سکھانے پڑھانے کا الزام تو یہ کھلا افترا اور محض بہتان ہے۔ ابن جریر طبری، امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ اپنی تاریخ میں اور حافظ عماد الدین بن اثیر، حافظ جمال الدین ابو الفرج بن جوزی اور شیخ شمس الدین مظفر سبط بن جوزی اور دوسرے ثقہ مورخین بیان کرتے ہیں کہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بصرہ کے امیر تھے۔ بصرہ کے لوگ شرارت پر تلے ہوئے تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کو معزول کرائیں، انہوں نے ایک سازش کے تحت ان پر زنا کی تہمت لگائی۔ اور چند جھوٹے گواہ اٹھے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان سے گواہی دلائیں۔ اسی سازش کے تحت بصرہ میں اس الزام کی شہرت دی گئی۔ یہانتک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک بھی یہ خبر پہنچی۔ آپ نے ان سب کو بلوایا چنانچہ جناب مغیرہؓ مع چار گواہوں کے مجلس عدالت صحابہ کے روبرو جس میں جناب امیر المومنین خود بھی تشریف فرما تھے پیش کئے گئے۔ اہل بصرہ نے بحیثیت مدعی دعویٰ دائر کیا کہ جناب مغیرہؓ نے ام جمیل نامی ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ گواہ گواہی کے لئے آئے تو ایک نے کہا کہ میں نے ان کو اسکی دونوں رانوں کے بیچ میں دیکھا۔ اس پر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا

لَا وَاللّٰهِ حَتّٰى يَشْهَدَ أَنَّهُ يَلِجُ فِيهَا وُلُوجَ الْمِرْوَدِ فِي الْمُكْحُلَةِ۔ (نہیں خدا کی قسم اس وقت تک اسکی گواہی معتبر نہیں جبتک یہ گواہی نہ دے کہ (اس نے عضو مخصوص کو) اسطرح اندر جاتے دیکھا جس طرح سرمہ دانی میں سلائی جاتی ہے)

اس پر گواہ نے کہا نعم اَشْهَدُ عَلٰى ذٰلِكَ (ہاں میں اسی کیفیت کی گواہی دیتا ہوں) اس کے بعد دوسرے اور تیسرے گواہ نے بھی اسی طرح گواہی دی۔ جب چوتھا گواہ جو زیاد بن ابیہ تھا گواہی کے لئے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح گواہی دیتے ہو۔

تواس نے کہا میں اتنا جانتا ہوں کہ

رَأَيْتُ مَجْلِساً وَنَفَساً حَثِيْثاً وَانْتِهَاراً وَرَأَيْتُهُ مُسْتَبْطِناً وَرِجْلَيْنِ كَأَنَّهُمَا أُذُنَا حِمَارٍ۔ میں نے ایک نشستگاہ، پھولا ہوا سانس، اور ایستادگی دیکھی۔ اور ان کو اس کے پیٹ پر دیکھا، دونوں پاؤں ایسے لگتے تھے جیسے گدھے کے دو کان۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ کیا تونے ایسا دیکھا جس طرح سلائی سرمہ دانی میں جاتی ہے۔ اس نے کہا نہیں اس طرح نہیں دیکھا۔ اب اس صورت حال کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ شرعاً حد ثابت ہوگئی؟ اور یہ مقدمہ بند کرنے کا تو تھا نہیں۔ صحابہ کی کھلی مجلس میں سب پیش تھے، سب کے سامنے سوال وجواب ہورہے تھے۔ اس گواہ کو سکھانے پڑھانے کا مرحلہ کہاں پیش آیا اگر برسرِ مجلس جناب عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تو کیا صحابہ کرام جن میں جناب علی رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے اس کو گوارا فرمالیتے یہ حضرات تو اتنا منصف مزاج عادل اور جری تھے کہ برسر منبر امیر المؤمنین ؓ کو ٹوکنے اور جواب طلبی سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اور پھر یہ معاملہ تو حدود اللہ کا تھا امور شرع اور حدود کے اثبات میں کوئی خامی، سستی اور رواداری برتی جاتی تو صادقوں اور عادلوں اور سچے مسلمانوں کی یہ جماعت کثیر، جو اسی مقصد اور فیصلہ کے لئے جمع ہوئی تھی کب اسے برداشت کرسکتی تھی۔ ان اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی عادت تو امر ناحق ومنکر کو چھپانے کی نہیں آشکارا کرنے کی تھی۔ وہ دین کے معاملہ میں نہ بے جا لحاظ کرتے تھے نہ بے جا رواداری برتتے تھے، یہ سب کے سب ایسی غلط روش پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے اور جس پر حد ثابت ہوچکی ہو اس کو یوں ہی اچھوتا کیسے جانے دیتے! اگر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے شاہد کو سکھایا ہوتا تو یہ حضرات فوراً ہی آپ کی گرفت کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وصف خود شیعی روایات سے ثابت ہوچکا ہے کہ آپ قبول حق میں اتنے مستعد تھے کہ دینی امور میں ایک عورت کی بات سے قائل ہوگئے! اور پھر ان کا یہ وصف تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دین وشرع کا کوئی اہم کام بغیر صحابہ ؓ کے مشورہ اور ان کی موجودگی کے انجام نہیں دیتے تھے۔ اور شروع طعن میں جس کلمہ کی ادائیگی شیعوں نے آپ کی طرف منسوب کی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اور آپ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ البتہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا تھا اور جس کی عزت و ابرو، اور جان پر بنی ہو اور بخیال خویش جھوٹ وسازش کا شکار ہو وہ ایسی باتیں کہتا ہی ہے۔ بات تو گواہ کی ہے کہ اگر وہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر گواہی دینے آیا تھا تو وہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی باتوں سے متاثر کیوں ہوا۔ اور اس کا لحاظ کیوں کیا۔ اور اگر گواہ مدعیٰ علیہ کا لحاظ کرکے۔ اور مدعیٰ علیہ کے نقصان کی گواہی دلوائے۔ یہ بات کسی بھی مذہب وشریعت میں نہیں۔

اور اگر یہ مقولہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا مان لیں، تو یہ آپ کی فراست مومنانہ کا ایک نمونہ ہے کہ آپ جو صورت آئندہ سامنے آنے والی ہے اس کو بیان فرمارہے ہیں اور آپؓ کے ساتھ بارہا ایسا ہوا کہ آپ نے قرائن اور مومنانہ بصیرت سے پتہ چلا کر کسی چیز یا واقعہ کے متعلق فرمادیا کہ یہ ایسا ہے۔ اور وہ واقعتا ویسا ہی ہوا۔ محض شیعوں کے کہنے سے تو یہ نہیں مانا جاسکتا۔ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے گواہ سے یہ کہا کسکے سامنے کہا؟ کون گواہ ہے؟ اسکی دلیل کیا ہے؟ اور یہ شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس دلی ارادہ سے کیسے واقف ہوگئے کہ آپ کے دل میں یہ بات تھی کہ گواہ گواہی سے منحرف ہوجائے؟ دل کا حال تو صرف خدا جانتا ہے! اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حد ٹالنے والی بات سرزد ہونا مان لیا جائے تو آپ کا یہ فعل تو امام معصوم کے عمل کے مطابق ہوگیا۔ ان پر اگر طعن روا ہے تو امام معصوم اس سے کہاں بچیں گے! ان کی مدافعت میں اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو اسکو یہاں بھی منطبق کرلیں، محمد بن بابویہ قمی نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ اَنَّ رَجُلاً جَاءَ إِلَى أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَقَرَّ بِالسَّرِقَةِ اِقْرَاراً لَا تُقْطَعُ بِهِ الْيَدُ فَلَمْ يَقْطَعْ يَدَهُ۔ ایک شخص نے امیر المؤمنین

(علی) رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر اس انداز میں چوری کا اقرار کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹا جانا چاہیئے تھا مگر آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جب اس کے اقرار سے قطع ید کی حد واجب ہو گئی تھی تو جناب امیر رضؓ نے اس پر حد کیوں جاری نہیں کی، اور یہ حد کیوں ٹلادی گئی؟

اعتراض (۷) ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطابؓ بڑے بڑے مہر باندھنے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اگر زیادہ مہر کو عزت و خوبی کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حقدار تھے۔ حالانکہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں (رضی اللہ عنہن) کے مہر پانچسو سے زیادہ کے نہیں باندھے لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ سنت رسول پر سختی سے عمل کرو اور زیادہ مہر نہ باندھو۔ آئندہ اگر کسی نے زیادہ مہر باندھا۔ تو میں مقدار سنت سے زیادہ رقم بحق بیت المال ضبط کرلوں گا۔ اس پر ایک خاتون اٹھی اور کہنے لگی۔ عمر سنو! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰھُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡئًا ۔ اگر عورتوں کو مال کا ڈھیر دے ڈالو تو اس ڈھیر سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

ایسی صورت میں تمہیں کیا حق ہے کہ مہر کی زائد از سنت رقم واپس لو۔ اگرچہ ان کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر جناب نے فرمایا کُلُّ النَّاسِ اَفۡقَهُ مِنۡ عُمَرَ حَتَّی الۡمُخَدَّرَاتِ فِی الۡحِجَالِ ۔ (دین کی سمجھ میں سب ہی عمر سے بڑھے ہوئے ہیں حتیٰ کہ پھر کھٹوں کی پردہ نشین عورتیں بھی) اس واقعہ میں شیعوں کے پیش نظر قابل اعتراض بات یہ ہے کہ آپ ایک عورت کے مقابل لاجواب ہو گئے۔ کوئی جواب نہ بن پڑا اور جو ایک عورت کو جواب دینے سے عاجز ہو وہ امامت کے قابل کب ہو سکتا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جس پر شیعہ بغلیں بجائیں، آپ کی خاموشی اس لئے نہیں تھی کہ آپ اس کا جواب باصواب دینے سے عاجز ہو گئے تھے بلکہ آپ کتاب اللہ کے ادب و احترام کی بنا پر خاموش ہو گئے تھے۔ کہ وہ اپنے کو کتاب اللہ کے مقابل رکھ کر اس کے جواب سے گریز کر رہے تھے۔ (نیز آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ محترمہ کا مبلغ علم کتنا ہے۔ قرآنی آیت کا مفہوم احادیث کی روشنی میں ان کو سمجھانے اور بتانے کا یہ موقعہ بھی نہ تھا کہ وہ کوئی محفل مناظرہ تو تھی نہیں۔ جب آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حوالہ دے چکے تھے۔ اس کے باوجود محترمہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ آپ کا یہی مفہوم ہوتا جو وہ سمجھ رہی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادتی مہر کو ناپسند نہ فرماتے، ایسے وقت آپؓ کا سکوت ہی صحیح اور مناسب تھا۔ ن)

کیونکہ کتاب اللہ کے مقابلہ میں چون وچرا، یا توجیہات و تاویلات بلند مرتبہ اہل ایمان کے شایاں شان نہیں۔ ان کے نزدیک اسلم راستہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے ظاہری الفاظ کو تسلیم کرلیں۔ اور اسی لئے آپؓ نے سکوت اختیار فرمایا۔ (دراصل ان محترمہ کو اعتراض زائد از سنت مقدار کی واپسی پر تھا۔ اور اسی کے ثبوت میں یہ قرآنی آیت پڑھی) اگر ان کی غرض حوالہ یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بھاری بھاری مہر باندھنے سے راضی ہوتا ہے تو یہ بات تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم مبارک کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ احادیث صحیحہ میں کثرت و زیادتی مہر کی نفی منقول ہے! خطابی نے غریب الحدیث میں یوں روایت کی ہے کہ

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ تَیَاسَرُوۡا الصَّدَاقَ فَاِنَّ الرَّجُلَ یُعۡطِی الۡمَرۡاَۃَ حَتّٰی یَبۡقٰی فِیۡ نَفۡسِهٖ خَسِیۡکَۃً

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہر میں آسانی کرو۔ آدمی اگرچہ (بھاری مہر بھی) عورت کو دیتا ہے مگر دل میں پھانس سی چبھی رہ جاتی ہے!

ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ

قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم اِنَّ مِنۡ خَیۡرِ النِّسَآءِ اَیۡسَرَھُنَّ صِدَاقًا ۔

کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عورتوں میں وہ عورت بہتر ہے جس کا مہر بہت ہلکا ہو۔

عَنْ عَائِشَةَ عَنْهُ صلی اللہ عَلَیْهِ وسلم قَالَ یُمْنُ الْمَرْأَةِ تَسْهِیْلُ اَمْرِهَا فِیْ صِدَاقِهَا۔

ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ عورت کا مبارک ہونا اس کے مہر کا آسان و ہلکا ہونا ہے۔

احمد و بیہقی کی مرفوع روایت ہے کہ۔

اَعْظَمُ النِّسَآءِ بَرَکَةً اَیْسَرُهُنَّ صِدَاقاً۔

(سب سے زیادہ بابرکت وہ عورت ہے جس کا مہر سب سے زیادہ ہلکا ہو)

اس آیت سے زیادہ سے زیادہ مہر کی زیادتی کا جواز نکل سکتا ہے اگرچہ بکراہت ہوگا۔ لیکن وہ نص کہاں ہے جو یہ تعین کرے کہ آیت میں لفظ قنطار سے مہر مراد ہے، کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ قنطار زیور روپیہ، پیسہ، اور ساز و سامان ہو جو مرد اپنی بیوی کو دیتے ہیں۔ مہر نہ ہو! اس لئے کہ اس قسم کے عطایا و ہدایا جوان عورتوں کو ہبہ کر دئے جاتے ہیں۔ ان کو واپس لینا زیبا نہیں۔ خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اسے طلاق دے کر بے آسرا اور تکالیف معاش وغیرہ کے حوالہ کر رہے ہو، ایسی حالت میں تو اس ہبہ کی واپسی اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہوگی جو خلاف شرع بھی اور خلاف مروت بھی! اور امر جائز میں ممانعت بمصالح ملی و ملکی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے خیر خواہانہ نصیحت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اپنے اموال بے جا نمود و نمائش، غلط فخر و مباحات، زمانہ سازی اور اسراف بے جا میں نہ ضائع کریں۔ کہ یہ دوسرے حقداروں کی حق تلفی کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ باہم تنازعات، مقدمہ بازی، لڑائی جھگڑے اور کسی بڑے فتنہ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

اور مصالح ملکی و ملی کی نگہداشت اور جائز اخراجات پر قدغن، یا انہیں محدود کرنا خلیفہء وقت کا کام ہے۔ ہر زمانہ میں اس کے نظائر ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ طلاق ایک امر جائز ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جناب زید رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرماتے تھے۔ کہ وہ جناب زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دیں علی ہذا نکاح سنت نبوی ہے، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اہل کوفہ سے فرماتے تھے کہ

یا اَهْلَ کُوْفَةَ لَا تُزَوِّجُوا الْحَسَنَ لِاَنَّهُ مِطْلَاقٌ لِلنِّسَآءِ (اے اہل کوفہ حسن (رضی اللہ عنہ) کی شادی نہ کراؤ کیونکہ وہ عورتوں کو طلاق بہت دیتے ہیں، حالانکہ ان کا فعل جائز تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جس کلام پر اعتراض ہے اس سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مہر کی زیادتی کے جواز کے تو قائل تھے مگر انجام بد پر نظر فرما کر روکتے تھے۔

اگر ان محترمہ کا آیت سے مقصد مال کی واپسی حرام ہوتا ہو۔ تو وہ حرمت خاوندوں اور شوہروں کے ثابت ہوگی۔ نہ کہ ان خلفاء یا احکام کے لئے جو ڈانٹ ڈپٹ کر اس سے روکیں۔ اور اسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّکَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا۔ اور اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری کو لانا ہو اور ان میں سے ایک کو ڈھیروں مال دیدیا ہو! (تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو) اور رہی بیت المال کی ڈانٹ بطور تنبیہ تھی۔ ویسے جمہور اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کو یہ حق ہے کہ اگر کسی فی الحال یا فی المآل فتنہ کا اندیشہ ہو تو جائز بات پر بھی قدغن لگا سکتا اور سزا دے سکتا ہے۔ اور مال کی قرقی بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ اور اعتراض میں یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی کا اقرار کیا، ایک معاندانہ اور بے سر و پا جھوٹ ہے۔ کسی بھی روایت میں اس اقرار کی تصریح نہیں۔ البتہ وہ جملہ آپنے ضرور فرمایا جو ایک طرف تو آپ کی تواضع، کسر نفسی اور حسن اخلاق کی نشاندھی کرتا ہے کہ آپ نے سوچا کہ ایک ناواقف علوم قرآن اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اپنی بات کی سند قرآن مجید سے لائی ہے اب اس کے استنباط کو دلائل صحیحہ سے غلط بتاؤں تو دل شکستہ ہو جائیگی، اور پھر استنباط قرآن کی شاید جرأت نہ کرے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اس کی دل جوئی کی خاطر اپنے کو اس معاملہ میں معترف اور قائل کروں تاکہ اسکو بھی اور دوسروں کو بھی معانی قرآن

میں غور خوض اور اس کے دقائق اخذ کرنے کی امنگ پیدا ہو اور یک گونہ قرآن سے وابستگی رہے۔ تو دوسری طرف اسکے قول کی تردید بھرے مجمع میں اس کو شرمندگی سے بچانے کا مقصد بھی ظاہر کرتا ہے، اس قصہ کے علاوہ دوسرے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں یہ وصف خاص طور پر تھا کہ آپ چاہتے تھے کہ لوگ کتاب اللہ سے وابستگی حاصل کریں اور قرآن پر غور و فکر اور مسائل کے اخذ واستنباط میں مشغول رہیں۔ ورنہ کون رئیس وقت اور حاکم زمانہ ایسا بے نفس ہوتا ہے کہ اعیان حکومت یا مجمع احباب و معتقدین میں ایک ناسمجھ عورت کی سمجھ بوجھ کی تعریف و توصیف کے ساتھ اپنے کو قائل اور ملزم کے ردیف میں پیش کرے۔ اور اس کے سوال پرچپ ہو جائے! اگر بالفرض آپؓ سے کوئی جواب نہیں پڑا تھا تو ان محترمہ کی گرفت کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے لئے ایک جواز تو موجود ہی تھا اور آپ اسکو اس معاملہ میں سزا بھی دے سکتے تھے کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کا ذکر رہے تھے اور وہ اس کے مقابلہ میں قرآنی آیت لاکر نعوذ باللہ گویا یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے بے خبر تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو میں سمجھی ہوں۔ لیکن مقتدایان دین و شریعت کی شان کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے نفوس پاک میں نفسانیت اور سخن پروری کی بو تک نہ آئے۔ انہیں تو صرف حق کی تلاش اور اس کا اتباع منظور ہوتا ہے اور وہ حق خود ان کے اپنے پاس ہو یا دوسرے سے حاصل ہو۔ اسی لئے تمام اکابرین وارباب یقین اس منقبت عظیم میں باہم شریک و ہمسر ہیں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک قصہ منقول ہے چنانچہ ابن جریر اور ابن عبدالبر نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ

قَالَ سَائَلَ الرَّجُلُ عَلِيًّا عَنْ مَسْئَلَةٍ فَقَالَ فِيْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ لَيْسَ هٰكَذَا وَلٰكِنْ كَذَا وَكَذَا قَالَ عَلِيٌّ اَصَبْتَ وَاَخْطَاءْنَا وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

راوی کہتا ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے ایک شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے اس کے جواب میں کچھ فرمایا تو اس نے پلٹ کر کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا ایسا ہے جناب علیؓ نے فرمایا تو نے ٹھیک کہا ہم سے خطا ہو گئی۔ اور ہر جاننے والے سے اونچا جاننے والا ہے!

آپؓ کے اس قابل تعریف طرز عمل کو نواصب نے اسی طرح مورد طعن بنایا جس طرح بد خو بد فطرت شیعوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کہا! یہاں ایک بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اگر کسی ایک مسئلہ میں امام سے زیادہ کسی کو معلومات ہوں۔ یا اس مسئلہ کے نکات کا غیر امام کو علم ہو اور امام کی معلومات اور ذہن وہاں تک نہ پہنچا ہو تو یہ بات خلافت و امامت کی لیاقت کو ناقص نہیں بناتی، اور ان کی لیاقت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ بحکم الٰہی انا جعلناک خلیفۃ فی الارض خلیفہ وقت بھی تھے۔ مگر کسی دوسرے کا کھیت چرجانے والی بکریوں کا جو مقدمہ آپ کے سامنے آیا، اس کے حکم کے سمجھنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذہن تیز نکلا اور وہ معاملہ کو سمجھ گئے۔ حالانکہ وہ اسوقت نہ نبی تھے نہ خلیفہ و امام! بلکہ نو عمر ہی تھے اس کے باوجود معاملہ فہمی میں حضرت داؤد علیہ السلام سے سبقت لے گئے! ابن بابویہ قمی نے من لا یحضرہ الفقیہ، میں بروایت احمد بن عمر حلبی لکھا ہے کہ

قَالَ سَاَلْتُ اَبَا الْحَسَنِ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ اِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ قَالَ حَكَمَ دَاوٗدُ بِرِقَابِ الْغَنَمِ وَفَهَّمَ اللّٰهُ سُلَيْمَانَ اَنَّ الْحُكْمَ لِصَاحِبِ الْحَرْثِ فِي اللَّبَنِ وَالصُّوْفِ۔

میں نے ابی الحسن (رحمہ اللہ علیہ) سے اللہ کے فرمان وداؤد وسلیمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے بکریاں دلانے کا فیصلہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا کہ کھیت والے کا حق دودھ اور اون میں ہے،

لہٰذا اگر ایک مسئلہ اللہ تعالیٰ کسی نادان عورت کو سمجھا دیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ سمجھائیں۔ تو ان کی خلافت و امامت میں اس سے کیا نقصان لازم آتا ہے۔ وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت میں بھی تو اس واقعہ سے کوئی نقص واقع نہیں ہوا۔ اور ظاہر ہے خلافت و امامت تو نبوت کی نیابت ہے۔ اور دنیا میں وہ کون ایسا ہے جس کو اپنے بارے میں یہ تجربہ نہ ہوا ہو کہ بعض اوقات بدیہی اور سامنے کی بات تک بھی ذہن نہیں پہنچا۔ اور عقل و فہم میں اس سے کم تر لوگ فوراً بات کی تہ کو پہنچ گئے اور انہوں نے اس نتیجہ پر اسے تنبیہ کیا۔ مگر بغض و عناد نے جس کے دل پر قبضہ کر رکھا ہو اس کا کیا علاج۔

اعتراض ۸: یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے اہل بیت کا حصہ ان کو نہیں دیا اور یوں قرآن کے حکم کے خلاف کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ بمعلوم رہے کہ مال غنیمت میں سے جو کچھ تم پاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول رسول کے قرابتدار، اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

جواب: اس اعتراض کا جواب، یہ ہے کہ امامیہ مذہب کی رو سے یہ اعتراض صحیح نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک، یہ آیت، مصارف خمس کے بارے میں ہے استحقاق کے بیان کے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا اگر امام وقت کی صوابدید کا تقاضا یہ ہو کہ ان بیان کردہ چار مصارف میں سے کسی ایک کے لئے وہ مخصوص کر دے تو اس کے لئے یہ جائز اور درست ہے! امامیہ کی ایک جماعت کثیر کا یہی مذہب ہے۔ چنانچہ ابوالقاسم مصنف شرائع الاحکام نے جس کو امامیہ محقق کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور دوسرے علماء نے اس کی تسریح کی ہے اور اس کے ثبوت میں اپنے ائمہ سے روایات بیان کی ہیں۔ لہٰذا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک، دو سال اس خیال سے ان کو خمس نہ دیں کہ ان کو ضرورت نہ رہی ہو۔ یا ان کے مقابلہ میں دوسرے فرقے زیادہ حاجتمند ہوں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اور آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خمس ان چار طبقوں ہی کو دیا جائے ان سے باہر کسی کو نہ دیا جائے اور پھر ان میں سے خواہ ہر ایک کو دیا جائے خواہ ایک دو کو! اور اسکی دلیل یہ ہے کہ آیت زکوٰۃ انما الصدقات الخ میں بھی مصارف زکوٰۃ کا ہی بیان مقصود ہے اور صحیح مذہب بھی یہی ہے اسی لئے اگر کوئی ان آٹھ طبقوں میں سے کسی ایک ہی طبقہ کو زکوٰۃ دے تو جائز ہے۔ یہی حکم یہاں بھی ہے! اور خود جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ذوالقربیٰ کا حصہ خود نہیں لیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق بنی ہاشم کے فقراء اور مساکین کو دے دیا کرتے ان سے جو کچھ بچ رہتا وہ دوسرے مسلمان فقراء و مساکین میں بانٹ دیتے! طحاوی اور دار قطنی نے بحوالہ محمد اسحاق روایت بیان کی ہے کہ

اَنَّهٗ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا جَعْفَرٍ مُحَمَّدَ بْنَ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ اَنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ لَمَّا وَلِیَ الْاَمْرَ النَّاسِ کَیْفَ صَنَعَ فِیْ سَهْمِ ذَوِی الْقُرْبٰی فَقَالَ سَلَكَ بِهٖ وَاللّٰهِ مَسْلَكَ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ۔

میں نے جناب ابو جعفر رحمہ اللہ سے پوچھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے ذوی القربیٰ کے حصہ کے متعلق کیا طریقہ اختیار فرمایا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ اسی مسلک پر عمل پیرا رہے جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔

وَزَادَ الطَّحَاوِیُّ فَقُلْتُ کَیْفَ اَنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ قَالَ وَاللّٰهِ مَا کَانَ اَهْلُهٗ یَصْدُرُوْنَ اِلَّا عَنْ رَأْیِهٖ۔

طحاوی نے یہ ٹکڑا مزید بیان کیا۔ میں نے کہا اب آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے تو فرمایا خدا کی قسم آپ کے اہل آپ کی رائے کے خلاف نہیں چل رہے۔

اور تقسیم خمس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریق عمل یہ تھا کہ اول اہل بیت کے نادار و مساکین کو عنایت فرماتے۔ پھر جو بچ رہتا اسے

بیت المال میں داخل کر کے بیت المال کے مصارف میں لگاتے رہتے۔ اسی لئے اہل بیت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خمس دینے کی روایات تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور مشہور و متواتر بھی بہت ہیں! ابو داؤد نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے بحوالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یوں روایت کی ہے کہ اَنَّ اَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ قَسَّمَا سَهْمَ ذَوِى الْقُرْبٰى لَهُمْ۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ دونوں نے ذوالقربی کا حصہ ان کو تقسیم کیا۔ نیز ابو داؤد نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے۔ اَنَّ عُمَرَ كَانَ يُعْطِى ذَوِى الْقُرْبٰى مِنْ خُمُسِهِمْ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذوی القربی کو خمس دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ عبدالعظیم منذری نے اسکی صحت کی تصریح کی ہے۔ روایات کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما خمس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتداروں کا حصہ نکالا کرتے تھے اور اسکو ان کے نادار اور مسکینوں میں تقسیم فرماتے تھے اس کے علاوہ بھی ان کی دیگر ضروریات اسی سے حل اور پوری فرمایا کرتے تھے اس کو میراث کے طور پر ہر غنی و فقیر، محتاج و غیر محتاج کو نہیں دیتے تھے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تقسیم بھی یہی تھا۔ اور احناف نیز امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا اب بھی یہی مذہب و مسلک ہے جیسا کہ احکام الشرائع کے حوالہ سے اوپر مذکور ہوا۔ ہدایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

اَمَّا الْخُمُسُ فَيُقْسَمُ عَلٰى ثَلٰثَةِ اَسْهُمٍ سَهْمٌ لِلْيَتَامٰى وَ سَهْمٌ لِلْمَسَاكِيْنِ وَسَهْمٌ لِاَبْنَاءِ السَّبِيْلِ يَدْخُلُ فُقَرَاءُ ذَوِى الْقُرْبٰى فِيْهِمْ وَيُقَدَّمُوْنَ وَلَا يُدْفَعُ اِلٰى اَغْنِيَائِهِمْ۔

خمس تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک یتیموں کے لئے ایک مساکین کے لئے اور ایک مسافروں کے لئے جن میں فقراء ذوی القربی داخل ہیں۔ اور مقدم! ان کے غنی اور مالداروں کو نہیں دیا جاتا۔

وَقَالَ الشَّافِعِىُّ لَهُمْ خُمُسُ الْخُمُسِ يَسْتَوُوْنَ فِيْهِ غَنِيُّهُمْ وَفَقِيْرُهُمْ وَيُقْسَمُ بَيْنَهُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ وَيَكُوْنُ بَيْنَ بَنِىْ هَاشِمٍ وَبَنِى الْمُطَّلِبِ دُوْنَ غَيْرِهِمْ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ لِذِى الْقُرْبٰى مِنْ غَيْرِ فَصْلٍ بَيْنَ الْغَنِىِّ وَ الْفَقِيْرِ۔

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس خمس کا ایک خمس نکالا جائے گا۔ اور اس میں غریب اور مالدار سب برابر ہوں گے اس میں سے عورت کو اکہرا حصہ ملے گا مرد کو اس کا دوگنا۔ یہ تقسیم محدود ہو گی بنی ہاشم اور مطلب میں غیروں کو اس میں سے نہیں دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول ذوی القربی میں فقیر و غنی کی کوئی تمیز نہیں"

اب سوچنے (اور شرمانے) کی بات یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق تھا اور بعد میں وہ "معصوم" کے فعل کے مطابق بھی ثابت ہوا۔ اور امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا مذہب بھی یہی قرار پایا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کا کیا جواز اور کیا گنجائش رہ جاتی ہے،

رہی بات شافعی مسلک کے خلاف ہونیکی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے مقلد تو تھے نہیں کہ اس بہانے ان کو ہدف طعن بنایا جائے! اور پھر جب احناف وامامیہ آپؓ کے طرز عمل کے مؤید ہیں تو شافعیہ کی مخالفت سے کیا ڈرنا۔

اب غور طلب یہ مسئلہ رہ گیا کہ جب دینے اور نہ دینے کی دونوں روایات صحیح ہیں تو ہر دو قسم روایات میں تطبیق کی صورت کیا ہو۔ تو ان میں تطبیق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) چونکہ محتاجوں کو دیتے تھے، اغنیاء کو نہیں دیتے تھے۔ جن کو ملا انہوں نے کہا دیتے ہیں جنکو نہ ملا وہ کہتے ہیں نہیں دیتے تھے!

(۲) نفی و اثبات دینے کی وجوہ اور طریقہ سے متعلق ہے جس نے دینے کے متعلق کہا اس نے یہ مطلب لیا کہ مصرف کے مطابق دیا۔ اور

جس نے نہ دینے کے متعلق کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ وراثت کے طور پر نہیں دیا۔ اس صورت میں ہر دو قسم کی روایات اپنی اپنی جگہ صحیح درست ہیں! اور اس تطبیق کی دلیل یہ ہے کہ مفصل روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خمس میں سے قرابت داروں کا حصہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے نام بنام خانہ بخانہ تقسیم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یکمشت حضرت علی و حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سپرد فرماتے اور یہ ہدایت دیتے کہ اس میں سے فقراء کو دیں، بیواؤں کا نکاح کرائیں۔ کنواروں کی شادی کرائیں جن کے پاس خادم نہ ہوں ان کے لئے لونڈی غلام خرید دیں۔ بے گھروں کے گھر بنوا دیں شکستہ گھر والوں کے گھروں کی مرمت کرا دیں۔ بے سواری والوں کو سواری دلوا دیں چنانچہ آپ کی خلافت کے آخر تک یہی معمول رہا۔ آپ کی حیات مبارک کا آخری سال تھا تو بدستور سابق دونوں حضرات کو بلوا کر فرمایا کہ خمس میں سے ذوی القربی کا حصہ لے لیں جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امسال بنی ہاشم میں کوئی محتاج و حاجتمند باقی نہیں رہا۔ البتہ عام مسلمانوں میں فقراء کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ امسال یہ حصہ بھی ان مسلمانوں ناداروں میں تقسیم فرما دیں۔ اس وجہ سے آپ کی خلافت کے آخری سال یہ حصہ ذوی القربی میں تقسیم نہیں ہوا۔ اگر چہ اس مجلس سے اٹھنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ٹوکا کہ تم نے ایک غلطی کی۔ تمکو وہ مال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے قبضہ میں لیکر فقراء مسلمین میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا چاہیئے تھا۔ ہوسکتا ہے بعد کے خلفاء تمہارے اس فعل کو سند بنالیں اور یہ کہکر تمکو اس کے دینے سے انکار کر دیں کہ تم تو خود ہی اسکو موقوف کر چکے اور لینے سے انکار کر چکے ہو!

اب ہر سہ مذاہب (حنفی، شافعی، امامی) کی روشنی میں مسئلہ خمس کی تفصیلی حیثیت ملاحظہ فرمائیے!

شیعوں کے نزدیک جو شخص امام ہو وہ آدھا خمس خود لے لے، اور آدھا یتیموں مسکینوں اور مسافروں کو بقدر حاجت و ضرورت بانٹ دے ان کے نزدیک سات چیزوں میں خمس واجب ہوتا ہے۔

(۱) وہ مال غنیمت جو حربی کافروں سے ہاتھ لگے خواہ کتنا ہی ہو (۲) کوئی کان ہو مثلاً فیروزہ، تانبہ، سونا، چاندی، گل ارمنی، یا کسی بھی قسم کی ہو۔ البتہ اس کے ضروری اخراجات مثلاً کھدائی صفائی وغیرہ کر کے باقی ماندہ کی قیمت بیس مثقال شرعی سونے جتنی ہو (۳) دریا و سمندر سے غوطہ زنی سے جو کچھ حاصل ہو (۴) حلال و حرام مال جو آپس میں رل مل جائیں (۵) وہ زمین جو ذمی نے مسلمانوں سے خریدی ہو۔ (۶) جو دفینہ زمین سے نکلے اور (۷) وہ نفع و فائدہ جو تجارت، زراعت، حرفت یا ان جیسے کسی پیشہ سے حاصل ہو جب یہ فائدہ اس شخص کے کل سالانہ اخراجات سے بڑھ جائے تو اس کا خمس دیا جائے!

حنفیہ کے نزدیک پورے خمس کے تین حصے کئے جائیں گے۔ ان تین میں سے دو حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کئے جائیں گے، البتہ یہ لحاظ رکھا جائے کہ پہلے ہاشمی، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو دیا جائے۔ ان سے بچ جائے تو پھر عام مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم ہو۔ اور احناف کے نزدیک خمس تین چیزوں میں واجب ہوتا ہے، (۱) مال غنیمت (۲) کان منطبع۔ (وہ کان جس سے نقش و نگار آرائش و زیبائش وغیرہ کی اشیاء نکلتی ہوں) جیسے سونا چاندی، تانبا، رانگ پارہ وغیرہ (۳) زمین سے نکلنے والا دفینہ خزانہ!۔

اور شوافع کے نزدیک خمس کے پانچ حصے کئے جائیں ایک حصہ بنام رسول خلیفہ وقت کو دیا جائے۔ دوسرا بنی ہاشم و بنی مطلب کے امیر و غریب میں بطریق میراث کہ مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ، برابر تقسیم کیا جائے (یعنی امیر و غریب میں کوئی فرق نہ کیا جائے) باقیماندہ تین حصے عام مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کئے جائیں۔ ان کے نزدیک خمس دو چیزوں میں واجب ہوتا ہے۔ (۱) مال غنیمت۔ (۲) زمین سے برآمد ہونے والا خزانہ! اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقسیم کو ان ہر سہ مذاہب ما بعد پر

چنانچہ تو بظاہر حنفیہ اور اکثر امامیہ کے مذاہب سے بہت ملتی جلتی صورت نظر آئیگی۔ کہ یکشت حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سپرد کرتے۔ بنی ہاشم کے ہر شخص کو تقسیم نہیں کرتے تھے۔

اعتراض ۹) یہ ہے کہ دین میں آپ نے ایسی نئی باتیں نکالیں جن کا پہلے وجود نہ تھا۔ مثلاً باجماعت تراویح۔ کہ جو خود ان کے اعتراف سے بدعت ہے! اور متفق حدیث یہ ہے کہ مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے وہ مردود ہے، اور ہر نئی نکالی ہوئی بات گمراہی ہے،

(ان مسکینوں کا وہ حال ہے کہ آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ اب انہیں پتہ نہیں کہ ہم غلط سلط کیا کہہ رہے ہیں کس کو کہہ رہے ہیں بات میں وزن بھی ہے یا نہیں۔ یہی کیفیت اس طعن میں ہے اگر آنکھیں کھول کر انہوں نے اپنی ہی کتابیں پڑھی ہوتیں تو معلوم ہو جاتا کہ) اس طعن سے اہل سنت کو الزام نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ خود انہیں کی کتب حدیث سے بطریق شہرت و تواتر یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں تین رات تراویح باجماعت ادا فرمائیں، دیگر نوافل کی طرح ان کو تنہا ادا نہیں فرمایا اور ترک جماعت پر بطور عذر یہ فرمایا۔ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یُّفْرَضَ عَلَیْكُمْ۔ مداومت کی وجہ سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ تم پر فرض نہ کر دی جائے۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد فرضیت کا خدشہ نہ رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ کا اجراء و احیاء فرما دیا! سنیوں اور شیعوں دونوں کے ہاں یہ اصولی قاعدہ مقرر و موجود ہے کہ جو حکم نص شارع کے مطابق کسی عذر و علت اور سبب سے مقید ہو۔ تو جب وہ عذر و علت باقی نہ رہے تو وہ حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکو بدعت کہا تو گویا بدعت کا اعتراف کر لیا۔ تو دراصل یہ بھی ان کی سمجھ کا پھیر اور عناد کا مظہر ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ فرمایا تھا نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ۔ کیا ہی اچھی نئی بات ہے! تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت ادائگی پر ہمیشگی نئی بات ہے۔ اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا مبارک پہلے سے معلوم تھا کہ عذر نہ ہوتا تو آپؐ کے نزدیک اس پر مداومت پسندیدہ و مرغوب تھی اس لئے موانع اور عذر اٹھ جانے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند فرمودہ طریقہ کا اجراء آپ کے ذریعہ ہو رہا ہے تو آپؓ کے لحاظ سے تو نئی بات ہے مگر منشاء نبوت کے مطابق ہونیکی وجہ سے یہ نئی بات" اچھی ہے اسے برا اور گمراہی کی بات کہنے کی کون مسلمان جرأت کر سکتا ہے! یہ حفظ مراتب کی بات ہے۔ اسے معاند و حاسد اور بدگو کب سمجھ سکتا ہے۔ یہی ایک بات نہیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو جناب رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہ تھیں مگر خلفاء و ائمہ کے وقت میں اجماع امت سے ان کو وجود ملا۔ ان کو بدعت نہیں کہیں گے اور اگر کسی کو بدعت کا لفظ بہت ہی محبوب ہو تو اسے اجازت ہے کہ حَسَنَۃٌ" کے لاحقہ کے ساتھ اسے بدعتِ "حَسَنَۃٌ" کہہ لے، مگر "بدعت سیئہ" کہنے کا اصول شرع کی روشنی میں اسے نہ حق ہے نہ اس کے پاس جواز! اس لئے کہ حدیث (نئی بات) اس چیز کے ساتھ مخصوص ہے جسکی نہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہو نہ خلفاء و ائمہ اور اجماع امت سے اس کا ثبوت ملتا ہو! اور اگر اس بات کو یہ شیعہ نہ مانیں۔ تو ان کی عید غدیر، جشن و تعظیم نوروز، قتل عمر کے دن نماز و مسرت، شکرانہ۔ لونڈیوں کی شرمگاہوں کی حلت۔ بعض اولاد کو ترکہ سے محروم کرنے کا فعل وغیرہ کا کیا بنے گا۔ (یہ تو صورت و حقیقت دونوں لحاظ سے بدعات سیئات ہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تو کسی ذہن میں ان کا تصور تک بھی نہ تھا۔ ان کا گمان (فاسد) ہے کہ یہ تمام امور ائمہ نے نکالے اور اختراع کئے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اہل سنت کے نزدیک۔ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ائمہ کا درجہ اور حکم رکھتے ہیں۔ (اور ان کا یہ دعویٰ تمہارے دعوں کی طرح بے اصل و بے دلیل نہیں بلکہ) اس پر ایک مشہور حدیث کی دلالت بھی موجود ہے۔

مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرٰی اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ عَضُّوْا عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔

تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا اسے بہت اختلاف نظر آئیں گے۔ اسوقت تم پر میری سنت اور میرے بعد کے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل لازم ہے، اس کو دانت گڑو کر پکڑ لو۔

لہٰذا معلوم ہوگیا کہ خلفائے راشدین کی نکالی ہوئی بات بدعت کہہ کر رد کرنے کی چیز نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مانند مضبوطی سے تھامنے والی لائق عمل سنت ہے۔

اعتراض (۱۰) شیعہ اپنی کتابوں میں لکھ گئے ہیں کہ اِنَّ عُمَرَ قَضٰی فِی الْجَدِّ مِائَةَ قَضِیَّةٍ۔ عمرؓ نے دادا کی میراث کے بارے میں سو فیصلے نافذ کئے! لطیفہ ملاحظہ ہو کہ یہی عبارت نواصب نے جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھی ہے اب پتہ نہیں اس جھوٹ گھڑنے میں پہل کس نے کی۔ اور سرنامہ اپنے من پسند نام ٹانگ دئے۔ ممکن ہے جس استاد کے دونوں شاگرد ہیں اسی نے گھڑ کر ہر ایک کے حوالہ کر دی ہو۔ البتہ اہل سنت کے ہاں یہ روایت قطعی موجود نہیں! اس لئے انہیں اسکی طرف نہ توجہ کی ضرورت ہے نہ جواب کی فکر! امامیہ چونکہ روایات میں اختلاف اور رد و بدل کے عادی مشہور ہیں اس لئے اس کی جھلک یہاں بھی موجود ہے۔ کسی نے یہ روایت ج (جد) سے کی ہے تو کسی اور نے ح (حد) سے، اور بعض روایات میں "حد الخمر" کے الفاظ ہیں۔ (بہرحال یہ فن کا معاملہ ہے اگر یہ "خدا" کو "جدا" کر دیں تو آپ کیا کریں گے۔ ن)

قاعدہ کے مطابق تو اس اعتراض کے جواب دینے کے ہم پابند نہیں۔ تاہم اپنے ان "مہربانوں" کی خاطر فرضی طور پر اسے مان لیں تو "حد خمر" والی روایت پر تو ہمیں اعتراض کی کوئی بات نظر نہیں آتی اس لئے کہ اسوقت تک کتاب و سنت میں اسکی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ اس لئے صحابہ کرام کے دلوں میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مختلف خیالات و تجاویز ہوتی تھیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہر ایک کی رائے اور خیال جانچتے اور پرکھتے رہتے ہوں گے! اور جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں حضرت علی مرتضیٰ و جناب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کی رائے باصواب پر اجماع منعقد ہوگیا۔ تو اختلاف قضیہ کا سوال ہی نہ رہا۔

اور اگر یہ جیم سے جد ہے تو یہ ان کا کھلا جھوٹ ہے اس لئے کہ جد کی میراث کے بارے میں تو اختلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد میں بھی تھا۔ اس بارے میں صحابہ کرام مختلف الخیال تھے۔ بالآخر معاملہ دو اقوال پر ٹھہرا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کا قول تھا کہ اسے باپ کی جگہ تصور کریں۔ اور دوسرا قول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کہ اس کو بھی ایک بھائی سمجھ کر شریک میراث کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں اقوال کی ترجیح میں متردد تھے۔ آپ کا رجحان قول صدیق رضی اللہ عنہ کی ترجیح کی جانب تھا۔ اس سلسلہ میں آپ بارہا حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت نیز دوسرے کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے گھروں پر گئے دونوں جانب گفت و شنید ہوئی بحث و مباحثہ ہوا دلیلیں دی گئیں، اور یہ بات کسی طرح بھی عیب شمار نہیں کی جا سکتی۔

یہ تو مفاد ملت کے لئے مسئلہ کی تعیین کا قابل تعریف عمل تھا۔ ایسی صورت میں سینکڑوں دلیلیں دی جاتی ہیں، ہر دلیل کا مدعا اور قضیہ جدا ہوتا ہے، اس پر طعن کرنا انتہائی نادانی اور کور ذوقی کے سوا کچھ نہیں۔ اس بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں حضرت زید بن ثابتؓ کا قول آپ کے نزدیک قابل ترجیح قرار پایا۔ صورت مسئلہ کی تشریح و تفہیم کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کو اپنے گھر لے گئے، وہاں آپ نے ایک نہر کھودی، اس میں سے شاخیں، شاخوں میں سے نالیاں نکالیں اور اس نہر میں اس انداز سے پانی چھوڑا کہ تمام شاخوں اور نالیوں میں پہنچنے لگا۔ پھر ایک ذیلی نالی کا منہ بند کر دیا تو اس کا پانی پلٹ کر بیچ کی نالی میں آگیا اور اوسکی مساوی سطح والی نیز اس سے نیچے والی نالیوں میں بہنے لگا مگر اوپر والی نالی میں نہیں چڑھا! اس تصویر و تمثیل سے یہ ثابت ہوگیا کہ دادا سے بیٹے کو اور

بیٹے سے بیٹوں کو جو کچھ پہنچا۔ وہ اس سلسلہ کے رک جانے سے دوبارہ سارے کا سارا تنہا دادا کو واپس نہیں پہنچے گا دادا کی قرابت اپنی جگہ پر ایک الگ قرابت ہے اور بھائیوں کی قرابت الگ۔ ایک دوسرے کی قرابت باہم کسی دوسرے قرابت کو باطل نہیں کرتی۔ اس تمثیل سے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کی ترجیح پر مطمئن ہو گئے!

اعتراض (۱۱) آپ نے عورتوں سے متعہ کرنے اور حج تمتع کرنے سے منع کیا حالانکہ یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جاری تھے، اس طرح آپ نے گویا خدا کے حکم کو منسوخ اور اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا۔ اور کتب اہل سنت میں آپ کا یہ اعتراف بایں الفاظ موجود ہے۔ مُتْعَتَانِ کَانَتَا عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَنْھٰی عَنْھُمَا دو طرح کے جو متعے عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں رائج تھے میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں!

جواب :- اہل سنت کے نزدیک حدیث کی صحیح ترکتاب مسلم میں بروایت سلمہ بن الاکوع سبرہ بن معبد جہنی نیز دیگر صحاح میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یوں مروی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو حرام قرار دیدیا تھا۔ صرف تین یوم کے لئے اجازت دی تھی پھر یہ حرمت تاقیام قیامت قرار دیدی گئی۔ تین دن کی اجازت بھی جنگ اوطاس کے موقعہ پر دی گئی تھی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعہ کے حرام ہونے والی روایت تو اتنی متواتر اور مشہور ہوئی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد اور محمد بن الحنفیہ کی ساری اولاد اس روایت کو بیان کرتے چلے گئے اور موطا، بخاری و مسلم اور دوسری متداول اور مستعمل کتابوں میں بہت سی سندوں کے ساتھ یہ روایات منقول ہیں۔

شیعوں نے ان روایات میں یہ شبہ ڈالا ہے کہ یہ حرمت غزوہ خیبر کے وقت تھی پھر جنگ اوطاس کے وقت دوبارہ حلال کر دیا گیا۔ مگر ان کی شرارت نہیں تو بے خبری پر ضرور محمول ہے۔ ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو دراصل غزوہ خیبر کو خانگی گدھوں کے گوشت کی حرمت کی تاریخ ٹھہرایا گیا ہے۔ حرمت متعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ عبارت ایسی ہے جس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کی حرمت کی تاریخ خیبر ہی ہے۔ اسی وہم کو بعض محققین نے نقل کرتے ہوئے کہدیا ہے۔ نَھٰی عَنْ مُتْعَةِ النِّسَآءِ یَوْمَ خَیْبَرَ۔

لیکن اگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس روایت میں تحریم متعہ کو خیبر کی تاریخ سے متعین فرماتے تو آپؓ کا ابن عباس رضی اللہ عنہما پر ردو الزام درست کیسے ہوتا۔ حالانکہ جب آپ نے ان کو الزام دیا تو یہی روایت پیش کی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو متعہ جائز سمجھنے پر ان الفاظ سے ڈانٹا جھڑکا! اِنَّکَ رَجُلٌ تَائِہٌ (تم ایک پاگل آدمی ہو) لہٰذا جو شخص تحریم متعہ کی تاریخ غزوہ خیبر بتاتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے غلط استدلال کا مدعی ہے۔ اور یہی دعویٰ اسکی جہالت و حماقت پر گواہی کیلئے کافی ہے اہل سنت کی ایک جماعت نے جناب عبداللہ اور حسن محمد ابن الحنفیہ رحمہما اللہ کے دونوں صاحبزادوں سے روایت کی ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں جناب امیرالمومنین رضی اللہ عنہ سے بیان کی کہ آپ نے فرمایا۔ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اُنَادِیَ بِتَحْرِیْمِ الْمُتْعَةِ۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے حرام ہونیکی منادی کرنے کا حکم فرمایا! پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک یا دوبار متعہ حرام قرار پاگیا جس کو اس کی اطلاع ہوگئی وہ اس سے رک گیا۔ اور جسے خبر نہ ہو سکی وہ نہ رکا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد آیا اور یہ معلوم ہوا کہ بعض جگہ یہ فعل ضرورت کی حد سے نکل کر رواج اور فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ تو آپؓ نے اس کی حرمت بیان فرمائی اور احکامات ریاست کی طرح اسکو شہرت دی۔ اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کی حرمت ہر خاص وعام کے علم میں بھی آگئی اور ذہن نشین بھی ہو گئی، کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسکی حرمت بیان فرما چکے ہیں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام سے ہی تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ عمل ہوا۔

اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ وہ حلال ہونیکی شکل میں رائج بھی ہو یا اس کے حلال ہونے کا حکم باقی بھی ہو ! پھر اگر احادیث و روایات سے قطع نظر بھی کرلی جائے تو قرآنی آیات سے صراحتاً اسکی حرمت کا پتہ چلتا ہے۔ ان آیات میں شیعی تاویلات سے اگر کام لیا جائے، جیسا کہ سابق اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ تو ان سے آیات کی تحریف لازم آتی ہے ! متعہ والی عورت کو یہ بیوی کیسے ثابت کرسکتے اور یہ درجہ اس کو کیسے دے سکتے ہیں، جبکہ بیوی کے احکام مثلاً عدت، طلاق، ایلا، ظہار، اس سے صحبت سے درجہ احصان کا حصول۔ امکان لعان اور وراثت، خود شیعوں کے نزدیک بھی اس پر لاگو اور منطبق نہیں ہوتے، اور یہ ایک عام و ظاہر قاعدہ ہے کہ جب خبر پائی جاتی ہے تو وہ اپنے تمام لوازم کے ساتھ پائی جاتی ہے ! اور ابو بصیر نے اپنی صحیح میں جناب ابی عبد اللہ صادق رحمہ اللہ علیہ سے یوں روایت کی ہے کہ اَنَّہٗ سُئِلَ عَنِ الْمُتْعَۃِ اَھِیَ مِنَ الْاَرْبَعِ قَالَ لَا وَ لَا مِنَ السَّبْعِیْنَ۔ آپ سے متعہ کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ چار میں داخل ہے ؟ آپ نے فرمایا نہیں نہ چار میں نہ ستر میں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ممتوعہ بیوی شمار نہیں ہوتی ورنہ چار میں ضرور شامل ہوتی ! اور قرآن مجید میں جہاں کہیں عورتوں سے نفع اٹھانے کو جائز و حلال قرار دیا ہے وہیں احصان اور سفاح کی قید لگائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ۔	اور ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں بھی تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں اگر مال کے بدلہ تم ان کو حاصل کرنا چاہو تو بیوی بنانے کو مستی نکالنے کے لئے نہ اپناؤ۔
وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ۔	(آج تمہارے لئے حلال کی گئیں) مسلمان پاکدامن عورتیں بھی، اور ان قوموں کی پارسا عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جبکہ تم ان کو ان کا معاوضہ (مہر) دے دو اور مقصد بھی) بیوی بنانا ہو نہ کہ شہوت رانی،

اور ظاہر ہے کہ ممتوعہ میں احصان (بیوی پن) نہیں ہے۔ اور خود شیعہ بھی اس کو احصان کا سبب نہیں سمجھتے ! نہ غیر شادی شدہ متعہ کرنے والے پر حد رجم لگاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ متعہ کرنے والا مسافح (صرف مستی نکالنے والا) ہے کہ اسکی غرض ماء دافق (اچھلتا پانی) نکالنا۔ اور اس پانی کے مقامات کو خالی کرنا ہے۔ نہ اس سے مقصد گھر بسانا ہوتا ہے۔ نہ حصول اولاد، اور عزت و ناموس کی حفاظت، وغیرہ ! اہل سنت کے مقابلہ میں حجت و دلیل کے طور پر شیعوں کے پاس لے دے کر صرف یہ آیت ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْھُنَّ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَۃً — پھر جسطرح تم ان سے منتفع ہوئے ہو تو ان کا جو مہر مقرر ہوا ہے وہ ادا کرو !

اور اسکی بابت ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ متعہ کے حلال ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتی، اور استمتاع سے مراد فعل زوجیت ہے جس پر لفظ "فا" دلالت کرتی ہے اور ایک کلام کے دوسرے کلام کے بعد آنے یا اس کے کلام سابق پر موقوف ہونے کو بتاتی ہے۔ اور اس سے پہلے کی آیت میں نکاح اور مہر کا ذکر ہے ! اور یہ لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کرکے یہ بات کہتے ہیں کہ یہ حضرات اس آیت کو "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْھُنَّ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی" پڑھتے تھے جس سے صاف متعہ کا پتہ چلتا ہے۔ تو ان کا یہ قول ہفوات کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا منقول لفظ (الی اجل مسمی) بالاجماع قرآن میں موجود نہیں۔ اور قرآن کے متواتر ہونے پر ہر دو فرقے، شیعہ و سنی متفق ہیں۔ نہ یہ حدیث پیغمبر ہے۔ تو اب حجت و دلیل میں یہ کیا پیش کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یہ کہہ سکتے ہیں یہ ہو سکتی ہے کہ یہ روایت شاذہ منسوخہ کہدیں۔ اور منسوخ شدہ شاذ روایت کو جسکی صحیح سند مفقود ہو قرآن محکم یقینی کے مقابلہ پر لانا۔ اور قرآن محکم یقینی کو اس کی وجہ سے ترک کرنا اور نظر انداز کرنا کس عقلی توجیہہ کی بنا پر قابل توجہ ہے۔

اور پھر شیعہ وسنی دونوں میں یہ اصولی قاعدہ مقرر و طے شدہ ہے کہ حلت وحرمت کی دو دلیلیں جو قوت دلیل میں مساوی ہوں باہم متضاد و متعارض ہوں تو حرمت کے حکم کو مقدم رکھنا چاہئے! لیکن یہاں تو یہ دلیل متعارض نہیں بلکہ ایک صریح کذب اور جھوٹ ہے، اس لئے کہ اس قرأت کو نہ تو اب تک کسی نے سنا ہے نہ عرب وعجم میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں قرآنی نسخوں میں سے کسی میں یہ عبارت دیکھی گئی۔ تو پھر اباحت کو کیسے مقدم رکھ سکتے ہیں! اور یہ لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نسبت سے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ متعہ کو جائز سمجھتے تھے۔ تو اے کاش! یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کے تمام مسائل پر کاربند ہوتے تو کم از کم صراط مستقیم پر تو قائم ہوتے۔ لیکن یہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما اس مسئلہ پر فرماتے کیا تھے۔ قصہ خود جناب محترم رضی اللہ عنہ کی تصریح کے مطابق یوں ہے کہ آپ فرماتے تھے متعہ ابتدائے عہد اسلام میں مطلقا مباح تھا اور اب صرف مجبور کے لئے ایسا مباح ہے جس طرح کسی کیلئے خون، خنزیر اور مردار! جارفی بطریق خطابی حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت بیان کرتا ہے کہ۔ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ لَقَدْ سَارَتْ بِفُتْيَاكَ الرُّكْبَانُ وَ قَالُوْا فِيْهَا شِعْرًا قَالَ وَمَا قَالُوْا قُلْتُ قَالُوْا۔

فَقُلْتُ لِلشَّيْخِ لَمَّا طَالَ مَجْلِسُهُ. يَا شَيْخُ هَلْ لَكَ فِي فُتْيَا ابْنِ عَبَّاسٍ. فِي غَيْدَةٍ رَخْصَةِ الْأَطْرَافِ آنِسَةٍ. تَكُوْنُ مَثْوَاكَ حَتّٰى مَصْدَرِ النَّاسِ.

فَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا بِهٰذَا أَفْتَيْتُ إِنَّمَا هِيَ كَالْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَلَحْمِ الْخِنْزِيْرِ۔ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا سواروں نے آپ کا فتوی مشہور کر رکھا تھا۔ اور اس پر اشعار بھی کہے ہیں، آپ نے پوچھا وہ شعر کیا ہیں میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب شیخ کی مجلس طویل ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو ابن عباس کے فتوے کے مطابق ایک نازک اندام لطیف و نرم بدن اور خود سپرد عورت میں کوئی رغبت ہے جو لوگوں کی واپسی تک آپ کا ٹھکانا ہو آپ نے فرمایا بہت خوب، میں نے تو یہ فتوی نہیں دیا وہ (متعہ) مردار، خون، اور خنزیر کی طرح ہے،

جامع ترمذی میں امام ترمذی رحمہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں روایت کی ہے۔

قَالَ إِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ كَانَ الرَّجُلُ يَقْدَمُ الْبَلْدَةَ لَيْسَ لَهُ بِهَا مَعْرِفَةٌ فَيَتَزَوَّجُ الْمَرْأَةَ بِقَدْرِ مَا يَرٰى أَنَّهُ يُقِيْمُ بِهَا فَتَحْفَظُ لَهُ مَتَاعَهُ وَ تُصْلِحُ لَهُ شَيْئَهُ حَتّٰى إِذَا نَزَلَتِ الْآيَةُ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا حَرَامٌ۔

آپ نے فرمایا ابتدائے عہد اسلام میں متعہ تھا (ہوتا یہ تھا کہ) کوئی شخص شہر و قصبہ میں اپنے کام سے آتا تھا وہاں کسی سے اس کی جان پہچان نہ ہوتی تو وہ کسی عورت سے اپنی مدت قیام کا یقین کر کے شادی کر لیتا تھا جو اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کی ہر چیز درست رکھتی تا آنکہ یہ آیت نازل ہوئی تب حضرت نے فرمایا۔ صحبت کی ان دو صورتوں کے علاوہ ہر طریقہ حرام ہے!

یہ تو عورتوں کے متعہ کا حال تھا، اب رہا متعۃ الحج، یعنی اشہر حج میں ایک ہی سفر میں یا ایک ہی احرام میں حج وعمرہ کرنا، جو حج تمتع یا حج قران کی صورتیں ہیں اس سے آپ نے ہرگز منع نہیں فرمایا۔ یہ آپ پر افترا یا بہتان ہے۔ البتہ آپ اسکو اولی سمجھتے تھے کہ آدمی آئے عمرہ کرے اور گھر لوٹ جائے۔ اور پھر آئے اور حج کرے۔ دوسرے معنوں میں حج کی تینوں قسموں میں سے آپ حج افراد کو اولی سمجھتے تھے! اب بھی امام شافعی سفیان ثوری اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کے نزدیک حج افراد ہی افضل ہے۔ بعض اور فقہا کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور اس افضلیت کی دلیل آیت۔ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (حج وعمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو) ہے اور اتمام کے معنے تفسیر آیت میں یوں مذکور ہیں إِتْمَامُهُمَا أَنْ تُحْرِمَ بِهِمَا مِنْ دُوَيْرَةِ أَهْلِكَ۔ (ان دونوں کے اتمام کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اہل (بیوی بچے) کی قیام گاہ سے دونوں کا احرام باندھے۔) (یعنی عمرہ کر کے گھر آئے۔ پھر گھر سے احرام باندھ کر حج کو جائے!) پھر آگے ارشاد ہے۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَۃِ اِلَی الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ (پس اگر کوئی عمرہ کا فائدہ حج کے ساتھ اٹھائے تو اسے چاہئے کہ مطابق گنجائش ہدی واجب ساتھ لے جائے)، ہدی یا قربانی متمتع پر فرض ہے جبکہ مفرد پر فرض نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمتع میں کوئی ایسی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے ہدی کو واجب قرار دیا۔ اور تمام شرعی قرائن پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حج میں ہدی۔ قصور کی بنا پر ہی واجب ہوتی ہے۔ ہدی کے ساتھ تمتع و قران بھی جائز ہے۔ اور حدیث مبارک سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کو تمتع و قران دونوں سے زیادہ پسند فرمایا اس کی افضلیت کی واضح دلیل ہے، اس لئے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر حج افراد ہی ادا فرمایا۔ اور عمرۃ القضاء اور عمرہ جعرانہ کے وقت صرف عمرہ ہی فرمایا۔ حالانکہ عمرہ جعرانہ کے موقعہ پر آپ نے فرصت بھی پائی مگر آپ نے حج نہیں فرمایا اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے، اور عقلا بھی حج و عمرہ دونوں کی افرادی ادائیگی ہی افضل معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک کے لئے احرام اور ادائیگی کے لئے جدا جدا سفر نیکیوں کے دوچند ہونے کا سبب ہوگا۔ جیسے ہر نماز کے لئے تازہ وضو کا مستحب ہونا۔ یا ہر نماز کے لئے جائے سکونت سے مسجد میں جانا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعۃ الحج کو منع فرمایا اور اسے جاری نہ رکھا وہ متعۃ الحج دوسرے معنوں میں ہے یعنی حج کو فسخ کر کے عمرہ ادا کرنا اور بلا عذر عمرہ کے لئے حج کے احرام سے نکلنا۔ اور اسی پر امت کا اجماع ہے کہ اس قسم کا متعۃ الحج بلا عذر حرام ہے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مصلحتاً یہ فسخ کرایا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس عمل سے جاہلیت کی ایک ناروا اور غلط رسم کو توڑنا تھا۔ ایام جاہلیت میں وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کو بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے اِذَا عَفَی الْاَثَرُ وَبَرَأَ الدَّبَرُ وَانْسَلَخَ الصَّفَرُ حَلَّتِ الْعُمْرَۃُ لِمَنِ اعْتَمَرَ۔ جب نشانات قدم مٹ جائیں سواری کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینہ گذر جائے تو عمرہ کرنے والوں کے لئے عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔

چونکہ یہ عمل مصلحتاً تھا اس لئے اسی وقت و زمانہ کے لئے مخصوص تھا، دوسروں کے لئے یہ جائز نہیں کہ بلا عذر یہ فسخ کریں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نیز دیگر صحابہ کی روایت سے یہ تخصیص ثابت ہے چنانچہ مسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کَانَتِ الْمُتْعَۃُ فِی الْحَجِّ لِاَصْحَابِ مُحَمَّدٍ خَاصَّۃً (متعۃ الحج اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا۔) اور نسائی نے حارث بن بلال رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی ہے کہ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَسْخُ الْحَجِّ لَنَا خَاصَّۃً اَمْ لِلنَّاسِ عَامَّۃً فَقَالَ بَلْ لَنَا خَاصَّۃً۔ (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ فسخ حج ہمارے لئے خاص ہے یا عام امت کے لئے بھی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ہمارے لئے ہی مخصوص ہے۔) نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے،

قَالَ الْمَازِرِیُّ اُخْتُلِفَ فِی الْمُتْعَۃِ الَّتِیْ نَھٰی عَنْھَا عُمَرُ فِی الْحَجِّ فَقِیْلَ فَسْخُ الْحَجِّ اِلَی الْعُمْرَۃِ وَقَالَ الْقَاضِیْ عِیَاضٌ ظَاھِرُ حَدِیْثِ جَابِرٍ وَعِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ وَاَبِیْ مُوْسٰی اَنَّ الْمُتْعَۃَ الَّتِی اخْتَلَفُوْا فِیْھَا اِنَّمَا ھِیَ فَسْخُ الْحَجِّ اِلَی الْعُمْرَۃِ قَالَ وَلِھٰذَا کَانَ عُمَرُ یَضْرِبُ النَّاسَ عَلَیْھَا وَلَا یَضْرِبُھُمْ عَلٰی مُجَرَّدِ التَّمَتُّعِ ای الْعُمْرَۃِ فِیْ اَشْھُرِ الْحَجِّ۔

مازری کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعہ سے حج کے زمانہ میں روکا ہے اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ عمرہ کے لئے حج فسخ کرنے کی صورت ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت جابر، عمران بن حصین اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ متعہ جس میں اختلاف ہے وہ عمرہ کے لئے حج فسخ کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا کرنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی گوشمالی بھی کر دیتے تھے، صرف تمتع پر نہیں مارتے تھے، یعنی اشہر حج میں عمرہ کرنے پر!

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا "انا انھیٰ عنھما" اس کا مطلب یہ ہے میں جو تمہارا والی وحاکم ہوں منع کرتا ہوں کہ تمہارے دلوں پر خاطر خواہ اثر ہو، کیونکہ میں دینی معاملات میں جو سختی برتتا ہوں تم کو بخوبی اندازہ ہے، اس لئے اس معاملہ میں تساہل نہ برتنا۔ رہا معاملہ اصل نہی اور ممانعت کا سو قرآن مجید اور حدیث مبارک دونوں سے وہ پہلے ہی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔ (ان مذکورہ صورتوں کے علاوہ اگر کوئی اور صورت اختیار کرنا چاہے پس وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔) یا وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ حج وعمرہ دونوں اللہ کے لئے پورے کرو! مگر بعض لوگ اپنی لاپرواہی سے اور بعض دوسرے اپنی سرکشی اور فسق کی بنا پر قرآن وحدیث کا حکم کم ہی خاطر میں لاتے ہیں۔ ان کو حدود میں رکھنے اور سنی و کہی ہوئی بات پر کان دھرنے کے لئے صاحب اقتدار کا جبر اور سختی درکار ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ مقولہ مشہور ہو گیا ہے کہ بادشاہ قرآن کی نسبت زیادہ بندوبست کرتا اور احکامات پر عمل کراتا ہے۔"

فاروق اعظم گا نہی کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی اسی نکتہ پر مبنی ہے۔ کہ ممانعت تو قرآن وحدیث کر چکے، اب ان پر عمل میں کراؤں گا۔ اس لئے میں ان دونوں باتوں سے تمکو منع کرتا ہوں۔

حضرت عثمان غنیؓ پر اعتراضات

اور ان مطاعن واعتراضات کی کل تعداد دس ہے۔

اعتراض (۱) پہلا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں پر ایسے والی وحاکم مقرر فرمائے جن سے ظلم وزیادتی اور خیانت سرزد ہوئی اور ناشائستہ امور کے وہ مرتکب ہوئے مثلاً ولید بن عقبہ جس نے شراب پی اور مستی ہی کی حالت میں صبح کی نماز کی امامت بھی کی۔ اور دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھائیں اور کہا کہ دو رکعات میں تمہارے لئے بڑھا رہا ہوں۔ اور جناب معاویہ (رضی اللہ عنہ) کو چاروں صوبوں کا مختار بنا دیا بالآخر وہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ جناب امیر (رضی اللہ عنہ) کے عہد میں نہ ہونے والی باتیں ہوئیں۔ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا والی بنایا۔ اور اس نے لوگوں پر اتنے مظالم کئے کہ لوگ تنگ آکر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور بلوہ کیا: مروان کو اپنا وزیر اور منشی مقرر کیا، جس نے جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے دھوکہ کیا کہ خط میں اقبلوہ (انکی اطاعت کرو) کے بجائے اقتلوہ (ان کو قتل کر ڈالو) لکھدیا۔ اور پھر اپنے عاملوں کی شکایات پر سکوت فرمایا اور ان کو معزول کرنے میں تامل سے کام کیا۔ اور نوبت یہ آگئی کہ لوگ ان کے ہاتھوں تنگ آگئے اور آپ کے خلاف ان عاملوں کے طرز عمل کے ساتھ نفرت پھیل گئی۔ اور اس وقت ان کے معزول کرنے کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا بالآخر قتل وغارت گری ہوئی جس کا کوئی تدارک نہ ہو سکا۔ اب جو شخص ایسا بدتدبیر ہو، جو امین وخائن اور عادل وظالم میں تمیز نہ کر سکے نہ مردم شناس ہو وہ امامت کے قابل نہیں ہو سکتا۔"

جواب:- اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ امام کو یہ چاہیئے کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھے اس کے وہی کام سپرد کرے۔ امام کے لئے علم غیب رکھنے کی شرط سوائے شیعوں نہ اہل سنت کے ہاں ہے اور نہ ہی کوئی اور طبقہ وطائفہ اس کا قائل ہے! اور ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے حسن ظن رکھنا بھی اسلامی شعار ہے، اور جناب عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے یہی کیا، انہوں نے جس کو کام کا آدمی سمجھا اس کے سپرد وہی کام کیا۔ جس کو اپنے حسن ظن سے امین وعادل مطیع واطاعت شعار دیکھا اسی کو امور سلطنت وریاست سپرد کئے! معاند ومخالف فرقہ کی غوغا آرائی سے ہٹ کر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے عمال وحکام خلیفہ سے محبت رکھنے کے علاوہ ان کے احکام کے تابعدار تھے۔ فوج کشی، اور دور و دراز کے دیار وامصار کے فتح کرنے میں معرکہ آرائی میں چاق وچوبند، اور بیدار مغزی میں نادرۂ روزگار تھے۔ ان کے فتوحات اوراق تاریخ پر ثبت ہیں! اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اندلس تک جا پہنچا تو مشرق میں کابل، بلخ اور روم میں اسلام کا پرچم لہرایا۔ رومیوں سے خشکی پر بھی نبرد آزما ہوئے تو بحری لڑائیاں لڑکر

بھی ان کو مفتوح کیا۔ خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عراق وعجم اور خراسان فتنہ وفساد کا گہوارہ رہ چکے تھے، ان کی اتنی مؤثر گوشمالی کی گئی کہ فتنہ وفساد کا نشان تک لوگوں کے دلوں سے مٹا ڈالا، اسلام کی اتنی شان وشوکت اور فتوحات کا یہ عظیم الشان سلسلہ تاریخ کے اوراق پر ثبت کرنے والا کیا اتنا ہی بودا تھا کہ وہ معمولی عمال حکومت سے عاجز آجاتا۔ اور ان کی گوشمالی نہ کر پاتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا حسن تدبیر سے حل فرماتے تھے، آپ کو امور جہاںبانی سے بے خبری نہیں تھی، نہ وہ عوام کی نفسیات سے ناواقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امراء وحکام کے بہت سے لوگ یوں ہی خواہ مخواہ بھی دشمن اور درپے آزار ہوتے ہیں، اور جھوٹی سچی شکایتیں ان کا وطیرہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے لئے تو عدل وانصاف کا شور وغوغا بلند کئے رکھتے ہیں، مگر جن کے وہ خلاف ہوتے ہیں اسکو وہ فوراً پھانسی چڑھوانا چاہتے ہیں، اس کے لئے عدل وانصاف کے معروف طریقے برتنے کے بھی روادار نہیں ہوتے، اہل سنت کے نزدیک نہ جناب خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ معصوم تھے۔ نہ ان کے عمال وحکام بے خطا۔ وہ بھی ان سازشیوں اور غوغائیوں کی طرح انسان تھے۔ اگر کوئی عامل وحاکم خائن یا بددیانت نکلا۔ یا اس نے ظلم وستم روا رکھا۔ تو اس میں جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا کیا قصور جبکہ ان سے متعلق شکایات آپ نے کبھی نظر انداز بھی نہ کیں، جب کسی شکایت کی تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ شکایت درست ہے تو آپ نے متعلقہ فرد سے بازپرس بھی کی اور اسکو معزول بھی فرمایا مثلاً ولید! اور جو عمال حکومت اسلامی ریاست کے رکن رکین تھے جنکی مدبرانہ مساعی سے اور جن کی جنگی مہارت سے، اور بیدار مغزی سے اسلام اور مسلمانوں کو شوکت مل رہی تھی، جو اسلام وریاست کے وفادار تھے۔ نہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ اٹھا، نہ سازش ہوئی اور جنہوں نے روم کی کامیاب لڑائی لڑی اور نمایاں فتوحات حاصل کیں۔ جیسے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ تو ان کو آخر کیوں معزول کرتے؟ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد گوشہ نشینی ہی اختیار کرلی تھی۔ بعد کے جھگڑوں ٹنٹوں میں انہوں نے مطلق دخل نہ دیا۔ اسی سے ان کی اچھائی اور سلامتی فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے، کہ شکایات جہاں کی بھی ہوں ان میں ہاتھ عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے سازشی ٹولے کا تھا۔ اوراق سابق میں آپ تفصیل پڑھ چکے ہیں، مصر میں وہ بیٹھا ہوا آگ لگاتا اور بھڑکاتا رہا تھا۔ وہ زیرک تھا، پڑھا لکھا، تیز وطرار، اور چرب زبان تھا۔ وہ یہودی سیاست کا ماہر اور منجھا ہوا تھا۔ سیادت وقیادت کی ہوس نے کم اسلام دشمنی نے زیادہ اسے آتش زیر پا کر رکھا تھا جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کی خواہش اعزاز کو مسترد کرکے اسے دھتکار دیا تھا! ایسے عالم میں ایسا دشمن جو نہ کرتا تھوڑا تھا! بہرحال حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے اپنی صوابدید اور مومنانہ ذمہ داریوں کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اور عزت وعظمت اسلام، ملت مسلمہ کی نیکنامی کے لئے جو کچھ آپ کر گئے آپ کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہ کرسکا۔ کاتب تقدیر نے جب مقدر میں شہادت تحریر کردی تھی تو اس کے اسباب بھی تو مہیا ہونے تھے! لہذا تدبیر مساعد تقدیر نہ ہوئی فتنہ وفساد کا دروازہ بند نہ ہو سکا! آپ انہیں حالات سے گذرے جن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانہ خلافت کے پہلے دن سے لے کر آخری لمحات تک گذرتے رہے۔ حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہرچند بہترین تدابیر اور چیدہ مشورے خلافت وریاست کے امور کے انتظام کے سلسلہ میں عمل میں لاتے رہے، مگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا۔ اور خاطر خواہ طریقہ پر مسند خلافت پر تمکن حاصل نہ ہوا۔ یہی حال ہر دو اصحاب گرامی قدر رضی اللہ عنہما کا اپنے عمال وحکام کے سلسلہ میں رہا۔ وہ بھی باہم یکدگر ملتے جلتے تھی۔ اتنا فرق البتہ تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے عمال، امراء حکام آپ کے ساتھ تسلیم وانقیاد محبت ووفا سے پیش آتے رہے، سرکشی اور بغاوت اور نافرمانی سے دور رہے۔ غنائم اور خمس وغیرہ مسلسل اور باقاعدہ دارالخلافہ بھیجتے رہے جس کے سبب اہل اسلام دولت وثروت کی زندگی کے دور میں داخل ہوگئے! اور عیش وعشرت

کی زندگی کے عادی ہوتے گئے اور یہی حد سے گذری ہوئی پُر عشرت زندگی فتنہ و فساد کا سبب بنگئی۔

ادھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عامل اور حکام دین و ملت کے وفادار تو کیا ذاتی طور پر بھی آپؓ کے مطیع و فرمانبردار نہ تھے۔ ہر کام کو بگاڑتے چاروں طرف سے شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر لوٹتے، خیانتیں کر کے ظلم و ستم ڈھا کر دنیا و آخرت کی روسیاہی حاصل کرتے اور بھاگ نکلتے۔ غیروں کا تو کیا ذکر خود آپؓ کے اقارب اور چچا زاد بھائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اگر کسی کو اس بات میں شبہ ہو تو وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ خط پڑھ لے جسے نہج البلاغہ نے درج کیا ہے۔ واضح رہے نہج البلاغہ ان کے ہاں کی اصح ترین کتاب ہے اس خط میں آپ اپنے چچا زاد بھائی کو خطاب فرما رہے ہیں۔ آپ کا یہ خط آپؓ کے مشہور خطوط میں سے ہے اور اکثر کتب امامیہ میں ملتا ہے۔ خط کا ابتدائیہ قابل توجہ ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اس روسیاہ سے جو حسن ظن تھا وہ بھی ملحوظ خاطر رہے۔

اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَشْرَکْتُکَ فِیْ اَمَانَتِیْ وَجَعَلْتُکَ شِعَارِیْ وَبِطَانَتِیْ وَلَمْ یَکُنْ فِیْ اَھْلِیْ رَجُلٌ اَوْثَقَ مِنْکَ فِیْ نَفْسِیْ لِمُوَاسَاتِیْ وَمُوَازَرَتِیْ وَاَدَاءِ الْاَمَانَۃِ اِلَیَّ فَلَمَّا رَاَیْتَ الزَّمَانَ عَلٰی ابْنِ عَمِّکَ قَدْ کَلِبَ وَالْعَدُوَّ قَدْ حَرِبَ وَاَمَانَۃَ النَّاسِ قَدْ خَزِیَتْ وَھٰذِہِ الْاُمَّۃَ قَدْ فَتَکَتْ وَشَغَرَتْ قَلَبْتَ لِابْنِ عَمِّکَ ظَھْرَ الْمِجَنِّ فَفَارَقْتَہٗ مَعَ الْمُفَارِقِیْنَ وَخَذَلْتَہٗ مَعَ الْخَاذِلِیْنَ وَخُنْتَہٗ مَعَ الْخَائِنِیْنَ فَلَا ابْنَ عَمِّکَ اٰسَیْتَ وَلَا الْاَمَانَۃَ اَدَّیْتَ وَکَاَنَّکَ لَمْ تَکُنِ اللّٰہَ تُرِیْدُ بِجِھَادِکَ وَکَاَنَّکَ لَمْ تَکُنْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّکَ وَکَاَنَّکَ تَکِیْدُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ عَنْ دُنْیَاھُمْ وَتَنْوِیْ غِرَّتَھُمْ عَنْ فَیْئِھِمْ فَلَمَّا اَمْکَنَتْکَ الشِّدَّۃُ فِیْ خِیَانَۃِ الْاُمَّۃِ اَسْرَعْتَ الْکَرَّۃَ وَعَاجَلْتَ الْوَثْبَۃَ وَاخْتَطَفْتَ مَا قَدَرْتَ عَلَیْہِ مِنْ اَمْوَالِھِمُ الْمَصُوْنَۃِ لِاَرَامِلِھِمْ وَاَیْتَامِھِمُ اخْتِطَافَ الذِّئْبِ الْاَزَلِّ دَامِیَۃَ الْمِعْزَی الْکَسِیْرَۃَ فَحَمَلْتَہٗ اِلَی الْحِجَازِ رَحِیْبَ الصَّدْرِ بِحَمْلِہٖ غَیْرَ مُتَاَثِّمٍ مِّنْ اَخْذِہٖ کَاَنَّکَ لَا اَبَا لِغَیْرِکَ حَدَرْتَ اِلٰی اَھْلِکَ تُرَاثَکَ مِنْ اَبِیْکَ وَاُمِّکَ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ اَوَمَا تُؤْمِنُ بِالْمَعَادِ اَوَمَا تَخَافُ مِنْ نِقَاشِ الْحِسَابِ اَیُّھَا الْمَعْدُوْدُ کَانَ عِنْدَنَا مِنْ ذَوِی الْاَلْبَابِ کَیْفَ تُسِیْغُ طَعَامًا

حمد و ثنا کے بعد واضح ہو کہ میں نے تمکو اپنی امانت کا شریک کار کیا، تمکو اپنا اوڑھنا بچھونا (یار غار) بنایا۔ تم میرے اہل خانہ میں میرے نزدیک غمخواری، رفاقت اور امانت داری میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھے۔ لیکن جب تم نے اپنے ابن عم کا برا وقت دیکھا اور دشمن کو آمادہ پیکار پایا۔ اور لوگوں کی امانت داری خیانت کی شکل اختیار کر گئی اور یہ امت خونریزی میں ڈوب گئی تو تو منہ پھاڑ کر رہ گیا اور عین غم و اندوہ کے عالم میں اس کو دغا دیگیا۔ اوروں کی طرح تو بھی اس سے بچھڑ گیا۔ دوسروں کی طرح تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اوروں بھی خیانت کرنے والوں کا خیانت میں ساتھی بن گیا۔ تو نے اپنے ابن عم کی نہ ہمدردی کی نہ اس کی امانت ادا کی۔ گویا تو اپنے جہاد میں مخلص نہیں تھا تجھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدنظر نہ تھی۔ نہ اپنے رب کی طرف سے کسی کھلی دلیل پر قائم تھا۔ گویا تو مکر و فریب سے دنیا کمانا چاہتا اور دھوکہ سے امت کے خزانے اڑا لینے کی نیت رکھتا تھا۔ جب حالات کی ستم گری نے تجھے خیانت کا موقعہ دیا تو تو جھپٹ پڑا۔ اور بے صبر ہو کر ان کا جتنا مال سمیٹ سکتا تھا لے بھاگا۔ یہ وہ مال تھا جو امت کے بیواؤں اور یتیموں کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا جس طرح بدحال بھیڑیا خون آلود، ہڈی ٹوٹی بکری کو لے بھاگتا ہے۔ اب تو وہ مال سمیٹ کر حجاز لے گیا ہے اور یوں اٹھائے ہوتے ہے گویا اس کے لینے میں تو نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تیرا باپ مرے (تیرا ناس ہو) گویا وہ تیرا جوڑا ہوا مال تھا یا تجھے اپنے ماں باپ کا ورثہ ملا تھا۔ کیا کہنے! یا تو آخرت کے عذاب سے نڈر ہو گیا ہے؟

وَشَرَابًا وَّاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّكَ تَاْكُلُ حَرَامًا وَّتَشْرَبُ حَرَامًا وَّتَبْتَاعُ الْاِمَاءَ وَتَنْكِحُ النِّسَاءَ مِنْ اَمْوَالِ الْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْمُجَاهِدِيْنَ الَّذِيْنَ اَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ هٰذِهِ الْاَمْوَالَ وَاَحْضَرَ بِهِمْ هٰذِهِ الْبِلَادَ فَاتَّقِ اللّٰهَ وَارْدُدْ اِلٰى هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ اَمْوَالَهُمْ فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تَفْعَلْ ثُمَّ اَمْكَنَنِيَ اللّٰهُ مِنْكَ لَاُعْذِرَنَّ اِلَى اللّٰهِ فِيْكَ وَلَاَضْرِبَنَّكَ بِسَيْفِيَ الَّذِيْ مَا ضَرَبْتُ بِهٖ اَحَدًا اِلَّا دَخَلَ النَّارَ۔

اور حساب لکھنے والوں کا تجھے کوئی خوف نہیں رہا۔ تو تو ہمارے نزدیک عقلمندوں کا انتخاب تھا۔ تیرے حلق سے لقمہ کس طرح اترتا ہے جبکہ تو جانتا ہے کہ حرام کھا رہا ہے اور حرام پی رہا ہے۔ یتیموں مسکینوں اور مجاہدوں کو اللہ تعالیٰ نے جو مال دیا تھا اور جنکی خاطر اس نے ان شہروں کو سرسبز وشاداب بنا رکھا ہے۔ اس مال سے تو لونڈیاں خرید رہا ہے۔ عورتوں سے نکاح کرتا ہے (اور اڑا رہا ہے) اللہ تعالیٰ سے ڈر، حقداروں کا مال واپس کر! اگر تو نے ایسا نہ کیا اور میں تجھ پر قابو پا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیرے معاملہ میں بری الذمہ ہو جاؤں گا، اور تجھے اسی تلوار سے قتل کروں گا کہ اس سے میں نے جس کو مارا وہ جہنم رسید ہوا "

اس خط کے پورے مضمون اور اس میں پوشیدہ کرب پر غور کیجئے اور اس عامل کی خیانت وخباثت کا اندازہ لگائیے، اور پھر جناب شہید رضی اللہ عنہ کے پورے دور خلافت پر نظر ڈال جائیے کیا وہاں بھی کسی عامل سے ایسی خیانت وخباثت کا ثبوت ملتا ہے! کیا وہاں بھی کوئی مال کھا کر اسطرح بھاگتا ملتا ہے۔ (اور گالیاں کھا رہا ہے)

جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایک اور عامل منذر بن جارود تھا، وہ بھی سخت خائن اور چور نکلا۔ جب اس کی خیانت ظاہر ہوئی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی دھمکی آمیز خط لکھا۔ آپؓ کا یہ خط بھی مشہور خطوط میں شمار ہوتا ہے، جو نہج البلاغہ کے علاوہ امامیہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے! ملاحظہ ہو۔

اَمَّا بَعْدُ فَصَلَاحُ اَبِيْكَ غَرَّنِيْ مِنْكَ وَظَنَنْتُ اَنَّكَ تَتَّبِعُ هَدْيَهٗ وَتَسْلُكُ سَبِيْلَهٗ فَاِذَا اَنْتَ فِيْمَا رُقِّيَ اِلَيَّ عَنْكَ لَا تَدَعُ لِهَوَاكَ اِنْقِيَادًا وَّلَا يُبْقِيْ لِاٰخِرَتِكَ عِيَادًا تَعْمُرُ دُنْيَاكَ بِخَرَابِ اٰخِرَتِكَ وَتَصِلُ عَشِيْرَتَكَ بِقَطِيْعَةِ دِيْنِكَ اِلٰى اٰخِرِ الْكِتَابِ الْمُكَرَّمِ۔

حمد وثنا کے بعد! میں تیرے باپ کی نیک بختی کے سبب تیرے بارے میں دھوکہ کھا گیا اور میں یہ سمجھ بیٹھا کہ تو اپنے باپ کے نقش قدم پر ہوگا اور اسی کے راستہ پہ چلتا ہوگا۔ مگر ان خبروں سے جو تیرے متعلق مجھ تک پہنچی اچانک ہی یہ معلوم ہوا کہ تو تو اپنی خواہشوں کا اسیر ہے۔ اپنی آخرت کے لئے تیرے پاس کوئی ذخیرہ نہیں۔ کیا تو اپنی آخرت برباد کر کے دنیا آباد کرنا چاہتا ہے؟ اور اپنے دین کا رشتہ کاٹ کر اپنے عزیز واقارب سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ الی آخر المکتوب "

حاصل کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مابین اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر دو حضرات نے اپنی بہترین صوابدید کے مطابق جو کچھ حق سمجھا اور جو کام اپنے ذمہ لازم جانا اس کو عمل میں لائے۔ اس میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں فرمائی۔ اپنے خیال اور حسن ظن کے مطابق عمال وحکام مقرر فرمائے! نہ وہ کسی کے دل کا حال جانتے تھے، اور نہ یہ جانتے تھے کہ آج جو اچھا ہے کل برا ہو جائے گا۔ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ظاہری اور دکھاوے کے اخلاق سے پیغمبر بھی متاثر ہوتے رہے! وہ تو چونکہ ان پر وحی کا نزول ہوتا رہتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی ان کا اندرون اپنے انبیاء پر ظاہر فرما دیتے۔ اور ان کی کوئی سازش، کوئی برا ارادہ اور منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تاکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو خالص کرے۔ نیز یہ فرمایا مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو ایسی (رلی ملی) حالت میں جو تم کو درپیش ہے، چھوڑے نہیں رکھے گا۔ جب تک خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ نہ کر دے۔

امام کے لیے ضروری نہیں کہ وہ غیب دان ہو، اور اس کا حسن ظن پھر غلط نہ نکلے اور اس کو پہلے معلوم ہو جائے کہ اس سے کیا کچھ سرزد ہونے والا ہے!

البتہ اس سلسلہ میں شیعوں کے بڑی دشواری اور مشکل ہے کیونکہ ان کے عقیدہ میں امام "غیب دان" ہوتا ہے اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ خیانت ظاہر ہونے سے پہلے اور کام سپرد کرنے سے پیشتر ہی جان جایا کرتے تھے، کہ فلاں خائن ہے وہ خیانت سے باز نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق آئمہ کے لئے گذشتہ و آئندہ کا علم حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور یہ کسی ایک دو کا خیال نہیں ان کے ہاں کا اجماعی مسئلہ ہے۔ محمد بن یعقوب کلینی اور دوسرے علماء نے مختلف روایتوں اور متعدد طرق سے ثابت کر رکھا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک دیدہ و دانستہ خائنوں اور فسادیوں کو مسلمانوں کا والی مقرر فرماتے تھے: اور بالآخر وہ خائن لوگ مال و دولت سمیٹ کر بھاگ جاتے اور یوں مسلمانوں کے حقوق تلف کرنے کا باعث ہوتے تھے۔ اور پھر سوائے نصیحت ناموں، عتاب ناموں اور وعظ و نصیحت کے کوئی چارہ کار یا تدارک کی صورت نہ رہتی تھی!

اُدھر بیچارے عثمان غنی رضی اللہ عنہ محض اپنے حسن ظن پر (کیونکہ علم غیب تو ان کو تھا نہیں)، عامل مقرر کر دیتے اور ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتتے۔ اور پشیمان و پریشان ہوتے!

اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک اور عامل کی داستان سنئے، جس نے آپ کے محترم و مقدس خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور کن کن اذیتوں سے انہیں دوچار کیا، یہ مردود زمانہ جس کی اصل بھی قابل اعتراض رہی، زیاد بن سُمَیَّہ (عرف زیاد بن سفیان) تھا! جو ملک فارس و شیراز کا آپکی طرف سے صوبہ دار تھا۔ وہ اتنا بے حیا تھا کہ اپنی بے نسبی پر فخر کرتا اور علی الاعلان۔ اپنی والدہ پر جو ایک لونڈی تھی زنا کی گواہی دیتا تھا۔ وہ قصہ یوں ہے کہ جناب ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے اسلام لانے سے پیشتر حارث ثقفی مشہور طبیب کی لونڈی سُمَیَّہ نامی سے ناجائز تعلق قائم کیا، جس کے نتیجہ میں اس نے ایک بچہ جنا چونکہ وہ حارث کی لونڈی تھی اور حارث ہی کے ایک غلام کی منکوحہ بھی اس لئے بچپن میں یہ لڑکا عبدالحارث کے لقب سے مشہور ہوا۔ جب وہ بڑا ہوا تو شرافت و بلاغت، خوش تقریری اور حسن بیانی کا بہت چرچا ہوا، اس کی سوجھ بوجھ زیرکی و دانائی، دور دور شہرت پا گئی! ایک روز قریش کے ایک سنجیدہ بزرگ عمرو بن عاص نے کہا کہ "اگر یہ لڑکا قریش میں ہوتا تو عرب کو اپنی لاٹھی سے ہانکتا"، ابوسفیان رضؓ نے یہ سنکر کہا۔

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ مَنْ وَضَعَہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ ۔ بخدا میں اس کو خوب جانتا ہوں جس کا یہ نطفہ ہے۔ اس مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے آپ نے پوچھا ابوسفیان وہ کون تھا، ابوسفیان نے کہا "وہ میں ہوں"، آپ نے فرمایا بس رہنے دے ابو سفیان رضؓ! اس پر ابوسفیان نے یہ اشعار پڑھے

اَمَا وَاللّٰہِ لَوْلَا خَوْفُ شَخْصٍ	یَرَانِیْ یَا عَلِیُّ مِنَ الْاَعَادِیْ
لَاَظْھَرَ سِرَّہٗ صَخْرُ بْنُ حَرْبٍ	وَلَمْ تَکُنِ الْمَقَالَۃُ عَنْ زِیَادٍ
وَقَدْ طَالَتْ مُجَامَلَتِیْ ثَقِیْفًا	وَتَرْکِیْ فِیْھِمْ ثَمَرَ الْفُؤَادِ

ترجمہ۔ بخدا اگر مجھے اس شخص کا ڈر نہ ہوتا جو مجھے دشمنوں میں شمار کرتا ہے، تو اے علی، صخر بن حرب (یعنی میں) اس لڑکے کے بھید کو ظاہر

کر دیتا تو پھر یہ خوش گفتاری زیاد کی شمار نہ ہوتی۔ بہت عرصہ میں نے قوم ثقیف سے اسے چھپائے رکھا اور اپنے جگر گوشہ کو ان کے پاس چھوڑے رکھا،،

یہ قصہ زیاد نے بھی سن رکھا تھا۔ اور بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کہتا تھا کہ میں اصل میں ابوسفیان رضؓ کا نطفہ اور قوم قریش کا فرد ہوں۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو فارس کا حاکم بنایا، تو نظم مملکت قائم کرنے ان شہروں کی حالت درست کرنے اور فتنہ وفساد پر قابو پانے میں اس کی کارگردگی بڑی شاندار رہی، اور اس کی تدابیر و تجاویز کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔
یہ حالت دیکھ کر جناب معاویہ رضی اللہ نے اس سے خفیہ رابطہ قائم کیا، تاکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ان سے آملے۔ اور اسے لالچ دیا کہ اگر وہ اس کے لئے تیار ہو تو اسے شریک نسب بھی کر لیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا خوش تدبیر اور لائق فائق اور کام کا آدمی اگر حریف سے کٹ کر اپنے سے آملے تو یہ بڑی سیاسی کامیابی تھی! آپ نے اس کو لکھا کہ اگر تو میرے پاس آگیا تو میں تجھے اپنا بھائی کہوں گا، اولاد ابوسفیانؓ میں تجھے شامل قرار دوں گا۔ کیونکہ تو آخر تو ابوسفیان ہی کا نطفہ ہے۔ اور تیری دانائی شرافت سوجھ بوجھ تیرے دعوی کی صداقت کے منہ بولتے گواہ ہیں۔ جب اس پخت و پز کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ نے زیاد کو اس مضمون کا خط لکھا۔

قَدْ عَرَفْتُ اَنَّ مُعَاوِيَةَ كَتَبَ اِلَيْكَ يَسْتَزِلُّ لُبَّكَ وَ يَسْتَفِلُّ غَرْبَكَ فَاحْذَرْهُ اِنَّمَا هُوَ الشَّيْطَانُ يَاْتِي الْمَرْءَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَعَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ لِيَقْتَحِمَ غَفْلَتَهُ وَيَسْتَلِبَ عِزَّتَهُ فَاحْذَرْهُ وَقَدْ كَانَ مِنْ اَبِيْ سُفْيَانَ فِيْ زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَلْتَةٌ مِنْ حَدِيْثِ النَّفْسِ وَنَزْغَةٌ مِنْ نَزَغَاتِ الشَّيْطَانِ لَا يَثْبُتُ بِهَا نَسَبٌ وَلَا يُسْتَحَقُّ بِهَا مِيْرَاثٌ وَالْمُتَعَلِّقُ بِهَا كَالْوَاغِلِ الْمُدَفَّعِ وَالنَّوْطِ الْمُذَبْذَبِ۔

مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ معاویہؓ نے تجھے خط لکھا ہے، وہ تجھے بیوقوف بنا کر تیری تیزی کو ماند کرنا چاہتا ہے تم اس سے ڈرتے رہو۔ وہ اس شیطان کی مانند ہے جو آدمی کو آگے سے پیچھے سے دائیں بائیں سے ہر طرف سے گھیرنے کی فکر میں رہتا ہے تاکہ جب اسے غافل پائے فکر پائے تو قابو پا کر تباہ کر دے۔ تم اس سے ہوشیار رہو! اور عمرؓ کے زمانہ میں ابوسفیان کے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی جو وسوسہ نفسانی یا شیطانی خیال ہی تھا کہ اس سے نہ کسی کا نسب ثابت ہو سکتا ہے نہ کسی میراث کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اس کو سند و ثبوت میں پیش کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے زبردستی ہانک کر لایا گیا ہو، اور جو ادھر میں لٹکا ہوا، ادھر ادھر ہل رہا ہو،،

جب زیاد نے یہ خط پڑھا تو کہنے لگا۔ ورب الکعبہ شہد ابی الحسن بانی ابن ابوسفیان (رب کعبہ کی قسم علیؓ نے تو گواہی دی ہے کہ میں ابوسفیانؓ کا بیٹا ہوں)

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک آپؓ کا رفیق رہا۔ ساتھ نہ چھوڑا۔ اور جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت و سیادت کا معاملہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، اور ادھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی حد سے زیادہ کوشش کی، اور ابوسفیانؓ رضی اللہ عنہ کے اسی قول کو دلیل بنا کر جو جناب عمرو بن عاص اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے روبرو کہا تھا اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور ۴۴ھ میں زیاد بن ابوسفیان اس کا لقب تجویز کر کے تمام قلمرو میں اعلان کرا دیا کہ آئندہ سے اسے زیاد بن ابوسفیان کہا جایا کرے! اور یہ سعی و کوشش اس لئے کی کہ وہ مدبر، شجاع اور بہت زیرک سردار تھا۔ جمعیت بھی اس کے ساتھ بہت تھی اپنے ساتھ ملانے سے ان کی ریاست میں استحکام اور مضبوطی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک امکانی خطرہ کا سدباب بھی تھا۔ ممکن ہے وہ بغاوت کر کے ان کے لئے خطرات کا باعث بن جائے۔ بہرحال جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی سیاسی تدبیر میں کامیاب ہوئے اور وہ آپ کا رفیق و

معاون بن گیا۔

اس بدفطرت نے جناب معاویہؓ کے ساتھ ہوجانے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی تک تو تھوڑا بہت ظاہری لحاظ برتا۔ مگر آپ کی وفات کے بعد جب عراق کا گورنر بنایا گیا تو کوفہ پر قبضہ کے بعد سب سے پہلے جناب سعید بن شریح رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پڑگیا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے مخلص رفقاء میں سے تھے۔ اور آپ کے بلند قلعہ خاندان کے دلی دوستوں میں سے گنے جاتے تھے۔ اس کا ان کے درپے آزار ہونا گویا خاندان واولاد علی رضی اللہ عنہ سے عداوت ودشمنی کی ابتداء تھی!

جناب سعید کو جب اس کے ارادوں کی بھنک ملی تو وہ کوفہ سے نکل کر مدینہ منورہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے۔ ان کا کوفہ میں گھر تھا۔ اہل عیال تھے مال واسباب تھا ان سب پر زیاد نے قبضہ کرلیا۔ مال واسباب لوٹ کر گھر جلا دینے کا حکم دیدیا۔

جب یہ اطلاع جناب حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو یہ خیال فرمایا کہ آخر اتنے عرصہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا رفیق، ودوست رہا ہے، لحاظ ومروت کچھ تو برتے گا۔ آپ نے بطور سفارش اس کو خط لکھدیا۔

مِنْ حسین ابْنِ عَلِیٍّ اِلٰی زِیَادٍ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ عَمَدْتَ اِلٰی رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ لَہٗ مَا لَھُمْ وَعَلَیْہِ مَا عَلَیْھِمْ فَھَدَمْتَ دَارَہٗ وَاَخَذْتَ مَالَہٗ وَعِیَالَہٗ فَاِذَا اَتَاکَ کِتَابِیْ ھٰذَا فَابْنِ دَارَہٗ وَرُدَّ مَالَہٗ وَعِیَالَہٗ فَاِنِّیْ قَدْ اَجَرْتُہٗ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ۔

حسین ابن علی کی طرف سے زیاد کو امابعد تم نے ایک ایسے مسلمان شخص پر ہاتھ ڈالا ہے جس کے حقوق بھی وہی ہیں جو سب مسلمانوں کے ہیں اور اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو اور مسلمانوں کی ہیں۔ تونے اس کا گھر ڈھادیا۔ مال واسباب اہل عیال پر قبضہ کرلیا۔ (یہ تونے کیا کیا) اب جب مرا یہ خط تجکو ملے تو تجھے چاہیئے کہ اس کا گھر تعمیر کرادے، مال وعیال واپس کردے کیونکہ میں نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اس کے متعلق مری یہ سفارش مان لے۔

آپؓ کے اس خط کے جواب میں بدبخت ناشکرے نے جو کچھ لکھا وہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے

مِنْ زِیَادِ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ اِلَی الْحُسَیْنِ بْنِ فَاطِمَۃَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ اَتَانِیْ کِتَابُکَ تَبْدَءُ فِیْہِ بِاسْمِکَ قَبْلَ اِسْمِیْ وَاَنْتَ طَالِبٌ لِلْحَاجَۃِ وَاَنَا سُلْطَانٌ وَاَنْتَ سُوْقَۃٌ وَکِتَابُکَ اِلَیَّ فِیْ فَاسِقٍ لَا یُؤْوِیْہِ اِلَّا فَاسِقٌ مِثْلُہٗ وَشَرٌّ مِنْ ذٰلِکَ اِذَا اَتَاکَ وَقَدْ اٰوَیْتَہٗ اِقَامَۃً مِنْکَ عَلٰی سُوْءِ الرَّاْیِ وَرَضِیَ بِذٰلِکَ وَاَیْمُ اللّٰہِ لَا یَسْبِقُنِیْ اِلَیْہِ سَابِقٌ وَلَوْ کَانَ بَیْنَ جِلْدِکَ وَلَحْمِکَ فَاِنَّ اَحَبَّ لَحْمٍ اِلَیَّ اَنْ اٰکُلَہٗ لَلَحْمٌ اَنْتَ فِیْہِ فَاَسْلِمْہُ بِجَرِیْرَتِہٖ اِلٰی مَنْ ھُوَ اَوْلٰی بِہٖ مِنْکَ فَاِنْ عَفَوْتُ عَنْہُ لَمْ اَکُنْ شَفَّعْتُکَ فِیْہِ وَاِنْ قَتَلْتُہٗ لَمْ اَقْتُلْہُ اِلَّا بِحُبِّہٖ اِیَّاکَ

زیاد بن ابی سفیان کی طرف سے حسین بن فاطمہ کی طرف! تمہارا خط مجھے ملا جس میں تم نے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا حالانکہ تم مجھ سے درخواست کررہے ہو، اور رعایا ہو جبکہ میں حاکم ہوں! تم نے یہ خط ایسے فاسق کے بارے میں لکھا ہے جسکو وہی پناہ دے گا جو اسی جیسا یا اس سے بھی بڑا فاسق ہوگا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ وہ تمہارے پاس آیا اور تم نے اسے پناہ دیدی اسی وجہ سے وہ اپنی غلط رائے پر اڑا ہوا ہے۔ اور اس پر راضی ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ تمہارے گوشت پوست میں بھی سما جائے تب بھی میری گرفت اس تک سب سے پہلے پہنچے گی، پس مجھے وہ گوشت بہت مرغوب ہوگا جس کے اندر تم سمائے ہوئے ہو لہٰذا اس غلطی کی پاداش میں تم اس کو اس کے حوالہ کردو جو تم سے بہتر ہو اگر میں نے (بالفرض) اس کو معاف کر بھی دیا تو یہ اس وجہ سے نہیں ہوگا کہ تم نے اس کی سفارش کی تھی، اور اگر میں نے اس کو قتل کیا

تو اسکی صرف یہ وجہ ہو گی کہ وہ تم سے رشتہ محبت رکھتا ہے ''

سرکشی اور گستاخی سے لبریز جب یہ خط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملا۔ تو آپ نے وہی خط ملفوف کر کے اپنی تحریر کے ساتھ کہ اصل واقعہ یہ تھا میں نے زیاد کو ایسا لکھا تھا جس کا اس نے یہ جواب دیا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر سخت غصہ ہوئے اور فوراً اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر زیاد کو بھیجا۔

مِنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ اَبِيْ سُفْيَانَ اِلٰى زِيَادٍ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ حُسَيْنَ ابْنَ عَلِيٍّ بَعَثَ اِلَيَّ كِتَابَكَ اِلَيْهِ جَوَابَ كِتَابِهِ اِلَيْكَ لِابْنِ شُرَيْحٍ فَعَلِمْتُ اَنَّكَ بَيْنَ رَأْيَيْنِ رَأْيٍ مِنْ اَبِيْ سُفْيَانَ وَرَأْيٍ مِنْ سُمَيَّةَ اَمَّا رَأْيُكَ مِنْ اَبِيْ سُفْيَانَ فَحِلْمٌ وَعَزْمٌ وَاَمَّا الَّذِيْ مِنْ سُمَيَّةَ فَكَمَا يَكُوْنُ رَأْيُ مِثْلِهَا وَمِنْ ذٰلِكَ كِتَابُكَ اِلَى الْحُسَيْنِ بِشَتْمِ اَبَاهُ وَتَعَرَّضُ لَهٗ بِالْفِسْقِ وَلَعَمْرِيْ اَنْتَ اَوْلٰى بِالْفِسْقِ مِنَ الْحُسَيْنِ وَلَاَبُوْكَ اِذَا كُنْتَ تُنْسَبُ اِلٰى عُبَيْدٍ اَوْلٰى بِالْفِسْقِ مِنْ اَبِيْهِ وَاِنْ كَانَ الْحُسَيْنُ بَدَأَ بِاسْمِهٖ اِرْتِفَاعًا عَنْكَ فَاِنَّ ذٰلِكَ لَمْ يَضَعْكَ وَاَمَّا تَشْفِيْعُهٗ فِيْمَا شَفَعَ فِيْهِ فَقَدْ دَفَعْتَهٗ عَنْ نَفْسِكَ اِلٰى مَنْ هُوَ اَوْلٰى بِهٖ مِنْكَ فَاِذَا اَتَاكَ كِتَابِيْ هٰذَا فَخَلِّ مَا فِيْ يَدِكَ لِسَعِيْدِ بْنِ شُرَيْحٍ وَابْنِ لَهٗ دَارَهٗ وَلَا تَعَرَّضْ لَهٗ وَارْدُدْ اِلَيْهِ مَالَهٗ وَعِيَالَهٗ فَقَدْ كَتَبْتُ اِلَى الْحُسَيْنِ اَنْ يُخَيِّرَ صَاحِبَهٗ بِذٰلِكَ فَاِنْ شَاءَ اَقَامَ عِنْدَهٗ وَاِنْ شَاءَ رَجَعَ اِلٰى بَلَدِهٖ فَلَيْسَ عَلَيْهِ سُلْطَانٌ بِيَدٍ وَّلِسَانٍ وَاَمَّا كِتَابُكَ اِلَى الْحُسَيْنِ بِاسْمِهٖ وَلَا تَنْسُبُهٗ اِلٰى اَبِيْهِ بَلْ اِلٰى اُمِّهٖ فَاِنَّ الْحُسَيْنَ وَيْلَكَ مَنْ لَا يُرْمٰى بِهِ الرَّجَوَانُ اَفَاسْتَصْغَرْتَ اَبَاهُ وَهُوَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اَمْ اِلٰى اُمِّهٖ وَكَلَّتَهٗ وَهِيَ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَفْخَرُ لَهٗ اِنْ كُنْتَ تَعْقِلُ وَالسَّلَامُ۔

معاویہؓ کی طرف سے زیاد کے نام، حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے تمہارا وہ خط جو تم نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا مجھے بھیجا ہے جس میں انہوں نے ابن شریح کی سفارش کی تھی، جس کو پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ تو دو نسبتوں (رایوں) کے درمیان پھنسا ہوا ہے ایک نسبت ابوسفیان کی ہے تو دوسری طرف سمیہ کی، ابوسفیان کی نسبت سے تجھے بردبار متحمل، اور ارادہ کا پختہ ہونا چاہیئے، اور سمیہ کی نسبت کا تقاضا ہے کہ تیری رائے ایسی گھٹیا ہونی چاہیئے جیسے ان لوگوں کی ہوتی ہے اور اس کا ثبوت تیرا وہ خط ہے جو تو نے حسینؓ کو لکھا جس میں تو نے ان کی والدہ کو گالی دی اور ان کو فاسق ٹھہرایا۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں، کہ تو حسینؓ سے زیادہ فسق کا اہل ہے۔ اور تیرا باپ جب تو ایک غلام کی طرف منسوب کیا جائے ان کے باپ سے فسق کا زیادہ اہل ہے حسینؓ نے خود کو اونچا سمجھ کر اگر اپنا نام پہلے لکھ دیا تو کیا ہوا تجھے تو اس نے نہیں گھٹایا۔ اور ان کی سفارش رد کر کے اس نیکی کو جو قبول سفارش کی صورت میں حاصل ہوتی تو نے اپنے سے بہتر کی طرف لوٹا دیا جب مرا یہ خط تجھے ملے تو سعید بن شریح کا جو مال و متاع تیرے پاس ہے اس کے حوالہ کر دو۔ مال و عیال لوٹا دو اور گھر بنوا کر دو اور اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرو۔ میں نے حسینؓ کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے دوست کو ان احکامات کی خبر کر دیں، پھر اگر وہ چاہے تو ان کے پاس رہے اور چاہے تو اپنے شہر میں آجائے، بہرحال تیرے ہاتھ اور زبان کو ان پر کوئی اختیار نہیں اور تو نے جو حسینؓ کو خط میں ان کے والد کی طرف منسوب کرنے کی بجائے والدہ کی طرف منسوب کیا ہے تو تمہاری یہ حرکت افسوس ناک ہے حسینؓ تو وہ ہیں جو نہ کسی بدی سے ذلیل کئے جا سکتے ہیں نہ عزت و مرتبہ سے گرائے جا سکتے ہیں کیا تو نے ان کے والد کو حقیر جانا؟ وہ علی ابن ابی طالب ہیں! اور ان کی والدہ کی

طرف نسبت کی! وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی
حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) ہیں۔ یہ نسبت تو اور بھی زیادہ قابل
فخر ہے! اگر تجھ میں کچھ سمجھ ہوتی،

غرض ابن زیاد اور اسکی اولاد میں سے خاصکر عبید اللہ کی شرارت وگستاخی، جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ساتھ جس قابل نفرت حد تک پہنچی ہوئی ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے!

اس تفصیل کے بعد شیعہ حضرات کے لئے مشکل صورت حال یہ ہے کہ ابن زیاد جب ولد الزنا تھا اور ولد الزنا امامیہ کے نزدیک (سور کی طرح) نجس العین ہوتا ہے۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو فارس کے لوگوں پر نیز مسلمانوں کے لشکر پر حاکم وامیر کیسے بنا دیا۔ اور اس وقت چونکہ نماز پنجگانہ، جمعہ وعیدین کی امامت بھی امیر کے ذمہ ہوتی تھی تو گویا یہی نطفۂ ناتحقیق، مسلمانوں کو نمازیں بھی پڑھاتا رہا۔ اور بقول امامیہ نمازیں تباہ کرتا رہا۔ کیونکہ امامیہ کے ہاں یہ تحقیق وتصریح شدہ مسئلہ ہے کہ ولد الزنا کی امامت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ تو ایسی صورت میں شیعوں کا کیا منہ اور ان کو کیا حق ہے کہ وہ جناب عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ پر یہ طعن توڑیں اور اعتراض کریں کہ آپؓ کے عمال ظالم یا خیانت پیشہ تھے! (ایں گنا ہے است کہ در شہر شما نیز کنند!

اعتراض (۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حکم بن ابی العاص کو جو مروان کا باپ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قصور کی بنا پر مدینہ بدر کر دیا تھا۔ آپ نے اس کو پھر مدینہ واپس بلالیا۔

جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو مدینہ سے اس بنا پر نکال دیا تھا کہ منافقین سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے، اور کفار سے بعض معاملات میں تعاون بھی کرتا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں باہمی فتنہ انگیزی کی نوبت بھی آجاتی تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعہد شیخین رضی اللہ عنہما، کفر ومنافقت کا حجاز میں عموماً اور مدینہ منورہ میں خصوصاً نام ونشان ہی مٹ گیا۔ اور کافر ومنافق سے دوستی اور تعاون اور اس کے سبب فتنہ انگیزی کا خدشہ ہی نہ رہا تو بقاعدہ طے شدہ کہ جب کوئی حکم کسی علت، سبب اور وجہ سے مقید ہو تو علت کے ختم ہو جانے کے بعد وہ حکم بھی باقی نہیں رہتا، مدینہ بدری کا حکم بھی اس سے اٹھ گیا۔

اور جناب شیخین رضی اللہ عنہما نے بمصلحت اس کے مدینہ میں داخلہ کو پسند نہیں فرمایا کہ احتمال تو ابھی باقی تھا کہ یہ دونوں حضرات بنی تمیم سے تھے اور حکم بنو امیہ میں سے تھا ایسا نہ ہو کہ عداوت دور جاہلیت کے سبب رگ جاہلیت جوش مار جائے اور مسلمانوں میں کسی نوع کی چہ، چہ، میں، میں، شروع ہو جائے۔

اور جناب غنی رضی اللہ عنہ کا تو وہ چونکہ بھتیجا تھا۔ اس قسم کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ لہٰذا بطور صلہ رحمی آپ نے اسے مدینہ بلالیا۔ اور یہ اعتراض لوگوں نے خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی کیا تھا کہ آپ نے حکم کو مدینہ میں کیسے بلالیا۔ جس کا انہوں نے کافی وشافی جواب اسی وقت دیدیا تھا کہ میں نے وصال سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی واپسی کی اجازت لے لی تھی!

جب ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے تو میں ان کے پاس گیا۔ آپ نے دوسرا گواہ طلب فرمایا۔ اسی طرح میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاں بھی گیا کہ شاید وہ مجھ تنہا کی گواہی قبول کرلیں۔ مگر انہوں نے بھی دوسرا گواہ مانگا۔ اب میں خود خلیفہ ہوں، اپنے علم یقینی کے سبب ان کو بلا سکتا ہوں لہٰذا میں نے بلالیا اس لئے اعتراض کی کوئی بات ہے نہ حکم رسول کی مخالفت کا سوال۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی شہادت اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہے بروایت صحیح یہ منقول ہے کہ مرض

مرض آخری میں ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاش میرے پاس ایک مرد صالح آتا کہ میں اس سے ہمکلام ہوتا۔ ازواج مطہرات اور دوسرے خدام خانہ نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بلوالیں۔ فرمایا نہیں، پھر حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ناموں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر ہاں فرمائی چنانچہ جب آئے تو تنہائی میں ان سے کچھ سرگوشی فرمائی۔ ہو سکتا ہے لطف و مہربانی کی اس خاص ساعت میں آپ نے اس کی بھی خطابخشی کرائی ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس "مرد صالح" کی سفارش کو شرف قبول عطا فرمادیا ہو۔ کہ دوسرے اسی وجہ سے اس سے باخبر نہ ہوسکے!

پھر یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ حکم نے آخر عمر نفاق و فساد کی عادت سے توبہ کرلی تھی۔ اسی لئے اس کے بعد اس سے کوئی ایسی حرکت صادر نہیں ہوئی! اور پھر عمر کے لحاظ سے بھی وہ کس بل نہیں رہا تھا پیر فرتوت ہوگیا تھا کسی ضرر اور فتنہ کا اندیشہ بھی نہ رہا تھا۔

اعتراض (۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اہل بیت اور اپنے عزیز و اقارب کو بہت زیادہ مال و دولت بخشا۔ اور بے انتہا اسراف کیا حتی کہ بیت المال کو کنگال کردیا۔ حکم بن ابی العاص جب مدینہ میں آیا تو اسے ایک لاکھ درہم دیئے اس کے بیٹے حارث بن حکم کو مدینہ کے بازاروں کا محصول، عشور، خزانہ اور منڈیاں عطا کیں۔ مروان کو افریقہ کا خمس دے ڈالا۔ عبداللہ بن خالد بن اسید، بن ابی العاص بن امیہ جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آیا تو اسے بطور انعام تین لاکھ درہم دیئے۔ اپنی لڑکی کو مروارید کے دو دانے ایسے دیئے جنکی قیمت جوہریوں اور تاجروں کے اندازے سے بھی زیادہ تھی۔ دوسری لڑکی کو یاقوت و بیش قیمت جواہر سے جڑی ہوئے سونے کی انگیٹھی دی۔ اور بیت المال کا اکثر روپیہ اپنی عمارتوں کی تعمیر باغات، اراضی اور کھیتوں کی درستگی میں صرف کیا۔

عبیداللہ بن ارقم اور معیقیب دوسی نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے عہد سے داروغہ بیت المال کی خدمت پر مامور تھے یہ حالت دیکھ کر اپنی خدمت سے استعفیٰ دیدیا اور اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کرلی، تو مجبور ہو کر یہ خدمت جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی۔ ایک روز تقسیم اموال بیت المال کے بعد ایک لاکھ روپیہ کی بقایا رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بخشدی۔ ظاہر ہے جب اپنے مال کو مسرفانہ طور پر خرچ کرنا اور فضول اڑانا شریعت کے لحاظ سے قابل ملامت ہے۔ تو مسلمانوں کے اموال کو اس طرح فضول خرچیوں میں اڑانا کیوں نہ قابل ملامت اور لائق مذمت ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داد و دہش اور بخشش و عطا کو بیت المال سے بتانا اور پھر اس کی بنا پر آپ پر اعتراض کرنا سراسر افترا، بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ آپ کا لقب غنی، خلافت کا مرہون تو نہیں تھا آپ کی ثروت اور دولت مندی تو حصول خلافت سے پہلے سے چلی آرہی تھی۔ لشکر اسلام کی مدد، قحط کے وقت اہل مدینہ کے لئے آپ کا ایثار و امداد کون جھٹلا سکتا ہے، اس کے علاوہ ہر ضرورت کے وقت آپ کی بیش از بیش داد و دہش کے واقعات سے معمور اسلامی تاریخ سے کون آنکھیں بند کرسکتا ہے؟ خصوصاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت مبارکہ کے آخری دور میں جب فتوحات کثرت سے ہوئیں بے اندازہ غنائم حاصل ہوئے ہر سمت سے دولت کے انبار در انبار سمٹ سمٹ کر مدینہ منورہ آنے لگے اور ان سے حصہ پایا کر نبی محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار اور سچے رفیقوں رضوان اللہ عنہم اجمعین کے حالات بدل گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض وہ رفقاء اور صحابی جو کبھی نان شبینہ کی صبر و رضا کے ساتھ حالت گذار چکے تھے اسی اسی ہزار کے حصوں کے مالک قرار پائے۔ اور خود عالی جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو وہ دور بھی گذار چکے تھے کہ اہل و عیال کو فاقہ کی حالت میں دیکھ کر خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ درہم عنایت فرمائے تھے کہ ان سے

بچوں کے لئے کھانا لے آئیں۔ ن)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس دور میں وسعت و فراخی حاصل ہوئی، بہتوں نے عمارتیں کھڑی کر لیں۔ باغات اور اراضیات خرید لئے اور جائدادیں بنالیں، اسوقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تاجر تو تھے ہی، اسوقت انکی تجارت کو اور بھی فروغ حاصل ہوا اور دولت وثروت میں بھی خوب اضافہ ہوا۔ پھر آپ نہ تنگدل صاحب دولت تھے، اور نہ ہی آپ کا ہاتھ رُکا ہوا تھا۔ اپنے اور پرائے سب آپ کی داد و دہش سے فیضیاب ہوتے تھے آپ کے لطف و عنایت اپنے قبیلوں پر ہی نہ تھی، آپ غلاموں یتیموں بیواؤں پر ہمیشہ اپنا مال و دولت لٹاتے رہے۔ اور صدقہ و خیرات کا کوئی راستہ کوئی موقعہ آپ کے ہاتھ سے نہ نکل پاتا۔ آپ کا یہ معمول زبان زد خلائق ہے کہ آپ معمولاً ہر جمعہ ایک غلام خرید فرما کر آزاد کیا کرتے تھے۔ اور انصار و مہاجرین رضوان اللہ علیہم کی روزانہ دعوت بھی آپ کے معمول میں شامل تھی جس میں پرُ تکلف کھانا کھلاتے تھے! اس سلسلہ میں جناب حسن بصری رحمہ اللہ علیہ کا ارشاد ملاحظہ کیجئے!

شَهِدْتُ مُنَادِيَ عُثْمَانَ يُنَادِي يَا أَيُّهَا النَّاسُ اُغْدُوا عَلٰى عَطِيَاتِكُمْ فَيَغْدُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَهَا وَافِرَةً يَا أَيُّهَا النَّاسُ اُغْدُوا عَلٰى اَرْزَاقِكُمْ فَيَغْدُوْنَ فَيَأْخُذُوْنَهَا وَافِيَةً حَتّٰى وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعَتْ اُذُنَايَ يَقُوْلُ عَلٰى كِسْوَتِكُمْ فَيَأْخُذُوْنَ الْحُلَلَ وَاغْدُوْا عَلَى السَّمَنِ وَالْعَسَلِ وَقَالَ الْحَسَنُ وَالْاَرْزَاقُ دَارَّةٌ وَخَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ رَوَاهُ اَبُوْ عُمَرَ فِي الْاِسْتِيْعَابِ۔

میں گواہ ہوں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے صبح کے وقت یہ اعلان بذریعہ منادی کرایا جاتا کہ حضرات آیئے اور اپنے عطایا لے جایئے، آیئے اپنی خوراک لے جایئے اور لوگ آتے تھے اور خوب لے جاتے تھے، اور میرے کانوں نے یہ اعلان بھی سنا کہ آؤ اپنے لئے لباس لے جاؤ۔ اور لوگ اپنی پوشاکیں حاصل کرتے اور اسی کے ساتھ گھی و شہد کے ناشتہ سے بھی لطف اندوز ہوتے حسن رحمہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خوراک وافر بھی ہوتی اور بہت عمدہ بھی۔ ابو عمر نے یہ روایت استیعاب میں کی ہے"

آپؓ کی داد و دہش اور جود و سخا کا جو اندازہ لگانا چاہے تاریخ کا مطالعہ کر کے لگا سکتا ہے!

اللہ کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کو کسی نے اسراف نہیں بتایا خود حدیث کی رو سے بھلائی میں خرچ کرنا اسراف نہیں لا اِسْرَافَ فِي الْخَيْرِ۔ اور اعزہ و اقارب پر خرچ کرنا تو دگنے اجر کا موجب ہوتا ہے، حدیث صحیح میں ہے کہ مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے، اور خویش و اقارب پر صرفہ دو بھلائیاں رکھتا ہے، ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔ قرآن نے بھی اقارب کو دوسرے مصارف پر مقدم رکھا ہے۔ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (اور اس کی محبت پر مال دو، اقرباء کو یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کو)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ نے سالم بن جعدؒ سے روایت بیان کی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو جن میں جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے اپنے پاس بلایا اور ان کو قسم دلا کر پوچھا کہ سچ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخشش و عطایا میں قریش کو دوسرے لوگوں پر مقدم خیال فرماتے تھے؟ اور اسی طرح بنی ہاشم کو قریش پر! اس پر تمام صحابہ نے سکوت کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ اگر جنت کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دیدی جائیں تو میں وہ بنی ہاشم کو دیدوں تاکہ ان میں سے کوئی باہر نہ رہ جائے۔ بلکہ وہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہو جائیں! لیکن ان تمام مصارف کو بیت المال سے سمجھنا بڑا تعصب اور عناد ہے! خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے اس سلسلہ میں جب سوال کیا تو آپ نے فرمایا۔ خلافت سے پہلے میرے پاس جتنی دولت تھی تمکو خوب معلوم ہے اور میری داد و دہش اور بخشش و عطایا کی جو کیفیت ہے وہ بھی تم سب جانتے ہو۔ یہ جانتے پوچھتے بے جا شبہات اور عدل و تقوی کے خلاف گمان میرے بارے میں کیوں کرتے ہو؟

اب رہیں وہ باتیں جن کا ذکر اس قصہ کے شروع میں آیا ہے یہ نقل دروغ ہے، اور ان سے قصہ میں گڑبڑ پیدا کی گئی ہے بات کچھ اور ہے رنگ اس کو دوسرا دیدیا گیا ہے، بیت المال کا نام اپنے جھوٹ میں زور پیدا کرنے کے لئے دیدیا ہے حالانکہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں اور اصل قصہ بھی اتنا ہے کہ جناب غنی شہید رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کا نکاح حارث بن حکم کی بیٹی سے کیا۔ اور ان کو اپنی ذاتی دولت میں سے (بہو کی رونمائی کہہ لو یا اسوقت کا کوئی رواج)، ایک لاکھ روپیہ انکو بھجوایا۔ اور اپنی بیٹی ام رومان۔ کو مروان بن حکم کے نکاح میں دیا تو اسکو بھی ایک لاکھ روپیہ دیا۔ اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی مال و دولت سے دیا۔ بیت المال کا کوئی سوال ہی نہیں تھا! اور نیسا ہی صلہ رحمی اور خویش پن پر مبنی تھی! جو حکم شرع کے ساتھ ساتھ مقبول و پسندیدہ عوام و خواص فعل تھا۔

اور مروان کو افریقہ کے خمس کی بخشش کی داستان بھی جھوٹی اور سراسر افتراء ہے! اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی سرگردگی میں پیادوں و سواروں کا ایک لاکھ کا لشکر دیار مغرب کی فتح کے لئے روانہ کیا جب وہ مغرب کے پایہ تخت شہر افریقہ کے قریب پہنچا۔ تو میدان کارزار وہیں جما۔ مسلمانوں نے انتہائی جدوجہد اور کوشش سے وہاں فتح حاصل کی اور بے حد و حساب مال غنیمت ہاتھ آیا۔ جناب عبداللہ (مذکور) رضی اللہ عنہ نے نقد رقوم کا خمس نکالا جو رواجی سکہ کے مطابق پانچ لاکھ دینار بنتا تھا۔ اور یہ رقم دارالخلافہ کو روانہ کردی،

نقود کے علاوہ اسباب و مویشی کی صورت میں جو مال غنیمت تھا۔ وہ مدینہ سے دور و دراز کی مسافت باربرداری ناکافی ہونے اور اس پر اخراجات کے بار کی وجہ سے دارالخلافہ بھیجنے کی کوئی صورت نہ تھی اسوقت کے حالات اور سواری وغیرہ کی کیفیت کے ساتھ طویل مسافت کا جو کئی ماہ میں قطع ہوتی تھی تصور کیجئے اور پھر سوچئے کہ امیر لشکر نے ان مشکلات اور دشواریوں کے مدنظر اس اسباب و مویشی کو فروخت کرنے کا کتنا مناسب فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ اسباب غنیمت جو بیت المال کے خمس میں کا تھا امیر لشکر نے مروان کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کردیا۔ مروان نے ایک لاکھ میں سے زیادہ رقم نقد ادا کردی، جو نقدی میں شامل کر کے مدینہ منورہ روانہ کردی گئی اور بقایا کے متعلق جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ سے یہ وعدہ وعید ہوئے کہ وہ مدینہ پہنچکر ادا کردوں گا اور خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ادھر اہل مدینہ کو بڑی گھبراہٹ اور سخت پریشانی تھی کہ کسی کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس جہاد میں شریک تھا جو کالے کوسوں، پرانے دشمن کی سرزمین پر برپا تھا، سب کو اندازہ تھا کہ بڑی سخت لڑائی ہوگی، مسافت بھی بڑی دور و دراز کی ہے، راستے اور سڑکیں خیر ہیں۔ نہ کوئی خبر نہ کسی کی اطلاع مجملاً خبر ملی بھی تو اتنی کہ دشمن بہت زیادہ بھی ہے اور قوی و طاقتور بھی، بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے اور بہت آدمی شہید ہوئے ہیں۔ ایسی ادھوری و نامکمل اور حوصلہ شکن خبر سے ہر ایک فکر مند پراگندہ حواس اور پریشان تھا۔ ایسے پریشان عالم میں مروان کی آمد سے جو اموال غنیمت سے لدا پھندا تھا، جو فتح کی خوشخبری، کے ساتھ لشکریوں کے خطوط پیغامات اور تفصیلی خبریں لایا تھا اہل مدینہ کے لئے مژدہ جانفزا تھا۔ گھر گھر فتح کی خبر امن و سکون بنکر پہنچی، اور سب کے لئے خوشی و مسرت اور فرحت و شادمانی کا سامان مہیا ہوا۔ تاریخ کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دن اہل مدینہ نے مروان کو کس نیک اور بہترین دعاؤں سے یاد نہ کیا، اور تعریف و تحسین کا کونسا پہلو تھا جس سے دریغ کیا بے انتہا دلی دعاؤں کا تحفہ اسے دیا گیا۔ اور بہت تعریف و توصیف ہوئی اور اس وقت تک اس سے قابل شکایت کوئی بات سرزد بھی نہ ہوئی تھی کہ ان تمام باتوں پر اس کی وجہ سے پانی پھر جاتا۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بشارت کے صلہ میں اور امانتداری اور دیانت سے اس اہم خدمت انجام دینے میں کہ اتنی دور و دراز کی مسافت اور پُرخطر راستوں اور طرح طرح کی مشقت برداشت کر کے مسلمانوں کی امانت بخیر و خوبی پہنچائی۔ اور اہل مدینہ کو فرحت و شادمانی

نصیب ہوئی ۔ اسباب یہیں کی بقایا رقم کی ادائیگی اس کو معاف کر دی ۔ امام و خلیفہ وقت کو یہ اختیار ہے کہ بشارت دہندوں ۔ ملک و ملت کے لئے جاسوسی کی خدمت انجام دینے والوں اور مسلمانوں کے لئے خوشخبریاں لانے والے کو بیت المال سے انعامات دے ۔ اور پھر یہ کام بھی آپ نے تنہائی یا پوشیدہ طور پر نہیں صحابہ کی موجودگی اور اہل مدینہ کی رضا مندی سے کیا ۔ تو اب اعتراض و طعن کی اس میں کون سی بات ہے ۔

یہاں اسراف کے معاملہ میں ایک علمی لطیف نکتہ قابل غور ہے ، کہ انعام و عطایا ، داد و دہش کئے جانے والی رقوم و اموال کا اس مال سے جس سے یہ دیا جا رہا ہے تناسب دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق حکم لگایا جائے گا ۔ مثلاً اگر ایک لاکھ روپیہ میں سے ایک روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ عطیہ دیا ہے تو وہ اسراف نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ ایک لاکھ سے ایک ہزار کی ایسی ہی نسبت ہے جیسے دس کی ایک ہزار سے ۔

اور تمام عقلی و حسی امور میں تناسب کی رعایت عقل کے مقتضی کے بھی مطابق ہے ، اور شرع کے بھی ۔ مثلاً کسی دوا میں دو چیز گرم ہوں ، اور سو چیز ٹھنڈے تو اس دوا کو سخت گرم ، (مزاجاً) ہرگز نہیں کہیں گے ۔ یہی معاملہ شرع کا ہے ، کہ اگر کسی جگہ و مقام کا خراج ایک لاکھ روپیہ ہو ۔ اور وہاں سے پچاس ہزار وصول کیا جائے تو اس معاملہ کو عدل ہی کہا جائے گا ظلم و زیادتی اس کا نام رکھنا حکم شرع کے خلاف ہوگا ۔

اسی قیاس پر مقدار زکوٰۃ اور دیگر شرعی اندازوں اور غنیمتوں کی تقسیم میں تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ بڑی رقم میں سے چند ٹکے نکال لینے یا پانچ رہنے کو معمولی اور حقیر شئے قرار دے کر نظر انداز کیا جا تا رہا ہے ۔ (آج بھی اس کا امتحان کیا جا سکتا ہے اس طرح کہ اگر ایک آدمی کا ایک سو روپیہ اور ایک روپیہ والا نوٹ گر جائے اور تلاش کے وقت سو والا مل جائے ایک والا نہ ملے تو وہ کہے گا جانے دو لیک سو کا تو مل گیا ۔ روپیہ والا نہیں ملتا تو نہ ملے ۔ یہاں اگر اس کی نظر میں تناسب کی اہمیت نہ ہوتی تو بنئیے کی طرح حساب کی دمڑی تلاس کرنے کے لئے روپیہ کا تیل پھونکنے کی مثال یہ بھی قائم کر دیتا ۔ کہ روپیہ کے نوٹ کے لئے ہلکان ہو جاتا ۔ جیسا اگر سو کا نہ ملتا تو ہوتا (ن)

لہٰذا اب اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی کی داد و دہش کو دیکھا جائے تو زمانہ خلافت کی وہ داد و دہش جس پر طعن و اعتراض کیا جاتا ہے اتنی حقیر معلوم ہوگی جیسے سوئی کے ناکہ پر پانی کی تری ، اس لئے اگر بیت المال سے بفرض محال اس خرچ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی اسے اسراف نہیں کہا جا سکتا ۔ کروڑوں روپیہ پوری فراخدلی سے راہ خدا میں بطیب خاطر لٹانے والے نے بیت المال سے چند لاکھ کی بخشش کر دی تو قاعدہ مذکورہ بالا کی رو سے یہ اسراف اور قابل اعتراض بات نہیں ، ہاں اگر ان مصارف کو ان کے مجموعی مصارف کے تناسب سے ہٹ کر دیکھیں تو اسراف کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ عقلی ، حسی اور شرعی امور میں تناسب کو نظر انداز کر کے افراط و تفریط کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ۔ اگر کوئی لگائے تو وہ مردود و نامقبول ہوگا ۔ اسی لئے اس معاملہ میں حضرت غنی رضی اللہ عنہ پر اسراف کا الزام مردود اور ناقابل تسلیم ہے ۔

اور عبد اللہ بن خالد بن اسیدؓ کو تین لاکھ درہم دینے کا جو لوگ کہتے ہیں (تو شیعوں کا حال تو تقریباً ہر معاملہ میں "کانا اور لے بھاگی" کا سا ہے ۔ ان کے لئے اتنا کافی ہے کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عہدا ور تین لاکھ کی رقم بس نتیجہ نکالنے میں ان کو کیا دیر ۔ کہ لو جی ! فلاں کو عثمان (رضی اللہ عنہ) نے بیت المال سے تین لاکھ درہم دے ڈالے صحیح معاملہ کی کھوج سے انہیں چڑ ہے ۔ افتراء اور جھوٹ ان کے لئے شیر مادر ہے" اسی لئے یہ جو کہتے ہیں عموماً جھوٹ نکلتا ہے ۔ اور یہاں بھی) وہ جھوٹ ہے ۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ قرضہ تھا جو با قاعدہ تحریر کے بعد ان کو دیا گیا تھا ۔ اہل مصر کے محاصرہ کے وقت یہی بات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمائی بھی تھی ! اور عبد اللہؓ نے وہ روپیہ بیت المال کو ادا بھی کر دیا تھا ۔

اسی طرح حارث بن حکم کے بازاروں کا عشر ، چنگی وغیرہ کے سلسلہ میں جو کہا ہے ، وہ سب غلط ہے اس سلسلہ میں کوئی عطا و بخشش

نہیں کی گئی بات صرف اتنی تھی کہ حارث کو ملازم رکھا گیا اور محتسبوں کی طرح اس کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ بازار کا گشت لگائے۔ بھاؤ تاؤ کی دیکھ بھال رکھے لوٹ کھسوٹ، ظلم و زیادتی نہ ہونے دے۔ تول جوکھ کے ترازو بٹوں کی جانچ رکھے! ملازمت کو دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ اہل شہر کی طرف سے یہ شکایت ہوئی کہ اس نے بازار کی ساری کھجور کی گٹھلیاں، خود خرید لیں دوسرے گاہکوں کو خریدنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ اور یوں دوسروں کے اونٹ بے، چارہ رہ گئے، کیونکہ یہ ان کی خوراک تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور نوکری سے اسی وقت برخاست کرکے اہل شہر کی شکایت کا برمحل ازالہ کرکے ان کی تسلی خاطر کی!

اس میں عیب وطعن کی کیا بات ہے۔ یہ تو ان کا قابل تحسین اور لائق تعریف کارنامہ اور مبنی برانصاف عمل ہے کہ قریبی رشتہ داری کے باوجود محض شکایت سنتے ہی اس کے خلاف کارروائی کر ڈالی۔

اسی طرح ابن ارقم اور معیقیب دوسی کے استعفیٰ کا معاملہ ہے کہ اس میں بھی دھوکہ دھڑی سے کام لیا، حقیقت کے بجائے اپنی طرف سے من گھڑت افسانہ تراش لیا، صحیح بات یہ تھی کہ انہوں نے کبرسنی، اور ضعف کے سبب اس محنت و مشقت طلب خدمت کی کما حقہ ادائیگی سے معذور ہو جانے کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا۔ اور ان کے استعفیٰ کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مجلس میں خطبہ کے دوران اعلان کیا اور فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ أَرْقَمَ لَمْ يَزَلْ عَلَى خَزَائِنِكُمْ مُنْذُ زَمَنِ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ إِلَى الْيَوْمِ وَإِنَّهُ قَدْ كَبُرَ وَضَعُفَ وَقَدْ وَلَّيْنَا عَمَلَهُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ۔

لوگو عبداللہ بن ارقم جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے آج تک تمہارے بیت المال کے خزانچی رہے ہیں، اب وہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں اس لئے ہم نے ان کا کام زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور بطور اعتراض انہوں نے جو یہ بات کی ہے کہ آپ کی عمارات، باغات اور کھیت سب بیت المال کے پیسے سے تھے! تو یہ بھی ان کا افتراء اور جھوٹ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کمانے کا جو ہنر اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا۔ اور جو ڈھب آپ کو ملا ہوا تھا، اس کی نظیر بعد میں بھی نہیں دیکھی گئی کہ حق حلال طریقہ پر انتہائی عزت و وقار کے ساتھ بلا تعب و مشقت کسی نے اس قدر مال و دولت کمایا ہو! آپ اپنی حلال کی کمائی کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اس قدر فراخدستی اور انبساط قلبی سے خرچ کرتے تھے کہ مضمون حدیث نعم المال الصالح للرجل الصالح۔ (پاک آدمی کی ملک میں پاک مال کی اچھائی کا کیا کہنا) کا صحیح مصداق بن گئے تھے۔

عہد خلافت سے پہلے کمائی کے بہت سے طریقے آپ اختیار فرماتے رہے اور خلافت کے بعد یہ تدبیر اور تجویز ذہن میں آئی کہ آپ اپنی قلمرو میں، عراق ہو یا حجاز، جہاں بھی بنجر و ناکارہ زمین ملتی، خرید لیتے، اور پھر غلاموں اور ملازموں کو کھیتی باڑی کے سامان و اوزار دے کر اس افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے پر لگا دیتے، کہ زمین کو آباد کرو اور اس کی آمدنی سے اپنی گذر بسر کرو۔ جب زمین درست ہو جاتی تو باغ لگواتے، اس میں میوہ دار درخت لگاتے، کنوئیں اور نہریں بنواتے۔ غرض ہر طرح سے اس زمین کی آبادی اور سرسبزی میں کوشاں رہتے اور یہی وجہ ہے کہ عرب کی زمین جو قحط زدہ، بنجر اور بے آب و گیاہ تھی آپ کے عہد خلافت میں اتنی آباد سرسبز و شاداب ہو گئی تھی، کہ بڑے بڑے خوشنما علاقوں کی نظیر کہلانے کے مستحق تھی۔ جگہ جگہ چشمے جاری ہیں، آبشار لعل ہیں میووں سے درخت لدے ہوئے ہیں، کھیتیاں سرسبز و شاداب ہر طرف لہلہا رہی ہیں! گویا زمین نے سونا اگل دیا ہے۔ پھر موالی، غلام، ملازمین کے وہاں آباد ہو

جانے اور بس جانے سے، صحراؤں، وادیوں اور جنگلات میں رہزنی، چوری، چکاری کا خدشہ جاتا رہا، درندوں کا ڈر اور خوف جاتا رہا، کہ وہ آبادیوں کی وجہ سے وہ سے نکل بھاگے! مسافروں کے لئے راستے بے خطر اور پرامن ہوگئے۔ تجارتی قافلے بے کھٹکے آنے جانے لگے۔ راستہ میں ان کو قیام گاہ اور جانوروں کے لئے چارہ کی سہولت میسر آنے لگی۔ مختلف ملکوں اور شہروں سے تجارت کو فروغ ہوا۔ نفیس سامان اور عمدہ اور نوع بنوع اشیاء کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں آسانی ہوگئی،

اور یہ دو امور امن و خوشحالی، آبادی و زراعت آپؓ ہی عہد سعادت مہد میں نصیب ہوئے۔ جو عرب میں عجائبات اور خرق عادات میں شمار ہوتے تھے! حدیث شریف میں ایک پیشین گوئی بایں الفاظ کی گئی ہے۔

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَعُوْدَ اَرْضُ الْعَرَبِ مَرُوْجًا وَّاَنْهَارًا۔

جب تک عرب کی زمین مرغزار اور نہروں والی نہ بن جائے قیامت نہیں آئیگی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم طائی سے فرمایا۔

اِنْ طَالَتْ بِكَ الْحَيٰوةُ لَتَرَيَنَّ الظَّعِيْنَةَ تُسَافِرُ مِنْ حِيْرَةِ النُّعْمَانِ اِلَى الْكَعْبَةِ لَا تَخَافُ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ۔

اگر تمہاری عمر بڑی ہوئی تو تم دیکھوگے کہ ایک اونٹ سوار عورت مقام حیرۃ النعمان سے کعبہ تک (تنہا) سفر کریگی اور اس کے دل میں خدا کے ڈر کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔

اور یہی نہیں بلکہ حدیث شریف میں عہد عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی صراحت کے ساتھ بطور اظہار مسرت یہ فرمایا گیا کہ عثمانؓ کے زمانہ میں مال و دولت کی کثرت ہوگی خزانہ بہت ہوگا لوگوں میں دولت کی بدولت تکلفات کا رواج ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اس خوش تدبیری کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے، منجملہ ان کے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں کہ آپ نے سواد ینبع، فدک، زہرہ اور دوسرے گاؤں میں اسی ترکیب کو استعمال فرمایا۔ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے غابہ اور اس کے گرد و نواح میں، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ذی خشب اور جرف میں اسی تدبیر کو اختیار کیا۔ اسی طرح دیگر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جہاں جہاں موقعہ ملا ایسا ہی کیا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کے گرد و نواح خوب سرسبز و شاداب اور آباد ہوگئے۔ اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عرصہ خلافت کچھ اور دراز ہوجاتا تو پورے حجاز کی سرزمین، اللہ زار اور باغ و بہار ہوتی۔

اور جس طرح امام کی اجازت سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اُفتادہ و بنجر غیر مملوکہ زمین کو اپنے خرچ و محنت سے کار آمد و آباد کر سکتا ہے۔ تو امام و خلیفہ کو اس حق سے محروم کرنے کا کیا جواز ہے۔ اور اس زمین کی کمائی خلیفہ کے لئے کیوں نہ حلال ہوگی۔ اور کیوں اس کا تصرف ناجائز ہوگا۔ صریح روایات اور تاریخی حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُفتادہ و بنجر زمین میں کاشت کرتے، غیر آباد کو آباد کراتے، باغات لگواتے، کنوئیں کھدواتے اور نہریں جاری کراتے، اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی روپیہ پیسہ سے کرتے اور اس کا صلہ وصول کرتے۔ اور آمدنی میں روز بروز اضافہ ہوتا۔ اور آپ کے زمانہ میں اہل مدینہ میں کون ایسا تھا جو کھیتی باڑی نہ کرتا یا باغات نہ لگواتا ہو!

اور بیت المال کے بقیہ کو جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دے دینے کا واقعہ بھی سچ نما جھوٹ ہے۔ صحیح روایت یہ ہے کہ آپؓ نے ایک بیت المال سے مستحقین میں رقم تقسیم فرمانے کا حکم دیا۔ مستحقین میں سے کوئی باقی نہ رہا اور رقم میں ایک ہزار درہم باقی بچ رہے۔ تو آپ نے وہ رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور فرمایا کہ اپنی صوابدید کے مطابق مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کردیں چنانچہ انہوں نے یہ رقم مسجد نبوی کی مرمت و درستگی میں صرف فرمادی۔ محب طبری نے اہل سنت کے گذشتہ واقعات کے ضمن میں اسے بیان کیا ہے!

غرض بدگمانی کے مرض لاعلاج ہیں یہ بدگمان و متعصب لوگ اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ جہاں کہیں حضرت عثمان غنی رضی عنہ کا ذکر دیکھتے اور اس کے ساتھ آپ کی بیدھڑک اور فراخدلانہ بخشش و عطا کا حال سنتے ہیں، تعمیر مساجد و مقامات مقدسہ یا مسلمانوں پر دولت لٹانے کا، اقربا کی امداد کا واقعہ پڑھتے ہیں تو آنکھ بند کر کے الزام لگا بیٹھتے ہیں کہ آپ نے یہ سب کچھ بیت المال کی رقم سے کیا، اور یوں مسلمانوں کی رقم ضائع کر کے ان کی حق تلفی کی ہے۔

اس خود ساختہ بدگمانی، اور تعصب و نادانی کا تو کوئی علاج نہیں۔ ان کی مثال تو لشکر درانی کے ان فوجیوں کی سی ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی کے دور میں وہ دلی میں گھسے اور لوگوں کے مال و اسباب کو اپنے تصرف میں لائے تو جب وہ شہر میں گھومتے، اور سنہری مسجد اور منقش و عالی شان عمارتیں سرائیں، مدارس وغیرہ دیکھتے تو بہت افسوس کرتے حتیٰ کہ بعض تو روتے بھی۔ اور سبب پوچھنے پر کہتے کہ ہمیں اس کا صدمہ ہے کہ ہمارے بادشاہ کے اموال کو کس بے دردی سے ضائع کیا گیا ہے۔ اگر یہ ساری دولت سنبھال کر رکھی جاتی تو آج ہمارے بادشاہ کے کام آتی۔

اعتراض (۴) چوتھا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں کئی صحابہ کو اپنے عہدہ سے معزول کیا۔ مثلاً جناب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی امارت سے معزول کر کے آپ کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز کو متعین کیا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر سے ہٹایا اور ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رض کو مقرر کیا۔ حالانکہ یہ وہ ہیں جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے اور جن کا خون حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کر دیا تھا۔ اور فتح مکہ کے دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور پرزور سفارش کر کے ان کی خطا معاف کرائی، پھر یہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے!

جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی ولایت سے معزول کیا۔ نیز جناب مغیرہ بن شعبہ کو بھی کوفہ سے ہٹایا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوفہ کی قضا لے لی، اور خزانوں کی دارو غگی سے علیحدہ کیا۔

جواب۔ اس طعن کا بے محل ہونا ہر سمجھ دار پر واضح ہے کہ اگر ائمہ و خلفاء کو کسی ماتحت کے عزل و نصب کا اختیار نہ ہو تو پھر اس کی کیا عزت اور وقار رہے گا۔ یہ ان کے اختیاری امور میں سے ہے جس کو چاہیں مقرر کریں جس کو چاہیں معزول کریں نہ ان پر یہ لازم ہے نہ یہ اس کے پابند ہیں کہ سابقہ عمال ہی کو برقرار رکھیں، ہاں اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ بلا قصور بلا وجہ معزول نہ کریں اور وجہ و سبب ذاتی کمزوری ہی نہیں مملکت کے مفاد اور انتظامی و سیاسی معاملات بھی ہو سکتے ہیں۔

اور ان حضرات کی معزولی بھی بلا سبب نہیں تھی ان کے اسباب تھے جنکی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جسکو دیکھنے ہی سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حسن تدبیر کا پتہ چلتا ہے۔ فی الحقیقت ان حضرات کی علیحدگی اور دوسرے حضرات کا ان کی جگہ تقرر انتظام و استحکام مملکت کے ساتھ دوسرے شہروں کے فتح کا سبب بھی بنا۔ اور خلافت کی شان کچھ سے کچھ ہوگئی۔ لشکر و افواج میں اس قدر اضافہ ہوا، ولایت و مملکت کا دائرہ اسقدر کشادہ ہوا اور قلمرو اسلامی کا خلفہ اس قدر وسیع تر ہوا کہ قیصر و کسریٰ کی نسلوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسلامی مملکت کا طول اگر اندلس سے کابل تک تھا تو عرض قسطنطنیہ سے عدن تک پھیلا ہوا تھا۔ قاتلین عثمان دس بارہ سال صبر و چین سے اور بیٹھے رہتے تو ان کو ایران و خراسان طرح ہند و سندھ ترک و چین میں بھی یا علی علی کے نعرے لگاتے کو مل جاتے۔ ان بدبختوں کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہ ہوئی، کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھوں سے کام چھین کر گو بنو امیہ کو مسلط کیا مگر نام تو محمد و آل محمد کا بالا ہو رہا ہے۔ عبداللہ بن عامر کریز کے طفیل ہی یہ مشہد، شیراز، نیشاپور و ہرات میں "یا علی" کا نعرہ لگانے کے قابل ہوتے اس لئے کہ خراسان اسی نے فتح کیا تھا۔ اور بنو امیہ کی ترک و چین، ہند و سندھ تک نارسائی ہی نے اس

علاقہ کے لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے آوازے سے محروم رکھا۔ اور وہاں کوئی بھی نہ جان سکا کہ علی رضی اللہ عنہ کون تھے۔
ذیل میں ہم مجبوراً عزل ونصب کے اسباب کا اجمالی ذکر کرتے ہیں اور حوالہ میں شیعوں ہی کے معتبر مورخین ابن قتیبہ اور ابن اعثم کو پیش کرتے ہیں، تاکہ انہیں کچھ تو لاج آئے۔
حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی علیحدگی اگر عمل میں نہ آتی تو سخت خانہ جنگی اور فتنہ کا اندیشہ تھا، جو اگر پھوٹ پڑتا تو ناقابل تدارک ہوتا۔ کوفہ اور بصرہ دونوں تباہ ہو جاتے۔ کیونکہ دونوں شہر کے لشکریوں میں سخت اختلاف ونفاق رونما ہو چکا تھا۔
اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے۔ اس کی حدود فارس سے ملتی تھی، جس کے زمیندار، خاصے طاقتور تھے ان سے مقابلہ کے لئے آپ نے خلافت سے امداد چاہی، چنانچہ پایۂ گاہ خلافت کی طرف سے کوفہ کے لشکر کو ان کی مدد واعانت کے لئے مقرر کیا۔ وہ کوفی لشکر ابھی بصرہ نہیں پہنچا تھا کہ راستہ میں رامہرمز سے لڑنے کی نوبت آگئی۔ یہ فارس واہواز کے درمیان ایک بڑا شہر تھا یہ لشکر اُدھر مڑ گیا۔ لڑائی ہوئی، اسلامی لشکر کو نمایاں فتح حاصل ہوئی، شہر بھی قبضہ میں آیا قلعہ بھی سرنگوں ہوا بے شمار مال ودولت، لونڈی غلام، ہاتھ آئے۔ اس سے پہلے بصرہ کے لشکر بھی ان سے نبرد آزما ہوتے رہے تھے۔ اس بنا پر جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ مال غنیمت تنہا کوفی لشکر میں تقسیم نہ ہو بلکہ بصری لشکر کو بھی اس سے حصہ ملے ا اس لئے انہوں نے کوفی لشکر کو کہا کہ جن لوگوں سے تم لڑے، جن کے مکانات تم نے تباہ وبرباد کئے ان کو تو میں امان دے چکا تھا۔ اور چھ ماہ کی مہلت ان کو دے چکا تھا۔ اور تم کو تو میں نے صرف ڈرانے دھمکانے اور رعب ڈالنے کیلئے ملایا تھا تم تو ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے اور جلد بازی سے کام لے لیا۔ مگر کوفی لشکر نے بصری لشکر کو غنیمت میں شریک کرنے سے انکار کیا اور کہا یہ امان دینے کا قصہ افترا اور جھوٹ ہے۔ باہم رد وکد نے شدت اختیار کرلی، اور دونوں لشکروں میں جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی، جب اس قصہ کی خبر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپؓ نے حکم دیا کہ جناب ابو موسیٰؓ رضی اللہ عنہ کے شریک لشکر بزرگ ومحترم صحابہ مثلاً حذیفہ بن یمان، براء بن عازب، عمران بن حصین، انس بن مالک اور سعید بن عمرو انصاری (رضی اللہ عنہم) اس معاملہ کی تحقیق وتفتیش کریں، اور یہ دیکھیں کہ ابو موسیٰ (رضی اللہ عنہ) کی قسم کا کیا معاملہ ہے۔ میں انہیں حضرات کی تحقیق وتفتیش کے لحاظ سے اپنا فیصلہ دے دوں گا۔ جناب موسیٰ رضی اللہ عنہ نے ان سب حضرات کے سامنے قسم کھائی۔
تو خلافت کا حکم صادر ہوا۔ کہ مال اور قیدی، سب واپس کر دیئے جائیں۔ اور مدت معینہ امان تک ان کو بالکل نہ چھیڑا جائے!
یہ فیصلہ کوفی لشکر کو ناگوار ہوا، اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئے، کوفی لشکر کی ایک جماعت خلیفہ کے ہاں پہنچی اور اعتراض کیا کہ اگر واقعی امان دی گئی ہوتی تو بصرہ کے لشکریوں کو تو اس کی اطلاع ہوتی اور ان میں یہ بات مشہور ومعروف ہوتی حالانکہ لشکر میں کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے جھوٹی قسم کھائی ہے۔ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور قسم کے بارے میں ان سے استفسار کیا، اسوقت بھی انھوں نے قسم کھا کر یہی کہا کہ میں نے سچی قسم کھائی ہے، اس پر آپ نے فرمایا اگر معاملہ یوں تھا تو پھر ان لشکریوں کو ان پر کیوں چڑھایا، کہ انہوں نے وہاں جا کر یہ سب کچھ کیا۔ قسم آپ کی اگر جھوٹی نہیں بھی ہے تب بھی ملک داری کی مصلحت کے خلاف یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہے۔ سردست میرے پاس کوئی مناسب آدمی نہیں کہ آپ کی جگہ مقرر کردوں فی الحال آپ بصرہ جائیں، صوبہ داری اور لشکر کی سرداری سنبھالیں جب مجھے کوئی کام کا آدمی مل گیا تو آپ کو معزول کردوں گا رہا آپ کی قسم کا معاملہ سو وہ خدا کے سپرد کرتا ہوں،

اسی دوران آپؓ شہید کر دیئے گئے اور امور خلافت کے والی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئے اُدھر بصری لشکریوں نے بھی شکایتوں کی بھرمار کردی۔ داد ودہش میں کنجوسی کی شکایات دربار خلافت میں پہنچائیں کوفی لشکر پہلے ہی ان سے کبیدہ خاطر تھا۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غور کیا کہ اگر ان کو تبدیل نہ کیا گیا تو دونوں لشکر برافروختہ ہوں گے اور فرائض منصبی بددلی سے انجام دینگے اور نتیجہ دونوں صوبوں کا حال ابتر ہو جائیگا لہٰذا مجبوراً ان کو وہاں سے ہٹا کر ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو برگزیدہ قریشی جوان تھے۔ اور جب وہ بچے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے تو آپؐ نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا! جوانی ہی میں جذبہ شہادت و نجابت کے آثار، سرداری و ریاست کے علامات ان کے اقوال و اعمال و حرکات سے ہویدا تھے۔
ان کا تقرر ان اطراف کے انتظام و انصرام اور دونوں لشکروں کی دلبستگی کے لئے واقعی بہت عمدہ اور کارآمد ثابت ہوا۔

احمد بن ابی سیارہ نے تاریخ مرو میں روایت کی ہے کہ جب عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے خراسان فتح کیا تو اعلان کیا کہ میں اظہار تشکر میں یہاں اس جگہ سے احرام باندھ کر نکلوں گا۔ چنانچہ وہ نیشاپور سے احرام باندھ کر نکلے! سعید بن منصور نے بھی اپنی سنن میں ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

اور جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا عزل اہل مصر کی بے شمار شکایات پر عمل میں آیا تھا۔ عہد فاروقی میں بھی بعض امور کی وجہ سے معزول ہوئے مگر توبہ کر لینے پر بحال کر دئے گئے تھے۔ لیکن شیعوں کو تو ان دو حضرات کی معزولی کی بنا پر حضرت عثمانؓ پر اعتراض کرنا کچھ زیب نہیں دیتا۔ اس لئے کہ یہ تو ان دونوں کو واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ انہیں تو حضرت شہید رضی اللہ عنہ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ایسے لوگوں کو انہوں نے معزول کیا۔ جب وہ اسلام کی قابلیت ہی نہیں رکھتے تو اسلامی ریاست کا حق ان کو کیسے اور کیوں پہنچے اسی لئے بعض اہل سنت اس کو بطور لطیفہ یوں بیان کرتے ہیں کہ شیعوں کو تو یہ کہنا چاہئے تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کرنے پر اکتفا کیوں فرمایا ان کو قتل کیوں نہیں کیا۔ کہ تحکیم کے موقعہ پر امت کے حق میں بداندیشی اور امام وقت کی شان میں بدسگالی کر ہی نہ پاتے۔

بعض خوش طبع حضرات نے اس طعن کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ یہ تو سمجھتے تھے کہ اگر میں ان دونوں کو ختم کر دوں تو پھر میری امامت ہر خاص و عام کے نزدیک ثابت اور مسلّم ہو جائیگی۔ اور چونکہ غیب کا علم امام کی خصوصیت ہے۔ اس لئے شیعوں کو بھی انکار کا موقعہ نہ ہوگا مگر چونکہ آپ کے مزاج پر حیا و مروت غالب تھی، اس لئے یہ سمجھ کر کہ اس میں شیعوں کی کھلم کھلا تکذیب ہوگی اور وہ بے چارے نادم و شرمندہ ہوں گے، اس لئے ان کو صرف معزول کرنے پر اکتفا کیا، اس پر اگر شیعہ یہ اعتراض کریں کہ اگر جناب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ معزول کئے جانے کے لائق ہوتے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان کو اپنی طرف سے ثالث (حکم) کیوں مقرر کرتے، تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے مجبوراً ان کو حکم بنایا، راضی خوشی اور اختیاراً نہیں بنایا۔ اور چلو یہ مان لیں کہ خوشی ہی سے بنایا تب بھی تو چوک ہوئی۔

فائدہ جلیلہ

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما پر مطاعن اور اعتراضات سوائے شیعوں کے اور کوئی نہیں کرتا۔ یہ مطاعن اہل سنت کی کتابوں میں شیعوں کی کتب سے ہی منقول ہوتے ہیں۔ جو اکثر شیعی اصول پر منطبق ہوتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر مطاعن باعتبار اکثر شیعہ اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ پر اعتراض کرنے والے شیعہ بھی ہیں اور خوارج بھی۔ لہٰذا اعتراضات کی دو قسمیں ہوگئیں ایک وہ جو اصول شیعہ کے بموجب ہیں دوسرے خوارج کے اصول کے موافق۔ اس لئے اہل سنت کی کتابوں میں دونوں اقسام خلط ملط کر کے بیان ہو جاتی ہیں اور شیعہ تو دانستہ کہ اعتراضات کی تعداد بہت معلوم ہو دونوں قسم کے اعتراضات تمیز و تفریق کے بغیر بیان کرتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعض اعتراضات جو شیعوں یا سنیوں کی کتب میں منقول و موجود ہیں وہ نہ اصول شیعہ کے مطابق ہیں نہ ان کے مذہب کے موافق چنانچہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر اعتراض اسی نوع کا ہے اور حضرت عمرو بن عاصؓ کی موقوفی پر اعتراض نہ اصول شیعہ پر منطبق ہوتا ہے نہ اصول خوارج پر۔ اسلئے کہ یہ دونوں گروہ انکی تکفیر

کرتے ہیں اگرچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کیا اسوقت ان سے کوئی قول فعل موجب کفر سرزد نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ آخر میں شیعوں اور خوارج کے نزدیک، وہ "کافر" اور "مرتد" ہو گئے تھے۔ اس لئے ایسے صورت میں تو ان کی موقوفی اور عزل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت سمجھی جانی چاہیئے، نہ کہ قابل اعتراض!

اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کی یہ بھی کرامت ہے کہ شیعہ آپ سے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی درخواست کرتے تھے۔ آپ نے ان کو دکھلایا کہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو موقوف کر کے عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ اگرچہ وہ ابتدائے اسلام میں مرتد ہو گئے تھے لیکن دوبارہ اسلام لانے کے بعد ان سے کوئی برا فعل سرزد نہیں ہوا بلکہ ان کی حسن وتدبیر اور نیک نیتی کے سبب مغرب کا پورا علاقہ فتح ہوا، اور بے شمار خزانے دربار خلافت کو حاصل ہوئے حتیٰ کہ مغربی جزائر پر بھی حملہ آور ہوئے، اور غنائم حاصل کئے، مورخین نے لکھا ہے کہ ان کے غنائم سے پچیس لاکھ دینار (کھرے سونے کے) جمع ہوئے اور دیگر سامان، (یلدات اور مویشیوں وغیرہ کا تو کوئی حد وشمار نہ تھا۔ اس کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے بھیجا جو مسلمانوں پر تقسیم ہوا اور باقی چار حصے اپنے لشکر میں شرعی طریقے پر تقسیم کئے۔ ان کے لشکر میں بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی تھے اور صحابہ کی اولادیں بھی وہ سب کے سب ان کی عادات واطوار اور طرز عمل سے خوش تھے، ان کے کسی طرز عمل پر ان کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ ان حضرات میں عقبہ بن عامر جہنی، عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق عبداللہ بن عمرو بن عاص وغیرہ رضی اللہ عنہم) تھے۔ پھر جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا تو خود کنارہ کش اور غیر جانبدار رہے۔ کہتے تھے کہ ہم نے خدا سے عہد کیا ہے کہ کافروں سے جہاد وقتال کے بعد مسلمانوں سے قتال نہیں کریں گے۔ آخر عمر تک عزلت گزیں اور گوشہ نشین رہے۔

اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا یہ سراسر خلاف واقعہ بات ہے۔ ان کو تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کی شکایت پر موقوف کیا تھا۔ اور ان کی موقوفی پر آپ نے یہ تاریخی کلمات فرمائے تھے۔

مَنْ يَعْذِرُنِي مِنْ أَهْلِ الْكُوفَةِ إِنِ اسْتَعْمَلْتُ عَلَيْهِمْ تَقِيًّا اِسْتَضْعَفُوْهُ وَاِنِ اسْتَعْمَلْتُ قَوِيًّا فَجَّرُوْهُ۔

مجھے اہل کوفہ کے معاملہ میں کون معذور کہہ سکتا ہے اگر میں نے ان پر متقی عامل مقرر کیا تو اسے انہوں نے کمزور قرار دیا۔ اور اگر کوئی قوی عامل ان پر مقرر کیا تو اس میں کیڑے نکالنے لگے!

پھر ان کی جگہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب ان کو بھی رشوت ستانی سے متہم کیا۔ جو سراسر جھوٹ اور افترا پردازی تھی۔ مگر آپ نے رعایا کے پاس خاطر کے سبب ان کو بھی موقوف کر دیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے مدینہ کیوں بلایا اس کا حال بھی انشاء اللہ آگے بیان کیا جائے گا۔

اور ان سب باتوں سے قطع نظر خلیفہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جس کو چاہے عامل مقرر کرے اور جسکو چاہے موقوف کر دے۔ کسی کو اعتراض کا کیا حق! اور طعن کی کیا مجال!

رہی یہ بات کہ صحابی کو موقوف کر کے غیر صحابی کو مقرر کرنا، تو یہ واقعات تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بھی وقوع میں آئے۔ مثلاً حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب تھے، جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے۔ ان کو بلاوجہ وسبب اور بے قصور وہاں سے علیحدہ کیا۔ اور اس کا اعتراف آپؓ نے اس مراسلہ میں خود فرمایا جو ان کی معزولی کے سلسلہ میں ان کو لکھا گیا۔ اور جس کی نقل بحوالہ نہج البلاغہ باب مطاعن ابوبکر رضی اللہ عنہ گزر چکی۔ اور ان کی جگہ نعمان بن عجلان زرقی۔ کو مقرر فرمایا، جو نہ صحابی تھا۔ نہ علم وتقویٰ عدل ودیانت میں جناب عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا عشر عشیر اسی طرح جناب قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علمبردار تھے۔ اور خود صحابی وصحابی زادہ تھے جناب

امیر رضی اللہ عنہ نے مصر کی گورنری سے معزول کر کے مالک اشتر کو ان کی جگہ مقرر فرمایا۔ جو صحابی تو کیا صحابی زادہ بھی نہ تھا بلکہ فتنہ و فساد کی پوٹ تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اسی نے شہید کیا۔ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو ڈرا دھمکا کر بغاوت کا سبب بنا، اور اس کو اس علم یقینی کے باوجود مصر کا عامل بنایا کہ جب وہ مصر پہنچے گا۔ تو جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو برداشت نہ کریں گے اور وہ مصر پر چڑھائی کر دیں گے اور معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔

اعتراض (۵)

پانچواں اعتراض آپ پر یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن مسعود اور جناب اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہما کا عہد فاروقی سے جو سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس کو بند کر دیا۔ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ربذہ بدر کر دیا۔ جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امر بالمعروف کے سبب ناراض ہوئے، جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو منافق کہا۔ جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو اتنا مارا کہ آنت اترنے کی تکلیف لاحق ہو گئی۔ کعب بن عبداللہ نہدی رضی اللہ عنہ کو کلمہ حق کہنے کی بنا پر اہانت و تحقیر کی۔

یہ لوگ جلیل القدر صحابہ تھے جن کی اہانت اہل سنت کے نزدیک انسان کی دیانت مجروح ہونے کا سبب ہوتی ہے، تو جب اہل سنت کے نزدیک ان کی دیانت ہی برقرار نہ رہی تو ان کی امامت کیسے درست ہو گی۔

(روایت شیعہ کے مطابق) ان واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ

(حضرت) ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ) شام میں تھے، جب قاصدوں کے ذریعہ (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے افعال ناشائستہ ان کو معلوم ہوئے، تو ان معائب کی برملا تشہیر اور ان پر کھلم کھلا تنقید اور نکتہ چینی کرنے لگے، تو جناب امیر (معاویہ (رضی اللہ عنہ)) نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ابوذر (رضی اللہ عنہ) تمکو لوگوں کے سامنے ذلیل کرتے اور تمہاری اطاعت سے ان کو نکالتے ہیں۔ ان کا دفعیہ جلد از جلد کیا جانا چاہئے تب آپ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا۔ اَشْخِصْهُ اِلَیَّ عَلٰی مَرْكَبٍ وَعْرٍ وَسَائِقٍ عَنِيْفٍ۔ (ان کو میرے پاس تیز سواری اور تیز ہانکنے والے کے ہمراہ بھیجو)

چنانچہ جناب معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے ان کو اسی صورت سے مدینہ روانہ کیا، جب (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے پاس پہنچے تو آپ ان پر غصہ ہوئے اور کہا کہ تم کیوں لوگوں کو مجھ پر جری کرتے اور ان کو میری اطاعت سے نکالتے ہو تو ابوذر (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ آپ نے فرمایا کہ جب حکم بن ابی العاص کی اولاد تیس آدمیوں تک پہنچے گی تو خدا کے مال کو اپنا ٹھہرائیں گے اور اللہ کے بندوں کو لونڈی غلام سمجھیں گے اور خدا کے دین میں حیلہ اور جھوٹ کو دخل دیں گے جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہو گا اور بندگان خدا کو ان سے نجات بخشے گا۔ مجلس میں جو صحابہ موجود تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ سب نے انکار کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوا کر ان سے دریافت کیا آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی سے یہ حدیث نہیں سنی۔ البتہ یہ دوسری حدیث سنی ہے کہ مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ اَصْدَقَ لَهْجَةً مِنْ اَبِیْ ذَرٍّ۔ (نہ کسی پر نیل گوں آسمان سایہ فگن ہوا اور نہ گرد آلود زمین نے کسی کو اٹھایا جو ابوذر سے بات میں سچا ہو)

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غصہ ہوئے اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم شہر سے نکل جاؤ چنانچہ وہ ربذہ چلے گئے اور آخر دم تک وہیں رہے!

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی شام میں تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اونٹوں کی ایک قطار کو جن پر تشہ اور شراب لدی ہوئی تھی جاتے دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ شراب ہے جو امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے بغرض فروخت بھیجی ہے۔ آپ چھری لے

کرا اُٹھے اور شراب کی مشکیں اور پکھالیں پھاڑ ڈالیں اور ساری شراب بہ گئی۔

پھر اہل شام کو (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی بری خصلتوں سے ڈرایا (جناب امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے یہ قصہ (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ آپ عبادہ (رضی اللہ عنہ) کو اپنے پاس بلالیں یہاں رہنے سے لشکر و ملک میں وہ فساد کا سبب بن جائیں گے۔ چنانچہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے ان کو مدینہ بلوالیا اور سخت ناراض ہوئے کہ مجھ پر اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر کیوں نکتہ چینی کرتے ہو۔ کیا اولوالامر کی اطاعت کرنا بھی نہیں جانتے۔ جناب عبادہ (رضی اللہ عنہ) نے جواب دیا لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

اولا (حضرت) عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کو جب عہدہ قضا اور خزانہ داری سے برطرف کیا اور ولید بن عقبہ کو حاکم بنایا۔ تو (جناب) عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے ولید کے ظلم و ستم سے آشفتہ خاطر ہو کر لوگوں کے سامنے اس کے معائب بیان کرنا شروع کر دیئے۔ لوگوں کو کوفہ کی مسجد میں جمع کر کے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی برائیاں ان کے سامنے رکھیں، اور کہا کہ لوگو اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرو گے تو خدا کا غضب تم پہ نازل ہوگا اور تم پر برے لوگ مسلط کر دیئے جائیں گے۔ نیکوں کی دعائیں مقبول نہیں ہوں گی۔ اور جب ان کو جناب ابوذر (رضی اللہ عنہ) کی شہر بدری کی اطلاع ملی، تو مجمع عام میں تعزیت کی اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر طنز کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ۔ (پھر تم وہ لوگ ہو جو اپنوں ہی کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔ ولید نے یہ واقعات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجے، تو آپ نے ان کو کوفہ سے بلالیا۔ جب وہ مسجد نبوی میں پہنچے تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ ان کو مارے۔ غلام نے ان کو پیٹ کر مسجد سے نکال دیا۔ ان کے قرآن کو جلا ڈالا اور ان کے گھر میں ان کو قید کر دیا۔ اور سالانہ وظیفہ چار سال کے لئے بند کر دیا اسی حال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے وصیت کی کہ میری نماز جنازہ جناب زبیر (رضی اللہ عنہ) پڑھائیں۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نہ پڑھائیں۔ بیماری کی خبر سن کر (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) مزاج پرسی کو گئے تو ان سے کہا کہ اے ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) میرے لئے خدا سے گناہوں کی معافی چاہو، ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے کہا اے اللہ تو غفور رحیم لیکن عثمان سے درگذر نہ کرنا تاوقتیکہ تو اس میرا بدلہ نہ لے لے۔

جب سب صحابہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے آزردہ خاطر ہوئے اور (حضرت) عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) پر بھائی چارہ کے تعلق پر ناراضگی کا اظہار کیا تو جناب عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسے نکلیں گے۔ اب معاملہ تمہارے اختیار میں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو کہا کہ عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) منافق ہے۔ اسے پرواہ نہیں کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) نے سخت قسم کھائی کہ جب تک زندہ ہوں عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بات نہیں کروں گا۔ چنانچہ اسی جدائی کے عالم میں انتقال کیا۔

لہذا اگر عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) منافق تھے تو ان کی بیعت صحیح نہ رہی اور اگر منافق نہ تھے تو خود حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) ان پر نفاق کی تہمت لگانے کے سبب فاسق ہوئے۔ اور فاسق امامت کے قابل نہیں۔

اور عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) کے پیٹنے کا قصہ یہ ہے کہ تقریباً پچاس صحابہ (رضوان اللہ علیہم) نے جمع ہو کر ایک خط لکھا اور اس میں (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے معائب لکھے اور جناب عمار (رضی اللہ عنہ) سے کہا تم یہ خط (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو پہنچاؤ۔ ممکن ہے وہ ان باتوں سے آگاہ ہو کر اپنی بد اطواریوں سے باز آجائیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر تم ان بدعات سے باز نہ آئے تو ہم تم کو معزول کر دیں گے اور کسی دوسرے کو تمہاری جگہ مقرر کر دیں گے۔ جب آپ نے خط پڑھا تو اس کو زمین پر پھینک دیا۔ اس پر عمار (رضی اللہ عنہ) نے کہا اس خط کو حقیر نہ جانئے اسے اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لکھ کر آپ کو بھیجا ہے۔ خدا کی قسم میں آپ کے پاس نصیحت و خیر خواہی کے جذبہ سے آیا ہوں۔ اور

آپ کے بارے میں غمزدہ ہوں۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے کہا۔ اے ابن سمیہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان کو ماریں۔ چنانچہ انہوں نے اتنا مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر آپ خود اٹھے اور ان کے پیٹ اور عضو مخصوص پر لاتیں ماریں کہ آپ کو فتق کی بیماری لاحق ہو گئی۔ بیہوشی ہی کے عالم میں ان کی چار نمازیں بھی قضا ہو گئیں، جو ہوش میں آ کر انہوں نے ادا کیں۔ فتق کے عارضہ کے سبب جس نے سب سے پہلے پاجامہ یا شلوار پہنی وہ عمار (رضی اللہ عنہ) ہی تھے۔

بنو مخزوم اس واقعہ سے بہت برہم ہوئے، اور کہا کہ اگر عمار (رضی اللہ عنہ) اس فتق کی بیماری سے مر گئے تو ہم ان کے بدلہ میں بنو امیہ کے ایک بڑے آدمی کو مار ڈالیں گے۔ اس واقعہ کے بعد عمار (رضی اللہ عنہ) گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تا آنکہ جناب امیر (رضی اللہ عنہ) خلیفہ ہوئے!

کعب بن عبدہ نہدی (رضی اللہ عنہ) کا قصہ یوں ہے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت نے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو ایک خط لکھا اور اس میں آپ کے ایک ایک عیب اور برائی لکھی اور لکھا کہ اگر برائیوں سے باز آ جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ ہم آپ کی اطاعت سے نکل جائیں گے، اطلاع شرط تھی سو وہ ہم نے پوری کر دی۔ یہ خط آپ تک پہنچانے کیلئے قافلہ کے کسی آدمی کو دیدیا۔ کعب بن عبدہ نے بھی الگ سے آپ کو ایک خط لکھا جس میں بڑے درشت اور سخت انداز میں آپ کو مخاطب کیا تھا وہ خط بھی اسی قاصد کو دیدیا (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) یہ خط پڑھ کر بہت غصہ ہوئے۔ اور (جناب) سعید بن العاص (رضی اللہ عنہ) کو لکھا کہ کعب بن عبدہ کو کوفہ سے نکالدو تاکہ وہ کوہستان چلا جائے۔ چنانچہ وہاں کے گھر گئے ان کو برہنہ کیا اور بیس کوڑے لگائے اور پھر شہر بدر کر کے کوہستان کی طرف بھیجدیا۔

سعید بن العاص۔ نے اشتر نخعی کی بھی توہین و تذلیل کی، اس کا قصہ یوں ہے (جناب) سعید جب کوفہ کے صوبہ دار ہوئے اور مسجد میں گئے تو سب لوگ آپ کے پاس آئے۔ اور کوفہ اور مضافات کی خوبیاں بیان کرنے لگے، عبدالرحمٰن بن حسین جو کوتوال شہر تھا۔ بولا کاش کوفہ کے مضافات ہمارے امیر کی جاگیر میں آجائیں۔ اس پر اشتر نخعی بولا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو ہم نے تلوار سے فتح کیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے ہمیں اس کا مالک بنایا ہے۔ عبدالرحمٰن نے اسے ڈانٹا، اور کہا کہ امیر اگر چاہیں تو یہ سارا علاقہ ضبط کر سکتے ہیں۔ اشتر نے درشتی اور سختی برتی تو اور لوگ بھی اس کی حمایت اور اپنی زمینوں کے پاس میں اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالرحمٰن کو اتنا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔

سعید نے یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ اشتر، اور اس کے مددگاروں کو کوفہ سے نکال کر شام بھیجدو، چنانچہ وہ شام چلے گئے، اور (قتل عثمان (رضی اللہ عنہ) تک وہیں رہے! پھر سعید بھی کوفہ کا انتظام نہ سنبھال سکے، لوگ بلوہ کر کے ان پر چڑھ آئے۔ اور وہ مدینہ چلے گئے۔ اس وقت کوفہ کے سرداروں نے اشتر کو لکھا کہ تمہارے بھائیوں نے ایک عہد کر لیا اور قسم کھائی ہے۔ سعید کو کوفہ سے نکال دیا ہے۔ اور (حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھو اور ہم سے آملو تاکہ سب مل جل کر یہ مہم سر کریں چنانچہ وہ فوراً کوفہ پہنچا اور ثابت بن قیس کو توال شہر کو مار پیٹ کر نکال دیا۔ کوفہ کی تمام فوجیں اشتر کے ساتھ مل گئیں اور قسم کھائی کہ اب (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے کسی عامل کو کوفہ میں نہ آنے دیں گے۔ آخر آپ نے مجبور ہو کر انہیں لوگوں کی خواہش کے مطابق حضرت ابو موسیٰ اشعری کو کوفہ کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔“

جواب:۔ اس طعن و اعتراض کا اجمالی اور الزامی جواب تو یہ ہے کہ جن حضرات کے حوالے سے شیعوں نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے، ان میں سے اکثر تو خود ان کے نزدیک واجب القتل تھے۔ وہ عزت و احترام کے قابل ہی کب تھے، کیونکہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان صریح کو چھپایا، ”ظالموں“ کی مدد سے اہل بیت کے حق کو نقصان پہنچایا۔ اور شہادت حق سے خاموش رہے! اور شیعہ منطق کی رو سے ایسے حضرات سے جو بیزار نہ ہو جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا تھا وہ اگر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے کر دیا تو ان پر طعن و اعتراض کیوں؟ ان کی تعریف کرنی چاہیئے!

اور ایک دو حضرات جو شیعوں کے ہاں اس سلوک سے مستثنیٰ بھی ہیں تو ان کا ایک دوسرا ”جرم“ ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے بھی انکو عقوبت ملنی چاہ

چاہیئے تھی۔ التقیہ دینی و دین آبائی۔ کے پیش نظر جب خود جناب امیر رضی اللہ عنہ خاموش تھے۔ تو انہوں نے یہ جواب کیوں ترک کیا۔ جناب امیرؓ کی تقلید کیوں نہ کی ان کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باتوں کو خاموشی سے گوارا کرنا چاہیئے تھا اور خاموش رہنا چاہیئے تھا۔
پھر ان دونوں کا "جرم بے وفائی" بھی ثابت ہوگیا، کہ ذاتی معاملات کی وجہ سے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی کی، ان کے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کے ہاتھوں اہانت وغیرہ برداشت کی، مگر عہد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جبکہ نص امامت کے اظہار کا اصل موقع اور وقت تھا، خاموش رہے، جس کی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کا واجبی حق بھی تلف ہوا۔ اور دین پیمبر میں بھی خلل پڑا۔ ایسے "بے وفاؤں" کو اچھا ہوا سزا ملی۔ اس کی وجہ سے جناب عثمانؓ پر طعن کیوں؟ انہوں نے تو عین شیعہ فلسفہ کے مطابق ان پر گرفت فرمائی۔ کہ تقیہ کیوں چھوڑا۔ علی الاعلان بات کہنے کے مرتکب کیوں ہوئے۔

جواب (۲)، خلافت و امامت کا معاملہ اتنا اہم اور مہتم بالشان ہے کہ اسکی حفاظت و بقا کے لیے، اور اس میں برہمی اور انتشار پیدا کرنے والوں، یا اس کی حرمت پر اثر اندازی کے وقت کسی قسم کا لحاظ و مروت کرنا سستی و غفلت برتنا مناسب اور زیبا نہیں، خود جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حرم رسول ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا لحاظ و پاس نہیں فرمایا،
جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری، قدیم الاسلام، رشتہ دار تھے دونوں کو قتل کیا۔ اور محض خلافت کی حفاظت کی خاطر، ورنہ یہ بات تو جناب امیر رضی اللہ عنہ بخوبی اور بوثوق جانتے تھے کہ یہ حضرات اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم آپؓ کی جان کے خواہاں نہیں تھے۔ وہ تو صرف قاتلان عثمانؓ کا مطالبہ کرتے تھے۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خیال مبارک میں، لشکر سے اس قدر فوج کا کٹ کر علیحدہ ہو جانا خلافت و مملکت میں خلل پیدا کرتا اور خلیفہ کا حکم ناقابل عمل ٹھہرتا تھا، اس لئے ان سے لڑائی لڑی۔ اور رشتہ داری، سسرال، زوجیت اور صحبت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، سارے ہی علاقے نظر انداز فرما دیئے!
اور جب کوفہ والوں کو جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت سے باز رکھا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے خاطر خواہ ان کی سرزنش کی۔ اور مالک اشتر کے ذریعہ ان کا گھر جلوایا گیا مال و اسباب لوٹا گیا اور آپؓ نے اسے روا رکھا! یہ باتیں ہر دو فرقہ کی تواریخ میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ تو گویا معلوم ہوا کہ امیر خلافت کے استحکام و حفاظت کے سلسلہ میں چھوٹی موٹی مصلحتیں تلف ہوتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وجود خلافت اور استحکام خلافت سب سے مقدم اور نہایت اہم مصلحت ہے۔ تو اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت و صیانت کے لئے بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا ہو یا اہانت کی ہو، تو وہ موجب طعن کیوں؟ جبکہ یہ ڈرانا یا اہانت قتل سے بہر حال کم ہی ہے۔
اور جنگ جمل کے بعد ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جس قدر توہین و تذلیل ہوئی۔ تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے،
یہ جوابات تو وہ تھے جو شیعی فلسفہ و مذاق کے مطابق تھے۔ لیکن اہلسنت نے صحیح روایات کی روشنی میں اس اعتراض و طعن کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر اصحاب کی موجودگی میں بھی اور علیحدگی میں بھی بار بار تاکید فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمکو کسی وقت خلافت کی خلعت سے نوازے گا۔ منافق اس شرف کو تم سے چھیننا چاہیں تو مزاحمت اور جھگڑنے کے بجائے صبر کرنا۔ چنانچہ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت موجود ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کی مجلس میں ایک روز فتنہ کا ذکر فرما رہے تھے کہ عنقریب واقع ہوگا۔ اس ذکر سے رفقاء کو سراسیمہ دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس وقت یہ راہ راست پر ہوں گے۔ صحابہ کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے! پھر ایک مرتبہ اسی فتنہ کے ذکر کے دوران فرمایا کہ اس روز بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے کھڑا ہونے والا چلنے والے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔

مرض وصال میں ایک روز فرمایا لیت عندی رجلا اکلمہ . کاش اسوقت میرے پاس وہ شخص ہوتا جس سے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اہل بیت کرام نے، حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر دریافت کیا کہ ان کو بلائیں تو آپ نے انکار فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے بھی انکار فرمایا. جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیا گیا تو آپ نے فرمایا ہاں! جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت دیر تک سرگوشی میں کچھ گفتگو فرماتے رہے، مرض کی وجہ سے آپ لیٹے ہوئے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سر کو سینہ مبارک پر رکھے ہوئے وصیت فرما رہے تھے۔ اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اسوقت بے اختیار باواز بلند اللہ المستعان، اللہ المستعان. کے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ یہ روایت ازواج مطہرات اور اسوقت موجود دیگر خدام خانہ رضوان اللہ علیہم نے بیان فرمائی۔
ایک مرتبہ جناب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دو، اور کہو کہ تم پر عام بلوہ ہوگا۔
خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس قطعی نصوص و احکام اور تاکیدی وصایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود تھیں۔ اور آپ ان وصایا پر ثابت قدم رہے! جب آپ نے دیکھا کہ منافقین کے ساتھ کچھ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی لاعلمی اور ناواقفی یا کسی غلط فہمی کے سبب منافقین کے ہم آہنگ وہم آواز ہو رہے ہیں، تو آپ نے یہ چاہا کہ یہ سچے مسلمان منافقوں کا ساتھ نہ دیں اس سلسلہ میں اپنی صوابدید کے مطابق ان حضرات کو مناسب تنبیہ بھی فرمائی، مقصد ان کی خیر خواہی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ان حضرات کی آڑ لے کر یہ منافق و اوباش زور نہ پکڑیں۔

اہل سنت کے نزدیک عصمت خاصۂ انبیاء ہے۔ یہ حضرات بھی صحابہ کو معصوم نہیں جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ عہد عثمان سے قطع نظر عہد صدیقی و فاروقی رضی اللہ عنہم حتیٰ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر حدود جاری ہوئیں۔ بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسطح بدری اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما کو حد قذف میں پکڑا۔ کعب بن مالک مرارہ ابن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جن میں سے دو حضرات شریک بدر بھی تھے غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کے سبب بارگاہ نبوت سے نکال دیئے گئے۔ اور سارے مسلمانوں کے مقاطعہ کا نشانہ بنے، ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کیا گیا۔ کئی حضرات پر شراب نوشی کی حد جاری ہوئی۔ ان کے علاوہ بھی سزائیں ہوئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی حسب موقعہ و حال بعض حضرات کو تنبیہ فرمائی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ منافق اور اوباش لوگوں کا ساتھ دیکر اپنا حشر ان کے ساتھ نہ کرائیں، اور جو دنیا و آخرت میں ان کے لئے عذاب و روسیاہی مقدر ہو چکی ہے، اس سے بچ جائیں، اور بحمد اللہ ایسا ہی ہوگا کہ قتل عثمانؓ میں کسی صحابی نے حصہ نہیں لیا منافقوں اور اوباشوں کے ہی دست و دامن خون عثمان سے تر ہوئے۔
اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امر مقدر کا علم ہو چکا تھا اس لئے نہ ان بدبختوں کے حملہ کا بچاؤ کیا نہ کسی کو حمایت میں بلایا۔ بلکہ صبر و رضا کے ساتھ جام شہادت نوش فرمالیا۔

جن حضرات کو آپ نے تنبیہ فرمائی یا گوشمالی کی وہ چونکہ عواقب و نتائج سے آپ کی طرح آگاہ نہ تھے اس لئے بعد میں ان سے معذرت بھی چاہی، اگر غور کیا جائے اور انصاف سے کام کیا جائے۔ تو اہل سنت کا یہ موقف درست نظر آتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حال ہو بہو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے پورے طور پر ملتا ہے۔ کہ ان کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی۔

یا علیؓ لا تجتمع الامۃ علیک بعدی وانک تقاتل الناکثین والقاسطین والمارقین۔ — اے علی میرے بعد تمہاری خلافت پر ساری امت متفق نہ ہوگی۔ تمہیں عہد شکنوں، بے انصافوں اور بددینوں سے، لڑائیاں لڑنی پڑینگی۔

چنانچہ جب آپ مسند خلافت پر متمکن ہوئے، تو حتی المقدور فتنہ کے فرو کرنے اور مخالفوں سے قتل و قتال اور جنگ و جدال کے ذریعہ اپنے سے دور کرنے کی کوشش فرمائی نہ اس میں کوئی تامل فرمایا، اور نہ کسی کے منصب و مقام کا کوئی لحاظ کیا نہ کسی مروت اور رعایت سے کام لیا،

اسی لئے آپ کی ان کارروائیوں کی زد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آئیں، اور طلحہ و زبیر یعلی بن منبہ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم یا دوسرے صحابہ کرام بھی آئے! مگر مقدر نے یاوری نہیں کی۔ اس لئے امور خلافت حسب منشا انجام نہ پاسکے۔

ان اجمالی گذارشات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ سلسلہ بسلسلہ تفصیلی جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

طعن واعتراض میں قصص واقعات جس انداز میں ذکر ہوئے، وہ حسب دستور، دجل وفریب کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ساری باتیں شیعوں کی من گھڑت اور بناوٹی ہیں، معتبر تاریخوں کا دامن ان کے ذکر سے خالی ہے۔ ان کتابوں میں واقعات کی جو اصل صورت حال ہے اس کے مطالعہ ہی سے اعتراضات کی قلعی کھل جاتی اور جواب خود بخود سامنے آجاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ بحوالہ ابن سیرین، اور دیگر ثقہ تابعین کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ مزاجاً بہت متشدد تھے۔ زبان بھی بے قابو تھی۔ خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے خدام سے الجھ پڑتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے گتھم گتھا ہو گئے، اور مادر پدر تک پہنچ گئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زبان درازی پر ڈانٹا اور فرمایا اَعَیَّرْتَہٗ بِاُمِّہٖ اِنَّکَ امْرَءٌ فِیْکَ جَاہِلِیَّۃٌ۔ (کیا تم اسے ماں کے حوالہ سے عار دلاتے ہو، تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کا اثر ہے)

عہد عثمانی میں لشکر شام میں جب انہیں قیام کا اتفاق ہوا تو فتوحات میں غنائم کی کثرت کے سبب بے شمار دولت ہاتھ آنے کے باعث مہاجر وانصار لکھ پتی ہو گئے، تو جناب ابوذر رضی اللہ عنہ نے سب پر اعتراضات شروع کر دیئے، پہلا نشانہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بنے، اور حوالہ کے لئے آیت وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ الخ سنانے لگے! اور اموال کو خرچ کرنا فرض بتانے لگے! جناب معاویہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہرچند سمجھایا کہ یہاں خرچ کرنے سے مراد بقدر زکواۃ ہے۔ سارا مال خرچ کرنا مراد نہیں ہے۔ اور اسکی دلیل میراث وفرائض کی آیت ہے۔ کیونکہ اگر سارے کے سارے مال کا خرچ کرنا فرض وواجب ہوگا تو متروکہ مال کی تقسیم کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔ مگر بات ان کی سمجھ میں نہ آئی وہ اپنے خیال پر اڑے رہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ سختی اور درشتی سے پیش آنے لگے!

شامی لشکر نے جمہور امت کی روش سے ہٹ کر ان کی روش پر انگشت نمائی شروع کر دی اب وہ جدھر جاتے لوگ گروہ در گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو جاتے اور ان کو چڑانے اور غصہ دلانے کے لئے جان بوجھ کر زور زور سے یہ آیت پڑھتے۔ انہوں نے گویا یہ چڑ بنالی۔ جب بات مذاق اور ہنسی ٹھٹھے اور طعن وطنز تک پہنچ گئی تو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے سارا ماجرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا۔ آپ نے حکم بھیجا کہ ان کو مدینہ روانہ کر دیں۔ چنانچہ ان کی شایان شان عزت واحترام کے ساتھ ان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ یہ شیعوں کی اپنی اپج ہے جو وہ کہتے ہیں کہ تیز رو سواری پر بھیجے گئے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ان کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی اہل مدینہ شام میں پیش آنے والے واقعات وقصے سن چکے تھے یہاں کے خوش طبع اور رنگین مزاج لوگ بھی ان کے پیچھے لگ گئے۔ وہ بھی دل لگی اور مزاح کے لئے ان سے آیت کے معنے پوچھنے لگے۔ اسی دوران حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے فوت ہو گئے۔ آپ نے بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑی، آدائیگی حقوق وصایا وغیرہ کے تقسیم ہوا تو آٹھواں حصہ چار عورتوں کو پہنچا۔ ان میں سے ایک بیوی کو مرض وفات میں چونکہ طلاق دیدی تھی اس لئے اس کو پورے حصے کے بجائے ایک مقررہ رقم دینے پر صلح کر لی تھی اور وہ اسی ہزار درہم سے زیادہ تھی! (اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحیح ورثا کے حصہ میں کتنا مال خطیر آیا ہوگا)

دل لگی بازوں کو شوشہ ہاتھ آگیا۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو چڑانے کے لئے جناب عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی مال داری کا قصہ سنایا۔ اس معاملہ میں ان کا ایک مزاج بنا ہوا تھا۔ لہذا حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے دوزخی ہونے کا فتوی لگا دیا۔ اور جوش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت صریحہ کو بھی بھلا بیٹھے۔ یہ معاملہ ایک نص صریح کے چونکہ خلاف تھا جناب کعب احبار (رضی اللہ عنہ) جو اہل کتاب کے علماء

میں سے تھے اور عہد فاروقی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ جناب یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ ملت حنیفیہ آسان ترین، کشادہ ترین مذہب ہے۔ اور سارے مال کا خرچ کرنا تو یہودی مذہب میں بھی واجب نہیں جو بہت تنگ اور سخت مذہب ہے۔ تو مذہب اسلام میں سارا مال خرچ کرنا کس طرح واجب ہو سکتا ہے، بات ذرا سوچ سمجھ کر کیا کیجیے۔ آپ حسب عادت غصہ میں آگئے اور فرمانے لگے ارے یہودی تجھے ان مسائل سے کیا واسطہ! اور لاٹھی اٹھا کر انہیں مارنے دوڑے۔ وہ وہاں سے بھاگے اور سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نشستگاہ میں آگئے۔ اور آپ کی پیٹھ پیچھے چھپ گئے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ غصہ میں بھرے وہاں پہنچے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لاٹھی کا وار کعب احبار پر کر دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس کی زد میں آئے اور آپ کے پاؤں پر لاٹھی سے چوٹ لگی۔ ان کی بدحواسی اور بیخودی دیکھ کر ہی حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے خدام کو حکم دیا کہ انہیں پکڑو کہیں غصہ میں ایسی جگہ چوٹ نہ مار بیٹھیں کہ موت کا سبب بن جائے۔ چنانچہ خدام نے انہیں پکڑا اور گھر چھوڑ آئے۔ جب جوش ختم اور غصہ دور ہوا۔ تو آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے، میں اپنے اس خیال پر اتنا پختہ ہوں اور یہی میرا مذہب ہے۔ کہ کل مال خرچ کرنے کو واجب سمجھتا ہوں۔ مگر پہلے شامی اور اب اہل مدینہ نے مجھے نشانہ تضحیک بنالیا ہے۔ وہ مجھے چھیڑنے اور چڑانے کے لئے میرے ارد گرد اکٹھا ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق اڑاتے ہیں اور مجھے پاگل کر دیتے ہیں، کہ ایسے واقعات کی نوبت آجاتی ہے آپ مجھے مشورہ دیجئے میں کیا کروں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہاں اب بات تو ایسے ہی ہو گئی ہے۔ کہ لوگ باگ آپ سے سزا لینے کے لئے ایسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ آپ اگر ان مجمعوں سے کنارہ کشی گوارہ کر سکیں تو بہتر صورت یہی ہے۔ اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ مضافات مدینہ میں سے کسی مقام پر سکونت اختیار کر لیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ سے تین منزل کی دوری پر واقع مقام ربذہ میں آپ تشریف لے گئے۔ اور وہیں رس بس گئے۔ تھوڑے وقفہ سے مسجد نبوی کی زیارت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے آتے جاتے رہے!

ان حالات سے متعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوئی شکایت آپ سے منقول نہیں۔ جو بات ملتی ہے وہ یہی کہ آپ جناب شہید رضی اللہ عنہ کے انتہائی مطیع اور فرمانبردار رہے۔ اور اسکی دلیل وہ قصہ ہے جو تمام مورخین نے بیان کیا ہے کہ جب آپؓ ربذہ گئے اسوقت وہاں کا عامل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام تھا۔ جو مسجد میں جماعت پنجگانہ کی امامت بھی کرتا تھا۔ آپ کے پہنچنے پر جب نماز کا وقت آیا۔ تو اس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ مجھ سے افضل اور بہتر ہیں اس لئے امامت آپ ہی فرمائیں۔ مگر آپ نے فرمایا تم عثمان (رضی اللہ عنہ) کے نائب ہو اور عثمان (رضی اللہ عنہ) مجھ سے افضل ہیں، اور نائب بھی اصل ہی کے حکم میں ہے اس لئے ضروری اور لازم ہے کہ امام تم ہی بنو، چنانچہ اس غلام نے امامت کی اور آپ نے اس کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی۔ تو یہ ہے اصل قصہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا۔ مگر اس فرقہ کا وطیرہ ہی بغض و عناد کا ہے۔ اس لئے قصوں میں حسب مطلب کانٹ چھانٹ اس کی عادت ہے۔ اور ایک قصہ سے دوسرے واقعہ کی پیوند کاری اس کا طریقہ۔ اور نتیجۃً خیالی تصویر اور وہمی بت تراش کر اسی کو معبود بنا لیتے ہیں۔

اور جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی محض افتراء اور بہتان ہے، نہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شکایت لکھی اور نہ ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ منورہ بلایا۔ کسی تاریخ سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے معتبر تواریخ میں یوں مذکور ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب قبرص پر لشکر کشی کی تو جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بھی شریک لشکر تھے۔ اس لئے کہ اس جہاد کے فضائل اور اس میں شریک مجاہدین کی مغفرت کی شہادت خود فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نیز اپنی بیوی ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا سے سن چکے تھے جزیرہ کی فتح کے بعد جو مال غنیمت حاصل ہوا، اس میں سے خمس علیحدہ کر کے دارالخلافہ روانہ کر دیا اور باقی مال مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے خود جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بیٹھے۔ دوسری طرف چند صحابہ کرام جن میں جناب عبادہ، شداد بن اوس فہری،

ابو درداء، واثلہ بن اسقع، ابو امامہ باہلی اور عبداللہ بن بسر مازنی۔ رضی اللہ عنہم تھے۔ الگ گوشہ میں بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے کہ تقسیم موافق سنت ہوتی ہے۔ یا خلاف سنت! اسی دوران دو فوجی، دو گدھے لئے جناب عبادۃؓ کے سامنے سے گذرے تو آپ نے پوچھا تم یہ گدھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ اور یہ کس کام کے لئے ہیں، لشکریوں نے بتایا کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عنایت فرمائے ہیں تاکہ ان پر سواری کر کے سفر حج پر جائیں۔ اس پر جناب عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ نہ تمہارے لئے حلال ہیں اور نہ معاویہؓ کی یہ بخشش جائز ہے۔ یہ سن کر لشکری واپس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، گدھے واپس کر کے کہنے لگے کہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ان کا لینا جائز نہیں۔ اس لئے ہم ان کو کیسے لے اور ان پر حج کر سکتے ہیں! امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر مسئلہ کی صورت حال معلوم کی تو آپ نے کہا۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِي غَزْوَةِ حُنَيْنٍ وَالنَّاسُ يُكَلِّمُوْنَهُ فِي الْغَنَائِمِ فَاَخَذَ وَبَرَةً مِّنْ بَعِيْرٍ وَقَالَ مَالِيْ مِمَّا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مِنْ هٰذِهِ الْغَنَائِمِ مِثْلُ هٰذِهٖ اِلَّا الْخُمُسُ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ فَاتَّقِ اللّٰهَ يَا مُعَاوِيَةُ وَاَقْسِمِ الْغَنَائِمَ عَلٰى وَجْهِهَا وَلَا تُعْطِ اَحَدًا مِّنْهَا اَكْثَرَ مِنْ حَقِّهٖ۔

غزوہ حنین کے موقعہ پر جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غنائم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا ایک بال ہاتھ میں لیکر فرمایا کہ اس مال غنیمت میں میرے لئے خمس سے ایک بال بھی نہیں ہے۔ اور وہ خمس بھی تم مسلمانوں کے ہی صرف میں آتا ہے! تو اے معاویہ! اللہ سے ڈرو اور مال غنیمت اس طرح بانٹو کہ کسی کو اس کے حق سے زیادہ نہ دو!

اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا یہ مال غنیمت سنبھالو اور اپنی صوابدید پر اسے تقسیم کر دو! اور مجھے اس بار گراں سے ہلکا کر دو، میں تمہارا ممنون احسان ہوں گا؟ چنانچہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ داروغہ تقسیم بنے اور جناب ابو امامہ اور ابو درداء رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے معاون و شریک کار بنے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یہ نظم باقی و جاری رہا۔ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کی وفات شام میں ہوئی۔ بیت المقدس میں مدفون ہوئے۔ نہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جدا ہوئے اور نہ مدینہ منورہ تشریف لائے! لہذا یہ قصہ ہی جھوٹا ہے۔

یہی حال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ناخوشی کے قصہ کا ہے کہ یہ بھی افتراء اور جھوٹ ہے۔ کتب صحیحہ اس کے بیان سے خالی ہیں۔
صحیح واقعہ اس قدر ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی قرات قرآن میں اختلاف کے سبب یہ نوبت آنے لگی ہے کہ لوگ اختلاف قرأت کو بہانہ بنا کر غیر منزل الفاظ بھی پڑھنے لگے ہیں۔ تو آپ نے حضرت حذیفہ بن یمان اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے مشورہ سے یہ انتظام فرمایا کہ تمام عرب و عجم ایک ہی مصحف پر متفق ہو جائیں اور باہم مختلف نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس جو مصاحف تھے ان میں قرأت شاذہ کے علاوہ بعض ادعیہ قنوت اور بعض تفسیری عبارات بھی درج تھیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن مجید کے وقت بیان معانی کے طور پر فرمائی تھیں۔ ان مصاحف میں ان کی برقراری آئندہ چل کر فساد عظیم کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ نفس قرآن میں اختلاف ہوتا۔ جو رفتہ رفتہ بیش از بیش خرابیوں اور برائیوں کا سبب بنتا ہے ان حضرات نے اپنے مصاحف میں ان کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ مگر مصحف لینے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے جبر سے کام لیا اور مار پیٹ کی بھی نوبت آئی۔ مگر اس کی اجازت، یا حکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرگز نہیں دیا تھا۔ اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنا مصحف بخوشی بلا جبر دیدیا تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ نہ کوئی بات ہوئی، نہ باہم کدورت کی نوبت آئی! اس کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر ممکن و مناسب طریقہ سے آپ کو راضی کرنا چاہا۔ اور عذر و معذرت بھی پیش کی۔ ایسی صورت میں قرین انصاف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں آتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنفس نفیس ان کے مکان پر گئے۔ ان سے معافی چاہی۔ ان کا وظیفہ سالہا سال سے رکا ہوا تھا وہ دینا چاہا۔ تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب مجھے ضرورت تھی اس وقت تو بھجوایا نہیں اب سفر آخرت پر جا رہا ہوں تو آپ دے رہے ہیں میں نہیں لوں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا بچیوں کے کام آئے گا رکھ لیجئے۔ تو فرمایا میں نے لڑکیوں سے کہہ دیا ہے کہ ہر رات سورۂ واقعہ کا ورد کر لیا کریں کیونکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ جو کوئی ہر رات سورہ واقعہ پڑھے گا فاقہ میں مبتلا نہ ہوگا

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اٹھ کر ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گئے اور ان سے درخواست کی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو مجھ سے راضی کرا دیجئے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا نے متعدد مرتبہ کہلا کر بھیجا۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہنے لگے اے عبداللہ تم بھی اپنے بھائیوں سے یوسف علیہ السلام کی طرح کیوں نہیں کہہ دیتے لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۔ (آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے وہ ارحم الراحمین ہے) یہ سنکر جناب عبداللہ رضی اللہ عنہ چپ رہے کوئی جواب نہیں دیا۔

لہٰذا اس معاملہ میں ان کو راضی کرنے اور اپنے قصور کی معافی چاہنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس سعی و کوشش کے بعد وہ بری الذمہ ہوگئے۔ اب ان پر الزام بنائے عناد تو ہو سکتا ہے از روئے دیانت و انصاف نہیں۔ اور پھر جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ شکر رنجی، دشمنوں کی سی نہیں، بھائیوں اور عزیزوں کی طرح کی تھی جو بعض اوقات معمولی بات پر بھی ہو جاتی ہے۔ اس شکر رنجی کی بنا پر نہ وہ آپ کی خلافت سے منکر ہوئے۔ نہ یہ عقیدہ رکھا کہ وہ اس کی لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ سلمہ بن شقیق جو آپ کے خاص دوستوں میں سے تھے کہتے ہیں۔

دَخَلْتُ عَلَى ابْنِ مَسْعُوْدٍ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ تُوُفِّيَ فِيْهِ وَعِنْدَهٗ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ عُثْمَانَ فَقَالَ لَهُمْ مَهْلًا فَاِنَّكُمْ اِنْ تَقْتُلُوْهُ لَا تُصِيْبُوْنَ مِثْلَهٗ ۔

میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس مرض وفات میں ایک دن گیا تو آپ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے کہا، بس چپ کر جاؤ۔ اگر کبھی تم نے ان کو قتل کر دیا تو ان جیسا کبھی نہ پاؤ گے!

غرض سیاست و انتظام ملکی میں اس قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے واقعات پیش آتے ہیں اگر ان کو مطاعن میں شمار کریں تو شیعوں کا تو قافیہ تنگ ہو جائے گا۔ مثلاً وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا کہیں گے کہ انہوں نے اپنے حقیقی بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بالکل چھوڑ دیا۔ ان کا وظیفہ اتنا تنگ کر دیا کہ مجبور ہو کر جنگ صفین کے بعد وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ اور جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی، آپ کے خاص ساتھی تھے۔ ان کو معزول کیا۔ ان کا وظیفہ بند کیا اور ان سے تعلقات توڑ لئے۔ حتیٰ کہ وہ آپ سے الگ ہو کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرفدار ہو گئے! جناب عقیل اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہما۔ مراتب و عزت میں حضرت ابوذر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کم تو نہیں۔ اگر ان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مستحق طعن ہیں تو یہ نادان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جناب امیر داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے طعن کی زد میں آجاتے ہیں۔ کسی مسلمان کی تو یہ جرأت نہیں کہ عظیم المرتبت اصحاب کرام تو رہے اپنی جگہ کسی عام صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کا خیال بھی دل میں لائے!

یہی حال حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے قصہ کا ہے کہ اس کی بھی کوئی اصل و بنیاد نہیں۔ اگر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ آپ کی تولیت اور بھائی چارگی پر نادم تھے تو آخر ان کو صاف اور دو ٹوک انداز میں کہنے سے کیا بات مانع تھی!

بات صرف اتنی صحیح ہے کہ ان دونوں حضرات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم اخوت کا رشتہ و تعلق جوڑا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر جناب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ، آپ سے خوش طبعی اور دل لگی بہت کرتے تھے! (اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بہت باحیا اور با مروت تھے۔ حیادار آدمی عموماً خوش طبعی سے پریشان اور دل تنگ ہو ہی جاتا ہے)۔ ایک روز ان کی خوش طبعی اور دل لگی سے اس قدر پریشان ہوئے کہ یہ الفاظ آپ نے فرمائے۔ اِنِّیْ اَخَافُ یَا ابْنَ عَوْفٍ اَنْ تَبْسُطَ مِنْ دَمِیْ۔ (اے ابن عوف مجھے ڈر ہے کہ تو (اپنی دل لگی سے) مجھے مار نہ ڈالے۔)

اور دوستوں اور ہم صحبتوں میں اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے ہیں (مگر ان کی وجہ سے دل میں گرہ نہیں پڑتی) دل صاف رہتے ہیں!

جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی لوگوں کے ساتھ خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔ چنانچہ دارقطنی نے زیاد بن عبداللہ نخعی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ "ہم مسجد اعظم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت بیٹھے ہوئے تھے ان دنوں کوفہ کے مکانات سفالپوش تھے کہ اتنے میں، مؤذن نے آکر کہا کہ یا امیر المؤمنین (رضی اللہ عنہ) عصر کی نماز کا وقت ہوگیا، آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ! وہ بیٹھ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد آیا اور اسی طرح کہا، اس پر آپ نے (ازراہ دل لگی) فرمایا۔ یہ کتا ہم کو سنت سکھاتا ہے"!

دارقطنیؒ نے اسی زیاد مذکور سے ایک اور روایت بیان کی ہے۔ کہ ایک شخص جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور وضو کے بارے میں آپ سے پوچھا، (کہ دائیں ہاتھ سے شروع کرنا چاہیئے یا بائیں سے)، آپؓ نے فرمایا دائیں سے شروع کرو یا بائیں سے! پھر آپ نے منہ سے گوز کی آواز نکالی (گویا وضو ٹوٹنے کا اظہار فرمایا) پھر پانی منگایا اور وضو بائیں ہاتھ سے شروع فرمایا"

اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قصہ جس انداز میں بیان کیا ہے وہ بھی صحیح' اہل سنت کی روایات کے مطابق یہ قصہ یوں ہے کہ ایک دن حضرت سعد بن ابی وقاص اور جناب عمار رضی اللہ عنہما مسجد میں آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھجوائی کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہیں آپ بھی مسجد میں آجائیں، آپ کی طرف سے صادر شدہ بعض امور جو عوام کی شکایت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق آپ سے گفتگو اور مشورہ کرنا ہے! آپؓ نے اپنے غلام کے ہاتھ کہلوایا، اسوقت تو مجھے بہت سے کام درپیش ہیں، اس وقت تو آپ لوگ جائیں اور فلاں روز ملاقات کا وعدہ ہے۔ جو باتیں ہوں میں سنوں گا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ تو یہ سنکر چلے گئے۔ مگر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے پھر کہلوایا کہ آپ کو آج ہی ابھی آکر بات کرنی چاہیئے۔ آپؓ نے پھر عذر کیا۔ مگر عمار رضی اللہ عنہ نے پھر تقاضا کیا مگر آپؓ نے عذر فرمایا۔ مگر عمارؓ مُصر رہے۔

اسوقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام نے ان سے ہاتھا پائی کی، مسجد سے گھسیٹ کر باہر نکال دیا اور کہنے لگے کہ شریعت میں اجازت کی حد تین مرتبہ ہے آپ حد شرعی سے بڑھ گئے لہذا آپ کو سزا دینا ضروری ہوا، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے، لوگوں کو اکٹھا کیا۔ عمار رضی اللہ عنہ کو بھی بلوایا اور قسم کھا کر کہا کہ غلام کی یہ حرکت نازیبا میرے ایماء و اجازت سے نہیں ہوئی۔ اس غلام کو ڈانٹا ڈپٹا۔ اور فرمایا۔ هٰذِهٖ یَدِیْ لِعَمَّارٍ فَلْیَقْتَصَّ مِنِّیْ اِنْ شَاءَ۔ (یہ میرا ہاتھ عمار کے سامنے ہے، وہ اگر چاہیں تو مجھ سے اپنا قصاص لے سکتے ہیں۔) اس پر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ چوما۔ اور آپ سے راضی و خوش ہوگئے!

اور اس کی واضح و قوی دلیل یہ ہے کہ محاصرہ کے ایام میں جناب عمار رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل تھے جو بلوائیوں کو سمجھا بجھا کر، اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حقوق کو یاد دلا کر محاصرے سے روک رہے تھے۔ اور جسدن آپؓ کا پانی بند کیا گیا۔ تو عمار رضی اللہ عنہ باہر آئے اور بلند آواز سے فرمایا سبحان اللہ قَدِ اشْتَرٰی بِئْرَ رُوْمَةَ وَ تَمْنَعُوْنَهٗ مَاءَهَا۔ (سبحان اللہ جس نے بیر رومہ خریدا تم اس کا پانی بند کرتے ہو) پھر دوڑتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ آج بلوائیوں نے عثمان (رضی اللہ عنہ) کا پانی بند کر دیا ہے۔ میں نے سمجھایا مگر وہ مانتے نہیں کوئی ترکیب کرنی چاہیئے کہ ان تک پانی پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلوائیوں سے کہنا سننا بے کار ہے وہ تو مانیں گے نہیں، کوئی خفیہ تدبیر کرنی چاہیئے! آخر سعی و کوشش کرکے اونٹ کی ایک پکھال پانی بھر کر پہنچائی گئی۔

لہٰذا جناب عمار رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا تو اس مثل کا مصداق بنتا ہے کہ "مدعی و مدعیٰ علیہ راضی ہوگئے مگر منصف راضی نہیں ہوا"!

اور کعب بن عبدہ نہدی رضی اللہ عنہ کا قصہ پورا بیان نہیں کیا۔ آدھا حصہ چھوڑ دیا پورا قصہ یوں ہے۔ کہ

جب جناب کعب رضی اللہ عنہ کے پیٹنے کی اطلاع آپ کو ہوئی تو آپ نے جناب سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ کر خط لکھا اور کہا کعبؓ کو عزت و احترام کے ساتھ میرے پاس بھیجو! جب وہ آپ کے پاس پہنچے، تو آپ نے کعبؓ سے فرمایا تم نے مجھے بہت سخت خط لکھا۔ یہ مشورہ کا طریقہ ہے اور نہ بھائیوں کو نصیحت کرنے کا اصول۔ نصیحت تو بڑے نرم اور دل نشیں طریق پر کرنی چاہیئے! نہ کہ ڈانٹ ڈپٹ ہو، خصوصاً خلفا، امراء کے معاملہ میں تو رفق و نرمی ہی لازم ہے۔ فرعون باوجودیکہ سلسلہ شقی و بدبخت تھا مگر اس کے معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبر کو نرم روی کی تعلیم دی۔ فقولا لہ قولا لینا۔ (تم دونوں اس سے نرمی و رفق سے بات کرنا) میں نے تمہارے مارنے پیٹنے کا حکم نہیں دیا تھا، میرے حکم و اجازت کے بغیر تمہیں پیٹا گیا ہے۔ اس کے باوجود میں بدن سے قمیص اتارتا ہوں، یہ چابک موجود ہے تم اپنا بدلہ مجھ سے لے سکتے ہو! اس پر کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کے اس منصفانہ جذبات و خیالات کو دیکھتے ہوئے میں اپنے معاملہ سے درگذر کرتا ہوں، سخت الفاظ استعمال کرنے میں واقعی میں نے قصور کا ارتکاب کیا۔ اس کے بعد جناب کعب رضی اللہ عنہ آپ کے مصاحب خاص کی حیثیت سے آپ کے پاس رہے!

اب رہا اُشتر نخعی کا قصہ تو وہ اسی طرح صحیح جس طرح ان لوگوں نے بیان کیا ہے مگر وہ نہ صحابی تھا، نہ صحابی زادہ۔ وہ تو کوفہ کا ایک فتنہ پرور اور باغی تھا۔ اس نے حاکم وقت کا لحاظ نہیں کیا، خلیفہ کے عامل کی اہانت کی، اور دوسروں کو بھی ورغلایا۔ اگر ایسے شورہ پشتوں سے حاکم و حکومت چشم پوشی کریں تو ایک فساد برپا ہو سکتا ہے۔ اُشتر نخعی تو وہی ہے جس نے فتنہ کی بنیاد ڈالی، اور بالآخر اس کی بھڑکائی ہوئی شورش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جام شہادت پلایا مگر یہ اس کے بعد بھی فتنہ انگیزی سے باز نہ آیا حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو اسی نے قتل کی دھمکیاں دے کر مدینہ چھوڑنے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے دامن عافیت میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اور بالآخر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تک نوبت آئی۔ اشتر نخعی کی یہ ساری فتنہ سامانیاں اور یہ حرکتیں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بدنظمی کا موجب بنیں، یہ ہمیشہ جناب امیرؓ پر حکم چلاتا تھا۔ اس نے کبھی آپ کی ایسی اطاعت نہیں کی جیسی کسی خلیفہ و امام وقت کی کی جانی چاہیئے تھی! یہ باتیں نہ کوئی سربستہ راز ہیں نہ من گھڑت، تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور زبان زد خلائق ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو اس کے اور اس کے دوستوں کی فرمائش پر حضرت ابوموسیٰ اشعری کو والی کوفہ اور جناب حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کو داروغہ خراج بھی مقرر فرمایا مگر فتنہ پرداز سرشت نے نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ سازشوں میں لگا رہا۔ اہل مصر سے ساز باز کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بعض روایات میں تو یہ ہے کہ خود بھی قتل میں شریک تھا۔ قتل عثمانؓ کا واقعہ قیامت تک کے فتنہ کا سبب بنا، اور اس فتنہ کے دروازے کو کھولنے والوں میں ایک نام اُشتر نخعی کا بھی ہے! ایسا شخص تو قتل کر دیا جاتا تو مناسب تھا۔ کہ امت سے فساد کی جڑ کٹ جاتی، اخراج اور ڈانٹ ڈپٹ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مروت و رحم دلی تھی کہ اسی تک نوبت پہنچ کر رہ گئی!

اعتراض (۶) چھٹا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے قصاص نہیں لیا۔ حالانکہ انہوں نے ہرمزان بادشاہ اہواز جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہوگیا تھا قتل کر دیا تھا۔ اور اس پر تہمت یہ لگائی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھا۔ اور پھر یہ تہمت بھی پایۂ ثبوت کو نہ پہنچی اور آپؓ نے ابولولو کی ایک کم عمر لڑکی کو مار ڈالا۔ اور جفینہ نصرانی کو بھی اسی تہمت میں قتل کیا کہ وہ بھی قتل عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں شریک تھا۔

سب صحابہ جمع ہو کر آپؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص لیجئے! جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے دیت تو دیدی مگر قصاص نہیں لیا۔ حالانکہ قصاص کا حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے اور جو شخص کتاب اللہ کے حکم کا اجراء نہ کرے وہ امامت کے قابل نہیں ،،

جواب:- جمہور علماء کے مذہب کے مطابق ابولولو کی لڑکی کا قصاص نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ وہ مجوسیہ تھی۔ اور اسی وجہ سے جفینہ نصرانی کا قصاص بھی واجب نہیں ہوتا کیونکہ نصرانی تھا اور مسلمان و نصرانی (کافر) میں قصاص نہیں ہوتا اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد موجود ہے لایقتل مسلم بکافر۔ (مسلمان کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔)

اب رہی بات ہرمزان کی کہ وہ بظاہر مسلمان تھا پھر بھی اس کا قصاص نہ لینے کی اہل سنت نے وجوہ بیان فرمائی ہیں۔

اول:- ہرمزان اہواز کا بادشاہ تھا۔ اہل فارس کے سلطنتوں سے چونکہ ان کا ملک نکل چکا تھا جس کی وجہ سے ائمہ اسلام، اور عام مسلمانوں پر یہ خار کھائے ہوئے تھا جنگ سے کامیابی کی امید کھو کر مکاری اور فریب سے کام لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امان حاصل کی۔ اس کے فریب کا قصہ تو بڑا مشہور ہے، کہ جب وہ گرفتار ہو کر آیا تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ جب اسے خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو بڑی بے چینی کا اظہار کر کے پانی پلانے کی درخواست کی، جب پانی کا پیالہ اسے دیا گیا تو کہنے لگا کہ پانی پینے اور سیراب ہونے تک کی مجھے مہلت دی جائے تو پانی پی لوں ورنہ میں ادھر منہ پیالے سے لگاؤں اور اُدھر میری گردن مار دی جائے تو کیا فائدہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اطمینان رکھ جب تک تو پانی نہ پی لے تجھے امان ہے۔ کوئی تجھے نہ مارے گا۔ اس مکار نے تمام حضرات کے سامنے دو تین مرتبہ اس کا اقرار کرایا۔ اور پھر پانی زمین پر گرا دیا اور کہنے لگا، اب مجھے قتل کرو گے تو نقض امان لازم آئے گا۔ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس کی مکاری پر تعجب کے ساتھ فرمانے لگے کہ چالاک معلوم ہوتے ہو، بہتر ہے تم اسلام میں آجاؤ۔ اس نے کلمہ پڑھا۔ اور یوں مدینہ میں رہنے کی صورت نکال لی۔ عراق کا کچھ علاقہ بھی بطور جاگیر اسے مل گیا! یہاں رہ کر اسکو موقعہ ملا کہ وہ خلافت مآب رضی اللہ عنہ کے معمولات پر نظر رکھ سکے جب اس نے دیکھا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس نہ حشم و خدم ہے، نہ چوکی، پہرہ، تو اسے بہت افسوس ہوا کہ ایسے بے احتیاط رئیسوں سے پیچھا چھڑانا کون مشکل بات تھی، شاہان فارس ان حالات سے غافل ہی رہے اور ان کو قتل نہ کرا سکے، چنانچہ اس نے سازباز کی اور ابولولو کو خفیہ طور پر بلا کر اسے حکم دیا اور شہادت امیر المومنین کا سانحہ پیش آیا۔ جفینہ اور دوسرے کافروں کو بھی اس نے گانٹھ لیا تھا۔ وہ سب اکٹھے ہو کر اس کام کے لئے تنہائی میں تدبیریں کرتے اور منصوبے سوچتے رہتے تھے،

چنانچہ حضرت عبداللہ اور جناب عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم نے گواہ پیش کیے کہ ابولولو، اور جفینہ، اس کے پاس آتے جاتے اور قتل امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے متعلق مشورے کرتے ہیں۔ ہرمزان نے ہی آلہ قتل (دو دھاری) خنجر تیار کرایا تھا۔ اور کہتا تھا کہ وہ کون جوانمرد ہو گا جو اپنی قوم اور اپنے دین کی حمایت میں اس شخص سے بدلہ لے گا، جس نے نہ ہماری عزت ہی مٹی میں نہ ملائی دین و دولت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ چنانچہ اسکی انگیخت پر ابولولو نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دینے والا ہرمزان ہی تھا۔ تب صحابہ کرام کے مجمع میں یہ طے پایا کہ آلہ قتل لایا جائے اور جو صورت اس کی بیان کی گئی ہے اگر وہ اس کے مطابق نکلے تو شہادت پختہ اور ان تینوں کی شرکت قتل تسلیم کی جائے گی ورنہ نہیں۔ جب وہ خنجر پیش ہوا تو وہ ہو بہو وہی تھا جس کے متعلق گواہوں نے گواہی دی تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسلک کے مطابق (اور یہی امام شافعی، امام مالک اور دوسرے آئمہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے) قتل کا حکم دینے والا خود واجب القتل ہوتا ہے۔ اس لئے آپ نے قصاص نہیں لیا۔ یہ حکم تو عام لوگوں کے بارے میں ہے۔ لیکن خلفاء اور اماماں ریاست کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان کو قتل کرنے کا حکم دینے والا اگر بدلہ اور قصاص میں نہ بھی مارا جائے تب بھی از روئے سیاست اور تدبیر مملکت! اس کا قتل از

بس ضروری ہے۔

دوم۔ اگر اس کا قصاص حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لیا جاتا تو ایک بڑا ہنگامہ اور شورش برپا ہو جاتی۔ کیونکہ بنو تمیم، بنو عدی بنو امیہ اور بنو جمح سارے کے سارے قصاص میں قتل کئے جانے کے خلاف تھے، بلکہ بنو سہم تو خاص طور پر برہم اور آمادہ فساد تھے وہ تو کہتے تھے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عبد اللہ سے قصاص لیں گے تو ہم خانہ جنگی شروع کر دیں گے۔ چنانچہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ رئیس بنو سہم نے تو بھرے مجمع میں با آواز بلند کہدیا تھا کہ بھائیو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کل امیر المومنین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اور آج ان کا بیٹا مار اجائے اللہ کی قسم ایسا ہر گز نہ ہوگا۔

اور یہ بات صحیح ہے کہ فتنہ فرو کرنیکی خاطر قصاص موقوف کر دیا جائے اور ورثار مقتول کو در گذر یا دیت پر راضی کر لیا جائے تو درست ہے۔

اور پھر اس بارے میں کیا کہا جائے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کے خوف سے موقوف فرمایا تھا۔ وہاں تو یہ بھی ہوا کہ ورثار عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ دیت دلائی گئی اور نہ ہی ان کو راضی کیا گیا، یہاں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے ورثار کو اتنا مال و دولت دے کر راضی اور خوش کر دیا تھا کہ پھر وہ قصاص کا نام بھی زبان پر نہ لائے؛ اگر فتنہ کے خوف سے قصاص کی موقوفی کو وجہ اعتراض بنا لیا جائے گا تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف نواصب کے طعن کا جواب نہ بن پڑیگا؛ اس لئے صحیح جواب ہر دو اطراف یہی مناسب اور موزون ہے کہ فتنہ کے خوف سے قصاص موقوف کیا گیا۔ بلکہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کسی خلش کی گنجائش بھی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرمزان کے ورثار کو راضی کر لیا تھا۔

سوم۔ تیسری وجہ جیسا کہ بعض حنفیہ نے لکھا اور محمد بن جریر طبری اور دوسرے ائمہ مورخین نے اس کی تصریح کی ہے کہ ہرمزان کے سارے ورثار مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے، کچھ فارس میں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو طلب بھی فرمایا مگر غالباً وہ عذر کی وجہ سے نہیں آئے اور قصاص کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ سارے ورثار حاضر ہوں اور مطالبہ کریں۔ ایسی صورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا درست و جائز نہ تھا۔ لامحالہ ایسی صورت میں بجز دیت اور کوئی صورت نہ تھی وہ بھی بیت المال سے دی جاسکتی تھی قاتل کے مال سے نہیں، کیونکہ کتب حنفیہ میں اس کی بھی تصریح ہے۔ کہ امام عادل کے قتل میں جس نے کسی نوع کی مدد کی ہو گو وہ اس میں بالذات شریک نہ ہوا ہو وہ واجب القتل ہے۔

اور یہ بات کہ اس کے سارے ورثار مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے صرف اہل سنت کی ہی کتابوں سے نہیں معلوم ہوتی، شریف مرتضیٰ اور دوسرے امامیہ کے ہاں بھی اس کا مذکور ہے؛ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس موقعہ پر بعض شیعوں نے کچھ اور اعتراض بھی کئے تھے جن کا ذکر نصیر الدین طوسی نے اپنی کتاب تجرید میں کیا ہے۔ مگر شیعی مورخین نے ان کو اپنی تاریخوں سے حذف کر دیا ہے۔ اسی لئے ہم نے بھی ان کو مستقل طور پر ذکر نہیں کیا۔ اسی اعتراض کے ضمن میں اجمالی طور پر کچھ بیان کئے دیتے ہیں۔ ان اعتراضوں میں سے ایک اعتراض تو یہ ہے کہ جناب ولید بن عقبہ نے شراب پی۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پر شراب کی حد جاری نہیں کی؛ لیکن یہ روایت ہی غلط ہے۔ یہی بات صاحب استیعاب نے کہی ہے اور طبری کہتے ہیں۔

اَنَّهُ تَعَصَّبَ عَلَيْهِ قَوْمٌ مِنْ اَهْلِ الْكُوْفَةِ بَغْيًا وَّحَسَدًا وَّ شَهِدُوْا عَلَيْهِ زُوْرًا اَنَّهُ تَقَيَّأَ الْخَمْرَ۔

اہل کوفہ نے ان سے تعصب برتا اور بغض و حسد کی بنا پر یہ جھوٹی گواہی دی کہ انہوں نے شراب کی قے کی۔

پھر یہ پورا قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا۔

يَا اَخِيْ اِصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْجُرُكَ وَيُبَوِّءُ الْقَوْمَ بِاِثْمِكَ

میرے بھائی تم صبر کرو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا بدلہ عنایت فرمائے گا۔ اور وہ لوگ تیرے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے۔

اس کے آگے اصل صورت حال بیان کی ہے۔

وَهٰذَا الْخَبَرُ مِنْ اَهْلِ الْاَخْبَارِ لَا يَصِحُّ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ وَلَا عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ لَهٗ اَصْلٌ۔ وَالصَّحِيْحُ عِنْدَهُمْ مَا رَوَاهُ عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ الْمُخْتَارِ وَسَعِيْدُ بْنُ اَبِيْ عَرُوْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الدَّانَاجِ عَنْ حُصَيْنِ بْنِ الْمُنْذِرِ اَبِيْ سَاسَانَ اَنَّهٗ رَكِبَ اِلٰى عُثْمَانَ فَاَخْبَرَهٗ بِقِصَّةِ الْوَلِيْدِ وَقَدِمَ عَلٰى عُثْمَانَ رَجُلَانِ فَشَهِدَا عَلَيْهِ بِشُرْبِ الْخَمْرِ وَاَنَّهٗ صَلَّى الْغَدَاةَ بِالْكُوْفَةِ اَرْبَعًا ثُمَّ قَالَ اَزِيْدُكُمْ فَقَالَ اَحَدُهُمَا رَاَيْتُهٗ يَشْرَبُهَا وَقَالَ الْاٰخَرُ رَاَيْتُهٗ يَتَقَيَّاُهَا فَقَالَ عُثْمَانُ لَمْ يَتَقَيَّاْهَا حَتّٰى شَرِبَهَا فَقَالَ لِعَلِيٍّ اَقِمْ عَلَيْهِ الْحَدَّ فَقَالَ عَلِيٌّ لِابْنِ اَخِيْهِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَعْفَرٍ اَقِمْ عَلَيْهِ الْحَدَّ فَاَخَذَ السَّوْطَ فَجَلَدَهٗ وَعُثْمَانُ يَعُدُّهٗ حَتّٰى بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ فَقَالَ عَلِيٌّ اَمْسِكْ جَلَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعِيْنَ وَجَلَدَ اَبُوْبَكْرٍ اَرْبَعِيْنَ وَجَلَدَ عُمَرُ ثَمَانِيْنَ وَكُلٌّ ذٰلِكَ سُنَّةٌ

اہل حدیث کے نزدیک، اہل خبر کی یہ روایت صحیح نہیں۔ اور نہ اہل علم کے نزدیک اس کی کوئی اصل و بنیاد ہے۔ ان کے نزدیک وہ روایت صحیح ہے جس کو عبدالعزیز بن مختار اور سعید بن ابی عروبہ نے عبداللہ الداناج سے روایت کیا ہے، اور اس نے حصین بن منذر ابی ساسان سے کہ وہ سوار ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ولید کے قصہ کی خبر دی۔ پھر دو آدمی بطور گواہ آئے اور انہوں نے اس کے شراب پینے کی گواہی دی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس نے فجر کی چار رکعت پڑھائیں۔ اور کہا یہ دو کی زیادتی میری طرف سے تمہارے لئے ہے! ایک گواہ نے تو کہا میں نے اسے شراب پیتے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں نے اسے شراب قے کرتے دیکھا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے شراب پی تب ہی تو شراب کی قے کی۔ اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس پر حد جاری کر دیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ان کے کوڑے لگاؤ۔ انہوں نے کوڑے مارنے شروع کئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انکی گنتی شروع کر دی۔ جب چالیس کوڑے لگ چکے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بس اب رک جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چالیس چالیس کوڑے لگوائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی۔ مگر یہ سب سنت ہیں،،

ایک اور روایت دیکھئے۔

وَرَوَى ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ اَبِيْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ الْبَاقِرِ قَالَ جَلَدَ عَلِيٌّ الْوَلِيْدَ بْنَ عُقْبَةَ فِي الْخَمْرِ اَرْبَعِيْنَ جَلْدَةً بِسَوْطٍ لَهٗ طَرَفَانِ

ابن عیینہ نے بحوالہ عمرو بن دینار جناب ابی جعفر محمد بن علی باقر سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد میں ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے لگوائے۔ کوڑا دو شاخہ تھا۔

اب آپ غور فرمائیں کہ ان کا اعتراض کہاں تک مبنی بر صداقت تھا۔

اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنگ احد میں ثابت قدم نہ رہے بلکہ بھاگ اٹھے اور بیعت رضوان اور بدر میں آپ شریک نہ ہوئے! اب جہاں تک احد سے بھاگنے کا معاملہ ہے تو تیس صحابہ کرام کے سوا سارے ہی تتر بتر ہو گئے تھے۔ تو اعتراض صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ اور پھر اس معاملہ کو جب اللہ تعالیٰ نے معاف فرما کر رفت گذشت کر دیا۔ اور قرآن میں اس معافی کی آیت نازل فرما دی۔ تو اب تو کسی پر بھی اعتراض کی گنجائش نہ رہی۔

ترجمہ آیت۔ دو جماعتوں کے ملنے والے دن جو لوگ تم سے منہ پھیر گئے تو درحقیقت ان کی بعض لغزشوں کے سبب شیطان نے ان کے

قدم ڈگمگا دیئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف فرما دی کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے"

اور بالفرض اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہ بھی بھاگتے تو شیعہ پھر بھی ان کو کہاں بخشتے۔ دیکھ لو اس دن ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سرفہرست رہے مگر شیعوں کے طعن سے ان کے سینے بھی فگار ہیں۔ ثابت قدم رہنے والوں میں تیرہ مہاجر اور باقی انصار تھے، مگر ان میں سے اکثر حضرات شیعہ ناوک افگنی کا شکار ہیں!

مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، جناب طلحہ، جناب عبدالرحمن بن عوف اور جناب سعد بن ابی وقاص، رضی اللہ عنہ اجمعین۔ سارے کے سارے شیعہ دشمنی کا شکار رہیں۔ یہی حال انصار رضوان اللہ علیہم کا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک ایسے موقعہ پر بھاگنا زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ کے تحت آتا ہے جس سے لیاقت وقابلیت امامت متاثر نہیں ہوتی۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل جانے کے بعد وہ گناہ بھی مٹ گیا! تعصب سے خالی الذہن شخص کتب تاریخ وسیر کا مطالعہ کرے تو وہ ان بھاگنے والے حضرات کو معذور سمجھے گا۔ کیونکہ سردار لشکر کی قتل کی افواہ کے بعد لشکر کا اپنی جگہ ڈٹے ہی رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر یہ حضرات بھاگے ہی کہاں، لشکر گاہ میں ہی تتر بتر تھے۔ کہ صورت حال کا صحیح علم ہوتے ہی سارے سمٹ آئے!

اب رہا بدر میں عدم شرکت کا واقعہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال اور تیمارداری کے لئے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ مدینہ میں رُکے رہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے بچوں اور اہل خانہ کی نگہداشت کیلئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے! اور اس صورت حال کی وجہ سے تو عدم حاضری حاضری سے بہتر شمار ہوتی ہے! یہ نادان خوب کو ناخوب سمجھ رہے ہیں! یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عثمان کو وہی اجر ملیگا جو بدر میں شریک دوسرے حضرات کو! اور غنیمت میں بھی ایک آدمی کے برابر ان کا حصہ ہے!

رہی بیعت رضوان! کہ وہ تو ہوئی ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ تو بذات خود اس بیعت کی غایت اور سبب تھے! جب سوال آ درپیش ہوا کہ کافروں سے جاکر کون سوال وجواب کرے تو کسی نے اس کی حامی نہ بھری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدمت پیغامبری اور سفارت کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا آپ تشریف لے گئے، تو یہ افواہ اڑ گئی کہ دشمنوں نے ان کو قتل کر دیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے! تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بیعت سرت لی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لئے لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ مگر منہ نہ موڑیں گے۔ مگر بعد میں جب معلوم ہوا خبر جھوٹی تھی اور آپ زندہ ہیں تو لشکر میں تسلی واطمینان پیدا ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جو بیعت ان کی موت کی خبر کی بنا پر ہو رہی ہے وہ اس میں کس طرح شریک ہو سکتے تھے۔ وہ موجود ہوتے تو بیعت رضوان، ہی کہاں ہوتی۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ اس موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرما رہے ہیں کہ یہ ہاتھ عثمان کا ہے۔ یا بعض روایات کے مطابق، یہ ہاتھ عثمان کے لئے ہے، یعنی اس کے ذریعہ عثمان بھی شریک بیعت شمار ہوں گے تو جس جگہ ایسا ذی حشم اور مولائے کائنات نائب موجود ہو تو وہاں ان کی عدم حاضری کا کیا نقصان اور ضرر ہے۔

غرض ان اعتراضات کے بودے پن کا احساس کر کے ہی اکثر علمائے امامیہ نے ان کو اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہے!

اعتراض۔ (۷) ساتواں اعتراض یہ ہے کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا۔ اس لئے کہ ۱۰ر تا ۱۴ر ذی الحجہ منیٰ میں آپ نے پوری نماز ادا فرمائی قصر نہیں کیا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں عموماً اور اس جگہ خاص طور پر قصر فرماتے تھے! اسی بنا پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپ کے طرز عمل پر اعتراض بھی کیا!

جواب:۔ تعصب ملاحظہ ہو کر بات میں زور پیدا کرنے کیلئے صحابہ کرام کے اعتراض کا تو ذکر کیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جواب

کوگول کر گئے ۔) جن حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے یہ اعتراض کیا تھا وہ حقیقت حال سے واقف نہیں تھے ۔ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اب میں نے مکہ میں بھی ایک شادی کرکے یہاں بھی اپنا گھر بنالیا ہے ! اب میں یہاں آکر مسافر نہیں رہتا اس لئے قصر بھی نہیں کرتا ۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ پر اعتراض نہیں کیا ۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا یہ جواب امام احمد، طحاوی ، ابوبکر بن ابی شیبہ اور ابن عبدالبر نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں ۔

أَنَّ عُثْمَانَ صَلَّى بِالنَّاسِ بِمِنًى أَرْبَعًا فَأَنْكَرَ النَّاسُ عَلَيْهِ فَقَالَ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي تَأَهَّلْتُ بِمَكَّةَ مُنْذُ قَدِمْتُ وَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ تَأَهَّلَ بِبَلَدٍ فَلْيُصَلِّ صَلٰوةَ الْمُقِيمِ فِيهَا أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي ذُبَابٍ عَنْ أَبِيهِ وَغَيْرُهُمَا عَنْ غَيْرِهِ ۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو منیٰ میں نماز پڑھائی تو چار رکعت پڑھائی ، جس پر لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا تو جواباً آپ نے فرمایا کہ لوگو جب سے میں آیا ہوں تب سے مکہ مکرمہ میں خانہ داری کرلی ہے ۔ (شادی کرکے یہاں گھر لے لیا ہے ۔) اور یہ بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے ۔ کہ جو کوئی کسی شہر میں خانہ دار ہوجائے تو وہ اس شہر میں مقیم کی طرح نماز پڑھے ۔

اس کے بعد تو کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہی ۔ ایسی صورت میں تمام مذاہب کے علماء کے نزدیک قصر درست نہیں ۔

اعتراض ۔ (۸) یہ ہے کہ آپ نے حوالی مدینہ منورہ کی چراہ گاہ بقیع نامی کو قرق کرکے لوگوں کو اس چراہ گاہ سے روک دیا ۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا رقبہ دوگنا کرکے رمنہ میں داخل کردیا ۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِيْ ثَلَاثٍ اَلْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ ۔ تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں پانی ۔ گھاس ۔ (چارہ) اور آگ ۔

نیز مدینہ کے بازار کو قرق کیا ، تاکہ ان کا گماشتہ جب تک کھجور کی گٹھلیوں کی خرید فروخت سے فارغ نہ ہوجائے کوئی اور گٹھلیاں نہ خریدے ۔

اور دریا کی کشتیوں کو قرق کیا تاکہ ان کے مال تجارت کے علاوہ کوئی اور مال نہ لیجائیں

جواب :۔ چراہ گاہ کا قصہ صحیح ہے ، اور اس کی وجہ آپ نے خود صحابہ کرام کے روبرو بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ لَاحِمَى اِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ ۔ (چراہ گاہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہے) اور میں نے اس کو صدقہ اور بیت المال کے اونٹوں اور جہاد کے گھوڑوں کے لئے چراہ گاہ بنایا ہے اور چراہ گاہ کو رمنہ ٹھہرایا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے گھوڑوں اور صدقہ کے اونٹوں کے لئے خود چراہ گاہ بنائی ہے ۔ اس پر صحابہ کرام نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہت مختصر سی چراہ گاہ بنائی تھی مگر آپ نے تو اس سے کئی گنا بڑی بنائی ۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت کے بیت المال اور اس وقت کے بیت المال میں موازنہ کرلو اور اسی تناسب سے چراہ گاہ میں زیادتی سمجھ لو آپ کے اس جواب کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تسلیم کرلیا اور خاموش ہو رہے !

بازار قرق کرنے والی بات سراسر غلط ہے ! اتنی بات ضرور ہوئی کہ حارث بن حکم جو بازار کا داروغہ بنا تھا اس نے اپنی طرف سے کچھ ایسی پابندی عائد کی تھی ، اور یہ بات دو تین روز ہی چلی ۔ جب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا ۔ داروغہ کو موقوف فرمادیا ۔

رہا کشتیوں کا معاملہ ! تو وہ ان کی ذاتی ملکیت کی کشتیاں تھیں ، پہلے جب اور لوگوں کی اپنی کشتیاں نہیں تھیں تو وہ اپنا مال واسباب بمع گماشتوں کے آپ کی ہی کشتیوں میں لایا کرتے تھے ۔ جب اور لوگوں نے بھی کشتیاں بنالیں تو آپ نے اپنی کشتیوں پر بار برداری کی ممانعت فرمادی کہ دوسروں کا مال بار نہ کریں یہ نہیں کیا (جیسا کہ اعتراض سے تاثر ملتا ہے ۔) کہ سب ہی کی کشتیوں کو قرق و پابند کردیا ہو ۔ پہلے اجازت دینا ان کا احسان تھا ۔ اب اگر آپ یہ احسان نہیں کر رہے تھے تو اس میں ملامت وطعن کی کیا بات ہے !

اعتراض ۔ (۹) نواں اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو بہت سی جاگیریں ، اور اراضی قطعات عنایت فرمائے ۔ جو

بیت المال کی ارضیات میں سے تھے۔ اسطرح آپ نے گویا مسلمانوں کا حق تلف کیا۔

جواب:۔ آپ نے اپنے رفیقوں، یا مصاحبوں کو ارضی قطعات دیئے وہ تمام اس مقصد کے لئے تھے کہ افتادہ اور غیر آباد زمین کو وہ آباد کریں۔ کاشت شدہ زمین آپ نے کسی کو مرحمت نہیں فرمائی۔ اس کی ساری تفصیلات کتب تاریخ میں محفوظ ہیں۔ افتادہ اور بنجر زمین اگر آباد ہوجائے تو اس میں تو ملک اور قوم کی بھلائی ہے۔ ملک آباد ہوتا ہے۔ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور خلق خدا کے رزق میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ بھلا اس میں اچھائی کا کون سا پہلو ہے کہ ہزاروں ایکڑ زمین ناکارہ پڑی رہے۔ نہ ملک کے کام آئے نہ مخلوق خدا کے۔ بلکہ چوروں، ڈاکوؤں کی پناہ گاہ کے کام آئے! ملک آباد ہو، زمین کا چپہ چپہ پر کاشت ہونے لگے۔ تو ایک طرف خلق خدا کو آسودگی میسر آتی ہے دوسری طرف رہزنوں اور فسادیوں کے ٹھکانے بھی ختم ہوجاتے ہیں، یہ تو قابل تعریف کارنامہ تھا۔ جو بغض و عناد رکھنے والوں نے طعن میں بدل ڈالا۔

اس کے علاوہ اہل سیر نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں یمن کے بہت سے شریف خانہ بدوش آپ کے پاس آئے، اور کہنے لگے ہم نے جہاد کی خاطر اپنا گھر بار اور زمینیں چھوڑی ہیں، آپ ہمیں جہاد کے علاقوں کے قرب وجوار میں زمینیں عنایت فرمائیں تاکہ دشمنان اسلام کے ساتھ جہاد میں دور دراز کی مسافت سے بھی بچیں، اور باری باری اس میں حصہ لے سکیں، اس وقت فارس کا علاقہ اس علاقہ کے زمیندار بہت سرکش تھے ان لوگوں کو آپ نے وہیں آباد کیا اور انہیں حدود میں ان کو ان کی متروکہ زمین کے بدلے قطعات ارضی بھی عنایت فرمائے۔ اور بعض صحابہ کی زمین بطور تبادلہ بھی ان کو دی۔ مثلاً جناب طلحہ رضی اللہ عنہ سے ان کی حضر موت والی زمین اُن کو دلوادی، اور ان کی حضرت طلحہؓ کو! اور جناب اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے کندہ کی زمین لے کر، انکو دوسری جگہ اس کے بدلہ دیدی! اور یہ سب کچھ باہمی رضامندی سے ہوا!! اس میں طعن واعتراض کہاں سے نکل آیا۔

اعتراض۔ (۱۰)، شیعہ کہتے ہیں سارے ہی صحابہ ان کے قتل پر خوش تھے، ان کی ہجو اور مذمت کرتے تھے، تین دن ان کا لاشہ یوں ہی ڈالے رکھا اور دفن کی کوشش نہ کی!

جواب:۔ دروغ گویم برروئے تو، قسم کا اعتراض شیعوں کے سوا اور کوئی کر بھی نہیں سکتا صریح جھوٹ اور بہتان انہیں کا حصہ ہے! اگر "سارے" ہی صحابہ ان سے ناخوش تھے تو ان کے قصاص کیلئے لڑنے والے یہ طلحہ و زبیر عائشہ، معاویہ، اور عمرو بن عاص وغیرہم، رضی اللہ عنہم اجمعین کون تھے! اور یہ کس عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے لڑ رہے تھے کیا انہوں نے کسی اور خیالی وہمی عثمان کے لئے یہ ساری تگ ودو کی تھی۔ سنیوں اور شیعوں دونوں کی تاریخیں موجود ہیں۔ بلوہ مٹانے کی سارے صحابہ نے کوشش کی۔ جب بلوائیوں نے ان کی کوئی بات نہ سنی تو انہیں حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ آپ نے لڑائی کی اجازت نہ دی، بڑی شدت سے ان کو روکا۔ آپ کے منع کرنے پر وہ حضرات خاموش تو ہوگئے مگر آپ کی پانی، اور دیگر تکالیف کے ازالہ میں آخر دم تک کوشاں رہے، اور تدبیر وحیلہ سے کام لیتے رہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصار کی جمعیت کے ساتھ آپ کے پاس آئے نوجوانان انصار نے ان سے کہا ان شئت کنا انصار اللہ مرتین۔ (آپ اجازت دیں تو ہم دوبارہ بھی انصار اللہ کا کردار ادا کریں)

اُدھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تمام مہاجرین کو لے کر آپ کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ آپ پر چڑھ دوڑنے والے یہ لوگ ہماری تلواروں کے زخم خوردہ ہیں، اس سے ڈر کر مسلمان ہوئے ہیں۔ اب بھی ڈر سے ہی ان کے ہوش خطا ہیں۔ یہ ساری ہاؤ وہو، اور لن ترانیاں صرف اسی لئے ہیں کہ وہ بظاہر کلمہ گو ہیں۔ اور آپ کلمہ کی عزت و حرمت کا پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ آپ حکم دیں ابھی ذرا دیر میں ان کو وہ بات یاد دلا دیں جو ان کے حافظہ سے محو ہوگئی ہے: اور ان کو ان کی حقیقت سے آگاہ کردیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صبر، حلم ومروت

ملاحظہ ہو کہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کہو میری جان کی خاطر اسلام میں رخنہ پیدا نہ کرو
اس کے باوجود حضرات حسنین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، ابوہریرہ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ، اور دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں موجود رہے اور جب بھی بلوائی ہلہ بولتے تو یہ حضرات مدافعت کرتے، اور ان کو دھکیل دیتے۔
ان کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی غلاموں کی اچھی خاصی نفری موجود، اگر آپ ذرا بھی اشارہ فرمادیتے، تو بلوائیوں کو اپنی حقیقت معلوم ہوجاتی۔ یہ حضرات نہتے بھی نہیں تھے ہتھیاروں سے مسلح اور پوری طرح تیار ہوکر آپ کے پاس آئے، وہ بلوائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کو سخت بے چین اور بے قرار تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم وہی تو ہیں جنکی تلوار کی تاب خراسان سے لے کر افریقہ تک کوئی نہ لاسکا۔ صرف آپ اجازت دیدیں پھر دیکھئے ہم ان کا کیا حشر کرتے، اور تماشا بناتے ہیں۔ یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ یہ سمجھ گئے کہ کلمہ کی حرمت کے سبب کوئی ہمیں نہیں چھیڑتا۔ اسی لئے دیدہ دلیر ہوگئے ہیں، اور سمجھانے بجھانے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ نہ آپ کی بات سنتے ہیں نہ صحابہ کرام کے کہنے پر کان دھرتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہی فرماتے رہے کہ میری رضامندی چاہتے اور میرے احسان وسلوک کا حق ادا کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار رکھدو۔ اور اپنے اپنے گھر جاؤ، اور سنو، جو اپنے ہتھیار رکھدے۔ وہ میری غلامی سے آزاد ہے۔

وَاللهِ لَاَنْ اُقْتَلَ قَبْلَ الدِّمَاءِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اُقْتَلَ بَعْدَ الدِّمَاءِ۔

خدا کی قسم مجھے یہ بات زیادہ محبوب ہے کہ میں خونریزی کرائے بغیر قتل کر دیا جاؤں بجائے اس کے خونریزی کراؤں اور پھر قتل ہوجاؤں۔

مطلب یہ تھا کہ میرا قتل مقدر ہوچکا ہے۔ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آگاہ فرماچکے ہیں اگر تم لڑے بھی تب بھی میری شہادت نہیں ٹلے گی۔ تو اس خونریزی کا کیا حاصل جس سے مقصود ومدعا بھی حاصل نہ ہو۔
یہ بات فریقین کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں، اولاد ابوجعفرؓ اور اپنے مصاحب خاص قنبرؓ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر متعین فرمادیا تھا۔ نیز حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے لڑکوں کو حفاظت کے لئے متعین کیا ہوا تھا کہ بوقت ضرورت بلوائیوں کا مقابلہ کریں، چنانچہ جب بھی بلوائی ہلہ بولتے تھے تو یہ حضرات پتھروں اور ڈنڈوں سے مار مار کر انہیں بھگا دیتے تھے اسی مدافعتی لڑائی میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چوٹ کھائی محمد بن طلحہ۔ اور قنبر کے سر پھوٹے، مگر دروازہ سے بلوائیوں کو داخل نہ ہونے دیا برابر کے کسی انصاری کے گھر میں نقب لگا کر اندر گھسے اور آپ کو شہید کرڈالا۔
شیعوں کی صحیح ترین کتاب اس واقعہ کی گواہ ہے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں واللہ لقد دفعت (اللہ کی قسم میں نے خود ان کا دفاع کیا ہے) آپ جب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لاتے، بلوائیوں کو کوڑے مار کر دور ہٹاتے، انہیں برا بھلا کہتے۔
کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ اس تمام بات چیت اور معاملہ کو نفاق کہے اور ظاہر وباطن کے اختلاف پر محمول کرے۔ خود جو منافق ہو وہی ایسی بات منہ سے نکال سکتا ہے۔ اور ایسے پاک دل بزرگ کے دامن کو اپنے ناپاک خیال سے آلودہ کرسکتا ہے۔
اور اگر اسوقت نفاق (تقیہ) کی گنجائش تم کہتے ہو تو کوفہ میں (جبکہ آپ خلیفہ وامام تھے)، جو خطبہ مرحمت فرمایا اس میں کیوں قسم کھائی۔ کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو دفع کیا ہے اور آپ کی شہادت کے بعد ببانگ دہل یہ کیوں فرمایا۔

اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ عُثْمَانَ كَمَثَلِ اَثْوَارٍ ثَلٰثَةٍ كُنَّ فِیْ اَجَمَةٍ اَبْیَضَ وَاَسْوَدَ وَاَحْمَرَ وَمَعَهُنَّ فِیْهَا اَسَدٌ فَكَانَ لَا یَقْدِرُ مِنْهُنَّ عَلٰی شَیْءٍ لِاِجْتِمَاعِهِنَّ عَلَیْهِ فَقَالَ لِلثَّوْرِ الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ لَایُدِلُّ عَلَیْنَا فِیْ اَجَمَتِنَا هٰذِهٖ

میری اور عثمان کی مثال ان تین بیلوں کی سی ہے جو ایک جنگل میں تھے ایک کالا، دوسرا سفید اور تیسرا سرخ تھا۔ اس جنگل میں ایک شیر بھی تھا مگر تینوں کے اتفاق واتحاد کے سبب ان کا شکار نہیں کرسکتا تھا۔ اسنے (چال چلی اور) کالے اور سرخ بیل سے کہا کہ اس جنگل میں ہمارے موجود ہوتے

اِلَّا الثَّوْرُ الْاَبْيَضُ فَاِنَّ لَوْنَهٗ مَشْهُوْرٌ وَلَوْنِيْ عَلٰى لَوْنِكُمَا فَلَوْ تَرَكْتُمَانِيْ اَكَلْتُهٗ وَصَفَتْ لَكُمُ الْاَجَمَةُ فَقَالَ دُوْنَكَ فَكُلْهُ فَاَكَلَهٗ فَلَمَّا مَضَتْ اَيَّامٌ قَالَ لِلْاَحْمَرِ لَوْنِيْ عَلٰى لَوْنِكَ فَاتْرُكْنِيْ اٰكُلِ الْاَسْوَدَ فَقَالَ دُوْنَكَ فَكُلْهُ فَاَكَلَهٗ ثُمَّ قَالَ لِلْاَحْمَرِ الْاٰنَ اٰكُلُكَ فَقَالَ دَعْنِيْ اُنَادِيْ ثَلَاثًا فَقَالَ افْعَلْ فَنَادٰى ثَلَاثًا اَلَا اِنِّيْ اُكِلْتُ يَوْمَ اُكِلَ الْاَبْيَضُ ثُمَّ رَفَعَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ صَوْتَهٗ فَقَالَ اَلَا اِنِّيْ هُنِئْتُ يَوْمَ قُتِلَ عُثْمَانُ۔

کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی، اس لئے تمہارا اور میرا رنگ تو ایک سا ہے۔ البتہ یہ سفید بیل جس کا اجلا رنگ ہر ایک کو نظر آجاتا ہے، (یہ ہم سب کو مروا ڈالے گا)، اگر تم کچھ نہ کہو تو میں اس کو کھا جاؤں۔ پھر تم دونوں کے لئے جنگل میں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ دونوں نے کہا ٹھیک ہے اسے کھا جاؤ۔ چند دن گذرے تھے کہ سرخ بیل کے پاس آیا اور کہنے لگا ہم تم تو ہم رنگ ہیں یہ کالا ہم میں نہیں ملتا۔ اسے بھی کھا جاؤں؟ سرخ بیل نے کہا کھا جاؤ۔ شیر اسے بھی چٹ کر گیا۔ اب سرخ سے کہا اب تمہاری باری ہے۔ اس نے کہا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں تین دفعہ آواز لگاؤں۔ شیر نے کہا ٹھیک ہے، لگاؤ آوازیں! بیل نے کہا سنو! میں تو اسی دن کھا لیا گیا تھا جب سفید بیل کھا لیا گیا تھا۔ پھر امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے باآواز بلند فرمایا۔ سنو! میں اسی دن سبک (بے قدر) ہو گیا تھا جس دن عثمان قتل کئے گئے۔"

اور یہ قصہ شہرت و تواتر میں اس حد تک پہنچا ہے کہ فریقین کی کتابوں میں محفوظ و مذکور ہے۔ اس کا اب کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

جناب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہر روز صبح بلوائیوں کے پاس جاتے اور کہتے ان کو قتل نہ کر دینا کہ ان کے قتل کے نتیجہ میں فتنے اور فساد برپا ہوں گے۔ اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو منافقین کے متعلق پورا علم رکھتے تھے، اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس علم کی گواہی بھی دی ہے۔ وہ ہمیشہ ڈرایا کرتے تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کرنا کہ یہ امر فتنہ و فساد کا سبب بنجائیگا۔

اور آپ کا دفن نہ ہونا۔ تو اس کا سبب بلوائیوں کا ہلڑ، اور فساد تھا۔ اور اقرتری جوان اوباشوں نے صحابہ کرام کو ڈرا دھمکا کر پھیلا دی تھی اس کا باعث بنی، رات کو جب بلوائی نیند میں مدہوش تھے تو حضرات زبیر بن عوام، حکیم بن حزام، مسورہ بن مخرمہ، جبیر بن مطعم، ابوجہم بن حذیفہ بدری، یسار بن مکرم اور آپ کے لڑکے عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہ نے شہیدوں کی طرح خون آلود کپڑوں میں نماز جنازہ ادا کر کے آپ کو دفن کیا جناب جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے نماز کی امامت کی! تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت بھی شریک تھی، جن میں حسن بصری، امام مالک کے دادا مالک رحمہم اللہ بھی تھے! آدمیوں کے علاوہ آپ کے جنازہ میں فرشتے بھی شریک تھے، چنانچہ حافظ دمشقی نے مرفوعاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک روایت کئے ہیں۔

یوم یموت عثمان یصلی علیہ ملائکۃ السماء جس دن عثمان وفات پائیں گے آسمان کے فرشتے ان پر نماز جنازہ پڑھیں گے!

اس روایت کی تائید ابن ضحاک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو بطریق سہم بن خنیس مروی ہے۔ یہ شہادت کے واقعہ میں موجود تھا۔ وہ کہتا ہے۔

فَلَمَّا اَمْسَيْنَا قُلْتُ لَئِنْ تَرَكْتُمْ صَاحِبَكُمْ حَتّٰى يُصْبِحَ مَثَّلُوْا بِهٖ فَانْطَلَقْنَا بِهٖ اِلٰى بَقِيْعِ الْغَرْقَدِ فَاَمْكَنَّا لَهٗ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ حَمَلْنَاهُ فَغَشِيَنَا سَوَادٌ مِنْ خَلْفِنَا فَهِبْنَاهُمْ حَتّٰى كِدْنَا نَتَفَرَّقُ فَاِذَا مُنَادٍ يُنَادِيْ لَا رَوْعَ عَلَيْكُمْ اُثْبُتُوْا فَاِنَّا جِئْنَا لِنَشْهَدَهٗ وَكَانَ ابْنُ خُنَيْسٍ يَقُوْلُ هُمُ الْمَلَائِكَةُ۔

جب شام ہوئی تو میں نے لوگوں سے کہا اگر تم نے اپنے سردار کو صبح تک اسی حال میں رہنے دیا تو یہ بلوائی ان کے ناک کان کاٹ کر مثلہ کر دیں گے ہمیں آدھی رات کے وقت ان کی لاش اٹھانے کا موقعہ ملا تو ہم ان کو لے کر بقیع کی طرف چلے تو اچانک ایک جماعت نے ہمیں پیچھے سے آگھیرا جس سے ہم ڈر گئے اور ہم ڈر کی وجہ سے بھاگنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کسی نے پکار کر کہا۔ ڈرو مت، حوصلہ رکھو ہم بھی جنازہ میں شرکت کیلئے آئے ہیں۔ ابن خنیس

کہتے تھے کہ وہ فرشتے تھے۔

اور یہ جو کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم آپ کے ہجو اور برائی کیا کرتے تھے تو ان کی من گھڑت، اور افترا محض ہے۔ اس سلسلہ میں اہل بیت کی ایک روایت ملاحظہ ہو۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَنَامِ عَلٰى بِرْذَوْنٍ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ مِّنْ نُّوْرٍ تَعَمَّمَ بِهَا وَبِيَدِهٖ قَضِيْبٌ مِّنَ الْفِرْدَوْسِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اِلٰى رُؤْيَاكَ بِالْاَشْوَاقِ وَاَرَاكَ مُبَادِرًا فَالْتَفَتَ اِلَيَّ وَتَبَسَّمَ وَقَالَ اِنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ اَضْحٰى عِنْدَنَا فِي الْجَنَّةِ مَلِكًا عَرُوْسًا وَقَدْ دُعِيْنَا اِلٰى وَلِيْمَتِهٖ فَاَنَا مُبَادِرٌ لِذٰلِكَ۔

جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہیں نورانی عمامہ زیب سر ہے، اور جنت کے کسی درخت کی چھڑی دست مبارک میں ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں، (مگر معلوم ہوتا ہے کہ) آپ کو کہیں تشریف لے جانے کی عجلت ہے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف توجہ فرمائی اور مسکراتے ہوئے فرمایا، کہ عثمان بن عفان ابھی صبح ہمارے پاس جنت میں آئے ہیں اور اس طرح آئے ہیں جیسے شاہی دولہا، اور ہمیں ان کی دعوت ولیمہ میں بلایا گیا ہے اسی لئے میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

یہ روایت حسین بن عبد اللہ البنار الفقیہ نے بیان کی ہے۔

اور ابو شجاع دیلمی جو مشہور محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور جن کو شیعہ بھی معتبر مانتے ہیں اپنی کتاب منتقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی خواب اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا خواب بھی صحیح روایت کے ساتھ مشہور ہے۔ جیسے دیلمی مذکور نے بھی منتقی میں روایت کیا ہے۔

عَنْ حَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ مَا كُنْتُ لِاُقَاتِلَ بَعْدَ رُؤْيَا رَاَيْتُهَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلَى الْعَرْشِ وَرَاَيْتُ اَبَا بَكْرٍ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى مَنْكِبِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَاَيْتُ عُمَرَ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى مَنْكِبِ اَبِيْ بَكْرٍ وَرَاَيْتُ عُثْمَانَ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى مَنْكِبِ عُمَرَ وَرَاَيْتُ دَمًا دُوْنَهٗ فَقُلْتُ مَا هٰذَا فَقَالُوْا دَمُ عُثْمَانَ يَطْلُبُ اللّٰهُ بِهٖ لَهٗ۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں، کہ جو خواب میں دیکھ چکا ہوں اس کے بعد اب میں نہیں لڑوں گا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں آپ کے برابر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شانوں پر ہیں اور جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر ٹکے ہوئے ہیں وہاں میں نے خون دیکھا اور اس کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ تو جواب ملا یہ خون عثمان ہے جو اللہ تعالیٰ سے اپنا قصاص طلب کر رہا ہے۔"

اور ابن سمان نے قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے۔

قَالَ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَوْمَ الْجَمَلِ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَبْرَأُ اِلَيْكَ مِنْ دَمِ عُثْمَانَ وَلَقَدْ طَاشَ عَقْلِيْ يَوْمَ قُتِلَ عُثْمَانُ وَاَنْكَرَتْ نَفْسِيْ وَجَاءُوْنِيْ لِلْبَيْعَةِ فَقُلْتُ اِلَّا اَسْتَحْيِيْ مِنَ اللّٰهِ اَنْ اُبَايِعَ

یوم جمل کے موقعہ پر میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے اے اللہ میں تیرے سامنے خون عثمان سے برأت ظاہر کرتا ہوں جس دن ان کا قتل ہوا (صدمہ سے) عقل گم ہوگئی اور مجھے حد درجہ صدمہ و ناگواری

تومًا تقتلوا رجلًا قال قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم الا استحي من رجل تستحي منه الملائكة واني لاستحي من الله ان ابايع وعثمان قتيل في الارض لم يدفن بعد فانصرفوا فلما دفن رجع الناس يسئلون البيعة فقلت اللهم اني مشفق مما اقدم عليه ثم جاءت عزيمة فبايعت فقالوا يا امير المؤمنين فكانما صدع قلبي۔

ہوئی۔ پھر وہ لوگ بیعت کے لئے میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کیا میں ان لوگوں سے نہ شرماؤں جنہوں نے عثمانؓ کو قتل کیا، جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس سے فرشتے شرماتے ہیں کیا میں اُس سے نہ شرماؤں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ وہ تو بے گور وکفن کشتہ پڑے ہوں اور میں بیعت لے لوں۔ تو سب لوگ واپس چلے گئے، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدفون ہو چکے تو وہ لوگ پھر واپس آئے۔ اور بیعت پر اصرار کرنے لگے تو میں نے کہا، اے اللہ میں جو اقدام (بیعت) کر رہا ہوں اس سے میں ڈر رہا ہوں۔ پھر مجھے (موجودہ حالات کے پیش نظر) اس کی اہمیت کا خیال آیا تو میں نے بیعت کر لی۔ بعد بیعت جب انہوں نے مجھے امیر المؤمنین کہہ کر پکارا۔ تو ان کے ایسا کہنے سے میرا دل پارہ پارہ ہو گیا،

اور اسی راوی نے جناب محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ

ان علیًا قال یوم الجمل لعن الله قتلة عثمان في السهل والجبل۔

جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یوم جمل کے موقعہ پر فرمایا قاتلین عثمان پر اللہ لعنت کرے۔ خواہ وہ زمین پر ہوں خواہ پہاڑ پر!

اور اس روایت کا بھی یہی راوی ہے۔ کہ

ان علیًا بلغه ان عائشة تلعن قتلة عثمان فرفع يديه حتى بلغ بهما وجهه فقال انا العن قتلة عثمان لعنهم الله في السهل والجبل مرتين او ثلاثًا

جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان پر لعنت فرماتی ہیں تو آپ نے اپنے ہاتھ چہرہ تک اٹھا کر دو تین مرتبہ فرمایا میں بھی قاتلین عثمانؓ پر لعنت بھیجتا ہوں، اللہ ان پر لعنت فرمائے وہ زمین میں ہوں یا پہاڑ پر،

اور اسی راوی نے جناب عبد اللہ بن حسین بن حسین رضی اللہ عنہم سے یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ

وقد ذكر عنده قتل عثمان فبكى حتى بل لحيته۔

جب قتل عثمان کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو آپ زار وقطار روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

وعن جندب قال دخلت على حذيفة فقال لي ما فعل الرجل يعني عثمان فقلت اراهم قاتليه نعم قال ان قتلوه كان في الجنة وكانوا في النار۔

حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو مجھ سے پوچھا کہ حضرت عثمان کے معاملہ کا کیا ہوا، میں نے کہا میرا خیال ہے وہ (بلوائی) ان کو قتل کر ڈالیں گے۔ تو آپ نے فرمایا اگر ان کو قتل کر دیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور قاتلین جہنم میں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم کے اقوال وتاثرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اور ان کے قتل کے بارے میں! اور جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ تو خود شیعوں کے نزدیک اس روایت کی بنا پر جو ان کی کتابوں میں موجود ہے صادق الحدیث، (سچ بولنے والے) ہیں! اور اگر ہم وہ ساری روایات، اقوال وتاثرات بیان کرنے لگیں جو قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت میں نیز ان کے جنتی ہونے اور ان قاتلوں کے جہنمی ہونے کے بارے میں صحابہ کرام اور

تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول وثابت ہیں تو اس کیلئے بڑا دفتر درکار ہوگا۔
ان چند مشہور روایات سے بھی یہ ثابت ہوگیا کہ یہ کہنا کہ آپ کا لاشہ تین دن بے گور و کفن پڑا رہا صریحاً جھوٹ اور افترا ہے جس کی تکذیب و تردید تمام تاریخی کتابوں میں موجود ہے! اس لئے کہ اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ آپ کی شہادت ۱۸ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد عصر واقع ہوئی۔ اور ہفتہ کی رات کو آپ کی تدفین عمل میں آئی۔
پھر جس ذات گرامی قدر کی نسبت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شہادت موجود ہو کہ وہ بلا حساب۔کتاب جنت میں جائیں گے اور شہادت بھی ایسی جو تواتر کی حد تک ثابت ہے تو اب وہ کون سی شہادت ہے جس کی ضرورت باقی رہتی ہے!
مناسب ہے کہ اس عنوان کو یہیں ختم کرکے دوسرے عنوانات کو لیں۔اہل انصاف اور صاحب بصیرت اہل ایمان کے لئے یہ بیان کردہ حصہ ہی کافی وشافی ہے! اور ہدایت دینے والا تو اللہ ہی ہے!

مطاعن ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔

اعتراض۔ (۱) یہ پاک بی بی مدینہ سے مکہ گئیں اور پھر وہاں سے بصرہ! حالانکہ ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو خدا تعالیٰ نے گھروں سے باہر نکلنے سے منع اور گھروں میں ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یہ کب مناسب تھا کہ رسول کی عزت کی حفاظت کرنے کے بجائے سولہ ہزار کے "اوباش" لشکر کے ساتھ نکل پڑتیں۔

جواب۔ اگر آیت حجاب، سے گھر میں ٹھہرے رہنا اور باہر مطلقاً نہ نکلنا مراد ہوتا تو نزول آیت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان محترمات طیبات کو حج وغیرہ کے لئے جانے کی اجازت دیتے نہ غزوات میں ساتھ لے جاتے! نہ ہی والدین سے ملاقات، مریضوں کی عیادت، اور مُردوں کی تعزیت کے لئے باہر جانے کی اجازت مرحمت فرماتے۔ اس لئے آیت کا جو مطلب معترضین نے نکالا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ اس ممانعت اور حکم سے صرف حجاب اور پردہ کی تاکید مقصود ومراد ہے۔ کہ دیگر چادر پوش عورتوں کی طرح کوچہ و بازار میں ادھر اُدھر نہ پھرتی پھریں! اور سفر کرنے میں حجاب اور پردہ کے خلاف کوئی بات نہیں۔ آج اس (گئے گذرے) زمانے میں بھی پردہ نشین خواتین، ستر وحجاب کی پابندیوں کے ساتھ سفر کے لئے نکلتی ہیں۔ خاص طور پر وہ سفر جو دینی ملی یا دنیاوی مصالح پر مبنی ہو، جیسے حج وعمرہ، جہاد وغیرہ،۔
تو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ سفر بھی اس نوعیت کا تھا کہ مسلمانوں میں باہم رخنہ پڑ گیا ہے اسکی اصلاح ہو، اور امام عادل کے قتل کے قصاص کے مطالبہ میں سب مسلمان متفق وشریک ہوں۔ آپؓ کا یہ سفر حج وعمرہ کے سفر کی مانند تھا۔ آج بھی اگر یہ کہا جائے کہ فلاں عورت گھر میں بیٹھنے والی ہے باہر نہیں نکلتی۔ تو اس سے کیا مطلب لیا جاتا ہے۔ خود ہی غور کرلیں، انصاف کو کام میں لائیں۔ ہٹ دھرمی نہ کریں۔
(اگر اس سیدھے سادے علمی جواب سے انکی تسلی نہ ہوتی ہو تو مجبوراً ہم) ایک جواب اور دیتے ہیں۔ کہ خلافت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جب اہل بیت کے "حقوق سلب" ہوئے تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (بقول شیعہ راوی) بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خاتون جنت بی بی فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو سوار کرکے مدینہ کے محلوں، اور انصار کے گھروں میں خانہ بخانہ رات کو گشت کراتے اور امداد و معاونت طلب فرماتے تھے۔ یہ روایت شیعہ حضرات کے نزدیک مشہور اور متواتر ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ اب یہاں غور کا مقام ہے کہ ننگ وناموس کے تحفظ کے معاملہ میں بیٹی، بیوی سے زیادہ نہ ہو تو کم بھی نہیں ہوتی۔ اب دیکھئے ناموس رسول کے گھر سے سفر کے لئے نکلنے اور اپنے خیمہ یا مستقر میں قیام کرنے، اور دوسروں کے گھروں میں نہ جانے، اور در بدر پھرنے میں آخر کوئی تفاوت وفرق ہے یا نہیں۔ اور پھر دو تین گاؤں ضبط ہونے کا ضرر تو ذاتی اور انفرادی ہو سکتا تھا اور قتل خلیفہ نے تو پوری امت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس میں دنیا ہی نہیں دین کا بھی ایسا ضرر تھا جس کی لپیٹ میں

پوری ملت مسلمہ آگئی تھی!

تو ذاتی نقصان کے تدارک کے لئے سفر کرنے، اور پوری ملت کے نقصان کی تلافی کرانے کے لئے سفر کرنے میں جو فرق ہے وہ صاف ظاہر ہے، اس سے کون انکار کر سکتا ہے، اس لئے جب وہ سفر قابل طعن نہیں تو یہ سفر کس منطق سے قابل اعتراض قرار پا سکتا ہے!

ایک اور جواب یہ ہے کہ تمام ازواج مطہرات مثلاً ام المؤمنین حضرت ام سلمہ اور ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہما جو شیعوں کے نزدیک بھی محترم و مقبول و معتبر ہیں حج و عمرہ کے لئے گھروں سے باہر تشریف لے جاتی تھیں۔ بلکہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا تو اس سفر میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ مکرمہ تک شریک سفر تھیں، اور آپ کی خواہش تو یہ تھی کہ ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی آگے بھی جائیں۔ مگر عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے جو آپ کے بیٹے تھے اپنی کسی مصلحت سے ان کو روک دیا۔

یہ عجیب دھاندلی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو حجاب و ستر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ازواج مطہرات کو سفر کی اجازت مرحمت فرمائیں اور یہ غدائی خوار اس پر طعن و تشنیع کریں! ملاحظہ فرمایئے خدائی اجازت!

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا.

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ وہ اپنے اوپر چادر ڈال رکھیں یہ ان کے لئے ایک پہچان ہے تاکہ وہ ایذا نہ پہنچائی جائیں۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اور حدیث صحیح سے یہ ثابت ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ أُذِنَ لَكُنَّ أَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِكُنَّ۔ (اپنی ضروریات کے لئے تمکو گھروں سے باہر) نکلنے کی اجازت دیدی گئی۔) ہاں سفر کے لئے محرم کا ہونا شرط ہے، تو آپ (رضی اللہ عنہا) کے اس سفر میں سگے بھانجے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے۔ پھر آپ کی بہن ام کلثوم بنت ابی بکر صدیق کے شوہر جناب طلحہ بن عبید اللہ (رضی اللہ عنہم) بھی ساتھ تھے اور دوسری بہن جناب اسماء بنت ابی بکر کے شوہر حضرت زبیر بن عوام۔ (رضی اللہ عنہم) بھی ہمرکاب تھے۔ اور ان دونوں کی اولادیں بھی شریک سفر تھیں۔

ابن قتیبہ جس کی کتاب پر شیعوں کو کتاب اللہ سے زیادہ اعتماد ہے اپنی تاریخ میں رقمطراز ہے۔

لَمَّا بَلَغَهَا بَيْعَةُ عَلِيٍّ أَمَرَتْ أَنْ يُعْمَلَ لَهَا هَوْدَجٌ مِنْ حَدِيدٍ فِيهَا مَوْضِعُ الدُّخُولِ وَالْخُرُوجِ فَخَرَجَتْ وَابْنَا طَلْحَةَ وَالزُّبَيْرِ مَعَهَا۔

جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اطلاع ملی تو آپ نے ایک آہنی (ھودج) بنوایا جس میں اترنے چڑھنے کا راستہ بھی رکھا۔ پھر جناب طلحہ کے دونوں بیٹوں اور جناب زبیر رضی اللہ عنہم کی معیت میں سفر کے لئے روانہ ہوگئیں۔

پھر ازواج مطہرات تو امہات المؤمنین ہیں، اس حیثیت سے باعتبار احترام و عزت پوری امت انکی اولاد ہے۔ اسی لئے تمام علمائے امت کا مذہب یہی ہے کہ امت کے کسی بھی فرد کی معیت میں ان کو سفر کرنا جائز ہے!

یہی وجہ تھی کہ خلیفہ ثانی امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو سفر حج کے لئے بھیجا تو جناب عثمان غنی اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ان کے ہمراہ روانہ کیا اور فرمایا تم ان کے سعادت مند بیٹے ہو۔ اس لئے تم میں سے ایک ان کی سواری کے آگے رہے۔ اور دوسرا پیچھے! اور ان سب سے قطع نظر خود قرآنی آیت کے الفاظ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مطلق نکلنے سے منع نہیں فرمایا، بلکہ جاہلیت اولیٰ کے طریق پر بناؤ سنگار کی نمائش کرتے ہوئے نکلنے کو منع فرمایا۔ تو اب اس نہی سے استدلال نہیں رہا۔ اب رہی یہ بات وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی، تو یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ شیعوں کے نزدیک امر وجوب کے لئے متعین نہیں

تو پھر اس کے خلاف کرنے سے خرابی کیسے لازم آسکتی ہے!

اعتراض۔ (۲) کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خون عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے سفر اختیار فرمایا حالانکہ ان کا کوئی تعلق نہ تھا، نہ وہ وارث تھیں اور نہ کوئی رشتۂ قرابت تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی و عناد تھا۔ اسی لئے ان کے خلاف فتنہ برپا کیا۔ جبکہ اس سے پہلے خود لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر برانگیختہ فرمایا کرتی تھیں، اور فرماتی تھیں اُقْتُلُوْا نَعْثَلًا۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے۔

اِنَّ عَائِشَۃَ اَتَاھَا خَبَرُ بَیْعَۃِ عَلِیٍّ وَکَانَتْ خَارِجَۃً مِّنَ الْمَدِیْنَۃِ فَقِیْلَ لَھَا قُتِلَ عُثْمَانُ وَبَایَعَ النَّاسُ عَلِیًّا فَقَالَتْ مَا اُبَالِیْ اَنْ تَقَعَ السَّمَآءُ عَلَی الْاَرْضِ قُتِلَ وَاللّٰہِ مَظْلُوْمًا وَاَنَا طَالِبَۃٌ بِدَمِہٖ فَقَالَ عُبَیْدٌ اَوَّلُ مَنْ حَمَّشَ عَلَیْہِ وَاَطْمَعَ النَّاسَ فِیْ قَتْلِہٖ لَاَنْتِ وَلَقَدْ قُلْتِ اُقْتُلُوْا نَعْثَلًا فَقَدْ فَجَرَ فَقَالَتْ عَائِشَۃُ قَدْ وَاللّٰہِ قُلْتُ وَقَالَ النَّاسُ فَقَالَ عُبَیْدٌ مِنْکِ الْبَدَاءُ وَمِنْکِ الْغِیَرُ وَمِنْکِ الرِّیَاحُ وَمِنْکِ الْمَطَرُ وَاَنْتِ اَمَرْتِ بِقَتْلِ الْاِمَامِ وَقُلْتِ لَنَا اِنَّہٗ قَدْ فَجَرَ۔

جب آپ مدینہ منورہ سے باہر تھیں تب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ان کو اطلاع ملی، آپ کو بتایا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے اور لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔ آپ نے اسوقت فرمایا۔ آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو بھی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اللہ کی قسم وہ مظلوم قتل کیئے گئے۔ اور میں ان کے خون کا مطالبہ کرتی ہوں۔ عبید نے ان سے کہا سب سے پہلے جس نے لوگوں کو بھڑکایا اور ان کے قتل پر ابھارا وہ آپ ہی تھیں، اسوقت آپ نے کہا تھا کہ نعثل کو مار ڈالو کہ وہ فاجر ہو گیا ہے۔ اس پر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بے شک میں نے ایسا کہا اور لوگوں نے بھی کہا اس پر عبید نے کہا کہ اس کی ابتدا بھی آپ نے کی اور اس میں تبدیلی بھی آپ ہی کی طرف سے ہو رہی ہے۔ آپ ہی کی طرف سے ہوا بھی ہے، اور آپ ہی کی طرف سے بارش بھی۔ امام کے قتل کا آپ ہی نے ہمیں حکم دیا کہ وہ فاجر ہو گئے ہیں،،

جواب:۔ اس اعتراض کے جواب میں اول تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ خلیفۂ عادل کے خون کا بدلہ لینا ہر مسلمان کا حق ہے۔ ورثہ کے ساتھ یہ حق مخصوص نہیں! کیونکہ خلیفۂ عادل۔ اموال کی حفاظت اور فیئ وغنائم کے انتظام و تقسیم میں تمام مسلمانوں کا نائب ہوتا ہے۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو ام المؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں، اس مطالبہ کے کرنے کی عام مسلمانوں سے زیادہ حقدار تھیں۔ احکام الٰہی کے نفاذ کے لیئے وہ کیوں تگ و دو نہ فرمائیں۔ خصوصًا قصاص جیسے اہم دینی معاملہ میں! جبکہ وہ قصاص بھی ایک مظلوم کا ہو جیسے خلافت و امارت کا مالک ہوتے ہوئے بلا کسی شرعی وجہ کے قتل کر دیا ہو۔ اور حضرت عائشہ و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے باہم دلی بغض و عناد کا تو کسی مسلمان کا دل میں تصور تک نہیں آسکتا۔ ہر مسلمان ایسے خیال و تصور سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے یہ محترم و مقدس ہستیاں تو ایک دوسرے کے فضائل و مناقب میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ دیلمی نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حب علی عبادۃ۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت عبادت کا درجہ رکھتی ہے) آپؓ کا سفر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ و جدال کا نہیں تھا، قتل سے باہم جو کشتی پڑ گئی اور دلوں میں جو گرہ لگ گئی تھی اس کی اصلاح اور باہم صلح و صفائی اور خون عثمان کا قصاص مقصد سفر تھا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے اور ان کو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نکال دیا جائے۔ اور قاتلین عثمان کی دھمکیوں اور ڈرانے میں آکر جناب طلحہ و زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم مدینہ چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے، مطمئن ہو کر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے رفیق

ومعاون نہیں اور باہم اتفاق ومودت سے خلافت کا انتظام حسن وخوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے۔ ادھر جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر مخالفین بھی حد سے زیادہ آگے نہ بڑھیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں کہ قاتلین عثمان نے بعد قتل، حضرات طلحہ وزبیر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ اور علی الاعلان منافقانہ گفتگو کرتے رہے۔

رہی بات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں کے اکسانے کی تو یہ ابن قتیبہ، ابن اعثم کوفی اور سماطی، کا پیشہ ورانہ جھوٹ اور افتراء ہے۔ یہ تو مشہور کذابوں میں گنے جاتے ہیں۔ چنانچہ جنگ جمل اور دوسری لڑائیوں کی جو رپورٹنگ انہوں نے کی ہے۔ وہ شیعہ وسنی دونوں کے نزدیک افترا اور بہتان پر مبنی ہے! (یہ جھوٹے اور مفتری واقعات میں کذب بیانی سے آگے بڑھ کر واقعات تخلیق کرنے میں بدنام ہیں) یہ عدد رجہ ناانصافی اور بغض وعناد کا گھناؤنا اظہار ہے کہ زوجہ محبوبہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اللہ اور رسول کی شہادت کو بالائے طاق رکھ کر چند اخوان الشیاطین جھوٹے اور بے ایمان کوفیوں کا دم چھلا بنجائیں (اور انہیں کی تال پر ناچنے لگیں) اور ان کی اتباع و پیروی میں اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ۔

پاک باز عورتوں پاک مردوں کے لئے اور پکباز مرد پاک عورتوں کے لئے زیبا ہیں ان کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ اس سے پاک دامن ہیں ان کے لئے مغفرت اور اچھا رزق ہے!

اہل سنت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بابت ابن قتیبہ کی بات کو کس طرح وقعت دے سکتے ہیں جبکہ ترمذی، ابن ماجہ اور ابو حاتم رازی نے بطریق متعدد یہ روایت کی ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِعُثْمَانَ۔ یَا عُثْمَانُ لَعَلَّ اللّٰهُ یُقَمِّصُكَ قَمِیْصًا فَاِنْ اَرَادُوْكَ عَلٰی خَلْعِهٖ فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ ثَلَاثًا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہ فرمایا اے عثمان، شاید اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی پوشاک پہنائے۔ اگر لوگ وہ پوشاک اتارنا چاہیں تو تم ان کی خاطر وہ پوشاک نہ اتارنا۔

اعتراض۔ (۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی بلکہ اس پر جمی بھی رہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں اور محمد بن مسکویہ نے تجارب الامم میں، اور ابن قتیبہ نے کتاب السیاست، میں ایک روایت یوں بیان کی ہے کہ جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک لشکر راستہ میں ایک ایسے مقام سے گذرا جہاں پانی تھا۔ تو وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا، جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا اس پانی کا کیا نام ہے، انہوں نے بتایا کہ اسے حوّاب کہتے ہیں۔ یہ سنکر آپ فرمانے لگیں مجھے یہاں سے واپس لے چلو! جناب محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا آخر کیوں؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازواج سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے!

كَاَنِّیْ بِاِحْدٰكُنَّ تَنْبَحُهَا كِلَابُ الْحَوْاَبِ فَاِیَّاكِ اَنْ تَكُوْنِیْ یَا حُمَیْرَاءُ۔

گویا میں تم میں سے ایک پر حوّاب کے کتوں کو بھونکتا دیکھتا ہوں۔ تو اے حمیرا تم وہ نہ ہونا۔

پس یہ ممانعت یاد ہونے کے باوجود آپ وہاں سے واپس نہ ہوئیں۔

جواب:- جو روایات ان لوگوں نے بیان کی ہیں یہ بات تو ان سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ اور اہل سنت کی روایات میں بصراحت آپ کے یہ الفاظ ملتے ہیں رُدُّوْنِیْ۔ رُدُّوْنِیْ۔ (مجھے واپس لے چلو۔ واپس لے چلو) اسی کے ساتھ ان کی روایات میں بطور تتمہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے واپسی میں پس وپیش کیا۔ مگر اہل لشکر نے اس سلسلہ میں آپؓ سے موافقت نہ کی، اور

باہم اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اسی دوران مروان بن حکم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لشکری قریب کے دیہات و آبادی سے اسی ایسے افراد کو بطور گواہ لائے یہ کہتے تھے کہ یہ پانی حواب نہیں کہلاتا۔ بلکہ وہ کوئی اور پانی ہے۔ اس گواہی کے بعد آپ رضی اللہ عنہا کے آگے روانہ ہوئیں۔ یہ جواب تو روایت کے مقابلہ میں روایت سے تھا۔ اب از روئے درایت ایک اور جواب ملاحظہ فرمائیے، کہ

حدیث میں پانی پر سے گذرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک معصیت سے جو ان میں سے کسی ایک کو پیش آسکتی ہے اس سے خبردار فرما رہے ہیں، اس حدیث سے نہی سمجھنا اور مخالفت رسول پر اصرار اور ضد کی نسبت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کرنا کس طرح ممکن ہے خاص کر اس صورت میں جبکہ "اِیَّاکِ اَن تَکُوْنِیْ یَا حُمَیْرَآءُ" کے الفاظ اہل سنت کی معتبر و مستند کتابوں میں موجود ہی نہیں ہیں: اور اگر بالفرض موجود بھی ہوں تو ان کا مطلب وہی ہوگا جیسے کوئی سربراہ خاندان افراد خاندان کو اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے آئندہ پیش آنے والے خطرات و خدشات سے آگاہ کرے۔ اور ان سے ڈرائے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اسی قسم کی پیش بینی اور احتیاط کے لئے تھا۔ یہ شرعی نہی تھی جس کی مخالفت معصیت کہلاتی ہے۔ صراحتاً شرعی نہی کی عدم موجودگی میں آپ رضی اللہ عنہا کے عمل کو معصیت قرار دے کر طعن کرنا سوائے تعصب، و بغض و عناد کے کچھ نہیں!

یہ واقعہ اوراق گذشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ایک شب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے اور نماز تہجد کی تاکید فرمائی مگر آپ نے جواباً قسم کھا کر کہا کہ ہم سوائے فرض کے ہرگز کوئی نماز نہ پڑھیں گے۔ وَاللہ لا نصلی الا ما کتب اللہ لنا۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے تو اپنے زانو پیٹتے یہ فرماتے جا رہے تھے۔ (انسان کتنا جھگڑالو ہے) اب ذرا دونوں جگہوں کی مخالفت کا موازنہ کرلیں (تو کیا فیصلہ ہے شیعہ حضرات کا جناب امیر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق۔) حقیقت میں بنظر انصاف دیکھا جائے تو ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اصرار میں معذور رہی تھیں، مکہ مکرمہ سے روانگی کے وقت ان کو کہاں معلوم تھا کہ راستہ میں چشمہ حواب بھی پڑے گا۔ اور اس پر سے گذرنا ناگزیر بھی ہوگا۔ اور پھر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ وہی مقام ہے، تو واپسی کا ارادہ بھی کیا۔ مگر لشکر نے اس کی موافقت نہ کی۔ اس لئے اس پر عمل نہ ہو سکا۔ اور پھر حدیث میں بھی اس کی تصریح نہیں ہے کہ اگر ایسا واقعہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیئے! آپ کا مقصد سفر چونکہ باہم صلح و صفائی بین المسلمین تھا جو اپنی جگہ اہم تو ہے ہی مگر شرعاً اس کا حکم بھی ہے۔ اسی کے پیش نظر آپ نے سفر جاری رکھا۔

اعتراض۔ (۴) یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لشکر بصرہ پہنچا۔ تو اس نے بیت المال لوٹ لیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل عثمان بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کو جو صحابی تھے۔ اہانت کے ساتھ نکال دیا۔

جواب:۔ یہ ہے کہ یہ واقعہ نہ آپ کے اشارہ سے ہوا، اور نہ آپکی مرضی سے ہوا۔ اور جب آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے نہ صرف یہ کہ جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ سے عذر و معذرت کی بلکہ حد سے زیادہ ان کی دلجوئی فرمائی۔ اور ان کا دل خوش کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش فرمائی۔ تاریخ میں اسی جیسا ایک اور واقعہ بھی محفوظ ہے۔ کہ جناب امیرالمؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک لشکری مالک اشتر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں عہد عثمانی کے ایک گورنر جناب ابوموسیٰ اشعری صحابی رضی اللہ عنہ کا کوفہ میں گھر جلایا گیا۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ تو کیا ان کے نزدیک یہ بھی طعن کی بات ہے؟ اگر نہیں تو لشکریان عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں بیت المال لٹنے سے جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طعن کیوں۔ اگر ہو تو دونوں جگہ ہو، ورنہ کہیں بھی نہیں۔ جیسا کہ سنیوں کا مسلک ہے! اور پھر ان دونوں واقعات میں قابل لحاظ و غور ایک نمایاں اور بنیادی فرق بھی ہے۔ یہاں بیت المال، پر دست درازی ہوئی جس میں ان دست درازوں کا بھی حق و حصہ تھا۔ جناب عثمان انصاری عامل بصرہ کی ذاتی املاک و اموال پر دست درازی نہیں کی گئی مگر وہاں ذاتی املاک لوٹی گئیں۔ جلائی گئیں اور تباہ کر دی گئیں!

اور پھر یہاں جو کچھ ہوا آخری چارۂ کار کے طور پر ہوا۔ ان کے زندہ رہنے اور بقا کے لئے کوئی صورت چھوڑی نہیں گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ جناب

طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے اول جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ خلیفۂ شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر ہمارے ساتھ مسلمانوں کی ایک جمعیت آئی ہے۔ ہم جو زادِ راہ لے کر چلے تھے وہ ختم ہو گیا اگر آپ بیت المال کے اموال ہمارے پاس لے آئیں تو ان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اس سے انکار کیا بلکہ آمادۂ پیکار ہوئے، اور حکم جاری کیا کہ کوئی لشکری بصرہ میں داخل نہ ہونے پائے، کھانا پینا، دانہ، چارہ سب بند کر دیا۔ جب لشکر کی جان کے لالے پڑ گئے، تو معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا۔ لشکر میں جو اکھڑ مزاج لوگ تھے۔ اور اسوقت کے حالات کے مطابق ایسے لوگوں کو پورے طور پر قابو میں رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ہلّہ کر کے شہر میں گھس گئے اور بیت المال کو جس میں ان کا حق بھی تھا لوٹ لیا۔ تو ایسی صورت میں اعتراض اور برہمی کی کہاں گنجائش!

اور اس سب کچھ کے باوجود اہل سنت میں کوئی بھی جب حضرت عائشہ، وطلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم تک کو "معصوم" نہیں کہتا، تو لشکریوں کی عصمت کا کون قائل ہو گا کہ ان سے اس قسم کے اعمال کے صدور سے عقیدہ میں فرق آئے!

اور جب جناب طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما قتل کئے گئے، ام المؤمنین زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی توہین جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی۔ تو ان کے عقیدہ میں فرق کیوں نہیں پڑا۔ جب کہ باعتبار مراتب جناب عثمان انصاری کو جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ پھر اس قسم کے واقعات کے صدور سے ان کے عقیدہ میں کیوں خلل پیدا ہو گا۔

جحش بن زیاد الضبی راوی ہے کہ میں نے احنف بن قیس کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

لَمَّا ظَهَرَ عَلِيٌّ عَلٰى اَهْلِ الْجَمَلِ اَرْسَلَ اِلٰى عَائِشَةَ ارْجِعِيْ اِلَى الْمَدِيْنَةِ قَالَ فَاَبَتْ قَالَ فَاَعَادَ اِلَيْهَا الرَّسُوْلُ وَاللّٰهِ لَتَرْجِعِنَّ اَوْ لَاَبْعَثَنَّ اِلَيْكِ نِسْوَةً مِنْ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ مَعَهُنَّ شِفَارٌ حِدَادٌ يَاْخُذْنَكِ بِهَا فَلَمَّا رَاَتْ ذٰلِكَ خَرَجَتْ۔ رَوَاهُ اَبُوْ بَكْرِ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ فِي الْمُصَنَّفِ۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل جمل پر قابو پا لیا تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہلوایا کہ آپ مدینہ منورہ واپس چلی جائیں آپ نے انکار فرمایا۔ تو دوبارہ قاصد بھیجا کہ واللہ یا تو آپ واپس چلی جائیں گی، یا پھر میں بکر بن وائل کی خنجر بردار عورتوں کو بھیجوں گا کہ وہ آپ کو ان کے ذریعہ قابو کر لیں گی۔ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ صورت حال دیکھی تو آپ مدینہ روانہ ہوئیں۔ (ابو بکر بن شیبہ نے اپنی مصنّف میں اسے روایت کیا۔)

اعتراض۔ (۵)

یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کر دیا جس پر آیت قرآنی نازل ہوئی

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ

جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے بطور سرگوشی ایک بات کہی تو ان بیوی نے وہ بات بیان کر دی۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پہ ظاہر کر دیا کہ بعض کو یہ بات بتا دی اور بعض سے چھپالی، اور جب نبی نے اپنی بیوی کو بتایا کہ تم نے ایسا کیا، تو وہ کہنے لگیں آپ کو یہ کس نے بتایا۔ آپ نے فرمایا مجھے علیم وخبیر (خدا) نے بتایا۔"

جواب:- مفسرین اس پر متفق ہیں کہ راز حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے افشا کیا تھا کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دروازہ کی درز سے اپنے بستر پر دیکھا تھا۔ اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ میں نے ماریہ کو اپنے لئے حرام کر لیا ہے۔ تو تم میرا یہ راز چھپائے رکھنا کسی سے ذکر نہ کر دینا۔"

مگر آپ اس خوشی میں جو ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے حرام کر لینے کی خبر سے انہیں ہوئی تھی کتمان راز کی تاکید کو بھول گئیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ راز فاش کر دیا اور اسی وجہ سے جناب ماریہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ واقعہ کہہ ڈالا۔ وہ تحریم کے معاملہ کے بجائے "راز کی بات" اس واقعہ کو

سمجھتی رہیں جو در سے انہوں نے دیکھا تھا اس لئے تحریم کی بات کہہ ڈالی۔

ان حالات کے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف افشاء راز کی نسبت کرنا محض تہمت و افتراء ہے؟

اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اہل سنت کا جو عقیدہ ہے، اس میں ان کا یہ عمل بھی کوئی خلل نہیں ڈالتا۔ اس لئے کہ امر، اگر وجوب کیلئے بھی ہو، استحباب مقصود نہ ہو، تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ خلاف وجوب معصیت اور گناہ ہے۔ اور آیت کا جملہ "ان تتوبا الی اللہ" صاف بتاتا ہے کہ اس معصیت سے توبہ مقبول ہے۔ اور بالاجماع یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے توبہ کی اور وہ مقبول ہوئی۔ اور آپ آخر دم تک ازواج مطہرات میں داخل رہیں، اور خوشخبری پائی۔

طبرسی کی مجمع البیان جو شیعوں کی معتبر تفسیر سمجھی جاتی ہے اس میں طبرسی کہتا ہے۔

قِيلَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَسَمَ الْاَيَّامَ بَيْنَ نِسَآئِهٖ فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ حَفْصَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِيْ اِلٰى اَبِيْ حَاجَةً فَاْذَنْ لِيْ اَنْ اَزُوْرَهٗ فَاَذِنَ لَهَا فَلَمَّا خَرَجَتْ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى جَارِيَتِهٖ مَارِيَةَ الْقِبْطِيَّةِ اُمِّ اِبْرَاهِيْمَ وَقَدْ كَانَ اَهْدَاهَا الْمُقَوْقِسُ فَاَدْخَلَهَا بَيْتَ حَفْصَةَ فَوَقَعَ عَلَيْهَا فَاَتَتْ حَفْصَةُ فَوَجَدَتِ الْبَابَ مُغْلَقًا فَجَلَسَتْ عِنْدَ الْبَابِ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَجْهُهٗ يَقْطُرُ عَرَقًا فَقَالَتْ حَفْصَةُ اِنَّمَا اَذِنْتَ لِيْ مِنْ اَجْلِ هٰذَا۔ اَدْخَلْتَ اَمَتَكَ بَيْتِيْ ثُمَّ وَقَعْتَ عَلَيْهَا فِيْ يَوْمِيْ وَعَلٰى فِرَاشِيْ اَمَا رَاَيْتَ لِيْ حُرْمَةً وَحَقًّا فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَيْسَ هِيَ جَارِيَتِيْ قَدْ اَحَلَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ لِيْ اُسْكُتِيْ فَهِيَ حَرَامٌ عَلَيَّ اَلْتَمِسُ بِذٰلِكَ رِضَاكِ وَلَا تُخْبِرِيْ بِذٰلِكِ اَحَدًا مِّنْهُنَّ وَهُوَ عِنْدَكِ اَمَانَةٌ فَلَمَّا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَعَتْ حَفْصَةُ الْجِدَارَ الَّذِيْ بَيْنَهَا وَبَيْنَ عَائِشَةَ فَقَالَتْ اَلَا اُبَشِّرُكِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ حَرَّمَ عَلَيْهِ اَمَتَهٗ مَارِيَةَ وَقَدْ اَرَاحَنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَاَخْبَرَتْ عَائِشَةَ بِمَا رَاَتْ وَكَانَتَا مُتَصَافِيَتَيْنِ مُتَظَاهِرَتَيْنِ عَلٰى سَائِرِ اَزْوَاجِهٖ فَنَزَلَتْ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ فَاعْتَزَلَ نِسَآئَهٗ تِسْعَةً وَّعِشْرِيْنَ يَوْمًا وَقَعَدَ فِيْ مَشْرَبَةِ اُمِّ اِبْرَاهِيْمَ مَارِيَةَ

کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کے مابین باری کے دن مقرر فرما رکھے تھے۔ (ایک مرتبہ) حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اپنے والد سے کچھ کام آپ اجازت فرمائیں تو میں ان سے مل آؤں، آپ نے ان کو اجازت دیدی جب وہ چلی گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ام ابراہیم جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو بلوایا۔ یہ شاہ مصر مقوقس کی طرف سے آپ کو ہدیہ کے طور پر ملی تھیں۔ ان کو آپ جناب حفصہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں لے گئے۔ اور صحبت فرمائی اسی دوران حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آگئیں، گھر کا دروازہ بند پاکر باہر دروازہ ہی پر بیٹھ گئیں۔ جب کچھ دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو آپ کے چہرہ مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ تب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ آپ نے مجھے اس لئے اجازت دی تھی، کہ میرے گھر، میرے بستر اور میری باری کے دن اس لونڈی سے صحبت فرمائیں۔ آپ نے میری عزت اور حق کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ لونڈی اللہ تعالیٰ نے میرے لئے حلال نہیں کی ہے۔ اچھا شکوہ نہ کرو میں تمہاری دلجوئی کی خاطر اس کو اپنے لئے حرام کر لیتا ہوں۔ مگر اس بات کا ذکر باقی ازواج سے نہ کرنا۔ یہ میرا راز تمہارے پاس امانت ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا دوڑ کر اس دیوار کے پاس گئیں جو ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی مشترک تھی اور کہنے لگیں خوشخبری سنو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لونڈی ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ اور یوں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے سکون و راحت مہیا فرما دی۔ اور پورا واقعہ جو دیکھا تھا

حَتّٰی نَزَلَتْ اٰیَةُ التَّخْیِیْرِ وَقِیْلَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَلَا یَوْمًا لِعَائِشَةَ مَعَ جَارِیَةِ الْقِبْطِیَّةِ فَوَقَفَتْ حَفْصَةُ عَلٰی ذٰلِكَ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُعْلِمِیْ عَائِشَةَ بِذٰلِكَ وَحَرَّمَ مَارِیَةَ عَلٰی نَفْسِهٖ فَاَعْلَمَتْ حَفْصَةُ عَائِشَةَ الْخَبَرَ وَاسْتَكْتَمَتْهَا فَاَطْلَعَ اللّٰهُ نَبِیَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ وَهُوَ قَوْلُهٗ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا یَعْنِیْ حَفْصَةَ وَلَمَّا حَرَّمَ مَارِیَةَ الْقِبْطِیَّةَ اَخْبَرَ حَفْصَةَ اَنَّهٗ یَمْلِكُ مِنْ بَعْدِهٖ اَبُوْ بَكْرٍ وَعُمَرُ فَعَرَّفَهَا بَعْضَ مَا اَفْشَتْ مِنَ الْخَبَرِ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ اَنَّ اَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ یَمْلِكَانِ بَعْدِیْ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا دیا تھا۔ باقی ازواج مطہرات کی نسبت ان دونوں بی بیوں میں دوستی اور اتفاق کے باہم روابط زیادہ استوار تھے۔ اس پر آیت تحریم یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک نازل ہوئی۔ تو آپ نے انتیس روز تک اپنی ازواج سے کنارہ کشی اختیار فرما کر ام ابراہیم کے بالاخانہ پر قیام فرمایا تا آنکہ آیت تخییر نازل ہوئی۔ بعض راویوں نے یہ کہا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باری کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے خلوت فرمائی تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وہاں موجود تھیں۔ اور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ اور آپ نے ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا۔ مگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس کی اطلاع اس تاکید کے ساتھ کہ کسی سے ذکر نہ کرنا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو کردی جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدی۔ اس آیت میں مراد بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالینے کی خبر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو دی اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی تھی کہ میرے بعد جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما خلیفہ ہوں گے۔ انہوں نے خبر کا ایک حصہ افشا کردیا اور دوسرا نہیں بتایا۔

اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ افشا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوا۔ نہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے: اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ افشا خوشی و فرحت کی زیادتی کے سبب ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔

اور پھر عیاشی کی وہ روایت جو اس نے جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے کی ہے اور وہ شیعوں کے نزدیک بہترین محدثین شمار ہوتا ہے۔ وہ صاف رضامندی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہوتا ہے۔ اور اس راز کے افشا پر کوئی عتاب بھی نہیں! یہاں ایک اور مسئلہ بھی واضح ہوگیا، کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی الٰہی کے ذریعہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہوگیا تھا، تو اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حکم، امر الٰہی کے مخالف ہوتا ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام تو تقدیر الٰہی کے خلاف دعا تک نہیں کرتے چہ جائیکہ خلافت کی تقرری وموقوفی کے احکام صادر فرمائیں! معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا۔ یہ سب یاروں کی گھڑنت اور افترا ہے! چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰی یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ۔ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ۔ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ۔

جب ابراہیم (علیہ السلام) کا خوف دور ہوا اور بشارت (ان کو) ملی۔ تو وہ ہم سے قوم لوط کے معاملہ میں اصرار کرنے لگے (کہ انہیں عذاب نہ دیا جائے) وہ نرم دل بردبار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں (اسی لئے یہ اصرار کر رہے تھے ہم نے ان سے کہا) ابراہیم اس (اصرار) سے گریز کرو، تمہارے رب کا اس معاملہ میں حکم جاری ہوچکا۔ اب تو ان پر عذاب آئیگا جو لوٹایا نہیں جاسکتا۔

اعتراض ۔(۶) خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ مَاغِرْتُ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْ نِسَآءِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا غِرْتُ عَلٰی خَدِیْجَۃَ وَمَا رَأَیْتُھَا قَطُّ وَلٰکِنْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُکْثِرُ ذِکْرَھَا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے سوائے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کسی کے حال پر مجھ کو غیرت نہیں آئی حالانکہ میں نے ان کو بالکل نہیں دیکھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کثرت سے فرمایا کرتے تھے۔

جواب:۔ غیرت اور رشک تو عورتوں کا طبعی تقاضا ہے! اور طبعی تقاضے پر کوئی گرفت نہیں۔ ہاں غیرت و رشک کی بنا پر کوئی قول و فعل خلاف شرع سرزد ہو تو البتہ گرفت کا موقعہ ہوتا ہے۔

حدیث صحیح میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کسی بیوی کے گھر میں تھے کہ ایک دوسری زوجۂ محترمہ نے آپ کے لئے عمدہ کھانا تیار کرکے بھجوادیا مگر ان محترمہ نے غیرت کے مارے خادمہ سے طشت لے کر زمین پر پٹخ دیا۔ کہ طشت تو ٹوٹا ہی کھانا بھی بکھر گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کی حرمت کے لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے بنفس نفیس خود اٹھے اور کھانا چننے لگے، ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے، غارت امکم۔ مگر اس کے علاوہ نہ ان محترمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ فرمایا نہ ناراض ہوئے۔ جب اس معاملہ میں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی محترمات کے ساتھ یہ سلوک و معاملہ ہے ایرے غیرے کو حق کہاں پہنچتا ہے کہ ان امہات محترمات رضی اللہ عنہن کو اعتراض کا نشانہ بنائے۔ اور اپنی عاقبت خراب کرے!

کتب امامیہ میں تو ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ درج ہے کہ انہوں نے ائمہ کے معاملہ میں حسد و رشک کا اظہار فرمایا، تو ان کے مقابلہ میں بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ غیرت کیا وزن رکھتی ہے، اور کیسے اس پر یہ لوگ اعتراض کرسکتے ہیں۔

اعتراض ۔(۷) حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا، آخر عمر میں فرمایا کرتی تھیں قَاتَلْتُ عَلِیًّا وَلَوَدِدْتُّ اَنِّیْ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا۔ میں علی (رضی اللہ عنہ) سے لڑ پڑی۔ اور میری خواہش ہے کہ میں بھولی بسری بات ہوتی!

جواب:۔ ان الفاظ سے کوئی روایت بطریق صحیح منقول نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یوم جمل کی یاد جب بھی آتی، آپ بے اختیار اتنا روتیں کہ چادر مبارک آنسوں سے تر ہو جاتی۔ یہ رونا اس بنا پر ہوتا کہ کاش میں نکلنے میں جلدی نہ کرتی، پہلے حالات کی تحقیق کیوں نہ کرلی، غور و فکر کیوں نہ کیا، کہ اتنا زبردست المیہ پیش آگیا۔ اگر یہ اپنی لکھی ہوئی بات منوانے پر اتنے مصر ہیں تو اہل سنت کی معتبر، صحیح اور مستند کتابوں کی بات بھی تو سنیں اور اسے قبول کریں جن میں ایسے ہی الفاظ جناب علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ جب ام المومنین رضی اللہ عنہا کے لشکر کو ہزیمت ہوگئی اور دونوں طرف کے کافی لوگ ہلاک و شہید ہوگئے تو آپ جب مقتولین کی لاشوں کے ملاحظہ کے لئے گئے تو اپنے زانو پیٹ پیٹ کر یہ فرمارہے تھے، یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا۔ (اے کاش میں اس سے پہلے مر کر بھولی بسری بات کیوں نہ ہوگیا)، اگر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا فرمایا بھی ہو تو وہ اسی قبیل سے ہوگا۔ اور جہاں مقصد انصاف پسندی، اور رجوع بحق ہو وہاں طرفین سے اسی قسم کے احساسات ندامت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو باہم مرتبہ شناسی پر مبنی ہوتا ہے!

کیا یہ تعجب اور دکھ کی بات نہیں کہ ایسے قابل قدر جذبات و احساسات کو بھی یہ لوگ مطاعن میں شمار کرتے ہیں۔

اعتراض ۔(۸) کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن تھا اپنے والد اور ان کے دوست حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا مقبرہ بنادیا۔

جواب:۔ کتب اہل سنت میں جو احادیث صحیحہ مروی و منقول ہیں ان سے ثابت ہے کہ گاہ بصراحت گاہ باشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوش خبری دی ہے کہ یہ دونوں محترم حضرات آپ کے جوار میں مدفون ہوں گے! چنانچہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تدفین وہاں پاگئی تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اِنِّیْ کُنْتُ لَاَظُنُّ اَنْ یَّجْعَلَکَ اللّٰہُ مَعَ صَاحِبَیْکَ اِذْ کُنْتُ کَثِیْرًا اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُنْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ وَقُمْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ وَانْطَلَقْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ۔

میرا پختہ گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ تمکو اے عمر، تمہارے دونوں دوستوں کے ساتھ ملادے گا۔ اس لئے کہ میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کا کلام سنا کہ میں، ابوبکر اور عمر وہاں تھے۔ میں، ابوبکر و عمر کھڑے تھے۔ میں، ابوبکر اور عمر چلے!

لہٰذا آپ کے وہاں دفن ہونے کے جواز کا اس سے صاف اور کھلا حکم اور کیا ہوگا جو کمال رضامندی اور خوشنودی کا پتہ دیتا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریحی اجازت درکار ہوتی تو پھر جناب حسن رضی اللہ عنہ نے اس حجرہ میں دفن ہونیکی خواہش کا اظہار کیوں فرمایا تھا۔ جبکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ اب اس قسم کی اجازت اور حکم شرعی کا حصول ناممکن اور محال ہے!

دوسرا جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے تمام حجرے ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مالک بنادیا تھا اور ہر ایک کے لئے ایک ایک مکان نامزد فرمادیا تھا۔ حکم فقہی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب ایک شخص اپنی کسی اولاد کے نام کوئی مکان بنائے یا خریدے اور پھر اس کو اسی کے قبضہ میں چھوڑے رکھے تو وہ اسی کی ملک ہوجاتا ہے۔ دوسری اولاد یا وارثوں کا اس میں کوئی دخل نہیں رہتا۔ اور یہی حکم ازواج اور دیگر اقارب کا ہے۔

ازواج مطہرات کی ملکیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اپنے مکانات میں مالکانہ تصرف فرماتی رہتی تھیں، مثلاً توڑ پھوڑ، مرمت، ان کو تنگ یا کشادہ کرنا۔ دروازہ نکالنا وغیرہ۔ اور یہی حال سیدہ فاطمۃ الزہراء اور جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے حجروں کا بھی ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے گھروں کے مالک تھے۔

اور قرآن مجید کی آیت وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ میں اشارہ قریب قریب تصریح کے ہے۔ پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا بموجودگی اصحاب کرام جن میں جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کرنا اور کسی کا بھی انکار نہ کرنا اسبات کی قطعی دلیل ہے کہ حجرہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں تھا۔ اور یہ سب ہی کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم خلفاء کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے اور معمولی تغیرات پر گرفت فرماتے تھے! اگر اس معاملہ میں بھی وہ دیکھتے کہ کوئی امر خلاف شرع ہے تو وہ کبھی خاموش نہ رہتے! لہٰذا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم کے نزدیک اپنے اپنے حجروں پر ازواج مطہرات کی ملکیت مسلم الثبوت تھی! کسی نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت طلبی پر اعتراض نہیں کیا۔ اور یہ بات تو شیعی کتب سے ثابت ہے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حجرہ مبارک میں اپنے جد اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونیکی اجازت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے چاہی تھی! یہ الگ بات ہے کہ ان کی وفات کے بعد مروان کی مداخلت کے باعث ایسا نہ ہوسکا۔ اس سلسلہ میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ مع اہل وعیال اور دوست احباب مسلح ہو کر آمادہ پیکار بھی ہوئے مگر مروان نے فوری طور پر مسجد نبوی اور روضہ اطہر کے اردگرد فوج متعین کردی!! اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس معاملہ میں جناب حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہمراہیوں کو گزند نہ پہنچ جائے، کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیچ میں پڑ کر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سمجھا بجھا کے نیز مصلحت وقت دکھا کر آپ کے غصہ کو کم کیا۔ اور معاملہ بغیر خون خرابے کے نمٹ گیا۔

لہٰذا اگر حجرہ شریف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ملک نہ تھا تو جناب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اجازت کیوں طلب فرمائی، ایسی صورت میں مروان سے اجازت لینی چاہئے تھی کہ وہ حاکم وقت ہونیکی حیثیت سے بیت المال، اور اوقاف وغیرہ پر متصرف تھا۔ اور اس کے حکم کی وجہ سے جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اجازت بھی مفید نہ ہوئی۔ اگر کسی کو اس روایت سے انکار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ ابن صباغ مالکی کی کتاب فصول مہمہ فی معرفۃ الائمہ، یا دوسری کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اس موقع پر اپنے دلی بغض وعناد سے مجبور ہو کر بہت سے شیعہ بطریق تہمت و افتراء جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ اتہام

لگاتے ہیں، کہ آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اجازت دینے کے بعد پچتائیں، اور ایک خچر پر سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آئیں، دفن سے روکا۔ میراث کا دعویٰ کیا۔ اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ اونکا بونکا شعر پڑھا۔

تجملت تبغلت وان عشت تفیلت
لک التسع من الثمن وبالکل تطمعت

(تم شتر سوار ہوئیں خچر سوار ہوئیں اور زندہ رہیں تو ہاتھی سوار بھی ہوگی تمہارا حصہ تو آٹھویں حصہ کا نواں حصہ ہے مگر تم تو سارا مال ہضم کر گئیں۔

حالانکہ انہیں شاید یہ پتہ نہیں کہ حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نورث ولا نورث (انبیاء کی ہماری جماعت نہ کسی کے وارث ہوتے نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے) کی راوی خود حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی تو ہیں۔ اور پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم کو میراث طلب کرنے سے روکا۔ تو آپ میراث کا دعویٰ کیسے کر سکتی تھیں۔ اور آپ کو سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آنے کی کیا ضرورت تھی تدفین آپ ہی کے حجرہ میں ہونی تھی۔ اپنے حجرہ کا دروازہ بند فرما لیتیں

اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب کیسے صحیح ہو سکتا ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل متروکات کے آٹھویں حصہ کا نواں جس میں حجرے، سکونت و کاشت کی زمین ہتھیار، اونٹ خچر اور گھوڑے بھی شامل تھے۔ بالیقین جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے علاوہ تھے تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ان کے ہضم کر جانے کا الزام کیسے درست ہو سکتا ہے۔ کل میراث نہ آپ کے قبضہ میں گئی نہ آپ نے کھائی!

غرض جھوٹوں پر خدا کی لعنت کے قانون کے مطابق ان مفتریوں کے ہاتھ، لعنت، ندامت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور قانون الٰہی ایسے جھوٹوں کو خود ان کی اپنی زبان سے رسوا کرتا ہے۔

اعتراض - (۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مسکن عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ فرما کر دوران خطبہ یہ الفاظ فرمائے۔

الا ان الفتنۃ ھھنا ثلاثا من حیث تطلع قرن الشیطان۔

آگاہ رہو، فتنہ یہیں ہے۔ تین مرتبہ فرمایا، جہاں سے شیطان کا سینگ نکلتا ہے!

اور اس سے مراد عائشہ (صدیقہ رضی اللہ عنہا) کا فتنہ ہے جبکہ آپ امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے لڑنے کیلئے مدینہ سے بصرہ گئیں۔ اور ہزاروں مسلمانوں کے قتل کا سبب بنیں!

جواب:۔ کلام صحیح ہے مگر مراد باطل ہے۔ اور یہ دانستہ کلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تحریف ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بہت سی جگہوں اور مقامات پر فرمائے ہیں اور اشارہ مسکن عائشہ کی طرف نہیں مشرق کی طرف فرمایا ہے۔ ہر جگہ مسکن صدیقہ رضی اللہ عنہا کہاں! مسجد نبوی میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرماتے تھے یہ اتفاق ہے کہ وہاں سے رخ کرنے سے حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا سامنے پڑتا ہے۔ کیونکہ آپ کا مسکن مشرقی جانب تھا۔ پھر آئندہ کی عبارت کو تو دیکھو کیوں کہ قرن شیطان کے طلوع کی جگہ مسکن عائشہ نہیں سمت مشرق ہے۔ اور وہ روایت جو ان الفاظ سے سمت مشرق کی مراد ظاہر کرتی ہے خود انہیں کی کتابوں میں موجود ہے! مگر انتہائی بغض وحسد اور شرارت کی بنا پر ادھر سے آنکھیں موندلی ہیں اور غلط مراد (معنی) کو پھیلانے میں اخوان الشیاطین کا کردار ادا کرتے جا رہے ہیں۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم کی روایت اس قصہ کے سلسلہ میں بیجا شبہ دور کرنے میں کافی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

راس الکفر ھھنا واشار نحو المشرق حیث یطلع قرن الشیطان فی ربیعۃ ومضر۔

کفر کا سرا یہاں ہے اور اشارہ فرمایا سمت کی طرف جہاں قرن شیطان طلوع ہوتا ہے ربیعہ مضر میں۔

اس امت مرحومہ میں جو فتنہ بھی اٹھا اسی سمت سے اٹھا۔ سب سے پہلا فتنہ مالک بن اشتر کا خروج تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی حضرت عثمان

شہید رضی اللہ عنہ کے خلاف کوفہ سے نکلے اور کوفہ مدینہ منورہ سے جانب مشرق ہے!

دوسرا فتنہ عبید اللہ بن زیاد کا تھا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنا اس کے بعد مدعی نبوت مختار ثقفی کا فتنہ نمودار ہوا، پھر اکثر بدعات اور باطل عقائد ان ہی اطراف سے رونما ہوتے رہے۔ اسی لئے رافضیوں کا منبع بھی کوفہ ہے اور معتزلہ کی جائے پیدائش بصرہ۔ واصل بن عطا بصری ہے۔ قرامطہ کوفہ کے علاقہ کی پیداوار ہیں۔ خوارج نہروان سے نکلے تو دجال اصفہان سے!

اس شخص کے کفر میں کیا شک ہوسکتا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سفر بصرہ کو آڑ بنا کر آپ کے مسکن ومحل کو مقام فتنہ کہتا یا خیال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ تو منبع ایمان، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا مسکن تھا، جن کے اسم مبارک ہی سے فتنہ کفر بھاگتے ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اس حجرہ مبارک سے حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہوئیں تھیں۔ فتنہ اندازی تو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھی۔ اگر بصرہ کا سفر معاندین کے نزدیک ناگوار سفر ہو بھی تو اس کے لئے تو آپ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئیں، تو اب مکہ مکرمہ (العیاذ باللہ) محل فتنہ ہونا چاہیئے حجرہ مبارک کیوں؟

اعتراض۔(۱۰) یہ لوگ روایت کرتے ہیں کہ

اِنَّ عَائِشَۃَ شَوَّفَتْ جَارِیَۃً وَقَالَتْ لَعَلَّنَا نَصِیْدُ بِھَا بَعْضَ فِتْیَانِ قُرَیْشٍ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی کا بناؤ سنگار کیا اور مقصد یہ بتایا کہ شاید اس طرح ہم کسی قریشی جوان کو شکار کر سکیں۔ کہ وہ اس کی طرف مائل ہو کر اس سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوجائے اور میرے حلقہ تابعداری میں آجائے۔

جواب:۔ اول تو چند وجوہ سے یہ روایت مجروح ہے، اور اس سے ثبوت پیش کرنا درست نہیں۔ مثلاً یہ روایت وکیع بن جراح سے مروی ہے جو انہوں نے عمار بن عمران سے انہوں نے عنم (قبیلہ) کی ایک عورت سے اور اس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے اس میں عمار بن عمر مجہول الحال ہے، کوئی نہیں جانتا وہ کیسا آدمی تھا۔ اور عنم کی عورت اسم ومسمی دونوں جہت سے مجہول الحال ہے نہ کوئی اس کا نام جانتا ہے نہ اس کا حال چال۔ اس لیے ان دونوں کی بات معتبر اور قابل حجت نہیں۔ پھر اس روایت میں عنعنہ ہے۔ اور یہ مرسل ومنقطع دونوں کا احتمال رکھتا ہے کوئی جہت اس سے متعین نہیں ہوتی، ایسی بے سروپا روایات سے تمسک کرکے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ذات مطہر پر طعن کرنا کسی مومن کی تو شان نہیں ہوسکتی۔ اگر وجہ عداوت شے دیگر ہو تب بھی یہ خلاف انصاف ہے کہ اپنی عداوت کے اظہار کے لئے دوسرے کے ایمان میں خلل اندازی کرے اور ان کے لئے ایسے حربے استعمال کرے۔ اور پھر یہ طعن کی بات ہے ہی نہیں۔ اپنی متبنیٰ، لڑکی یا پروردہ لونڈی وغیرہ کے لئے مناسب بر ڈھونڈنا کونسی عار بات ہے۔ اور اس غرض ومقصد سے لڑکی کا بناؤ سنگھار کرنا کہ اس سے نکاح کی رغبت ہو مسنون مستحب ہے! اور ہمیشہ سے رائج اور جاری ہے۔ (کیا طعن کرنے والے اپنی لڑکیوں کو دولہا کے اعزہ کے سامنے بھوتنی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یا کچھ بناؤ سنگھار کرتے ہیں! اور کیا وہ بہترین داماد کے حصول کے لئے، زیبائش کو واقعی قابل اعتراض طریقہ مانتے ہیں۔)

صحاح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ منقول ہیں جو آپ نے اپنے متبنیٰ جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی نسبت فرمائے۔ جو سیاہ فام اور کریہ المنظر تھے!

لَوْ کَانَ اُسَامَۃَ جَارِیَۃً لَکَسَوْتُھَا وَحَلَّیْتُھَا حَتّٰی اَنْفَقَھَا۔ اگر اسامہؓ لڑکی ہوتے تو میں ان کا بناؤ سنگھار کرتا۔ ان کو زیور پہناتا تا کہ ان کی طرف لوگ راغب ہوں۔

اور آج بھی شرفاء وغیر شرفاء سب میں یہ طریقہ جاری ہے کہ منگنی کے وقت لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کرتے، اچھا لباس اور بقدر میسر زیورات وغیرہ سے زیبائش بڑھاتے ہیں۔ بلکہ ایسے موقعہ پر زیور مانگ مانگ کر آرائش اور ناموری کرتے ہیں۔ تاکہ عام دنوں میں نظر آنے والی لڑکی میں

ایسا اظہار نظر آئے جو باعث ترغیب ہو، اور دولہا دلہن متاثر ہو کر اسے پسند کر لیں۔ تو ایسی بات جو دنیا کے تمام طبقات حتیٰ کہ طعن کرنے والوں کے اپنے ہاں بھی، رائج اور معمول بہ ہو اور شرعاً بھی سنت و مستحب ہو وہ قابل اعتراض و موجب طعن کس منطق سے ہو گئی!

بلا تخصیص عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر اعتراضات

ایسے اعتراضات دس ہیں۔

اعتراض۔ (۱) صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ اوّل جنگ اُحد میں کہ سب بھاگ اٹھے دوم جنگ حنین میں کہ وہاں بھی ان کے قدم اکھڑ گئے۔ یہ دونوں جہاد کفار کے مقابلہ میں تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرہی میں کفار کی لڑائی سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے!

جواب:- جنگ اُحد کے وقت تک فرار سے ممانعت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر یہ لغزش معاف بھی کر دی گئی۔ ولقد عفا اللہ عنھم! (خدا نے جسے معاف کر دیا مگر آپ اسے معاف کرنے پر تیار نہیں۔ ایسی حالت میں تو آپ اپنے ایمان کی خیر منایئے۔ ن)

اور پھر جنگ اُحد میں منافقین تو لڑائی سے پہلے ہی بھاگ لئے تھے! مسلمان دو بدو ہوئے باقاعدہ لڑائی لڑی۔ مگر جب شکست ہوئی اور یہ مشہور ہوا کہ (خاکم بدہن) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی۔ تو ایسی حالت میں کہ سردار لشکر نہ رہے اور جمعیت تباہی کی نذر ہوئی ہو تو ایسی حالت میں فرار کی ممانعت نہیں۔

اور جنگ حنین کی پسپائی کو فرار کہنا تو کھلی دھاندلی ہے۔ یہ تو ایک جنگی چال تھی جو پہلی غلط چال اور بے تدبیری کی اصلاح اور لشکر کو نقصان سے بچانے کے لئے کی گئی۔ ہوا یہ کہ میدان جنگ کا بغور جائزہ لینے کا موقعہ نہ ملنے کے سبب یہ بات اور دشمن کی چال سامنے نہ آسکی کہ دشمن نے تنگ راستہ کے اطراف کی جھاڑیوں میں اپنے تیر انداز متعین کر کے چھپا دیئے ہیں۔ مسلمان بے فکر آگے بڑھے تو اس اچانک حملہ اور افتاد سے سراسیمہ ہو گئے، اور انتشار میں مبتلا ہو گئے، اس وقت بھی پسپا ہونے والے بھی مہاجر و انصار کے کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان صحابہ تھے جو فتح مکہ یا بعد میں مسلمان ہوئے۔ مگر ان کی پسپائی کو بھی فرار کہہ سکتے اس لئے صورت حال سمجھ میں آنے کے بعد یہ فوراً پلٹے اور پھر مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے۔ (اور پھر جس ذات گرامی و محترم صلی اللہ علیہ وسلم، کی "جھوٹی حمایت" کا دم بھر کر یہ معترض ان کے جاں نثاروں کو مطعون کرنے اور انہیں گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دینے کے لئے مضطرب و بے چین ہیں جب انہوں نے ہی اپنے اصحاب و ساتھیوں کو کچھ نہ کہا تو یہ جو نہ تین میں نہ تیرہ میں! کیوں ناز خائی میں اپنا ایمان ضائع کر رہے ہیں نا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ (پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔ اور ایسے لشکر اتارے جنکو تم دیکھ نہ پائے تھے۔)

(تم جن کو بزعم خود کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر اپنے بغض و کینہ کا نشانہ بنا رہے ہو، اللہ کے ہاں ان کے مرتبہ کا کچھ جلوہ نظر آیا کہ نہیں۔ ان کے لئے سکینت خداوندی کا نزول ہو رہا ہے لشکر خداوندی ان کی مدد کے لئے اتر رہا ہے۔ اور پھر وہ مظفر و منصور لوٹ رہے ہیں! مگر اس سب کے باوجود تمہیں وہ اب تک کبیرہ کے مرتکب ہی نظر آرہے ہیں۔ ن) ابو القاسم بن سعید شیعی نے اپنی کتاب شرائع میں بطور نص یہ بیان کیا ہے کہ جب جنگ میں ہلاکت کا یقین ہو جائے تو جنگ سے بھاگنا جائز ہے۔ (تو اب یہ کس منہ سے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں)

اور پھر یہ شیعہ تو اپنی کتابوں میں درج صحیح روایتوں کے سبب انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب مانتے ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام وغیرہ جنکا معصوم ہونا قطعی ہے۔ اس پر اجماع بھی ہے۔ تو اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو معصوم بھی نہیں ہیں۔ کسی کبیرہ کا ارتکاب ہو بھی گیا تو ان کے نزدیک طعن کا کیا جواز، خصوصاً جب وہ گناہ، توبہ و استغفار اور رحمت الٰہی سے محو بھی کر دیا گیا ہو۔

پھر یہ گناہ ان کی طاعات اور جہاد کی مشقتوں کے اجر کو ملیا میٹ نہیں کر سکتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں وارد قرآن و احادیث متواترہ کی بشارات سے چشم پوشی کرنا اور اکا دکا بشری لغزشوں کی ٹوہ میں لگا رہنا۔ کسی صاحب ایمان کی شان تو ہرگز نہیں۔ (معاندین کے جھک مارنے سے اللہ و رسول کے نزدیک تو ان کے مرتبہ میں ستی بھر کمی نہیں آسکتی۔ البتہ عاقبت انہیں کی خراب ہوگی۔ ن)

ویسے بھی ان شبہات سے اہل سنت کے اعتقاد میں تو کوئی خلل پڑتا نہیں اس لئے معاندین کی یہ ساری تگ و دو لا حاصل ہے کیونکہ وہ صحابہ کی عصمت کے قائل نہیں۔ اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا ہو تو کیا غم۔ (جبکہ غفور الرحیم خدا کی ذات ہے۔ ہاں معاندین کے ہاتھ میں بخشش کا کام ہوتا۔ تو سوچتے۔ ن)

اہل سنت کی راہ اعتدال کی راہ ہے اس لئے وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً حقوق صحبت، خدمت رسول، ان کی جانبازیاں و جاں نثاریاں، راہ خدا میں گھر بار، جان و مال، آل و اولاد لٹا بیٹھنا، دین و شریعت کو رائج کرنا، اور وہ آیات جو ان کی شان میں نازل ہوئیں اور وہ احادیث جو ان کی رفعت شان اور بلندی درجہ پر حرف آخر ہیں وہ سب ان کے پیش نظر رہتی ہیں لیکن شیعہ! کہ ان کو عیبوں اور گناہوں کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں

اعتراض۔ (۲) کچھ بلکہ اکثر صحابہ کرام نے جب ڈھول اور اونٹوں کی آواز سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا خطبہ دیتے چھوڑ کر کھیل تماشے اور خرید و فروخت کے لئے دوڑ پڑے۔ اور اس دنیا کی متاع قلیل پر نماز جیسی اہم اور بنیادی رکن اسلامی کو اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں قربان کر دیا۔ ان کا یہ عمل صاف طور پر بے دیانتی پر دال ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں فرمایا گیا۔ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ٳنْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔ جب کاروبار یا کھیل کود کی کوئی بات دیکھ پاتے ہیں تو اس کی طرف چھپٹ پڑتے ہیں اور آپ کو اکیلا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

جواب — یہ قصہ ہجرت کے ابتدائی ایام کا ہے، جبکہ ہنوز احکام و آداب شریعت سے سب حضرات کو پوری واقفیت حاصل نہ تھی۔ قحط کے ایام تھے، جس کی وجہ سے سب کو پریشانی لاحق تھی! تجارتی قافلہ کا شدت سے انتظار تھا۔ خدشہ یہ بھی تھا کہ قافلہ کا سارا اناج یکمشت کسی نے لے لیا، یا قافلہ گزر گیا تو نرخ گراں تر ہو جائے گا۔ ان ہی حالات کی بنا پر اضطراری طور پر ادھر چھپٹ پڑے۔ مگر کبار صحابہ مثلاً ابوبکر صدیق و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بدستور مسجد میں بیٹھے رہے۔ پور تربیت و تادیب سے قبل کا کوئی فعل، افعال جاہلیت کی مانند قابل عتاب اور لائق اعتراض نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کا انداز گو عتاب اور تادیب کا ہے مگر اس کے باوجود انجام کار سے ڈرایا یا کسی عذاب کا مورد نہیں بتایا گیا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حضرات پر نہ عتاب فرمایا نہ غصہ ہوئے نہ ڈانٹ ڈپٹ فرمائی۔ تو اب اور کس کی یہ مجال یا حق ہے کہ وہ ان نفوس مقدسہ پر طعن یا اعتراض کرے۔

اور پھر لغزش کا صحابہ، یا امتیوں سے سرزد ہونا نہ بعید از عقل ہے نہ تعجب کی بات کہ ان میں عصمت کا جوہر ہوتا ہی نہیں۔ معصوم انبیاء و رسل علیہم السلام تک سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو عتاب الٰہی کا باعث تھے! ایسے امور کا تقاضائے بشریت کے سبب ظہور ناگزیر ہے۔ پے بہ پے تنبیہات کے سبب ہی تو تہذیب و تادیب حاصل ہوتی ہے۔

اعتراض۔ (۳) اہل سنت کی صحاح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت موجود ہے۔

سیجاء برجال من امتی فیوخذ بہم ذات الشمال فاقول اصیحابی اصیحابی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم وانت علی کل شیء شہید فیقال انہم لن یزالوا مرتدین علی اعقابہم منذ فارقتہم۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) میری امت کے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لیجایا جائیگا تو میں کہوں گا یہ تو میرے امتی ہیں، یہ تو میرے امتی ہیں (انہیں جہنم میں کیوں لے جا رہے ہو) اس پر مجھے بتایا جائیگا کہ آپ واقف نہیں۔ آپ کے بعد انہوں نے کیسے کیسے عمل کئے۔ جنکی پاداش میں ان کو لیجایا جا رہا ہے) تب میں وہ الفاظ دہراؤں گا جو اللہ کے ایک صالح بندہ (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہے تھے کہ جب تک میں ان میں موجود رہا ان کا نگران رہا اور تو نے مجھے ان کے درمیان اٹھا لیا۔ تو آپ ان کے نگران رہے۔ اور آپ تو ہر شے کے نگران اور جاننے والے ہیں۔ تو کہا جائیگا کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تو یہ تب سے مرتد ہی رہے۔

جواب:۔ حدیث مذکورہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مرتد سے مراد وہ لوگ ہیں جنکی موت ارتداد ہی پر ہوئی۔ اور جو مرتد ہوئے ان میں سے کسی کو بھی اہل سنت نہ صحابی کہتے اور مانتے ہیں، نہ ان کے فضائل وخوبی کا کوئی معتقد ہے۔ قبیلہ بنی حنیفہ اور بنی تمیم کے اکثر لوگ بصورت وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آئے مگر وہ ارتداد کی وبا کا شکار ہو کر خائب وخاسر ہوئے!

اہل سنت کی گفتگو کا موضوع تو وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہیں جو ایمان وعمل صالح کے ساتھ راہی سفر آخرت ہوئے۔ اور اختلاف رائے کے باعث آپس میں لڑے جھگڑے بھی۔ قتل وقتال تک کی نوبت بھی باہم ہوئی۔ اس سب کے باوجود دونوں متحارب جماعتوں نے باہم ایک دوسرے کو نہ کافر کہا، نہ بدعتی! بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ایمان کی گواہی دیتے اور مؤمن کہتے اور مانتے رہے!

ایسے باایمان اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان کی زنبیل میں کوئی روایت ہو تو پیش کریں۔

یہ قصہ تو ان مرتدوں کا ہے جو فریقین کے نزدیک مرتد تھے! بحث تو مرتدوں کے ساتھ جنگ وجدال کرنے والے مسلمانوں سے ہے! وہ تو بلا شبہ دین کا علم بلند کرنے والے تھے۔ انہوں نے تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ قیصر وکسریٰ کی عظمت وشوکت کو پاش پاش کیا لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا۔ قرآن مجید کی تعلیم دی۔ صلوٰۃ قائم کی شریعت سکھائی۔

خدا کے دشمنوں سے جہاد میں، کافر کو مسلمان بنانے، دین وشریعت اور قرآن کی تعلیم دینے میں جو اجر وثواب ہے اسے ہر مسلمان جانتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایسے حضرات کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بشارتیں بھی دیں اور اچھے وعدے بھی فرمائے۔ ذیل میں آیات ملاحظہ ہوں۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا

تم میں سے اہل ایمان اور اچھے عمل کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے۔ کہ انکو خلافت ارضی کا اسی طرح حقدار بنا دیگا جسطرح ان سے پہلوں کو بنایا تھا۔ اور ان کو ان کے اس دین میں جو ان کے لئے پسند کیا گیا ہے تمکن عطا فرمائے گا۔ اسکے بعد انکے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ تاکہ یہ میری عبادت کریں اور اس میں کسی کو بھی میرا شریک نہ ٹھہرائیں۔

چند جگہ ان کے متعلق ارشاد فرمایا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ! (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں)

واعد لہم جنت تجری من تحتہا الانہار خلدین فیہا ابدا۔

ان کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جنکے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا۔

مؤمنوں کو یہ بشارت دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے بڑے اعزاز و اکرام ہیں!

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔

پس جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنکو محض میری راہ میں تکلیف دی گئی اور جنہوں نے جہاد کیا مرنے بھی مارا بھی، میں ان کی لغزشوں کو معاف کروں گا اور ان کو ایسے باغوں میں رکھوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

یہاں ایک باریک بات جان لینی چاہئے کہ انبیاء السلام پر سب و شتم اور طعن اس لئے کفر و حرام ہے، کہ ان میں سب و شتم کی وجہ یعنی گناہ و کفر سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ حضرات کرام تو اپنی ذات میں تعظیم و توقیر اور مدح و تعریف کے بے شمار اسباب اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اب مسلمانوں کی وہ جماعت جو اپنے اندر اعزاز و اکرام، تعظیم و توقیر کے اسباب کی حامل ہو اور نص قرآنی سے ان کے گناہوں اور لغزشوں کی بخشش و معافی بھی ثابت ہو چکی ہو تو ایسی جماعت بالیقین اعزاز اکرام میں انبیاء کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی جماعت کی بدگوئی کرنا اس کو ہدف ملامت بنانا اس کی اہانت و تحقیر کرنا بھی حرام ہے!! فرق صرف اتنا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں تو اسباب تحقیر سرے سے تھے ہی نہیں۔ ان میں تھے مگر وہ مٹا دیئے گئے اور مآل کار یہ کہہ سکتے ہیں کہ گویا کہ یہ اسباب ان میں تھے ہی نہیں، اس لئے کہ توبہ کر لینے والے کی طرف گناہ و لغزش کی نسبت حرام ہے!

سوائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عام امتیوں کا یہ حال نہیں ہے کہ ان کے گناہوں کی معافی کا ہمکو علم وحی، اور قرآن سے قطعی معلوم ہو گیا ہو، یا ان کی طاعتوں کا قبول ہونا اور ان کے اعمال سے بالتخصیص اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا بطریق یقین ثابت ہو گیا ہو۔ گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طبقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور عام امتیوں کے درمیان بطور برزخ ہے۔ اسی لئے جمہور علماء امت کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ کے علاوہ کوئی شخص کتنا بھی متقی و پرہیزگار ہو صحابہ کرام کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ یہ بڑا قیمتی اور نفیس نکتہ ہے اسے ذہن نشین رکھنا چاہئے۔ پھر ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا گیا۔ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا۔

ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی رحمت اپنی خوشنودی اور ان باغات کی جو ان کے لئے ہیں جن میں برقرار رہنے والی نعمتیں ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمکو ایمان کی محبت عطا فرمائی اسے تمہارے دلوں کی رونق و زینت بنایا۔ اور کفر و فسق اور گناہ سے تمہارے اندر نفرت اور کراہت پیدا فرمائی

اس آیت سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ پاکبازوں کی اس جماعت میں سے کسی سے اگر کسی فسق و عصیان کا ارتکاب ہوا بھی ہے تو وہ خطا، سہو، یا مغالطہ اور غلط فہمی کے سبب ہوا۔ ورنہ فسق و نافرمانی کو برا جانتے اور سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب محال و ناممکن ہے۔ اور عقلاء کے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ثابت و طے شدہ ہے کہ اختیاری اعمال و افعال کرنیکے لئے یہ بات (ابتدائی ضروری و لازمی شرط ہے کہ وہ اس کو کرنے سے پہلے اچھا بھی سمجھتا ہو اور اس کی طرف شوق و میلان بھی رکھتا ہو۔ اور یہ اوپر کی آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے دلوں کی گہرائی میں کفر، فسق اور عصیان سے کراہیت اور نفرت موجود تھی۔ اس لئے، دانستہ اور شوق و خوشی سے کسی برائی کے ارتکاب کا ان کے متعلق خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ وہی سچے پکے مؤمن ہیں۔ اپنے رب کے نزدیک ان کے لئے مراتب عزت بھی ہیں۔ معافی بھی ہے۔ اور عمدہ رزق بھی!

اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ ان کے ظاہری افعال و اعمال، نماز روزہ، حج و جہاد نہ دکھاوے کے تھے نہ ان میں نفاق وغیرہ کا کھوٹ ملا ہوا تھا یہ تو بڑے سچے اور کھرے مؤمن تھے۔ کہ اپنے رب کے پاس باعزت مراتب بھی رکھتے تھے۔ اور عمدہ میزبانی بھی حاصل تھی۔ اور یہ مراتب و میزبانی کی عزت اسی لئے پائی تھی کہ ان کے رب نے ان کی بخشش و مغفرت فرمادی تھی۔ اور ان کا ایمان حقیقی اور یقینی تھا!

یہ بھی ارشاد فرمایا لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ ہاں رسول اور ان کے ایمان والے ساتھیوں نے اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کئے اور بھلائیاں انہیں کے لئے ہیں۔ اور کامیاب و کامران بھی یہی ہیں!

ایک جگہ ارشاد ہے۔ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ تم میں سے فتح سے قبل جان و مال سے جہاد کرنے والوں کی کوئی برابری نہیں کرسکتا وہ بڑے بلند مرتبہ لوگ ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جنہوں نے فتح کے مال و جان سے جہاد کیا۔ اور اللہ کا وعدہ ہر ایک سے بھلائی اور بہتری کا ہے! اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے!

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ وَيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ فقراء مہاجرین جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کے اموال چھینے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے طلبگار اور اللہ و رسول کی مدد کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

آخر آیت تک کا مضمون سامنے رکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان نفوس مقدسہ سے نفاق کے احتمال تک کو واضح اور کھلے الفاظ میں باطل کرتی ہے!

نیز ارشاد ربانی۔ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔ وہ دن کہ نہیں رسوا کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور ان کے مؤمن ساتھیوں کو ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑتا پھریگا۔

یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہ ہوگا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی وفات کے بعد بھی ان کا نور زائل نہ ہوگا۔ ورنہ زائل شدہ اور لٹا ہوا نور قیامت کے دن ان کے کیسے کام آسکتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان، وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ اپنے پاس سے ان کو نہ ہٹائیے جو صبح و مسا اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اسی کی ذات کے طالب ہیں!

بھی ان محترم و مکرم حضرات رضی اللہ عنہم کے متعلق نفاق کے احتمال کو بھی باطل کرتا ہے۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ۔ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ہمارے فرمانوں کو ماننے والے اور ان پر ایمان رکھنے والے جب آپ کے پاس آئیں تو بعد سلام ان کو بتائیے کہ تمہارے رب نے ازراہ مرحمت اپنے لئے یہ طے فرمالیا ہے کہ تم میں سے ازراہ نادانی کوئی برائی کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلے (تو اسکی مغفرت ہوگی) کیونکہ وہ غفور رحیم ہے!

ان کے گناہوں کے بخشے جانے کی اس سے واضح اوصاف دلالت کیا ہوگی۔ جب رب غفور نے ان کو دامن رحمت میں لے کر معاف فرمادیا تو

اب مواخذہ کا سوال ہی نہیں ! ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ.

اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان و اموال کے بدلہ جنت کا سودا کرلیا ہے۔ کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کر کے مریں گے بھی ماریں گے بھی ! یہ پختہ وعدہ توراۃ و انجیل اور قرآن میں درج ہے اور اللہ سے اپنے عہد کو پورا کرنے میں کون بڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے حق میں بدا محال ہے، کہ بہشت اور مغفرت کے خبر دینے کے بعد ان کو عذاب دیں، یا دوزخ میں ڈالیں۔ اس لئے کہ وعدہ میں بدا جائز نہیں۔ ورنہ وعدہ خلافی لازم آئیگی۔ نیز فرمایا لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ۔ (اللہ تعالیٰ ان مؤمنوں سے خوش اور راضی ہوا جنہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی۔ ان کے دلی جذبات سے بھی آگاہ ہوا۔) اس آیت سے معلوم ہوا کہ رضامندی محض ان کے عمل سے نہ تھی بلکہ ان کے دلوں میں ایمان صدق و اخلاص، ثابت و برقرار تھے، اور جو ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے رضاء الٰہی کا وہی اصلی سبب تھے !

یہاں بعض نادان شیعہ کہدیتے ہیں کہ کام سے رضامندی، اس شخص سے رضامندی کو مستلزم نہیں۔ مگر وہ عناد سے اتنے مغلوب معلوم ہوتے ہیں کہ آیت کے الفاظ پر توجہ دینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ فرمایا ہے۔ عَنْ بَيْعَةِ الْمُؤْمِنِينَ نہیں فرمایا۔ اور فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ کو اس کا ضمیمہ و تتمہ بتایا۔ تو ظاہر ہے کہ ثبات و اخلاص اور ارادوں کا محل تو دل ہے، تو خوشنودی صاحب فعل سے متعلق ہے فعل سے نہیں۔ اور نفع اندوزی منشاء فعل سے متعلق ہے صورت فعل کے ساتھ نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اگر کسی کو حفظ قرآن کی نعمت میسر آجائے اور اسکی حدیث و روایات تک رسائی نہ بھی ہوئی ہو تب بھی اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق شبہ میں پڑے یا ان کی بزرگی اور اعزاز و اکرام میں کسی قسم کا شک کرے۔ اس لئے کہ قرآن کا اکثر حصہ ان ہی نفوس قدسیہ کی تعریف و توصیف سے بھرا ہوا ہے۔ ناظرہ خواں بیچارہ آیت کا ایک لفظ پڑھتا اور سن لیتا ہے مگر اس کو اس کے آگے پیچھے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور اسی لئے وہ اس پر غور و تدبر بھی نہیں کرسکتے نہ یہ معلوم کرسکتے ہیں اس میں کون کون سی قیود ہیں اور نظم قرآنی میں اس کا ضمیمہ کس کس چیز کو قرار دیا گیا ہے تاکہ غلط راہوں، اور جاہلوں کو اس میں تاویل و تحریف یا من مانے معنے پہنانے کی گنجائش نہ مل سکے !

اللہ کی قسم ! اگر میرے والد ماجد مجھے حفظ قرآن کے علاوہ کوئی اور تعلیم نہ بھی دیتے تب بھی ان کا یہ کام عظیم الشان ہوتا کہ میں تاعمر اس کا شکریہ نہ ادا کرسکتا۔ یہ ساری نعمت مجھے حفظ قرآن کی بدولت میسر آئی کہ ہر دینی مشکل میں اسی سے کام لے کر حل کرلیتا ہوں۔ والحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

اعتراض۔ (۸) یہ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "قرطاس و قلم" طلب فرمایا تو صحابہ نے تعمیل کے بجائے حیلے حوالے سے کام لیا اور آپ سے حجت بازی کی اور جھگڑے !

جواب:۔ اس کا اصل اور تفصیلی جواب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اعتراض کے موقعہ پر دیا جا چکا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جنکے دماغوں میں بغض و عناد اور بدگمانی و بدظنی کا غبار بھرا ہو وہ دوستی اور محبت کے لطیف جذبات کو نہ سمجھ پاتے ہیں نہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے سبب اسوقت جو کیفیت تھی اور آپ جتنے مضطرب و بے چین تھے، اسوقت آپ کو ایسے معاملہ کے لئے جو کسی عنوان طے پا چکا ہو، اور آئین و شریعت کی اس کے ذریعہ کوئی ضرورت پوری بھی نہ ہو رہی ہو، ایسے عالم میں ہر محب مخلص اپنے محبوب

کو ناروا اور فضول مشقت سے بچانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اعتراض کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ اسوقت کے حاضرین مجلس میں اکثریت حضرات اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی تھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تو کم تعداد میں تھے۔ اب اعتراض کا سارا زور اقلیت پر ڈالدینا جبکہ اکثریت کی شرکت اور مرضی سے وہ فعل انجام پذیر ہوا ہو، انتہائی درجہ بد دیانتی اور بیہودگی ہی کہلا سکتی ہے۔

پھر اس واقعہ کے بعد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پانچ یوم حیات رہے۔ اہل بیت ہمیشہ خدمت میں رہے، سامان نوشت وخواند موجود اور دسترس میں رہا۔ کاتب بھی متعین رہے۔ اگر وہ کوئی بہت ہی اہم دینی معاملہ تھا تو ساری سہولتوں کی موجوگی کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس خواہش کا یا اس کی تکمیل کا اظہار یا اعادہ کیوں نہ فرمایا اسوقت تو کوئی حیلہ باز اور جھگڑنے والا آپ کے آس پاس نہ تھا کیا کوئی مسلمان نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں "ترک واجب" کی سوء ظنی کے بعد بھی اپنا ایمان سلامت رکھ سکتا ہے!

اللہ تعالی کی جناب سے جنکو "خیر امت" اور "امت وسط" کے معزز القاب عنایت ہوئے ہوں، جن کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہو، اور جو "شہداء علی الناس" کا تمغہ رکھتے ہوں ان کی نسبت "بدترین امت" کا اعتقاد، خیال و گمان رکھنا۔ اللہ تعالی کی مرضی ہی کے خلاف نہیں نصوص قرآنیہ کی کھلم کھلا مخالفت بھی ہے!

اعتراض۔ (۵)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی بجا آوری میں سہل انکاری سے کام لیتے تھے مستعدی اور لپک جھپک نہیں دکھاتے۔ بلکہ کاہلی اور سستی دکھاتے۔ آپ کے مقاصد سے روگردانی کرتے۔ جان چراتے اور بے جا ٹال مٹول سے کام لیتے۔ اسکی دلیل میں وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ یوم احزاب کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلَا رَجُلٌ یَّاْتِیْنِیْ بِخَبَرِ الْقَوْمِ جَعَلَهُ اللّٰهُ مَعِیَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَلَمْ یُجِبْ اَحَدٌ وَکَانَتْ تَهُبُّ رِیْحٌ شَدِیْدَةٌ وَقَرٌّ فَقَالَ یَا حُذَیْفَةُ قُمْ فَلَمْ اَجِدْ بُدًّا اِذْ دَعَانِیْ بِاسْمِیْ اِلَّا اَنْ اَقُوْمَ قَالَ فَاذْهَبْ فَأْتِنِیْ بِخَبَرِ الْقَوْمِ فَلَمَّا وَلَّیْتُ مِنْ عِنْدِهٖ جَعَلْتُ کَاَنَّمَا اَمْشِیْ فِیْ حَمَّامٍ حَتّٰی رَاَیْتُهُمْ وَرَجَعْتُ وَاَنَا اَمْشِیْ فِیْ مِثْلِ الْحَمَّامِ فَلَمَّا اَتَیْتُهٗ وَاَخْبَرْتُهٗ قُرِرْتُ۔

کیا کوئی شخص ایسا ہے جو مخالف لشکر کی مجھے خبر لادے۔ (اس کے اجر میں) اللہ تعالی قیامت کے دن اسے میرے ساتھ رکھیں گے، مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ اسوقت سخت طوفانی جھکڑ چل رہے تھے اور بہت ٹھنڈ تھی۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا حذیفہ تم اٹھو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میرا نام لیکر فرمایا تو مجھے اٹھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آپ نے فرمایا جاؤ اور مخالف لشکر کی خبر لاؤ۔ جب میں وہاں سے چلا ہوں تو ایسا معلوم ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں حتی کہ میں لشکر کو دیکھ کر واپس ہوا تب بھی کیفیت ایسی ہی تھی۔ جب واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے چکا تو مجھے ٹھنڈ لگنے لگی۔

ان لوگوں کا یہ اعتراض اس لیے قابل جواب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حکم کی شکل میں نہیں تھا بلکہ ایسی بات کی صورت میں تھا جو عمومی طور پر سامنے رکھی جاتی ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالی کے درج ذیل ارشادات کی طرح ہے

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا۔

ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھی، کہ اسے برداشت کریں، مگر وہ اس سے ڈر گئے اور اسے اٹھانے سے انکار کردیا۔

نیز فرمایا۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا۔

پس اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں خوشدلی سے آؤ یا بادل نخواستہ؛

فَقَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ۔ دونوں نے کہا ہم خوشدلی ہی سے آتے ہیں!

اور قرائن حالیہ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ امر شرعی تبلیغ نہ تھا۔ اور امر ہونے کے باوجود یہ کہاں سے لازم آیا کہ وہ وجوب کے لئے تھا بلکہ اس کا جملہ جعلہ اللہ معی یوم القیمۃ۔ اس کے مندوب و مستحب ہونے پر واضح دلیل ہے۔ کیونکہ واجبات میں ثواب کا وعدہ نہیں فرماتے۔ اگر فرماتے بھی ہیں دخول جنت یا دوزخ سے نجات پر اکتفا فرماتے ہیں۔ اس خاص ثواب کا وعدہ اس کے مندوب ہونے کی واضح دلیل ہے!

بطور اصول یہ بات طے شدہ ہے کہ امر وجوب کے لئے بھی ہو تو وہ وجوب کفایہ ہوگا۔ موسم چونکہ بہت شدید سرد تھا اس لئے ہر ایک نے چاہا کہ یہ کام کوئی دوسرا کرے۔ اگر یہ حکم فرداً فرداً ہر ایک پر واجب ہوتا تو اس کی بجا آوری میں سارے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور جلد از جلد بجا آوری کا مظاہرہ کرتے۔

اگر یہ کوئی بھی بات نہ مانیں تو پھر یہ بتائیں کہ کیا یہ طعن جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ بھی تو اس وقت اس جماعت میں شامل اور موجود تھے! آپ نے اس حکم کی تعمیل کیوں نہ فرمائی اور حکم بجا لانے میں عجلت کیوں نہ برتی! اتنے کچھ کے بعد بھی اگر جناب امیر و دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں یا وہ گوئی کرے اور خیالات بد کو دل میں جگہ دے، تو ان کے منہ توڑنے کے لئے، کتاب اللہ، احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتب سیر سے ہزاروں دلیلیں ان کے منہ پر ماری جا سکتی ہیں۔ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کا تمغۂ صداقت و شہادت ان حضرات کے لئے قرآن مجید میں موجود ہے۔ جو مہاجرین و انصار اور مجاہدین رضی اللہ عنہم کو اطاعت و انقیاد کی وجہ سے مرحمت فرمایا گیا۔

بخاری و مسلم اور کتب سیر میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جان نثاری، پروانہ وار فدائیگی اور آپ پر دل و جان قربان کرنے کی کیفیات ساری کی ساری محفوظ و موجود ہیں! ان حضرات کے متعلق یہ الفاظ تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں کہ

كَانُوْا يَبْتَدِرُوْنَ اِلٰى اَمْرِهٖ۔ وَكَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وُضُوْئِهٖ وَاِذَا نَخَمَ وَقَعَ فِىْ كَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَدَلَكَ مِنْهَا عَلٰى وَجْهِهٖ۔

وہ آپ کے حکم بجالانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی پر لڑ پڑنے کے قریب ہو جاتے۔ اگر آپ کی کلی کا پانی کسی کی ہتھیلی پر آپڑتا تو وہ فوراً اسے اپنے منہ پر مل لیتا۔

کسی ذات کے ساتھ یہ شیفتگی و وارفتگی کسی نے پہلے کہاں دیکھی ہوگی، اور جس نے اب دیکھ لی وہ حیران رہ گیا۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جناب عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جو اس وقت مشرکین مکہ میں سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن۔ وہ مکہ والوں کی طرف سے سوال و جواب کے لئے آئے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و شیفتگی کی یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جب مکہ واپس گیا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی مدح سرائی۔ اور تعریفوں کے پل باندھ دئے۔ اور کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور شاہان عجم اور دوسرا مملکت سب کو دیکھا سب کے درباروں میں گیا ہوں، مگر کسی کو بھی گو اسکی سات پشتیں نوکری میں گذر گئی ہوں اتنا مطیع و منقاد نہیں دیکھا۔

ان شیعوں پر تو کلمہ گوئی ایک تہمت ہی ہے۔ ورنہ کوئی کلمہ گو کلمہ پڑھ لینے کے بعد ان نفوس مقدسہ کے متعلق ایسی یا وہ گوئی اور ہرزہ سرائی نہیں کر سکتا! اگر امتثال امر میں اس قسم کی سستی موجب طعن ہوتی ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے بھی ایک دفتر لکھ ڈالیں! اور سر فہرست ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم مبارک لکھ لیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ایک درخت کے کھانے سے منع فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا یہ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے شیطانی وسوسہ کے زیر اثر اس درخت کو کھا لیا! ایک بات البتہ ہے۔ یہ معترض شیعہ آخر انہیں اسلاف کے اخلاف تو ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکری تھے، اور جو عدول حکمی اور شوخ چشمی میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں ان کی نافرمانی کی گواہی تو خود جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بر سر منبر دی، جس کی کیفیت انہیں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں مسطور و مرقوم ہے۔ اور جس کا حوالہ اس کتاب

میں بھی گذر چکا ہے۔ یہ اپنے ان اسلاف پر عائد شدہ مطاعن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جیسے پاکباز محب و منقاد حضرات کے کھاتے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

اعتراض۔ (۶) کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں سے فرمایا

اَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُوْنَنِیْ وَتَتَقَحَّمُوْنَ فِیْهَا۔ میں تمہاری کمر پکڑ کر آگ سے کھینچتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے ادھر آؤ، آگ سے ادھر آؤ۔ مگر مجھ سے چھوٹ کر آگ میں گر پڑتے ہو!

یہ اعتراض پہلے اعتراض سے بھی زیادہ لچر پوچ ہے! اس روایت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نبی اور ایک امت کی مثال ہے۔ وہ کوئی بھی نبی ہو سکتا ہے۔ اور کوئی سی بھی امت! اس میں اپنے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کی تخصیص ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ ہر شخص کی شہوات نفسی و غضبی اسے دوزخ کی طرف کھینچتی ہیں۔ اور پیغمبر کی نصیحت اور فرمان اس کو اس سے روکتا ہے لہذا ہر نبی کی مثال اپنی امت کے ساتھ اس شخص کی سی ہے جو محض شفقت و ہمدردی و خیر خواہی کے جذبہ سے ہر شخص کی کمر پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا اور ان غلبۂ غضب و شہوت کے سبب اس سے بچیا چھڑا کر جانی آگ میں گھسا جاتا ہے، اور اکثر لوگوں میں چونکہ شہوت و غضب کا غلبہ شدید ہوتا ہے اس لئے پیغمبر کی شفقت و جذبہ کارگر نہیں ہوتی اور آگ میں گر پڑتے ہیں۔ اور پھر یہ تو تمثیل میں ذکر کردہ آگ ہے، آتش دوزخ آخرت نہیں ہے۔ اور اس آگ سے مراد گناہ اور خواہشات و شہوات ہیں جو عموماً آتش دوزخ میں جانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا دوزخ میں گرنا ہرگز مراد نہیں ہے۔ ورنہ تو یہ حدیث قرآنی آیت کے صریحاً مخالف ہوگی۔ جس میں فرمایا گیا ہے کہ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے کہ اس نے تمہیں بچا لیا)

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں بہت سی آیات میں ان کے لئے جنت تیار کرنے اور عظیم کامیابی اور بہترین اجر کا وعدہ ہے۔

اور پھر اگر انہیں لفظ کے عموم سے دلیل لانے پر اصرار ہی ہے تو پھر یہ سب کو شامل ہوئی، اور ان سب میں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی شامل ہوگی۔ (پناہ بخدا) اور اگر خصوص خطاب سے دلیل لیتے ہیں تو پھر بعض کے فعل سے سب پر اعتراض کرنا لازم آتا ہے جو بالکل غیر معقول ہے!

اعتراض۔ (۷) صحیح مسلم میں جناب عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ۔ اِذَا فُتِحَتْ عَلَيْكُمْ خَزَائِنُ فَارِسَ وَالرُّوْمِ اَيُّ قَوْمٍ اَنْتُمْ قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ كَمَا اَمَرَنَا اللّٰهُ تَعَالٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا بَلْ تَتَنَافَسُوْنَ تَتَحَاسَدُوْنَ ثُمَّ تَتَدَابَرُوْنَ ثُمَّ تَتَبَاغَضُوْنَ۔

جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب روم و فارس کے خزانوں پر تمہاری دسترس ہوگی اسوقت (باعتبار اخلاق) تم کیسی قوم ہوگے۔ عبدالرحمن بن عوف نے فرمایا اللہ کے حکم کے مطابق۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ تم باہم حریص ہوگے ایک دوسرے سے حسد کروگے۔ ایک دوسرے سے آنکھیں چراؤگے اور ایک دوسرے سے بغض رکھوگے!

جواب:۔ اس طعن و اعتراض کا یہ ہے کہ یہاں انہوں نے بددیانتی کا حسب عادت مظاہرہ کیا ہے، وہ الفاظ نقل کر دیئے جن پر اطلاع کرنا مقصود تھا اور حدیث کا تتمہ جو ان کے مذموم مقصد کی تردید کرتا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو اعتراض سے بچاتا اور اصل مراد کو ظاہر کرتا ہے اسے گول کر گئے! بالکل اسی ملحد کی طرح جو لا تقربوا الصلوٰۃ، کو تو اپنی مطلب براری کے لئے پڑھتا ہے مگر انتم سکاریٰ کو ہضم کرتا ہے۔ چوری تو ہر جگہ اور ہر معاملہ میں قابل نفریں حرکت ہے مگر خاص کر ایسے مقامات پر حدیث کی چوری نہ صرف نازیبا بلکہ چور کی منافقت

سمجھی جائے گی۔ حدیث کا آخری حصہ ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

ثُمَّ تَنْطَلِقُوْنَ اِلٰى مَسَاكِنِ الْمُهَاجِرِيْنَ فَتَحْمِلُوْنَ بَعْضَهُمْ عَلٰى رِقَابِ بَعْضٍ۔ پھر تم مہاجرین کی طرف جاؤ گے اور وہاں ان کے بعض کو دوسرے کی گردن پر سوار کرو گے!

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ بغض وحسد کرنے والا کوئی اور فرقہ ہے! اور یہ فرقہ مہاجرین صحابہ کا تو بالکل نہیں۔ خواہ وہ انصار ہوں یا دوسرا مگر انصار کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ مہاجرین کو باہم ورغلا کر لڑا دیا ہو۔ اب رہے ایسے لوگوں کا وجود تابعین ہی میں پایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جو موضوع بحث ہیں دو ہی گروہوں میں منقسم ہیں۔ یعنی مہاجر و انصار۔ ان کا مہاجر ہونا تو ان از روئے حدیث غلط ٹھہرا۔ اور انصار ہونے کی حالات وواقعات تردید کر رہے ہیں۔ اور حدیث کے الفاظ غیر مبہم طور پر اعمال بد کے وقوع کا زمانہ فارس وروم کے خزانے فتح کرنے کے بعد متعین کرتے ہیں۔ کہ اسوقت تم میں سے بہت سے لوگ خزائن وفتوحات کی کثرت کی بنا پر بغاوت وفساد کی راہ اختیار کریں گے۔ اور مہاجرین کو کہ خلافت وریاست ان کا ورثہ ہے چرب زبانی، دروغ گوئی اور لگائی بجھائی کر کے باہم لڑا دو گے! جب ہم تاریخ کے اوراق میں اس جماعت اور اس کے سرغنوں کا کھوج لگاتے ہیں تو وہاں، جناب عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ، مالک اشتر، مروان بن حکم، اور ان جیسے لوگوں کے نام نمایاں درج ملتے ہیں۔

لہٰذا اس اعتراض وطعن کا ہدف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہرگز نہیں۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں معاذ اللہ کذب لازم آئے گا۔

ایک اور جواب اس قسم کے اعتراض کا نبوت کی بحث میں گذرا ہے، کہ شیعی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ اور ڈانٹ کے باوجود ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام، تمام عمر ائمہ اہل بیت کی طرف سے حسد وبغض میں گرفتار رہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک) تو ان معصوم کی پیروی میں غیر معصوم صحابہ بھی قدم زن ہو گئے تو اعتراض کیوں! اگر شیعوں کے ہاں پیغمبر معصوم کے عمل کی کوئی توجیہہ یا جواب ہو سکتا ہے تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی بابت اہل سنت کی طرف سے بھی وہی توجیہہ یا جواب تصور کر لیا جائے!

اعتراض۔ (۸)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ اٰذٰى عَلِيًّا فَقَدْ اٰذَانِيْ۔ جس نے علی رضی اللہ عنہ کو ستایا اس نے گویا مجھے ستایا، اور حضرت بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی نسبت فرمایا۔ مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِيْ۔ جس نے انہیں غصہ دلایا اس نے گویا مجھے غصہ دلایا۔ حالانکہ سب صحابہ نے علیؓ کی عداوت اور بی بی زہراء (رضی اللہ عنہا) کی ایذا رسانی پر اتفاق کیا ہے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ان کو رسوا کیا جبکہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے ان کے گھر کو جلانا چاہا۔

اسکی تفصیل شیعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی قنفذؓ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ کہ وہ آکر بیعت کر لیں مگر وہ نہیں آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو طیش آیا۔ اور خود ان کے گھر گئے اور ساتھ ہی اپنے ساتھ لکڑی کے گٹھے اور آگ بھی لے گئے۔ گھر پہنچے تو دروازہ بند دیکھا تو زور سے آواز دی کہ علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) دروازہ کھولو۔ مگر جناب علی (رضی اللہ عنہ) خاموش رہے اور دروازہ نہ کھولا۔ تو آپ نے دروازہ کو آگ لگا دی اور بلا تامل اندر گھس گئے۔ جب سیدہ زہراء (رضی اللہ عنہا) نے یہ دیکھا تو بے اختیار حجرہ سے نکل آئیں اور عمر (رضی اللہ عنہ) کے سامنے آکر اپنے بابا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر رونا شروع کر دیا۔ تب عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی تلوار مع میان کے ان کی کوکھ میں چبھوئی۔ اور علی (رضی اللہ عنہ) سے کہا ہاں اٹھو اور ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا۔ سارے صحابہ اسوقت موجود تھے مگر کسی نے دم نہ مارا۔ اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دختر ودماد (رضی اللہ عنہما) کو ظالموں

کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس وصیت کو جو آپ نے اہل بیت کے حق میں فرمائی تھی پس پشت ڈالدیا،،

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ یہ سارا قصہ اور بیان شیعوں اور کوفہ کے کذابوں کا من گھڑت افترار اور دروغ بے فروغ ہے! تو دجھوٹ گھڑیں، بہتان باندھیں اور اس کا جواب اہل سنت سے مانگیں، تو یہ بے چارے کیسے عہدہ برآ ہوسکیں گے جب اہل سنت سے ہی جواب لینا ہے تو پہلے اہل سنت کی کتابوں سے اسکی حقیقت معلوم کرواور پھر جواب مانگو اس لئے کہ اہل سنت کے ہاں روایات میں دروغگوئی کا چلن نہیں۔ ان کے ہاں تو جو بات صحیح ہے وہ بلا کم وکاست حوالہ قرطاس وقلم ہوتی ہے۔ یہ ہر مسلمان کو جان لینا چاہیئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے کوئی بھی جناب امیر اور سیدہ زہرا رضی اللہ عنہما کے درپے آزار نہ ہوا نہ ان کے ساتھ پرخاش رکھی بلکہ ہمیشہ ان کی شان کے شایاں عزت وتوقیر کرتے ہر طرح کی مدد ونصرت کے لئے کمربستہ رہتے۔ اور سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے۔ جب بھی ان کی طرف سے کسی اعانت کی طلب ہوئی یا کسی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ ان کی مدد واعانت کی گئی۔ چنانچہ عبد الرحمن ابزی کہتا ہے۔

شَهِدْنَا صِفِّيْنَ مَعَ عَلِيٍّ فِي ثَمَانِ مِائَةٍ مِمَّنْ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ بَيْعَةَ الرِّضْوَانِ وَقُتِلَ مِنْهُمْ ثَلَاثَةٌ وَسِتُّوْنَ رَجُلاً مِنْهُمْ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ وَخُزَيْمَةُ بْنُ ثَابِتٍ ذُوْ الشَّهَادَتَيْنِ وَجَمْعٌ كَثِيْرٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَقَدْ ذَكَرَهُمْ وَغَيْرُهُ

ہم (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ جنگ صفین میں آٹھ سو نفر تھے جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی ان میں سے تریسٹھ افراد مقتول ہوئے جن میں عمار بن یاسر اور خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ اور مہاجرین والنصار رضوان اللہ علیہم کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جن کا اس نے اور دوسروں نے بھی ذکر کیا ہے۔

یہ بات جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبہ مندرجہ نہج البلاغہ میں موجود ہے، علاوہ ازیں آپؓ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو خطوط تحریر فرمائے وہ سب موجود ہیں جن میں آپؓ نے مہاجرین وانصار کے ساتھ ہونے کو اپنی خلافت کے حق ہونے کی دلیل قرار دیا ہے! ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے دانا اور فہیم سے ایسا عمل ظہور میں آئے۔ اور یہ قنفذ کون ہے جس کے نہ نام کا پتہ نہ ذات کا۔ یہ کس حیثیت سے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کرسکتا تھا۔

آپؓ کا ساتھ دینے والے اور جنگ صفین میں آپ کے دوش بدوش یہی مہاجر وانصار تو تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظروں سے ابھی ابھی اوجھل ہوئے تھے، جناب زہرا رضی اللہ عنہا موجود تھیں۔ جناب شیخین رضی اللہ عنہما کی قوت وشوکت انہیں دو گروہوں سے تھی۔ بخلاف جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے پاس تو ایک لاکھ شامی پہلوان پشت پناہی کے لئے موجود تھے، وہ اگر انصار ومہاجرین کو نظرانداز کرتے تھے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن اس دور میں جبکہ سارے کے سارے مہاجر وانصار زندہ ہوں۔ کوئی فوت نہ ہوا ہو اور نہ ہی قتل ہوا ہو، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا ہوئے بھی دو چار دن ہوئے ہوں۔ تو یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان مہاجر وانصار نے خاندان رسول پر "ظلم" ہوتے دیکھا اور خاموش رہے! ظلم وغضب کے معاملہ میں خاموشی! یہ ان نفوس زکیہ پر الزام واتہام ہے، ان کی اجتماعی خاموشی کا صرف ایک ہی مطلب تھا جو ہوسکتا ہے عین منشار نبوت کے مطابق ہو رہا ہے اور کسی پہلو بھی نہ کسی پر جبر ہے نہ ظلم، اور نہ کسی کی حق تلفی کی جارہی ہے نہ کسی کو ستایا جارہا ہے نہ اسے ذلیل کیا جارہا ہے! افہام وتفہیم کی فضا ہے، آراء کا اختلاف اگر ہے بھی تو اسے فہم وفراست سے حل کیا جارہا ہے۔ لاٹھی یونکا، اور وہ ایسے معاملہ میں، جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہوں، اہل حل وعقد انہیں تسلیم کرکے عمل پیرا ہو چکے ہوں۔ یہ صرف دشمنان اسلام کا پروپیگنڈہ ہے اور کچھ نہیں۔ پھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں دیکھ لیں، کہ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور نہیں ہوئے بلکہ آپ ہی نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حملہ کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود مہاجر وانصار رضوان اللہ علیہم معتد بہ تعداد آپ کے زیر علم اور شانہ بشانہ تھی! اگر سارے ہی مہاجر وانصار ان

کے خلاف اوران کو دشمنوں کے حوالہ کرنے والے تھے تو یہ تعداد کہاں سے آگئی۔ بغرض یہ سب کچھ کسی بھی عقل رکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا ہاں جسکی عقل شیطان یا اخوان الشیطان نے مار رکھی ہو وہ البتہ صحرائے ضلالت وگمراہی میں بھٹکنے والا ہی ایسی باتیں گھڑتا یا باور کرتا ہے۔
اب پہلے آپ یہ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق کیا خیالات اور کیا برتاؤ تھا۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ آپ کے اوصاف وفضائل میں رطب اللسان رہتے دوسرے صحابہ کرام کو آپکی عزت وتوقیر کرنے کیلئے تاکید فرماتے رہتے۔ چنانچہ دارقطنی نے شعبی سے روایت کی ہے کہ

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے تو آپ کو دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جسے ایسے آدمی کے دیکھنے کی خواہش وخوشی ہو جو لوگوں میں باعتبار مرتبہ بلند ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باعتبار قرابت سب سے قریب ہو۔ اور آپ کی پیروی ومتابعت میں سب سے افضل وبرتر ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ ان آنے والے صاحب کو دیکھ لے!

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی آپ کی توقیر وتعظیم کرنے، آپ سے صلاح ومشورہ طلب کرنے میں مبالغہ فرماتے تھے۔ دارقطنی نے سعید بن مسیب کی روایت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ روایت کئے ہیں۔
اَیُّهَا النَّاسُ اِعْلَمُوْا اَنَّهٗ لَا یَتِمُّ شَرَفٌ اِلَّا بِوِلَایَةِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ۔ (لوگو خوب سمجھ لو کہ شرافت کی تکمیل علی کی دوستی ہی سے ہو سکتی ہے)۔ اور جب موءودہ کے متعلق سوال اٹھا تو صحابہ کرام باہم مختلف الرائے تھے، اسی میں یہ سوال پیش آیا کہ مہینہ دو مہینہ کا ساقط کردہ حمل بھی موءودہ کہلائے گا یا نہیں۔ تو محتاط صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی رائے تھی کہ وہ بھی موءودہ میں شامل ہے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ جب تک اس پر سات مرتبہ نہ گذرلیں وہ موءودہ نہیں ہوتی۔ یہ حضرت جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، صَدَقْتَ اَطَالَ اللّٰهُ بَقَاءَكَ اَبَا الْقَاسِمِ۔ (ابو القاسم اللہ آپ کی زندگی دراز فرمائے آپ نے سچ فرمایا)
حریری نے "درۃ الخواص فی اغلاط الخواص" میں لکھا ہے کہ یہ دعائیہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل ادا فرمایا۔

عظیم باپ کے صحیح خلف الرشید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما برگزیدہ اصحاب کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جہاد وقتال میں عدم شرکت پر ہمیشہ ملول ومتاسف رہے۔ طبرانی نے اوسط المعاجم، میں روایت بیان کی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مکہ میں یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جانب عراق روانہ ہو گئے ہیں۔ تو یہ مکہ سے دوڑ پڑے اور تین دن رات کے فاصلہ کی مسافت پر آپ کو جالیا آپ سے کہا۔

اَیْنَ تُرِیْدُ فَقَالَ الْحُسَیْنُ اِلَی الْعِرَاقِ فَاِذَا مَعَهٗ كُتُبٌ وَهُوَ اَمِیْرٌ فَقَالَ هٰذِهٖ كُتُبُهُمْ وَبَیْعَتُهُمْ فَقَالَ لَا تَنْظُرْ اِلٰی كُتُبِهِمْ وَلَا تَاْتِهِمْ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ اِنِّیْ مُحَدِّثُكَ حَدِیْثًا اِنَّ جِبْرَئِیْلَ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَخَیَّرَهٗ بَیْنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ فَاخْتَارَ الْاٰخِرَةَ وَاِنَّكَ بِضْعَةٌ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَلِیْهَا اَحَدٌ مِّنْكُمْ فَاَبٰی اَنْ یَّرْجِعَ وَاَعْتَنَقَهٗ ابْنُ عُمَرَ

آپ کا ارادہ کہاں جانے کا ہے؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ عراق جا رہا ہوں۔ اور آپ کے ساتھ مکاتیب وعہد ناموں کے بڑے دفتر اور طومار تھا۔ جس کے متعلق فرمایا کہ یہ وہاں کے لوگوں کے خطوط ہیں اور یہ بیعت نامے ہیں! حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے ان خطوط اور بیعت ناموں پر نہ جائیے۔ میں جو کہتا ہوں بغور سنیئے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیل امین آئے اور دنیا وآخرت میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حق دیا کہ ان میں سے جو چاہیں پسند فرمالیں

فَبَكَىٰ وَاَجْهَشَ فِي الْبُكَاءِ اَسْتَوْدِعُكَ مِنْ قَتِيْلٍ.

فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو اختیار فرمایا۔ اور آپ بھی ان کے جسد مبارک کا ایک جز ہیں آپ میں سے کوئی بھی متولی خلافت نہ ہوگا۔ پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپسی سے انکار فرمایا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے معانقہ کیا اور بآواز بلند رو رو کر کہے جا رہے تھے کہ اے مقتول میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

بزاز نے بھی عمدہ وصحیح سند کے ساتھ اسی قسم کی روایت بیان کی ہے!

اب ہم ان لڑائیوں کے معاملہ کو لیتے ہیں جو حضرت طلحہ، جناب زبیر اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہم اجمعین اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مابین واقع ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ بات تو بلا خوف و تردید بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ان لڑائیوں کی بنا جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بغض و عناد ہرگز نہ تھا۔ نہ آپ کو ایذا پہنچانا مطمح نظر تھا بلکہ ان کے کچھ دوسرے ہی سیاسی قسم کے اسباب وعوامل تھے۔ جنکو قابل اعتماد مورخین نے شرح وبسط اور اور خاصی تفصیل سے مدون ومرتب کیا ہے۔ اور وہ سارے کے سارے اسباب وعوامل وقوع میں بھی آئے۔

اجمالاً ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے، کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کوفہ و مصر کے اوباشوں اور شورش پسند بدمعاشوں نے شہید کر دیا۔ تو اسوقت فضا و حالات کو دیکھتے ہوئے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان سے الجھنا یا دارو گیر کرنا مصلحتاً مناسب خیال نہیں فرمایا۔ اور خاموشی اختیار فرمائی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اس فعل قبیح وشنیع کو لائق ستائش سمجھا اور اس پر فخر کرتا اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کو برائی سے یاد کرنے کی مذموم حرکت بھی شروع کر دی۔ اور علی الاعلان کہنے لگے کہ ہم نے جو کیا یہی حق ہے۔ دوسری طرف چند برگزیدہ صحابہ کی ایک جماعت جسمیں جناب طلحہ و زبیر، نعمان بن بشیر، اور کعب بن عجرہ، وغیرہ رضی اللہ عنہم قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت دلگیر اور متاسف وملول تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بدترین سانحہ ہے جو امت میں رونما ہوا اگر ہمیں ابتدا ہی میں صحیح طور پر معلوم ہو گیا ہوتا کہ ایسا ہوگا تو اب اول قدم پر ہی اس کا سدباب کر دیتے! افسوس وہ مظلوم مارے گئے۔ وہ یقیناً حق پر تھے، ان کے قاتلین ہی غلط رو اور باطل پر تھے! قاتلوں اور شورش پسندوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بعض حضرات ہمارے خلاف یہ رائے رکھتے ہیں تو انہوں نے طے کیا کہ ان کو بھی جام شہادت پلا کر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کی راہ پر روانہ کر دیں۔ بعض مخلص اور ہمدرد لوگوں کے ذریعہ اس پختہ ویزتی اطلاع ان حضرات کو ملی اور یہ حضرات مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ وہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بسلسلہ حج پہلے سے قیام فرما تھیں! ان حضرات نے سارے حالات وکوائف سے آپ کو آگاہ کر کے یہ بھی کہا کہ اب ہم آپ کی پناہ میں ہیں۔ کہ پریشانی میں ماں کی گود بچہ کے لئے باعث سکون ہوتی ہے۔ آپ مسلمانوں کی ماں ہیں۔ مسلمانوں پر جو افتاد آ پڑی ہے اور عربوں کی جو آفت ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی ہے اس کو اب صرف آپ ہی ٹال سکتی ہے! کیونکہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے تو مصلحت وقت کے پیش نظر ان بدبختوں کے سامنے خاموشی اختیار فرمالی ہے! اور شر پسندوں نے اس خاموشی کو کمزوری سمجھ لی ہے۔ اور اب وہ ظلم و تعدی پر زیادہ جری اور بے باک ہوتے جا رہے ہیں۔ جبتک حضرت عثمان شہید کا قصاص ان سے نہ لیا جائے گا۔ اور ان کی بدکرداری کی قرار واقعی سزا نہ دیجا سکیگی معاملات صحیح نہ ہوں گے۔ ان کا ظلم و تعدی بڑھتی رہیگی۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا تو من مانی کریں گے۔ دیار وامصار میں انتشار وافتراق پھیل جائے گا اور سارے مسلمان امن واطمینان سے محروم ہو جائیں گے!

اسوقت جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ جب تک امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ ان کے گھیرے میں ہیں اور وہ لوگ مدینہ میں ہیں تم مدینہ نہ جاؤ، جہاں اطمینان وسکون نظر آئے وہاں قیام کرو، اس دوران تدبیروں سے حیلے حوالوں سے یہ کوشش جاری رکھو کہ

جناب امیر رضی اللہ عنہ ان کے نرغہ سے نکل آئیں۔ جب ان سے ان بدبختوں کا اثر ختم ہوئے گا تو اسوقت تمہاری رفاقت ان کے لئے مفید بھی ہوگی اور موثر بھی، اسوقت جب وہ تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہاری رفاقت قبول کریں گے تب اس پر غور کرنا اور سوچنا کہ خلیفہ مظلوم کا قصاص کس طرح لیا اور قاتلوں کو سرزنش تنبیہہ اور گوشمالی کس طرح ہو کہ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہو۔ اگر یہ کام بہت بڑا ہے۔ اسے بچوں کا کھیل نہ سمجھنا۔ تمام موجود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور چونکہ اسوقت مسلمانوں کی فوجیں عراق و بصرہ میں تھیں اس لئے انہیں اطراف کو قیام کے لئے مناسب خیال کیا۔ اور ام المؤمنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زور ڈالا کہ جب تک فتنہ فرو نہ ہو اور امن و امان نہ قائم ہو، امور خلافت صحیح طور پر انجام نہ پانے لگیں۔ اور ہماری ملاقات امیر المؤمنین سے نہ ہو جائے، آپ ہمارے ساتھ ہی قیام فرمائیے۔ آپ ہمارے لئے بہت بڑا سہارا ہیں۔ آپ امت کی ماں ہیں آپ کا اعزاز و اکرام بھی تمام امہات سے بڑھا ہوا ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی کسی بدبخت کو جرات نہ ہوگی۔ لہذا بہت سی مصالح ملکی و ملی کی خاطر اور اس توقع پر کہ جو خلیج مسلمانوں میں پیدا کردی گئی ہے۔ اس کو پاٹنے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں آپ کی مساعی ممکن ہے بارآور ہو جائیں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ فرمالیا۔ ان میں سے آپؓ کے اقارب بھی تو تھے۔ ایک سگے بھانجے، دوسرے بہنوئی۔ اور بھی دیگر اصحاب! چنانچہ آپ بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں۔

مگر قاتلین اور شورش پسندوں کی یہ حرکت کسی فوری جذبہ یا ابال کا نتیجہ نہ تھی نہ ہی اس کا سبب تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد و عادل نہ تھے۔ بلکہ یہ اسلام کے خلاف کفر کی اولین سازش تھی جس کی پشت پر پوری شیطنت اور ابلیسیت کی طاقت مرکوز تھی!

مدتوں منصوبہ بندی کی گئی، رجال کار تیار کیے گئے، اور اس کی خشت اول عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ برسوں سے خفیہ و اعلانیہ تحریک چلائی جارہی تھی۔ اطراف و اکناف سے شورش پسندوں اور فسادیوں کو ورغلایا اور ابھارا گیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ برسوں کی محنت اور تیاری پر وہ کسی بے تدبیری سے پانی پھیر دیتے۔ لہذا قتل عثمان کے بعد ہیئت حاکمہ پر انہوں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اول پروگرام - بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ جب اطمینان سے پورا کرلیا، تب بھی ان کے گرد سے اپنا گھیرا نہیں ہٹایا۔ بلکہ گرفت اور گھیراؤ اور سخت مضبوط کردیا۔ اور حالات کو اس نہج پر لے آئے کہ سازشی گروہ معتبر مانا جانے لگا۔ وہ جو کچھ کہتے وہی صحیح تسلیم ہوتا۔ وہ جو سازش بھی چاہتے کامیاب ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے پیش نظر اصلاح بین المسلمین کا پروگرام تھا وہ اگر کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف قاتلان عثمان کیفر و کردار کو پہنچا دیئے جاتے بلکہ منافقت بھی اپنی موت آپ مرجاتی، مگر مشیت ایزدی میں کچھ اور ہی طے تھا اس لئے ام المؤمنین کے سفر خیر کو بھی دشمن نے اپنا مطلب برآری بنالیا۔ اور جناب امیر تک یہ قصہ بہت سی رنگ آمیزیوں کے ساتھ دوسرے انداز میں پیش کیا۔ اور آپ پر زور دیا کہ آپ کو لامحالہ ان کا تعاقب کرنا چاہیئے۔ حضرات حسنین، عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے ہرچند اس سے روکا۔ اور مخالفت کی، مگر آپ پر اثر فسادیوں کا ہی غالب رہا ان حضرات کی بات آپ نے نہیں مانی۔ بالآخر آپ تعاقب میں روانہ ہو گئے!

جب بصرہ پہنچے، تو آپ نے قعقاع کو ام المؤمنین اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجا کہ معلوم کریں ان حضرات کا مدعا و مقصد کیا ہے۔ چنانچہ قعقاع آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا ام المؤمنین آپ کے سفر کی کیا غرض ہے آپ نے فرمایا مسلمانوں میں باہم مصالحت۔ پھر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بلوایا وہ آئے تو قعقاع نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ صلح و اصلاح کس طرح ترکیب سے ہوگی، انہوں نے قاتلین عثمان کی حوالگی کیلئے کہا تو قعقاع کہنے لگا یہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے، فتنہ فرو ہو کر مسلمان سب متفق ہو کر مطالبہ کریں تب

ہی ایسا ہو سکتا ہے، لہٰذا تقاضائے وقت یہ ہے کہ فی الحال اس معاملہ میں نرمی اختیار کرلو، ان دونوں حضرات نے تسلیم کر لیا کہ تمہاری رائے صائب ہے قعقاع جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹے اور واقعات کی اطلاع دی۔ حالات روبراہ ہوتے دیکھ کر سب ہی کو خوشی تھی، اور یقین ہوتا جارہا تھا کہ صلح کی رکاوٹ اب دور ہوگئی ہے۔ عنقریب صلح ہو جائیگی۔ لشکر وہاں تین دن مقیم رہا، تیسرے دن کی شام کو باہمی نامہ و پیام کے ذریعہ یہ طے پاگیا کہ اگلے دن جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما تنہائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کریں گے اور اس مجلس میں قاتلین عثمان میں سے کوئی نہ ہوگا۔ یہ خبر ایسی تھی کہ منافقوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، ان کو نظر آنے لگا کہ ساری محنت مٹی میں مل کر اکارت ہی نہیں جائیگی جان کے لالے بھی پڑ جائیں گے اور ایک ایک کو چن چن کر قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ حیران و پریشان اپنے مربی اور استاذ عبداللہ بن سبا کے پاس گئے۔ حالات بتا کر چارہ کار پوچھا۔ اس نے کہا بس صورت ایک ہی ہے۔ رات کو لشکر ام المؤمنین پر شب خون مارو، اور چیخ چیخ کر کہو مسلمانوں نے دھوکہ دے کر ہم پر حملہ کر دیا، یہی بات امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے بھی دل نشین کرو۔ بالآخر انہوں نے یہی کیا۔ لشکر ام المؤمنین پر ٹوٹ پڑے اور الزام یہ لگایا کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے غدر کیا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ خبر سن کر تعجب میں رہ گئے۔ مگر اب وقت گذر گیا تھا، جنگ کی آگ پورے زور سے بھڑک چکی تھی۔ سر قلم ہو رہے تھے، منافقوں کی چالبازی مومنوں کی فراست پر بازی لے گئی تھی۔ ناچار امیر رضی اللہ عنہ بھی شریک جنگ ہوگئے، اور پھر ہوا جو ہونا تھا!

قرطبی کے علاوہ دیگر اہل سنت کے مورخین کی اکثریت نے اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے، اور جناب حسن، جناب عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں۔ اب شیعوں کے اسلاف۔ قاتلان عثمان۔ جو ان کے پیشوا بھی ہیں۔ ادھر ادھر کی ژٹلیات بیان کرنے لگیں، تو ہم انہیں گوز شتر کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

اول اول اہل شام کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ قاتلان عثمان سے قصاص لیا جائے اور انہیں پوری سزا ملنی چاہیئے۔ مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اسوقت بھی یعنی جنگ جمل کے بعد کہ اب میدان صاف تھا مخالف اور جھگڑنے والے ختم ہوگئے تھے، آپ کی طرف سے عذر واجبی کیا گیا۔ تو وہ بدگمان ہوگئے اور خلافت سے منکر ہو کر آپ کی برائیاں کرکے کہنے لگے کہ دراصل آپ خلافت کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اور پھر وہ مدمقابل بنکر اٹھ کھڑے ہوئے، جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایک فرمان بحوالہ نہج البلاغہ پہلے بیان ہوچکا ہے جس میں آپ نے فرمایا۔ "ہم ایسے ہوگئے کہ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑتے ہیں اس لئے کہ اس میں کجروی، گمراہی، شبہ اور تاویل نے جگہ لے لی ہے،،

اور قاتلین عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں بھی نہج البلاغہ میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

قَالَ لَہٗ بَعْضُ اَصْحَابِہٖ لَوْ عَاقَبْتَ قَوْمًا اَجْلَبُوْا عَلٰی عُثْمَانَ فَقَالَ یَا اِخْوَتَاہُ اِنِّیْ لَسْتُ اَجْھَلُ مِمَّا تَعْلَمُوْنَ وَلٰکِنْ کَیْفَ بِھِمْ وَالْمُجْلِبُوْنَ عَلٰی شَوْکَتِھِمْ یَمْلِکُوْنَنَا وَلَا نَمْلِکُھُمْ وَھَا ھُمْ ھٰؤُلَاۗءِ قَدْ ثَارَتْ مَعَھُمْ عُبْدَانُکُمْ وَالْتَفَّتْ اِلَیْھِمْ اَعْرَابُکُمْ وَھُمْ خِلَالَکُمْ یَسُوْمُوْنَکُمْ مَا شَاءُوْا۔

آپ کے بعض رفقاء نے کہا کاش ان لوگوں کو سزا دیتے جنہوں نے حضرت عثمان پر بلوہ کیا۔ فرمایا بھائیو! میں اس چیز سے ناواقف نہیں جو تم کہہ رہے ہو، لیکن ایسا ہو کس طرح سکتا ہے۔ اس لئے کہ صاحب قوت و شوکت ان کے پاس ہے۔ وہ ہم پر حاکم ہیں، ہم ان پر نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ مل کر تمہارے غلاموں نے چڑھائی کی اور تمہارے صحرائیوں نے اکٹھے ہو کر ان کا ساتھ دیا۔ اور یہ تم ہی میں سے ہیں جو دل کھول کر تمہاری ہی برائیاں کرتے پھرتے ہیں،،

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوگیا کہ صحابہ کرام، حضرت علی رضوان اللہ علیہم، سے جس بات کا تقاضا کر رہے تھے آپ اس سے تغافل محض اس لئے فرما رہے تھے کہ آپ مجبور محض ہو کر رہ گئے تھے، اور ضرورت اسی کی متقاضی تھی۔ اور جناب امیر اس میں معذور تھے۔

نہج البلاغہ کے مندرجات تو شیعہ حضرات کے مرغوبات اور پسندیدہ ہیں، ان میں تو اہل سنت کو کوئی عمل دخل نہیں۔ اگر ہم اپنی روایات ذکر کریں تو پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔ اور بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے!

حالانکہ شیعہ ایسی روایات ذکر نہیں کرتے۔ بڑے خفیہ طریقہ پر راز رکھتے ہیں کہ مذہب کا سارا تار و پود ہی نہ بکھر جائے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھلی دلیل ہے کہ خواہی نہ خواہی کہیں نہ کہیں دوچار عبارات ان سے انہیں کی معتبر کتابوں میں ایسی درج کرادی ہیں۔ جو اہل سنت کے بہت ہی کام آتی ہیں! اور ان کے خود ساختہ مذہب کی خود ہی پول کھول دیتی ہیں۔

قنفذ کا قصہ، سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر کا دروازہ جلانا۔ یا ان کی کوکھ میں تلوار کا ٹھوکا۔ یہ سب ان کے کوفہ کے اخوان الشیطان مفتریوں اور کذابوں کی من گھڑت ہے۔ جو "حسن اتفاق" سے ان شیعوں کے پیشوا اور مقتدا بھی ہیں!

اہل سنت کی کتاب میں بطریق صحیح تو کیا بطریق ضعیف بھی اس کا ذکر نہیں۔ شیعی راویوں کا تفصیلی احوال پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان بدبختوں نے تو اپنے ائمہ کو نہیں بخشا۔ طرح طرح کی تہمتیں ان پر جڑ دیں۔ نوع بنوع افترا ان سے منسوب کئے۔ اور یہ کچھ تو انہوں نے دعوائے محبت و اخلاص کے علی الرغم کیا، اب آپ خود سوچ لیں جن سے ان کو عداوت ہے جو ان کا دین و ایمان بھی ہے ان کے متعلق تو یہ جھوٹ کے مینار کھڑے کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں گے۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا بھی ہے! بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتابوں میں کذب و افترا اور بہتان کے سوا کچھ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو اہل سنت ان جھوٹوں کی ان جھوٹی روایات پر کیوں کان دھریں گے جو قرآن مجید، اور عترت کے یکسر مخالف ہیں۔ کیونکہ اہل سنت کے دین و ایمان کا رشتہ تو قرآن مجید اور اقوال عترت سے وابستہ ہیں۔ اور یہ دو عادل گواہ ان کے بہتان اور افترا کی جڑ کاٹنے کے لئے کافی و افی ہیں۔

ان اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کے متعلق قرآن کی شہادت درکار ہو تو وہ بھرا پڑا ہے جگہ بجگہ ہم ان کے حوالے بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ آیت اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین۔ کس کے بارے میں ہے۔ اشداء علی الکفار رحماء بینھم کن لوگوں کی شان میں آیا ہے۔ الذین ان مکناھم الآیہ۔ کس جماعت کے حق میں نازل ہوئی۔ کیا آیت میں مذکورہ امید کا پسندیدہ مشغلہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر یہی تھا کہ خانۂ زہرا رضی اللہ عنہا کو جلائیں اور ان کی کوکھ میں تلوار چبھائیں! اسی کے ساتھ اس آیت پر بھی نظر رہے۔ و لکن اللہ حبب الیکم الایمان الآیہ۔ یہ کس کو خطاب کر رہی ہے فعل بد فسوق ہے یا نہیں؟ مگر یہ آیت تو اس پاکباز جماعت سے فعل بد کی پسندیدگی کی تردید کر رہی ہے۔ وہ فعل بد کو پسند ہی نہیں کرتے اس کے ارتکاب کا ان سے کیا سوال،

اور اگر اس گروہ اتقیا و اصفیاء کے متعلق حضرت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت ہی سننا چاہتے ہو تو نہج البلاغہ ہی اٹھا کر دیکھ لو کہ انہوں نے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گرامی قدر رضوان اللہ علیہم کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے۔ ان اصحاب کرام کا اپنے دوستوں کے سامنے تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

لَقَدْ رَأَیْتُ اَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَا اَرٰی اَحَدًا مِّنْکُمْ یُشْبِھُھُمْ لَقَدْ کَانُوْا یُصْبِحُوْنَ شُعْثًا غُبْرًا بَاتُوْا سُجَّدًا وَّقِیَامًا لَا یُرَاوِحُوْنَ بَیْنَ جِبَاھِھِمْ وَاَقْدَامِھِمْ یَقِفُوْنَ

مجھے تم میں سے کوئی بھی اصحاب محمد رصلی اللہ علیہ وسلم) کی مانند دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دن محنت و مشقت کے کاموں میں گذارتے تو رات نماز کے سجود و قیام میں۔ نہ وہ اپنی پیشانیوں کو آرام دیتے نہ قدموں کو۔ گویا آخرت کے ڈر نے انہیں آتش زیر پا کر رکھا

عَلٰى مِثْلِ الْجَمَرِ مِنْ ذِكْرِ مَعَادِهِمْ كَانَ بَيْنَ اَعْيُنِهِمْ رُكَبًا مِنْ طُوْلِ سُجُوْدِهِمْ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ هَمَلَتْ اَعْيُنُهُمْ حَتّٰى تَبُلَّ جِبَاهَهُمْ وَمَادُوْا كَمَا يَمِيْدُ الشَّجَرُ فِى الْيَوْمِ الْعَاصِفِ خَوْفًا مِّنَ الْعِقَابِ وَرَجَاءً لِّلثَّوَابِ ۔

ہو۔ ان کی پیشانیوں پر طویل سجدوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ اللہ کے ذکر پر آنکھوں سے اسقدر آنسو ابل پڑتے کہ چہرہ تر ہو جاتا۔ اور وہ اللہ کے عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں طوفان میں لرزیدہ درختوں کی مانند ہلتے رہتے ،،

اور یہ بھی فرمایا۔

وَقَالَ اَيْضًا لَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَقْتُلُ اَبْنَاءَنَا وَاٰبَاءَنَا وَاِخْوَانَنَا وَاَخْوَالَنَا وَاَعْمَامَنَا وَمَا يَزِيْدُ بِذٰلِكَ اِلَّا اِيْمَانًا وَتَسْلِيْمًا وَمُضِيًّا عَلَى اللَّقَمِ وَصَبْرًا عَلٰى مَضِيْضِ الْاَلَمِ وَجِدًّا عَلٰى جِهَادِ الْعَدُوِّ وَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ مِنَّا وَالْاٰخَرُ مِنْ عَدُوِّنَا يَتَصَاوَلَانِ تَصَاوُلَ الْفَحْلَيْنِ يَتَخَالَسَانِ اَنْفُسَهُمَا اَيُّهُمَا يَسْقِىْ صَاحِبَهٗ كَاْسَ الْمَنُوْنِ فَمَرَّةً لَنَا وَمَرَّةً لِعَدُوِّنَا مِنَّا فَلَمَّا رَاَى اللّٰهُ صِدْقَنَا اَنْزَلَ بِعَدُوِّنَا الْكَبْتَ وَاَنْزَلَ عَلَيْنَا النَّصْرَ حَتّٰى اسْتَقَرَّ الْاِسْلَامُ مُلْقِيًا جِرَانَهٗ مُتَبَوِّءًا اَوْطَانَهٗ وَلَعَمْرِىْ لَوْ كُنَّا نَاْتِىْ مَا اَتَيْتُمْ مَا قَامَ لِلدِّيْنِ عَمُوْدٌ وَلَا اخْضَرَّ لِلْاِسْلَامِ عُوْدٌ ۔

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں قتال کرتے اور مقتول بیٹے، باپ، بھائی، ماموں، چچا ہوتے۔ اور یہ ایسا ایمان کے تقاضے اطاعت کے جذبہ۔ راہ راست پر چلنے کی خاطر، صدمہ کی تکلیف پر صبر کرتے ہوئے دشمن کے خلاف جہاد میں کوشش کرتے ہوئے، کہتے، ایک ہم میں سے دوسرا دشمنوں میں سے دونوں باہم ایک دوسرے پر شیر کی طرح حملہ آور ہوتے اور ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش کرتے کہ دونوں میں سے کون اپنے مدمقابل کو موت کا جام پلاتا ہے۔ کبھی ہم بازی لے جاتے، کبھی ہمارا دشمن جیت جاتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہماری صداقت پرکھ لی، تو دشمن پر ذلت تھوپی اور ہمیں فتح عطا فرمائی۔ حتیٰ کہ اسلام کا سکہ جم گیا۔ اور اسے استقرار نصیب ہوا۔ اس کے پڑوسی مطمئن۔ اس کے دیار و امصار جائے امن و قرار ٹھہرے۔ اور میری جان کی قسم کہ ہم بھی اگر وہی کرتے جو تم کر رہے ہو۔ تو نہ دین کو قیام و قرار نصیب ہوتا، نہ ہی شجر اسلام سرسبز و بار آور ہوتا۔

اور پھر ان جملہ شہادتوں سے قطع نظر کی صورت میں بھی ایک آیت قرآنی ہمیں ایسی موجود ملتی ہے جو اس قصہ کو جھٹلانے کے لئے کافی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۔

جو قوم اللہ و رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے آپ اس کو ایسا نہ پائیں گے کہ وہ اللہ و رسول سے ضد و کد رکھنے والے سے دوستی رکھیں، خواہ وہ ان کے باپ ہوں ان کے بیٹے ہوں، یا ان کے بھائی یا ان کے کنبہ والے۔ وہ لوگ وہی ہیں جنکے قلوب پر ایمان کندہ کر دیا گیا ہے۔ اور اپنی روح سے ان کو تقویت پہنچائی ،،

اس آیت سے بالکل صاف اور صریح طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا ایسے شخص کی طرف راغب ہونا یا دوستی کا ہاتھ بڑھانا جو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ہو یا اسکی حمایت کرنا۔ یا اس کی دوستی کو حکم الٰہی کے نفاذ میں روکاوٹ بنانا محال و ناممکن ہے۔ لہٰذا ایسے بلند اوصاف رکھنے والے حضرات سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسے واقعہ پر سکوت اختیار کریں چہ جائیکہ

ان میں سے کوئی ایسے ناز یبا عمل کا ارتکاب کرے، حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دین کا علم بلند رکھنے میں انہوں نے اپنی جانیں اور اموال نثار کردیں ہوں اور ساری زندگی سنت رسول کے زندہ کرنے میں گذار دی ہو۔ سبحانک ھذا بھتان عظیم۔
جب اہل سنت کے سامنے خدا و رسول، جناب امیر و حسنین رضی اللہ عنہم کی وقیع شہادت موجود ہو تو ان سے یہ توقع کیوں رکھی جاتی ہے کہ وہ ان اخوان الشیطان کی بکواس اور ابن مطہر حلی اور ابن شہر آشوب مازندرانی کی افتراء پردازی و ژاژ خائی پہ کان دھرنیگے۔ ان کی نظر میں تو یہ صدائیں کوئے کی کائیں کائیں، اور صوت حمار سے زیادہ وزن نہیں رکھتیں!

اعتراض۔ (۹)

بخاری و مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی تَاْخُذَ اُمَّتِیْ مَاْخَذَ الْقُرُوْنِ قَبْلَھَا شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کَفَارِسٍ وَالرُّوْمِ قَالَ وَمَنِ النَّاسِ اِلَّا اُوْلٰئِکَ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اسوقت تک نہیں آئیگی جب تک میری امت وہ کچھ نہ کرے جو پہلے کی امتیں کر چکی ہیں۔ ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ کی مقدار حاضرین نے پوچھا یا رسول اللہ کیا وہ فارس و روم کے لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا ان کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔

اس اعتراض و طعن میں ان ناہنجاروں نے دنیا کو اپنی عقلوں پہ ماتم کرنے کی دعوت دینے کا مضحکہ خیز اقدام کیا ہے، کہ ساری امت کو اول تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں محصور قرار دیا اور پھر اس حدیث کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف استعمال کیا۔ حالانکہ اس حدیث میں لفظ امت مذکور ہے۔ صحابہ کا لفظ نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت زیادہ تر کفار فارس و روم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ کیا عقائد میں، کیا اعمال میں، کیا اخلاق میں، کیا رسم و رواج میں، مثلاً رومی تثلیث کے قائل ہیں، کہتے ہیں اللہ تین میں سے ایک ہے۔ غالی رافضی بھی پانچ خدا مانتے ہیں۔ باب اول میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ پھر رومی کہتے ہیں کہ حشر روحانی ہوگا نہ کہ جسمانی اسمعیلیوں اور دوسرے رافضیوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ رومی پیشاب پاخانہ کی نجاست سے نہیں بچتے، نہ کوئی اہتمام ان کے ہاں اس کے لئے پایا جاتا ہے۔ امامیہ کے ہاں بھی انسانی بول و براز نجس نہیں جانتے۔ اس میں اگر یہ لتھڑ بھی جائیں تب بھی ایسی حالت میں نماز جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کا بیان باب فقہ میں گذر چکا ہے۔
رومی خدا اور رسول پہ افترا کرتے اور جھوٹے الزامات لگاتے ہیں، امامیہ بھی افترا و کذب میں اپنے ان استادوں کو پیچھے چھوڑ کر خود استاد کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں!
فارس والے خالق خیر و شر کو علیحدہ علیحدہ ثابت کرتے ہیں، تو امامیہ بلکہ سارے رافضی خدا کو خالق خیر اور بندہ و شیطان کو خالق شر جانتے ہیں۔ فارسی تقدیر کا انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آدمی کا ارادہ تو وقوع میں آجاتا ہے مگر اللہ کا ارادہ واقع نہیں ہوتا۔ امامیہ بشمول جملہ رافضی بھی یہی مذہب اپنائے ہوئے ہیں۔ فارسی نوروز کی بہت تعظیم کرتے، اسے بمثل عید شمار کرتے ہیں۔ قمر کو عقرب میں، اور بھورے کی رسم اور محاق (چاند کا سورج کے مقابلہ میں آجانے) کو منحوس مانتے ہیں۔ بالکل (شبر البشیر) اسی طرح امامیہ بھی نوروز کی تعظیم کرتے اور ان امور کو منحوس سمجھتے ہیں، متعہ اور شرمگاہوں کا حلال ہونا جیسے ہندوستان کے راجہ عمل پیرا رہتے ہیں۔ امامیہ کے نزدیک بھی جائز ہے۔
محرمات سے نکاح اور اغلام، مجوسی فارسیوں کا دین ہے۔ رافضیوں میں باطنی فرقہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ماتم نوحہ گری، چاک گریبانی اور سیاہ لباس کرنا مصیبت و آفت کے وقت فارسی مجوسیوں میں رائج ہے۔ امامیہ بھی اپنے وطیرہ میں ان کے قدم بقدم ہیں۔

یہ تو مشتے نمونہ از خروارہ ہے۔ بنظر تحقیق و تفتیش دیکھا جائے تو یہ قوم شیعہ کفر و شرک کی بہت سی گندگیوں ہیں، انہیں کے ہم عنان اور شبر البشیر، ندا عابذرا عا کی زندہ مثال نظر آئیگی۔

اب عام ناظرین کے ساتھ دل چاہیے تو شیعہ قوم بھی غور کرلے کہ اس حدیث مبارک کو عملاً صحیح ثابت کرنے میں اور اس کا مصداق بننے میں آگے آگے کون ہے!

اعتراض۔(۱۰) یہ ہے کہ بخاری شریف میں بحوالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْلَا اِنَّ قَوْمَكِ حَدِيْثٌ عَهْدِهِمْ بِكُفْرٍ وَاَخَافُ اَنْ تُنْكِرَ قُلُوْبُهُمْ لَاَمَرْتُ اَنْ يُهْدَمَ الْبَيْتُ وَاُدْخِلَتْ فِيْهِ مَا اُخْرِجَ مِنْهُ وَاَلْزَقْتُهٗ بِالْاَرْضِ وَجَعَلْتُ مَا بَابَيْنِ شَرْقِيًّا وَغَرْبِيًّا وَبَلَغْتُ بِهٖ اَسَاسَ اِبْرَاهِيْمَ۔

اگر تمہاری قوم کا عہد کفر ابھی قریب نہ گذرا ہوتا اور مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ وہ اسے گوارا و پسند نہ کرینگے تو میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا حکم دیتا۔ اور اس میں سے نکالا ہوا حصہ اس میں شامل کرتا، اس کی کرسی زمین سے ملا دیتا۔ اس میں شرقاً غرباً دو دروازے قائم کرتا، اور اس کو ابراہیمی بنیاد پر از سر نو تعمیر کرتا۔

تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، کی قوم قریش ہی تو تھی۔ تو معلوم ہوا ان کے دل اور باطن صاف نہ تھے۔ اور ان کے باطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خائف تھے اور ان کے ڈر سے بعض شرعی امور میں آپ تقیہ فرماتے تھے۔

جواب:۔ اس اعتراض کا یہ ہے کہ قومک سے سارے ہی قریش مراد ہوں تو اس میں اوروں کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی داخل ہوں گے بلکہ پورا ہاشمی قبیلہ بھی کیونکہ وہ بھی قریش میں سے ہیں۔ اور اگر چند افراد مراد ہوں تو اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ مولفۃ القلوب اور فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہونے والے افراد سے خوف کا اظہار ہے جو نہ ابھی آداب شریعت سے مؤدب ہوئے تھے اور نہ ہی قوت ایمانی ابھی مستحکم ہوئی تھی، اپنے خاص اصحاب اور رفقاء قدیم سے آپ کو کوئی خوف نہ تھا۔

اب رہی تقیہ کی بات تو وہ تبلیغی امور احکام شرعی اور واجبات میں ثابت کرنا چاہیئے، دنیوی مصالح اور عمارات کی شکست وریخت میں بات بنتی نہیں۔ اگرچہ وہ عمارت کعبہ شریف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ عمل بالاتفاق نہ ماموربا اللہ ہے اور نہ واجب۔ اور پھر حدیث میں لفظ خوف ہے اور خوف سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقع بھی ہو جائے۔ لہٰذا اس حدیث کے ساتھ تمام اصحاب پر طعن کرنا اور خصوصاً ان پر جو یہاں زیر بحث مسئلہ میں سخت بد دیانتی کے ساتھ تعصب وعناد کا گھناؤنا مظاہرہ بھی ہے۔

گیارہواں باب

خصوصیات مذہب شیعہ

اہل سنت رحمہم اللہ نے بڑی کد و کاوش اور تلاش و جستجو، اور تفتیش و تحقیق سے اس فرقے کے پانچ ایسے خواص معلوم کئے جو کسی دوسرے اسلامی فرقے میں نہیں ملتے، ملتے ہیں تو شاذ و نادر اور وہ بھی شیعوں کے میل ملاپ کا اثر ہوتا ہے وہ خواص خمسہ یہ ہیں۔

(۱) اوہام (۲) عادات (۳) غلوات (۴) تعصبات اور (۵) ہفوات، اول تو آپ ان خواص خمسہ کے معنے ذہن نشین کرلیں اسکے بعد بطور نمونہ ہر ایک سے کچھ کچھ ذکر کیا جائے گا انشاء اللہ۔

الف:۔ عادات۔ وہ ہیں جو ان کے عوام و خواص میں بلا ان کے علماء کی تصریح و تذکیر شہرت رکھتی ہیں۔ ان عادات کا ذکر نہ انکی کتابوں میں ہے۔ نہ ان کے علماء نے تصریح کر کے کوئی مذہبی ثبوت پیش کیا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ کے خوارق کا انکار، ماتم، نوحہ، شیون، تصویر سازی، تربت نوازی، بموقعہ ایام عاشورہ۔ ان باتوں کے متعلق عبادت کا گمان رکھنا اور یہ عقیدہ قائم کرنا کہ اس سے تمام سال کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور بابا شجاع الدین کے عید کے دن آٹے کا پتلا بشکل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بنانا اسکے پیٹ میں شہد ڈالنا اور اسکو قتل کر ڈالنا اور اس شہد کو پی جانا۔ دو شنبہ کے دن کو منحوس سمجھنا، چار کے عدد سے الرجک ہونا، بارہ کے عدد کو مبارک جاننا اور اسی طرح کی عادتیں۔

اس فرقہ کی یہ عادات اسلیے قابل گرفت نہیں کہ ہر فرقہ نے اپنے لیے کچھ عادات کچھ رسوم، کچھ بدعات گھڑ رکھی ہیں۔ لیکن چونکہ اس فرقہ کے علماء و خواص ان امور سے انکار کرتے اور انہیں خلاف کتاب اللہ جانتے ہیں تو ان سے اعتراض ساقط ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں انکی ان عادات کو نظر انداز کیا ہے، اسے موضوع بحث نہیں بنایا، البتہ انکی بعض عادات جو علمی انداز میں پیش کی جاتی ہیں اگرچہ بحوالہ کتب اور بلحاظ فردا دعلماء ان کا ثبوت نہیں، ہم نے باب فقہ میں انکا ذکر کیا ہے، مثلاً جمعہ اور جماعات کا ترک، وضو میں پاؤں کا مسح کرنا، موزوں پر مسح ترک کرنے کو سنت بتانا تراویح کو ترک کرنا، دبر میں وطی کرنا، اور متعہ کو افضل عبادات جاننا،

ب:۔ ہفوہ۔ یہ ہے کہ اپنے مذہب کی حفاظت کی خاطر یا مخالف مذہب کو شکست دینے کی غرض سے حس، عقل صریح، اور تواتر کے خلاف کسی امر کا ارتکاب کیا جائے۔

ج:۔ غلو۔ یہ ہے کہ جو بات اپنے نزدیک ثابت نہ ہو وہ اپنے محبوب افراد کے ساتھ انتہائی محبت و عقیدت کے پیش نظر وہ بات انکے لیے ثابت کرتے ہیں، یا جو چیز خود کے نزدیک ثابت ہے انکے بارے میں اس سے انکار کر دیتے ہیں۔

د:۔ تعصب۔ یہ ہے کہ جن افراد سے انکو انتہائی بغض ہے انکے بارے میں منفی شئی کو ثابت اور ثابت کو منفی بتاتے اور ثابت کرتے ہیں، گویا غلو اور تعصب دونوں ایک ہی تھیلی کے دو چٹے بٹے ہیں۔ کیونکہ ہر دو میں اپنے مسلمات کی نفی اور اپنے منکرات کی تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب یہ عمل اپنی محبوب شخصیات کے لیے ہو

تو وہ غلو ہوتا ہے اور مبغوض شخصیت کیلیے ہو تو اسے تعصب کہتے ہیں اور یہ دونوں عادتیں نص قرآنی کے مطابق حرام ہیں۔

(۱) یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقِّ۔ — اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو مت کرو اور اللہ تعالیٰ کی نسبت حق بات ہی منہ سے نکالو۔

(۲) یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ اَنْتُمْ تَشْھَدُوْنَ۔ — اے اہل کتاب گواہی دیدینے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو۔

اسی باعث اس کتاب میں غلو و تعصب کو ایک ہی فصل کے تحت بیان کیا ہے اور شہرت کی بنا پر غلو کو بھی تعصب کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اور اوہام چونکہ گمراہی کی جڑ اور بنیاد ہوتے ہیں، اس لیے انکو مستقل فصل میں سب سے پہلے بیان کیاگیا ہے۔ اس طرح یہ باب تین فصلوں پر مرتب کیا گیا ہے۔
(۱) فصل اوہام (۲) فصل تعصبات (۳) فصل ہفوات۔

پہلی فصل

شیعی اوہام

واضح رہے کہ عقل کے تفکر میں زیادہ تر غلطی غلبۂ وہم سے ہوتی ہے اسی لیے ہر اس فرقہ کا جس پر اوہام غالب ہوں عقلی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً بچے اور عورتیں اسی لیے بچوں کے نزدیک لکڑی کا ہر گھوڑا دوڑنے والا ہوتا ہے اور قالین کا شیر پھاڑنے والا ہوتا ہے۔ اور عورتوں کے نزدیک ہر بیماری کا سبب اوپری، پرائی یا سایہ آسیب، یا شیخ سدو کا دخل ہوتا ہے۔ انکے نزدیک شادی و غمی کی مقررہ رسمیں چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شرعی حکم چھوڑنا۔ اور وہ اسے باعتبار عقل محال سمجھتی ہیں اور اچھے برے شگون لینا، فال نکالنا انکے نزدیک وحی منزل من اللہ کا حکم رکھتی ہے۔ لہٰذا جب شیعی مذہب و دلائل میں وہم کا غلبہ ہوا تو انکی عقل پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ اسی لیے سلف نے فیصلہ دیا کہ شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں۔

اب ان کے اوہام کی تفصیل سننے سے پہلے یہ ادر جان لیجیے کہ وہم کا عقل پر غلبہ مطالب حقہ و صحیحہ کی دریافت میں چند انواع وطرق سے ہوتا ہے۔

نوع اول:۔ یہ کہ عقل حکم جزئی (خصوصی) کو کلی (عام) جانتی ہے مثلاً یہ کہ ہر مخالف دشمن ہے۔ اب یہاں غلطی کا منشا یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ اسکے عکس کو کلی مانیں جو حقیقت میں ہے بھی۔ یہ وہم میں پڑ کر اس کو کلی تسلیم کر لیتے ہیں۔ اہل بیت اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعوں کو یہی غلطی لاحق ہوئی بلکہ اہلسنت اور اہل بیت کے حق میں بھی۔ کہ صحابہ اور اہل سنت کے بیشتر فقہی مسائل کو امامت سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اہل بیت سے مخالف پایا تو یہ حکم لگا بیٹھے کہ انکو اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے حالانکہ باعتبار عقل مخالفت کو عداوت کہنا ہرگز صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر ایک ہی مقصد کے طالب حصول مقصد کیلیے جدا راستوں پر گامزن ہوں تو انہیں باہم دشمن نہیں کہتے چنانچہ فقیہ و امام اعظم اہلسنت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ

علیہ کے شاگرد قاضی ابو یوسف وامام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہما نے بہت سے مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے۔ اب کون عقلمند انکو اپنے استاد کا دشمن کہے یا مانے گا۔

اسی قاعدہ سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ مثلاً اگر باہم دو شخص کسی معاملہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں یا ایک دوسرے کے کسی مشورہ واجتہاد میں کوئی غلطی پکڑتا ہے تو وہ اسکا دشمن ہے۔ اسی لیے جناب امیر کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی بعض باتوں کو ناپسند کرنا۔ یا ان کے بعض اجتہادی مسائل میں انکو خطا کار ٹھہرانا شیعوں کے نزدیک دشمنی کی کھلی اور صاف دلیل ہے۔ اسی طرح جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قصاص عثمان رضی اللہ عنہ میں تاخیر کو بنظر انکار دیکھنے کو یہ لوگ دشمنی پر محمول کرتے ہیں۔ تو جب اصل ہی غلط ہے اس سے جو شاخیں نکلیں گی وہ سب ہی غلط ہونگی۔ حالانکہ کتب شیعہ میں اسی اصل کے خلاف ثابت ہے۔ ابو مخنف جناب حسین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کو ناپسند فرماتے تھے اور جسکو جناب حسن رضی اللہ عنہ کی غلطی اور خطا قرار دیتے تھے۔

لہٰذا اگر انکی تسلیم کردہ اصل کے مطابق کسی بات کا ناپسند کرنا یا اسکو خطا ٹھہرانا عداوت پر مبنی ہو تو لازم آتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جناب حسن رضی اللہ عنہ کے دشمن ہوں ایسا اعتقاد کفر صریح کی طرف لے جاسکتا ہے۔

دوسری نوع: ۔ حصر کے صیغہ کو اکبر میں اپنی طرف سے بڑھا لیتے ہیں کہ نتیجہ غلط نکلے اور شیعوں کے اکثر دلائل اسی نوع کے ہیں جس کا نمونہ باب امامت میں گذر چکا۔ مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ، عالم تھے، شجاع تھے اور متقی تھے اور جوان اوصاف کا حامل ہو امام وہی ہے دوسرا نہیں۔ حالانکہ صغریٰ میں حصر بالکل نہیں۔ اور یہ غلطی اس لیے ہے کہ ہر دو مقدمات میں حد اوسط پوری پوری مکرر نہیں آئی۔ حالانکہ نتیجہ نکالنے کیلیئے حد اوسط کا مکرر آنا شرط ہے، لیکن وہم جو معانی کی قیودات کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر و عاجز ہوتا ہے وہ اس سے غافل رہ کر سمجھ بیٹھتا ہے کہ شاید اس میں حد اوسط مکرر آگئی ہے چنانچہ یہ دلیل بھی اسی نوع اور قبیل کی ہے کہ جناب امیر واجب الاطاعت ہیں اور جو واجب الاطاعت ہو وہی امام ہے وغیرہ وغیرہ۔

تیسری نوع: ۔ یہ کہ مطلوب کچھ اور ہوتا ہے اور نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے لیکن چونکہ ان دونوں میں قرب اور نزدیکی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہم سمجھ بیٹھتا ہے کہ مطلوب حاصل ہو گیا اسی وجہ سے شیعوں کے اکثر دلائل نامکمل و ناتمام ہوتے ہیں۔ اس کتاب کے مباحث امامت میں اسکی بحث گذر چکی ہے۔ مثلاً یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ مدینۃ العلم کے دروازہ ہیں اور جو مدینۃ العلم کا دروازہ ہو امام ہے۔ وہم نے سمجھا کہ امام چونکہ رئیس امت ہے اور دروازہ بھی گھر کی ریاست کسی نہ کسی وجہ سے رکھتا ہے پس جناب امیر رضی اللہ عنہ جب دروازہ ہوئے تو امام بھی ہوئے حالانکہ مدینۃ العلم کا دروازہ ہونا کچھ اور ہے اور امام ہونا کچھ اور۔ ان میں آپس میں نہ اتحاد ہے نہ تلازم۔

چوتھی نوع: ۔ یہ مصادرت بر مطلوب کی شکل میں ہوتا ہے کہ وہم لفظاً یا مفہوم کے تغیر کی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ دلیل کا مقدمہ کچھ اور ہے اور مطلوب کچھ اور ہیں لئے ایک کو دوسرے سے ثابت کر دیا حالانکہ عقل دونوں کو ایک جانتی یا ایک ذات سمجھتی ہے لہٰذا اسکو ثابت کرنا "اثبات الشئ لنفسہ،، کا مصداق ہے۔

مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اولی بالتصرف ہیں اور جو اولی بالتصرف ہو وہ امام ہے حالانکہ

امام کے اصل معنی ہی ، اولی بتصرف عام،، کے ہیں لہذا اکبر واوسط ایک ہی چیز ہوئے ۔ اور صغری اور مطلوب بلحاظ معنی ایک قضیہ اگرچہ لفظاً ہیں تغائر ہو ۔
اور مصادرت کی ایک قسم یہ ہے کہ دلیل کے مقدمات مطلوب سے زیادہ واضح نہ ہوں بلکہ مقابل نزدیک پوشیدہ اور قابل منع ہو مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ معصوم ہیں اور امام معصوم ہوتا ہے اہلسنت کے نزدیک جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت تو بہرحال کسی نہ کسی وقت ثابت ہے لیکن معصومیت وہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ مانتے ہیں ۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کسی وقت بھی معصوم نہیں جانتے ہاں محفوظ سمجھتے ہیں ۔ آپ کی امامت کو ثابت کرنے والی دلیلیں بڑی واضح اور مضبوط ہیں ۔ مگر آپ کی عصمت ثابت کرنے والے دلائل خدشہ اور قباحت سے خالی نہیں ۔

پانچویں نوع :۔ لفظی اشتراک کی غلطی ہے ۔ یعنی دو چیزوں پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اس چیز کا حکم دوسری چیز کے لیے ثابت کرتے ہیں ۔ مثلاً نبی نزول شریعت اور وحی میں امام ہے ۔ اور نبی کا خلیفہ بھی حکم و احکام صلح و جنگ میں امام ہے ۔ لہذا جب نبی معصوم ہوگا تو خلیفہ بھی معصوم ہوگا ۔ حالانکہ امام کا اطلاق نبی پر کسی اور معنے کے لحاظ سے ہے اور خلیفہ پر دوسرے معنی سے ۔
نحوی توجیہات میں اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے مثلاً کہتے ہیں وھم راکعون ویؤتون الزکوۃ سے حال واقع ہوا ہے تو چاہیئے کہ ایتاء الزکوۃ سے مقارن ہو حالانکہ وہ یقیمون الصلوۃ سے حال ہے تاکہ صلوۃ یہود سے احتراز ہو جائے ۔ غلط مجاز بھی اسی قبیل سے ہے یعنی بطور مجاز ایک چیز پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں پھر حقیقی معنے کے لازم کو اس چیز کیلئے ثابت کرتے مثلاً بعض روافض کہتے ہیں کہ اللہ نور ہے اور ہر نور محسوس ہے تو اللہ بھی محسوس ہے چنانچہ ہشام بن حکم اور ان کے دوسرے پیشواؤں کا یہی مذہب ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پر نور کا اطلاق بر بنائے مجاز ہے اور محسوسیت حقیقی معنی کا لازم ہے مجازی معنے کا نہیں ۔ یا مثلاً کہتے ہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نفس نبی فرمایا ہے اور نفس نبی ، معصوم ہوتا ہے ، واجب الاطاعت ہوتا ہے ، اور اولی بتصرف ، اور تمام مخلوق وانبیاء سے افضل ۔ تو یہ تمام امور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کرتے ہیں حالانکہ آپ کو نفس نبی مجازاً فرمایا گیا اور مجاز پر حقیقت کا حکم مرتب نہیں ہوتا ورنہ بہادر کو شیر کہنا اس سے انسانیت سلب کرنا ہوگا ۔

چھٹی نوع :۔ ایہام العکس کی ہے یعنی ایک سچا مقدمہ عقل کے ہاتھ لگتا ہے اور وہم اسکے عکس کو بھی کلیہ صادقہ سمجھ بیٹھتا ہے اور اس سے دلیلوں میں کام نکالتا ہے مثلاً یہ کہ ہر انسان معصوم قابل امامت ہے یہ ایک سچا مقدمہ ہے مگر وہم نے اسکا عکس تراش لیا کہ ہر قابل امامت ، معصوم ہے ۔ حالانکہ منطقیوں کے نزدیک یہ بات طے اور ثابت ہے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ نہیں آتا ۔

ساتویں نوع :۔ اغفال اللزوم کی ۔ ہے یعنی حکم ملزوم لازم اعم کو دیتے ہیں اور یوں غلطی میں پڑ جاتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ نبی کیلئے عصمت اس لیے ضروری ۔ ہے کہ وہ امت کی ریاست کا مالک ہوتا ہے تو جو بھی رئیس امت ہوگا وہ معصوم ہوگا حالانکہ نبی کی عصمت معجزہ کی تصدیق کے سبب سے ہے ریاست کے باعث نہیں ۔ اور یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سورہ براۃ کی تبلیغ سے معزول کرنا اسی سبب سے تھا کہ آپ نیابت پیغمبر کے قابل نہ تھے تو پھر

آپ کسی نیابت کے قابل نہ رہے انکا ایسا کہنا بھی اسی قبیل سے ہے اس لیے کہ آپ کا یہ عزل عرب عادت کے مطابق تھا جو ان کے ہاں نقض عہد کے وقت جاری تھی اور اسی زمرہ میں ہے انکا یہ کہنا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ اہل بیت میں سے نہیں تھے کہ انکو حق خلافت پہنچتا۔ اسلیے وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کے معاملہ میں خطاکار تھے۔ گویا کہتے یہ ہیں کہ اہل بیت کے مقابلہ میں ہر صحابی کو دعوائے خلافت کا حق نہیں اور بھی اسی طرح کے اقوال ہیں۔ جو اغعال اللزوم کے زمرہ میں آتے ہیں۔

آٹھویں نوع:۔ یہ دو متنافی اشیاء کا دو وقت میں بھی ہونا محال قرار دیتے ہیں۔ اور انکی یہ غلطی زمانے سے غفلت پر مبنی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کسی نہ کسی زمانہ میں کافر تھے اور کافر قابل امامت نہیں حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دو متنافی چیزوں کا ایک وقت میں جمع ہونا تو محال ہے مگر ایک ذات میں دو وقتوں میں جمع محال نہیں مثلاً سونا، جاگنا، گرمی، سردی وغیرہ وغیرہ۔

نویں نوع:۔ قوۃ کو فعل کی جگہ استعمال کر لینا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی امام تھے کیونکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ (جو نسبت ہارون کی موسیٰ سے تھی وہی نسبت تم کو مجھ سے ہے) اسلیے اگر آپؓ بلا فصل امام نہ ہوں تو آپ کا عزل لازم آتا ہے۔ اور امام کا معزول ہونا جائز نہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ کے حضور۔ امام بالقوہ۔ تھے امام بالفعل نہ تھے۔ اور امام بالقوہ۔ کو جب ان سے قابل ترجیح افراد کی موجودگی کے سبب مقرر ہی نہیں کیا گیا تو عزل کا کیا سوال۔

دسویں نوع:۔ جزو کو کل کی جگہ لے لینا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اولاد پیغمبر جزو پیغمبر ہیں اور پیغمبر معصوم ہیں۔ لہذا اولاد بھی معصوم ہے حالانکہ معصوم پیغمبر کی مکمل شخصیت ہے اسکا کوئی جزو نہیں اور اسی میں غلط مجاز کی شکل بھی موجود ہے اس لیے کہ اولاد جزو حقیقی نہیں ہوتی۔

گیارھویں نوع:۔ یہ کہ عرض کو ذات کی جگہ لے لینا اور تابع کو متبوع کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ امام نائب پیغمبر ہوتا ہے تبلیغ کے معاملہ میں۔ تو وہ احکام کا اسی طرح مبلغ ہوگا جس طرح نبی اور پیغمبر۔ اور پیغمبر معصوم ہے تو چاہیئے کہ امام بھی معصوم ہو۔ حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ پیغمبر مبلغ بالذات ہے اور امام مبلغ بالتبع۔ ہے اور عصمت مبلغ بالذات کا خاصہ ہے اور اسی قبیل سے وہ بات ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس امت کا امام نائب پیغمبر ہے جو تمام پیغمبروں سے بہتر ہیں لہذا امام کو بھی تمام پیغمبروں سے بہتر ہونا چاہیئے حالانکہ نائب شخص کو تمام صفات میں اس شخص کا حکم نہیں ملتا۔

(جب وہ نائب پیغمبر ہونے کے باوجود پیغمبر کے مرتبہ پر نہیں تو تمام پیغمبروں سے افضل ہونا تو بعد کی بات ہے)۔

بارھویں نوع:۔ یہ ہے کہ ایک لازم مشترک میں شریک دو چیزوں کے اتحاد کا حکم لگانا مثلاً مشیر۔ مکرہ (منع کرنے والا ہے) کیونکہ جب معاملہ میں مشورہ ہوا یا جس میں مجبور کیا گیا۔ دونوں کی رضامندی کو دخل ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قصۂ قرطاس میں مشیر ہوئے تو مکرہ بھی ہوئے اور جو نبی کو کسی چیز پر مجبور کرے وہ گنہگار ہے حالانکہ مشورہ دینے اور مجبور کرنے میں عقل کے نزدیک فرق ظاہر ہے اگرچہ وہم اسکا یقین نہ کرے اسی لیے بچے عورتیں اور نادان مشیر کو بھی مکرہ کی طرح ملامت کرتے ہیں۔

تیرھویں نوع :۔ یہ کہ عدم ملکہ کو ایجاب وسلب کی جگہ جاننا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جب خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم معصوم نہ تھے تو فاسق ہوئے حالانکہ عصمت نہ ہونے سے فسق لازم نہیں آتا کیونکہ انکے درمیان محفوظ کا ایک واسطہ ہے۔

چودھویں نوع :۔ یہ کہ مجموعی کل، کو افرادی کل کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ ہر صحابی معصوم نہ تھا تو گویا کل صحابہ بھی معصوم نہ ہوئے اسلیے انکا اجماع خطا کا احتمال رکھے گا۔ حالانکہ مجموعی کل اور افرادی کل کے احکام میں بہت فرق ہے مثلاً ہر انسان اس گھر میں سما سکتا ہے اور یہ روٹی اسکا پیٹ بھر سکتی ہے مگر سب انسان نہ اس گھر میں سما سکتے ہیں اور نہ یہ روٹی سب کا پیٹ بھر سکتی ہے

پندرھویں نوع :۔ یہ کہ نئی نئی مثالوں کو ایک خاص چیز جاننا اور اس قسم کا وہم کم زور عقل والوں پر غلبہ کرتا ہے یہاں تک کہ دریا کے پانی، چراغ کے شعلے اور فوارہ کے پانی کو اکثر اشخاص ایک پانی اور ایک شعلہ خیال کرتے ہیں اور اکثر شیعہ اپنی عادات میں اس خیال میں منہمک ہیں۔ مثلاً عاشورہ کا دن جو ہر سال آتا ہے اسکو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن خیال کرتے ہیں اور نوحہ و ماتم، نالہ و شیون، گریہ وزاری، سینہ کوبی و بیقراری بالکل ان عورتوں کی طرح شروع کر دیتے ہیں جو ہر سال اپنے مردوں پر کرتی ہیں حالانکہ عقل جانتی اور مانتی ہے کہ زمانہ سیال اور غیر قار ہے اسکے اجزاء کو ہرگز قرار نہیں اور جو معدوم ہوگیا اسکا لوٹنا محال ہے جناب حسین رضی اللہ کی شہادت اس دن ہوئی تھی جسکو بارہ سو (اور اب چودہ سو) سال کا عرصہ ہوتا ہے اس دن کو آج کے اس دن سے کیا اتحاد اور کونسی مناسبت ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحی کو اس پر اس لیے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں سرور وشادمانی کے اسباب ہر سال تازہ اور نئے ہوتے ہیں یعنی رمضان کے روزوں کی ادائگی اور خانہ کعبہ کے حج کی ادائگی جو نئی نعمت کا شکریہ ہیں جو سال بسال نیا سرور اور نئی فرحت پیدا کرتے ہیں اسی لیے شرعی عیدیں اس وہم فاسد پر مقرر نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ اکثر عقلائے بھی نوروز و مہرجان اور اس قسم کے دنوں کو عید منایا ہے کہ یہ ہر سال آسمانی تغیرات کے سبب نئی نئی فرحت لاتے ہیں اور نئے نئے احکام کا سبب بنتے ہیں۔

بابا شجاع الدین کی عید، عید غدیر سب اسی خیال فاسد پر مبنی ہیں۔ یہیں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا دن یا نزول وحی کا پہلا دن، اور شب معراج کو شرعاً عید کیوں قرار نہیں دیا۔ عید الفطر عید النحر کو قرار دیا۔ اسی طرح کسی نبی کے یوم تولد یا یوم وفات کے دن کو عید قرار نہیں دیا۔ اور صوم یوم عاشورہ کو کیوں منسوخ فرمایا جسکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سال اول میں یہود کی موافقت میں ادا فرمایا ان سب میں یہی راز کار فرما ہے کہ وہم کو اسمیں مداخلت کا موقعہ نہ ملے۔

سولھویں نوع :۔ ایک چیز کی صورت (تصویر) کو وہی چیز قرار دینا اور اس قسم کے اوہام نے اکثر بت پرستوں کی رہزنی کی اور انکو گمراہی میں مبتلا کیا۔ کمسن اور نادان بچے بھی اس وہم میں پڑ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہ مٹی کے کھلونے ہتھیار گھوڑے بنا کر انہیں اصلی گھوڑے اور ہتھیار سمجھتے ہیں۔ کمسن بچیاں رنگ برنگ کپڑے پہنا کر انکی شادیاں کرتی اور بہت خوش ہوتی ہیں۔

اس قسم کے وہم کا شیعوں پر تو بہت ہی غلبہ ہے حضرات حسنین، جناب امیر، جناب سیدہ رضی اللہ عنہم

کی مصنوعی قبور بناتے ہیں اور حقیقی قبروں کی طرح انہیں مان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں سجدے کرتے ہیں، فاتحہ وسلام پہنچاتے ہیں، مورچھل، مگس راں اٹھائے مجاوروں کی طرح ان کے پاس کھڑے رہتے ہیں اور خوب داد کفر دیتے ہیں عقل کے نزدیک بچوں کی حرکت اور ان "پیران نابالغ" کی حرکات میں کوئی تفاوت اور فرق نہیں۔

سترھویں نوع: کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے نام سے موسوم کر کے تعظیم یا اہانت، سب وشتم مار پیٹ کا سلوک کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سلوک اصل شخص سے کر رہے ہیں ان کا یہ وہم پہلے وہم سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

آپ نے بچوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا یا سنا ہوگا کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بادشاہ، کسی کو وزیر، کسی کو چور، کسی کو کوتوال بنا کر باہم اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ شیعہ بھی محرم میں یہ ناٹک رچاتے ہیں کسی کا نام یزید، کسی کا شمر، اور بعض خواتین کو خواتین اہل بیت کا نام دے کر ان سے وہی سلوک کرتے ہیں، جو ان کے نزدیک اصلاً ہونا چاہیئے تھا۔ ان کے اس وہم کو اللہ کی کتاب کی ایک آیت باطل کرنے کیلیے کافی ہے۔

اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ۔	یہ کچھ نہیں صرف ایسے نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں بغیر اللہ کی منظوری کے

ان کی اسی وہم کی پیداوار ان کی یہ حرکت ہے کہ جب کسی کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن دیکھتے ہیں تو اسکی تحقیر و اہانت کرتے ہیں حالانکہ حدیث صحیح میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ناموں میں سے سب سے زیادہ محبوب عبداللہ و عبدالرحمٰن نام ہیں۔

بالکل معمولی اور سامنے کی بات ہے کہ کسی چیز کا نام اس چیز کے خواص و اثرات نہیں رکھتا۔ مثلاً آگ کا نام گرم نہیں۔ پانی کا نام ٹھنڈا نہیں، شکر کا نام مٹھاس نہیں اور ایلوے کے نام میں کڑواہٹ نہیں پائی جاتی۔

اٹھارویں نوع: یہ کہ ظرف کو تناقض کی شرط نہیں جانتے اس وہم نے بھی عوام میں بہت گمراہی پھیلائی ہے اور انہیں راہ راست سے بھٹکایا ہے۔

دو نقیضوں کے دو مختلف ظرفوں میں جمع ہو جانے کو یہ محال ہی جانتے ہیں۔ چنانچہ مسئلہ اجتہاد میں شیعہ اسی وہم میں گرفتار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر امام خدا کی جانب سے مقرر نہ ہو اور ایسے احکام جن پر نص شرعی نہ ہو اگر وہ مجتہدین کی رائے سے وابستہ ہوں تو اجتماع نقیضین لازم آئیگا کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگر ایک چیز کو حلال قرار دیا ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اسکو حرام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ صاف بات ہے کہ جب مجتہد کا ظن مختلف ہوا تو اجتماع نقیضین کہاں ہوا دونوں کا ظن ایک ہوتا اور احکام مختلف تو کہا جا سکتا تھا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ محمود کے گمان میں حامد کھڑا ہے مگر احمد کے گمان میں کھڑا ہوا نہیں ہے تو اسمیں نقیض کہاں اور یہ باہم متناقض کیسے ہوئے۔

یہاں بھی غیر منصوصات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم متعین نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے وہی حکم متعین ہے جو اسکے یا اسکے پیشواؤں کے اجتہاد کے مطابق ہو اور یہ اختلاف امتی رحمۃ کے یہی معنے ہیں۔

انیسویں نوع: یہ کہ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ تشبیہ دینے میں مشبہ اور مشبہ بہ میں پوری پوری

مساوات کا سلب جاننا۔
یہ وہم کمسن بچوں کو لاحق ہوتا ہے تمیز دار اور شعور رکھنے والے لڑکوں کو نہیں شیعوں کو یہ وہم بہت ہوتا رہتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو زہد، تقوی، علم اور حلم میں جب اولوالعزم انبیاء علیہم السلام سے تشبیہ دی ہے تو امیرالمؤمنین رضی اللہ عنہ کو ان انبیاء اولوالعزم کے برابر ہونا چاہیے اور جو اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے برابر ہوگا وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے افضل ہوگا اب ایسی لچر بات کا کوئی کیا جواب دے۔

بیسویں نوع:۔ یہ کہ عادیات کو اولیات کے بجائے لاتے ہیں۔ یہ وہم اکثر گمراہ فرقوں کو لگا ہے اور بڑے بڑے اہل علم اس بھنور میں غوطے کھاتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ریاست اسکی اولاد اور اسکے خاندان میں چلتی ہے اور دلیل یہ کہ قیصر و کسریٰ کے ہاں یہی ہوتا تھا۔ اور زمینداروں یا راجپوتوں میں اسی کے مطابق عمل ہوتا ہے داماد کے ہوتے ہوئے خسر کو ریاست کا حق نہیں پہنچتا۔
اسی وہم کے مقابلہ میں اسی جنس کا ایک دوسرا وہم بھی ہے یعنی کہ انسان کے مرنے کے بعد ریاست کے اختیارات اسکی بیوی کے سپرد ہیں اور اگر اسکی کئی بیویاں ہوں تو جو بیوی اسکی خاص ہو اور جو کنوارپنے کی حالت میں اسکی بیوی بنی ہو امامت کا معاملہ اسکے ہاتھ میں ہے۔ نہ اس معاملہ میں لڑکی کو کوئی دخل ہے نہ داماد کو۔
بہر حال عقل کے نزدیک دونوں وہم فاسد اور غلط ہیں شرع میں عہدہ اور ریاست ورثہ میں شمار نہیں۔ قابلیت، صلاحیت لیاقت یا صاحب ریاست کے اشارہ پر ترجیح کا دارومدار ہے۔

اکیسویں نوع:۔ غائب کو نظر آنے والی چیز پر قیاس کرنا ہے مثلاً اللہ تعالے اور پیغمبر علیہ السلام کو مخلوق اور امت پر قیاس کرنا اس سخت بیماری نے بھی بہت سوں کے عقائد خراب کئے ہیں۔ چنانچہ شیعوں کے الہیات و معاد کے اکثر مسائل اسی اصل پر موقوف ہیں خصوصاً وجوب اصلح و لطف اور وجوب عدل اور مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عذاب وغیرہ اس وہم سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے گذشتہ ابواب میں ان کا بیان گذر چکا ہے۔

بائیسویں نوع:۔ ترک اضافات یعنی یہ کہ ایک چیز کو چند چیزوں سے دو تین نسبتیں حاصل ہوں ایک نسبت کوئی حکم چاہتی ہو دوسری کچھ اور اب ان میں سے ایک کا لحاظ کریں اور باقی کو نظر انداز کر دیں امامیہ کو یہ وہم اکثر مسائل میں لاحق ہوا ہے مثلاً کہتے ہیں کہ امامت چونکہ نبی کی نیابت ہے اسلیے وہ نبی کی اجازت پر موقوف ہوگی لہذا امام کی امامت پر نص ہونا واجب ہوا۔ حالانکہ امامت ریاست امت ہے اور انہیں کے اختیار پر موقوف ہے۔ تو اس لحاظ سے امام کا منصوص علیہ ہونا ضروری نہیں یا مثلاً کہتے ہیں کہ امیر سے محبت کرنا واجب ہے جبکہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے انسے پرخاش رکھی لہذا وہ واجب البغض ہوئیں حالانکہ اسکا یہ پہلو بھی تو ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام واجب المحبت ہیں اور ام المؤمنین آپ کی محبوب زوجہ لہذا وہ واجب المحبت ہوئیں۔
اس قسم کا وہم ان کے تمام معتقدات میں گھسا ہوا ہے۔ اور حفظت شیأ و غابت عنک اشیاء (ایک چیز یاد رہ گئی اور باقی ساری چیزیں تیری نظر سے غائب ہو گئیں)۔ کی پرانی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ وہم کے سوا انکو سب کچھ بھول گیا۔

تیئیسویں نوع :۔ یہ کہ جو کچھ دلی آرزو ہو مثلاً کمال انتظام حسن سیاست ملک، اور لوازم ریاست ان چیزوں کے متعلق واقعی یہ گمان کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ گویا تحقیق شدہ ہے مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شرعی حکم اور دنیوی مصلحت کیلئے امام معصوم واجب الطاعت ہے۔ اسلیے کہ اسپر غیب سے القا ہوتا ہے وہ اپنی تدبیر وحکم میں ہرگز غلطی نہیں کرتا یہ عجیب لطیفہ ہے کہ ایک چیز گویا واقع تو ہوئی مگر ہماری نظر سے غائب ہے نہ ہم اسکو دیکھتے ہیں نہ اسکی خبر سنتے ہیں پھر بھی یقین سے جانتے ہیں کہ ایسا ہے یہ وہم تو ہے ہی غفلت اسپر مزید ہے کہ جب ہم اسکو نہ دیکھ رہے ہیں نہ اسکی خبر سن رہے ہیں ایسی بات یا چیز کا تو وجود وعدم برابر ہوا۔ تو اسکے وقوع میں کونسا لطف اور کیا حاصل۔

چوبیسویں نوع :۔ یہ ہے کہ ہمیں اپنی معلومات میں جسکی دلیل نہ ملے وہ باطل ہے سابقہ بے وقوفوں میں سے اکثر نے اسی کو دلیل بناکر اندھیرے میں رنگوں کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اندھیری میں کوئی رنگ نہیں اسلیے کہ ہم نہیں دیکھ پاتے اور جو ہم دیکھ نہ سکیں اسکا وجود نہیں۔ مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ اسکا جواز ہے کہ رنگ موجود مگر ہم اسکو سمجھ نہ سکتے ہوں اکثر شیعہ اس وہم کا شکار رہیں اور اسی بنا پر ازواج مطہرات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے فضائل کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں مذکور نہیں۔ ارباب سیر و تواریخ کے ذکر کردہ امور واقعیہ کا انکار کرتے ہیں انکے باطل و غلط ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس بارے میں اگر ان کے سامنے آیات یا متفق علیہ احادیث پیش کی جائیں تو کہتے ہیں کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس عبارت سے یہ مدعا ثابت ہوتا ہو یہ تو در اصل۔ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ۔ کا مصداق ہیں۔

پچیسویں نوع :۔ یہ کہ زمانہ میں تقدم، کتابوں کی تصنیف، رسائل کی تدوین، دنیا میں شہرت، شاگردوں اور ساتھیوں کی کثرت، یہ سب حق پر ہونے کی دلیلیں ہیں۔ لہذا ہمارے علماء کے پیشوا چونکہ یہ تمام صفات بدرجہ اکمل رکھتے تھے اس لیے بلا شبہ انکے تمام معتقدات واقعہ کے مطابق ہی ہوں گے۔ اس وہم کی اصلیت یہ ہے کہ دنیاوی مناصب میں مال و جاہ کا حصول، شہرت، پیروؤں وخدام کی کثرت و بہتات بزرگی۔ ثروت و شان و شوکت کی دلیل ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ دنیاوی طور پر آگے بڑھے ہوئے افراد کے تقدم کو ادراک حق کے تقدم کے برابر جانتے اور علمی اور دینی دنیا میں بھی انکو سبقت و پیش دستی کا مستحق سمجھ بیٹھتے ہیں ایسے خیال و وہم کی غلطی ڈھکی چھپی نہیں۔ بالکل آشکارا ہے۔

ایسی باتیں اور معاملے حکماء ہند و یونان میں ان لوگوں سے زیادہ پیش آتے رہے ہیں حالانکہ انکے اکثر معتقدات خصوصاً الٰہیات، نبوت اور معاد میں انکی بے وقوفی کی شہادت دے رہے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اس بے وقوف فرقہ کے مغالطے اور اوہام اگر ہم پورے پورے بیان کرنے بیٹھ جائیں تو دفتر کے دفتر بھی انکے لیے کافی نہ ہونگے۔

مجبوراً اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اتنے سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کتنے پانی میں ہیں۔

دوسری فصل

شیعی تعصبات

واضح رہے کہ تعصب اسے کہتے ہیں کہ ایک چیز اپنے نزدیک دلیل قطعی سے ثابت ہے مگر مخالف کے مقابلہ میں اسکا انکار کر دیا جائے اور جو چیز اپنے نزدیک قابل انکار ہے اسی چیز سے فریق مخالف پر الزام رکھنا گویا مخالف بھی نفی و اثبات میں خود کے موافق ہو ورنہ اگر وہ موافق نہ ہوگا تو وہ دلیل الزامی ہوگی۔ تعصب نہ ہوگا اور چونکہ درحقیقت غلو بھی یہی ہے کہ منفی کا اثبات کیا جائے اور مثبت کی نفی کی جائے۔ محض شدت محبت کے سبب تو اسے بھی تعصب میں شمار کیا گیا ہے۔ اس فصل میں اسکا بھی ذکر ہوگا مگر عنوان کلام ہر دو میں تعصب ہی رہے گا۔

تعصب (۱) ۱۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ سے آفتاب سے زیادہ روشن دلائل جو اہل بیت اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق تواتر اہل سنت کے ہاں مروی ہیں انکے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو ان سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور وہ واہی تباہی روایات جو ان کے مجروح و مطعون اور غیر معتبر راویوں سے طریق قوم کے موافق امامیہ سے منقول ہیں انکو قبول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام جس کی روایت کرے وہ موجب علم و عمل ہے اگرچہ اسکی اسناد میں مجہول، ضعیف، جھوٹے اور وضاع راوی ہی کیوں نہ ہوں اور اہل سنت کی مرویات چاہے ثقہ راویوں سے ہوں واجب الرد، اور انکار کے قابل ہیں۔ حالانکہ باب اخبار میں انکے تمام علماء بھی کہتے ہیں کہ موثق روایت ضعیف سے مقدم ہے، بہتر اور معتبر ہے، اور ثقات اہل سنت کی روایات بلاشبہ ان کے نزدیک موثق ہیں۔

تعصب کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان خفی الدلالت آیات کو نص صریح جانتے ہیں جو قواعد و اصول عربیت کے موافق انکے مدعا پر ہرگز دلالت نہیں کرتیں اور نصوص صریحہ کو متشابہات سمجھتے ہیں جو اہل سنت کے مذہب پر صحیح دلالت کرتی ہیں۔

حالانکہ اس سلسلہ میں انکے علماء کا اس طور بارہا امتحان بھی ہوا۔ کہ بعض کافر ذمی لوگوں کو جو نہ کسی مذہب سے سروکار رکھتے تھے۔ اور اہل مذاہب سے انکا کوئی تعلق نہیں تھا، لغت عربی کی تعلیم یا ترجمہ تحت اللفظ سیکھنے پر جب انکو وہ آیات سنا کر پوچھا گیا کہ تم ان سے کیا سمجھے تو انہوں نے بلاتوقف اہل سنت کے مدعا پر گواہی دی شیعہ مدعا اس آیت سے نہ انکے سمجھ میں آیا اور نہ اسپر انہیں یقین آیا۔

تعصب (۲): ۔حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب علی رضی اللہ عنہ کو برابر جانتے ہیں حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام مخلوقات پر افضلیت خود انکے نزدیک بھی بتواتر منقول ہے

تعصب (۳): ۔علی رض کی محبت جسکے دل میں ہوگی خواہ وہ کافر و مشرک ہو، یہودی و نصرانی ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور جو دل میں صحابہ کی دوستی رکھے خواہ عابد و متقی ہو اور اہل بیت سے بھی محبت رکھتا ہو پھر بھی وہ دوزخی ہے۔

چنانچہ رضی الدین لغوی شیعی نے اپنے چند شعروں میں زنیبا بن اسحاق نصرانی کے بہشتی ہونے کا حکم لگایا ہے حالانکہ اس نے جناب ابوبکرؓ و عمرؓ کو برا نہیں کہا ہے۔

ابیات

عَدِیٌّ وَتَیْمٌ لَا اُحَاوِلُ ذِکْرَهُمْ	بِسُوْءٍ وَلٰکِنِّیْ مُحِبٌّ لِهَاشِمِ
وَمَا یَعْتَرِیْنِیْ فِیْ عَلِیٍّ وَاَهْلِهٖ	اِذَا ذُکِرُوْا فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمِ
یَقُوْلُوْنَ مَا بَالُ النَّصَارٰی یُحِبُّهُمْ	وَاَهْلُ النُّهٰی مِنْ اَعْرُبٍ وَاَعَاجِمِ
فَقُلْتُ لَهُمْ اِنِّیْ لَاَحْسِبُ حُبَّهُمْ	سَرٰی فِیْ قُلُوْبِ الْخَلْقِ حَتَّی الْبَهَائِمِ

ترجمہ:۔ میں عدی و تیم (ابوبکر و عمر کے قبیلے) کا ذکر برائی سے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کرتا۔ لیکن میں بنی ہاشم سے محبت رکھتا ہوں۔ اور جب دین خدا میں علیؓ اور اسکے گھرانے کا ذکر کیا جائے تو مجھے ملامت گر کی ملامت نہیں چھوتی۔ کہتے ہیں کہ اسکا کیا سبب ہے عرب و عجم اور نصاریٰ کے عقلمند ان سے محبت کرتے ہیں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں کہ انکی محبت انسانوں کے دلوں میں کیا بہائم کے دلوں تک میں اثر کر گئی ہے۔

اور ابن فضلوں یہودی کو تو انکے علماء ان دو تین بیتوں کی وجہ سے بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الْجَنَّةِ سُؤْلِیْ	وَاعْفُ عَنِّیْ بِحَقِّ اٰلِ الرَّسُوْلِ
وَاسْقِنِیْ شَرْبَةً بِکَفِّ عَلِیٍّ	سَیِّدُ الْاَوْلِیَاءِ بَعْلُ بَتُوْلِ

ترجمہ:۔ میرے پروردگار میرا جنت کا سوال پورا فرما۔ اور آل رسول کے طفیل میرے گناہ بخش دے۔ اور علیؓ کے ہاتھ سے مجھے پانی پلا جو ولیوں کے سردار اور شوہر بتول ہیں۔

حالانکہ حضرت علیؓ اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی محبت انکی مدح گوئی، منقبت خوانی بالاجماع موجب اجر و ثواب اور ایک طرح کی عبادت ہے مگر تمام قابل اجر و ثواب اعمال میں قبولیت کیلئے ایمان شرط اول ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ وَاِنَّا لَهٗ کٰتِبُوْنَ۔	اور جو اچھے کام کرتا ہے بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو تو اسکی سعی و کوشش ضائع نہیں ہوتی۔ ہم اسکو لکھ رکھتے ہیں۔

جب محبوب خدا پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی آپکے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر کافروں پر اثر انداز نہ ہوئی۔ تو جناب امیر و اہل بیت رضوان اللہ عنہم جو بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اور تابعدار ہیں۔ تو انکی محبت کافر کے حق میں کیسے کارگر ہو سکتی ہے۔ اور پھر کافروں کی دوزخ سے رہائی اور بہشت میں انکا دخول خود ان شیعوں کے نزدیک باطل و محال ہے۔ خواہ وہ کتنے بھی اعمال خیر کیوں نہ کرلیں۔ اور اہل ایمان خواہ کس قدر بھی گناہ نہ رکھتے ہوں انکے نزدیک بہشت میں ضرور داخل ہونگے صحابہ سے محبت زیادہ سے زیادہ معصیت اور گناہ کبیرہ ہی ہوگی تو اہل سنت انکی دوستی کیوجہ سے بہشت سے کیوں محروم رہیں گے۔ حالانکہ وہ اہل بیت کرام سے بھی بلاشبہ محبت رکھتے ہیں۔ اور جب اہل بیت کی محبت کافر کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا سکتی ہے تو اہل سنت جو صرف صحابہ سے دوستی رکھنے کے مرتکب ہیں دوزخ سے خلاصی پاکر جنت

میں کیوں داخل نہ ہوں۔

تعصب (۴): ۔ یہ ہے کہ کہتے ہیں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے ہوئے کوئی معصیت ضرر نہیں پہنچاتی حالانکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے مثلاً مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (جو بُرا کام کریگا اسکا بدلہ پائے گا) مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (جو ذرہ برابر برائی کریگا وہ اسکے آگے آئیگی) علاوہ ازیں اسکے خلاف خود ائمہ کرام رحمہم اللہ سے صحیح روایات مروی ہیں جو کتاب میں بیان ہو چکی ہیں۔

تعصب (۵): ۔ صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم سے انتہائی بغض و عداوت کی وجہ سے پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ان بدبختوں نے "ملعونہ" رکھدیا اور اللہ تعالی کے فرمان كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ کو بھی پس پشت پھینک دیا ہے اور اپنے امام جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو جو ابن بابویہ نے بسند صحیح اپنی تفسیر میں روایت کی ہے فراموش کردیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اَمَا عَلِمْتَ یَا مُوْسٰی اَنَّ فَضْلَ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ عَلٰی سَائِرِ الْاُمَمِ کَفَضْلِیْ عَلٰی خَلْقِیْ۔	اے موسیٰ کیا تم جانتے نہیں کہ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فضیلت تمام امم کے مقابلہ میں ایسی جیسی میری فضیلت میری تمام مخلوق پر۔

اسی طرح آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ بھی انہوں نے نظر انداز کردی ہے۔

تعصب (۶): ۶۔ موجودہ قرآن مجید سے بریت ظاہر کرتے ہیں حالانکہ یہ بلاشبہ ان کے ائمہ حضرات رحمہم اللہ کے نزدیک منقول بالتواتر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوران نماز و خارج نماز بہ نیت عبادت اسکی ہی تلاوت فرماتے تھے اور جناب حسن عسکری اور دیگر ائمہ رحمہم اللہ نے اسی قرآن کی تفسیر لکھی اور اسی کی آیات والفاظ سے اپنے کلام میں دلائل واستشہادات پیش کئے۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن منزل نہیں بلکہ یہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا تحریف کردہ ہے کیونکہ انہوں نے ہی اسے جمع کیا اور انہوں نے ہی اسے رواج دیا۔ کوئی حد ہے اس بغض و عناد کی؟

تعصب (۷): ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کو ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن سے بڑھکر جانتے ہیں حالانکہ کسی بھی ملت و شریعت میں بروں کی برائی کار ثواب نہیں مانی گئی چہ جائیکہ وہ ذکر الٰہی سے زیادہ ثواب کا درجہ رکھے جو باجماعِ جملہ مِلَل و نِحَل افضل ترین شغل اور احسن ترین عمل ہے (یہ بات بغض و عناد سے انکی کھوپڑی میں جڑ پکڑ سکتی ہے اور وہی ایسا لغو و بے ہودہ عقیدہ رکھ سکتے ہیں)

تعصب (۸): ۔ بڑے بڑے صحابہ (رضی اللہ عنہم) ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) پر لعنت بھیجنے کو بڑی عبادت شمار کرتے اور پنجوقتہ نمازوں کی طرح اسکو ہمیشہ ادا کرنا فرض خیال کرتے ہیں۔ ابوجہل فرعون و نمرود کو جو بلاشبہ خدا اور اسکے رسولوں کے دشمن ہیں کبھی کچھ نہیں کہتے نہ انکی کتابوں میں اسکے متعلق کچھ لکھا ہے انکی کتابوں میں تو یہ لکھا ہے کہ جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر ہر صبح لعنت بھیجنا ستر نیکیوں کے برابر ہے مگر ابوجہل فرعون و نمرود پر لعنت رتی بھر بھی حسنہ نہیں۔

تعصب (۹): ۔ بنات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام کلثوم اور بی بی رقیہ رضی اللہ عنہما کا عقد چونکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا اسلیے ان ہر دو محترمات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے خارج کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں نہیں تھیں۔ بلکہ بعض تو انکو حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں بھی نہیں مانتے کہ کہیں ماں کی طرف سے ہی بی بی زہرا رضی اللہ عنہا سے اشتراک نہ ہو حالانکہ یہ آیت یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ (اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو) کے سراسر خلاف ہے (ایک بیٹی کیلئے بنات، صیغہ جمع کی کیا تک تھی)

نہج البلاغہ میں ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تغیر سیرت پر ناراض ہوتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے ،، کہ دامادی کے سبب آپ اس رتبہ تک پہنچے کہ شیخین رضی اللہ عنہما بھی نہ پہنچے تھے ،، (یہ کن کی دامادی کی طرف اشارہ ہے)

اور دیکھئے ابو جعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ وہ اپنی دعا میں یہ فرمایا کرتے تھے۔

اللھم صل علی رقیۃ بنت نبیک	اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر رحمت فرما
اللھم صل علی ام کلثوم بنت نبیک	اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت فرما۔

کلینی کی روایت بھی ملاحظہ کیجئے۔

تَزَوَّجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَدِیْجَۃَ وَھُوَ ابْنُ بِضْعٍ وَعِشْرِیْنَ سَنَۃً فَوُلِدَ لَہٗ مِنْھَا قَبْلَ مَبْعَثِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَلْقَاسِمُ وَرُقَیَّۃُ وَزَیْنَبُ وَاُمُّ کُلْثُوْمٍ وَوُلِدَ لَہٗ بَعْدَ الْمَبْعَثِ اَلطَّیِّبُ وَالطَّاھِرُ وَفَاطِمَۃُ۔	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی تو آپ کی عمر پچیس سال تھی تو آپ کی بعثت سے قبل، قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم (رضی اللہ عنہم) پیدا ہوئیں، اور بعثت کے بعد طیب، و طاہر، اور فاطمہ رضی اللہ عنہم تولد ہوئے۔

اور دوسری روایت میں اس نے بیان کیا ہے کہ بعثت کے بعد صرف فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی پیدا ہوئیں اور طیب و طاہر رضی اللہ عنہما بعثت سے پہلے پیدا ہوئے ،، ملا طاہر قزوینی نے شرح میں قصہ کی تفصیل لکھی ہے۔

تعصب (۱۰): ۔ یہ کہتے ہیں کہ جناب ابو بکر صدیق، عمر فاروق، اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم منافقوں میں سے تھے حالانکہ یہ بات انکے نزدیک ثابت ہے کہ آیت مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ کے ذریعہ مؤمن و منافق باہم ممیز ہو چکے تھے۔ آخر حیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام نماز مقرر فرمایا حالانکہ منافق کو بالاجماع امام نماز بنانا جائز نہیں۔ اور پھر حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہمیشہ حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے رہے انکے علاوہ جناب ابوذر، سلمان فارسی، مقداد اور جناب عمار رضی اللہ عنہم بھی ان تینوں حضرات کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور کبھی انکی اقتدا سے علیحدہ نہیں ہوئے۔

تعصب (۱۱): ۔ کہ تیمی اور عدوی جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دو بت تھے جنکو وہ چھپائے رکھتے

اور انہیں کی عبادت کرتے تھے۔ حالانکہ یہ بات انہی لوگوں کے نزدیک ثابت ہے کہ جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنی بنایا تھا اور اپنی صاحبزادی کا نکاح کرنا چاہتے تھے۔ اگر انکی بکواس صحیح مان لی جائے تو پہلی بات تو یہ کہ جناب اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا جو مومنہ تھیں جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ سے انکا نکاح کیسے صحیح ہوا اور جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی ولادت کیسی ہوئی۔ اور غلط ولادت والے کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنی کیسے بنالیا اور اپنی بیٹی انکے نکاح میں دینے کا کیوں ارادہ کیا ایک معصوم، کا بت پرستوں سے اس قسم کے معاملات کرنا کس شرع و منطق کی رو سے صحیح قرار پائے گا۔

تعصب (۱۲) :۔ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی وہ آیات جو حضرات مہاجرین و انصار خصوصاً حضرت ابوبکر، و عمر عثمان و طلحہ، زبیر اور جناب صدیقہ رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئیں سب متشابہات ہیں جنکے معنی کا پتہ نہیں۔ ابن شہر آشوب السروی مازندرانی نے جو انکے عالموں میں سے ہے یہ بات لکھی ہے۔ اور دوسرے بھی اسکے دیکھا دیکھی یہی بیان کرنے لگے ہیں۔

تعصب (۱۳) :۔ اہل سنت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے میں حد سے بھی بڑھ جاتے ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے عناد رکھتے ہیں افراط سے کام لیتے ہیں اسی وجہ سے ان حضرات کو نواصب کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس افتراء و بہتان کا سہرا ابن شہر آشوب نے اپنے سر باندھا ہے۔ حالانکہ یہی لوگ خود اپنی کتابوں میں اہل سنت کی کتابوں خصوصاً بیہقی ابوالشیخ اور دیلمی سے نقل کرتے ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدٌ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ وَیَکُوْنَ عِتْرَتِیْ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ نَفْسِہٖ ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک میں کسی کو اپنی جان سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں وہ مومن نہیں ہوتا اور میری عترت بھی اسکو اپنی جان سے زیادہ پیاری نہ ہو جائے۔
عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِعَمِہٖ وَاَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰہِ وَاَحِبُّوْا اَھْلَ بَیْتِیْ لِحُبِّیْ اِلٰی خَیْرِ ذَالِکَ	ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے محبت کرو کہ وہ تم پر انعام فرماتا ہے اور اللہ سے دوستی کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔

ان روایات کے علاوہ شیعہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت جناب امیر اور آپ کی ذریت رضی اللہ عنہم سے محبت فرائض ایمان میں سے شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عربی اشعار میں فرمایا ہے

فَلَا تَعْدِلْ بِاَھْلِ الْبَیْتِ خَلْقًا ۔ فَاَھْلُ الْبَیْتِ ھُمْ اَھْلُ السَّعَادَۃِ
فَبُغْضُھُمْ مِنَ الْاِنْسَانِ خُسْرٌ ۔ حَقِیْقِیٌّ وَحُبُّھُمْ عِبَادَۃٌ

(اہل بیت کو عام مخلوق کی طرح کا نہ سمجھو وہ نیک بخت لوگوں کی جماعت ہے۔ ان سے عداوت و بغض انسان کے لیے حقیقی خسارہ ہے۔ اور ان سے محبت عبادت کا سا درجہ رکھتی ہے)۔

ان اشعار کو شیخ بہاء الدین آملی نے اپنے کشکول میں ذکر کر کے شیخ موصوف سے یہ بھی نقل کیا کہ آپ نے

فرماتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ایمان لے آیا مگر آپ کے اہل بیت پر ایمان نہیں لایا تو وہ مومن نہیں۔ اور ان شیعوں کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حب اہل بیت کا حال بھی معلوم ہے اور اس سلسلے میں جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے امام صاحب کی پرخاش بھی پوشیدہ بات نہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ جناب اعمش حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو جو ابو جہل کی بیٹی کیلیے پیغام نکاح دینا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر اظہار ناراضگی فرمانے کو بیان کیا کرتے تھے۔ مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے کہتے تھے کہ گو واقعہ صحیح ہے۔ مگر تم جس انداز بیگانہ اور بے ادبانہ میں اسکو بیان کرتے ہو یہ درست نہیں۔ اور جب کوئی دینی مسئلہ اسپر موقوف بھی نہیں تو کیوں بیان کرتے ہو۔ چنانچہ شریک بن عبداللہ بن شبرمہ، ابن ابی لیلی رحمہم اللہ جو امام صاحب کی رائے سے متفق تھے۔ سب مل کر اعمش رح کے گھر گئے اور ان سے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ملامت کی، جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جہاں تک حب علی رضی اللہ عنہ کا سوال ہے تو میں اسمیں تم سے بھی دو قدم آگے ہوں مگر حدیث کو جس طرح سنا ہے اسی طرح روایت کیا ہے۔ میرا یہی منصبی فریضہ ہے پھر ان حضرات کے سامنے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے مناقب میں بہت سی روایات بیان کیں کہ سب حضرات خوش ہو گئے اور خوش خوش واپس آگئے۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جناب محمد باقر، جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہما سے علم وطریقت کے استفادہ کی جو شاگردانہ نسبت حاصل ہے یا جناب زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے جو رابطہ وتعلق ہے وہ نہ محتاج بیان ہے نہ محتاج ثبوت۔ جناب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی جناب ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی زیارت کی جناب امیر نے اسکے حق میں برکت اولاد کی دعا فرمائی چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی دعا کی قبولیت کی علامت ہیں جناب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت اس خاندان سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اس سلسلہ میں ان کے اشعار شیعہ کتب میں مذکور و مسطور ہیں۔ ہم انکی توجہ انکی اپنی کتابوں میں مندرج اشعار کی طرف دلاتے ہیں کہ انہیں دیکھیں۔ اور اپنے الزام کی مضحکہ خیزی پر ہو سکے تو ندامت سے سر جھکالیں۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے تھے۔ پوری زندگی ان کے ہم مجلس رہے آپ سے علم حاصل کیا اور آپ کے شاگرد رشید شمار ہوئے ہیں۔ اور جب جناب علی رضا رحمۃ اللہ علیہ نیشا پور پہنچے تو ایک خچر پر سوار تھے، شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ جو اہل سنت کے بڑے صوفیا میں سے ہیں آپ کے آگے آگے جلو داری کرتے چلتے تھے اور صوفیہ کی ایک دوسری جماعت اپنی چادروں سے آپ پر سایہ کیے ہوئے ہوتی۔

حافظ ابو زرعہ رازی، اور محمد بن اسلم طوسی رحمہما اللہ اپنے تمام طلباء اور حدیث کے کاتبان کے ساتھ اپنے مدرسوں اور اپنے مقامات سے باہر آپ کی زیارت کیلیے نکل آئے۔ اور شہر میں ایک ہل چل مچ گئی۔ لوگ باگ آپ کی زیارت کو امنڈ آئے۔ محدثین اہل سنت نے عرض کیا کہ اس موقع پر آپ اگر ایک دو حدیثیں اپنی آبائی سند یعنی سلسلۃ الذہب سے مجمع کے سامنے بیان فرمادیں تو ہم سب بہت احسانمند ہونگے۔ چنانچہ آپ نے اب وجد کے حوالہ سے یہ روایت بیان فرمائی۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ حِصْنِیْ فَمَنْ قَالَہَا دَخَلَ حِصْنِیْ وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِیْ اٰمِنَ مِنَ الْعَذَابِ۔	کلمہ لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جس نے یہ کلمہ پڑھ لیا وہ میرے قلعہ میں داخل ہوگیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوگیا وہ عذاب سے مامون ہوگیا۔

اسوقت اہل سنت علماء محدثین اور طلبا جو دوات بردار تھے ان کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار تھی۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جب اس روایت کو ذکر کرتے تو فرماتے اگر یہ پاگل پر پڑھی جائے تو اسے ہوش آجائے اور بیمار پر پڑھی جائے وہ صحت یاب ہو جائے۔

ابن اثیر نے کامل میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امامیہ میں سے صاحب الفصول نے بھی تاریخ الائمہ میں ایسا ہی ذکر کیا ہے حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت مشہور ہے۔

کَانَ عِنْدَہٗ رَجُلٌ مِنْ قُرَیْشٍ فَاَتَاہُ عَلِیُّ بْنُ حُسَیْنٍ فَقَالَ لَہُ الرَّجُلُ الْقُرَشِیُّ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ مَنْ ھٰذَا قَالَ سَعِیْدٌ ھٰذَا الَّذِیْ لَا یَسَعُ مُسْلِمًا اَنْ یَجْھَلَہٗ ھُوَ عَلِیُّ بْنُ حُسَیْنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمْ اَجْمَعِیْنَ۔	کہ انکے پاس ایک قریشی بیٹھے ہوئے تھے کہ جناب علی بن حسین رضی اللہ عنہما تشریف لائے قریشی نے پوچھا ابوعبداللہ یہ کون صاحب ہیں سعید نے کہا یہ وہ ہیں جن سے ناواقف رہنا کسی مسلمان کیلیے جائز نہیں یہ علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں۔

پھر تصوف کے اکثر سلسلے انہی حضرات تک منتہی ہوتے ہیں۔ تو گویا یہ اہل سنت کے سب فرقوں کے پیرومرشد ہیں اور اہل سنت کے نزدیک پیرومرشد کی جو عزت و احترام اور عظمت ہے وہ سب پر واضح اور روشن ہے۔ یہ حضرات تو اپنے مرشد سے بغض و عناد رکھنے یا انکی اہانت کرنے کو سلسلۂ طریقت سے نکل جانیکے مترادف سمجھتے ہیں۔

اب لائق غور اور قابل توجہ یہ بات ہے کہ اہل سنت کا دارومدار شریعت اور طریقت پر ہی تو ہے اور انہی دو باتوں کو وہ سرداری اور بزرگی کا ذریعہ جانتے ہیں شریعت کے ستون اور بڑے یہی چار ائمہ عظام رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اور طریقت کے بڑے صوفیا کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر دو فرقوں۔ اہل شریعت و اہل طریقت کا رجوع اہل بیت ہی کی طرف ہے اور یہ انہی بزرگوں کے خوان فیض کے ریزہ چیں ہیں۔ لہٰذا اہل بیت سے بغض رکھنے کی نسبت اہلسنت کی طرف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک محسوس چیز کا انکار کرنا یا اجتماع ضدین کا دعویٰ کرنا کوئی بھی عقلمند اسکو گوارا نہیں کرتا۔

اور اہلسنت کو نواصب کہنا، نور کو اندھیرا، یا آفتاب کو تاریک کہنے کے مترادف ہے تاریخ کی اس گواہی کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ اہل سنت ہمیشہ نواصب سے برسرمقابلہ رہے ہیں وہ انکی ہفوات اور بکواس کی ہمیشہ تردید کرکے منہ توڑ جواب دیتے رہے ہیں۔ انکے شاعروں نے ان کے مقابلہ میں زبان سے سیف سنان کا کام لیا ہے۔ کثیر عزہ، مشہور شاعر کے دو شعر دیکھئے۔

لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ یَسُبُّ حُسَیْنًا	اَوْ اَخَاہُ مِنْ سُوْقَۃٍ وَاِمَامٍ
وَرَمَی اللّٰہُ مَنْ یَسُبُّ عَلِیًّا	بِصِدَامٍ وَاَوْفَقِیْ وَجُذَامٍ

(حسین کو گالی دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو یا انکے بھائی کو جو انکے ماتحت و امام ہیں گالی دینے والے پر بھی۔ اور علی رضی اللہ عنہم انکو گالی دینے والے کو اللہ تعالیٰ، صدمے، لغزش۔ اور جذام کی مار مارے) حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اہل بیت سے اہل سنت کی محبت کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اسکا تصور کر سکتے ہیں (کیونکہ انکی پیدائش بغض و عناد اور نفاق کے خمیر سے ہوئی، محبت کی نہ انکو ہوا لگی نہ وہ اس سے واقف و آگاہ ہیں اور یہ ان کے خمیر کا ہی قصور ہے کہ وہ اپنے مقتداؤں اور رہنماؤں کو بھی دانستہ یا نادانستہ اپنے بغض و عناد کا نشانہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں) اگر انہیں اہلسنت کی محبت کی شدت کا اندازہ کرنا ہو تو پھر ناصبی مذہب اختیار کر کے سامنے آئیں۔ اور اور دیکھیں کہ اہلسنت ان سے کیا سلوک کرتے ہیں

تعصب (١٤):۔ یہ کہتے ہیں کہ اہلسنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کو فسق نہیں کہتے اور انکے قاتل ابن ملجم سے امام بخاریؒ نے روایت کی اور اسکی تعدیل و توثیق بھی کی ہے۔

انکا یہ جھوٹ انتہا درجہ کا افترا اور بہتان ہے۔ اور انکی بے شرمی اور بے حیائی کا منہ بولتا ثبوت ہے اسلیے کہ کتاب صحیح بخاری کوئی نادر الوجود کتاب تو ہے نہیں۔ شہروں کو چھوڑئیے چھوٹے قصبات میں اسکے نسخے ملیں گے اسکے راوی گنے چنے، اور موثق و مضبوط۔

اہلسنت قتل مومن کو شرک باللہ کے بعد سب سے بڑا گناہ کہتے ہیں۔ انکی کتب عقائد میں بھی یہی لکھا ہے اس نفس مقدس کے قتل کو تو وہ حدیث نبوی کے بموجب کفر جانتے ہیں۔ اہلسنت کی تمام کتابوں میں حدیث اشقی الاخرین کا مورد یہی ملعون بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات تو کوئی سنی محدث اس سے روایت بیان کرے گا خارج از بحث ہے اور پھر بخاری جیسا امام۔

طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَشْقَى النَّاسِ ثَلٰثَةٌ. عَاقِرُ نَاقَةِ ثَمُوْدَ وَابْنُ اٰدَمَ الَّذِیْ قَتَلَ اَخَاهُ. وَقَاتِلُ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ	سارے انسانوں میں بدبخت ترین تین افراد ہیں ثمود کی اونٹنی کی کوچیں کاٹنے والا۔ آدمؑ کا وہ بیٹا جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ اور علی ابن ابی طالبؓ کا قاتل۔

ابن شہر آشوب نے بھی اس افترا کو اپنی مثالب میں امام بخاری پر بہتان باندھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں نے اہلسنت پر افترا پردازی اور بہتان تراشی میں بے حیائی کی تمام حدود پار کر لی ہیں (سچ ہے کہ جب حیا جاتی رہے تو جو چاہے کرو)

تعصب (١٥):۔ انکو اہلسنت سے جو بغض و عناد ہے اور جس کی بنا ان کی نسبت سنت پیغمبر ہے۔ تو یہ شیعہ اس بغض و عناد میں اتنے اندھے ہو گئے ہیں کہ ان کے علماء سنت پیغمبر پر لعنت کر کے اپنا ایمان کفر کے مول پر دے چکے ہیں وہ کہتے ہیں ہمکو کفر قبول ہے مگر سنت پیغمبر کو اچھا کہنا منظور نہیں یہ تو وہی مثال ہوئی غصہ تو سوکن پہ آیا مگر قتل شوہر کو کر دیا اور یہ بات کوئی مفروضہ نہیں صاحب ابن عباد جو سالطین دیالمہ کا وزیر تھا اس فرقہ کے داعیوں میں اسکی نظیر ناپید ہے وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

حُبُّ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ	هُوَ الَّذِیْ یَهْدِیْ اِلَی الْجَنَّةِ

إِنْ كَانَ تَفْضِيلِي لَهُ بِدْعَةً | فَلَعْنَةُ اللهِ عَلَى السُّنَّةِ ۔

(علی بن ابی طالب کی محبت ہی جنت میں لے جاتی ہے میرا ان کو افضل ٹھہرانا اگر بدعت ہے تو پھر سنت پر اللہ کی لعنت ہو۔ (نعوذ باللہ من ذلک الھفوات)

تعصب (۱۶) :۔ اہل سنت کی بعض روایات پر زبان طعن دراز کرتے اور انہیں سخت سست کہتے ہیں مثلاً سہو پیغمبر والی روایت، یا لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز قضا ہو جانے والی روایت، چنانچہ ابن مطہر حلی نے انہی دو روایات کے نقل کرنے پر بہت واہی تباہی بکی ہے۔ مگر ان اندھوں کو یہ نظر نہیں آیا کہ خود انکی کتابوں میں ان روایات کو نہ صرف نقل ہی کیا گیا بلکہ انکی تصحیح بھی بیان کی گئی ہے۔

ان میں سے حدیث ذوالیدینؓ تو یہ ہے۔

أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ أَوِ الْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ ذُو الْيَدَيْنِ أَقُصِرَتِ الصَّلٰوةُ أَمْ نَسِيتَ يَا رَسُولَ اللهِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَنْ خَلْفَهُ أَصَدَقَ ذُو الْيَدَيْنِ قَالُوا نَعَمْ صَلَّيْتَ رَكْعَتَيْنِ فَبَنَى عَلَى صَلٰوتِهِ وَاَتَمَّ اَرْبَعًا وَسَجَدَ لِلسَّهْوِ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ تَشَهَّدَ وَسَلَّمَ

رسول اللہ صلی اللہ نے ظہر، عصر کی نماز ادا فرمائی اور دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ تو جناب ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز میں قصر ہو گیا۔ یا آپ سے سہو ہوا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر مقتدیوں سے دریافت فرمایا کیا ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں سب نے عرض کی بے شک! تب آپ نے اسی نماز پر بنیاد رکھتے ہوئے دو رکعت اور پڑھیں اور سہو کے دو سجدے کیے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیرا۔

اور حدیث لیلۃ التعریس وہ یہ ہے کہ۔

عَرَّسَ فِي مُنْصَرَفِهِ مِنْ خَيْبَرَ فَنَزَلَ قَبْلَ طُلُوعِ الصُّبْحِ فَرَقَدَ فَغَلَبَتْ عَيْنَاهُ فَلَمْ يَسْتَيْقِظْ حَتّٰى وَقَعَ عَلَيْهِ حَرُّ الشَّمْسِ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ وَتَوَضَّأَ وَصَلَّى قَضَاءَ الصُّبْحِ وَقَالَ هٰذَا وَادِي الشَّيْطَانِ ۔

خیبر سے واپسی پر ایک جگہ طلوع فجر سے کچھ دیر پہلے شب باشی کے لیے آپ نے قیام فرمایا نیند کا غلبہ تھا کہ آپ سو گئے اور جب دھوپ کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ کی آنکھ کھل گئی تب آپ نے وضو فرما کر صبح کی نماز قضا پڑھی اور فرمایا یہ شیطان کی وادی ہے۔

ان روایات کی نسبت ابن مطہر حلی کہتا ہے۔ کہ پہلی روایت عبادات میں پیغمبر کے نسیان کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری شیطان کے تسلط کو۔ اور ہر دو نبوت میں سقم پیدا کرتی ہیں۔ لہذا یہ اہلسنت کا افتراء ہے۔ مگر خود اس مفتری کے دیدے پٹم ہو گئے اور اسے یہ نظر نہیں آیا کہ پہلی حدیث ابوجعفر طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بطریق صحیح روایت کی ہے اور اس نے ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور کلینی نے بھی بحوالہ ابی عبداللہ سماعہ سے روایت کی ہے۔ اور دوسری اسناد سے بھی بحوالہ ابی عبداللہ سعید اعرج سے روایت کی ہے اور اسکے آخر میں کہا ہے کہ۔

إِنَّ رَبَّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ هُوَ الَّذِي أَنْسَاهُ رَحْمَةً | امت پر مہربانی کی نظر سے اللہ تعالےٰ نے آپ سے سہو

لِلْأُمَّةِ الَاتَرَی اَنَّ رَجُلًا لَوْ صَنَعَ مِثْلَ هٰذَا لَعُیِّرَ وَقِیْلَ مَا تُقْبَلُ صَلوٰتُكَ فَمَنْ دَخَلَ عَلَیْهِ الْیَوْمَ مِثْلُ هٰذَا قَالَ قَدْسَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَصَارَ وَاُسْوَةً ۔

کرایا۔ تم خیال نہیں کرتے کہ اگر کسی سے ایسی حرکت ہوتی تو اسے ملامت کی جاتی اور کہا جاتا کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ مگر اب آج اگر کسی سے ایسی حرکت سرزد ہو تو کہا جائے گا کہ ایسا تو حضور کو بھی پیش آچکا ہے اور وہ ہمارے لیے نظیر واسوہ ہے۔

اور دوسری روایت کو طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بحوالہ عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کیا ہے۔ کلینی نے کافی میں حمزہ بن طیار سے بحوالہ ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کیا اور آخر میں یہ اضافہ کیا کہ

اَنَا اَنَمْتُكَ وَاَنَا اَیْقَظْتُكَ فَاِذَا قُمْتَ فَصَلِّ لِیَعْلَمُوْا اِذَا اَصَابَهُمْ كَیْفَ یَصْنَعُوْنَ لَیْسَ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذَا نَامَ هَلَكَ ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے ہی تجھے سلایا میں نے ہی تجھے جگایا۔ جب جاگ جاؤ تو نماز پڑھ لو تاکہ امت کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جب ایسا واقعہ پیش آئے تو وہ کیا کریں۔ ایسا نہیں جیسا کہ کہتے ہیں کہ جو سو یا اسکی نماز گئی۔

ان روایات سے جو اعتراض انہوں نے کیا ہے کہ دونوں باتیں نبوت میں خلل انداز ہیں، تو انکی یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس لیے بھول چوک، نسیان ولزوم کی طرح بشری احکام میں سے ہیں، ہاں امور تبلیغی ہوتے تو بات کچھ درست ہو سکتی تھی اس لیے کہ ان امور میں رسولوں سے کوتاہی جائز نہیں۔ مثلاً نہی کے بجائے امر یا اسکے برعکس۔ ایسی بھول چوک کسی پیغمبر سے نہیں ہوئی۔

متفرق انبیاء ورسل علیہم السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ارشادات دیکھیے۔

موسیٰ علیہ السلام۔ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ۔ بھول چوک میں میری گرفت نہ کیجیے

آدم علیہ السلام۔ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ وہ بھول گئے ہم نے انکا ارادہ پختہ نہ پایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ۔ جب کچھ بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو

اور اس وادی میں آپ پر شیطان کا تسلط ہرگز نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اثر حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو جاگنے اور محافظت کا فرض سونپ کر اطمینان سے آرام فرمایا تھا۔ شیطان نے بصورت سید حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر غلبہ پا لیا اور اس بہانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم کی نماز قضا ہو گئی۔ اگر کسی شخص کے گماشتہ یا وکیل پر کوئی ظالم وغاصب تسلط پالے تو اسے ہرگز اس شخص پر تسلط پالینا نہیں کہتے گو نقصان کا اثر اس شخص تک بھی پہنچے۔

تعصب (۱۷):۔ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں اگر کوئی شخص تعالیٰ جدُّ ربنا کہے تو اسکی نماز فاسد ہو جاتی ہے حالانکہ تعالیٰ جَدُّ رَبِّنَا قرآن میں آیا ہے۔ اور اس آیت وسورۃ کا نماز میں پڑھنا انکے نزدیک بھی جائز ہے۔ ممنوع نہیں۔ دوران بحث انکا جواب یہ تھا کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے قول کے طور پر نقل کیے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ کفار کے اقوال نقل کیے ہیں مثلاً وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ

وَقَالَتِ النَّصَارَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ (یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاری نے کہا عیسی مسیح اللہ کے بیٹے ہیں) اور جہاں کہیں کافروں کا قول نقل فرمایا وہاں اسکے عقب میں اسکی تکذیب بھی ساتھ ہی لگادی ہے۔ قرآن کے تفصیلی مطالعہ سے اسکا پتہ چلتا ہے مگر اس جگہ اس قول کی تکذیب بالکل مذکور نہیں اگر اس آیت کے حوالہ سے بھی ان کے تعصب کی آگ نہ بجھے تو جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس قول کے بارے میں یہ کیا کہیں گے جو نہج البلاغہ نے آپ کے ایک خطبہ کے ذیل میں نقل کیے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْفَاشِیْ حَمْدُہٗ وَالْغَالِبُ جُنْدُہٗ اَلْمُتَعَالِیْ جَدُّہٗ (ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جسکی حمد عام جسکے لشکر غالب ہیں۔ جسکی شوکت بالاتر ہے)۔

تعصب (۱۸): ان کا کہنا ہے کہ اہلسنت یہود و نصاری سے بدتر ہیں۔ یہ بات ابن المعلم نے بیان کی ہے اس اچھوتی بات کی واقعی داد نہیں دی جا سکتی کہ خدا، رسول، فرشتوں، قرآن، دیگر کتب الہیہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے رسول و خاندان رسول کے ساتھ انکی جانی و مالی محبت و وابستگی۔ یہ ساری باتیں توانکے نزدیک رائگاں۔ البتہ یہود و نصاری کا کفر پیغمبر کے ساتھ ان کی عداوت اور انکا انکار، فرشتوں خصوصا حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ انکی عداوت یہ سب اس فرقہ کو پسند اور گوارا ہے۔ سچ ہے۔ گندگی کا کیڑا گندگی ہی میں خوش ہے۔
اور پھر اس قول سے تو انہوں نے اپنے پیشواؤں اور مقتداؤں کی پیروی کا حق ادا کر دیا انہوں نے بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کافروں اور بت پرستوں کو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کہا تھا شیعوں کو بھی حق وفاداری کا پاس کرتے ہوئے ان کی اگلی ہوئی گندگی کو نگلنا ہی چاہیئے تھا (قرآن کریم نے ان باطل پرستوں کے لیے ایک آئینہ مہیا کیا ہے۔ انہیں وہ دیکھ لینا چاہیئے تاکہ انہیں اپنی اصلی شکل میں کوئی شبہ نہ رہے)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا۔

تم نے نہیں دیکھا ان کو جو صاحب کتاب تھے کہ وہی اب بتوں اور شیطان پر ایمان لے آئے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ یہ کافر مومنوں کے مقابلہ میں زیادہ راہ راست پر ہیں۔

(شیعہ کو بھی کتاب (قرآن) سے حصہ ملا تھا۔ مگر جب یہ کتاب سے فرنٹ ہو کر جبت وطاغوت (ابن سبا وغیرہ) پر ایمان لے آئے تو انہیں اپنے پیشرو اور مقتداؤں کی اتباع میں لازما انہیں کے قول کو دہرانا اور یہود و نصاری کو مسلمانوں سے اچھا بتانا ہی چاہیئے تھا)۔

تعصب (۱۹): یہ کہتے ہیں، غالی، کیسانی اسماعیلی، اور رافضیوں کے دوسرے فرقے جو ائمہ کی امامت کے منکر ہو کر امامت ہی کے مکذب کہلائے اور ائمہ کی شان میں انہوں نے دریدہ دہنی بھی کی ہے یہ سب کے سب محبت علیؓ کے باعث جنت میں جائیں گے۔ اور اہلسنت ہمیشہ ہمیش دوزخ میں رہیں گے اور ان کی تمام ائمہ کی دوستی بھی کام نہ آئیگی۔ اور شریعت وطریقت میں ان کو اپنا امام تسلیم کرنا فائدہ دے گا اگرچہ انہوں نے ان حضرات میں سے کسی کی تحقیر بھی نہیں کی بلکہ سب کی تعظیم ہی کرتے رہے۔ مگر جائیں گے دوزخ ہی میں۔ اب یہ بات اللہ ہی جانے کہ اہل سنت کی حب علی کیوں بے اثر ہے اور کیسانیوں اور اسماعلیوں

کی ائمہ کی تکذیب کیوں بے اثر نہیں ۔

تعصب (۲۰) :۔ یہ ہے کہ ایسی احادیث جو شیعوں کے نزدیک ان کے اپنے طریقے کے مطابق صحیح الثبوت ہیں ۔ اگر سوء اتفاق سے ان روایات کا مضمون اہل سنت کے مذہب سے موافقت کر جائے تو وہ روایات ان کے نزدیک ناقابل عمل ناقابل قبول بلکہ نظر انداز کر دیئے جانے کے قابل ہیں اس لیے اس صورت میں اہلسنت کی موافقت کا کفر " لازم آتا ہے ۔ مثلاً مذی و منی کے نجس ہونے کی روایات یا ان کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جانے روایت اور سجدہ سہو کی روایات ۔ کہ ابو جعفر طوسی وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے ۔ اور بڑے تالاب میں غسل کی روایات جنکا ذکر ابن المعلم نے کیا ہے ۔ اور ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجا خود ان کے اقرار سے سنت پیغمبر ہے جسکی تصریح صاحب الجامع نے کی ہے ۔

ان کے شیخ الطائفہ نے ایک قاعدہ اور اصول مقرر کیا ہے کہ کلینی کی بعض روایات یا اس کے شیخ محمد بن نعمان کی روایات یا شیخ الشیخ محمد بن بابویہ قمی کی روایات یا خود شیخ الطائفہ نے جن روایات کی تصحیح کی ہے جب ایسی روایات پر عام لوگ عمل کرنے لگیں تو ان کو متروک العمل سمجھ لینا چاہیئے ۔

معلوم نہیں یہ اپنے " برے ہمزاد " اہل سنت سے کہاں کہاں بھاگیں گے ۔ اور ان سے بچنے کیلیے کہاں کہاں ہاتھ پاؤں ماریں گے ۔ اجزائے کلمہ (دینیا و عقیدہ) اور الفاظ قرآن کے اشتراک سے کیسے پیچھا چھڑائیں گے ۔ اور علی ، حسن ، حسین ، فاطمۃ الزہرا (رضی اللہ عنہم) کے نئے نام رکھ کر کب اہل سنت کی موافقت سے جان چھڑائیں گے ۔

ایک دوسرا اصول اور قاعدہ باتفاق انکے ہاں یہ بھی مقرر ہے کہ جب کسی مسئلہ میں دو روایات ہوں تو ان میں سے جو روایت اہل سنت کے موافق ہو ، اسکے الٹ پر عمل کرنا چاہیئے کیونکہ رشد و ہدایت اسی میں ہے ۔

تعصب (۲۱) :۔ ان کی بہت سی کتابوں میں لکھا ہوا ہے ۔ کہ اہلسنت یہود و نصاریٰ سے بہت گئے گزرے ہیں ۔ ان کے بدن سے کوئی چیز چھو جائے تو اسے دھونا چاہیئے انسانوں کو نجس اور گندہ کہنے والوں کا اپنا یہ حال ہے کہ انسانی پاخانہ بھی ان کے ہاں نجس نہیں اس سے بدن لتھڑا ہوا ہو تب بھی انکی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا ۔ ٹھیک ہے یہ اہل سنت کے ہاتھ نہ لگائیں مگر ان کے پاخانہ سے مستفیض ہوتے رہیں کہ وہ تو ان کے نزدیک نجس نہیں ! پاک ہے ۔

تعصب (۲۲) ہر کام مثلاً کھانا پینا پہننا ، سوار ہونا ، اٹھنا ، بیٹھنا وغیرہ بجائے بسم اللہ کے ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) پر لعنت سے شروع کرنا چاہیئے ۔ وہ اسے مبارک اور با برکت خیال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے نام کاغذ پر لکھ کر مع لعن کے ۔ اسے بطور فلیتہ جلائیں اور بخار کے مریض کو اسکی دھونی دیں تو وہ بخار سے شفا پا جائے گا ۔

ایک بات یہ کہتے ہیں کہ جب کسی کھانے پر ستر مرتبہ ان دو اسمائے (مبارکہ) پر لعن کر کے دم کر دیں تو اس کھانے میں بہت برکت ہو جاتی ہے (بات دراصل یہ ہے کہ جو خود لعنتی ہو اسکی لعنت تو بے اثر ہوتی ہے ۔ یہ ان محترم و مقدس بزرگوں کے اسماء مبارکہ کی تاثیر ہے کہ مریض شفایاب ہوتے اور کھانوں میں برکت ہوتی ہے

اور یہ اتنا بڑا افضل واعزاز ہے کہ لعنتی لوگ۔ خود غیر محسوس طور پر اس کے اقرار پر مجبور ہوئے۔ انہیں یقین کرنا چاہیئے کہ جب وہ ان اسماء مبارکہ کے ساتھ لعنت چسپاں کرتے ہیں تو لعنت تو لعنتی کو دیکھ کر اس سے چمٹ جاتی ہے اور اسماء مبارکہ پاک وصاف رہ جاتے ہیں۔ اور اپنا صحیح اثر دکھاتے ہیں۔ ن)

کافی کلینی میں یہ مرقوم ہے کہ خدا کے نزدیک عورتوں میں بدترین نام "حمیرا" ہے۔ اور یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لقب ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی لقب سے مخاطب فرماتے تھے۔ مگر یہ لوگ ابولہب کی بیوی کو برا نہیں جانتے جسکی برائی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی (شاید اسلیے کہ آجکل ابولہب کے مشن کے وارث یہی ہوں)۔

ان کے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکوں کے نام ابوبکر و عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) رکھے تھے۔ اور یہ بھی بالیقین معلوم ہے کہ باپ پر بیٹوں کا یہ حق ہے کہ وہ انکے نیک و اچھے نام رکھے پس جب ابوبکر و عمر، عثمان میں کوئی برائی نہیں تو صدیقہ کا لقب کب برا ہو سکتا ہے۔ اگر معاملہ جناب امیر سے عداوت کا ہے تو جناب صدیقہ ان تینوں حضرات سے بڑھ کر تو مخالف نہیں تھیں۔ اور پھر لقب کا رتبہ اختصاص میں نام سے کمتر ہے کیونکہ تعیین وتشخیص کے لیے وضع اصلی میں علم کا ہی اعتبار ہے لقب تو در اصل صفات سے ہوتا ہے اور غلبۂ استعمال سے اختصاص پیدا کر لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز بالذات مخصوص ہو وہ مخصوص بالعرض سے زیادہ قوت والی ہوتی ہے (یہاں بطور لطیفہ دو باتیں ذہن نشیں ہو جائیں تو کیا مضائقہ اول تو یہ شیعہ چونکہ اپنے لڑکوں کا نام عموماً۔ ابوبکر و عمر و عثمان (رضی اللہ عنہم) نہیں رکھتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نام رکھے تو شیعہ ان کے پیرو نہیں رہے۔ دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک بھی یہ نام اچھے شمار ہوتے ہیں۔ تب ہی اس نے برے لوگوں سے یہ توفیق ہی سلب کر لی کہ وہ ان اچھے اور بابرکت ناموں کا کبھی فیض ہی حاصل نہ کر سکیں۔ اور انہیں کبھی یہ توفیق نہ ہو تو اپنے لڑکوں کے ایسے بابرکت نام رکھ سکیں۔ ن)

تعصب (۲۳) :۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طعن کی طرح جناب حفصہ رضی اللہ عنہا پر طعن کو بھی عبادات بلکہ فرائض پنجوقتہ میں شمار کرتے ہیں بعد ادائیگی پنجگانہ دیگر ورد و وظائف کے مقابلہ میں اسکے ورد کو بہترین وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کوئی ایسا امر صادر نہیں ہوا جو انکی بدگوئی کا سبب اور اسکا یہ خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ کوئی گناہ نہیں رکھتیں بجز اسکے کہ وہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ حالانکہ ولا تزر وازرۃ وزر اخری۔ اسکے صریح خلاف ہے اگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہی سبب موجب طعن ہے تو تعجب ہے جناب محمد بن ابی بکر کو اسی طرح کی نسبت رکھتے ہوئے ان لوگوں نے کیوں معاف کیے رکھا۔ اور ان پر لعن وطعن کیوں نہیں کرتے اگر یہ کہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت وصحبت ان کے حق میں مانع لعن ہے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت اور تعلق زوجیت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کیوں مانع طعن نہیں ہوا۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق قرب وصحبت کے سبب ہی معزز و محترم تھے۔ اس لیے اس سلسلہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق زیادہ قابل لحاظ ہونا چاہیئے تھا۔

تعصب (۲۴) :۔ اس فرقہ کے ایک نابکار شیخ مقداد نامی نے الزام لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ سے فعل شنیع کیا تھا۔

حالانکہ شریف مرتضیٰ نے "تنزیہ الانبیاء والائمہ" نامی کتاب میں۔ اور دوسرے علماء امامیہ نے قطعی طور سے حکم لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفا رضوان اللہ علیہم ظاہری شریعت کی پاسداری اور زہد دین و تقویٰ کے امور کو شائع کرنے اور رواج دینے کا بہت اہتمام کرتے اور خاص خیال رکھتے تھے تاکہ اسمیں کوتاہی کے سبب منصب امامت کی لیاقت مجروح نہ ہو اور لوگوں کی نظروں سے نہ گر جائیں خصوصاً عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس معاملہ میں بڑی کد و کاوش رہتی اور بہت احتیاط و پرہیز مدنظر رہتا۔

تعصب (۲۵) :۔ یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بلکہ تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے طلاق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا کہ جب چاہیں طلاق دیدیں حالانکہ اللہ تعالے نے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم رسول مقبول کو بھی ازواج مطہرات کے طلاق کا مختار نہ بنایا تھا۔ آپ اس معاملہ کو دوسرے کے سپرد کیسے فرما سکتے تھے ارشاد باری ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ۔

آپ کیلئے ان عورتوں کے بعد نہ تو کوئی اور حلال ہے۔ اور نہ انکا تبادلہ دوسری زوجات سے کو آپ کو ان کا حسن بھلا کیوں نہ لگتا ہو۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو پابند فرما دیا گیا کہ نہ مزید کوئی نکاح فرمائیں گے اور نہ ہی موجودہ ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کے بدلے دوسری بیوی لائیں گے۔

ازواج مطہرات کو یہ فضیلت و عزت اس لیے نصیب ہوئی کہ انہوں نے اپنے حق اختیار کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کو خیر باد کہہ کر آخرت کو قبول کر لیا تھا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت و رفاقت کو دنیاوی عیش، ساز و سامان اور کامرانی کے مقابلہ میں پسند کیا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی یہ چاہا کہ ان کو دنیا و آخرت میں پیغمبر کی رفاقت سے جدا نہ کرے اور یہ پیغمبر طلاق کی تلخی سے انہیں نا آشنا رکھے۔ چنانچہ آیت تخییر کے ذیل میں خود شیعی تفاسیر میں ان کی ثابت قدمی مذکور و مسطور ہے۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ اس ایثار و اختیار میں تمام ازواج مطہرات سے حضرت صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کو سبقت نصیب تھی۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دیتے یا کسی کو اسکا اختیار دیتے۔

اور اگر آپ ایسا اختیار کسی کو سپرد فرماتے بھی تو شیعوں کو اس سے کیا فائدہ۔ کیونکہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حیات تو وہ طلاق عمل میں آئی نہیں۔ اور وصال کے بعد وہ توکیل و تفویض کالعدم ہو گئی۔ اس لیے کہ سارے فرقوں کے اجماع کے مطابق موکل کی وفات کے بعد وکالت باطل ہو جاتی ہے اور جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے برسر پرخاش تھیں اس وقت آپ طلاق کے مالک نہ تھے۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وفات کے بعد طلاق دینے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اس فرقہ کی بنیاد اور شرط وجود ہی۔ کذب و افترا، توہمات و تعصبات پر ہے اس لیے نہ ان کے تعصبات

کی کوئی حد ہے اور نہ وہ کبھی رک سکتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں مناسب احوال ان میں تبدیلی و اضافہ ہوتا ہی رہے گا۔ ہم کہاں تک ان کا تعاقب کر کے کھوج لگائیں گے۔ اس لیے جو کچھ ذکر کیا جا چکا اسی پر اکتفا کرتے ہیں ہم نے تینوں فصلوں میں بطور نمونہ ہی پیش کیا ہے۔ پورے تعصبات کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے۔

تیسری فصل

شیعی ہفوات

ھفوہ (۱): یہ کہتے ہیں کہ انبیاء و ائمہ کا کام دین و مذہب کا چھپانا ہے۔ انہوں نے پوری زندگی تقیہ میں بسر کی ہے۔ کسی کو بھی مذہب و دین واضح طور پر نہیں بتایا۔

یہ ہفوہ چھوڑتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ ایسا ہے تو پھر انبیاء کی بعثت اور ائمہ کے تقرر سے حاصل کیا ہوا یعنی کچھ بھی نہیں۔ دنیا ان کی آمد سے پہلے بھی اندھیرے میں تھی آمد کے بعد بھی اندھیرے میں رہی۔

دراصل اس باطل خیال کی بنیاد اس تخیل پر ہے کہ ہر صاحب عزم، یا ہر طالع آزما جو ایک سلطنت کا علم بلند اور دوسری کا سرنگوں کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ارادوں کو راز رکھتا، اور اپنی تدبیروں کا کسی کو پتہ نہیں لگنے دیتا اور کج فطرت لوگ ایسے ہی لوگوں پر انبیاء و ائمہ کو قیاس کر کے مذکورہ غلط و باطل تصور و عقیدہ گھڑنے کے مرتکب ہوئے ذرا سا بھی غور کر لیں تو پتہ چل جائے گا کہ نبی کو مبعوث اور امام کو مقرر کر کے ان کو اخفاء راز کا مکلف بنانا ایسا ہی ہے کہ کسی کو قاضی شہر مقرر کر کے پابند کر دیا جائے کہ نہ کسی سے بات کرے، نہ کسی کی فریاد سنے، نہ کوئی فیصلہ دے تو ایسے تقرر کو ایک نادان بچہ بھی کھیل سمجھے گا اور مذاق اڑائے گا اور بظاہر یہ فعل بے قوفی سمجھا جا سکتا اور ایسا کرنا بعثت نبی اور تقرر امام کے سراسر خلاف ہے۔ اگر انبیاء اور ائمہ حکم خدا کے بجائے اپنی مرضی سے یہ تقیہ کرتے ہیں تو وہ عاصی اور گنہ گار اور تارک واجب قرار پائیں گے اور پھر عصمت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جھوٹ بولنا، نفاق اختیار کرنا، انبیاء و ائمہ کی شان کے خلاف ہے اور ان بزرگ و محترم و مقدس ہستیوں کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ان بری خصلتوں کو اپنا شعار بنائے رکھیں۔ اور لوگوں کو ہدایت و رہنمائی کے بجائے دھوکہ دیں اور گمراہ کریں اگر منکرین و مخالفین اور معاندین کی طرف سے ان کو کوئی اندیشہ یا خطرہ بھی ہوتا ہے تو بھی کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہتے انہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان میں اللہ تعالے ارشاد فرماتے ہیں۔

يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا۔	اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے انکی نگرانی کو اللہ ہی کافی ہے۔

اگر ان ہفواتیوں کے کہنے کے مطابق انبیاء تقیہ کیے ہوئے ہوتے تو کفار کی طرف سے اذیت کیوں برداشت

کرتے، مارپیٹ، گالم گلوچ، بے عزتی، بے حرمتی، جلاوطنی ان کے ہاتھوں کیوں بھگتتے۔ جبکہ عام مسلمانوں کے لیے فرمایا گیا، "کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں بغیر اپنے سے پہلوں کی طرح تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت کئے بغیر جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ وہ تکالیف اتنی سخت تھیں کہ نبی اور انکے ساتھی یہ کہنے لگے تھے کہ اللہ کی نصرت و مدد آخر کب آئے گی"۔ تو انبیاء وائمہ کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہیئے۔

اور اس ہفوہ کی تان اس پر توڑی ہے کہ آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ میں "اَتْقَاکُمْ" سے مراد وہ ہے جو تقیہ میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ ان کے مفسرین نے ان الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے (گویا انہوں نے دوسروں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے ہاں کے اَتقا کو منافق اعظم کہہ جلنے کا برا نہیں مانیں گے۔ کیونکہ شیعوں سے قطع نظر پوری دنیا کے نزدیک تقیہ و نفاق ہم معنی ہیں۔ ن) اور اس تفسیر کے موجب لازم آتا ہے کہ حضرت یحییٰ و حضرت زکریا علیہما السلام اور جناب حسین رضی اللہ عنہ جنہوں نے بالاجماع تقیہ نہیں کیا خدا کے نزدیک کرامت و بزرگی نہ رکھتے ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جتنے بھی منافق تھے وہ بزرگی و کرامت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ۔ (ناظرین یہ یاد کرلیں کہ خدا کے ہاں جناب حسین رضی اللہ عنہ جو کرامت و بزرگی بھی رکھتے ہوں مگر شیعوں کے نزدیک تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے کوئی عزت و حرمت نہ رہ گئی تھی۔ اور کوفہ کے شیعوں نے اس کا عملی ثبوت دیا۔ خطوط کی ترسیل سے لیکر کارگاہ شہادت کی تاریخ کا مطالعہ کر جائیے کہ ہر جگہ شیعہ آپ کو گھیر گھار کر، کشاں کشاں، او دھکیلتے ہوئے مقتل تک لے جاتے نظر آئیں گے جہاں پہنچا کر وہ خود منہ پھیر کر دشمنوں سے سازش کے دام کھرے کرنے پہنچ گئے۔ آج یہ جتنے چاہیں مرثیے جوڑ لیں۔ روز قیامت بہت قریب ہے انشاء اللہ خون حسین کے ایک ایک قطرہ کا ان کو حساب دینا ہی ہوگا۔ کیونکہ قاتلان حسین میں سرفہرست یہی ہیں۔ ن)

اور تقیہ کے وجوب اور اسکی خوبیوں کے سلسلہ میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ سب جھوٹ من گھڑت اور افترا۔ جناب صادق اس قسم کی ہفوات کو جائز ہی نہیں سمجھیں گے چہ جائیکہ وہ اسے واجب قرار دیں۔ اور اپنے جد امجد جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی مخالفت فرمائیں گے۔ نہج البلاغہ ان کی اصح الکتب ہے اور متواتر بھی۔ اس میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی نص صریح بایں الفاظ موجود ہے۔ عَلَامَۃُ الْاِیْمَانِ اِیْثَارُکَ الصِّدْقَ حَیْثُ یَضُرُّکَ عَلَی الْکِذْبِ۔ (جب جھوٹ کے مقابلہ پر سچ بولنا نقصان کا سبب ہو، اس وقت سچ بولنا ایمان کی علامت ہے) یہ نص بتاتی ہے کہ تقیہ کرنے والا ایمان ہی نہیں رکھتا۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا الخ | وہ اپنے صبر کی وجہ سے دوہرا اجر دئے جائیں گے۔ کی تفسیر بھی یہ تقیہ ہی سے کرتے ہیں کہتے ہیں حسنہ تقیہ ہے اور اسکا اظہار سیئہ ہے حالانکہ اس سے پہلے کی آیت صاف طور پر اظہار پر دلالت کرتی ہے وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا۔ آخر تک۔

پھر تقیہ میں صبر کی ضرورت بھی تو نہیں۔ یہ تو بلا مشقت حسب دلخواہ مال اڑانا اور عیش کرنا ہے۔ کیونکہ تقیہ میں تو ہمہ دم بہر حال سراسر موافقت و اتحاد اور تسلیم و رضا ہے، نہ مخالفت نہ عناد پھر بھی صبر کی گھاٹی کہاں

اور کیسے پیش آسکتی ہے۔
کذب افترا انکی گھٹی کا جزنہ ہوتا تو شاید ان کو توفیق مل جاتی کہ اپنے ہی فرقہ کی کتابوں میں مندرج تقیہ کو باطل کرنے والی منہ بولتی روایات ہی کا مطالعہ کر لیتے جو کسی اور سے نہیں اہل بیت کرام رحمہم اللہ سے مروی ہیں ان میں ایک وہ روایت ہے جو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور رضی نے نہج البلاغہ میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے۔
امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم اگر میں ان کے مقابلہ میں تن تنہا آؤں اور وہ اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ زمین ان سے پٹی پڑی ہو تو بھی ان کی پرواہ نہ کروں نہ ان سے دہشت کھاؤں۔ میں ان کی گمراہی سے بھی باخبر ہوں اور اپنی ہدایت سے بھی۔ مجھے اپنی طرف سے نیز اپنے رب کی طرف سے ہدایت کا یقین ہے۔ میں اللہ تعالےٰ سے اچھے اجر اور ملاقات کا امیدوار ہوں اور منتظر بھی۔
پس جو شخص تن تنہا ہوتے ہوئے دشمن کے اتنے بڑے لشکر سے جس نے زمین کا چپہ چپہ بھر رکھا ہو نہ ڈرے نہ ان سے دہشت زدہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا منتظر، اور امیدوار عنایات وکرامات ہو۔ ایسے شخص کی زندگی و موت کے معاملات میں تقیہ کی گنجائش اور اسکا امکان کہاں پایا جاسکتا ہے۔ پھر تقیہ بغیر خوف کے نہیں ہوتا۔ اور خوف دو طرح کا ہوتا ہے۔ اول جان کا خوف اور ائمہ کرام کو یہ خوف بالکل نہیں ہوتا۔ اسکی دو وجوہ ہیں پہلی تو یہ کہ ان کی موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔ کلینی نے کافی میں یہ مسئلہ ثابت کیا ہے اور سارے ہی امامیہ کا اس پر اجماع ہے دوسری وجہ یہ کہ ائمہ کو ماکان ومایکون کا علم ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی موت۔ اس کی کیفیت و وقت سے باخبر ہوتے ہیں اور اسکا تفصیلی علم رکھتے ہیں۔ لہذا وقت سے پہلے جان کا خوف ان کو کیوں ہونے لگا۔ دوسرا خوف، بدنی یا روحانی ایذا کی مشقت کا ہوتا ہے۔ اور ان تکالیف کو برداشت کرنا اور گوارا کرنا ہمیشہ نیکوکاروں کا وطیرہ اور طرۂ امتیاز رہا ہے انہوں نے اوامر الٰہی کے امتثال میں تکلیفوں کو گوارا کیا ہے۔ جابر اور قاہر بادشاہان وقت اور فراعین زمانہ سے مقابلہ کیا ہے اگر اس معاملہ میں بزدلی دکھائیں، اور عبادت و مجاہدہ میں مشقت کا تحمل گوارا نہ کریں تو وہ نیکوں ہی کے شمار میں نہیں آسکتے چہ جائیکہ وہ نیکوں کے امام شمار ہوں لہذا ان کیلیے کسی طرح بھی تقیہ ثابت و جائز نہ ہوا۔
پھر اگر بقول شیعہ تقیہ جائز یا واجب ہوتا۔ تو شیعوں کے گمان کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں چھ ماہ کا توقف کیوں کرتے اتنے عرصہ بیعت سے رکے رہنا تو صراحتاً ملال و ناخوشی کا اظہار ہے (جو تقیہ کی نفی ہے) سب کے ساتھ بیعت ہی کر لیتے۔

تیسری روایت جو تقیہ کو باطل ٹھیراتی ہے۔ عباسی نے زرارہ بن اعین سے اس نے ابی بکر بن حزم سے روایت کی ہے۔

قَالَ تَوَضَّأَ رَجُلٌ وَمَسَحَ عَلَى خُفَّيْهِ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ وَصَلَّى فَجَاءَ عَلِيٌّ فَوَجَأَ رَقَبَتَهُ فَقَالَ وَيْلَكَ تُصَلِّيْ عَلَى غَيْرِ وُضُوْءٍ فَقَالَ اَمَرَنِيْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَاَخَذَ بِيَدِهٖ فَانْتَهٰى بِهٖ اِلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اُنْظُرْ مَا يَقُوْلُ هٰذَا عَنْكَ وَرَفَعَ صَوْتَهٗ عَلٰى عُمَرَ فَقَالَ اَنَا اَمَرْتُهٗ بِذٰلِكَ۔

کہا کہ ایک شخص نے وضو کیا موزوں پر مسح کیا اور مسجد میں آکر نماز ادا کی اتنے میں جناب علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو اسکی گدی دبوچ کر فرمایا ارے تیرا ناس ہو بغیر وضو کے نماز پڑھتا ہے۔ اس نے کہا مجھے تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا آپ نے اسکا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لاکر کہا دیکھیے یہ آپ کے بارے

میں کیا کہتا ہے۔ اور انداز تخاطب گرجنے برسنے جیسا تھا
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں میں نے اسے یہی کہا تھا

اب یہاں تقیہ کہاں رہا۔ جب غلط کار کو گدی سے دبوچ لیا اور خلیفۂ وقت پر گرج برس لیے تو تقیہ رخصت ہو گیا۔
چوتھی روایت شیعوں کے مقتدا اور نہج البلاغہ کے شارح راوندی کی ہے۔ جیسے اس نے اپنی کتاب خرائج الجرائح میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

أَنَّ عَلِيًّا بَلَغَهُ عَنْ عُمَرَ أَنَّهُ ذَكَرَ شِيعَتَهُ
فَاسْتَقْبَلَهُ فِي بَعْضِ طُرُقَاتِ بَسَاتِينِ الْمَدِينَةِ
وَفِي يَدِ عَلِيٍّ قَوْسٌ فَقَالَ يَا عُمَرُ بَلَغَنِي عَنْكَ
ذِكْرُكَ لِشِيعَتِي فَقَالَ ارْبَعْ عَلَى صَلْعَتِكَ فَقَالَ
عَلِيٌّ إِنَّكَ لَهَهُنَا ثُمَّ رَمَى بِالْقَوْسِ عَلَى الْأَرْضِ
فَإِذَا هُوَ ثُعْبَانٌ كَالْبَعِيرِ فَاغِرًا فَاهُ وَقَدْ أَقْبَلَ نَحْوَ
عُمَرَ لِيَبْتَلِعَهُ فَقَالَ عُمَرُ اللهَ اللهَ يَا أَبَا الْحَسَنِ لَا عُدْتُ
بَعْدَهَا فِي شَيْءٍ وَجَعَلَ يَتَضَرَّعُ إِلَيْهِ فَضَرَبَ بِيَدِهِ
إِلَى الثُّعْبَانِ فَعَادَتِ الْقَوْسُ كَمَا كَانَتْ فَمَضَى إِلَى
بَيْتِهِ فَقَالَ سَلْمَانُ فَلَمَّا كَانَ فِي اللَّيْلِ دَعَانِي
عَلِيٌّ فَقَالَ سِرْ إِلَى عُمَرَ فَإِنَّهُ حُمِلَ إِلَيْهِ
مِنْ نَاحِيَةِ الْمَشْرِقِ مَالٌ وَقَدْ عَزَمَ أَنْ يَحْبِسَهُ
فَقُلْ لَهُ يَقُولُ لَكَ عَلِيٌّ أَخْرِجْ مَا حُمِلَ إِلَيْكَ مِنَ
الْمَشْرِقِ فَفَرِّقْهُ عَلَى مَنْ هُوَ لَهُمْ وَلَا تَحْبِسْهُ
فَأَفْضَحَكَ قَالَ سَلْمَانُ فَمَضَيْتُ إِلَيْهِ وَأَدَّيْتُ
الرِّسَالَةَ فَقَالَ أَخْبِرْنِي عَنْ أَمْرِ صَاحِبِكَ مِنْ أَيْنَ
عَلِمَ بِهِ فَقُلْتُ فَهَلْ يَخْفَى عَلَيْهِ مِثْلُ هَذَا
فَقَالَ يَا سَلْمَانُ اقْبَلْ مِنِّي مَا أَقُولُ لَكَ مَا
عَلِيٌّ إِلَّا سَاحِرٌ وَإِنِّي لَمُسْتَيْقِنٌ بِكَ وَالصَّوَابُ أَنْ
تُفَارِقَهُ وَتَصِيرَ مِنْ جُمْلَتِنَا قُلْتُ لَيْسَ كَمَا
قُلْتَ وَلَكِنَّهُ وَرِثَ مِنْ أَسْرَارِ النُّبُوَّةِ مَا قَدْ رَأَيْتَ
مِنْهُ وَعِنْدَهُ أَكْثَرُ مِنْ هَذَا فَقَالَ ارْجِعْ إِلَيْهِ
فَقُلْ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ لِأَمْرِكَ فَرَجَعْتُ إِلَى عَلِيٍّ فَقَالَ
أُحَدِّثُكَ عَمَّا جَرَى بَيْنَكُمَا فَقُلْتُ أَنْتَ

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو خبر ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ
عنہ ان کے شیعوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں مدینہ کے
باغات کے راستہ میں آپ دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا
اس وقت حضرت علیؓ کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے
کہا اے عمر (رضی اللہ عنہ) مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم میرے
شیعوں کے متعلق کچھ کہتے رہتے ہو جواب میں حضرت
عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے علی (رضی اللہ عنہ) اپنے منڈ
کے سر پر رحم کھاؤ۔ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا
تم اس درجہ تک پہنچ چکے ہو۔ اور اپنی کمان زمین پر ڈال
دی جو فوراً اژدھا بن کر منہ کھولے ہوئے عمر کو نگلنے کیلیے
ان کی طرف لپکی۔ اس پر عمر چلائے خدا کے لیے اے ابوالحسن
اب میں تمہارے کسی معاملہ میں دخل نہ دوں گا اور ان کے
آگے گڑگڑانے لگے۔ پس علیؓ نے اژدھے پر ہاتھ ڈالا تو
وہ کمان بن گئی۔ اس کے بعد جناب عمر رضی اللہ عنہ اپنے
گھر لوٹ آئے سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رات ہوئی تو
حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا عمر رضی اللہ
عنہ کے پاس جاؤ مشرق سے ان کے پاس مال آیا ہے
جسے وہ ہضم کرنا چاہتے ہیں لہذا ان سے کہو کہ علیؓ
کہتے ہیں جو مال مشرق سے آیا ہے نکالو اور حقداروں
میں اسے بانٹ دو اسے دبانے کا خیال نہ کرو ورنہ میں تمہیں
ذلیل کروں گا۔ سلمانؓ کہتے ہیں میں ان کے پاس گیا اور
جاکر یہ پیغام پہنچایا۔ وہ کہنے لگے تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دوست
کو اس مال کی خبر کیسے لگی۔ میں نے کہا ان سے ایسی بات
کہاں چھپ سکتی ہے تو کہنے لگے سلمان! میری بات مان لو

اَعْلَمُ مِنِّیْ فَتَکَلَّمَ بِکُلِّ مَا جَرٰی بَیْنَنَا فَقَالَ اِنَّ رُعْبَ ثُعْبَانٍ فِیْ قَلْبِہٖ اِلٰی اَنْ یَّمُوْتَ ....

علی تو ایک جادوگر ہیں میرا تمہارے بارے میں یقین ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ تم ان سے جدا ہو کر ہم میں آملو، میں نے کہا جیسا آپ خیال کرتے ہیں معاملہ ایسا نہیں ہے ان کے بارے میں آپ نے جو ملاحظہ کیا وہ وہ اسرار نبویہ ہیں جو انہیں ورثہ میں ملے ہیں۔ اور ان کے پاس تو اس سے بھی زائد ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا اچھا ان کی طرف واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں نے آپ کا حکم سنا اور مانا۔ لہذا میں جناب علی رضی اللہ کے پاس واپس آیا تو آپ نے پوچھا کہو جو باتیں عمر (رضی اللہ عنہا) سے ہوئیں سناؤں۔ میں نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں پھر آپ نے وہ تمام باتیں دھرا دیں جو ہمارے درمیان ہوئی تھیں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ اژدھے کا خوف مرتے دم تک ان کے دل میں رہے گا۔۔

اس روایت میں تقیہ کی گردن ماری گئی ہے۔ اور خوب دل کھول کر اس کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ لہذا اس سے معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کے عہد میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے جن امور پر سکوت عمل میں آیا مثلاً قصۂ فدک، اور جناب ام کلثوم رحمہا اللہ کا عقد نکاح وغیرہ وہ محض اس بنا پر تھا کہ آپ کے نزدیک وہ درست تھے۔ اور آپ انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ورنہ انکار و تنقید کی پوری طاقت رکھتے تھے۔ اگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے شرع کی منع کردہ باتوں پر سکوت فرماتے اور سستی برتتے تو فاسق نہ ہو جاتے۔ بلکہ دختر سیدۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں اگر اس تمام اقتدار کے باوجود سستی یا رواداری سے کام لیتے تو کونسی ایسی برائی تھی جو لازم نہ آتی۔ اور کچھ نہ سہی اسکی وجہ سے منصب امامت کی لیاقت سے تو میلوں دور جا پڑتے۔

چنانچہ ایک دو مرتبہ کوئی ممنوع و ناگوار چیز سامنے آئی، یا علم غیب سے معلوم کیا تو اتنے شدید غصہ سے کام لیا۔ ظالموں کے سخت ترین انسان عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے جنکو کسی کا لحاظ نہ تھا اس قدر خائف ہو گئے۔ لہذا معلوم ہوا کہ متعہ کی حرمت، سنت تراویح کا اجراء و رواج یا تاخمس و غنائم کی تقسیم، عمال کا تقرر، اور دوسرے مہمات خلافت ان سب کو آپ پسند فرماتے تھے، ورنہ تو چشم ابرو کے ایک اشارے سے سارا کارخانۂ خلافت درہم برہم کر سکتے تھے۔ کسی لاؤ لشکر۔ اعوان و انصار کی بھی مطلق ضرورت و حاجت نہ تھی وہ ایک بے تیر کی ایک کمان ہی کافی تھی۔

عہد فاروقی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے سکوت۔ اور دین و خلافت کے ظاہری امور میں موافقت کی جو وجوہ کتب امامیہ میں لکھی گئی ہیں کہ آپ بے بس، لاچار، ذلیل و بے مقدرت تھے۔ مقابلہ کی طاقت نہیں

رکھتے تھے۔ ایسی وجوہ ہیں کہ اول تو آپ کے یہ باتیں شایان شان نہیں۔ دوسرے امامیوں کی یہ واہی تباہی بکواس کے سوا کچھ نہیں۔ جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد شیخین میں بڑے معزز اور بڑے لائق احترام رہے۔ دونوں حضرات کے مشیر و خیر خواہ رہے۔ اور ملت حنیفیہ پر قائم رہے۔ ان کے دوستوں، ساتھیوں اور خلفاء نے ان کو کبھی بے مقدرت، بے بس، لاچار، اور بے وقر نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ان کے شایان شان برتاؤ کیا۔ یہ تو شیعہ ہی ہیں جنہوں روز اول سے آپ کو اپناء آلۂ کار، سمجھا۔ اور ان کی حقیقی محبت و عزت نہیں کی۔ ان سے تقیہ جیسی ذلیل حرکت منسوب کر کے ان کا سارا وقار، دبدبہ اور عزت خاک میں ملا دی۔

ان سے تقیہ منسوب و ثابت کرنے سے دراصل اہل بیت کیلیے ایسی باتیں لازم آتی ہیں جو انکی غیرت عزت آبرو سب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ مثلاً اپنی بیٹی کافر کے نکاح میں دینا یا اپنی تمام بہنوں بیٹیوں کو کفار کے حوالہ کرنا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان حضرات کو وہ مقدرت و قوت حاصل تھی کہ اسکا دفاع کر سکتے۔ اور ایک معجزہ دکھا کر ایسے حضرات کو چشم زدن میں ذلیل کر سکتے تھے۔

اہلسنت اور کتب شیعہ میں باتفاق تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ جناب امیر و اہل بیت رضی اللہ عنہم نے خلفاء ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے فروع فقہیہ کے بہت سے مسائل میں اختلاف کیے ان سے بحث و مناظرہ کیا۔ لیکن اس مخالفت یا مناظرہ کی بنا پر کسی ایک نے بھی صراحتاً تو کیا اشارہ و کنایہ میں بھی انکو مطعون نہیں کیا ایذا دہی تو بہت دور کی بات تھی۔ اس سے بھی تقیہ باطل ہوا۔ کیونکہ بعض مسائل میں واقعہ کا اظہار ہونے کے باوجود کوئی ضرر نہیں پہنچا۔ گویا ثابت ہو گیا کہ اظہار کی قوت موجود تھی اور نقصان کا خوف معدوم۔

اور اگر تقیہ مانا جائے تو وہ یا خدا کے حکم سے ہوگا۔ یا بغیر حکم خدا ہوگا پہلی شق میں ثابت ہوتا ہے کہ معاذ اللہ خدا تعالٰی حکیم نہیں۔ کیونکہ ایک کام کا حکم دینا اور پھر اسکے خلاف کا امر صادر کرنا۔ تو حکمت و دانائی کی جگہ سفاہت و حماقت لگتا ہے اور اگر شق ثانی ہو۔ یعنی محض لوگوں کی ایذا رسانی کے ڈر سے تقیہ ہو تو ائمہ و اہل بیت جیسے داعیان حق پر بزدلی سستی اور بے صبری تھوپنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایسے شخص میں امامت کی لیاقت نہیں۔

سارا قرآن جہاد کی مشقتوں پر تحمل اور مصائب پر صبر کی تلقین سے بھرا ہوا ہے۔ صابرین کی مدح سرائی بھی جا بجا ملتی ہے۔ اور ان امور سے بھاگنا یا جان چرانا صالحین اور صابرین کا طریقہ بھی نہیں رہا۔

ایک اور بات کہ اگر تقیہ واجب ہی ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ نہ فرماتے۔

؏ اگر مجھے اس عہد کا پاس نہ ہوتا جو مجھ سے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا تب تم دیکھتے کہ مددگاروں کی تعداد کے لحاظ سے کمزور کون ہے۔ اسکا حوالہ کتب امامیہ کے حوالے سے پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ عام امامیوں کا یہ خیال ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ پر اپنی خلافت سے قبل تقیہ واجب تھا۔ اور خلافت کے بعد حرام ہو گیا۔ لہذا آپ سے جو روایات خلافت و ولایت کے بعد منقول ہیں ان میں تقیہ ہرگز نہیں ماننا چاہیئے ورنہ لازم آئے گا کہ ایک معصوم حرام کا مرتکب ہوا۔ لیکن ان میں سے سید مرتضٰی امامی اس بات کا قائل ہے کہ آپ پر خلافت اور ولایت کے بعد بھی تقیہ واجب تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسکا یہ قول غلط اور باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر بعد خلافت بھی تقیہ واجب ہوتا تو آپ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول

نہ فرماتے۔ اس لیے کہ آپ ان کے نزدیک ہی تھے جسکا اظہار بھی ان الفاظ میں فرمایا تھا۔
اِنِّی اَخَافُ کَیْدَهٗ وَاِنَّ کَیْدَهٗ لَعَظِیْمٌ۔ میں انکی تدبیر سے خائف رہتا ہوں انکی چال بڑی گہری ہوتی ہے۔

جناب ابن عباس اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی مشورہ دیا ولہ شہراً واعزلہ دہراً (ایک ماہ کیلیے ان کو حاکم بناؤ، اور پھر ہمیشہ کیلیے معزول کردو) مگر آپ نے اسکا جواب دیا۔ وَمَا کُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا (میں فساد پیشہ سے مدد وقوت لینے والا نہیں ہوں) چنانچہ یہی معزولی فساد عظیم کا باعث بنی، زمین سے فتنے ابل پڑے اور نوبت قتل وقتال تک پہنچکر رہی۔

سید مرتضی کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت وخلافت تو ایک دکھاوا تھی یوں ہی برائے نام۔ حقیقت سے خالی۔ کیونکہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے پرخاش رکھتے تھے جو آپ کی وفات تک جاری رہی اور آپ کے متبعین اور فوج میں ایسے لوگ تھے جو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد تھے۔ اور درپردہ وہ آپ کے دشمن تھے۔ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے انصاف اور فضائل کے معتقد اور ان کے معاونین اور حامیوں کے مداح۔ ایسی صورت میں اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ خاطر خواہ انداز پر اپنے عقیدہ کا اظہار فرماتے یا اس پر عمل پیرا ہوتے تو گمان غالب تھا کہ یہ متبعین ساتھ چھوڑ جاتے۔ اور امر خلافت اور کٹھن ہو جاتا۔ اس وجہ سے ولایت کی حالت میں آپ پر تقیہ واجب تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شیعیت کے دعوی کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت کو بھی نمائشی اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔

اہلسنت کے نزدیک یہ ولایت سراسر بامعنی تھی اور ولایت کی حقیقت اس پر منحصر تھی درحقیقت ولایت کے معنی ملک میں تصرف کرنے، احکام جاری کرنے، رعایا سے محصولات وخراج لینے اور مفسدوں کی تنبیہ وتادیب پر قدرت رکھنے کے ہیں۔ اور اس وقت کے اکثر اسلامی شہروں پر جناب امیر رضی اللہ عنہ ایسے تصرف وولایت کی قدرت بدرجہ کمال رکھتے تھے۔ خصوصاً حجاز، حرمین، یمن، عمان، بحرین، آذربائجان، عراقین، فارس، وخراسان میں بغیر کسی جھگڑے، مقابلہ یا رکاوٹ کے احکام جاری ونافذ تھے۔ اور وہاں کے باشندے دل وجان سے آپ کے مطیع وفرماں بردار تھے۔ اگر مخالف تھا تو شام کا علاقہ تھا۔ اگر ملک کے کسی ایک حصہ میں گڑبڑ ہو جائے تو یہ معنی ولایت کے منافی نہیں اس سے خلافت وامامت نمائشی وبرائے نام نہیں کہلا سکتی ذرا صدر اول۔ عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تو نظر ڈالیے۔ کہ آپ خلیفہ مقرر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف سوائے جزیرۃ العرب کے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اور اس میں بھی سب دشمن اور مفسد بڑے زور آور تھے مثلاً مسیلمہ کذاب، بنو حنیفہ، بنی تمیم کی مدعیہ نبوت سجاح، اور بنو تمیم وہ قبیلہ تھا کہ سارے عرب میں انکے لڑاکا مشہور تھے۔ اس کے مرد مردان کارزار سمجھے جاتے تھے۔

دوسری طرف مانعین زکوۃ کی شورش تھی تو شام میں بنو غسان، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے برسرپرخاش تھا۔ اور پھر اردگرد کے تمام عرب قبائل فتنہ ارتداد میں گرفتار۔ غرض کیفیت یہ تھی کہ سوائے اہالیان مکہ ومدینہ کے آپ کا کوئی حامی وناصر نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود آپکی استقامت وثبات کا یہ عالم تھا

کہ آپ نے کسی شرعی معاملہ میں معمولی سی مداہنت اور کمزوری یا رواداری کو بار پانے نہیں دیا۔ اور ایسے عالم میں بھی اعلان فرمایا تو یہ فرمایا۔

لَوْمَنَعُوْنِیْ عِقَالاً کَانُوْا یُؤَدُّوْنَهَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُھُمْ۔	اگر جانور کی رسی بھی جو یہ زکوۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے مجھے نہ دینگے تو میں ان سے قتال کرونگا

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ تو سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ملک کے ایک علاقہ کے بسنے والوں سے ڈر کر دین محمدی کو مٹنے اور دولت سرمدی کے زوال کو کیسے روا رکھتے۔ یہ بات صرف شیعہ کی سمجھ میں آئے تو آئے کسی مسلمان کے تو تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ وہ تو ایسے خیال پر سُبْحَانَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ پڑھتے ہیں ایک طرف تم ان کو وصی بحق کہتے ہو اور دوسری طرف ان پر الزام لگاتے ہو کہ گویا جناب امیر رضی اللہ عنہ نے دین محمدی میں خلل کو جائز رکھا اور گوارا کیا، کیا تمہاری عقلوں کو زنگ لگ گیا۔ یا آنکھیں بصارت کھو بیٹھیں۔ کہ نہ یہ دیکھتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو نہ یہ سوچتے ہو کہ کس کے متعلق کہہ رہے ہو اور یہ بات جو انہوں نے کہی کہ آپکے متبعین اور افواج میں دشمنوں کی اولاد کی اکثریت تھی اور وہی ان کے پیرو تھے۔ تو اس میں اکثریت والی بات تو بالکل غلط ہے۔ اسلیے کہ اکثریت تو کوفیوں مصریوں اور قاتلین عثمان کی تھی۔ جنکی ساری تگ و دو صحابہ کرام کے مطاعن کی تلاش میں صرف ہو رہی تھی وہ تو ان حضرات کرام کی بزرگی اور اعزاز کے انہدام کے خواہاں تھے۔ یا عراق و عجم، خراسان و فارس اور اہواز کے ایسے لوگ تھے جو خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد کے زخم خوردہ تھے۔ اور ان کی فوجوں سے دوبدو شکست کا زخم کھا کر دلوں میں کینہ چھپائے ہوئے تھے۔ یا پھر وہ اکھڑ، اور ان گھڑ عرب جو فتنہ انگیزی جنگجوئی طعن و بدگوئی کو اپنی فطرت میں لے کر اس دنیا میں آئے۔ اور جنکا محبوب مشغلہ احکام و حکام میں ردوبدل اور اکھاڑ پچھاڑ، اور پھر ایسے مزاج کے لوگوں کے سامنے مسائل بھی عین ان کی خواہش و آرزو اور تمناؤں کے بر لانے والے ہوں جیسے متعہ کہ عیاش طبع اور شہوت پرست لوگوں کی کشش کا باعث، یا مسح رجلین کا مسئلہ کہ آدھے وضو سے چھٹی یا تراویح کی معافی۔ کہ بے ایمان روزہ دار کیلیے افطار کے بعد ایسا ہے جیسے موت کے بعد عذاب قبر پھر اکثر عجمیوں وعربیوں پر تراویح بہت شاق و دشوار تھی۔ چنانچہ ایک مشہور شاعر طرطوسی نے اس سلسلہ میں جو کہا ہے اسکا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"روزہ کا دن بدبختی کا دن ہے اور تراویح کی رات مصیبت کی رات ہے۔ بیمار بن جاؤ کہ پاک چیزیں تمہارے لیے حلال ہو جائیں گی۔ اور بعض وقت بیمار بننا ہی عین شفا ہے۔ اور اگر روزہ رکھنا ہی پڑ جائے تو اکثر بعد عشاء کا روزہ رکھو"

تو ان مسائل نے جن لوگوں کے دلوں کو کھینچا وہ بھی آپ کے ساتھیوں اور فوجیوں میں شامل تھے۔ تو معلوم ہو گیا کہ اکثریت کن لوگوں کی تھی۔ اور صحابہ کی جو اولادیں آپ کے ساتھ تھیں وہ انصار تھے جو ہمیشہ سے محب علی اور شیعان علی شمار ہوتے تھے وہ شیخین رضی اللہ عنہما کا عدل اور ان کی فضیلت سے آگاہ تھے۔ اور اپنے والدین سے وضع و آئین پیمبری سے بھی واقف ہو گئے تھے، تو گویا بقول شیعہ شیخین کی طرف سے سنت پیغمبری میں جو تحریف یا تغیر، ہوا تھا اسے خوب جانتے تھے اور کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ کے مصداق

نادر مسائل پرانے مسائل کے مقابلہ میں انکو پسند اور جمعیت خاطر کا سبب بھی ہوں گے۔ اس طرح یہ سارے مٹھی میں تھے۔ پھر خوف کس سے تھا۔ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے دو ایک ہوں گے۔ تو وہ مصر میں جب مارے گئے تو ان کا خوف بھی زائل ہو گیا۔ اب رہے امیر معاویہ اور جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ان سے اگر خوف تھا تو وہ بغاوت اور محاذ آرائی کا تھا۔ اسکے لیے مخالفت میں انہوں نے کونسی کمی کی تھی کہ اگر آپ اظہار حق فرماتے اور اصل امور شرع مروج فرماتے تو وہ اپنی مخالفت میں کیا اضافہ کرتے۔

اس کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی سامنے رہے کہ ابتدائے بعثت سے لیکر حیات مبارکہ کے آخری لمحہ تک آپ کے اکثر پیرو (متبعین) یا تو آپ کے جانی دشمنوں کی اولاد تھے یا ان کے بھائی بند مثلاً عکرمہ بن ابوجہل، حارث بن ہشام، صفوان بن امیہ بن خلف، جبیر بن مطعم، اور خالد بن ولید (رضی اللہ عنہم اجمعین) جو امیر الامراء اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر برہنہ تھے یہ سب کے سب ان کافروں کے فرزند تھے جو آپ کے سخت ترین جانی دشمن تھے۔ اسکے باوجود آپ نے کبھی بھی امور شرعیہ میں کسی رورعایت یا نرمی وسستی سے کام نہیں لیا۔

یہی حال سابقہ انبیاء ورسل علیہم السلام اور ان کے ورثا کا رہا ہے۔ کہ ہمیشہ دشمنوں اور مخالفوں سے پالا پڑتا رہا۔ اگر ان کے اسلاف کی دشمنی وعداوت، تبلیغ احکام وامور شرع میں ملحوظ رکھی جایا کرتی تو شرع کیسے ظہور میں آتی اور دین حق دین باطل سے کس طرح ممتاز ہوتا۔

پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے پیروؤں نے آپ کی بات مان لینے، آپ کی تعظیم وتوقیر کرنے اور آپ کی رفاقت میں جان لڑا دینے میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی چنانچہ جنگ جمل وصفین، اور نہروان کے واقعات موجود ہیں، اور جو شخص کسی پر جان نچھاور کرنے کے آخری اقدام پر تلا ہوا ہو وہ ان کے شرعی فرمان سے کیوں منہ موڑنے لگا۔

اور اتنا تو بہرحال تمام متبعین اور پیروؤں کے بارے میں متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب آپ کا شمار خلفائے راشدین میں کرتے اور اپنے زمانہ ووقت میں ساری مخلوق سے بہتر سمجھتے تھے۔ اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ ومذہب ہے اور ان کے نزدیک یہ بھی طے شدہ ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حکم رکھتی ہے تو جن لوگوں کے ایسے خیالات اور عقائد ہوں ان سے ڈرنا اور تقیہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پانچویں روایت جو کلینی کی ہے یہ ہے۔

رَوَى الْكُلَيْنِيُّ عَنْ مُعَاذِ بْنِ كَثِيْرٍ عَنْ اَبِيْ عَبْدِ اللهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ اِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْزَلَ عَلٰى نَبِيِّهٖ كِتَابًا فَقَالَ هٰذِهٖ وَصِيَّتُكَ اِلَى النُّجَبَاءِ فَقَالَ وَمَنِ النُّجَبَاءُ يَا جِبْرِيْلُ فَقَالَ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ وَوَلَدُهٗ. وَكَانَ عَلَى الْكِتَابِ خَوَاتِيْمُ مِنْ ذَهَبٍ فَدَفَعَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عَلِيٍّ وَاَمَرَهٗ اَنْ يَفُكَّ خَاتَمًا مِنْهُ فَيَعْمَلَ بِمَا

کلینی نے بحوالہ معاذ بن کثیر جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل فرمائی اور فرمایا کہ یہ تمہاری طرف سے نجباء کیلیے وصیت ہے۔ آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے جبرئیل (علیہ السلام) سے دریافت فرمایا وہ نجباء کون ہیں؟ انہوں نے کہا کہ علی بن ابی طالب اور انکی اولاد (رضی اللہ عنہم) اور کتاب پر سونے کی مہریں تھیں پس رسول اللہ

فِيهِ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى الْحَسَنِ فَفَكَّ خَاتَمًا فَعَمِلَ بِمَا
فِيهِ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى الْحُسَيْنِ فَفَكَّ خَاتَمًا فَوَجَدَ فِيهِ
أَنْ أَخْرِجْ بِقَوْمٍ إِلَى الشَّهَادَةِ فَلَا شَهَادَةَ لَهُمْ إِلَّا
مَعَكَ وَاشْتَرِ نَفْسَكَ لِلّٰهِ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى
عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَفَكَّ خَاتَمًا فَوَجَدَ فِيهِ أَنْ أَطْرِقْ
وَاصْمُتْ وَالْزَمْ مَنْزِلَكَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ
الْيَقِينُ فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى ابْنِهِ مُحَمَّدِ بْنِ
عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ فَفَكَّ خَاتَمًا فَوَجَدَ فِيهِ حَدِّثِ
النَّاسَ وَأَفْتِهِمْ وَانْشُرْ عُلُومَ أَهْلِ الْبَيْتِ وَصَدِّقْ
آبَائَكَ الصَّالِحِينَ وَلَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللهَ فَإِنَّهُ
لَا سَبِيلَ لِأَحَدٍ عَلَيْكَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى جَعْفَرٍ الصَّادِقِ
فَفَكَّ خَاتَمًا فَوَجَدَ فِيهِ حَدِّثِ النَّاسَ وَأَفْتِهِمْ وَ
لَا تَخَافَنَّ أَحَدًا إِلَّا اللهَ فَانْشُرْ عُلُومَ أَهْلِ بَيْتِكَ
وَصَدِّقْ آبَائَكَ الصَّالِحِينَ فَإِنَّكَ فِي حِرْزٍ وَأَمَانٍ
فَفَعَلَ ثُمَّ دَفَعَهُ إِلَى ابْنِهِ مُوسٰى وَهٰكَذَا إِلَى
قِيَامِ الْمَهْدِيِّ وَرَوَاهُ مِنْ طَرِيقٍ آخَرَ عَنْ مُعَاذِ بْنِ
كَثِيرٍ أَيْضًا عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ وَفِيهِ فِي الْخَاتَمِ
الْخَامِسِ وَقُلِ الْحَقَّ فِي الْأَمْنِ وَالْخَوْفِ وَلَا تَخْشَ
إِلَّا اللهَ۔

صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ کتاب علی (رضی اللہ عنہ) کو دی
اور حکم فرمایا کہ ان مہروں میں سے ایک کو توڑیں اور اس میں
جو کچھ درج ہے اس پر عمل کریں۔ پھر حسن (رضی اللہ عنہ)
کو دی آپ نے مہر توڑی اور جو کچھ اس میں پایا عمل کیا۔
پھر حسین (رضی اللہ عنہ) کو دی اور انہوں نے مہر توڑی
تو اس میں یہ لکھا پایا کہ ایک قوم کی ہمراہی میں شہادت
کے لیے نکلو کیونکہ تمہارے بغیر ان کی شہادت معتبر
نہیں اور راہ خدا میں اپنی جان کی بازی لگاؤ تو انہوں نے
ایسا ہی کیا پھر علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ کو دی انہوں
نے بھی ایک مہر توڑی تو اسمیں یہ لکھا پایا کہ سر تسلیم خم کرو
خاموش رہو گھر میں بیٹھے رہو اور مرتے دم تک اپنے رب کی
عبادت کرتے رہو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بیٹے
محمد بن علی بن الحسین (رحمۃ اللہ علیہ) کے سپرد کی انہوں
نے ایک مہر توڑی تو اسمیں یہ پایا لوگوں سے حدیث بیان
کرو، ان کو فتویٰ دو اور اہل بیت کے علم کو پھیلاؤ اور اپنے
نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو اور سوائے خدا کے
کسی سے نہ ڈرو کیونکہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پھر
جعفر صادق (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ کی آپ نے ایک مہر
توڑی تو اسمیں یہ لکھا ہوا پایا کہ لوگوں سے حدیث بیان کرو
ان کو فتویٰ دو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو اہل بیت کا علم پھیلاؤ اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق
کرو تم یقیناً امن و حفاظت میں ہو تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بیٹے موسیٰ (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ کی اور اسی
طرح ظہور مہدی تک ہوتا چلا جائیگا۔ اور ایک دوسرے سلسلہ سند سے بھی معاذ بن کثیر سے روایت
کی ہے اور اس نے ابی عبد اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) سے اسمیں پانچویں مہر میں یوں ہے۔ امن و خوف میں حق بات
کہو اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈر۔

یہ روایت بڑے اچھے فوائد پر مشتمل ہے۔

الف: ائمہ حضرات جو کچھ کرتے تھے خدا کے حکم کے مطابق کرتے انکو جن باتوں کا حکم دیا گیا انہوں نے وہ انجام
دیں۔ لیکن زمین پر اقتدار حاصل کرنے اور امور مملکت میں دخل اندازی کا ان میں سے کسی بزرگ کو بھی حکم نہیں ملا
ورنہ وہ اسکے لیے تگ و دو کرتے اور ضرور کامیاب ہوتے۔

ب: جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم میں خاموش رہنے کوئی گڑبڑ نہ کرنے اور

خلفائے ثلاثہ کی اطاعت و فرماں برداری سے پیش آنے پر مامور تھے۔ اور انہوں نے اس حکم الہٰی کی پوری پوری پابندی فرمائی فہو المراد یہی ہمارا مقصد ہے۔

ج: بعض ائمہ مثلاً جناب باقر و صادق رحمۃ اللہ علیہما کو کسی کے ساتھ تقیہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ لہٰذا ان کے وہ تمام اقوال و افعال و روایات جو اہل سنت کے نزدیک ان سے بطریق تواتر و شہرت مروی ہیں سب کے سب سچائی اور ظاہر پر مبنی ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما علماء اہل سنت نے آپ سے جو کچھ سیکھا وہ سب فرمودۂ خدا تھا۔ مگر شیعوں نے جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے وہ ان اقوال میں جو اہلسنت کی موافقت میں ہیں اور انکی کتابوں میں مذکور ہیں رد و بدل کر کے ان کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں تو یہ تحریف و تنسیخ تو ہے ہی مگر اسی کے ساتھ وصیت کے بھی صاف طور پر خلاف ہے۔

چھٹی روایت سلیم بن قیس ہلالی نے اپنی کتاب احتجاجات میں اشعث بن قیس سے ایک طویل روایت کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

اَنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَ لَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَالَ النَّاسُ اِلٰى اَبِىْ بَكْرٍ فَبَايَعُوْهُ حَمَلْتُ فَاطِمَةَ وَاَخَذْتُ بِيَدِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ وَلَمْ نَدَعْ اَحَدًا مِّنْ اَهْلِ بَدْرٍ وَاَهْلِ السَّابِقَةِ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ اِلَّا نَاشَدْتُهُمُ اللّٰهَ حَقِّىْ وَ دَعَوْتُهُمْ اِلٰى نُصْرَتِىْ فَلَمْ يَسْتَجِبْ لِىْ مِنْ جَمِيْعِ النَّاسِ اِلَّا اَرْبَعَةُ رَهْطٍ اَلزُّبَيْرُ وَسَلْمَانُ وَاَبُوْ ذَرٍّ وَالْمِقْدَادُ۔

امیر المومنین (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور لوگوں کا جھکاؤ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی طرف ہوا اور آپ سے بیعت لی گئی تو میں نے فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو اونٹ پر سوار کیا اور حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کا ہاتھ پکڑا اور اہل بدر، مہاجرین و انصار کے سابقین میں سے کسی کو نہ چھوڑا جسکو میں نے اپنے حق کیلئے قسم نہ دی ہو اور اپنی مدد کے لیے نہ بلایا ہو مگر ان حضرات میں سے چار کے سوا میری بات کسی نے بھی نہ مانی۔ یعنی زبیر، سلمان، ابوذر اور مقداد (رضی اللہ عنہم)

یہ روایت بھی صاف غمازی کر رہی ہے کہ امام برحق پر تقیہ واجب نہ تھا اگر واجب ہوتا تو خاتون جنت اور شباب اہل جنہ کے سرداروں کو لیکر یوں دربدر نہ پھرتے۔ اس میں فائدہ کی کوئی بات نہ تھی بلکہ جو لوگ بیعت کر چکے تھے ان کے سامنے ایسی بات کے اظہار میں تو سراسر مضرت تھی۔

ساتویں روایت۔ بھی سلیم بن قیس سے ایک دوسری کتاب میں جو شیعوں کے ہاں "ابان بن عیاش" کے نام سے مشہور ہے اس نے سلیم سے اسکی یوں روایت کی ہے

اِنَّ اَبَا بَكْرٍ بَعَثَ اِلٰى عَلِىٍّ قُنْفُذًا حِيْنَ بَايَعَهُ النَّاسُ وَلَمْ يُبَايِعْهُ عَلِىٌّ وَقَالَ لَهُ انْطَلِقْ اِلٰى عَلِىٍّ فَقُلْ لَهُ اَجِبْ خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَانْطَلَقَ فَبَلَّغَهُ فَقَالَ لَهُ مَا اَسْرَعَ مَا كَذَبْتُمْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جب لوگوں نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی اور علی (رضی اللہ عنہ) نے ان سے بیعت نہ کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قنفذ کو ان کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو تسلیم کر لو پس اس نے جاکر یہ بات پہنچا دی تب علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا تم لوگوں نے

وَارْتَدَدْتُمْ وَاللّٰهِ مَا اسْتَخْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرِيْ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر کس قدر جلد جھوٹ منسوب کر دیا۔ اور ان سے پھر گئے خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

یہ روایت بھی تقیہ کے بطلان کا علی الاعلان اظہار کر رہی ہے۔

آٹھویں روایت کتاب سلیم میں اسی ابان سے مروی ہے۔

اِنَّهَا لَمَّا لَمْ يُجِبْ عَلِيٌّ غَضِبَ عُمَرُ وَاَضْرَمَ بِالنَّارِ بَابَ دَارِ عَلِيٍّ فَاَحْرَقَ الْبَابَ وَدَفَعَهُ فَاسْتَقْبَلَتْهُ فَاطِمَةُ وَصَاحَتْ يَا اَبَتَاهُ وَيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَرَفَعَ عُمَرُ السَّيْفَ وَهُوَ فِيْ غِمْدِهٖ فَوَجَّى بِهٖ جَنْبَهَا وَرَفَعَ السَّوْطَ فَضَرَبَ بِهٖ ذِرَاعَهَا فَصَاحَتْ يَا اَبَتَاهُ فَاَخَذَ عَلِيٌّ بِتَلَابِيْبِ عُمَرَ وَهَزَّهٗ وَوَجَّى اَنْفَهٗ وَرَقَبَتَهٗ۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نہیں مانی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خفا ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ کو آگ لگادی اور جلا کر اسکو ڈھا دیا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بابا کی دہائی دیتی ہوئی آئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میان سمیت اپنی تلوار سے انکی کوکھ میں کچوکا دیا اور کوڑا ان کے پیرہن پر مارا وہ پھر ہائے بابا چلائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گردن دبوچی اور اسے جھٹکا دیا ناک و گدی کو بھی رگڑا۔

نویں روایت اسی کتاب میں یہ بھی درج ہے۔

قَالَ عُمَرُ لِعَلِيٍّ بَايِعْ اَبَا بَكْرٍ۔ قَالَ اِنْ لَمْ اَفْعَلْ ذٰلِكَ قَالَ اِذًا وَاللّٰهِ يُضْرَبُ عُنُقُكَ قَالَ كَذَبْتَ وَاللّٰهِ يَا ابْنَ صَهَّاكَ لَا تَقْدِرُ عَلٰى ذٰلِكَ اَنْتَ اَلْاَمُ وَاَضْعَفُ مِنْ ذَالِكَ۔

عمر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لو آپ نے کہا اگر نہ کروں تو پھر کیا ہوگا انہوں نے فرمایا تب بخدا تم قتل کر دئے جاؤ گے علیؓ نے کہا اے ابن صہاک بخدا تم نے جھوٹ کہا تم اس پر قادر نہیں ہو سکتے تم تو اس سے زیادہ لئیم اور کمزور ہو۔

اس روایت نے تو تقیہ کا ناس ہی مار دیا۔ اور جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا کہ جناب امیرؓ نے گالی بھی دی تکذیب بھی کی اور اس پر قسم کھا کر اسے پختہ اور مؤکد بھی کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اضعف الخلق کہا۔

حالانکہ شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں منقول و مروی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ ان کے لشکری اہل شام کی بدگوئی کرتے اور گالیاں دیتے ہیں تو آپ نے انکو اس سے روکا اور فرمایا کہ مجھے تمہارا کلیر ہونا پسند نہیں۔ اب پتہ نہیں آپ نے اپنی زبان کو گالی سے آلودہ کرنا کیوں پسند فرمایا۔

(در اصل نہ یہ زبان آپ کی ہے۔ نہ آپ کا اخلاق ہے۔ یہ تو کسی بدفطرت کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ اپنی زبان ان کے دہن مبارک میں ٹھونسنے کی ناپاک جسارت کر رہا ہے۔ ن)

دسویں روایت محمد بن سنان کی روایت ہے۔

اِنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يَا مَغْرُوْرُ اِنِّيْ اَرَاكَ فِي الدُّنْيَا قَتِيْلًا بِجِرَاحَةِ

امیر المومنین نے عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہما) سے کہا اے مغرور میں تجھکو دنیا میں مقتول دیکھ رہا ہوں کہ عبد ابن معمر

مِنْ عَبْدِ بْنِ اُمِّ مَعْتَمٍ تَحْكُمُ عَلَيْهِ جَوْرًا فَيَقْتُلُكَ يَدْخُلُ بِذَالِكَ الْجِنَانَ عَلٰى رَغْمِهٖ مِنْكَ۔

اس فیصلہ کی وجہ سے جو تم اسکے حق میں ظلما صادر کروگے اور وہ تمہیں قتل کردے گا اور تمہارے نہ چاہنے کے باوجود جنت میں جائیگا۔

پڑھتا جا شرماتا جا، اس طرح چک میں کہیں تقیہ کا وجود نظر آتا ہے، کوسوں منزلوں اسکا تو پتہ نہیں۔

گیارہویں روایت یہی محمد سنان راوی ہے۔

اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ لِعُمَرَ اِنَّ لَكَ وَلِصَاحِبِكَ الَّذِيْ قُمْتَ مَقَامَهٗ هَتْكًا وَصَلْبًا تُخْرَجَانِ مِنْ جِوَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتُصْلَبَانِ عَلٰى دَوْحَةٍ يَابِسَةٍ فَتُوْرِقُ فَيُفْتَتَنُ بِذَالِكَ مَنْ وَالَاكُمَا ثُمَّ تُؤْتٰى بِالنَّارِ الَّتِيْ اُضْرِمَتْ لِاِبْرَاهِيْمَ وَيَأْتِيْ جُرْجِيْسُ وَدَانِيَالُ وَكُلُّ نَبِيٍّ صِدِّيْقٍ فَتُصْلَيَانِ فِيْهَا فَتُحْرَقَانِ وَتَصِيْرَانِ رَمَادًا ثُمَّ تَأْتِيْ رِيْحٌ ثُمَّ تَنْسِفُكُمَا فِي الْيَمِّ نَسْفًا۔

امیر المومنین نے عمر (رضی اللہ عنہما) سے کہا کہ تمہارے لیے نیز جسکی جگہ تم نے سنبھالی ہے یقینا بے آبروئی اور سولی پر چڑھنا ہے۔ تم دونوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پڑوس سے نکالدیے جاؤگے اور سولی دیے جاؤ گے ایک سوکھے درخت پر جو پتے لے آئیگا۔ اس سے تمہارے ہمدرد فتنہ میں پڑجائیں گے۔ اس کے بعد وہ آگ لائی جائیگی جو ابراہیمؑ کے لیے بھڑکائی گئی تھی اور جرجیسؑ، دانیالؑ اور ہر نبی صدیق آئیں گے پس تم دونوں اسمیں ڈالے جاؤگے اور جلائے جاؤگے اور راکھ ہوجاؤگے پھر ہوا آئے گی اور تم کو سمندر میں ڈال کر نیست و نابود کردیگی۔

یہاں بھی دامن تقیہ تار تار ہے اور اصول تقیہ اشکبار۔

(مندرجہ بالا روایت کے متعلق بلاریب وشک ہر مسلمان جانتا ہے کہ جناب امیر یہ الفاظ و بیان تو کجا انکو پتہ تک نہیں ہوگا کہ سبائیوں نے ان کی طرف کیا کیا جھوٹ منسوب کرکے پھیلا دیا ہے۔ البتہ اس روایت سے رافضیوں کی ان وارداتوں کی ضرور تصدیق ہوگئی جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ جن میں ان بدبختوں نے کئی مرتبہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے اجساد مبارکہ کو پہلوئے رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے نکال کر اسی سبائی بکواس کو عملی جامہ پہنانے کی ناکام کوشش کی۔ اور اسی کوشش میں ایک مرتبہ ۴۰ رافضی مسجد نبوی میں غرق زمین ہوکر کندۂ جہنم بنے۔ جسکا نشان ہنوز موجود ہے۔ ن)

گو تقیہ کے بطلان کی روایات کتب شیعہ میں بے شمار موجود ہیں مگر یہاں صرف بارہ روایات پر اکتفا کیا گیا۔ کسی بھی عقلمند کو ان روایات کے مطالعہ کے بعد یہ شک نہیں رہے گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جو اپنے دشمنوں میں جری، ہیبت، سرکشی اور دبدبہ میں مشہور اور ضرب المثل تھے وہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سامنے ہر معاملہ میں بودے، پست ہمت اور حقیر و ذلیل تھے۔ تو پھر دوسرے حضرات جو آپ سے کمزور ضعیف و بزدل تھے ان کا معلوم نہیں بدحواسی میں کیا حال ہوتا ہوگا۔ ان کے تو ہاتھ پاؤں بھول جاتے ہونگے لہٰذا معلوم ہوگیا کہ جناب امیر کا امور مملکت میں دخل نہ دینا۔ اور ان کو ان ہی چند ضعیف و کمزور و حقیر لوگوں کے صوابدید پر دیدہ و دانستہ چھوڑے رکھنا بے بسی اور تقیہ پر مبنی نہیں تھا اگرچہ یہ بھی پتہ چل

گیا تھا کہ ایسا کرنا مخلوق کے دین و ایمان کے فساد کا سراسر سبب بنا اور شریعت کی تحریف اور کتاب اللہ کی تبدیلی جیسے نتائج اس پر مرتب ہوئے ۔ اب اسکا جواب شیعہ ہی دیں کہ اسقدر طاقت وقوت اور دبدبہ رکھتے ہوئے جناب امیر نے فساد عقیدہ، تحریف شریعت اور تبدیلی کتاب اللہ کیسے اور کیوں گوارا فرمالی ۔ جبکہ مذکورہ بالا روایات نے تقیہ کے اصول کو توجھٹلا دیا ۔

ائمہ سے تقیہ کا وقوع سراسر جبن، بزدلی، بے عزتی اور ناحفاظتی ہے ۔ خاص کر ایسی صورت میں کہ موت بھی ان کے ہاتھ میں ہو گذشتہ و آئندہ حالات کی ان کو خبر بھی ہو اور پھر تقیہ بھی اس حد تک کہ فاسق و فاجر انکی لڑکیاں اور بہنیں چھین لیں وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتے ہوں بلکہ اول قدم پر ہی دفاع اور روک دینے کی صلاحیت بھی حاصل ہو ۔ کہ پھر کسی تعب و مشقت کی بھی ضرورت نہ رہے، صرف ایک کمان ڈال دینے اور زبان ہلا دینے سے کام تمام ہو جائے بہر حال ایسا ذلیل اور قابل نفرت خیال و تصور ان محترم حضرات کی شان میں کسی مسلمان کے دل و دماغ میں تو ہرگز نہیں آسکتا ۔ اس لیے کہ یہ صریح کفر ہے یہ ساری قباحتیں اور نحوستیں تو اس منحوس تقیہ کے اصول کی پیداوار ہیں اور اس کے واجب ہونے سے کیا بلکہ صرف واقع ہو جانے سے وہ ساری اغراض فوت ہو جاتی ہیں جو نصب امام سے مقصود ہوتی ہیں نہ ہی امامت ظاہر ہو پاتی ہے نہ ہی شریعت کی حفاظت اور نہ ہی حق باطل سے تمیز پاتا ہے ۔ اور اگر کوئی ابتداء دعوی امامت و خلافت کرے اور جب دیکھے کہ لوگ اسکی امامت کے منکر ہیں اور اس سے سختی و درشتی سے پیش آتے ہیں تو وہ تقیہ اختیار کر کے بیٹھ جاتے اور ہر معاملہ میں ان کا شریک عمل رہے تو عوام و خواص یہی سمجھیں گے کہ اس نے اپنے دعوی سے رجوع کر لیا ہے ۔ اور یہ بھی یقین کر لیں گے کہ آدمی تھڑ دلا اور بڑ بولا تھا کہ اتنے بڑے منصب کا دعوی تو کر بیٹھا مگر کچھ چلتی نہ دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا ۔

درحقیقت یہ خیال حد درجہ نازیبا و ناشائستہ ہے اور کوئی بھی مسلمان اسکو پسند نہیں کر سکتا مگر اسکو کیا کیا جائے ۔ کہ شیعہ روایات جو ان کے ہاں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی بابت ملتی ہیں اسی حالت کو ثابت کرتی ہیں ۔ بفرض محال ہم یہ مان بھی لیں کہ تقیہ میں کوئی خرابی نہیں، مگر لڑکیوں اور بہنوں کے چھین لیے جانے پر دب جانا اور دم بخود رہ جانا مسلمان کی دل شکنی اور نفرت قلبی کے لیے تو یہی کافی ہے ۔ اور ان کی یہ اٹکل شوئی بھی بے کار اور افترا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دختر جناب امیر رضی اللہ عنہ پر حاوی نہ ہو سکے کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو گیا ۔ یہ ایک دیدہ دلیرانہ چوری ہے جو حضرت سارہ علیہا السلام کے قصہ سے اڑائی گئی ہے ۔ سب کو معلوم ہے کہ ایک ظالم نے ان عفت مآب کو غصب کر لیا تھا ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سربسجدہ مصروف التجا تھے ۔ وہ بدبخت جب بھی بدنیتی کرتا بے ہوش ہو کر گر پڑتا ۔ مگر یہاں تو قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ نکاح میں آگئیں پھر ان کے بطن سے زید بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف پیدا ہوا بلکہ زندگی کی بیس بہاریں بھی دیکھیں اور عین عالم شباب میں بنی عدی کی باہم خانہ جنگی میں صلح و صفائی کے لیے جاتے ہوئے رات کی اندھیری میں کسی نامعلوم فرد کے ہاتھوں مغالطہ میں شہید ہو گئے اور اتفاق یہ کہ آپ کی والدہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی اسی روز بیماری کے سبب فوت ہو گئیں ۔ دونوں

جنازے ساتھ لائے گئے جناب حسین و عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے نماز جنازہ پڑھی اور دفن کیا۔ اور کچھ نہ بھی ہو تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری لمحہ تک ان پاکباز محترمہ رضی اللہ عنہا کا آپ کے گھر میں رہنا بلاشبہ ثابت ہے۔ اول تو جگر پارۂ رسول کا ایک "فاجر و کافر" کے ہاتھوں چھن جانا ہی متصور نہیں اور اگر ہو بھی گیا تھا تو یہاں خلاصی زیادہ متوقع تھی۔ اور نکاح کے بارے میں عذر پیش کرنے کی خاطر بے حیا قوم جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت نقل کرتی ہے کہ اول فرج غصب منا۔ اس کو سنکر تو مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر لعنت ہے ان بدباطن بدبختوں پر کہ محض عداوت عمر میں اتنے اندھے ہو گئے کہ اس قسم کی کفریات پاکباز ائمہ اطہار پر بکنے میں بھی انہیں ذرا شرم و عار نہیں۔ حالانکہ ان کے شرمناک جھوٹ کی تکذیب کے لیے خود کتب امامیہ میں صحیح روایات موجود ہیں۔ جو عداوت عمر کی بنا پر طاق نسیان بنا رکھی ہیں۔ ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ ادھر سے اندھے ہیں۔ تو دنیا تو اندھی نہیں ملاحظہ فرمائیے۔

سُئِلَ الْاِمَامُ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ الْبَاقِرِ عَنْ تَزْوِجِهَا فَقَالَ لَوْلَا اَنَّہٗ رَاٰہُ اَهْلًا لَّهَا مَا كَانَ يُزَوِّجُهَا اِيَّاهُ وَكَانَتْ اَشْرَفَ نِسَاءِ الْعَالَمِ جَدُّهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَخَوَاهَا الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاَبُوْهَا عَلِيٌّ ذُو الشَّرَفِ وَالْمَنْقَبَةِ فِي الْاِسْلَامِ وَاُمُّهَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَّتُهَا خَدِيْجَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ۔

جناب محمد بن علی الباقر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر حضرت عمر کو جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لائق نہ پاتے تو ان سے نکاح ہی کیوں کرتے وہ تمام مستورات عالم میں شریف ترین تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نانا۔ جوانان جنت کے سردار حضرات حسنین رضی اللہ عنہما۔ ان کے ماں جائے بھائی، شرف و منقبت کے مالک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ کی جگر گوشہ ان کی والدہ ہیں ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ان کی نانی۔

ان کو یہ بات تو سامنے رکھنی چاہئے تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شیعہ کی برائی کرنے پر اتنی شدت سے باز پرس کی اور کمان کا اژدہا بنا کر ان کو ہراساں اور بے عزت کیا۔ تو کیا وہ اپنی بیٹی کے چھن جانے پر اور عزت و ناموس کا سوال درپیش ہونے پر ایسے ہی ٹھنڈے مزاج کا ثبوت دیتے اور ان کی رگ غیرت و حمیت میں کوئی جنبش نہ ہوتی اور وہ خاموشی سے بغیر تعارض کئے اسے گوارا کر لیتے۔ ایسی پاک و مطہر گرامیقدر لائق احترام ہستیوں کے متعلق وقوع زنا کا وہم بھی اپنے دل میں لانا گو مجبوری سے ہو مسلمانوں کے کھلا کفر ہے۔ مگر کھلے کفر کے مرتکب یہ ناپاک اور بدفطرت گروہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کی پاکی و پاکبازی قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے ان کے پاک دامن کو محض عداوت و بغض و عناد عمر رضی اللہ عنہ کے سبب اس فعل کے داغ سے داغدار کرے اور جناب امیر اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو بے غیرتی اور بے ناموسی کے اتہام سے متہم کرے۔ مگر یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ ساری کالک ان ملعونوں

ہی کے چہروں کا تاقیام قیامت بزرہے گی۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے سبائی منصوبوں کی خاطر سارے ہی قابل احترام و شرف بزرگوں کو مجروح کرنے کی ناپاک منصوبہ بندی کی جسارت کی ہے جنکی پاک دامنی کا خدا گواہ ہے ان کے دامن پر تو یہ منافق و کافر کیا دھبہ کاری کریں گے۔ البتہ خود ہی قردۃ خاسئین بنکر رہیں گے۔ انہوں نے تعداوت و بغض میں جس کفر و زندیقیت کا مظاہرہ کیا اسکی نظیر کسی فرقہ میں پائی گئی نہ پائی جاسکی۔ شیطان بزبان قرآن آدم (انسان) کا کھلا دشمن ہے اور انتہا درجہ کی عداوت اور بغض رکھتا ہے مگر اس نے بھی خدا تعالیٰ پر کوئی تہمت یا جھوٹ نہیں جوڑا اور اسے مجبوری و بے بسی جیسے نقائص سے متہم نہیں کیا۔

فائدہ عظیمہ

جب تقیہ کی بات بحث میں آہی گئی تو فرق اسلامیہ میں اسکے سلسلہ میں جو افراط و تفریط پائی جاتی ہے اسے بھی مختصرا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوا۔

اگر تقیہ میں شیعوں کے ہاں حد درجہ افراط ہے تو اسکے مقابلہ میں خوارج کے ہاں بے انتہا تفریط۔ شیعوں کا افراط ان کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ معمولی اور بہت ہی معمولی خوف یا لالچ کے باعث اظہار و اقرار کفر بھی جائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ واجب گردانتے ہیں۔ اور خوارج کی تفریط یہ ہے کہ وہ دین کے مقابلہ میں جان و ناموس کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو اپنے انتہاپسند مزاج کے باعث اس باب میں عجیب عجیب زیادتیوں سے کام لیتے ہیں۔ اس میں سے ایک یہ کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی چور یا غاصب آکر اسکا بہت سا مال و دولت لے جانا چاہے تب بھی اسکو نیت توڑنا حرام ہے۔ چنانچہ وہ حضرت بریدہ اسلمی صحابی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کرتے ہیں کہ وہ نماز میں اپنے گھوڑے پر نظر رکھتے تھے کہ بدک کر بھاگ نہ جائے۔

اسلئے مناسب ہوا کہ مذہب اہل سنت جو درمیانی درجہ ہے کو تحریر میں لے آئیں اہلسنت کی اکثر کتب میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ پہلی بات تو یہ کہ تقیہ ایک مشروع فعل ہے چنانچہ آیات ذیل اسکی دلیل ہیں۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَالِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً ۔	مومنوں کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ مومنوں کو نظر انداز کرکے کافروں کو دوست بنائیں اور جو ایسا کرے وہ اللہ کے نزدیک کسی شمار میں نہیں ہاں اگر ان سے کوئی آڑ لینی ہو تو اور بات ہے۔

یا فرمایا۔

إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ۔	مگر وہ جو مجبور کر دیا جائے دراں حالیکہ اسکا دل ایمان پر جما ہوا ہو۔

ان کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں

تقیہ کی تعریف یہ ہے کہ جان، مال، اور آبرو کو دشمن کے شر اور اسکی دست و برد سے بچائیں۔

دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن سے دینی و ملی اختلاف کے سبب دشمنی ہو جیسے کافر مشرک

مرتد وغیرہ، دوسرا وہ جس سے کسی دنیاوی اغراض واسباب کے سبب دشمنی ہو۔ جیسے مال وجائیداد، اسباب وغیرہ، جب دشمنی دو طرح کی ہوئی تو لامحالہ تقیہ کی بھی دو قسمیں ہوں گی۔

پہلی قسم جس میں از روئے شرع تقیہ کی صورت یہ ہوگی کہ جب مسلمان کسی ایسی جگہ گھر جائے جہاں کافروں کی وجہ سے دین ومذہب کو ظاہر نہ کر سکے تو اس پر ہجرت واجب ہو جاتی ہے وہ اس جگہ کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں اسے اپنے دین مذہب کے اظہار کی آزادی اور پوری قوت میسر ہو۔ اسکے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اپنی کمزوری کیلیے کوئی جواز تلاش کر کے اپنے مذہب وطریقۂ اسلام کو چھپائے۔ اس پر قرآنی قطعی نصوص وارد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یٰعِبَادِیَ اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۔	میرے بندو میری زمین بڑی وسیع ہے۔ پوجا صرف میری ہی کرو۔

یا ارشاد ہوا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۔	جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہوا ہوتا ہے فرشتے جب انکی روح قبض کرتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ تم کہاں پھنسے ہوئے تھے وہ کہیں گے کہ ہم زمین کے کمزور افراد تھے۔ فرشتے ان سے کہیں گے کیا اللہ کی

زمین کشادہ نہ تھی۔ تم وہاں ہجرت کیوں نہ کر گئے۔ ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے ہاں ترک ہجرت میں کوئی واقعی عذر ہو تو وہ قابل لحاظ ہوگا۔ مثلاً عورتیں، بچے، اندھے، لنگڑے، لولے، اپاہج، زیر حراست یا قیدی، یا انہیں کی مانند۔

مخالفین اگر خود اسکو یا اسکے ماں باپ بیوی بچوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہوں اور گمان غالب یہ ہو کہ وہ اپنا ارادہ قتل پورا کر کے رہیں گے۔ خواہ یہ قتل دانہ پانی بند کرنے یا جلاوطن کرنے یا کسی اور صورت سے ہو ایسی صورت میں بقدر ضرورت ان سے زبانی موافقت کی اجازت ہے۔ مگر ایسی حالت سے بچ نکلنے کی کوشش اور حیلہ جوئی واجب ہے۔

اور اگر یہ خیال ہو کہ کچھ مالی یا بدنی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے جو قابل برداشت ہو، مثلاً قید وبند، یا غیر مہلک مار پیٹ، ایسی صورت میں مخالف کے ساتھ موافقت جائز نہیں۔ جواز کی صورت میں بھی موافقت رخصت ہے ورنہ اس وقت بھی عزیمت یہی ہے کہ دھڑلے سے اپنے مذہب کا اظہار کرے چاہے جان جاتی ہی رہے۔ (درحقیقت یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل ہی جدا ایک دوسری ہی کیفیت ہے۔ اسکو رخصت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گو صورۃ تقیہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت کے لحاظ سے آسمان وزمین کا فرق ہے)

اب ذرا شیعوں کی سہل انگاری اور زیادتی دیکھیے کہ معمولی سے مال وزر کی خاطر بلکہ مجلس میں کسی اعزاز واکرام کی امیدمیں بلکہ صرف زبانی طور پر خود کو قبلہ وصاحب کہلوانے اپنا دین وایمان تج کر مخالف کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور ہجرت کو ہرگز واجب نہیں جانتے اور ان تمام قرآنی آیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں ترک ہجرت پر کھلم کھلا عتاب فرمایا گیا ہے اور یہ کوئی پہلی مثال نہیں بلکہ انکا معاملہ تمام قرآن

کے ساتھ ایسا ہی ہے۔ ان کی معتبر کتب میں یہ مذکور و مسطور ہے۔

مَنْ صَلّٰی خَلْفَ سُنِّیٍّ فَکَاَنَّمَا صَلّٰی خَلْفَ نَبِیٍّ۔ | جس نے سنی کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

مگر تھوڑے سے نان و آش کی خاطر دیکھ لیجئے اپنی نماز کس طرح خراب کرتے اور اس نماز کے مقابلہ میں دوسری نمازوں کے زیادہ ثواب کے امیدوار بنے رہتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرقہ مذہبی اعتقادات میں کتنا بودا اور لاپرواہ اور حیلہ ساز واقع ہوا۔ غیرت اور شدت کی تو اسمیں بو باس تک نہیں انکسار اوڑھنا بچھونا، وہ تعصب اور اندھاپن ہے جو یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر بدگوئی کرنے اور طعن و تشنیع میں صرف کرتے ہیں دینی مشقت برداشت کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے۔ دنیا کا حقیر ساز و سامان یہاں کی راحت و لذت ان کے نزدیک دین و آخرت کے بڑے منافع اور دیرپا نعمتوں سے بھی زیادہ عزیزتر اور اہم تر ہیں۔ یہ واضح اور صحیح طور پر اس آیت کے مصداق ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ | یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے داموں خریدا ہے۔ وہاں نہ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائیگی نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

دنیا بھر کے عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ محبت و بغض، تصدیق و تکذیب، اور اخلاص و نفاق کے دعوے کے جھوٹ سچ جانچنے اور پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ تجربہ اور بلاء و مصائب کے وقت منافع کے تلف ہو جانے، لذتوں کے ترک کرنے اور رنج و مشقت کے برداشت کرنے کے باوجود اپنے دعوی پر مصر اور ثابت قدم ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ یوں تو ہر شخص مصلحت وقت کے موافق اپنے متعلق کوئی نہ کوئی دعوی رکھتا ہی ہے۔ اگر ان عام اور معمولی تکالیف سے بچنے کیلئے تقیہ لازم ہو جائے تو سچ جھوٹ میں تمیز کیسے ہو سکے گی۔ اگرچہ علم الٰہی میں دلوں کی پوشیدہ اور سینہ کی چھپی ہوئی باتیں روشن ہیں۔ اور اسکو امتحان کی حاجت بھی نہیں۔ لیکن دینی تکلیف کا مدار اور امر و نواہی پر عمل کا پتہ تو امتحان نما معاملات پر ہے۔ چنانچہ اس معاملہ کو صفائی سے ظاہر فرمایا۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ | تاکہ تمہیں پرکھے کہ بلحاظ اعمال کون اچھا ہے۔

یا فرمایا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ۔ | ہم تم کو یقیناً آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین کون ہیں۔

اور فرمایا

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ | البتہ ہم آزمائیں گے تمکو خوف و دہشت اور بھوک سے (سابقہ ڈال کر) اور مالوں جانوں اور پیداوار میں کمی ڈال کر۔

اب رہی دوسری قسم تو اس صورت میں ہجرت واجب ہونے اور نہ ہونے میں علماء کی آراء مختلف ہیں ایک گروہ اسے واجب کہتا ہے اور اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتا ہے وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو) اور دوسری دلیل مال کے ضائع کرنے کی ممانعت سے لی ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہجرت واجب نہیں۔ کہ وہاں سے ہجرت دنیاوی مصالح میں سے ایک مصلحت اور ملت کے اتحاد کے سبب ہجرت نہ کرنے سے اس کمزور وضعیف شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ اسکا غالب دشمن بحیثیت مسلمان اس سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔

دونوں گروہوں کے مابین فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اپنی جان یا عزیز و اقارب کی ہلاکت کا یا شدید بے عزتی کا خطرہ ہے تو یہاں سے بھی ہجرت واجب ہے۔ لیکن یہ ہجرت عبادت اور لائق ثواب نہیں کہ اس پر اسے ثواب بھی ملے اسکا وجوب محض اس شخص کی دنیاوی مصلحت کی بنا پر ہے

تحقیق کی بات یہ ہے کہ ہر واجب عبادت نہیں ہوتا بہت سے واجبات ہیں کہ ان پر کوئی ثواب نہیں مثلاً سخت بھوک کے وقت کھانا، مرض میں یقینی اور ظنی نقصانات سے بچنا صحت کی حالت میں سمیات سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہجرت بھی اسی قسم کی ہے۔ یہ ہجرت الی اللہ ورسولہ نہیں ہے کہ ثواب آخرت کا سبب بنے۔ تقیہ سے متعلق اس مفید بحث کے بعد اب ہم اصل معاملہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم کے عہد مبارک میں ہرگز تقیہ نہیں کیا۔ پسندیدہ دین کے اظہار پر آپ کو قدرت تھی۔ دین و دنیا کے کسی معاملہ میں آپ کسی سے خائف نہیں تھے۔ امر دین میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے ہجرت نہیں فرمائی اگر آپ خائف ہوتے تو آپ پر بموجب آیت قرآنی اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الخ کے۔ اور دنیاوی امور میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مال وجان کے بارے میں آپ سے نہ کوئی لڑا جھگڑا نہ الجھا اور نہ سخت کلامی سے پیش آیا اسکے برعکس ہر کہہ و مہ آپ کی نہایت تعظیم و توقیر کرتے۔ اور محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کا برتاؤ بھی سب کے ساتھ علی قدر مراتب تھا۔ چنانچہ تاریخ اس پر گواہ ہے۔

رہا شیعوں کا مذہب تو وہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے محققین تو آپ کی خود اپنی خلافت میں بھی تقیہ کو واجب بتاتے ہیں چہ جائیکہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں۔ یہاں قاضی نور اللہ شوستری نے بڑی پوچ اور گوزشتر قسم کی بات کہی ہے وہ کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے لڑائی کا نہ ہونا (یعنی عہد خلفاء ثلاثہ میں) ایسا ہے جیسا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل ہجرت مقاتلہ نہ کرنا یا اکثر انبیاء کا مقاتلہ نہ کرنا۔

یہاں قاضی صاحب کو ہجرت کے لفظ سے دھوکا لگا ہے اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا حال نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت حال کی طرح ہے تو پھر ان کا حال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے وقت یا ہجرت کے بعد کے حال کے مطابق کیوں نہ ہو حالانکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ ہی نہیں فرمایا یہ بات

بالاجماع ثابت ہے اس سے انکار وفرار ممکن ہی نہیں۔
خدا اور رسول کے متعلق ہلکی بات یا بغیر سوچے سمجھے کوئی کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہئے۔ اور پھر قبل ہجرت ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا یہ حال تھا کہ وہ ابوجہل، اور امیہ بن خلف کے ساتھ مل کر نعوذ باللہ لات ومنات کو پوجتے تھے یا دوسرے رسوم جاہلیت اور ذبح لغیر اللہ میں ان کے شریک عمل تھے یا ان کی مدح وثنا اپنا ورد بنایا ہوا تھا۔ یا ان کے ساتھ ہم پیالہ وہم نوالہ رہتے تھے۔ یا احکام میں ان کی پیروی کرتے یا یہ کہ ہر وقت وہمیشہ باہم مقابلہ گفت وشنید اور مارپیٹ رہتی تھی۔
آپ تو ان کی عادات اور رسوم کی برائی اور ہجو برملا کرتے۔ لوگوں کو برسر میدان علی الاعلان دین حق کی طرف بلاتے اور سختیاں برداشت کرتے۔ حتی کہ بعد ہجرت کے انصار ومددگار پیدا ہوئے تو زبانی دعوت سے گذر کر نوبت تلوار وتفنگ تک پہنچی۔ تو گویا وہاں تو مراتب اظہار میں ترقی تھی تقیہ اور پوشیدگی کا وہاں کیا سوال یہی حال انبیاء سابقین علیہم السلام کا تھا ہاں جب اور جن انبیاء کرام پر جہاد بالسیف واجب نہ تھا بلکہ اسکا تعلق امراء وملوک سے تھا اور جو انبیاء کے زیر فرمان تھے اس لیے وہ خود جنگ وجدال اور جمع لشکر میں مشغول نہ ہوتے تھے۔ اور جب ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم مامور بجہاد ہوئے (اور یہ جہاد تا قیام قیامت جاری قرار بھی دیا گیا) تو یہ ضروری قرار پایا کہ آپکے خلفاء ہی نہیں آپ کی ساری امت بھی مامور بجہاد ہو۔
اب اگر کوئی شخص انبیاء سابقین کی سنت جہاد کو ترک کرے اور اس ترک کو لازم قرار دے لے تو بلاشبہ کافر ہو جائے۔ اور کبھی ایسا نہ ہوا نہ ہوگا کہ بغاوت اور کفر کے ظہور کے بعد ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے نائب یا خلیفہ سے وجوب جہاد ساقط ہو جائے۔
لہذا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حال کو انبیاء سابقین کے حال پر قیاس کرنا ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کیلیے نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنا فرض تھا نہ کہ کعبہ مکرمہ کی طرف۔ اور آیت استقبال قبلہ سے پیشتر آپ کا حال بھی وہی تھا جو انبیاء سابقین اور خود ہمارے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا یہی حال تمام احکام شرعیہ میں تھا۔ ایسی مجنونانہ بڑ لگانے والے کو عقلاء کی فہرست سے خارج کردینا چاہیئے آیت جہاد کے نزول سے پہلے اگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اسکے نزول کا انتظار تھا اور آپ ترک قتال فرمائے ہوئے تھے۔ تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کس بات کا انتظار تھا۔ قرآن میں تو امت محمدیہ پر جہاد وقتال واجب ہو چکا تھا۔ پھر اولوالامر جو پیغمبر علیہ السلام کے نائب ہیں اور جنکے تقرر سے غرض محض یہ ہے کہ جہاد کریں۔ دین کا اعلان کریں اور ظالم سے مظلوم کا حق دلائیں۔ کس بات کا انتظار کرتے رہے اور کیوں ،جہاد، نہیں کیا۔ یہ ہے مبلغ علم ان کے علماء کا اور حال ان کے محققین کی بے سروپا کا اس کا عوام کا تو کہنا ہی کیا۔
اب تقیہ سے متعلق اہلسنت کے خیالات بھی گوش گذار کر لیجئے۔
اہل تاریخ کا اس پر اجماع ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا کہ آپ اگر یزید کی بیعت کرلو اور اسے امام برحق تسلیم کرلو تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ جہاں رہنا منظور ہو بخوشی رہو بار بار یہ پیشکش ہوئی مگر جب آپ نے یزید کو اپنے رویہ پر ڈٹا پایا اور اسے قابل امامت نہ سمجھا تو آپ نے کھلم کھلا اس کی بیعت

سے انکار کر دیا اور ہرگز کوئی تقیہ نہ فرمایا اور پھر پیش آیا جو پیش آنا تھا۔
لہٰذا اگر تقیہ واجب ہوتا تو اسکے اس سے زیادہ سازگار حالات اور کیا ہو سکتے تھے۔ کہ دشمنوں کا خوف بے انتہا تھا۔ ستر نفر مار ڈالے جانے کیلئے تیس ہزار لشکریوں میں محصور ہو چکے تھے قتل و بے عزتی اور بے آبروئی یقینی ہو چکی تھی۔ ایسے عالم میں آپ کے ثبات نے یہ بتا دیا کہ وجوب تو بڑی بات ہے آپ رحمۃ اللہ علیہ تقیہ کے جواز کے بھی قائل نہ تھے۔
ایک دوسری بات۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دو حالتیں تھیں اول یہ کہ عہد شیخین اور زمانہ ذی النورین رضی اللہ عنہم میں آپ نے بیعت خلافت کی کسی سے کوئی تعارض نہ فرمایا نماز، روزہ، حج، مشورہ، تدابیر امور مہمہ میں انکے ساتھ شریک و دخیل رہے۔ اور خلا، ملا برابر رہا۔
دوسری حالت یہ کہ جناب ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے بیعت، جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کئی بار مقابلہ کیا اگرچہ آپ کے ساتھی کم تھے چنانچہ قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں لکھا ہے کہ قریش میں سے صرف پانچ نفر آپ کے ساتھ تھے جبکہ تیرہ قبیلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اس لیے آپ کو فتح نصیب نہ ہوئی اور آپ دفع شر نہ فرما سکے تو لا محالہ پہلی صورت میں بھی خلفاء ثلاثہ رضوان اللہ علیہم سے آپ کی موافقت تقیہ و بے چارگی کی بنا پر نہ تھی ورنہ یہاں بھی تقیہ فرماتے۔
ایک اور بات یہ کہ شیعوں کی ایک معتبر کتاب بحر المناقب میں مناقب اخطب سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے محمد بن خالد سے روایت کی۔

خَطَبَهُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَوْ صَرَفْنَاكُمْ عَمَّا تَعْرِفُونَ إِلَى مَا تُنْكِرُونَ مَا كُنْتُمْ صَانِعِينَ قَالَ فَسَكَتُوا قَالَ قَالَ ذَالِكَ ثَلٰثًا فَقَامَ عَلِيٌّ فَقَالَ إِذًا كُنَّا نَسْتَعْتِبُكَ فَإِنْ تُبْتَ قَبِلْنَاكَ قَالَ وَإِنْ لَمْ قَالَ إِذًا نَضْرِبُ الَّذِي فِيهِ عَيْنَاكَ فَقَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ مَنْ إِذَا اعْوَجَجْنَا أَقَامَنَا۔

جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ اگر میں تم کو جانی پہچانی راہ سے اجنبی راہ کی طرف پھیر دوں تو تم کیا کرو گے۔ راوی کے مطابق سب چپ رہے۔ آپ نے تین مرتبہ اسے دھرایا۔ تو جناب علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا اس وقت ہم تم سے توبہ کا مطالبہ کریں گے۔ اگر توبہ کر لو گے تو ہمارے لیے قابل قبول رہو گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں ایسا نہ کروں؟ کہا اس وقت ہم تمہارا سر قلم کر دیں گے جس میں تمہاری آنکھیں ہیں جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس امت میں وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ٹیڑھے راستہ پر چل نکلیں تو وہ ہم کو سیدھا کر دیں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ جناب مرتضیٰ علی رضی اللہ عنہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کس قدر پختگی سے قائم تھے، اور ممنوعات شرعیہ میں سستی نہ کرنے اور ان سے انکار کرنے کی قدرت رکھنے میں آپ کا مرتبہ کس قدر بلند و رفیع تھا اور جب یہ حال ہو اور معاملہ کی نوعیت ایسی ہو تو تقیہ کی وہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔
پھر قاضی نور اللہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ آپ بھی ان میں سے ہیں جو اعراف میں ہوں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کو بہت عزیز اور دوست رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ عباس میرے والد کی

جگہ ہیں۔ غرض آپ کے فضائل اتنی تفصیل سے بیان کئے کہ اس مختصر میں اسکی سمائی بھی مشکل ہے اسکے بعد یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ نے جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رشتہ مانگا۔ آپ نے پہلی بار انکار کیا دوسری بار سکوت فرمایا۔ اسکے بعد خود جناب عباس رضی اللہ عنہ نے متولی نکاح بنکر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے باندھ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ لوجہ تقیہ اس سے نہ روک سکے اور اسی لیے سکوت فرمایا۔ ہر عقلمند بلا ادنیٰ تامل کے یہ جان لے گا کہ اتنے فضائل رکھنے والی ہستی کے متعلق یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے ظالم کے ظلم میں آپ نے اعانت کی ہو۔

ھفوہ (۲) :۔ یہ کہ شیخین رضی اللہ عنہما اہل نفاق میں سے تھے حالانکہ ان کی قوت ایمانی بطریق تواتر ثابت ہے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کو اپنے ساتھ شمار فرمایا ہے۔ کلینی سے باب الامت میں درجات ایمان سے متعلق جو حدیث روایت کی گئی ہے اسمیں تصریح ہے کہ مہاجرین اولین کے ایمان کو تمام امتیوں کے ایمان پر بدرجہا ترجیح ہے۔ پھر جناب کی جو نص نہج البلاغہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں مذکور ہے وہ بھی آپ کے کمال ایمان پر شاہد و دال ہے۔ اور جناب محمد باقر اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا آپ کو صدیق کے لقب سے ملقب کرنا اس ھفوہ کی ریڑھ ہی مار دیتا ہے۔

ھفوہ (۳) :۔ یہ کہ شیخین اصحاب العقبہ میں سے تھے۔ یعنی وہ بارہ منافق جنہوں نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر اثنار راہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کو تنہا پاکر قتل کرنا چاہا تھا۔ عمار بن یاسر اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما اس سازش سے آگاہ ہو گئے اور بروقت مداخلت کر کے ان کی سازش ناکام بنا دی۔

یہ ھفوہ تواتر اور بداہت کے صاف خلاف ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں حضرات کی صاحبزادیاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں تھیں۔ ان کو اس قسم کے کام کے وہاں زیادہ مواقع حاصل تھے۔ پھر ان حضرات کا خانۂ نبوت میں آنا جانا، آپ سے خلوت و جلوت میں ملاقات و یکجائی اتنی مشہور و معروف ہے کہ ضرب المثل ہو گئی ہے۔ اس قسم کے رازدانوں اور جلوت و خلوت کے ساتھیوں کو فرصت و تنہائی کے وقت کی تلاش کی بھلا کیا ضرورت۔ رفیق غار، اور صاحب عریش (بموقعہ جنگ بدر) کو اس کام کی تکمیل کیلئے ان سے اچھے مواقع کب مل سکتے تھے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس کی نظر کتب سیر پر ہو اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شیخین کی صحبت یا ان حضرات سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی الفت و موانست، شفقت و موانست و حمایت معلوم ہو وہ ان حضرات کی نسبت اس قسم کے احتمال کو ہرگز جائز نہیں رکھے گا۔ ان حضرات کے متعلق ایسا احتمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کوئی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا احتمال رکھے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پھر ان شیعوں ہی کی تفاسیر سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت اصحاب العقبہ ہی کی شان میں نازل ہوئی۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۔	اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا۔ اور اسلام لاکر پھر کافر ہوئے۔ اور جو چاہا تھا وہ نہیں پایا۔

اس آیت سے بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ اصحاب عقبہ کا حال دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو توبہ کریں اور عذاب نفاق سے نجات پالیں، یا گناہ پر اصرار کریں تو اس صورت میں دنیا و آخرت میں عذاب کے سزاوار ٹھہریں اور

ان کا کوئی معین ومددگار نہ ہو اور شیعہ اس پر متفق ہیں کہ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ نے اس نفاق سے توبہ نہیں کی۔ تو آیت کی رو سے ان کو عذاب الیم دنیا میں پہنچنا چاہیئے اور ان کو کوئی حامی و ناصر بھی میسر نہ ہونا چاہیئے۔ مگر ان کی پوری زندگی آئینہ کی مانند سامنے ہے۔ انہیں کوئی عذاب نہیں پہنچا، رہا حمایت ونصرت کا معاملہ تو ان حضرات کو جو حمایت ونصرت میسر رہی اس سے کوئی شیعوں کی طرح اندھا ہی انکار کر سکتا ہے اور تاریخ کو جھٹلا سکتا ہے۔

اب ایک طرف کتاب اللہ ہے دوسری طرف شیعہ۔

پوری امت اس پر متفق ہے کہ کتاب اللہ میں جھوٹ کو مطلق دخل نہیں اسکے اندر تو جھوٹ کیا ہوتا کوئی باہر سے بھی اس میں جھوٹ داخل نہیں کر سکتا۔ دوسری امت مسلمہ اس پر بھی متفق ہے کہ شیعہ جھوٹ بولنے، جھوٹ گھڑنے، اور جھوٹ منسوب کرنے میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں نے جھوٹ بولا۔ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اصحاب عقبہ میں سے نہیں ہیں۔

ہفوہ (۴):۔ یہ کہ امام کے محض وجود کو لطف قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالے نے امام مقرر فرما کر لطف کا حق ادا فرما دیا۔ اب اسکو ظاہر کر کے تسلط اور غلبہ دینا یہ لطف کیلیے بالکل ضروری نہیں۔ یہ اتنی کچی بات ہے کہ اس پر ہوشمند تو کیا مکتب کے بچے بھی یقین کرنے کو تیار نہ ہوں گے۔ ذرا کسی مدرسہ کے لڑکوں کو کہیئے کہ تمہارے لیے ایک ایسے استاد کا انتظام کیا گیا ہے۔ جسکو نہ تم دیکھ سکتے ہو نہ اس کی آواز سن سکتے ہو اور نہ ہی وہ تم کو دیکھ سکتا ہے نہ ہی تمہاری آواز سن سکتا ہے پھر جو رد عمل ہو گا آپ کو پتہ ہی چل جائے گا۔

ہفوہ (۵):۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اوصاف خدائی سے متصف کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ اعراض اَیْنَ وَمَتٰی سے پاک ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو بشر نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ امور بداہت عقل کے صاف وصریح خلاف اور اسکو جھٹلانے والے ہیں۔ کسی شیعی شاعر کا ایک شعر ہے

یَجِلُّ عَنِ الْاَعْرَاضِ وَالْاَیْنِ وَالْمَتٰی ۔۔ وَیَکْبُرُ عَنْ تَشْبِیْهِهٖ بِالْعَنَاصِرِ

(وہ اعراض، اور این ومتی سے برتر ہیں اور وہ اس سے بھی بالاتر ہیں کہ ان کو عناصر سے تشبیہ دی جائے)

ایک دوسرا شاعر دوسرے خیال کو یوں نظم کرتا ہے۔

اَهْلُ النُّهٰی عَجَزُوْا عَنْ وَصْفِ حَیْدَرَةٍ ۔۔ وَالْعَاشِقُوْنَ بِمَعْنٰی حُبِّهٖ تَاهُوْا

اِنْ اَدْعُهٗ بَشَرًا فَالْعَقْلُ یَمْنَعُنِیْ ۔۔ وَاَخْشَی اللّٰهَ فِیْ قَوْلِیْ هُوَ اللّٰهُ

(اہل عقل حیدر کی تعریف سے عاجز رہ گئے اور عاشق ان کی محبت میں حیران ہیں)

(اگر ان کو بشر کہوں تو مجھے عقل روکتی ہے۔ اگر ان کو اللہ کہوں تو اللہ سے ڈرتا ہوں)

یہ خیال وعقیدہ غالی شیعوں کے عقائد سے قریب اور کفر وزندیقیت کے سوا کچھ نہیں۔

ہفوہ (۶):۔ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کو جناب علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی پاسداری کے لیے بھیجا تھا۔ وہ درپردہ تمام انبیاء کے ساتھ تھے اور ظاہراً حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور جو اس بات کا انکار کرے انکے مذہب میں اسے کافر کہا جاتا ہے یہ بات ابن طاؤس اور دوسروں نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہے۔

ابن المعلم نے جناب محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ لَوْلَا عَلِیٌّ لَمْ یُخْلَقِ الْاَنْبِیَاءُ (علی اگر نہ ہوتے تو انبیاء پیدا نہ کئے جاتے) یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن علی (رضی اللہ عنہ) کا درجہ سارے انبیاء اور رسولوں سے بلند ہوگا۔ تمام انبیاء اور رسول محبت علی اور آپ کی شیعیت بطور دین مانے ہوئے تھے۔ اور اسکی آرزو رکھتے تھے کہ ان کا حشر بحیثیت شیعۂ علی ہو حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسکے آرزومند تھے یہ بات ابن طاؤس نے ذکر کی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ علی (رضی اللہ عنہ) کا حق خدا تعالےٰ پر ثابت ہے۔ یہ تمام ہفوات اور بکواس ساری آسمانی شرائع اور نصوص قرآنیہ کی تکذیب کرنے والے اور کفر و زندیقیت کی اصل و بنیاد ہیں۔

ہفوہ (۷): یہ کہ قرآن مجید کی تحریف کرتے ہیں اور سیاق و سباق کے خلاف اسکو خلاف مراد معنی پر محمول کرتے ہیں حتی کہ جاہل نا عاقل اسکو نشانہ مذاق بناتا ہے۔ اس فرقہ کی تمام تفاسیر اسی قماش کی ہیں۔

بطور نمونہ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) صِرَاطَ مُسْتَقِيْمٍ۔ کے متعلق کہتے ہیں اس سے حب علی۔ مراد ہے

(۲) اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ سے مراد علی و اولاد علی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔

یہ دونوں تفسیریں نہ صرف یہ کہ نظم قرآن سے کوئی ربط نہیں رکھتیں باہم بھی ایک دوسرے کی تکذیب کرتی ہیں۔

(۳) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ سے مراد عشرہ مبشرہ (رضوان اللہ علیہم) کے لوگ آدمی ہیں۔

(۴) جہاں کہیں لفظ ربک کا آیا ہے وہاں علیؓ مراد ہیں حتی کہ آیت اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ میں بھی گویا علی رضی اللہ عنہ کو روز جزا کا مالک بھی قرار دیتے ہیں یہ پہلے بھی باب مکائد میں بیان ہو چکا ہے۔ عنقریب پھر بیان ہوگا۔

(۵) وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا۔ (یعنی کافر اپنے پروردگار پر دلیر ہے) کی تفسیر ای فی اخذ الخلافۃ (یعنی خلافت لینے میں) کرتے ہیں حالانکہ یہاں کافر سے مراد بت پرست ہیں اس سے پہلے کی عبارت اسکی دلیل ہے۔ فرمایا وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ (اور اللہ کے سوا ایسی ہستیوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان)

(۶) یہ بھی کہتے ہیں کہ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ سے مراد شرکت فی الخلافۃ مع علی غیرہ ہے۔ (یعنی تم خلافت میں علی کے غیر کو شریک کرتے ہو اس لیے تمہارے اعمال حبط و ضائع ہو جائیں گے) لیکن انکو اتنا معلوم نہیں کہ اس آیت کا کچھ اول بھی ہے وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (آپ کی طرف اور جو آپ سے قبل گذرے وحی بھیجی گئی۔ کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع و بے کار جائینگے) اس میں خلافت علی میں غیر کی شرکت کہاں گھس آئی کہ اس سے نہی ہو۔ اور اگر نہی تھی ہی تو پھر دوسروں کو خلیفہ کیوں کیا۔ اور اگر صرف ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا حال تمام انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی پہنچا تھا تو اس منادی کی کیا ضرورت تھی۔ پھر آیت کا سیاق بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ہے اور سباق قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ اور یہ سیاق و سباق کی دونوں آیات صاف بتا رہی ہیں کہ شرک سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے اور یہ قاعدہ و اصول شیعوں کے ہاں بھی طے کردہ و تسلیم شدہ ہے کہ شارع کے کلام میں جب کوئی لفظ آئے تو شرعی معنی پر

حصول ہوگا۔ لغوی معنی یہ نہیں ہوگا خصوصاً جبکہ لغوی معنی ضمیر کا بھی محتاج ہو۔ جس کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔
(۷) یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ میں سلطان سے مراد جناب علی رضی اللہ عنہ کی صورت ہے یعنی جب فرعون حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کو کوئی اذیت پہنچانا چاہتا فوراً اسے علیؓ کی صورت دکھا دی جاتی وہ سہم کر رہ جاتا۔ حالانکہ قرآن مجید میں غلبہ کو آیات سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور آیات جمع کا صیغہ ہے کم از کم دو آیات تو ہونی چاہئیں اور صورت علی تو ایک ہی آیت ہوگی (اگر ہوئی بھی تو) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آیات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں کہیں ان کا قصہ بیان فرمایا ہے وہی معجزات پر اکتفاء فرمایا ہے۔ عصاء اور ید بیضا جیسا سورۃ طٰہٰ میں مذکور ہے تو آسان نشانی کا ذکر اور اکبری نشانی کو نشانیوں کے شمار میں نظر انداز کر دینا شان بلاغت کے خلاف ہے۔
اور پھر یہ کیا بات ہوئی کہ فرعون تو صرف آپ کی تصویر سے سہم اور ڈر جاتا تھا مگر جناب ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پھر آپؐ کے جیتے جاگتے جسم حقیقی نے اتنا بھی اثر نہ کیا کہ اسکے دیکھنے سے ان کے مزاج میں کچھ نرمی ہی آجاتی۔
(۸) یہ کہتے ہیں کہ يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ الآیہ میں رب سے مراد علیؓ ہیں۔
(۹) یہ قائل ہیں کہ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ میں انس وجن سے علی کے شیعہ مراد ہیں کیونکہ ان سے کسی گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا علی کی ولایت انکے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیگی اور جب گناہ رہے ہی نہیں تو سوال کس بات کا ہوگا ابن بابویہ، ابن طاؤس اور دوسروں نے اسکو بیان کیا ہے۔ مگر یہ عالم وفاضل، ایک تو یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ سیاق نفی میں انس وجان نکرہ ہے اور وہ عام الفاظ میں سے ہیں ان سے شیعان علی کی تخصیص کے کوئی بنیاد اور وجہ نہیں دوسرے یہ کہ کیا شیعہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی محرمات سے زنا اور اپنے لخت جگر یا شریک دودھ سے اغلام بازی کرے۔ نیز ساری زندگی شراب نوشی خنزیر خوری اور سود کاری جھوٹ وغیبت میں گذارنے کے باوجود پرسش سے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ یہ اعمال بد ان کے لیے نماز روزہ ودیگر عبادات واعمال صالحہ کی طرح موجب اجر وثواب بھی ہوں گے اگر وہ ایسا ہی خیال کرتے ہیں تو یہ تو اباحیوں اور زندیقیوں کا مذہب ہوا۔ بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے۔ کیونکہ وہ لوگ ان امور کو مباح خیال کر کے ان کے ارتکاب پر عذاب کا خوف نہیں رکھتے۔ اور یہ شیعہ تو عذاب کے خوف سے ہی مامون نہیں بلکہ ان خباثتوں اور نجاستوں اور بداعمالیوں پر اجر وثواب کی امید رکھتے اور ان بدکاریوں کو عبادت جانتے ہیں۔
(۱۰) یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں صبر کا حکم اور صابرین کی تعریف بیان ہوئی ہے۔ ان سب سے مراد، شیعہ اور انکا وہ صبر مراد ہے جو یہ جناب مہدی کے آنے تک مخالفین کے ہاتھوں تکلیفیں اور مصائب اٹھائیں گے
ان مذکورہ تفاسیر سے اگر کوئی شیعہ انکار کرے تو اسے یہ تمام تفسیریں شیعوں کی اصح الکتب کلینی میں موجود ملیں گے۔ وہاں وہ دیکھ سکتا ہے اسکے علاوہ ان کو تفسیر علی بن ابراہیم۔ اور تفسیر ابن بابویہ جسکو یہ جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتا ہے نیز شریف مرتضی کی کتاب تنزیہہ الانبیاء والائمہ کے مطالعہ کی اگر توفیق مل جائے تو وہاں یہ سارے حوالے ان کو موجود ملیں گے۔
هفوه (۸) یہ کہ روز جزا کے مالک وحاکم حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور جناب علیؓ ہوں گے اس خیال خام کی تردید

قرآن مجید میں جا بجا ملتی ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ وغیرہ وغیرہ اسکی مثالیں ہیں۔ اگر یہ حضرات حاکم ہوں تو شفاعت بے معنی ہو جائیگی امت کو پھر خوف و خطر کیوں ہو گا اور یہ حضرات خود ان کو کیوں ڈرائیں گے ایک بات لائق توجہ یہ بھی ہے کہ ان شیعوں کے نزدیک حساب کتاب، وزن اعمال، سوال وغیرہ جو روز قیامت کی ہولناکیاں ہیں شیعوں کو توان سے سابقہ پیش ہی نہیں آئے گا یہ سب تو غیر شیعوں کیلیے مخصوص ہیں۔ وہ تو برملا کہتے ہیں کہ علی کو دوست رکھنے والا خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی یا ہندو مشرک دوزخ میں نہیں جائیگا۔

علل الشرائع ابن بابویہ کی ایک کتاب ہے اس نے اسمیں یہی بات لکھی ہے۔ اس نے اس روایت کو بحوالہ مفضل بن عمر جناب ابی عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے معانی الاخبار میں بھی یہ روایت موجود ہے اور شیعہ اعتقاداً اس مسئلہ کو متواتر سمجھتے ہیں اس صورت میں حب علی کے مقابلہ میں نہ خدا و رسول پر ایمان کی کوئی حیثیت ہے نہ تمام عقائد اور تکلیفات کی ضرورت اور تمام حدود اور ساری تعزیرات ساقط اور القط ہو جاتے اور امور شریعت میں کوئی شرعی امر ضروری نہیں رہتا۔

یہ ہفوہ بے شمار فسادات کی بنیاد اور اصل ہے۔ ایسے ہفوات پر اعتقاد رکھنے کے بعد تو اثنا عشریوں کو چاہیئے کہ اپنے مذہب کو حمیریہ معتریہ کہا کریں۔ کہ اعتقادات کی ہمرنگی کا یہی تقاضہ ہے۔

ہفوہ (۹):۔ کہتے ہیں کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حیلوں بہانوں سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا۔ چنانچہ علی بن منظاہر واسطی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی بیان کر ڈالی ہے حالانکہ جناب فاروق اعظم کا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ خصوصی لگاؤ دلی محبت عزت و احترام اور توقیر سسرال ہو جانے پر فخر، عطایا کے رجسٹر میں آپ کی حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی فضیلت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی روایات خود ان شیعوں کے ہاں بتواتر ثابت ہیں اور نہج البلاغہ کے شارحوں نے جو اکثر شیعہ ہیں ان سب کو اپنے شرحوں میں لکھا ہے۔

اور شریف مرتضی (شیعی) کی کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعریف ان الفاظ میں موجود ہے۔

اِنَّ عُمَرَ كَانَ مُظْهِرًا لِلْاِسْلَامِ وَالْمُتَمَسِّكَ بِشَرَائِعِهٖ كَانَ	بے شک عمر اسلام کو ظاہر کرنے والے اور تمام احکام اسلام پر عمل کرنے والے تھے۔

ایسے اوصاف سے متعلق شخص کے متعلق کوئی فاتر العقل ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ اپنے دوست، مشیر، دست و بازو، محب اور خسر کو جو باپ کے درجہ کا ہوتا ہے قتل کرنے کی تدبیر کرے گا۔

ہفوہ (۱۰):۔ کہتے ہیں کہ جو شخص فلاں فلاں پر ستر بار لعنت کرے تو اسکو ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا ستر گناہ محو کر دیئے جائیں گے۔ اور جنت کے ستر درجے اسے الاٹ کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ابو جعفر طوسی نے بحوالہ جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ مختلف روایات کے ضمن میں اسکا ذکر کیا ہے۔ یہ ایسا سفید جھوٹ ہے کہ سارے مذاہب و شرائع اپنے اپنے انداز میں اسکی تردید رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ بروں کو بھی برا کہنا کسی شریعت میں ثواب کا موجب نہیں

بروں اور بدوں کا سردار شیطان ہے مگر اسکو برا کہنا بھی نیکی میں شمار نہیں ہوتا۔ آپ صبح سے شام تک اس پر لعنت کریں گے تو بھی آپ کے نامۂ اعمال میں ذرہ بھر نیکی نہیں لکھی جائیگی (اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کیلئے عموماً اور شیعوں کیلئے خصوصاً جناب اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر پیش کرتا ہوں شاید کسی کی آنکھ کھل جائے ؎
نئی ترکیب شیطاں نے نکالی ہے یہ اغوا کی ×× خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھکو برا کہئے۔ شیعہ علماء کا ھفوہ بالا بھی شیعی عوام کیلئے شیطانی اغواء سے کم نہیں۔ ان محترم ہستیوں پر لعنت سے انکا تو کچھ بگڑتا نہیں البتہ شیعوں کی اپنی عاقبت یقیناً خراب ہوگی۔ ن)

بطریق صحیح جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے اپنے رفقاء کو جب اہل شام کو گالیاں بکتے سنا تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم گالیاں بکنے والے ہو (بحوالہ نہج البلاغہ) نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کو خدا کی حمد وثنا اور ذکر سے افضل کہتے ہیں چنانچہ احول کے ذریعہ متعدد طرق سے جناب صادق کی روایات ملتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو اکبر فرمایا ہے وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ مگر یہ احول وہ ہے جس نے بار بار جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ پر جھوٹ باندھا ہے اور آپ نے اسے افتراء پرداز اور جھوٹا کہا ہے لیکن اسکا کیا کیجائے کہ شیعہ مذہب کی بنیاد ہی جھوٹ دجل اور فریب پر رکھی گئی۔ اور وہ ہی آجتک اسکو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔

ھفوہ (۱۱) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کراماً کاتبین کو یہ حکم دیدیا ہے کہ قتل عمرؓ کے یوم سے تین دن تک لوگوں کے نامۂ اعمال نہ لکھے جائیں۔ نہ کسی کا گناہ درج کیا جائے یہ روایت علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحٰق قمی سے اس نے جناب حسن عسکری سے انہوں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جس میں حکایت اب بیان ہورہی ہے یہ روایت افتراء اور جھوٹ پر مبنی ہے یہ نہ صرف اصول شریعت کے خلاف ہے بلکہ متواتر روایات کو بھی جھٹلانے والی ہے۔ اس روایت کو ماننے والا ذرا غور کرکے بتائے کہ ایک شخص قتل عمرؓ کے یوم بالغ ہوا اور تین دن تک قابل تصور اور ناقابل تصور سارے ہی کبیرہ گناہ کا دھڑلے سے ارتکاب کرتا رہا جسمیں محرمات کے ساتھ زنا، اغلام، شراب نوشی، قتل، بت پرستی، چوری اور جناب علی رضی اللہ کا سب وشتم سب ہی کچھ شامل ہے۔ اور وہ تین دن کے میعادی وقفہ میں انتقال کرگیا۔ اب وہ بغیر حساب جنت میں چلا جائے۔ تو کیا روایت بالا کے مطابق درست ہوگا۔ اگر کسی میں رمق بھر عقل اور صحیح دینداری ہوگی وہ اس روایت کے باطل ہونے پر کوئی شک نہیں کریگا۔

ھفوہ (۱۲) :- کہتے ہیں کہ تیمی اور عدوی نام کے دو بت تھے اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما خدا کو چھوڑ کر ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ابان بن عیاش اور دوسروں نے سلیم بن قیس ہلالی سے یہ روایت کی ہے اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگائی گئی ہے۔ جناب فصل تعصبات میں اس ھفوہ کی برائی بیان کی گئی ہے۔

ھفوہ (۱۳) کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطاب کے صلبی فرزند نہ تھے بلکہ ولد الزنا تھے۔ حالانکہ اوروں کو چھوڑئے خود امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے نیز دیگر ائمہ نے سینکڑوں مرتبہ ان کو "ابن الخطاب" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ امہات المومنین میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ دوسری طرف امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ گویا آپ نبی محترم کے خسر ہیں تو علی مکرم کے داماد اور حب علی کے بدبخت دعویدار اس سے بالکل نہ شرمائے کہ علیؓ

پھر یہ الزام لگائیں کہ انہوں نے ولد الزنا کو داماد بنالیا۔
سارے امامیہ کا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے نسب کے انکار پر اتفاق ہے ان کے علماء النساب کی کتابوں میں اسکو لکھا بھی ہے ان میں حمید الدین نخعی صاحب بحر الانساب بھی ہے۔ اور حسن بن سلمان العذری اپنی ملتقطات میں اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

ھفوہ (۱۴) :۔ کہتے ہیں کہ ہر سال موسم حج میں فرشتے جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی قبور سے زندہ کر کے منیٰ میں لاتے ہیں اور رمی جمار کی جگہ ان کو سولی پر چڑھاتے ہیں۔ ابوالحضر نے اپنے باپ دادا کے حوالے سے جناب محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان کی ہے۔

یہ ہفوہ بھی شیعی کذب و افتراء کا شاہکار ہے۔ اور ائمہ کو بدنام کرنے کی ناپاک سعی یا پھر پاگلوں کی بڑ ہے اس لیے کہ دار الجزاء تو آخرت ہے دنیا تو نہیں۔ یہ ہفوہ خلاف نقل ہونیکے علاوہ عقل وحس کے بھی خلاف ہے یہ لاکھوں حاجی ہر سال حج کیلیے منیٰ میں تین چار دن قیام کرتے ہیں الکو کہیں نہ سولی گڑی دکھائی دیتی ہے نہ کہیں کوئی لٹکا ہوا نظر آتا ہے آخر یہ شیعہ ذہنی سولی کس کو دیتے ہیں (میرے خیال میں ان ایام میں یہ خود کو سولی پر لٹکا ہوا محسوس کرتے ہیں اور اس وقت یہ اپنا نام ابوبکر و عمر رکھ لیتے ہونگے۔ ن)

اگر یہ کہیں کہ حجاج کو دکھانا منظور نہیں تو ہم کہیں گے کہ آخر عذاب قبر میں کونسی کمی تھی کہ فرشتے ان کو قبروں سے نکالتے اور بازار منیٰ میں لاتے ہیں اگر حاجیوں کو عبرت دلانا اور خود انکو اپنی تذلیل و رسوائی سے آگاہ کرنے کا مقصد تھا اور وہ کسی نے دیکھا نہیں تو ساری تگ و دو لاحاصل، عبث اور لغو ثابت ہوئی اور اللہ تعالیٰ عبث سے پاک ہے یہ بات شیعہ عقائد میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

ھفوہ (۱۵) :۔ کہتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفر ہجرت میں اسلیے ساتھ لیا تھا کہ کہیں قریش مکہ کو سمت سفر سے مطلع نہ کر دیں کہ آپ کس طرف تشریف لے گئے۔ اس ہفوہ پر ہر شیعہ خود بغلیں بجانا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے ورنہ یہ اتنا ظاہر البطلان ہے کہ تردید کی مطلق حاجت نہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو یہ کہتے ہیں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت تھی کہ موسم گرما کی دوپہر ان کے گھر تشریف لے جا کر ارادہ ہجرت سے مطلع فرماتے اور مشورہ طلب فرماتے کہ کب و کس طرح نکلنا چاہیئے، زاد راہ اور سواری ان سے کیوں لیتے، سفر کا کھانا اور ناشتہ ان کے گھر سے ان کی صاحبزادی سے تیار کرایا۔ پھر ابوبکر ہی کے چیلے عامر بن فہیرہ کو راہ نما کی حیثیت دی سواری کے اونٹ اسکے حوالے کئے انہیں ابوبکر کے بڑے بیٹے عبداللہ (رضی اللہ عنہما) کو حالات کے تجسس اور خبر گیری کے لیے اور قریش کی تجویزوں و خبروں سے آگاہی کیلیے ہرکارہ مقرر کیا۔ اور پھر اللہ تعالےٰ نے کیوں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فکرمندی اور غم کو اور آنحضرت صلے اللہ کا ان کو معیت کا گہرا راز فشار کرتے ہوئے تسلی و دلاسہ دینے کو حکایتاً بیان فرمایا اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا اس ہفوہ سے شیعوں کی اس اندرونی کھولن اور بھڑکتی ہوئی آتش عداوت کا پتہ چلتا ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس عزت و فضیلت کے سبب ہے جو آپ کو اس سفر صحبت و رفاقت میں میسر آئی۔ جس کا ذکر رہتی دنیا تک قرآن مجید میں محفوظ ہو گیا وہ چاہتے ہیں ہفوے اڑا اڑا کر جھوٹ اور افتراء بازی کر کر کے اس فضیلت میں کیڑے نکالیں مگر بے سروپا محض خیالی

تکے سے تمام واقعہ، اسکے پس منظر پیش منظر مالہٗ وماعلیہ کو یہ کیسے جھٹلا سکتے ہیں اسکے تو ہر ہر رخ اور ہر ہر پہلو سے ان کے بکواس کی تردید اور انکی ذلت میں اضافہ پر اضافہ ہوگا۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ ایسے ہی موقع کیلیے فرمایا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملا عبداللہ مشہدی مصنف اظہار الحق نے اس قصہ اور آیت کا بڑی کاوش اور باریک بینی سے جائزہ لیکر مجبوراً یہ منصفانہ رائے ظاہر کردی ہے کہ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ احتمال (جو شیعوں نے بیان کیا ہے) حقیقت سے بہت دور ہے (یعنی شیعوں کا یہ بیہودہ غلط در غلط ہے) اسمیں تعجب کی کیا بات ہے کہ آپ خلیفۂ اول کو اپنی رفاقت و ہمراہی کیلیے چن لیں جن کو سسر ہونے کی نسبت بھی حاصل تھی۔ اور لوگوں سے ایمان و اسلام میں سبقت لے جانے کی برتری بھی آپ کو نصیب تھی اور اکثر اوقات رسالتماب صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں موجود رہتے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کی صحبت سے دل بستگی محسوس ہوئی ہو (کلام ملا بجنسہٖ تمام ہوا) قاضی نوراللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں اس بحث کی رکاکت کی تصریح کی ہے والحمدللہ۔ مفسر نیشاپوری نے کہا ہے۔

ثُمَّ اِنَّا لَا نُنْکِرُ اَنَّ اِضْطِجَاعَ عَلِیٍّ عَلٰی فِرَاشِہٖ طَاعَۃٌ وَفَضِیْلَۃٌ اِلَّا اَنَّ صُحْبَۃَ اَبِیْ بَکْرٍ اَعْظَمُ لِاَنَّ الْحَاضِرَ اَعْلٰی مِنَ الْغَائِبِ وَلِاَنَّ عَلِیًّا مَا تَحَمَّلَ الْمِحْنَۃَ اِلَّا لَیْلَۃً وَّاحِدَۃً وَّاَبُوْبَکْرٍ مَکَثَ فِی الْغَارِ اَیَّامًا وَاِنَّمَا اخْتَارَ عَلِیًّا لِلنَّوْمِ عَلٰی فِرَاشِہٖ لِاَنَّہٗ کَانَ صَغِیْرًا وَلَمْ یَظْہَرْ مِنْہُ دَعْوَۃٌ بِالدَّلِیْلِ وَالْحُجَّۃِ وَلَا جِہَادٌ بِالسَّیْفِ وَالسِّنَانِ بِخِلَافِ اَبِیْ بَکْرٍ فَاِنَّہٗ دَعَا جَیْشَ جَمَاعَۃٍ اِلَی الدِّیْنِ وَقَدْ ذَبَّ عَنِ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالنَّفْسِ وَالْمَالِ وَکَانَ غَضَبُ الْکُفَّارِ اَشَدَّ مِنْ غَضَبِہِمْ عَلٰی عَلِیٍّ وَلِہٰذَا لَمْ یَقْصُدُوْا عَلِیًّا بِضَرْبٍ وَّاَلَمٍ لَمَّا عَرَفُوْا اَنَّ الْمُضْطَجِعَ ہُوَ انتہٰی۔

پھر ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ علیؓ کا آپکے بستر پر سونا فضیلت وطاعت ہے مگر صحبت ابوبکرؓ اس سے بڑھکر ہے کیونکہ حاضر بمقابلہ غائب بلند مرتبہ ہوتا ہے اور اس لیے کہ علیؓ نے صرف ایک رات تکلیف برداشت کی مگر ابوبکرؓ غار میں کئی دن ٹھہرے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کیلیے اس لیے انتخاب فرمایا تھا کہ آپ ابھی بچے تھے آپ نے نہ ابھی دلیل وحجت سے دعوت دینی شروع کی تھی نہ تلوار اور بھالے سے بخلاف ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے ایک جماعت کو دین کی طرف بلایا تھا اور جان ومال کی بازی لگاکر رسول کو بچایا تھا۔ کفار کا غیظ وغضب علیؓ کی نسبت ابوبکرؓ پر زیادہ تھا اسی لیے جب انہوں نے دیکھا کہ سونے والے وہ ہیں تو انہوں نے علیؓ کو مارنے یا تکلیف پہنچانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

ھفوہ (۱۶):۔ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن فلاں عورت کے بدن کی کھال اصحاب کہف کے کتے کی کھال سے بدل جائے گی۔ دراصل باتوں اور روایتوں میں حسب مرضی کانٹ چھانٹ اور کتربیونت اس فرقہ کی پرانی عادت اور شرارت ہے یہ الفاظ دراصل بلعم باعورا کی نسبت آئے ہیں وہ ان کے نزدیک سزا کا سزاوار نہ قرار پایا تو روایت میں اصلاح کے طور پر تحریف وتصرف کرکے اس قسم کی روایت کی یہ ان کا پرانا پیشہ اور عادت ہے کہ یہ ان کافروں کا بھی پاس کرتے اور ان کو برائی سے یاد نہیں کرتے جنکے کفر پر اللہ ورسول کے کلام میں صراحت وارد ہوتی ہے اور جنہوں نے اللہ ورسول سے انتہائی دشمنی اور عداوت برتی اور جنکی بدبختی اور بدانجامی پر قرآن مجید گویا ہے اور نہ انکی بدحالی

کو یہ کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں جو سزائیں وارد ہیں انکو انکے مرتبہ سے زیادہ جان کر خلفاء رسول اور ازواج رسول کے حق میں یہ روایت کرتے اور چسپاں کرنے کی ناپاک جسارت کرتے ہیں۔ اور یوں قرآن و حدیث کی تحریف اور ان میں تصرف کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں اور ان کا حال اس بے وقوف کا سا ہے جسنے بعض قرآنی آیات کی اصلاح کی تھی کہ اسنے جب پڑھا وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهٗ۔ یا۔ وَخَرَّ مُوْسٰى۔ تو یوں اصلاح کی وَعَصٰى مُوْسٰى رَبَّهٗ۔ وَخَرَّ عِيْسٰى۔ اور کہنے لگا کہ عصا موسی علیہ السلام کا تھا نہ کہ آدم علیہ السلام کا اور خر (گدھا) تو عیسی علیہ السلام کا تھا نہ کہ موسی علیہ السلام کا۔ اس ہفوہ کی تردید کیلیے قرآن کی یہی آیت کافی ہے کہ۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔	اے اہل بیت اللہ تعالے چاہتا ہے کہ تم سے نجاست اور گندگی دور فرما کر تم کو طاہر و مطہر کر دے۔

اور کتے کی کھال گو وہ اصحاب کہف ہی کا ہو نجس ہے۔

یا یہ آیت۔ اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبَاتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ۔ یا یہ آیت۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ۔ جب ازواج کی تبدیلی دوسری ازواج سے بھی جائز نہ رہی تو ازواج کی تبدیلی ناپاک و نجس کتے سے کیسے جائز ہوگی۔

اس ہفوہ میں ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے آیت ذیل کے مضمون کو خود اپنے اوپر کس طرح چسپاں کر لیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔	جو لوگ اللہ و رسول کو اذیت دیتے ہیں (خواہ عمل سے خواہ باتوں سے) انکے لیے دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور انکے لیے بڑا دردناک عذاب تیار ہے۔

اور یہ اس لعنت ہی کا اثر ہے کہ وہ یہ وعید دیکھ، پڑھ اور سنکر بھی اسی پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنی حرکات شنیعہ سے باز نہیں آتے اپنا ایمان برباد کرتے اور اللہ و رسول کو اذیت دینے والے اعمال و عقائد سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ھفوہ (۱۷): ۔ کہتے ہیں کہ زمین کا وہ حصہ جو کسی معصوم کے بدن سے چھو جائے کعبہ مکرمہ سے ہزار درجہ بہتر ہے یہ بات ان کے شیخ مقتول نے دروس میں بیان کی اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے۔

اس ہفوہ کا باطل و غلط ہونا بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ اسکو مان لینے سے لازم آئے گا کہ یہود و نصاری کے کنیسے، رہبان کے معبد، دیر، مجوس کے آتش خانے اور بتوں کے استھان جہاں کسی معصوم کا گذر ہوا ہو خصوصا کوفہ و صفین کے درمیان کی منزلیں کعبہ مکرمہ سے بہتر ہوں۔ بلکہ خلفائے عباسیہ کے وہ گھر جہاں ائمہ معصومین نظر بند رہے کعبہ سے ہزار درجہ افضل ہوں۔ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا وہ گھر جہاں یزید پیدا ہوا اور جسمیں ایک مرتبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عیادت کیلیے تشریف لے گئے کعبہ مکرمہ سے ہزار درجہ بہتر ہو۔ تف ہے ان ہفوہ بازوں پر کہ وہ نہیں سوچتے کہ ان کے زبان و قلم سے کیا نکل رہا ہے۔

ھفوہ (۱۸) ایک طرف تو یہ خود اقراری ہیں کہ صاحب امر حقیقی بادشاہ امام معصوم مہدی منتظر ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ سزائیں مقرر کرے یا سزائیں نافذ کرے لوگوں کے جھگڑے نمٹے چکائے جمعہ و جماعت

قائم کرے جہاد کا حکم دے۔ اور جو ان کی اجازت کے بغیر ان امور میں دخل دے وہ فاسق ہے اور نافرمان۔
پھر دوسری طرف خود ہی کہتے ہیں کہ، امام معصوم، کی غیر موجودگی میں امور شرع اس مجتہد کی ذمہ داری ہیں جو اپنے اندر نیابت تک کی شرائط رکھتا ہو۔ یعنی جو اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا ہو اور اسکے زمانہ میں اس سے بڑا کوئی عالم نہ ہو تو وہ جہاد کے علاوہ ہر بات میں امام کا نائب ہے۔ یہ مسئلہ امامیہ کا متفقہ اور اجماعی ہے۔ اس میں پہلی بات تو یہ کہ اہل سنت پر جو یہ طعن کرتے تھے، وہ کہاں گیا۔ کہ یہ لوگ بغیر نص کے اپنے اجماع سے رسول کا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اور یوں دین پیغمبر میں تصرف کرتے اور دخل دیتے ہیں، اب یہ کس نص اور دلیل سے اپنے امام کا نائب مقرر کرتے ہیں۔ دوسری بات قابل قباحت و خلش یہ کہ انکے پاس وہ کونسا پیمانہ اور ذرائع ہیں جس سے یہ معلوم کریں گے کہ شرق و غرب پوری دنیا میں موجود علماء وقت میں کون سب سے بڑا عالم ہے عملی طور پر یہ کام جتنا مشکل و محال ہے سب پر ظاہر ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ان کے وہ بعض علماء جنکے اجماع پر یہ اعتماد رکھتے ہیں اور جنکو انہوں نے اپنے ہاں امام کا درجہ دے رکھا ہے اور انکے امر و نہی سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں۔ مثلاً ابن بابویہ، ابن المعلم، سید مرتضیٰ، ابن مطہر حلی، شیخ مقتول، وغیرہ وغیرہ ان کا اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ عالم ہونا کسی بھی جہت سے ثابت نہیں۔
اب دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب نیابت امام کی شرط اعلم ہونا ٹھہری اور اسکا معلوم ہونا محال و مشکل ہے تو لامحالہ دو صورتیں ہوں گی یا تو احکام شرعیہ بغیر عمل معطل پڑے رہیں گے یا امام معصوم، کے فرمان کے خلاف عمل ہوگا یہ ایسا ضغطہ اور آفت ہے جس سے ان کا نکلنا محال ہے۔

ھفوہ (۱۹) :۔ یہ کہ وقت محدود کے علاوہ دیگر اوقات میں جہاد کو فاسد اور معصیت خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید اور احادیث رسول بطریق تواتر جہاد کی ہمہ وقت فضیلت پر صاف طور پر گواہ ہیں۔ معمولی عقل والا بھی یہ کہے گا کہ وجوب جہاد کا سبب جب دشمنوں کا دفعیہ اور اسلام کا بول بالا قرار پایا تو جب تک دشمن موجود اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ضرورت ہے جہاد جاری رہے گا ان ہر دو اسباب کے ہوتے ہوئے جہاد نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا پکے ہوئے پھوڑے سے مواد نہ نکالنا۔ اور اعضائے رئیسہ کے کمزور ہونے کے باوجود قوت کی دوا استعمال نہ کرنا۔

ھفوہ (۲۰) یہ لوگ قرآن کو مُنزّل نہیں مانتے بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تحریف کردہ خیال کرتے ہیں یہ اپنے عقیدہ پر ہی جمے رہتے تو کسی بات پر تو ثبات و استقامت کی انکے ہاں مثال مل جاتی اس عقیدہ کے باوجود یہ خود ہی اپنے ائمہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ اسی قرآن کو نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور بہ نیت ثواب اسی قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اسکی آیات کو احکام شرعیہ کیلئے دلیل ٹھہراتے تھے۔ غضب بالائے غضب یہ کہ ان کے پاس بھی قرآن منزل موجود نہیں اور سارے امامیہ اسی تحریف شدہ، کلام اللہ کی تلاوت کرتے اور اپنے مردوں کو اسی کا ایصال ثواب کرتے ہیں۔ اگر وہ عقیدہ ہے تو یہ خلاف عقیدہ لغو حرکت کیوں۔

ھفوہ (۲۱) :۔ یہ کہتے ہیں کہ دَآبَّةُ الْاَرْضِ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اللہ انہیں جہنم رسید کرے کتنے بے ادب ہیں۔ آیت وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً الْاَرْضِ۔ کی تفسیر کلینی نے یہی بیان کی ہے۔ اور افتراء و تہمت کے لیے جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا کندھا تلاش کیا ہے اور ان کے حوالہ

سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہلوایا انا الدابۃ الارض التی تکلم الناس (میں ہی وہ زمینی چوپایہ ہوں جو لوگوں سے بات کرتا ہے) حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور پر مذکور ہے۔ کہ دابۃ الارض کے خروج کا وقت قرب قیامت کا زمانہ ہے اور لوگوں پر ہلاکت و مصائب ٹوٹ پڑنے کا وقت ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا زمانہ اس سے سینکڑوں سال مقدم ہے اور آپ کی واپسی کا زمانہ بمطابق عقیدۂ امامیہ امام مہدی کا وقت ہے۔ اور ابھی تو قیامت میں عرصہ دراز کا بعد ہے۔

ھفوہ (۲۲) :۔ اپنی لونڈیوں، کنیزوں اور بیویوں کی شرمگاہوں کو مہمانوں، دوستوں کو بحق دوستی و میزبانی بطور عاریت سپرد کرنا بہترین عبادت خیال کرتے اور او نچے درجہ کی طاعت جانتے ہیں۔ اور اس پر اجر جزیل کی روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ رقعہ مزورہ کے راقم ابن بالویہ نے حضرت صاحب الزمان سے رقعہ نقل کیا ہے جس کے پڑھنے سے ہر شریف مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوتے اور سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ مگر اس طائفہ ملعونہ کی بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو، کہ اس قدر گندے اور شرافت و پاکبازی سے عاری خیالات ایسے نفوس قدسیہ عالی مرتبت حضرات کی طرف منسوب کرتے اور ذرا نہیں شرماتے۔

ھفوہ (۲۳) :۔ یہ عورتوں کے متعہ کو بہترین عبادت اور افضل طاعت خیال کرتے ہیں۔ تفسیر فتح اللہ میں آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً۔ کے ذیل میں بحوالہ ابن بابویہ جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ یہ روایت مذکور ہے۔ کہ کوئی خالصتاً لوجہ اللہ کسی عورت سے متعہ کرے تو اس سے جو بات یا اس کے ساتھ جو حرکت بھی کرے اسے اللہ تعالیٰ اسے ایک نیکی عطا فرمائے گے اور اگر اس سے ہمبستری کرے تو حق عز اسمہ اسکے تمام گناہ معاف فرما دے گا اور جب غسل کرے گا تو ہر بال کے عوض جس پر پانی بہے اسکی مغفرت کرے اور رحمت برسائے گا۔ لہذا اس روایت کے بموجب النسان کے لیے عمر بھر میں ایک مرتبہ متعہ کرنا گناہوں کی معافی کیلیے کافی ہے۔ تفسیر مذکور میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہ جو دنیا سے بغیر متعہ کئے چلا گیا ہو تو قیامت میں بگڑی صورت اور کریہہ المنظر بنا ہوا اٹھے گا۔ اس شخص کی طرح جس کی ناک کاٹ دی گئی ہو۔

معاذ اللہ! ثم معاذ اللہ! کیا اس روایت کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمہ رحمہم اللہ جنہوں نے بالاجماع متعہ نہیں کیا۔ زد نہیں پڑتی اور کیا وہ اس ذلت میں گرفتار قرار نہیں پاتے۔

اسی تفسیر میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا جو ایک بار متعہ کرے اسکا درجہ حسین رض کے برابر ہو گا۔ جو دو مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ حسن رض کے درجہ کے برابر ہو گا اور جو تین مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ علی رض جیسا ہو اور جو چار مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) جیسا ہو۔ یہ روایت سنکر ایک لطیفہ گو کہنے لگے کہ اس روایت میں ایک کمی رہ گئی۔ آخر میں یہ اضافہ ہونا چاہیئے تھا کہ جو پانچ مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ اللہ تعالےٰ جیسا ہو گا تا کہ متعہ کی عظمت و شان پورے طریق پر ثابت ہو جاتی۔

اسی تفسیر میں جناب سلمان فارسی جناب مقداد جناب اسود کندی اور جناب عمار یاسر رضی اللہ عنہم سے روایت مذکور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ اٹھے اور ایک پر اثر تقریر فرمائی۔ اسکے بعد فرمایا لوگو میرے بھائی جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پاس ایک تحفہ

لائے ہیں اور وہ مومن عورتوں سے متعہ کرتا ہے۔ مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو یہ تحفہ نہیں بخشا گیا۔ میں تم سے کہتا ہوں یہ میری سنت ہے میرے زمانے ہی میں نہیں میرے بعد بھی جو اسے قبول کرے، اس پر عمل پیرا ہو وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے۔ اور جس نے میرے اس حکم کی مخالفت کی اس نے گویا خدا سے مخالفت کی جان لو کہ اہل مجلس میں سے جو میری مخالفت کرے اور میرے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے اسکو باطل ثابت کرے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ دوزخی ہے اس پر خدا کی لعنت ہو جو میری مخالفت کرے کیونکہ اس نے جس نے انکار کیا تو گویا اس نے میری نبوت کا انکار کیا اور خدا کی مخالفت کی اور جو خدا کی مخالفت کرے وہ دوزخی ہوگا۔

جو اپنی پوری زندگی میں ایک بار متعہ کرے وہ جنتی ہے۔ جب عورت اپنے مرد ممنوع کے پاس بیٹھتی تو فرشتہ ان پر اترتا ہے اور جب تک اپنی نشستگاہ سے اٹھیں انکی رکھوالی کرتا ہے۔ اگر باہم ہم کلام ہوں تو وہ کلام ان کے حق ذکر و تسبیح کا حکم رکھتا ہے اور جب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں تو جو بھی گناہ کئے ہوں وہ سب انگلیوں کے پوروں سے جھڑ جائیں اور جب باہم بوسہ بازی کریں تو اللہ تعالیٰ ہر بوسہ کے عوض ایک حج و عمرہ کا ثواب لکھتا ہے۔ بمقدار اونچے اونچے پہاڑوں کے۔ اور جب اٹھ کر غسل میں مشغول ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میرے ان دو بندوں کو دیکھو کہ اٹھ کر غسل کرنے لگے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ میں ان کا پروردگار ہوں تم گواہ رہو کہ میں نے ان کے گناہ معاف کئے۔ ان کے بدن کے جس بال پر پانی گرتا ہے حق تعالیٰ ہر بال کے عوض ایک نیکی لکھتا اور ایک گناہ معاف کرتا ہے اور دس درجے بلند کرتا ہے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اس بارے میں جو صرف کوشش کرے اسکا کیا درجہ ہے۔ فرمایا وہی جو مرد متمتع اور عورت متمتعہ کا ہے۔ اس کے بعد فرمایا اے علیؓ جب یہ دونوں غسل سے فارغ ہوتے ہیں تو جو قطرہ ان کے بدن سے گرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہو جاتا ہے اور قیامت تک اسکا ثواب غسل کرنے والے کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ اے علیؓ جو اس سنت کو حقیر جانے اور اسے زندہ نہ کرے وہ میرے شیعوں سے نہیں ہے میں اس سے بیزار رہوں گا۔

اب ان روایات پر غور کر لیا جائے کہ تمام شرائع اور ادیان و ملل سے کس قدر مخالف ہیں۔ نکاح جو بالاتفاق انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اسکو کسی نے گناہ معاف ہونے اور درجات بڑھنے کا ثواب نہیں بتایا پس حرکت فاحشہ کی کیا حیثیت۔ کسی بھی دین و آئین میں شہوت رانی اور نفس کی خواہش پوری کرنے کو اسقدر ثواب تو کیا بلکہ اسکے عشر عشیر کا سبب بھی نہیں ٹھیرایا۔ ایسی حرامکاری کو وہی دین و آئین اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے جس میں خدا کے دشمنوں کے ساتھ جہاد اور رمضان کی راتوں میں شب بیداری جسکی قرآن میں تعریف آچکی ہو۔ سب سے بڑی معصیت اور گناہ کبیرہ ہو۔ مگر بصورت متعہ حرامکاری میں شب بیداری وہ عبادت ہو کہ ایک بار کرنے سے درجہ امامت اور چار بار کرنے سے درجہ نبوت پر فائز کر دے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ قرآن مجید جو محض ثواب کے اسباب بتانے اور لوگوں کو جنت میں پہنچنے کا راستہ بتانے کیلئے نازل ہوا وہ تو اس سب سے بڑی عبادت کی بو باس اور محاسن سے یکسر خالی ہے۔ اس میں اس سہل اور آسان راستہ کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور انبیاء و ائمہ کے درجات تک پہنچنے کا راستہ نامعلوم ہی رہا۔

اگر چند ضعیف و من گھڑت اور واہی تباہی روایات ابن بابویہ کی تفصیلی یا میر فتح اللہ کے پٹارے ہیں "ثوب ناپاک" کی طرح چھپی پڑی ہوں اور کسی نے ان پر یقین نہ کیا تو پھر اسمیں لطف و احسان الٰہی کیا رہا۔ ایسے عمدہ و دلچسپ مضمون کو تو ایک بار نہیں بار بار قرآن مجید میں لانا چاہیئے تھا۔ اور نماز روزہ، حج زکوٰۃ و جہاد جیسی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا چاہیئے تھا۔ تاکہ خاص و عام اس سے واقف ہوتے مکتب کا ہر بچہ اسکو پڑھتا اور تواتر و شہرت کی حد تک وہ پہنچتا۔

بہر حال ان کے نزدیک جب متعہ ایک بڑی عبادت ٹھیرا تو انہوں نے اسمیں وسعت بھی دی تاکہ کوئی آدمی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اس کے "ثواب" سے محروم نہ رہے۔ وہ وسعت کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔ علی بن احمد ہیثمی فرقہ امامیہ کا چوٹی کا عالم کربلائے معلٰی کی جامع مسجد کا امام اور خطیب بھی تھا اس کا شمار ان کے واجب الاطاعت مجتہدین میں ہوتا تھا۔ اس نے اور ان کے دوسرے عالموں نے کہا ہے امامیہ کے نزدیک بالاتفاق "متعہ دوریہ" جائز ہے۔ اور وہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی رات ایک عورت چند مردوں سے گھڑی دو دو گھڑی، کے لیے متعہ کر سکتی ہے اور باری باری سب کو نمٹا سکتی ہے (مگر اس صورت میں غسل کرنے کے ثواب میں یہ عورت کونسے متمتع کے ساتھ شریک قرار دی جائیگی۔ ن)

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم امامیوں کے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ خاوند والی عورت سے بھی متعہ جائز ہے جبکہ ان کے خاوند سنی المذہب ہوں اسلئے کہ ہمارے نزدیک اہل سنت کا نکاح صحیح نہیں یوں ان کی عورتیں نکاح کے باوجود بغیر خاوند والی ہیں۔ اور ایسی عورتوں سے متعہ بالاجماع جائز ہے۔ بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہندو اور مجوسی عورت سے بھی متعہ جائز ہے بشرطیکہ وہ زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہدے چاہے اسکے دل میں ان الفاظ کے کوئی معنی و مفہوم نہ ہوں۔

خاتمۂ باب۔ خلاصۂ حساب

واضح رہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایک ہی مذہب پر برقرار و متحد و متفق تھی۔ بانیان قتل اور قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے دور رس سازشی منصوبہ کی داغ بیل ڈالی۔ اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کی مرضی کے خلاف ایک نئے شیعی مذہب کو وجود میں لے آیا گیا۔ جو ہر لحاظ سے مسلمانوں سے الگ ایک مستقل مذہب ہے اس لیے کلمہ سے لے کر قبر کے گڑھے میں دفن ہونے تک کوئی شرعی مسئلہ ایسا نہیں جو اہلسنت سے موافق ہو۔ اگر نادانستگی میں اسکی موافقت کسی وقت ظاہر بھی ہو جائے تب بھی دانستہ اور جان بوجھ کر یہ ہمیشہ مذہب اہلسنت کے مخالف ہی رہے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہر دو جماعت میں سے ہر ایک کی حقانیت کو پرکھنے کیلیے کوئی معیار ہونا چاہیئے تو وہ معیار کتاب اللہ اور اقوال عترت رسول ہیں اب ہمیں چاہیئے کہ یہ دیکھیں کہ اس معیار کے مطابق کونسا مذہب کافروں کے مذہب کے مشابہ ہے اور کونسا مذہب کافروں کے مذہب کے منافی اور بالکل اسکا الٹ ہے

کیونکہ کافروں کے متعلق دونوں جماعتوں کا یہ اجماعی اور متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ لعنت گمراہی میں گرفتار ہیں۔
اس پرکھ کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ دونوں جماعتوں کے اختلاف کے وقت ایک دوسرے کی روایات کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ لہذا کتاب اللہ اور اقوال عترت رسول جس مذہب کی حقیت کی گواہی دیں گی ہمارے نزدیک وہی مذہب حق ہوگا۔ اور اس کے مقابل مذہب کو ہم باطل سمجھیں گے۔ اور جو آئین کفر و شرک اور انکے مذہب سے ملتا جلتا اور مشابہ ہوگا اسکو ہم مذہب باطل سمجھیں گے اور اسکے مقابل کو مذہب حق۔
لہذا ہم اول قرآن مجید کو سامنے لاتے ہیں۔ کہ اسمیں بہت سی آیات ہیں جو مذہب اہل سنت کی حقیت ثابت کرتی ہیں۔ مگر ہم تبرکاً ان کے بارہ ائمہ کے عدد کے موافق بارہ آیات قرآنیہ بیان کرتے ہیں۔

آیت (۱) :۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ۔

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے (اصحاب) جو ہیں وہ کافروں پر سخت گیر مگر باہم بہت نرم دل ہیں۔ تم انہیں رکوع و سجود میں اللہ تعالےٰ کا فضل و رضا طلب کرتے ہوئے پاؤ گے۔ ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ثبت ہیں۔

اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا دین دراصل دین حق ہے اس لیے کہ ممدوح کا موافق بھی ممدوح ہوتا ہے۔

آیت (۲) :۔ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

اور ان کے بعد آنے والے کہتے ہیں اے پروردگار ہمکو اور ہمارے سابق الایمان بھائیوں کو بخشدے اور ایمان والوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ پیدا نہ کر اے ہمارے رب تو مہربان و رحم والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا مذہب حق ان لوگوں کا ہے جو کسی مومن کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے۔ اور اپنے سے پہلے ایمان لانے والوں کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ صحابہ کرام اور امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہم ہیں کیونکہ اس آیت سے پہلے مہاجرین و انصار کا ذکر ہے۔

آیت (۳) :۔ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔

جس کے لیے سیدھی راہ کھل گئی ہو اسکے بعد بھی وہ رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چل پڑتا ہے وہ اپنے کئے کو خود ہی بھگتے گا اور ہم اسے دوزخ کے حوالہ کر دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

آیت سے یہ معلوم ہوا مومنوں کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا مستحق دوزخ ہے۔ اس آیت کے نزول کے وقت مؤمنین صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی تھے۔

آیت (۴) :۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ

جو ایمان لاکر نیک کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انکو اسی طرح زمین میں اقتدار دے گا جسطرح ان

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ سے پہلوں کو اقتدار دیا۔ اور انکے لیے جو دین پسند کیا ہے ان کے لیے اسے تمکن عطا فرمائے گا۔ انکے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کرتے ہیں میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتے۔ اس حالت کے بعد اگر کوئی کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جس دین نے تمکن استحکام اور مضبوطی حاصل کی خدا کا پسندیدہ دین وہی تھا۔ اور وہ دین جسکا اس وقت وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا تو کچھ منافقوں، سازشیوں، اور شورش پسند قاتلوں کے دلوں میں انکی سازشوں اور نفاق کے ساتھ مخفی و پوشیدہ تھا۔ وہ اللہ کا پسندیدہ دین نہیں اور خدا کے پسندیدہ دین کے مخالف اور اسلامی اقتدار کی نعمت کی ناشکری کرنے والے فاسق ہیں اور طاعت خداوندی سے خارج مثلاً رافضی، خوارج، اور نواصب،

آیت (۵): ـ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (وہ وہ خدا ہے کہ جو خود اور اسکے فرشتے تم پر رحمت کا نزول کرتے ہیں تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے)

اس آیت کے اصل مصداق تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی ہیں مگر جس نے بھی ان کی پیروی کر لی وہ بھی گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آگیا۔ اسلیے کہ اگر کوئی رات کی اندھیریوں میں مشعل لے کر چلے تو روشنی اسے ہی میسر نہیں ہوتی اسکے قدم بقدم ہمسفر بھی اس روشنی سے مستفید ہوتے ہیں تاریکی سے وہ بھی خلاصی پا لیتے ہیں۔

آیت (۶): ـ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا۔ (اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی طمانینت وسکینہ نازل فرمایا۔ اور پرہیزگاری کی بات پر انکو ثابت قدم رکھا (کیونکہ) وہ اسکے بہت زیادہ حقدار بھی تھے اور اسکے لائق بھی)

معلوم ہوا صلح حدیبیہ کے وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کیلیے جو سکینت اور طمانینت نازل فرمائی گئی۔ اسمیں آپ کے رفقاء اور جاں نثار اصحاب رضی اللہ عنہم بھی شریک وسہیم تھے اور اس وقت انکے دلوں پر کلمۃ التقوی کندہ اور چسپاں کر دیا گیا تاکہ کسی وقت بھی وہ ان سے الگ نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ان سے خلاف تقوی کوئی بات صادر نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو الزام کلمۃ التقوی بے معنی بات ہو جاتی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کندہ کلمہ بھی نشان چھوڑ گیا۔ جبکہ کلمات رب نہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں نہ ان کا اثر زائل ہوتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا وہ جماعت ہی کلمہ تقوی کی زیادہ مستحق بھی تھی اور اسکی اہل بھی مستحق تو اسلیے کہ مسلمان ہی صرف وہ تھے باقی تو سارا جہان کفرستان تھا۔ اور اہل اسلیے کہ وہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کے تربیت دادہ تھے اور یہ اسکی برکت وعظمت ہے کہ ان حضرات کو قیامت تک نجوم ہدایت قرار دیا گیا کہ جو بھی تقوی کا طالب ہو اب وہ انہی احق واہل، اصحاب نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی واقتدار کرے ان کی پیروی سے جو روکش ہوا اسے تقوی کی ہوا بھی نہ لگی۔

آیت (۷): ـ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ـ

لیکن رسول اور انکے مسلمان ساتھی کہ انہوں نے جہاد میں اپنے اموال کھپا دیئے اپنی جانیں لڑا دیں ـ (اسلیے) بھلائیاں بھی انہیں کا حصہ ہیں اور کامیاب بھی وہی ہیں ـ

ظاہر ہے کامیاب و بامراد کے جو قدم بقدم ہوگا وہ بھی کامیاب ہوگا ـ (رسول جس راستہ پر چل کر رضائے الٰہی کی جس جنت میں پہنچے آپکے اصحاب کرام انہیں قدموں پر قدم رکھتے ہوئے منزل مراد تک پہنچے گویا یہ منزل مراد کی راہ متعین ہو گئی اب جو اس منزل کو حاصل کرنا چاہے اسے چاہیئے کہ وہ انہیں قدموں پر چل کر جائے اس لیے کہ اسکے سوا منزل مقصود کا کوئی راستہ ہی نہیں ۔ ن)

آیت (۸): ـ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ـ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ـ

لیکن اللہ نے ایمان کی محبت تم کو عطا کی اور اسے تمہارے دلوں کی زینت بنایا (یعنی باوقعت) اور کفر، فسق اور نافرمانی کی نفرت تم میں پیدا کی ـ ان کی ہدایت و رشد اللہ تعالیٰ کے فضل و نعمت کے سبب سے ہے ـ

جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے بھلا بنا کر دنیا بھر کیلیے نمونہ قرار دیا تو ظاہر ہے کہ ایسے بھلے کا تابع بھی بھلا ہوگا ـ

آیت (۹): ـ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ـ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر تمکن عطا کر دیں تو یہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پابندی سے ادائیگی کریں اور بھلے کاموں کا حکم دیں اور برے و ناگوار کاموں سے منع کریں ـ

یہ آیت مہاجرین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی ـ
قاعدہ کے مطابق مقدم کے ساتھ تالی (تابع) کا وجود لازم ہے ـ تا کہ کلام اللہ کے متعلق کوئی جھوٹا شبہ بھی نہ کر سکے ـ اب یہاں مقدم کا ذکر ہو گیا اور ان کے اوصاف بھی معلوم ہو گئے ـ لہذا ان کے تالی (تابع) بھی ایسے ہی ہونگے ان کے دین حق پر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہوگا ـ

آیت (۱۰): ـ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ـ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ـ هُوَ مَوْلٰكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ـ

اس نے تم کو انتخاب کیا، تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہ رکھی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے ـ اس نے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی تمہارا نام مسلمان رکھا ـ تاکہ رسول تو تمہارے گواہ ہوں اور تم لوگوں کے ـ پس قائم کرو ـ زکوٰۃ ادا کرو اللہ پر مکمل اعتماد رکھو وہی تمہارا آقا ہے اور کیسا بہتر آقا اور کتنا اچھا مددگار ہے ـ

چنیدہ اور منتخب خدا کا تابع بھی یقینی طور پر نجات پا لینے والا ہوتا ہے ـ

آیت (۱۱): ـ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (تم

بہترین امت ہو جو لوگوں کیلیے پیدا کی گئی ہے۔ تاکہ تم سے بھلائیوں کے کرنے کے حکم اور برائیوں سے روکنے کی نہی کا کام لے)

امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ تعالیٰ نے خیر امت رکھا ہے اس امت کو اس نام کے علاوہ بطور طعن کسی دوسرے نام یا گالی سے یاد کرنے والا نہ تو مسلمان ہو سکتا ہے نہ خیر امت کا کوئی فرد۔ دوسری بات یہ امت وصف خیریت سے متصف ہے اور اس خیریت کا باعث اسکا فریضہ منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس امت کا نام تقیہ، اخفاء، احکام الٰہی میں نرمی نہیں ہے۔ اور نہ ایسے لوگ جو ان اوصاف سے متصف ہوں خیر امت کا حصہ ہیں۔

آیت (۱۲): هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

(وہ وہی ذات حق ہے جس نے ہدایت و دین حق کے ساتھ اپنے رسول کو مبعوث فرمایا تاکہ تمام ادیان پر اسکی فوقیت و برتری ظاہر فرمائیں)

معلوم ہوا کہ دین حق کا یہ نمایاں وصف ہے کہ وہ کھلم کھلا اور ظاہر و باہر ہو، بلی کے گو کی طرح چھپایا اور پوشیدہ رکھا جانے والا دین، ہرگز حق نہیں۔ بلکہ سرے سے کوئی دین ہی نہیں وہ تو ہفوے بازوں کا اختراع اور گھڑا ہوا ایک مجوبہ ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں یہ بات جو یہ حضرات کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب کے ظہور کا وقت امام مہدی کا زمانہ ہے تو ان کا یہ قول لچر و پوچ ہے اس لیے کہ لیظہرہ کا لام ارسل رسولہ سے متعلق ہے لہذا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متصل ہی اس دین کا ظہور ہو۔ اور وہ جاری رہے۔ اور ظاہری طور پر کوئی دین بجز اہلسنت کے جاری و زندہ نہیں۔

آیات قرآنیہ سے استدلال و ثبوت کے بعد ہم اب اقوال عترت رسول کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے روایات اہل سنت سے بالکل مدد نہیں لی بلکہ شیعہ کتب کی اوراق گردانی اور انکی روایات کی چھان بین کی ہے۔ اور ہمیں ان ہی کتابوں میں خاطر خواہ کافی مواد ملا ہے۔ انکی کتابوں میں اہل بیت گرامی سے مروی بہت سی ایسی روایات ہیں جو بڑے واضح اور صاف انداز میں اہلسنت کے مذہب کی حقانیت اور مذہب شیعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں۔ ذیل کی پہلی روایت "کتاب السواد والبیاض" کے امامی مصنف نے اپنی مذکورہ کتاب میں درج کی ہے۔

(۱): عَنِ الْإِمَامِ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ جَعْفَرِ الصَّادِقِ فَإِنَّهُ قَالَ فِي تَفْسِيرِ قَوْلِهِ تَعَالَىٰ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ قَالَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ بِمَا سَبَقَ لَهُمْ مِنَ التَّوْفِيقِ وَالْإِعَانَةِ وَرَضُوا عَنْهُ بِمَا مَنَّ عَلَيْهِمْ مِنْ مُتَابَعَتِهِمْ رَسُولَهُ وَقَبُولِهِمْ مَا جَاءَ بِهِ۔

امام ابی عبد اللہ جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالے کے قول "والسابقون الاولون۔ ورضوا عنہ" تک کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تو ان سے یوں راضی ہوا کہ انہوں نے اس سے پہلے توفیق و مدد سے کام لیا۔ اور وہ یوں اللہ سے راضی ہوئے کہ اس نے ان پر یہ احسان کیا کہ رسول کی متابعت اور ان کے لائے ہوئے دین کی پیروی کا موقعہ نصیب ہوا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم کے تابعین کو رضوانِ الٰہی کا مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ اور بموجب نصِ قرآنی "ورضوان من اللہ اکبر" اللہ کی ذرا سی رضا تمام دنیاوی و اخروی لذائذ و نعائم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

(۲):۔ انہی روایات میں سے ایک روایت صاحب الفصول کی ہے جو ایک امامی اثنا عشری مصنف ہے۔

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِیِّ الْبَاقِرِ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنَّہٗ قَالَ لِجَمَاعَۃٍ خَاضُوْا فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ اَلَا تُخْبِرُوْنِیْ اَنْتُمْ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ قَالُوْا لَا قَالَ فَاَنْتُمْ مِنَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ قَالُوْا لَا قَالَ اَمَّا اَنْتُمْ فَقَدْ بَرِئْتُمْ اَنْ تَکُوْنُوْا اَحَدَ هٰذَیْنِ الْفَرِیْقَیْنِ وَاَنَا اَشْهَدُ اَنَّکُمْ لَسْتُمْ مِنَ الَّذِیْنَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔

ابی جعفر محمد بن علی باقر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے اس گروہ سے جو حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضوان اللہ عنہم کے بارے میں باتیں بنا رہے تھے۔ فرمایا مجھے بتاؤ تو کیا تم مہاجر ہو جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جن کا مال اس لیے ضبط کیا گیا۔ کہ وہ اللہ کے فضل و رضا کے طالب تھے اور اللہ و رسول کی جی جان سے مدد کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا نہیں ہم وہ مہاجر نہیں۔ تب آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے دار ہجرت میں مقام کیا اور ایمان میں سبقت کی اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس گئے یہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگے نہیں ہم ان میں سے بھی نہیں۔ تب آپ نے فرمایا گویا تمکو اقرار ہے کہ ان دونوں فرقوں میں سے ہونے کا تمہارا کوئی دعوی نہیں۔ اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تم ان میں سے نہیں ہو جنکے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔ "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا ..." آخر آیت تک۔

اس اثر سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم کی شان میں بدگوئی کرنے والے یہ کہ نہ صرف گمراہ ہی ہیں بلکہ دائرۂ ملت سے بھی خارج ہیں۔

(۳):۔ انہی روایات میں سے جناب امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت ہے کہ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حق میں دعا فرمائی ان پر درود بھیجا اور ان الفاظ میں ان کی مدح و ثنا فرمائی۔

بِاَنَّهُمْ اَحْسَنُوا الصُّحْبَۃَ وَاَنَّهُمْ فَارَقُوا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ فِیْ اِظْهَارِ کَلِمَتِہٖ وَاَنَّهُمْ کَانُوْا مُصِرِّیْنَ عَلٰی مُحَبَّتِہٖ۔

وہ نیک صحبت لوگ تھے انہوں نے کلمۃ اللہ کی خاطر اپنی بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیا اور اسی کی محبت پر ڈٹے رہے۔

اور بعد دعا یہ بھی فرمایا۔

لِلَّذِیْنَ اتَّبَعُوا الصَّحَابَۃَ بِاِحْسَانٍ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ۔

جنہوں نے صحابہ کی پیروی واقعی صحیح طور کی وہ اپنی دعاؤں میں (دلوں میں یاد رکھتے ہیں) اور کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان کے

ساتھ ہم سے پہلے گذر چکے ہیں۔
بحمد اللہ اس وصف سے متصف فرقہ اہلسنت ہی کا ہے۔ ناصبی خوارج اور رافضی تو کھلم کھلا اس وصف سے محروم ہیں۔

(۴) :- روایت ذیل کو شیعہ محدثین نے جناب امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور جس تفسیر کو شیعہ انہیں کی طرف منسوب کرتے ہیں اس تفسیر میں بھی یہ موجود ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلٰى اٰدَمَ يَا اٰدَمُ اِنَّ مُحَمَّدًا لَوْ وُزِنَ بِهٖ جَمِيْعُ الْخَلْقِ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَسَائِرِ عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ مِنْ اَوَّلِ الدَّهْرِ اِلٰى اٰخِرِهٖ وَمِنَ الثَّرٰى اِلَى الْعَرْشِ لَرَجَحَ بِهِمْ يَا اٰدَمُ لَوْ اَحَبَّ رَجُلٌ مِّنَ الْكُفَّارِ اَوْ جَمِيْعُهُمْ رَجُلًا مِّنْ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَصْحَابِهٖ لَكَافَاهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَنْ ذٰلِكَ بِاَنْ يَّخْتِمَ لَهٗ بِالتَّوْبَةِ وَالْاِيْمَانِ ثُمَّ يُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع فرمایا کہ اگر محمدؐ کو ایک طرف رکھ کر اور باقی ساری مخلوق ـــ انبیاء و رسل مقرب فرشتے نیک بندے از ابتداء تا انتہائے زمانہ۔ از زمین تا عرش۔ کو دوسری طرف رکھ کر تولا جائے تب بھی محمدؐ کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اور اے آدم کافروں میں سے کوئی یا سب اولاد محمد یا اصحاب محمد میں سے کسی کو محبوب رکھے تو اللہ اسکے لیے کافی ہو جائے گا کہ اسکا خاتمہ ایمان و توبہ پر فرمائے اور اسکو جنت میں داخل کرے

اس روایت میں کسی شیعی، خارجی، ناصبی، کیلیے تمسک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ وہ بھی یہ کہکر کہ ہم بھی بعض آل یا اصحاب محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو محبوب رکھتے ہیں اس لیے ہمارا بھی حشر ایسا ہی ہوگا۔ اسلیئے کہ کسی سے محبت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی تو ہے کہ انہیں میں سے کسی کے ساتھ بغض و عداوت بھی نہ رکھتا ہو۔ کسی کے ساتھ عداوت رکھتے ہوئے کسی دوسرے کی محبت کا دعویٰ قابل قبول نہیں۔ یہ کوئی گہری بات نہیں بالکل ظاہر اور سامنے کی بات ہے کہ جب ایک شخص کی محبت فضیلت کا سبب ہوئی تو اسکے خلاف بغض یقیناً باعث ذلت و نقصان ہوگا۔ اور چلیئے ان امور سے تھوڑی دیر قطع نظر کر لیتے ہیں، مگر پھر بھی یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ جو لوگ تمام آل اور تمام اصحاب کے ساتھ محبت رکھتے ہوں۔ وہ زیادہ حق رکھتے زیادہ بہتر ہونگے، اور درجہ میں زیادہ بلند ہوں گے ان سے جو چند سے محبت کرتے ہوں، اور ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔

(۵) :- اسی تفسیر مذکور میں یہ روایت بھی مذکور ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَوْحٰى اِلٰى اٰدَمَ اَنَّ اللّٰهَ لَيُفِيْضُ عَلٰى كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْ مُّحِبِّيْ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مَّا لَوْ قُسِمَتْ عَلٰى كُلِّ عَدَدِ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ طُوْلِ الدَّهْرِ اِلٰى اٰخِرِهٖ وَكَانُوْا كُفَّارًا لَاَدَّاهُمْ اِلٰى عَاقِبَةٍ مَّحْمُوْدَةٍ وَّاِيْمَانٍ بِاللّٰهِ حَتّٰى يَسْتَحِقُّوْا بِهِ الْجَنَّةَ وَاَنَّ رَجُلًا مِّمَّنْ يُّبْغِضُ اٰلَ مُحَمَّدٍ وَّاَصْحَابَهٗ اَوْ وَاحِدًا مِّنْهُمْ يُعَذِّبُهُ اللّٰهُ عَذَابًا

اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آدم علیہ السلام کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ محمدؐ، آل محمد اور اصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے ہر محبت کرنے والے پر اسقدر مہربانیاں لٹاتا ہے کہ اگر وہ ابتدائے زمانہ سے لیکر آخر زمانہ تک کی کافر مخلوق پر تقسیم کر دی جائے تو وہ ایمان باللہ اور انکی آخرت ایسی سنوار دے کہ وہ جنت کے مستحق بن جائیں۔ اور جو شخص آل محمد یا اصحاب محمد سے یا ان میں سے کسی ایک سے بغض و عداوت رکھے

لَوۡقُسِّمَ عَذَابُہٗ مِثۡلِ خَلۡقِ اللّٰہِ لَاَھۡلَکَھُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ | تو اللہ تعالیٰ اسکو ایسا عذاب دے گا کہ اسے ساری مخلوق پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کو ہلاک کر ڈالے۔

ان روایات میں قابل غور ایک بات یہ بھی ہے کہ محبت کے ذکر میں واحداً (یعنی کسی ایک سے) نہیں فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ محبت تمام آل واصحاب رضی اللہ عنہم کی مطلوب ومقصود ہے اور بغض کے ذکر میں سب کے علاوہ۔ واحداً بھی علیحدہ سے ذکر کیا ہے جسکا صاف مطلب یہ ہے کہ ان حضرات میں سے کسی ایک سے بغض وعداوت ہی ہلاکت کیلئے کافی ہے۔ اب یہ بات دن میں چمکتے سورج کی طرح ظاہر ہے کہ تمام آل وتمام اصحاب رضوان اللہ علیہم سے محبت کرنے اور ان تمام کے بغض سے بری ہونے میں اہلسنت ہی تنہا ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں۔ والحمد للہ علی ذالک۔

(۶) :۔ اسی سلسلہ کی ایک وہ روایت ہے جو نہج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اَنَّہٗ قَالَ اَلۡزِمُوا السَّوَادَ الۡاَعۡظَمَ فَاِنَّ یَدَاللّٰہِ عَلَی الۡجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمۡ وَالۡفُرۡقَۃَ فَاِنَّ الشَّاذَّ مِنَ النَّاسِ الشَّیۡطَانُ۔ | آپ نے فرمایا کثرت کے ساتھ وابستہ رہو کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور بچھڑ جانے سے بچو کیونکہ جماعت سے بچھڑ جانے والا شیطان ہے۔

اور ابتداء سے لیکر آجتک سواد اعظم اہلسنت ہی ہیں۔ رافضی، خارجی اور نواصب کسی بھی زمانہ میں نہ سواد اعظم رہے ہیں اور نہ انشاء اللہ قیامت تک ہونگے۔ انکے سواد اعظم ہونیکی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ عقائد اہلسنت دل سے قبول کرلیں۔

(۷) :۔ بحوالہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نہج البلاغہ نے یہ روایت نقل ومحفوظ رکھی ہے۔

اِنَّ اَمِیۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ قَالَ لِلنَّاسِ. جَمَاعَۃٌ یَدُ اللّٰہِ عَلَیۡھَا۔ وَغَضَبُ اللّٰہِ عَلٰی مَنۡ خَالَفَھَا۔ | امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ لوگوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس جماعت کی مخالفت اللہ کے غصہ وغضب کو بھڑکاتی ہے۔

چودہ صدیاں بیت گئیں۔ آجتک سوائے اہل سنت کے کوئی جماعت نہیں گذری، لطیفہ یہ کہ شیعوں کے ہاں ان کا نام ہی جماعت پڑ گیا۔ اب گویا اس جماعت کا مخالف بقول جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ خدا کے غضب کا سزاوار ہوا۔
ان ہر دو روایات بالا کو ان کے دوسرے محدثین مثلاً ابوجعفر محمد بن یعقوب رازی کلینی، محمد بن علی بن بابویہ قمی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، اور دوسروں نے بھی روایت کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ نہج البلاغہ میں وارد ہے جو شیعوں کے نزدیک پوری کی پوری متواتر ہے۔ اور شیعہ اپنی کتابوں میں مختلف طرق سے لائے ہیں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضوان اللہ علیہم کی وہ روایات جو اہل سنت کے مذہب کی حقیقت وصحت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت کے پیشواؤں نے سب کچھ سیکھا ہی اہل بیت سے ہے۔ کیا فقہ واصول عقائد اور کیا سلوک طریقت یا تفسیر وحدیث سب کچھ انہیں سے حاصل کیا۔ اہل بیت سے ان کی شاگردی کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ عالم آشکارا حقیقت ہے اور بہت مشہور ومعروف ہے۔ اور اسی تعلق کی بنا پر اہل بیت ہمیشہ ان سے نرمی، خلق اور فراخ قلبی سے پیش آتے رہے۔ بلکہ بشارتیں بھی دیں ہیں۔

اور اس بات کا اعتراف و اقرار علمائے امامیہ سے بھی ثابت ہے۔ اگر کوئی جان بوجھ کر ڈھیٹ پنے سے حق سے آنکھ چرائے تو اسکا کوئی علاج نہیں۔ ابن مطہر حلی نے نہج الحق اور منہج الکرامہ میں اسکا اعتراف کیا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ امام مدینہ امام مالک رحمہما اللہ نے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کیا۔ امام شافعیؒ امام مالک رحمہما اللہ کے اور امام احمد بن حنبل امام شافعی رحمہما اللہ کے شاگرد ہیں۔ اور جناب امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جناب باقر اور زید شہید رحمہما اللہ سے بھی تلمذ کیا ہے۔

امامیہ اپنے ان مجتہدوں کو واجب الاطاعت مانتے ہیں جو امام کی غیر موجودگی میں اجتہاد کی شرائط اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن وہ مجتہد جو ائمہ کی موجودگی میں شروط اجتہاد کا مالک ہی نہ ہو بلکہ ائمہ سے اجتہاد اور فتوی کی اجازت بھی حاصل کرچکا ہو۔ امامیہ کے نزدیک اسکے مذہب کا اتباع تو بطریق اولی ہونا چاہیئے (لیکن ایسا نہیں ہے) یہ بات خود شیخ حلی کو تسلیم ہے وہ اعتراف کرتا ہے کہ جناب باقر، زید شہید اور جعفر صادق رحمہم اللہ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو فتوی کی اجازت دی ہے۔ لہذا آپ کا جامع الشروط ہونا بنص امام سے ثابت ہوا۔ اب شیعوں میں سے جو بھی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو واجب الاطاعت نہ جانے وہ گویا "معصوم" کی شہادت کو جھٹلاتا ہے۔ اور یہ بات عامی شیعہ بھی جانتا ہے کہ معصوم کی شہادت جھٹلانا کفر ہے۔ خصوصاً امام کی غیر موجودگی میں۔ ان کا مذہب ابن بابویہ، ابن عقیل، اور ابن المعلم کے مقابلہ میں زیادہ قابل اتباع ہوگا۔

کہیں تو یہ انصاف کریں اور تعصب اور عناد سے دست بردار ہوں۔ اس بارہ میں اہلسنت کی روایات نہیں مانتے چلو نہ مانیں خود امامیوں کی روایات تو انکے لیے قابل قبول ہونی چاہیئں۔ چنانچہ ابوالمحاسن حسن بن علی نے اپنی اسناد سے ابی البحیری سے روایت کی ہے: کہ

دَخَلَ اَبُوحَنِیْفَۃَ عَلٰی اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَلَمَّا نَظَرَ اِلَیْہِ الصَّادِقُ قَالَ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَیْکَ وَاَنْتَ تُحْیِیْ سُنَّۃَ جَدِّیْ بَعْدَ مَا اَنْدَرَسَتْ وَتَکُوْنُ مَفْزَعًا لِکُلِّ مَلْھُوْفٍ وَغِیَاثًا لِکُلِّ مَھْمُوْمٍ یَسْلُکُ الْمُتَحَیِّرُوْنَ اِذَا وَقَفُوْا وَتَھْدِیْھِمْ اِلٰی وَاضِحِ الطَّرِیْقِ اِذَا تَحَیَّرُوْا فَلَکَ مِنَ اللّٰہِ الْعَوْنُ وَالتَّوْفِیْقُ یَسْلُکُ الرَّبَّانِیُّوْنَ بِکَ الطَّرِیْقَ۔

ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے نانا کی سنت کو زندہ کررہے ہو جبکہ وہ مٹ چکی ہے۔ تم ہر مضطر کی جائے پناہ بنوگے اور ہر غمگین کی فریاد رسی کا مرکز ہوگے جب حیرت زدہ ٹھٹھک کر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے تو تم ہی سے راستہ پوچھیں گے۔ اور جب وہ حیرانی میں ہونگے تو تم ہی ان کو کھلے راستہ پر لگاؤگے تو اللہ کی طرف سے تم کو مدد اور توفیق ملے گی۔ اللہ والے تم سے راستہ پوچھا کریں گے۔

سارے ہی امامیہ یہ روایت کرتے اسے تسلیم کرتے اور مانتے ہیں کہ "جب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ وقت ابو منصور کے پاس آئے تو اسکے پاس عیسی بن موسی حاضر تھے وہ کہنے لگے اے امیر المومنین یہ آج پوری دنیا کے بڑے اور نامور عالم ہیں اس پر منصور نے پوچھا اے نعمان! تم نے کس سے اکتساب علم کیا ہے؟ ابو حنیفہ رح بولے علی رضؓ کے ساتھیوں سے اور انہوں نے علیؓ سے۔ اور عبد اللہ بن عباس کے ساتھیوں سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عباس سے اس پر منصور بولا۔ اے جوان! تم نے بڑا درجہ استناد حاصل کیا ہے۔

اور یہ بھی ان امامیوں ہی کی کتب میں مسطور و مرقوم ہے کہ "ابو حنیفہؒ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم تھا جو آپ کو گھیرے ہوئے تھے اور ہر طرف سے آپ سے سوال پوچھے اور آپ کی طرف سے جوابات دیئے جا رہے تھے۔ سوالات کے جواب اتنے برجستہ اور فوری ہوتے گویا وہ پہلے سے آپ کی جیب میں ہوں اور آپ نکال نکال کر دے رہے ہوں۔ اسوقت اچانک ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ جناب ابو حنیفہؒ نے جب آپ کو دیکھا فوراً تعظیماً کھڑے ہو کر کہا اے ابن رسول اللہ۔ اگر آپ کی آمد کی مجھے بھنک بھی مل جاتی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس حال میں نہ دیکھتا کہ میں بیٹھا ہوں اور آپ کھڑے ہوں۔ ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تم بیٹھے رہو۔ لوگوں کو جواب دیتے رہو میں نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح پایا ہے"

حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے مسئلہ تفضیل کے ذیل میں شرح تجرید ابن مطہر حلی میں یہ دونوں روایتیں موجود ہیں۔ اگر اس موقعہ پر کسی شیعہ کے دل میں یہ شیطانی دغدغہ پیدا ہو کہ جب امام ابو حنیفہؒ یا ان جیسے مجتہدین اہلسنت حضرات ائمہؒ کے شاگرد تھے تو پھر بہت سے مسائل میں ان حضرات کے خلاف فتاوی کیوں دیئے۔ تو اسکا جواب قاضی نور اللہ شوستری کی مجالس المومنین میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ جناب عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جناب امیر رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے اور آپ کے سامنے ہی درجۂ اجتہاد تک پہنچ چکے تھے اور آپؓ کی موجودگی میں اجتہاد کیا کرتے تھے اور بعض مسائل میں جناب امیر رضی اللہ سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اور آپ اسے جائز سمجھتے۔

ہشام احول، ابن سالم، میثمی، زرارہ، اصول عقائد الٰہیہ میں مثلاً تجسیم وصورت اور حدوث عالم باری تعالیٰ میں حضرات ائمہ کے صریح مخالف تھے۔ کلینی اور امامیہ کی دوسری صحیح کتابوں میں بذریعہ ثقات ایسی روایات موجود ہے کہ حضرات ائمہ ان سب لوگوں سے ان مذکورہ عقائد میں مخالفت کے سبب نفرت فرماتے اور انہیں سرزنش بھی کرتے اس سب کے باوجود بھی ان بزرگوں سے انکی شاگردی اور تلمذ سے کسی کو انکار نہیں۔ اور جب یہ لوگ ان ائمہ سے روایات بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی بھی سرتابی نہیں کرتا۔

امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا اختلاف تو محض فروع فقہیہ میں ہے اصول عقائد میں کوئی اختلاف نہیں۔ پھر بھی انکو نظر سے گرایا جا رہا ہے۔ اسکا سبب؟ تعصب وعناد کے سوا ہمکو تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجتہد کو اپنی دلیل کی پیروی لازم ہے۔ ہاں مسائل منصوصہ کے خلاف دیدہ و دانستہ کرنا اس کیلیے حرام ہے۔ اور جب مسئلہ کے لیئے کوئی نص موجود نہ ہو تو مجتہد اور "امام معصوم" میں یہ فرق ہے کہ مجتہد کے اجتہاد میں خطا کا احتمال رہتا ہے اور "امام معصوم" کا قول یقیناً صحیح ہوتا ہے۔ اور خطا کی صورت میں مجتہد پر کوئی عتاب نہیں بلکہ اسکو ایک گونہ اجر ملتا ہے۔ چنانچہ معالم الاصول شیعہ میں اسکی تصریح موجود ہے۔ تو مجتہد کی خطائے احتمالی بمنزلہ صواب یقینی کے ہوئی جسے کوئی خوف و ضرر نہیں ہوتا۔ نہ اسکے ہی حق میں نہ مقلد کے حق میں۔ البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ اجتہاد اپنی جگہ اور صحیح صورت حال کے ساتھ ہو یعنی قرآن صریح۔ خبر متواتر یا مشہور اور اجماع امت کے مقابلہ میں اجتہاد نہ ہو۔ اس لیے کہ ان دلائل کی موجودگی میں اجتہاد درست نہیں۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اہلسنت کے مجتہدین اور ان کے راوی سارے کے سارے تقویٰ، عدالت اور دیانت میں

اتنے مشہور و معروف ہیں کہ شیعہ بھی عقیدۂ سنت کے طعن کے سوا ان میں فسق، کذب، یا دنیا داری جیسا کوئی عیب بھی لگانے کی جرأت نہیں کر سکے۔ جبکہ دوسرے فرقوں خصوصاً شیعوں کے رواۃ کا جو حال ہے وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ انکے راوی خود انہی کے ہاتھوں ایسے مجروح و مطعون ہیں کہ بایدو شاید کسی اور فرقے کے راوی ایسے ہوں۔

صفین کی جنگ کے بعد جناب امیرؓ کے لشکری جو خلاصۂ فرقہ ہیں اور اس گروہ کے قرن اول اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اقوال و افعال زیادہ تر انہی مطعون و مجروح رواۃ کی وساطت سے مروی ہیں ان کا حال آنجنابؓ کے خطبوں منقولہ نہج البلاغہ میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکا کہ یہ کس قدر خائن فاسق امامؑ کے احکامات کے نافرمان کاذب اور جھوٹے تھے۔ انکے سارے طور طریقے منافقوں کے سے تھے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی منافقت کی گواہی دی۔ اور کوفہ کی جماعت جنکی روایت پر عقیدہ کا دارومدار ہے۔ جیسے ہشامین، زرارہ، میثمی وغیرہ ان سب کو خود ائمہ نے تجسیم کے معاملہ میں افترا پرداز کہا اور ان کو بد دعا دی اور لعنت بھیجی ہے۔ بعض کو اپنی صحبت میں آنے سے روک دیا جیسا کہ عبداللہ بن مسکان۔ شیخ مقتول نے ۔۔ ذکری میں اسکا ذکر کیا ہے۔

اور ان رواۃ میں بعض تو ایسے ہیں کہ انکا اسلام بھی ثابت نہیں مثلاً زکریا بن ابراہیم نصرانی جس سے ابوجعفر طوسی اور دوسرے لوگوں نے روایات لی ہیں۔ اور عباسی دور میں جب ائمہ نظر بند رکھے جاتے تھے تو شیعوں کے اکثر راوی عباسیوں کے ڈر سے گھر سے باہر تک نہ نکلتے تھے نہ ائمہ سے اپنے تعلق کا اظہار کر سکتے تھے۔ بخلاف اہلسنت کے کہ ان کے علما اس وقت بھی ائمہ سے شرف ملاقات حاصل کرتے اور اکتساب فیض کرتے تھے۔

ساری تاریخوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ عباسی خلیفہ کی جیل میں نظر بند تھے تو امام محمد (محمد بن الحسن الشیبانی) اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما ان کی زیارت کو جاتے اور علمی مشکلات کو حل کرتے ایسے عالم میں کہ وہ متہم ہونیکی بنا پر اسیر حکومت تھے۔ ان حضرات کا ان سے ملاقات کرنا انکے انتہائی خلوص اور تعلق خاطر کا مظہر ہے اور یہ تاریخی بات امامیہ کی اپنی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ امامیہ میں سے صاحب الفصول نے مذکورہ بالا ہر دو حضرات سے جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے خرق عادات کے باب میں روایت بھی بیان کی ہے

اَنَّهُمَا قَالَا لَمَّا حَبَسَهُ هَارُوْنُ الرَّشِيْدُ دَخَلْنَا عَلَيْهِ وَجَلَسْنَا عِنْدَهُ فَجَاءَهُ بَعْضُ الْمُوَكَّلِيْنَ فَقَالَ اِنِّيْ قَدْ فَرَغْتُ فَانْصَرِفُ فَاِنْ كَانَ لَكَ حَاجَةٌ فِيْ شَيْءٍ اٰتِيْكَ بِهَا حِيْنَ اَجِيْئُكَ غَدًا فَقَالَ مَالِيْ حَاجَةٌ ثُمَّ قَالَ لَنَا اِنِّيْ اَعْجَبُ مِنَ الرَّجُلِ سَأَلَنِيْ اَنْ اُكَلِّفَهُ حَاجَةً يَاْتِيْ بِهَا مَعَهُ اِذَا جَاءَ وَهُوَ مَيِّتٌ فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ فَجَاءَةً فَمَاتَ الرَّجُلُ فِيْ لَيْلَتِهٖ تِلْكَ فُجَاءَةً۔

انہوں نے کہا کہ جب ہارون رشید نے انکو قید کیا تو ہم انکے پاس گئے اور انکے پاس بیٹھ گئے۔ آپ کے پاس کوئی مامور و متعین شدہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس جا رہا ہوں آپ اگر کسی چیز کی ضرورت یا خواہش رکھتے ہوں تو بتائیں میں کل لیتا آؤں گا۔ آپ نے اسے جواب دیا نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پھر ہم سے فرمایا میں اس پر حیران ہوں کہ یہ شخص جو مجھ سے میری حاجت پوچھتا ہے۔ کہ اگر کچھ ہو تو میں کل لیتا

آؤں مگر یہ تورات ہی کو مرنے والا ہے چنانچہ وہ شخص اسی شب اچانک فوت ہو گیا۔
ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اہلسنت کا مذہب ہمیشہ ظاہر و مشہور رہا۔ اور شیعوں کا مذہب اسکے برعکس ہمیشہ مستور و مخفی رہا (کسی سازش کی طرح) اور دین محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کو ظاہر ہونا لازم ہے فرمان خداوندی ہے هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (وہ، وہ ہے جس نے ہدایت و دین حق کے ساتھ اپنا رسول بھیجا تاکہ تمام دینوں پر اسکو غالب وظاہر کرے) اور یہ بھی فرمایا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے) اور اس پر اتفاق ہے کہ عباد سے مراد امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔ عرب، عجم، شام، روم، مصر، مغرب کے وارث ہمیشہ اہلسنت ہی رہے ہیں۔ جب مسلمانوں کی شامت اعمال سے عراق و خراسان پر تاتاری کافروں اور چنگیزیوں کا تسلط ہوا۔ تو ان شہروں کے وارث شیعہ ہوئے گویا دولت محمدی کے اصل وارث اہلسنت ہیں۔ اور شیعوں کا یہ گروہ چنگیزیوں کے اگلے ہوئے لقمے کھانے والا ہے۔
اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اہل تشیع اور اہلسنت کے اختلاف کا مدار اور مرکزی مسئلہ امامت کا معاملہ ہے۔ ان کے ہاں امامت کا مسئلہ ایسے پانچ اصولوں پر موقوف ہے جن میں سے کوئی ایک بھی قابل سماع دلیل سے ثابت نہیں۔ وہ اصول خمسہ یہ ہیں:۔

اصل اول:۔ یہ کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ۔ بلا فصل امام (خلیفہ) تھے۔

اصل دوم:۔ ائمہ کی تعداد میں نہ کمی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

اصل سوم:۔ امام آخر کی درازی عمر۔ ان کا پوشیدہ رہنا۔ یا مرنے کے بعد انکی واپسی جیسا کہ انکے فرقوں میں اختلاف ہے۔ یہ تینوں باتیں کتاب اللہ اور اخبار متواترہ سے نہ آجتک ثابت کی جاسکی ہیں اور نہ قیامت تک ثابت ہونگی۔

اصل چہارم:۔ صحابہ کا مرتد و کافر ہونا۔ حق کو چھپانا باطل کو ظاہر کرنا۔ ناشائستہ امور پر ان سب کا اتفاق۔ حالانکہ قرآن مجید میں صحابہ کی شان میں اور انکے حال کی اچھائی اور انکے نتیجہ کی بہتری پر صاف اور کھلے طور پر شاہد و ناطق ہیں۔

اصل پنجم:۔ ائمہ کے متعلق تقیہ کا اعتقاد رکھنا کہ شیعوں کو وہ ایسی باتیں بتا دیتے تھے جو اوروں سے چھپاتے تھے۔ حالانکہ وہ دوسرے بھی انہی کے شاگرد ہوتے انہی سے علم و طریقت حاصل کئے ہوتے۔ تو بلا وجہ اور سبب حضرات ائمہ کے لیے جھوٹ بولنا کیا ضرور تھا۔

ان پانچوں امور کو جنکو شیعہ "اسلام کے ارکان خمسہ" کی مانند جانتے ہیں۔ ہم نے ظاہری عقل، کتاب اللہ، سنت مشہورہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بلکہ ساری اگلی پچھلی شریعتوں کے قواعد پر ان کو جانچ پرکھ کر دیکھ لیا اور ان کو سب کے خلاف پایا اور یوں ہم نے یقین کے ساتھ جان اور سمجھ لیا کہ یہ مذہب خاندان نبوت سے نہیں لیا گیا بلکہ ایک مصنوعی اور اختراعی مذہب ہے۔ (جسکی پہلی بنیادی اینٹ عبد اللہ بن سبا یہودی نے نصب کی اور پھر اسکے حواریوں نے موقعہ بموقعہ وقتاً فوقتاً اسکی تعمیر و تکمیل میں اہم کردار ادا کیا اور یہ کوئی سر

بستہ راز نہیں کہ ابن سبا کا استاد معلم الملکوت ہے۔ ن)
ان اصول کے ثبوت میں شیعوں نے جو دلائل دیتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ایسی احادیث ہیں جو ضعیف الحال راویوں سے مروی ہیں جنکا انکے زمانہ میں علماء میں شمار ہی نہ تھا۔ اور جنکے راوی خود انکے نزدیک جرح و قدح سے مجروح و مطعون اور جھوٹ و بد دیانتی سے متہم ہے۔ یا وہ قرآنی آیات ہیں کہ ان کے ساتھ جب تک اسباب نزول اور خصوصی واقعات شامل نہ کئے جائیں ان کے ظاہر سے ان کا مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اور وہ اسباب نزول یا خصوصی واقعات اکثر موضوع، ضعیف اور اقترار شدہ اخبارات ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اصل مطلب حاصل کرنے کے لیے گھڑے ہوئے ناقابل تسلیم مقدمات ملانے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسکی تفصیل گذر چکی ہے۔

ان امور میں جو بھی عقلمند غور و خوض سے کام لے اور حقیقت حال سے واقف ہو وہ بلا تأمل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ مذہب از ابتدا تا انتہا، فریب، مخترع، اور مصنوعی ہے۔ اور یہ بات روز روشن کی طرح اسپر عیاں ہو جائیگی۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ان کے مذہب کے مطالعہ کے دوران ایک یہ بات بھی ہم نے دیکھی اور محسوس کی کہ شیعہ مذہب اصول و فروع میں کافروں کے پانچ مذہبوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی یہود، نصاری، صابئین، مجوس اور ہنود۔ دنیا بھر کے کفار میں علماء، کتب، اور تصنیف و تالیف کے نقطۂ نظر سے یہی پانچ مذہب ممتاز اور مشہور ہیں۔ اور ملت حنیفیہ کے سراسر خلاف ہیں۔

اور انتہائی غور و فکر سے کام لینے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شیعہ مذہب بحیثیت مجموعی بعینہٖ ان فرقوں کا مذہب ہے۔ ہر مذہب سے ایک نہ ایک چیز لے لی ہے۔ مثلاً۔ اپنی تعریف میں مبالغہ سے کام لینا۔ عذاب الٰہی سے امن میں رہنے کا دعویٰ، عذاب و عقاب سوال وجواب، وزن اعمال سے خود کو مستثنیٰ کرنا، اور ان امور کو دوسروں کے ساتھ مخصوص کرنا۔ یہ سب کچھ یہود سے لیا ہے کیونکہ وہی کہتے تھے۔ نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے دوست ہیں) لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ (ہمیں آگ چند دن سے زیادہ نہ چھوئے گی) لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (یہودی و نصرانی کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا) اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے بغض و عناد رکھنا اور خدا کے مقرب بندوں اور محبوب دوستوں سے تعصب۔ یہ بھی یہودیوں کی انکے لیے بخشش ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ اسپر گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دینا۔ بدأ کا قول۔ یہ بھی یہود کی چھوڑی ہوئی ہنڈیاں یا لگے ہوئے لقمے ہیں جو ان کے خوان مذہب کا حصہ ہیں۔

ائمہ کی محبت میں غلو، انکو آکر ماننا، ان میں روح الٰہی کے حلول کا عقیدہ، انکو معصوم جاننا، انکے لیے علم ثابت کرنا، موت ان کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ رکھنا، جناب امیرؓ کو قاسم جنت و دوزخ تسلیم کرنا، ان کو روز جزا کا مالک قرار دینا اور اپنے کو انکی محبت کے سبب بخشا ہوا، نجات پایا ہوا سمجھنا، یہ سارے عقائد نصاری کی پٹاریوں سے اڑائے ہوئے ہیں جو جناب مسیح علیہ السلام کی عبدیت کے منکر تھے۔ اور مذکورہ بالا مراتب انکے لیے ثابت کرتے تھے جسطرح شیعوں میں امام ہے نصاری میں پوپ کا بھی وہی درجہ ہے۔ آدھے قرآن کو ظاہر پر محمول کرنا اور دوسرے آدھے کو جو صحابہ

ومہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم کی تعریف میں ہے غلط سلط اور باطل تاویلات سے تحریف کرنا، یہ بھی یہود و نصاریٰ دونوں کی مشترک پلیٹ ہے جس میں یہ بھی منہ مار رہے ہیں۔ امامت کو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں مخصوص و محدود کرنا بھی یہود کے قول کے مشابہ ہے۔ وہ بھی نبوت کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں۔ اپنے کو خدا کا دوست کہنا اور شیعہ علی کی تعریف میں ایران توران کی ہانکنا بھی انہوں نے یہودیوں سے سیکھا ہے۔ یہودیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا تھا کہ یہودیو! تم کو اگر یہ زعم ہے کہ تم ہی اللہ کے دوست ہو اور کوئی نہیں تو اپنا سچ ثابت کرنے کیلیے ذرا موت مانگ کر تو دکھاؤ۔ (ہم بھی ان پیروان یہود سے یہی کہتے ہیں کہ جب تم ہی اللہ کے دوست اور مستحق جنت ہو، مالک جنت بھی تمہارے اپنے پیارے ہیں تو پھر دنیا کے اس جہنم زار میں کیوں دنیا بھر کی لعنت پھٹکار سمیٹ رہے ہو مر کر جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔ مرنا بس میں نہیں ، مرنے کی آرزو تو کر سکتے ہو وہی کر کے دکھاؤ۔ ن) کتاب اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے اس میں کچھ الفاظ کا اضافہ کرنا یہ بھی بعینہٖ یہودی حرکت ہے۔ یہود کہتے ہیں جب تک مسیح دجال نہ آئے جہاد جائز نہیں۔ اثنا عشری کہتے ہیں جب تک امام مہدی کا ظہور نہ ہو جہاد جائز نہیں۔ مغرب کی نماز کو ستارہ دیکھنے تک موخر کرنا بعینہٖ یہود کا مذہب ہے۔ تین طلاقوں کے بیک وقت وقوع سے انکار کرنا بھی عین قول یہود کے مطابق ہے۔ یہودی کہتے ہیں مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اتنا اتنا ثواب ہے اس مصرعہ پر شیعوں نے یہ گرہ لگائی کہ سنی کے قتل کی کوشش کو ستر سالہ عبادت کا درجہ دیا ہے۔ یہودی کہتے ہیں لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (امیین کے حقوق غصب کرنے پر ہم سے کوئی جواب طلبی نہیں ہو سکتی ہے) امامیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سنیوں کی جان و مال و آبرو پر دست درازی میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہودی جناب عیسیٰ، مادر محترم مریم علیہما السلام اور ان کے حواریوں پر سب و شتم کرتے ہیں، شیعہ بھی اصحاب پیغمبر، خلفائے راشدین، امہات المومنین رضوان اللہ علیہم کو سب و شتم کرتے ہیں۔

نصاریٰ پیشاب پاخانے کی نجاست کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ ناک کی ریزش یا تھوک کی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ مذی، ودی، اور بعد پیشاب قضیب کو جھٹکنے اور خشک پاخانہ میں شیعوں کا بھی یہی مسلک ہے، ان کے نزدیک بھی یہ نجاسات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ نصاریٰ اپنی نمازوں میں قبلہ کو معین کرنے کی پابندی نہیں لگاتے چاروں طرف سجدہ کرنا جائز بتاتے ہیں، امامیہ بھی نوافل میں بلا عذر استقبال قبلہ کی قید اڑا دیتے ہیں۔ اور ہر طرف سجدہ کرتے ہیں۔ نئی اختراعی عیدوں کے منانے میں بھی نصاریٰ کے ساتھ پوری پوری مشابہت رکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی بہت سی عیدیں اپنی طرف سے گھڑلی ہے۔ یوم عاشورہ میں ائمہ کی قبروں پر تصاویر لگانا۔ ان کو سجدہ کرنا یا ان کے روبرو دست بستہ کھڑے رہنا نصاریٰ کے عمل سے ملتا جلتا ہے کہ وہ بھی کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ، بی بی مریم (علیہما السلام) کی تصاویر بناتے ہیں، انکی تعظیم کرتے اور سجدہ کرتے ہیں،

اب ذرا صابئین سے مشابہت دیکھیے کہ جب قمر عقرب میں یا محاق میں ہوتا ہے اس سے احتراز کرتے ہیں۔ تاریخوں اور ایام کی سعادت و نحوست کے بارے میں بڑا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں، نوروز اور شرف آفتاب کی تعظیم کرتے ہیں، صابئین تمام ستاروں کو فاعل مختار اور زمینی اشیاء کا خالق خیال کرتے ہیں، رافضی بھی تمام حیوانات

کو خالق و فاعل مختار جانتے ہیں۔
مجوسی نیکی و بدی کا الگ الگ خدا مانتے ہیں یعنی یزداں و اہرمن رافضی بھی خالق غیر خدا کو مانتے ہیں اور خالق شر شیطان و انسان کو ٹھہراتے ہیں۔ اسلیے علماء ملت نے انہیں اس ملت کے مجوسی ہونے کا خطاب دیا ہے۔ مجوسی عورت کے مباح کرنے میں فراخ دل، بلکہ انتہا درجہ بے غیرت و بے حیا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ رافضی بھی متعہ اور شرمگاہوں کے حلال کرنے میں انکے قدم بقدم ہیں۔ بلکہ متعہ اور تحلیل فروج میں بیٹیوں اور بہنوں کو حلال جانتے ہیں جسکی وجہ بیان ہو چکی۔
رہی ہنود سے مشابہت تو ہندو جو کچھ اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی یہ لوگ ایام عاشورہ میں اپنے ائمہ کی قبور کی تصاویر کے ساتھ کرتے ہیں۔ انکو غسل دیتے ہیں، سوار کرتے نوبتیں بجاتے ہیں، انکے سامنے کھانا رکھتے ہیں، اور جھوٹا موٹا بطور تبرک تقسیم کرتے ہیں، جناب قاسم اعلی بی سکینہ کا بیاہ، شادی، نکاح، رسم مہندی زندوں کی طرح عمل میں لاتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو انکی توہم پرستی ہندوؤں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اسلیے کہ وہ تو صرف اشخاص کی تصویروں کی پرستش کرتے ہیں اور یہ قبروں اور اشخاص کے جنازوں کی تصویروں کی پوجا و پرستش کرتے ہیں ہندو گائے کے پیشاب اور گوبر کو پاک کہتے ہیں، یہ رافضی بھی انسان اور گائے دونوں کے پیشاب پاخانہ کو پاک مانتے ہیں۔ اور اسی طرح انکے نزدیک دونوں کا خشک پاخانہ بھی پاک ہے، ستر عورت ہندو کے ہاں لنگوٹی میں چھپنے والے تین اعضاء ہیں اور شیعہ مذہب میں یہی ستر عورت ہے، ہندو عبادت کے وقت ننگا رہنا اچھا خیال کرتے ہیں۔ رافضی بھی نماز و طواف میں برہنہ ہونے کو جائز کہتے ہیں بشرطیکہ آگے پیچھے کے اعضاء پر مٹی لتھیڑ لی جائے۔
ہندو اپنی پیشانی پر معبد کی خاک ملتے ہیں شیعہ بھی خاک ہی کو اپنی سجدہ گاہ بناتے اور قبلہ ٹھہراتے ہیں۔
ہندو کے ہاں پرستش و پوجا کے وقت کپڑے کی پاکی شرط نہیں، امامیہ بھی اس کپڑے کو جو بدن سے متصل نہ ہو پاک ہونے کی شرط نہیں لگاتے، مثلاً پگڑی، ازار بند، کمر بند، موزہ، سر پر چادر، پیشاب، مذی و ودی ہندو کی طرح امامیہ کے نزدیک پاک ہیں، ہندو اپنی عبادت کیلئے کسی خاص سمت و جہت کو متعین نہیں کرتے، شیعہ بھی نوافل اور سجدہ تلاوت میں قبلہ رو ہونا فرض نہیں مانتے، ہندو اپنے روزے میں بعض اشیاء کا کھانا جائز رکھتے ہیں انکو روزہ توڑنے والی اشیاء شمار نہیں کرتے، شیعہ بھی غیر عادی اشیاء کھا لینے کو ناقض صوم نہیں جانتے مثلاً موم وغیرہ۔ ہندو کے نزدیک خون مسفوح حرام نہیں، رافضی بھی کھانے میں خون مسفوح بہت سا مل جانے کو بھی حلال کہتے ہیں، ہندو کے ہاں نکاح کی مشہوری اور گواہ ضروری نہیں، متعہ میں امامیہ بھی اسی روش کو مانتے ہیں۔
ہندو باندیوں کی شرمگاہیں جسکے لیے چاہیں حلال کر سکتے ہیں بعینہ یہی مسلک ان رافضیوں کا بھی ہے۔
غیر مسکوک چاندی پر نہ ہندو کے ہاں زکوۃ ہے نہ ہی مذہب امامیہ میں۔

بارھواں باب[۱۲]

تولّا ۔ اور تبرّا ۔

تولّا کے معنی محبت کے ہیں اور **تبرّیٰ** کے معنی ہیں عداوت کے ۔

اس نازک بحث میں پڑنے سے پہلے چند مقدمات بترتیب گوش گذار کر لیجئے ضروری اور مفید ہیں۔ یہ مقدمات شیعوں کے معتبر علماء کے اقوال اور آیات قرآنی کی رو سے ثابت شدہ ہیں۔ پھر ان سے نتیجہ نکالکر وضاحت سے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ قابل محبت کون ہے اور لائق عداوت کون ۔ اور یہ سب کچھ شیعوں کی مقرر کردہ اصول کی بنا پر ہوگا۔ اہل سنت کے اقوال کو اس میں قطعی کوئی دخل نہیں ۔

مقدمہ (۱) :۔ یہ کہ مخالفت اور عداوت میں فرق ہے ۔ مخالفت کو عداوت لازم نہیں۔ بات اگرچہ صاف و ظاہر ہے۔ محتاج دلیل نہیں مگر ضد توڑنے اور جائے فرار مسدود کرنے کی خاطر دو وجوہ سے اسے ثابت بھی کرتے ہیں

اوّل :۔ ملا محمد رفیع واعظ۔ مصنف ابواب الجنان، جو اثنا عشریہ میں ایک معتبر شخصیت شمار ہوتا ہے نے تصریح کی ہے کہ دو مومنوں کے درمیان امور دنیاوی میں مخالفت ممکن ہے ۔ گو بتقاضائے ایمان دونوں باہم محبت رکھتے ہوں

دوم :۔ اثنا عشریہ شیعوں کے اعتقاد کے موجب شیخ ابن بابویہ اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے درمیان فقہی مسائل یا مروی روایات کی تصحیح کے سلسلہ میں مثلاً میثاق وغیرہ میں باہم اختلاف متحقق اور ثابت ہے۔ اس کے باوجود وہ اتحاد مذہب کے سبب باہم رابطۂ محبت بھی رکھتے ہیں ۔ لہذا مخالفت عداوت سے عام ہوگئی۔ اس جہاں مخالفت ہو ضروری نہیں وہاں عداوت بھی ہو ۔ البتہ جہاں عداوت ہوگی وہاں مخالفت بھی ضرور ہوگی ۔

مقدمہ (۲) :۔ یہ کہ کبھی محبت و عداوت جمع بھی ہو جاتی ہیں ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عداوت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک دینی مثلاً مسلمان کی عداوت کافر کے ساتھ کہ محض اصول عقائد کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں ۔ دوسرے دنیاوی مثلاً ایک مسلمان کی عداوت اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے کسی دنیاوی نفع و نقصان کے سبب یا ایک دوسرے کے طور و طریقوں اور طرز عمل سے نفرت رکھنے کے باعث ۔ پس معلوم ہوا کہ مختلف الجنس یعنی دینی و دنیوی محبت و عداوت کا یکجا ہو جانا ناممکن الوقوع نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات واقع ہو جاتا ہے ۔ اور متفق الجنس مختلف النوع یا مختلف النوع مختلف الصفت محبت و عداوت کا جمع ہونا بھی جائز الوقوع ہے ۔ جیسے مومن فاسق بحیثیت ایمان تو محبوب ہے اور بلحاظ فسق مبغوض ۔ (جیسے آیات المومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض ۔ اور ان اللہ لا یحب الخائنین ۔ یا۔ ان اللہ لا یحب الظالمین) اور اس دلیل سے کہ بری بات سے روکنا فرض ہے ۔ اور بری بات سے روکنے کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس سے دلی بغض رکھے ۔

اب یہاں ایک اور بحث ہے کہ بعض نیک اعمال کے صدور کے سبب مثلاً، خیرات، بھلائی، انصاف، دادرسی، مروت، جوانمردی، پاس عہد اور صدق کلامی کے کسی کافر سے بھی دینی محبت ہو سکتی ہے یا نہیں ؟ سرسری نظر تو مومن فاسق پر قیاس کرتے ہوئے محبت و عداوت کے جمع ہونے کا حکم لگاتی ہے مثلاً سخاوت کی

وجہ سے حاتم سے محبت یا عدالت کے سبب نوشیرواں سے محبت. مگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو یہ محال نظر آتا ہے کہ دینی محبت و عداوت یکجا جمع ہوں. وجہ اور سبب یہ ہے کہ خدا کے ہاں کسی عمل کے مقبول ہونے کی شرط اول اعتقاد کی درستی ہے، یہاں چونکہ اعتقاد ہی فاسد ہے اسلئے اسکا عمل بھی دینی لحاظ سے خدا کے ہاں فاسد و نا مقبول ہوا اور قابل اعتبار نہ رہا چہ جائیکہ قابل محبت ہوتا. پس نیک اطوار کافر یا منصف مزاج کافر سے محبت دنیاوی تو ہو سکتی ہے، دینی نہیں، اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ،

جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال (خیر بھی) بیابانی سراب کی طرح ہیں کہ پیاسا ان کو دیکھ کر جب پہنچتا ہے تو وہاں کچھ نہیں پاتا، وہاں قضائے الٰہی کو موجود پاتا ہے جو اسکا حساب برابر چکا دیگا. اللہ تعالےٰ حساب جلدی لینے والا ہے.

لہذا معلوم ہو گیا کہ ایک شخص میں ایک ہی حیثیت سے محبت و عداوت کا جمع ہونا محال ہے. البتہ دو حیثیات سے جائز الوقوع ہے، چنانچہ ملا محمد رفیع واعظ صاحب ابواب الجنان نے سادات میں سے دو ائمہ کا قصہ نقل کیا ہے.

اور یہ اجتماع جب عوام امت میں ممکن ہوا تو خواص امت میں بھی محال نہ رہا. کیونکہ مقتضائے بشریت تو ایک ہی ہے. عوام و خواص کے درمیان جو فرق ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ خواص سے بشریت کے احکام جاتے رہیں. اور عوام میں موجود رہیں. بلکہ یہ فرق فضائل و مناقب کی قلت و کثرت کے سبب. یا ایمان کی قوت و ضعف کے باعث اور شریعت کے رواج دینے اور احکام الٰہی قبول کرنے میں آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے ہے چنانچہ درجات ایمان کی لمبی حدیث میں بروایت کلینی جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سب کچھ بیان ہو چکا. اور باتفاق رائے خواص امت کے تین طبقے ہیں" (۱) اہل بیت اولاد پیغمبر، آپکے اعزہ (۲) ازواج مطہرات (۳) مہاجرین والانصار میں سے چند مخصوص مخلصین (رضوان اللہ علیہم) اتنا ضرور ہے کہ ہر دو جانب متقابل باہم مناسبت رکھتے ہوں. مثلاً امت کے عام افراد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خواص کے ساتھ اسطرح پیش آئیں جیسے وہ آپس میں پیش آتے ہیں. اسپر کئی شرعی دلیلیں دی جا سکتی ہیں پہلی دلیل تو یہ مشہور حدیث شریف ہے.

اللّٰهَ اللّٰهَ فِي أَصْحَابِي لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِي | دیکھو دیکھو میرے صحابہ! میرے بعد انکو نشانہ نہ بنانا،

دوسری وہ حدیث جو اہل بیت و انصار کے بارے میں ہے، اَقْبَلُوا عَنْ مُحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُسِيئِهِمْ (انکی بھلائیاں بیان کرنے والے کی بات مانو اور انکی برائی کرنے والوں سے کنارہ کش ہو جاؤ) ایک دلیل ہے وَ أَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ (آپ کی ازواج انکی مائیں ہیں) اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا إِنَّ أَمْرَكُنَّ مِمَّا يُهِمُّنِي مِنْ بَعْدِي وَلَمْ يَصْبِرْ عَلَيْكُنَّ إِلَّا الصَّابِرُونَ (میرے بعد تمہارے جو حالات و معاملات ہونگے مجھے وہ فکرمند کرتے ہیں. اور تمہارے معاملہ پر صابر ہی صبر و استقامت پر قائم رہ سکتا ہے) مطلب یہ کہ میرے بعد تمہاری اطاعت و فرماں برداری اور تمہارے شایان شان حقوق تعظیم ہر کوئی بجالائے بڑا مشکل نظر آتا ہے ہاں وہی جو صبر و استقامت کامل رکھتا ہو.

شرعی دلائل کے علاوہ اس سلسلہ میں عرف عام سے بھی بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ اولاد کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ والدین کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جسطرح آپس میں یا اپنے ہم جنسوں سے پیش آتا ہے۔ مثلاً انکے عیوب کی گرفت یا ان پر لعن وطعن وغیرہ۔ اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہر سلطنت میں خواص سلطنت کی ایک جماعت ہوتی ہے مثلاً شاہزادے، بیگمات، وزراء، عمائد اور امراء، جنہوں نے ابتداء میں اس سلطنت کی نشوونما میں خاص کردار ادا کیا ہوا ہوتا ہے۔ اور انتہا میں وہ اسکے بقا کا سبب بنتے ہیں انہی ان تھک جدوجہد اور محنت کے سبب اس مملکت کا وجود ممکن ہوسکا۔ اب جو لوگ اس مملکت میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھاتے ہیں انکے ذمہ ان حضرات کی سابقہ خدمات کا حق ادا کرنا اور انکے ربط قدیم کا اعتراف کرنا لازمی ہے ان قدیم ذمہ داران مملکت کے علاوہ ایک وہ جماعت ہوتی ہے جو قیام ملک کے بعد آئی اور اسکے وسائل سے مستفید ہورہی ہے۔ تو یہ نئی جماعت جو برتاؤ اپنے ہم چشموں اور ہمعصروں سے کرتے ہیں ویسا ہی برتاؤ بانیان مملکت سے کریں گے تو وہ باعث طعن ہونگے اور لائق سرزنش ان خواص کا باہم معاملہ جیسا بھی ہو نئی جماعت اگر اپنے معاملات کو ان پر قیاس کریگی تو وہ توہین مملکت کا سبب بنیں گے۔ ایک دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی رذیل کسی شریف کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اس شریف نے کسی دوسرے شریف کے ساتھ کیا ہو تو وہ عقلا کے نزدیک معذور نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اسکو تنبیہ کریں گے سزا دیں گے اور کہیں گے۔ ایاز قدر خود بشناس۔

مقدمہ (۳):۔ یہ کہ مومنین کی آپس میں دشمنی جو کسی دنیاوی بات کے سبب ہو وہ ایمان میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ البتہ قبیح اور قابل مذمت ضرور ہے اور پھر اس میں حفظ مراتب کا خیال نہ رکھا گیا تو بہت ہی زیادہ بری اور لائق مذمت ہے۔ اور لحاظ اور حفظ مراتب کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہم رتبہ ہوں چاہے خواص میں سے ہوں چاہے عوام میں سے اور عدم حفظ مراتب کی شکل یہ ہے کہ عامی کسی خاص سے الجھ جائے اور اس سے وہ سلوک کرے جو اپنے ہم جنس وہم طبقہ سے کرتا ہے۔

صدر اول میں خواص تین قسم پر تھے، اصحاب ازواج اہل بیت۔ اسکے بعد کے زمانہ میں بھی تین ہی رہے۔ سادات علماء اور مشائخ طریقت (صوفیاء واولیاء کرام)

گویا یہاں دو دعوے کئے گئے ہیں کہ باہم دشمنی ایمان میں خلل نہیں ڈالتی اور مذموم وقبیح ہے۔ ان دونوں دعوؤں کے لیے کافی کلینی کی ایک ہی روایت بطور ثبوت کافی ہے۔

ملا محمد رفیع واعظ جناب ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قصہ آزردگی کے ذیل میں صفوان جمال سے بحوالہ کافی جو روایت لایا ہے اسکے آخر میں کہتا ہے کہ حضرت ابوعبداللہ رحمۃ اللہ علیہ گفتگو پر ایک ہی رات گذرنے پر جناب عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کے گھر تشریف لے گئے اور صلح کرلی۔ بحوالہ کافی اسنے یہ بھی بیان کیا ہے،

لَا يَفْتَرِقُ رَجُلَانِ عَلَى الْهِجْرَانِ إِلَّا اسْتَوْجَبَ أَحَدُهُمَا الْبَرَاءَةَ وَاللَّعْنَةَ وَرُبَّمَا اسْتَحَقَّ ذٰلِكَ كِلَاهُمَا قَالَ الرَّاوِي وَهُوَ مُعْتَبٌ جُعِلْتُ فِدَاكَ هٰذَا الظَّالِمُ فَمَا بَالُ الْمَظْلُومِ قَالَ لِأَنَّهُ	دو شخص باہم یکدگر آزردگی دل میں رکھکر جدا نہیں ہوتے مگر ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیزاری و لعنت کا سزاوار ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں ہی مستحق ہوتے ہیں، معتب راوی نے کہا میں آپ پر فدا۔

لایدعوا اخاہ الی الصلح ولا یتغامض لہ۔ | ظالم تو ٹھیک مستحق بے زاری ولعنت ہو اگر مظلوم وہ کس وجہ سے؟ آپ نے فرمایا وہ اس لیے کہ نہ اس نے چشم پوشی کی اور نہ بھائی کو صلح ہی کی دعوت دی۔ اس سے یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ خواص امت میں اس قسم کی آزردگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر اُن کے ایمان پر خلل انداز نہیں ہو سکی ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس قسم کی آزردگیاں ایمان میں خلل انداز نہ ہونے کے باوجود ہیں قبیح اور مذموم جنکا جلد دفعیہ ہو جانا چاہیئے۔ آزردگیٔ خواص کا گواہ وہ قصہ ہے جو بتقاضائے بشریت باوجود درجہ و مرتبہ مساوی ہونے کے وقوع پذیر ہوا۔ اور جسکے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ لقب ابو تراب سے مفتخر ہوئے یہ واقعہ آپ اور سیدۃ النساء بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہم کے مابین پیش آیا، ملا محمد رفیع واعظ نے اس قصہ کو بیان کر کے تقاضائے بشریت پر محمول کیا ہے،

مقدمہ (۴) یہ کہ مطلق دینی عداوت کا دار و مدار کفر پر ہے۔ ہر کافر کو دشمن جاننا چاہیئے کیونکہ احکام قرآنی کی رو سے دینی عداوت کا سبب کفر ہے اور جب علت وسبب ایک ہو تو حکم بھی ایک ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ یا اللہ تعالےٰ کا قول يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ یا فرمایا لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِىْ شَىْءٍ۔ پہلی آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کے کسی کافر سے، باپ بیٹا، عزیز و دوست ہونے کے دنیاوی تعلقات ہوں تو کفر کے ہوتے ہوئے سب تعلقات قابل ترک اور بے اعتبار ہونگے، انکو نظر انداز کر کے مدار عداوت پر رکھنا چاہیئے اور محبت دینی کا ایمان پر۔ لہذا تمام اہل ایمان سے بحیثیت ایمان محبت رکھنا واجب ہے خواہ وہ فرماں بردار ہوں یا نافرمان کیونکہ وجوب محبت کا جو سبب ہے وہ دونوں میں موجود و مشترک ہے اور جب علت پائی جائے تو حکم کا وجود واجب ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اور یہ طے شدہ بات ہے کہ ایک شئی کا محب، اسکے محب و محبوب دونوں ہی کا محب ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ تمام مسلمانوں کا محبوب ہے، اللہ تعالےٰ کی محبت ہر مسلمان کے دل میں باقی دوسروں سے زیادہ ہونی چاہیئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اہل ایمان اللہ کی محبت سب سے زیادہ رکھتے ہیں) اور جب اللہ تعالےٰ مومنوں کو مطلقاً دوست رکھتا ہے تو یہ لازم ہوا کہ ہر مومن تمام مومنوں کو دوست رکھے ورنہ پھر وہ خدا کا دوست نہ رہے گا۔ اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (اللہ مسلمانوں کا دوست ہے۔ انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے) نیز فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (اور یہ اس لیے کہ اللہ ایمان لانے والوں کا حامی دوست ہے، اور کافروں کا کوئی دوست نہیں) یا یہ ارشاد اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پسندیدہ کام کئے ان پر عنقریب اللہ کی دوستی ظاہر ہو جائیگی) قرآن سے یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مومنوں کی دوستی کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سے زائل نہیں ہوتی۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا

(جب تمہارے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا، مگر اللہ تو ان دونوں کا دوست ہے) ان دونوں فرقوں سے مراد بالاتفاق بنو سلمہ اور بنو حارثہ ہیں۔ جنہوں نے یوم احد کے موقعہ پر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بہکانے میں آکر میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ حرکت گناہ کبیرہ شمار ہوتی ہے خصوصاً ایسے جہاد کے وقت کہ خود پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اس میں بنفس نفیس موجود ہوں اور بھاگ جانے پر آپ کی ہلاکت کا پورا پورا گمان اور خطرہ ہو، اور پھر جبکہ وقت ایسا نازک ہو کہ ملت اسلامیہ کی نشوونما پورے طور پر نہیں ہوسکی اسلام کا پودا ابھی پورے طور پر جڑ بھی نہیں پکڑ سکا ایسے وقت ذرا سی غلطی اور قصور سے نہایت ہی ہولناک اور تباہ کن اثرات بھی ظاہر ہوسکتے تھے ان سب کے باوجود اللہ تعالے نے ان کی دوستی سے دست برداری ظاہر نہیں فرمائی اور دونوں گروہوں کو مومنین ہی کے خطاب سے یاد کیا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (مومنوں کو بھروسہ اللہ ہی پر رکھنا چاہیئے) اتنی محبت تو محض بتقاضائے ایمانی ضروری ہے، اور جب مسلمانوں میں اعمال صالحہ بھی پائے جاتے ہوں مثلاً جہاد، قتال مرتدین توبہ طہارت، تقویٰ، اور اچھے اخلاق تو ایسی صورت میں تو وہ خاص اور یقینی طور پر اللہ تعالے کے محبوب ہونگے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ یا فرمایا يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ یا ارشاد ہوا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ یا فرمایا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ یا یہ ارشاد ہوا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔

مقدمہ (۵):- یہ کہ مومن و کافر کے ساتھ محبت و عداوت کے مختلف مراتب اور جدا جدا درجے ہیں مثلاً باپ، بیٹا، بھائی، چچا، ماموں، ماں اور بہن کے ساتھ محبت اور تعلق خاطر میں جو تفاوت اور فرق پایا جاتا ہے اس سے ہر عقلمند واقف ہے اور محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح دنیاوی دشمنوں میں عداوت کے قوی و ضعیف ہونے یا آثار عداوت کی قلت و کثرت میں جو تفاوت اور فرق و اختلاف ہے وہ بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں۔ بعینہ اسی طرح وہ محبت دینی جو ایمان کی وجہ سے ہو اسمیں تفاوت اور اختلاف ہونا بلحاظ ایمانی قوت یا اسمیں زیادتی کے بموجب درجۂ ایمان کے علو و بلندی کے اور بمقدار اختلاف و تفاوت مسلمانوں کے محب یا محبوب خدا ہونے میں۔ لہذا جسکا درجہ محبوبیت زیادہ ہو اس سے محبت بھی زیادہ رکھنی چاہیئے۔

بالاتفاق محبت کا بلند درجہ وہی ہے جو سید المرسلین رسول رب العالمین حبیب خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے ہو۔ اس کے بعد ان سارے مسلمانوں سے جنکو آپ کی ذات مبارک سے انتہائی نزدیکی اور بڑا قرب حاصل ہے یہ جماعت تین طبقوں پر مشتمل ہے۔

(۱) اولاد و اقارب جو آپ کے جسم اطہر کا جز اور جگر پارے ہیں، جنکے بارے میں ارشاد فرمایا۔ اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ۔ وَاَحِبُّوْنِيْ لِحُبِّ اللّٰهِ۔ وَاَحِبُّوْا اَهْلَ بَيْتِيْ لِحُبِّيْ۔ (اللہ کو محبوب رکھو کہ وہ تم کو نعمتوں سے پالتا ہے اور اللہ کی محبت کی خاطر مجھ سے محبت رکھو۔ اور میری محبت کے حصول کیلیے میرے اہل بیت سے محبت کرو)

(۲) ازواج مطہرات، جو آپ کے اجزائے بدن کے بمنزلہ ہیں (جو آپ کی ناموس عزت و آبرو ہیں اور آپ کی جلوت و خلوت کی محبوب ہستیاں ہیں) جنکی شان میں ارشاد ربانی ہے۔ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ۔

بنی نوع انسان اس پر متفق ہے کہ بیویاں انتہائی خلط ملط۔ اور الفت و محبت کے سبب (اعزاز و اکرام اور تعلق

خاطر ہیں) شوہر (شخص) کا حکم رکھتی ہیں (وہ درحقیقت یک جان دو قلب کا درجہ رکھتی ہیں) اسی لیے شریعت میں محرمیت (محرم ہونے) و میراث کے معاملہ میں سسرالی تعلق کو معتبر مانا ہے اور احسان جتاتے وقت نسب و صہر دونوں کو شانہ بشانہ رکھکر ایک لڑی میں پرو دیا ہے،

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔ | وہ وہ ذات ہے جسنے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اسکو نسب اور سسرال میں تقسیم کیا۔

(۳) رفقائے سفر، اصحاب کرام، جو زندگی کے سفر میں آپکے ہم قدم و ہم عنان و ہم آواز رہے۔ آپ کی نصرت و امداد میں ہمیشہ بڑھ بڑھ کر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے صحیح معنوں میں آپکے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہایا، جان و مال و عزت و آبرو سب کچھ آپکے لیے خطرہ میں ڈالا۔ گھر بار کو خیر باد کہا، سارے دنیاوی رشتہ و پیوند توڑ ڈالے اور آپ کی خوشنودی کی خاطر ماں، باپ، بھائی بیٹے، بیوی، بہن، اور سارے اقارب سے ناطہ توڑ لیا۔ ان کی یہی قربانیاں اور جذبات ایثار و محبت اللہ تعالےٰ کی نظر میں معتبر اور وقیع ٹھیریں اور ان کے اس عمل کی قدردانی فرمائی اور انکے حق میں خاص عنایت کا یوں اظہار فرمایا۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ یہ بات سارا عالم جانتا ہے کہ اس قسم کی سچائی اور خلوص، نزدیکی اور قرب میں نسب سے بھی اعلیٰ و ارفع ہے جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے ؎

اَلْقَوْمُ اِخْوَانُ صِدْقٍ بَيْنَهُمْ سَبَبٌ ٭ مِنَ الْمَوَدَّةِ لَمْ يَعْدِلْ بِهٖ نَسَبٌ

(یہ لوگ باہم برادران صداقت ہیں۔ ان کے درمیان دوستی کا وہ رشتہ ہے جس کی برابری نسب بھی نہیں کر سکتا) لہٰذا ان تینوں طبقوں میں عام مسلمانوں کی نسبت اور بلحاظ جملہ مسلمانوں کے محبت کے اسباب دو وجوہ سے قوی اور زیادہ بھرپور اور بکثرت ہیں۔

اول حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کا انتہائی قرب و اتصال جسکی وجہ سے تمام بنی آدم سے محبوبیت میں ممتاز و منفرد ہیں دوم۔ دین شریعت کا ان کے ذریعہ رواج پانا اور دور و نزدیک اسکی اشاعت اور پھیلاؤ اور تقویٰ اور جہاد میں انکا بلند ترین درجہ۔ ہاں اس جماعت میں سے کوئی اگر گناہ کا مرتکب ہو۔ یا ایمان سے خالی ہو اور اس کے سبب اسکے سابقہ اعمال سوخت ہو گئے ہوں تو نص قرآنی کے مطابق انکے ساتھ عداوت و دشمنی واجب ہے۔ رسول محتشم صلے اللہ علیہ وسلم کی قربت کا اعزاز اس برائی کی وجہ سے ساقط ہو جائیگا۔ اور یہ گروہ بالا کے حکم سے مستثنیٰ ہو جائے گا۔ مثلاً ابولہب وغیرہ۔ اب ان اشخاص کے ایمان و عدم ایمان اور اعمال و طاعات کے سوخت ہونے کے متعلق چھان بین اور تحقیق و تفتیش کرنی چاہیئے۔

خواجہ نصیر طوسی ایمان و کفر کی بحث اور حبط اعمال کے ذیل میں تجرید العقائد میں کہتا ہے۔ اَلْاِيْمَانُ التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَاللِّسَانِ (ایمان زبان و قلب کی تصدیق کا نام ہے) بِكُلِّ مَاجَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعُلِمَ مِنْ دِيْنِهٖ ضَرُوْرَةً وَلَا يَكْفِي الْاَوَّلُ (ہر اس چیز کے ساتھ جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم لائے۔ اور ضروریات

دین کا جاننا۔ اور پہلے کا جاننا ہوا کافی نہیں) بسبب فرمان الٰہی وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ (یقین سے جان لیں ان کے نفوس) وَلَا الثَّانِي (تصدیق کے بغیر اقرار بھی کافی نہیں) بسبب قول خداوندی۔ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا (آپ کہئے کہ تم ایمان ہی نہیں لائے)

خواجہ مذکور یہ بھی کہتا ہے۔ وَالْكُفْرُ عَدَمُ الْإِيمَانِ (اور کفر ایمان نہ ہونے کا نام ہے) اس قول میں اسکا اشارہ اسطرف ہے کہ ایمان وکفر میں کوئی واسطہ نہیں جیساکہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ إِمَّا مَعَ الضِّدِّ أَوْ بِدُونِهِ (ضد کے ساتھ یا بغیر ضد (مخالف کے) وہ یہ بھی کہتا ہے۔ وَالْفِسْقُ الْخُرُوجُ عَنْ طَاعَةِ اللّٰهِ مَعَ الْإِيمَانِ (فسق اللہ تعالٰے کی اطاعت سے نکل جانا ہے۔ سلامتی ایمان کے باوجود) یعنی وہ فسق جو ارتکاب معصیت کہلاتا ہے یہ ایمان سے منافات نہیں رکھتا۔ اور مومن فاسق ہوسکتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے۔ وَالنِّفَاقُ إِظْهَارُ الْإِيمَانِ مَعَ إِخْفَاءِ الْكُفْرِ۔ وَالْفَاسِقُ مُؤْمِنٌ مُطْلَقًا۔ (کفر چھپا کر ایمان کا اظہار نفاق ہے۔ اور فاسق مطلقاً مومن ہے یعنی احکام دنیا و آخرت میں مثلاً تجہیز و تکفین، دعائے معفرت، صدقات، تحریم لعن و تبرا۔ بحیثیت ایمان اس کی محبت واجب ہوتے ہیں، یا دخول جنت میں گو بعد از عذاب ہی ہو۔ اسکے لیے پیغمبر کی شفاعت ہوتی ہیں، اور اس امکان میں کہ اللہ تعالٰے اسے معاف کرے جیساکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ادَّخَرْتُ شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ وَلِوُجُودِ جِدِّهِ وَالْكَافِرُ مُخَلَّدٌ فِي النَّارِ وَعَذَابُ صَاحِبِ الْكَبِيرَةِ مُنْقَطِعٌ لِاسْتِحْقَاقِ الثَّوَابِ بِإِيمَانِهِ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَلِقُبْحِهِ عِنْدَ الْعُقَلَاءِ وَالسَّمْعِيَاتُ مُتَأَوَّلَةٌ وَدَوَامُ الْعِقَابِ مُخْتَصٌّ بِالْكَافِرِ وَالْعَفْوُ وَاقِعٌ لِأَنَّهُ حَقُّهُ تَعَالَى فَجَازَ وُقُوعُهُ

میں نے شفاعت گناہ کبیرہ کرنے والوں یا اسکی کوشش کرنے والوں کیلیے اٹھا رکھی ہے اور کافر تو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اور کبیرہ کے مرتکب کا عذاب ختم ہوجائے گا کیونکہ ایمان کی وجہ سے وہ مستحق ثواب بھی تو ہے۔ جیسے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے ضرور دیکھ گا (یعنی اسکا اجر پائے گا) عقلاء کے نزدیک یہ قبیح ہے اور سمعیات قابل تاویل ہیں۔ عذاب کی ہمیشگی کافر کے ساتھ مخصوص۔ گناہ کی معافی ضرور ہوگی کیونکہ وہ اللہ تعالٰے کا حق ہے، جو وقوع میں آئے گا۔

لہذا خواجہ نصیر کے پورے کلام سے پتہ چلا کہ فاسق پر لعنت بھیجنا اور اس سے بیزاری ظاہر کرنا، جائز نہیں بلکہ اسکی شان دوسرے مومنوں کی طرح ہے کہ اس کی مغفرت کی دعا بھی کی جانی چاہیئے اس کے لیے بھی ایصال ثواب ہونا اور صدقہ وخیرات کی جانی چاہیئے تاکہ عذاب سے چھٹکارا پاوے اسکی نجات اور اس کے لیے پیغمبر کی شفاعت کی امید رکھنی چاہیئے۔ اور جب تک اس میں ایمان موجود ہے اس سے محبت رکھنا واجب ہے اور اس سے عداوت دینی نقطہ نظر سے حرام ہے۔ کیونکہ تبرا اور گالی اس وقت تو خیر ٹھیک ہوسکتی ہے کہ اس میں محبت کی کوئی وجہ موجود نہ ہو اور اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اسکی موت کفر پر ہو۔ اس لیے کہ کفر کے ہوتے پھر کسی عمل خیر کا کوئی اعتبار نہیں۔ فسق وگناہ کے سبب اس سے اظہار بیزاری جائز نہیں ہاں اسکے فعل فسق وعصیان سے بیزاری ضرور ظاہر کرنی اور اسے برا سمجھنا چاہیئے۔

خواجہ نصیر نے تجرید میں یہ بھی کہا ہے۔ وَالْإِحْبَاطُ بَاطِلٌ لِاسْتِلْزَامِهِ الظُّلْمَ لِقَوْلِهِ تَعَالَىٰ

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ (اعمال کی سوخت غلط بات ہے اسلیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول، جو ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اس کا اجر پائے گا، کی روشنی میں ظلم کو لازم کرتا ہے) لہذا جب تک اس سے کفر سرزد نہ ہو اس کا کوئی عمل سوخت نہ ہوگا۔

مقدمہ (۶) بالاتفاق صحابہ کرام، ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہم سے وہ چیز صادر نہیں ہوئی جو ان کے کفر کا سبب ہو کر ان کے اعمال حبط کرنے کا باعث بنتی۔ یا حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے قائم ربط کو گھٹاتی یا کم کرتی یا اعتبار کھوتی سوائے اس کے فدک جیسے معاملات میں خلافت وغصب حقوق اہل بیت کے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخالفت رونما ہوئی اور نوبت محاربہ تک پہنچی۔ اب ذرا یہاں یہ غور کر لیا جائے کہ علماء شیعہ کے نزدیک یہ مخالفت، محاربہ، غصب کفر ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں خواجہ نصیر طوسی کا قول مشہور ہے۔ کہ مخالفوہ فسقہ ومحاربوہ کفرۃ (انکے مخالف فاسق ان سے لڑنے والے کافر ہیں) لہذا اصحاب میں سے جنہوں نے صرف مخالفت کی وہ تو تبرا کے لائق نہیں کیونکہ ان کے عمل کو کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ فسق کہہ سکتے ہو۔ اور فاسق مومن ہے۔ تو گویا شیخین اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم پر خود اصول شیعہ کے مطابق تبرا جائز نہیں اور اتنی بات کا ان کے محقق علماء نے بھی اعتراف کیا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں تحریر کیا ہے کہ شیعوں کے بارے میں اہل سنت کا یہ کہنا کہ وہ شیخین (رضی اللہ عنہما) کو کافر ٹھیرا لیتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ کتب اصول شیعہ میں نہ اسکی کوئی بنیاد ہے نہ اصلیت ان کا مذہب صرف اسیقدر ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے مخالف فاسق ہیں اور ان سے لڑنے والے کافر جیساکہ نصیر الدین طوسی نے تجرید میں لکھا ہے اور بمقتضائے حدیث حربك حربي وسلمك سلمي (تیری لڑائی میری لڑائی اور تیری صلح میری صلح ہے) یہی ثابت ہوتا ہے اور ظاہر بھی ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تو نہیں بلکہ جنگ وقتال کئے اور تلوار و بھالے کی زحمت برداشت کئے بغیر اپنے لاؤ لشکر اور پیروؤں کی زیادتی کے سبب انکے حق کو سلب کیا اور رسول کی خلافت کے حق کو غصب کیا، (شوستری کا بیان ختم ہوا)

ملا عبد اللہ مشہدی، مصنف کتاب اظہار الحق۔ اس اصل پر۔ بحث کرتے ہوئے اس کا جواب لکھتا ہے۔ بحث یہ کہ اگر کوئی کہے کہ خلافت مرتضی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اگر نص صریح نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے ہیں، اور اگر ہے تو جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی ان کا مرتد ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس بحث کو بجنسہ لکھکر لکھتا ہے کہ جس نص کا انکار موجب کفر ہے وہ یہ ہے کہ نص شدہ کو باطل خیال کریں اور اس نص میں سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی معاذ اللہ تکذیب کریں۔ لیکن حق تو ان کا مانتے ہیں مگر اغراض دنیاوی، مصالح سیاسی، یا مال وجاہ کے سبب اسے نظر انداز کر دیں تو یہ فسق وعصیان ہوگا کفر نہیں ہوگا مثلاً زکوۃ باجماع امت واجب ہے اور قرآن وحدیث سے منصوص ہے لہذا جو اس کا انکار کرے گا مرتد ہو جائے گا۔ اور جو وجوب کا تو معتقد ہو مگر پیسے کی محبت یا بخل کے سبب ادائیگی سے روگردانی کرتا ہے تو وہ اپنے اوپر گناہ کا بوجھ لاتا ہے۔ اور یوں گنہ گار ہوتا ہے۔ جن حضرات نے خلیفہ اول کی ہے خلافت پر اتفاق کیا وہ یہ نہیں کہتے تھے۔ کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پر نص، مگر صحیح نہیں کہا۔ بلکہ بعض اوقات بعض لوگ تو یہ کہتے کہ اس سلسلہ میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص مذکور نہیں اور بعض دوسرے کلام

پیغمبر علیہ السلام میں رکیک تاویلات کرتے۔ (اس کی بات ختم ہوئی)
ان کے اس کلام سے چند مفید نتائج حاصل ہوئے۔ اول تو یہ کہ نص کے معنی سے انکار یا اس کے مدلول میں فاسد تاویل سے کفر لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ ایک قسم کا فسق اعتقادی ہے جیسے اہل سنت کے ہاں خطائے اجتہادی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دوسرے فدک کا غصب یا قرطاس نہ دینا، یا اسکے علاوہ امور جو بعض حضرات سے صادر ہوئے اور اسکا سبب حدیث نحن معاشر الانبیاء لانرث ولانورث، یا آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ سے استدلال ہو تو یہ بھی کفر نہیں بلکہ فسق اعتقادی ہی کی ایک شکل ہے۔ جسے ہم خطائے اجتہادی کہتے ہیں۔ اسلیے کہ جب امامت کے مسئلہ کی نص میں باطل تاویل کفر کا سبب نہ بن سکی تو مسئلہ میراث یا کچھ لکھدینے میں جو مسئلہ امامت سے بالاتفاق ہزاروں درجہ کم ہیں آیت وحدیث سے تمسک کرنا کیوں کفر کا سبب ہوگا اس کی تصریح خود انہوں نے بھی اپنے ہاں کی ہے۔
خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مسئلہ خلافت میں اختلاف جب تاویل کی بنا پر ہو تو وہ اعتقادی فسق ہے۔ اس سے ہی یہ لازم آیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل کا اعتقاد انکے ہاں حقیقت ایمان میں داخل نہیں بخلاف نماز روزہ وزکواۃ کی فرضیت کے اعتقاد کے۔ اس فرق کو جو کہ پورے فرقہ کا اجماعی ہے قیمتی ثبوت اور دستاویز کی طرح ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔ یہ تو خود اپنے ہاتھ پاؤں کاٹنے والی بات ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ اسی لیے یہ سب خواجہ نصیر طوسی کا قول بطور گواہی بڑے زور کے ساتھ پیش کرتے ہیں گویا میدان مار لیا ہو۔ جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے والوں کا ایمان خود انہیں کے محققین کے اقرار واعتراف سے ثابت ہوگیا تو اب ان کے ظاہری اعمال واخلاق کی بحث لانی چاہیئے جو ان کے حسن سیرت پر دلالت کرتی ہے۔
آیت يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ الخ۔ کے ذیل میں ملا عبداللہ مشہدی رقمطراز ہے کہ صرف شہادتین کا اقرار اور اجمالی تصدیق ہر اس چیز کی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لائے۔ اسلام کا ایک مرتبہ ہے اور جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پوری امت اجابت یہ مرتبہ رکھتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت ونگرانی کے وعدہ کے سبب اس مرتبہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ عقیدہ اسلامی کا اسی قدر حصہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے کافی تھا۔ مثلاً مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکالدینا۔ مرتدین ومنکرین زکوۃ سے قتال، یا مدعیان نبوت سے جنگ۔ یا فارس وروم کے کافروں سے جہاد۔ اور جنہوں نے خلافت وریاست کے حصول کا قصد کیا، انہوں نے ان امور میں انتہائی جد وجہد اور کدوکاوش اختیار کی کہ لوگوں کی نظر میں استحقاق امیر خلافت پر دھبہ نہ آجائے اور ان میں سے بہت سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پاتے کے سبب اور قرب زمانہ کے باعث ان میں صحبت کی برکتیں موجود ہونے کی وجہ سے یہ حضرات صاحب زہد وورع وتقویٰ بھی تھے۔ جو مالیات محرمات ظاہریہ سے بھی محترز رہے۔ بلکہ بعض مباح اور جائز لذتوں کو بھی ترک کردیا۔ ان سے جو کچھ غفلت وسستی عمل میں آئی وہ امر خلافت اور حقوق اہل بیت میں تھی۔ (انتہی کلامہ)
اس تحریر سے معلوم ہوگیا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت شریف کی برکت سے اور اس برکت شریف کے ان کے جان ودل میں گھر کرلینے سے یہ نفوس مقدسہ اصل ایمان کے علاوہ ورع زہد وتقویٰ سے بھی آراستہ تھے۔ نیز

یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کا پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق صحبت خلوص قلب کے ساتھ تھا۔ نفاق وظاہر داری کی تو ان حضرات کو ہوا بھی نہیں لگی تھی یہ نہ ہوتا تو صحبت مبارک سے اکتساب فیض اور حصول برکت کیسے کر سکتے تھے۔

اب یہاں عقلاء کے لیے قابل غور بات یہ ہے کہ جب خود انہی کے (بلا جبر واکراہ برضاء ورغبت خود) اقرار واعتراف سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایمان، ورع، تقوی، اور زہد ان میں بالیقین موجود تھا تو اسکے بعد یہ دعوے کرنا کہ امر خلافت اور اہل بیت کے حق میں ان سے گناہ صادر ہوا ایک یقینی الثبوت چیز کے خلاف دعوی کرنا ہے۔

معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل کسی دلیل سے تمسک یا کسی نص کے فہم کے سبب ہی وقوع میں آیا ہوگا کیونکہ جب صحبت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم نے ان میں اتنا اثر کر لیا کہ وہ اتقاء زہد اور ورع کے لیے روشن پیکر بن گئے۔ کہ اپنے پرائے سب انکی ان خوبیوں کو سراہنے لگے۔ تو ایسی صورت کے بعد ان کے متعلق یہ تصور کر لینا کہ انہوں نے یہ حرکت دنیاوی لالچ یا حُب مال وجاہ کی خاطر دیدہ ودانستہ کی۔ ایسی متضاد بات ہے جو کوئی بھی عقلمند نہیں کہہ سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت پر تو حرف آئے گا مگر انکے زہد وتقوی وورع، اور محرمات سے بچنے کی صفت کہاں بچیں گی جس کا انہوں نے خود ہی اعتراف کیا اور انہوں نے اپنی تحریر میں جو یہ جملہ ٹانک دیا ہے کہ ،، وہ یہ کدو کاوش اسلیے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظروں سے گر کر امر خلافت کی اہلیت نہ کھو دیں۔ تو یہ انکی اٹکل اور بے سر وپا ہوائی ہے بلکہ پھڑکتے اور دھڑکتے دل کو تھامنے کی کوشش ناکام ہے۔ یا پھر دل کی باتیں جاننے کا دعوی ہمیں اتنے تکلفات میں پڑنے کی تکلیف ہی نہیں دی گئی۔ ظاہری حال کے مطابق تکلیف دی گئی ہے۔ کسی کو بظاہر اچھا دیکھیں، اچھا سمجھیں، اچھا کہیں۔ اور پھر یہاں تو اس ظاہر کے ساتھ ساتھ اسکا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ انکے حالات کی حسن وخوبی صحبت شریف کی برکت سے تھی تو لا محالہ اس صحبت نے ان کے باطن پر بھی تو اثر کیا ہوگا۔

بہر حال یہ بات طے ہے کہ علماء شیعہ کے اعتراف سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جماعت کے خصائص وفضائل کرسی نشیں ہو گئے۔ اور ثابت ہو گیا کہ وہ باایمان تھے زاہد ومتقی، اور ورع والے تھے۔ محرمات سے اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ بعض مباحات سے بھی بچتے تھے۔ اسلام کو رائج کرنے مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کفار فارس وروم کے ساتھ جہاد کرنے میں انہوں نے کوشش کی۔

اب ہم اس بحث کا آغاز کریں گے کہ ان حضرات عالی وقار اور والا تبار کا درجہ اور مقام اللہ تعالے کے نزدیک کتنا بلند اور عالی تھا۔ اور انکے اعمال صالحہ کو دربار خداوندی میں کیسی پذیرائی ملی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالے کی رضا اور خوشنودی سے بڑھ کر کوئی مرتبہ عالی اور بلند نہیں ہو سکتا۔ جسکو اللہ تعالے پسند فرمائے وہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو تمام اہل ایمان میں مقبول ہوگا۔ فرمایا۔ وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ ملا عبد اللہ مشہدی صاحب کتاب اظہار الحق نے کہا ہے کہ اس آیت سے صحابہ کی فضیلت پر اہل سنت کا استدلال ہر صورت میں صحیح ہے۔ اسکے جواب میں امامیہ کی مشہور باتیں اپنی روش کے مطابق نہ جاندار ہیں نہ کوئی قوت رکھتی ہیں۔ البتہ مشہور باتوں کے خلاف جواب دے سکتے ہیں۔

فریق مخالف کے طریق استدلال کی جو صورت ہے وہ تفسیر نیشاپوری میں یوں ہے۔

قَالَ اَھْلُ السُّنَّةِ لَا شَكَّ اَنَّ اَبَا بَكْرٍ سَبَقَ اِلَى الْھِجْرَةِ فَھُوَ مِنَ السَّابِقِيْنَ وَقَدْ اَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِاَنَّهٗ رَضِيَ عَنْهُ وَلَا شَكَّ اَنَّ الرِّضٰى مُعَلَّلٌ بِالسَّبْقِ اِلَى الْھِجْرَةِ فَيَدُوْمُ بِدَوَامِهٖ فَدَلَّ ذٰلِكَ عَلٰى صِحَّةِ اِمَامَتِهٖ وَعَدَمِ جَوَازِ الطَّعْنِ فِيْهِ۔

اہلسنت نے کہا ابوبکرؓ نے ہجرت میں سبقت کی تو وہ سابقین میں سے ہوئے اور سابقین سے اللہ تعالے راضی ہوا تو ان سے بھی راضی ہوا اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ ہجرت میں سبقت ہی رضامندی کا سبب ہے اور ہجرت کی سبقت دائمی ہے لہذا اللہ تعالے کی رضا بھی دائمی رہے گی۔ معلوم ہوا ان کی امامت صحیح ہے اور ان پر طعن ہرگز جائز نہیں۔

اس کلام کے بعد ملا مشہدی کہتا ہے کہ اس بات کا یہ جواب دینا کہ ہجرت و نصرت کی سبقت میں ایمان شرط ہے اور وہ شخص معاذاللہ کبھی ایماندار تھا ہی نہیں حتی کہ امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناخوشی ظاہر ہونے سے پہلے بھی انصاف سے بہت دور تھا۔ اور یہ کہنا بھی بلا مقصد ایک تکلف ہی ہے کہ سابقین ہجرت و نصرت سے وہ لوگ مراد ہیں، جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلافت بلافصل کی تصدیق کی ہو اور امر خلافت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کیا ہو کیونکہ آیت کے کسی لفظ سے اس قید کا پتہ نہیں چلتا۔ (انتہی کلامہ)

ملا جی کے اس کلام سے یہ بات صاف سمجھی جاسکتی ہے کہ جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امامت سے انکار بھی آیت کے عموم میں تخصیص نہ پیدا کر سکا تو دوسری کوتاہیاں مثلاً فدک وغیرہ جو وقوع میں آئیں۔ کہاں تخصیص پیدا کر سکیں گی۔ کیونکہ آیت میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو اس قید کی طرف اشارہ کرے۔

پھر عبداللہ مشہدی کہتا ہے بہتر ہے یوں جواب دیا جائے کہ یہ آیت صرف اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالے مہاجرین والنصار کے سابقین سے اور اس ہجرت و نصرت میں پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی سبقت سے راضی ہوا۔ اور جب وہ انکے کسی فعل سے راضی ہوا تو لامحالہ اسکی جزا جنت میں ہمیشہ رہنے سے ہوگی۔ اور ظاہر ہے دخول جنت رضائے الٰہی پر موقوف ہے اور وہ موقوف اس رضائے الٰہی کے آخر عمر تک باقی رہنے پر حسن خاتمہ کے ساتھ اور ایمان کی بقاء کے ساتھ اور اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ایسے اعمال صادر نہ ہوں جو اچھے اعمال کو سوخت کر دیں، انتہی کلامہ

یہ تو انکے ہاں کے چوٹی کے دانشمندوں کی لیاقت علمی اور حافظہ کا حال ہے کہ وہ اپنے ہی کلام کے ہر پہلو کا بھی لحاظ نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ اپنے اصول وعقائد ہی انہیں یاد رہتے ہیں۔

اول تو بروئے قواعد واصول یہ آیت اس مضمون پر صحیح طور سے دلالت نہیں کرتی جسکی اس نے تقریر کی ہے کیونکہ آیت کا مقصد رضامندی ظاہر کرنا ہے۔ مہاجرین والنصار کی ذاتوں سے اور جب انکی ذاتوں کو ہجرت و نصرت کے خاص وصف سے یاد کیا ہے تو یہ لازم آیا کہ یہ وصف تعلق رضا کا سبب ہو نہ یہ کہ رضا کا تعلق اسی سے ہو اور متعلق رضا ہونے اور تعلق رضا کا سبب ہونے میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ ملا تو خیر خاص اس رسیدہ ہے مکتب کے بچے بھی اس فرق کو جانتے ہیں۔

اگر کلام اللہ میں اسی طرح دھاندلی چلنے لگے تو کسی بھی مقصد میں استدلال کی صورت قائم نہیں ہو سکتی مثلاً آیت موالات صرف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ تمہاری ولایت اس وصف کے ساتھ متعلق ہے

یعنی نماز قائم کرنے اور بحالت رکوع زکواۃ دینے سے اور یہ وصف بشرط ہے اچھے خاتمہ اور فلاں فلاں باتوں سے اسی طرح کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔
دوسرے یہ کہ جب اس عمل کی جزا بالیقین جنت کی دائمی رہائش ہوئی تو اس جزا سے روکنے والی دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں یا کفر و ارتداد، یا وہ بداعمالیاں جو اچھے اعمال کو سوخت کر دیں۔ اول صورت میں مخالفوہ فسقہ کا قاعدہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ ملا عبداللہ مشہدی نے مذکورۃ الصدر جواب و سوال کے ذیل میں اعتراف کیا ہے کہ کسی تاویل باطل کی بنا پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت سے یا نص سے انکار موجب کفر نہیں۔
اور قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں یہ لکھ چکا ہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما مرتد نہیں اور یہ سب کچھ بیان ہو چکا ہے۔ دوسری صورت میں خود اپنے عقائد کے خلاف کرتا ہے۔ نصیر الدین طوسی تجرید العقائد میں کہہ ہی چکا ہے کہ حبط اعمال ایک قسم کا ظلم ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ملاجی کو اپنا یہ عقیدہ ایسا فراموش ہوا اور سخن پروری میں وہ اتنے غرق ہوگئے کہ خلفاء کے اعمال حبط کرنے والے گناہوں کی گنتی اور تعیین کرنے لگے۔ کہ چار اعمال کو حبط اعمال کا سبب بھی بیان کر ڈالا۔ اول یہ کہ وہ غزوہ احد میں جنگ سے بھاگے دوم خلافت مرتضی کو غصب کیا۔ سوم فدک بھی دبا لیا چہارم جناب فاروق نے قرطاس وقلم میں رکاوٹ ڈالی، حالانکہ اپنے کلام مذکورۃ الصدر میں خود اعتراف کر چکا ہے کہ امامت مرتضی سے انکار بھی آیت میں تخصیص پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اسکو رضا اور خوشنودی سے کوئی منافات نہیں۔ جب وہ رضامندی کے منافی ہی نہیں تو اعمال کسطرح سوخت کرے گا۔ اگرچہ تمام شیعوں کے نزدیک بدلیل آیت لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ اعمال کا سوخت ہونا کفر و شرک کا خاصہ ہے۔ اور احد کے دن بھاگنا اول تو از روئے قرآن معاف ہو چکا ہے دوسرے وہ اس آیت کے نازل ہونے سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ کس طرح اعمال کے حبط و سوخت کا سبب بنے گا۔ کہ اول تو عفو الٰہی کے باعث گویا نسیاً منسیاً ہوا۔ پھر اس آیت کے نزول کے بعد اگر وہ عمل حبط ہو چکا تھا تو حبط شدہ اعمال کے ساتھ رضائے الٰہی کا وابستہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔
اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ توبہ آخر میں نازل ہے۔ اور جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی اور خلافت مرتضی کو غصب کر لینا باعتراف فضلائے شیعہ کفر نہیں تو اس سے اب حبط اعمال کی صورت کب متصور ہو سکتی ہے۔ اور فدک کا تو غصب واقع ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے لیکر اپنے قبضہ میں نہیں لیا بلکہ میراث یا ہبہ ناتمام کی روک تھام کی ہے۔ اسے غصب کوئی فاتر العقل ہی کہہ سکتا ہے۔
اور پھر اسکے باوجود یہ روکنا بھی ایک حدیث مشہور کے سبب سے تھا اس لیے وہ گناہ بھی نہ تھا کفر تو دور کی بات ہے اور اعمال سوخت ہو جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ رہا قرطاس وقلم کا معاملہ تو شیخین رضی اللہ عنہما نے اس سے بالکل نہیں روکا ایتونی بقرطاس کے مخاطب صرف شیخین رضی اللہ عنہما تو نہ تھے۔ تمام بنی ہاشم اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم شریک ہیں جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے تو مشورہ دیا تھا اور مشورہ حبط اعمال کا سبب کس اصول قاعدے سے ہوگا۔
حاصل کلام یہ کہ یہاں ملاجی کی بے دست و پائی دیکھنے کے لائق ہے بےچارہ چاروں طرف ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ مگر مقصد کا کوئی پتہ ہاتھ نہیں لگ پا رہا۔

اسی طرح دوسری آیات اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ الخ اور وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللهِ الخ اور اِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ الی آخر السورۃ۔ ان آیات مذکورہ بالا میں ملا محمد عبد اللہ مشہدی اور انکے ساتھ دوسرے شیعہ علماء نے بہت ہاتھ پاؤں مارے بہت کوشش کی کہ ادھر اُدھر سے کوئی مفید مطلب بات پلے پڑ جائے مگر۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، بالآخر ہار تھک کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور چار و ناچار ان حضرات کے مراتب عالیہ کے قائل ہو گئے۔ یہ ہے ان شیعوں کے نزدیک ان مہاجرین و انصار کا حال جو ان کے خیال میں جناب امیر رضی اللہ عنہ و اہل بیت رضوان اللہ علیہم کے مخالف تھے جن میں خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم بھی شامل تھے۔

اب رہا معاملہ ان مہاجرین اولین کا جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محاربہ کیا۔ مثلاً ام المومنین، جناب طلحہ و زبیر، رضی اللہ عنہم تو ان کے معاملہ میں شیعہ حضرات بڑے چکر اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ انکے اگلے لیڈر تو مخالف اور محارب میں کوئی فرق نہیں کرتے وہ تو سب کو کافر کہتے اور سب پر سب و شتم کرتے اور تبرا بھیجتے ہیں، مگر ان کے پچھلے سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے امامت کو نبوت کا درجہ دیکر اسکے منکر کو کافر شمار کیا تو اصول مذہب میں بڑی گڑبڑ پیدا ہو جائیگی۔ ایک خلل اور گڑبڑ تو یہ ہے کہ حضرات ائمہ بلا کسی تکلف اور بغیر کسی مجبوری کے ان حضرات سے رشتہ مناکحت قائم کرتے اور اپنی لڑکیاں انکو دیتے بھی ہیں اور ان سے لیتے بھی ہیں۔ چنانچہ جناب سکینہ رحمۃ اللہ علیہا کا جناب مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ اور جناب قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی لڑکی سے جناب امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح کیا۔ اور اسی طرح کا عمل تمام حضرات ائمہ کے درمیان قائم، دائم، جاری رہا۔ غرض ان حضرات کا معاملہ منکرین امامت کے ساتھ ہرگز ایسا نہ تھا جیسا کہ انکا معاملہ منکرین نبوت کے ساتھ۔ اور ہر امام کی امامت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت کی طرح ہے۔

دوسری گڑبڑ یہ کہ خود انکے اپنے عزیز و اقارب ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے مثلاً محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت سے منکر تھے۔ اور ان سے اختلاف رکھتے اور جھگڑا کرتے تھے۔ اور حجر اسود سے فیصلہ طلب کرنے کے بعد بھی اور اسکی شہادت کے باوجود جو جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں تھی اپنی امامت کے دعوے سے دست بردار نہ ہوئے۔ اور دنیا سے کوچ کے وقت اپنی اولاد کے حق میں امامت کی وصیت کر کے رخصت ہوئے۔ اور نذر و نیاز اور خمس وغیرہ جو کچھ مختار ثقفی ان کو بھیجتا اس میں جناب زین العابدینؒ کو بالکل شریک نہ کرتے۔ یا مثلاً زید شہید رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ اپنی ہی امامت کے مدعی تھے۔ اور امام محمد باقرؒ کی امامت کے منکر۔ انہوں نے اس بارے میں ہشام بن الحکم سے مناظرہ بھی کیا، مگر اس دعوی سے دست بردار نہ ہوئے حتی کہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کی اولاد یحیی و متوکل جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے برسر پرخاش رہے۔ پھر اسی طرح جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد آپس میں لڑتی رہی۔ مثلاً عبد اللہ افطح اور اسحق بن جعفر اپنی اپنی امامت کا دعوی کرتے رہے۔ اور اگر امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو لیں تو ان میں سے بھی ایسے افراد مثلاً نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تھے جو اپنی امامت کے مدعی ہوئے۔ اور دوسرے ائمہ کی امامت کے منکر۔ اور معاملہ تو تو میں میں سے گذر کر جنگ و قتال تک پہنچتا تھا۔ اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ بلکہ ان کے پیرووں نے تو آپس

میں کشت وخون کیا ہے اور یہ ساری تفصیلات کتب تاریخ والنساب کے اوراق میں مذکور ہے۔
لہذا اگر انکار امامت انکار نبوت کی طرح کفر ہو تو یہ سب کے سب حضرات کافر ٹھہرتے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ حضرات ائمہ جنہوں جناب زید شہید اور محمد بن الحنفیہ رحمہما اللہ یا ان جیسے حضرات کے بارے میں خوبی وفلاح کی شہادت دی ہے وہ جھوٹے قرار پاتے ہیں۔
اور اگر یہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد امام وقت کے انکار کے بعد بھی کافر نہیں ہوتی مگر دوسرے ہوجاتے ہیں تو موجبات کفر میں تفاوت واختلاف اور تمیز لازم آتا ہے۔ حالانکہ موجبات کفر میں بالاتفاق کوئی تفاوت نہیں خواہ امام زادہ ہو یا علوی، ادھر زبان سے کلمہ کفر نکلا ادھر کافر ہوا۔ بالآخر مجبور ولاچار ہوکر یہ کہنا پڑا کہ منکر امامت کافر نہیں ہوتا۔ پھر مخالف ومحارب میں فرق نکال بیٹھے کہ منکر مخالف ہے اور مخالف فاسق اور محارب کافر لیکن یہاں ایک اور خرابی لازم آگئی۔ کیونکہ انکار امامت کفر نہیں اور محاربہ انکار کو لازم ہے جبکہ امام اپنا تصرف چاہتا ہے تو گویا کفر غیر کفر کو لازم ہوگا حالانکہ یہ محال ہے جو حکم لازم کا ہے وہی ملزوم کا ہوتا ہے۔ لہذا انکار بھی کفر ہوگا۔
یہ بھی ظاہر ہے کہ محاربہ خود انکار کا ایک مرتبہ ہے۔ کیونکہ جب امام تصرف کا ارادہ کرے تو انکار کی یہی شکل ہوگی اکثر شیعوں نے اس بات کا جواب اس طریقہ سے دیا ہے کہ اگرچہ قاعدہ کا تقاضہ یہی ہے کہ جب کسی چیز کا انکار کفر نہ ہو تو اس چیز کے مالک کے ساتھ محاربہ بھی کفر نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ محاربہ انکار ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس قاعدہ کو خلاف عقل ہم نے محاربان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں ترک کردیا ہے اس لیے کہ ہم کو متفق علیہ حدیث حربك حربی وسلمك سلمی پہنچی ہے۔
انکے اس جواب میں بچند وجوہ خلش موجود ہے۔ اول یہ کہ یہ کلام مجاز پر محمول ہے حرف تشبیہ کے حذف کے ساتھ۔ یعنی حربک کا نہ حربی۔ اس لیے کہ معنی حقیقی تو بہرحال ممکن ہی نہیں ظاہر کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حرب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حقیقۃً تو حرب نہیں تھی بلکہ حکماً تھی۔ جب مجاز بحذف حرف تشبیہ ہوا تو اس حدیث سے اس کا مذموم وقبیح ہونا تو معلوم ہوا۔ مگر کفر نہیں ہوا کیونکہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کا تمام احکام میں یکساں ہونا لازم نہیں، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بہت سے صحابہ اور متعدد قبائل مثلاً اسلم، غفار، جہینہ، مزنیہ کے حق میں ارشاد فرمائے حالانکہ بالاتفاق ان سے محاربہ کفر نہیں۔
دوسرے یہ کہ کلام کے معنی یہ ہیں حربك بالتخصیص حربی۔ پس بہت سی جماعتوں کی لڑائی مثلاً قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی جن میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہوں گے حرب رسول نہ تھی۔ اور اس قسم کا اضمار مشہور بھی ہے اور رائج بھی۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے دوست سے کہے جو تیرا بدخواہ میرا بھی بدخواہ ہوگا۔ اور وہ دوست ایسی جماعت کے زمرہ میں ہے جنکا کوئی بدخواہ کسی امر عام مشترک کے سبب سے ہے تو وہ شخص عموم کلام میں داخل نہ ہوگا۔ نہ بروئے لغت نہ بلحاظ عرف اور صحابہ کرام اور ام المومنین رضی اللہ عنہم خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے بلکہ انکا تو قاتلین عثمان سے پورا قصاص لینے کا مطالبہ تھا جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی اسی لشکر میں شریک تھے تو لامحالہ ان سے بھی لڑائی ٹھنی۔
تیسرے حَرْبُكَ حَرْبِي. عَدَاوَتُكَ عَدَاوَتِي سے کنایہ ہے۔ ظاہر ہے یہ حضرات جناب امیر رضی اللہ عنہ سے

سے عداوت نہ رکھتے تھے ۔ نہ انکی لڑائی عداوت کی بنا پر تھی محض دفع فساد کیلیے مقابلہ کی نوبت آئی اور بات جنگ وقتال تک جا پہنچی ۔

چوتھے یہ کہ تمام اختیاری امور میں قصد وارادہ شرط ہے تاکہ وہ مدح وذم کا مصداق بن سکے ۔ مثلاً ایک شخص کہے جو اس برتن کو توڑے گا میں اس کے ساتھ ایسا ایسا کروں گا ۔ اب ایک شخص نے چلنے میں ٹھوکر کھائی اور اسکا پاؤں برتن سے لگا اور برتن ٹوٹ گیا تو بالاجماع اسے برتن توڑنے والا نہیں کہا جائے گا ۔ اور وہ اس دھمکی کا مصداق نہیں ہوگا ۔ چنانچہ معتبر تاریخوں کی رو سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے انکی لڑائی بالکل اسی نوع کی تھی ۔

پانچویں یہ کہ ہم تسلیم بھی کرلیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی لڑائی بہرحال محاربہ رسول ہے ۔ لیکن محاربہ رسول بھی تو مطلقاً کفر نہیں ۔ البتہ نبوت اور رسالت کے انکار کے ساتھ کفر ہے ۔ دنیا اور مال کی طمع کے ساتھ کفر نہیں اسپر وہ آیت دال ہے جو قطاع الطریق کے حق میں وارد ہے اور ڈاکو بالاجماع کافر نہیں فاسق ہیں ۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا ۔ سود خوروں کے بارے میں بھی اسی قسم کی دھمکی آئی ہے ۔ حالانکہ وہ بالاتفاق کافر نہیں ۔ فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ۔ بلکہ یہاں تو ان فاسقین کے لیے خدا اور رسول ہر دو سے لڑائی لڑنا ثابت کیا ہے اور حدیث میں تو صرف حرب رسول کا ذکر ہے تو جب خدا اور رسول ہر دو سے لڑائی موجب کفر نہ ہوئی تو تنہا رسول سے محاربہ کیوں کفر ہوگا ۔ ہاں رسول کے ساتھ لڑائی دین کے انکار کے ساتھ اور اسلام کی توہین کی غرض سے ہو تو وہ بلاشبہ کفر ہے مطلق لڑائی کفر نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا کہوگے ؟ حضرت ہارون علیہ السلام سے محاربہ میں آپ نے کوئی تامل نہ کیا اور اتنا سخت محاربہ کیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام زاری کرنے لگے اور فرمایا ۔ یَا ابۡنَ اُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡیَتِیۡ وَلَا بِرَاۡسِیۡ ۔ محاربہ اور لڑائی میں اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی بمطابق اَنۡتَ مِنِّیۡ بِمَنۡزِلَةِ هَارُوۡنَ مِنۡ مُّوۡسٰی ۔ وہ رتبہ رکھتے تھے ۔ ادھر زوجہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قاتلین عثمان کا حامی اور معاملہ قصاص میں ٹال مٹول کرنے والا سمجھ کر ان سے رنجش و پرخاش رکھی ۔ دوسری حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا حامی اور حدود تعزیر میں سستی کرنے والا جان کر اپنے بڑے بھائی اور پیغمبر کی اہانت کی ۔ لہٰذا اگر محاربہ رسول کو کفر قرار دیا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا ۔ ان کا مقام کہاں ہوگا ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام اور اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ جو معاملہ کیا اور جو صدمات پہنچائے کیا وہ محاربہ سے کم اذیت ناک تھے ۔ پھر ان حضرات کو آپ کہاں اور کس مقام پر لے جا کر کھڑا کریں گے ۔

ایسے مباحث اور مواقع پر آدمی کو منصف مزاجی سے کام لینا چاہیئے اور ہر شخص کے مرتبہ اور مقام کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے ۔ دوسری طرف کی شخصیت کوئی گری پڑی ہستی نہیں زوجہ ومحبوبہ رسول ہیں ۔ جو قرآنی حکم کے مطابق ام المومنین ہیں ۔ اور اس طرح جناب امیر خود کی بھی ! ماں اپنے بیٹے کو اگرچہ قصور سے بری الذمہ ہو ڈانٹ ڈپٹ سکتی ہے ۔ زمانہ کا اونچ نیچ سمجھا سکتی ہے ۔ کسی بھی عمل کے متعلق بازپرس کر سکتی ہے ۔ ہم تم پوچھنے

جو نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کی ماں پر لعن طعن کریں، سب وشتم کریں، اور تبرا بازی کریں (یہ تو پرائے شگون اپنی ناک کٹائی ہوئی، یہ تو ماں بیٹوں کا قضیہ تھا یہاں حل نہ ہوا تو آگے بڑوں کی خدمت میں پہنچ کر طے ہو جائے گا اور سب باہم شیر و شکر ہو جائیں گے، کمبختی تو ان کی آئے گی جنہوں نے یہاں کرائے کے فوجیوں کا کردار ادا کیا، اپنی حیثیت کو بھول کر بڑے بول بولے۔ جنکی عزت وحرمت جزو ایمان تھی اسکے پاک دامن کو لعن طعن اور سب وشتم کے دھبوں سے داغدار کیا اور خوب دل کھول کر بڑی ڈھٹائی اور رعونت سے ڈنکے کی چوٹ برسر منبر دنیا کو گواہ بنا کر دیدہ ودانستہ اپنی عاقبت خراب کی اپنی گور کو آتش جہنم سے بھرنے کا سامان کیا، اور پھر مست وبے خود ہو کر نعرہ لگایا، شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم،،۔ ن) چنانچہ حضرت موسی اور حضرت یوسف علیہما السلام کے برادران پر زبان طعن دراز کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں جبکہ وہ برابر کے بھائی ہیں، اور یہاں تو ماں بیٹے کا تعلق ہے یہاں تو اور زیادہ محتاط ہونا چاہیئے، اگر فرق مراتب کا خیال نہ کیا اور ان کو بھول گئے، تو یاد رکھو زندیق کہلاؤ گے۔

حاصل کلام یہ کہ حدیث حربك حربي سے محاربان جناب امیر رضی اللہ کے کفر کے اثبات کیلیے تمسک کرنا قاعدہ کے لحاظ سے درست قرار نہیں پاسکتا اور بہت سے اصولوں کے خلاف رہتا ہے ان لڑائی لڑنے والوں کے نہ اعمال صالحہ کہیں جاتے ہیں اور نہ ان کا ایمان ضائع ہوتا ہے، اور یہی بغض وعداوت سب وشتم اور تبرا کو روکتے ہیں۔ اور محارب ومخالف کا فرق کسی طرح بھی سمجھنے میں آنے کے لائق نہیں۔

اس سلسلہ میں بھی علمار شیعہ کی آرا اور اقوال سنئے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں بیان کیا ہے کہ شیعیت کا مفہوم (خلاصہ) یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل تھے، اس سلسلہ میں سب وشتم اور لعن جائز نہیں اور خلفائے ثلاثہ (رضوان اللہ علیہم) کے نام زبان پر لانے کی گنجائش ہے۔ اگر جاہل شیعہ وجوب طعن کا حکم لگائیں تو ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں، اور شیعوں پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف خبث وفحش کی نسبت کرتے ہیں تو حاشا ثم حاشا ایسا ہرگز نہیں، فحش کی نسبت تو کسی عامی آدمی کی طرف بھی حرام ہے چہ جائیکہ حرم پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ نسبت کی جائے البتہ جب حضرت صدیقہ (رضی اللہ عنہا) وقرن فی بیوتکن کی مخالفت کرتے ہوئے بصرہ آئیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کا اقدام کیا اور بموجب حدیث حربك حربي وسلمك سلمي، جسکو فریقین مناقب امیر رضی اللہ عنہ میں ذکر کرتے ہیں کہ نہ جناب امیر کے ساتھ لڑائی مقبول ہے نہ حضرت پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ، اس لیے وہ قابل طعن ٹھہریں۔ اسی کے متصل دوسرے ہی سانس میں یہ بات بھی کہی کہ کتب شیعہ میں ایک ضعیف روایت یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں توبہ کی۔ لیکن لڑائی کا قصہ متواتر ہے اور توبہ کی حکایت خبر آحاد۔ بہرحال اس بات کی بنا پر ان پر طعن جائز نہیں،، (انتہی کلامہ)

اہل تاریخ اس سے بھی واقف ہیں، کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کسی لشکری کے حوالہ سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی توبہ بھی منقول ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی

حدیث یاد دلانا جس سے آپ کی خلافت کی حقیت ثابت ہوتی تھی، اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا معرکہ جنگ سے واپس ہو جانا بھی بطریق شہرت و تواتر مروی ہے تو ان روایات کی رو سے بھی شیعہ کے نزدیک ان اشخاص پر بھی طعن جائز نہ ہوگا۔ اور یہی مدعا ہے۔

واضح رہے کہ شیعہ اسلاف میں سے مثلاً عبد اللہ مشہدی اور انکے ساتھیوں نے اس عقیدہ سے رجوع کر لیا ہے کہ "حضرت امیر کا محارب کافر ہے"۔ اور صرف اتنے ہی پر قناعت کی ہے کہ جناب سے لڑائی کفر تو نہیں ہے لیکن فسق اور گناہ کبیرہ تک پہنچا دیتی ہے کیونکہ انہوں نے نص کی تکذیب بہر حال نہیں کی۔ اس میں کوئی غلط تاویل کی یا نص محاربہ سے انکار کر کے اسے حلال سمجھا۔ تو یہ صورت فسق اعتقادی کی ہے کفر کی نہیں، اُدھر خواجہ نصیر الدین طوسی بھی کوئی ایسا ویسا نہیں علماء شیعہ کے نزدیک اس کا قول بھی "وحی ناطق" کا درجہ رکھتا ہے خاص طور پر باب اعتقاد میں اسلیے ان کے متاخرین میں سے بعض نے ملا عبد اللہ اور خواجہ نصیر الدین کے اقوال میں تطبیق دی ہے کہ "بمقتضائے حدیث حربک حربی جناب مرتضی رضی اللہ عنہ سے لڑنے سے کفر لازم آتا ہے۔ اگرچہ التزام کفر نہ ہو۔ اور لزوم کفر شیعوں کے نزدیک بھی کفر نہیں۔ بلکہ التزام کفر، کفر ضرور ہے۔ لہذا خواجہ کا قول باعتبار لزوم ہے جو ظاہر حدیث کے موافق ہے اور جناب ملا اور اسکے ساتھیوں کا قول بلحاظ التزام ہے جب ان میں التزام کفر نہ ہوا تو ان پر مرتد کا لفظ راست نہ آیا"، انتہی کلامہ۔

حق یہ ہے کہ یہ کلام تکلف کا شاہکار ہے۔ اصول شیعہ میں اس سے بڑھ کر تکلف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ لیکن حدیث مشہور گو قابل تاویل ہے اور بالیقین اسکے حقیقی معنی مراد بھی نہیں پھر بھی یہ ان آیات قطعیہ سے بالکل نہیں ٹکراتی جو عام مہاجرین و انصار اور خصوصاً ازواج مطہرات اور ان دونوں بزرگوں (رضوان اللہ علیہم) کی شان میں وارد ہوئی ہیں۔ پھر شیعی قواعد کی رو سے بھی ان حضرات کا کفر صحیح نہیں بیٹھتا۔ بات جو زیادہ سے زیادہ کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ امام وقت کے خلاف لڑائی بغاوت ہے اور بغاوت فسق ہے کفر نہیں۔ اور اگر اسکی بنا بھی کسی تاویل یا شبہ پر ہو تو یہ بغاوت فسق بھی نہیں بلکہ خطائے اجتہادی ہے۔ یہ تھا شیعہ نکتہ نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ اور انکی خلافت کے متعلق،

اسکے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اہلسنت کا جو مذہب ہے وہ بھی زیر بحث لے آیا جائے۔ اور اسکو بھی ذرا تفصیل کے ساتھ ناظرین کے گوش گذار کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ فقہی اجتہادی مسائل مثلاً امامت، میراث پیغمبر، ہبہ قبل القبض کا تمام نہ ہونا، تقسیم خمس، حج تمتع، وغیرہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہرگز کفر نہیں، کفر کیا معصیت و گناہ بھی نہیں کیونکہ آپ بھی منجملہ مجتہدین ایک مجتہد تھے اور مسائل اجتہادیہ میں مجتہدوں کا اختلاف جائز ہے اور ہر مجتہد اجر کا مستحق ہے۔

ہاں بغض و عداوت اور عناد کے جذبہ سے جس نے آپ سے لڑائی لڑی وہ اہلسنت کے نزدیک بھی کافر ہیں اس پر سب کا اجماع ہے اور خوارج اور اہل نہروان کے بارے میں انکی یہی رائے اور مسلک ہے۔ اور حدیث حربک اسی قسم کے حرب پر محمول ہے۔ لیکن یہاں بھی لزوم کفر ہے التزام کفر نہیں تو ان پر مرتد کا اطلاق نہیں ہوگا اور انکا غیر معقول شبہ نصوص قطعیہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ کے خلاف ہے تو وہ انکے عذر کا سبب نہیں

بن سکتا۔ گویا اہلسنت کے نزدیک احکام اخروی میں خوارج کافر ہیں۔ انکے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ نہ نماز جنازہ پڑھنی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔
بغض وعداوت اور عناد کے جذبہ سے پاک محض کسی غلط شبہ، غلط فہمی یا غیر مناسب تاویل کی وجہ سے آپ سے لڑنے والے جیسے صاحبان جمل اور اصحاب صفین۔ تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلان اعتقادی میں مشترک ہیں فرق یہ ہے کہ اصحاب جمل کی یہ خطائے اجتہادی اور فسق اعتقادی کسی طور پر بھی طعن وتحقیر کو سند جواز عطا نہیں کرتا اسلیئے کہ انکی مدح خوانی، سبقت اسلامی ہیں اور جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم سے انکی قرابت ثابت ہوتے ہیں اور حضور سے انکے نسبی اور سسرالی رشتہ ثابت ہوتے ہیں نصوص قطعیہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ وارد ہیں، جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام کا معاملہ آپ کی عصمت اور علو مرتبہ پر جو قرآنی نصوص وارد ہیں وہ آپ پر طعن کرنے یا آپ کی تحقیر سے مانع ہوگئیں۔ جو آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں سرزد ہوا۔ وہ بے تاملی اور عجلت کی بنا پر ہوا ورنہ یہ سب کچھ للہ، فی اللہ تھا، شیطانی وسوسہ کا تو آپ کے لیے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔
رہا اصحاب صفین (رضی اللہ عنہم) کا معاملہ تو جو امور اصحاب جمل کے متعلق قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوئے ان حضرات کیلیے قطعی اور یقینی طور پر نصوص موجود نہیں اس لیے ان کے معاملہ میں توقف وسکوت لازمی ہے۔ ان آیات واحادیث کے عموم پر نظر کرتے ہوئے جو فضائل صحابہ کے سلسلہ میں وارد ہیں بلکہ تمام ہی مومنین کے فضائل پر مشتمل ہیں اور جو انکی نجات اور شفاعت کی امید پروانہ دکھا رہے رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں،
اہل شام کی جماعت میں سے کسی کے متعلق جب تک قطعی اور یقینی طور پر یہ نہ جان لیں کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض وعداوت رکھتا تھا حتی کہ آپ کو کافر کہتا تھا اور سب وشتم اور لعن طعن کرتا تھا تو ہم ایسے شخص کو یقیناً کافر کہیں گے۔ اور جب یہ بات معتبر روایات سے پایہ ثبوت تک نہ پہنچے تو چونکہ انکا اصل ایمان بالیقین ثابت ہے اس لیے ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہونگے
خلاصہ کلام یہ کہ اہلسنت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کافر کہنے والا آپ کے جنتی ہونے سے انکاری، یا دینی اوصاف، علم، عدالت، زہد، تقویٰ کے اعتبار سے آپ کو خلافت کیلیے نا اہل کہنے والا اور آپ کی لیاقت کا منکر۔ کافر ہیں، یہ بات خوارج نہروان کے متعلق قطعی ثبوت کی حد تک پہنچنے کے سبب انکو کافر کہتے ہیں اور جنکے بارے میں پایہ ثبوت تک نہیں پہنچی انکو کافر نہیں کہتے۔
اہلسنت کے مذہب کی یہ وضاحت وتحقیق انکے اصول طے شدہ کے بھی مطابق ہے کیونکہ انکا اتفاق ہے کہ ضروریات دین سے انکار کرنے والا کافر ہے۔ اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایمانی درجہ میں بلند ہونا، آپ کا جنتی ہونا، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لائق ہونا نہ صرف احادیث سے بلکہ آیات قرآنیہ سے ثابت ہے، لہذا ان کا منکر کافر ہوگا۔ اور کم ظرفی، حب مال وجاہ، تاویل باطل، غلط فہمی یا کسی کے بھڑکانے اور بہکانے کی وجہ سے آپ سے لڑائی کفر نہیں فسق عملی یا اعتقادی ہے۔
اما میہ جب اصل بنیاد میں اہلسنت سے اتفاق کرتے ہیں تو انہیں حکم میں بھی اتفاق کرنا چاہیئے
مقدمہ (۷) یہ کہ اگر کوئی مرد مومن مرتکب کبیرہ ہو جائے یا کسی غلط فہمی یا شبہ فاسد میں پڑکر

کسی ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہو جائے تو اسے سب وشتم اور لعن طعن کرنا جائز نہیں اور اس سلسلہ میں کئی دلیلیں دی جا سکتی ہیں مثلاً۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ (سنو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اپنے اور مومن و مومنات کیلیے معافی چاہتے رہو) اس اصولی قاعدہ پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی چیز کا حکم دینا، اسکے خلاف کو روک دینا ہے، لہٰذا مومن فاسق جو محتاج استغفار ہیں انکو استغفار کا حکم دینا اس بات سے روکتا ہے کہ ان کے گناہ کے سبب ان کو زجر و توبیخ اور لعن طعن نہ کی جائے، نہ بددعا کی جائے۔ کیونکہ یہ سب باتیں استغفار کے ضد ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں۔ اسی لیے نماز کی آخری رکعت میں تشہد و درود کے بعد دعائے ماثورہ مشتمل بر استغفار مؤمنین و مومنات مسنون ٹھیرا۔ اور لعن کرنا یا بد دعا دینا ان کو رحمت الٰہی سے دور پھینکنا ہے اور شریعت کے حکم سے مقابلہ کرنا حرام قرار دیا جا چکا ہے،

(۲) اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ الآیہ معلوم ہوا کہ حاملین عرش الٰہی بھی مسلمانوں کیلیے استغفار میں مشغول و مصروف ہیں۔ اور ظاہر ہے مقربان دربار کے خلاف حضور شاہ کوئی لب کشائی غضب و ناخوشی کا ہی سبب ہو سکتا ہے، ایسے مسلمان و مومن کے خلاف بد دعا یا سب وشتم جسکے لیے حاملان عرش استغفار میں مشغول ہوں ہرگز رضائے الٰہی نہیں ہو سکتی۔

(۳) اہل کبائر کے حق میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت ثابت ہے اب تم ان کو گالی یا بد دعا دے کر دربار خداوندی میں پیغمبر کے مدمقابل ہونے کی جرأت نہیں کر رہے ؟

(۴) وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ الآیہ معلوم ہوا کہ اس امت کے پچھلے آنے والوں کو اس شاندار روایت کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنے سے پہلوں کیلیے دعائے مغفرت کرنی چاہیئے اور اس روایت کو زندہ و تازہ رکھنا چاہیئے۔ تاکہ کل ہم جب اسکے محتاج ہوں تو ہمارے بعد والے ہمیں فراموش نہ کر دیں۔ اب جو اس کے خلاف کرے۔ یعنی بجائے دعائے مغفرت و عفو ان پر لعن طعن کرے وہ گویا ملت و دین کا حق تلف کر رہا ہے۔

(۵) محبت و دوستی کا سبب ایمان ہے جو فاسق میں موجود ہوتا ہے، یہ فسق قابل نمائش تمغہ نہیں۔ یہ ایک مرض ہے جو علاج کا محتاج ہے اس سے تعلق اور ہمدردی کا تقاضا ہے کہ اسکا یہ مرض دور کیا جائے اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک زندگی میں ایک موت کے بعد۔ زندگی میں علاج یہ ہے کہ اسے اچھی باتوں کرنے اور بری باتوں سے رکنے کو کہا جائے، وعظ و نصیحت کی جائے، حدود تعزیر سے آلائش روحانی دور کی جائے۔ اور جب وہ مر جائے تو دوسرا طریقہ کام میں لایا جائے کہ اسکے لیے دعائے مغفرت کی جائے ایصال ثواب کیا جائے۔ صدقہ و خیرات، کلمہ و کلام سے اسے فائدہ پہنچایا جائے، یہ تو ایک فطری سی اور انسانی زندگی کی پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ جب کسی کا بھائی بند، عزیز رشتہ، مبتلائے مرض ہوتا ہے تو وہ اسے گولی مار کر یا قتل کر کے ازالہ مرض کرنے کی نہیں سوچتا وہ اسے لیکر طبیب کی طرف بھاگتا ہے، جو اس کا علاج اس مرض کے اثر کو زائل کرنے کی صورت میں کرتا ہے، اسکے قتل اور اسکی روح مٹانے کی شکل میں نہیں کرتا، حدیث صحیح کا ایک مضمون ہے لعن المومن کقتلہ (مومن کو لعنت کرنا گویا اسکو قتل کرنا ہے) اسلیے کہ لعنت کے معنی رحمت سے دور کرنے کے ہیں۔ اور

اسمیں جب تک ایمان موجود ہے اسکی رحمت سے دوری نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں اس پر لعنت کرنے والا اللہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس کا ایمان سلب کرلیں، اب وہ سوچ لے کہ کس سے کیا کہہ کر اپنے لیے کانٹے بو رہا ہے، کیونکہ سلب ایمان تو ہلاکت ابدی ہے جو قتل سے ہزار درجہ سخت ہے۔

(۶) علت کا وجود چاہتا ہے کہ حکم موجود ہو اور علت کے زوال کا تقاضا ہے کہ علت نہ ہو تو حکم بھی نہ ہو۔ لہذا مومن فاسق کا ایمان دائم ہے روح کے دوام کے سبب۔ دوام روح کی صفت ہے۔ اور یہ ایمان دوستی و محبت کا سبب ہوتا ہے۔ تو وجوب محبت بھی دائم بدوام روح ہوگا فسق ایک بدنی عمل ہے جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہوگا تو یہ فسق بھی معدوم ہو جائے گا۔ اور اسکے اسباب، بغض وعناد، سب وشتم، لعن طعن، اہانت و تحقیر بھی بعد موت زائل ہو جائیں گے اور ایمان کے تقاضے (بسبب دوام ایمان) باقی رہیں گے اور وہ مثلاً مغفرت و بخشش وغیرہ ہیں اسی لیے حدیث صحیح میں وارد ہے۔ لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ اَفْضَوْا اِلٰی مَاقَدَّمُوْا (مردوں کو گالی نہ دو کیونکہ وہ تو اپنی آگے بھیجی ہوئی اشیاء تک پہنچ چکے) موت اس لحاظ سے فاسق کے حق میں توبہ کا حکم رکھتی ہے کہ وہ عمل بد کا سلسلہ تو منقطع کر دیتی ہے مگر عمل سابق کو نہیں مٹا سکتی اور توبہ عمل سابق کو بھی ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ اب موت کی وجہ سے جب عمل بد ختم ہو گیا، تو اب صرف ایمان رہ گیا۔ وجوب محبت جسکا تقاضا ہے۔

(۷) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ (سورۂ توبہ)
ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے محض ایمان پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے (آگے پیچھے کوئی تعلیق نہیں) لہذا مسلمان اور مومن پر لعن کرنا اور اسکے عذاب کی آرزو، یا دعا کرنا گویا خدا تعالیٰ سے یہ چاہنا ہے کہ وہ ان کی خاطر وعدہ خلافی کر جائے قطع نظر اس کے کہ خدا کے ہاں وعدہ خلافی کا خانہ ہی نہیں۔ ان دشمنان دین وایمان کی سادگی کی بھی تو داد دینی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے فرمایا کہ وَاللّٰهُ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ پس یہاں طلب محال کے ساتھ نتیجہ میں سوء ادبی بھی!

مقدمہ (۸):۔ امور دنیا کے سبب بزرگوں میں باہم بہت دفعہ آزردگی پیدا ہوتی ہے مگر اسکے باوجود یہ بزرگ اس آزردگی باہم کے سبب کبھی اپنے مرتبہ سے نہیں گرے اور نہ تحقیر واہانت کے سزاوار قرار پائے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور انکے برادران۔ کہ ان کے مابین تو بہت کچھ ہوا کیا ہے۔ مگر ہمارے لیے صرف یہی حکم ہے کہ ان کی عزت وتکریم کریں اور انکی تعظیم ملحوظ خاطر رکھیں۔

ائمہ اور امام زادوں میں جو اختلاف پیدا ہوا حتی کہ بعض نے بعض کی امامت تک سے انکار کر دیا تو ان حضرات کے معاملہ میں شیعہ حضرات کا طرز عمل بھی یہی ہے کہ سب کچھ ہوتے علی الرغم وہ سب کی عزت وتکریم کرتے ہیں اب اس عزت وتعظیم کی وجہ انکے نزدیک چاہے جو کچھ ہو مگر اس سے تو مجال انکار نہیں کہ ان میں سے معصوم تو صرف ایک ہی ہوگا۔ اپ اپنی تعلیم مذہب اور افتاد طبیعت کے مطابق انکو معصوم کے مدمقابل کو جو کہنا چاہیئے عجیب بات یہ ہے کہ وہ نہیں کہتے، ان کے حق میں کفر تو بڑی بات ہے فسق تک کا اعتقاد بھی نہیں رکھتے۔ اب جس وجہ سے امام زادگان رحمۃ اللہ علیہم سے شیعوں کا یہ طرز عمل ہے۔ اسی وجہ سے اہل سنت بھی رسول رحمت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلقین، اصحاب، ازواج مطہرات، اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی تعظیم وتکریم کام میں لاتے ہیں اور ہر دو فریقوں کو اپنے اپنے طرز

عمل میں معذور رکھتے ہیں۔
اور ملا عبداللہ مشہدی جوان شیعوں میں نسبتاً ذرا گہری نظر رکھتا ہے اور حاضر دماغ رہتا ہے اس متوجہ پر متنبہ ہو کر مطلق منع کو ناکافی جان کر اسکے اس سے چشم پوشی نہ کر سکا اور خود ایک سوال قائم کر کے اسکے جواب کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ مقام شبہ کا ہے اور عقلمند کو چاہیئے کہ شبہ کی صورت واضح کر کے بیان کرے پھر اسکو دور کرنے کی کوشش کرے اگر کوئی کہے کہ دو ہمرتبہ اشخاص ہوں یا جماعت مقبولان الٰہی میں سے ہوں اور ان کے درمیان کسی شبہ، شک یا اختلاف رائے کیوجہ سے نزاع یا رنجش پیدا ہو جائے اس صورت میں ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی پر بھی طعن کریں اور اس سے بدگوئی سے پیش آئیں (اب اسکے جواب میں کہتا ہے) یہ فرضی اگر ایسے تمام صلحائے امت کے درمیان پیش آئے جو سب کے سب جائز الخطا ہوں تو ممکن ہے۔ اور اگر زیر غور مقام ایسا ہو کہ ایک طرف معصوم ہوں اور دوسری طرف جائز الخطا تو یہ جائز نہیں اس صورت کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں مخاصمہ کے ہر دو اطراف برابر نہیں ایک طرف معصوم ہیں تو دوسری طرف جائز الخطا۔ معصوم چونکہ خطا کا احتمال نہیں رکھتا اس لیے وہ مقابل سے ناحق آزردہ نہ ہوگا۔ اور دوسری طرف چونکہ جائز الخطا ہے وہ اگر کسی بنا پر شبہ کر کے معصوم سے آزردہ ہو کر عداوت رکھے گا تو وہ معذور نہ ہوگا کیونکہ معصوم کی محبت اور اس کی رعایت تعظیم پر نص آچکی ہے، تو اس کے شبہ کا کوئی اعتبار نہیں جسطرح شیطان کا شبہ حضرت آدم علیہ السلام اور انکی اولاد کی عداوت میں کہ اس کا یہ شبہ قابل عذر نہیں، (انتھی کلامہ)
اس جواب میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کر کے گڑبڑانے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ دانستہ مغالطہ میں ڈالنے کیلیے کی گئی ہے، ورنہ وہ اتنے کودن نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ ہم نے اپنے کلام کی بنیاد ہی ایسی صورت پر رکھی ہے کہ اگر دو معصوموں میں باہم آزردگی و ناراضگی پیدا ہو، جب وہ دونوں ہی معصوم ہیں تو پھر کہاں ابلیس کہاں آدمؑ۔
اور ایسی مثالیں کہ فریقین معصوم ہوں اور ان میں باہم آزردگی پیدا ہو۔ اور دونوں ایک دوسرے کی حق تلفی کریں ہم کتب امامیہ سے بہت سی پیش کر سکتے ہیں۔
(۱) حضرت آدم علیہ السلام کا تنازعہ کہ حضرات ائمہ کا درجہ ان سے بلند کیوں ہو گیا، پھر ان سے مخالفت کرنا، ان سے حسد رکھنا، ان کی محبت کا عہد باوجود حکم الٰہی کے پورا نہ کرنا، اسکی پوری تفصیل بحث نبوت میں بیان ہو چکی ہے۔
(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے بڑے اور نبی بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی اہانت و تحقیر کرنا، داڑھی پکڑنا ان کے سر کے بال کھینچنا، یہ واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے کسی کو مجال انکار نہیں۔
(۳) شیعوں کی معتبر کتاب، بحر المناقب میں مناقب اخطب خوارزم سے ابوتراب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے نقل ہے کہ جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لائے جناب علی رضی اللہ عنہ کو وہاں نہ دیکھا تو پوچھا میرا عم زاد کہاں ہے۔ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا مجھ میں ان میں کچھ ناچاقی ہو گئی اس لیے یہاں قیلولہ کرنے کے بجائے وہ باہر چلے گئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ مسجد میں پہلو کے بل لیٹے سو رہے ہیں، اور سر و چہرہ صحن مسجد کی خاک سے خاک آلودہ تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قُم یا اباتراب، قم یا اباتراب۔ (ابوتراب اٹھو۔ ابوتراب اٹھو) یہ واقعہ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے، (انتھی کلامہ)۔
(۴) ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی، امامیہ کا بہترین محدث ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتا

ہے کَانَ یُبْدِیْ الْکَرَاھَۃَ لِمَا فَعَلَہٗ اَخُوْہُ الْحَسَنُ مِنْ صُلْحِ مُعَاوِیَۃَ وَیَقُوْلُ لَوْ جُزَّ اَنْفِیْ کَانَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا فَعَلَہٗ اَخِیْ (آپ اپنے بھائی جناب حسن رضی اللہ عنہ کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے پر بڑے خفا تھے اور فرماتے تھے، کہ اگر میری ناک کٹ جاتی تو وہ مجھے زیادہ پسند تھی اس بات کے مقابلہ میں جو میرے بھائی نے کیا) لہٰذا ان صورتوں میں آزردگی و ناراضگی ہر دو جانب حق ہو تو اجتماع نقیضین لازم آتا ہے اور اگر ایک طرف حق اور دوسری طرف باطل ہو تو طرف باطل کی عصمت درہم برہم ہوتی ہے اور یہ خلاف مفروض ہے۔ پس معلوم ہوا کہ معصوم کے ساتھ آزردگی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک وہ جو عداوت، تعصب، عناد اور بغض پر مبنی ہو جیسے خوارج نواصب کی اہل بیت اور مسلمانوں سے، دوسری وہ کہ باقتضائے بشریت ہو یا کسی ایسی دلیل سے جسکا اسے انکشاف ہو گیا ہو جیسے جناب سیدہ کی آزردگی جناب مرتضیٰ (رضی اللہ عنہما) سے یا حضرت موسیٰ کی کبیدگی حضرت ہارون علیہما السلام سے۔ یا جناب حسین کی جناب حسن (رضی اللہ عنہما) سے، اور ایسی آزردگی جو بتقاضائے بشریت ہو یا ظہور دلیل کے سبب ہو نہ فسق ہے، نہ موجب طعن کہ عصمت میں خلل پڑے، جب ایسی آزردگی سے عصمت معصوم میں کوئی خلل نہیں پڑتا تو عدالت و تقویٰ میں بدرجہ اولیٰ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اور ہم یہی بات ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں، فدک وغیرہ کے سلسلہ میں صحابہ کرام کو جناب مرتضیٰ و بی بی زہرا رضی اللہ عنہما سے جو آزردگیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ اسی نوعیت کی تھیں، صاحب اظہار الحق اس جواب پر متنبہ ہو کر چپ نہ رہ سکا اور خود ہی ایک سوال قائم کر کے اس کے جواب کی فکر میں لگ گیا۔ لیکن جو سوال اس نے قائم کیا ہے اسکا وہ صحیح جواب دے ہی نہ پائے گا۔ اس نے سوال قائم کیا کہ ممکن ہے نیک لوگوں کی ایک جماعت ایک بات چاہیں یا کسی بات کو مسلمانوں کے مفاد میں دیکھیں مگر وہ بات اہل بیت کے لیے بے فائدہ اور فضول ہو اور وہ بتقاضائے بشریت اور اس سبب سے کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنا مفاد پہلے دیکھتا ہے نیک لوگوں کی مخالفت کریں اور ان سے ناراضگی رکھیں اور اس کا اظہار بھی کریں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اہل بیت کے کلام میں ناراضگی و ناخوشی ظاہر کرنے والی باتیں اسی وجہ سے ہوں اور اس طرف سے رنجش و عداوت مطلق نہ ہو۔

اس سوال کا بڑا طول طویل جواب بڑے گھماؤ پھراؤ سے دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کی رو سے جناب امیر معصوم ہیں، اور حقائق شرعیہ کو زیادہ جاننے والے تو آپ کے لیے یہ کہاں زیبا ہے کہ حق کے خلاف نیکوں کی مخالفت کریں لہٰذا آپ کی کیفیت صحابہ کے ساتھ ایسی ہے جیسے نیکوں کی باہم ہوتی ہے،

مگر یہ جواب بھی بچند وجوہ پُر خلل ہے، اوّل، بی بی زہرا، جناب حسین رضی اللہ عنہما، اور حضرت آدم و حضرت موسیٰ علیہما السلام بھی معصوم ہی تھے، تو انکے لیے کب مناسب تھا کہ حق کے خلاف معصوموں کی مخالفت کریں اور اگر ہر دو طرف حق مانا جائے گا تو اجتماع ضدین لازم آئے گا، یا یہ کہ ان میں سے ایک فریق معصوم نہ ہو،

دوسرے بعض اوقات مقابلۃً "ٹھیک" اور "زیادہ ٹھیک" کا ہوتا ہے اور کبھی "ٹھیک" اور "غلط" کا جواز روئے دلیل مجتہد کے حق میں ٹھیک ہی کا درجہ رکھتا ہے اس طرح گویا کسی جانب سے بھی حق کے خلاف نہ ہوا،

مقدمہ (۹):۔ ہر عقلمند جب اپنی سمجھ بوجھ کا جائزہ لے اور دوسروں کے حالات و واقعات پر بھی نظر رکھے تو یہ بات یقیناً اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ بسا اوقات خوفناک و ہولناک واقعات کے سبب یا الفت و عداوت کے باعث وہ مقررہ طے شدہ بلکہ بدیہی اصول بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ یا ان کے خلاف کسی گفتگو یا عمل کا مرتکب

ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات یہ غفلت و فراموشی طول بھی کھینچ جاتی ہے، اور بعض اوقات متنبہ ہو کر، صحیح معلومات کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور یہ غفلت و فراموشی بتقاضائے بشریت ہوتی ہے جس میں کسی کا کوئی استثنار نہیں نبی، غیر نبی، معصوم، غیر معصوم، ولی، غیر ولی، متقی، غیر متقی، سب اسمیں شامل و شریک ہیں اور اس نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ انبیا، علیہم السلام کو اس کیفیت میں زیادہ دیر نہیں رکھا جاتا فوراً متنبہ ہو جاتا ہے۔

دوسروں کیلئے ضروری نہیں ہے کہ جلد متنبہ ہو جائے قرآن و حدیث سے بے شمار دلیلیں اسکی ملتی ہیں،

اول: حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر درخت سے اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ سن کر یقین ہو گیا تھا کہ یہ تجلی الٰہی ہے جو مصروف تکلم ہے، اور عصا ڈال دینے کا حکم دے رہی ہے ایسی صورت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کسی بھی مخلوق کا خوف و خطرہ اپنے دل میں نہ لائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے اور پورا پورا محافظ بھی مگر پھر بھی جب عصا سانپ کی صورت میں متحرک نظر آیا تو آپ ایسے ڈرے کہ بھاگ اٹھے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا اسی وقت دوران کلام لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ (ڈرو نہیں میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے) سے متنبہ ہوا،

دوسرے: فرعون کے جادوگروں سے مقابلہ کے وقت وعدۂ الٰہی کے مطابق آپ کو پختہ یقین تھا کہ ان کے مقابلہ میں غلبہ مجھ ہی کو حاصل ہو گا، اسکے باوجود جب جادوگروں نے رسیوں اور لاٹھیوں کے سانپ بنا بنا کر میدان میں پھینکنے اور اپنے مخصوص نعرے لگانے اور شور مچانا شروع کیا تو اچانک آپکے دل میں خوف آگھسا یہاں پھر آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کیلئے فوری طور پر متنبہ ہوا، لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (ڈرو نہیں تم ہی فتحمند رہو گے)

تیسرے: کوہ طور سے واپسی پر قوم کو گئوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر اور حضرت ہارون علیہ السلام کی جانب سے عدم اطلاع پا کر آپ ایک دم مشتعل ہو گئے غصہ دماغ میں چڑھا تو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہارون تو پیغمبر ہیں، معصوم ہیں پیغمبر و معصوم، شرک و بت پرستی پر کیسے راضی ہو سکتا ہے، عدم اطلاع کی کوئی وجہ ہی ہو گی،

چوتھے: آپ نے خضر علیہ السلام سے عہد کیا کہ آپکے معاملہ میں مطلقاً دخل نہ دوں گا نہ آپکے اعمال کے اسباب آپ سے پوچھوں گا، لیکن جوں ہی آپ نے کوئی اچھنبے کی بات دیکھی تو عہد ذہن سے فراموش ہو گیا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کے فعل پر سخت نکتہ چینی کی اور بالآخر خضر علیہ السلام کی یاد دہانی پر متنبہ ہوئے،

پانچویں: حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ قوم لوط کافر اور مستحق عذاب ہے نیز یہ اعتقاد بھی پختہ تھا کہ حکم الٰہی ٹالا نہیں جا سکتا، اسکے باوجود مجرموں کی پیروی میں استغاثہ لے کر بارگاہ الٰہی میں جا پہنچے۔

ارشاد خداوندی ہے،

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ يٰۤاِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ۔

جب ابراہیم کا ڈر نکلا۔ اور خوشخبری سن لی تو وہ قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑنے لگے، ابراہیم بڑے بھلے خدا ترس اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ ہم نے کہدیا ابراہیم اس خیال سے درگذرو تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا یہ عذاب آکر رہے گا اسے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

چھٹے: ۔حضور صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، عشا بعد جب سب نمازی جاچکے تو ام المؤمنین بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا ملاقات کیلیے تشریف لائیں، بہت دیر تک بیٹھی رہیں جب واپسی کا ارادہ ہوا تو چونکہ رات خاصی گذر چکی تھی، اسلیے آنحضرت صلے اللہ علیہ ان کو گھر تک پہنچانے کیلیے مسجد سے باہر تشریف لائے، اثنائے راہ میں دو بڑے مخلص ایمان والے انصاری ملے جب انہوں نے حضور کو پہچان لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ ساتھ میں محترمہ بھی ہیں، تو راستہ سے ایک سمت سمٹ کر تیزی سے نکل جانا چاہا مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انکو روکا اور فرمایا یہ عورت میری بیوی صفیہ ہیں، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! غلاموں کی یہ گستاخانہ جرأت کہاں کہ وہ آپکے متعلق کوئی غلط خیال کرتے۔ آپ نے فرمایا شیطان آدمی کا دشمن ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ شیطان تمہارے دلوں میں گمان بد اور خیال فاسد نہ ڈال دے،

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عصمت کا اعتقاد رکھتے ہوئے بھی یہ ممکن تھا کہ اس حالت کو دیکھتے ہوئے جو عام لوگوں کیلیے سبب تہمت ہو سکتی ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی ایسی تہمت کا وہم کسی کے دل میں پیدا ہو جائے، اور یہ بات ایمان واعتقاد کے منافی نہیں،

ساتویں: ۔امامیہ کی ساری کتب اخبار میں بحوالہ ابی حمزہ الثمالی علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت بیان کی ہے

قَالَ اَبُوْحَمْزَةَ قَالَ لِیْ عَلِیُّ بْنُ الْحُسَیْنِ کُنْتُ مُتَّکِئًا عَلَی الْحَائِطِ وَاَنَا حَزِیْنٌ مُتَفَکِّرٌ اِذْ دَخَلَ عَلَیَّ رَجُلٌ حَسَنُ الثِّیَابِ طَیِّبُ الرَّائِحَةِ فَنَظَرَ فِیْ وَجْهِیْ ثُمَّ قَالَ مَا سَبَبُ حُزْنِكَ قُلْتُ اَتَخَوَّفُ مِنْ فِتْنَةِ ابْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ فَضَحِكَ ثُمَّ قَالَ یَا عَلِیُّ هَلْ رَاَیْتَ اَحَدًا خَافَ اللّٰهَ فَلَمْ یُنْجِهٖ قُلْتُ لَا قَالَ یَا عَلِیُّ هَلْ رَاَیْتَ اَحَدًا سَاَلَ اللّٰهَ فَلَمْ یُعْطِهٖ قُلْتُ لَا ثُمَّ نَظَرْتُ فَلَمْ اَرَ قُدَّامِیْ اَحَدًا فَتَعَجَّبْتُ مِنْ ذٰلِكَ فَاِذَا اَقَائِلٌ اَسْمَعُ صَوْتَهٗ وَلَا اَرٰی شَخْصَهٗ یَقُوْلُ یَا عَلِیُّ هٰذَا الْخَضِرُ۔

حمزہ کہتا ہے مجھ سے علی بن حسین نے کہا میں دیوار سے ٹیک لگائے غمزدہ وفکر مند سا بیٹھا تھا کہ اچانک سی ایک خوش لباس وخوشبو میں بسا ہوا شخص میرے سامنے آکھڑا ہوا، اور میرے چہرہ پر نظر ڈال کر بولا تمہارے غم وفکر کی کیا وجہ ہے میں نے کہا میں فتنۂ ابن زبیر سے خوفزدہ ہوں یہ سنکر وہ شخص ہنسا اور پھر بولا اے علیؑ کیا تم نے کوئی آدمی ایسا دیکھا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہو اور اللہ تعالےٰ نے اسے نجات نہ دی ہو، میں نے کہا نہیں پھر وہ بولے کیا تم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اسے نہ دیا ہو، میں نے کہا نہیں۔ یہ کہکر میں سامنے نظر اٹھاتا ہوں، تو وہاں کوئی نہیں تھا، میں اس پر متعجب ہی تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی، میں آواز ہی سن سکتا تھا بولنے والے کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اے علی یہ خضر تھے۔

اس قصہ میں جناب امام کو شدت خوف کے سبب ان دو باتوں سے غفلت ہوگئی جن سے ہر مومن آگاہ وباخبر ہوتا ہے اس لیے حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعہ آپ کو متنبہ فرما کر یہ غفلت دور کر دی گئی۔ لہذا اگر بعض صحابہ پر اہل بیت کی جانب سے یا اہل بیت پر بعض صحابہ (رضوان اللہ علیہم) کی طرف سے ایسے حالات طاری ہو جائیں اور وہ طول بھی کھینچ جائیں اور ایک دوسرے کے فضائل ومناقب سے بھی غفلت رہے تو اسمیں نہ تو تعجب کی کوئی بات ہے اور نہ ایسا ہونا دور از خیال بات ہے پھر یہ کیفیت محل طعن وتشنیع کیوں بنے،

مقدمہ (۱۰) :- یہ کہ فضیلت خاص اگر نہ ہو تو فضیلت عام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اسکے تقاضوں اور حقوق سے چشم پوشی کرنی چاہیئے۔ اور یہ مقدمہ عقل ونقل دونوں سے ثابت ہے عقل سے تو اس طرح کہ یہ ظاہر ہے کہ خاص کے اٹھ جانے سے عام نہیں اٹھتا مثلاً انسان وحیوان کا انتفاء اور جب عام نہیں اٹھا یعنی اس کی نفی نہیں ہوئی تو اسکا اثبات اور وجود ہے اور جب وہ خود موجود ہے تو اس کے لوازم بھی موجود ہیں، تاکہ لزوم کے معنے صادق آسکیں اسی لیے یہ مقولہ ہے کہ جب کوئی شئی پائی گئی تو اسکے لوازم بھی پائے گئے۔

اور نقل سے ثبوت اس طرح ہے کہ اہل کتاب جو اہل ملت میں داخل ہیں بہت سے احکامات میں انکو غیر اہل کتاب پر ترجیح دی گئی ہے مثلاً ان کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے میں۔ اسی نقطہ نظر سے کہ گو فضیلت خاص یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان ان میں موجود نہیں ہے، لیکن مطلق انبیاء پر ان کا ایمان ہے یہی صفت ان کو ایک ایسے شخص سے ممتاز کرتی ہے جو اس وصف سے عاری ہو، یا مثلاً عرب کو بلحاظ کفو عجم پر ترجیح ہے کہ وہ اولاد اسمٰعیل ہیں، گو قریشی کفارت ان میں نہ ہو، اسی طرح قریش کو تمام عرب پر برتری دی گئی ہے گو وہ خمس لینے اور زکوۃ کے حرام ہونے میں ہاشمیوں کی طرح نہ ہوں اسی طرح اور بھی مثالیں ہوسکتی ہیں، الغرض شریعت میں جا بجا اس مقدمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے طول کلام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کی جزئیات بالتفصیل بھی بیان کی جاسکتی تھیں، فی الحال یہی کافی ووافی ہے، اس سے قطع نظر کہ اس مقدمہ کو عقل ونقل دونوں کی پشت پناہی حاصل ہے امامیہ فرقہ خود بھی اسے تسلیم کرتا ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک اولاد علی ہونا ایسی فضیلت ہے، جو تمام علویوں میں مشترک اور باعث محبت ہے یہ بات انکی کتب میں صراحت کے ساتھ مسطور وموجود ہے، حالانکہ بعض علوی، ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے پھر بھی وہ فضیلت عامہ یعنی علوی ہونے سے نہیں نکلتے خواہ ان میں فضیلت خاص یعنی اعتقاد امامت تمام ائمہ ہو یا نہ ہو،

اسی طرح محب علی ہونا، اور خود کو شیعۂ علی کہنا ان کے نزدیک ایسی خوبی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ائمہ کی امامت کے منکرین پر بھی بدگوئی، لعن طعن وطعن جائز نہیں۔ پہلی بات کا ثبوت تو یہ کہ جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادہ جناب امیر نے اپنی امامت کا دعوی کیا اور امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا انکار کیا اور ان کے ساتھ پرخاش رکھی حتی کہ حجر اسود سے فیصلہ کرانے کی نوبت آئی اور حجر اسود نے جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں گواہی دی مگر پھر بھی محمد بن الحنفیہؒ آخر عمر تک اپنے دعوی سے دست بردار نہیں ہوئے، مختار ثقفی کو اپنا نائب مقرر کیا، کوفہ کے شیعوں کو اس کی اعانت ورفاقت کے لیے خطوط لکھے اور اسکو اہل شام سے لڑنے اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کیلیے مقرر کیا، مختار نے بھی بعد فتح امرائے شام کے سروں کو فتحنامہ اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہؒ ہی کو بھیجا، جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں اور رحلت کے وقت اپنے بیٹے ابو ہاشم کو امامت کی وصیت کی اب وہ اعتقاد جو شیعہ محمد بن الحنفیہؒ اور ان کے بیٹے ابو ہاشم کے بارے میں رکھتے ہیں یا جو تعظیم وتوقیر وہ ان کی کرتے ہیں وہ ان کی کتابوں خصوصاً مجالس المومنین میں دیکھنی چاہیئے۔

اور اسی طرح کا واقعہ جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ انہوں نے بجائے کسی امام کی بیعت کرنے کے خود اپنی امامت کا دعوی کیا، اور تلوار لہرا کر اعلان کیا کہ اہل بیت میں امام وہی ہے جو مرد میدان ہو تلوار لے کر خروج کرے

جو پوشیدہ اور چھپا رہے وہ امام نہیں چنانچہ قاضی نور اللہ اور دوسرے شیعوں نے ابوبکر حضرمی کے حوالہ سے مجالس وغیرہ میں یہ باتیں بیان کی ہیں، اور اس دعویٰ وامامت کا سلسلہ آپ کی اولاد میں جاری رہا یحییٰ اور متوکل نے بھی خروج کیا اور امامت کا دعویٰ ان بزرگوں سے متعلق شیعی عقیدت و محبت کا احوال ان کی کتابوں میں مرقوم و محفوظ ہے یہ سب ان کو نیکی سے یاد کرتے اور واجب المحبت جانتے ہیں بلکہ جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے مناقب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ میں نص صریح نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ان کی شہادت کے بعد فرمایا۔ اللہ مجھے بھی ان کے خونوں میں حصہ دار بنائے، قسم بخدا زید میرے چچا ہیں وہ اور انکے ساتھی ایسے ہی شہید ہیں جیسے علی بن ابی طالب اور ان کے ساتھی" شیخ ابن بابویہ نے امالی میں فضیل بن یسار سے اسکی روایت کی ہے، اور قاضی نور اللہ نے بھی مجالس المومنین میں فضیل بن یسار کے حالات کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے۔ اور یہ بات بھی اسی ذیل میں آتی ہے کہ جناب جعفر صادق کے پانچوں لڑکے محمد، اسحاق، عبد اللہ موسیٰ، اسمٰعیل، امامت کے سلسلہ میں باہم مخالفت رکھتے تھے۔

عبد اللہ افطح، اسمعیل کے سگے بھائی ہیں انکی ماں فاطمہ بنت حسین بن حسین بن علی رحمہم اللہ تھیں، اسمٰعیل جناب جعفر کی اولاد میں سب سے بڑے تھے، وہ آپ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، اسمٰعیل کی وراثت کے سبب جناب جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امامت کا دعویٰ انہوں نے یعنی عبد اللہ افطح نے کیا اور دلیل میں جناب امام جعفر کا یہ قول پیش کیا کہ ان ھذا الامر فی الاکبر ما لم یکن فیہ عاھۃ، (امامت بڑے ہی میں رہے گی تاآنکہ اسمٰعیل کی خرابی نہ ہو) جناب جعفر کو غسل بھی انہوں نے دیا نماز جنازہ بھی پڑھائی قبر میں بھی انہی نے اتارا انگوٹھی بھی انہوں نے لی امام وصی نے امانتیں بھی انہیں کے سپرد کیں،

ادھر محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ان کی سند یہ تھی کہ جناب محمد باقر نے جناب صادق (رحمہما اللہ) سے فرمایا تھا کہ تمہارے گھر میں میرے بعد ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کا نام تم محمد رکھو گے۔ وہ امام ہوگا۔

اسمٰعیلیہ، اسماعیل کو امام مانتے ہیں تو اسحاقیہ اسحٰق کو، اور موسویہ امام موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں، امام علی رضا کے بعد امام محمد تقی بچے اور حالات سے بے خبر تھے اکثر شیعہ ان کی امامت کے منکر ہیں، امام نقی کے بعد موسیٰ بن محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ایک جماعت ان کی پیرو ہوئی، جناب امام علی تقی کے بعد جعفر بن علی نے امامت کا دعویٰ کیا امام حسن عسکری کی امامت کے قائل تھے ان کا حمار یہ لقب رکھا، جب امام حسن عسکری نے وفات پائی تو جعفر نے اپنے دعویٰ میں قوت حاصل کرلی اور کہا کہ حسن بن علی نے کوئی جانشین نہیں چھوڑا امام کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ کوئی خلف وجانشین رکھتا ہو، لہٰذا امام حسن کے ماننے والے بہت سے لوگوں نے جعفر کی طرف رجوع کرلیا، ان میں سے ایک شخص حسن بن علی بن فضال تھے، یہ شخص شیعوں کے مجتہدین، محدثین و معتبرین میں سے تھے،

جعفر بن علی کے بعد ان کا لڑکا علی بن جعفر اور ان کی لڑکی فاطمہ جعفر نے شرکت میں امامت کا دعویٰ کیا اور جو امام حسن عسکری کی امامت کے معتقد تھے وہ بھی گیارہ فرقوں میں بٹ گئے،

مقصد کلام یہ کہ ان حضرات کی آپس کی مخالفتیں اور ایک دوسرے کی امامت کا انکار کوئی راز سربستہ قسم کی چیز نہیں تھی، بلکہ سلیقے کی ہانڈی کی طرح علی الاعلان پھوڑی جارہی تھی جلوتی اور خلوتی سارے ہی راز ہائے

درون پردہ سے آگاہ ہو چکے تھے، خصوصا امام حسن عسکری اور جعفر بن علی کے درمیان تو طعن بازی، فسق اور ارتکاب کبائر تک کے الزامات کی نوبت پہنچ گئی تھی شیعہ اسے خوب جانتے ہیں،

خاتمہ کلام کے طور پر کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ ان ساری مخالفتوں عداوتوں اور تو تو میں میں کے باوجود ان بزرگوں کو اولاد علی ہونے کی نسبت حاصل ہے اس لیے ان کی ساری خامیاں، اپنی جگہ مگر یہ ان سب کے نزدیک مقبول اور واجب التعظیم والمحبت ہیں، اور ان کی شکر رنجیاں اور عداوتیں، مخالفتیں وغیرہ سب لائق اغماض و چشم پوشی ہیں

اب دوسری بات۔ محب علی یا شیعۂ علی کی طرف آئیے۔ سب کو معلوم ہے کہ مختار امامت زین العابدین کا منکر تھا، نہ صرف منکر بلکہ معاند بھی، کہ آپ کے ایک صلبی بیٹے عبد اللہ کو اس نے کوفہ میں قتل کر دیا اس کے علاوہ بھی بہت سی قبیح اور ناشائستہ حرکات اس سے سرزد ہوتی رہیں ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے قاضی نور اللہ نے مختار ثقفی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس کی حسن عقیدت میں کسی شیعہ کو کوئی کلام نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ جب اس کے اعمال پر لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تو وہ اس پر سب وشتم کرنے لگے، امام باقر کو جب علم ہوا تو آپ نے شیعوں کو اس سے روکا کہ اس پر لعن طعن نہ کی جائے وہ تو ہمارا بہت بڑا محسن ہے، اس نے ہمیں مارنے والوں کو مارا، ہم کو اموال بھیجے اور دولت دی، (انتہی کلامہ)

تو گویا جس نے اپنے اوپر شیعۂ علی کا لیبل چسپاں کر لیا، اب اسکے لیے دنیا بھر کی ساری خباثتیں حلال ہو گئیں۔ آپ سے نسبت پیدا کر لینے کے بعد اسکے ساتھ برائی سے پیش آنا حرام ہے، اور اثنا عشریوں کے ہاں چونکہ بنی فضال اور دوسرے واقفیہ، ناووسیہ کی روایات مقبول ہیں ان پر بھی لعن طعن جائز نہیں کیونکہ آخر وہ محب علی تھے اور خود کو شیعۂ علی کہتے تھے، کیا ہوا جو بہت سے ائمہ کی امامت کو ٹھکراتے اور انکار کرتے تھے،

جب یہ مقدمہ ہر پہلو سے ثابت ہو گیا اور کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی تو اب اہل سنت کہتے ہیں کہ علی کی جگہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کو فرض کرنا چاہیئے، اور آپ کی محبت اور آپ پر ایمان کو علی کی محبت اور علی کی امامت کے اعتقاد کی جگہ جاننا چاہیئے، اور اقارب و ازواج واصحاب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین وانصار میں سے بجائے اولاد علی فرض کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کو جنہوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت رکھنے کا دعوی کیا ان پر ایمان رکھا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کیا، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کے خاندان کی خدمات بجا لائے اگرچہ ان سے انکار، قدر ناشناسی، اور اعمال قبیحہ کا صدور ہو ان کو بجائے مختار و بنی فضال کے سمجھنا چاہیئے، اور ان میں آپس میں موازنہ کرنا چاہیئے،

اب جو یہ کہتا ہے کہ محبت علی اور شیعیت علی یہ تاثیر رکھتی ہے کہ وہ اس کا دعوی کر کے بے شک ائمہ کی امامت کا انکار کرے ان کی شان میں بدگوئی کرے ان سے پرخاش رکھے مگر یہ تعلق اسے یہ تحفظ فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے لعن طعن سے محفوظ رہتا ہے۔ وہ یہ بتائے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ کی امت میں خود کو شمار کرنا اتنی تاثیر کیوں نہیں رکھتا کہ علیؓ کی امامت کے انکار کے بعد وہ شیعوں کے لعن وطعن سے محفوظ رہ سکے،

ہم کہتے ہیں یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ کہ یا تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا درجہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے درجہ سے (العیاذ باللہ) گھٹیا ہے، یا علیؓ کا درجہ (خدانخواستہ) محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے درجہ سے بڑھیا۔ اور یہ دونوں

صورتیں شیعوں کے نزدیک غلط و باطل ہیں بلکہ ان کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم وعلیؓ باعتبار درجہ برابر و مساوی ہیں، جیساکہ باب نبوت میں گذر چکا ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کی بلندی جناب علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے منصب پر اس مساوات کے علاوہ ہے، اسی لیے تمام کتب شیعہ میں امامت کو نیابت نبی کہا گیا ہے،
جب یہ دس مقدمات ذہن نشیں ہو گئے تو اب ان سے نتیجہ نکال لیجئے اللہ تعالےٰ مقاصد و مبادی تک پہنچنے کی ہدایت اور توفیق مرحمت فرمائے،

منصف کا حرف آخر

اپنے موضوع کی عجیب تر کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" بارھویں صدی ہجری کے بعد زیب تحریر سے مزین ہو کر نقش اختتام سے آراستہ ہوا خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس کی ابتدا میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اسی شرط کے تحت انجام تک پہنچا،
حضرت باری عزوجل اسمہٗ کے فضل عمیم سے امید ہے کہ اس تحفہ کو اپنی بارگاہ میں مقبولیت کا درجہ عطا فرماکر تمام مومن مرد و عورت کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرمائیں گے، اور اپنے انتہائی کرم و فضل جود و احسان کے طفیل راقم کتاب کو بھی اجر نیک اور ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔ جناب باری میں انتہائی الحاح، عاجزی اور زاری سے ملتجی ہوں کہ زبان و قلم کی لغزش سے اثنائے تقریر و تحریر میں اپنی یا اپنے دوستوں کی مرضی کے خلاف اس کتاب میں کوئی بات درج یا سرزد ہو گئی ہو تو محض اپنی بے پناہ عنایت و مہربانی سے اسے معاف فرماکر درگذر فرمائیے اور دنیا و آخرت میں اسکے مواخذہ سے نجات بخشیے، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

تمت بالخیر

خلیل الرحمان نعمانی مظاہری
۲۹ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۲ھ
۲۱ جولائی سنہ ۱۹۸۲ء چہارشنبہ،